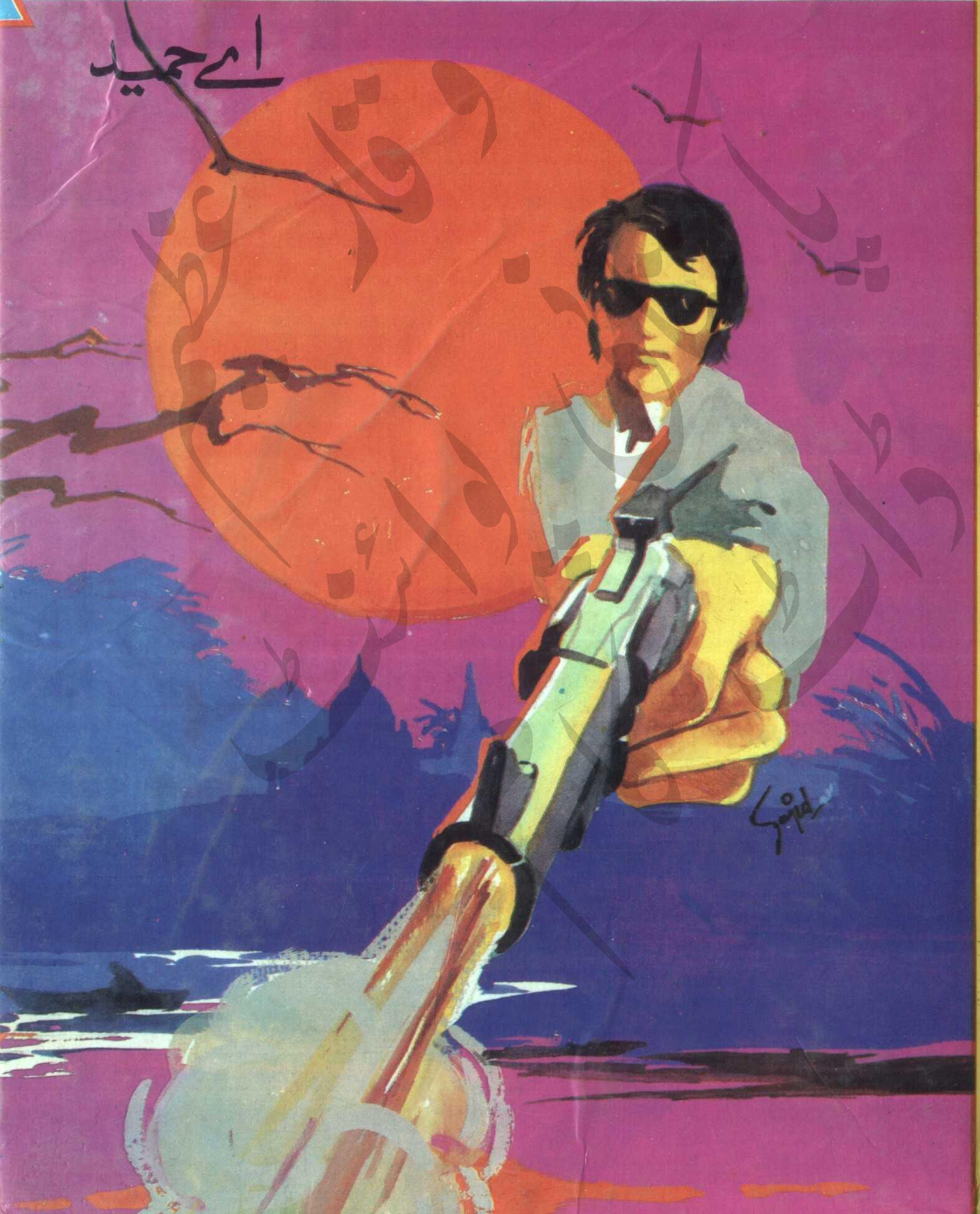
خزاں کی بارش

سوناگاچی کی راتیں



لاہور میں جنوری کی ابر آلود صبح ...... ہلکی بارش میں شہر سے باہر نہر کنارے کے درخت بھیگ رہے ہیں۔ یہ سفیدے کے درخت ہیں جن کے پتے خزاں کی ہواؤں میں جھڑ گئے ہیں۔ یہ زرد پتے گھاس پر پڑے ویران آنکھوں سے اپنی ان شاخوں کو تک رہے ہیں۔ جن پر وہ کونپلیں بن کر پھوٹے۔ بہار کی ہوائیں میں پروان چڑھے۔ ان کے سایوں میں بیٹھ کر پرندوں نے محبت کے گیت گائے اور پھر ایک دن خزاں کے پہلے جھونکے کے ساتھ ٹوٹ کر گر پڑے۔ سب رشتے ناتے ٹوٹ گئے۔ نہ ساون کی ہواؤں میں جھولا جھلانے والی شاخیں رہیں نہ بہار کی صبح کو تازگی بخشنے والی شبنم رہی اور نہ وہ خوش رنگ پرندے رہے جو چمکیلی روشنی میں محبت کے نغمے سنایا کرتے تھے۔ نہر کنارے ان پتوں کا زرد فرش بچھا ہے۔ یہ بڑا پاکیزہ فرش ہے۔ ہوا بھی اس فرش پر ننگے پاؤں چلتی ہے۔ یہ زرد پتے وہ محبت بھرے خط ہیں۔ جو درختوں نے اپنی محبوبہ زمین کے نام لکھ لکھ کر نیچے گرا دیئے ہیں۔ نہر سفیدے کے ان درختوں کے بیچ سے ہو کر گزرتی ہے۔ نہر کا پانی ہلکی بارش میں اپنے سینے پر ننھے ننھے دائرے بناتا اور نیو کیمپس کی طرف بڑھتا جا رہا ہے آگے لکڑی کا چھوٹا سا پل آتا ہے۔ اس پل کی بائیں جانب ہری بھری ڈھلان ہے جس سے ایک پتھریلا راستہ یوکلپٹس اور آم کے درختوں میں گھری ہوئی ایک دو منزلہ کوٹھی کے گیٹ تک جاتا ہے۔ اس کوٹھی کا نام ''کینال لاج'' ہے۔

''کینال لاج'' کی اونچی چار دیواری کو سفید جنگلی گلاب کی بیلوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔ اس قدیم کوٹھی کی بالکونیوں پر آم کے درختوں کی ٹہنیاں جھکی ہوئی ہیں۔ چیت و ساکھ

(مہینوں کے ہندی نام) کے بعد جب ان شاخوں پر ہری ہری آم کی کیریاں لگتی ہیں تو شبانہ اب بھی بالکونی میں کھڑی ہو کر انہیں توڑ کر کھایا کرتی ہے۔ شبانہ لاہور ہی کے ایک اعلیٰ معیار کے کالج میں بی اے کی سٹوڈنٹ ہے۔ "کینال لاج" میں اس کی بڑی بہن غزالہ بھی ہے۔ دو بڑے بھائی عامر اور عقیل بھی ہیں۔ والدہ اور والد بھی رہتے ہیں۔ والد کا نام خواجہ غلام احمد ہے جو ریلوے کے بہت بڑے ٹھیکیدار ہیں۔ یہ کوٹھی ان کے والد یعنی شبانہ کے دادا نے بنوائی تھی جب وہ لاہور کی گنجان آبادی والے اپنے آبائی مکان سے نقل مکانی کر کے اس کوٹھی میں آ گئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد یہ کوٹھی ان کے اکلوتے بیٹے خواجہ غلام احمد کے حصے میں آ گئی جو شاہ خرچ اور آسائش پسند تھے۔ شبانہ کی والدہ سے ان کی شادی اسی کوٹھی میں ہوئی تھی۔ ریلوے کی ٹھیکیداری بھی انہیں اپنے والد سے وراثت میں ملی تھی۔ وہ دن بھر ٹھیکیداری کے جھمیلوں میں الجھے رہتے مگر شام کو گھر آ کر نہا دھو کر بوسکی کی کشمیری کڑھائی والی قمیص اور سفید شلوار پہن کر اپنے دوستوں کے ساتھ کوٹھی کے لان میں کرسیاں ڈلوا کر بیٹھ جاتے اور چائے اور تاش کا دور شروع ہو جاتا۔ رات کے کھانے پر ہر روز ان کے ساتھ چھ سات دوست ضرور موجود ہوتے اور ان کے لیے خانساماں بڑے اہتمام سے کشمیری کھانے پکاتا جن کی نگرانی شبانہ کی والدہ خود کرتی تھیں۔ خواجہ غلام احمد کی شادی کو تیس پینتیس برس گزر چکے تھے۔ ان کے دونوں لڑکے اور لڑکیاں جوان ہو گئی تھیں۔ خود ان کے بال سفید ہو گئے تھے۔ مگر زندگی اب بھی بھرپور طریقے سے بسر کر رہے تھے۔ رات کے کھانے پر اب بھی ان کے دو چار دوست ضرور مدعو ہوتے۔ بڑا لڑکا عقیل ان کے ساتھ ٹھیکیداری کرتا تھا۔ اس سے چھوٹا عامر بی۔اے کرنے کے بعد یورپ جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ بڑی لڑکی غزالہ نے ایف اے تک پڑھنے کے بعد گھر کے کام کاج میں والدہ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ شبانہ سب سے چھوٹی تھی اور زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس کا رجحان انگریزی ادب' مصوری اور شاعری کی طرف تھا۔ وہ خود شعر نہیں کہتی تھی مگر انگریزی فرانسیسی اور اردو شاعروں ادیبوں کی کتابیں اس نے اپنے کمرے کی الماریوں میں جمع کر رکھی تھیں جنہیں وہ رات گئے تک پڑھا کرتی۔

ادب کے مطالعہ نے شبانہ کی شخصیت میں ایک جمالیاتی حسن اور وقار پیدا کر دیا تھا۔ اور اس نے خواب دیکھنے شروع کر دیئے تھے۔ ایسے خواب جن میں وہ پائین اور برچ کے درختوں میں بنے ہوئے قدیم محرابی دروازوں والے پر اسرار محل دیکھتی جن کے دھند میں ڈوبے باغوں کے قطعوں میں سرخ اور سفید گلاب کھلے ہوتے۔ کسی سنگ مرمر کی جھکی ہوئی بالکونی میں وہ ایک شہزادے کو دیکھتی کہ سترہویں صدی کے خوش رنگ لباس میں ملبوس ہاتھ میں رباب لئے کھڑا اسے اپنی طرف بلا رہا ہے۔ یہ خواب شبانہ رات کو بھی دیکھتی اور کبھی دن کے وقت بھی وہ ان خواب آلود خیالوں میں کھو جاتی جب وہ اپنی سرخ گاڑی میں کالج جا رہی ہوتی۔ پھر وہ اچانک کسی آواز سے چونک پڑتی اور خوابوں کا یہ رنگین سلسلہ ٹوٹ جاتا اور اس کے سارے رنگ بکھر جاتے۔

کالج میں وہ سب سے خوبصورت اور بہترین لباس والی لڑکی مشہور تھی۔ ایف اے تک وہ ایک شوخ و شنگ لڑکی تھی جس کی شرارتوں سے کوئی پروفیسر اور اس کی کوئی سہیلی نہیں بچ سکتی تھی لیکن انگریزی ادب اور شعر کے مطالعے نے اسے اپنے حلقہ طلسم میں لینا شروع کر دیا اور وہ سنجیدہ ہوتی گئی۔ مگر وہ خشک نہیں ہوئی تھی۔ وہ اب بھی کالج کی سہیلیوں کے ساتھ قہقہے لگاتی تھی مگر اب اس کے قہقہوں میں ایک آہنگ' موسیقی اور دل میں اتر جانے والا وقار پیدا ہو گیا تھا۔ انہی دنوں وہ اپنے بڑے بھائی کے ساتھ گرمیوں کی چھٹیوں میں یورپ گئی تو آسٹریا میں اسے قدیم کلاسیکی موسیقاروں کی کمپوزیشنز سننے کا موقع ملا۔ شوپین اور بیتھوون کی سمفنیز نے اسے بے حد متاثر کیا۔ لاہور واپس آئی تو وہ موسیقی کے آہنگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے پنجاب کی صوفیانہ موسیقی کے کتنے ہی کیسٹ خرید لئے۔ وہ انہیں روز رات کو اپنے ڈیک میں لگا کر سنتی۔ جدید یورپی موسیقی کی تال اور پنجابی موسیقی کے درد بھرے سروں نے شبانہ کی شخصیت میں ایک گداز پیدا کر دیا۔ وہ اپنے ساتھ یورپ سے شوپین اور بے بیتھوون کے لانگ پلے اور بہت سے کیسٹ لائی تھی۔ وہ انہیں سنتی تو ان گنت وائیلنوں کی والہانہ لہریں اسے کشادہ سمندروں میں لے جاتیں جہاں وہ ایک ربی وسعت میں اپنے آپ کو جذب ہوتا محسوس کرتی۔ جدید مغربی موسیقی کی ردھم اس

کے خون میں زندگی اور توانائی کے نئے سورج طلوع کرتی اور پنجاب کی صوفیانہ موسیقی سنتے ہوئے اس کے معصوم اور پاکیزہ دل میں ان جانے جذبوں کی کونپلیں اپنے آپ پھوٹنے لگتیں۔

جس وقت کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت جنوری کی ابر آلود صبح ہے اور لاہور شہر ہلکی ہلکی سرد بارش میں بھیگ رہا ہے۔ شبانہ کی رہائش گاہ "کینال لاج" والی نہر خاموشی سے بہہ رہی ہے۔ کنارے پر بچھا زرد پتوں کا فرش موسم سرما کی ہلکی بارش میں بھیگ رہا ہے۔ "کینال لاج" کے کچن میں خانساماں اور دو نوکرانیاں کوٹھی میں رہنے والوں کے لیے ناشتہ تیاری کر رہی ہیں۔ شبانہ کی بوڑھی والدہ اپنے کمرے میں تخت پر قالین بچھائے بیٹھی آنکھیں بند کیے تسبیح پھیر رہی ہیں۔ ان کے بے آواز ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے ہیں۔ شبانہ کے والد خواجہ صاحب قد آدم آئینے کے سامنے کھڑے اپنے سفید بالوں میں کنگھی کر رہے ہیں۔ باہر سخت سردی ہے مگر کمرے کے آتشدان میں گیس کے ہیٹر کی وجہ سے ہلکی ہلکی پرسکون گرمائش ہے۔ دوسرے کمرے میں شبانہ کی بڑی بہن غزالہ الماری میں سے دھلے ہوئے میز پوش نکال رہی ہے۔ شبانہ کا بڑا بھائی عقیل بھی اپنے کمرے سے تیار ہو کر نکل آیا ہے۔ اور درمیان والے کمرے کی لمبی میز پر آکر بیٹھ گیا ہے اور اخبار کھول کر پڑھنے لگا ہے۔ عامر ابھی تک اپنے کمرے میں سو رہا ہے۔ شبانہ بھی کالج جانے کے لیے تیار ہو رہی ہے۔ اس کے ڈیک کے پلییئر میں خواجہ فرید کی کافی کی ٹیپ آہستہ آہستہ چل رہی ہے اور کمرے میں فریدہ خانم کی دھیمی آواز ابھر رہی ہے۔

سانول موڑ مہاراں

شبانہ صبح کو روزانہ کافی سنتی ہے۔ بالوں کو سنوارنے کے بعد شبانہ نے جیکٹ پہنی۔ کلون کا اسپرے کیا اور قد آدم آئینے میں آخری بار اپنے لباس کا جائزہ لیا۔ وہ اب سادہ مگر خوبصورت لباس پہنتی تھی۔ خوبصورت ان معنوں میں کہ وہ اپنے لباس کی کٹنگ اپنی نگرانی میں کرواتی تھی۔ اس کے کمرے کے آتشدان میں لکڑی کے دو بڑے بڑے کندے جل چکے تھے اور ان کے انگاروں پر سفید راکھ کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ شبانہ کو گیس کا ہیٹر پسند

نہیں تھا۔ وہ قدیم کلاسیکی فضاؤں میں رہنے والی لڑکی تھی۔ سولہویں اور سترہویں صدی کی یورپی کلاسیکی فضائیں۔ جہاں آئی وی کی خود رو بیلوں سے ڈھکی ہوئی دیواروں والے پرانے قلعوں کی سبز پوش کھڑکیوں میں چاندنی راتوں کو شہزادیاں اترا کرتی تھیں۔ شبانہ کے کمرے کی فضا نیم گرم تھی۔ جس میں بیش قیمت فرانسیسی کلون کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ شبانہ نے پلییئر کو بند کر دیا اور شیشے کی کھڑکی کھول کر بالکونی میں آئی تو جنوری کی بارش میں بھیگتی سرد ہواؤں نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ شبانہ نے ایک جھرجھری سی لی مگر وہ بالکونی میں آکر کھڑی ہو گئی۔

پرانے آم کے درخت کی شاخیں بالکونی پر جھکی ہوئی تھیں۔ ان کے پتوں سے بارش کا پانی بالکونی کے فرش پر ٹپک رہا تھا فضا میں گھاس، درختوں کے پتوں اور نہر کنارے اگی ہوئی جھاڑیوں کی ترو تازہ مہک تھی۔ شبانہ نے گہرا سانس لیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے موسم سرما کی الائچیوں کی خوشبو والی ٹھنڈی مہک اس کے سارے جسم میں سرایت کر گئی ہو۔ بارش کی شفاف ٹھنڈی بوندیں اس کے چہرے پر پڑیں۔ شبانہ کے ہونٹوں پر گرم اور زندگی سے بھرپور مسکراہٹ نمودار ہوئی جیسے اس نے بارش کو ایک حسین شہزادی کے روپ میں اپنے سامنے مسکراتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ وہ بالکونی سے اتر کر واپس اپنے نیم گرم کمرے میں آگئی۔ پہلی منزل کے ڈائننگ روم میں اس کی والدہ، والد، بڑا بھائی عقیل اور غزالہ پہلے سے موجود تھے۔ دنیا جہان کی باتیں ہو رہی تھیں۔ شبانہ سیڑھیاں اتر کر آئی تو عقیل نے کہا۔

"آج تمہاری سیلون کی چائے تمہیں نہیں مل سکتی۔ تمہیں سبز چائے پینی پڑے گی۔"

شبانہ نے اپنے والد کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اپنے سبز چائے کے پیالے میں باقر خانی بھگو رہے تھے۔

"ابو! ضرور رات آپ نے اپنے دوستوں کو پلا دی ہو گی۔"

باپ نے کہا۔ "ارے بیٹی! تھوڑی سی تو رہ گئی تھی۔ عقیل تمہیں ٹولنٹن مارکیٹ سے نیا ڈبہ لا دے گا۔" عقیل نے ٹوسٹ پر مکھن جماتے ہوئے کہا۔

"میں تو سائٹ پر جا رہا ہوں۔ شبانہ تم خود ہی کالج سے واپس آتے ہوئے لیتی آنا"

غزالہ بولی۔ "آج سبز چائے سے ہی ناشتہ کرلو بے بی۔"

شبانہ نے تنگ کر کہا۔ "دیکھئے امی جان مجھے باجی نے پھر بے بی کہا۔ میں بے بی نہیں ہوں۔"

غزالہ ہنسنے لگی۔ شبانہ کی والدہ نے سبز چائے کا گھونٹ لیا۔ سفید رومال اپنے ہونٹوں سے لگایا اور کہا۔

"بیٹی! ہمارے لئے تو تم بے بی ہی ہو۔"

شبانہ نے ناراضگی سے کہا۔ "میں بے بی نہیں ہوں۔ میں شبانہ ہوں۔ بی۔اے کی سٹوڈنٹ -----"

عقیل بولا۔ "بی اے کے پہلے سال میں ہی ہو ناں۔"

"پھر کیا ہوا۔" شبانہ نے جھنجھلا کر کہا۔ "اگلے سال دوسرے ایئر میں جاؤں گی۔"

خواجہ صاحب نے خانساماں سے کہا۔ "اسد جو! بھائی میری بچی کے لیے بڑی عمدہ انگلش چائے دم کر کے لاؤ۔"

خانساماں اسد جو فوراً کچن کی طرف چلا گیا۔ غزالہ کہنے لگی۔

"شبانہ! یہ جو تم صبح صبح لپٹن چائے پیتی ہو اس کی جگہ کبھی سبز چائے پی کر دیکھو تو تمہاری طبیعت سارا دن بشاش رہے۔"

شبانہ نے ٹشو پیپر نکالتے ہوئے کہا "باجی! مجھے صبح کو سبز چائے اچھی نہیں لگتی میں کیا کروں۔"

شبانہ کی والدہ بولیں۔

"بیٹی سبز چائے تو ہم کشمیریوں کی گھٹی میں پڑی ہے اور پھر یہ خشک بھی نہیں ہوتی۔"

عقیل ناشتہ کرتے ہوئے اخبار بھی پڑھ رہا تھا۔ بولا۔

"غزالہ اصل میں انگریزی ادب کی اسٹوڈنٹ ہے اسی لیے اسے انگریزی چائے ہی پسند ہے۔"

شبانہ کارن فلیکس میں دودھ ملا رہی تھی۔ کہنے لگی۔ "بھائی جان! آپ بھی انگریزی ادب پڑھیں۔ مگر آپ کو تو ٹھیکیداری ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ اچھا میں آج آپ کو شیلے کی نظموں کی کتاب دوں گی۔"

"یہ تم ہی پڑھا کرو۔" عقیل نے بیزاری سے کہا۔ "اب شیلے ہمارے کسی کام نہیں آسکتا۔"

شبانہ کے والد نے عقیل کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ریلوے ہیڈ کوارٹر میں ایکس سی این سے مل کر سائٹ پر جانا۔ اور ہاں ان سے پہلے والے بل کی بات بھی کرنا۔ پندرہ لاکھ کی پے منٹ خوامخواہ رکی ہوئی ہے۔"

خانساماں شبانہ کے لیے انگلش چائے دم کر کے لے آیا۔ شبانہ نے پیالی میں چائے انڈیلی تو اسے یوں لگا جیسے پیالی میں سورج غروب ہو رہا ہے۔ ایک لمحے کے لیے وہ پھر خواب کے جزیروں میں نکل گئی۔ اس کے اردگرد کوئی چہرہ نہیں تھا۔ کوئی شکل نہیں تھی۔ کوئی آواز نہیں تھی۔ صرف ایک آواز تھی۔ ہلکی بارش کے قطروں کی درخت کے پتوں پر گرنے اور پھر وہاں سے پتھریلے فرش پر ٹپکنے کی آواز----- وہی سبز بیل میں ڈھکا ہوا قلعہ تھا جس کی سبز پوش بالکونی میں سترہویں صدی کا خوش لباس شہزادہ بربط ہاتھ میں لئے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اچانک کسی نے اسے آواز دی۔

"شبو! کیا سوچ رہی ہو۔ کالج سے دیر ہو رہی ہے تمہیں۔"

یہ غزالہ کی آواز تھی۔ شبانہ نے چونک کر دیکھا وہ ایک بار پھر اپنے بہن بھائیوں میں واپس آگئی تھی۔ غزالہ کرسی گھسیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ شبانہ کے والد اور عقیل بھی اٹھ کر اپنے اپنے بریف کیس لیے کمرے سے نکل گئے۔ شبانہ نے اپنی امی جان کے گلے میں بانہیں ڈال کر ان کا نورانی ماتھا چوما اور کہا۔

"امی! میں جا رہی ہوں۔"

ماں نے بیٹی کو پیار کیا اور دعا دی۔ شبانہ کتابیں اٹھائے کمرے سے نکل کر کوٹھی کے برآمدے میں آگئی۔ ہلکی ہلکی بارش ابھی تک ہو رہی تھی۔ اس کے والد اور بھائی کار کو

گیراج سے نکال کر گیٹ کی طرف مڑ گئے۔ لان کے سنگین بھیگے ہوئے فرش پر بارش اور سرد ہواؤں میں دوڑ کر گیراج میں گئی اور اپنی سرخ گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا اور آہستہ سے اسے باہر نکالا اور پھر اسے گیٹ کی طرف موڑ دیا اور تھوڑی دیر بعد اس کی کار نہر کنارے والی پکی سڑک پر بارش میں رواں دواں تھی۔ آج اس کے صرف دو پیریڈ تھے۔ اسے دو بڑے ضروری کام بھی کرنے تھے۔ ایک تو ٹولنٹن مارکیٹ میں جا کر سیلون کی چائے کا ڈبہ خریدنا تھا اور دوسرے لائبریری سے ہنری تھارو کی کتاب "والڈن" ایشو کروانی تھی۔ اس کتاب کا حوالہ شبانہ نے ولیم فاکز کے ایک چھپے ہوئے لیکچر میں پڑھا تھا اس نے اپنے لیکچر میں "والڈن" کی کتاب کی اس قدر تعریف کی تھی کہ شبانہ نے فوراً کالج کی لائبریری میں اس کی تلاشی شروع کر دی۔ مگر وہاں اسے نہ مل سکی۔ اس نے شہر کی مشہور دکانوں پر بھی اسے ڈھونڈا مگر ناکام رہی۔ اب وہ سرکاری لائبریری میں اس کا پتہ کروانا چاہتی تھی۔ اسے امید تھی کہ لائبریری میں اسے یہ کتاب ضرور مل جائے گی۔

بوندا باندی مسلسل ہو رہی تھی۔ شبانہ نے گاڑی کالج کے پارکنگ میں ایک طرف کھڑی کر دی۔ کالج کے احاطے میں سنبل کے تناور درخت بارش میں ٹپک رہے تھے۔ شبانہ نے دیکھا کہ کلاس رومز کے برآمدے میں اس کی سہیلیاں ٹکریوں میں بیٹھی خوش گپیوں میں مشغول تھیں۔ کئی ایک نے دور سے ہاتھ ہلا کر شبانہ کا خیر مقدم کیا شبانہ ٹپکتے درختوں کے نیچے سے تیز تیز قدموں سے گزر کر برآمدے میں آ گئی۔ نجمی اس کی خاص سہیلی اسے دیکھ کر اسی کی طرف بڑھی۔ "شبو! آج تو غضب کا موسم ہے۔ چلو شیزان میں چل کر کافی پیتے ہیں۔"

شبانہ نے اپنی جیکٹ پر سے بارش کے قطرے جھاڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے ٹولنٹن مارکیٹ اور لائبریری تک جانا ہے۔ واپسی پر کافی بھی پیتے آئیں گے۔"

نجمی نے کہا۔ "تم کیسی رومانٹک لڑکی ہو کہ ایسی خوبصورت بارش میں بھی پیریڈ اٹینڈ کرو گی۔ چلو ابھی چلتے ہیں پھر بارش رک جائے گی۔"

شبانہ نے مسکراتے ہوئے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی اور بولی۔ "اری نجمی! ابھی تو نہ

لائبریری کھلی ہو گی نہ ٹولنٹن مارکیٹ"

نجمی نے شبانہ کو بازو سے پکڑ کر برآمدے کی سیڑھیوں کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "اتنی دیر ہم شیزان میں بیٹھ کر کافی پیئیں گے۔"

دونوں گاڑی میں بیٹھ کر مال کی طرف روانہ ہو گئیں۔ جنوری کی بوندا باندی کا تسلسل جاری تھا۔ مال روڈ بھیگ رہی تھی۔ دونوں جانب کھڑے پیپل کے گنجان درخت بھی بھیگ رہے تھے۔ کار کے وائپرز مسلسل چل رہے تھے۔ شبانہ گاڑی چلا رہی تھی۔ نجمی نے فوریز گروپ کے گانے کی کیسٹ لگا دی۔ گانے کے بول اور اس کی کمپوزیشن اور انٹرول میوزک کی لہریں شبانہ کو جیسے بہا کر لے گئیں۔ "میں جاننا چاہتا ہوں محبت کیا ہے" گیت کے بولوں میں ایک طلسم تھا۔ ایک کشش تھی جو شبانہ کو ان دیکھے جزیروں اور گمنام جنگلوں میں کھینچ کر لے گئی۔ اس ٹیپ کو وہ کبھی کبھی ہی سنا کرتی تھی۔ خاص طور پر جب کبھی وہ گاڑی میں اکیلی بیٹھی شہر کی سنسان سڑک پر سے گزر رہی ہوتی تھی۔ اسے اپنی والدہ سے سنا ہوا ایک پرانا کشمیری گیت یاد آ گیا جس میں ایک لڑکی جو زعفران کے کھیتوں میں راستہ بھول جاتی ہے اور کہتی ہے۔ "میں زعفران کی تلاش میں نکلی تھی کہ راستہ بھول گئی۔ ڈل پر کھلے ہوئے کنول کے پھول رات کے اندھیرے میں ڈوب گئے ہیں۔ میں گھر کیسے پہنچوں گی؟" شبانہ کو ایسے لگا جیسے وہ بھی زعفران چننے نکلی تھی کہ گھر کا راستہ بھول گئی مگر اسے رات کے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے کنول کے سفید پھول اب بھی دکھائی دے رہے تھے۔

نجمی نے چونک کر کہا۔ "اری شبو! کہاں جا رہی ہو؟ ہم تو شیزان سے آگے نکل آئے ہیں۔"

شبانہ نے ایک دم سے گاڑی کی رفتار کم کر دی اور پھر "سوری" کہہ کر گاڑی کو سائیڈ لین میں لے آئی۔ یہاں سے دوبارہ گاڑی سڑک پر ڈالی اور اسے شیزان کے سامنے درختوں کے نیچے لا کر کھڑا کر دیا۔

شیزان کی فضا نیم گرم اور پر سکون تھی اس کی فضا میں کافی کی دھیمی دھیمی تلخی آمیز مہک رچی ہوئی تھی۔ اس مہک میں یوکلپٹس کی ان شاخوں کی ہلکی خوشبو بھی تھی جو تانبے

کے بڑے گلدان میں سجائی ہوئی تھیں۔ شیزان میں خاموشی تھی۔ صرف دو گاہک کونے کی جانب بیٹھے بڑے سکون سے ناشتہ کر رہے تھے۔ شبانہ اور نجمی بہت خوش ہوئیں۔ ایک تو شیزان میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ دوسرے انہیں اپنی پسند کی شیشے کی دیوار کے پاس والی میز مل گئی جہاں سے بارش میں بھیگتی مال روڈ کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ ان دنوں نجمی کا ندیم سے رومان بڑے زور و شور سے چل رہا تھا جو یونیورسٹی کا اسٹوڈنٹ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو خط بھی لکھتے تھے۔ ٹیلیفون بھی کرتے تھے اور ہفتے میں دو ایک بار کسی خفیہ جگہ پر مل بھی لیتے تھے۔ نجمی ندیم سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ شبانہ کو اس کے رومان کا علم تھا۔ بلکہ شبانہ اس کی رازدار تھی۔ مگر اسے نجمی کے رومان سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اصل میں شبانہ خوابوں میں رہنے والی اور خواب دیکھنے والی لڑکی تھی۔ حقیقت کی دنیا میں رہنے والے لوگ اسے کوئی اجنبی مخلوق نظر آتی تھی اور ان کے مسائل اس کی سمجھ سے باہر تھے۔ شبانہ اپنی خواب کی دنیا کو ہی حقیقت کی دنیا سمجھتی تھی۔ وہ اصلی زندگی میں یوں زندگی بسر کر رہی تھی جیسے سوتے میں کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ ہوٹل کا ویٹر قالین پر بے آواز قدموں سے چلتا ان کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

نجمی نے کافی اور کچھ سینڈوچز لانے کا آرڈر دیا۔ شبانہ آرام دہ کرسی میں دھنسی شیشے میں سے باہر مال روڈ کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں بارش میں گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ کبھی کوئی رین کوٹ پہنے تیز تیز قدموں سے گزر جاتا۔ سڑک کنارے کے پیپل کے گنجان درختوں کی ٹہنیاں ابر آلود موسم کی سرد ہوا میں ادھر ادھر لہرا رہی تھیں۔ باہر کی آوازیں بہت دھیمی ہو کر شیزان کی فضا میں آتی تھیں۔ شبانہ بھی ذہنی طور پر ایک ایسی ہی پر اسرار گمنام فضا میں رہتی تھی جہاں حقیقت کی دنیا کی آوازیں اور لوگوں کا شور بند شیشے کی دیواروں میں سے بہت ہی دھیما ہو کر اس تک پہنچ پاتا تھا۔ وہ جس فضا میں دن رات کا زیادہ حصہ بسر کرتی اس میں اسے اپنے ہی خیالات آپس میں سرگوشیاں کرتے سنائی دیتے۔ دور شجاعت کے جفاکش نات خواتین کی آبرو کی خاطر اپنی جان قربان کرتے نظر آتے اور سبز پوش

بالکونی میں بربط بجاتے خوش لباس شہزادے اسے اپنی طرف بلاتے

نجمی اسے کچھ کہہ رہی تھی۔ شبانہ کی خوابناک محویت کا سلسلہ جہاں ٹوٹا وہاں اسے نجمی کی آواز سنائی دی۔ "میں نے اس کے بعد بالکل فون نہیں کیا۔"

شبانہ نے پوچھا۔ "کس کو فون کیا تم نے؟"

نجمی نے تعجب سے شبانہ کی طرف دیکھا اور بولی۔ "یہ تمہاری بیٹھے بیٹھے گم ہو جانے کی عادت کب تمہارا پیچھا چھوڑے گی۔ مجھے تم بہت بور لگنے لگی ہو۔"

شبانہ فوراً سمجھ گئی کہ نجمی یقیناً ندیم کی بات کر رہی ہوگی۔ وہ مسکرا دی۔ "ارے میں تو تمہیں مذاق کر رہی تھی تو کیا اب ندیم کو تم فون نہیں کرو گی؟"

نجمی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "اس نے یہ کہہ کر مجھے اوفنڈ کیا ہے کہ پہلے میں اسے ٹیلیفون کروں۔ کیوں؟ وہ کیوں نہیں کرے گا؟ یہ ایکویٹی کا زمانہ ہے عورت اور مرد کے حقوق برابر ہیں۔"

شبانہ نے ایک گہرا سانس بھرا۔ "اچھا کافی تم بناؤ گی یا میں بناؤں؟"

کافی میز پر رکھ دی گئی تھی نجمی خاموشی سے کافی بنانے لگی۔

"اچھا شبو۔ ایک بات بتاؤ۔ ندیم کا یونیورسٹی میں یہ آخری سال ہے۔ وہ کہتا ہے میں ہائی ایجوکیشن کے لئے باہر جاؤں گا۔ دو سال کے لئے۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے وہاں کہیں فکس نہ ہو جائے۔"

شبانہ کو یہ باتیں عجیب سی لگ رہی تھیں۔ مگر نجمی اس کی بڑی اچھی سہیلی تھی اس کے مسائل میں اسے دلچسپی لینی ہی پڑتی تھی۔ ویسے بھی اسے نجمی سے ہمدردی اور محبت تھی۔ وہ اسے زندگی میں سکھی دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ "تم بھی اس کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتیں؟"

نجمی نے غصے سے شبانہ کی طرف دیکھا۔ "تم مذاق کے موڈ میں ہو تو میں کوئی اور بات شروع کر دیتی ہوں۔"

"ارے بھئی میں تو سیریس ہوں۔" شبانہ نے کہا۔

نجمی جھنجلا کر بولی۔ "میں اس کے ساتھ کیسے جا سکتی ہوں؟ مجھے کون بھیجے گا شادی سے پہلے؟"

"تو پھر اس سے شادی کر لو۔"

نجمی نے چمچہ پلیٹ میں رکھ دیا اور ٹشو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی۔ "چلو چھٹی ہوئی۔ اچھا کہا گویا شادی اتنی آسان ہے میرے گھر والوں کو تم اچھی طرح سے جانتی ہو وہ میری شادی خالد سے کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔"

خالد نجمی کا قریبی رشتے دار تھا اور باہر سے سول انجینیرنگ کی ڈگری لے کر پاکستان آنے ہی والا تھا۔ نجمی کو وہ ذرا پسند نہیں تھا۔ وہ کہا کرتی تھی کہ وہ چبا چبا کر باتیں کرتا ہے۔ مجھے برا لگتا ہے۔ ویسے بھی وہ ندیم کو پسند کر چکی تھی۔ اس سے محبت کرتی تھی اور دونوں ایک دوسرے کے مزاج سے اچھی طرح نہ صرف واقف ہو چکے تھے بلکہ قبول بھی کر چکے تھے۔ شبانہ بھی ندیم سے مل چکی تھی۔ اس کے خیال میں ندیم غیر سنجیدہ اور متلون مزاج تھا لیکن اچھا لڑکا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ باتیں وقت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں اس نے نجمی سے کہا۔ "تم امی سے کہہ کیوں نہیں دیتیں کہ خالد تمہیں پسند نہیں اور تم ندیم سے شادی کرنا چاہتی ہو۔" نجمی نے اپنا ماتھا پکڑ لیا۔ "کاش میں ایسا کر سکتی شاید ابھی ایسا نہیں کہہ سکتی۔ امی بھی خالد کے حق میں ہیں۔ دیکھا جائے گا۔ وقت آئے گا تو صاف کہہ دوں گی۔ آخر میری مرضی کے بغیر تو وہ مجھے کسی کے حوالے نہیں کر سکتے۔"

شبانہ نے مذاق کرتے ہوئے کہا۔ "تم جہاں امی ابو کہتے ہیں وہاں شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

نجمی نے چمچہ مٹھی میں دباتے ہوئے کہا۔ "تمہارے سر پر مار دوں گی یہ چمچ ۔ ۔ ۔ ۔"

شبانہ کافی پینے لگی۔ وہ مسکرا دی تھی۔ نجمی بولی۔ "جب تمہارے دل پر چوٹ لگے گی تو پوچھوں گی ابھی تو تم کتابوں میں ہی غرق رہتی ہو۔"

شبانہ نے کہا۔ "بھئی میں تو شادی اور محبت وغیرہ کی بالکل قائل نہیں ہوں۔ یہ

دونوں چیزیں وقت ضائع کرنے والی باتیں ہیں۔"

نجمی نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔ "برٹرینڈ رسل کی نانی نہ بنو۔ جب تم پر بھی یہ وقت پڑے گا تب پوچھوں گی آرام سے کافی پیو۔ ویسے شبو آج کافی کچھ ٹھیک نہیں بنی۔ میں اور منگواتی ہوں۔"

اس نے میز کی سطح پر آہستہ سے چمچ بجایا۔ کونے میں کھڑے ویٹر نے سر گھما کر دیکھا اور تیزی سے بڑھا۔ نجمی نے اسے دوسری کافی لانے کو کہا۔ شبانہ نے گھڑی دیکھی اور کہنے لگی۔

"نجمی میں پہلا پیریڈ اٹینڈ کر ہی لیتی تو اچھا تھا مس بھگت کا پیریڈ تھا۔ وہ ناراض ہو جائے گی۔"

نجمی نے سر کو ہلکا سا جھٹک دیا۔ "مس بگلا بھگت تمہیں کچھ نہیں کہے گی تم اس کی فیورٹ اسٹوڈنٹ ہو۔ اب بھول جاؤ اور میرا کافی کا موڈ تباہ نہ کرو۔ پہلے ہی کافی خراب نکلی ہے۔"

دوسری دفعہ شبانہ نے خود کافی بنائی۔ وہ دیر تک شیزان کے اس پرسکون کونے میں بیٹھی کافی پیتی اور باتیں کرتی رہی۔ باہر بارش تھم گئی تھی لیکن آسمان پر اسی طرح بادل چھائے ہوئے تھے۔ نجمی نے کہا۔

"شبو! بائی گاڈ آج یہاں سے اٹھنے کو دل نہیں کرتا۔"

شبانہ باہر مال پر آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ "اور کافی بناؤں؟ تم پیو گی؟" نجمی نے پوچھا۔

"تمہارے ساتھ میں بھی پی لوں گی۔"

شبانہ نے دوسری بار بھی خود ہی کافی بنائی۔ پھر وہ گاڑی میں بیٹھ کر پہلے ڈولنٹن مارکیٹ پہنچیں۔ مارکیٹ کی دکانیں کھل چکی تھیں۔ مارکیٹ کی فضا میں ولائتی پرفیومز کی ملی جلی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں ایک خاص دکان پر فوراً چائے ملتی تھی۔ شبانہ نے سیلون ٹی کے دو ڈبے خریدے۔ نجمی نے چھوٹی بہن کے لئے فوراً چاکلیٹ خریدے

اور دونوں باتیں کرتیں مارکیٹ سے باہر آ گئیں۔

جس لائبریری میں شبانہ کو ولیم تھارو کی کتاب تلاش کرنے جانا تھا وہ وہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔ شاید یہ پاکستان کی سب سے پرانی لائبریری تھی۔ ایک پرسکون خاموش اکیلی اکیلی سی سڑک مارکیٹ کے پچھواڑے سے گزرتی تھی۔ لائبریری کا محرابی گیٹ اسی سڑک پر تھا۔ اس گیٹ پر بوگن ولا کی گلابی پھولوں والی بیل چڑھی ہوئی ہے نصف دائرے کی شکل میں ایک پکی روش پرانی اور نئی لائبریریوں کے برآمدے کی طرف جاتی ہے۔ پرانی لائبریری کے گنبد پر کائی جمی ہوئی ہے۔ اس کے اندر داخل ہوں تو ٹھنڈا اندھیرا اور کتابوں کی خاص پرانی خوشبو آپ کا خیر مقدم کرتی ہے۔ کتابوں کی الماریاں چھت تک چڑھی ہوئی ہیں۔ کونے میں اخبارات کی فائلوں کے ڈھیر پڑے ہیں فرش اکھڑ کر جگہ جگہ سے بیٹھ گیا ہے۔ جافریوں میں پرانے بوسیدہ میز بچھے ہیں جن پر روز کے اخبارات لا کر ڈال دیئے جاتے ہیں۔ یہاں زیادہ تر تحقیق کا کام ہوتا ہے۔ اکثر عینک پوش اکتائے ہوئے بوڑھے بوڑھے چہرے دکھائی دیتے ہیں۔ لائبریری کے جدید حصے میں کتابوں کے شیلف قرینے سے لگائے گئے ہیں۔ فرش پر پالش چمکتا ہے پہلو کے رخ بنے ہوئے آہنی شیلفوں کے بیچ بیچ میں سبز میز ڈال کر آمنے سامنے کرسیاں رکھی ہوئی ہیں۔ یہاں بیٹھ کر لوگ کتابوں کا مطالعہ بھی کرتے ہیں اور نوٹس بھی تیار کرتے ہیں۔ مغربی کونے میں یہاں ماڈرن طرز کی ایک جافری بنی ہے جس کی دوسری جانب لائبریری کا عقبی لان ہے۔ جافری سے روشنی چھن چھن کر اندر لائبریری کے ہال میں آتی ہے۔ اس جافری میں ایک علیحدہ چھوٹی میز لگی ہے۔ اس میز کے آمنے سامنے بھی اسٹیل کی دو کرسیاں بچھی ہیں۔ شبانہ اور نجمی لائبریری کے جدید پورشن میں داخل ہوئیں تو سکون کا سانس لیا۔ کیونکہ باہر والی شدید سردی اور یخ ہوائیں نہیں تھیں۔ فضا میں ایک سنجیدہ خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لوگ میزوں کے سامنے بیٹھے خاموشی سے مطالعہ کر رہے تھے۔ شبانہ اور نجمی کی ایڑیوں کی ٹک ٹک پر کچھ چہروں نے گردنیں اٹھا کر انہیں ایک لمحے کے لئے دیکھا اور پھر کتابوں اور رسالوں پر جھک گئے۔ شبانہ اور

نجمی ہونٹوں کو دبائے مسکراتی ہوئی لائبریری کے کاؤنٹر پر گئیں۔ شبانہ نے "والڈن" کے بارے میں پوچھا تو کاؤنٹر کلرک نے مغربی کونے کی جانب ایک شیلف کی طرف اشارہ کیا۔ شبانہ کو اس کتاب کے مل جانے کی توقع نہیں تھی۔ وہ نجمی کو ساتھ لے کر شیلف کی طرف آ گئی۔ جافری میں ابر آلود دن کی پھیکی پھیکی روشنی آ رہی تھی۔ اس روشنی میں انہیں میز پر کہنیاں رکھے گردن تک لمبے بالوں والا ایک چوڑے شانوں والا آدمی مطالعے میں محو نظر آیا۔ شبانہ شیلف میں کتاب تلاش کرنے لگی۔ نجمی نے آہستہ سے کہا۔

"آخر تم اس کتاب کے پیچھے کیوں پڑی ہو۔ یہاں اور کتنی کتابیں ہیں۔ کوئی سی لے لو۔"

شبانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آخر تم ندیم کے پیچھے کیوں پڑی ہو۔ شہر میں کئی نوجوان ہیں۔ . . ."

نجمی نے شبانہ کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بس بس۔ میں آگے نہیں سن سکتی۔"

نجمی کی شوخ آواز کچھ زیادہ ہی بلند ہو گئی تھی۔ لائبریریوں میں ایسی آواز کو شور کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ جافری میں جو شخص کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا اس نے گردن پھیر کر شبانہ اور نجمی کی طرف دیکھا۔ نجمی نے ہنستے ہوئے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ شبانہ نے معذرت خواہانہ انداز میں آہستہ سے کہا۔ "سوری۔"

اس آدمی نے مسکرا کر اپنے سر کو ایسے ہلایا جیسے کہہ رہا ہو۔ کوئی بات نہیں میڈم اس کی سیاہ چمکیلی آنکھوں میں شبانہ کو ایک اتھاہ گہرائی محسوس ہوئی۔ اس کی عمر چالیس کے قریب ہو گی کنپٹیوں پر بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ کھلتا ہوا سرخی مائل رنگ ناک ستواں آگے سے ذرا سی اوپر اٹھی ہوئی . . . بالکل یونانی ناک . . . .

وہ دوبارہ مطالعے میں اور شبانہ شیلف میں سے کتاب تلاش کرنے میں مصروف ہو گئی کتاب اسے کہیں بھی نظر نہ آئی۔ نجمی نے شبانہ کو بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "اس لڑکے کو یہاں لاتے ہیں۔ ایسے تمہیں کتاب نہیں ملے گی۔"

نجمی کی عادت تھی کہ وہ بازو سے پکڑ کر کھینچنے لگتی۔ شبانہ کو یہ بات شائستگی کے

خلاف لگتی مگر اس نے کبھی نجمی کو نہ ٹوکا تھا۔ ۔ ۔ وہ کاؤنٹر پر آگئی اور کاؤنٹر کلرک سے کہا کہ شیلف میں کتاب نہیں ہے۔ وہ کاؤنٹر کا تختہ ہٹا کر باہر نکل آیا۔ آیئے میں آپ کو نکالے دیتا ہوں۔ وہ واپس شیلف کے قریب آئی تو شبانہ نے دیکھا کہ وہ یونانی ناک اور مقناطیسی سیاہ آنکھوں والا آدمی وہاں نہیں تھا۔ جس میز پر وہ تھوڑی دیر پہلے بیٹھا تھا وہاں گلاب کا ایک مرجھایا ہوا پھول پڑا تھا۔ شبانہ کو یہ بات بڑی عجیب سی لگی۔ اس نے لائبریریوں میں کتابیں اور کتابیں پڑھنے والے تو بہت دیکھے تھے مگر میز پر پڑا مرجھایا ہوا پھول وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ مگر اس نے کوئی خیال نہ کیا اور شیلف کی طرف دیکھنے لگی۔ لڑکے نے فوراً ایک قطار میں سے کتاب نکال کر شبانہ کو دے دی۔

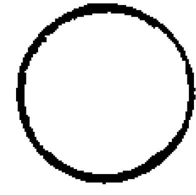
"یہ ہے ولیم تھارو کی کتاب والڈن"

شبانہ نے کتاب کو کھول کر ایک نظر دیکھا اور کاؤنٹر پر آکر اپنا کارڈ نکال کر رکھ دیا۔ ضروری اندراج کے بعد کتاب شبانہ کے حوالے کر دی گئی۔ نجمی نے چلتے ہوئے کہا "یہ اتنی باریک چھپائی والی کتابیں نہ پڑھا کرو شبو۔ تمہیں موٹے شیشوں والی عینک لگ جائے گی۔"

شبانہ کتاب کو کھولے اس کے صفحے پر نظریں جمائے نجمی کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ ایک الماری کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے وہی خاص قسم کی تمباکو اور کافی کی ملی جلی مہک محسوس ہوئی جو اس نے تھوڑی دیر پہلے جافری میں محسوس کی تھی جب وہ یونانی ناک والا آدمی کتاب کے مطالعے میں محو تھا۔ شبانہ کی نظریں اپنے آپ کتاب پر سے ہٹ گئیں۔

جب وہ ایک الماری کے قریب سے گزری تو اچانک اس کی نظر بائیں جانب اٹھ گئی۔ وہی باوقار سنجیدہ چہرے والا آدمی ایک شیلف کے سامنے کتاب کھولے اس کے ورق الٹ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ شخص بھی شبانہ کو دیکھتا۔ شبانہ آگے چل دی لائبریری کے سامنے لان میں یوکلپٹس کے درختوں کی لمبی لمبی نازک ٹہنیاں جنوری کی

سرد ہوا میں آہستہ آہستہ لہرا رہی تھیں۔



شبانہ اور نجمی کالج واپس آگئیں۔

شبانہ نے آخری پیریڈ اٹینڈ کیا اور لائبریری سے نکلوائی ہوئی کتاب اور سیلون کی چائے ساتھ لئے گھر آگئی۔ آسمان پر سارا دن بادل چھائے رہے تھے رات کو پھر بارش شروع ہوگئی۔ شبانہ کو سردیوں کی بارش سے بہت محبت تھی شیشم اور سفیدے کے گرتے پتے درختوں کے بے برگ و بار ٹہنیاں۔ ۔ ۔ بارش میں دھلے ہوئے سفید زرد اور سرخ گلاب اور چہروں کو چھو کر گزرتی یخ بستہ ہواؤں کے جھونکے آتش دان کے پاس چائے۔ ۔ ۔ یہ سب جزئیات تھیں اس تصویر کی جس کے فریم کے اندر شبانہ زندگی بسر کر رہی تھی۔ رات کو ہلکا سا کھانا کھانے کے بعد شبانہ دوسری منزل پر اپنے کمرے میں آگئی۔ آتش دان میں دھیمی دھیمی آگ جل رہی تھی۔ کمرے کی فضا پرسکون، خوشگوار اور نیم گرم تھی۔ شبانہ نے الیکٹرک کیتلی میں پانی گرم کیا۔ جاپانی سٹو کیر کی نیلے پھولوں والی ٹی پاٹ اور پیالی کھڑکی والی گول تپائی پر رکھی۔ پھر سیلون کی چائے کا ڈبہ کھول کر خوشبو کو سونگھا۔ وہ سری لنکا کے بارش میں بھیگتے چائے کے باغات میں نکل گئی۔ اس نے چائے بنائی اور تھارو کی کتاب کھول کر پڑھنے لگی کمرے میں صرف ٹیبل لیمپ ہی روشن تھا۔ اس کتاب میں تھارو نے ایک جھیل کے کنارے اپنا چھوٹا سا کاٹیج بنایا تھا جہاں اس نے مراقبے میں چھ ماہ بسر کئے تھے۔ یہ کتاب اسی طویل مراقبے کی کیفیات کے بارے میں لکھی گئی تھی۔

شبانہ چائے پیتے ہوئے اسے انہماک سے پڑھ رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکی بند تھی۔ بالکونی والا شیشے کا دروازہ بھی بند تھا۔ آگے پردہ گرا ہوا تھا۔ کمرے میں خاموشی تھی جس میں سوائے باہر آم اور یوکلپٹس کے پرانے درختوں میں گرتی بارش کی آواز کے دوسری کوئی آواز نہیں تھی۔ شبانہ کو بارش کی آواز بھی خاموشی کا ایک حصہ محسوس

میں اندھیرا ہوگیا۔ پھر اس اندھیرے میں کمرے میں رکھی ہوئی چیزوں کے دھندلے دھندلے خاکے ابھرنے لگے۔ یہ ابر آلود رات کی اس پھیکی دھندلی مرطوب روشنی کی وجہ سے تھا جو کھڑکی اور بالکونی والے دروازے کے سفید پردوں میں سے چھن کر اندر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ روشنی نہیں تھی.... اسے ہم روشنی کا سایہ کہہ سکتے ہیں ابر آلود رات کی۔ روشنی نہیں ہوتی۔ نیند کی پریاں سنبل کے اڑتے ہوئے پور کی طرح اترنے لگیں۔ شبانہ نے آنکھیں بند کرلیں اور نیند کی پریاں اسے اپنے ساتھ لے کر بحیرہ روم کے تاریک سمندروں میں لے گئیں۔ جہاں بوکاشی کا بادبانی جہاز وقت کی نامعلوم منزلوں کی طرف رواں تھا۔ شبانہ کے پاؤں جہاز کے عرشے پر نہیں لگے ہوئے تھے۔ وہ فضا میں تیرتی ہوئی جہاز کے عرشے پر گھوم رہی تھی۔ پھر اسے ایک آواز سنائی دی۔ یہ بربط کی آواز تھی، دھیمی، پرسوز، دل کی گہرائیوں میں اتر جانے والی۔ شبانہ نے لکڑی کا زینہ دیکھا جو اس قدیم بادبانی جہاز کی نچلی منزل کو جاتا تھا۔ شبانہ زینہ اُتر کر ایک نیم روشن راہ داری میں آگئی۔ بربط کی آواز ایک بند کیبن کے اندر سے آرہی تھی۔ شبانہ جیسے فضا میں تیرتی ہوئی کیبن کے پاس آگئی۔ کیبن کا دروازہ بند تھا لیکن وہ بند دروازے میں سے ہی گزر گئی۔ چھت سے لٹکتے بلوریں فانوس کی دھیمی روشنی میں بابل کے قالینوں والا فرش، دیوار پر لگا سنہری فریم والا آئینہ اور گیارہویں صدی کے مخملیں کاؤنچ نظر آئے۔

فضا میں قدیم شاہی محلات کی خواب گاہوں ایسی خوشبو تھی۔ شبانہ نیند کے شعور سے خالی الذہن تھی۔ وہ خود کو اس ماحول کا ایک حصہ تصور کر رہی تھی۔ ایک چوڑے شانوں اور لمبے بالوں والا آدمی شہزادوں کے لباس میں ملبوس کاؤنچ پر بیٹھا بربط بجا رہا تھا۔ اس کی پشت شبانہ کی طرف تھی۔ اچانک بربط کی آواز تھم گئی۔ نغمات کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور اجنبی شہزادے نے گردن گھما کر شبانہ کی طرف دیکھا۔ ایک پل کے لئے شبانہ کا کھویا ہوا شعور واپس آگیا اس نے شہزادے کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی پراسرار شخص تھا جو لائبریری کی جافری میں کتاب کے مطالعے میں غرق تھا۔ بربط مرمریں گول میز

پر رکھتے ہوئے شہزادہ شبانہ کی طرف بڑھا۔ شہزادے کے ہونٹ بند تھے مگر شبانہ کو اس کی گہری آواز سنائی دی۔

"میں بوکاشی ہوں۔ پنڈورا نے مجھ سے بے وفائی کی۔ میں اس کے دوسرے روپ کی تلاش میں ہوں۔ میرے بادبانی جہاز کا سفر شاید کبھی ختم نہیں ہوگا۔ کیا تم پنڈورا کا دوسرا رُوپ ہو؟"

جہاز سمندر کی لہروں پر ڈول رہا تھا۔ محبت کا فانوس دائیں بائیں ڈول رہا تھا شہزادے نے آگے بڑھ کر شبانہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور ایک گھٹنا قالین پر ٹیک کر تعظیم کی۔ شبانہ کے ہاتھ سے شہزادے بوکاشی کا ہاتھ سنبل کی طرح پھسل گیا اور سمندر کی طوفانی لہر پوری طاقت سے جہاز سے ٹکرائی۔ جہاز کا فانوس ایک طرف کو جھک گیا اور شبانہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ خواب گاہ کی تاریکی میں بارش کی ہلکی آواز اسی طرح آرہی تھی۔ شبانہ ابھی تک اپنے آپ کو بوکاشی کے بادبانی جہاز میں ہی محسوس کر رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اپنی خواب گاہ میں واپس آگئی۔ اس نے گہرا سانس بھرا اور آنکھیں دوبارہ بند کرلیں۔

رات کو ہم کوئی بھی خواب دیکھیں اس کا اثر ہمارے ذہن پر تھوڑی دیر کے لئے ہی رہتا ہے۔ جوں جوں دن کی روشنی بڑھتی جاتی ہے خواب کی جزئیات معدوم ہوتی جاتی ہیں اور بعد میں ہمیں اس خواب کی ایک پرچھائیں سی ہی یاد رہتی ہے اور ایک خاص مدت گزر جانے کے بعد وہ بھی ہمارے ذہن سے اُتر کر لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہوجاتی ہے۔ ہم نے زندگی میں اب تک کروڑوں خواب دیکھے ہوں گے لیکن اگر ہم یاد کرنا چاہیں تو ہمیں مشکل سے دو چار ہی یاد آئیں گے وہ بھی پوری تفصیل کے ساتھ نہیں بلکہ ان کا ایک سایہ سا ہمارے شعور کے پردے پر سے گزر جائے گا۔ لیکن بچپن سے اب تک دیکھے ہوئے ہمارے سارے خواب لاشعور کے اہراموں میں دفن ہیں۔ اپنی تمام جزئیات اور آوازوں اور چہروں کے ساتھ... مگر لاشعور پر ہمارا اختیار نہیں ہے۔ لیکن شبانہ نے رات کو جو خواب دیکھا تھا اس کی ایک ایک تفصیل، ایک ایک جزئیات ہر آواز

تصویر کے پورے رنگ اسے یاد تھے۔ جیسے اس کے شعور میں نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ صبح و شام کا بیشتر حصہ خوابوں کی دنیا میں ہی گزارتی تھی۔ وہ خود خوابوں کی دنیا کی رہنے والی تھی۔ خوابوں کی دنیا ہی اسے حقیقت کی دنیا لگتی تھی۔

ناشتہ اس نے معمول کی طرح اپنی امی، ابو، بھائی عقیل اور بڑی بہن غزالہ کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھ کر کیا۔ چھوٹا بھائی عامر اس روز بھی اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ وہ کہیں دس گیارہ بجے اٹھتا تھا۔ اور پھر تھوڑا بہت ناشتہ کر کے اپنی موٹر سائیکل لے کر کالج نکل جاتا تھا۔ ان دنوں وہ لندن جانے کی تیاریوں میں تھا جہاں وہ سول انجنیئرنگ میں داخلہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ناشتے کی میز پر شبانہ اپنی عادت کے مطابق خاموش تھی مگر آج اس کی خاموشی میں گہری محویت کا عالم تھا۔ فلائنگ ڈچ مین کے بادبانی جہاز کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ کیا یہ سب خواب تھا؟ نہیں۔۔۔ یہ خواب نہیں تھا۔ شبانہ ناشتہ کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ پھر غزالہ نے اس کے آگے سے شوگر پاٹ اٹھاتے ہوئے اس سے کوئی بات کی تو وہ چونک پڑی۔۔۔۔ غزالہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہاں کھو گئی ہو تم؟"

شبانہ ان لوگوں کی خاطر ان کی پسند کی باتیں کرنے لگی۔ روز کی طرح اس کے ابو اور بڑا بھائی عقیل ناشتے کے بعد بریف کیس اٹھا کر اپنے اپنے کاروبار کے لئے چل دیئے شبانہ نے پورچ سے ان کی گاڑی اسٹارٹ ہوتے اور پھر دور ہوتے جانے کی آواز سنی۔ والدہ نے شبانہ سے کہا کہ آج کالج سے جلدی آ جانا رنگ محل سے تمہاری پھوپھی آ رہی ہیں۔ شبانہ کو پھوپھی خالہ چچی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر اپنی والدہ کا دل رکھنے کے لئے وہ ان سے بڑے اخلاق سے پیش آتی اور ان سے گھل مل کر باتیں بھی کر لیا کرتی تھی۔ اگرچہ ان سے باتیں کرتے ہوئے کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا کہ شبانہ الگ ہو کر بالکونی میں کھڑی نیچے لان کے پھولوں کو دیکھ رہی ہے۔ اور یہ کوئی اور لڑکی ہے جو اپنی پھوپھی یا خالہ سے گفتگو کر رہی ہے۔۔ شبانہ نے کہا۔

"اچھا امی! میں جلدی آ جاؤں گی۔"

معمول کے مطابق اس نے اپنی امی کا ماتھا چوما اور کتابیں اٹھا کر باہر چلی گئی۔ وہ گاڑی کو دھیمی رفتار سے چلا رہی تھی۔ رات کی بارش میں سبزہ دھل کر نکھر آیا تھا۔ اب بارش نہیں ہو رہی تھی اور بادل چھٹنا شروع ہو گئے تھے۔ شبانہ نے اپنے خواب کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا۔ وہ کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ کالج میں وہ نجمی کے علاوہ دوسری سہیلیوں سے بھی مل کر ہنسی مذاق میں مصروف رہی مگر اس نے نجمی کو کچھ نہ بتایا۔ وہ اس خواب کی تمام خوشبوؤں تمام رنگوں، تمام سرگوشیوں کو اپنے ذہن، اپنے شعور کے نہاں خانے تک ہی محدود رکھنا چاہتی تھی۔ جیسے کوئی آدمی اگربتیاں سلگا کر اپنے آپ کو کسی خانقاہ میں بند کر لیتا ہے۔

شبانہ کے قدم آج غیر شعوری طور پر لائبریری کی طرف اٹھ رہے تھے۔ ایک خیال اس کے ذہن میں بار بار سر اٹھا رہا تھا۔ اس خیال کو اپنے دل سے چھپانا چاہتی تھی اور یہ خیال لائبریری کی طرف جانے کا تھا۔ کالج میں دو پیریڈ خالی آئے تو اس نے غیر ارادی طور پر گاڑی نکالی اور مال روڈ پر آ گئی۔ اس کا رخ ٹولنٹن مارکیٹ کی طرف تھا موسم ایسا تھا کہ کسی وقت سنہری دھوپ نکل آتی تھی اور کسی لمحے پھر بادلوں کے سائے چھا جاتے تھے۔ شبانہ نے گاڑی ٹولنٹن مارکیٹ کے باہر کھڑی کی اور لائبریری کی طرف جانے کی بجائے مارکیٹ میں داخل ہو گئی۔ غیر شعوری طور پر وہ اس خیال سے بچنا چاہتی تھی جو اب ایک خواہش کا روپ دھار چکا تھا۔ یہ خواہش اسے لائبریری کی طرف کھینچ رہی تھی۔ مگر شبانہ کی خود آرائی اور شخصی وقار اسے اپنے طور پر لائبریری میں جا کر اس پراسرار شخص کو دوبارہ دیکھنے سے روک رہا تھا۔ ہاں۔۔۔ وہ اس چوڑے شانوں اور چمکیلی پراسرار سیاہ آنکھوں والے اجنبی کو ایک بار پھر دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ اس کا دل اسے کشاں کشاں لائبریری کی طرف کھینچ رہا تھا اور ذہن اس کے پاؤں کو جکڑے ہوئے تھا۔ مارکیٹ میں ایک دکان پر کھڑی ہو کر اس نے یونہی نیل پالش کے شیڈ دیکھنے شروع کر دیئے۔ یہاں سے ہٹ کر وہ گروسری کی دکان پر آ گئی اور اس نے بغیر ارادے کے چائے کا ایک اور پیکٹ خرید

لیا اپنے تئیں وہ یہ تصور کر کے مارکیٹ سے باہر نکلی کہ گاڑی میں بیٹھ کر واپس کالج کی طرف چلی جائے گی اس نے پیکٹ پچھلی سیٹ پر رکھا۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور جب اسے گھمانے لگی تو گاڑی کا رخ مارکیٹ کے عقب میں واقع لائبریری کی طرف تھا۔ یہ اس کے دل کی فتح تھی۔

شبانہ نے گاڑی لائبریری کے پورچ میں ایک طرف کھڑی کر دی۔ آج اس نے جامنی رنگ کا گرم سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے پل اوور کا رنگ سیاہ تھا۔ پرس کاندھے سے لٹکائے وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی لائبریری کی سیڑھیاں چڑھ کر ہال میں آ گئی۔ ہال کی فضا حسب معمول نیم گرم تھی۔ وہ ایک الماری کے سامنے کھڑی ہو کر یونہی کتابوں کے پشتے پڑھنے لگی۔ وہ ہال کے مغربی کونے والی جافری کی طرف جانا چاہتی تھی اور ادھر جاتے ہوئے جھجک بھی رہی تھی۔ ایک نوجوان بالکل اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور کتابیں دیکھنے لگا۔ اب شبانہ کے پاس کوئی اور چارہ کار نہیں تھا کہ وہاں سے ہٹ جائے۔ وہ الماریوں کے درمیان سے گزرتی باہر بڑی راہداری میں آئی تو اس کی نگاہیں اپنے آپ مغربی کونے والی جافری کی طرف اٹھ گئیں۔ وہاں پڑی ہوئی میز خالی تھی۔ سب سے پہلے شبانہ کو سکون کا احساس ہوا کہ وہ پُراسرار اجنبی وہاں موجود نہیں تھا اور اس کے بعد اسے افسوس ہوا کہ جس کے لئے وہ لائبریری میں اپنے پندار کے صنم کدے کو ویران کر کے آئی تھی وہ اسے وہاں نہیں ملا تھا۔ شبانہ اس شیلف کے پاس آ گئی جو لکڑی کی جافری کے قریب تھا۔ اس نے کنکھیوں سے خالی میز کو دیکھا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران سی رہ گئی کہ خالی میز پر گلاب کا ایک مرجھایا ہوا سُرخ پھول پڑا تھا۔ پھر اسے وہی پائپ کے تمباکو اور کافی کی ملی جلی دھیمی دھیمی خوشبو محسوس ہوئی۔ کیا وہی پراسرار اجنبی یہ پھول رکھ گیا ہے؟ کیا وہ روز یہاں یہ پھول رکھ جاتا ہے؟ وہ یہ پھول کس کے لئے رکھ جاتا ہے؟ شبانہ یہی سوچتی ہوئی کاؤنٹر پر آ کر رک گئی۔ کاؤنٹر کلرک شبانہ کو پہچانتا تھا۔ اس لئے کہ وہ اکثر لائبریری میں آتی جاتی تھی اور اس لائبریری کی باقاعدہ ممبر بھی تھی۔ کاؤنٹر کلرک کتابوں کے رجسٹر میں اندراج کر رہا تھا۔ اس نے شبانہ کی

طرف دیکھ کر سر کو ذرا سا جھکا کر سلام کیا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ شبانہ کاؤنٹر پر کھڑی یونہی کتابوں کے ڈھیر کو ٹٹول رہی تھی۔۔۔ وہ کاؤنٹر کلرک سے پوچھنا چاہتی تھی کہ جافری میں جو میز ہے اس پر سرخ گلاب کا پھول کون رکھ گیا ہے؟ جو یہ گلاب کا پھول رکھ گیا ہے وہ کون ہے؟ مگر حیا مانع تھی۔ کاؤنٹر کلرک نے رجسٹر بند کرتے ہوئے شبانہ کی طرف دیکھا اور بولا۔

"میڈم پوئٹری کی کچھ نئی کتابیں آئی ہیں۔ فہرست دیکھنا پسند کریں گی۔"

شبانہ کچھ دیر کے لئے رکنا چاہتی تھی تاکہ وہ یہ فیصلہ کر سکے کہ اسے گلاب کے پھول والے پُراسرار اجنبی کے بارے میں اور پُراسرار اجنبی کے گلاب کے پھول کے بارے میں اس سے کچھ پوچھنا چاہیئے کہ نہیں۔۔۔۔ اس نے کہا۔

"دکھائیں تو۔۔۔ ماڈرن لائبریری والوں کی چھپی ہوئی ہیں کیا؟"

"جی نہیں۔۔۔ کولنیز لندن نے چھاپی ہیں۔"

اور کاؤنٹر کلرک نے دراز میں سے انگریزی میں ٹائپ شدہ لسٹ شبانہ کے سامنے رکھ دی۔ روایتی کتابیں تھیں۔ شبانہ کی نظریں کاغذ پر ٹائپ کئے ہوئے حروف پر تھیں اور وہ سوچ رہی تھی کہ میز کے گلاب کے بارے میں کیا پوچھے؟ کس طرح پوچھے۔۔۔ لسٹ کاؤنٹر کلرک کو واپس کرتے ہوئے بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔

"اس جافری میں۔۔۔۔"

کاؤنٹر کلرک نے اس کی بات پوری نہ ہونے دی اور کہا۔

"جی ہاں میڈم! ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ وہاں باہر سے سڑک کا شور سنائی دیتا ہے۔ لائبریرین صاحب نے نوٹ لکھ کر محکمے کو بھیج دیا ہے کہ وہاں شیشے کے فریم جڑوا دیئے جائیں۔"

شبانہ نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اچھا ہوا کہ اس کاؤنٹر کلرک سے وہ بات نہیں پوچھی جو وہ پوچھنا چاہتی تھی۔ لائبریری کی عمارت سے باہر نکلی تو سورج ایک بار پھر موسم سرما کے بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا تھا اور درختوں اور

سڑک پر سے دھوپ غائب ہو گئی تھی، سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ سرد ہوا چلنے لگی تھی۔ شبانہ نے گاڑی باہر نکالی اور جب مال روڈ پر آئی تو اس کا جی کافی پینے کو چاہا۔ کافی وہ نجمی کے ساتھ ہمیشہ شیزان میں ہی بیٹھ کر پیتی تھی۔ اس نے ٹائم دیکھا۔ ابھی پیریڈ شروع ہونے میں پون گھنٹہ باقی تھا۔ گاڑی شیزان کے باہر ایک طرف پارک کر کے وہ اندر ریستوران کی نیم گرم فضا میں آ گئی۔ بہت کم لوگ میزوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کونے والی شبانہ اور نجمی کی پسندیدہ نشست آج بھی خالی تھی۔ شبانہ نے بیٹھتے ہی ویٹر کو کافی لانے کا آرڈر دیا اور پرس کھول کر چوکور آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا پھر پرس بند کر دیا اور شیشے میں سے مال روڈ پر سے گزرتے لوگوں اور گاڑیوں کو دیکھنے لگی۔ ریستوران کی فضا میں معمول کے مطابق پیٹیز اور پیسٹریوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی یوکلپٹس کی ان ٹہنیوں کی سوندھی باس بھی آ جاتی تھی جو ریستوران والے روز صبح درخت سے توڑ کر پیتل کے بڑے گلدان میں لگا دیتے تھے۔ شبانہ کو یوکلپٹس کی خوشبو بہت پسند تھی۔ نجمی کے بغیر کافی پیتے ہوئے اسے بہت سکون محسوس ہو رہا تھا۔ کافی کی تلخ تر مہک سانس کی ایک لکیر کی مانند اس کے حلق میں اتر گئی۔ اسے نہر کے کنارے اگی ہوئی گھاس کی ہری ہری پتیوں کی خوشبو یاد آ گئی۔ بچپن میں شبانہ اس نہر پر اپنی سہیلیوں کے ساتھ چھلانگیں لگایا کرتی تھی۔ یہ نہر ان کی کوٹھی "کینال لاج" کے سامنے سے گزرتی تھی۔ جنوری کے اخیر میں نہر کا پانی بند کر دیا جاتا اور وہ یہاں سے گیلی مٹی نکال کر اپنی سہیلیوں کے ساتھ کنارے پر بیٹھ کر گھروندے بناتی، خدا جانے یہ کافی کا اثر تھا کہ شبانہ کو اپنے بچپن کی یاد آنے لگی تھی، ویسے بھی اسے بچپن کی یادیں بہت عزیز تھیں مگر وہ انہیں کم ہی یاد آتی تھیں۔ جن دنوں وہ لندن میں تھی وہاں ایک نہر کی پلیا پر سے گزرتے ہوئے اسے بچپن کی یاد بہت آتی تھی۔ اس کا ذہن ایک بار پھر لائبریری کے میز پر رکھے گلاب کے باسی پھول کی طرف چلا گیا۔ یہ پھول اتنا باسی نہیں تھا۔ بس ٹہنی سے توڑنے کے کچھ دیر بعد جیسے سرخ گلاب کمھلا جاتا ہے ویسے ہی تھا وہ پھول۔۔۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جیسے

سرخ گلاب ٹہنی سے توڑنے کے تھوڑی دیر بعد ہی اداس ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے میز پر پڑا پھول اداس تھا۔۔۔ افسردہ تھا۔۔۔ اس دن بھی جب وہ پراسرار آدمی میز پر سے اٹھ کر گیا تھا تو شبانہ کی نظر اتفاق سے خالی میز پر پڑی تو وہاں گلاب کا افسردہ پھول پڑا تھا۔ ہو سکتا ہے اس پراسرار اجنبی کو سرخ گلاب بہت پسند ہیں۔ مگر جانتے ہوئے وہ اسے لائبریری کی میز پر کیوں چھوڑ گیا تھا؟ اور آج تو وہ لائبریری میں موجود بھی نہیں تھا لیکن گلاب کا سرخ پھول میز پر رکھا تھا۔ شبانہ کو عجیب سا لگا وہ ایک اجنبی شخص کے بارے میں اتنی تفصیلات اور مین میخ کے ساتھ سوچ رہی ہے۔

بل اور ٹپ کے پیسے پلیٹ میں رکھ کر وہ اٹھی اور ریستوران سے باہر نکل آئی۔ بادل پھر گہرے ہونے لگے تھے۔ بوندا باندی نہیں شروع ہوئی تھی۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ لوگ گرم کپڑوں میں سمٹے سمٹائے فٹ پاتھ پر سے تیز تیز قدموں سے گزر رہے تھے۔ شبانہ گاڑی لے کر چیرنگ کراس سے آگے نکلی تو اس کو موسم اور ہرا بھرا سبزہ اتنا اچھا لگا کہ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس سڑک پر سے ہو کر اپنے کالج جائے جو لارنس باغ کے جنوبی کنارے کی طرف تھی۔ اس سڑک کی دونوں جانب سنبل اور شیشم کے اونچے اونچے گھنے چھتناروں والے درخت تھے۔ وہ ان کے نیچے سے گزری تو گاڑی کے بونٹ، اسکرین اور چھت پر سے ٹپ ٹپ کی آواز آنے لگی۔ بوندا باندی پھر شروع ہو گئی تھی۔ یہ آواز شبانہ کو اتنی اچھی لگی کہ اس نے گاڑی کی رفتار بہت آہستہ کر دی۔ اس کی جانب لارنس باغ کے سرسبز تختے تھے جو بارشوں میں دھل دھلا کر اور زیادہ ہرے بھرے ہو گئے تھے۔ انہیں دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک کا احساس ہوتا تھا۔ جو تختہ باغ کے سڑک والے کنارے پر تھا وہاں بانس کے درختوں کے جھنڈ بھی تھے۔

شبانہ کبھی کبھی بانس کے ان جھنڈوں کو دیکھنے خاص طور پر اس سڑک پر سے گزرا کرتی تھی۔ بانس استوائی درخت ہے اور موسلا دھار بارشوں والے خطوں

میں اگتا ہے مگر لارنس باغ میں یہ تنہا پردیسی درخت کئی برسوں سے نشوونما پا رہے تھے۔ سڑک سردی اور بارش کی وجہ سے خالی خالی تھی۔ اس سڑک پر سے ایک راستہ باغ کے اندر کو جاتا ہے۔ وہاں لوگ گاڑیاں کھڑی کرکے صبح شام سیر کرنے باغ میں جاتے ہیں۔ شبانہ کا دل چاہا کہ وہ بانس کے درختوں کو قریب سے دیکھے۔ ان کے سانس کی مہک محسوس کرے۔ کافی کا تلخ رومانٹک ذائقہ ابھی تک اس کے ہونٹوں پر تھا۔ وہ گاڑی کھڑی کرکے اتری اور بانس کا جو بڑا جھاڑ سب سے قریب تھا ہلکی بارش میں بھاگ کر اس کے سائے میں آگئی۔ اب اسے بانس کی گنجان نوکیلی شاخوں میں بارش کی بوندوں کے گرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔۔۔ یہاں بانس کی ہری ہری تازہ کونپلوں کی لطیف خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ بارش کی موٹی موٹی بوندیں شبانہ کے بالوں پر گریں تو وہ واپس اپنی گاڑی کی طرف مڑی۔۔۔ اچانک اسے تمباکو اور کافی کی ملی جلی مہک آئی۔ اس کی نظریں اپنے آپ دائیں جانب اٹھ گئیں۔۔۔ بانس کا جو درخت پہلے والے درخت سے چند قدم ہٹ کر تھا۔ وہاں سے وہی پراسرار اجنبی نظر آیا۔۔۔ وہ لمبے سیاہ کوٹ میں ملبوس بنچ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ وہ اس رخ پر بیٹھا تھا کہ شبانہ کو اس کے چہرے کا صرف ایک پہلو ہی نظر آتا تھا۔

اس کے سر کے سیاہ بال جن میں کہیں کہیں سفید بالوں کی جھلک نمایاں تھی گیلے گیلے تھے اور ایک لٹ آگے ماتھے پر آگئی تھی۔ وہ پائپ منہ سے لگائے ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا اور اس نے ایک ہاتھ میں جو اس کے گھٹنے پر تھا گلاب کا سرخ پھول تھام رکھا تھا۔ اس نے شبانہ کو نہیں دیکھا تھا۔ شبانہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ تیز تیز قدموں سے گیلی گھاس پر چلتی اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ گاڑی کی اسکرین پر بارش کی بوندیں بہہ رہی تھیں اس نے وائیپرز چلا دیئے۔۔۔ اب وہ پراسرار اجنبی کو بنچ پر بیٹھے دیکھ رہی تھی۔ تعجب ہے کہ وہ اسے گاڑی سے اترتے وقت نظر نہیں آیا تھا۔ اب اس کی پشت شبانہ کی طرف تھی۔ پیچھے سے کسی کی گاڑی کے ہارن کی

ہلکی سی آواز آئی۔ شبانہ نے پیچھے دیکھا۔۔۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی کار میں بیٹھا اسے مسکراتے ہوئے اشارے سے کار ذرا دوسری طرف کرنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ شبانہ نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے بیک کرکے اس کا رخ سڑک کی طرف پھیر دیا۔ اب وہ سڑک پر آگئی تھی اور کار کو واپس گھما کر دوبارہ باغ میں جانا مناسب نہیں تھا۔ وہ سڑک پر آگے چل پڑی۔ چوک ابھی دور تھا کہ شبانہ نے ایک دم کار کو روکا۔۔۔ گیئر بدل کر اسے واپس موڑا اور پیچھے کی طرف آگئی۔ کار کی رفتار دھیمی تھی۔ اس نے گاڑی لارنس باغ والی سڑک پر اسی جگہ لاکر ایک دم سے کھڑی کر دی جہاں اس نے ابھی گاڑی نکالی تھی۔ اس کی نظریں بے اختیار بانس کے درخت کی طرف اٹھ گئیں۔ بنچ خالی تھا۔ وہ اجنبی وہاں نہیں تھا۔ شبانہ نے کھڑکی کا شیشہ اتار دیا۔ ٹھنڈی تیز ہوا کا جھونکا اندر آگیا۔ اس نے سر باہر نکال کر سامنے والے پلاٹ میں چاروں طرف دیکھا۔۔ وہ پراسرار اجنبی کہیں بھی نہیں تھا۔

ایک لمحے کے لئے اس کے ہونٹ سمٹ گئے۔ پھر اس نے کار کا شیشہ چڑھالیا دروازہ کھول کر باہر نکلی دروازے کو لاک کیا اور ہلکی بارش میں گھاس پر سے گزرتی خالی بنچ کی طرف بڑھی۔ جس بات کا اسے خیال لگا تھا وہی ہوئی خالی بنچ پر سرخ گلاب کا ایک پھول پڑا بارش کی بوندا باندی میں بھیگ رہا تھا۔ شبانہ نے پھول کو اٹھا لیا پھول تھوڑا تھوڑا مرجھایا ہوا تھا اس کی مخملیں پنکھڑیاں سمٹی ہوئی تھیں۔ شبانہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ کار کو اسٹارٹ کیا اور باہر سڑک پر آگئی۔ اس نے گلاب کے پھول کو سونگھا۔ اس میں سے گلاب کی گہری مہک آئی گلاب کا پھول شبانہ نے ڈیش بورڈ کے اوپر والی خالی جگہ پر رکھ دیا اور اپنے کالج کی طرف روانہ ہوگئی۔

کالج کے گیراج میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد اس نے گلاب کے پھول کو اپنے سنہری کڑھائی والے چھوٹے رومال میں لپیٹ کر پرس میں رکھا اور کلاس روم کی طرف چلنے لگی۔ پیریڈ شروع ہوچکا تھا۔ مس ایلوا لیکچر دے رہی تھی۔ شبانہ سر جھکائے

خاموشی سے اپنی ایک کلاس فیلو کے ساتھ جاکر بیٹھ گئی اور کاپی کھول کر لیکچر غور سے سننے لگی۔ مس ایلوا شبانہ کو کلاس روم میں داخل ہوتے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئی تھی۔ جب شبانہ بیٹھ گئی تو اس نے اپنے لیکچر کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیا۔ شبانہ مس ایلوا کے ہلتے ہوئے ہونٹ دیکھ رہی تھی۔ اس کی آواز سن رہی تھی مگر وہ کیا کہہ رہی ہے شبانہ کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ گلاب کے سرخ پھول اور پراسرار اجنبی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کافی دیر تک وہ ان ہی خیالوں میں الجھی رہی۔ پھر اس نے جلدی سے ان تصورات کو جھنجوڑ کر اپنے ذہن کی اسکرین سے الگ کیا اور لیکچر سننے لگی۔

پیریڈ کے بعد نجمی نے اسے گھیر لیا۔ "تم کہاں چلی گئی تھیں اکیلی؟ مجھے ساتھ کیوں نہیں لے کر گئی۔ میں نے تمہیں گاڑی میں گیٹ سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ ضرور تم شیزان کافی پینے گئی ہوں گی۔" اس نے شبانہ کو زچ کر دیا۔ اب وہ اسے مجبور کرنے لگی کہ موسم اچھا ہے چل کر ہم سب کو شیزان میں کافی پلاؤ۔ شبانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہاری کافی مجھ پر ادھار رہی۔ کل کافی کے ساتھ لیمن ٹارٹ اور ریفرز بھی کھلاؤں گی۔"

"کیوں آج کیا بات ہے؟ کیا کسی کو ڈیٹ دے رکھی ہے؟" نجمی نے شوخی سے پوچھا۔ شبانہ نے ہنس کر کہا۔

"بھئی ڈیٹ تو تمہیں ملتی ہے۔ ہم اس نعمت سے محروم ہیں۔ بات یہ ہے کہ امی نے کہا تھا جلدی آجانا رنگ محل سے پھوپھی آرہی ہیں۔"

نجمی شرارت سے بولی۔

"ضرور تمہارے رشتے کی بات ہوگی۔ میں جانتی ہوں تمہارا پھوپھا زاد بھی تو کیلیفورنیا سے واپس آیا ہوا ہے۔"

شبانہ مسکرانے لگی۔

"نجمی! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے شادی بیاہ کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔"

نجمی بولی۔ "اری تم نہیں سوچتیں مگر تمہارے ڈیڈی ممی تو سوچتے ہیں۔"

شبانہ نے نجمی کے کان کو ذرا سا کھینچا اور سرزنش کے انداز میں بولی۔

"پہلے تم تو اپنی شادی رچاؤ۔ تم تو دولہا بھی پسند کر چکی ہو۔"

نجمی نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ "شبو! مجھے تو ندیم سے شادی ہوتے نظر نہیں آتی۔ خدا کی قسم اگر وہاں میری شادی نہ ہوئی تو نیند کی گولیاں کھا کر مر جاؤں گی۔"

"کیوں؟ کیا ندیم نے انکار کر دیا ہے؟" شبانہ نے اسے چھیڑتے ہوئے پوچھا

نجمی نے کہا۔

"ارے اس کی اماں نہیں مانتی۔ کہتی ہے تمہارا بیاہ اپنے بھائی کی بیٹی سے کروں گی۔ اس کے بھائی نے اپنی بیٹی کے لئے ایک کینال کا پلاٹ اور کار خرید کر ابھی سے رکھ لی ہوئی ہے۔ بھلا کار کا ماڈل نہیں بدل جائے گا۔ جب تک۔"

شبانہ نے کہا۔ "اری تجھے ماڈل کی فکر لگی ہے اور اگر ندیم کی شادی وہیں ہو گئی تو کیا کرو گی؟" "خودکشی"۔ نجمی نے ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ "اگر خودکشی نہ کر سکی تو تمہیں کہوں گی کہ مجھے دریائے راوی میں دھکا دے دے۔"

"تاکہ بعد میں پولیس مجھے پکڑ کر جیل میں بند کر دے۔" شبانہ نے نجمی کے بالوں کی لٹ کھینچتے ہوئے کہا۔ نجمی چیخ کر بولی۔

"خدا کے لئے میرے بال نہ کھینچو شبو۔ یہ پہلے ہی بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ کل سے میں آملے کے پانی میں بالوں کو دھویا کروں گی۔"

دوپہر کے کھانے پر شبانہ گھر پہنچ گئی۔ اس کی رنگ محل والی پھوپھی کے ساتھ اس کی بڑی بیٹی۔ اس کے بچے اور پھوپھا زاد ظفر بھی آیا ہوا تھا۔ شبانہ اسے بچپن ہی سے پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ اس سے عمر میں چار ایک سال بڑا تھا اور رنگ محل والے بڑے مکان میں جب وہ بچپن میں کھیلا کرتے تھے تو ظفر خواہ مخواہ اس کے بال کھینچا کرتا اور یونہی سب لڑکیوں اور لڑکوں پر اپنا جھوٹا رعب جمایا کرتا تھا۔ جب وہ بڑا ہو گیا تب بھی اس کی اوچھی عادتوں نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔

بی اے کرنے کے بعد ہی وہ کسی ترکیب سے ویزا لگوا کر امریکہ جا پہنچا تھا۔ جہاں وہ دو تین سال تک غائب رہا پھر جب واپس آیا تو بڑا بنا ٹھنا تھا۔ سب کے لئے تحفے لایا معلوم ہوا کہ کیلیفورنیا میں اس کے اپنے دو پٹرول پمپ ہیں اور بڑی ٹھاٹھ سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ پھر اس نے لاہور میں بھی ایک مشہور کمپنی کے دو حصے خرید لئے۔ خالص کاروباری ذہنیت رکھتا تھا۔ ادب شعر اور نازک جذبات سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ گھسے پٹے لطیفے سنا کر منہ پھاڑ کر قہقہے لگاتا اور دوسروں کو بھی قہقہے لگانے پر مجبور کرتا۔

شبانہ کو معلوم تھا کہ وہ کیلیفورنیا سے کراچی پہنچ گیا ہے اور رات کو لاہور پہنچ رہا ہے۔ اس کے کان میں یہ بھنک پڑ گئی ہوئی تھی کہ ابو اور امی اس کی شادی ظفر سے کرنا چاہتے ہیں۔ شبانہ ابھی اس سلسلے میں خاموش تھی۔ اپنی بڑی بہن غزالہ سے بھی اس نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ غزالہ اس سے عمر میں کافی بڑی تھی مگر اسے کوئی ایسا مرض لاحق ہو گیا تھا کہ اس کی شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ ہفتے میں ایک دو بار اس پر بے ہوشی کے دورے پڑ جاتے تھے۔ مدت سے اس کا علاج ہو رہا تھا مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ قدرتی طور پر اس کے امی ابو اب شبانہ کی بات پکی کرنا چاہتے تھے۔ مگر شبانہ دل میں فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ ظفر سے کبھی شادی نہیں کرے گی خواہ اس کے لئے اسے بغاوت ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ کھانے کی میز پر سبھی موجود تھے۔ پھوپھی نے شبانہ کو ساتھ لگا کر پیار کیا۔

ظفر ایک سال کے وقفے کے بعد کیلیفورنیا سے لاہور آیا تھا۔ اس نے بڑے اوچھے انداز میں منہ پھاڑ کر سب کے سامنے کہا۔ ”شبو! تُو پہلے سے بہت خوبصورت ہو گئی ہے۔ ونڈر فل!“

شبانہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ اس کے امی ڈیڈی کو بھی یہ بات اچھی نہ لگی تھی۔ غزالہ اور عقیل نے بات کا رخ دوسری طرف پھیر دیا اور امریکہ کی باتیں شروع ہو گئیں۔ کھانے کے بعد میوزک شروع ہو گیا۔ شبانہ کا چھوٹا بھائی عامر

ظفر سے امریکہ کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ پھوپھی شبانہ کی امی کے پاس بڑے تخت پر بیٹھ کر راز و نیاز میں مصروف ہو گئیں۔ شبانہ سمجھ گئی کہ وہ ظفر سے اس کے رشتے کی تفصیلات طے کر رہی ہوں گی۔ غزالہ برتن وغیرہ اٹھوانے لگی۔ عقیل اٹھ کر اپنے کمرے میں اور ابو اپنے کمرے میں دوپہر کو ذرا آرام کرنے کے لئے چلے گئے۔ شبانہ بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ پلنگ پر کمبل گھٹنوں تک ڈال کر بیٹھ گئی اور ”والڈن“ کتاب پڑھنے لگی۔

شبانہ ایک بار پھر وہ حصہ پڑھنا چاہتی تھی جہاں تھارو نے فلائنگ ڈچ مین ہوکانٹی کا ذکر کیا ہے۔ شبانہ کو اپنے پرس میں رکھے ہوئے پھول کا خیال آ گیا جو اس نے لارنس باغ میں بارش میں بھیگتے بنچ پر سے اٹھایا تھا اور جیسے وہ پر اسرار شخص وہاں چھوڑ گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر سنگار میز پر سے پرس اٹھا کر کھولا اور سفید رومال میں سے گلاب کا پھول نکال کر سونگھا۔ پھر اسے اپنی نازک انگلیوں میں دبائے پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی۔ کتاب کو کھولا پھول کو دوسری بار سونگھا اور تپائی پر رکھ دیا۔ وہ کتاب پڑھنے میں محو تھی کہ پہلے دروازے پر دستک ہوئی پھر آواز آئی میں اندر آ سکتا ہوں اور ساتھ ہی ظفر چمڑے کی بے ڈھنگی امریکی جیکٹ میں اندر آ گیا۔ اندر آتے ہی اس نے لمبا سانس لیا اور بولا۔

”واہ! تمہارا کمرہ تو امریکن پرفیوم سے مہک رہا ہے۔ مگر مجھے یہ خوشبوئیں ذرا پسند نہیں۔ ویسے میں تمہارے لئے ایک تحفہ لایا ہوں شبو۔“

شبانہ نے کتاب بند کر دی۔ ظفر اس کے پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا۔ شبانہ سمٹ گئی اسے ظفر کی یہ حرکت بھی غیر شائستہ لگی۔ جیب سے ایک پیکٹ نکال کر کھولا اور اس میں سے سونے کی ایک ننھے سے ہیرے والی انگوٹھی نکال کر کہا۔

”اصلی ہیرے کی انگوٹھی ہے شبو۔ ویسے تم اسے منگنی کی انگوٹھی بھی سمجھ سکتی ہو۔“

اور ساتھ ہی بے ہنگم قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ شبانہ نے اسے تیز نظروں سے

گھور کر دیکھا اور کہا۔ "اگر یہ منگنی کی انگوٹھی سمجھ کر مجھے دے رہے ہو تو اسے اپنے پاس ہی رکھو۔ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

ظفر نے منہ پھاڑ کر ایک اور قہقہہ لگایا اور بولا۔

"چلو یہ انگوٹھی تمہیں میری امّی خود پہنا دیں گی۔ اس وقت تم یہ تحفہ قبول کرو میری طرف سے۔" اس نے جیکٹ کی جیب سے پارکر کا ایک بال پوائنٹ اسے پیش کیا۔ شبانہ نے بے دلی سے کہا۔ "یہاں رکھ دو۔" ظفر نے بال پوائنٹ کی ڈبی تپائی پر رکھ دی۔ وہاں گلاب کے پھول کو اٹھا کر سونگھا اور چھینک مار کر بولا۔

"یہاں آکر جب بھی کوئی پھول سونگھتا ہوں چھینکیں شروع ہو جاتی ہیں۔ بال پوائنٹ تمہیں پسند ہے نا شبو؟"

شبانہ نے کندھے ذرا سے سکیڑ کر دھیمی آواز میں کہا۔

"ہوں! شکریہ۔"

وہ گلاب کے اس پھول کو دیکھ رہی تھی۔ جسے ظفر باتیں کرتے ہوئے اپنے ہاتھ میں مروڑ رہا تھا۔ شبانہ نے عاجزی سے کہا "پلیز ظفر یہ پھول تپائی پر رکھ دو۔" ظفر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "کیا یہ کسی کی نشانی ہے؟ آئی ایم سوری۔ بھئی امریکہ میں ہم اس قسم کی باتیں کر لیا کرتے ہیں۔" اور اس نے پھول کو تپائی پر اچھال دیا۔ شبانہ نے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "سوری ظفر۔ میرے سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔ میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔" ظفر اٹھ کھڑا ہوا۔

"نو پرابلم! شام کو آؤں گا۔ کسی ریستوران میں چل کر جوس پئیں گے۔" اور منہ پھاڑ کر ہنستا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ شبانہ نے تپائی پر اوندھے پڑے گلاب کے پھول کو جلدی سے اٹھا کر سیدھا کر دیا۔

.. ..

ظفر کے جانے کے بعد شبانہ نے اطمینان کا سانس لیا اس نے تپائی پر پڑے پھول کو دیکھا اسے محسوس ہوا جیسے گلاب کا پھول بھی اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا ظفر امریکہ سے اس کے لئے منگنی کی انگوٹھی لایا تھا اور اس کے گھر والے ظفر سے اس کی منگنی کر دینے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھے یہ بات شبانہ کے لئے پریشان کن تھی کیونکہ وہ ظفر سے شادی کر کے خود کو اوندھے کنویں میں نہیں گرا سکتی تھی اس شادی کی بات ایک عرصے سے چل رہی تھی مگر ابھی تک شبانہ کی امیّ ابوّ یا بڑی بہن غزالہ نے اس کی مرضی دریافت نہیں کی تھی۔

شبانہ کا خاندان اگرچہ جدی پشتی رئیس اور کسی حد تک ماڈرن تھا مگر شادی بیاہ کے معاملوں میں وہ ابھی تک قدیم روایات میں جکڑا ہوا تھا۔ لڑکی خواہ کتنی پڑھی لکھی کیوں نہ ہو ماں باپ شادی کے معاملے میں اس سے مشورہ کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے منگنی کی انگوٹھی نے شبانہ کو خبردار کر دیا تھا اس سے پہلے کہ شبانہ کی امیّ یا غزالہ اس سے کوئی بات کرتیں شبانہ نے شام کی چائے کے بعد خود ہی غزالہ سے بات چھیڑ دی وہ اپنی بہن غزالہ کو اپنے کمرے میں لے گئی اور اسے صاف لفظوں میں بتا دیا کہ وہ ظفر سے کسی حالت میں بھی شادی کرنے پر تیار نہیں ہے۔

غزالہ ایک دانشمند اور دور اندیش عورت تھی ویسے بھی وہ شبانہ سے بڑی تھی اور اسے اپنی چھوٹی بہن سے پیار بھی تھا۔ پہلے تو اس نے یہ سُن کر شبانہ

کو راضی کرنے کی کوشش کی کہ شادی کرنے کے بعد سب ٹھیک ہو جاتا ہے اور پسند کی شادی میں بھی ہمیشہ خوش رہنے کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔ لیکن شبانہ نے جب یہ کہہ دیا کہ وہ کسی سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتی تو غزالہ نے اپنی بہن کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"شبو! شادی ہر عورت کی منزل ہے ہماری سوسائٹی اس قسم کی ہے کہ یہاں کوئی عورت شادی کے بغیر پورے تحفظ سے زندہ نہیں رہ سکتی۔"

شبانہ اپنی بڑی بہن کے سامنے پلنگ پر پاؤں لٹکائے خاموش بیٹھی تھی غزالہ کا وہ بے حد احترام کرتی تھی وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ اس گھر میں غزالہ ہی ایک ایسی ہستی ہے جو اس کے دکھ درد کو پہچانتی ہے اور وقت پڑنے پر اسے صحیح مشورہ دے سکتی ہے اس نے غزالہ کی طرف دیکھا اور بولی۔

"آپی! جب مناسب وقت آئے گا تو ہو سکتا ہے۔ میں شادی بھی کر لوں مگر ابھی میں تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہوں میں انگریزی میں ایم اے کر کے ڈاکٹریٹ کرنا چاہتی ہوں یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے جسے میں ادھورا نہیں چھوڑ سکتی آپ امی ابو کو سمجھائیں کہ ابھی میری شادی کی بات کہیں نہ کریں۔" غزالہ کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

"لیکن امی تو تمہاری پھوپھی کو زبان دے چکی ہیں اس جمعہ کو منگنی کی تاریخ بھی پکی ہو گئی ہے۔"

شبانہ کو غصہ آگیا۔ "آپی میں کوئی ڈھور ڈنگر نہیں ہوں۔ پڑھی لکھی ذمہ دار لڑکی ہوں کسی کو مجھ سے مشورہ لئے بغیر میرے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق نہیں پہنچتا آپ امی کو کہہ دیجئے کہ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی کہیں بھی شادی نہیں کرنا چاہتی اگر مجھے مجبور کیا گیا تو میں کچھ کھا کے خودکشی کر لوں گی۔"

غزالہ جلدی سے اٹھ کر شبانہ کے پاس پلنگ پر آگئی۔ اس نے چھوٹی بہن کو اپنے ساتھ لگا لیا اور سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر بولی۔

"خبردار جو پھر کبھی ایسا خیال بھی دل میں لائی۔ تم فکر نہ کرو میں امی ابو کو سمجھا لوں گی۔ تمہاری مرضی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا جائے گا۔"

شبانہ اپنی بہن غزالہ سے بہت پیار کرتی تھی اس نے جب یہ حوصلہ دیا تو شبانہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ غزالہ نے شبانہ کو پیار کیا اور بولی۔

"اب تم آرام کرو۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔ تمہیں جتنا پڑھنا ہے بیشک پڑھو۔"

شبانہ کی امی اور ابو ظفر سے اس کی منگنی کا دن واقعی مقرر کر چکے تھے۔ لیکن جب غزالہ نے انتہائی دانشمندی اور پوری ذمہ داری سے انہیں ساری بات کھول کر بیان کی تو ماں باپ سوچ میں پڑ گئے غزالہ نے کہا۔

"ابو جان! پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے آپ فی الحال اس بات کو یہیں رہنے دیں منگنی کا کیا ہے نہ بھی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ابھی شبو کو اپنی تعلیم مکمل کر لینے دیں جب وقت آئے گا تو میں ظفر سے شادی کرنے پر راضی کر لوں گی۔"

دوراندیش ماں باپ چپ ہو گئے۔ غزالہ کی امی نے بڑی عقلمندی سے سمجھا دیا کہ ابھی منگنی کی ضرورت نہیں ہے ظفر جب سال ڈیڑھ سال بعد امریکہ سے دوسری بار واپس آئے گا تو شادی ہی کر دی جائے گی۔ ظفر کو جب پتہ چلا کہ اس کی منگنی ملتوی ہو گئی ہے تو اسے اپنی توہین محسوس ہوئی وہ جانتا تھا کہ شبانہ اس کو پسند نہیں کرتی اور یہ سب کچھ اسی کے ایما پر ہوا ہے اس نے کھلے لفظوں میں کہہ دیا کہ یہ اب میرے وقار کا مسئلہ بن گیا ہے۔ شادی کروں گا تو شبانہ ہی سے کروں گا نہیں تو اسے اغوا کر کے لے جاؤں گا ظفر کی ماں نے اسے ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔

"خبردار! جو پھر ایسی بات زبان پر لایا انہوں نے کب انکار کیا ہے یہی کہا ہے کہ شبانہ کو ایم اے کر لینے دیں۔ تم دوسری بار آؤ گے تو شادی کر کے اسے اپنے ساتھ لے جانا آخر ہم بھی تو اسی شہر لاہور میں رہ رہے ہیں اور میرے بھائی

ی بیٹی ہے کوئی غیر نہیں ہے۔"

ظفر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا باہر نکل گیا وہ ایک نارمل قسم کا معمولی پڑھا لکھا نوجوان تھا جس کو دولت، خوبصورت کپڑوں نئے ماڈل کی گاڑیوں اور دوستوں کی دعوتیں کرنے اور ان کی دعوتوں میں شرکت کرنے کا شوق تھا زندگی میں اس کے کوئی بلند نظریات یا تصورات نہیں تھے امریکہ میں اس نے بڑی جدوجہد کے بعد ایک مقام حاصل کیا تھا اس کے پاس گرین کارڈ بھی تھا اور کیلیفورنیا میں دو پیٹرول پمپ بھی تھے۔ اپنا ایک گارڈن ہاؤس تھا جہاں وہ عیش و عشرت سے زندگی بسر کر رہا تھا۔

شبانہ سے اسے محبت وغیرہ کچھ نہیں تھی لیکن شبانہ کی بے رخی نے اس کے مردانہ وقار کو زبردست ٹھیس پہنچائی تھی اس نے شبانہ سے شادی کو اپنے وقار اور عزت کا مسئلہ بنا لیا تھا اور فیصلہ کر لیا تھا کہ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے وہ شبانہ کو ایک بار اپنی بیوی بنا کر ہی دم لے گا چاہے اس کے بعد وہ اس سے طلاق لے کر ہی چلی جائے شبانہ کی باتوں سے ظفر نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اسے پسند نہیں کرتی ظفر نے اسے اپنی توہین پر محمول کیا تھا وہ خوش شکل تھا دولت مند تھا امریکی نیشنل تھا امریکہ میں اس کا اپنا خوبصورت مکان تھا اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں تھی اس کے خیال میں ہر لڑکی اس سے شادی کرنے میں فخر محسوس کرتی لیکن شبانہ اس سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی تھی وہ سمجھ گیا تھا کہ منگنی محض شبانہ کے انکار کی وجہ سے ملتوی ہوئی ہے ظفر نے اس بارے میں شبانہ کی بہن یا امی سے بھی کوئی بات نہ کی۔ دل میں اس نے شبانہ کو حاصل کرنے کا آہنی ارادہ کر لیا اور خاموش رہا۔

پاکستان میں اس کے ویزے کی مدت ختم ہونے والی تھی اسی دوران وہ بہت کم "کینال لاج" شبانہ کے ہاں گیا جس روز اسے امریکہ کے لئے پرواز کر جانا تھا اس سے ایک دن پہلے شام کو وہ شبانہ کے ہاں اپنی ممانی اور ماموں یعنی شبانہ کی امی ابو سے ملنے چلا آیا شبانہ کے ابو اور عقیل گھر پر نہیں تھے غزالہ اور شبانہ کی امی نے ظفر کا خیر مقدم کیا۔ امی نے اسے پاس بٹھا کر پیار کیا اور کہنے لگیں۔

"بیٹا خیر سے جاؤ اور خیر خیریت سے واپس آؤ خط ضرور لکھتے رہنا۔"

غزالہ نے کہا" جاتے ہی فون کر دینا اس سے بڑی تسلی ہو جاتی ہے۔"

ظفر کی آنکھیں شبانہ کو تلاش کر رہی تھیں وہ شاید دوسری منزل میں اپنے کمرے میں تھی۔ عامر اپنی امریکی جیکٹ کی زپ کھولتا ہوا کمرے میں داخل ہوا ظفر کو دیکھا تو ہیلو بھائی جان کہہ کہ اس سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا امی نے کہا تمہارے بھائی جان کل واپس امریکہ جا رہے ہیں۔"

"اوہ تو۔" عامر نے ظفر کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

ظفر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔"میں تو کہتا ہوں تم بھی امریکہ آ جاؤ میرے پاس وہیں انجینئرنگ کا کورس کر لو۔"

غزالہ کہنے لگی" یہ اب لندن جانے کی سوچ رہا ہے۔"

ظفر بولا" ارے لندن میں کیا رکھا ہے۔ امریکہ ٹیکنالوجی میں بہت آگے ہے آ جاؤ۔ اپنا گھر ہے میں کیلیفورنیا یونیورسٹی میں تمہیں داخلہ بھی دلوا دوں گا۔"

ظفر نے اب شبانہ کے گرد محاصرہ تنگ کرنا شروع کر دیا تھا امی نے کہا۔

"بیٹا تم وہاں جا کر پتہ کرنا۔ پھر ہم عامر کو تمہارے پاس بھیج دیں گے اس سے اچھی بات اور کیا ہو گی۔"

ظفر بولا" ممانی جان آپ فکر نہ کریں میں جاتے ہی اس کے داخلے کا بندوبست کر دوں گا، کیوں بھئی تم تیار ہو؟"

عامر نے خوش ہو کر کہا" کیوں نہیں بھائی جان کیلیفورنیا یونیورسٹی میں داخلہ مل جائے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو گی۔"

ظفر نے ممانی سے پوچھا" عقیل بھائی جان اور ماموں ابھی تک نہیں آئے کیا؟"

غزالہ بولی" ابو کا فون آیا تھا کہ وہ شام کو ذرا لیٹ پہنچیں گے۔"

ممانی نے کہا" جاؤ شبانہ سے مل آؤ۔ وہ اوپر اپنے کمرے میں ہو گی۔"

غزالہ نہیں چاہتی تھی کہ ظفر اوپر شبانہ سے ملنے جائے کیونکہ شبانہ اسے پسند

نہیں کرتی تھی لیکن امی سیدھی اور پرانے زمانے کی خاتون تھیں اور پھر ظفر کے ساتھ شبانہ کی شادی کا خیال ان کے دل میں اپنی جگہ پر بدستور قائم تھا ظفر بھی چاہتا تھا کہ جاتی دفعہ وہ شبانہ کو ہیلو ہیلو کر لے چنانچہ وہ اٹھا اور سیڑھیاں چڑھ کر شبانہ کے کمرے کی طرف چل دیا شبانہ کے کمرے کا دروازہ بند تھا ظفر نے آہستہ سے دستک دی اور حسبِ عادت اونچی آواز میں بولا۔ "ہیلو شبو! میں ہوں ظفر۔"

وہ اب سوچی سمجھی حکمت عملی پر چل رہا تھا شبانہ نے بے دلی سے دروازہ کھولا اور میز کے سامنے کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ وہ ٹیبل لیمپ روشن کئے کوئی کتاب پڑھ رہی تھی آتش دان میں آگ جل رہی تھی کمرے کی فضا گرم تھی چائے کی خالی پیالی شبانہ کے پاس ہی پڑی تھی۔ گلاب کا مرجھایا ہوا سرخ پھول اس نے چھوٹی نیلی پھولدار بوتل میں پانی ڈال کر سجا رکھا تھا مگر پھول مرجھا چکا تھا اور سرنگوں تھا۔ شبانہ جو کتاب پڑھ رہی تھی اس میں نشانی کا زرد کاغذ رکھ کر اس نے کتاب بند کر کے میز پر ڈال دی۔ ظفر کے آنے سے کمرے کی فضا جو چند لمحے پہلے ہلکی پھلکی اور رومانٹک تھی اب بوجھل ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔ فضا میں شبانہ کو ایک کھچاوٹ اور تناؤ سا محسوس ہونے لگا تھا۔

ظفر کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گیا اور اپنے تھری پیس سوٹ کی واسکٹ میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولا۔ "میں کل واپس جا رہا ہوں سوچا تمہیں ملتا جاؤں کل شاید وقت نہ ملے۔"

شبانہ گہرا سانس کھینچ کر خاموش رہی وہ مرجھاتے ہوئے گلاب کے پھول کو تک رہی تھی اور سوچ رہی تھی ظفر کب کمرے سے جائے اور وہ پھر اپنی کتاب کے مطالعے میں محو ہو جائے ظفر کے جانے کا سن کر اسے بہت خوشی ہوئی تھی مگر وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتی تھی اسے جواب میں کچھ کہنا بھی ضروری تھا اپنے کاندھے کی شال درست کرتے ہوئے ظفر کی طرف دیکھا اور بولی۔۔۔ "ویزا ختم ہو گیا کیا؟"

ظفر نے گردن ایک طرف ٹیڑھی کر کے شبانہ کو غور سے دیکھا اور بولا "ویزے

کی مدت بڑھ بھی سکتی تھی ایسی کوئی بات نہیں لیکن جب کوئی اسے پسند نہ کرے تو فائدہ کیا۔"

شبانہ نے فوراً بات کا موضوع بدل دیا۔ "ابو اور عقیل بھائی ابھی نہیں آئے شاید ان سے بھی مل لینا تھا۔"

ظفر اب بھی شبانہ کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا یہ نظریں شبانہ کو بری لگ رہی تھیں کہنے لگا۔ "انہیں کل مل لوں گا اس وقت تو میں صرف تم سے ملنے آیا تھا کل دوپہر کی فلائٹ ہے سوچا اس وقت تم کالج گئی ہو گی۔"

شبانہ نے کوئی جواب نہ دیا ظفر نے اپنی واسکٹ کے بٹن کھول دیئے۔

"تم نے کمرے میں زیادہ ہیٹنگ کر رکھی ہے تھرموسٹیٹ نہیں لگوایا کیا؟"

"نہیں۔" شبانہ نے بے دلی سے کہا اور کتاب کھول کر پڑھنے لگی۔ وہ پڑھ نہیں رہی تھی کتاب پر چھپی انگریزی تحریر کو صرف دیکھ رہی تھی۔

"میری وجہ سے تم بور تو نہیں ہو رہی ہو؟"

شبانہ کے منہ تک آتے آتے یہ بات رہ گئی کہ ہاں میں سخت بور ہو رہی ہوں خدا کے لئے تم میرے کمرے سے چلے جاؤ۔ مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے مگر وہ ایسا نہ کہہ سکی بس اتنا ہی کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

ظفر واقعی شبانہ کے مزاج سے بے خبر تھا اس نے شبانہ کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی اور اگر وہ کوشش بھی کرتا تو اسے بالکل نہیں سمجھ سکتا تھا کیونکہ ظفر کے نزدیک عورت کوئی سمجھنے والی شئے نہیں تھی۔ وہ اکھڑ پنے کا مظاہرہ کر رہا تھا بولا۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو تمہاری شکل بتا رہی ہے کہ تم کو میرا آنا اچھا نہیں لگا۔"

شبانہ کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو گئیں وہ ظفر کو بہت کچھ کہہ دینا چاہتی تھی مگر ضبط کر گئی طویل سانس لے کر بولی۔ "تم نے کب سے چہرے پڑھنے شروع کر دیئے؟"

ظفر نے ایک بے ہنگم سا قہقہہ لگایا اور بولا "جب سے تم مجھ سے نفرت کرنے لگی ہو۔" اس کے ساتھ ہی ظفر نے مرجھاتے ہوئے پھول کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ پھول تم نے بڑا سنبھال کر رکھا ہوا ہے ضرور کسی کی نشانی ہو گی۔"

"شٹ اپ۔" شبانہ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

ظفر کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلنے لگیں۔ پھر فوراً ہی اس کا چہرہ بدل گیا اور بلند قہقہہ لگا کر بولا۔ "یہ تمہاری بچپن سے ہی عادت ہے بڑی جلدی ٹمپر لوز کر دیتی ہو۔" پھر کرسی کے بازوؤں پر زور سے ہاتھ مار کر بولا۔

"اچھا بھئی خدا حافظ! جاتی دفعہ تو مجھ سے ناراض نہ ہو۔ میں فون کروں گا۔ کیلیفورنیا سے تمہیں اوکے۔۔۔۔ بائی" اور ظفر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے نکل گیا سیڑھیاں اترتے وقت اس کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا اور وہ واسکٹ میں دیئے ہوئے ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ رہا تھا۔

دوسرے دن ایئر پورٹ پر ظفر کو چھوڑنے شبانہ کے گھر سے شبانہ کا بڑا بھائی عقیل اور چھوٹا بھائی عامر گئے ظفر کے جانے کے بعد شبانہ نے بے حد سکون محسوس کیا۔ اس روز کالج میں بڑی چہل پہل تھی۔ دوسرے کالج کی کچھ لڑکیاں آئی ہوئی تھیں موسم بے حد خوبصورت تھا آسمان گہرا نیلا تھا سنہری نیم گرم دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ کالج کے لان کے درخت دھوپ میں چمک رہے تھے شبانہ کلاس روم سے نکل رہی تھی کہ سامنے نجمی آتی ہوئی دکھائی دی شبانہ نے کہا۔ "تمہارا کوئی پیریڈ تو نہیں نجمی؟" نجمی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا "پیارے! اگر کوئی پیریڈ ہوتا بھی تو تم پر قربان کر دیتی آج تم نے بڑا خوبصورت پنک کلر کا پل اوور پہن رکھا ہے۔"

شبانہ نے مسکراتے ہوئے کہا "آج بڑی موڈ میں ہو۔ لگتا ہے صبح صبح ندیم سے ملاقات ہوئی ہے۔"

نجمی نے ایک آہ بھر کر کہا کہ "اس کا نام نہ لو دل کے داغ روشن ہو جاتے ہیں تم میرے خالی پیریڈ کا پوچھ رہی تھیں مجھے کچھ کھلانے پلانے کا پروگرام ہے کیا۔"

شبانہ اس کے ساتھ برآمدے میں چلنے لگی "نجمی موسم اتنا خوبصورت ہے کہ جی چاہتا ہے۔ اس وقت لارنس باغ کے اوپن ایئر کیفے میں لیموں کے درخت کے

نیچے بیٹھ کر چائے پی جائے۔"

نجمی نے شبانہ کو بازو سے پکڑ کر سیڑھیوں کی طرف کھینچتے ہوئے کہا "اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے میرا کوئی پیریڈ نہیں ہے۔"

اور وہ کھینچتی ہوئی شبانہ کو کالج کے پارکنگ گیراج کی طرف لے گئی جہاں شبانہ کی گاڑی پارک تھی دس منٹ بعد دونوں سہیلیاں لارنس باغ کے اوپن ایئر کیفے کے لان میں لیموں کے پیڑ کے نیچے نواڑی کرسیوں پر بیٹھی تھیں نجمی کو شبانہ نے بتا دیا تھا کہ ظفر کی طرف سے منگنی کی پیش رفت ہوئی تھی جسے اس نے اپنی بہن غزالہ کی مدد سے ملتوی کروا دیا ہے اب اس نے نجمی کو بتایا کہ ظفر واپس امریکہ چلا گیا ہے نجمی نے چائے بناتے ہوئے کہا۔

"شبو! ویسے تمہیں اس پروپوزل پر غور ضرور کرنا چاہیئے آخر ایک نہ ایک دن تمہاری شادی کسی نہ کسی ظفر یا عبدالقدوس سے ہو ہی جائے گی۔ اور اگر شادی ہونی ہی ہے تو پھر ظفر سے بہتر چانس کوئی نہیں شادی کے فوراً بعد تمہیں بھی گرین کارڈ مل جائے گا۔"

شبانہ نے نجمی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تم کیوں نہیں کر لیتیں ظفر سے شادی؟ تمہاری بات چلاؤں؟"

نجمی نے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا "میں تو ندیم کو دل دے بیٹھی ہوں مگر تمہارے ساتھ ایسی کوئی پروپوزیشن نہیں ہے ڈیئر تمہارا دل صحیح و سالم ابھی تک تمہارے اپنے پاس ہے۔" پھر شبانہ کو گھورتے ہوئے بولی۔

"کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے اگر کسی کو دل دے بیٹھی ہو تو کم از کم مجھے ضرور بتا دو شبو!"

شبانہ نے پیالی میں چمچ ہلاتے ہوئے کہا۔

"ابھی تک میرا دل میرے اپنے ہی پاس ہے کم از کم میں نے ظفر کو نہیں دیا۔ چھوڑو ان باتوں کو دیکھو لیموں کے پتوں سے کیسی ہلکی ہلکی مہک آ رہی ہے۔" نجمی نے

زور سے سانس کھینچ کر کہا۔

"مجھے تو بالکل نہیں آ رہی ہے۔ یہ لیموں کے درخت سردیوں کی بارش اور گلاب کے پھول تمہیں لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ زندگی ان کے ساتھ بسر نہیں کی جا سکتی۔"

شبانہ نے چائے کا ہلکا سا گھونٹ لیا اور ٹشو پیپر ہونٹوں پر لگاتے ہوئے بولی۔ "یہی میں ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ زندگی سوائے لیموں کے درختوں، سردیوں کی بارش اور گلاب کے پھولوں کے اور کچھ نہیں ہے۔"

نجمی نے قہقہہ لگایا "مائی ڈیئر تم ایسا افورڈ کر سکتی ہو تم سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوئی ہو۔"

شبانہ کو نجمی کی یہ بات بُری لگی۔ تنک کر بولی۔ "خدا نے اگر مجھے امیر ماں باپ کے گھر پیدا کیا ہے تو میں اس کا شکر کیوں نہ ادا کروں؟ اور اس کا شکر ادا کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ میں اس کے درختوں، پھولوں، دریاؤں، پہاڑوں اور خوشبوؤں سے پیار کروں اور ان کے ساتھ ہی رہتے ہوئے زندگی بسر کروں۔"

نجمی ہنستے ہوئے بولی۔ "یار تم تو ناراض ہو گئی ہو بابا جو چاہے کرو مگر میرے لئے فروٹ کیک اور منگواؤ۔"

شبانہ بھی مسکرانے لگی اس نے ویٹر کو اشارے سے بلا کر مزید فروٹ کیک لانے کا آرڈر دے دیا ان کے اوپر لیموں کے چھوٹے سے پیڑ کا سایہ تھا اس خوشبو دار سائے نے آدھی میز کو ڈھانپ رکھا تھا باقی آدھی میز پر سورج کی سنہری دھوپ تھی۔ نجمی دھوپ میں بیٹھی ہوئی تھی لیموں کے پیڑ پر ابھی پھول بھی نہیں آئے تھے یہ پھول مارچ اپریل میں آتے تھے جو ابھی درخت کی ٹہنیوں اور پتوں کے اندر کہیں گردش کر رہے تھے۔ شبانہ لیموں کی چھوٹی چھوٹی سبز پتیوں سے ان پھولوں کی اٹھتی ہوئی دھیمی خوشبو محسوس کر رہی تھی یہ خوشبو اس سانس کی مانند تھی جس کی آواز سنائی نہ دیتی ہو۔ اسے یا لیموں کی ٹہنیاں محسوس کر سکتی

تھیں اور یا شبانہ محسوس کر سکتی تھی۔ نجمی سے یہ لطیف ترین خوشبو کا سانس بہت دور تھا چائے پینے کے بعد دونوں سہیلیاں لارنس باغ کی خوبصورت روشوں پر چمکیلی دھوپ میں ٹہلنے لگیں قطعوں میں ڈیلیا، گلاب اور پینزیز کے پھول کھل رہے تھے باتیں کرتے ٹہلتے ٹہلتے وہ سنبل کے گنجان درختوں والی پرانی اور خاموش سڑک پر سے ہوتی ہوئی اس پلاٹ کے قریب آ گئیں جہاں بانس کے جھنڈ سے تھے اچانک شبانہ کی نگاہ بانس کے جھنڈ کے پاس اس بنچ کی طرف اٹھ گئی جہاں کچھ روز پہلے اس نے پُراسرار اجنبی کو ہلکی بارش میں بیٹھے دیکھا تھا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہاں گلاب کا سرخ پھول رکھا ہوا اسے ملا تھا شبانہ کا چہرہ اداس ہو گیا وہ کرکٹ گراؤنڈ کے کنارے بنے ہوئے کاٹیج کو دیکھنے لگی اس کے دل میں ایک خواہش کروٹیں لینے لگی اس نے نجمی سے کہا۔

مجھے لائبریری سے ایک کتاب نکلوانی ہے تم میرے ساتھ چلو گی یا پہلے تمہیں کالج چھوڑ دوں؟"

نجمی نے شرارت سے کہا "اگر تم لائبریری میں اکیلی جانا چاہتی ہو تو مجھے بے شک کالج بھی نہ چھوڑو میں بس میں بیٹھ کر چلی جاؤں گی۔"

شبانہ مسکرا دی "تم بس یہی باتیں سوچتی رہتی ہو۔"

لیکن دل میں شبانہ نے نجمی کے قیافے کی داد دی اس نے شبانہ کے دل کی کیفیت کو پہچان لیا تھا شبانہ واقعی اس وقت پُراسرار اجنبی کا خیال دل میں لے کر لائبریری جا رہی تھی۔ نجمی اس کے ساتھ ہی گئی شبانہ نے اپنے کارڈ پر یونہی دستکووسکی کی ایک کتاب نکلوا لی۔ لائبریری کے ہال میں داخل ہوتے ہی اس کی نگاہیں بے اختیار کونے والی جافری کی طرف اٹھ گئیں تھیں جہاں میز خالی تھی کتاب دیکھنے کے بہانے وہ جافری کے قریب آ گئی میز پر گلاب کا سرخ پھول نہیں تھا تمباکو اور کافی کی خوشبو بھی لائبریری کی فضا میں موجود نہیں تھی۔ شبانہ کا دل جانے کیوں اُداس اور بوجھل سا ہو گیا کہیں وہ اجنبی اس شہر سے چلا تو نہیں گیا؟ لیکن مجھے اس سے

گیا۔ شبانہ نے خود ہی اپنے دل کی جیسے سرزنش کی اور نجمی کے ساتھ لائبریری سے نکل کر گاڑی میں بیٹھی اور اسے اسٹارٹ کر کے کالج کی طرف چل دی۔

تیسرے روز صبح ہی صبح سان فرانسسکو سے ظفر کا فون آگیا فون غزالہ نے سنا ظفر نے امی ابو عقیل اور عامر سے بھی باتیں کیں۔ اس نے شبانہ کا بھی پوچھا شبانہ اس وقت اپنے کمرے میں جاگ رہی تھی جب عامر نے آکر بتایا کہ ظفر بھائی جان کا امریکہ سے فون آیا ہے اور وہ تمہیں ہیلو کہہ رہے ہیں۔

شبانہ نے بالوں میں برش کرتے ہوئے کہا۔

انہیں میری طرف سے بھی ہیلو کہہ دو۔"

"اوکے۔"

اور عامر تیزی سے سیڑھیاں اُترنے لگا شبانہ ناشتے کی میز پر آئی تو اس کی امی نے کہا۔"ظفر تمہارا بار بار پوچھ رہا تھا تم بھی اس سے بات کر لیتیں۔"

شبانہ نے کوئی جواب نہ دیا غزالہ جلدی سے بولی"شبانہ شاید غسل خانے میں تھی پھر بات کر لے گی۔"

شبانہ کے والد دلیے پر دودھ ڈال رہے تھے وہ خاموش رہے امی سبز چائے پی رہی تھیں عقیل کے ایک ہاتھ میں چائے کا کپ تھا اور نظریں گھٹنوں پر رکھے اخبار پر جمی تھیں کہنے لگا۔

"سٹینڈرڈ کا اشتہار ابھی نہیں آیا۔"

والد نے چمچ سے دلیہ کھاتے ہوئے کہا۔

"اشتہار دے بھی دیں تو کوئی فائدہ نہیں۔ دس لاکھ کے ٹینڈر میں ہمیں زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ ہی بچ سکے گا۔ پھر کمیشن کی رقم الگ جائے گی۔ تم برج والے ٹھیکے کا جا کر پتہ کرو آج۔"

امی نے بالائی کی پیالی کی طرف اشارہ کیا اور شبانہ سے کہا۔

"بیٹی تم نے بالائی کھانی کیوں چھوڑ دی ہے یہ لپٹن چائے خشکی کرتی ہے۔"

غزالہ نے مسکرا کر کہا۔

"امی جان! آج کل بالائی کھانے کا فیشن نہیں ہے۔ آج کل تو۔۔۔" اچانک غزالہ کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ رگیں پھول گئیں اور وہ کرسی سے نیچے گر پڑی اسے دورہ پڑ گیا تھا۔ شبانہ کو یاد تھا۔ آج سے آٹھ نو برس پہلے جب پہلی بار غزالہ کو یہ دورہ پڑا تھا تو گھر میں کہرام مچ گیا تھا لیکن اس کے بعد ہفتے پندرہ دن کے بعد غزالہ کو یہ دورہ ضرور پڑنے لگا۔ اس کے لئے ایک خاص پرائیویٹ کلینک میں کمرہ بک کرا دیا جاتا۔ وہاں اس کو آکسیجن اور ڈرپ لگ جاتے۔ دو خاص ڈاکٹر اس کی دیکھ بھال کرتے اور دو دن کے بعد غزالہ ٹھیک ٹھاک ہو کر "کینال" ج" میں واپس آجاتی۔ چنانچہ اس روز بھی جب اسے دورہ پڑا تو سوائے شبانہ کی امی کے کسی اور کو زیادہ پریشانی نہ ہوئی۔ غزالہ کو اسی وقت گاڑی میں لٹا کر اپر مال روڈ والے کلینک پہنچا دیا گیا۔ شبانہ، اس کی امی عقیل اور ابو ساتھ تھے۔ غزالہ بے ہوش تھی۔ ڈاکٹروں نے فوراً آکسیجن ماسک چڑھا کر ڈرپ لگا دیئے انجکشن لگائے اور ایک گھنٹے کے اندر اندر غزالہ ہوش میں آگئی۔ رات شبانہ غزالہ کے پاس کلینک میں ہی رہی۔ دوسرے روز نجمی خبر سنتے ہی کلینک پہنچ گئی۔ عامر شبانہ کا ناشتہ لے کر آگیا۔ دوسرے روز شام کو غزالہ گھر آگئی۔ اس بار ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ غزالہ کو شہر کے ہنگاموں سے دور کسی صحت افزا مقام پر بھیج دیا جائے۔ شبانہ کے ابو نے فوراً عقیل کو کوہ مری بھیج کر دو مہینوں کے لئے چشموں کی جانب ایک پوری کوٹھی کرائے پر لے لی۔ کوہ مری برف میں ڈوبا ہوا تھا۔ سیزن ختم ہو چکا تھا۔ مال پر صرف سمیز ریستوران اور رنسٹاٹ ہی کھلے تھے۔ ان میں فوجیوں کے لئے سیروز سینما میں فلم کا ایک شو ہوتا تھا۔ غزالہ کے ساتھ عامر، شبانہ ایک نوکرانی اور ایک خانساماں بھی گئے۔ شبانہ نے خود ہی مری جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وہ پہاڑوں پر برف گرتی دیکھنا اور سمیز ریستوران کی کافی پینا چاہتی تھی۔ ایک گاڑی میں یہ سب لوگ بیٹھے دوسری ویگن میں روزمرہ ضروریات کا سامان اور بستر

وغیرہ ساتھ لے گئے۔ بڑا بھائی عقیل پہلے ہی سے کوہ مری میں تھا۔ برف کے سفید ٹکڑے سفید موٹر کراس کرتے ہی شروع ہو گئے۔ برف آلودہ کوہ مری سردی میں ٹھٹھر رہا تھا درختوں کی بے برگ و بار ٹہنیاں سفید ہو رہی تھیں۔ مکانوں کی ڈھلانی چھتوں پر بھی برف جمی ہوئی تھی۔ سنی بینک سے لے کر مال روڈ، ڈاک خانے اور اوپر چشموں تک برف ہٹا کر سڑک درمیان سے صاف کر دی گئی تھی۔ دونوں جانب برف کی چار فٹ اونچی دیوار کھڑی تھی۔ چشموں والی کوٹھی میں فرنیچر اور قالین پہلے ہی سے بچھے ہوئے تھے۔

عقیل نے دونوں بیڈ روم اور نشست گاہ کے آتش دانوں میں آگ روشن کروا رکھی تھی۔ نشست گاہ، دونوں بیڈ روم اور ڈائننگ روم، کچن کی فضا گرم تھی۔ لاہور سے یہ لوگ منہ اندھیرے چلے تھے اور گیارہ بج رہے تھے۔ دن کے وقت یہ کوہ مری پہنچ گئے۔ غزالہ نے ہر شے قرینے سے سجا دی۔ غزالہ کے بیڈ روم میں ٹیبل لیمپ، گلدان اور مخمل کا صوفہ لگوایا۔ دوپہر کا کھانا سب نے مل کر ڈائننگ روم میں کھایا۔ غزالہ پر اب حسب سابق دورے کا اثر باقی نہ تھا۔

ڈاکٹروں نے پہلی بار اس کو صحت افزا مقام پر بھیجنے کی ہدایت کی تھی۔ غزالہ بھی اس ہوا بدلی پر خوش تھی۔ دوپہر کو انہوں نے آرام کیا۔ شام ہونے سے پہلے سب نے گرم کپڑے گرم مفلر اور اوور پہنے، سروں پر اونی ٹوپیاں جمائیں۔ ہاتھوں میں چھتریاں لیں اور چشمے والی کوٹھی کے پورچ سے نکل کر پیدل ہی مال روڈ کی طرف چل پڑے۔

عقیل اور عامر آگے آگے تھے۔ شبانہ اور غزالہ ان کے پیچھے چل رہی تھیں۔ آسمان صاف تھا برف گرنے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ سانس کے ساتھ بھاپ سی نکل رہی تھی۔ سردی بے پناہ تھی۔ مگر جوانی کے گرم خون نے ٹھٹھرتی برف آلود سردی میں ان کے چہرے لال کر دیئے تھے۔ ڈاک خانے کے آگے سے ڈھلان اترنے کے بعد یہ لوگ سمیز ریستوران میں آکر بیٹھ گئے۔ شبانہ اس سے پہلے کئی

بار برف کے موسم میں کوہ مری آ چکی تھی۔ وہ برفباری کے زمانے میں برف گرتی دیکھنے عقیل یا عامر کے ساتھ ایک ہفتے کے لئے مری ضرور آتی تھی سمیز ریستوران میں آکر وہ مال روڈ والی میز پر بیٹھ جاتی۔ شیشے والی کھڑکیاں بند ہوتیں اور وہ برف باری میں بازار اور سامنے والے خاموش گرجا گھر کو دیکھا کرتی۔

اس روز بھی سمیز ریستوران کی شیشے کی ساری کھڑکیاں بند تھیں۔ گاہک نہ ہونے کے برابر تھے۔ درمیان میں بخاری سلگ رہی تھی جس کی وجہ سے ریستوران کی فضا میں ہلکی ہلکی گرمائش رچی ہوئی تھی۔ انہوں نے مال روڈ والی کھڑکیوں کے ساتھ والی میزوں پر نشستیں جمالیں اور ویٹر کو کافی اور لیمن ٹارٹ اور فروٹ کیک لانے کا آرڈر دیا۔ برفباری میں شبانہ یہاں ہمیشہ کریم والی کافی پیا کرتی۔ اس روز بھی اس نے کریم والی کافی کو ہی ترجیح دی۔ سامنے والے گرجا گھر کا چھوٹا سا صحن خالی اور سنسان تھا۔ گرجا گھر کے صحن اور ڈھلانی چھت پر برف جمی ہوئی تھی۔ اس سے اوپر والے بنگلے کی چھت اور لان بھی برف آلود تھا۔ عامر بہت خوش تھا اس نے اپنے لطیفوں سے غزالہ کو خوب ہنسایا۔ دو روز وہاں رہ کر عقیل بھائی واپس لاہور چلے گئے۔

اب عامر ان کے ساتھ تھا۔ دونوں خانساماں اور ملازمہ بھی تھی۔ دن بھر یہ لوگ بنگلے کی گرم فضا میں ٹیپ ریکارڈ اور انگریزی اور پاکستانی میوزک سنتے دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرتے۔

شبانہ اپنی بڑی بہن غزالہ کے پاس بیٹھتی اس سے باتیں کرتی۔ پھر اپنے بیڈ روم میں آتش دان کے قریب بیٹھ کر "والڈن" یا قدیم انگریزی شاعری کا مطالعہ کرنے لگتی۔ تیسرے پہر سب لوگ سمیز ریستوران میں کافی پینے چل دیتے۔ ایک روز دوپہر کو ہی بادل چھا گئے اور تیسرے پہر ہلکی ہلکی برف کے سنبل ایسے گالے گرنا شروع ہو گئے۔ شبانہ اسی رومانٹک لمحے کا انتظار کر رہی تھی۔ سرمئی رنگ کے بادلوں کی دھند میں اس نے سفید برف کی پنکھڑیاں گرتی دیکھیں تو اس کا چہرہ سرخ

ہوگیا۔ غزالہ نے اس موسم میں سمیز ریستوران جانے سے معذوری ظاہر کی۔ عامر سو رہا تھا۔ شبانہ خود بھی برف باری میں اکیلی سیر کرنا چاہتی تھی۔ گرم پتلون کے اوپر سوئس سویٹر پہن کر پنک کلر والا گرم لمبا کوٹ پہنا۔ گلے میں انگلش مفلر اور سر پر اونی ٹوپی اوڑھی اور چھتری لے کر شبانہ اکیلی ہی گرتی برف میں سمیز ریستوران کی طرف چل پڑی۔ برف کی بے آواز، نرم اور ریشم ایسی چھوٹی چھوٹی پنکھڑیاں ہلکی ہوا میں اس کے آگے پیچھے رقص کرتی گر رہی تھیں۔ دوپہر کے تین بجے کا وقت تھا مگر سرمئی دھند اور برفباری نے منظر کو دھندلا دیا تھا۔ مال پر دونوں جانب کے بنگلے دھند اور برف میں گم ہوتے جا رہے تھے۔ سڑک سنسان تھی۔ شبانہ دل میں دعائیں مانگنے لگی کہ سمیز ریستوران کھلا ہوا ہو۔ پوسٹ آفس کا موڑ گھومتے ہی اسے دور سے سمیز ریستوران میں جلتی روشنی دکھائی دی۔ اس کا دل باغ باغ ہوگیا۔ سمیز ریستوران کھلا تھا۔ مگر وہاں سوائے دو بیروں کے کوئی گاہک نہیں تھا۔ دونوں بیرے بخاری کے پاس گرم ہوکر بیٹھے تھے۔ شبانہ اپنی خاص میز پر جا کر بیٹھ گئی۔ اور کریم والی کافی کا آرڈر دے دیا۔

مال روڈ کی جانب کھلنے والی کھڑکیاں بند تھیں۔ شبانہ نے شیشے میں سے نیچے دیکھا۔ مال پر برف کی ہلکی تہہ جم رہی تھی۔ سرد ہوا میں سامنے والے گرجا گھر کے صحن اور اوپر والے بنگلے کے برآمدوں اور ویران باغ میں برف کی پنکھڑیاں اڑ رہی تھیں۔ شبانہ نے دستانے اتار کر کوٹ کی جیب میں ٹھونسے اور زور زور سے ہتھیلیاں رگڑنے لگی۔

اس کی سرخ سپید نازک ہتھیلیوں کا رنگ سرخ ہوگیا۔ اس کا چہرہ سامنے پنڈی پوائنٹ کی طرف اور سمیز ریستوران کی سیڑھیاں اس کی پشت کی جانب تھیں۔ برف باری میں مال روڈ دور تک سنسان اور دھندلی دھندلی تھی۔ شبانہ نے بڑی محبت اور اہتمام سے کافی بنائی اور اس کے پہلے ہی خوشبودار گھونٹ کے ساتھ اس کے جسم میں گرم استوائی جنگلوں کی گرم مہک سرایت کر گئی۔ شبانہ نے آنکھیں بند کرلیں اب اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بے لہر بیکراں سمندر تھا جس کی

سطح پر ایک بادبانی جہاز آہستہ آہستہ ڈول رہا تھا۔ اس کے بادبان مستولوں کے ساتھ لپٹے ہوئے تھے۔ پھر اس کے کانوں میں بربط کے نغمے کی دھیمی دھیمی آواز شہد بن کر ٹپکنے لگی۔ پھر جیسے سارا منظر ساری آوازیں ساکت ہوگئیں۔

شبانہ کو کافی کی تلخ خوشبو محسوس ہوئی۔ یہ اس کے سامنے رکھے بلوریں کافی پاٹ کی خوشبو نہیں تھی۔ اب اسے پائپ کے تمباکو کی مہک بھی محسوس ہوئی۔ شبانہ نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک دراز قد آدمی لمبے اوورکوٹ میں ملبوس پیچھے سے آکر اس کے قریب سے آگے گزر گیا۔ شبانہ کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے اس چوڑے شانوں والے دراز قد آدمی کو پہچان لیا تھا۔ اس کے کاندھوں پر کہیں کہیں برف کے گالے اب بھی موجود تھے۔ وہ کونے والی میز پر کھڑکی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کوٹ کی جیبوں سے ہاتھ نکال کر اس نے سلگتا ہوا پائپ منہ سے ہٹا کر میز پر رکھ دیا۔ اس کی پشت شبانہ کی طرف تھی مگر شبانہ اسے پہچاننے میں کبھی دھوکہ نہیں کھا سکتی تھی۔ اس نے سر پر سیاہ رنگ کی اطالوی بیرٹ کیپ پہن رکھی تھی جس میں سے کنپٹیوں پر اس کے ہلکے ہلکے سفید بال صاف نظر آرہے تھے باہر برف گر رہی تھی۔ شبانہ نے سوچا کہ اسے اٹھ کر واپس چلا جانا چاہیئے۔ پھر خیال آیا کہ اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اسے بیٹھ کر اطمینان سے کافی کا لطف اٹھانا چاہیئے۔ لیکن اب اس کا سارا دھیان ادھر کونے والی میز پر بیٹھے پراسرار اجنبی کی طرف تھا۔ یہ یہاں کیسے آگیا؟ کیا اسے معلوم ہوگیا تھا کہ میں کوہ مری میں ہوں؟ مگر اسے میرا تعاقب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا میرا خیال ہے یہ محض اتفاق ہے۔

شبانہ اپنے ہی خیالات میں الجھی اپنے لئے کافی کا دوسرا کپ بنانے لگی۔

اچانک پراسرار آدمی اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ شاید واپس جا رہا تھا۔

شبانہ کا دل ایک بار پھر زور سے دھڑکا۔ اب ان دونوں کا آمنا سامنا ہونا تھا۔ شبانہ نے جان بوجھ کر اپنا چہرہ کھڑکی کے شیشے کے ساتھ لگا دیا اور یوں

ظاہر کیا جیسے وہ سڑک پر برف گرنے کے منظر سے لطف اندوز ہو رہی ہے درانہ نداجنبی اس کے قریب سے گزر گیا۔ شبانہ کو ایک بار پھر کافی اور پائپ کے تمباکو کی ملی جلی خوشبو آئی۔ شبانہ اسے دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر کوشش کے باوجود بلکہ خواہش کے باوجود اپنا چہرہ کھڑکی سے پیچھے نہ ہٹا سکی۔ اب وہ اس لئے اپنا چہرہ پیچھے نہیں کر رہی تھی کہ اسے یقین تھا کہ وہ اجنبی ریستوران کی سیڑھی اتر کر مال پر سے ضرور گزرے گا۔

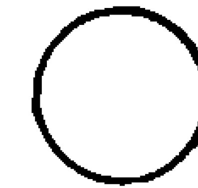
شبانہ اسے گرتی برف سے جاتا دیکھنا چاہتی تھی۔ تین چار منٹ گزر گئے مگر وہ آدمی نہ آیا۔ شاید وہ پنڈی پوائنٹ کی طرف جانے کی بجائے پوسٹ آفس کی طرف چلا گیا تھا۔ شبانہ نے گہرا سانس لیا اور پیالے میں آہستہ آہستہ چمچ ہلانے لگی۔ وہ پیچھے مڑ کر پوسٹ آفس کی طرف نگاہ ڈالنا چاہتی تھی مگر اس خیال سے ایسا نہ کر سکی کہ کسی بیرے کو شک نہ ہو جائے کہ میں ادھر اسی آدمی کو تک رہی ہوں۔ اسے کسی کے قدموں کی چاپ دوبارہ سنائی دی۔ اس نے پیچھے دیکھا۔ بیرا پلیٹ میں زرد رنگ کا ایک لفافہ رکھے اس کے پاس آکر رک گیا اور بولا۔

"بیگم صاحب یہ آپ کے لئے ہے جی"

"کس..... کس نے دیا ہے۔" شبانہ نے کسی قدر ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"جی۔ وہ صاحب جو ادھر بیٹھے تھے دے گئے ہیں۔"

بیرا لفافہ شبانہ کی میز پر رکھ کر واپس چلا گیا۔ شبانہ نے کپکپاتی انگلیوں سے لفافہ کھولا۔ اس کے اندر سرخ گلاب کا پھول تھا مگر یہ پھول باسی تھا۔



لفافے میں سوائے باسی پھول کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

شبانہ کو یہ بڑی رومانٹک اور دلفریب بات لگی کہ کوئی اسے لفافے میں

باسی پھول ڈال کر بھیجے۔ باسی پھول اس اعتبار سے بھی اسے بہت پسند تھے کہ وہ ایک بار مرجھا کر پھر کبھی نہیں مرجھاتے۔ ان کی اداس مہک اسے ان سرسبز شگفتہ باغوں کی یاد دلاتی تھی جو سینکڑوں برس پہلے دریاؤں کے کنارے اپنی سایہ دار روشوں پر نازک اندام لڑکیوں کو ہنستے کھیلتے چلتے دیکھا کرتے تھے لیکن پھر دریا صحراؤں کے سینے میں اتر کر روپوش ہو گئے۔ روشیں ویران ہو گئیں۔ باغ ریت کی چادر میں چھپ کر معدوم ہو گئے اور ان کی دلگداز خوشبوئیں تاریخ کے بوسیدہ اوراق میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سمٹ گئیں۔ شبانہ نے لفافے میں سے باسی پھول نکالا اسے اپنے ہونٹ کے قریب لے گئی اس میں سے دھیمی معموم مہک آ رہی تھی۔ یہ ان قدیم خانقاہوں کی مہک تھی جہاں پاکباز راہبائیں خدا کی یاد میں زندگی بسر کرتی تھیں۔

شبانہ نے پھول لفافے میں ڈالا۔ اسے اپنے پرس میں رکھا اور گرتی برف میں سمبز ریستوران کی سیڑھیاں اتر کر مال روڈ پر آ گئی۔ اس اجنبی نے پہلی بار شبانہ کو گلاب کا باسی پھول بھیجا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ شبانہ کو پہلے ہی دیکھ چکا ہے جب وہ لائبریری آیا کرتی تھی اور جب اس نے بانس کے جھنڈ کے پاس اسے دیکھا تھا شبانہ انہی خیالات میں گم برف باری میں ویران سڑک کی چڑھائی چڑھ رہی تھی۔

برف زیادہ گرنے لگی تھی۔ برف کی پنکھڑیاں برف کے گالوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ ڈاک خانے کے اوپر چڑھ کر چیڑھ کے درختوں والا موڑ گھوم کر شبانہ اپنی کوٹھی کی طرف چلی تو دوسری جانب کھلی وادی میں سے تیز یخ بستہ ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ برف اس کی آنکھوں میں الجھنے لگی۔ شبانہ نے اونی دستانے والا ہاتھ چہرے کے آگے کر لیا اور تازہ برف پر پاؤں جماتی آگے بڑھتی گئی۔

غزالہ اس کے بارے میں فکرمند تھی۔ وہ عامر کو سمبز ریستوران میں بھیجنے والی تھی۔ "تمہیں برف میں باہر نہیں جانا چاہیئے تھا شبو۔" غزالہ نے شبانہ کو کمرے میں آکر کاندھوں سے برف جھاڑتے دیکھ کر کہا۔ کچن میں سے عامر نکل آیا۔

"باجی! تم واقعی ایڈونچرس لڑکی ہو میں بھی برف باری میں سیر کرنے جا رہا ہوں"، غزالہ نے اسے منع کیا۔ شبانہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "آپی! یہی تو موسم انجوائے کرنے کا ہے۔"

شام کی چائے عامر اور شبانہ نے غزالہ کے بیڈ روم میں ہی پی۔ شبانہ اپنی خاص چائے یعنی سیلون ٹی ساتھ لے گئی تھی۔ وہ چائے پر غزالہ اور عامر سے کوہ مری کی برف پوش خوبصورتی اور فکر انگیز سکون کے بارے باتیں کرتی رہی۔ لیکن اس کے دل میں دراز قد رومانٹک اجنبی کا خیال گردش کر رہا تھا وہ کوہ مری میں کیسے آ گیا؟ ضرور اسے علم ہو گا کہ شبانہ کوہ مری جا رہی ہے۔ کیا وہ صرف اس کی خاطر برف پوش کہساروں میں آیا تھا؟

رات سونے سے پہلے بھی شبانہ ایسے ہی رومانٹک خیالات میں گم رہی شیلے کی نظموں کی کتاب اس کے سامنے کھلی تھی لیکن تصور میں وہ سمیز ریستوران میں بیٹھی اس اجنبی کو دیکھ رہی تھی جو جاتی دفعہ اسے گلاب کا باسی پھول دے گیا تھا اسے وہ شام یاد آ گئی جب اس نے پہلی بار اس پراسرار اجنبی کو لاہور کی لائبریری میں جافری میں بیٹھے کتاب کے مطالعے میں محو دیکھا تھا پھر جب نجمی ذرا اونچی آواز میں بولی تھی تو اجنبی نے چہرہ گھما کر انہیں دیکھا اس کی آنکھوں میں ایک عجیب کلاسیکی گہرائی اور کشش تھی۔ ایک انتھاہ خاموشی تھی۔ جو عام طور پر ایسے ٹیلوں کے آس پاس ہوتی ہے جن کے اندر ہزاروں برس کی تہذیب کے کھنڈر دفن ہوں۔ شبانہ نے کتاب بند کر کے تپائی پر رکھ دی اور مخملیں لحاف اوپر کر لیا پھر آنکھیں بند کر لیں باہر برف آلود فضا چپ چاپ تھی۔ کبھی اندھیری رات میں کوئی یخ بستہ جھونکا چیڑھ کے برف پوش درختوں کو چھو کر گزرتا تو برف کے گالوں کے گرنے کی آواز آتی اور پھر گہرا سکوت چھا جاتا اس نے سوچا کہ شیلے اور کیٹس نے شاید ایسی ہی لازوال خاموشی اور سکوت میں اپنی نظمیں تخلیق کی ہوں گی۔ اس نے لحاف سے ہاتھ نکال کر جلدی سے ٹیبل لیمپ بجھا دیا اور گرم ریشمی نیند کی آغوش میں اتر گئی۔

دوسرے دن بھی موسم ابر آلود تھا۔ وادی میں دھند چھائی تھی۔۔۔ مگر برف باری نہیں ہو رہی تھی۔ کل کی گری ہوئی برف ٹھنڈی یخ ہوا میں جمنے لگی تھی۔ عامر نے بیڈ روم پر دستک دیتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ "باجی! امی ابو کا لاہور سے فون آیا ہے۔"

شبانہ بستر سے نکل کر گاؤن جسم پر سنبھالتی غزالہ کے کمرے کی طرف بھاگی۔۔۔ فون غزالہ کے کمرے میں تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے امی سے باتیں کر رہی تھی۔

"امی! شبانہ بھی آ گئی ہے اس سے بات کریں۔"

فون پر لاہور کے سب لوگوں نے باتیں کیں امی ابو اور عقیل نے بار بار تاکید کی کہ غزالہ کا بہت خیال رکھا جائے۔

عقیل نے کہا" میں نے ٹھیکیدار رحمان صاحب کو بھی فون کر دیا ہے۔ وہ اپر ٹوپا میں رہتے ہیں دن میں ایک بار آ کر تم لوگوں کی خیر خیریت پوچھ جایا کریں گے" ابو نے شبانہ سے کہا کہ وہ باسمتی اور دوسری ضروری چیزیں نوکر کے ہاتھ ویگن میں بھجوا رہے ہیں۔ پھر وہ غزالہ سے باتیں کرنے لگے۔ غزالہ کی صحت کوہ مری میں آ کر پہلے سے بہت اچھی ہو گئی تھی۔ اس کا زیادہ وقت بستر میں لیٹے کتابیں ناول پڑھتے گزرتا۔ شام کو تھوڑی دیر سیر کے لئے شبانہ یا عامر کے ساتھ ڈاکخانے تک جاتی مگر شبانہ صبح شام سمیز ریستوران میں جا کر کافی پیتی تھی۔ اس باسی پھول والے رومانٹک واقعے کے بعد دو دن گزر گئے تھے۔

شبانہ کو پھر وہ اجنبی دکھائی نہیں دیا تھا۔ تیسرے روز آسمان پر صبح ہی سے سیاہ گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔ عامر ناشتے کے بعد سیر کرنے مال روڈ کی طرف نکل گیا۔ غزالہ اپنے بستر میں لیٹی تھی۔ شبانہ بھی اس کے پاس چلی آئی۔ گزشتہ روز دوپہر کے بعد عقیل بھائی کے دوست ٹھیکیدار رحمان صاحب آ کر خیر خیریت پوچھ گئے تھے۔ انہوں نے اپنی طرف سے دو چوکیدار بھی کوٹھی کے باہر بٹھا دیئے تھے۔ شبانہ نے غزالہ کے بیڈ روم کی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر شیشے میں سے باہر دیکھا۔

سرمئی بادل دھند کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ غزالہ نے کہا۔"آج برف گرے گی.... خانساماں سے کہنا بازار جاکر مرغیاں وغیرہ لے آئے۔"

شبانہ باہر سرمئی دھند میں لپٹے ہوئے چیڑھ کے درختوں کو دیکھ رہی تھی جن کی ٹہنیاں ہوا میں جھولنے لگی تھیں۔ غزالہ کا کمرہ گرم تھا۔ آتشدان میں صبح کو تازہ آگ روشن کر دی گئی تھی۔ شبانہ کچھ دیر اپنی بہن غزالہ کے پاس بیٹھی لاہور کی باتیں کرتی رہی۔ اس نے گھر امیّ کو فون بھی کیا پھر خانساماں کو مرغیاں وغیرہ لانے بازار بھیج دیا۔ دوپہر کا کھانا شبانہ نے خانساماں کے ساتھ مل کر بنایا۔ دونوں ادھیڑ عمر خانساماں بڑے اچھے کھانے پکا لیتے تھے مگر آج شبانہ بھی ان کے ساتھ لگ گئی۔ دوپہر کے کھانے پر عامر بھی آگیا سب نے کھانا غزالہ کے بیڈ روم میں ہی کھایا۔ موسم ویسے ہی ابر آلود تھا۔ ابھی تک برف باری شروع نہیں ہوئی تھی۔ کھانے کے بعد شبانہ اپنے کمرے میں آگئی۔ تھوڑی دیر آرام کیا پھر اس کا دل باہر جانے کو بے تاب ہوگیا۔ اس نے فوراً گرم لباس پہنا، سر پہ اونی ٹوپی جمائی، گلے میں گرم مفلر لپیٹا، ہاتھوں پر اونی دستانے چڑھائے، چھڑی لی اور غزالہ سے کہا کہ میں تھوڑی دیر سیر کے لئے جا رہی ہوں ابھی واپس آجاؤں گی۔ غزالہ نے اسے ہدایت کی کہ موسم ٹھیک نہیں ہے اس لئے زیادہ دور نہ جائے

شبانہ کوٹھی کے احاطے سے باہر نکلی تو سرد ہواؤں نے اس کا خیر مقدم کیا آج اس کا دل اُوپر جے سینز اینڈ میری کانونٹ اسکول کی طرف جانے کو چاہ رہا تھا چنانچہ مال کی طرف جانے کے بجائے وہ اسی چھوٹی سی برف پوش سڑک پر ہوگئی جو اوپر چشموں کی طرف چلی گئی تھی۔ سارا علاقہ سنسان تھا، کوٹھیاں بنگلے خالی تھے۔ اُونچے اُونچے چیڑھ کے درختوں کے نیچے جے سینز اینڈ میری کانونٹ، اسکول کا چھوٹا سا لکڑی کا جنگلہ بند تھا۔ جنگلے کے اوپر ہلکی برف کی تہہ جمی تھی۔ کانونٹ اسکول موسم سرما کی چھٹیوں کی وجہ سے بند تھا۔ شبانہ سیر کرتے کرتے وہاں سے بھی آگے نکل گئی آگے ایک راستہ گورنمنٹ ہاؤس کو اور ایک راستہ

پہاڑی کے پہلو سے ہوتا ہوا اُوپر چلا گیا تھا۔ شبانہ نے اس راستے پر چلنا شروع کر دیا۔ یہاں پہلی بار اس نے محسوس کیا کہ بادل گہرے ہوگئے ہیں اور ہوا میں تیزی آگئی ہے لیکن وہ چلتی گئی۔ ایسے موسم میں سیر کرنا اسے بہت پسند تھا۔ لاہور میں اسے یہ موسم نصیب نہیں تھا۔ لندن میں اپنے مختصر قیام کے دوران وہ برف باری میں ضرور سنسان سڑکوں پر لمبی لمبی سیریں کیا کرتی تھی مگر لندن کی سڑکوں کو کوہ مری کے چیڑھ کے درختوں کی سبز الائچی ایسی مہک میّسر نہیں تھی۔ چیڑھ کے درخت اگرچہ برف پوش تھے مگر ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے شبانہ کو بڑی رومانٹک اور لطیف خوشبو آرہی تھی۔ یہ خوشبو بے حد پاکیزہ اور شفاف تھی جو شبانہ کے خیالات پر جمے ہوئے شہر کے مادی زنگ کو اتار رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی درخت انسان کے پرانے ساتھی ہیں۔

انسان نے انہی درختوں میں کبھی اپنے ارتقاء کا سفر شروع کیا تھا تب وہ درختوں کی زبان اور درخت اس کی زبان جانتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے، دونوں ایک دوسرے کے احساسات سے واقف تھے۔ پھر انسان درختوں سے بچھڑ گیا۔ اس نے شہر آباد کر لئے مگر وہ درختوں کو نہیں بھولا۔ اس نے اپنے پتھروں کے مکانوں کے آگے بھی درخت لگا لئے لیکن اب وہ درختوں کی زبان نہیں جانتا تھا۔ درخت بھی اسے نہیں پہچانتے تھے کیونکہ وہ بہت بدل گیا تھا۔ کبھی وہ درختوں سے ہاتھ ملا کر آگے بڑھتا تھا لیکن اب وہ ان کی طرف دیکھے بغیر اپنے پریشان خیالات کے بھنور میں الجھا آگے گزر جاتا ہے۔

شبانہ نے دستانہ اُتار کر چیڑھ کے ایک درخت کے تنے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اسے تنے میں درخت کے دل کی دھڑکن محسوس ہوئی۔ چیڑھ کی بلند و بالا شاخوں نے ایک جھکولا سا کھایا۔ شاخوں پر سے برف پھسل کر شبانہ کے اُوپر گری۔ ہوا تیز ہوگئی تھی۔ شبانہ نے دستانہ پہنتے ہوئے نیچے وادی کی طرف دیکھا۔ وادی بادلوں میں ڈوب گئی تھی۔ اُوپر کی جانب تیز ہواؤں کے تھپیڑے آنے لگے پھر

بادلوں میں گرج کر آواز سنائی دی۔ شبانہ نے سوچا کہ شاید طوفان آرہا ہے اسے واپس چلنا چاہیئے وہ واپس مڑی ہی تھی کہ اسے سرمئی بادلوں کی تاریک سرد دھند نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شبانہ کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ اپنا ہاتھ چہرے پر رکھ کر وہیں کھڑی ہو گئی۔ وادی کی جانب سے تیز ہواؤں کی چیخیں سنائی دینے لگیں جو شبانہ کے جسم سے ٹکرا کر اُوپر چشموں کی طرف نکل جاتیں۔ شبانہ کو اپنے چہرے پر برف کے گالوں کی نمی محسوس ہوئی۔ برف گرنے لگی تھی۔ یہ شاید برف کا طوفان تھا۔ شبانہ پہاڑی کی دیوار کے ساتھ ساتھ پیچھے کی طرف چلنے لگی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی دوسری جانب وادی کی خطرناک ڈھلان ہے۔

اس نے چہرے پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ سرمئی دھند میں برف کے گالے چکراتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ ہوائیں چیخ چیخ کر چیڑھ کے درختوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ درختوں کی شاخیں جھکتی تو ان پر رکی ہوئی برف آبشار کی طرح نیچے گرنے لگتی۔ دن کی روشنی اندھیرے میں بدل گئی تھی۔ شبانہ کو لگ رہا تھا کہ وہ بادلوں میں سفر کر رہی ہے اسے ایک قدم آگے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ اندازے سے چل رہی تھی۔ تیز مسخ بستہ ہواؤں کے جھکڑوں میں اس کے قدم اکھڑنا شروع ہو گئے۔

شبانہ کا دل خوف سے ڈوبنے لگا۔ کہیں تیز ہوائیں اسے اٹھا کر وادی کی جانب نہ پھینک دیں۔ اس نے ایک درخت کو پکڑ لیا۔ طوفانی ہوائیں اس کی آنکھوں کو کھلنے کا موقع نہیں دے رہی تھیں۔ اب شبانہ پچھتانے لگی کہ وہ ایسے موسم میں گھر سے کیوں نکل آئی اسے غزالہ کا بھی خیال آیا وہ اس طوفان کو دیکھ کر ضرور پریشان ہو رہی ہوگی۔

شبانہ ایک درخت سے دوسرے اور دوسرے درخت سے تیسرے درخت کو پکڑ پکڑ کر آگے بڑھنے لگی۔ آگے کوئی درخت نہیں تھا۔ یہاں پتھروں کے درمیان ' ایک تنگ سا راستہ اندر کی طرف چلا گیا تھا۔ شبانہ کو یہ جگہ محفوظ لگی اور وہ ٹیلے کی دیوار کے باہر نکلے ہوئے پتھروں کا سہارا لیتی قدم قدم چلنے لگی۔ برفباری اور

تیز ہواؤں کا طوفان زیادہ شدت اختیار کر گیا تھا۔ تنگ پتھریلے راستے پر ایک قدم کے بعد کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر بھی وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتی بڑھ رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے کوئی ایسی کھوہ یا چٹانی غار مل جائے جہاں وہ پناہ لے سکے۔ تنگ راستہ آگے جا کر بائیں طرف گھوم گیا۔ یہاں اپنے اوپر شبانہ کو چھوٹے شور مچاتے چیختے درختوں کے وجود کا احساس ہوا۔ وہ ایک درخت کو پکڑ کر ہانپنے لگی۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ وہ سرمئی بادلوں اور گرتی برف کی دھند میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگی۔

ہوا کے برق رفتار تھپیڑوں نے ایک پل کے لئے اس کی آنکھوں کے آگے سے دھند کو ہٹا دیا۔ شبانہ کو سامنے ایک کوٹھی کا گیٹ دکھائی دیا۔ اسے اور تو کچھ نہ سوجھا اس لمحے کو غنیمت جان کر شبانہ گیٹ کی طرف [illegible]۔ گیٹ لکڑی کا [illegible] فٹ اونچا تھا جو کھلا تھا۔ سامنے کوٹھی کی پتھر کی لوتھل سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جس کی دونوں جانب بڑے بڑے سنگین گملے رکھے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر یہ سارا منظر بادلوں کی سرمئی دھند میں ڈوب گیا۔

شبانہ کو پتھر کی سیڑھیاں نظر آچکی تھیں اس نے اندازے سے قدم آگے بڑھایا اور پتھر کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ بنگلہ بالکل خالی ہوگا اور وہ اس کے برآمدے میں یا اگر کوئی کمرہ کھلا ہوا تو اس کے اندر طوفان کے گزر جانے تک پناہ لے سکے گی۔ کوہ مری میں ہی خریدی ہوئی مضبوط چھڑی اس کے بہت کام آرہی تھی۔ سیڑھیاں زیادہ نہیں تھیں۔ وہ اوپر آئی تو اسے گرتی برف اور سرمئی دھند میں سامنے ایک بیضوی بنگلے کا خاکہ ابھرتا نظر آیا۔ اس کی ڈھلانی چھت پر برف جمی تھی۔ ایک پتلا سا راستہ پتھر کے گملوں کے درمیان سے ہوتا سامنے برآمدے تک جاتا تھا۔

شبانہ دوڑ کر برآمدے میں آگئی [illegible] ہوائیں [illegible] سردی شدید تھی۔ شبانہ [illegible] اندر کسی خالی [illegible] چاہتی [illegible]

کو آہستہ سے دھکا دیا اسے تعجب ہوا دروازہ اندر سے بند تھا۔ ممکن ہے چوکیدار نے دروازے اندر سے بند کر دیئے ہوں اور خود کسی کھڑکی یا باتھ روم کے دروازے سے نکل کر تالا لگا کر چلا گیا ہو۔

شبانہ دروازے کے ساتھ لگ کر اپنے آپ کو گرم اوورکوٹ میں سمیٹے کھڑی تھی۔ برف کے گالے ہوا کے تھپیڑوں کے ساتھ برآمدے تک آرہے تھے۔ کھڑے کھڑے سردی کے مارے اس کے دانت بجنے لگے۔ وہاں اسے کوئی نوکروں کا کوارٹر بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید کوٹھی کے پیچھے کوئی گیراج وغیرہ موجود ہو۔ وہ دروازے سے ہٹ کر چلنے لگی تو اسے اندر سے دروازے کی چٹخنی کھلنے کی آواز سنائی دی۔

شبانہ پر پہلا تاثر یہ ہوا کہ وہ ڈر گئی کہ خدا جانے اندر کون ہوگا۔ وہ وہاں رکنے کی بجائے بنگلے کی سیڑھیوں کی طرف لپکی اتنے میں پیچھے سے کسی نے بھاری سنجیدہ آواز میں کہا۔

"طوفان زیادہ ہے۔۔۔ اندر آجاؤ۔"

شبانہ ابھی برآمدے کے فرش کے کنارے پر ہی تھی اس نے پلٹ کر دیکھا ایک لمحے کے لئے اس کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ کمرے کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔ ادھ کھلے دروازے میں ایک دراز قد چوڑے شانوں والا آدمی کھڑا پائپ منہ میں لگائے دونوں ہاتھ گرم سواتی جبے کی جیبوں میں ڈالے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شبانہ اسے پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔ یہ وہی پراسرار اجنبی تھا۔ گلاب کے پھولوں، پائپ اور کافی کی ملی جلی خوشبو اور بانس کے جھنڈوں والا کمرے کے بیچ میں آبنوسی گول تپائی رکھی تھی جس پر کافی کا ٹن، پیالہ اور دو کتابیں پڑی تھیں۔ ایک شیشے کا چھوٹا سا گلدان بھی تھا جس میں گلاب کا باسی پھول سجا تھا۔ کمرے میں پائپ کے تمباکو اور کافی کی ملی جلی خوشبو پھیلی تھی۔ اجنبی پائپ ہاتھ میں لئے آتشدان کے قریب کارنس پر کہنی رکھے کھڑا شبانہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے

ہونٹوں پر ایک دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔ "بیٹھو۔۔۔ میں تمہارے لئے کافی بناتا ہوں۔"

شبانہ خاموشی سے جلتی آتشدان کی طرف بڑھی۔ اس نے اونی ٹوپی اور دستانے اتار دیئے۔ کمرے کی فضاء ایسی پرسکون اور نیم گرم تھی کہ شبانہ نے اوور کوٹ بھی اتار کر صوفے کی پشت پر رکھ دیا۔ صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ اب بھی کچھ ہچکچا رہی تھی۔ اجنبی نے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کیا تم کافی نہیں بناؤ گی؟ میں جانتا ہوں تم کافی بہت اچھی بناتی ہو۔"

شبانہ کچھ جھجھک بھی رہی تھی لیکن اسے اس فضاء میں ایک اپنائیت کا احساس بھی ہو رہا تھا جیسے وہ وہاں پہلے بھی کئی بار آچکی ہو۔۔۔ پھر اسے یہ سب کچھ ایک خواب کی طرح لگنے لگا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اجنبی ابھی تک، آتشدان کے سامنے آگ کی طرف رُخ کئے کھڑا تھا۔ شبانہ نے دیکھا کہ وہ ایک باوقار وجیہہ اور پرانے وینس شہر کے مہم جو سرداروں ایسی شخصیت کا مالک تھا۔ اس کا سر بڑا تھا، ماتھا چوڑا اور گھنے سیاہ بال اوپر جاکر گھنگھریالے ہوگئے تھے۔ کنپٹیوں پر بالوں نے ہلکی سفید رنگت اختیار کرنی شروع کر دی تھی۔ رنگ کھلتا ہوا تھا مگر اس میں شمالی کارتھیج کے جنگجو بہادروں ایسی پختہ سرخی تھی جو جنوبی علاقوں میں دشمن سے ایک مدت تک جنگ کرنے کے بعد لوٹے ہوں۔ شبانہ نے صوفے پر بیٹھنے کے بعد ایک گہرا سانس لیا اور بولی۔ "آپ کو میرا نام کس نے بتایا؟"

نیم گرم، پرسکون، بند کمرے کے باہر برف کا طوفان ابھی تک چیخ رہا تھا مگر اندر اس کی آواز بند کواڑوں اور بھاری پردوں کی وجہ سے بہت کم آرہی تھی۔ اجنبی آتشدان سے ہٹ کر شبانہ کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کا پائپ بجھ گیا تھا۔ اس نے لائٹر روشن کر کے پائپ روشن کیا اور گہری آواز میں کہنے لگا۔

"تمہارا نام مجھے اس وقت بھی معلوم تھا جب تم پیدا بھی نہیں

ہوئی تھیں۔"

شبانہ کو فضا اور زیادہ پراسرار اور افسانوی ہوتی محسوس ہوئی۔ کہیں وہ سچ مچ خواب تو نہیں دیکھ رہی؟ اس اجنبی نے ایسا جواب دیا تھا جو خوابوں میں ہی دیئے جاتے ہیں۔ اس جواب کا تعلق حقیقت کی دنیا سے بالکل نہیں تھا۔ شبانہ کو اپنے گرد روشنی کا ہالا سا منڈلاتا نظر آنے لگا۔ اس کی رگ و پے میں ایک سکون کی کیفیت تھی جیسے کوئی مسافر طوفانی سفر کے بعد اپنے مکان کے گرم کمرے میں آگیا ہو۔ شبانہ ایک لمحے کے لئے بھی کوئی گھبراہٹ یا اجنبیت محسوس نہیں کر رہی تھی۔ وہ کافی بنانے لگی۔ اس کی نگاہ کارنس کے اوپر دیوار پر لگی سنہری فریم والی آئل پینٹنگ کی طرف اٹھ گئی۔

وہ انگریزی ادب کی طالب علم تھی اور موسیقی اور مصوری کی تاریخ سے واقف تھی۔ اس نے تصویر کو پہچان لیا یہ ریفائیل کی تصویر تھی جس میں بیضوی چہرہ اور نازک گردن والی ایک ایسی عورت کو دکھایا گیا تھا جس کی آنکھیں افتخار اور انکسار سے لبریز تھیں۔ چہرے کے نقوش بے حد نازک اور حساس تھے۔ اس کے حسن میں ایک ایسی پاکیزگی اور وجدان تھا جو طویل مذہبی زندگی بسر کرنے کے بعد ہی میسر آتا ہے۔ شبانہ کے سامنے بیٹھے ہوئے پراسرار اجنبی نے شبانہ کو تصویر کا جائزہ لیتے دیکھا تو پائپ کا ہلکا سا کش لگانے کے بعد بولا۔

"تم جو سوچ رہی ہو وہ ٹھیک ہے۔۔ یہ ریفائیل کی ایک مشہور تصویر کا پرنٹ ہے۔ میں نے ویانا سے منگوایا تھا۔ تم اس تصویر والی عورت کو پہچانتی ہو؟"

شبانہ نے کافی بناتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

"میں اسے کیسے پہچان سکتی ہوں؟"

اجنبی نے اپنی پیالی اٹھالی۔۔ پائپ تپائی پر گلدان والے مرجھائے ہوئے گلاب کے پھول کے پاس رکھ دیا اور بولا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو اس عالم میں تمہارا کسی کو بھی پہچاننا ناممکن ہے۔"

ماحول مزید پراسرار ہو گیا۔ اس اجنبی کی باتیں اس کی شخصیت کی طرح سمجھ میں نہ آنے والی اور افسانوی تھیں۔ وہ دیومالائی انداز میں باتیں کر رہا تھا۔ شبانہ کو اپنے خواب میں دیکھے ہوئے فلائنگ ڈچ مین لوکاشی کی دیکھی ہوئی شکل یاد آگئی جب وہ خاموش سمندر میں کھڑے اس کے ویران بادبانی جہاز پر اس سے ملنے گئی تھی تو وہ بالکل ایسا ہی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس نے بادبانی جہاز میں قدیم زمانے کا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں بربط تھا جبکہ یہاں وہ سواتی جبے میں تھا اور پائپ پی رہا تھا۔ شبانہ اگرچہ خوابوں کی دنیا میں رہنا پسند کرتی تھی لیکن وہ ان خوابوں کے کردار حقیقت کی دنیا میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے خیال میں ایسا ممکن بھی نہیں تھا۔ باہر طوفان برف و باراں اسی طرح جاری تھا۔ اس نے پراسرار اجنبی سے براہ راست سوال کر دیا۔

"میں آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہوں گی کہ آپ کا نام کیا ہے؟ آپ اصل میں کون ہیں اور آپ نے شمیز ریستوران میں مجھے گلاب کا مرجھایا ہوا پھول کیوں بھیجا تھا۔"

ایک لمحے کے لئے اس آدمی نے شبانہ کے خوبصورت آنکھوں والے چہرے کو غور سے دیکھا پھر ذرا سا آگے جھک کر بولا۔

"میں ان میں سے تمہارے کسی ایک سوال کا جواب بھی نہیں دے سکتا۔ وقت آنے پر تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

پھر وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ بھاری پردہ ایک طرف ہٹا کر شیشے میں سے باہر دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے وہیں خاموش کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا آتشدان کے پاس آیا اور تپائی پر سے ایک کتاب اٹھا کر اس کے ورق الٹنے لگا۔ ورق الٹتے ہوئے ایک سوکھا ہوا پھول نیچے گر پڑا۔ اس نے پھول اٹھایا۔ شبانہ نے دیکھا کہ کتاب میں دبا کر رکھنے سے سرخ پھول خشک ہو چکا تھا۔ اجنبی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے شبانہ کی طرف نگاہیں اٹھا کر کہا۔

"تم مجھے راحیل کہہ کر بلا سکتی ہو۔۔۔ یہ میرا نام نہیں ہے۔۔۔ تمہارا نام بھی وہ نہیں ہے جس نام سے تمہیں سب پکارتے ہیں۔ اس سرخ گلاب کی خشک پنکھڑیوں کو بھی تم نہیں پہچان سکو گی جو کبھی شبنم کی نمی سے تر و تازہ تھیں اور اندلس کے ایک دور افتادہ اناروں کے باغ کی ایک بارہ دری میں تم نے مجھے دیا تھا۔"

شبانہ نے چونک کر اجنبی کو دیکھا اس کے چہرے پر آتشدان میں جلنے والی آگ کی دھیمی دھیمی چمک ایسے لگ رہی تھی جیسے مغربی افق پر سورج غروب ہو رہا ہو۔ شبانہ نے پیالی میز پر رکھ دی۔

"آپ جو باتیں کر رہے ہیں وہ میری سمجھ سے باہر ہیں۔" پراسرار اجنبی کو اب سے ہم راحیل کے نام سے ہی یاد کیا کریں گے۔ راحیل نے سرگوشی ایسی آواز میں کہا۔

"دنیا میں صرف تم ہی ایک ایسی ہستی ہو جس کو میری باتیں سمجھنا چاہئیں۔ مجھے اور کسی ذی روح سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرا کسی ذی روح سے سوائے تمہارے کوئی ناطہ بھی نہیں ہے۔"

شبانہ نے پوچھا۔۔ "لیکن میرا آپ سے کیا ناطہ ہے میں نے زندگی میں مشکل سے دو تین بار ہی دیکھا ہو گا اور آج پہلی بار آپ سے بات کرنے کا موقع ملا ہے۔"

راحیل نے کہا۔۔۔ "لیکن میں نے تم سے کئی بار باتیں کی ہیں۔ آج نہ وہ باغ باقی رہے ہیں نہ وہ درخت جن کی شاخوں میں صبح کی نرم و پاکیزہ ہوا رحمدلی سے سرگوشیاں کرتی گزرا کرتی تھی اور جن کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہم میٹھے چشمے کے کنارے بیٹھے باتیں کیا کرتے تھے۔ ریت ان زمرد ایسے باغوں کو اڑا کر لے گئی ہے۔ آوازیں خلاء کے ارتعاش میں کھو گئی ہیں مگر مجھے معلوم تھا کہ تم آؤ گی۔۔۔ ضرور آؤ گی۔۔۔ میں تمہارے ہی انتظار میں اس روز لائبریری کی جافری میں میز پر کتاب کھولے بیٹھا تھا۔۔۔ کیا تمہیں کچھ یاد آ رہا ہے؟ کیا تم غرناطہ شہر کے اس پائیں باغ کو دیکھ رہی ہو جس کے محرابی دروازے پر سرخ گلاب کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔

پھر راحیل نے جذباتی انداز میں سوکھے پھول کی پنکھڑیوں کو شبانہ کے چہرے کے قریب لاتے ہوئے کہا۔

"یہ اسی محرابی دروازے کی بیل کا سرخ گلاب ہے کیا اس کی اداس مہک تمہیں اپنی دلگداز آواز میں خاموشی کا کوئی گمشدہ گیت سناتی محسوس نہیں ہوتی۔"

شبانہ اٹھ کھڑی ہوئی اس کو اچانک کچھ بے چینی سی محسوس ہونے لگی تھی خواب کے کسی چہرے کو اس نے آج تک دن کی روشنی میں نہیں دیکھا تھا۔ ان پراسرار دھند میں ڈوبی ہوئی آوازوں کو کبھی حقیقت کی دنیا میں دوبارہ نہیں سنا تھا۔ اس نے دستانے پہنے، سر پر اونی ٹوپی اوڑھی اور کوٹ پہنا اور چھتری اٹھا کر بولی۔

"میں جا رہی ہوں۔۔۔ آپ کی میزبانی کا شکریہ۔"

راحیل صوفے پر ہی بیٹھا رہا۔ پائپ اس کے ہاتھ میں تھا۔ آنکھیں شبانہ کے مضطرب چہرے پر جمی تھیں اس نے آہستہ سے کہا۔

"طوفان تھم گیا ہے۔۔۔ تم واپس اپنے گھر پہنچ جاؤ گی۔۔۔ خدا حافظ!"

اس کے بعد شبانہ نے کوئی بات کی اور نہ اس پراسرار اجنبی راحیل نے کوئی لفظ بولا۔ شبانہ تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ سرد یخ آلود ہوا اس کے چہرے سے ٹکرائی۔ طوفان تھم گیا تھا مگر ہلکی ہلکی برف اب بھی گر رہی تھی۔ چاروں طرف نرم سفید برف کی چادر بچھی تھی۔ درخت برف میں ڈوبے ہوئے تھے۔ شبانہ لان کے گملوں میں سے گزرتی، پتھر کی سیڑھیاں اتر کر برف پوش پگ ڈنڈی پر آ گئی۔ ابھی شام نہیں ہوئی تھی۔ دن کی روشنی سرمئی بادلوں سے بھی جھک رہی تھیں۔ شبانہ گرتی برف میں واپس کوٹھی پر آئی تو عامر اس کی طرف لپکا۔

"باجی! مائی گاڈ! خدا کا شکر ہے آپ کی شکل دیکھی۔ باجی غزالہ کا تو غم کے مارے برا حال ہو گیا ہے۔ آپ طوفان میں کہاں تھیں۔"

شبانہ کپڑوں پر سے برف جھاڑتی سیدھی غزالہ کے بیڈ روم میں گئی۔ غزالہ

نے شبانہ کو دیکھا تو اس کی جان میں جان آئی۔ ناراض ہو کر ذرا سی ڈانٹ کے ساتھ کہنے لگی۔

"اگر تم نے ایسے ہی مجھے پریشان کرنا ہے تو میں کل ہی لاہور واپس چلی جاؤں گی۔ تم کہاں تھیں؟ میں نے کہا نہیں تھا طوفان آنے والا ہے مت جاؤ۔"

شبانہ نے کوٹ اتار کر پلنگ پر پھینکا اور اپنی بڑی بہن کو پیار کرتے ہوئے بولی۔ "آپی! مجھے کیا خبر تھی کہ اتنا زبردست طوفان آ جائے گا۔ وہ تو خدا کا شکر ہوا کہ اوپر چشموں تک ہی گئی تھی۔ طوفان نے تو اچانک گھیر لیا۔ خوش قسمتی سے ایک خالی کوٹھی کا گیراج نظر آ گیا بس وہیں گھس کر بیٹھ گئی۔ اب طوفان تھما تو وہاں سے نکلی ہوں۔ آئی ایم سوری آپی! اب تم سے اجازت لئے بغیر کبھی بھی باہر نہیں جاؤں گی۔ اب خوش ہو جاؤ پلیز!"

غزالہ تو شبانہ کو دیکھتے ہی خوش ہو گئی تھی۔ جب شبانہ نے اسے یقین دلایا کہ وہ آئندہ اس کی مرضی کے بغیر کہیں باہر نہیں جائے گی تو اسے اور زیادہ اطمینان ہو گیا۔ شبانہ نے اپنے ہاتھ سے سیلون کی چائے بنا کر غزالہ کو دی۔ دونوں بہنیں بیٹھ کر چائے پینے اور باتیں کرنے لگیں۔ شبانہ کی آنکھوں کے آگے پراسرار راحیل کا ... اور وہ نیم گرم کمرہ گھوم رہا تھا جہاں آتشدان میں آگ روشن تھی اور فضا میں ... کے تمباکو اور کافی کی خوشبو میں باسی گلاب کے پھولوں کی مہک گھل مل رہی تھی اور جہاں تھوڑی دیر پہلے بیٹھی وہ اس وجیہہ اور پراسرار آدمی سے باتیں کر رہی تھی بلکہ اس کی دیو مالائی باتیں سن رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی کیا یہ سچ مچ کوئی خواب کی دنیا کا آدمی ہے؟ کیا یہ تاریخ کے اوراق سے نکل کر ہماری جیتی جاگتی تلخ ترش اور شیریں دنیا میں آ گیا ہے یا یہ سب کچھ محض میرا وہم ہے۔ ممکن ہے میں نے کچھ بھی نہ دیکھا ہو۔ کسی اجنبی سے بات نہ کی ہو۔ کسی نے مجھے گلاب کا پھول پیش نہ کیا ہو؟

ریفائیل کی خوبصورت تصویر والا کوئی بھی بنگلہ پہاڑی کے اوپر موجود نہ ہو۔

فرائیڈ نے اپنی کتاب میں خوابوں کے باب میں لکھا ہے کہ کبھی کبھی ہم دوہری زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔ یہ دوسری زندگی خواب کی دنیا سے نکل کر ہمارے اوپر طاری ہو جاتی ہے۔ ہم جو کچھ کر رہے ہوتے ہیں وہ حقیقت نہیں ہوتی لیکن وہ خواب بھی محسوس نہیں ہوتا۔ شبانہ نے اپنے ان خیالات کو جھٹک دیا۔ وہ ایسا سوچنا نہیں چاہتی تھی وہ صرف اس قسم کے خواب دیکھنا چاہتی تھی۔ ان کی روشنی میں وہ ان خوابوں کی خوشبوؤں اور رنگوں کے ساتھ حقیقت کی زندگی بسر کرنا چاہتی تھی لیکن اسے یوں لگ رہا تھا کہ خوابوں نے اس کے لاشعور کی دنیا سے نکل کر دن کی روشنی میں اس کے ساتھ سفر کرنا شروع کر دیا ہے۔ خواب کے کردار اس کی اصل زندگی میں داخل ہونے لگے ہیں۔

شبانہ نے اسی وقت خیال کر لیا کہ وہ کل کسی وقت پہاڑی کے اوپر والی اس کوٹھی کو ضرور جا کر دیکھے گی کہ وہاں اصل میں کون رہتا ہے۔ کیا یہ محض اس کا وہم تھا۔ دن کے وقت جاگتے میں دیکھا ہوا خواب تھا یا واقعی یہاں وہ اجنبی شخص رہتا ہے۔

رات کو وہ دیر تک اپنے بیڈ روم میں جاگتی رہی۔ اسے بار بار فلائنگ ڈچ مین کی دیو مالائی کہانی کا خیال آ رہا تھا۔ مگر وہ تو ایک افسانوی کردار تھا۔ شبانہ تھارو کی "والڈن" کھول کر ورق گردانی کرنے لگی۔ اس کتاب نے دوبارہ شبانہ کو پرسکون سمندر میں فلائنگ ڈچ مین کے بادبانی جہاز کی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ وہ جیسے ہوا کی لہروں پر اپنے آپ فضا میں اڑی جا رہی تھی۔ اس نے خالی سمندر میں جہاز کو دیکھا جس کے بادبان مستول سے لپٹے ہوئے تھے اور جو بے معلوم انداز میں جھول رہا تھا۔ باورچی خانے سے عامر کی بلند آواز نے اس کے خواب انگیز خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

عامر نے خانساماں کو آواز دی تھی۔ شبانہ نے کتاب بند کر کے ریکارڈ پلیئر کا بٹن آن کر دیا۔ بیڈ روم کی نیم گرم خوشبودار فضا میں ... کی ... سمفنی کے درد بھرے سر ابھرتے چلے گئے۔ یہ گویا ان ... کی ...

دھیمی سسکیوں کی آوازیں تھیں جو نظر نہ آنے والی خزاں کی ہواؤں کی طرح سوکھے پتوں کو اپنے دامن میں تمیٹتی شبانہ کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھیں۔ خزاں کی ان غم انگیز ہواؤں کے ساتھ ہی شبانہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

دوسرے روز ناشتے کے بعد اس نے غزالہ سے کہا کہ وہ ڈاک خانے تک جا رہی ہے۔ کوٹھی سے نکلتے ہی اس کے قدم اپنے آپ پہاڑی والے بنگلے کی طرف اٹھنے لگے۔ برف باری رات ہی کسی وقت ہی رُک گئی تھی۔ نیلے آسمان پر دھوپ چمک رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جس کی وجہ سے سردی میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ ٹیرس پر بنے ہوئے گول بنگلے کی ڈھلانی چھت، پتھروں کی دیوار اور لکڑی کے گیٹ پر برف کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ گیٹ بند تھا۔ اس نے اسے کھولا اور تنگ راستے سے گزرتی بڑے بڑے سنگین گملوں کے قریب سے ہو کر وہ برآمدے میں آ گئی۔ آتش دان والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ اس نے دروازہ کو دھکیلا دروازہ کھل گیا۔ کمرہ خالی تھا۔ آتش دان بجھا ہوا تھا۔ آتشدان کے پاس وکٹورین عہد کے پرانے صوفے اور آبنوسی تپائی ویسے ہی پڑی تھی۔

شبانہ کمرے میں داخل ہو گئی کارنس کی دیوار پر ریفائیل کی بنائی ہوئی پینٹنگ موجود نہیں تھی۔ کمرے کی فضا ٹھنڈی تھی۔ تپائی پر صرف چھوٹا بلوریں گلدان پڑا تھا جس میں گلاب کا باسی پھول سر جھکائے ہوئے تھا۔ شبانہ کو برآمدے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک ادھیڑ عمر چوکیدار کمبل کی بکل مارے اندر آ گیا۔

"بی بی جی کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

شبانہ نے پوچھا۔" وہ صاحب جو یہاں رہتے تھے کہاں ملیں گے"، تو چوکیدار نے کہا۔" وہ تو چلے گئے بی بی جی۔"

"کیوں؟" شبانہ کے منہ سے اپنے آپ یہ سوال گیا۔

چوکیدار نے گردن ایک طرف جھکاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں جی۔"

شبانہ نے مزید استفسار کیا تو چوکیدار نے کہا" میں چھ برس سے یہاں چوکیداری کر رہا ہوں جی۔ مجھے اپنے مالک کا نام بھی معلوم نہیں۔ وہ برف کے موسم میں دو تین دن کے لئے آتے ہیں اور پھر چلے جاتے ہیں۔ انہیں ملنے بھی یہاں آپ سے پہلے کبھی کوئی نہیں آیا۔"

"کیا یہ.... یہ بنگلہ ان کا اپنا ہے بابا؟" شبانہ نے پوچھا۔

" مجھے یہ بھی معلوم نہیں بی بی جی! انہوں نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں کی میرا کام اس بنگلے کی خبر گیری کرنا ہے۔ مجھے ہر ماہ میری تنخواہ کا منی آرڈر مل جاتا ہے۔"

شبانہ نے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں ایک تصویر لگی تھی... وہ... کہاں چلی گئی؟"

چوکیدار نے کہا" جی یہ تصویر مالک برف کے سیزن میں اپنے ساتھ لاتے ہیں اور ساتھ ہی لے جاتے ہیں۔ آپ کہاں سے آئی ہیں بی بی جی" شبانہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ گلدان میں لگے باسی پھول کو ایک نظر دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گئی....

. . . . .

شبانہ بوجھل قدموں سے ویران پہاڑی کوٹھی کے ٹیرس سے گزر کر لکڑی کے چھوٹے سے جنگلے کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ کوہ مری کا نیلا آسمان چمکیلی دھوپ میں شیشے کی طرح شفاف تھا۔ ڈھلانوں پر برف کی تہہ بچھی تھی۔ چیڑھ کے درختوں کی ٹہنیاں ہلکی سرد ہوا میں ہلتیں تو ان پر رکی ہوئی برف نیچے گرنے لگتی۔ شبانہ نے ایک اداس نگاہ ویران کوٹھی پر ڈالی۔ جانے کیوں اسے لگا جیسے وہ اپنی سنہری خوشبودار انمول یادوں کا ایک قیمتی حصہ اس خالی کوٹھی میں آتشدان کے پاس چھوڑ آئی ہے۔

جہاں کل برف باری کے طوفان میں دھیمی دھیمی آگ جل رہی تھی۔ نیم گرم فضاء میں پائپ کے تمباکو، سرخ گلاب اور شبانہ کی بیش قیمت خواب انگیز پرفیوم کی ملی جلی مہک رچی ہوئی تھی اور پراسرار اجنبی آتشدان کے کارنس پر کہنی رکھے اس سے خواب کی دنیا کی باتیں کر رہا تھا۔ شبانہ کو وہ باتیں حقیقت کے بہت قریب محسوس ہو رہی تھیں اس لئے کہ وہ خود خوابوں کی دنیا کی رہنے والی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ خواب کی دنیا ہی اصل دنیا ہے جو ہماری ہے جس سے ہمارا ازلی اور ابدی رشتہ ہے۔ ہم پیدا ہونے سے پہلے اسی دنیا میں تھے اور مرنے کے بعد واپس اسی دنیا میں چلے جاتے ہیں۔ ایک ناپیدا کراں ازل اور ایک لامحیط ابد کے درمیان ساٹھ ستر سال کی حقیقی زندگی کا وقفہ کیا حیثیت رکھتا ہے اور کسے معلوم ہے کہ یہ

زندگی حقیقت ہے بھی کہ نہیں؟ ممکن ہے جسے ہم حقیقت سمجھ رہے ہیں مرنے کے بعد ہمیں معلوم ہو کہ وہ تو خواب تھا اصل زندگی تو اب شروع ہوئی ہے۔ شبانہ کو پراسرار راحیل کی باتیں یاد آنے لگیں اس کا اصل نام بھی شبانہ کو معلوم نہیں تھا اس نے کہا تھا "میرا کوئی نام نہیں۔ . . تم مجھے راحیل کہہ کر بلاسکتی ہو۔"

شبانہ کو وہاں کھڑے کھڑے سردی محسوس ہونے لگی۔ وہ کوٹھی کے تنگ راستے سے نکل کر اپنے کاٹیج کی طرف آہستہ آہستہ چلنے لگی جہاں اس کی بیمار بڑی بہن غزالہ یقیناً اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ چیڑھ کے نیم برف پوش درختوں کے نیچے ٹھنڈک اور عجیب سی دارچینی کی دھیمی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ شبانہ نے اونی مفلر سے اپنے سرخ کان ڈھانپ رکھے تھے۔ اس کے کانوں میں جیسے کوئی کیٹس اور ورڈز ورتھ کی نظموں کی سطریں سرگوشیوں میں پڑھ رہا تھا۔

اس کی بیمار بڑی بہن غزالہ اپنے بیڈ روم میں بستر پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ شبانہ کو دیکھا تو کتاب پرے رکھ دی اور بولی "باہر تو بڑی سردی ہوگی شبو؟" شبانہ نے مفلر اتار کر کرسی کے اوپر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں باجی! برف باری کے بعد جب دھوپ نکلتی ہے اور سردی زیادہ ہو جاتی ہے اور اب تو ہوا بھی چلنے لگی ہے۔" غزالہ نے ریشمی کمبل کو ذرا سا اوپر کھینچتے ہوئے کہا "میرا جی چاہتا ہے آج سمیز ریستوران میں کافی پئیں۔ . . تم میرے ساتھ چلو گی نا؟"

"کیوں نہیں آپی۔" شبانہ نے اپنی روگی بڑی بہن کے پاس پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "میں تو خود چاہتی ہوں کہ تم کھلی ہوا میں تھوڑا باہر نکلو۔ . . اور پھر اب تو تمہاری صحت پہلے سے بہت اچھی ہو گئی ہے۔"

غزالہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور شبانہ کی طرف شفقت اور محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ اسے شبانہ سے بہت پیار تھا۔ اس کی ایک ہی تو بہن تھی۔ اسے یاد تھا جب شبانہ چھوٹی سی تھی اور وہ اسے ساتھ لے کر کینال بینک والی نہر پر سیر کے لئے اپنے ساتھ لے جایا کرتی تھی۔ اس نے کہا "شبو! مجھے لگتا ہے

کہ میں اندر سے خالی ہو گئی ہوں... اگر مجھے کچھ ہو گیا تو...."

شبانہ نے بے اختیار غزالہ کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا "آپی! پھر کبھی ایسی بات منہ سے نہ نکالنا... تم ہزار سال تک زندہ رہو گی... تم بالکل ٹھیک ہو... بس اپنے دل کو خوش رکھو... دیکھو... میں تمہارے ساتھ ہوں پھر تم ایسے خیال دل میں کیوں لاتی ہو؟ ٹھہرو میں تمہارے بالوں میں کنگھی کرتی ہوں۔" شبانہ کو کنگھی نہ ملی تو وہ سنگھار میز سے برش اٹھا کر غزالہ کے بالوں پر پھیرنے لگی۔ وہ بھی اپنی بڑی بہن سے بہت پیار کرتی تھی۔ بہن کے پیار کو شاید دنیا کا کوئی بھائی اور دنیا کی کوئی بہن پوری طرح سے نہیں سمجھ سکتی۔ شبانہ اپنی بڑی بہن کے بالوں پر برش پھیرتے ہوئے دل میں اس کی طویل زندگی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ سہ پہر کو اس نے غزالہ کو خوب اچھی طرح سے گرم کپڑے پہنائے، سر پر اونی ٹوپی اور گلے میں گرم مفلر لپیٹا اور اسے ساتھ لے کر مال روڈ پر سمیز کی طرف چل پڑی۔

موسم بالکل صاف تھا، دھوپ ماند پڑ رہی تھی، ہلکی ہلکی سرد ہوا صبح سے یکساں رفتار کے ساتھ چل رہی تھی۔ دونوں بہنیں برف پوش رستوں پر سنبھل سنبھل کر آہستہ آہستہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے مال روڈ پر آ گئیں۔ مال روڈ کو درمیان سے برف صاف کر کے خشک راستہ بنا دیا گیا تھا۔ شبانہ نے سمیز ریستوران کی جہازی کھڑکیوں کو دیکھا۔ اس کے دل میں ایک موہوم سی خواہش ضرور تھی کہ شاید سمیز میں پراسرار اجنبی راحیل سے ملاقات ہو جائے۔ برف آلود سردی کی وجہ سے سمیز میں اکا دکا گاہک ہی بیٹھے کافی وغیرہ پی رہے تھے۔ دونوں بہنیں کونے والی کھڑکی کے پاس بیٹھ گئیں۔ سامنے گرجا گھر کا صحن خالی تھا۔ شبانہ نے کریم کافی اور کچھ سینڈوچز منگوائے۔ غزالہ لمبے گرم کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کرسی سے ٹیک لگائے بیٹھی اپنی چھوٹی بہن کو کافی بناتے دیکھ رہی تھی پھر ایک نظر ویران سڑک پر ڈالی اور کہنے لگی۔

"شبو! امی تمہاری شادی کے بارے میں بڑی پریشان رہتی ہیں۔"

شبانہ کا ہاتھ پیالی میں چمچ ہلاتے، ایک لمحے کے لئے رک گیا... پھر اس نے گرم خوشبودار کافی کی پیالی اپنی بہن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپی! جب تک میں بی اے نہیں کر لیتی کیسے شادی کر سکتی ہوں۔"

غزالہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے کافی پینے لگی۔ نیچے سڑک پر ایک آدمی سرخ پھولوں کا بڑا سا گلدستہ تھامے گزر گیا۔ شبانہ کو گلاب کے سرخ پھول یاد آ گئے۔ مگر اسے پائپ کے تمباکو کی خاص خوشبو محسوس نہ ہوئی۔ غزالہ کہہ رہی تھی۔ "اس برس تم بی اے کر لو گی... میری شادی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... امی اور ابو تمہاری ذمہ داری ادا کر دینا چاہتے ہیں۔ ظفر برا لڑکا نہیں ہے اپنا خون ہے اور پھر امریکہ میں..." شبانہ نے کافی کی پیالی میز پر رکھ دی اور کہا۔

"آپی! پلیز! کوئی اور بات کرو... وہ دیکھو گرجا گھر کے پیچھے ٹیرس پر جو کوٹھی ہے اس میں میری ایک سہیلی ایک بار آ کر رہی تھی... وہ کہتی تھی کہ یہاں بھوت رہتے ہیں۔"

غزالہ نے جلدی سے کہا۔ "خدا کے لئے بھوتوں کی بات نہ کرو... مجھے بھوتوں سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

شبانہ شرارت سے مسکرانے لگی۔ غزالہ نے شبانہ کو مسکراتے دیکھا تو بولی۔

"شبو! میں چاہتی ہوں تم ہمیشہ مسکراتی رہو... ہمیشہ خوش رہو تمہیں کبھی کسی کی نظر نہ لگے۔" "اگر تم یہ چاہتی ہو آپی تو خدا کے لئے امی ابو کو کسی طرح سمجھاؤ کہ میری شادی ظفر سے کرنے کا خیال دل سے نکال دیں۔ میں اس کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ سکوں گی۔"

غزالہ نے شبانہ کا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔ "آخر تمہیں اس سے نفرت کیوں ہے؟ وہ اتنا برا لڑکا نہیں ہے اس میں کوئی عیب بھی نہیں ہے... بس کاروباری قسم کا ہے اور تمہاری طرح شاعرانہ مزاج کا نہیں ہے... اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہوتی، شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

شبانہ نے کسی قدر جھنجلا کر کہا۔ "شادی کے بعد کبھی سب ٹھیک نہیں ہوتا آپ...

شادی کے بعد ہی ساری خرابیاں شروع ہوتی ہیں۔ ظفر کی اور میری طبیعت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کوئی نقطہ ایسا نہیں جہاں ہم کبھی متفق ہوں۔ وہ شمال کا رہنے والا ہے تو میں جنوب میں رہتی ہوں۔ پھر شادی کے بعد سب کیسے ٹھیک ہو جائے گا؟" غزالہ نے پیار سے شبانہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے جیسا تم کہو ویسے ہی ہوگا... میں امی ابو کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔"

شبانہ کا دل چاہا کہ وہ اپنی بہن کو بے اختیار گلے لگا لے... مگر ریستوران میں وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی... اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی بہن کا ہاتھ تھام لیا اور مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"آپی گھر میں ایک تم ہی ہو جو مجھے سمجھتی ہو... خدا کرے تمہیں میری عمر بھی لگ جائے۔" غزالہ نے شبانہ کو پیار سے جھڑک دیا۔ "ایسی فضول باتیں نہیں کیا کرتے"

شبانہ اطمینان سے کافی پینے لگی اس نے کئی بار ریستوران کی فضاء کا جائزہ لیا تھا۔ راحیل اسے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مال روڈ پر سے دو تین لمبے گرم اوورکوٹ والے آدمی گزرے تھے مگر ان میں راحیل کوئی نہیں تھا۔ شبانہ کا دل بوجھل سا ہو گیا۔ یہ شخص کس دنیا سے آتا ہے اور کس دنیا کو نکل جاتا ہے۔ حقیقت کی دنیا سے اس کا تعلق کس نسبت سے ہے؟

شبانہ کے ذہن میں ایسے ہی خیالات گردش کر رہے تھے کہ غزالہ نے ہاتھوں پر سیاہ دستانے چڑھاتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے اب گھر چلنا چاہیئے مجھے سردی لگنے لگی ہے۔"

کاٹیج میں آ کر غزالہ اپنے بستر پر گرم ہو کر نیم دراز ہو گئی۔ شام کو لاہور سے امی کا فون آ گیا۔ اس وقت شبانہ کا چھوٹا بھائی عامر بھی وہاں موجود تھا اور کیسٹ پلیئر پر ایک نئی کیسٹ چڑھا رہا تھا۔ غزالہ نے امی سے بات کی دوسرے کمرے سے شبانہ بھی آ گئی باری باری سب نے امی سے بات کی۔ امی ان کے بغیر اداس

ہو رہی تھیں۔ انہوں نے شبانہ سے بھی کہا کہ تم لوگوں نے کوہ مری میں کافی رہ لیا ہے برفوں کے موسم میں زیادہ رہنا ٹھیک نہیں لاہور میں بھی کافی سردی پڑ رہی ہے اس لئے اب واپس لاہور آ جاؤ۔ امی کے ٹیلی فون کے بعد غزالہ اداس ہو گئی۔ اس نے شبانہ سے کہا کہ واپس لاہور چلتے ہیں اب میرا یہاں بالکل دل نہیں لگتا۔

شبانہ اس امید پر وہاں مزید کچھ روز ٹھہرنا چاہتی تھی کہ شاید کبھی اور کسی وقت اچانک پراسرار اجنبی راحیل سے اس کی ملاقات ہو جائے.... لیکن غزالہ کی طبیعت کے پیش نظر اس نے بھی واپس لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اگلے روز انہوں نے لاہور جانے کا پروگرام بنا لیا۔ انہیں صبح سویرے کوہ مری سے روانہ ہونا تھا۔ نوکروں نے بڑا سامان رات کو ہی ویگن میں باندھ کر رکھا دیا تھا۔ شبانہ سورج نکلنے سے پہلے اٹھ بیٹھی۔ وہ لاہور جانے سے پہلے ایک نظر اس کاٹیج کو دیکھنا چاہتی تھی جہاں پراسرار راحیل نے اس کے ساتھ برف کے طوفان میں یادگار لمحات گزارے تھے۔

اس نے لمبا کوٹ پہن کر سر پر اونی ٹوپی اوڑھی اور چھتری ہاتھ میں لے کر چشموں کی طرف نکل گئی۔ سورج ابھی نہیں نکلا تھا مگر دن کا نورانی اجالا نیلے غبار کی شکل میں چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ کئی جگہ ڈھلانوں پر سے برف پگھل چکی تھی۔ فضاء میں چیڑھ کے درختوں کی مرطوب مہک رچی ہوئی تھی۔ وہ چشموں کے قریب سے ہوتی ہوئی ان اونچے اونچے چیڑھ کے درختوں میں آ گئی جہاں سے ایک تنگ راستہ اوپر چبوترے پر بنے ہوئے پرانے اور ویران کاٹیج کو جاتا تھا۔ لکڑی کا جنگلا بند تھا۔ پتھر کے بڑے بڑے گملوں میں ٹراپیکل پودے شبنم میں بھیگ رہے تھے۔ شبانہ جنگلے کے پاس جا کر رک گئی۔ سامنے برآمدہ سنسان تھا پیچھے کاٹیج کا دروازہ اسی طرح بند پڑا تھا۔ چوکیدار بھی وہاں نہیں تھا۔ شبانہ پتھر کی سیڑھیاں چڑھ کر شبنمی گھاس پر قدم رکھتی برآمدے میں آ گئی۔ اس نے بند

دروازے کو ذرا سا دھکیلا دروازہ اندر سے بند تھا۔ شبانہ نے شیشے کو ہاتھ سے صاف کر کے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ کمرے کے اندر کارنس کے پاس وکٹورین صوفہ خالی پڑا تھا۔ آتش دان میں آگ نہیں جل رہی تھی۔ دیوار پر ریفائیل کی پینٹنگ موجود نہیں تھی۔ کمرہ خالی، سرد اور ویران تھا۔ شبانہ نے ایک گہرا سانس بھرا اور سست قدم اٹھاتی واپس چل پڑی۔ چیڑھ کے درخت کی بلند شاخ پر سے کوئی پرندہ پھڑپھڑا کر اڑ گیا۔ شبانہ نے چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ پرندہ غوطہ لگا کر نیچے وادی میں اتر گیا تھا۔

شبانہ کا دل اداس ہو گیا۔ وہ بلند درختوں میں سے گزرتی واپس اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ سورج راستے میں ہی نکل آیا۔ ڈھلانوں اور چھتوں پر برف کے ٹکڑے طلوع ہوتے سورج کی سنہری روشنی میں سونے کی طرح چمکنے لگے۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ گاڑی میں غزالہ کے ساتھ بیٹھی سنی بینک سے نیچے اتر کر لاہور کی طرف جا رہی تھی۔

لاہور پہنچ کر شبانہ کی زندگی پھر اسی ڈگر پر چل نکلی۔ . . مگر وہ راحیل کے خیال کو ایک پل کے لئے بھی اپنے دل و دماغ سے نہ نکال سکی تھی۔ وہ گھر پر ہو، کالج میں نجمی کے ساتھ ہو یا پبلک لائبریری میں اس کے دل میں پراسرار راحیل کی سرگوشیاں لہراتی رہتی تھیں۔ اس کی عجیب بے نام سی یاد شبانہ کے ساتھ چلتی تھی۔ تقریباً ہر روز شبانہ ایک لائبریری جاتی اس خیال سے کہ شاید لائبریری کے کتابیں کونے کی جیفری کے پاس اسے راحیل کی وجیہ شکل نظر آ جائے مگر جیفری میں رکھی میز پر نہ اسے راحیل دکھائی دیتا، نہ گلاب کا سرخ پھول نظر آتا اور نہ ہی اسے پائپ کے تمباکو کی خیال انگیز خوشبو محسوس ہوتی۔

مارچ کے آخر میں لاہور میں بہار کا موسم شروع ہو گیا۔ شبانہ کے کالج میں آڑو اور انار کے جو پیڑ گراؤنڈ کے کنارے لگے تھے ان کی اوپر کو اٹھی ہوئی گہرے براؤن سوکھی ٹہنیوں پر ننھی ننھی کونپلوں کی سبز آنکھیں طلوع ہونے لگیں . . . پھر دیکھتے دیکھتے ان درختوں پر گلابی اور سرخ شگوفے نکل آئے۔ شبانہ کے

اپنے پرانے بنگلے کینال لاج کے لان میں کوٹھی کی دیوار کے ساتھ جو کھٹے کے پودے لگے تھے ان پر سفید کلیاں کھل گئیں اور ساری فضاء ان کی میٹھی مہک سے لبریز ہو گئی اب کھٹے کے پودے لوگ کوٹھیوں یا مکانوں کے باہر بہت کم لگاتے ہیں۔ پہلے یہ پودے بہت دیکھنے میں آتے تھے۔ کھٹا لیموں کی نسل کا پھل ہے اس کا چھلکا سخت اور سبز ہوتا ہے۔ ہم اسکول کے زمانے میں امرود کے کچالو پر اسے نچوڑ کر کھایا کرتے تھے۔ اب نہ وہ امرود رہے نہ کچالو اور نہ کھٹے اب تو لیموں کا رنگ بھی اتنا زرد ہو گیا ہے کہ دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ قریب المرگ ہے اور چہرے پر موت کی زردی چھا رہی ہے۔

لیموں اور کھٹے کو ملا کر ایک ایسی تیسری جنس تیار کی گئی ہے کہ جو نہ کھٹا ہے اور نہ لیموں۔ یہ تیسری جنس کا زمانہ ہے شاید. . لیکن میں واپس کھٹے کے پیڑوں کی طرف جاتا ہوں۔ جب ان پیڑوں پر بہار میں کلیاں کھلتی ہیں تو جہاں یہ پیڑ لگے ہوتے ہیں وہاں ارد گرد کا سارا علاقہ ان کی خوشبو سے بھر جاتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ درخت گہرے خوشبودار سانس لے رہے ہیں۔ شبانہ کی کوٹھی "کینال لاج" میں کھٹے کے علاوہ انار، ناشپاتی اور جنگلی گلاب کی بیل بھی دیوار پر چڑھی ہوئی تھی۔ کینال بینک کی نہر کے کنارے یوکلپٹس اور سفیدے کے درختوں پر بھی نئی نویلی پتیاں نکل رہی تھیں۔

ایک جگہ دھریک کے درختوں میں کاسنی رنگ کے پھولوں کے گچھے لٹکنے لگے تھے۔ ان کی اپنی گہری گہری میٹھی میٹھی خوشبو تھی۔ شبانہ اپنی گاڑی میں روزانہ کالج جاتی تو نہر کنارے جاتے ہوئے اسے طرح طرح کے پھولوں پودوں اور کلیوں کی خوشبوئیں آتیں۔ وہ کسی وقت گہرا سانس بھر کر سانس روک لیتی جیسے بہار کی خوشبوؤں کو اپنے بدن میں حل کر لینا چاہتی ہو۔ شبانہ کے کالج میں پارکنگ لاٹ کے پاس ہی سنبل کا ایک بہت تناور درخت تھا۔ اس درخت کی شاخوں میں سنبل کے سرخ پھول لالٹینوں کی طرح لٹکنے لگے تھے۔ شبانہ انہیں دیکھتی تو بے اختیار

اس کا جی ان درختوں سے پوچھنا چاہتا کہ سنبل کے گھنے درختو! تم اپنے سرخ پھولوں کے فانوس لٹکائے کس کا انتظار کر رہے ہو؟ وہ کون شہزادی ہے جس کو ہر موسم بہار میں تم اپنے سرخ پھولوں کی روشنی دکھاتے ہو؟ کیا اس کے بال سنہری ہیں؟ کیا اس کی آنکھیں نیلی ہیں؟ وہ جنوب سے آئے گی یا شمال سے؟ وہ ماضی کے کن ان دیکھے سمندروں کی دھند پار کر کے تمہارے پاس آئے گی؟ بہار گزر جاتی ہے سنبل کے سرخ پھول بجھ کر گر پڑتے ہیں۔ کاروں کے پہیے انہیں روند کر گزر جاتے ہیں اور سنبل کے درخت آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور اگلے موسم بہار کے انتظار میں چپ ہو جاتے ہیں۔ ایک روز لاہور کے آسمان پر موسم بہار کے بادل چھا رہے تھے ٹھنڈی خوشبودار ہوا چل رہی تھی۔ چار بجے ن جائے اس نے اپنی امّی اور بہن غزالہ کے ساتھ پی اور پھر گاڑی نکال کر نہر کے کنارے کنارے شمال کی طرف چل دی۔ کینال بینک والی نہر کی یہ خاموش پرسکون اور خیال انگیز چھوٹی سی سڑک شبانہ کی کمزوری تھی۔

اس زمانے میں ابھی یہ سڑک پکی نہیں ہوئی تھی اور اس پر ٹریفک بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ آگے جا کر نہر پر ٹاہلی یعنی شیشم کے درختوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ شیشم کا درخت پنجاب کی پہچان ہے۔ مارچ اپریل میں جب شیشم کی شاخوں میں زرد رنگ کا بور آتا ہے تو ایک عجیب سی دل پر گہرا اثر کر دینے والی مہک اڑنے لگتی ہے۔ کبھی جہلم چھاؤنی کی ٹاہلیوں کی مہک وزیر آباد تک جاتی تھی اب ڈیزل کا دھواں اسے جہلم میں ہی نگل لیتا ہے مگر ہم اس زمانے کا ذکر کر رہے ہیں جب کینال بینک والی نہر کی شمالی ٹاہلیوں کی خوشبو میں مست بھونرے اپنا راستہ بھول جاتے تھے۔

شبانہ کی گاڑی جب ان ٹاہلیوں کے نیچے سے گزری تو اسے گہری شگفتہ اداس خوشبو نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس نے گاڑی کی رفتار دھیمی کر دی اب اس خوشبو میں اس گھاس کی مرطوب مہک بھی شامل ہو گئی تھی جو نہر

کنارے آدھی پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ابھی اس علاقے میں آبادی کا سیلاب نہیں آیا تھا۔ دونوں جانب ہرے بھرے کھیت ہی کھیت تھے۔ شبانہ دھیمی رفتار سے گاڑی لیے جا رہی تھی کہ اسے ایک جگہ بڑی نہر میں سے ایک چھوٹی نہر نکل کر بائیں جانب کھیتوں میں جاتی نظر آئی۔ اس نہر کے ساتھ ایک بڑا ہی رومانٹک کچا راستہ بھی جا رہا تھا جس پر ٹاہلیوں کا سایہ تھا۔ یہ راستہ شبانہ کو اتنا اچھا لگا کہ اس نے بے اختیار گاڑی اس طرف موڑ دی۔ یہ چھوٹی سی پرسکون کچی سڑک نہر کے ساتھ ساتھ جاتی تھی۔ نہر کا رتیلا پانی بہتا ہوا آئینہ لگ رہا تھا۔ بادل جھک آئے تھے اور دن کی روشنی بادلوں کے ٹھنڈے سایوں میں سمٹ سی گئی تھی۔

جب شبانہ گاڑی چلاتی کافی آگے نکل آئی تو اچانک اس کی نظر ایک پرانی کوٹھی پر پڑی جس کے آدھے ٹوٹے ہوئے لکڑی کے گیٹ پر جا کر یہ سڑک ختم ہو جاتی تھی اور نہر کوٹھی کے پہلو سے ہو کر آگے نکل گئی تھی۔ شبانہ نے پہلے یہ کوٹھی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ یہ پرانی وضع کی ایک منزلہ بوسیدہ سی کوٹھی تھی جس کے گرد گول دیوار بنی ہوئی تھی۔ اس دیوار کو جنگلی بیلوں نے چھپا رکھا تھا۔

کوٹھی کے وسیع لان میں بھی شیشم کے اونچے اونچے درخت کھڑے تھے لان کچا اور ہموار تھا۔ شبانہ نے گیٹ کے پاس گاڑی لے جا کر اسے موڑا تو اچانک اسے ایک عجیب سی خوشبو محسوس ہوئی اس کا دل ایک پل کے لئے زور سے دھڑک اٹھا۔ اس نے گاڑی ٹاہلی کے درختوں میں ایک طرف کھڑی کر کے انجن بند کر دیا۔ اس نے غور سے پرانی کوٹھی کے برآمدے کی طرف دیکھا برآمدے کے محرابی ستونوں پر عشق پیچاں کی کاسنی پھولوں والی بیلیں بے ترتیبی سے چڑھی ہوئی تھیں۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ کوٹھی عرصے سے ویران پڑی ہے شبانہ گاڑی میں سے نکل کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی برآمدے کی محرابوں کے پاس آ گئی۔ برآمدے کے فرش پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ محرابی دیواروں پر بھی جگہ جگہ زرد گھاس اگ رہی تھی جس پر اسرار خوشبو نے شبانہ کو وہاں گاڑی

روک کرا نہر نے پر مجبور کر دیا تھا وہ برآمدے میں پھیلی ہوئی تھی۔ برآمدے کے سامنے ایک چھپر کے نیچے قدیم زمانے کی دو نشستوں والی گرد آلود پرانی بگھی کھڑی تھی جس کے پہیے مٹی میں دھنس رہے تھے۔ پراسرار خوشبو برآمدے کے مشرقی کونے کی جانب سے آرہی تھی۔

شبانہ نے برآمدے کے فرش کو غور سے دیکھا۔ اس پر کسی انسانی قدموں کے نشان نہیں تھے۔ شبانہ کونے کی طرف بڑھی۔ فرش کی گرد پر اس کے قدموں کے نشان پڑتے جا رہے تھے۔ وہ پراسرار خوشبو کے تعاقب میں آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک جگہ خوشبو گہری ہو گئی۔ شبانہ نے دائیں جانب دیکھا یہاں رنگ برنگے شیشوں والا ایک دروازہ تھا جو ذرا سا کھلا تھا۔ خوشبو اس دروازے سے اندر سے آرہی تھی۔

شبانہ نے غور سے اپنے دائیں بائیں دیکھا... آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے۔ اس کی موٹر شیشم کے درختوں میں کھڑی تھی۔ ایک درخت پر فاختہ بول رہی تھی۔ نہیں یہ خواب نہیں ہے۔ شبانہ نے اپنے آپ سے کہا اور ادھ کھلے کیواڑ میں سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اندر جھانک کر دیکھا پہلے تو اسے کمرے میں کچھ نظر نہ آیا شاید ایسا ہی مہر بہ لب اندھیرا بابل و نینوا کے اجاڑ کھنڈروں میں چھپا رہتا ہوگا۔

کمرے کی چھت کے قریب ایک چھوٹا سا روشندان تھا جس کے نیلے شیشے کے ٹکڑے میں سے باہر کی روشنی کی کرنیں نیلے غبار کی طرح کمرے میں اتر رہی تھیں۔ شبانہ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہزاروں برس پہلے ماضی کے زمانے میں آگئی ہے۔ پراسرار خوشبو جو اسے یہاں تک کھینچ لائی تھی اس کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔

وہ کمرے میں داخل ہوگئی۔ فرش پر نہ معلوم کس رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ پراسرار خوشبو... یعنی وہی پائپ کے تمباکو کی خوشبو نیم روشن فضا میں رچی ہوئی تھی۔ اب اسے اندھیرے میں چیزوں کے خاکے ابھرتے نظر آئے۔ ایک گول میز ٹھنڈے بڑے آتشدان کے پاس رکھی تھی۔ میز پر کوئی گلدان قسم کی شے پڑی تھی۔ شبانہ میز کے قریب گئی تو اس نے روشندان سے آتی ہلکی نیلی روشنی میں دیکھا چھوٹی گول میز پر گرد کی ہلکی تہہ جمی ہوئی ہے۔ درمیان پر سیاہ رنگ کا چھوٹا گلدان پڑا ہے جس میں گلاب کا سرخ پھول سجا ہے۔ شبانہ نے اپنی نازک انگلیوں سے گلاب کے پھول کی ریشمی پنکھڑیوں کو چھوا تو اسے پائپ کے تمباکو کی خوشبو اپنے بالکل قریب محسوس ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا ادھ کھلے دروازے میں اسے راحیل دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں پائپ تھا اور کمرے کی نیم روشنی میں اس کا چہرہ پوری طرح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کا دل جیسے کسی نے اپنی گرم مٹھی میں لے لیا۔ پراسرار راحیل اس کی طرف بڑھا وہ مسکرا رہا تھا اور اس کے سفید ہموار دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

اب شبانہ کو اس کا یونانی ناک اور کنپٹیوں کے ہلکے ہلکے سفید بال صاف نظر آرہے تھے۔ اس نے شبانہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سامنے والی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گہری آواز میں بولا۔

"اس طرف ایک دروازہ ہے جو نیلے انگوروں کے باغ میں کھلتا ہے
.... میرے ساتھ آؤ۔"

شبانہ پر جیسے اس کی شخصیت نے ایک طلسم طاری کر دیا تھا۔ وہ کمرے کی دھندلی فضا میں اس کے ساتھ سامنے والی دیوار کی طرف بڑھی۔ وہ حیران تھی کہ اس کمرے میں کوئی اور دروازہ بھی ہے۔ راحیل نے دیوار میں بنا ہوا چھوٹا سا دروازہ کھول دیا۔

کمرے میں باہر کی روشنی آئی تو شبانہ نے دیکھا کہ اس کے سامنے یوکلپٹس کے درختوں کا ایک باغ ہے جس کے وسط میں لکڑی کے کھمبوں پر نیلے انگور کی بیل نے اوپر ایک چھت سی ڈال دی ہے۔ چوڑے پتوں کے درمیان میں نیلے

انگوروں کے کتنے ہی گچھے عقیق و جواہر کی طرح لٹک رہے تھے۔ اس چھت کے نیچے لکڑی کی ایک پرانی میز پڑی تھی جس پر نیلے پھولوں والا چینی کا ایک پرانا گلدان رکھا تھا۔ میز کے پاس بانس کی دو کرسیاں بچھی تھیں۔ آسمان پر بہار کے بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ قریب ہی چھوٹی سی نہر بہہ رہی تھی۔ شبانہ نے کنکھیوں سے پراسرار راحیل کو دیکھا... اس نے گہرے رنگ کی پتلون کے اوپر قرمزی رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ کلائی پر چوکور ڈائل والی سنہری گھڑی بندھی تھی اس کے یونانی ناک اور گہری آنکھوں والے چہرے پر ساحل کارتھیج پر جلا وطن کئے گئے شہزادوں ایسی وجاہت تھی۔ اس نے شبانہ کا نازک ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ وہ انگور کی بیل کی چھت کے نیچے آ کر رک گیا۔ پھر قریب ہی بہتی نہر کی طرف دیکھ کر بولا۔

"اس نہر کا پانی ہزاروں برس سے بہہ رہا ہے۔ کبھی اس کے کنارے سنگ مرمر کا ایک چھوٹا سا محل ہوا کرتا تھا جس کی پتھر کی جالیوں میں سے چاند کی روشنی محل کی خواب گاہ میں آیا کرتی تھی آج نہ وہ محل باقی ہے اور نہ وہ دیو داسیاں جو نشاط گاہوں میں آخر شب مونگرہ غنچوں اور سرخ گلابوں کے ہار گوندھتے ہوئے سو جاتی تھیں اور جن کی سانسوں سے موتیہ کی مہک آتی تھی۔ اس ندی پر انار کے درختوں کی شاخیں اپنے سرخ و سبز اناروں کو جھک کر آئینہ دکھاتی تھیں۔ وہ انار کے درخت وقت کی سیاہ آندھیوں میں گم ہو گئے۔"

راحیل جیسے وقت کے ان دیکھے چہرے سے مخاطب تھا۔ شبانہ کی نگاہیں ندی کے بہتے آئینے پر جمی تھیں جس میں اسے ان گنت چہرے، شہر، مکان، باغ، محل، اور قبرستان بنتے بگڑتے، بستے اجڑتے نظر آ رہے تھے۔ راحیل نے پلٹ کر شبانہ کی طرف دیکھا اور بانس کی سبز کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ادب سے تھوڑا سا جھک

کر بولا۔

"انگور کی بیل کے نیچے میں بہار کی ہلکی بارش میں چائے پیتا ہوں، میں جانتا تھا تم آؤ گی... میں تیری راہ دیکھ رہا تھا... بیٹھو! انگور کے نیلے گچھے نسیم کے جھرمٹ ہیں۔ سائرس شہنشاہ کے ایران میں شہزادیاں اپنے بال سیاہ انگور کے گچھوں کی طرح گوندھا کرتی تھیں۔ ایران نے یونانیوں کو مشرق کا تقدس اور شکوہ دیا تھا۔ سکندر کو ایران ہی نے غیر فانی افسانوی کردار عطا کیا۔ یہ نیلے انگور اسی عظیم اور قدیم ترین ملک ایران کے عطیات میں سے ہیں۔ میں نے تمہارے لئے گلدان میں سرخ گلاب لگا دیا تھا میں جانتا ہوں تمہیں سرخ گلاب بہت پسند ہیں۔"

شبانہ بانس کی سبز کرسی پر بیٹھی راحیل کو باتیں کرتا دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی زبان پوری طرح سمجھ رہی تھی مگر اس کی باتیں شبانہ کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں مگر یہ باتیں اس کے جذبات کو تسکین ضرور پہنچا رہی تھیں۔ گرمیوں کی صبح کو چلنے والی شبنمی ہوا ہماری سمجھ میں نہیں آتی لیکن وہ ہماری روح کو مزید لطافت عطا کرتی ہے۔ شبانہ نے آنکھیں اٹھا کر اوپر دیکھا۔ نیلے انگور کے دو گچھے عین اس کے سر کے اوپر لٹک رہے تھے۔ راحیل مسکرایا۔

"یہ انگوروں کا نظام شمسی ہے ان انگوروں میں تمہیں سورج، عطارد مریخ، زہرہ... سبھی سیارگان ملیں گے۔"

شبانہ نے گوشۂ چشم سے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھا تو راحیل نے اس کی کلائی پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔

"یہاں وقت نہیں ہے۔ تم جب میری ویران کوٹھی میں داخل ہوئی تھیں تو وقت اسی وقت ٹھہر گیا تھا۔"

راحیل نے شبانہ کی گھڑی پر سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا شبانہ نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تو پتہ چلا کہ گھڑی کی سیکنڈوں کی سوئی اپنی جگہ پر ساکت ہے۔ وہ خوش

ہوئی وہ نہیں چاہتی تھی کہ اتنا خوبصورت وقت گزر جائے اس نے راحیل کی طرف دیکھا اور ذرا سا مسکرا کر بولی "یہاں تمہارے لئے چائے کون بناتا ہے؟"

راحیل نے کونے کی جانب ایک پرانے گول کمرے کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

"اس کمرے میں چائے کے باغ ہیں۔ ہری بھری ڈھلانیں ہیں جن پر چائے کے سرسبز پودے جنوب مشرقی ایشیا کی مرطوب بارشوں میں مسکراتے ہیں۔"

راحیل پائپ کا نیلا دھواں اڑاتے ہوئے کونے والے گول کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک بوڑھا ملازم ہاتھوں میں چائے کا طشت لئے آتا دکھائی دیا۔ چائے کی چینک پیالے اور نقرئی چمچے کے ساتھ طشت میں کچھ گلاب کے سرخ پھول بھی پڑے تھے۔ راحیل نے شبانہ کے لئے خود چائے بنائی اور اس کی پلیٹ میں پیالی کے ساتھ گلاب کا ایک پھول بھی رکھ دیا۔ چائے کا ہلکا سا گھونٹ لینے کے بعد راحیل نے بیل میں لٹکتے نیلے انگوروں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں دریائے ایراوتی کے دیش میں جا رہا ہوں تم مجھ سے ملنے آؤ گی شبانہ؟"

شبانہ نے راحیل کے یونانی پراثر حساس اور وجیہہ چہرے کی طرف دیکھا اس نے محسوس کیا کہ وہ قدیم مصر و یونان کے کسی جلاوطن شہزادے کو دیکھ رہی ہے آہستہ سے بولی۔

"میں کیسے آسکتی ہوں مجھے کوئی نہیں آنے دے گا۔"

راحیل کا پائپ بجھ گیا تھا اس نے پیالی میز پر رکھ دی ماچس جلا کر پائپ سلگایا اور بولا۔

"ایک دریا پہاڑوں سے نکل کر اپنے سمندر سے ملنے چل پڑا سمندر تک راستے میں جس نے بھی اس کا راستہ روکا وہ یا تو دریا کی تہہ میں ڈوب گیا یا اس کی لہروں میں اس کے ساتھ ہی بہہ گیا۔"

شبانہ مسکرائی۔ "میں دریا نہیں ہوں۔ میرا واسطہ حقیقت کی دنیا سے ہے۔ جہاں میری امی، ابو، بھائی، بہن رہتے ہیں اور مجھے کسی دوسرے ملک میں جانے کے لئے ان سے اجازت لینی ہوتی ہے۔"

راحیل نے پائپ کا ہلکا سا کش لگا کر کہا۔

"تم اپنی حقیقت کی دنیا میں ضرور رہو۔ تمہاری حقیقت کی دنیا تمہیں جو پہناتی ہے پہنو۔ جدھر لے جاتی ہے ادھر جاؤ اپنی امی، ابو کے پیچھے چلو۔ اور جب وہ تمہارے آگے آگے چلتے موت کی وادی میں اتر جائیں اور تم اکیلی رہ جاؤ اور اپنے پیچھے اپنے بچوں کی رہنمائی کرتے ہوئے تم بھی حقیقت کی دنیا سے پردہ پوش ہو جاؤ تو دریائے ایراوتی کے شہر میں ضرور آنا۔ میں وہاں تاڑ اور ناریل کے مرگ باغ میں تمہیں ملوں گا۔ تمہاری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ حقیقت کی دنیا تمہاری چائے کی گرمی اور مہک اڑا رہی ہے۔"

شبانہ نے ٹھنڈی چائے کا گھونٹ پیا تو اسے کچھ ایسا احساس ہوا جیسے کوئی شبنم سی بھیگی ہوئی گھاس پر باریک ململ کا دوپٹہ ڈال دے اور شبنم اس دوپٹے کو اپنے اندر جذب کر لے۔

راحیل سے الگ ہو کر اس کے دل میں بہت سے سوال پیدا ہو جاتے۔ وہ اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی لیکن اس کے قریب بیٹھتے ہی وہ سب کچھ بھول جاتی۔ ان گنت سوال اس کے ذہن کے افق سے بادلوں کی طرح لپٹ جاتے اچانک شبانہ کو انگور کے پتوں پر بارش کے قطروں کے گرنے کی آواز سنائی دی اس نے سر اوپر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے اوپر انگور کی بیل کی چھت پڑی تھی جس پر بارش کے قطرے گرنے لگے تھے۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ بارش کا ایک شفاف موتی انگور کے پتے سے پھسل کر شبانہ کی چائے کی پیالی میں گرا تو جل ترنگ ایسی آواز پیدا ہوئی۔ راحیل نے میز پر اپنی کہنیاں ٹکا دیں اور چائے کی پیالی پر نظریں جما کر بولا۔

"بارش کی کئی زبانیں ہیں۔ بارش کئی زبانوں میں بات کرتی ہے۔ ٹین کی ڈھلوانی چھت پر اس کی زبان اور ہوتی ہے خزاں کے خشک پتوں پر وہ سسکیوں کی زبان میں بات کرتی ہے۔ چائے کی پیالی میں وہ موسیقی کی زبان میں بولتی ہے کھلے سمندروں میں سوائے سمندروں کے اس کی زبان کوئی دوسرا نہیں سمجھتا اور گیندے کے پھول سے وہ زرد زبان میں بولتی ہے۔ جانتی ہو زرد زبان کیا ہوتی ہے؟ یہ خزاں کی زبان ہے۔ درخت اسی زبان میں اپنے جھڑتے ہوئے زرد پتوں کو الوداع کہتے ہیں۔"

شبانہ آہستہ سے اٹھ کھڑی ہوئی "اب میں جاؤں گی" راحیل نے اٹھ کر تعظیماً اس کی کرسی تھوڑی سی پیچھے کھینچ لی تاکہ شبانہ کو گزرنے میں آسانی ہو۔ وہ اس کے ساتھ چلنے لگا بارش.... بہار کی بارش کے موتی ان کے اوپر گر رہے تھے۔ "کیا تم ایراوتی کے شہر میں آؤ گی۔"

ایراوتی ایک دریا کا نام ہے جو مقدس عبادت گاہوں کے سرخ پھول اپنے ساتھ لے کر تاریک سمندر میں گرتا ہے۔ اس کے کنارے ایک شہر آباد ہے۔ اس شہر کا نام رنگون ہے۔ رنگون میں برسات کی راتیں کالی ہوتی ہیں اور جب بارش ہوتی ہے تو فضاء میں صندل، گل مہر اور کیلے کے سبز تنوں اور رجنی گندھا کے سفید پھولوں کی خوشبوئیں سانس لیتی ہیں۔ رجنی گندھا کا پھول صرف بارش کی زبان سمجھتا ہے۔ جنگل کی بارش، پاکیزہ اور بے لوث بارش!

شبانہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں سے گزرتی ہوئی پرانی کوٹھی کے کچے لان میں آ گئی جہاں ٹاہلی کے تناور درختوں میں ہلکی بوندا باندی سرگوشیاں کر رہی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس نے پلٹ کر کوٹھی کی طرف دیکھا۔ برآمدہ سنسان تھا۔ بارش کی آواز تیز ہونے لگی تھی۔

شبانہ نے گاڑی نکالی اور کچے راستے سے گزرتی واپس بڑی نہر پر آ گئی بارش ہو رہی تھی۔ گاڑی کی چھت پر گرتی بارش کی زبان سے شبانہ ناواقف تھی۔

اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ سامنے دیکھ رہی تھی مگر اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنے خیالوں کو مختلف لباس میں چلتے پھرتے دیکھ رہی تھی۔ "کینال لاج" کے گیراج میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد وہ سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے سنگھار میز کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس کے بالوں میں بائیں جانب گلاب کا سرخ پھول لگا تھا۔ اسے کچھ یاد نہیں تھا کہ یہ پھول اس کے بالوں میں کس نے لگایا۔ گلاب کے پھول کو بالوں سے اتار کر اس نے سنگھار میز پر رکھا اور بالوں پر برش پھیرنے کے بعد نیچے سٹنگ روم میں آ گئی۔ اس کی امی بڑے تخت پر بیٹھی رہی تھی اس نے شبانہ کی طرف دیکھا اور بولی۔

"تمہارے ابو کا فون آیا تھا۔ آج موچی دروازے والے پرانے مکان کے شیش محل میں چراغ جلاتے چلنا ہے۔ تم بھی تیار ہو جانا۔"

شبانہ "بہت اچھا امی" کہتی غزالہ کے کمرے میں چلی گئی۔ غزالہ کی طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ یہ پہلا دورہ تھا جس کے اثرات ابھی تک باقی تھے۔ وہ پلنگ پر لیٹی تھی اور صاف لگ رہا تھا کہ اسے سانس لینے میں کچھ دقت محسوس ہو رہی ہے۔ شبانہ نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"آپی! طبیعت ٹھیک ہے نا؟"

غزالہ مسکرا دی۔ "میری طبیعت بالکل ٹھیک ہے تم تو خوامخواہ پریشان ہوتی ہو۔"

شبانہ نے کہا۔ "آج شام شیش محل میں چراغ جلانے جانا ہے میں تمہارے لئے خاص منت مانگوں گی۔"

غزالہ نے شبانہ کا ہاتھ تھام لیا۔ شبانہ نے محسوس کیا کہ غزالہ کا ہاتھ روئی کے گالے کی طرح نرم اور ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔ "شاہ پری سے کہنا غزالہ اس حالت میں حاضری نہیں دے سکتی۔ مجھے معاف کر دینا۔" شبانہ نے اپنی بیمار

بڑی بہن کا ماتھا چوم لیا۔ شام ابھی ہوئی نہیں تھی کہ شبانہ کے ابو اور عقیل آ گئے
موچی دروازے والے پرانے مکان کے شیش محل میں جانے کی تیاریاں شروع ہو
گئیں۔ ابو گلاب کے ہاروں کی ٹوکری، سفید مخانے اور مالٹوں کی دو بھری ہوئی ٹوکریاں
اپنے ساتھ لائے تھے۔

عامر اپنے کالج کے دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے گیا ہوا تھا۔ بڑا بھائی
عقیل اس قسم کی باتوں کو نہیں مانتا ہے اس لئے وہ موچی دروازے والے شیش محل
میں جمعرات کو چراغ جلانے شاذ و نادر ہی جاتا تھا۔ شبانہ کی امی اور ابو تو ہر جمعرات
کو پرانے گھر کے شیش محل میں جا کر چراغ جلا آتے تھے۔ مہینے کی آخری جمعرات کو
وہ پھل اور مخانے لے کر جاتے اور بچوں میں بانٹتے۔ آج بھی مہینے کی آخری جمعرات
تھی۔ موچی دروازے والے پرانے حویلی نما مکان میں یہ شیش محل شبانہ کی دادی
نے اپنی شادی کے بعد بنوایا تھا۔ یہ شیش محل ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جس کی
دیواروں پر چھوٹے چھوٹے چوکور شیشے لگا دیئے گئے تھے۔ درمیان میں میز پر
گلدان میں موسم کے پھول ہر جمعرات کو سجا دیئے جاتے تھے۔
کارنس پر مٹی کے چھوٹے چھوٹے پیالے رکھے ہوئے تھے جن میں جمعرات کو
موم بتیاں روشن کی جاتی تھیں۔ دو رکابیوں میں گندھا ہوا آٹا بھر کر اس میں اگربتیاں
سلگا کر لگا دی جاتی تھیں۔ پھر امی اور ابو وہاں بیٹھ کر قرآنی آیات کا ورد کرتے
اور کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے واپس چل دیتے۔ اس کوٹھڑی پر کبھی تالا نہیں ڈالا
گیا تھا۔ موچی دروازے والے اس پرانے جہازی مکان میں صرف ایک نوکر ہی
رہتا تھا جو مکان کی چوکیداری بھی کرتا تھا۔ اس شیش محل میں کوئی ہوائی مخلوق
رہتی تھی جن کی باقاعدہ وہاں شادیاں ہوتی تھیں۔ بڑی سیڑھی چڑھ کر ڈیوڑھی
آتی تھی۔ اس اندھیری ڈیوڑھی میں بائیں جانب شیش محل کی کوٹھڑی کا دروازہ تھا
شبانہ اس ہوائی مخلوق کی قائل تھی۔ اس نے خود اپنے کانوں سے اس اندھیری
سیڑھیوں پر پائل کی چھن چھن سنی تھی جیسے کوئی عورت تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی

ہو اس نے اس نظر نہ آنے والی مخلوق کے قہقہوں اور باتیں کرنے کی آوازیں بھی
کئی بار سنی تھیں۔ ایک بار جب وہ اسکول میں پڑھتی تھی اور اپنی دادی سے ملنے
پرانے مکان میں آئی ہوئی تھی تو وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ اچانک اس کے سامنے
ایک انتہائی خوبصورت نورانی چہرے والی لڑکی آ گئی جس کے شاندار لباس میں سے
ملکوتی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

شبانہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لڑکی نے مسکرا کر شبانہ کی طرف دیکھا
اور تیزی سے اس کے قریب سے ہو کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔ اس شیش محل میں اس ہوائی
مخلوق کی شادیاں بھی ہوتی تھیں۔ دادی اماں کہا کرتی تھیں کہ ایک بار وہ اگربتیاں
سلگانے شیش محل میں داخل ہوئی تو کیا دیکھتی ہے کہ فرش پر قالین بچھا ہے۔ کچھ
عورتیں ایک سجی سجائی دلہن کو لئے بیٹھی مسکرا رہی تھیں دادی اماں نے انہیں سلام
کیا۔ اگربتیاں رکابی میں سلگائیں اور انہی قدموں واپس چلی گئی۔ اس ہوائی مخلوق
نے گھر والوں کے کسی معاملے میں کبھی دخل نہیں دیا تھا۔ کبھی کسی سے کوئی بات
نہیں کی تھی۔ سال دو سال میں کبھی کبھار ہی وہ خاندان کے کسی فرد کے سامنے ظاہر
ہوتے تھے۔

ویسے ان کے سیڑھیاں اترنے، چلنے پھرنے اور کبھی کبھی عورتوں کے ہلکے
ہلکے قہقہوں کی آوازیں ضرور سنائی دے جاتی تھیں۔ دادی اماں ایک بھائی کی
وفات کے بعد شبانہ کی فیملی کینال بینک والی کوٹھی میں اٹھ آئی۔ اس کوٹھی میں
شبانہ کی پیدائش ہوئی۔ دادی اماں موچی دروازے والے پرانے مکان میں ہی
رہیں۔ ان کی خدمت گزاری کے لئے دو عورتیں رکھ دی گئی تھیں۔ دن میں ایک
بار شبانہ اپنی والدہ کے ساتھ دادی اماں سے ملنے موچی دروازے والے
مکان میں ضرور جاتی۔ پھر دادی اماں بھی انتقال کر گئی اور موچی دروازے والا
پرانا حویلی نما مکان ویران ہو گیا اور اس کی دیکھ بھال کے لئے ایک چوکیدار رکھ
دیا گیا۔

اب صرف جمعرات کی جمعرات شیش محل میں چراغ جلانے کے لئے یہ لوگ وہاں جاتے تھے۔ آج بھی اس مقصد کے لئے یہ کنبہ موچی دروازے جا رہا تھا۔ شبانہ نے سادہ لباس پہن کر دوپٹے سے سر ڈھانپ لیا تھا۔ اس نے اپنے طور پر جلانے کے لئے کچھ موم بتیاں بھی ساتھ رکھ لی تھیں۔ ابھی سورج غروب ہوا ہی تھا کہ یہ لوگ گاڑی میں بیٹھ کر موچی دروازے کی طرف روانہ ہو گئے۔

شبانہ کا کچھ بچپن موچی دروازے کی گلیوں میں بھی گزرا تھا۔ اگرچہ وہ کینال بینک والی کوٹھی کینال لاج میں پیدا ہوئی تھی۔ مگر اس کے بیشتر رشتے دار موچی دروازے کے اندر ہی رہتے تھے اور وہ اکثر وہاں جاتے رہتے تھے۔

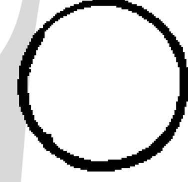
شبانہ کو لاہور شہر کی پراسرار نیم روشن، نیم چھتی ہوئی گلیاں بڑی اچھی لگتی تھیں ان کے اپنے مکان میں ایک سہ دری گلی کی طرف نکلی ہوئی تھی۔ جس کے روشندانوں میں رنگ برنگے شیشے لگے تھے اس سہ دری پر پرانی چک پڑی رہتی۔ شبانہ یہاں بیٹھ کر ان کبوتروں کو دانہ دنکا چنتے دیکھا کرتی جنہوں نے سامنے والی مکان کی دیوار کے اندر گھونسلہ بنا رکھا تھا۔

شبانہ اپنی امی جان اور ابو کے ساتھ موچی دروازے کے بازار میں داخل ہوئی تو شفاف آنکھوں اور سفید مونچھوں والے پوکیرے چچا گامی نے انہیں سلام کیا، شبانہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر دعا دی اور ابو سے کہا۔

"خواجہ صاحب موتیے کے ہار میں نے الگ نکال کر رکھ لئے تھے۔" پھر چچا گامی نے موتیے کے ہاروں سے بھری ہوئی ٹوکری نکال کر دی جس پر ململ کا رومال گیلا کر کے ڈالا ہوا تھا۔ موچی دروازے والے مکان میں چوکیدار نے صفائی کروا رکھی تھی۔ بڑے کمرے کے پرانے صوفوں کی گرد بھی جھاڑ دی گئی تھی۔ امی ابو نے منہ ہاتھ دھو کر وہیں ٹھنڈے پانی سے وضو کیا اور پھولوں کے ہار لے کر شیش محل والی کوٹھڑی کی طرف بڑھے۔

شبانہ بھی موتیے کے ہار ہاتھوں میں تھامے ان کے پیچھے پیچھے تھی شیش محل

میں موم بتیاں روشن ہوئیں تو دیواروں پر لگے آئینوں کی وجہ سے کوٹھڑی جگ مگ کرنے لگی۔ رکابیوں میں اگربتیاں سلگا دی گئیں۔ گلدان میں گلاب کے تازہ پھول سجائے گئے۔ شبانہ کارنس پر روشن اگربتیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے ایسے لگا جیسے کوئی گوٹے لگے کیسری لباس اور نورانی چہرے والی لڑکی اس کے سامنے سے مسکراتی ہوئی گزر گئی۔



شبانہ نے شیش محل میں آیات قرآنی پڑھنے کے بعد اپنی بڑی بہن غزالہ کے لئے دعا مانگی۔ یہ دعا شبانہ نے خدا سے مانگی تھی۔ اگرچہ بچپن ہی سے شبانہ کے ذہن میں گھر کے ماحول نے یہ خیال جاگزیں کر دیا تھا کہ شیش محل کی ہوائی مخلوق زندہ ہے اور زندہ انسانوں کی طرح ان کے ہاں بھی شادی بیاہ ہوتے ہیں مگر شبانہ نے کبھی ان سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ وہ جب بھی شیش محل میں جا کر دعا مانگتی تو اس کے ذہن میں سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے اور کسی کا خیال نہیں ہوتا تھا وہ جانتی تھی کہ جن و انس بھی اللہ تعالیٰ ہی کی ایک مخلوق ہے جو اللہ ہی کے زیر فرمان ہے اور دعا صرف اللہ ہی سے مانگنی چاہیئے کیونکہ اللہ ہی دعا سننے اور اسے شرف قبولیت بخشنے والا ہے۔

شبانہ کو شیش محل کا گلاب موتیے اور اگربتیوں کی خوشبوؤں سے مہکا ہوا ماحول بہت پسند تھا اور اس ماحول میں وہ اپنے آپ کو خدا کے زیادہ قریب محسوس کرتی تھی۔

شیش محل سے باہر نکل کر شبانہ کی امی اور ابو نے محلے میں پھل اور مٹھائی تقسیم کئے چوکیدار کو روپے دیئے رات ہو چکی تھی جب یہ لوگ گاڑی میں بیٹھ کر کینال بینک والی کوٹھی میں واپس آئے۔ شبانہ نے غزالہ کے گلے میں بھی موتیے کا ہار ڈالا اور اسے کہا۔

"آپی! میں نے خدا سے تمہارے لئے بڑی دعا مانگی ہے۔ اب تم بالکل اچھی ہو جاؤ گی۔" غزالہ کے چہرے پر ایک اداس مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور منہ ہی منہ میں اللہ کے پاک ناموں کا ورد کرنے لگی۔

غزالہ ہمیشہ آنکھیں بند کر کے اللہ کے مقدس اسماء کا ورد کیا کرتی تھی۔ لیکن اللہ کے نظام میں کون دخل دے سکتا ہے جو بیماری غزالہ کو لگی تھی اس نے اندر ہی اندر اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس پر پڑنے والے دورے شدید ہوئے اور کوہ مری سے واپس آنے کے چار ماہ بعد غزالہ کو آخری دورا پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔

غزالہ کی موت نے کینال لاج میں کہرام بپا کر دیا۔ شبانہ پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ اگر اس کی سہیلی نجمی خود رو کر اسے نہ رلاتی تو شبانہ کا زندہ بچنا بھی محال لگتا تھا۔ کئی روز تک گھر پر سوگ کی کیفیت طاری رہی۔ شبانہ کی پیاری بہن ہی نہیں بلکہ اس کی پیاری سہیلی اس کا غم کھانے والی اس کے دل کو سمجھنے والی غزالہ اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی تھی۔

عامر کو بہت صدمہ ہوا تھا۔ امی بھی اس صدمے سے نڈھال ہو گئی تھیں۔ شبانہ کے ابو اور بڑے بھائی عقیل نے تھوڑے دن غزالہ کا سوگ کیا پھر اپنے کاروبار میں مصروف ہو گئے۔

امی اور شبانہ نے ہر روز شام کو غزالہ کی قبر پر موم بتیاں جلاتے اگربتیاں سلگا اور فاتحہ پڑھنے جاتیں۔ چالیسویں پر شہر کے سبھی رشتے دار موجود تھے۔ چالیسویں کے بعد شبانہ جمعرات کو غزالہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتی۔ امی جان پر جوڑوں کے درد نے حملہ کر دیا۔ شبانہ انہیں بڑی مشکل سے گاڑی میں بٹھا کر قبرستان لے جاتی تھی۔ غزالہ کی وفات کو دوسرا مہینہ جا رہا تھا کہ ایک دن شبانہ کی امی پر فالج کا شدید حملہ ہوا اور وہ تین روز بے حس و حرکت پڑے رہنے کے بعد اپنی بیٹی غزالہ کے پاس پہنچ گئیں۔ چار پانچ مہینوں کے اندر اندر "کینال لاج" جیسے ویران ہو کر

رہ گیا۔ شبانہ پہلے بڑی بہن اور پھر اپنی پیاری امی کے صدمے سے بے حال ہو کر ایسی بیمار ہوئی کہ اس کے بھائیوں اور ابو کو اس کی جان کے بھی لالے پڑ گئے۔ اسے پرائیویٹ ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا جہاں اس کی پیاری سہیلی نجمی دن رات اس کی خدمت کرتی رہی۔

ایک ہفتے بعد شبانہ کی طبیعت بحال ہونا شروع ہو گئی۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اب اسے حوصلہ دینے والا سوائے نجمی کے اور کوئی نہیں تھا۔ چھوٹا بھائی عامر اس کا ضرور خیال رکھتا تھا مگر وہ نوجوان تھا۔ اس کا زیادہ وقت کالج کے دوستوں کے ساتھ گزرتا۔ بڑا بھائی عقیل اور ابو اپنے ٹھیکیداری کے کاموں میں الجھے رہتے۔

شبانہ نے خود ہی حوصلہ کیا اور غم کے جو پہاڑ اس پر ٹوٹ پڑے تھے ان کے بوجھ تلے سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس دوران پراسرار راجیل سے بھی اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی اسے اتنی فرصت ہی نہیں ملی تھی کہ وہ کینال بینک کے نہر والے پرانے مکان میں جاتی اور یہ معلوم کرتی کہ راجیل وہاں پر موجود ہے کہ نہیں۔ والدہ کی وفات سے پہلے دو ایک بار وہ نجمی کے ساتھ پبلک لائبریری میں ضرور گئی تھی۔ اس خیال سے کہ شاید وہاں راجیل سے اچانک ملاقات ہو جائے اور وہ اسے اپنی بہن کی وفات کا بتائے۔ مگر راجیل اسے لائبریری میں بھی کہیں نظر نہ آیا۔

پھر والدہ بھی اللہ کو پیاری ہو گئی اور شبانہ بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہو گئی نجمی دن میں دو بار اس کے پاس ہسپتال آتی تھی۔ کالج کی دوسری سہیلیاں بھی شبانہ کا دل بہلانے آ جاتی تھیں۔ امتحان قریب آ گئے۔ شبانہ پوری طرح سے صحت مند نہیں ہوئی تھی مگر وہ بی اے کے امتحان میں ضرور بیٹھنا چاہتی تھی۔ امتحان شروع ہو گئے۔ شبانہ نے پورے پرچے دے دیئے۔ تین مہینے بعد نتیجہ نکلا تو شبانہ دوسری پوزیشن لے کر پاس ہو گئی تھی۔

اس نے یونیورسٹی میں داخلے کی درخواست دی تو ایک روز ابو نے اسے بلا کر کہا بیٹی مزید تعلیم حاصل کرنے سے کیا فائدہ ہوگا۔ نوکری تو تمہیں کرنی نہیں میں چاہتا ہوں کہ اب تم اپنا گھر بسانے کے بارے میں سوچو۔ یہاں تمہاری خیر گیری کرنے والی نہ تمہاری بہن رہی اور نہ تمہاری والدہ ہی سلامت رہی ہمیں اپنے کاروبار سے فرصت نہیں ملتی۔

عامر کو تو میں اسی برس ظفر کے پاس امریکہ بھجوا رہا ہوں۔ وہ خود بھی امریکہ جا کر ہی پڑھنا چاہتا ہے۔ شبانہ نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ وہ ابھی شادی کے بارے میں نہیں سوچ سکتی۔ وہ انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد ہی کچھ کہہ سکے گی۔ ابو خاموش ہو گئے۔

شبانہ واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔ بستر پر لیٹ کر اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ اسے غزالہ اور امی جان یاد آ گئیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کافی دیر تک رونے کے بعد جب اس کے دل کا غبار ہلکا ہوا تو اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ گاڑی نکالی اور نہر کے ساتھ ساتھ شمال کی طرف چل دی۔

غزالہ اور امی جان کی وفات پر امریکہ سے شبانہ کا منگیتر ظفر لاہور نہیں آیا تھا مگر اس نے ٹیلیفون پر ابو اور بڑے بھائی عقیل سے اپنے غم کا بار بار اظہار کیا اور معذرت پیش کی تھی کہ بعض کاروباری مجبوریوں کی وجہ سے وہ امریکہ نہیں چھوڑ سکتا۔

ابو کو ظفر کا کچھ زیادہ ہی خیال رہتا تھا انہوں نے ظفر کو ہدایت کی کہ جو اللہ کو منظور تھا وہ ہو گیا۔ اب اسے اپنے کاروبار کی طرف زیادہ دھیان دینا چاہیئے۔ خود شبانہ کے ابو جان اور بھائی جان عقیل کو بھی دن رات کاروبار ہی کی فکر پڑی رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ غزالہ اور امی کے انتقال کے بعد شبانہ اتنی بڑی کوٹھی میں خود کو تنہا محسوس کرنے لگی تھی۔ ان ہی خیالوں میں الجھی شبانہ گاڑی کو کینال بینک والی نہر کے کچے راستے پر شمال کی طرف لئے جا رہی تھی۔

اکتوبر کی آخری تاریخیں تھیں پنجاب میں یہ خزاں کا موسم ہوتا ہے۔ سفیدے کے درختوں کے پتے اسی موسم میں گرتے ہیں۔ نہر کی کچی سڑک پاپولر کے سوکھے پتوں سے بھری ہوئی تھی۔ درختوں کی شاخوں پر جو زرد پتے لگے رہ گئے تھے وہ ہوا کے جھونکے سے ٹوٹ کر چکراتے ہوئے نیچے گر پڑتے تھے۔

شیشم کے درختوں پر پتوں نے ابھی گرنا شروع نہیں کیا تھا۔ پنجاب میں شیشم کے درختوں کے پتے نومبر دسمبر میں گرنا شروع ہوتے ہیں۔ شہتوت کے پیڑوں کی شاخیں بھی ننگی ہو گئی تھیں۔ نہر میں پانی کناروں سے بہت نیچے ہو کر بہہ رہا تھا پانی کا رنگ سبزی مائل ہو رہا تھا۔ موسم میں ہلکی ہلکی خنکی آ گئی تھی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ مئی جون جولائی اور اگست میں جو گرمی پڑی تھی لاہور کے لوگوں کو اس سے نجات مل چکی تھی۔ رات کو سردی ہو چکی تھی اور کمبل اوڑھ کر سونا پڑتا تھا دن میں دھوپ ناگوار نہیں لگتی تھی پے در پے صدموں اور بیماری کی وجہ سے شبانہ کا چہرہ کمزور پڑ گیا تھا۔

نجمی نے بھی بی اے کلیئر کر لیا تھا اور شبانہ کے ساتھ ہی اس نے بھی یونیورسٹی میں ایم اے انگریزی کے لئے فارم بھر کر جمع کرا دیا تھا۔ غزالہ اور امی جان کی وفات کے بعد شبانہ کو نجمی کی دوستی اور بے لوث محبت کا زیادہ احساس ہونے لگا تھا۔ پہلے وہ نجمی سے جو کبھی کبھی بے اعتنائی برت لیتی تھی اب اس نے اس عادت کو ترک کر دیا تھا۔ وہ نجمی کا پہلے سے زیادہ خیال رکھتی تھی لیکن ابھی تک شبانہ نے اسے راحیل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہ راز شبانہ کے دل میں ابھی تک محفوظ تھا اگرچہ وہ چاہتی تھی کہ نجمی کو اس راز میں شریک کرے۔ آخر اس کی ایک ہی تو سہیلی تھی۔

گاڑی نہر کے اس مقام پر پہنچ گئی جہاں سے ایک چھوٹی سی نہر نکل کر ٹاہلیوں میں گھری ہوئی پرانی کوٹھی کی طرف جاتی تھی۔ شبانہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس چھوٹی نہر کے کنارے کنارے گاڑی لئے بڑھی۔ پرانی شکستہ کوٹھی

ویسے ہی ویران اور سنسان تھی۔ برآمدے کے فرش پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی وہ برآمدے سے گزر کر دروازے کی طرف بڑھی لیکن یہ دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گئی کہ دروازے پر تالا پڑا تھا اسے وہاں سے پائپ کے تمباکو کی خوشبو بھی نہیں آرہی تھی کہیں کسی جگہ اسے گلاب کا کوئی پھول بھی گرا ہوا دکھائی نہ دیا یہ بوسیدہ پرانی کوٹھی گولائی کی شکل میں بنی ہوئی تھی۔

شبانہ اس کی دوسری جانب گئی کہ ادھر ہی انگور کا باغ تھا مگر اسے وہ باغ کہیں دکھائی نہ دیا جہاں انگور کی بیل کی چھت کے نیچے میز پر بیٹھ کر اس نے راجیل کے ساتھ چائے پی تھی وہ چھوٹی سی نہر بھی یہاں نہیں تھی جس کے کنارے کبھی سنگ مرمر کا کوئی محل ہوا کرتا تھا۔ کچھ فاصلے پر ٹاہلیوں کے نیچے وہ نہر ضرور بہہ رہی تھی جو بڑی نہر سے نکل کر ادھر کھیتوں میں سے گزرتی تھی۔

شبانہ کوٹھی کے پچھلے لان کی طرف واپس آگئی یہاں شہتوت کے جو چند ایک درخت تھے ان کے پتے جھڑنے کے بعد کچے صحن میں بکھرے ہوئے تھے ٹاہلیوں کے پتے ابھی اپنی شاخوں پر ہی لگے خزاں کی بارش کا انتظار کر رہے تھے۔ کب خزاں کی پہلی بارش ہو اور درختوں کے پتے گرنا شروع ہو جائیں۔ ایک جانب چھپر کے نیچے پرانی زنگ خوردہ بگھی ویسے ہی پڑی تھی۔ کوئی نوکر یا چوکیدار بھی کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

شبانہ گاڑی میں بیٹھ کر واپس روانہ ہو گئی وقت گزرتا چلا گیا۔ شبانہ اور نجمی کو یونیورسٹی میں ایم اے انگریزی میں داخلہ مل گیا۔ شبانہ نے ساری توجہ اپنی پڑھائی کی طرف مبذول کر دی کبھی کبھی اسے راجیل کا ضرور خیال آتا اس سے ملے ایک عرصہ گزر گیا تھا اس نے کہا تھا میں دریائے ایراوتی کے شہر رنگون جا رہا ہوں۔ کیا تم مجھے وہاں ملنے آؤ گی؟ ضرور وہ رنگون جا چکا ہے شبانہ یہ سوچ کر خاموش ہو رہتی۔ سردیاں گزر رہی تھیں کہ ابو نے شبانہ کے بڑے بھائی عقیل کی شادی کر دی۔

شادی اپنے پرانے رشتہ داروں میں ہی ہوئی جو رنگ محل میں رہتے تھے۔ شبانہ بھابھی کو جانتی تھی شادی بڑے سادہ طریقے سے ہوئی۔ بھابھی کے آنے سے "کینال لاج" والے گھر کی رونق کسی حد تک واپس آگئی۔ بھابھی کا نام نجمہ تھا نجمہ زیادہ پڑھی لکھی خاتون نہیں تھی۔ خاص اندرون شہر رہنے والی لڑکی تھی۔ اسے لباس گہنے زیور اور کھانے پکانے کا بہت شوق تھا۔ آتے ہی اس نے خانساماں اور نوکرانی کو اپنے کنٹرول میں لے لیا۔

شبانہ کو بڑی خوشی ہوئی کیونکہ اب کھانے وغیرہ کا سارا انتظام بھابھی نجمہ کے ذمے تھا شبانہ پوری یکسوئی سے اپنی پڑھائی کر سکتی تھی نجمہ بھابھی ویسے بھی بڑی ہنس مکھ اور سیدھے سبھاؤ کی تھی۔ عقیل بھائی اس سے بہت خوش تھے۔ روپے پیسے کے معاملے میں انہوں نے نجمہ کو پورا اختیار دے رکھا تھا۔

شبانہ ہر جمعرات کو اپنی امی اور بہن غزالہ کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے اور پھول چڑھانے ضرور جاتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اپنی والدہ کی دوسری روایت کو بھی نبھانے کی پوری کوشش کرتی۔

مہینے کی آخری جمعرات کو ابو کے ساتھ موچی دروازے والے اپنے پرانے مکان کے شنبنش محل میں دیا جلانے اور پھول چڑھانے ضرور جاتی تھی شبانہ کی امی جان نے اپنی موت سے کچھ روز پہلے اپنے خاوند اور شبانہ کے ابو کو اپنی آخری خواہش ان الفاظ میں بیان کی تھی کہ میری موت کے بعد شنبنش محل والے پرانے مکان کو ہرگز فروخت نہ کرنا۔ نہیں تو میری روح کو بہت تکلیف پہنچے گی شبانہ کے ابو نے اپنی بیمار اور زندگی کے دکھ سکھ کی ساتھی بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے یقین دلایا تھا کہ وہ موچی دروازے والا مکان کبھی فروخت نہیں کریں گے اور شنبنش محل میں ہر جمعرات کو دیا بتی جلتی رہے گی مگر شبانہ کے ابو ہر جمعرات اب شنبنش محل خود نہیں جاتے تھے بلکہ چوکیدار کو کہہ دیا تھا کہ وہ جمعرات کی جمعرات شنبنش محل میں اگربتیاں سلگا کر دیا بتی

جلا دیا کرے۔ خود صرف مہینے کی آخری جمعرات کو شیش محل جاتے تھے جب شبانہ بھی ان کے ساتھ ہوتی تھی۔ عقیل بھائی کی شادی کے بعد اچانک امریکہ سے شبانہ کا منگیتر ظفر لاہور آگیا۔

شبانہ کی پھوپھی کے ساتھ وہ غزالہ اور شبانہ کی امی کا افسوس کرنے کینال بینک والی کوٹھی آیا۔ عجیب کاؤ بوائے والا لباس پہن رکھا تھا اس نے شبانہ گھر پر ہی تھی۔ ظفر کو غزالہ اور امی کی موت کا کیا افسوس ہو سکتا تھا بس جان بوجھ کر اداس شکل بنائے شبانہ کے ابو اور عقیل بھائی کے پاس بیٹھا افسوس کرتا رہا۔ پھر وہ پھوپھی اور ابو کے ساتھ قبرستان چلا گیا واپس آکر شبانہ کے پاس آکر بولا۔ "آئی ایم سوری شبانہ! میں تار ملتے ہی آجاتا مگر کچھ ایسی پرابلمز میں پھنسا تھا کہ نہ آسکا۔ آپی کا مجھے بہت افسوس ہوا تھا۔"

شبانہ نے بھی دو ایک رسمی سے جواب دیئے اور یہ کہہ کر بھابھی نجمہ کے کمرے میں چلی گئی کہ بھابھی نے اسے بلایا ہے۔ ظفر بھی نیچے چلا گیا تھوڑی دیر بعد عقیل بھائی کے کمرے۔۔۔ سے اس کے منہ پھاڑ کر ہنسنے کی بے ہنگم آواز آئی تو شبانہ کو بہت برا لگا ظفر پندرہ دنوں کے لئے آیا تھا رات کو وہ اپنے رنگ محل والے مکان پر سوتا اور دن بھر کینال بینک والی کوٹھی میں منڈلاتا رہتا۔

شبانہ بارہ بجے کے بعد یونیورسٹی سے واپس آتی تو ظفر عجیب عجیب لباس میں اس کا منتظر ہوتا چونکہ شبانہ کے ابو اور بھائی عقیل نے ظفر کو بہت منہ لگا رکھا تھا اس لئے وہ شبانہ سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا اس کے رویے میں۔۔ کچھ کچھ اہانت کا پہلو بھی جھلکنے لگا تھا جیسے وہ شبانہ کو اپنے زیر دام سمجھ رہا ہو شبانہ بھی اس کی ذرا پروا نہیں کرتی تھی مگر اندر سے وہ ایک طرح کا خوف سا محسوس کرنے لگی تھی حقیقت یہ تھی کہ غزالہ اور امی کی موت کے بعد وہ اپنے آپ کو بے یار و مددگار سمجھنے لگی تھی وہ جانتی تھی کہ اب اس خاندان میں ایسا کوئی شخص نہیں ہے جو اس کے دل کو سمجھ سکے اور مصیبت کے وقت اس کی حمایت کر سکے۔

ظفر کی ماں نے شبانہ کے ابو سے ایک بار پھر بیاہ کی بات چھیڑ دی اور کہا کہ بچی کو آگے پڑھا کر کیا کرلو گے ظفر آیا ہوا ہے چار کلمے پڑھا کر اسے ساتھ ہی امریکہ بھیج دو اس بار شبانہ کے ابو نے اپنی بہو نجمہ کے ذریعے شبانہ کا عندیہ معلوم کیا تو شبانہ نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا میں جب تک اپنی پڑھائی مکمل نہ کرلوں شادی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی پھر اس نے نجمہ بھابھی کا ہاتھ پکڑ لیا اور منت کے انداز میں کہا بھابھی! تم عقیل بھائی جان کو سمجھاؤ کہ میری شادی یہاں نہ کریں میں ظفر کے ساتھ خوش نہیں رہ سکوں گی۔

بھابھی نجمہ ایک عام لڑکی تھی اس نے شبانہ کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ "اری امریکہ جا کر عیش کرے گی وہاں ایسی ایسی وائیل اور ریشم کی چادریں ملتی ہیں کہ سارا لگمٹی بازار چھان مارو کبھی نہیں ملیں گی میں تو خود سوچ رہی ہوں کہ عقیل سے کہوں۔ یہاں کا کام سمیٹو اور امریکہ چلے چلو کہتے ہیں وہاں سونا بھی سستا ہے۔"

شبانہ ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گئی ایک روز شبانہ یونیورسٹی کیمپس کے لان میں نجمی کے ساتھ بیٹھی کافی پی رہی تھی کہ نجمی نے شبانہ کو کہنی مار کر کہا۔ "یہ لو وہ یہاں بھی آگیا ہے۔"

شبانہ نے سر گھما کر دیکھا ظفر سرخ رنگ کی ٹیوٹا گاڑی سے باہر نکل رہا تھا اس نے دور ہی سے شبانہ کو ہاتھ اٹھا کر امریکی طرز میں سلام کیا نجمی کو معلوم تھا کہ شبانہ ظفر سے بیاہ نہیں کرنا چاہتی کیونکہ ان دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا شبانہ ایک آئیڈیل پرست اور خوابوں میں رہنے والی لڑکی تھی جبکہ ظفر کا آئیڈیل صرف دولت تھا اور وہ دولت کمانے کے ہی خواب دیکھتا تھا شبانہ نے کافی کا مگ گھاس پر رکھ دیا۔

"یہ کم بخت یہاں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا نجمی تم مجھے اکیلی چھوڑ کر نہ جانا پلیز۔"
نجمی وہیں بیٹھی رہی۔ ظفر کاؤ بوائے کی طرح چلتا چیونگ گم چباتا قریب آکر بے تکلفی سے گھاس پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"میں ادھر اپنے ایک مجسٹریٹ دوست سے ملنے آیا تھا سوچا تمہاری یونیورسٹی دیکھتا چلوں۔ اچھی یونیورسٹی ہے تم کیسی ہو نجمی؟" نجمی نے سر ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہوں۔"

"ویری گڈ! چاکلیٹ تمہیں ضرور پسند ہوں گے۔" اور ظفر نے جیب سے چاکلیٹ کی بار نکال کر اس کے دو ٹکڑے کئے ایک نجمی اور ایک شبانہ کو پیش کیا۔ شبانہ نے بیزاری سے کہا۔

"میں چاکلیٹ نہیں کھایا کرتی۔" نجمی نے کہا۔ "لاؤ دونوں مجھے دیدو مجھے چاکلیٹ بہت پسند ہیں۔" ظفر منہ پھاڑ کر ہنسا اور بولا۔ "ونڈر فل" نجمی میں تمہارے لئے امریکہ سے چاکلیٹ لاؤں گا۔ امریکہ میں چاکلیٹ بہت عمدہ ہوتے ہیں پھر اس نے جیب سے بٹوہ نکال کر کھولا اور بیس بیس ڈالر کے نوٹوں کی بھرپور جھلک دکھا کر کریڈیٹ کارڈ باہر گرا دیا پھر جلدی سے اسے اٹھایا اور بولا۔

"شبانہ! یہاں امریکن ایکسپریس والوں کا کریڈیٹ... کارڈ تو نہیں چلتا میرا خیال ہے۔"... شبانہ نے منہ سکیڑتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیا معلوم"...... نجمی بولی۔

"تم کسی بینک سے دریافت کر لو۔" ظفر ایک بار پھر گنواروں کی طرح ہنسا۔

"بینک والوں کا اس کریڈیٹ کارڈ سے کوئی لنک نہیں ہے بہت بلند چیز ہے امریکن ایکسپریس والوں کا کریڈیٹ کارڈ تو امریکہ میں بھی کسی کسی کو ہی ملتا ہے اس کارڈ پر میں جب اور جس وقت چاہوں دنیا کے کسی بڑے دارالسلطنت کے بڑے سے بڑے ہوٹل میں جا کر ٹھہر سکتا ہوں مجھے ایک سینٹ بھی ادا نہیں کرنا۔ . پڑے گا۔" نجمی نے کہا۔

"تو کیا یہ سب کچھ مفت ہی چلتا ہے؟"

ظفر نے پھر وہی بے ہنگم قہقہہ لگایا شبانہ کے کانوں میں جیسے کسی نے کھولتا ہوا پانی ڈال دیا اسے نجمی پر سخت غصہ آرہا تھا کہ خواہ مخواہ اس سے باتیں کیوں کئے جا

رہی ہے شبانہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ارے میں تو نوٹس کلاس روم میں ہی بھول آئی ابھی لے کر آتی ہوں۔" اور وہ تیز تیز قدموں سے چلتی کاریڈور میں آگئی جب وہ اپنی طرف سے کافی دیر لگا کر واپس آئی تو دیکھا کہ نجمی بھی ظفر کے ساتھ قہقہے لگا رہی تھی جانے کیوں شبانہ کو نجمی کا اس طرح بے تکلفی سے ہنسنا پسند نہ آیا۔ انہوں نے کافی بھی منگوا رکھی تھی۔ شبانہ کو دیکھ کر ظفر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"شبو! تمہارا کیا خیال ہے؟ نجمی کہہ رہی ہے کہ مجھے گلبرگ میں کوٹھی بنانی چاہیئے اور میں سوچ رہا ہوں کہ جزیرہ ہوائی میں کسی جھیل کے پاس کاٹیج بنواؤں وہاں جواہرات کا کاروبار بھی خوب ہوتا ہے ارے ہاں یہ تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گیا شبانہ میں نے امریکہ میں ہیرے جواہرات کا کاروبار بھی شروع کر دیا ہے۔" نجمی نے شبانہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"اری شبو! ظفر بھائی جان نے ایک ہیرا مجھے دکھایا ہے سچ ایسا چمکیلی تراش والا ہیرا میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

شبانہ بادل نخواستہ وہاں ایک بار پھر بیٹھ گئی اب ظفر نے دوسری جیب میں سے مخمل کی چھوٹی سی تھیلی نکالی اور اس میں سے سبز کاغذ میں لپٹا ہوا ہیرا نکال کر شبانہ کو دکھایا۔ شبانہ نے اسے ایک نظر دیکھ کر کہا۔

"اچھا ہے" اور پھر بولی۔

"نجمی! میں اب گھر جاؤں گی۔" اس پر ظفر فوراً بولا۔

"میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں عقیل بھائی سے ایک ضروری کام ہے۔" شبانہ نے کہا۔

"وہ اس وقت گھر پر کبھی نہیں ہوتے۔" یہ محض اتفاق تھا کہ شبانہ کی گاڑی سروس اسٹیشن پر تھی۔

ظفر ہنس کر بولا۔ "وہ کوٹھی پر ہی ہے میں نے تھوڑی دیر پہلے اسے فون کیا تھا۔

وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا آؤ گھر چلتے ہیں۔"

شبانہ انکار نہ کر سکی اور ظفر کے ساتھ سرخ ٹیوٹا میں بیٹھ کر کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئی راستے میں ظفر نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اپنی شادی کی بات چھیڑ دی۔ اس کے انداز اور باتوں سے شبانہ نے پہلے بھی یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ شبانہ ہی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور یہ شادی وہ شبانہ کے سر کو نیچا کرنے اور اس پر فتح حاصل کرنے کے لئے کرنا چاہتا ہے۔

ظفر کے لئے لڑکیوں کی کمی نہیں تھی اس کے ساتھ رشتے داروں میں کوئی بھی اپنی لڑکی بیاہنے کے لئے تیار تھا مگر وہ صرف شبانہ ہی سے شادی کرنے کا عزم کئے ہوئے تھا وہ شبانہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ ممکن تھا کہ شادی کے بعد وہ اسے چھوڑ کر کسی دوسری لڑکی سے شادی کر لے مگر یہ شادی اس کے وقار کا مسئلہ بن گئی تھی۔

شبانہ نے بھی عہد کر رکھا تھا کہ وہ ہرگز ہرگز اس چھوٹی سطح کے آدمی سے بیاہ نہیں کرے گی جب ظفر نے بیاہ کی تاریخ کے بارے میں شبانہ کو بتایا کہ وہ اسی برس موسم گرما میں واپس آکر اس سے بیاہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو شبانہ کو سخت غصہ آ گیا وہ کہنا نہیں چاہتی تھی مگر اس سے رہا نہ گیا اس نے ظفر کی طرف دیکھے بغیر کڑوے لہجے میں کہا۔

"میں کوئی بھیڑ بکری نہیں ہوں ظفر صاحب کہ صرف آپ ارادہ کریں اور مجھے خرید کر امریکہ لے جائیں شادی کے لئے میری مرضی بھی ضروری ہے اور میں ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔"

ظفر کار ڈرائیو کرتے ہوئے سامنے سڑک پر نظریں جمائے ہوئے تھا اس نے بھی کسی قدر تلخی سے کہا۔ "شادی کرنا نہیں چاہتی ہو یا صرف مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔"

شبانہ نے فوراً جواب دیا۔ "یہی سمجھ لو کہ میں تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔" ظفر کے چہرے پر سے ایک سایہ سا آکر گزر گیا۔ اس نے آگے کوئی بات نہ کی یونیورسٹی کیمپس سے شبانہ کی کینال بینک والی کوٹھی "کینال لاج" زیادہ دور نہیں تھی ظفر نے کار کوٹھی کے پورچ میں کھڑی کی تو شبانہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی ظفر اب بھی خاموش رہا اس کے اندر جیسے زہر کا پھپھولا پھوٹ پڑا تھا اور اس کا سارا زہر اس کے جسم میں سرایت کر گیا تھا یہ زہر مطالبہ کر رہا تھا کہ مجھے شبانہ چاہیے شبانہ ہی اب وہ تریاق تھا جو ظفر کے خون سے زہریلے اثرات نکال کر باہر پھینک سکتا تھا۔

شبانہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی طرف چلی۔ ۔ گئی اور ظفر کار بند کر کے چابی کی زنجیر انگلی کے ساتھ گھماتا کسی گہری سوچ میں گم عقیل بھائی کے کمرے کی طرف بڑھا۔ ۔ شبانہ کا چھوٹا بھائی عامر امریکہ جا کر انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کو شروع ہی سے بیتاب تھا دوسری طرف ظفر بھی اس تلاش میں تھا کہ اسے شبانہ کے قلعے کی دیوار توڑنے کا کوئی موقع ہاتھ لگے۔

عامر نے امریکہ جانے کی خواہش کا مکرر اظہار کیا تو ظفر اسے ساتھ لے جانے پر تیار ہو گیا وہ شبانہ کی فیملی کو اپنے احسانوں کے بوجھ تلے کچھ اس طرح دبانا چاہتا تھا کہ وہ وقت آنے پر اس کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکیں عقیل بھائی اور ابو بھی راضی ہو گئے انہیں اور کیا چاہیئے تھا چنانچہ ظفر جب پندرہ دن بعد امریکہ واپس جانے کے لئے طیارے میں سوار ہوا تو شبانہ کا چھوٹا بھائی عامر بھی اس کے ساتھ تھا۔

شبانہ نہیں چاہتی تھی کہ ظفر کا احسان لیا جائے مگر اس کی اب وہاں کون سنتا تھا اس کی بات سننے والی عزالہ اور اس کی امی اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ شبانہ دل مسوس کر رہ گئی لیکن یہ احساس اس کی تالیف قلب کا باعث بھی۔ ۔ ۔ ۔ تھا کہ ظفر لاہور سے چلا گیا۔

جنوری کا ابر آلود موسم تھا کہ رنگون میں بہادر شاہ ظفر کا مزار دیکھنے کے لئے ایم اے کی طالبات کو رنگون یونیورسٹی کا ایک دعوت نامہ آ گیا ہر لڑکی کو پانچ ہزار روپے جمع کروانے تھے۔

کل بارہ لڑکیاں رنگون جا رہی تھیں۔ شبانہ کا خیال راحیل کی طرف چلا گیا اس نے کہا تھا۔

"میں دریائے ایراوتی کے شہر میں تمہیں ملوں گا دریائے ایراوتی کے شہر میں جب بارش ہوتی ہے تو اندھیرا چھا جاتا ہے اور فضا صندل ناریل اور کیلے کے درختوں کی ٹھنڈی مہک سے لبریز ہو جاتی ہے۔"

شبانہ نے فوراً پانچ ہزار روپے جمع کروا دیئے اور ٹیم میں اپنا نام لکھوا دیا اس نے ابو اور عقیل بھائی سے اجازت بھی لے لی یونیورسٹی کی دو پروفیسرز بھی ساتھ جا رہی تھیں نیم سرکاری ٹور تھا نجمی کے پاس جمع کروانے کے لئے اتنی رقم نہیں تھی۔

شبانہ نے رقم خود جمع کروانی چاہی مگر اس کے ماں باپ نے لڑکی کو رنگون جانے کی اجازت نہ دی۔ نجمی لاہور میں ہی رہ گئی اور شبانہ کالج کی لڑکیوں کے ساتھ اپنی... پروفیسروں کی نگرانی میں رنگون روانہ ہو گئی۔

رنگون ایئر پورٹ پر حکومت برما کے محکمۂ تعلیم کے اعلیٰ افسران اور رنگون گورنمنٹ کالج فار گرلز کی لیڈی پروفیسروں نے پاکستانی وفد کا خیر مقدم کیا انہیں دو کاروں میں ایئر پورٹ سے منکی پوائنٹ میں دریائے ایراوتی کے کنارے ایک گرلز ہوسٹل میں پہنچا دیا گیا ان کی رہائش کے لئے ہوسٹل کے ایک پورے ونگ کو خالی کروا دیا گیا تھا۔ شبانہ کو [illegible] کی کھڑکی میں سے دریا نظر آیا تو اس نے برمی لیڈی پروفیسر می ہونگ سے... پوچھا کہ ایراوتی دریا ہے؟ می ہونگ مسکرائی۔

"یس! یہ ایراوتی ہے۔ رنگون کا سب سے خوبصورت دریا۔" شبانہ راحیل کے خیال میں کھو گئی۔ کیا اس دریا کے کنارے وہ اس کا انتظار کر رہا ہو گا؟ کیا معلوم وہ کہاں ہو؟ کس ملک میں ہو؟ کس دیس میں ہو؟

اس کے بارے میں شبانہ کو کچھ بھی تو معلوم نہیں تھا۔ دریا کا پاٹ کافی چوڑا تھا اس کنارے پر ناریل اور تاڑ کے درخت دریا پر جھکے ہوئے تھے۔ دریا کی

سطح پر ماہی گیروں کی کشتیاں اِدھر اُدھر تیرتی نظر آ رہی تھیں شبانہ پہلی بار برما کا دارالسلطنت دیکھ رہی تھی اونچی عمارتیں کشادہ سڑکیں، ٹرامیں، بگھیاں رکشے جنہیں انسان کھینچ رہے تھے۔ ریستورانوں کے باہر لٹکتے زرد کیلوں کے گچھے اور رنگ برنگی لنگیوں اور سفید فراکوں میں ملبوس زرد رنگ کی برمی عورتیں آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ دن کے چار بج رہے تھے فضا میں ناریل اور کافی کی مہک رچی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ گرلز ہوسٹل کے ایک کمرے میں دو دو لڑکیوں کو ٹھہرایا گیا۔ شبانہ کے ساتھ شادباغ لاہور کی عارفہ ٹھہری شبانہ اسے پسند کرتی تھی۔ بڑی صاف ستھرے ذہن کی پاک صاف لڑکی تھی کبھی کوئی غیر ضروری بات نہیں کرتی تھی شبانہ کے بعد وہ اس کے گروپ کی سب سے سنجیدہ لڑکی تھی جسے کچھ شوخ لڑکیاں بقراط بیگم کے نام سے بھی پکارتی تھیں۔

عارفہ نے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں سیل بہت ہے۔"

شبانہ نے کھڑکی کھول دی اور بولی۔

"یہ مرطوب ملک ہے عارفہ! یہاں بھی کولمبو اور تھائی لینڈ کی طرح بہت بارشیں ہوتی ہیں دیکھو باہر آم کے درخت پر کتنے سنہری سنہری آم لگے ہیں۔"

عارفہ نے آنکھوں پر عینک ٹھیک طرح سے جماتے ہوئے کھڑکی سے باہر جھک کر دیکھا۔ آم کے ایک گنجان درخت پر زرد اور سنہری آم لٹک رہے تھے عارفہ کہنے لگی۔ "بالکل اپنے لاہور کے آم لگتے ہیں۔"

شبانہ نے مسکرا کر کہا "آم تو ہر جگہ کے ایک جیسے ہی ہوتے ہوں گے۔" عارفہ کھڑکی سے ہٹ کر پلنگ کی طرف گئی اور اپنے سوٹ کیس میں سے کپڑے باہر نکالتے ہوئے بولی۔

"میرا بھائی لندن گیا تھا واپس آ کر اس نے بتایا کہ لندن کے آم میٹھے تو ہوتے ہیں مگر ان میں خوشبو نہیں ہوتی۔"

شبانہ کھڑکی میں سے باہر درختوں کو تک رہی تھی ان میں آم کے درخت

بھی تھے ناریل اور تاڑ کے درخت بھی تھے اور کچھ ایسے درخت بھی تھے جنہیں شبانہ نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ عارفہ اپنے لمبے سیاہ بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"شبو! بہادر شاہ ظفر کا مزار دیکھنے ہم کل جائیں گے کیا؟"

"میرا خیال ہے کل ہی لے جائیں گے یہ لوگ مگر یہاں ہمیں کچھ لیکچر بھی تو دیئے جائیں گے۔" شبانہ نے پلنگ پر آرام سے نیم دراز ہوتے ہوئے کہا عارفہ گیلے تولیے سے اپنی گردن رگڑنے لگی۔

"اگر یہ سرکاری کلچرل ٹور تھا تو ہم سے پانچ پانچ ہزار روپیہ فی لڑکی کیوں لیا گیا؟ یہ بہت رقم ہے۔" شبانہ اب بھی کھڑکی سے باہر تک رہی تھی جہاں سے اسے درختوں کی جھومتی ہوئی شاخیں صاف نظر آ رہی تھیں۔

"ہوائی جہاز میں آنے جانے کا کرایہ بھی تو بہت لگتا ہے اور پھر یہ نیم سرکاری ٹور ہے چلو اسی بہانے رنگون کی سیر بھی کر لیں گے۔" عارفہ بولی۔

"مجھے تو بہادر شاہ ظفر کا مزار دیکھنے کا بڑا شوق ہے میں وہاں فاتحہ ضرور پڑھوں گی۔" شبانہ کا خیال راحیل کی طرف سے پلٹ آیا کہنے لگی۔

"کیوں نہیں فاتحہ خوانی تو ہم سب کریں گے۔" عارفہ غسل خانے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"یہ چائے کب دیں گے ہمیں میرے تو سر میں درد شروع ہو گیا ہے۔" شبانہ بھی چائے کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ اتنے میں شبانہ کی کچھ ساتھی لڑکیاں ہنستی چہلیں کرتی کمرے میں آ گئیں۔ صدف نے اِدھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے پوچھا۔

"بقراط بیگم کہاں ہے؟"

عاشی نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا "شبو! بقراط بیگم تمہیں بہت بور کرے گی۔" نائیلہ نے ہنس کر کہا۔

"یہ شبو بھی تو آدھی بقراط بیگم ہے اس پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔" اور سب قہقہہ

لگا کر ہنس پڑیں شبانہ بولی۔

"دوستو! چائے کب ملے گی؟ کہاں ملے گی؟ کیسے ملے گی؟" عاشی نے گردن اٹھا کر کہا۔

"جناب یہ چائے کے باغوں کا ملک ہے چلو نیچے ڈائننگ روم میں چل کر چائے کا مطالبہ کرتے ہیں۔" شبانہ نے فوراً کہا۔

"نہیں نہیں عاشی! ہمیں کوئی ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیئے جس سے ہمارے ملک کی بدنامی ہو۔" صدف نے منہ بنا کر کہا۔

"ہم چائے پینے جا رہے ہیں کوئی ڈاکہ مارنے نہیں جا رہے۔"

"میرا مطلب ہے ہمیں نیچے چل کر ڈائننگ روم میں بیٹھ جانا چاہیئے چائے کا وقت ویسے بھی ہو رہا ہے چائے ضرور آ جائے گی۔"

شبانہ کی اس بات پر دوسری لڑکیاں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں نائیلہ بولی۔ "تو پھر تم ہماری لیڈر بن کر آگے آگے چلو اگر دس منٹ کے اندر اندر، بسکٹوں کے ساتھ چائے نہ آئی تو ہم اٹیک کر دیں گے۔"

سب لڑکیوں نے اونچی آواز میں "شبانہ زندہ باد" کے نعرے لگائے اور شبانہ کو اپنا لیڈر بنا کر آگے آگے چلاتی نیچے ڈائننگ روم میں لے آئیں برمی لیڈی پروفیسر می ہونگ نے انہیں دیکھ کر مسکراتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

"سسٹرز! ٹی از ریڈی۔"

عاشی نے آہستہ سے پنجابی میں کہا۔

"ایہہ ساڈی مامی کتھوں آ گئی اے۔"

شبانہ نے برمی لیڈی پروفیسر کا شکریہ ادا کیا اور انگریزی میں کہا۔

"ہم چائے پینے ہی نیچے آ رہی تھیں۔ ہمیں آپ کا ملک بہت پسند آیا ہے۔"

صدف نے شوخی سے کہا "اور تم بھی ہمیں بہت پسند ہو۔" برمی لیڈی پروفیسر نے شکریہ ادا کرنے کے انداز میں تھوڑا سا سر جھکایا اور مسکراتی ہوئی کچن کی طرف

گھوم لیں۔ دوسرے روز رنگون کے گورنمنٹ گرلز کالج کے آڈیٹوریم میں کالج کی پرنسپل نے برما کی ثقافتی تاریخ اور وہاں مسلمانوں کی آمد کے بارے میں ایک لیکچر دیا۔ شبانہ بھی اپنے وفد کی پاکستانی لڑکیوں کے ساتھ وہاں موجود تھی۔ پھر انہیں کالج کی لیبارٹریز دکھائی گئیں۔ اس کے بعد یہ بہادر شاہ ظفر کے مزار کی طرف روانہ ہو گئیں۔

بہادر شاہ ظفر کا مزار رنگون شہر سے دور ایک پہاڑی کے دامن میں واقع ہے ایک فوجی بیرک نما خانقاہ میں چھوٹا سا مزار ہے جہاں اسماء ربانی کے طغرے لگے تھے اگربتیاں سلگ رہی تھیں کچھ عقیدت مندوں نے پتھر کی جالیوں میں منت کے سرخ و سیاہ دھاگے باندھ رکھے تھے کئی لڑکیوں نے وہاں تصویریں اتاریں سب نے مل کر فاتحہ پڑھیں اور ہندوستان کے آخری بادشاہ کی روح کو ثواب پہنچایا۔ مزار کی حالت اچھی نہیں تھی۔ یہاں سے واپسی پر دن کا ایک بج گیا۔ کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کیا اور پھر لڑکیاں شہر میں شاپنگ کے لئے نکل گئیں۔

شبانہ بھی ان کے ساتھ تھی سوامی پگوڈا رنگون کا سب سے بڑا بودھ مندر ہے اور ایک بہت بڑے اور بلند چبوترے پر بنا ہے اس میں ساکیہ شہزادے گوتم بدھ کی سونے کی مورتیاں بھی رکھی گئی ہیں کئی سیڑھیاں چڑھ کر مندر کے بڑے دروازے تک جانا پڑتا ہے ہر پچاس ساٹھ سیڑھیوں کے بعد ایک کشادہ ڈیوڑھی آجاتی ہے جس کی دونوں جانب برمی لڑکیاں اور عورتیں پانی سے بھری ہوئی لکڑی کی بالٹیوں میں کنول، رجنی گندھا اور رتنا گری کے پھولوں کے بڑے بڑے گلدستے رکھے بیٹھی ہوتی ہیں۔ زائرین ان سے پھول خرید کر لے جاتے ہیں اور اوپر بودھ مندر میں ساکیہ شہزادے کی مورتی کے قدموں میں رکھ دیتے ہیں اور اگربتیاں سلگاتے ہیں موم بتیاں روشن کرتے ہیں اور دنیا بھر کے لوگوں کی بھلائی اور امن کے لئے دعائیں مانگتے ہیں۔

شبانہ نے اس بودھ مندر یعنی سوامی پگوڈا کی بہت تعریف سن رکھی تھی فریزر اسٹریٹ میں تھوڑی بہت شاپنگ کے بعد باقی لڑکیاں تو واپس ہوسٹل کو

چل دیں اور شبانہ اکیلی ہی رکشے میں بیٹھ کر سوامی پگوڈا مندر کی طرف روانہ ہو گئی۔ رنگون میں رکشے کو لنچہ کہتے ہیں اور جو آدمی رکشہ چلاتے ہیں وہ عام طور پر تامل، لوگ ہوتے ہیں جنہیں فرنگی کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے ان کالے کلوٹے فرنگیوں نے اپنے بالوں کا سر کے پیچھے جوڑا بنا رکھا ہوتا ہے اور پتلی پتلی ٹانگوں سے رنگون کی سڑکوں پر کافی تیز رکشا بھگاتے ہیں۔

شبانہ کو یہ سواری پسند نہیں تھی مگر وہاں کوئی ٹیکسی یا بگھی وکٹوریہ بھی اس وقت نہیں تھی۔ مجبوراً اسے انسانی رکشہ پر ہی سوار ہو کر سوامی پگوڈا پہنچنا پڑا۔

مندر کی فراخ سیڑھیوں کی دونوں جانب ناریل کے اونچے اونچے درختوں نے اپنا سایہ ڈال رکھا تھا۔ اس نے کچھ یورپی سیاح عورتوں کو بھی دیکھا جو مندر کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھیں چند ایک برمی بھکشو زرد لباسوں میں ملبوس سر جھکائے بڑے احترام کے ساتھ اوپر جا رہے تھے۔ پچاس ساٹھ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد پہلی کشادہ ڈیوڑھی آئی تو شبانہ نے دیکھا کہ دونوں جانب برمی عورتیں اور نوجوان لڑکیاں پھول بیچ رہی تھیں۔

انہوں نے رنگ برنگے لہنگے اور سفید کرتیاں پہن رکھی تھیں۔ کئی عورتوں نے برمی لوگوں کی طرح سروں پر زرد یا قرمزی رومال بھی باندھ رکھے تھے۔ یورپی سیاح عورتیں پھول خریدنے کے لئے رک گئیں۔ برمی بھکشو جنہیں رنگون میں پھونگی کہا جاتا ہے خود پھول نہیں خریدتے بلکہ انہیں پھول بیچنے والیاں خود اٹھ کر عقیدت سے پھول پیش کرتی ہیں۔ شبانہ نے اس طرح کے کنول کے پھولوں کو تصویروں میں ہی دیکھا تھا اب جب اس نے بالٹیوں کے ٹھنڈے پانی میں کنول کے کھلے ہوئے پھولوں کے گچھوں کو سر اٹھائے دیکھا تو اس کا چہرہ ایک انجانی روحانی مسرت سے چمک اٹھا۔

کنول کے پھول کو پاکیزگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ یہ واحد پھول ہے جو تالاب یا جھیل کے کیچڑ میں اگتا ہے مگر کیچڑ سے پاک رہتا ہے اور اپنا شاہانہ کھلا ہوا چہرہ پانی کی سطح سے اوپر اٹھائے رکھتا ہے۔

کنول کو برمی دیو مالا میں روحانی ارتقاء اور روح کے امن کی علامت بھی سمجھا جاتا
جاتا ہے شبانہ ان پھولوں کے قریب آ گئی۔ بالٹی میں بے داغ سفید اور ہلکے قرمزی
کنول پھولوں کے گچھے مسکرا رہے تھے۔ شبانہ انہیں دیکھتی رہ گئی۔ یہ کس عظیم مصور کے
ہاتھ تھے جس نے اتنی عالی شان حسین اور باوقار پھول بنایا تھا۔ پھول بیچنے والی لڑکی
شبانہ کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی

اس نے ٹوٹی ہوئی انگریزی میں پوچھا۔ وہ کون سے پھول خریدنا پسند کرے گی
شبانہ نے سوچا کہ ان پھولوں پر تو خود قربان ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ ان کی کوئی
قیمت نہیں تھی لیکن وہ انہیں خرید کر ہی حاصل کر سکتی تھی۔ شبانہ نے پھول بیچنے والی
لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کا معصوم چہرہ بھی کنول کے پھول کی طرح شگفتہ پاکیزہ اور
مقدس کیفیات کا حامل تھا۔ اٹھارہ انیس سال کی عمر ہوگی۔ زرد لہنگے اور سفید کڑھائی
کی کرتی میں ملبوس وہ کنول پھولوں کی بالٹیوں کے پیچھے لکڑی کی چوکی پر بیٹھی تھی۔ اس
نے اپنے سیاہ بالوں کے جوڑے میں بھی کنول کا ایک پھول سجا رکھا تھا۔ وہ مسکراتے
ہوئے معصومیت کے ساتھ شبانہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے دانت پاکیزہ سمندروں کے
موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ قدرت کی آغوش میں کئی نسلیں اپنے نیک اعمال کے
خزانے جمع کراتی ہیں تو کہیں ایک نسل کو خوبصورت چہرے اور موتیوں ایسے دانت
نصیب ہوتے ہیں۔

اس پھول بیچنے والی لڑکی کے چہرے پر نیک خیالات رکھنے والی ماں کا نور
چمک رہا تھا اس کے نقوش برمی نہیں تھے۔ شبانہ نے مسکراتے ہوئے اس
سے اس کا نام پوچھا لڑکی نے شرماتے ہوئے کہا۔ "روہنی" اس پھول بیچنے والی
لڑکی کا نام روہنی ہے۔ یہ برمی نام نہیں تھا۔

شبانہ نے اس سے کنول پھولوں کا ایک گلدستہ خریدا اور باتیں کرنے لگی
روہنی نے اسے بتایا کہ اس کی دادی شمالی ہند سے یہاں آ کر آباد ہو گئی تھی۔ شہر
کے باہر ان کا ایک چھوٹا سا باغ تھا جہاں تالاب میں انہوں نے کنول اگا رکھے تھے۔

روہنی نے شبانہ کے پوچھنے پر بتایا کہ وہ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں بھی بات
کر لیتی ہے۔ "امی کو ہندوستانی بولنا اچھا لگتا ہے۔" اس قسم کی اردو رنگون میں عام
بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ شبانہ نے کہا۔

"ہم واپسی پر تمہیں ملتے جائیں گے۔" اور مسکرا کر لڑکی کو سلام کیا اور سوامی پگوڈا کی
سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ مندر کے فراخ صحن میں پہنچ کر وہ ساکیہ شہزادے کی جگہ نصب
پتھر اور پیتل کی مورتیوں کو دیکھنے لگی۔ وہ بت پرست نہیں تھی۔ اس لئے شبانہ نے
کنول کے گلدستے کو صحن کی ایک جانب اگے ہوئے ناریل کے درختوں میں جا کر گھاس
پر ڈال دیا۔ پھول درختوں اور گھاس کو پسند کرتے ہیں۔

پتھر کی مورتیوں کے پاس ان کا دم گھٹتا ہے۔ وہ خود بھی پتھر ہو جاتے ہیں۔
شبانہ نے گھوم پھر کر سارے پگوڈا کو دیکھا۔ واقعی بہت شاندار بدھ مندر تھا۔ ساکیہ
شہزادے گوتم کا وہ بڑا احترام کرتی تھی۔ اس لئے کہ اس نے دکھی انسانوں کی بھلائی
اور ان کے دکھوں کا علاج تلاش کرنے کی خاطر محل کا عیش و آرام اور اپنی بیوی اور
بچے کو چھوڑ دیا تھا۔

گوتم بدھ کی نیت پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ فضا میں اگربتیوں اور لوبان کی
بوجھل خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ معبد سے واپس آنے سے پہلے شبانہ ایک بار پھر ناریل
کے درختوں کے پاس گئی۔ اس کے کنول کے پھول اسی طرح ہری بھری گھاس پر لیٹے
ہوئے تھے۔ شبانہ کو وہ بڑے پیارے لگے جیسے معصوم شہزادے زمین کی سیج پر
سو رہے ہوں۔

دوپہر کے بعد ہی سے رنگون کے آسمان پر کالی گھٹائیں چھانا شروع ہو گئی تھیں۔
رنگون میں بارشیں بہت ہوتی ہیں۔ یہ موسلا دھار بارشیں ہوتی ہیں بارش رک بھی جائے
تو آسمان پر بادل ہفتہ ہفتہ بھر چھائے رہتے ہیں۔ شبانہ معبد کی سیڑھیاں اتر کر
جب اس ڈیوڑھی میں آئی جہاں پھول بیچنے والی لڑکی روہنی تھی تو ہلکی ہلکی بوندا باندی
ہونے لگی۔

روہنی نے شبانہ کو رجنی گندھا پھولوں کا ایک چھوٹا سا گلدستہ پیش کیا۔ شبانہ نے اس کی قیمت ادا کرنی چاہی تو روہنی نے ہاتھ جوڑ لئے اور نفی میں سر ہلا کر پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ شبانہ نے روہنی کا شکریہ ادا کیا اور خاموشی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔

جب وہ سڑک پر آئی تو بارش زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ وہاں کوئی رکشہ وغیرہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ شبانہ جلدی سے ایک گنجان درخت کے نیچے آ کر کھڑی ہو گئی۔ بارش کے قطرے درخت کی شاخوں میں سے اس کے اوپر ٹپک رہے تھے۔ اس نے رجنی گندھا کے پھولوں کو اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک کالے رنگ کی چھوٹی سی موٹر کار عقب کی طرف سے آئی اور شبانہ کے قریب آ کر سڑک کے کنارے رک گئی۔ شبانہ نے کوئی خیال نہ کیا لیکن جب اسے پائپ کے تمباکو کی ہلکی سی مہک محسوس ہوئی تو اس نے پلٹ کر گاڑی کی طرف دیکھا۔ گاڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ اسٹیئرنگ پر راحیل پائپ لئے بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"رنگون کی بارش بڑی رومانٹک ہے مگر تم بھیگ جاؤ گی۔" شبانہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ راحیل نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم رنگون میں ہو۔"

گاڑی گرتی بارش میں رنگون کی دھندلی اور ناریل کے درختوں میں گھری ہوئی سڑک پر چلی جا رہی تھی اور شبانہ سوچ رہی تھی کہ وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی۔ رجنی گندھا کے پھولوں کی گہری طلسمی خوشبو اسے سرگوشیوں میں کہہ رہی تھی۔ شبانہ تم خواب دیکھ رہی ہو، خواب دیکھ رہی ہو۔

۔۔ ۔۔ ۔۔

گاڑی گرتی بارش میں رنگون کی سڑکوں پر چلی جا رہی تھی۔ شبانہ نے راحیل کو بتایا کہ وہ منکی پوائنٹ والے گرلز ہوسٹل میں ٹھہری ہوئی ہے۔ راحیل کی نگاہیں سامنے سڑک پر گرتی بارش پر جمی تھیں۔ اس نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" اس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ شبانہ ایک ایک سڑک کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ جب گاڑی ایک سڑک کا موڑ گھوم کر دریائے ایراوتی کے ساحل والی سڑک پر آئی تو شبانہ نے پہچان لیا۔ یہی وہ سڑک تھی جو گرلز ہوسٹل کو جاتی تھی۔ راحیل نے ہوسٹل کی ایک جانب سڑک کے کنارے درختوں میں گاڑی کھڑی کر دی اور شبانہ سے کہا۔

"میرا کاٹج یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے کل تم کس وقت فارغ ہو گی تمہیں اپنا کاٹج دکھانا چاہتا ہوں۔"

دوسرے روز کا سارا شیڈول شبانہ کے سامنے تھا۔ اسے سہ پہر کو ہی وقت مل سکتا تھا۔ راحیل نے کہا۔

"میں کل سہ پہر کو اسی جگہ گاڑی لے کر آ جاؤں گا۔ میں تمہیں ہوسٹل کے اندر لے جاتا لیکن میں جانتا ہوں دوسری لڑکیاں تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر نہ جانے کیا کیا سوچنے لگیں۔۔۔ اب تمہیں بارش میں ہی دوڑ کر ہوسٹل کے گیٹ تک جانا ہو گا۔"

"بارش میں بھیگنا مجھے اچھا لگتا ہے۔"

راحیل نے پائپ کا ہلکا سا کش لیتے ہوئے کہا۔ "بارش ہمیں ہر برسات کے موسم میں ان بنگلوں کی یاد دلاتی ہے جہاں سے نکل کر ہم نے شہر کی سنگین عمارتوں کی طرف اپنا سفر شروع کیا تھا۔ بارش ہمیں واپس لینے آتی ہے۔ میں کل سہ پہر کو آؤں گا... بارش کے ساتھ تمہیں لینے...."

وہ تھوڑا تھوڑا مسکرا رہا تھا۔ شبانہ نے راحیل کو رجنی گندھا کے پھول پیش کرتے ہوئے کہا "تمہیں تو گلاب کے پھول زیادہ پسند ہیں نا؟" راحیل نے رجنی گندھا کی پھولوں بھری ٹہنیاں شبانہ کے ہاتھ سے لے لیں اور بولا۔

"سب سے پہلے پھول انسان کی روح میں اگتے ہیں اس کے بعد وہ ٹہنی پر کھلتے ہیں.. تم اسے مقولہ مت سمجھنا.. یہ بات مجھے خود گلاب کے ایک پھول نے بتائی تھی۔"

شبانہ گاڑی سے نکل کر گرتی بارش میں سڑک کراس کر کے ہوسٹل کے گیٹ کی طرف بھاگی جہاں ناریل کے درخت بارش اور ہوا میں جھوم رہے تھے۔ راحیل شبانہ کو بارش میں دوڑتے دیکھتا رہا... اسے محسوس ہوا جیسے بارش کی تلاش میں بھاگ رہی ہو۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی گہری اور معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے گرتی بارش میں گاڑی آگے بڑھا دی۔

شبانہ کی روم میٹ عارفہ عرف بقراط بیگم نے بھیگے ہوئے کپڑوں کی طرف دیکھ کر تعجب سے پوچھا "تم کہاں چلی گئی تھیں شبانہ؟ یہ تم ساری بھیگ رہی ہو۔" شبانہ اپنے گیلے دوپٹے کو اتار کر کرسی پر ڈالتے ہوئے بولی۔

"سوامی پگوڈا دیکھنے گئی تھی.... واپسی پر بارش شروع ہو گئی... کوئی سواری ہی نہیں ملی... اف کس قدر موسلا دھار بارش ہوتی ہیں یہاں۔" عارفہ قمیض استری کر رہی تھی۔ کہنے لگی.. "جلدی سے کپڑے تبدیل کر دو تمہیں زکام نہ ہو جائے یہاں میرا بھی بڑی جلدی ہو جاتا ہے۔ میں تو تنگ آ گئی ہوں اس شہر سے... مجھے گیلے کپڑے دے دینا... استری کر دوں گی۔"

شبانہ نے دوسرے کپڑے پہن لئے۔ عارفہ اس کے گیلے کپڑوں کو باتھ روم میں جا کر نچوڑ کر لائی اور ان پر استری پھیرتے ہوئے بولی۔ "میں تو ان کے روز روز کے لیکچروں سے تنگ آ گئی ہوں.. وہی باتیں بتا رہے ہیں جو ہمیں پہلے سے معلوم ہیں بہادر شاہ ظفر کا مزار دیکھ لیا ہے... بس... اب تو ہمیں یہاں سے کوچ کر جانا چاہیئے۔"

شبانہ کھڑکی کے پاس والی کرسی پر بیٹھ کر باہر گرتی بارش میں جو تاڑ اور آم کے درخت نظر آ رہے تھے ان کو دیکھنے لگی۔ عارفہ کہہ رہی تھی۔

"یہ لوگ سارا سال کس طرح چاول کھاتے ہیں.. میں تو تنور کی روٹی کو ترس گئی ہوں۔ دھوپ نکلے تو حبس بھی بہت ہو جاتا ہے۔ لاہور کا موسم بہت یاد آ رہا ہے۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے لاہور لاہور ہی ہے۔"

پھر وہ شبانہ کی طرف پلٹ کر بولی۔ "تم تو خاص موچی دروازے کی رہنے والی جدی پشتی لاہوری ہو.. تمہیں لاہور یاد نہیں آتا! ہم تو خیر وزیر آباد سے لاہور میں آئے تھے۔"

شبانہ نے باہر آم کے درخت کی شاخوں میں ایک زرد رنگ کے آم کو تلاش کر لیا تھا جو بارش میں بھیگ رہا تھا۔ شبانہ اسے مسلسل دیکھ رہی تھی اور اس کی روح ایک انجانی، انمول خوشی کی کیفیت میں سرشار ہو رہی تھی۔ ہنری ڈیوڈ تھارو نے اپنی کتاب "والڈن" میں اس خوشی کو ہی روح کی حقیقی مسرت کہا ہے۔

شبانہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے درخت پر لگا، بارش میں بھیگتا زرد ٹھنڈا آم لافانی مسرتوں کی نظر نہ آنے والی لہریں اس کی طرف بھیج رہا ہے جو شبانہ کی گہرائیوں میں اترتی چلی جا رہی ہیں۔ بارش میں بھیگتے آم کو مسلسل دیکھتے رہنے سے اس کی شکل بدل گئی، اب وہ شبانہ کو سورج مکھی کا پھول دکھائی دینے لگا.. پھر وہ گلاب کا پھول بن گیا.. پھر اس نے چمکیلے زرد مرجان کی شکل اختیار کر لی اور پھر وہ جیسے قوس قزح بن کر سارے درخت پر پھیل گیا۔ اب شبانہ کو درخت نظر نہیں آ رہا تھا۔ آم بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے قوس قزح کے رنگ ہی رنگ تھے۔

ستارے ہی ستارے تھے، پریاں ہی پریاں تھیں، عقیق و زمرد اور نیلم کی لڑیاں ہی لڑیاں تھیں۔ شبانہ کے کانوں میں بیتھاون اور میلبنی کے سرمدی نغمات کی مترنم آوازیں ابھرنے لگیں۔ چلو... چلو... اوپر بادلوں کی طرف چلو زمرد، عقیق اور نیلم کی روشنیوں کی طرف چلو... چھوڑ دو... چھوڑ دو... کبھی گیلے، کبھی خشک کپڑوں، گرم تپتی سڑکوں کو، سنگین عمارتوں کو پتھروں کی قبروں کو... موت کے خوف میں مبتلا لوگوں کو، زلزلوں کی لہروں پر کھڑے شہروں کو، کھل کر مرجھا جانے والے پھولوں کو اور مل کر بچھڑ جانے والے ساتھیوں کو چھوڑ دو... اور اوپر چلو... بیتھاون، میلبنی اور برسط کے پاکیزہ، بلند اور سرمدی نغمات کی بہشتیوں میں چلو۔

"شبانہ! کھڑکی بند کر دو۔ بارش والی ہوا میں تمہیں زکام ہو جائے گا۔"

عارفہ کی آواز پر شبانہ سے پہلے کھڑکی سے باہر برستی بارش نے چونک کر دیکھا پھر سارے زمرد، سارے نیلم، سارے عقیق، سارے نغمات سمٹ کر زرد بھیگتے آم میں واپس آ گئے اور شبانہ نے گہرا سانس بھرتے ہوئے عارفہ کی طرف دیکھا اور بولی

"تم کیا کہہ رہی تھیں عارفہ؟"

"بھئی کھڑکی بند کر دو... کیسی بارش میں بھیگی ہوئی ہوا آ رہی ہے مجھے تو سردی لگنے لگی ہے۔" شبانہ نے کھڑکی بند کر دی اور بولی...

"میں تمہارے لئے چائے لے کر آتی ہوں۔" دوسرے دن پھر وہی تھکا دینے والے لیکچروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ باقی لڑکیاں بھی اب ان لیکچروں سے بور ہو گئی تھیں اور شہر کی سیر بھی کرنا چاہتی تھیں.... مگر یہ خالص کلچرل ٹور تھا.... لیکچر بڑے ضروری تھے۔ دوپہر کا کھانا مہمان لڑکیوں کو گرلز کالج کی کینٹین میں ہی کھلایا گیا۔ عارفہ عرف بقراط بیگم نے موٹے چاول دیکھے تو منہ بنا کر شبانہ سے کہا۔

"ان چاولوں سے کب پیچھا چھوٹے گا۔" شبانہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ راحیل کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد لڑکیاں ہوسٹل کی طرف چلنے کے لئے باہر آئیں تو ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ عارفہ بقراط نے سر پکڑ

لیا اور بے زاری سے بولی۔ "پھر بارش ہونے لگی ہے... یہ لوگ یہاں کس طرح زندہ رہتے ہیں۔"

سہ پہر کو بھی بوندا باندی ہو رہی تھی جب شبانہ چھوٹی سی چھتری لے کر ہوسٹل سے نکلی۔ عارفہ بقراط اس وقت سر پر پٹی باندھے سو رہی تھی۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ خشک ہوا کے بارش میں بھیگے ہوئے جھونکے چل رہے تھے۔ شبانہ سڑک پار کر کے سامنے والے درختوں میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ دو منٹ ہی گزرے ہوں گے راحیل اپنی سیاہ چھوٹی گاڑی لے کر آ گیا۔

اس نے گاڑی روک کر دروازہ کھول دیا۔ گاڑی میں داخل ہوتے ہی پائپ اور گلاب کی ملی جلی مہک نے شبانہ کو گھیر لیا۔ گاڑی دریائے ایراوتی کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف دوڑنے لگی۔

راحیل نے بارش میں دریا کی طرف دیکھا اور کہا۔ "عورت کو اس وقت دیکھنا چاہیئے جب وہ اپنے بچے کو پیار کر رہی ہو۔ اس وقت روح کا بچھڑا ہوا حصہ روح سے دوبارہ مل رہا ہے اور دریا کو اس وقت دیکھو جب بارش ہو رہی ہو۔ اس وقت دریا کا بچھڑا ہوا جسم قطرہ قطرہ ہو کر دریا سے دوبارہ مل رہا ہوتا ہے"۔

شبانہ کے کانوں میں پنجابی کافی کے بول گونجنے لگے۔ "کدی سانول موڑ مہاراں" ہاں... کبھی سانول مہار موڑتا ہے تو ماں اپنے بچے کا منہ چومتی ہے اسے پیار سے اپنے ساتھ لگاتی ہے۔ سانول کبھی مہاریں موڑتا ہے تو دریا بارش کے روپ میں اپنے دریا کے سینے پر گرنے لگتا ہے اور پھولوں سے بچھڑی ہوئی خوشبو واپس دھرتی کے سینے میں اترنے لگتی ہے۔

وے بیں رو رو عرض گزاراں
کدی سانول موڑ مہاراں

شبانہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کون تھا اس کا سانول؟ کس نے اس کی طرف اپنی مہاروں کو موڑنا تھا؟

وہ فلائنگ ڈچ مین کون تھا؟ وہ بکاشئی وینس کی نہروں والی گلیوں کے کس خوابیدہ پرانے مکان کی شہ نشین میں محو خواب تھا۔ کیا اس کا کوئی وجود بھی تھا؟ اس نے آہستہ سے سانس کھینچا اور کھڑکی میں سے دریا کی طرف دیکھنے لگی۔ یہ ایراوتی دریا تھا۔ بارش میں بھیگتا لبریز بھرا بھرا باوقار سمندر کی طرح کا دریا۔ راحیل کہہ رہا تھا دریائے ایراوتی کے بارے میں ایک گیت بہت مشہور ہے اسے ایراوتی کے ملاح جب مچھلیاں پکڑنے نکلتے ہیں تو گاتے ہیں تم سنو گی؟۔۔۔ سنو۔۔۔ میں تمہیں اس گیت کا اردو میں ترجمہ کر کے سناتا ہوں۔

"ایراوتی! ہماری ندی ایراوتی! تو اتنی اداس کیوں ہے؟

تیرے پانیوں میں ہمارے آنسو گرتے ہیں۔

کیا تو اس لئے اداس ہے؟

ایراوتی! تو نے یہ رقص کہاں سے سیکھا ہے؟

کیا پہاڑی کے اس موڑ سے جہاں تو جنگل کی طرف اپنا راستہ بدلتی ہے؟

ایراوتی! تیرے پانیوں میں ہمارے آنسو بھی شامل ہیں ایراوتی! تو اتنی اداس کیوں ہے؟

"ایراوتی! ہماری پیاری ایراوتی!۔۔۔"

شبانہ ایراوتی دریا کی ایک لہر بن کر اس کے سینے کے ساتھ لگی گمنام سمندروں کی طرف بہہ رہی تھی۔ یہ ایراوتی کی لہر تھی، یہ جہلم اور راوی کی لہر تھی، یہ عظیم دریا سندھ کی لہر تھی۔۔۔ یہ کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوتی ہے؟ بارش۔۔۔ بارش۔۔۔ بارش۔۔۔ دریا۔۔۔ دریا۔۔۔ دریا۔۔۔ گلاب کے سرخ پھول۔۔۔ زمردیں آسمان پر چمکتے نیلم کے ستارو! تم طلوع آفتاب کے گیت گاؤ۔۔۔ راحیل کہہ رہا تھا۔

"ایراوتی کا نشان کی پہاڑیوں سے نکلتا ہے۔ دریا کو نکلتے کسی کسی کی آنکھ ہی دیکھتی ہے۔"

اس نے گلاب کا سرخ پھول ڈیش بورڈ پر سے اٹھا کر شبانہ کو تھما دیا

دیا اور کہا۔ "یہ تم سے ملنے میرے پاس آیا تھا۔" شبانہ نے گلاب کو اپنے ہونٹوں کے قریب لاتے ہوئے کہا۔

"یہاں گلاب نہیں ہوتا۔"

راحیل بولا۔ "پھول کو یاد کرو وہ آجاتا ہے۔" شبانہ کو وہ سرخ گلاب یاد آ گئے جو اس نے اپنی والدہ اور بہن غزالہ کی قبروں پر ڈالے تھے۔ اس نے راحیل سے کہا۔

"شاید تمہیں معلوم نہیں راحیل۔۔۔ میری بڑی بہن غزالہ اور پیاری امی جان کا انتقال ہو گیا تھا۔"

راحیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ بوندا باندی اسی طرح ہوتی رہی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے معلوم ہے تمہیں دکھ ہوا تھا۔ اس لئے مجھے بھی دکھ ہوا تھا۔۔۔ تم نے اس دکھ کا اظہار نہیں کیا اچھا کیا۔۔۔ دکھ غیر قدرتی ہے۔۔۔ جب ہمیں کوئی دکھ پہنچتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم کسی شے کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔۔۔ تم اسے فلسفے کی باتیں تو نہیں سمجھ رہی ہو؟

اچھا چلو۔۔۔ ان باتوں کو چھوڑو۔۔۔ کبھی تم نے موت کو دیکھا ہے؟ اس سے زیادہ خوبصورت دنیا کی کوئی شے نہیں ہے۔۔۔ کیا تم اسے سمجھتی ہو؟ اچھا یہ بتاؤ۔۔۔ تم نے پنجاب میں چیت وساکھ کی چاندنی راتیں دیکھی ہیں۔۔۔ ان رتوں میں آموں پر سرخی آتی ہے۔۔۔ تم نے سندھ کے صحراؤں میں کھلنے والے حیرت انگیز پھولوں کو دیکھا ہے؟ پھول روہی میں بھی کھلتے ہیں۔۔۔ روہی میں نیچر کا جمال بھی ہے اور جلال بھی۔۔۔ کیا تم کبھی ان لوگوں سے ملی ہو جو سندھ اور بلوچستان کی سرزمین میں آج سے دس ہزار سال پہلے تہذیب و تمدن کی غیر فانی شمعیں روشن کر رہے تھے؟

چلو ان باتوں کو بھول جاؤ۔۔۔ دیکھو دریائے ایراوتی کی لہریں کتنی بے تابی سے اٹھ اٹھ کر بارش کا خیر مقدم کر رہی ہیں۔۔۔ یہ مائیں ہیں جو اپنے بچوں کو سینے سے لگا رہی ہیں۔"

بارش۔۔۔ بارش۔۔۔ بارش۔۔۔ بارش میں بھیگتی گاڑی دریا سے ہٹ کر ایک

پختہ سڑک پر آ گئی تھی اس سڑک کی دونوں جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے پر باغیچوں میں گھرے ہوئے بنگلے تھے۔ ہر بنگلہ زمین سے چار فٹ اونچے مچان پر بنایا گیا تھا۔ یہ بنگلے لکڑی اور بانس سے بنے تھے۔ ان کے باغیچوں میں گل مہر، رتنا گری اور ناریل کے درخت بارش کی ہوا میں جھوم رہے تھے۔ دریائے ایراوتی ان کے عقب میں بہہ رہا تھا۔

راحیل نے ایسے ہی ایک بنگلے کے بانس کی چھت والے گیراج میں لے جا کر گاڑی کھڑی کر دی۔ بارش میں بھیگتے ہوئے وہ برآمدے کے لکڑی کے فرش سے گزر کر ایک مختصر سے کمرے میں آ گئے۔ برآمدے کے بانسوں پر نیلے پھولوں والی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ اس کمرے کا سارا فرنیچر بانس کا تھا۔ فرش گیروے رنگ کے پھولدار قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ کیبنٹ پر کانسی کا ایک گلدان پڑا تھا جس میں کنول کے پھول سجے ہوئے تھے۔ رنگون کے موسم میں کسی آتشدان کی ضرورت نہیں ہوتی۔

راحیل شبانہ کو لے کر بنگلے کے پچھلے برآمدے میں آ گیا۔ یہاں بید کی سبز کرسیاں اور بید ہی کی گول میز پر سرخ گلابوں سے بھرا ہوا چینی کا گلدان پڑا تھا۔ برآمدے کی ڈھلوانی چھت پر بارش کی بوندیں ہلکا ہلکا جل ترنگ ساز بجا رہی تھیں۔ چھوٹے سے لان میں کیلے کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا جس کی شاخوں میں قرمزی اور زرد کیلوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ کیلے کے چوڑے پتے برسات کی بھیگی ہوئی ہوا میں جیسے مورچھل ہلا رہے تھے۔ راحیل نے بید کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کیلے کے ان جھنڈوں کے پیچھے دریائے ایراوتی بہہ رہا ہے۔"

شبانہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی اور سامنے کیلے کے درختوں کے پاس گل مہر کے چھوٹے درختوں کو تکنے لگی جن کی جھکی ہوئی ٹہنیوں پر گل مہر کے سرخ پھول لٹک رہے تھے اور بارش میں بھیگ رہے تھے۔ مرطوب ہوا میں کیلے کے پتوں کے علاوہ دریائی سرکنڈوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔

شبانہ نے راحیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں اور کوئی نہیں رہتا؟"

راحیل پائپ میں نیا تمباکو بھر رہا تھا... اس نے آہستہ سے کہا "جہاں میں رہتا ہوں وہاں کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔" پائپ میں تمباکو بھر کر اس نے میز پر رکھا اور اندر چلا گیا۔ شبانہ نے راحیل کو جیسے وہ تھا قبول کر لیا ہوا تھا۔ وہ اس کے خوابوں کی علامت تھا جہاں واقعی کوئی دوسرا نہیں ہوتا... کوئی دوست، کوئی دشمن، کوئی اپنا، کوئی پرایا نہیں ہوتا.... اب اسے راحیل سے کبھی یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی کہ وہ کون ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے، کیا کرتا ہے اور کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے وہ اس کے ساتھ ہوتی تو اسے محسوس ہوتا کہ وہ جاگتے جاگتے اچانک سو گئی ہے اور ایک خواب دیکھنے لگی ہے.. تب اسے ہر شے دھند میں ڈوبی اور ان جانی سی لگتی تھی۔ اسے پھول دھندلے دکھائی دیتے تھے اور خوشبوئیں صاف نظر آتی تھیں۔ یہ دنیا شبانہ کو اپنی دنیا لگتی تھی۔ وہ ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا چاہتی تھی۔ جاگتی دنیا نے اسے سوائے دکھوں اور تکلیف کے اور کچھ نہیں دیا تھا۔ جاگتی دنیا میں وہ ایک مجبور، بے کس لڑکی تھی۔ اس کی ناک میں نکیل پڑی تھی اور نکیل کی رسی دنیا والوں کے ہاتھوں میں تھی جو جدھر چاہتا اسے موڑ کر لے جاتا تھا... لیکن راحیل کی دنیا میں وہ ایک آزاد اور خود مختار عورت تھی۔

یہاں نہ کوئی اس پر اپنا حکم چلاتا تھا اور نہ وہ کسی کی غلام تھی۔ موسیقی کی ایک مترنم لہر کی طرح وہ اپنے ساز کے تاروں سے نکل کر فضاؤں میں پرواز کرتے ہوئے واپس اپنے تار کے پردوں میں آ کر سو جاتی تھی۔ راحیل واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں نیلے رنگ کے دو مگ تھے ان سے کافی کی تلخ مہک اٹھ رہی تھی۔

"جانتی ہو جنوب مغربی ایشیاء میں کافی کیوں پی جاتی ہے؟" وہ شبانہ کے پاس ہی اپنی کرسی پر بیٹھ گیا.... پھر اس نے پائپ سلگایا تو پائپ کے تمباکو کی خوشبو بارش اور رتنا گری کے پھولوں کی مہک میں گھل مل گئی۔ بارش کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی رک رک کر سرگوشیوں میں اپنی طرف بلا رہا ہو۔

شبانہ کو بچپن میں سنا ہوا ایک کشمیری گیت یاد آ گیا۔ شبانہ کے ماں باپ

کشمیری تھے مگر صرف اس کی دادی ہی کشمیری زبان جانتی تھی۔ جب وہ چھوٹی سی تھی تو اس کی دادی اسے گود میں لے کر ایک کشمیری گیت سنایا کرتی تھی جس کا ترجمہ اس نے بڑی ہوئی تو سنا۔ گیت یہ تھا۔

"سنو! سنو! چیڑھ کے ہرے بھرے جنگل میں کوئی اپنی طرف بلاتا ہے۔
یہ کس کی آواز ہے جو پریوں کی سرسراہٹ کے ساتھ گھل مل گئی ہے۔
سیب کے درختوں پر شگوفے پھوٹنے لگے ہیں۔
بھونروں سے کہو شگوفے سو رہے ہیں شور نہ مچائیں۔
ہرے بھرے جنگل میں یہ کون ہمیں بلا رہا ہے۔
کانگڑی کی آگ مدھم پڑ گئی ہے۔
سیب کے شگوفے سو گئے ہیں۔"

دادی کے پاس ایک چھوٹا سا سماوار تھا یہ روسی طرز کا کشمیری سماوار تھا۔ اس میں جب چائے ابلتی تو سیٹی بجنے لگتی تھی۔ دادی اماں ایسی سماوار میں سبز چائے اور برسات کے دنوں میں قہوہ بناتی تھیں۔۔۔ جیسا قہوہ شبانہ کی دادی بناتی تھی ویسا قہوہ اس نے پھر کبھی نہیں پیا۔

دادی پہلے صاف شفاف پانی کو سماوار میں ابالتیں۔۔۔ پھر اس میں تھوڑی سی دار چینی اور بادیان فطائی ڈالتی۔ ایک منٹ کے بعد کھولتے پانی میں سبز چائے کی چند ایک پتیاں ڈال دیتی۔ اس کے تین منٹ بعد وہ سماوار کے نیچے دہکتے کوئلوں کو سلاخ سے جھاڑ دیتیں پھر نیلی پھولدار پیالیوں میں جب وہ سماوار سے قہوہ انڈیلتیں تو قہوے کا رنگ خالص زرد سونے جیسا ہوتا اور اس میں سے کبھی دار چینی، کبھی صندل اور کبھی بادیان فطائی کے جنگلوں کی مہک آتی۔

شبانہ قہوے کا گھونٹ پیتی تو خوشبوؤں کی آبشار سی اس کے جسم میں اتر کر اس کی روح کو خوشبوؤں میں سرشار کر دیتی۔ اسے اپنا جسم روح سے بھی زیادہ لطیف محسوس ہوتا۔ دادی کی موت کے بعد جب اس نے ہوش سنبھالا تو اپنے

آپ کو کینال بینک والی کوٹھی میں پایا جہاں صبح شام لپٹن چائے ہی پی جاتی تھی۔ امی جان سردیوں میں صبح اپنے لئے سبز چائے ضرور بنواتی تھیں۔ قہوہ صرف شدید سردی اور بارش میں ہی پیا جاتا تھا مگر جس اہتمام سے دادی اماں قہوہ بناتی تھیں وہ اہتمام مفقود ہو چکا تھا۔

راحیل کہہ رہا تھا۔ "جنوب مشرقی ایشیا کی بارشیں کافی طلب کرتی ہیں جس طرح کیلے کا درخت بارش مانگتا ہے اسی طرح یہاں کی بارش کافی مانگتی ہے۔ بارش کو کافی کی پیاس ہوتی ہے۔"

شبانہ نے پوچھا "ساتھ والے کمرے میں جو گلاب کے پھول پڑے ہیں وہ کہاں سے آتے ہیں؟" راحیل نے کافی کا ہلکا سا گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

"وہ بہت دور سے آئے ہیں۔۔۔ ایک ایسے دیس سے جہاں وہ کھل کر کبھی نہیں مرجھاتے۔۔۔ یا تم یہ کہہ لو کہ جہاں یہ مرجھا کر جاتے ہیں اور دوبارہ کھل اٹھتے ہیں۔" پھر وہ شبانہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔ "جانتی ہو گلاب کے باسی پھول کہاں جاتے ہیں؟"

بارش کے قطرے کیلے کے پتوں پر گر کر عجیب خشک سی آواز پیدا کر رہے تھے۔ شبانہ راحیل کے یونانی ناک والے چہرے کو تک رہی تھی اور راحیل اب شبانہ کے چہرے سے نظریں ہٹا کر ناریل کے درختوں کے پیچھے کسی ایسی شے کو دیکھ رہا تھا جو اسے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید وہاں دریائے ایراوتی کی لہریں ہونی چاہئے تھیں یا انناس کے چھوٹے پودوں کی قطاریں ہونی چاہیئے تھیں جو نہیں تھیں۔

"کیسی عجیب بات ہے۔" راحیل نے کافی کا مگ میز پر رکھتے ہوئے شبانہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیسی عجیب بات ہے کہ تم جو بہت کچھ مجھے کہنا چاہتی ہو خاموش ہو اور میں جو نہیں کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا بہت باتیں کر رہا ہوں۔ شبانہ نے چونک کر راحیل کی طرف دیکھا۔۔۔ وہ راحیل سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ اس سے اپنے دل کی، اپنی

جاگتی دنیا کے دکھوں، غموں اور کلفتوں کی کئی ایک باتیں کرنا چاہتی تھی مگر اس نے کبھی اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ کیا وہ چاہتا ہے کہ میں اس سے اپنی جاگتی دنیا کے دکھوں کی بات کر دوں؟

شبانہ دل میں سوچ رہی تھی۔ اس نے راحیل کی پیشانی کو غور سے دیکھا۔ پائپ سلگانے کے لئے اس نے دیا سلائی جلائی تو پیشانی چمک اٹھی۔ پیشانی پر دو تین شکنیں بڑی گہری تھیں۔ کنپٹیوں پر تھوڑے تھوڑے سفید بال چاندی کی کہکشاں کی طرح لگ رہے تھے۔ شبانہ سامنے باغ کے درختوں کو تکنے لگی۔۔۔ پھر جیسے اس کے ہونٹوں سے یہ جملہ اپنے آپ نکل گیا۔

"میرے ابو میری شادی ایک ایسی جگہ کرنا چاہتے ہیں جہاں میں نہیں چاہتی کہ میری شادی ہو۔" راحیل پائپ سلگا رہا تھا۔۔ دوسری دیا سلائی بھی ضائع ہو گئی تھی اس نے تیسری دیا سلائی جلا کر پائپ کو اچھی طرح سے سلگایا اور پھر سامنے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"ان درختوں کے پیچھے ہی دریا ہے۔۔۔ کیا تم بارش میں دریا کی سیر کرو گی؟"
راحیل نے شبانہ کی زندگی کے سب سے اہم جملے کو سن کر بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کیا جاگتی دنیا کے حقائق کی طرف سے اس کے کان بند ہیں؟ شبانہ کو دل میں غصہ آ رہا تھا کہ اس نے یہ بات راحیل سے کیوں کہی اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ہلکی بوندا باندی میں کشتی میں بیٹھ کر دریا کی سیر کرے مگر راحیل کی بے اعتنائی کو دیکھ کر اس نے اپنا ارادہ بدل لیا۔ اپنے دل کی بات زبان پر لانے کے بعد اسے راحیل کی بے اعتنائی کا زیادہ احساس ہوا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
"میں اب واپس ہوسٹل جاؤں گی۔۔۔ دوسری لڑکیاں ہوسٹل پہنچ چکی ہوں گی۔"
راحیل یوں اٹھا جیسے پہلے ہی سے تیار ہو۔ شبانہ کو یہ بات بھی ناگوار گزری وہ چاہتی تھی کہ راحیل اسے اتنی جلدی واپس نہ جانے کے لئے کہے۔ اسے روکے اور کچھ دیر اور بیٹھنے کو کہے۔۔ مگر اس نے ایسا نہ کیا اور شبانہ کو ساتھ لے کر بنگلے کے گیراج

میں آ گیا۔ کار باہر نکالی۔ شبانہ کو بٹھایا اور ہلکی بارش میں اس کے ہوسٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ منکی پوائنٹ سے نکل کر رنگون کی بارش میں بھیگتی مختلف سڑکوں پر سے ہوتے ہوتے جب وہ ہوسٹل کی سڑک پر آئے تو راحیل نے شبانہ کو بتایا کہ رنگون کے زولوجیکل گارڈن کے پیچھے جھیلوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ وہاں جھیلوں میں کنول کے پھول ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ڈولتے رہتے ہیں اور مہاگنی اور ناڑ کے گہرے سبز سایوں والے بے شمار کنج ہیں۔

"وہاں ایک لوٹس گارڈن بھی ہے اس باغ میں ہر وقت ایک ایسے پھول کی مہک رچی رہتی ہے جو کسی کو نظر نہیں آتا۔ وہ درختوں کے نیچے پھیلی ہوئی جھاڑیوں میں کسی پوشیدہ جگہ پر اگتا ہے۔ برما کے لوگ اس پھول کو پشپانگ پھول کے نام سے پکارتے ہیں۔ کنواری لڑکیاں اکثر اس پھول کی تلاش میں نکلتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ جس لڑکی کو یہ پھول مل جائے اس کی شادی اس کی پسند کے لڑکے سے ہو جاتی ہے کیا تم اس پھول کو تلاش کرنے آؤ گی؟ کل اتوار ہے۔۔۔ تمہیں چھٹی ہو گی۔۔۔۔ میں صبح نو بجے گاڑی لے کر آ جاؤں گا۔"

شبانہ خوشی سے راحیل کی باتیں سنتی رہی۔ گرلز ہوسٹل آ گیا۔ راحیل نے گاڑی ایک طرف درختوں میں کھڑی کر دی۔ شبانہ دروازہ کھول کر اترنے لگی تو راحیل نے کہا۔ "میں کل صبح نو بجے آؤں گا۔۔۔ ہو سکتا ہے تم پشپانگ پھول تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤ۔"

شبانہ نے دھیمی آواز میں کہا "ٹھیک ہے" اور گاڑی سے نکل کر بارش میں تیز تیز قدم اٹھاتی گرلز ہوسٹل کی طرف چل پڑی۔ ہوسٹل کے گیٹ کے پاس پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیکھا راحیل گاڑی سے باہر کھڑا پائپ پیتے ہوئے اس کی طرف تک رہا تھا پھر اس نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا۔ شبانہ نے بھی آہستہ سے ہاتھ ہلایا اور جلدی سے ہوسٹل کے گیٹ میں داخل ہو گئی۔ اپنے کمرے میں آتے ہی اس نے کھڑکی کھول کر باہر دیکھا۔

درختوں کے نیچے راحیل کی کار نہیں تھی۔ پیچھے سے عارفہ کی تیز آواز آئی۔۔۔۔

"کھڑکی بند کر دو شبانہ مجھے سردی لگ رہی ہے۔"

شبانہ نے کھڑکی بند کر دی۔ عارفہ پلنگ پر کمبل اوڑھے سر پر پٹی باندھے لیٹی تھی۔ "شبانہ! خدا کی قسم یہاں کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔۔۔ تم میری بڑی پیاری سہیلی ہو۔۔۔ تھرما میٹر لگا کر دیکھو۔۔۔ مجھے بہت بخار ہے۔" شبانہ نے تھرما میٹر لگا کر دیکھا معمولی بخار تھا۔ اس نے کہا۔

"عارفہ تم خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہو۔۔۔ ذرا سا بخار ہے۔۔۔۔ میں تمہارے لئے قہوہ بنوا کر لاتی ہوں۔۔۔ تم ابھی ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

رات کو عارفہ نے بہت شور مچایا۔ بخار سو سے اوپر نہیں تھا مگر اس نے ایسی ہائے ہائے کی کہ شبانہ کو سونے نہ دیا۔ گیارہ بجے رات ایک ڈاکٹر کو بلوایا گیا۔ ڈاکٹر نے آتے ہی اسے ایسا ٹیکہ لگایا کہ وہ مرغی کی طرح گردن ایک طرف ڈال کر ایسی سوئی کہ باقی رات پہلو تک نہ بدل سکی۔ صبح نو بجے راحیل نے آنا تھا۔ شبانہ جلدی جلدی تیار ہو گئی۔ اس نے زرد رنگ کا اپنا پسندیدہ سوٹ پہنا۔ موسم خوشگوار تھا سردی نام کو بھی نہیں تھی۔

ٹھیک نو بجے شبانہ ہوسٹل سے نکل کر سڑک پار والے درختوں میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ دو منٹ بعد راحیل بھی آ گیا رنگون کے زولوجیکل گارڈن کے پیچھے جھیلوں کا واقعی بہت ہی خوبصورت سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک جھیل ختم ہوتی تھی تو ساتھ ہی دوسری جھیل شروع ہو جاتی تھی۔ کناروں پر مہاگنی ناریل، تاڑ اور خدا جانے کس نسل کے سینکڑوں گنجان درخت مرطوب موسم میں خاموش کھڑے تھے۔ بارش رات بھر ہوتی رہی تھی۔ اب بارش رکی ہوئی تھی۔ جھیل کنارے کی سڑکیں پختہ تھیں۔ ان پر کیچڑ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ لوگ چھٹی کی وجہ سے اپنے بال بچوں کے ساتھ وہاں سیر کرنے آئے ہوئے تھے۔ فضا میں مرطوب سبزے کی مہک رچی ہوئی تھی۔ شبانہ راحیل کے ساتھ ایک روش پر چل رہی تھی۔ اس نے راحیل سے پوچھا۔

"وہ پھول کہاں ہے جس کے بارے میں تم بتا رہے تھے؟"

راحیل بولا۔ "یہ اگر پتہ چل جائے تو میں اسے ڈھونڈ کر نہ لاؤں یہی تو تمہیں معلوم کرنا ہے۔" شبانہ نے کہا۔

"مگر مجھے تو اس پھول کی خوشبو تک نہیں آ رہی میں اسے کیسے تلاش کرونگی؟"

راحیل بولا "ابھی جھیل کے جنگل کا وہ حصہ نہیں آیا جہاں اس خاص پھول پشپانگ کی مہک پھیلی رہتی ہے۔ وہ سامنے کیلے کے جنگلی درخت دیکھ رہی ہو نا؟ بس ان درختوں کے پیچھے جو جھیل ہے اس کے کنارے پر اس پھول کی خوشبو شروع ہو جائے گی۔" کیلے کے جھنڈوں کے پیچھے ایک خوبصورت جھیل تھی جس کے پر سکون نیلے پانی کی شفاف سطح پر کنول کے بے شمار پھول کھلے ہوئے تھے۔

اس جھیل کے کنارے کنارے مہاگنی اور تاڑ کے درختوں کا سلسلہ دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ یہاں آتے ہی شبانہ کو ایک ایسی خوشبو محسوس ہوئی جو اس سے پہلے اس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ یہ کسی خواب کے باغ عدن کے پھول کی خوشبو تھی۔ اس میں ایک سحر تھا جو شبانہ کو اپنے احساسات پر طاری ہوتا لگ رہا تھا۔ راحیل نے کہا۔

"یہ خوشبو پشپانگ پھول کی ہے۔ یہ کنواریوں کے سپنوں کے شہزادے کا پھول ہے۔ کیا تم اسے تلاش کرو گی؟"

"ہاں" شبانہ نے جیسے خواب کے انداز میں کہا۔۔۔ راحیل مسکرا کر وہیں ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ اور پائپ کا تمباکو انگوٹھے سے دباتے ہوئے بولا۔

"تم اس پھول کی تلاش میں جاؤ۔۔۔ میں یہاں بیٹھ کر تمہارا انتظار کروں گا۔"

شبانہ پشپانگ پھول کی خوشبو کے ساتھ ساتھ مہاگنی کے گھنے درختوں میں داخل ہو گئی۔ پہلے جنگلی جھاڑیاں آئیں۔ پھر رتناگری کے پیڑوں کا جنگل شروع ہو گیا۔ پراسرار پوشیدہ پھول کی خوشبو برابر آ رہی تھی۔ شبانہ اس خوشبو کے پیچھے پیچھے آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے تمام جھاڑیوں اور پودوں کو چھان مارا۔ خوشبو آ رہی تھی۔

مگر پھول کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔ وہ اس تلاش بے سود سے تنگ گئی مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ جانے اسے کیوں یقین سا آگیا تھا کہ اگر اس نے پنشپانگ پھول کو تلاش کر لیا تو وہ اپنے سپنوں کے شہزادے کے پاس پہنچ جائے گی۔ اس نے ایک بار پھر پھول کی تلاش شروع کر دی۔ خوشبو اسے اپنے ساتھ لے کر جھیل کے کنارے کی طرف آ گئی۔ یہاں جنگلی شریفے کے درخت ہی درخت اگے ہوئے تھے۔ گھاس جھاڑیوں اور درختوں کی شاخیں بارش کی وجہ سے بھیگی ہوئی تھیں۔

شبانہ کی شلوار کے پائنچے اور قمیض جگہ جگہ سے گیلی ہو گئی۔ مگر وہ خوشبو کا سراغ لیتی آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی۔ ایک مقام پر اسے پھول کی خوشبو بہت زیادہ گہری محسوس ہوئی۔ وہ اس جگہ رک گئی۔ اس نے دو تین لمبے لمبے سانس لے کر پھول کی سمت کو متعین کیا اور گارڈینا کے ایک جھاڑ میں داخل ہو گئی۔ یہاں خوشبو اتنی گہری تھی کہ شبانہ کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ وہ یقیناً پھول کے پاس پہنچ چکی تھی۔ اپنے سپنوں کے شہزادے کے پاس پہنچ گئی تھی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک جگہ جھاڑیوں کی شاخوں کو پیچھے ہٹایا تو بیچ میں ہلکے نیلے رنگ کا کنول کی طرح کا ایک پھول اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ شبانہ نے جھک کر اسے سونگھا۔ وہی خوشبو تھی جو اس پھول کی پنکھڑیوں سے ان دیکھی لہریں بن کر پھوٹ رہی تھی۔ اس نے پھول کو توڑ لیا۔ وہ بھاگتی ہوئی اس جگہ پہنچی جہاں وہ راحیل کو چھوڑ گئی تھی۔ خوشی سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا مگر بنچ کے پاس آ کر ٹھٹھک سی گئی۔

راحیل وہاں پر نہیں تھا۔ پنشپانگ پھول کو سینے سے لگائے وہ راحیل کو ادھر ادھر درختوں میں تلاش کرنے لگی۔ مگر راحیل جیسے غائب ہو چکا تھا۔ وہ اسے تلاش کرتے کرتے تھک گئی۔ راحیل اسے نہ ملا۔۔۔ پھول کو اپنے سینے سے لگائے وہ جھیل کے باغوں سے باہر سڑک پر آ گئی۔ یہاں راحیل کی کار بھی موجود نہیں تھی۔ کیا وہ اسے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا ہے؟

شبانہ کو راحیل پر سخت غصہ آنے لگا۔ پھر اس نے یہ کہہ کر صبر کر لیا کہ راحیل پر اس کا کوئی حق بھی تو نہیں ہے۔ آخر وہ اس کا کون ہے؟ وہ اس کی کون ہے؟ وہ کیوں اس کے لئے وہاں بیٹھا رہتا۔۔۔ اسے چلا جانا تھا۔۔۔ وہ چلا گیا۔۔۔ وہ سپنوں کے شہزادے کا پھول کسے دکھائے گی؟

شبانہ کی نگاہ ایک برمی لڑکی پر پڑی جس کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی جھیل والے باغ کی طرف جا رہی تھی۔ شبانہ نے اسے آواز دے کر روک لیا۔ لڑکی نے مسکرا کر شبانہ کو دیکھا اور وہیں رک گئی۔ شبانہ نے انگریزی میں اسے پوچھا۔۔۔ "کیا تم انگریزی میں بات کر لیتی ہو؟" لڑکی نے مسکراتے ہوئے سر کو اثبات میں ہلایا۔ شبانہ نے پھول اس کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔

"یہ پنشپانگ کا پھول ہے۔"

برمی لڑکی کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا "تم خوش قسمت ہو۔۔۔ یہ پھول تو کسی کسی کو ملتا ہے۔" شبانہ نے کہا۔

"میں یہ پھول تمہیں دینا چاہتی ہوں اسے میری طرف سے تحفہ سمجھ کر قبول کرو۔" برمی لڑکی ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے بولی۔

"نہیں۔۔ نہیں۔۔۔ یہ بدشگونی ہوگی۔۔۔ یہ تم نے تلاش کیا ہے اب یہ تمہارا ہے۔۔۔ کیا تمہیں اپنے سپنوں کے شہزادے کی تلاش نہیں ہے؟"

شبانہ نے ایک اداس تبسم کے ساتھ پھول کو اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ برمی لڑکی اسے تعجب سے دیکھ رہی تھی کہ یہ کیسی لڑکی ہے۔ وہ پھول اسے دے رہی ہے جس کی تلاش میں کنواری لڑکیاں جنگل میں ماری ماری پھرتی ہیں۔ شبانہ واپس ہوسٹل میں آگئی عارفہ بقراط کمرے میں نہیں تھی۔ شبانہ کا دل مغموم تھا۔ اسے اپنا گھر یاد آ رہا تھا۔ اپنی پیاری امی اور بڑی بہن یاد آ رہی تھیں۔۔۔ وہ بستر پر لیٹ گئی اور دیر تک آنسو بہاتی رہی۔ جب دل ہلکا ہوا تو اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔۔۔ بالوں میں کنگھی کر رہی تھی کہ عارفہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"صدف اور نائیلہ یہاں آکر بہت شوخ ہو گئی ہیں۔ . . ہر کسی کو مذاق کرتی ہیں۔ . . اری شبانہ . . . . یہ پھول کون رکھ گیا ہے یہاں؟" شبانہ نے پھول کی طرف بے نیازی سے دیکھا اور بولی۔

"شاید نوکرانی رکھ گئی ہوگی"۔

عارفہ نے پھول کو اٹھا کر سونگھا . . . ناک سکیڑی اور زور سے چھینک مار کر بولی . . . "یہ تو نسوار کا پھول لگتا ہے مجھے۔" اس نے پھول اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور پیڈ قلم لے کر گھر خط لکھنے بیٹھ گئی۔ تیسرے پہر شبانہ کے قدم اپنے آپ دریا کنارے والے بنگلے کی طرف اٹھنے لگے۔ وہ راحیل کے بارے میں پتہ کرنا چاہتی تھی کہ کہاں ہے اور جھیل کنارے والے باغ سے اچانک غائب کیوں ہو گیا تھا۔ رنگون اس کے لئے ایک اجنبی شہر تھا مگر خاص خاص علاقوں میں جانے کے لئے اس نے کچھ نشانیاں یاد کر رکھی تھیں۔ وہ ٹیکسی میں سوار ہو کر اس بنگلے پر پہنچ گئی جہاں راحیل اسے لے کر گیا تھا۔ حسبِ دستور یہ بنگلہ بھی خالی پڑا تھا۔ راحیل وہاں نہیں تھا وہاں کوئی چوکیدار بھی نہیں تھا۔

شبانہ واپس آ گئی۔ کمرے میں داخل ہو رہی تھی کہ صدف برآمدے میں ملی۔ اس کے پاس ایک لفافہ تھا۔ "شبانہ! لاہور سے تیرا خط آیا ہے۔ . . ." شبانہ لفافہ لے کر کمرے میں آ گئی۔ ایڈریس انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا تھا جلدی سے کھول کر پڑھنے لگی۔ یہ اس کی پیاری سہیلی اور یونیورسٹی کی ساتھی نجمی کا خط تھا۔ صرف اتنا ہی لکھا تھا۔ "مجھ پر مصیبت ٹوٹنے والی ہے۔ گھر والوں نے میری شادی ندیم کی بجائے اسی لڑکے سے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے جس کو میں ذرا پسند نہیں کرتی۔ اس وقت مجھے تمہاری بہت ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ کیا تم ٹور ختم کر کے پہلے لاہور نہیں آ سکتیں شبو؟ یہ لوگ کل میری منگنی کر رہے ہیں۔ ندیم بھی پریشان ہے۔ وہ کہتا ہے چلو بھاگ چلتے ہیں۔ مگر تم جانتی ہو میں ایسا نہیں کر سکتی۔ . . مجھے اپنے ماں باپ کی عزت کا بہت خیال ہے خدا کے لئے تم جلدی آ جاؤ۔ . مجھے تمہاری ضرورت ہے . . . تمہاری نجمی۔"

خط پڑھ کر شبانہ کو نجمی کی بہت فکر لگی۔ اسے معلوم تھا کہ نجمی کی ماں کو زیور اور پیسے کا بڑا لالچ ہے اور جس لڑکے کے ساتھ وہ نجمی کی بات پکی کر چکی ہے وہ دولت مند لوگ ہیں اور لڑکی کے لئے الگ کوٹھی اور کار دے رہے ہیں۔ یہ عجیب بات تھی کہ بجائے جہیز کا مطالبہ کرنے کے لڑکے والے خود بہت کچھ دے رہے تھے۔ شبانہ کو شک ہونے لگا کہ لڑکے میں ضرور کوئی خرابی ہوگی۔ ابھی ٹور ختم ہونے میں چار دن باقی تھے اور وہ اکیلی واپس نہیں جا سکتی تھی۔ یہ چار دن شبانہ نے بڑی اداسی سے گزارے۔

تقریباً ہر روز وقت نکال کر وہ راحیل کی تلاش میں دریائے ایراوتی والے بنگلے پر ضرور جاتی مگر راحیل اسے نہ ملتا آخر رنگون سے لاہور روانہ ہونے کا دن آ گیا۔ . .

شبانہ نے خدا کا شکر ادا کیا۔ نجمی کو اس نے تسلی کا خط لکھ دیا کہ وہ پریشان نہ ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں بہت جلد واپس آ رہی ہوں۔ لاہور یہ لوگ رات کے وقت پہنچے۔ اگلے روز شبانہ یونیورسٹی گئی تو نجمی کو دیکھ کر اسے صدمہ ہوا۔ اس کا چہرہ دبلا ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے سے پڑ گئے تھے۔ وہ شبانہ کے گلے لگ کر رونے لگ پڑی۔ شبانہ نے اس کی دل جوئی کی۔ پھر دونوں سہیلیاں یونیورسٹی کینٹین کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئیں اور راز و نیاز کی باتیں کرنے لگیں۔

نجمی کی زبانی شبانہ کو معلوم ہوا کہ لڑکے کا نام پرویز ہے۔ اس کا کپڑے کا بہت بڑا بزنس ہے۔ وہ پہلے سے شادی شدہ ہے۔ اس کی بیوی مر چکی ہے۔ ایک تین برس کا لڑکا ہے جو لندن میں اپنی پھوپی کے پاس پرورش پا رہا ہے۔ شبانہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اس کے باوجود تمہاری امی وہاں تمہاری شادی کر رہی ہیں؟ کیا انہیں تمہارا کچھ خیال نہیں۔ کیسی ماں ہے یہ؟" نجمی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "شبو! یہ راز میں نے آج تک تمہیں نہیں بتایا۔ . . ."

یہ میری سوتیلی ماں ہے۔۔۔۔"

شبانہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ نجمی نے آج تک یہ بات اسے نہیں بتائی تھی۔

شبانہ کا نجمی کے ہاں کبھی کبھار ہی جانا ہوتا تھا۔ ان کا گھر اندرون شہر لوہاری دروازے کے اندر ایک گلی میں تھا۔ نجمی کی ماں کو دیکھ کر شبانہ کو یہ خیال ضرور آتا تھا کہ اس کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہے۔ اب نجمی نے اسے بتایا کہ جب وہ دو برس کی تھی تو اس کی حقیقی ماں کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کے ابو نے دوسری شادی کر لی تھی۔ لیکن سوتیلی ماں نے نجمی کو اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ نجمی کے دو سوتیلے بھائی بھی تھے۔ جو عمر میں اس سے بڑے تھے اور کوہ مری کے اسکول میں پڑھتے تھے۔ نجمی کہہ رہی تھی۔

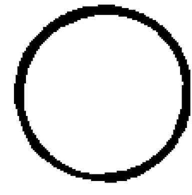
"میری سوتیلی ماں کی ایک ہی کمزوری ہے اور وہ ہے دولت۔ دولت حاصل کرنے کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ پرویز کے ماں باپ اسے بہت کچھ دے رہے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟

ندیم تو بڑا پریشان ہے۔ وہ کہتا ہے کراچی بھاگ چلتے ہیں۔۔۔ وہاں جا کر شادی کر لیں گے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر میں اپنے باپ کی بدنامی کا باعث نہیں بننا چاہتی۔ اگرچہ وہ میری سوتیلی ماں کے زیر اثر ہے اور ان میں اخلاقی جرأت نہیں ہے لیکن وہ میرے ابو ہیں۔ میں ان سے پیار کرتی ہوں اور ان کی عزت خاک میں ملانے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔" شبانہ سوائے تسلی دینے کے نجمی کے لئے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے نجمی کو اتنا ضرور کہا کہ گھر سے بھاگنے کا کبھی خیال بھی دل میں نہ لانا۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

"میں تمہارے ابو جان سے بات کرتی ہوں۔۔۔ ہو سکتا ہے وہ اس بیاہ کو رکوا دیں۔ مگر اب تو منگنی بھی ہو چکی ہے۔ پرویز کی ماں نے میری ماں کو ہیرے کی انگوٹھی دی ہے۔ ابو جان اب شاید کچھ نہیں کر سکیں گے۔" پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔

"شاید میری قسمت میں یہی لکھا تھا۔"

اور نجمی نے سر جھکا لیا۔۔۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔



نجمی نے شبانہ کو منع کر دیا کہ وہ اس کے ابو جان سے کوئی بات نہ کرے کیونکہ ان سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ نجمی کے سامنے اب ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنی خالہ کو کہہ کر یہ شادی رکوانے کی کوشش کرے۔ نجمی کی خالہ بڑی درویش صفت خاتون تھی اور نجمی سے پیار بھی کرتی تھی۔ جب نجمی نے اپنی خالہ سے ساری بات کر دی تو وہ خاتون سوچ میں پڑ گئی۔ پھر چہرہ اٹھا کر کہا۔

"بیٹی! منگنی ہو چکی ہے۔ تم نے دیر کر دی۔ پہلے مجھ سے ذکر کرتی کہ تم یہاں شادی نہیں کرنا چاہتی ہو تو میں تمہارے ابو سے بات کر سکتی تھی۔ اب اس کا کچھ فائدہ نہیں نکلے گا۔"

نجمی نے خالہ کی منت کی کہ "خالہ خدا کے لئے کچھ کرو۔ میری امی آج زندہ ہوتیں تو میری زندگی تباہ ہوتے کبھی نہ دیکھ سکتیں۔" خالہ کو اپنی مرحومہ بہن کا خیال آ گیا۔ اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ایک ترکیب ہو سکتی ہے۔ میں شاہ پری کی چوکی دلواتی ہوں۔ تمہاری سوتیلی ماں کو بھی بلواؤں گی تم ایسا کرنا کہ اپنی کسی سہیلی سے کہنا کہ جب شاہ پری مجھ پر حاضر ہو جائے تو تمہارے بارے میں مجھ سے سوال کرے۔ مجھے۔۔ یقین ہے کہ شاہ پری اس بے انصافی کے خلاف تمہاری سوتیلی ماں کی سرزنش کرے گی، ممکن ہے تمہاری ماں شاہ پری کے کہنے پر اس شادی سے باز آ جائے۔"

نجمی اپنی سوتیلی ماں کی طبیعت سے واقف تھی وہ جانتی تھی کہ دولت کے سامنے وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ مگر خالہ کے اصرار پر اس نے یہ حربہ بھی آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ نجمی کی خالہ کا گھر رنگ محل کی ایک تنگ گلی میں تھا۔ خالہ نے اعلان کر دیا کہ وہ اس جمعرات کو چوکی دلوا رہی ہے۔ اس نے نجمی کے گھر بھی پیغام بھجوا دیا۔

نجمی کی ماں نے سوچا کہ وہ شاہ پری سے نجمی کی شادی کے سلسلے میں پوچھے گی کہ لڑکے والوں سے اور کیا کچھ اینٹھا جا سکتا ہے۔ نجمی نے شبانہ کو بھی ساتھ چلنے کے لئے تیار کر لیا۔ چوکی کا وقت دن کے نو بجے کا تھا۔ نجمی شبانہ کو لے کر یونیورسٹی سے سیدھی رنگ محل خالہ کے مکان پر آ گئی۔ مکان کی بیٹھک کو جھاڑ پونچھ کر صاف ستھرا کر دیا گیا تھا۔ فرش دھو کر چاندنی کا فرش بچھا دیا گیا تھا۔ درمیان میں پھولدار جازم کے اوپر دو طرف پیتل کی گلاب دانیاں رکھی تھیں۔

درمیان میں پیتل ہی کے بڑے گلدان میں گلاب کے پھولوں کا بڑا گلدستہ سج رہا تھا۔ ایک جانب چوکی پر طشت پھلوں سے بھرا پڑا تھا جس پر ململ کا رومال ڈال دیا گیا تھا۔ سامنے دیوار پر پشمینے کی کشمیری چادریں جن کو کشمیری فردیں کہتے ہیں لٹک رہی تھیں۔ نیچے دو گاؤ تکیے لگے تھے۔ یہاں نجمی کی خالہ کو بیٹھ کر حال کھیلنا تھا۔ نجمی بچپن ہی سے خالہ کو شاہ پری کی چوکی دلواتے اور حال کھیلتے دیکھتی آئی تھی۔ اس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

شبانہ کے موچی دروازے والے گھر میں جو شیش محل تھا وہاں بھی ان کی رشتے دار عورتیں کبھی کبھی آ کر چوکی دلوایا کرتی تھیں۔ شبانہ بھی بچپن ہی سے عورتوں کو حال کھیلتے دیکھتے آئی تھی۔ نجمی اپنی سہیلی شبانہ کے ساتھ خالہ کے گھر میں داخل ہو کر سیدھی اوپر والی منزل میں خالہ کے پاس آ گئی۔ دونوں نے خالہ کو سلام کیا۔ خالہ صاف ستھرا سفید پاکیزہ لباس پہنے چارپائی پر بیٹھی تھیں۔

ان کی بیٹی طاہرہ ان کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی فضاء میں عطر چنبیلی کی خوشبو اڑ رہی تھی۔ شبانہ خالہ جان سے کئی بار مل چکی تھی۔ دونوں سہیلیاں پیڑھیوں پر خالہ کی چارپائی کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔ طاہرہ نے سبز چائے کا پوچھا۔ شبانہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ یونیورسٹی سے چائے پی کر ہی آ رہی ہیں۔ خالہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ تو کالی چائے ہو گی۔ ہم تمہیں سبز کشمیری چائے پلائیں گے۔"

طاہرہ فوراً پھولدار جاپانی پیالوں میں سبز چائے ڈال کر لے آئی۔ نجمی نے خالہ کو بتایا اس کی سوتیلی ماں بھی پہنچ رہی ہے اور وہ شاہ پری سے اس کے بیاہ کی تاریخ کے بارے میں شاید پوچھے گی۔" خالہ بولی۔

"تم گھبراؤ نہیں بیٹی۔ اللہ میاں سب ٹھیک کر دے گا۔" چونکہ آج چوکی کا دن تھا اس لئے خالہ نے صبح ہی سے اپنے لڑکوں کو کہہ دیا تھا کہ وہ دوپہر کا کھانا دفتروں میں ہی کھائیں۔ محلے کی صرف دو ایک عورتوں کو ہی دعوت دی گئی تھی جو خالہ کی پرانی ملنے والیاں تھیں اور جن کے سروں پر بھی شاہ پری کا سایہ تھا۔ ابھی شبانہ اور نجمی نے چائے ختم نہیں کی تھی کہ سیڑھیوں والا دروازہ کسی نے زور سے کھٹکھٹایا خالہ نے طاہرہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جیو مراثن آ گئی ہو گی اسے اوپر بلا لو۔" طاہرہ بڑی تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی پھر سیڑھیوں میں جیو مراثن کی آواز بلند ہوئی۔

"رب بھاگ لگائے رکھے۔ خیر کرے۔ داراں کہاں ہے خیر نال۔"

"طاہرہ کی آواز آئی۔ اوپر ہے امی ماسی۔"

جیو مراثن اس گھر کی بڑی پرانی دوست تھی اور طاہرہ اور گھر کے دوسرے افراد اس کا بے حد احترام کرتے تھے اور اسے ماسی کہہ کر بلاتے تھے۔" جیو مراثن اپنی دو جوان بیٹیوں کے ساتھ اوپر آ گئی۔ آتے ہی اس نے آگے بڑھ کر نجمی کی خالہ کا ماتھا چوما اور ہاتھ باندھ کر بولی۔

"داراں میرے حق میں ضرور دعا کروانا شاہ پری سے تمہارا بھانجا کویت جانا چاہتا ہے۔"

داراں نے جیو مراثن کی طرف دیکھ کر کہا۔ "جیو! جب شاہ پری آئے گی تو تم خود سوال کر لینا اس سے وہ تو تمہیں جانتی ہی ہے۔" جیو مراثن نے دعائیں دیتے ہوئے کہا۔

"مولا مشکل کشا رنگ لائے گا۔ خیر نال طبلے کی جوڑی میں نیچے بیٹھک میں ہی رکھ

آئی ہوں چنبیلی کا عطر منگوا لیا ہے ناں۔" طاہرہ بولی۔

"ہاں ماسی! نیچے طاق میں بھری ہوئی بوتل پڑی ہے۔" جیو مراثن کی بیٹیاں بھی باتیں کر رہی تھیں۔ بار بار ان کے منہ سے دعائیں نکل رہی تھیں۔ شبانہ اور نجمی نے انہیں گیارہ گیارہ روپے کی نذر پیش کی تو جیو مراثن نے باری باری دونوں کے ماتھے چوم کر انہیں ڈھیروں دعائیں دیں۔ پھر طاہرہ کی طرف دیکھ کر بولی۔

"پتر! طبلے کے لئے تھوڑا آٹا گوندھ کر رکابی میں رکھ دینا۔" اتنے میں نجمی کی امی بھی آ گئی۔ وہ اپنے ساتھ پھل کی ٹوکری لائی تھی۔ نجمی اور شبانہ کو دیکھ کر وہ حیران سی ہوئی۔ اسے نجمی کا وہاں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے کہا۔ "تو کالج کی پڑھائی چھوڑ کر کیوں آ گئی ہے ری۔"

نجمی نے کہا۔ "امی! شبانہ کو اپنے امتحانوں کے بارے میں کچھ پوچھنا تھا۔ اس کے ساتھ آئی ہوں۔"

نجمی کی امی نے خالہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "چوکیوں میں جوان لڑکیوں کو نہیں آنا چاہیئے بھابی۔"

درویش صفت خالہ نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ کہا۔ "یہ تو شاہ پری کا دربار ہے ہم کسی کو آنے اور کچھ پوچھنے سے منع نہیں کر سکتے بھابھی۔"

طاہرہ پھلوں کی ٹوکری اندر لے گئی۔ اندر ایک بڑے تبنوس میں نوکرانی پہلے سے ہی پھل کاٹ کر ڈال رہی تھی۔ کیلوں، امرود اور سیبوں کے کٹے کٹے ٹکڑے کئے جا رہے تھے۔ یہ سب چوکی کے دوران شاہ پری کی حاضری پر اہل مجلس کو تبرک کے طور پر دیا جاتا تھا اور بعد میں اسے محلے کے بچوں میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ نجمی کی امی نے نجمی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جاؤ نیچے جا کر بیٹھو۔" نجمی شبانہ کو لے کر نیچے بیٹھک میں آ گئی۔ بیٹھک میں پہلے ہی سے محلے کی دو عورتیں بیٹھی تھیں جنہیں خالہ نے مدعو کیا ہوا تھا۔ نجمی اور شبانہ انہیں سلام کر کے چاندنی کے فرش کی ایک جانب ہو کر بیٹھ گئیں اور سرگوشیوں میں

باتیں کرنے لگیں۔ اتنے میں طاہرہ اور نوکرانی نیچے آ گئیں۔ نوکرانی نے کٹے ہوئے پھلوں والا تبنوس اٹھا رکھا تھا۔ طاہرہ کے ایک ہاتھ میں گندھے ہوئے آٹے کی رکابی اور دوسرے ہاتھ میں اگربتیوں کا بنڈل تھا۔ آج اس نے بھی نہا دھو کر نئے کپڑے پہن رکھے تھے اور سر کے بالوں کو دوپٹے میں ڈھانپ رکھا تھا۔

نجمی اور شبانہ بھی سر کو پوری طرح ڈھانپ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اگربتیاں سلگا دی گئیں۔ پھلوں کا تبنوس یا طشت درمیان میں رکھ دیا گیا۔ پہلے جو ثابت پھلوں کا طشت پڑا تھا طاہرہ نے اسے گاؤ تکیوں کے برابر میں رکھ دیا۔ وہ خاص پھل تھے جو شاہ پری حاضر ہو کر خالہ جان کی وساطت سے خاص خاص لوگوں کو عطا کرتی تھی۔ تھوڑی دیر میں جیو مراثن بھی اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ نیچے آ گئی۔ گاؤ تکیوں کے بالکل سامنے دیوار کے ساتھ ان کے لئے تین پیڑھیاں لگا دی گئیں تھیں۔ انہوں نے چادر کھول کر طبلے کی جوڑی نکالی۔

جیو مراثن نے پان والی مخملی تھیلی اپنے سامنے رکھ لی۔ قوام والا پان منہ میں رکھا اور اگالدان کو اپنے قریب کر لیا۔ ایک بیٹی نے گھنٹی نکال کر ذرا سی بجائی۔ اس گھنٹی کی آواز پر جیو مراثن نے طبلے پر آٹا لگا کر اسے سر کرنا شروع کر دیا۔ محلے کی دونوں عورتیں بڑے ادب سے خاموش بیٹھی تھیں۔ تھوڑی دیر گزری ہو گی کہ اوپر سے خالہ جان، طاہرہ اور نوکرانی کے ہمراہ نیچے تشریف لے آئیں۔

ان کے ساتھ ہی عطر پھلیل کی تیز خوشبوئیں بھی نیچے بیٹھک میں آ گئیں۔ بیٹھک کی گلی کی طرف نکلنے والی ساری کھڑکیاں بند کر دی گئیں صرف ایک روشندان ہی کھلا تھا۔ سردیوں کا موسم کچھ کچھ شروع ہو گیا تھا مگر ابھی اتنی سردی نہیں تھی۔ خالہ جان جازم پر گاؤ تکیوں کے درمیان بیٹھ گئیں۔ ان کے گھنے کھچڑی بال پورے کھلے تھے اور ان کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ان بالوں میں بھی چنبیلی کا تیل لگایا گیا تھا۔ بیٹھک کی فضا مختلف قسم کی دیسی خوشبوؤں سے بوجھل ہو گئی مگر شبانہ ان خوشبوؤں کی عادی تھی۔

طاہرہ نے اب طاق میں سے چنبیلی کے عطر کی شیشی اٹھائی اور اس کا کارک کھول کر خالہ جان کے لباس اور سر کے بالوں میں عطر لگانا شروع کر دیا۔ جو عطر باقی بچا وہ اس نے نجمی اور شبانہ کے دوپٹوں پر مل دیا نوکرانی نے رہی سہی کسر گلاب دانیوں میں سے گلاب چھڑک کر پوری کر دی۔ فضا خوشبوؤں سے اس قدر بوجھل ہو گئی کہ شبانہ کو ہر سانس کے محسوس ہوتا کہ وہ عطر کے گھونٹ پی رہی ہے۔

جیو مراثن طبلہ سر کر چکی تھی۔ اس نے خالہ جان کی طرف دیکھا۔ نجمی کی سوتیلی ماں خالہ جان کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ جیو مراثن نے خالہ سے اجازت طلب کی۔

"سرکار کی اجازت ہو تو بندی دوہے کے بول شروع کرے۔ خالہ جان پر ماحول کے اثر اور کچھ ان کی طبیعت کی پاکیزگی اور خدا سے پیار کی وجہ سے ایک عجیب سی کیفیت ابھی سے طاری ہونے لگی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں، آنکھیں کھول کر جیو مراثن کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور بڑی نرم مگر باوقار آواز میں کہا۔" ہماری طرف سے اجازت ہے۔"

جیو مراثن نے حکم پاتے ہی طبلے پر زور سے ہاتھ مارا۔ ایک خاص تال بجانی شروع کر دی جس کے ساتھ اس کی ایک بیٹی گھنٹیاں بجا رہی تھی اور دوسری بیٹی تالی پیٹ رہی تھی۔ طبلہ، گھنٹیاں اور تالی اتنے زور سے اور ایسی زبردست تال سے بج رہی تھی کہ بیٹھک کی فضا گونجنے لگی۔ دو منٹ تک طبلہ بجانے کے بعد جیو مراثن نے اپنی کراری مگر سر کی پکی آواز میں بول اٹھائے۔

پیھاں مار چنہاں بہٹی وگدی اے
تیری باندی روڑ دی جاندی اے

وہ ایک بول اکیلی اٹھاتی اور اس کی دونوں بیٹیاں اپنی تیز اونچی آوازوں میں اس بول کو دوبارہ دہراتیں۔ موسیقی کی تال ایسی منتخب کی گئی تھی کہ طبلے کی گونج داہ تھاپ کا اثر سیدھا دل پر جا کر ہوتا تھا۔

شبانہ چونکہ اس قسم کی محفلیں بہت دیکھ چکی تھی اس لئے اس پر زیادہ اثر

نہیں ہو رہا تھا۔ اگر کوئی شخص پہلی بار ایسی مجلس میں آئے تو اس کے دل پر ضرور حال طاری ہو جائے۔ خالہ جان پہلے آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔ پھر انہوں نے دائیں بائیں بھی جھولنا شروع کر دیا جیو مراثن نے لے تیز کر دی۔ خالہ جان کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ سر کو آہستہ آہستہ دائیں بائیں جھٹک رہی تھیں۔ جیو مراثن کچھ دیر تک وہی بول دہراتی رہی۔ پھر اچانک اس نے بول اور لے تبدیل کر دی۔ اور تیز لے میں یہ مصرعہ اٹھایا۔

ہلا رے نی میری شاہ پریئے
نی میری شاہ پریئے
نی میری شاہ پریئے

طبلے کی گونج بلند ہو گئی۔ گانے کی لے تیز ہو گئی۔ اگربتیوں کے خوشبودار دھوئیں سے کمرہ بھر گیا۔ خالہ جان نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے سر کو آگے پیچھے ہلانا شروع کر دیا۔ وہ اپنے بالوں کو زور سے آگے گرائیں اور پھر سر اٹھا کر پیچھے لے جائیں۔ اب وہ باقاعدہ حال کھیلنے لگی تھیں۔ ان پر حال طاری ہو گیا تھا۔ جیو مراثن نے لے اور تیز کر دی۔ خالہ جان زیادہ زور سے سر آگے پیچھے مارنے لگیں۔

شبانہ، نجمی کی امی اور محلے کی دونوں عورتیں بڑے ادب سے سر جھکائے چاندنی کے فرش پر ایک طرف ہو کر بیٹھی تھیں۔ حال کھیلنے کا یہ سلسلہ پانچ دس منٹ تک جاری رہا۔ پھر ایک دم سے خالہ جان نے ہاتھ فضا میں بلند کر دیا۔ وہ ساتھ ساتھ حال بھی کھیلے جا رہی تھیں۔ ہاتھ کے بلند ہوتے ہی جیو مراثن نے طبلے پر اپنا ہاتھ روک لیا۔ گانا بند کر دیا گیا۔ جیو مراثن نے عاجزانہ لہجے میں آواز بلند کی۔

"شاہ پری کی تشریف آوری مبارک ہو۔ بندی کی خطائیں معاف کر دی جائیں بسم اللہ! بسم اللہ! بسم اللہ۔۔۔۔"

خالہ جان نے ہاتھ نیچے کر لیا اب وہ حال نہیں کھیل رہی تھیں۔ صرف اپنے جسم کو دائیں بائیں ہلا رہی تھیں ان کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے پھر انہوں نے

اپنی آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں بیٹھک میں سناٹا چھا گیا خالہ جان نے کسی قدر بھاری آواز میں پوچھا۔ "ہمیں کس لئے دعوت دی گئی تھی؟"

خالہ جان کی جو دو بوڑھی سہیلیاں چپ چاپ ادب سے بیٹھی تھیں اب ذرا آگے ہو گئیں وہ خالہ جان کی ہم کیفیت اور ہم مشرب تھیں ان میں سے ایک نے دونوں ہاتھ باندھ کر کہا۔

"حضور کا آنا مبارک ہو سرکار کے دیدار کے لئے یہ چراغ جلائے گئے ہیں۔" خالہ جان نے اپنی لال لال آنکھیں بند کر لیں وہ عجیب کیفیت میں آہستہ آہستہ جھوم رہی تھیں دوسری ہم خیال عورت نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔

"سرکار کو بہشت سے آنا پڑا حضور کو ہم نے تکلیف دی ہے ہمیں بخش دیا جائے" خالہ نے کوئی جواب نہ دیا وہ مسلسل جھوم رہی تھیں پھر دایاں ہاتھ فضاء میں بلند کرتے ہوئے حکم دیا۔

"ہمیں تیری باندی روڑدی جاندی اسے سناؤ۔" جیو مراثن کے ہاتھ طبلے پر ہی تھے فوراً سر جھکا دیا اور طبلے پر اتنی زور سے ہاتھ مارا کہ شبانہ کا دل بے اختیار اچھل سا پڑا خود شاہ پری کی فرمائش تھی جس پر مراثن نے جان لڑا دی وہ پوری آواز اور پورے جوش کے ساتھ سر مار مار کر گا رہی تھی۔

پیھاں مار جتھاں ہٹی وگدی اے
تیری باندی روڑدی جاندی اے

جیو مراثن کی آواز پھٹ کر تین چار شاخوں میں تقسیم ہونے لگی تو خالہ جان نے ایک بار پھر ہاتھ بلند کر دیا جیو مراثن کا ہاتھ طبلے پر رک گیا وہ پسینے میں تر بتر ہو گئی تھیں خالہ جان کے ماتھے پر بھی پسینے کے موتی چمکنے لگے تھے اب انہوں نے اپنی سرخ آنکھیں اٹھا کر جیو مراثن کی طرف دیکھا اور بارعب آواز میں کہا "تیرا بیٹا کویت ضرور جائے گا ہم اسے کویت پہنچائیں گے۔"

جیو مراثن میری سرکار میری سرکار کہتے ہوئے سجدے میں گر پڑی خالہ جان نے اسے ایسا کرنے سے منع کرتے ہوئے کہا۔ "سجدہ مت کرو سر اٹھاؤ جیو سجدہ صرف اللہ کے لئے ہے۔"

جیو مراثن نے جلدی سے سر اٹھایا اور ہاتھ باندھ کر ادب سے بیٹھ گئی۔ اب خالہ جان نے نجمی کی امی کی طرف نگاہ کی اور پوچھا۔ "تمہارے دل کا حال ہمیں معلوم ہے جو تم سوچ رہی ہو وہ غلط ہے دولت تمہارے ساتھ نہیں جائے گی یہ بچی جہاں چاہتی ہے وہاں اس کا بیاہ کر دے۔" نجمی کے کان سرخ ہو گئے اس نے آنکھیں نیچی کر لیں اسے اپنی سوتیلی ماں کی آواز سنائی دی۔

"سرکار ہم نے تو منگنی بھی کر دی ہے۔" خالہ جان نے کہا
"تو نے جہنم میں جانے کا راستہ چن لیا ہے ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"
پھر خالہ جان نے نجمی کی طرف دیکھا اور فرمایا "تیری سہیلی کو ہم نے پہلے بھی دیکھا ہے۔"

شبانہ کا دل دھڑکنے لگا اگرچہ وہ ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی جدید سائنسی علوم سے واقف تھی فلسفہ بھی اس نے پڑھ رکھا تھا اور اب انگریزی میں ایم اے کر رہی تھی مگر بچپن میں جو نقوش اس کے دل پر ثبت ہو چکے تھے انہیں وہ دور نہیں کر سکتی تھی ان کا اثر ابھی تک اس کے مزاج اور روح پر تھا اس کا دماغ اعتراض کرتا تھا مگر دل تسلیم کر رہا تھا کہ خالہ جان پر شاہ پری آتی ہے نجمی نے ادب سے کہا۔

"یہ میری سہیلی شبانہ ہے سرکار یہ آپ کی درگاہ میں اکثر حاضری دیتی رہتی ہے اس کے امتحان کے بارے میں حکم فرمائیں۔" خالہ جان نے جھومتے جھومتے آنکھیں ایک پل کے لئے بند کر لیں پھر فرمایا۔

"یہ لڑکی امتحان میں پاس ہو جائے گی۔" محلے کی دونوں عورتوں نے باری باری شاہ پری سے دعا کے لئے کہا خالہ جان نے فرمایا مسلمانوں کی فتح ہو گی خدا اور اس کے نبی پاک ﷺ کا نام روشن ہو گا کافر مٹ جائیں گے۔"

نجمی کی سوتیلی ماں نے بہت سی باتیں پوچھنی تھیں مگر خالہ جان نے بھاری بھر کم آواز میں کہا۔ "اب ہم جا رہے ہیں۔" دونوں عورتوں اور جیو مراثن نے بیک آواز ہو کر کہا۔

"بسم اللہ بسم اللہ بسم اللہ۔"

خالہ جان نے دائیں جانب رکھے نایاب پھلوں کے طشتت میں ہاتھ ڈالا ایک سیب جیو مراثن کو ایک ایک سیب محلے کی دونوں ہم خیال عورتوں کو ایک امرود شبانہ کو اور ایک سیب نجمی کو دیا۔ اس کے بعد بلند آواز میں السلام علیکم کہا جس کے جواب میں محفل میں بیٹھی سبھی خواتین نے بلند آواز میں وعلیکم السلام کہا اور خالہ جان وہیں گاؤ تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئیں دو منٹ کے لئے محفل پر سکوت طاری رہا نہ کوئی اپنی جگہ سے ہلا اور نہ کسی نے کوئی بات کی دو منٹ کے بعد محلے کی ہم خیال عورت اٹھ کر خالہ جان کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور ان کے شانوں کو آہستہ سے ہلاتے ہوئے بولی۔ "داراں بہن داراں بہن۔" خالہ جان آنکھیں کھول کر اٹھ بیٹھیں آنکھیں ان کی اب بھی سرخ تھیں۔ مگر شاہ پری تشریف لے جا چکی تھی انہوں نے طاہرہ کو آواز دے کر کہا طاہری میری گت کر دے پتر پھر انہوں نے اپنی ہم خیال عورت سے پوچھا۔

"شاہ پری سے کس نے کیا کیا پوچھا؟ انہوں نے کیا جواب دیئے ہم خیال عورت نے شروع سے آخر تک محفل کی ساری کارروائی سنا دی۔ خالہ جان نے نجمی کی امی کی طرف دیکھا جو خاموش بیٹھی تھیں۔"

بھائی شاہ پری نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل کرنا اس میں تیرے خاندان کی بھلائی ہے نجمی کی ماں نے نجمی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "تم لوگ اب کیوں بیٹھے ہو جاؤ کالج نہیں جانا ہے؟"

نجمی اور شبانہ اٹھ کھڑی ہوئیں انہوں نے خالہ جان کو بڑے احترام سے سلام کیا خالہ جان نے انہیں دعائیں دیں نجمی اور شبانہ مکان کی ڈیوڑھی سے نکل کر باہر گلی میں آ گئیں۔ گلی میں ابھی تک محلے کے دو چار چھوٹے بچے بیٹھک کی بند کھڑکی سے لگے

اندر سے اٹھنے والی گانے کی آواز کے منتظر تھے نجمی اور شبانہ کو دیکھتے ہی وہ بھاگ گئے گلی میں گزرتے ہوئے شبانہ نے کہا۔

"شاہ پری نے تو بڑے سخت لفظوں میں تیری امی کو اس بیاہ سے منع کر دیا ہے۔ میرا خیال ہے اب وہ اپنا ارادہ بدل لیں گی۔" نجمی نے ٹھنڈی سانس بھری اور بولی۔ تم میری ماں کو نہیں جانتی ہو شبو شاہ پری کی باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو گا اسے دولت چاہیئے دولت۔"

شبانہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی اس نے سوچا تھا کہ وہ نجمی سے راحیل کے بارے میں اپنے دل کا راز کھول دے گی اور اس سے راحیل کی پر اسرار شخصیت کے بارے میں بات کرے گی مگر نجمی اپنے جذباتی مسائل میں اس بری طرح سے الجھ گئی تھی کہ شبانہ نے اپنے ارادے کو ایک بار پھر ملتوی کر دیا اس سے پہلے بھی شبانہ کو کئی بار خیال آیا تھا کہ وہ اسے راحیل کے بارے میں کچھ بتائے شیزان کے پر سکون ماحول میں بیٹھ کر کافی پیتے ہوئے اس رومانٹک انسان کے اچانک اس کی زندگی میں نمودار ہونے اور پھر وقفے وقفے کے ساتھ ایک دم سے غائب ہونے کے سلسلے میں گفتگو کرے لیکن ہر بار شبانہ کی راز پرستی اور اپنے خول میں بند رہنے کی طبعی عادت نے اسے اس سے باز رکھا۔

شبانہ فطری طور پر اسرار پسند لڑکی تھی اسے معلوم تھا کہ جونہی راحیل کے بارے میں اس نے کسی سے بات کی اس رومانس کا سارا اسرار اور تجسس ختم ہو جائے گا اب جب اس نے اس راز سے پردہ اٹھانے کا فیصلہ کیا تو نجمی کو اپنی جذباتی پریشانیوں میں مبتلا پایا۔ اب نجمی کو شبانہ کی دلجوئی کی ضرورت تھی۔

شبانہ کی گاڑی موچی دروازے کے باہر پولیس اسٹیشن کے پاس ہی کھڑی تھی۔ موچی دروازے کے مین بازار میں پھول بیچنے والے چچا نے شبانہ کو دیکھا تو دور سے آواز دی۔

"پتر پھول نہیں لے جاؤ گی آج۔" شبانہ نے چچا کو قریب جا کر ادب سے سلام

کیا چچا نے آگے بڑھ کر شبانہ کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور دعا دی پھر دونوں کو سرخ گلابوں کا ایک ایک گجرا اور کچھ ہار پتوں میں لپیٹ کر دیئے اور تاکید کی کہ خواجہ صاحب کو میرا اسلام کہنا۔ گاڑی موچی دروازے سے باہر نکالتے ہوئے شبانہ نے نجمی سے کہا۔

"پھولوں والے چچا اب بھی مجھے بچوں کی طرح پیار کرتے ہیں۔ اس شخص کو میں بچپن سے دیکھ رہی ہوں اس کے بوڑھے چہرے پر بھی نور ہے۔"

نجمی نے جیسے کچھ نہیں سنا تھا وہ سوچ رہی تھی کہ آج ندیم سے مل کر اسے کہہ دے گی کہ وہ اسے بھول جائے قسمت میں ان کا ملاپ نہیں لکھا شبانہ کہہ رہی تھی "پھول والے چچا کے چہرے پر پھولوں کی معصومیت اور پاکیزگی ہے میں سمجھتی ہوں کہ دنیا میں رہ کر بھی سب سے بڑا سرمایہ ہے جو انسان اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔" نجمی نے اپنے خیالات سے چونکتے ہوئے "ہاں" کہا تو شبانہ سمجھ گئی کہ نجمی کیوں غیر حاضر ہے اس نے گاڑی کا گیئر بدلتے ہوئے اسے بھاٹی دروازے کی طرف ڈالا اور کہا۔

"اب تم کیا سوچ رہی ہو میرا مطلب ہے کہ اگر تمہاری امی منگنی توڑنے پر راضی نہ ہوئی جو میرا خیال ہے کہ نہیں ہوں گی تو تم؟" نجمی نے جھنجھلا کر کہا۔

"تو میں راوی میں چھلانگ لگا دوں گی تنگ آ گئی ہوں میں اس عورت کے ستم سے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور بولی۔

"ابو بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے آئے ہیں ان کو بھی میری زندگی کی پروا نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سمجھتے ہوں کہ تم وہاں خوش رہو گی تم نے بھی تو اپنے ابو سے کبھی اس قسم کی بات نہیں کی اب ان سے بات کر کے دیکھو وہ ضرور تمہاری طرفداری کریں گے۔

"میں جانتی ہوں کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور پھر میں یہ بات اپنے باپ سے کر بھی نہیں سکتی۔"

شبانہ نے اپنے پہلے والے عزم کو پھر دہراتے ہوئے کہا۔ "اگر تم کہو تو میں بات کروں تمہارے ابو سے؟" نجمی نے کوئی جواب نہیں دیا صرف ہلکے سے نفی میں

سر ہلا کر رہ گئی شبانہ نے یہ کہہ کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی کہ ابھی کافی وقت پڑا ہے، وہ پریشان نہ ہو کچھ سوچ لیں گے جب تک وہ ایم اے نہیں کر لیتی اس کی شادی نہیں ہو گی۔" نجمی نے کڑوا گھونٹ نگلتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔"

"ان باتوں کا گھر میں کسی کو خیال نہیں ہے انہیں میری تعلیم کی کیا فکر ہو سکتی ہے مجھے معلوم ہے وہ دو تین ماہ بعد میری پرویز سے شادی کر دیں گے امی تو گلبرگ جا کر وہ کوٹھی بھی دیکھ آئی ہیں جسے پرویز ان کے نام کرنے والا ہے۔" شبانہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو کیا وہ کوٹھی تمہارے نام نہیں ہو گی۔"

"ہرگز نہیں" نجمی نے طنزیہ انداز میں کہا اس کوٹھی کی میری سوتیلی ماں کو مجھ سے زیادہ ضرورت ہے وہ لوہاری دروازے والے گندے مکان سے اٹھ کر کوٹھی میں میرے پاس جائیں گی یہ کوٹھی بھی اسی کے نام ہو گی۔"

نجمی نے شبانہ کو یہ بھی بتایا کہ پرویز عمر میں بھی اس سے کافی بڑا ہے اس نے امی کو پچاس ہزار روپے بھی دیئے ہیں اس کی منگنی پر شبانہ کو یہ سن کر بہت دکھ ہوا۔ حقیقت یہ تھی کہ نجمی ایک نوجوان اور بے حد خوبصورت لڑکی تھی اس کی خوبصورتی کے چرچے کالج بھر میں تھے۔ پرویز نے کسی فنکشن میں اسے دیکھ لیا تھا اور اپنی والدہ کو رشتہ کے لئے اس کے گھر بھیج دیا۔

پرویز کروڑپتی تھا اس کے پاس روپے پیسے کی کمی نہ تھی جب اسے معلوم ہوا کہ نجمی کی امی سوتیلی ہے اور روپے پیسے کی لالچی ہے تو اس نے چیک بک اس کے سامنے رکھ دی اور نجمی کی ماں اس رشتے پر راضی ہو گئی تھی اس نے اس حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا کہ پرویز نجمی سے عمر میں بیس برس بڑا ہے اور اس کا پہلے سے ایک بچہ بھی ہے جو لندن میں اس کی پھوپھی کے پاس پل رہا ہے گاڑی وحدت روڈ سے نکل کر یونیورسٹی کیمپس کی سڑک پر آئی تو شبانہ نے کہا۔

تم کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھنا نجمی تھوڑا وقت گزر جانے دو حالات

معمول پر آجائیں گے۔"

"نجمی نے جھنجھلاہٹ کے ساتھ کہا جب تک میں زندہ نہیں رہوں گی۔" شبانہ نے ایک بار پھر اسے اس قسم کی جذباتی رو میں بہنے سے منع کیا اور اسے کہا کہ وہ خود اس کے ابو کے پاس جائے گی نجمی بار بار یہی کہتی رہی کہ اس کے ابو سے ملنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا ان کی اپنی کوئی رائے نہیں ہے موچی دروازے کے پھولوں والے چچا کے دیئے ہوئے گلابوں کے گجرے اور ہار ڈبنش بورڈ پیر پتوں میں لپیٹے پڑے تھے جن میں سے ان کی بھینی بھینی مہک آرہی تھی اس روز باقی کا سارا دن نجمی کالج میں چپ چپ رہی۔

شبانہ نے اس کی طبیعت بہلانے کی بہت کوشش کی مگر ظاہر ہے نجمی ایک زبردست جذباتی بحران سے گزر رہی تھی ان باتوں سے وہ کیسے بہل جاتی دوسرے روز صبح نجمی نے کالج کی لائبریری میں جاکر ندیم کو فون کر دیا اور کہا کہ وہ اس سے ملنا چاہتی ہے بہت ضروری کام ہے ندیم نے اسے کہا کہ میں ریلوے اسٹیشن پر تمہارا انتظار کرتا ہوں فوراً آجاؤ نجمی نے ٹیکسی پکڑی اور لاہور اسٹیشن کی طرف چل دی۔

شبانہ سے اس نے یہی کہا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ گھر جا رہی ہے ریلوے اسٹیشن پر معمول کی طرح ٹریفک کا شور اور لوگوں کا تانتا بندھا تھا مگر اس نے ندیم کو دیکھ لیا۔ وہ پورچ میں ایک طرف ستون کے پاس کھڑا بے چینی سے سگریٹ پیتے ہوئے بار بار آنے جانے والی ٹیکسیوں کو دیکھ رہا تھا۔ نجمی کو دیکھتے ہی اس نے اطمینان کا سانس لیا دونوں فرسٹ کلاس ریفریشمنٹ روم میں جاکر بیٹھ گئے۔ ندیم نے چائے کا آرڈر دیا اور نجمی سے پوچھا۔

"خیریت تو ہے نہ؟" نجمی کی آنکھوں میں آنسو آگئے ندیم کو معلوم تھا کہ نجمی کی منگنی ایک کروڑ پتی تاجر پرویز سے ہو چکی ہے مگر وہ مجبور تھا ایک تو وہ امیر ماں باپ کا بیٹا نہیں تھا دوسرے وہ خود اپنے پاؤں پر نہیں کھڑا تھا نجمی سے وہ محبت ضرور کرتا تھا مگر اپنے آپ کو بے بس محسوس کر رہا تھا اس نے سگریٹ کی راکھ کو ایش ٹرے

میں آہستہ سے جھاڑتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تمہاری شادی ہو رہی ہے۔" نجمی نے تڑپ کر ندیم کی طرف دیکھا اور تیز لہجے میں بولی۔

"اگر تم یہی چاہتے ہو کہ میری شادی کہیں اور ہو جائے تو یہ بھی ایک دن ہو جائے گی اور تم بیٹھے سگریٹ پیتے رہو گے۔"

ندیم جھنجھلا سا گیا۔ "میں کیا کر سکتا ہوں میں نے اپنی والدہ کے ہاتھ تمہارے ہاں پیغام بھیجا جو شریفانہ طریقہ ہوتا ہے۔ تمہاری امی نے صاف انکار کر دیا میں نے تمہیں سے کہا کہ چلو کسی دوسرے شہر جاکر شادی کر لیتے ہیں تم نے انکار کر دیا اب تم ہی مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ خودکشی میں نہیں کر سکتا۔"

نجمی کے دل و دماغ میں اپنی سوتیلی ماں اور معاشرے کی زیادتیوں کے خلاف ایک طوفان سا امنڈ آیا تھا۔ کیا وہ کوئی بھیڑ بکری ہے کہ جس نے زیادہ رقم دی اس کے حوالے کر دیا؟ کیا اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں؟ اپنی کوئی شناخت نہیں؟ اپنا کوئی حق نہیں؟ کیا اسے یہ حق بھی حاصل نہیں کہ اپنی مرضی سے زندگی بسر کر سکے؟

ندیم اسے کہہ رہا تھا "بعد میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک بار ہماری شادی ہو گئی تو پھر کوئی ہمیں کچھ نہیں کہے گا۔ تمہارے ماں باپ بھی ہمیں قبول کر لیں گے۔ ہم شادی کے بعد فوراً لاہور واپس آجائیں گے میں تمہارے ماں باپ کے قدموں پر گر پڑوں گا۔ مجھے یقین ہے تب وہ مجھے ٹھوکر نہیں مار سکیں گے تم ایک بار حوصلہ تو کرو۔ میرے ساتھ نکل چلو۔ ہم کراچی جاکر فوراً شادی کر لیں گے۔ وہاں میرا ایک بڑا عزیز دوست رہتا ہے وہ ہماری شادی کا سب بندوبست کر دے گا میں نے تو اس سے بات بھی کر لی تھی لیکن جب تم نہ مانیں تو میں بھی خاموش ہو گیا۔"

نجمی کے ذہن میں ندیم کی باتیں چنگاریاں بن کر گر رہی تھیں جو اس کے باغیانہ جذبات کو مزید بھڑکا رہی تھیں سب سے زیادہ اسے اپنی سوتیلی ماں پر غصہ آرہا تھا جو اسے دولت کے عوض ایک بڈھے کے ہاتھ فروخت کر رہی تھی اگر اسکی

اپنی ماں ہوتی تو اس کا درد بھی کرتی۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ میں کوئی بکاؤ مال نہیں ہوں پڑھی لکھی لڑکی ہوں مجھے آگے بڑھ کر معاشرے سے اپنا حق چھین لینا ہوگا نہیں تو ساری زندگی تباہی کے جہنم میں سلگتی رہوں گی۔ ندیم کہہ رہا تھا۔

"تمہیں اپنی زندگی، اپنے مستقبل کو بربادی سے بچانے کا پورا حق حاصل ہے نجمی تم پڑھی لکھی لڑکی ہو کوئی جاہل یا گنوار نہیں ہو۔ آج کل تو ان پڑھ لڑکیاں بھی اپنے اوپر ظلم ہوتے گوارا نہیں کرتیں اگر تم ہاں کہہ دو تو۔۔۔۔۔۔

اس وقت ساڑھے نو بجے ہیں۔ ہم دوپہر کی ٹرین پکڑ کر یہاں سے نکل پڑیں گے کل شام کو کراچی پہنچتے ہی ہماری شادی ہو جائے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔

نجمی کو یہ راستہ بڑا آسان لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے تمام مسائل اس کی زندگی کے سارے دکھ اور اس کے مستقبل کے خدشات صرف چوبیس گھنٹے گزرنے کے بعد حل ہو سکتے ہیں۔ وہ اپنی پسند کے لڑکے سے شادی کرنے کے لئے گھر سے جا رہی ہے۔ وہ شادی کے دوسرے ہی دن واپس لاہور آجائے گی۔ اس کے ابو اسے ضرور معاف کر دیں گے۔ سوتیلی ماں کی نجمی کو کوئی پرواہ نہیں تھی وہ اپنے خاوند کے ساتھ اپنے گھر واپس آئے گی۔ اسے کسی زیور کپڑے کی پرواہ نہیں وہ تو صرف ندیم سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ ندیم کہہ رہا تھا۔

"تمہیں ابھی اسی وقت فیصلہ کرنا ہے نجمی۔ ورنہ اس کے بعد تمہاری میری راہیں جدا ہو جائیں گی۔ پھر مجھ سے کبھی یہ توقع نہ رکھنا کہ میں تم سے ملنے تمہارے گھر آؤں گا۔ کیا تم مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو؟"

نجمی کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ "ہاں میں تم سے اور صرف تم ہی سے شادی کروں گی۔" ندیم نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے نجمی کی چمکیلی آنکھوں کی طرف دیکھا اور کہا۔

"کیا تم آج دوپہر میرے ساتھ کراچی چل رہی ہو؟ میں اپنے دوست کو ابھی فون کر دوں گا۔ وہ ہماری شادی کا سارا انتظام تیار کروا رکھے گا۔"

"ہاں۔ میں کراچی جا کر تم سے بیاہ کر لوں گی۔ میں تیار ہوں۔" یہ جملہ جیسے نجمی کے اندر چھپی ہوئی، کھولتی ہوئی لڑکی نے کہا تھا۔ ندیم نے گھڑی پر وقت دیکھا اور ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کیا۔ "نجمی ایک بار پھر غور کر لو۔ سوچ لو کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں تم پچھتانا شروع کر دو۔" نجمی نے ندیم کی طرف پرعزم نظروں سے دیکھا اور کہا۔

"میں نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے ندیم! لیکن اب تم اپنے فیصلے سے پیچھے مت ہٹ جانا۔ مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ گے میری ناموس کی حفاظت کرنا۔ مجھ سے شادی کر کے مجھے واپس میرے ماں باپ کے پاس لے آنا۔" ندیم بولا۔

"کیسی باتیں کرتی ہو نجمی۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہاری عزت میری عزت ہے۔ تم میری بیوی بننے والی ہو۔ میری ناموس پر تو میری جان بھی قربان ہے۔"

نجمی کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے ارد گرد حفاظتی دیوار کھینچ دی ہو۔ جیسے کسی نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں کے حصار میں لے لیا ہو لیکن یہ ساری جذباتی تخیل کاری تھی۔ نجمی نے کس قدر بھیانک فیصلہ کیا تھا۔ یہ خود اسے بھی معلوم نہیں تھا جھوٹ میں جب تھوڑا سا سچ ملا دیا جائے تو وہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔

نجمی زہر پینے والی تھی لیکن اپنی خوش فہمیوں اور خوش کن قیاس آرائیوں سے اس نے اس زہر کو تھوڑا سا میٹھا کر لیا تھا۔ یہ شیرینی وقتی تھی جبکہ زہر کی ہلاکت مستقل اور دائمی تھی۔ نجمی کو ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا کہ اس کے کاندھوں سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ اب یہ بوجھ ندیم کے کندھوں پر منتقل ہو گیا تھا لیکن ندیم نے صدق دل اور پوری ذمہ داری سے یہ بوجھ اٹھا لیا تھا۔

وہ نجمی سے شادی کر کے ایک ذمہ دار اور کامیاب شہری کی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ کراچی میں اس کا ایک قابل اعتبار دوست ایک ہوٹل کا منیجر تھا۔ اس کا نام زمان تھا۔ زمان سے ندیم کی ملاقات ایک برس پہلے کراچی کے اسی ہوٹل میں ہوئی تھی جس کا زمان منیجر تھا۔ دونوں بہت جلد ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے تھے۔

زمان کا مہینے میں لاہور کا ایک پھیرا ضرور لگتا تھا اور وہ ندیم سے ملے بغیر واپس نہیں جاتا تھا۔ زمان خوش پوش اور بہت خرچیلا تھا۔ اس کی تنخواہ اتنی نہیں تھی مگر وہ بڑے ٹھاٹھ سے کراچی میں رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک ٹیوٹا گاڑی بھی تھی۔ زمان نے ندیم کو یہی بتایا تھا کہ وہ ساتھ ساتھ درآمد برآمد کا کاروبار بھی کرتا ہے۔ ندیم کو اس کے کاروبار اور ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے زمان کی خوش گفتاری اور خوش لباسی بہت پسند تھی۔ اسی وجہ سے وہ اس کا ایک برس میں ہی گہرا دوست بن گیا تھا، جب نجمی کی منگنی ہو گئی تو ندیم بے حد پریشان ہوا اچانک اسے زمان کا خیال آیا۔ وہی ایک ایسا دوست تھا جو ندیم کی دل جوئی کر سکتا تھا۔

ندیم ٹرین میں بیٹھا اور سیدھا کراچی زمان کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے زمان کو بتایا کہ جس لڑکی سے وہ محبت کرتا ہے اس کا بیاہ کسی دوسرے سے ہو رہا ہے زمان نے ندیم کو کندھے سے پکڑ کر ہنستے ہوئے ہلکا سا جھٹکا دے کر کہا ”اور تم بدھو بنے اپنی محبوبہ کو دوسرے کے ساتھ جاتے دیکھتے رہ گئے؟ ندیم بھائی تم کس زمانے میں رہ رہے ہو۔ لڑکی کو بھگا کر یہاں لے آؤ۔ ہم تمہاری شادی کروا دیں گے۔“

ندیم اس کا منہ تکنے لگا۔ پہلے تو اس نے ایسا قدم اٹھانے سے خود انکار کیا تھا پھر کہا کہ نجمی گھر سے بھاگنے پر تیار نہیں ہو گی۔ زمان نے سگریٹ ایش ٹرے میں دباتے ہوئے قہقہہ لگایا اور ندیم کے کاندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔

”تو پیارے پھر ساحل سمندر پر جا کر کوئی دردناک فلمی گیت گاؤ میرے پاس تو تمہارا جو علاج تھا وہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔“ ندیم نے حامی تو نہ بھری مگر یہ خیال اس کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ چنانچہ اب جب نجمی کراچی بھاگ جانے پر راضی ہو گئی تو ندیم نے زمان کو فون کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے نجمی سے کہا۔

”میرا خیال ہے کراچی کی ٹرین بارہ بج کر بیس منٹ پر چھوٹتی ہے۔ تم یا تو

میرے ساتھ ہی رہو۔ یا اگر تمہیں گھر سے کچھ کپڑے وغیرہ لانے ہیں تو جا کر لے آؤ میں کراچی اپنے دوست زمان کو فون کر دیتا ہوں وہ نکاح خواں کو بالکل تیار رکھے گا کل شام کو کراچی پہنچتے ہی ہماری شادی ہو جائے گی۔“

زندگی میں کبھی انسان کی آنکھوں کے آگے سے پردہ اٹھ جاتا ہے اور کبھی آنکھوں کے آگے پردہ گر جاتا ہے۔ نجمی کی آنکھوں کے آگے پردہ گر چکا تھا۔ ہم مشرقی لوگ جس معاشرے میں زندگی بسر کر رہے ہیں اس میں مرد لوگ تو زندگی کی کشادہ شاہراہ پر بے خطری اور بے خوفی سے سفر کرتے ہیں۔ وہ ہر پڑاؤ پر ایک نیا معاشقہ کرتے چلے جاتے ہیں اور وہ کسی کے آگے جواب دہ نہیں ہوتے لیکن ہمارے معاشرے میں عورت کو چاہے وہ شادی شدہ ہو چاہے غیر شادی شدہ ساری زندگی ایک ایسی پل صراط پر سے گزرنا پڑتا ہے کہ ذرا سی ڈگمگاہٹ اسے زندگی بھر کے لئے مردوں کی بنائی ہوئی ذلت کی دلدل میں گرا دیتی ہے۔

نجمی کو اپنی پسند کی شادی کا پورا پورا حق تھا اس نے اپنے اس حق کے حصول کا ہی فیصلہ کیا تھا لیکن وہ یہ بھول گئی تھی کہ اس کے اردگرد مشرقی روایات کی مکڑیوں کا جالا تنا ہوا ہے۔ جسے وہ بڑی آسانی کے ساتھ ذرا سا ہاتھ ہلانے ذرا سا پاؤں باہر نکالنے سے تہس نہس کر سکتی ہے مگر اس جالے کو توڑ کر وہ اس میں بری طرح سے الجھنے والی تھی۔ پھر اس جالے سے نجات تقریباً ناممکن تھی۔ اس نے ندیم سے کہا۔ ”میں تھوڑی دیر کے لئے گھر جاؤں گی۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے اسی ریفریشمنٹ روم میں پہنچ جاؤں گی۔ دیکھو میں تمہاری خاطر اتنا بڑا قدم اٹھا رہی ہوں۔ اب کہیں تم مجھے چھوڑ نہ جانا۔“

ندیم نے آہستہ سے نجمی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ”نجمی! تمہارے ساتھ جیوں گا، تمہاری خاطر مروں گا۔“ نجمی نے اپنے اندر بے پناہ طاقت محسوس کی۔ لاہور ریلوے اسٹیشن سے نکل کر نجمی اپنے اندرون شہر والے مکان کی طرف اور ندیم مال روڈ والے ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف آفس کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے پاس وقت کم

تھا خوش قسمتی سے دوسری طرف سے زمان ہی بول رہا تھا۔ ندیم ٹیلی فون بوتھ میں تھا۔ اس نے کہا۔

"زمان میں ندیم لاہور سے بول رہا ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں نے تمہیں بڑی ضروری بات کرنے کے لئے فون کیا ہے۔ میری بات غور سے سنو۔ . . ."

ندیم نے مختصر لفظوں میں زمان کو ساری بات سمجھا دی اور فون بند کر کے باہر آ کر بل ادا کیا اور سیدھا اپنے گھر آ گیا اسے معلوم تھا کہ دو چار دنوں کے بعد واپس اسی گھر میں اپنی بیوی نجمی کے ساتھ آ جائے گا۔ اس لئے اسے وہاں سے کچھ بھی اٹھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اپنی الماری میں اس نے تین سو روپیہ بچا بچا کر رکھا ہوا تھا۔ یہ رقم اس نے بٹوے میں رکھ لی اور انہی کپڑوں میں گھر سے نکل گیا۔

ٹیکسی پکڑ کر وہ سیدھا بڑے ڈاکخانے میں آ گیا۔ یہاں اس نے ایک پوسٹ کارڈ خریدا۔ اس پر اپنے والد صاحب کے نام چند جملے لکھے کہ اسے ایک ضروری کام سے پشاور جانا پڑ گیا ہے۔ صورت حال ایسی پیدا ہو گئی ہے کہ میں گھر آ کر آپ کو اطلاع نہیں دے سکتا۔ دو یا تین دنوں میں واپس آ جاؤں گا آپ بالکل فکر نہ کریں میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ پوسٹ کارڈ پر اپنے گھر کا پتہ لکھ کر اس نے پوسٹ کر دیا۔ اسے کوئی شے ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کراچی میں زمان کے ہاں میں سب کچھ موجود تھا صرف انہیں ایک رات ہی ٹرین میں بسر کرنی تھی۔ دوسرے روز انہیں کراچی پہنچ جانا تھا جہاں نکاح خواہ تیار ہو گا اور ان کی شادی ہو جائے گی دو ایک روز کراچی ہوٹل میں ٹھہرنے کے بعد وہ واپس لاہور آ جائیں گے اور انشاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

انہی خیالات میں کھویا ہوا ندیم گیارہ بجے ہی لاہور ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا اب اسے نجمی کی طرف سے فکر لگی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ اپنا ارادہ بدل ڈالے۔ آخر لڑکی ہے اور پہلی بار گھر سے باہر قدم نکال رہی ہے۔ ایک لڑکی کے لئے یہ ایک بہت بڑا فیصلہ تھا۔

ندیم پہلے تو پلیٹ فارم پر ٹہلتا رہا۔ اس نے تین سگریٹ پھونک ڈالے۔ کراچی تک سیکنڈ کلاس کے اس نے دو ٹکٹ خرید کر رکھ لئے تھے۔ ساڑھے گیارہ بجے وہ اسٹیشن کی لابی میں آ کر ایک ستون کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہیں پورچ میں داخل ہوتی گاڑیوں، ٹیکسیوں اور تانگوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے حلق کا ذائقہ کڑوا ہو گیا تھا۔ سگریٹ کا مزہ جاتا رہا تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ پونے بارہ بج رہے تھے۔ پلیٹ نمبر ۴ پر کراچی جانے والی گاڑی آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

ندیم بے چینی کے عالم میں ہر آنے والی ٹیکسی اور تانگے اور رکشے کو تک رہا تھا پینتالیس منٹ بعد ٹرین کو کراچی روانہ ہو جانا تھا۔ نجمی ابھی تک نہیں آئی تھی پھر بارہ بج گئے۔ ندیم نا امید ہو گیا۔ نجمی نہیں آئے گی۔ گھر کی دہلیز نے اس کے پاؤں پکڑ لئے ہیں۔ لڑکی چاہے کتنی پڑھ لکھ جائے وہ لڑکی ہی رہتی ہے۔ اسے مرزا صاحباں کے پنجابی بول یاد آنے لگے جن میں جٹ ونجھل پنجاب کے دلیر عاشق مرزے کو سمجھاتا ہے کہ دیکھو ان عورتوں کی باتوں کا اعتبار نہ کرو۔ یہ پہلے ہنس ہنس کر دوستی کرتی ہیں اور بعد میں روتی ہوئی پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔

"فیر رو کے دینیدیاں" اس کا ترجمہ اردو میں شاید نہیں ہو سکتا۔ ندیم کے ذہن میں بھی پنجابی کے بول ہی گونج رہے تھے۔ ندیم نے سگریٹ پھینک دیا۔ وہ نجمی کی طرف سے نا امید ہو گیا تھا کہ اچانک ایک رکشا پورچ میں آ کر رکا اور اس میں سے نجمی باہر نکلی۔ ندیم نے جٹ ونجھل کو مخاطب کر کے کہا تم عورتوں کو نہیں سمجھ سکے مسٹر۔ عورت اگر کمزور ہے تو اس سے زیادہ طاقتور کوئی ذی روح بھی اس دنیا میں نہیں ہے۔ وہ بے اختیار ہو کر نجمی کی طرف بڑھا۔ نجمی کے پاس بھی کوئی بریف کیس وغیرہ نہیں تھا۔ صرف ایک بڑا پرس تھا جو اس نے کاندھے سے لٹکا رکھا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں کے چہرے آنے والی خوشیوں کے تصوّر سے جگمگا اٹھے۔ ندیم نے کہا۔ "جلدی چلو۔ ٹرین تیار ہے۔" وہ پل عبور کر کے پلیٹ فارم نمبر چار پر آ گئے کراچی جانے والی گاڑی ان کا انتظار کر رہی تھی۔

کراچی ایکسپریس چھوٹے چھوٹے اسٹیشن چھوڑتی کراچی کی طرف اڑی جا رہی تھی نجمی کو ندیم نے سیکنڈ کلاس کے زنانہ کمپارٹمنٹ میں بٹھایا تھا۔ ڈبے میں دوسری مسافر عورتیں بھی بیٹھی تھیں ان کے بچے بھی ساتھ تھے۔ نجمی کھڑکی کے بند شیشے سے سر لگائے مسلسل باہر کھیتوں کو پیچھے کی طرف جاتے دیکھ رہی تھی۔ دن کے دو تین بجے تک گھر میں کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ وہ گھر سے بھاگ گئی ہے۔

اس کے بعد جب وہ کالج سے گھر واپس نہ پہنچی تو اس کی سوتیلی ماں کو پریشانی ہوگی اور جب رات ہوگی تو اس کے ابوجان کی جو حالت ہوگی اس کا خیال کر کے نجمی کا دل پھٹا جاتا تھا مگر وہ مجبور تھی۔ اگر اس کے ابوجان میں اپنی بیٹی کے مستقبل کو تباہی سے بچانے کی ہمت ہوتی تو نجمی کبھی گھر سے باہر قدم نہ نکالتی وہ تو اپنی دوسری بیوی اور نجمی کی سوتیلی ماں کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کی بیٹی کو ایک ادھیڑ عمر شادی شدہ شخص کے حوالے کیا جا رہا ہے لیکن وہ خاموش تھے وہ اپنی بیٹی کو تباہی کے اندھے کنوئیں میں گرتے خاموشی سے دیکھ رہے تھے مگر نجمی ایک پڑھی لکھی اور ہوش مند لڑکی تھی۔

اسلام نے اسے اپنی پسند کی شادی کرنے کا پورا پورا حق دیا تھا اگرچہ وہ گھر سے فرار ہو کر ایک انتہائی جذباتی اور غیر ذمہ دارانہ قدم اٹھا چکی تھی لیکن اس کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی زندگی، اپنے مستقبل اور اپنی آئندہ

نسل کو تباہ ہونے سے بچانا چاہتی تھی وہ اپنی پسند کی شادی کر کے اپنی تمناؤں کے مطابق پرسکون زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔ وہ بار بار یہ کہہ کر اپنے ضمیر کو تسلی دے رہی تھی کہ آج کراچی پہنچ کر وہ ندیم سے شادی کرے گی اور کل وہ لاہور واپس روانہ ہو جائے گی اور اپنے شرعی خاوند کے ساتھ اپنے ماں باپ کے قدموں پر گر کر ان سے معافی مانگ لے گی سب انہیں معاف کر دیں گے۔ آخر وہ شادی کرنے جا رہی ہے صرف دو دنوں کی تو بات ہے یہ دو دن اس کے ابوجان کو بے حد اذیت ضرور دیں گے لیکن نجمی کی ساری زندگی، سارا مستقبل تباہ و برباد ہونے سے بچ جائے گا یہ اس کا حق تھا وہ کوئی ناجائز کام نہیں کر رہی تھی۔

کراچی میں جاتے ہی ان کا باقاعدہ شرعی نکاح پڑھایا جائے گا اور وہ قانونی طور پر ندیم کی بیوی بن جائے گی۔ ٹرین ایک بڑے اسٹیشن پر رکی۔ ندیم دوسرے کمپارٹمنٹ سے بھاگتا ہوا اس کے پاس آگیا۔ نجمی نے کھڑکی کا شیشہ گرا دیا۔

"تم ٹھیک ہو ناں؟" ندیم نے کسی قدر تشویش کے ساتھ پوچھا۔ نجمی نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میرا حلق خشک ہو رہا ہے۔" ندیم نے فوراً اسے ٹھنڈا مشروب پلایا اور اسے حوصلہ دیتا رہا کہ نجمی ہم کوئی گناہ نہیں کر رہے صرف گھر سے چلے جانے کی تکلیف ضرور دی ہے ہم نے اپنے ماں باپ کو... لیکن کل صبح ہی ہم لاہور واپس چل پڑیں گے اور اس وقت ہم میاں بیوی ہوں گے۔ نجمی نے اداس نگاہوں سے ندیم کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیا لاہور میں رہ کر ہم شادی نہیں کر سکتے تھے؟" ندیم نے کھڑکی کے قریب آتے ہوئے کہا۔

"وہاں بڑا مشکل تھا نجمی.... وہاں بات نکل جاتی اور ہمیں کوئی شادی نہ کرنے دیتا... اب تم ایسی باتیں مت سوچو... رات کو ہم کراچی پہنچ جائیں گے۔ زمان نے وہاں نکاح خواں کو بٹھا رکھا ہو گا... گواہ بھی موجود ہوں گے... جاتے ہی ہمارا

بیاہ ہو جائے گا... اور صبح پہلی گاڑی میں ہم واپس لاہور چل پڑیں گے۔" گاڑی نے سیٹی بجائی... ندیم نے ایک بار پھر نجمی کو تسلی دی اور اپنے ڈبے کی طرف دوڑا... ٹرین ایک بار پھر اپنے سفر پر چل پڑی۔ نجمی کے ساتھ جو بھاری بھرکم عورت بیٹھی تھی اس سے باتیں کرنے لگ گئی جیسا کہ ہمارے ہاں لوگوں کی عادت ہے وہ کرید کرید کر نجمی سے پوچھنے لگی کہ وہ کراچی کیوں جا رہی ہے؟ لاہور میں کہاں رہتی ہے جو لڑکا ہر اسٹیشن پر اس کو پوچھنے کے لئے آتا ہے کون ہے؟

نجمی نے اسے مختصر لفظوں میں بتایا کہ وہ کراچی اپنی خالہ سے ملنے جا رہی ہے اور یہ لڑکا اس کا خالہ زاد ہے۔ اس کے بعد وہ اخبار پڑھنے لگ گئی اسے معلوم تھا کہ کراچی تک یہ عورت اس کی جان کھا جائے گی۔ عورت نجمی کو اخبار پڑھتے دیکھ کر بھی باز نہ آئی اور پوچھنے لگی کہ کراچی میں اس کی خالہ کہاں رہتی ہے، اس کے خالو کیا کاروبار کرتے ہیں، کیا سرکاری آفیسر ہیں؟ نجمی نے کہا۔ "وہ ریلوے میں افسر ہیں"۔ عورت نے خوش ہو کر کہا۔

"جب تو تم ریلوے پاس پر سفر کر رہی ہو گی۔"

نجمی تنگ آ کر اپنی سیٹ پر لیٹ گئی اور بولی۔ "میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔" اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند کرتے ہی اس کے سامنے اس کی اپنی مرحوم والدہ کی شکل آ گئی۔ کس قدر سنجیدہ اور خاموش شکل ہوا کرتی تھی اس کی امی کی... نجمی کو وہ دن یاد آ گیا جب وہ اسے اپنے ساتھ لے کر رنگ محل مشن ہائی اسکول میں داخل کرانے گئی تھی۔

اس کی امی نے نسواری برقعہ اوڑھ رکھا تھا۔ نجمی کو پانچویں جماعت میں داخل کرانا تھا۔ نجمی کی امی نے اسے کوچہ فاصداں میں سے گزرتے ہوئے بتایا کہ جب میں رنگ محل مشن ہائی اسکول میں پڑھتی تھی تو وہاں کی پرنسپل ایک گوری میم ہوا کرتی تھی اس کا نام مس ایبل تھا۔ وہ گھر گھر جا کر لوگوں سے کہتی کہ اپنی بچیوں کو اسکول میں داخل کراؤ۔

مس ایبل امریکہ کی رہنے والی گوری چٹی دبلی پتلی میم تھی۔ وہ موچی دروازے اور رنگ محل کی تنگ و تاریک گلیوں میں ناک پر رومال رکھے بغیر گزرتی اور اندھیری ڈیوڑھیوں والے مکانوں کی تنگ سیڑھیاں چڑھ کر لوگوں سے انتہائی خوش اخلاقی سے بات کرتی اس کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی تھی۔

نجمی کی امی نے اسے یہ بھی بتایا کہ ایک بار مس ایبل کوچہ تیر گراں میں سے گزر رہی تھی کہ اسے وہاں ایک کوڑھی عورت دکھائی دی جو گندی نالی کے پاس پڑی تھی اور اس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ مس ایبل نے اپنے رومال سے اس عورت کا چہرہ صاف کیا اور اسے سہارا دیتی ہوئی باہر سڑک تک لائی... پھر تانگے میں بٹھا کر اسے اسپتال لے گئی۔

نجمی کی بند آنکھوں میں اپنی مرحوم والدہ کا چہرہ خاموش تھا۔ پھر جیسے اس کی والدہ نے اسے آہستہ سے کہا... "بیٹی تیرے باپ کو بڑا دکھ ہو گا۔ تیرے باپ نے ساری زندگی مجھے کوئی سکھ نہیں دیا... مگر تو اسے دکھ نہ دے۔"

نجمی نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ ٹرین دھڑ دھڑاتی ہوئی ایک چھوٹے اسٹیشن کو چھوڑ رہی تھی۔ نجمی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اس نے دور کھیتوں کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی والدہ کی روح سے کہا.....

"امی جان! میں کیا کروں؟ میں آپ کی طرح اپنی زندگی جہنم میں نہیں گزار سکتی۔ آپ نے خودکشی گوارا کر لی تھی۔ میں ایسا نہیں کر سکتی... اور پھر کوئی گناہ نہیں کر رہی... میں اپنی پسند کی شادی کرنے جا رہی ہوں۔ ابو جان کو آخر اپنی بیٹی کا خیال کیوں نہیں ہے؟ کیا میں ان کی بیٹی نہیں ہوں؟ کیا انہیں میرے مستقبل کا خیال نہیں ہونا چاہیے؟ مگر ان پر تو میری سوتیلی ماں نے جادو کر دیا ہوا ہے... جو وہ کہتی ہے وہی کرتے ہیں... جدھر وہ کہتی ہے ادھر کو ہی آنکھیں بند کر کے چل پڑتے ہیں میں اب رنگ محل مشن ہائی اسکولوں کے زمانے کی لڑکی نہیں ہوں... میں ایم اے میں پڑھ رہی ہوں اور شادی کے بعد سب سے پہلے اپنی تعلیم مکمل کروں گی۔ میرا

خاوند بھی اپنی تعلیم جاری رکھے گا۔ پھر ہم دونوں ڈاکٹریٹ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم ٹوئرز بھی کریں گے اور اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کریں گے۔ میری پیاری شریف اور بزدل امی جان مجھے معاف کردینا۔ میں بغاوت ضرور کر رہی ہوں مگر یہ بغاوت ایک خوش آئند اور سنہری مستقبل کے لئے کر رہی ہوں۔

"بیٹی چائے پیو گی؟"

نجمی اپنے خیالات سے چونک پڑی۔ اس کی ہم سفر خاتون تھرماس میں سے چائے کا کپ بھر کر نجمی کو پیش کر رہی تھی۔ نجمی نے شکریہ ادا کر کے کپ لے لیا اور چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ نکلنے لگی۔ اسے ان تمام لڑکیوں کا خیال آنے لگا جنہوں نے ہلاکت خیز فرسودہ روایات کے خلاف بغاوت کی اور آنے والی لڑکیوں کے لئے قربانیاں دے کر راستہ ہموار کیا۔۔ مگر جب شام ہوگئی اور ٹرین کے باہر میدانوں میں اندھیرا چھا گیا تو نجمی کا دل بیٹھنے لگا۔۔۔ اب گھر میں اس کے فرار کا علم ہو گیا ہوگا۔ اس کے ابو جان اپنے کمرے کے پلنگ پر پریشانی کی حالت میں سر پکڑ کر بیٹھے ہوں گے۔ اس کی سوتیلی ماں انہیں کوس رہی ہوگی کہ ان کے بے جا لاڈ پیار نے بچی کو خراب کیا ہے۔ سوتیلی ماں کسی کو نہیں بتائے گی کہ نجمی گھر سے فرار ہوگئی ہے۔

پولیس کو رپورٹ کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر وہ اس خیال سے بے حد پریشان ہوگی کہ نجمی کو کہاں تلاش کرے؟ وہ فوراً یہ پتہ کروائے گی کہ کیا ندیم بھی گھر پر نہیں ہے مگر وہ ندیم کے ماں باپ سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کرے گی کیونکہ اگر اس کے ہونے والے بوڑھے داماد پرویز کو علم ہو جاتا ہے تو سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا ہو سکتا ہے پھر وہ نجمی سے شادی کرنے پر تیار نہ ہو۔ وہ انکار کردے اور نجمی کی سوتیلی ماں گلبرگ والی کوٹھی، زیورات اور اپنے پچاس ہزار روپے سے محروم ہو جائے۔

نجمی کو بار بار اپنے ابو کا خیال آرہا تھا کہ انہیں بیٹی کے گھر سے بھاگ جانے کا بے حد صدمہ ہوگا۔ نجمی کو یہ غم بھی تھا کہ کہیں اس صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے

انہیں خدانہ کرے کچھ ہو نہ جائے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ نجمی کے باپ کو اپنی بیٹی کے مستقبل کا خیال نہ تھا اگر خیال تھا بھی تو وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے باوجود نجمی کو اپنے باپ سے محبت تھی جس طرح کہ لڑکیوں کو اپنے باپ سے محبت ہوا کرتی ہے چاہے باپ ان کا خیال رکھیں چاہے نہ رکھیں۔ ماں باپ اور بھائی کا رشتہ ایک ایسا رشتہ ہوتا ہے کہ لڑکی اس رشتے کے تقدس پر کبھی آنچ نہیں آنے دیتی۔۔۔ پھر نجمی کو اپنی پیاری اور رازدار سہیلی شبانہ کا خیال آگیا اسے اس خیال سے ضرور افسوس ہوگا کہ نجمی نے گھر سے بھاگنے سے پہلے اس سے مشورہ تک نہیں کیا لیکن ہو سکتا ہے وہ اس کے ابو جان کے پاس جا کر انہیں تسلی دے کہ نجمی بہت جلد واپس آجائے گی۔

نجمی ایسی لڑکی نہیں ہے جو ناجائز طور پر گھر سے فرار ہو۔۔۔۔ ممکن ہے وہ انہیں یہ بھی بتا دے کہ نجمی ندیم کے ساتھ گئی ہوگی اور وہ شادی کرنے کے فوراً بعد واپس آجائیں گے عجیب صورتحال تھی۔ نجمی کبھی کچھ سوچتی، کبھی کچھ سوچتی، کبھی اسے خیال آتا کہ اس نے شادی کے لئے ہی سہی مگر گھر سے بھاگ کر سخت غلطی کی ہے اور اسے اگلے اسٹیشن سے ہی واپس چلے جانا چاہیئے اور کبھی یہ سوچتی کہ اس نے وہی کچھ کیا ہے جو ایک پڑھی لکھی، اپنے حقوق سے باخبر اور اپنی زندگی تباہ نہ ہوتے دیکھنے والی لڑکی کو کرنا چاہیئے تھا۔

گاڑی رات ڈیڑھ بجے کے قریب کراچی اسٹیشن کے پلیٹ فارم میں داخل ہوئی اس خیال سے کہ گھر والوں کو اس کے فرار کا علم ہو گیا ہے اور جو کچھ گزرنی تھی گزر گئی ہے نجمی کے ذہن سے ایک بوجھ سا اتر گیا تھا۔ اب اس کی ساری توجہ اس طرف تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے ندیم سے اس کا نکاح ہو جائے تاکہ وہ قانونی اور شرعی طور پر اس کی بیوی بن جائے اور اگلے دن پہلی گاڑی سے واپس لاہور روانہ ہو جائے۔ اسٹیشن پر ندیم کا کراچی والا دوست نعمان انہیں لینے آیا ہوا تھا۔ ایک خوش لباس، خوش شکل مضبوط جسم والا آدمی سگریٹ پاؤں تلے مسلتا ہوا ندیم کی طرف بڑھا اسے گلے لگایا اور نجمی کی طرف دیکھ کر اسے سلام کیا اور کہا۔۔۔ آداب عرض بھابی جان!"

نجمی نے شرم سے سر جھکا لیا۔۔۔ اسے زمان کا بھابی جان کہنا بہت اچھا لگا تھا گویا اسے ندیم کی بیوی تسلیم کر لیا گیا تھا۔ یہ بڑی اچھی بات تھی وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ ایسی ہی فضا میں اس کا خیر مقدم ہو۔ زمان ندیم کو ایک طرف لے گیا۔ اس سے دو تین باتیں کیں اور پھر اس کے کاندھے پر ہاتھ مار کر کچھ کہا اور دونوں مسکراتے ہوئے نجمی کی طرف بڑھے۔ نجمی کو یہ رازداری اور ان کا عجیب انداز میں باہم مسکرانا اچھا نہ لگا۔ ندیم نے آ کر بتایا۔

"زمان کہہ رہا ہے کہ نکاح خواں صاحب رات بارہ بجے واپس جانے لگے تھے مگر میں انہیں چائے کی چینک سامنے رکھ کر اپنے کمرے میں چار گواہوں کے پاس بیٹھا کر آیا ہوں۔"

نجمی کے دل میں جو ہلکا سا شبہہ پیدا ہوا تھا وہ دور ہو گیا۔ زمان کی گاڑی اسٹیشن کے باہر کھڑی تھی۔۔۔ کافی چمکیلی اور قیمتی کار لگتی تھی۔ زمان نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور بڑے ادب سے کہا۔

"بیٹھئے بھابی جان۔" پھر اس نے ندیم سے کہا۔

"ندیم تم بھابی جان کے ساتھ ہی پیچھے بیٹھ جاؤ۔" زمان خود آگے بیٹھ گیا اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور وہ کراچی کی کشادہ روشن مگر ویران ویران سڑک پر روانہ ہو گئی۔ نجمی کا کراچی میں کوئی رشتے دار نہیں تھا مگر وہ دو ایک بار کالج کی لڑکیوں کے ساتھ کراچی آ چکی تھی۔ اسے کراچی کی صرف کلفٹن اور بندر روڈ ہی یاد تھا پھر کیماڑی میں انہوں نے اسٹیمر میں بیٹھ کر سمندر کی سیر کی تھی اس کے سوا نجمی کو کراچی کی سڑکوں کا کچھ علم نہیں تھا۔

ندیم اس کے پاس پچھلی سیٹ پر بیٹھا اسے تھوڑی تھوڑی دیر بعد تسلی کے دو بول کہہ دیتا تھا۔۔۔ نجمی نے آہستہ سے کہا۔ "میرے ابو جان کو بہت صدمہ ہوا ہو گا۔"

ندیم نے اس کے ہاتھ کو محبت سے دباتے ہوئے کہا۔ "دو ایک دن کی بات

ہے نجمی۔۔۔ جب میاں بیوی بن کر ان کے پاس جائیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ زمان نے سارا بندوبست کر رکھا ہے بس جاتے ہی ہمارا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔"

زمان اگلی سیٹ پر بیٹھا گاڑی چلا رہا تھا۔۔۔ ذرا اونچی آواز میں پیچھے دیکھے بغیر بولا۔ "بھابی! ہم نے چھوہارے بھی منگوا رکھے ہیں۔" اور پھر خود ہی ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"بھئی ہمارے پیارے دوست کی شادی ہو رہی ہے۔۔۔ اگرچہ شادی ذرا دوسرے حالات میں ہو رہی ہے لیکن کوئی بات نہیں۔۔۔ جب آپ لوگ لاہور جا کر کراچی آئیں گے تو میں اپنے ہوٹل میں شاندار دعوت کروں گا۔"

ندیم نے مسکرا کر نجمی کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔۔۔ دیکھا میرا دوست کتنا اچھا ہے۔۔۔ ایسے ہوتے ہیں جگری یار۔۔۔ نجمی نے شرما کر سر جھکا لیا اور پھر گردن گھما کر باہر دیکھنے لگی۔ گاڑی اونچی اونچی عمارتوں والی کسی سڑک پر سے گزر رہی تھی۔ ندیم نے نجمی کو اس سڑک کا نام بتایا اور بولا۔

"بس اب ہمارا ہوٹل قریب ہی ہے۔"

گاڑی ایک نسبتاً چھوٹی سڑک پر مڑ گئی۔۔۔ یہاں فاصلے فاصلے پر کوارٹر نما مکان بنے ہوئے تھے جن کے روشندانوں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا صرف صحن کے اندر کے بلب روشن تھے۔ اس چھوٹی سڑک کے کونے پر جا کر گاڑی نے ایک اور موڑ کاٹا اور ایک دو منزلہ عمارت کے احاطے میں جا کر کھڑی ہو گئی۔

نجمی نے کھڑکی میں سے ایک نظر عمارت کو دیکھا اس کی وضع قطع پرانی طرز کی تھی مگر رنگ روغن خوب کیا ہوا تھا۔ سامنے والے برآمدے میں سے ایک آدمی گاڑی کے ہارن کی آواز پر آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر گاڑی کے پاس آ گیا۔ اس نے زمان کو سلام کیا۔ زمان نے اسے کہا اوپر والا کمرہ کھول دو۔۔۔ اور وہ لوگ کہاں ہیں؟ اس اونگھتے ہوئے چوکیدار قسم کے آدمی نے بتایا کہ اوپر بیٹھے ہیں صاحب جی

زمان نے کار کا دروازہ کھول کر نجمی سے کہا "آیئے بھابی جان"۔ پھر ندیم کی طرف مخاطب ہو کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"مجھے ڈر تھا کہ کہیں نکاح خواں صاحب فرار نہ ہو گئے ہوں مگر چوکیدار نے بتایا ہے کہ وہ لوگ اوپر ہی بیٹھے ہیں۔۔۔ خدایا تیرا شکر ہے۔۔۔ اس نیک کام سے فارغ ہوتے ہی سجدہ شکر ادا کروں گا۔"

ندیم زمان کا شکریہ ادا کرنے لگا۔۔۔ زمان نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ارے شکریہ کس بات کا ادا کر رہے ہو؟ دیکھو بھابی! ندیم کیسی اوپری اوپری باتیں کر رہا ہے۔۔۔ بھئی یہ تو نیک کام ہے اور پھر تمہارے لئے تو جان بھی حاضر ہے۔۔۔ آؤ۔۔۔ اوپر چلتے ہیں۔"

زمان آگے آگے، ندیم اس کے پیچھے اور نجمی ندیم کے ساتھ ساتھ ہوٹل میں داخل ہو گئی۔ ہوٹل کی سیڑھیاں تنگ سی تھیں اور صرف دوسری منزل کی ڈیوڑھی میں، ایک مدھم سا بلب روشن تھا۔ زمان ان دونوں کو ایک کمرے میں لے آیا جہاں شاندار سجے ہوئے پلنگ کے چاروں طرف کاغذ کے پھولوں کے ہار لٹک رہے تھے۔ نجمی کا دل دھڑکنے لگا۔ ان دھڑکنوں میں خوشی کی لذت بھی تھی اور ایک خوف کا احساس بھی تھا۔ اپنے ابو کو، اپنی مرحوم ماں کو یاد کر کے نجمی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔۔۔ کاش وہ اپنے ہاتھوں سے نجمی کی شادی ندیم سے کرتے۔۔۔ خود اسے دلہن بنا کر رخصت کرتے۔

زمان نے نجمی سے کہا "بھابی! آپ تشریف لائیں۔۔۔ باتھ روم ساتھ ہی ہے منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو جائیں۔۔۔ معافی چاہتا ہوں میری یہاں کوئی بہن نہیں تھی ورنہ وہی آپ کو دلہن بناتی۔"

پھر وہ ندیم کی طرف متوجہ ہو کر ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا۔۔۔ "ندیم! یار تم یہاں کیا کر رہے ہو۔۔۔ چلو میرے ساتھ۔۔۔ پہلے نکاح کے چار بول تو پڑھا لو۔"

نجمی نے ندیم کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور آہستہ سے بولی۔

"زمان بھائی جان سے کہہ کر کل کی گاڑی پر لاہور جانے کے لئے سیٹیں ریزرو کروا لینا۔"

زمان نے ہنس کر کہا "ارے بھابی جان! آپ کیوں فکر کرتی ہیں کیا مجھے معلوم نہیں کہ آپ کا جلد سے جلد لاہور واپس جانا کتنا ضروری ہے۔۔۔ یہ فکر آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔۔۔ صبح ہوتے ہی پہلا کام یہی کروں گا۔۔۔ آؤ ندیم۔۔۔ نکاح خواں اور گواہ کہیں پھر فرار نہ ہو جائیں۔"

زمان اور ندیم کے نکلتے ہی نجمی نے حجلہ عروسی کا دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا دی۔۔۔ اس نے کاغذی پھولوں کے سہروں اور ہاروں سے سجے ہوئے پلنگ کو ایک نظر دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ سرہانے کی جانب تپائی پر ایک تھرماس اور دو گلاس پڑے تھے۔ کمرے کی فضا میں ولایتی پرفیوم کی دھیمی دھیمی مہک رچی ہوئی تھی۔ چھت سے لگا ہوا پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا تھا جس کی ہوا سے سہرے کی لڑیاں اور پھولوں کے ہار ادھر اُدھر لہرا رہے تھے۔ دیوار کے ساتھ ایک طرف پرانی طرز کا سنگار میز لگا ہوا تھا جس پر بالوں میں پھیرنے والا برش اور کنگھی پڑی تھی۔ نجمی کے بڑے پرس میں ضروری سامان موجود تھا۔ مگر یہ پرس ابھی تک نجمی کی گود میں ہی پڑا تھا۔

اس نے پرس میں سے چھوٹا سا رومال نکال کر اپنی آنکھیں صاف کیں اور اپنا اداس چہرہ اٹھا کر لہراتی ہوئی کاغذی پھولوں کی لڑیوں کو دیکھا۔۔۔ کیا واقعی یہ اسی کا حجلہ عروسی تھا؟ کیا وہ اسی حجلہ عروسی کی دلہن تھی؟ کیا گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ فرمانبردار اور نیک دلہنوں کی طرح اپنا حجلہ عروسی سجائے؟

نجمی کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو گرنے لگے۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کرنے لگا کہ وہ اپنے باپ کے اعتماد کا خون کر کے اپنے ہاتھوں پر شادی کی مہندی

رچانے آئی ہے... یہ کیسی شادی ہے کہ نہ اس کی ماں ہے نہ سہیلیاں ہیں، نہ ڈھولک پر کسی نے گیت گائے ہیں، نہ کسی ماموں نے کہارے سے اتارا ہے؟ ایک سیکنڈ کے اندر اندر اس کے ذہن میں کئی طرح کے خیالات، کئی طرح کی ملاقاتیں، کئی طرح کے تصورات ہلچل مچا کر گزر گئے۔ وہ ایک دم پلنگ پر سے اٹھ کھڑی ہوئی... اس نے سنگار میز کے آئینے میں اپنی شکل دیکھی... اس کی شکل ایسی حالت میں بھی خوبصورت تھی اور اس پر ایک آہنی عزم کا پرتو تھا۔

نجمی نے اپنے ہونٹوں کو بھینچ لیا اور جیسے اس کے دل نے کہا "کیسی منگنی؟ کیسا تیل مہندی؟ کیا بر دکھاوا اور آرسی مصحف اور عروسی کا جوڑا اور شب عروسی اور حجلہ عروسی اور ایٹن اور کھارا اور مکلاوہ! اور ولیمہ؟ یہ سب شو بزنس ہے اگر دل میں مجبوری کا خنجر اتر گیا ہو... شادی تو دو دلوں کا ایک دوسرے کو پسند کرنا اور اقرار کرنا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے اور تم نے ندیم کو پسند کر لیا ہے تیرے ماں باپ نے تیرے سینے میں اپنے جبر کا، اپنے مفادات کا، اپنی لالچوں کا خنجر اتار دینا چاہا تھا۔ تو نے اپنے حق کے لئے بغاوت کی، سچ کے لئے بغاوت کی، نیچر کی ایک زندہ اور سب سے بڑی قدر کے لئے بغاوت کی ہے۔

تیری شادی حجلہ عروسی کی محتاج نہیں ہے حجلہ عروسی تیری شادی کا محتاج ہے... اٹھ... اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جا اور باتھ روم میں چل کر منہ ہاتھ دھو، نئے کلر کی لپ سٹک لگا بالوں کو پہلے سے حسین ترین انداز میں سجا، آنکھوں کو قدرت کی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ آراستہ کر اور پھر نیچر کے فتنہ سامان مناظر کو اپنی آنکھوں کے سامنے اچھائیوں اور برائیوں کے تمام ضابطوں کو تنکوں کی طرح اڑاتے ہوئے دیکھ۔

نجمی کے چہرے پر اچانک وہ چمک آ گئی جو سورج کی پہلی کرن کے طلوع ہونے کے ساتھ ہی برف پوش چوٹیوں پر آتی ہے۔ اس نے اپنے پرس میں سے میک اپ کا مختصر سامان نکال کر سنگار میز پر رکھا اور منہ دھونے، تیار ہونے باتھ روم میں چلی گئی۔ چل اے غم نصیب، بجر نصیب دلہن! آج تیری شادی کی رات ہے۔

ابھی زمان ندیم کو لے کر ساتھ والے کمرے میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ نجمی ان تمام نفسیاتی اور روحانی ہیجان کے طوفانوں میں سے گزر گئی تھی اور باتھ روم میں منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔ زمان نے دوسری منزل پر نجمی کے کمرے سے دو کمرے چھوڑ کر تیسرے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور ندیم کو لے کر اندر داخل ہو گیا۔

کمرے میں صوفے پر تین آدمی بیٹھے تھے۔ انہوں نے اچکنیں پہن رکھی تھیں اور سروں پر شریفانہ ٹوپیاں تھیں... صاف لگ رہا تھا کہ وہ نکاح میں شریک ہونے کے لئے آئے ہیں... گول میز پر چھوہاروں کی پوٹلی پڑی تھی۔ زمان نے اندر داخل ہوتے ہی اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بھائی صاحب! نکاح خواں کہاں ہیں؟" ایک اچکن پوش صاحب نے جن کے منہ پر چیچک کے داغ تھے بڑی مایوسی کے عالم میں گردن ہلا کر کہا۔ "جناب وہ تو ایک گھنٹہ ہوا تھک ہار کر چلے گئے ہم نے انہیں بہت روکا مگر کہنے لگے کہ لڑکے والوں نے بڑی دیر کر دی ہے... میں ساری رات نہیں جاگ سکتا۔"

زمان اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا... ندیم بھی بہت پریشان ہو گیا۔ دوسرا اچکن پوش آدمی ٹوپی اتارتے ہوئے اٹھ کر بولا۔ "میرے محترم اب ہمیں بھی اجازت دیجئے... نکاح خواں کے بغیر ہمارا یہاں ٹھہرنا بیکار ہے... نکاح کی رسم اب کل پر ڈال دیجئے تو بہتر ہے۔"

تیسرا اچکن پوش بھی اٹھتے ہوئے بولا۔ "میرا بھی یہی خیال ہے... ویسے یہ نیک کام ہے اور جب لڑکی لڑکا دونوں بالغ ہیں اور ایک دوسرے سے شادی کرنے پر راضی ہیں تو ہم کل پھر حاضر ہو جائیں گے... اس وقت اجازت دیجئے۔"

اور وہ تینوں السلام علیکم کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ زمان نے انہیں وہیں روک لیا اور نہایت اخلاق کے ساتھ بولا۔ میں آپ حضرات کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے اتنی رات گئے تک انتظار کی زحمت اٹھائی دراصل گاڑی لیٹ ہو گئی تھی... ویسے نکاح خواں صاحب تھوڑی دیر مزید ٹھہر جاتے تو اچھا تھا۔"

چیچک رو اچکن پوش بولا۔ "بھائی زمان صاحب! اب دن نکلنے میں دیر ہی کون

رہ گئی ہے... آپ کل کسی وقت کا ٹائم رکھ لیں اور ہمیں فون پر اطلاع کر دیجئے گا۔ ہم حاضر ہو جائیں گے.... ہم بھی لڑکے لڑکیوں والے ہیں.... خیر کے کام میں ضرور شریک ہوں گے اور پیر شرع نے اس کی اجازت دے رکھی ہے کہ لڑکی کو دولہا پسند ہونا چاہیئے...

خدا حافظ!"

ندیم بھی وہیں کھڑا یہ ساری باتیں سن رہا تھا... جب تینوں مہمان چلے گئے تو ندیم نے مضطرب ہو کر کہا۔ "زمان بھائی! اب کیا کریں؟ میں نے تو سوچ رکھا تھا کہ آج نکاح ہو جائے گا تو کل نو دس بجے کی گاڑی میں کراچی سے نکل جائیں گے تاکہ رات تک لاہور پہنچ جائیں۔"

زمان نے اپنے آپ کو ایک بیکار بوجھ کی طرح صوفے پر گرا دیا۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگایا اور بولا۔ "ندیم میں تم سے بے حد شرمسار ہوں.... میں تو سوچ رہا ہوں کہ بھابی نجمی کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤں گا... وہ میرے بارے میں کیا سوچے گی کہ ندیم جس دوست کی اتنی تعریف کر رہا تھا، اتنے مان کے ساتھ اسے یہاں لایا ہے۔ وہ ایک نکاح خواں کو بھی نہ بٹھا سکا۔"

ندیم بھی سخت پریشان اور مایوسی کے عالم میں تھا۔ زمان نے اپنی پریشان خیالی سے گھبرا کر تازہ سلگایا ہوا سگریٹ راکھدان میں مسل ڈالا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا.... پھر اپنے آپ بولنے لگا۔

"میں نے بڑی مشکل سے ایک نکاح خواں صاحب کو راضی کیا تھا.. تمہیں شاید معلوم نہیں... اگرچہ یہ بیاہ ناجائز نہیں مگر پھر بھی آج کل حالات ایسے ہیں کہ ہر کوئی بہت محتاط ہو گیا ہے... یہ تینوں آدمی بھی شہر کے معززین میں سے تھے... یہ بھی میرے کہنے پر نکاح نامے پر دستخط کرنے آ گئے تھے... خیر... یہ تو کل بھی آ جائیں گے۔" پھر زمان نے میز کی دراز میں سے سادہ نکاح نامہ نکال کر ندیم کو دکھایا "یہ دیکھو نکاح نامہ تو میں نے صبح تمہارا فون آتے ہی منگا کر رکھ لیا تھا۔"

نکاح نامہ ندیم کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ اسے حسرت آمیز نگاہوں سے دیکھ

رہا تھا۔ زمان کہنے لگا۔ "اب رات تو سمجھو گزر ہی گئی ہے ایسا کرتے ہیں کہ میں صبح آٹھ نو بجے خود جا کر نکاح خواں کو لے آؤں گا اور پھر سب ٹھیک ہو جائے گا ندیم بھائی! تمہیں جو تکلیف ہوئی ہے اس کے لئے مجھے معاف کر دینا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بھابی سے میں کیسے معافی مانگوں۔ تم میری طرف سے معافی مانگ لینا۔

اب تم جا کر آرام کرو۔ میں صبح آٹھ بجے تمہیں جگا دوں گا۔ بھابی کے ساتھ والا کمرہ خالی ہے۔ تم وہاں سو جانا۔ کیا خیال ہے۔"

ندیم نے جلدی سے کہا۔ "ٹھیک ہے زمان بھائی میں ساتھ والے کمرے میں ہی سو جاؤں گا۔"

زمان نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "بھائی! میری طرف سے بھابی سے معافی ضرور مانگنا نہیں تو میرے ضمیر کو چین نہیں آئے گا۔"

ندیم نے زمان کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو پکڑ لیا اور بولا۔ "ایسی باتیں نہ کرو زمان بھائی تم میرے دوست ہو۔ اور پھر اس میں تمہارا کوئی قصور بھی تو نہیں ٹھیک ہے۔ میں نجمی کو ابھی سمجھا دیتا ہوں۔ اس کی پریشانی دور ہو جائے گی۔ تم بالکل فکر نہ کرو رات کو نکاح نہیں ہوا تو پھر کیا ہوا دن میں ہو جائے گا۔"

زمان نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہیں کیوں نہیں بھائی میں خود نکاح خواں کو لے کر آؤں گا۔ اس سے ساری بات ہو چکی ہے۔ اب تم جا کر آرام کرو۔ ذرا ٹھہرو یہ سلیپنگ سوٹ لیتے جاؤ۔"

زمان نے الماری میں سے ایک سلیپنگ سوٹ نکال کر ندیم کو دیا۔ اور ندیم شب بخیر کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ اس نے نجمی کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ نجمی نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ نجمی اسے دیکھ کر ٹھٹھک سی گئی۔ وہ پوری تو نہیں لیکن آدھی دلہن بن چکی تھی۔ لباس ریشمی تھا۔ بالوں کا جوڑا بنا تھا۔ پنسل سے بھنویں اور پلکیں کھنچی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں پر سرخ لپ اسٹک کی تہہ جمی تھی۔ جسم پرفیوم سے مہک رہا تھا۔ وہ ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ ندیم کو دیکھ رہی تھی۔ اس

نے اپنی نظریں جھکا لیں اور پلنگ کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بولی۔

"تم نکاح نامے پر میرے دستخط کروانے آئے ہو ندیم؟" پھر خود ہی پلٹ کر ندیم کی طرف دیکھا اور بولی۔

"کیسی عجیب بات ہے۔ یہ فرض عام طور پر خاندان کے بزرگ انجام دیتے ہیں۔ لاؤ کہاں دستخط کرنے ہیں۔"

ندیم نے دروازہ بند کرتے ہوئے نجمی کو سارا ماجرا سنایا تو وہ دل کو تھام کر پلنگ پر بیٹھ گئی ندیم اسے بار بار تسلیاں دینے لگا کہ ایسی کوئی خاص بات نہیں ہوئی ہے۔ اصل میں رات زیادہ ہو گئی تھی اور نکاح خواں صاحب انتظار نہ کر سکے اور چلے گئے۔ بے چارے معززین تو ابھی تک ہمارے انتظار میں بیٹھے تھے۔ اب انہوں نے کل دن میں آنے کو کہا ہے۔

زمان تو اس قدر شرمندہ ہے کہ وہ بار بار کہہ رہا تھا کہ بھابی جان سے ہاتھ باندھ کر معافی مانگنا۔ تم فکر مت کرو نجمی۔ صبح نو بجے زمان خود جا کر نکاح خواں کو لے آئے گا اچھا اب تم تھوڑی دیر آرام کر لو ساڑھے تین بج رہے ہیں۔ میں ساتھ والے کمرے میں سو جاتا ہوں۔"

نجمی کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ جن سے اس کا کاجل بہہ رہا تھا۔ ندیم نے اسے ایک بار پھر بڑے پیار سے حوصلہ دیا اور کہا۔

"خدا کے لئے حوصلہ کرو نجمی یہ تو محض زیادہ رات ہو جانے کی وجہ سے ہوا ہے نکاح خواں کہیں ملک چھوڑ کر تو نہیں چلا گیا۔ اچھا اب تم آرام کرو۔ اور یہاں اسی طرح دلہن بنے رہنا۔ تم بہت ہی خوبصورت لگ رہی ہو۔ میں صبح خود آ کر تمہیں لے جاؤں گا۔ شب بخیر۔"

نجمی آنسو پونچھنے لگی۔ ندیم نے کمرے سے نکل کر دروازہ بند کر لیا اور باہر سے اس کی آواز آئی۔

"اندر سے چٹخنی لگا لینا۔"

نجمی نے اٹھ کر چٹخنی لگائی اور پلنگ پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ پنکھا چل رہا تھا اور اس کی گردش سے کاغذی پھولوں کے سہرے کی لڑیاں لہرا رہی تھیں۔ یہ وہ حجلۂ عروسی تھا جس کا خواب رنگین شرمندہ تعبیر نہ ہوا تھا۔ دوسری طرف ندیم ساتھ والے کمرے میں داخل ہو کر کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ اس کمرے میں بھی عام ہوٹل کے کمروں کی طرح پلنگ بچھا ہوا تھا مگر یہ سادہ پلنگ تھا اور اس پر سہرے نہیں سجائے گئے تھے۔ وہ پلنگ پر لیٹ گیا۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ سفر نے اسے سخت تھکا دیا تھا۔ لیٹتے ہی اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ بے خبر ہو کر سو گیا۔ اس کمرے سے آگے ایک کمرہ چھوڑ کر زمان اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ میز پر چھوہاروں کی سینی اسی طرح پڑی تھی۔ وہ بار بار اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر بازار کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں سے نیچے جھانک لیتا تھا۔ بازار دور تک سنسان پڑا تھا۔ زمان نے ابھی تھوڑی دیر پہلے نیچے جا کر کسی جگہ ٹیلی فون کیا تھا۔ اب وہ کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد نیچے ایک بند ایمبولینس ویگن آ کر کھڑی ہو گئی۔ زمان نے اسے دیکھا تو پیچھے ہٹ کر کھڑکی بند کر دی۔

ایمبولینس ویگن کے اوپر سرخ بلب جھلملا رہا تھا۔ ڈرائیور نے اوپر کھڑکی بند ہوتے دیکھی تو سرخ بلب کا بٹن آف کر دیا۔ زمان نے میز کا دراز کھولا اور اس میں سے نکاح نامے کا دوسرا یعنی فالتو فارم نکال کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور جیب سے قلم نکال لیا۔ اتنے میں کمرے میں وہی تین معززین اچکن پوش داخل ہوئے زمان نے ان کی طرف دیکھ کر انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود قلم اور نکاح نامہ لے کر کمرے سے نکل کر نجمی کے دروازے پر آ کر آہستہ سے دستک دی۔

نجمی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ نیند اس کے اوپر منڈلا رہی تھی مگر اس پر طاری نہیں ہو رہی تھی۔ دوسری بار دستک ہوئی تو نجمی اٹھ کر دروازے کے پاس آ کر بولی۔ "کون ہے؟"

زمان نے آواز میں شفقت اور نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "میں ہوں بھابی جان زمان ..." نجمی نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ زمان نے بے حد معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔ "سب ٹھیک ہو گیا ہے بھابی جان۔ نکاح خواں آگیا ہے وہ رجسٹر میں ضروری اندراج کر رہا ہے اتنی دیر میں آپ نکاح نامے پر دستخط کریں۔

ندیم غسل خانے میں ہے۔ وہ بھی تیار ہو کر وہیں پہنچ رہا ہے۔ بھابی میری وجہ سے آپ کو جو تکلیف ہوئی ہے اس کے لئے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر آپ سے معافی مانگتا ہوں۔"

نجمی نے نکاح نامہ رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے شرمندہ نہ کریں بھائی جان۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ کہاں کہاں دستخط کرنے ہیں مجھے۔"

زمان نے نجمی کو دستخط کرنے والی جگہ بتاتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو چین نہیں آرہا تھا۔ بس گاڑی پکڑی اور نکاح خواں کو سوتے ہوئے اٹھا کر لے آیا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ آپ کو رات ہر حالت میں لاہور پہنچنا ہے۔"

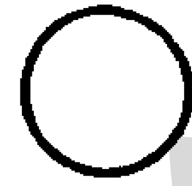
نکاح نامے پر جہاں جہاں دلہن کے دستخط ہوتے ہیں وہاں وہاں زمان نے نجمی کے دستخط کروالئے اور نکاح نامہ لپیٹتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کے لئے چائے بھجوار ہوں بس آپ جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر تھوڑا بہت تیار ہو جائیں۔ میرا مطلب ہے کہ دلہن بھابی کی منہ دکھائی تو ضرور ہوگی۔"

زمان بڑے محتاط انداز میں ہنستا ہوا کمرے سے نکل گیا ندیم کے کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے بند دروازے سے کان لگا دیئے۔ اندر سے ندیم کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آرہی تھی۔

زمان تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے کمرے میں آگیا۔ تینوں اچکن پوش معززین صوفوں پر جیسے بالکل تیار بیٹھے تھے۔ زمان نے ان میں سے ایک کو اشارہ کیا۔ وہ جلدی سے اٹھا میز پر رکھی تھرماس بوتل میں سے اس نے گرم گرم چائے نکال کر پیالی میں انڈیلی اور نجمی کے کمرے کی طرف چل دیا۔ دروازے پر دستک دے کر آہستہ سے کہا۔

"بیٹی چائے لے لو۔"

نجمی نے دروازہ کھول دیا۔ ایک شریف آدمی کو چائے کی پیالی لئے سامنے کھڑا دیکھا تو جلدی سے پیالی لے کر شکریہ ادا کیا اور دروازہ بند کر دیا۔ نجمی کو اس وقت چائے کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہی تھی کہ جو نکاح رات کو نہ پڑھا جا سکا تھا وہ اب پڑھا دیا جائے گا۔ ویسے وہ حیران تھی کہ ندیم نے غسل خانے میں اتنی دیر کیوں لگا دی ہے۔ اس نے کھڑے کھڑے چائے کے دو تین گھونٹ لئے اور پھر پیالی میز پر رکھ کر غسل خانے کی طرف بڑھی۔ اچانک اسے چکر آگیا اور اس نے پلنگ کو پکڑ لیا۔



نجمی کو ایک اور چکر آیا اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھانے لگا۔ وہ پلنگ کو پکڑ کر وہیں بیٹھ گئی۔ پہلا خیال جو اسے آیا وہ یہ تھا کہ چائے میں کچھ ملا ہوا تھا۔ چائے زہریلی تھی۔ کسی نے اس میں کیا ملایا تھا؟ کیا چائے کی کیتلی میں کچھ گر گیا تھا؟

نجمی نے ندیم کو آواز دینے کی کوشش کی مگر اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑی اور وہیں پرانے قالین کے فرش پر گر پڑی۔

ساتھ والے کمرے میں ندیم رات بھر کا تھکا گہری نیند سو رہا تھا۔ کراچی شہر پر صبح کی اولین روشنی ابھرنے لگی تھی۔ سڑک پر سے ایک بس کے تیزی سے گزرنے کی آواز آئی۔ یہ آواز نجمی نہ سن سکی، جو اچکن پوش معزز آدمی نجمی کو چائے دے کر آیا تھا وہ زمان کے کمرے میں گھڑی دیکھ رہا تھا۔ دوسرے اچکن پوش ساتھی صوفے کے پاس جیسے تیار کھڑے تھے۔ زمان نے اپنی کلائی کی گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور چیچک رو اچکن پوش کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

"شیرے! لوٹنی اور تم اسے کمرے سے نکال کر نیچے لے جاؤ گے۔"

پھر تیسرے اچکن پوش کی طرف متوجہ ہو کر کہا "وکی! تم ایمبولینس کے پاس رہو گے۔"

جلدی کرو تینوں اچکن پوش معزز کمرے میں سے نکل گئے۔ زمان بے چینی کے عالم میں کھڑکی کا ذرا سا پٹ کھول کر نیچے سڑک پر دیکھنے لگا۔ ایمبولینس ہوٹل کے آگے کھڑی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ تینوں معزز اچکن پوش یعنی شیرا، لوٹی اور وکی ایک بے ہوش عورت کو چادر میں لپیٹ کر اٹھائے ہوئے ایمبولینس کی طرف بڑھے وکی نے آگے بڑھ کر ایمبولینس کا دروازہ کھول دیا۔ بے ہوش نجمی کو ایمبولینس میں ڈال کر دروازہ بند کر دیا گیا۔

شیرا اور لوٹی ایمبولینس کے اندر نجمی کے پاس ہی بیٹھ گئے۔ وکی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ایمبولینس کی سرخ بتی نے دوبارہ جھلملانا شروع کر دیا اور پھر وہ اسٹارٹ ہو کر تیزی سے ہوٹل کے پورچ سے نکل کر سڑک پر روانہ ہو گئی۔

زمان نے جیسے اطمینان کا سانس لیا۔ کھڑکی بند کر کے جلدی سے کپڑے بدلے اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ دروازے کی چٹخنی اس نے لگا دی تھی۔ وہ جاگ رہا تھا، بتی اس نے بجھا دی تھی۔ روشندان میں سے دن کی روشنی کمرے میں آ رہی تھی۔ اس کی نظریں دیوار پر لگے کلاک پر تھیں۔ اس کی آنکھیں نیند کی وجہ سے جل رہی تھیں مگر نیند اس سے کوسوں دور تھی۔

اس نے ہوٹل کے نوکروں کو خاص طور پر ہدایت کر رکھی تھی کہ اوپر والی منزل کے ان تین کمروں میں کسی مہمان کو پریشان نہ کیا جائے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ دن کافی نکل آیا تھا۔ وال کلاک نے دن کے پونے آٹھ بجائے تو دروازے پر زور سے دستک دینے کی آواز آئی۔ زمان دیر سے اسی آواز کا انتظار کر رہا تھا۔ پہلے تو وہ چپ چاپ لیٹا رہا۔ تیسری بار دستک کی آواز بلند ہوئی تو اس نے جیسے نیند بھری آواز میں پوچھا۔

"کون ہے؟" باہر سے ندیم کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

"دروازہ کھولو زمان! میں ہوں ندیم۔" زمان نے جلدی سے دروازہ کھول دیا اور بناوٹی جمائی لیتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے ندیم؟ تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

ندیم جلدی سے اندر آ گیا۔ "نجمی اپنے کمرے میں نہیں ہے۔"

"کیا؟" زمان نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "اپنے کمرے میں نہیں ہے بھابی؟ تو باتھ روم میں ہو گی۔"

ندیم نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ "وہ باتھ روم میں بھی نہیں ہے۔"

زمان نے انتہائی پریشانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "باتھ روم میں بھی نہیں ہے؟ تو کہیں بھابی سیر کرنے نہ نکل گئی ہو۔"

ذہنی ہیجان کی وجہ سے ندیم اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑکی کھول کر نیچے جھانکا اور بولا۔ "نہیں نہیں۔ وہ سیر کرنے نہیں جا سکتی۔ وہ تو سخت تھکی ہوئی تھی اور پھر صبح صبح تو وہ سوئی تھی اس وقت سیر کو کیسے جا سکتی ہے؟"

زمان نے ندیم کی طرف بے بسی کے عالم میں دیکھا اور کہا "زمان! خدا کے لئے نجمی کو کہیں تلاش کرو۔ وہ اگر سیر کے لئے بھی گئی ہے تو کہیں کھو نہ جائے اسے کراچی کی سڑکوں کا کچھ پتہ نہیں ہے۔"

زمان جلدی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ "میرے ساتھ بھابی کے کمرے میں آؤ۔"

حجلۂ عروسی اسی طرح سجا ہوا تھا۔ چھت کا پنکھا چل رہا تھا اور دلہن غائب تھی کاغذی سہروں کی لڑیاں پنکھے کی ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ زمان کمال کی اداکاری کر رہا تھا۔ وہ باتھ روم میں گیا۔ وہاں سے نکلا تو پلنگ کے نیچے جھک کر دیکھنے لگا۔ بند کھڑکی کو کھول کر نیچے دیکھا۔ قالین کے فرش پر جھک گیا پھر ندیم کی طرف دیکھا اور بولا۔

"چٹخنی اندر سے کھلی ہے اس کا مطلب ہے بھابی اپنی مرضی سے باہر گئی ہے۔ وہ ضرور سیر کرنے نکل گئی ہو گی۔ میرے ساتھ آؤ۔"

دونوں ہوٹل کے پیچھے برآمدے میں آ گئے۔ زمان کو دیکھ کر نوکر اور چوکیدار

جو کس ہو گئے۔ زمان نے ان سے پوچھا کہ انہوں نے کسی خاتون کو ہوٹل سے باہر جاتے تو نہیں دیکھا؟ سب نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ سچے تھے، جس وقت زمان کے اچکن پوش ساتھی بے ہوش نجمی کو وہاں سے نکال کر لے گئے تھے اس وقت نوکر اور چوکیدار سو رہے تھے۔ زمان نے ندیم سے کہا۔

"گاڑی لے کر چلتے ہیں، تم گھبراؤ نہیں میرے دوست، بھابی یہیں کہیں ہو گی۔ وہ ضرور مل جائے گی۔"

زمان نے گاڑی نکالی، ندیم کو ساتھ بٹھایا اور ہوٹل کے ارد گرد کی سڑکوں پر چکر لگانے کے لیے چل پڑا۔ ساری سڑکیں دیکھ لیں۔ کچھ فاصلے پر ایک پارک تھا۔ اس کا کونہ کونہ چھان مارا مگر نجمی کا کچھ پتہ نہ چلا۔ ندیم کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ زمان اس سے زیادہ پریشانی ظاہر کر رہا تھا۔

اس نے ندیم سے کہا "میرا خیال ہے ہمیں تھانے میں رپورٹ درج کرا دینی چاہیے"

ندیم فوراً بولا۔

"نہیں نہیں! زمان اس سے بڑی بدنامی ہو گی۔ ہو سکتا ہے نجمی کے ماں باپ نے لاہور میں اس کے فرار کو سب سے چھپایا ہوا اور یہ کہا ہو کہ نجمی اپنی خالہ یا کسی دوسرے رشتے دار کے ہاں پنڈی، پشاور گئی ہے۔ پولیس میں رپورٹ درج کرائی تو پولیس اس سے پہلے مجھے پکڑ لے گی کہ میں اسے بھگا کر کیوں لایا تھا۔ پھر ہو سکتا ہے پولیس لاہور نجمی کے گھر بھی جائے۔"

زمان اور ندیم گاڑی کی طرف جا رہے تھے۔ زمان کہنے لگا "ایک بار پھر سوچ لو ندیم پولیس کی مدد سے ہم نجمی کو برآمد کرنے میں کامیاب ہو بھی سکتے ہیں۔"

"نہیں نہیں زمان۔ پولیس کی بات بیچ میں نہ لاؤ۔" ندیم نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "اس سے میری گرفتاری یقینی ہے اور تم جانتے ہو کہ میری نیت نیک تھی میں تو نجمی سے بیاہ کرنے اسے یہاں لایا تھا۔ مگر پولیس اعتبار نہیں کرے گی ہمارے دونوں خاندانوں کی مزید بدنامی ہو گی۔" زمان گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

"آخر بھابی کہاں جا سکتی ہے؟ اسے کمرے سے نکلنے کی ضرورت کیا تھی؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سیر کرتے کرتے دور نکل گئی ہو راستہ بھول گئی ہو اسے ہوٹل کے نام کا علم ہی ہے وہ جس ٹیکسی یا رکشہ ڈرائیور سے ہمارے ہوٹل کا نام لے گی وہ اسے یہاں پہنچا دے گا۔"

گاڑی واپس ہوٹل کی طرف جا رہی تھی زمان کہہ رہا تھا "ندیم میرے دوست! مجھے معاف کر دینا۔ میں تمہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔"

ندیم نے اداس تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں میرے دوست! میری تقدیر میں یہی لکھا تھا۔" اور ندیم ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔ زمان کہنے لگا۔

"رات جب تم بھابی کو چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگے تھے تو بھابی نے کچھ کہا تھا، نہیں؟" ندیم کا چہرہ اتر گیا تھا ہونٹ بار بار خشک ہو رہے تھے۔ اس نے بائیں ہاتھ سے اپنے ماتھے کو دباتے ہوئے کہا۔

"نجمی کچھ پریشان تھی مگر یہ پریشانی ظاہر ہے قدرتی بات تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ آرام سے سو جائے۔ صبح نکاح خواں نزو۔ آجائے گا پھر میں نے اسے باہر آ کر کہا کہ اندر سے چٹخنی لگا لو۔ مجھے اندر سے چٹخنی لگانے کی آواز آئی اور میں نے اپنے کمرے میں آ کر کپڑے بدلے اور لیٹتے ہی سو گیا۔ کاش میں جاگتا رہتا۔ نجمی کے پاس ہی رہتا۔"

ندیم نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ زمان اس کی دلجوئی کرنے لگا۔ "ندیم! تم تو حوصلہ کرو میرے دوست۔ میں تمہارے ساتھ ہوں میں مر نہیں گیا۔ کراچی شہر کا بچہ بچہ مجھے جانتا ہے میں نجمی کو دوپہر ہونے سے پہلے پہلے تلاش کر لوں گا۔ تم فکر مت کرو۔"

ندیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ آہستہ سے آہ بھری اور سامنے سڑک پر نظریں جما دیں۔ "میں تو سوچ رہا ہوں کہ واپس لاہور کیا منہ لے کر جاؤں گا۔ نجمی سے مجھے جو محبت ہے اور اس کے اچانک غائب ہو جانے سے مجھے جو صدمہ ہوا ہے وہ اپنی جگہ پر لیکن اگر لاہور میں نجمی کے ماں باپ نے میرے خلاف رپورٹ درج کرا دی تو میرا سارا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ میں اپنی تعلیم بھی مکمل نہ کر سکوں گا۔"

زمان نے تشفی آمیز لہجہ میں کہا۔ "تم ایسا کیوں سوچ رہے ہو ندیم؟ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ نجمی اگر اس شہر میں ہے تو ہم اسے ضرور ڈھونڈھ نکالیں گے۔ تم یقین کرو چاہے نہ کرو، مگر میرا دل کہتا ہے کہ نجمی سیر کے خیال سے باہر نکلی ہے اور راستہ بھول گئی ہے۔ تم دیکھ لینا ہم ہوٹل پہنچیں گے تو بھابی آ چکی ہوگی۔"

جب وہ ہوٹل پہنچے تو نجمی نہیں آئی ہوئی تھی۔ زمان ندیم کو اپنے کمرے میں لے آیا۔ "تم کچھ ناشتہ کر لو۔ رات کو بھی تم نے کچھ نہیں کھایا تھا ندیم۔ میں۔۔۔ میں نکاح خواں کو فون کرتا ہوں۔ اگر وہ آ گیا تو ہم اسے کیا جواب دیں گے۔"

ندیم بولا۔ "ہاں اسے منع کر دو۔ میں نہیں چاہتا کہ یہاں کسی کو نجمی کے گم ہو جانے کا علم ہو۔"

"میں تمہارے لئے ناشتہ منگواتا ہوں۔" زمان نے نیچے ناشتے کے لئے فون کر دیا۔ ندیم نے نفی میں ہاتھ ذرا سا ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں دوست کچھ کھانے پینے کو جی نہیں چاہتا یا اللہ! میرے گناہ معاف کر دے مجھے ایک بار نجمی ملا دے۔ میں اسے لے کر سیدھا لاہور چلا جاؤں گا۔ میں اس کے ماں باپ کی رضامندی سے شادی کروں گا۔"

زمان نے ٹیلی فون پر ایک غلط نمبر گھمایا اور ریسیور کان کے ساتھ لگا دیا۔ دوسری طرف سے کسی کی آواز نہیں آ رہی تھی لیکن زمان نے کہا۔

"ہیلو! کون صاحب؟ اچھا شاہ صاحب بول رہے ہیں۔ السلام علیکم۔ بات یہ ہے شاہ صاحب کہ دلہن کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ جی ہاں جی ہاں آپ دو ایک دن ٹھہر جائیے گا۔ جی ہاں شکریہ میں آپ کو فون کر دونگا۔ اور شاہ جی مجھے امید ہے کہ آپ یہ بات اپنے تک محدود رکھیں گے۔ بڑی مہربانی ہے۔ ارے شاہ جی آپ پر ہمیں پورا بھروسہ ہے اور پھر یہ تو ایک جائز نکاح تھا۔ اللہ مالک ہے میں ایک دو دن میں آپ کو فون کر کے دن اور تاریخ بتا دوں گا۔ شکریہ بہت بہت شکریہ۔ خدا حافظ۔"

زمان نے فون بند کر کے سانس بھرا اور بولا۔ "ہمارے مہربان شاہ صاحب تھے۔۔۔ نکاح خواں۔۔۔۔ وہ تو یہاں آنے کی تیاری کر رہے تھے۔"

ندیم نے سر لٹکا لیا اور بولا۔ "اب یہاں کیا رہ گیا ہے۔"

زمان نے ایک بار پھر ندیم کو انتہائی مخلصانہ الفاظ میں تسلی دی کہ وہ ہمت نہ ہارے اور نجمی بہت جلد واپس آ جائے گی۔ پھر ریسیور اٹھا کر کہنے لگا۔ "میں ان معزز گواہوں کو بھی آنے سے منع کر دوں جنہوں نے نکاح نامے میں دستخط کرتے تھے وہ بھی آ رہے ہوں گے۔" اور زمان نے ندیم کے سامنے ایک جھوٹ موٹ کا نمبر ملا کر پھر وہی اداکاری کی اور ٹیلیفون پر کہنے لگا۔

"شیخ صاحب معافی چاہتا ہوں۔ بس بچی کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ خدا کو یہی منظور تھا۔ آپ کو بڑی زحمت ہوئی ہے۔ میں انشاءاللہ دو ایک روز میں آپ کو وقت اور تاریخ بتا دوں گا۔ جی ہاں ویسے ایک زحمت میری خاطر کیجئے گا۔ بٹ صاحب اور ملک صاحب کو بھی بتا دیجئے گا۔ میرے پاس ان کے ٹیلیفون نمبر نہیں ہیں بہت بہت شکریہ۔"

ٹیلی فون رکھتے ہوئے زمان نے ندیم سے کہا۔ "یہ لوگ شہر کے بڑے معزز لوگ ہیں صرف میری خاطر نکاح نامے پر دستخط کرنے کو تیار ہو گئے تھے تم نے پھر چہرہ لٹکا لیا؟"

زمان ندیم کے پاس آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "ندیم! بھابی کو ڈھونڈ لانے کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ وہ میرے ہوٹل میں آ کر گم ہوئی ہے۔ میں جب تک اسے ڈھونڈھ نہیں لوں گا میرے ضمیر کو چین نہیں آئے گا یقین کرو میرے دوست! میں اپنی جان لڑا دوں گا لیکن بھابی کو جہاں کہیں بھی وہ ہو گی تلاش کر کے تیری خدمت میں پیش کر دوں گا۔"

ندیم نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ "میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ اپنے کمرے سے نکلی کیوں؟ اگر نکلی تو کدھر چلی گئی۔ وہ پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ ہوٹل کا نام بھی اسے

معلوم ہے وہ اگر اپنی مرضی سے گئی ہے تو اسے اب تک واپس آ جانا چاہئیے تھا۔"

زمان سمجھ گیا تھا کہ ندیم کے دل میں کیا ہے۔ فوراً بولا۔ "تو تمہارا کیا خیال ہے کہ بھابی کو کسی نے اغوا کر لیا ہے؟ نہیں نہیں ندیم یہ ناممکن ہے۔ میرے ہوٹل میں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہاں سے کبھی کوئی تنکا تک غائب نہیں ہوا پھر بھابی کو کوئی کیسے اغوا کر سکتا تھا؟ اگر خدانخواستہ ایسی بات ہوتی تو ہم ساتھ والے کمرے میں ہی تھے۔ وہ شور مچا سکتی تھی۔ دن نکل آیا تھا۔ ہم اس کی مدد کو پہنچ سکتے تھے۔ نہیں نہیں میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ بھابی کو کسی نے اغوا کیا ہے۔"

پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ بھابی لاہور چلی گئی ہو؟ میرا مطلب ہے کہ اس کو اچانک خیال آ گیا ہو کہ اس نے گھر سے بھاگ کر بھیانک غلطی کی ہے اور وہ بتائے بغیر ریلوے اسٹیشن کی طرف نکل گئی ہو؟"

اس کے ساتھ ہی زمان ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ "جلدی چلو۔ ہم ریلوے اسٹیشن چل کر دیکھتے ہیں ہو سکتا ہے بھابی وہیں پر ہو۔" وہ کار میں بیٹھ کر بڑی تیزی سے ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے۔ سٹی اسٹیشن پر زیادہ رش نہیں تھا۔ لاہور جانے والی ٹرین کا ابھی وقت نہیں ہوا تھا۔

زمان اور ندیم نے ریلوے اسٹیشن کا چپہ چپہ چھان مارا نجمی وہاں ہوتی تو انہیں ملتی زمان نے کہا۔ "چھاؤنی کے اسٹیشن پر چل کر دیکھتے ہیں۔" کراچی چھاؤنی کے اسٹیشن پر نجمی کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ وہ ناامید ہو کر واپس ہوٹل آ گئے۔ ندیم نے زمان سے درخواست کی کہ خدا کے لئے نجمی کے کمرے میں جو پھول کے سہرے لگے ہیں وہ اتروا دو۔ کیونکہ حجلۂ عروسی کی سجاوٹ ندیم سے دیکھی نہیں جاتی تھی اس کی آنکھوں میں بار بار آنسو آ جاتے تھے اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ندیم کو نجمی سے بے حد محبت تھی۔

زمان نے سارے سہرے اور کاغذی پھولوں کی لڑیاں اتار دیں۔ ندیم کونے میں سوگوار کھڑا حسرت بھری نظروں سے پلنگ کو تک رہا تھا۔ زمان سجاوٹ اتارتے ہوئے بولا۔ "تم بہت جلد جی ہار دیتے ہو ندیم۔ ہو سکتا ہے کل بھابی آ جائے اور کمرہ نہیں پھر سجانا پڑے۔"

ندیم یہ کہہ کر باہر نکل گیا کہ میں یہ سب کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ ندیم کے جانے کے بعد زمان نے غور سے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہ کپ جس میں نجمی کو بے ہوش کرنے والی انتہائی زود اثر دوائی پلائی گئی تھی وہاں سے ہٹا دی گئی تھی۔ جیک رواچکن پولش شیرا نجمی کے بے ہوش ہونے کے بعد کپ اور پلیٹ وہاں سے اٹھا کر لے گیا تھا۔ سنگھار میز پر نجمی کا پرس پڑا رہ گیا تھا جس کی تلاشی لینے کے بعد ندیم نے اسے اپنی اٹیچی کیس میں رکھ لیا تھا۔

زمان نے سارے کاغذی پھولوں کی لڑیاں اور سہرے ایک کپڑے میں لپیٹ کر الماری کے پیچھے رکھ دیئے پھر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ندیم اس کے کمرے میں بیٹھا ہو گا مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ زمان کو کچھ تشویش ہوئی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں ندیم پولیس میں رپورٹ درج کرانے کا فیصلہ نہ کر لے۔ زمان نیچے ہوٹل کے برآمدے میں آ گیا۔ زمان ہوٹل کا منیجر تھا۔ یہ ایک درمیانے درجے کا ہوٹل تھا۔

اس نے دیکھا کہ ندیم ہوٹل کے سامنے سڑک پر ٹہل رہا تھا۔ وہ گہری محویت کے عالم میں تھا زمان نے ندیم کو ساتھ لیا گاڑی نکالی۔ اور ایک بار پھر نجمی کی تلاش کی مہم پر نکل کھڑا ہوا۔ وہ ندیم کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ نجمی کی گمشدگی پر وہ اس سے زیادہ پریشان اور غم زدہ ہے۔ وہ گاڑی میں ندیم کو لئے لئے پھرتا رہا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تک اس نے کراچی کی کتنی ہی سڑکیں چھان ماریں۔ وہ ایئر پورٹ بھی گئے۔ لاہور جو فلائٹ گئی تھی اس کے مسافروں کی فہرست بھی دیکھی۔

اگرچہ ندیم کو معلوم تھا کہ نجمی اپنا پرس کمرے میں رکھ گئی تھی اور اس کے پاس کوئی خاص رقم نہیں ہو گی پھر بھی وہ بے نیل و مرام واپس ہوٹل میں آ گئے۔ زمان تو کمرے میں آتے ہی سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ جیب سے رومال نکال کر آنکھوں پر رکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "ندیم! میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا اگر بھابی نہ ملی تو میں خودکشی کر لوں گا۔"

ندیم اگرچہ خود غم سے نڈھال تھا مگر اپنے دوست کی ایسی حالت دیکھ کر اُلٹا۔۔

تسلیاں دینے لگا۔ "زمان میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ تم نے جو کچھ کیا ہماری بھلائی کے لئے ہی کیا۔"

زمان نے اپنے ماتھے پر زور سے ہاتھ مارا اور بولا۔ "مجھے کیا خبر تھی یہ بھلائی ہماری تباہی کا باعث بن جائے گی۔" پھر چھت کی طرف ہاتھ جوڑ دیئے اور رقت کے ساتھ بولا۔

"میرے مولا! میری بھابی کو واپس لا دے۔ میری بھابی کو واپس لا دے مجھ گناہ گار کے گناہ معاف کر دے۔"

ندیم زمان کے کاندھے دبانے لگا۔ "زمان! تم نے بھی حوصلہ ہار دیا تو مجھے حوصلہ کون دے گا؟"

زمان رومال سے مگرمچھ کے آنسو صاف کرنے لگا۔ پھر باتھ روم میں جا کر منہ پر چھینٹے مارے اور ندیم کی طرف دیکھ کر کہا۔ "خدا کے لئے اب تھوڑا بہت کچھ کھا لو۔"

زمان نے کچھ ناشتہ منگوایا جسے ندیم زہر مار کرنے لگا۔ زمان بڑی رغبت سے کھا رہا تھا مگر منہ بنا کر بولا "خدا کی قسم یہ لقمے زہر لگ رہے ہیں ہائے۔ اس وقت مجھے اپنے دوست کی شادی ہی دعوت کرنی تھی۔"

اور زمان نے اپنے اوپر ایک بار پھر رقت طاری کر لی۔ دوپہر کے بعد ندیم اپنے طور پر نجمی کی تلاش میں نکل گیا۔ شام تک وہ کراچی کی سڑکوں، پارکوں اور باغوں میں مارا مارا پھرتا رہا مگر نجمی بھلا اسے کہاں مل سکتی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا کہ وہ تھکا ہارا شکست خوردہ واپس ہوٹل میں آ گیا اس نے زمان سے کہا۔

"میں سوچتا ہوں کہ واپس لاہور جا کر معلوم کروں کہیں نجمی سیدھی اپنے گھر نہ چلی گئی ہو۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

زمان کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا اس نے پہلے تو اس خیال کی مخالفت کی پھر کہنے لگا۔ "تم بھی ٹھیک کہہ رہے ہو میرا دل کہتا ہے کہ بھابی گھبرا کر لاہور ہی چلی گئی ہے۔ کیا میں تمہارے ساتھ چلوں۔"

ندیم نے کہا۔ "نہیں نہیں تمہارا یہاں رہنا ہی ٹھیک ہو سکتا ہے نجمی واپس اسی جگہ آ جائے۔ میں اکیلا ہی لاہور جاؤں گا۔"

زمان نے سگریٹ نکال کر جلایا اور بولا۔ "لیکن تمہیں میرے ساتھ ایک وعدہ کرنا ہوگا اور وہ یہ کہ جاتے ہی مجھے فون کرو گے اور پھر میرے ساتھ برابر رابطہ رکھو گے۔"

ندیم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کراچی میں رہے تو وہاں رہ کر کیا کرے اس نے گھبرا کر لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لاہور اس کی طرف منہ پھاڑے ہوئے تھا۔ وہاں اسے کئی لوگوں کے کئی قسم کے سوالوں کے جواب دینے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ لاہور والوں نے اس کے خلاف اغوا کا مقدمہ درج کرا دیا ہو اور وہ لاہور جاتے ہی گرفتار کر لیا جائے۔ اس کے باوجود ندیم نجمی کے بارے میں اس قدر پریشان اور غمزدہ تھا کہ محض اس امید پر اس نے لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا کہ شاید نجمی اپنے ماں باپ کے گھر واپس چلی گئی ہو۔ جب اس نے فیصلہ کر لیا تو بے چین ہو گیا۔ "فون کر کے پتہ کرو لاہور کی گاڑی کس وقت چھوٹتی ہے۔"

زمان نے فوراً انکوائری کا نمبر ملایا معلوم ہوا گاڑی ساڑھے آٹھ بجے لاہور روانہ ہو گی۔ ندیم نے زمان سے کہا کہ وہ اس کے لئے ایک ٹکٹ منگوا دے۔ زمان نے فوراً اپنے آدمی کو پیسے دے کر ریلوے ریزرویشن آفس کی طرف روانہ کر دیا سیکنڈ کلاس میں ندیم کو سیٹ مل گئی زمان اسٹیشن پر ندیم کے ساتھ آیا۔

گاڑی چلنے لگی تو زمان نے ندیم کو گلے لگا لیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ "ندیم میرے دوست! مجھے معاف کر دینا مجھے معاف کر دینا۔"

ٹرین پلیٹ فارم سے کھسک رہی تھی۔ زمان نے تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ندیم سے کہا۔ "جاتے ہی مجھے فون کرنا میرا دل کہتا ہے کہ بھابی لاہور میں ہو گی۔ جاتے ہی فون کرنا مجھے تمہارے فون کا بے چینی سے انتظار رہے گا۔"

ٹرین پلیٹ فارم سے نکل گئی۔ زمان نے پیکٹ میں سے نیا سگریٹ نکال کر

سلگایا دیا سلائی بجھا کر دور پھینکی اور گاڑی کی طرف بڑھا۔ سیدھا اپنے ہوٹل میں آگیا کمرے میں آ کر اس نے ریسیور اٹھایا اور ایک خاص نمبر ملانے لگا۔ "مال گودام میں رکھوا دیا ہے۔"

دوسری طرف سے جیک روشیر کی آواز آئی "بالکل ٹھیک طرح سے رکھو دیا ہے کچھ مال خراب تھا اسے الگ کر دیا گیا ہے اب اسے ایکسپورٹ کرنے کے بارے میں کیا آرڈر ہیں؟"

زمان نے آہستہ سے کہا "ابھی انتظار کرو۔" اور فون بند کر دیا۔

ندیم کا لاہور کی طرف واپسی کا سفر بڑا کرب انگیز تھا اسے طرح طرح کے بھیانک خدشات نے گھیر رکھا تھا کبھی وہ اپنے ہاتھ میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی دیکھتا اور کبھی اپنے گھر والوں کو پریشانی کے عالم میں حوالات کے باہر بیٹھے ہوئے دیکھتا کبھی دیکھتا کہ پولیس اس پر تشدد کر رہی ہے اور نجمی کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہی ہے۔

تھوڑی دیر کے لئے وہ یہ بھول گیا کہ نجمی کس حال میں ہو گی اب اسے یہ فکر لگی تھی کہ لاہور جا کر اس کا کیا حال ہو گا اپنے گھر والوں کے بارے میں بھی پریشانی تھی کہ اگر نجمی کے باپ یا اس کی سوتیلی ماں نے تھانے میں رپورٹ درج کرا دی ہو گی تو پولیس نے ندیم کے والد صاحب کو بھی ضرور تھانے بلایا ہو گا انہیں مجبور کیا ہو گا کہ وہ بتائیں کہ ان کا بیٹا کہاں ہے۔

ندیم نے لاہور روانہ ہوتے وقت اپنے گھر خط لکھ دیا تھا کہ وہ ایک ضروری کام سے پشاور جا رہا ہے دو ایک دن میں واپس آ جائے گا ممکن ہے والد صاحب نے وہ خط پولیس کو دکھا دیا ہو اور پولیس اس کی تلاش میں پشاور روانہ ہو گئی ہو انہی خیالات میں الجھا ہوا ندیم لاہور کی طرف بڑھتا گیا جوں جوں لاہور قریب آ رہا تھا ندیم کا دل گھٹ رہا تھا آخر شام کے جھٹپٹے میں ٹرین لاہور کے پلیٹ فارم نمبر ۳ میں داخل ہو گئی ندیم نے اپنا چہرہ دوسرے مسافروں کے پیچھے چھپا لیا ٹرین رکی تو وہ ڈرتا ڈرتا مسافروں کی اوٹ لیتا ڈبے سے نکل کر گیٹ کی طرف چل پڑا کوئی پولیس کا سپاہی

نظر آتا تو وہ یہی سمجھتا کہ وہ اس کی تلاش میں وہاں آیا ہے۔ یونہی چھپتا چھپاتا ندیم رکشے میں بیٹھ کر اپنے مکان کی طرف روانہ ہو گیا ڈرتے ڈرتے مکان میں داخل ہوا اس کی والدہ نے دیکھا تو اس کو بڑھ کر گلے لگایا اور پھر ڈانٹنے لگیں۔ "ایسی بھی کیا مصیبت پڑ گئی تھی تمہیں کہ ہمیں بتا بھی نہ سکے کہ پشاور جا رہا ہوں۔"

دوسرے کمرے سے والد صاحب بھی نکل آئے "آ گئے ہو خیر سے؟ تمہیں شرم آنی چاہیئے سمجھے تم؟"

ندیم نے سر جھکا دیا وہ کہنے ہی والا تھا کہ ابا جی میں نجمی سے محبت کرتا ہوں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا کہ والد صاحب بولے "غضب خدا کا اپنے کسی دوست کو بھی بتا کر نہیں گئے بس ہمیں ایک خط لکھ دیا کہ میں ضروری کام سے پشاور جا رہا ہوں۔"

ندیم کے سر سے جیسے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ اس نے فوراً کہا۔ "ابو جان اصل میں میرے ایک دوست پر اچانک ایک مصیبت آن پڑی تھی بس اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر فوراً پشاور روانہ ہو گیا۔"

اس گھر میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ نجمی کو بھگا کر کراچی لے گیا تھا اس کا مطلب تھا کہ نجمی کے گھر والوں نے معاملے کو وہیں دبا دیا تھا انہوں نے نجمی کے گھر سے بھاگ جانے کی خبر نہیں ہونے دی تھی پولیس میں ندیم کے خلاف رپورٹ درج نہیں کرائی تھی۔ ندیم اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی پھانسی کی سزا معاف ہو گئی ہو اور عدالت نے اسے باعزت بری کر دیا ہو کیونکہ اگر نجمی کے گھر والوں نے یہ بات کسی کو بتائی ہوتی یا تھانے میں ندیم کے خلاف مقدمہ درج کرایا ہوتا تو یہ ناممکن تھا کہ ندیم کے ماں باپ کو اس کی خبر نہ ہوتی انسان بھی کتنا خود غرض ہو جاتا ہے اس وقت ندیم کو اپنے بچ جانے کی بے حد خوشی ہو رہی تھی اور نجمی کے غم کو وہ تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی بالکل فراموش کر بیٹھا تھا اسے اگر خطرہ تھا تو وہ اسے نجمی کی سہیلی شبانہ سے تھا کیونکہ شبانہ نجمی کی راز دار تھی اسے نجمی اور ندیم کے معاشقے کا علم تھا وہ تمام حالات سے واقف تھی اگر نجمی کے

ماں باپ نے شبانہ کو بھی یہی بتایا ہے کہ نجمی کو اچانک اپنے رشتے داروں کے پاس جانا پڑ گیا ہے تب تو ایسی تشویش کی بات نہیں ہے لیکن اگر شبانہ کو شک پڑ گیا ہے کہ نجمی ندیم کے ساتھ گھر سے فرار ہو گئی ہے تو وہ ندیم کو لاہور میں دیکھ کر نہ صرف حیران ہو گی بلکہ اس سے پوچھ گچھ کرنے کی کوشش کرے گی کہ وہ نجمی کو کہاں چھوڑ آیا ہے۔

ندیم نے اپنے سر کو جھٹک دیا اور غسل کرنے کے بعد اس نے کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر لیٹ کر پڑھنے لگا۔ ندیم کے والد نے خط ملتے ہی کالج میں اس کی چھٹی کی درخواست بھجوا دی تھی صبح ندیم کو یونیورسٹی جانا تھا وہاں شبانہ سے اس کا آمنا سامنا ہونا یقینی بات تھی ندیم دیر تک انہی خیالوں میں الجھا رہا پھر اس نے ٹیبل لیمپ بجھا دیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا اب اسے نجمی کا خیال آ گیا کہ وہ کہاں ہو گی؟ کس حال میں ہو گی؟

ندیم نے آنکھیں کھول دیں کمرے میں اندھیرا تھا وہ سوچنے لگا نجمی کہاں جا سکتی ہے وہ کہاں چلی گئی ہے کیا وہ اپنی مرضی سے گئی ہے؟ اگر اپنی مرضی سے گئی ہوتی تو ضرور لاہور میں آتی اچانک ندیم کو احساس ہوا کہ ابھی تک یہ بات تو ثابت ہی نہیں ہوئی کہ نجمی اپنے گھر واپس بھی آئی ہے کہ نہیں بہرحال ایک بات واضح ہو کر سامنے آ گئی تھی کہ نجمی کے ماں باپ نے معاملہ دبا دیا ہے اور پولیس تک نوبت نہیں پہنچی باقی اگر نجمی واقعی اپنے گھر واپس آ گئی ہے تو صبح شبانہ سے مل کر پتہ چل جائے گا اسی ادھیڑ بن میں ندیم کو نیند آ گئی اسے صبح نجمی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد زمان کو بھی کراچی فون کرنا تھا ندیم صبح یونیورسٹی جانے کے لئے جلدی تیار ہو گیا وہ خود شبانہ کو فون نہیں کرنا چاہتا تھا پہلے اس کا یہی خیال تھا کہ وہ شبانہ سے خود نہیں ملے گا اور کسی ذریعے سے نجمی کے بارے میں اس کا ردّ عمل معلوم کرے گا لیکن اب اس نے خود شبانہ سے ملنے کا فیصلہ کیا تھا اپنے طور پر وہ یہی ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ جیسے اسے نجمی کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔

کیمپس کے لان میں طلباء اور طالبات ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے باتیں کر رہے

تھے ان میں شبانہ نہیں تھی ندیم کینٹین میں آ گیا شبانہ یہاں بھی نہیں تھی وہ کینٹین سے نکل کر پرنسپل آفس کی طرف جا رہا تھا کہ برآمدے میں سامنے سے شبانہ آتی دکھائی دی ندیم کا دل زور سے دھڑکا پھر اس نے خود کو سنبھالا اور مسکراتے ہوئے شبانہ کی طرف بڑھا وہ بڑے غور سے شبانہ کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ندیم کو دیکھ کر شبانہ کے چہرے پر وہ ردّ عمل ظاہر نہیں ہوا تھا جو نجمی کے گھر سے بھاگ جانے کی صورت میں ظاہر ہونا چاہیئے تھا اس کا مطلب تھا کہ شبانہ کو بھی نجمی کے فرار کا علم نہیں ہے۔

"شبانہ میں پشاور گیا ہوا تھا رات کو آیا ہوں پھر شبانہ کو ایک طرف لے جا کر رازداری سے کہنے لگا کیا نجمی کہیں باہر گئی ہوئی ہے میں اس کے گھر تو نہیں جا سکا لیکن مجھے اس کی ایک رشتہ دار عورت نے بتایا ہے کہ وہ گھر پر نہیں ہے اور بہاولپور گئی ہوئی ہے۔

شبانہ نے فکرمندانہ انداز میں کہا۔" مجھے بھی یہی پتہ چلا ہے کہ وہ بہاولپور گئی ہوئی ہے مگر تعجب کی بات ہے کہ نجمی نے مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا اور اس کے والد کی طبیعت بھی خراب ہے۔"

اب اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ نجمی کے ماں باپ نے نجمی کے فرار کو دبا دیا ہے اور رشتہ داروں میں یہی مشہور کیا ہے کہ نجمی بہاولپور اپنی ماسی کے ہاں گئی ہوئی ہے نجمی کے والد کی علالت کا سن کر ندیم کو تشویش ہوئی یہ ایک قدرتی بات تھی باپ کے لئے یہ ایک بہت بڑے صدمے کی بات تھی۔

شبانہ کہہ رہی تھی "جب مجھے معلوم ہوا کہ تم بھی لاہور میں نہیں ہو تو میں تو یہی سمجھی کہ تم دونوں کہیں اکٹھے بھاگ گئے ہو۔"

ندیم نے اپنے چہرے کو سنجیدہ بنایا اور بولا۔" شبانہ بہن میں ایسا غلط قدم کبھی نہیں اٹھا سکتا اور ایسا وقت آ بھی جاتا تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ تم سے مشورہ نہ کرتے۔"

شبانہ نے کہا "اسی لئے تو میں حیران تھی اب تمہیں دیکھا تو یقین آ گیا کہ نجمی واقعی بیمار پڑ گئی ہے لیکن اس نے مجھ سے اس کا ذکر کیوں نہیں کیا؟" ہو سکتا ہے کہ اسے جلدی میں جانا پڑ گیا ہو۔ ندیم نے رومال سے منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ اتنا سا جھوٹ بولنے پر ہی اسے پسینہ آ گیا تھا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نجمی کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے اسے مجرمانہ احساس ہو رہا تھا۔

وہ کلاس میں جانے کا بہانہ بنا کر شبانہ سے جلد ہی جدا ہو گیا برآمدے کا موڑ مڑتے ہوئے اس نے یونہی بظاہر بے نیازی سے پیچھے دیکھا شبانہ ابھی تک برآمدے میں کھڑی ندیم کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ندیم کو دو طرح کی پریشانی نے گھیر لیا۔ ایک تو یہ کہ شبانہ اس کی طرف مشتبہ انداز میں کیوں تک رہی تھی اور دوسری یہ کہ ندیم نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا تھا وہ کیا سوچ رہی ہو گی؟

ندیم کے دل میں خیال آیا کہ وہ شبانہ کو سب کچھ بتا دے پھر جب اسے اپنے سامنے حوالات کی سلاخیں نظر آئیں تو اس نے جلدی سے یہ خیال دل سے نکال دیا وہ بوجھل دل کے ساتھ اپنے کیمپس کی طرف چل دیا۔

.. ..

شبانہ بہت کچھ سوچتی ہوئی کلاس روم میں داخل ہو گئی۔ کلاس روم میں نجمی کی شکل دکھائی نہ دی تو شبانہ اداس ہو گئی۔ اداسی شبانہ کو پسند تھی اداسی میں اسے محسوس ہوتا کہ وہ کسی ویران باغ میں سے گزر رہی ہے۔ خزاں کی ہوائیں درختوں کے سوکھے پتے اس کے اوپر گر رہے ہیں، گھاس پر زرد پتوں کا فرش بچھا ہے۔

شبانہ کو اپنے اوپر خزاں کی اداس شہزادی کا گمان ہوتا جو گزری محبتوں کے خواب اپنی پلکوں میں چھپائے زرد پتوں کی سسکیوں میں بہار کی وادیوں کی تلاش میں جا رہی ہو۔ اداسی کی ان ہی زرد پتوں کی لہر شبانہ کو راحیل کے پاس لے گئی تھی۔ راحیل، جس کا کوئی نام نہیں تھا، کوئی بہار نہیں تھی، کوئی خزاں نہیں تھی جو بارشوں میں جنگلوں کا سفر کرتا اور برفباری میں آتشدان کے پاس بیٹھ کر پیالی میں خوشبودار چائے انڈیلتے ہوئے ورڈز ورتھ کی نظمیں پڑھتا دن کی روشنی میں وہ کہیں دکھائی نہ دیتا اور مہر بہ لب سنسان راستوں کے اندھیرے میں سایہ بن کر ڈھل جاتا یہ وہ جذباتی مسائل تھے جن میں شبانہ الجھی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود اسے نجمی سے بڑا پیار تھا وہ ایک ہی اس کی سہیلی تھی وہ اس کے بارے میں پریشان تھی۔

جب وہ نجمی کے گھر اس کی بیمار پرسی کرنے گئی تو نجمی وہاں موجود نہیں تھی۔ کالج میں اس کی بیماری کی چھٹی کی درخواست آئی تھی۔ نجمی کے والد دوسرے کمرے میں بیمار پڑے تھے اور ڈاکٹر نے اسے کسی سے ملنے کو منع کر رکھا تھا۔ شبانہ نے

نجمی کی والدہ سے نجمی کے بارے میں پوچھا تو پہلے وہ کچھ نہ بولی... پھر بتایا کہ نجمی کو اپنی ماسی کے ہاں بہاولپور جانا پڑ گیا ہے۔ شبانہ کو احساس ہوا کہ اس سے کچھ چھپایا جا رہا ہے مگر وہ ان لوگوں کے ذاتی اور گھریلو معاملات میں دخل نہیں دے سکتی تھی وہ اس امر پر حیران ضرور تھی کہ نجمی کے ابو بیمار پڑے ہیں اور نجمی بہاولپور میں بیٹھی ہے جب شبانہ واپس جانے لگی تو نجمی کی سوتیلی ماں نے اسے کہا کہ وہ نجمی کی طرف سے دس پندرہ دنوں کی چھٹی کی درخواست کالج میں دیدے... شاید نجمی کو بہاولپور میں زیادہ دن لگ جائیں۔

شبانہ بہت اچھا جی جان کہہ کر واپس آ گئی تھی... پھر جب شبانہ کے علم میں یہ بات آئی کہ ندیم بھی لاہور میں نہیں ہے اور اس کی چھٹی کی بھی درخواست آ گئی ہے تو اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے... اگرچہ ندیم کو دیکھ کر اور اس سے باتیں کر کے شبانہ کے دل سے کچھ وسوسے دور ہو گئے تھے تاہم ندیم کا انداز پراسرار اور اکھڑا اکھڑا سا تھا جس سے شبانہ کو مزید شک ہونے لگا تھا... مگر خاموش رہی... وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ نجمی بہاولپور سے اسے خط لکھتی ہے یا نہیں۔ اب ہم وقت کی کتاب کے کچھ اوراق پیچھے کی طرف پلٹتے ہیں اور ان لمحات کو ایک بار پھر واپس لاتے ہیں جب کراچی شہر کی سڑکوں پر مشرق سے ابھرنے والے سورج کی اولین دھندلی روشنی کا پھیکا سا غبار پھیل رہا تھا اور ندیم اپنے دوست زمان کے ہوٹل کے ایک کمرے میں بے خبر سو رہا تھا۔

اور دوسرے کمرے میں بدنصیب دلہن نجمی کو تین آدمی چادر میں لپیٹ کر ہوٹل کی عقبی سیڑھیاں اتر کر باہر کھڑی ایمبولینس گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ نجمی کو ایمبولینس میں ڈالنے کے بعد ویگن تیزی سے نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ نجمی بے ہوش تھی... دو اچکن پوش آدمی نجمی کے پاس بیٹھے تھے ایک اچکن پوش آگے ڈرائیور کی سیٹ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ یہ لوگ آپس میں کوئی بات نہیں کر رہے تھے بالکل خاموش تھے پتھر کی مورتیوں کی طرح بیٹھے تھے ان میں ایک وکی تھا،

اور ایک چھپک رو شیرا تھا۔ اچکنیں انہوں نے اس لئے پہن رکھی تھیں کہ وہ بدنصیب دلہن کے نکاح میں بطور گواہ شرکت کرنے کے لئے آئے تھے اور اب اسی غمزدہ بے ہوش دلہن کو اغوا کر کے لئے جا رہے تھے۔ سورج نکلنے سے پہلے پہلے ایمبولینس ویگن شہر سے باہر ایک ایسے ویران علاقے میں پہنچ چکی تھی جہاں دور ایک طرف سمندر کا کنارہ تھا اور ایک جانب فاصلے پر شہر کی عمارتوں کی آخری منزلیں سورج کی روشنی میں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

ویگن آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ زمین ریتلی اور سخت تھی ایک غیر ہموار راستہ اونچے نیچے چھوٹے چھوٹے پتھریلے ٹیلوں کے درمیان سے گزر رہا تھا... پھر شہر کی عمارتیں مغربی افق میں چھپ گئیں اور زیادہ ویران اور سنسان علاقہ شروع ہو گیا کبھی ویگن کسی ٹیلے کی اوٹ سے باہر نکلتی تو دائیں جانب دور سمندر کی ایک جھلک نظر آ جاتی۔ ویگن کی چھت پر جو ایمبولینس کی نشانی یعنی سرخ بتی لگی تھی اس نے شہر سے باہر نکلتے ہی جھلملانا بند کر دیا تھا۔

راستے سے ہٹ کر دور ایک جگہ کچھ درخت دکھائی دیئے... ویگن ان درختوں کی طرف مڑ گئی۔ یہ درخت زیادہ گھنے نہیں تھے ان کے پیچھے ایک لمبی بیرک سی بنی ہوئی تھی جس کی ڈھلانی چھت کے تختے جگہ جگہ سے اکھڑے ہوئے تھے۔ بیرک کے آگے ایک برآمدہ تھا جس کا فرش گرد آلود تھا۔ صحن میں ایک جیپ کا صرف ڈھانچہ ہی کھڑا تھا۔ کونے میں دیوار کے ساتھ لکڑی کے خالی کھوکھوں کا ڈھیر لگا تھا۔ یہاں بظاہر کچھ بھی نہیں تھا مگر ایک چوکیدار برآمدے کے سامنے بندوق لئے اسٹول پر بیٹھا پہرہ دے رہا تھا۔

ویگن کو بیرک کے احاطے کی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھا اور احاطے کی ٹوٹی ہوئی کچی دیوار میں بنے جنگلے کی طرف بڑھا۔ ویگن احاطے میں تیزی سے داخل ہو کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ تینوں آدمی یعنی وکی، لوٹی اور شیرا جلدی سے ویگن میں سے باہر نکل آئے۔ چھپک رو شیرے نے چوکیدار سے کہا۔ "چاچا! مال آیا ہے... کونے والی کوٹھڑی کھول دو۔"

چوکیدار بیرک کی کونے والی کوٹھڑی کی طرف دوڑا۔۔۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے اس نے جیب سے چابی بھی نکال لی تھی۔ کوٹھڑی کا تالا کھول کر اس نے دروازے کا ایک پٹ کھول دیا اور خود پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وکی، ٹونی اور جیک روشیرا بے ہوش نجمی کو اٹھائے چلے آ رہے تھے۔ کمرے میں صرف ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی انہوں نے نجمی کو چارپائی پر ڈال دیا۔

جیک روشیرے نے ٹونی کو اشارہ کیا ٹونی بیرک کے دوسرے کمرے میں گیا جو کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا وہاں سے وہ ایک زنجیر نکال کر لے آیا اس زنجیر کے دونوں سروں پر ایک ایک ہتھکڑی لگی تھی۔ شیرے نے ایک ہتھکڑی بے ہوش نجمی کے پاؤں میں ڈال کر تالا لگا دیا اور دوسری ہتھکڑی چارپائی کے پائے کے ساتھ لگا کر مقفل کر دی۔ یہ زنجیر اتنی لمبی تھی کہ آدمی کمرے میں آسانی سے چل پھر سکتا تھا۔

کمرے میں صرف ایک چھوٹا سا روشندان تھا جس پر لوہے کی سلاخیں لگی تھیں اس کمرے میں ایک مختصر سا غسل خانہ بھی تھا جس میں کوئی روشندان یا کھڑکی نہیں تھی گویا اسے خاص طور پر اغوا شدہ لوگوں کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر تینوں آدمی کمرے سے باہر آ گئے۔ انہوں نے دروازہ بند کر کے تالا لگایا۔۔ چابی چوکیدار کے حوالے کی اور پھر شیرے نے چوکیدار کو ایک طرف لے جا کر کچھ ضروری ہدایات دیں اور یہ تینوں آدمی ویگن میں بیٹھ کر جدھر سے آئے تھے اُدھر ہی چلے گئے۔

چوکیدار سیاہ فام مضبوط تن و توش کا آدمی تھا۔ شیرے، ٹونی اور وکی کے جانے کے بعد اس نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور برآمدے کے آگے درخت کی چھاؤں میں رکھے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ زمان کے کارندے وکی، ٹونی اور شیرا نجمی کو ویران مقام پر واقع بیرک میں بند کرنے کے بعد ایک گمنام جگہ پر جا کر اپنے باس یعنی زمان کی ٹیلی فون کال کا انتظار کرنے لگے۔

اس کے بعد ندیم کے ساتھ جو کچھ بیتی اور زمان نے اس کے ساتھ جو ڈرامہ کیا وہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ اسی رات کو ندیم پریشان حالی میں لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔

تو واپس ہوٹل میں آ کر زمان نے شیرے کو خفیہ جگہ پر ٹیلیفون کیا اور پوچھا کہ مال رکھوا دیا ہے گودام میں؟ جب شیرے نے اسے بتایا کہ مال رکھوا دیا گیا ہے تو زمان نے اسے کہا کہ انتظار کرو اور فون بند کر دیا اس کے بعد زمان نے ایک اور جگہ فون کیا اور بولا۔

"ہیلو سیٹھ کیا حال ہے؟ میں نے اس لئے فون کیا ہے کہ مال آ گیا ہے۔۔۔ میں اسے بہت جلد ایکسپورٹ کر دینا چاہتا ہوں کیونکہ گودام میں اتنی جگہ نہیں ہے ... نہیں سیٹھ یہ بات نہیں ہے۔۔۔ اصل میں خطرہ ہے مال پڑا پڑا خراب نہ ہو جائے ... او کے۔۔۔ میں دو دن انتظار کر لوں گا۔۔۔ مجھے معلوم ہے سیٹھ مال کہاں پہنچانا ہے۔۔۔ ہم تو جائز کاروبار کرتے ہیں اور پوری دیانت داری کے ساتھ۔۔۔ او کے ... خدا حافظ!"

اس وقت رات کے دس بج رہے تھے زمان نے کار نکالی اور اس خفیہ اڈے کی طرف چل پڑا جہاں اس کے تینوں کارندے اس کا انتظار کر رہے تھے جاتے ہی اس نے شیرے سے کہا۔ "اسے زنجیر ڈال دی تھی؟" شیرا بولا۔

"بالکل ڈال دی تھی استاد اور چوکیدار کو بھی سمجھا دیا تھا۔" زمان سگریٹ سلگا کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔۔۔ پھر اس نے لیمپ کی روشنی میں ایک ایک کر کے تینوں کارندوں کو غور سے دیکھا اور بولا۔

"یہ مال بڑا قیمتی ہے۔۔۔ اس کی بہت قیمت پڑے گی۔۔۔ ایجنٹ سے میں نے بات کر لی ہے۔۔۔ دو دن کے بعد ہمیں مال اس کے حوالے کر دینا ہو گا۔۔ لیکن اس وقت میں اس عہد کو دُہرانا چاہتا ہوں جو میں نے تم سے لے رکھا ہے اور جس کی خلاف ورزی کا انجام تم تینوں کو اچھی طرح معلوم ہے۔۔۔ وکی! تم بولو۔" وکی نے کہا "ہم اس لڑکی پر بُری نیت سے ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔"

زمان نے ٹونی کی طرف دیکھ کر کہا "ٹونی! تم اپنا عہد دہراؤ۔" ٹونی نے کہا۔ "ہم لڑکی کو کسی کی امانت سمجھ کر اپنے پاس رکھیں گے۔۔۔ اس کی عزت کی حفاظت کریں گے۔"

اب زمان نے جیک روشیرے کی طرف دیکھا شیرے سے کہا۔" اگرچہ نکاح نامے کی رو سے وہ میری منکوحہ بیوی بن چکی ہے مگر وہ میرے لئے حرام ہے۔" زمان نے جیب سے چھوٹا سا جرمن آٹومیٹک پستول نکال لیا اور اس کی چمکیلی نالی پر انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔" تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو کہ اس پستول میں سے نکلی ہوئی گولی نے راجو کو کیوں ہلاک کیا تھا... اس لئے کہ اس نے میرے کاروباری اصولوں کو اور اپنے عہد کو توڑتے ہوئے میرے لائے ہوئے مال پر، میری امانت پر ہاتھ ڈالا تھا... یہ میرا شروع ہی سے اصول رہا ہے کہ جو عورت ایکسپورٹ ہونے کے لئے یہاں لائی جاتی ہے میں اس کی حفاظت کرتا ہوں جب تک کہ وہ ایکسپورٹ نہیں ہو جاتی.... راجو نے اس اصول کو توڑنا چاہا تھا اور میں نے اسے قتل کر دیا۔"

اب زمان نے شیرے کی طرف دیکھا اور بولا۔" اس بار جو لڑکی لائی گئی ہے اس کا نکاح تجھ سے کروایا گیا ہے۔ یہ جعلی نکاح ہے اس پر سوائے تمہارے اور لڑکی کے باقی سب دستخط نقلی ہیں.. مگر اسے کوئی نقلی ثابت نہیں کر سکتا تم خوب جانتے ہو کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے... محض اس لئے کہ اس لڑکی پر ہمارا حق بنا رہے اور اگر کبھی ایسی صورتحال پیدا ہو جائے تو تم نکاح نامہ دکھا کر اسے اپنی بیوی ظاہر کر سکو.... اس کے سوا تمہارا اس لڑکی سے کوئی تعلق نہ ہے، نہ رہے گا... مجھے یقین ہے کہ تم میری بات سمجھ گئے ہو گے۔"

شیرے نے سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔" استاد! یہ کوئی کہنے کی بات ہے ....ہم سب سمجھتے ہیں میری طرف سے تمہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔" زمان نے مسکراتے ہوئے پستول پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔" شکایت کا موقع تو اس پستول کی گولی کسی کو بھی نہیں دیتی میرے دوست!"

زمان اٹھ کھڑا ہوا" آج دس تاریخ ہے... تیرہ تاریخ کی آدھی رات کو لانچ مقررہ مقام پر پہنچ جائے گی ہمیں مال اسی رات ایجنٹ کے حوالے کر دینا ہوگا.... مال کی حفاظت کی ذمہ داری اب تم پر عائد ہوتی ہے... تم میں سے ہر ایک باری

باری بیرک میں ڈیوٹی دے گا۔"

زمان چلا گیا۔ ڈکی، لوٹی اور شیرا وہیں بیٹھے رہے۔ شیرے نے کہا کہ" آج کی باقی رات بیرک میں پہرے کی ڈیوٹی میں دوں گا۔" ڈکی، لوٹی کو نیند آ رہی تھی وہ بڑے خوش ہوئے کہ اس وقت وہ رات کو پہرہ دینے کی ڈیوٹی سے بچ گئے ہیں۔ شیرے نے جیب نکالی اور شہر سے دور سنگلاخ ٹیلوں والی اس ویران بیرک کی طرف روانہ ہو گیا جہاں نجمی بے بسی کے عالم میں قید تھی۔ صبح جب یہ لوگ اسے بیرک میں بند کر کے چلے گئے اور چوکیدار باہر برآمدے میں اسٹول ڈال کر بیٹھ گیا تو اس وقت دن کافی نکل آیا تھا۔

نجمی کو ہوش آ گیا اس کا سر ابھی تک بھاری تھا.... پہلے تو وہ یہ سمجھی کہ وہ اپنے ہوٹل والے حجلۂ عروسی میں ہی ہے لیکن بہت جلد اسے محسوس ہو گیا کہ وہ کھری چارپائی پر پڑی ہے اور چھت کے ساتھ پنکھا بھی نہیں چل رہا۔ روشندان میں سے دن کی روشنی کمرے میں آ رہی تھی۔ نجمی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اس کے اٹھتے ہی اس کے پاؤں کی زنجیر جھنجھنا اٹھی۔

نجمی نے اپنے پاؤں میں بندھی ہوئی زنجیر دیکھی تو اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی وہ چارپائی سے اتری تو اسے چکر سا آ گیا۔ وہ وہیں بیٹھ گئی دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لینے لگی کہ وہ کہاں آ گئی ہے اور اس کے پاؤں میں زنجیر کس نے ڈال دی ہے؟ وہ پڑھی لکھی لڑکی تھی اس قسم کے واقعات اخباروں اور رسالوں میں پڑھ چکی تھی فوراً سمجھ گئی کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور کوئی اسے اغوا کر کے یہاں لے آیا ہے۔ اسے جو چائے دی گئی تھی اس میں بے ہوشی کی دوائی تھی... یہ کام اسی چیک رو اچکن پوش کا ہے جس نے اسے چائے لا کر دی تھی... مگر وہ تو ندیم کے دوست زمان کا آدمی تھا وہ یہ بھیانک حرکت کیسے کر سکتا تھا؟

ندیم کہاں ہو گا؟ کیا ندیم کو معلوم ہے کہ مجھے اغوا کیا گیا ہے؟ نجمی کے دل میں پریشان خیالوں کے طوفان امڈ رہے تھے وہ اٹھی تو پاؤں کی زنجیر بج اٹھی اس نے

دیکھا کہ زنجیر کا دوسرا سرا چارپائی کے پائے کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ نجمی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا یہ کیا ہو گیا ہے؟ وہ کہاں آ گئی ہے؟ اب اس کے ساتھ کیا ہو گا؟ نجمی نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور بے اختیار رونے لگی۔

ندیم، شبانہ اور اپنے ابو کے چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے اب اسے اپنی سوتیلی ماں بھی یاد آ رہی تھی۔ نجمی کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی وہ دیر تک اپنی قسمت پر بلکہ اپنی حماقت پر آنسو بہاتی رہی۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے گھر سے قدم باہر نکال کر کتنی خوفناک غلطی کی تھی۔ وہ روتے روتے ندیم کو پکارنے لگی۔

"ندیم تم کہاں ہو؟ تم میری مدد کو کیوں نہیں آتے؟" پھر اس نے ہاتھ جوڑ کر خدا کے حضور گڑگڑا کر اپنے گناہ کی معافی مانگی اور کہا۔

"میرے خدا! مجھے ایک بار یہاں سے نکال دے پھر میں ایسی غلطی کبھی نہیں کروں گی۔۔۔ میرے گناہوں کو بخش دے۔۔۔ میری غلطیوں کو معاف کر دے۔" روتے روتے نجمی کی چیخیں نکل گئیں ان چیخوں کی آواز باہر بیٹھے ہوئے چوکیدار تک باقاعدہ پہنچ رہی تھی مگر یہ اس کے لئے کوئی نئی آواز نہیں تھی جو بھی عورت اس بیرک میں قید کی جاتی تھی وہ روتی ضرور تھی۔

یہ چوکیدار بھی زمان، ٹونی، وکی اور شیرے کی طرح نارمل انسانی احساسات اور جذبات والا آدمی نہیں تھا اس نے بھی زمان، ٹونی، وکی اور شیرے کی طرح اپنے ضمیر کو یہ کہہ کر وقتی طور پر افیون دے رکھی تھی کہ یہ تو ایک کاروبار ہے جو عورتیں یہاں لائی جاتی ہیں ان کا کوئی نہیں ہوتا ہے یا رو مددگار ہوتی ہیں۔ انہیں ایکسپورٹ کر دیا جاتا ہے اور پھر وہ نئے ماحول میں پہنچ کر سب کچھ بھول جاتی ہیں اور ہنسی خوشی زندگی بسر کرنا شروع کر دیتی ہیں ایک طرح سے تو یہ ان کی امداد ہی ہوتی ہے۔ چوکیدار بھی نجمی کے رونے کی آواز سن کر اپنے دل میں کہہ رہا تھا "احمق لڑکی اب رو رہی ہے۔۔۔ کچھ روز بعد نئے ماحول میں، نئے گھر میں، ہنستی بار ہنس کھیل رہی ہو گی۔"

چنانچہ نجمی بند کمرے میں کبھی ندیم، کبھی اپنے ابو جان اور کبھی اپنی پیاری سہیلی شبانہ کو یاد کر کے روتی رہی اور باہر چوکیدار بڑے اطمینان سے بیڑی پیتا رہا۔۔۔ پھر وہ اٹھ کر بیرک کے کونے والے چھوٹے سے باورچی خانے میں چلا گیا یہاں ضرورت کے مطابق آٹا، چاول، گھی، چینی اور دالیں وغیرہ ڈبوں میں موجود تھیں چوکیدار کھچڑی تیار کرنے لگا۔ کھچڑی تیار کر کے وہ ایک تھالی میں ڈال کر پانی کے کٹورے کے ساتھ نجمی کے پاس لے گیا۔۔۔ نجمی نے چوکیدار کو دروازہ کھول کر اندر آتے دیکھا تو اس کے پاؤں پر گر کر بے اختیار رونے لگی۔

"خدا کے لئے میرے حال پر رحم کرو۔۔۔ میں شریف ماں باپ کی بیٹی ہوں۔۔۔ مجھے یہاں سے آزاد کر دو۔" چوکیدار ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور بولا۔

"شریف ماں باپ کی بیٹیاں گھر سے نہیں بھاگا کرتیں یہ کھچڑی کھا لو۔۔ نہیں کھاؤ گی تو یہاں تمہاری اماں تمہیں آ کر نہیں کھلائے گی۔" یہ کہہ کر چوکیدار نکل گیا اور اس نے دروازے پر تالا لگا دیا۔ نجمی آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چوکیدار کا جملہ تیر بن کر اس کے دل میں پیوست ہو گیا تھا۔

اس نے ٹھیک ہی تو کہا تھا شریف ماں باپ کی بیٹی گھر سے نہیں بھاگتی وہ مر جاتی ہے مگر ماں باپ کی عزت کو خاک میں ملا کر گھر سے باہر قدم نہیں نکالتی اور نجمی تو گھر سے بھاگ کر آئی تھی۔۔۔ اس نے تو اپنے شریف النفس باپ کی عزت کا بھی خیال نہیں کیا۔ ماں سوتیلی سہی آخر اس کے باپ کی بیوی تھی اور باپ چاہے اس کی طرف سے کتنا ہی بے بس اور مجبور کیوں نہ ہو آخر اس کا باپ تھا وہ اس کی عزت تھی اس کی آبرو تھی، ہرنی جب پیاس بجھانے کے لئے اس تالاب کا رخ کرتی ہے جہاں شیر پانی پینے آتے ہوں تو اس کا انجام ظاہر ہے۔ نجمی کو کبھی یقین نہیں آ سکتا تھا کہ اسے ندیم نے زمان کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے تو کیا زمان نے اسے یہاں قید کر رکھا ہے؟ کیا وہ اسے بردہ فروشوں کے حوالے کرنا چاہتا ہے؟

زمان تو ندیم کا بڑا مخلص دوست تھا اور بھابی بھابی کہتے اس کی زبان نہیں تھکتی

تھی۔۔۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ یہ سب کچھ بھول کر اپنے دوست کے اعتماد کے سینے میں خنجر گھونپ دیتا۔۔۔ نہیں۔۔۔ نجمی نے سوچا یہ سب کچھ اس آدمی نے اپنے طور پر کیا ہے جو اس کے لئے چائے لے کر آیا تھا اس نے ایک گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کو دیکھا اور اس کی نیت خراب ہو گئی۔

نجمی نے رونے دھونے کی بجائے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے وہاں سے کسی طرح فرار ہونے کی ترکیبوں پر غور کرنا شروع کر دیا۔ وہ کوئی ان پڑھ لڑکی نہیں تھی۔ اس نے اپنے آپ کو بہت جلد سنبھالا دیا حالات کی سنگینی کو قبول کیا اور سوچنے لگی کہ وہاں سے کیسے فرار ہو سکتی ہے۔ چوکیدار کی زبان سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ابھی تک کراچی کے علاقے میں ہی ہے اور اسے ملک سے باہر نہیں لے جایا گیا اس نے کمرے کا اب ایک دوسری نظر سے جائزہ لیا۔ کمرے میں چھت کے پاس ایک ہی روشندان تھا جس میں لوہے کی سلاخیں لگی تھیں یہاں سے فرار ہونا ناممکن تھا باقی اس کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔

چوکیدار نے دروازے کو باہر سے تالا لگا دیا تھا۔ نجمی نے کھچڑی کی تھالی کی طرف دیکھا اسے بھوک لگ رہی تھی مگر کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن اسے وہاں سے فرار ہونا تھا اور وہ اپنے جسم کی طاقت ہر حالت میں بحال رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے تھوڑی سی کھچڑی کھائی۔۔۔ پانی پیا اور چارپائی پر جا کر بیٹھ کر سوچنے لگی کہ وہ وہاں سے کیسے بھاگ سکتی ہے۔ اپنے ماں باپ کے گھر سے اسے بھاگنا نہیں چاہئے تھا مگر وہ کتنی آسانی سے بھاگ آئی تھی اور یہاں سے وہ ہر حالت میں اپنی عزت بچا کر بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن وہاں سے بھاگنا اسے ناممکن نظر آ رہا تھا۔ اس کے پاؤں میں جو زنجیر بندھی تھی وہ غسل خانے میں نجمی کے ساتھ ساتھ گئی۔ منہ ہاتھ دھونے سے نجمی کا ذہن تیزی سے غور و فکر کرنے لگا۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گئی اور اپنے آپ سے بولی میں اپنی عزت کی خاطر جان قربان کر دوں گی۔۔۔ میں یہاں سے بھاگ کر سیدھی اپنے گھر جاؤں گی۔

اپنے پیارے ابو کے پاس جاؤں گی۔۔۔ مجھے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ اس نے باہر کان لگا دیئے۔۔۔ باہر سے سوائے کبھی کبھی کسی پرندے کے بولنے کے دوسری کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد چوکیدار برتن لینے آیا تو بندوق اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ نجمی نے اس کی طرف دیکھ کر عاجزی سے کہا، "انکل مجھے معاف کر دو۔۔۔ مجھ سے غلطی ہو گئی کہ میں ندیم کے ساتھ گھر سے بھاگی۔۔۔ مجھے خدا کے لئے معاف کر دو اور یہاں سے باہر جانے دو۔"

چوکیدار نے غصے میں کہا۔ "خبردار جو مجھے انکل کہا اب جو کیا ہے اسے بھگت یہاں کوئی تیری مدد نہیں کر سکتا۔" اور چوکیدار خالی برتن لے کر باہر نکل گیا۔ دن ڈھلتا چلا گیا۔ روشندان سے جو دن کی روشنی آ رہی تھی جب وہ پھیکی پڑنے لگی تو وہ سمجھ گئی کہ باہر سورج غروب ہو رہا ہے۔ بند دروازے کی درازوں پر بھی باہر کی جانب ٹین کی پتریاں جڑ دی گئی تھیں۔۔۔ پھر کمرے میں اندھیرا ہونے لگا۔ کمرے میں بجلی نہیں تھی۔

چوکیدار ایک بار پھر اندر آیا اور طاق میں لالٹین جلا کر واپس چلا گیا۔ نجمی اس سے ہاتھ جوڑ کر پوچھتی ہی رہ گئی کہ اسے وہاں کیوں لایا گیا ہے ندیم کہاں ہے؟ زمان صاحب کہاں ہیں؟ مجھے ان کے پاس لے چلو۔۔۔ مگر چوکیدار جیسے گونگا بہرہ بن گیا تھا۔ لالٹین اندر رکھ کر وہ چلا گیا اور باہر سے ایک بار پھر تالا لگا دیا گیا۔ رات کو نجمی کو وہی کھچڑی کھانے کو دے دی گئی۔۔۔

اب تو چوکیدار نے چپ سادھ لی تھی اور نجمی کی طرف دیکھتا بھی تو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا۔ نجمی انتہائی مایوسی کے عالم میں چارپائی پر بیٹھ گئی۔۔۔ پھر اس نے غسل خانے میں جا کر وضو کیا اور نماز پڑھی۔ نماز پڑھنے کے بعد جب وہ ہاتھ کھول کر خدا سے دعا مانگنے لگی تو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔۔۔ گڑگڑا کر خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتی اور روئے جاتی تھی۔ جب اس کے دل کو تھوڑی سی تسکین ہوئی تو اس نے

ہاتھ آنسو بھرے چہرے پر پھیرا اور چھت کی طرف منہ اٹھا کر کہا۔ "میرے اللہ! میری مدد فرما۔۔۔ میرے گناہ معاف کر دے میں توبہ کرتی ہوں۔۔۔ تو توبہ قبول کرنے والا ہے آئندہ ایسی غلطی، ایسا گناہ کبھی نہیں کروں گی۔"

نماز پڑھنے اور خدا کے حضور اپنے گناہوں کی معافی مانگنے سے نجمی کے دل کو تسکین بھی ملی اور نئی طاقت بھی ملی۔۔۔ وہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔۔۔ اس نے کھچڑی کھائی۔۔۔ پانی پیا اور پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگی کہ وہاں سے فرار ہونے کے لئے وہ کون سی حکمتِ عملی اختیار کرے۔۔۔ بظاہر اسے کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر اسے نیند آ گئی کسی نے سچ کہا ہے کہ نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔

نجمی کو بھی سولی پر نیند آ گئی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب زمان ندیم کو لاہور جانے والی ٹرین میں سوار کروا کر سیدھا اپنے ہوٹل آیا تھا اور وہاں سے اپنے آدمیوں کو فون کرنے کے بعد خفیہ ٹھکانے پر جا کر شیرو، وکی اور لوٹی کو ضروری ہدایات دے رہا تھا اور پھر جب آدھی رات کے بعد جیک روشیرا خاص طور پر اس رات چوکی پر پہرے کی ڈیوٹی ادا کرنے بیرک کی طرف جیپ پر سوار چلا آ رہا تھا تو نجمی اس وقت بھی سو رہی تھی جیک روشیرا رات کے اندھیرے میں سنگلاخ چٹانوں میں جیپ چلاتا خفیہ کمین گاہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اس وقت شیرے کا ذہن کیا سوچ رہا تھا یہ سوائے اس کے دوسرا کوئی نہیں جانتا تھا۔ جب سے شیرے نے ہوٹل میں نجمی کو دیکھا تھا اس کے دل میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی اور پھر جب زمان نے نکاح نامہ پر شیرے کو دستخط کرنے کے لئے کہا تو اس کے دل میں ایک نئے منصوبے نے جنم لے لیا۔ شیرے کو نجمی سے محبت ہو گئی تھی اس سے پہلے جب بھی زمان اس کی جھوٹ موٹ کی شادی کسی عورت سے کرواتا اور پھر اس عورت کو باہر ایکسپورٹ کر دیتا اور شیرے سے نکاح نامہ لے کر اپنے پاس رکھ لیتا تھا تو شیرے کے دل میں کبھی ایسا خیال نہیں آیا تھا جو اب اس کے

دل میں کروٹیں لے رہا تھا۔ نجمی سے زیادہ خوبصورت لڑکی اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ زمان کے ساتھ مل کر وہ جو عورتیں دوسرے ملک میں ایکسپورٹ کرتا رہا تھا وہ عام طور پر دیہاتی اور ان پڑھ ہوا کرتی تھیں اور شکل و صورت بھی ان کی واجبی ہوتی تھی مگر نجمی ان سب سے مختلف تھی وہ نہ صرف یہ کہ بے انتہا خوبصورت تھی بلکہ پڑھی لکھی بھی تھی یہی وجہ ہے کہ زمان نے اس کی بھاری قیمت ڈالی تھی۔۔۔ مگر شیرے کے ذہن میں ایک دوسرا ہی پروگرام تھا۔ نکاح نامہ ابھی اس کے پاس ہی تھا اس وقت بھی نکاح نامہ شیرے کی جیکٹ میں تھا۔ جیپ ساحل سمندر سے دور اونچے نیچے سنگین ٹیلوں کے درمیان سے گزر رہی تھی چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی آسمان پر ستارے اس طرح نکلے ہوئے تھے جیسے راکھ میں سے کہیں کہیں ادھ بجھے انگارے جھانک رہے ہوں۔ بھرا ہوا پستول شیرے کے کاندھے سے گولیوں کی پٹی کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ اس نے جیپ کی ہیڈ لائٹس بجھا رکھی تھیں۔

جب وہ خفیہ بیرک کے قریب پہنچا تو جیپ کی آواز سن کر چوکیدار ہوشیار ہو گیا وہ سمجھ گیا کہ ان کی ٹولی کا کوئی آدمی رات کے پہرے کے لئے آ رہا ہے جب یہاں کوئی عورت رکھی جاتی تھی تو چوکیدار کے علاوہ بھی زمان کا خاص ایک آدمی وہاں آ کر رات کو پہرہ دیتا تھا پھر بھی چوکیدار ہوشیار ہو کر بیرک کی دیوار کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ بندوق کا رخ جیپ کی طرف تھا اور وہ آنکھیں پھاڑے اندھیرے میں جیپ کے ہیولے کو آگے بڑھتے دیکھ رہا تھا۔ جیپ احاطے میں داخل ہو کر ایک طرف رک گئی۔ چوکیدار نے اپنی جیپ کو پہچان لیا تھا پھر جب شیرا جیپ سے باہر نکلا تو چوکیدار قریب آ کر بولا۔ "جب اتنی رات گزر گئی تھی تو تم نے کیوں تکلیف کی شیرے؟ میں تو یہاں موجود ہی تھا۔"

شیرے نے پستول والی پٹی کاندھے کے اوپر کرتے ہوئے کہا۔ "تم زمان کو نہیں جانتے کیا؟ وہ اصول کا آدمی ہے عجیب عجیب اصول بنا رکھے ہیں اس نے۔۔۔ بہرحال سب ٹھیک ہے نا؟

"بالکل ٹھیک ہے... لڑکی کو دن میں دو بار کھچڑی بھی کھلا دی تھی۔" شاباش! یہ بہت ضروری تھا... لڑکی نے شور تو نہیں مچایا؟" شبیرے نے برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔ چوکیدار بولا۔ "شور تو نہیں مچایا مگر روتی بہت رہی ہے اب تو گہری نیند سو رہی ہے۔"

شبیرا برآمدے میں پاؤں سیڑھی پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ جیب سے اعلیٰ قسم کے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ چوکیدار کو دیا ایک خود سلگایا۔ ہولسٹر میں سے پستول نکال کر اپنے پاس رکھ لیا اور کہنے لگا۔ "اب تو جا کر اپنی کوٹھری میں آرام کر میں پہرہ دینے کے لئے آ گیا ہوں۔"

پہلے بھی جب رات کو زمان کے ساتھیوں میں سے کوئی پہرہ دینے آجاتا تھا تو چوکیدار کو مزے سے سوجانے کا موقع مل جاتا تھا۔ شبیرے کو دیکھ کر وہ اس لئے بھی خوش ہوا تھا کہ اب وہ باقی رات آرام سے بے فکری کی نیند سو سکے گا۔ اس نے شبیرے کو سلام کیا اور سگریٹ کا کش لگاتا رات کے اندھیرے میں اپنی کوٹھری کی طرف چل پڑا اس کی کوٹھری بیرک کے دوسرے سرے میں کچن کے پاس ہی تھی۔ جانے سے پہلے وہ اس کوٹھری کی چابی حسب معمول شبیرے کو دے گیا تھا جس میں نجمی قید تھی۔

چوکیدار جب اپنی کوٹھری میں چلا گیا تو شبیرے نے طویل سانس لے کر آسمان کی طرف دیکھا چھدرے درختوں میں سے آسمان پر بجھے بجھے سے ستارے نظر آرہے تھے چاروں طرف موت ایسا سناٹا طاری تھا۔ شبیرے نے گردن گھما کر ایک نظر نجمی والے کمرے پر ڈالی۔ اس کے دل میں عجیب قسم کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ وہ خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا اور اندھیرے میں پارک کے احاطے میں بند جنگلے کی طرف ٹکٹکی باندھے تکتا رہا۔ اندھیرے میں جنگلے کا ایک خاکہ سا ہی نظر آرہا تھا۔ شبیرا اس انتظار میں تھا کہ چوکیدار گہری نیند سو جائے۔

ایک سگریٹ ختم ہوا تو اس نے دوسرا سگریٹ جلا لیا۔ شبیرے کے دل میں ہزاروں وسوسے اور اندیشے پیدا ہو رہے تھے اسے معلوم تھا کہ اس نے جس

منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ زمان کے ہاتھ بڑے لمبے تھے ملک میں شاید ہی کوئی شہر ایسا تھا جہاں اس کے سفاک ایجنٹ موجود نہ ہوں یہ وہ لوگ تھے جن کا کام ہی ماں باپ سے ناراض، نکھٹو اور ظالم شوہروں اور ساس کے ظلم سے تنگ آئی ہوئی عورتوں کو اپنی پھیلی کٹنیوں کے ذریعے ورغلا کر اغوا کر کے زمان کے خفیہ ٹھکانے پر پہنچانا تھا۔ یہ قاتل قسم کے لوگ تھے اور انسانی جان کی ان کے سامنے کوئی قیمت نہیں تھی۔ خود زمان دو آدمیوں کے خون سے ہاتھ رنگ چکا تھا اور ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے قانون کی گرفت سے آزاد پھر رہا تھا اگر شبیرا اپنے پروگرام پر عمل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر ہر شہر میں اس کی زندگی خطرے میں تھی یہی وجہ تھی کہ اس نے ایک ایسی ترکیب سوچ رکھی تھی کہ زمان کے فرشتے بھی اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے تھے۔ شبیرا چوتھا سگریٹ پی رہا تھا۔

اس نے سگریٹ کو زمین پر پھینک کر پاؤں سے مسلا اور اٹھ کر چوکیدار کی کوٹھری کی طرف آگیا۔ کوٹھری کے اندر اندھیرا تھا۔ شبیرے نے بند دروازے کے ساتھ کان لگایا اندر سے چوکیدار کے خراٹوں کی آواز آئی وہ پستول والی بیلٹ کو کاندھے پر اوپر کرتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا نجمی کی کوٹھری کے پاس آکر رک گیا اس نے جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا پھر آہستہ سے کمرے میں داخل ہو گیا اور دروازہ فوراً بند کر دیا۔ دروازہ بند کرنے کی آواز سے نجمی ہڑبڑا کر جاگ پڑی۔ شبیرے نے جلدی سے کہا۔

"یقین کرو میں کسی بری نیت سے نہیں آیا میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔" کمرے کے طاق میں لالٹین کی لو دھیمی کر دی گئی تھی۔ فضا میں مٹی کے تیل کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ نجمی کے چہرے پر گھبراہٹ تھی سمٹ کر چارپائی کے کونے میں بیٹھ گئی۔ اس کے پاؤں کے ساتھ بندھی ہوئی آدھی زنجیر چارپائی سے نیچے لٹک رہی تھی۔ نجمی نے اس دھیمی روشنی میں بھی جیجا رو شبیرے کو پہچان لیا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جو اس کے لئے بے ہوشی کی دوائی والی چائے لایا تھا۔

نجمی کے دل میں اس کے خلاف نفرت کا ہیجان سا امڈ پڑا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس کا منہ نوچ لے مگر وہ بے بسی کے عالم میں شدید حقارت کے ساتھ اسے دیکھتی رہی آخر اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم نے مجھ سے کس جنم کا بدلہ لیا ہے تم ہی نے مجھے بے ہوشی والی چائے پلائی تھی آخر میں نے تم لوگوں کا کیا بگاڑا ہے۔ ندیم کہاں ہے۔ زمان بھائی کہاں ہے؟ یہ لوگ میری مدد کیوں نہیں کرتے۔" شبیر بڑی احتیاط اور وضع داری کے ساتھ آگے بڑھ کر چارپائی کی پائنتی بیٹھ گیا۔ نجمی نے نفرت سے اپنے پاؤں مزید پیچھے کھینچ لئے۔

"چلے جاؤ یہاں سے نہیں تو میں شور مچا دوں گی تم میرے قاتل ہو، میرے دشمن ہو، ندیم نہیں ہے تو مجھے میرے بھائی زمان کے پاس لے چلو۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" شبیر نے کہا۔

"جس کو تم اپنا بھائی کہہ رہی ہو اسی زمان کے حکم پر میں نے تمہیں بے ہوشی والی چائے پلائی تھی۔" نجمی غصے سے بولی۔

"تم جھوٹ بولتے ہو زمان کبھی ایسا نہیں کر سکتا مجھے بتاؤ ندیم کہاں ہے؟ مجھے اس کے پاس لے چلو۔" شبیر نے نجمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے ایک بات بتاؤ زمان نے تم سے نکاح نامے پر دستخط کرائے تھے ناں تو پھر اس نے ندیم کے ساتھ تمہارا نکاح کیوں نہیں پڑھوایا۔" نجمی نے تلخ لہجے میں کہا۔

"اس لئے کہ نکاح سے پہلے تم مجھے اغواء کر کے یہاں لے آئے ہو۔" شبیر نے کہا۔ "میں زمان ہی کے اشارے پر تمہیں یہاں لایا ہوں مگر میں اکیلا اس جرم میں شامل نہیں ہوں میرے ساتھ زمان بھی اس جرم میں برابر کا شریک ہے جب کہ وہ ہمارا سردار ہے۔ لیڈر ہے اور یہ دیکھو۔"

شبیر نے جیب سے نکاح نامہ نکال کر نجمی کو دکھایا۔ "یہ دیکھو۔ اس نکاح نامے کے ذریعے تمہارا اور میرا بیاہ بھی کر دیا گیا ہے یہ وہی نکاح نامہ ہے جس پر زمان نے دھوکے سے تمہارے دستخط کروائے تھے شرعی طور پر اب تم میری بیوی ہو گئی ہو۔۔۔"

نجمی غصے سے پھٹ پڑی۔

"یہ جھوٹا نکاح نامہ ہے میں اس نکاح کو نہیں مانتی یہاں سے نکل جاؤ، نکل جاؤ۔"

اور نجمی چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر زار و قطار رونے لگ پڑی۔ شبیر نے دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ چوکیدار وہاں نہیں تھا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور قریب آ کر زمین پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"نجمی میں تمہاری مدد کرنے آیا ہوں میں اپنی زندگی داؤ پر لگا رہا ہوں کیونکہ تمہاری مدد کرنے کا مطلب اپنی موت کو آواز دینا ہے لیکن میں تمہیں بچانے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔" نجمی دوپٹے سے آنسو پونچھنے لگی پھر اس نے آنسوؤں بھری آواز میں کہا۔ "تم مجھے گڑھے سے نکال کر کنوئیں میں گرا دو گے آخر تمہیں میری مدد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

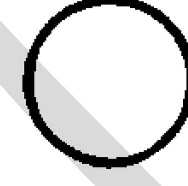
شبیر بولا۔۔۔ "یہ میں تمہیں بعد میں بتا دوں گا لیکن اس وقت میری بات دھیان سے سنو پرسوں یہ لوگ تمہیں یہاں سے اسمگل کر کے ایک ایسے ملک میں پہنچا دیں گے جہاں۔۔ رہ کر بڑی بد قسمتی کی زندگی بسر کرو گی تم وہیں بوڑھی ہو جاؤ گی اور تمہارا کوئی پوچھنے والا نہیں ہو گا تم وہاں سے فرار بھی نہیں ہو سکو گی اگر تم اپنی زندگی کو تباہ ہونے سے بچانا چاہتی ہو تو جیسا میں کہتا ہوں ویسا کرو اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔"

"تم۔۔ تم کیا چاہتے ہو؟" نجمی نے قدرے توقف کے بعد پوچھا نجمی کو تھوڑا بہت رضامند دیکھ کر شبیر کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس نے نکاح نامہ تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا تھا وہ کہنے لگا۔

"میں تمہیں یہاں سے نکال کر یہاں سے بہت دور ایک ایسے شہر میں لے چلوں گا جہاں تم آزادی اور سکھ چین سے رہ سکو گی اگرچہ اس نکاح نامہ کی رو سے تم قانونی طور پر میری بیوی ہو مگر میں تمہاری مرضی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا بولو! کیا تم میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو؟"

نجمی نے سوچا کہ اس شخص کی وساطت سے کم از کم اس قید سے تو چھٹکارا حاصل کرنا چاہیئے یہاں سے نکلنے کے بعد وہ اس چیچک رو سے بھی نجات حاصل کرے گی

یہ جس شہر میں بھی اسے لے کر جائے وہاں وہ پولیس کو خبر کر سکے گی شور مچا دے گی لوگوں کو اکٹھا کرے گی اس نے شیرے سے کہا "میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔" شیرے کے چیچک کے داغ ایک انوکھی مسرت کے ساتھ پھیل گئے وہ جلدی سے اُٹھ کر دروازے کی طرف گیا۔



شیرا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اس نے دروازہ بند کر کے تالا لگایا اور برآمدے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اس وقت رات کے دو بجنے والے تھے۔ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ پہرہ دینے کے انداز میں ٹہلتا ہوا چوکیدار کی کوٹھڑی تک گیا۔ کوٹھڑی کا دروازہ بند تھا۔ چوکیدار گہری نیند سو رہا تھا اس کی طرف سے تسلی کر لینے کے بعد شیرا تیز تیز چلتا نجمی کے کمرے میں واپس آگیا۔

نجمی چارپائی کے کونے میں سر جھکائے بیٹھی گہری سوچ میں گم تھی۔ اسے امید کی ایک کرن دکھائی دی تھی۔ اس شخص کے ذریعے نہ صرف وہ وہاں سے فرار ہو سکتی تھی بلکہ اپنی زندگی کو تباہی کے دلدل میں گرنے سے بچا سکتی تھی۔ شیرا دروازے کو چٹخنی لگا کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"میں تمہاری خاطر بہت بڑا خطرہ مول لے رہا ہوں۔ اگر زمان کے کانوں میں ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی کہ میں نے تمہیں یہاں سے نکال لے جانے کا منصوبہ بنایا ہے تو وہ ایک سیکنڈ ضائع کئے بغیر مجھے مروا دے گا تم سوچ رہی ہو گی کہ آخر میں اپنی زندگی داؤ پر کیوں لگا رہا ہوں۔ اس کی وجہ صاف صاف لفظوں میں یہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تمہیں اپنی بیوی بنا کر باقی زندگی شریف لوگوں کی طرح بسر کر دوں۔"

نجمی نے حقارت سے کہا "میں۔ میں تمہاری بیوی نہیں ہوں ہرگز نہیں ہوں۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

شیرے نے کہا۔ "نجمی! تمہیں ابھی اس کا اندازہ نہیں ہے کہ تمہارے ساتھ ابھی کیا ہونے والا ہے۔ زمان تم ایسی کتنی ہی عورتوں کی زندگیاں برباد کر چکا ہے انہیں اغوا کر کے دوسرے ملک میں فروخت کر دیا گیا ہے اور آج تک ان کا کچھ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کس حالت میں ہیں اور کیسی عذاب کی زندگی گزار رہی ہیں۔ تمہیں بھی دوسرے ملک میں بیچ دیا جائے گا۔ سوچ لو کہ وہاں تمہاری حیثیت کیا ہو گی۔ پھر تم پچھتاؤ گی کہ تم نے شیرے کی بات نہ مان کر کس قدر غلطی کی تھی۔"

نجمی نے سر جھکایا ہوا تھا۔ وہ بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ وہ اس شخص کی بیوی بن کر زندگی گزارنے سے موت کو ترجیح دیتی تھی لیکن اس نے سوچا کہ اس وقت یہاں سے فرار ہونا بڑا اہم ہے۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔ پھر بھی اس نے شیرے سے کہا۔ "میں ایک شرط پر تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔"

"وہ شرط کونسی ہے؟ مجھے بتاؤ۔" شیرے نے سانس بھرتے ہوئے کہا۔

نجمی بولی۔ "شرط یہ ہے کہ تمہیں مجھ سے بیاہ کرنے کے لئے میری مرضی حاصل کرنی ہو گی۔ اس نکاح نامے پر میں نے ندیم سے شادی کرنے کے لئے دستخط کئے تھے۔" شیرے نے بھی سوچا کہ جب یہ اس کے ساتھ چلنے پر تیار ہو گئی ہے تو شادی پر بھی راضی ہو جائے گی۔ وہ اسے اپنے سے الگ تو ہونے نہیں دے گا۔ آخر اسے اس کے پاس ہی رہنا ہے۔ اس نے کہا۔

"مجھے منظور ہے۔" نجمی نے ایک دم سے ندیم کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ شیرے نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"جو مرد عورت کی حفاظت نہیں کر سکتا وہ بھی کوئی اس قابل ہے کہ تم اسے یاد کرو وہ بزدل تھا تمہارے اغوا کا سن کر زمان سے کہنے لگا کہ خدا کے لئے پولیس کو خبر نہ کرنا اور کان لپیٹ کر لاہور بھاگ گیا۔"

نجمی نے سوال کیا۔ "کیا ندیم کو معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے اس کے دوست زمان نے اغوا کروایا ہے؟"

شبیرے نے کہا۔ ”زمان نے ایسا چکر چلایا کہ تمہارے بارے میں یہ مشہور کر دیا کہ تم اپنی مرضی سے کہیں چلی گئی ہو اور خود کو ندیم کے آگے بے قصور اور معصوم ظاہر کر کے پیش کیا تم اس مکار شخص سے واقف نہیں ہو۔ وہ کتنی عورتوں کی زندگیاں تباہ کر چکا ہے۔ مگر وہ قانون کے ہاتھ سے بچ نہ سکے گا۔ خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ میں جو کہتا ہوں اسے غور سے سنو۔“

پھر شبیرے نے نجمی کو بتایا کہ وہ کل رات اسے وہاں سے نکال کر لے جائے گا۔ آدھی رات کے وقت پہرہ دینے کے بہانے وہاں آئے گا اور اس کو لے کر وہاں سے فرار ہو جائے گا۔ ”میں خود تمہارے ساتھ اس گناہ کی دلدل سے فرار ہو جاؤں گا۔ میں اس زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ تمہاری صورت دیکھی تو میرے دل میں نیکی کا خیال پیدا ہو گیا۔ میں نے تمہیں دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ تمہیں تباہی کے غار میں نہیں گرنے دوں گا مجھے چوکیدار کا خطرہ ہے کہ وہ نہ آ جائے۔

اگر اس نے مجھے تم سے باتیں کرتے دیکھ لیا تو فوراً لیڈر زمان کو خبر کر دے گا اور وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد جو باہر جاتا تھا تو چوکیدار کو دیکھنے ہی جاتا تھا کہ اپنی کوٹھری میں سو رہا ہے؟ ایک بات کا خاص خیال رکھنا میرے اور تمہارے درمیان جو باتیں ہوئی ہیں اس کا کسی تیسرے کو علم نہیں ہونا چاہیئے تم میری بات کو سمجھ رہی ہو نا؟“

نجمی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ شبیرا مسکرایا۔ شاباش! تم بڑی اعلیٰ ضمیر کی لڑکی ہو تم نے سچ مچ میری زندگی بدل کر رکھ دی ہے۔ ورنہ میں جانے کب تک گناہ کی اس دلدل میں پھنسا رہتا۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔ کل میری پہرے کی ڈیوٹی بھی ہے۔ مگر میں تمہارے پاس اس وقت آؤں گا جب چوکیدار سو گیا ہو گا۔“

اتنا کہہ کر شبیرا جلدی سے باہر نکل گیا۔ باہر آتے ہی اس نے دروازہ بند کر کے تالا لگایا اور برآمدے سے اتر کر سامنے چل پھر کر پہرہ دینے لگا۔ وہ اپنے ذہن میں بہت سی باتیں سوچ رہا تھا۔ کل یہاں آنے سے پہلے اسے کتنے ہی ضروری

کام کرنے تھے اپنے بہت سے رازدار دوستوں سے ان کی خفیہ جگہوں پر جا کر ملنا تھا شبیرے کو یقین تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ ایک انتہائی حسین لڑکی اس کی بیوی بننے والی تھی اس نے دل میں سوچ لیا تھا کہ وہ ایک بار نجمی کو لے کر نکل گیا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت نجمی کو اس سے الگ نہیں کر سکے گی۔ نجمی اگر خود بھی چاہے گی تو شبیرے کو نہ چھوڑ سکے گی۔ دوسری بار نکاح پڑھوانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نکاح نامے کے ذریعے نجمی اس کی بیوی بن چکی تھی۔

شبیرے نے سر کو ہلکا سا جھٹک کر خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اس گروہ کی زندگی سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کر لے گا اور اپنی خوبصورت بیوی کے ساتھ نئے شہر میں نئی جگہ پر نئی زندگی شروع کر سکے گا۔ وہ برآمدے میں سیڑھیوں میں بیٹھ گیا۔ جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور اس کے کش لگاتے ہوئے کل اپنے پراسرار دوستوں سے ملنے کے بارے میں غور کرنے لگا۔

چند قدموں کے فاصلے پر کمرے کے اندر نجمی بھی جاگ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کل رات وہ اس جہنم سے نکل جائے گی۔ ندیم کے بارے میں شبیرے نے اسے جو کچھ بتایا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ زمان کے دوست کش کردار کے بارے میں اسے یقین آ گیا تھا۔ مگر ندیم اسے چھوڑ کر بھاگ گیا ہو گا اس پر یقین کرنے کو اس کا دل نہیں مانتا تھا۔ ندیم ضرور ابھی تک کراچی میں ہی ہو گا اور اس کی تلاش میں پولیس کے ساتھ سرگرداں ہو گا۔

وہ یہاں سے نکلتے ہی شبیرے کے چنگل سے بھی نکل بھاگے گی اور کسی نہ کسی طرح ندیم تک پہنچ جائے گی وہ پڑھی لکھی لڑکی ہے کسی کوٹھی میں گھس کر وہاں کے لوگوں کو اپنا حال نہ بتا کر ان سے تعاون کی درخواست کرے گی وہ وہاں سے انسپکٹر جنرل پولیس کو فون کر دے گی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کے بارے میں پولیس کو خبر تک نہیں کی گئی۔ ندیم کو ایسا کرنا چاہیئے تھا مگر اس نے بھی ڈر کے مارے اور اپنی گرفتاری کے خوف سے ایسا نہیں کیا۔ بہرحال ایک بات کا اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔

کہ وہ کل رات شیرے کے ساتھ وہاں سے فرار ہو جائے گی اور اس کے بعد اس کی پہلی کوشش یہ ہو گی کہ ذرا سا موقع ملتے ہی وہ شیرے کے جال سے بھی نکل بھاگے باہر شیرا اٹھ کر ٹہلنے لگا تھا۔ رات کے دو بجکر پندرہ منٹ ہو گئے تھے۔ شیرے نے اپنی کلائی کی گھڑی کو آستین سے رگڑ کر صاف کیا اور ایک اور سگریٹ سلگا لیا جب چار بجے تو پو پھٹ رہی تھی مشرق کی جانب افق پر نیلی روشنی کا غبار پھیلنے لگا تھا۔ شیرا اب واپس اپنی بیٹھک پر جا کر سو جانا چاہتا تھا تاکہ وہ بارہ بجے دن تک پوری نیند کر لے اور پھر اپنا کام شروع کر دے اس نے چوکیدار کو جا کر جگایا اور کہا۔ "چل بھئی صبح ہو گئی ہے اب تو ڈیوٹی سنبھال میں جا رہا ہوں۔"

چوکیدار آنکھیں ملتا کوٹھری سے باہر نکل آیا۔ "شیرے بھائی ابھی تو دن نہیں نکلا"۔ شیرے نے اسے جھڑک کر کہا۔

"تیرا دن کب نکلتا ہے؟ دیکھ کتنی روشنی ہو گئی ہے۔ سن اس عورت کو ناشتہ کرا دینا اور اچھی طرح خبر گیری کرنا۔ وہ بھاگ گئی تو تیری خیر نہیں۔"

چوکیدار نے جمائی لے کر کہا۔ "پہلے یہاں سے کبھی کوئی بھاگی ہے کیا؟ تم بے فکر ہو کر جاؤ اور آرام کرو۔" شیرے نے جیپ باہر نکالی اور اپنی بیٹھک کی طرف روانہ ہو گیا۔ سارا راستہ وہ اپنے پروگرام پر غور کرتا رہا۔

اس کا پروگرام بڑا خطرناک تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ساری رات جاگتے رہنے کے باوجود شیرے کی نیند غائب تھی اور اپنے منصوبے کے ایک ایک پہلو پر سوچ بچار کر رہا تھا۔ اس کے دوست اس کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ یہ سارے لوگ ناجائز کاروبار میں ملوث تھے۔ وہ بدمعاش قسم کے لوگ تھے مگر ان کی دوستیاں بڑی پکی تھیں۔ وہ اپنی بات کے دھنی تھے اور دوستوں کی خاطر جان قربان کرنے پر بھی تیار ہو جاتے تھے شیرے نے کافی سوچنے کے بعد ان میں سے ایک دوست ماکھن کا انتخاب کر لیا تھا۔ ماکھن شیرے کا پرانا دوست تھا۔ کئی باتوں میں اس کا راز دار بھی تھا بڑا دلیر نڈر اور دوستوں کا دوست، یاروں کا یار تھا۔

شیرا اس پر بھرپور اعتماد کر سکتا تھا اور ماکھن ہی واحد آدمی تھا جو اس مصیبت میں شیرے کے کام آ سکتا تھا۔ جیپ کراچی شہر کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ شہر صبح کی روشنی کے ساتھ بیدار ہو رہا تھا۔ شیرا شہر کی مختلف سڑکوں پر سے ہوتا ہوا ایک گنجان آبادی میں آ گیا۔ یہاں اس کا مکان تھا جہاں وہ اکیلا رہتا تھا۔ اس کے اکیلا رہنے پر کسی کو اس لئے اعتراض نہیں تھا کہ شیرا محلے میں بے حد شریف بن کر رہتا تھا۔ صبح گھر سے نکلتا اور کہیں رات کو بارات گئے واپس آتا تھا۔ ہر ایک سے جھک کر بڑے اخلاق سے ملتا تھا۔

جیپ گلی میں کھڑی کر کے وہ اپنی بیٹھک میں آ کر چارپائی پر پڑ گیا پھر ایسا سویا کہ جب آنکھ کھلی تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اٹھ کر جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا محلے کے ریستوران میں جا کر ناشتہ کیا اور پھر مکان کو تالا لگا کر جیپ میں سوار ہو کر سیدھا زمان کے ہوٹل میں آ گیا۔

زمان کاؤنٹر پر بیٹھا رجسٹر میں کچھ لکھ رہا تھا۔ شیرا خاموشی سے کرسی کھینچ کر قریب بیٹھ گیا اور نوکر سے چائے لانے کو کہا۔ زمان اپنے کام میں لگا رہا۔ پھر رجسٹر کو بند کر کے دراز میں رکھتے ہوئے بولا۔

"مال کی کیا پوزیشن ہے شیرے نے زمان کی طرف دیکھے بغیر کہا" "ٹھیک ہے استاد بالکل ٹھیک ہے۔ صبح ناشتہ بھی کرا دیا تھا۔" زمان نے ایک جگہ فون کیا اور آہستہ آہستہ بات کرنے لگا۔ شیرے کو معلوم تھا کہ زمان کہاں فون کر رہا ہے۔ زمان دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا۔

"کل کی بجائے اگر آج رات ہی لانچ کا انتظام ہو جائے تو اچھا ہے۔" شیرا جیسے سناٹے میں آ گیا۔ اگر لانچ کا آج رات انتظام ہو گیا تو اس کا سارا پروگرام نہس نہس ہو جائے گا وہ کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ پھر انگلیاں چٹخانی شروع کر دیں۔ نوکر چائے کا کپ لے آیا۔ شیرے نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ نوکر نے اس کے پاس ہی کاؤنٹر پر کپ رکھا اور چلا گیا ہوٹل میں کھانے کا وقت ہو رہا تھا اس لئے

نفی میں وقت تھی شبیرا زمان کو دھوکہ بھی نہیں دے سکتا تھا وہ مالک تھا لیڈر تھا۔ سارا دھندا تو اس کا تھا۔ شبیرے اور لوٹی کو تو ہر ماہ تنخواہ کے عوض کچھ رقم مل جاتی تھی۔ زمان فون پر کہہ رہا تھا۔ "ہاں ہاں کیا کہا! آج رات بندوبست نہیں ہو سکتا؟" تو پھر ٹھیک ہے کل رات ہی سہی مگر لانچ کو وقت پر وہاں موجود ہونا چاہیئے پولیس کی نظروں سے بچنا بڑا مشکل کام ہے لیکن تم پرواہ نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" شبیرے کی جان میں جان آ گئی اس کا منصوبہ تباہ ہوتے ہوتے بچ گیا تھا۔

اب اس نے کاؤنٹر پر سے کپ اٹھایا اور آہستہ آہستہ چائے کے گھونٹ نگلنے لگا۔ اس نے ساتھ ہی سگریٹ بھی سلگا لیا۔ وہ خوش تھا کہ اس کے سر سے ایک بہت بڑی بلا ٹل گئی تھی۔ زمان نے ٹیلی فون بند کر دیا اور شبیرے سے کہنے لگا "آج رات ہی مال کو ڈسپوز کر دیا جاتا تو اچھا تھا مگر ان لوگوں کے بھی اپنے اوقات ہوتے ہیں ایجنٹ نہیں مانا۔"

پھر کاؤنٹر پر شبیرے کی طرف ذرا آگے کو جھک کر بولا۔ "پچاس ہزار پر سودا طے ہوا ہے۔ بس تھوڑی دیر میں ان کا آدمی آ کر دے جائے گا باقی کی رقم تم مال کو لانچ میں سوار کرانے سے پہلے وصول کر لینا۔ وہ مال کو دیکھ کر باقی کی رقم ادا کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی بات نہیں دیکھیں گے تو بڑے خوش ہوں گے۔ ارے وہ تو بچی کے دو لاکھ سے کم وصول نہیں کریں گے اس بار بھی مال لے کر تم ہی جاؤ گے۔"

شبیرے نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں لیڈر تمہارے لئے تو اپنی جان بھی حاضر ہے۔" زمان نے شبیرے کی طرف گھور کر دیکھا اور کہا "کیا بات ہے زیادہ وفاداری کیوں جتا رہے ہو؟" شبیرے کے حلق میں جیسے پھانس سی اٹک گئی جلدی سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"بس استاد! کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ تیرے لئے میرے دل میں جو محبت ہے اسے بیان کروں۔ تمہارے ہم پر احسان بھی تو بہت ہیں ورنہ اس وقت ہم جیل کی ہوا کھا رہے ہوتے۔" زمان نے دراز میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور بولا۔

"پیارے ہم تو اصول کے آدمی ہیں جب تک ہمارا آدمی اصول کے مطابق کام کرتا رہے گا ہم بھی اس پر اپنی جان چھڑکیں گے۔ اصول کے خلاف چلا تو پھر اس کی جان کی خیر نہیں۔" ٹیلی فون کی گھنٹی بول پڑی۔ زمان نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا پھر آواز کو ایک دم فکر مند بناتے ہوئے بولا۔

"ندیم بھائی تم ہو؟ ہاں ہاں۔ میں سمجھ گیا۔ کیا؟ وہ لاہور میں بھی نہیں ہے؟ میرے خدا۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو پھر وہ شخص کہاں چلا گیا؟ ندیم! میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ میں تمہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔ نہیں نہیں تم چاہے کچھ کہو مگر میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ میں تو اب بھی تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ تمہیں پولیس کو خبر کر دینی.... کیا؟ ہوں۔ ہوں اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ویسے میرے آدمی صبح سے شام تک اسے ڈھونڈنے میں لگے ہوئے ہیں۔ شہر کا کوئی ایسا کونہ نہیں جو انہوں نے نہ چھان مارا ہو۔ اب میں کچھ لوگوں کو حیدر آباد دوڑا رہا ہوں۔

نہیں نہیں ندیم بھائی۔ یہ تو میرا فرض ہے آخر مجھے بھی ایک روز قبر میں جانا ہے میں خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا.... ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں تمہیں فون نہیں کر دوں گا۔ تم ہی کال کر کے پتہ کر لینا۔ خدا حافظ۔" زمان نے ریسیور رکھتے ہوئے شبیرے کی طرف آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ شبیرے نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔ زمان بولا۔

"تم سمجھ گئے ہو گے ایسا احمق لڑکا بھی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ ویسے ہمیں بیٹھے بٹھائے عمدہ مال ہاتھ لگ گیا۔ لوٹی کو میں نے بیرک پر پہرہ دینے کے لئے بھیج دیا ہے۔ رات کو کون جائے گا وہاں۔ شبیرے نے ایک لمحے توقف کے بغیر کہا۔

"میں ہی جاؤں گا رات کی ڈیوٹی سے سب ہی کتراتے ہیں۔" اس پر زمان نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر آج رات میں خود پہرہ دوں گا۔" شبیرے کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اس نے تو ویسے ہی یہ بات کہہ دی تھی فوراً بولا۔

"نہیں استاد تمہیں تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ آخر ہم کس لئے ہیں۔ میں

ہی پہرہ ڈیوٹی دوں گا۔" زمان نے مزید فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"اس میں تکلیف کی کونسی بات ہے؟ یہ تو تمہارا فرض ہے کیا میں تمہیں تنخواہ کے علاوہ سودے میں سے کمیشن نہیں دیتا؟ جتنی میں تم لوگوں کو کمیشن دیتا ہوں کوئی اور دے سکتا ہے؟" شیرا تو منہ سے بات نکال کر پھنس گیا تھا کہنے لگا۔

"تم تو ناراض ہو گئے استاد۔ ایسی بات نہیں ہے۔ میں نے ویسے ہی بات کی تھی۔ میں خوشی سے رات کو پہرہ دوں گا۔" زمان نے ایک دم شیرے کو ڈانٹ دیا۔ "بس بس۔ میں تم سب کو جانتا ہوں تم سب ہڈ حرام ہو گئے ہو۔ اب سارے کام میں خود ہی کیا کروں گا۔ آج رات بیرک پر میں خود پہرہ دوں گا۔" یہ کہہ کر زمان اٹھ کر ہوٹل کے اندر چلا گیا۔

شیرے کو کئی قسم کی پریشانیوں نے گھیر لیا۔ زمان نے اس کا سارا پروگرام الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا تھا کسی نے سچ کہا ہے کہ انسان کو فالتو بات زبان سے نہیں نکالنی چاہیئے۔ شیرا اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ اسے کیا ضرورت تھی ایسی بات کہنے کی۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ زمان کی طبیعت سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ اب اسے دنیا کی کوئی طاقت رات کو پہرہ دینے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ شیرا بھی اس کا شاگرد تھا۔

وہ بھی نجمی کو اس رات بیرک سے نکال کر لے جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ یہ اس کی زندگی کا سب ، اہم موڑ تھا۔ وہ ایک زندگی کو چھوڑ کر دوسری نئی زندگی شروع کرنے والا تھا۔ نجمی جیسی لڑکی اسے دوبارہ کبھی نہیں مل سکتی تھی۔ دنیا میں کسی نجمی کا باپ نجمی اس کے حوالے کرنے کو تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی نجمی کا باپ یہ یقین کرنے کو تیار نہیں ہو سکتا تھا کہ شیرا اس کی بیٹی سے شادی کے بعد شریفانہ زندگی شروع کر دے گا۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ شیرا اس سنہری موقع کو ہاتھ سے جانے دیتا؟

زمان کے جانے کے بعد وہ سگریٹ پھینکتا ہوا اٹھا اور ہوٹل سے نکل کر باہر

اپنی جیپ کے پاس آ گیا۔ اس نے اپنے منصوبے پر اسی طرح عمل شروع کر دیا جیسا کہ اس نے سوچ رکھا تھا۔ شیرے نے جیپ کا رخ اپنے جگری دوست ماکھن کے ڈیرے کی طرف موڑ دیا دن کے بارہ بجنے والے تھے۔ شیرے کی جیپ ہائی وے پر آتے ہی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

شیرے کے ذہن نے ہائی وے پر آتے آتے اسے ایک ایسی ترکیب عطا کر دی تھی کہ جس پر عمل کرنے سے سانپ بھی مر جاتا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹتی تھی۔ شیرا اپنے لیڈر زمان کو ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جو گڑ کھانے سے مر جائے اسے زہر دینے کی ضرورت نہیں تھی ترکیب اچھی تھی اس پر عمل کیا جا سکتا تھا۔ ہاں اگر یہ ترکیب کسی وجہ سے فیل ہو جاتی ہے تو شیرے نے سوچ رکھا تھا کہ وہ اپنی نئی زندگی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والے کے قتل سے بھی گریز نہیں کرے گا۔

ماکھن کے ڈیرے پر وہ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد پہنچا۔ ماکھن نے اٹھ کر شیرے کو گلے لگایا۔ اس کی بانہہ میں بانہہ ڈال کر اندر لے گیا اپنے آدمیوں کو کھانا لانے کا حکم دیا۔ دونوں دوستوں نے کھانا کھایا پھر ماکھن نے شیرے سے پوچھا۔

"اب بتا سائیں کیسے تکلیف کی میرے ڈیرے پر آنے کی۔" شیرے نے ماکھن کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا اور کہا کہ یہ اس کی زندگی کا آخری سنہری موقع ہے اس کے بعد شاید ایسا موقع پھر کبھی نہیں آئے گا۔ ماکھن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

سائیں موقع تو زندگانی میں آتے ہی رہتے ہیں ہاں اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو میں تمہاری خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ تم جیسے کہو گے ویسے ہی ہو گا۔ شیرے نے ماکھن کا ہاتھ شدت جذبات سے تھام لیا اور بولا۔

"ماکھن سائیں! میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔" ماکھن نے کہا۔

"کیسی بات کرتے ہو شیرے۔ ارے تم ہمارے دوست ہو اور دوست کے لئے تو ہماری جان بھی حاضر ہے۔ یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہے یہ کام تو ہم پیسے لے کر ایرے غیرے کے لئے کر دیتے ہیں تمہارے لئے نہیں کریں گے بھلا؟ تم ایسا

کرنا کہ رات کو اپنی عورت کو لے کر میرے ڈیرے پر آجانا۔ میں تمہیں اسی جگہ ملوں گا مگر تمہاری یہ عورت شور وغیرہ تو نہیں مچائے گی نا؟"

"ارے نہیں ماکھن سائیں۔" شیرے نے کہا۔

"وہ تو میرے ساتھ چلنے کو بالکل تیار ہے۔ یہ دیکھو ہماری تو شادی بھی ہو چکی ہے۔" اور شیرے نے ماکھن کو نکاح نامہ نکال کر دکھایا۔ ماکھن بولا۔

"مجھے تمہاری زبان پر اعتبار ہے سائیں۔ مگر تم کہہ رہے تھے نا کہ یہ نکاح عورت کی مرضی کے بغیر ہوا ہے۔" شیرے نے فوراً کہا۔

"مگر اب وہ میرے ساتھ چلنے پر راضی ہے۔ ماکھن نے ہنس کر کہا۔

"راضی ہے تو پھر جھگڑا کس بات کا ہے تم فکر نہ کرو بس اسے لے کر رات کو یہاں آجاؤ۔ میں خود تمہیں ساتھ لے کر چلوں گا۔" شیرے نے کان میں دیا سلائی چلاتے ہوئے کہا۔

"آگے دبئی کے لئے کتنے روپوں کی ضرورت ہوگی؟" ماکھن نے شیرے کے کاندھے کو ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہوش کرو سائیں شیرے ہوش کرو۔ تم اپنے یار ماکھن کے ساتھ جا رہے ہو۔ تم سے کون مائی کا لال پیسہ لے گا تم اپنے لئے جتنی چاہے رقم لے آنا میرے لئے کسی پیسے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" شیرا چار بجے تک ماکھن کے پاس ہی رہا۔ اس نے اس دوران ساری تفصیلات طے کر لیں اور پھر دونوں دوست بغلگیر ہو کر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ شیرا جیپ میں بیٹھ کر واپس شہر کی طرف چل پڑا۔ اب اسے اپنی دوسری اسکیم پر عمل کرنے کی تیاریاں شروع کرنی تھیں۔

وہ سیدھا ہوٹل میں آگیا۔ ہوٹل میں زمان نے شیرے وکی اور لڈی کو ایک کمرہ دے رکھا تھا جہاں وہ ضرورت کے وقت رات کو بھی سو جاتے تھے اور دن کے وقت بھی موجود رہتے تھے۔ اس کی ایک ایک چابی تینوں کے پاس رہتی تھی۔ زمان کاؤنٹر پر نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں آرام

کر رہا ہے۔ یہ ہوٹل اصل میں زمان ہی کی ملکیت تھی لیکن اس نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ ہوٹل کا مالک اس کا ایک دوست ہے جو دبئی میں رہتا ہے اور وہ اس کا منیجر ہے۔ شیرا تیسری منزل پر واقع اپنے مشترکہ کمرے میں آگیا۔ اس کمرے میں شیرے کا ایک ٹرنک پڑا تھا جس میں وہ اپنی ضرورت کی چیزیں رکھا کرتا تھا۔ اس نے جیب سے چابی نکال کر ٹرنک کا تالا کھولا اور اس میں سے ایک کیپسول ڈبی میں سے نکال کر ہتھیلی پر رکھا اور مسکرانے لگا۔ پھر اس نے کیپسول کو کھول کر اس کا زرد رنگ کا سفوف کاغذ پر ڈال دیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ ایسے ہی ایک کیپسول کا آدھے سے بھی کم سفوف شیرے نے نجمی کی چائے کی پیالی میں ڈالا تھا جس کے دو گھونٹ پینے کے بعد وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔

شیرے نے سفوف کو دوبارہ کیپسول میں بند کر دیا اس کو اپنی جیکٹ کی اندر والی جیب میں سنبھال کر رکھا اور ٹرنک کو تالا لگا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ وہ اس منظر کو اپنی آنکھوں کے سامنے لے آیا جو آج رات خفیہ کمین گاہ والی بیرک میں پیش آنے والا تھا۔ شیرے نے بھرا ہوا پستول بھی اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ اسے پہلے بے ہوشی کا زود اثر سفوف اور اگر ضرورت پڑی تو پھر پستول کو استعمال کرنا تھا۔ صرف ایک بات کی اسے الجھن سی لگی تھی کہ کہیں نجمی نے اپنا ارادہ تبدیل نہ کر دیا ہو۔

پھر وہ سوچنے لگا کہ یہ لڑکی زنجیر سے بندھی قید میں پڑی ہے اسے معلوم ہے کہ وہ بردہ فروشوں کے ہاتھوں بکنے والی ہے پھر وہ کیسے شیرے کے ساتھ جانے کا ارادہ بدل لے گی! پھر بھی شیرا کچھ دیر پہلے نجمی سے مل لینا چاہتا تھا مگر صورتحال ایسی پیدا ہو گئی تھی کہ اب وہ عین وقت پر ہی اس کے پاس جا سکتا تھا اسی ادھیڑ بن میں وقت گزرتا گیا۔

شیرے کو نیند بالکل نہیں آرہی تھی۔ باہر دن ڈھلنے لگا تو شیرے نے [illegible] غسل کیا اپنے ٹرنک میں پڑی تمام چیزوں کا جائزہ لیا۔ اس میں سے اس نے [illegible] ایک کنگھی اٹھا کر اپنی جیب میں رکھی اور ٹرنک کو تالا لگا دیا۔ پھر اپنی جیکٹ [illegible]

جیبوں کو چیک کیا۔ بھرا ہوا پستول اور کیپسول موجود تھا۔ اس کے بٹوے میں صرف سوا سو روپے تھے۔ اسے مزید روپوں کی ضرورت تھی جس کے لئے اسے کراچی ہی میں اپنے ایک اور بزرگ دوست کے پاس جانا تھا کمرے کو تالا لگا کر شیرا جیپ میں بیٹھا اور اپنے بزرگ دوست کی دکان کی طرف چل پڑا۔ اس بزرگ دوست کی، عینکوں کی دکان تھی۔ شیرا اس کے پاس پیسے رکھوا دیا کرتا تھا۔ اس کے پاس شیرے کی چھ ہزار روپے کی رقم جمع تھی۔ وہ اس نے اپنے دوست سے لے کر رومال میں باندھ کر جیب میں رکھی اور واپس ہوٹل میں ہی آگیا۔

شام ہو رہی تھی۔ زمان ابھی تک اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ شیرے کو بے چینی لگی تھی آج کی رات اس کی زندگی کی بڑی اہم رات تھی۔ اس رات نے شیرے کی زندگی کا پلٹ کر رکھ دینی تھی۔ وہ پچھتا بھی رہا تھا کہ اس نے منہ سے ایسی بات کیوں نکالی کہ جس کے جواب میں زمان کو خود رات کی ڈیوٹی دینے کے لئے تیار ہونا پڑا شیرا ہوٹل کے کاؤنٹر کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اگرچہ یہ ہوٹل ناموزوں جگہ پر تھا پھر بھی یہاں مسافر آتے جاتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی ایک مسافر اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ شیرے کو پتہ تھا کہ زمان رات کے نو بجے سے پہلے خفیہ بیرک میں پہرہ دینے کے لئے نہیں جائے گا۔ وہ چائے کا کپ منگوا کر پینے لگا۔

جب رات ہو گئی تو زمان سیڑھیوں پر نظر آیا۔ اس نے نیلی جین اور اسی رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ رات کی ڈیوٹی دینے کے لئے تیار ہو کر آیا تھا۔ شیرے نے ایک بار پھر اپنی قسمت آزمانی چاہی۔ زمان کاؤنٹر پر آکر بیٹھا تو شیرے نے ہنس کر کہا۔

"استاد کیا تم واقعی رات کی ڈیوٹی دو گے؟ میں تو یونہی مذاق کر رہا تھا۔"

زمان نے سگریٹ کیس میں سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور بولا۔

"میرا تمہارا مذاق بالکل نہیں ہے شیرے تم میرے ماتحت ہو اور میں تمہارا

باس ہوں۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے باس۔" شیرے نے فوراً جواب دیا "تو پھر کان کھول کر سن لو۔ آج اور آج کے بعد تم بیرک پر کبھی رات کی ڈیوٹی نہیں دو گے۔"

شیرے نے دل میں کہا، پیارے آج کے بعد ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔ تم خوش قسمت ہو کہ میں نے صرف تمہیں بے ہوش کرنے کا ہی فیصلہ کیا ہے ورنہ یہ تمہاری آخری شام ہوتی۔ یہ شیرے کے دل کے خیالات تھے۔ اس نے اوپر سے کہا۔

"ٹھیک ہے باس۔ جیسا تم کہو گے ویسا ہی ہو گا۔" رات پورے نو بجے زمان اپنی جیپ میں بیٹھ کر اس خفیہ بیرک کی طرف روانہ ہو گیا جہاں نجمی قید تھی۔ شیرا برابر اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ اس نے زمان کو اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے جیپ میں بیٹھ کر جاتے دیکھ لیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد شیرا نیچے اتر آیا۔

اس نے کھانا منگوا کر کھایا پھر سگریٹ کے دو نئے پیکٹ منگوا کر جیبوں میں رکھ لئے اسے معلوم تھا کہ اسے کیسا سفر درپیش ہے اور کہاں سے کہاں تک اسے سگریٹ تو کیا شاید پانی بھی نہیں ملے گی۔ جوں جوں رات گہری ہوتی جا رہی تھی اس کی بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ دس بجے ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ پہلے اس نے سوچا کہ کسی سینما ہال میں جا کر بیٹھ جائے اور گیارہ بجے تک فلم دیکھتا رہے۔ لیکن پھر اس نے کراچی کی سڑکوں پر چکر لگانے کا فیصلہ کیا اور جیپ نکال کر سڑک پر آگیا۔ گیارہ بجے تک وہ کراچی کی جگمگاتی سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ ساڑھے گیارہ بجے اس نے ایک پٹرول پمپ سے جیپ کی ٹینکی پٹرول سے فل کرائی اور جیپ کو خفیہ کمین گاہ کو جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔

ٹھیک اس وقت لاہور کی ایک تنگ و تاریک گلی کے مکان کی شہ نشین میں ندیم پلنگ پر لیٹا جاگ رہا تھا۔ لاہور میں ہلکی ہلکی سردی شروع ہو گئی تھی۔ وہ نجمی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اسے نیند آنی بھی نہیں چاہیے تھی۔ وہ اپنی محبت کی آبرو کا تحفظ نہ کر سکا تھا اور آبرو کے بغیر محبت ایک لاش ہے

جسے بہت جلد خاک میں مل جانا ہوتا ہے۔ ندیم ٹکٹکی باندھے چھت کو تک رہا تھا۔ اسی شہر کے مضافات میں نہر کے کنارے ایک خوشنما قدیم وضع کی کوٹھی "کینال لاج" کی ایک خواب گاہ میں شبانہ اپنے پلنگ سے ٹیک لگائے بیٹھی کھڑکی میں سے باہر سفیدے کے درختوں کو دیکھ رہی تھی جن کے اندھیری رات میں اسے خاکے ہی دکھائی دے رہے تھے۔

وہ نجمی کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ بہاولپور جانے کے بعد اس نے ابھی تک اسے کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ کوئی فون بھی نہیں کیا تھا۔ شبانہ کو یہ سارا معاملہ پراسرار لگ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی زندگی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ راحیل سے ملے اسے کتنے ہی دن گزر گئے تھے۔ اس کے خوابوں کا فلائنگ ڈچ مین غروب ہوتے سورج کے سامنے ہی ان دیکھی دنیاؤں میں چلا جاتا تھا۔ پھر سورج کئی بار طلوع ہوتا مگر راحیل کا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔

شبانہ کا چھوٹا بھائی عامر امریکہ میں تھا۔ شبانہ کے منگیتر ظفر نے اسے مزید تعلیم کے لئے سان فرانسسکو کے کسی کالج میں داخل کرا دیا تھا۔ ظفر کے احسانات اس فیملی پر بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ شبانہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے اردگرد مکڑی کا جالا بنا جا رہا ہے اور بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب وہ اس جالے میں اس طرح الجھ جائے گی کہ اس سے نجات حاصل کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ بڑی بہن غزالہ اور شفیق ماں اب اس کے پاس نہیں تھیں بڑے بھائی عقیل کی بیوی ایک سیدھی سادی لاہور کی عورت تھی جو شبانہ کے جذباتی مسائل کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

عقیل والد صاحب کے ساتھ ٹھیکیداری کے جھمیلوں میں سارا دن الجھا رہتا تھا۔ شبانہ یونیورسٹی سے واپس آتی تو سوائے کتابوں میں غرق ہو جانے کے اس کے پاس دوسرا کوئی چارہ کار نہیں ہوتا تھا۔ پہلے وہ نجمی کے ساتھ شام کا وقت گزار لیتی تھی۔ اب وہ بھی لاہور میں نہیں تھی۔ شبانہ نے سوچا کہ وہ کل نجمی کے گھر جا کر اس کا بہاولپور والا ایڈریس لائے گی تاکہ اسے خط لکھ سکے۔ نہر کنارے ایک کار گزر گئی۔ شبانہ

دور تک اس کی آواز سنتی رہی۔ پھر اس نے پلنگ کے پاس ہی تپائی پر رکھے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دبا دیا۔ خواب گاہ میں شیخ غلام فرید کی کافی کے بول ابھرے۔

کدی سانول موڑ مہاراں

شبانہ کا سانول کون تھا؟ کیا کبھی وہ اپنی ڈاچی کی مہار موڑ کر اس کے گھر آئے گا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ شبانہ رو رو کر عمر گزار دے گی؟

وے میں رو رو عمر گزاراں
سانول موڑ مہاراں

کراچی کی جگمگاتی روشنیاں بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ شیرے کی جیپ ہائی وے پر بھاگی جا رہی تھی نجمی کے ساتھ شادی کا نکاح نامہ، سگریٹ، بھرا ہوا پستول، تقریباً چھ ہزار روپے اور بے ہوشی کا سفوف یہ تمام چیزیں شیرے کی کھدر کی صدری میں تھیں جو اس نے قمیض کے نیچے پہن رکھی تھی۔ راستے میں سگریٹ اور پستول اس نے نکال کر اپنی قمیض کے اوپر پہنی ہوئی واسکٹ کی جیبوں میں رکھ لئے۔ اگرچہ نکاح نامے پر دھوکے سے نجمی کے دستخط کروائے گئے تھے مگر شیرا نجمی کے ساتھ ایک نئی اور شریفانہ زندگی شروع کرنا چاہتا تھا۔

شیرے کے باس اور عیار بردہ فروش اسمگلر زمان نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نجمی کا بیاہ شیرے سے کرایا تھا بیاہ کیا کرایا تھا۔ دھوکے سے نجمی کے دستخط نکاح نامے پر کروا لئے اور پھر معمول کے مطابق شیرے نے بھی نکاح نامے پر دستخط کر دیئے تھے یہ محض پیش بندی کے لئے تھا کہ نجمی کو بیرون ملک فروخت کر دینے کے بعد اگر معاملہ گڑبڑ ہو گیا اور قانونی صورتحال پیدا ہو گئی تو نجمی کو شیرے کی بیوی ثابت کیا جا سکے لیکن شیرے نے اس بار فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس گناہ اور بدمعاشی کی زندگی سے توبہ کر کے اسی عورت کے ساتھ شرافت اور نیکی سے زندگی بسر کرے گا جس کے ساتھ اس کا نکاح ہو چکا ہے۔

شیرے نے نجمی کے سامنے اپنے دل کا حال کھول کر بیان کر دیا تھا۔ نجمی لاہور

کے متوسط گھرانے کی پڑھی لکھی خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ اپنے بزدل محبوب ندیم کی باتوں میں آکر گھر سے بھاگنے کا ایک غلط اور خطرناک قدم اٹھا کر مصیبتوں کے گرداب میں پھنس چکی تھی اب وہ کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل کر واپس اپنے گھر فرار ہونا چاہتی تھی۔ جب شیرے نے اسے بتایا کہ زمان اسے دوسرے ملک میں فروخت کرنے والا ہے جہاں وہ ایک موم بتی کی طرح پگھل پگھل کر مر جائے گی اور کوئی اس کی خبر لینے والا نہیں ہو گا اور اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ اب جبکہ ان دونوں کا نکاح بھی ہو چکا ہے تو وہ اس کے ساتھ شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو نجمی نے حامی بھر لی۔

وہ شیرے کے ساتھ کسی طور بھی زندگی بسر نہیں کر سکتی تھی مگر شیرے کی شکل میں اسے وہاں سے فرار کا موقع مل رہا تھا اس نے دل میں یہی سوچ رکھا تھا کہ شیرا جب اسے زمان کے خونی پنجے سے نکال کر کسی دوسری جگہ لے جائے گا تو وہ وہاں سے کسی نہ کسی طرح بھاگ کر لاہور اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ جائے گی۔

شیرے کی جیپ ہائی وے سے بائیں جانب ایک ویرانے میں مڑ گئی آسمان پر تارے نکلے ہوئے تھے۔ شہر کی روشنیاں شیرے کے عقب میں زرد اور بھورے پتھروں کے ٹیلوں کے پیچھے گم ہو چکی تھیں۔ کلر زدہ میدان میں جگہ جگہ خشک جھاڑیاں اُگی تھیں۔ جیپ ریتیلی مٹی اڑاتی اپنی منزل یعنی زمان کی خفیہ بیرک کی طرف بڑھ رہی تھی اس بیرک میں اس سے پہلے کتنی لڑکیاں قید رہ کر بیرون ملک فروخت کر دی گئی تھیں۔ اس گھناؤنے جرم میں شیرا زمان کے ساتھ برابر کا شریک رہا تھا۔

آج اسے اپنے گناہوں اور جرائم پر ندامت ہو رہی تھی اور دل میں خدا سے التجائیں کر رہا تھا کہ وہ اس کے گناہ معاف کر دے اس لئے کہ شیرے نے پوری نیک نیتی سے نجمی کے ساتھ گھر بلو زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شیرے کو اس حقیقت کا علم تھا کہ نجمی ایک دم سے اس کے ساتھ رہنے پر تیار نہیں ہو جائے گی ہو سکتا ہے کہ نجمی نے زمان کے چنگل سے نکلنے کے لئے شیرے کے ساتھ بھاگنے کا فیصلہ کیا ہو لیکن شیرے نے بھی پورا پورا انتظام کر لیا تھا وہ نجمی کو ساتھ لے کر ایک ایسے ملک میں

جانے کا منصوبہ تیار کر چکا تھا جہاں نجمی شیرے سے الگ ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ دور سے بیرک کے قریب درختوں کے سیاہ جھنڈ نظر آئے شیرے نے جیپ کی رفتار کم کر دی۔ جب وہ بیرک کے درختوں والے کچے احاطے میں داخل ہوا تو زمان اور چوکیدار رائفلیں تان کر برآمدے کے ستونوں کے پیچھے چھپ گئے۔ زمان نے شیرے کی جیپ کو پہچان لیا وہ اس کے قریب آ گیا۔

"تم اس وقت یہاں کیوں آئے ہو؟" کوٹھڑی کے اندر قید نجمی نے جیپ کی آواز سن لی تھی وہ سمجھ گئی تھی کہ وعدے کے مطابق شیرا اسے وہاں سے نکال لے جانے کے لئے پہنچ گیا ہے وہ بند دروازے کی درز میں سے باہر دیکھنے لگی۔ برآمدے کے ساتھ لالٹین لٹک رہی تھی اس کی روشنی میں نجمی نے جیپ کے قریب زمان اور شیرے کو باتیں کرتے اور پھر آہستہ آہستہ چل کر برآمدے کی طرف آتے دیکھا شیرا زمان سے کہہ رہا تھا۔

"باس! میں کبھی نہ آتا... مگر میرا دل بار بار مجھے ملامت کر رہا تھا کہ میں نے اپنی جگہ تمہیں بھجوا کر زیادتی کی ہے اس لئے جیپ لے کر چلا آیا۔"

زمان برآمدے کی سیڑھیوں میں بیٹھ گیا شیرا بھی اس کے پاس ہی سیڑھیوں میں بیٹھ گیا وہ عقابی نظروں سے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ چوکیدار اپنی کوٹھڑی کی طرف چلا گیا تھا۔ رات سنسان تھی۔ لالٹین کی روشنی صرف برآمدے تک ہی محدود تھی۔ درختوں کے نیچے جو جھاڑیاں تھیں ان میں سے جھینگروں اور کسی سانپ کے بولنے کی مسلسل آواز آ رہی تھی وقفے وقفے سے بلند ہوتی سیٹی کی آواز سانپ کی تھی جسے شیرا خوب پہچانتا تھا۔ زمان نے سگریٹ نکال کر سلگا لیا اور شیرے کی طرف جھک کر آہستہ سے کہنے لگا۔

"لانچ کل رات تیار ہو گی تم اسے لے کر شروع رات ہی یہاں سے نکل جانا اور باقی رقم گن کر وصول کرنا یہ تسلی کر لینا کہ کرنسی نقلی نہ ہو۔" شیرے نے سگریٹ کا کش لگاتے [illegible] کہا۔

"تم فکر نہ کرو استاد! سب ٹھیک ہو گا۔" شیرا چوری چوری چوکیدار کی طرف بھی دیکھتا جاتا تھا آج رات ہر حالت میں شیرے کو نجمی کو ساتھ لے کر اپنے جگری دوست کے پاس وہاں سے کئی میل دور اس کے ٹھکانے پر پہنچنا تھا وہ اس کا انتظار کر رہا ہو گا۔ شیرے کے پاس وقت بہت کم تھا اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"باس! میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔" زمان نے کوئی اعتراض نہ کیا اسے بھی اپنی نیند کو کچلنے کے لئے چائے کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ شیرے کو باورچی خانے کی طرف جاتے دیکھ کر زمان نے کہا۔

"چوکیدار کو کہو وہ چائے بنا دے گا۔" شیرے نے پلٹ کر کہا۔

"اسے کہاں چائے بنانی آتی ہے استاد! میں خود بنا کر لاتا ہوں۔" شیرا جلدی سے باورچی خانے میں داخل ہو گیا اس نے آگ جلا کر کیتلی میں پانی رکھا۔ اس میں پتی ڈالی، دودھ ڈالا، چینی ڈالی اور چمچہ ہلانے لگا۔ چائے تیار ہو گئی تو شیرے نے اسے تین پیالیوں میں ڈالا پھر دو پیالیوں میں بے ہوشی کا سفوف ڈال دیا۔ یہ بڑی جلدی اثر کرنے والا سفوف تھا اب شیرے کو ایک ہی خطرہ تھا کہ کہیں پیالی نہ بدل جائے یا استاد زمان شبہ ہونے کی صورت میں اسے اپنی پیالی میں سے چائے پینے کے لئے نہ کہہ دے۔

شیرے نے باورچی خانے سے نکلتے ہی ایک پیالی چوکیدار کو دے دی جو باہر ایک پتھر پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ سادہ پیالی بائیں ہاتھ میں اور سفوف والی پیالی دائیں ہاتھ میں لئے وہ ہنسی مذاق کے موڈ میں زمان کو ہوٹل کے ایک نوکر کی کوئی دلچسپ بات سناتا زمان کے پاس آ گیا اور اس کی طرف بڑی بے نیازی سے پیالی بڑھا کر بولا۔

"باس! ہوٹل میں بھی ایک نوکر ایسا ہے جس کی ہر حرکت پر ہنسی آتی ہے بیوقوف ضرور ہے مگر کام بڑی محنت اور دیانت سے کرتا ہے۔" شیرا اوپر اوپر سے بڑے لائٹ موڈ میں بات کر رہا تھا مگر اندر سے اس کا دل دھڑک رہا تھا کہ کہیں زمان

کو شک نہ پڑ جائے کہ پیالی میں شیرے نے کچھ ملا تو نہیں دیا۔ زمان نے سگریٹ پاؤں تلے مسلنے کے بعد پیالی ہاتھ میں لے لی اور ہونٹوں کے قریب لے گیا شیرے نے اپنے پیے ضرر پیالے میں سے گھونٹ بھرا اس نے گردن کو ذرا سا گھما کر پیچھے نیم اندھیرے میں بیٹھے چوکیدار کو دیکھا اگر وہ کم تحت پہلے بے ہوش ہو گیا تو سارا معاملہ اُلٹ سکتا تھا مگر چوکیدار ابھی تک بے ہوش نہیں ہوا تھا۔

شیرا اپنے منصوبے پر عمل در آمد کا ایسا پختہ عزم کر چکا تھا کہ بے ہوش نہ ہونے کی صورت میں وہ زمان اور چوکیدار کو گولی سے اڑانے کا ارادہ کئے ہوئے تھا زمان نے چائے کا ایک گھونٹ پی لیا۔

شیرے نے اپنی جیب میں اس طرح ہاتھ ڈالا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو پھر بولا ”میں اپنا لائٹر چولہے کے پاس ہی بھول آیا ہوں ابھی لاتا ہوں استاد۔“ وہ اس وقت زمان کے سامنے نہیں رہنا چاہتا تھا۔ زمان بڑا کائیاں آدمی تھا بے ہوشی کے ذرا سے احساس کے ساتھ ہی وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ سکتا تھا اور پھر بندوق اس کے پاس ہی تھی وہ شیرے کو گولی سے اڑا سکتا تھا۔

شیرا تیز تیز قدم اٹھاتا باورچی خانے کی طرف چلنے لگا چوکیدار جہاں بیٹھا تھا وہاں کچھ اندھیرا تھا شیرا اس کے قریب سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے گر چکی تھی اور وہ بے ہوش ہو کر باورچی خانے کی دیوار کے ساتھ لگ گیا تھا۔ شیرا تیزی سے باورچی خانے میں گھس گیا اندر آتے ہی اس نے قمیض کے اندر والی صدری سے بھرا ہوا پستول نکال لیا اور کھڑکی میں گھات لگا کر زمان کی طرف تکنے لگا۔

زمان چائے کا شاید تیسرا چوتھا گھونٹ پی رہا تھا اچانک وہ اٹھا پیالی اس کے ہاتھ سے گر پڑی۔ اس نے بندوق کا رُخ کچن کی طرف کرنے کی کوشش کی مگر وہ ایسا نہ کر سکا پھر اس نے بندوق چلانے کی بھی کوشش کی مگر اس میں کامیاب نہ ہوا بے ہوشی کا سفوف اپنا کام کر چکا تھا۔ زمان لڑکھڑایا اور پھر زمین پر گر پڑا۔

شیرے نے پستول اسی طرح ہاتھ میں رکھا اور دوسری طرف درختوں کے پیچھے سے چلتا ہوا زمان سے کوئی دس قدم دور کھڑا ہو گیا اسے شک تھا کہیں زمان کوئی چال نہ چل رہا ہو پھر وہ دبے پاؤں اس کے سر کی طرف سے قریب آیا اور لپک کر بندوق اٹھا کر پرے پھینک دی۔ اس نے زمان کو ہلا چلا کر دیکھا زمان بے ہوش ہو چکا تھا۔

شیرا بھاگ کر چوکیدار کے پاس گیا۔ نجمی بند کوٹھری کے دروازے سے لگی یہ سارا تماشہ دیکھ رہی تھی کہ شیرے کے ساتھ یہاں سے بھاگ کر وہ پہلے موقع پر ہی فرار ہو جائے گی۔

شیرے نے چوکیدار اور زمان کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر ان کے ہاتھ پاؤں رسی سے جکڑ دیئے اور لپک کر نجمی کی کوٹھڑی کا دروازہ کھول دیا۔ نجمی پیچھے ہٹ گئی اندر اندھیرا تھا شیرے کو نجمی کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں جو اندھیری رات میں چیتے کی طرح چمک رہی تھیں۔

”راستہ صاف ہے میرے ساتھ چلو۔۔ آجاؤ۔۔۔۔ ڈرو نہیں۔۔۔ میں تمہارا خاوند ہوں کوئی غیر نہیں ہوں۔“ نجمی نے چارپائی پر گرا ہوا دوپٹہ اٹھا کر سر پہ ڈالا اور شیرے کے پیچھے پیچھے کوٹھڑی سے نکل کر جیپ کی طرف چلی۔ شیرے نے واسکٹ کی جیب میں سے نائیلون کی رسی نکالتے ہوئے کہا۔

”میری نیت پر شک نہ کرنا نجمی۔۔۔ لیکن میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔۔ میں اپنی زندگی کا آخری داؤ لگا رہا ہوں۔“ نجمی خاموش تھی وہ سوچ رہی تھی کہ یہ شخص اسے کہاں لے جائے گا اور وہ کہاں اور کس مقام پر سے فرار ہونے کی کوشش کرے گی شیرے نے نجمی کے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے رسی سے باندھ دیئے نجمی نے کچھ نہ کہا وہ جیپ میں اسٹیئرنگ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

شیرے نے طوفانی اسپیڈ سے جیپ کو بیرک کے احاطے سے نکالا اور اندھیری رات میں اسے ویران میدان میں ایک طرف ڈال دیا۔ وہ تیز رفتاری سے جیپ

کو لئے جا رہا تھا۔ کچھ دور تک جیپ سڑک پر دوڑتی رہی پھر اس کا رُخ دائیں جانب اونچے نیچے غیر ہموار میدان کی طرف موڑ دیا گیا۔ جیپ بار بار اچھل رہی تھی نجمی کی ہڈیاں دکھنے لگیں اس نے کہا۔ "آہستہ کیوں نہیں چلاتے ؟"

شیرے نے کوئی جواب نہ دیا وہ جیپ آہستہ نہیں چلا سکتا تھا پھر بھی اپنی بیوی کا خیال کرتے ہوئے اس نے رفتار تھوڑی سی کم کر دی اس نے جیپ کی ہیڈ لائٹس بند کر دی تھیں۔ ستاروں کی دھیمی روشنی میں وہ صحیح رُخ پر جا رہا تھا۔ کئی سوکھے کھڈ اور نالے عبور کرنے کے بعد جیپ ایک بار پھر کھلے میدان میں آ گئی یہ میدان ریتیلا تھا جگہ جگہ اندھیرے میں جنگلی جھاڑیوں کے جھنڈ بکھرے ہوئے تھے۔

جیپ ہچکولے کھاتے جا رہی تھی اس کی رفتار ایک بار پھر تیز ہو گئی تھی جس کی وجہ سے نجمی کا انگ انگ درد کرنے لگا تھا۔ ہاتھ پیچھے بندھے ہونے کی وجہ سے وہ ان دھچکوں سے اپنا بچاؤ نہیں کر سکتی تھی اس نے چلا کر کہا۔

"جب میں اپنی مرضی سے تمہارے ساتھ جا رہی ہوں تو تم نے میرے ہاتھ کیوں باندھ رکھے ہیں ؟ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔" شیرے نے ایک دم بریک لگا دیئے۔ نجمی کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ شیرے نے اُتر کر نجمی کے ہاتھ کھول دیئے لیکن ایک ہاتھ پھر بھی جیپ کے دروازے کی ریلنگ سے باندھ دیا نجمی نے اعتراض کیا مگر شیرا کچھ نہ بولا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر وہ اچھل کر بیٹھا اور جیپ ایک بار پھر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

اب نجمی نے ایک ہاتھ سے اپنی سیٹ کو اور دوسرے بندھے ہوئے ہاتھ سے کھڑکی کی آہنی سلاخ کو تھام رکھا تھا۔ یہ تکلیف دہ ویرانے کا سفر جاری رہا۔ نجمی بے بسی کے عالم میں کبھی آس پاس اندھیرے میں ڈوبے میدان کو تکتی اور کبھی ستاروں کو دیکھنے لگتی یہی ستارے لاہور میں ان کے مکان کے اُوپر بھی چمک رہے ہوں گے ؟ کیا وہ زندہ ہوں گے ؟ کاش میں ان کے اعتماد کو ذبح کر کے گھر سے نہ بھاگتی۔۔۔ کاش مجھے کوئی سمجھانے والا ہوتا۔

ندیم نے میری زندگی کو تباہی کے راستے پر ڈال دیا ہے لیکن نہیں اس میں ندیم کے علاوہ اس کا اپنا قصور بھی ہے۔ وہ سمجھدار، پڑھی لکھی، بالغ لڑکی تھی اسے ایسا گھناؤنا قدم کبھی نہیں اٹھانا چاہیئے تھا اسے اپنے ماں باپ کی عزت اور اپنی آبرو خاک میں نہیں ملانی چاہیئے تھی۔ وہ شریف ماں باپ کی بیٹی تھی اور شریف بیٹیوں کو اپنے ماں باپ کی عزت کا خیال ہوتا ہے وہ تو اپنی اور اپنے ماں باپ کی عزت پر جان قربان کر دیتی ہیں اور نجمی ان کی عزت کو نیلام کر کے گھر سے بھاگ آئی تھی۔

اب اسے اپنے گناہ کی سزا بھگتنا تھی اور وہ بھگت رہی تھی۔ ایک ناسمجھ ہرنی جب درندوں سے بھرے ہوئے جنگل کا رُخ کرتی ہے تو اس کا یہی انجام ہوتا ہے جیپ اب ایک ایسے جنگل میں سے گزر رہی تھی جہاں اندھیری رات میں اونچے اونچے پتلے پتلے درخت فاصلے فاصلے پر اگے ہوئے تھے ان کے بیچ میں راستہ بنا ہوا تھا۔

شیرے نے اب جیپ کی ہیڈ لائٹس جلا دی تھیں۔ ایک لومڑ یا کتا بھاگ کر جیپ کے آگے سے نکل گیا۔ جیپ کی روشنی چند گز تک ہی پڑ رہی تھی اس کی وجہ وہ جھاڑیاں تھیں جو کچے راستے پر جھکی ہوئی تھیں۔ اب رات کی ہواؤں میں سمندر کی مرطوب ہوا بھی شامل ہو گئی تھی۔ شیرے کے جگری دوست کا ڈیرا قریب آ رہا تھا۔ نجمی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ شخص اسے کہاں لئے جا رہا ہے۔ ایک دو بار اس نے پوچھا بھی مگر شیرے نے کوئی جواب نہ دیا۔

نجمی کو دُور روشنی کا نقطہ ٹمٹماتا نظر آنے لگا یہ شیرے کے دوست کے ڈیرے کی لالٹین کی روشنی تھی جو اس کی کوٹھڑی سے باہر بانس کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ شیرے نے جیپ کی رفتار کم کر دی۔ نجمی نے کہا۔

"اب تو میرا ہاتھ کھول دو میں یہاں سے بھاگ کر کہاں جاؤں گی ؟" شیرے نے نجمی کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی اس کی نظریں دور نظر آتی لالٹین کی روشنی پر جمی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ اس ڈیرے پر رات کو باہر کوئی روشنی نہیں کرتا یہ لالٹین شیرے کے دوست نے صرف اس کی خاطر روشن کر رکھی تھی۔ جیپ جھاڑیوں

اور ریت کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریوں کو روندتی ہوئی ڈیرے کی کوٹھڑی کے باہر ایک طرف جا کر رک گئی۔ شبیرے کا دوست اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ باہر موجود تھا اس کے کاندھے سے پستول لٹک رہا تھا۔ شبیرا اس کی طرف بڑھا دونوں دوست گلے ملے۔ شبیرے نے نجمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ میری بیوی ہے میں اسے لے آیا ہوں۔" اس کے دوست نے شبیرے کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے ایک طرف لے گیا۔ "معاملہ خراب ہو گیا ہے شبیرے" شبیرا منہ کھولے اپنے دوست کو تکنے لگا۔ شبیرے کے بال گرد میں اٹے ہوئے تھے اس کا دوست اسے کوٹھڑی میں لے گیا۔ یہاں ایک کھاٹ بچھی ہوئی تھی۔

"تم بیٹھو۔۔۔ منہ ہاتھ دھو لو۔۔۔ میں تمہیں سب سمجھاتا ہوں۔" شبیرا جلدی سے بولا۔

"مگر تم تو کہتے تھے کہ ہر شے ٹھیک ٹھاک ہے؟" اس کے دوست نے کہا "شبیرے۔۔۔ میرے دوست۔۔۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو کہ بارڈر کے حالات بدلتے رہتے ہیں یہاں کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے میں نے تمہارے بارڈر کراس کرانے کا پورا بندوبست کر رکھا تھا مگر عین وقت پر معاملہ گڑبڑ ہو گیا ہے اس وقت دونوں جانب سیکورٹی اتنی سخت کر دی گئی ہے کہ کوئی چڑیا بھی بارڈر کراس نہیں کر سکتی۔

شبیرے نے کہا "ہم دو دن بعد بارڈر کراس کر لیں گے۔" اس کا دوست بولا۔

"میں نے سارا پتہ کروا لیا ہے یہ سیکورٹی نامعلوم مدت تک جاری رہے گی خدا جانے کیا بات ہو گئی ہے دو ایک جگہوں پر تو فوجوں نے بھی اگلے مورچے سنبھال لئے ہیں اور بی ایس ایف والوں کی گاڑیاں ہر وقت گشت لگاتی رہتی ہیں۔" پھر اس نے باہر کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بھابی کو یہاں لے آؤ۔۔۔ میں بستر لگوا دیتا ہوں۔۔۔ تم اگر چاہو تو اسی کوٹھڑی میں سو جاؤ صبح بات کریں گے۔" اس نے شبیرے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"گھبراؤ نہیں میرے دوست کچھ نہ کچھ ہو جائے گا میں تمہیں واپس کراچی نہیں جانے

دوں گا میں جانتا ہوں وہاں تمہارے دشمن اب تمہاری گھات میں بیٹھے ہیں۔" شبیرے کا چہرہ اتر گیا تھا وہ بارڈر کراس کر کے دوسرے ملک میں نکل جانے کا منصوبہ بنا چکا تھا کہ معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا اس نے نجمی کا ہاتھ کھول دیا اور سر پر سے گرد جھاڑتے ہوئے بولا

"میرے ساتھ آ جاؤ۔۔۔ گھبراؤ نہیں۔۔۔ یہ میرا جگری یار ہے وہ تمہیں بھابی کہتا ہے۔"

نجمی اپنی کلائی کو دوسرے ہاتھ سے دباتی ہوئی شبیرے کے ساتھ کوٹھڑی کے پاس آئی۔ شبیرے کا دوست ایک طرف ہٹ کر بڑے ادب سے کھڑا تھا۔ اس نے نجمی کو سلام کیا اور بولا۔

"بھابی! یہ جگہ تمہارے لائق نہیں مجھے معاف کر دینا۔" نجمی نے سوچا کہ یہ شخص نرم دل اور شریف انسان لگتا ہے اس سے فرار ہونے میں مدد لی جا سکتی ہے اس کی بپتا سن کر یقیناً اس کا دل پگھل جائے گا وہ بوجھل قدموں سے کوٹھڑی میں داخل ہو گئی۔

وہاں پہلے ہی سے بستر لگا دیا گیا تھا دوسری کوٹھری سے ایک عورت آنکھیں ملتی ہوئی نمودار ہوئی اس نے نجمی کا منہ ہاتھ دھلایا اور بستر پر بٹھا کر کچھ کہے بغیر واپس چلی گئی تھوڑی دیر میں شبیرا بھی آ گیا وہ واسکٹ اتار رہا تھا کہ نجمی نے کہا۔

"تم یہاں نہیں سوؤ گے۔" شبیرا واسکٹ اتارتے اتارتے رک گیا۔ "تم میری بیوی ہو نجمی! میرے پاس نکاح نامہ موجود ہے۔" نجمی نے نفرت سے کہا۔

"خبردار! اس نکاح نامے کا نام نہ لینا۔" شبیرا قریب آ کر بولا۔

"مگر نجمی تم تو میرے ساتھ زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر چکی تھیں۔" نجمی نے گہری آہ بھری۔۔۔ پھر شبیرے کی طرف دیکھا اور شکستہ آواز میں بولی۔

"ہاں۔۔۔ میں نے یہی فیصلہ کیا ہے۔۔۔ مگر تم ابھی اس کوٹھڑی میں نہیں سوؤ گے۔۔۔ جو میں کہتی ہوں وہی کرو۔۔۔ جاؤ۔۔۔ کل دیکھا جائے گا۔" شبیرے نے واسکٹ پہنے رکھی اور کوٹھڑی سے باہر نکل گیا اس نے یہ بات اپنے جگری دوست کو بتا دی انہوں نے کوٹھڑی کے باہر تالا لگا دیا تالے کی آواز سن کر نجمی کا دل بیٹھ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کی قسمت کو تالا لگا دیا ہے۔ اس کے خواب ہوتے پہلے

دلنوں کی بہار ختم ہو گئی ہے اب وہ اس بہار کو کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ اس کا جسم درد کر رہا تھا وہ چارپائی پر لیٹ گئی اس نے آنکھیں بند کر لیں اسے شبانہ کا خیال آ گیا وہ کس حال میں ہو گی؟ اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہو گی۔ نجمی کی آنکھوں میں گرم گرم آنسوؤں کے قطرے کپکپانے لگے ایک گرم آنسو اس کی آنکھ سے نکل کر اس کے رخسار پر بہہ گیا پھر نجمی نے اپنے منہ پر دونوں ہاتھ رکھ لئے اور دوسری طرف منہ کر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی دیر تک روتے رہنے کے بعد اس پر نیند کی غنودگی طاری ہوتی گئی اور وہ سو گئی۔

ساتھ والی کوٹھڑی میں شیرا بھی سو گیا تھا۔ صبح اس کی آنکھ کھلی تو دن کافی نکل آیا تھا اس کے دوست نے ناشتہ تیار کروا رکھا تھا۔ نجمی کی محافظ عورت نے نجمی کو اپنی نگرانی میں غسل کروانے کے بعد دوسرے کپڑے پہنا دیئے تھے اسے ناشتہ بھی کروا دیا گیا تھا اور اب نجمی کوٹھڑی میں سر جھکائے خاموش بیٹھی اپنے کئے پر آنسو بہا رہی تھی۔

شیرا ناشتہ کرتے ہوئے اپنے دوست کے ساتھ بڑی اہم باتیں کر رہا تھا بارڈر کراس کرنا اب ناممکن تھا۔ شیرے نے اپنے دوست کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ لڑکی پڑھی لکھی ہے اور لاہور کے معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہے وہ اس کے ساتھ گھر بسانے پر راضی نہیں ہے مگر وہ اس سے شادی کر چکا ہے نکاح نامے پر لڑکی کے دستخط موجود ہیں وہ ہر صورت میں نجمی کے ساتھ ایک نئی شریفانہ زندگی شروع کرنا چاہتا ہے۔ اس کے دوست نے کہا۔

"کچھ روز تمہارے ساتھ رہے گی تو اپنے آپ راضی ہو جائے گی۔۔۔ اب واپس جائے گی تو اس کی وہ عزت نہیں ہو گی عورت کو داغ لگ جائے تو پھر اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا وہ ان باتوں کو ضرور سمجھتی ہو گی۔" شیرا بولا۔

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ اب میں اسے لے کر کہاں جاؤں؟ پاکستان میں میں کسی بھی شہر میں رہا تو زمان کے آدمی وہاں پہنچ کر مجھے قتل کر ڈالیں گے اور ہو

سکتا ہے کہ یہ لڑکی بھی میرے ہاتھ سے نکل جائے۔" اس کے دوست نے شیرے کو ایک مشورہ دیا اور بولا۔

"اگر تم میرے اس مشورے کو تسلیم کر لو تو میں تمہارا سارا بندوبست کر دوں گا۔"

شیرا اچانک سے پیالی میں چائے ڈال رہا تھا وہ رک گیا اپنے دوست کی طرف چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا اور بولا۔

"اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا۔" پھر اچانک اس کے چہرے پر مایوسی کے سائے منڈلانے لگے بولا۔

"لیکن یہ لڑکی وہاں بڑی آسانی سے مجھ سے بھاگ جائے گی۔۔۔ وہ تو اپنا ہی ملک ہو گا۔" شیرے کے دوست نے شیرے کو اپنی نو بیاہتا اور زبردستی کی بیوی کو ساتھ لے کر مشرقی پاکستان چلے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب مشرقی پاکستان میں مکمل طور پر امن اور سکون تھا۔ شیرا کہہ رہا تھا۔

"دوست! مجھے صرف ایک سال کسی الگ تھلگ مقام پر ایسی جگہ رہنا ہو گا جہاں میری بیوی کے پاس آنے جانے والا کوئی نہ ہو یہ جگہ شہر سے دور کسی ویران مقام پر واقع ہو میں چاہتا ہوں کہ اس سے ایک بچہ ہو جائے۔۔۔ بس پھر یہ عورت مجھ سے کہیں نہیں جائے گی۔" شیرے کا دوست مسکرا رہا تھا سگریٹ کا کش لگا کر پستول والی پیٹی گود میں رکھتے ہوئے بولا۔

"اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔۔۔ میرا ایک آدمی تمہارے ساتھ مشرقی پاکستان جائے گا وہ تمہیں وہاں ایک ایسی جگہ پر پہنچا دے گا جہاں وہی کچھ ہو گا جو تم چاہتے ہو تم چاہے زندگی بھر وہاں رہو تمہیں کوئی نہیں پوچھے گا تمہارے کھانے پینے کا سارا خرچ میرا مشرقی پاکستان والا دوست اٹھائے گا اور یہ تم پر کوئی احسان نہیں ہو گا اس کا۔۔۔ تم یوں سمجھ لو کہ وہ خرچ میں کر رہا ہوں گا۔" شیرے نے کہا۔

"میں تم پر بھی بوجھ نہیں بننا چاہتا بس مجھے ایک سال کی مہلت چاہیئے

بچہ ہو گیا تو پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا یہ لڑکی پھر ہمیشہ کے لئے میری ہو کر رہے گی۔" شبیرے کے دوست نے کہا۔

"تم بے فکر ہو کر وہاں ایک سال رہو وہ جگہ شہر سے دور۔۔ بہت دور ایک پہاڑی جنگل میں ہے۔۔۔ مگر تمہیں ضرورت کی ہر شے وہاں ملے گی۔" شبیرے کے سامنے سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ اسے مشرقی پاکستان جانے کے لئے پہلے کراچی جانا پڑتا جہاں زمان اور اس کے ساتھی شبیرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہوں گے اس مسئلے کا حل شبیرے کے دوست نے یہ نکالا کہ وہ ان دونوں کو اپنے خاص محافظوں کی مدد سے کراچی کی بندرگاہ تک پہنچائے گا۔ شبیرے نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ چونکہ وہ ایک بار پھر کراچی جا رہے ہیں ممکن ہے نجمی کو شور مچانے یا کوئی مصیبت کھڑی کر دینے کا موقع مل جائے۔ شبیرے کے دوست نے کہا۔

"اس کا ایک ہی علاج ہے اور یہ کہ نجمی کو بے ہوش کر کے بیمار ظاہر کر کے بندرگاہ تک لے جاؤ ایک بار تم دونوں بحری جہاز میں داخل ہو گئے تو پھر کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا ویسے بھی میرا آدمی تمہارے ساتھ ہو گا۔" شبیرے نے کہا۔

"تو پھر جتنی جلدی ہو سکے ہمارا ٹکٹ منگوا دو۔" بے ہوشی کا سفوف شبیرے کے پاس ہی تھا اس کا اثر آدمی پر چوبیس گھنٹے تک ضرور رہتا تھا۔ شبیرے کے دوست نے اسی روز کراچی سے چاٹگام تک کے دو سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ منگوا لئے بحری جہاز دو روز بعد دن کے وقت کراچی سے روانہ ہونے والا تھا۔ اس دوران شبیرے نے نجمی کو کوٹھڑی میں ہی بند رکھا اسے محافظ عورت کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے باہر جانے کی اجازت تھی۔

جس روز انہیں کراچی کی بندرگاہ کی طرف روانہ ہونا تھا شبیرے نے نجمی سے یہی کہا کہ وہ واپس کراچی جا رہے ہیں۔ نجمی نے پوچھا کہ وہ کراچی کس لئے جا رہے ہیں؟ جس کا جواب شبیرے نے یہ دیا کہ تمہیں وہاں چل کر بتاؤں گا۔ نجمی یہ سمجھی کہ

شاید زمان کا کچھ دباؤ پڑا ہے ہو سکتا ہے زمان نے کراچی میں شبیرے کے کسی قریبی آدمی یا بھائی کو یرغمال بنا لیا ہو وہ خوش ہوئی کہ اس اجاڑ ویرانے سے تو نجات ملے گی۔ کراچی ایک بڑا شہر تھا اور وہاں جا کر لاہور جانے کے ذرائع پیدا کئے جا سکتے تھے دن کے سات بجے انہیں روانہ ہونا تھا۔ چھ بجے شبیرا نجمی کے لئے چائے لے کر آ گیا۔ نجمی کی پیالی میں بے ہوشی کے سفوف والی چائے تھی نجمی کو اس قسم کا شک پیدا نہیں ہو سکتا تھا بھلا اب شبیرے کو کیا ضرورت تھی کہ اسے بے ہوش کرتا چنانچہ وہ بلا جھجک چائے پینے اور کراچی کی باتیں کرنے لگی۔

دوسرے گھونٹ پر ہی اس کا سر اسی طرح سے چکرایا جس طرح کراچی میں شادی کی رات چکرایا تھا وہ فوراً سمجھ گئی کہ اسے بے ہوش کیا جا رہا ہے۔ پیالی اس کے ہاتھ سے گر پڑی وہ شبیرے سے پوچھنے ہی والی تھی کہ بے ہوش ہو گئی ایک گھنٹے بعد بند ویگن اس طرح کراچی بندرگاہ کی طرف اڑی جا رہی تھی کہ شبیرے نے کوٹ پتلون اور ٹائی لگا رکھی تھی مونچھیں صاف کر دی تھیں۔ نجمی سامنے والی سیٹ پر برقعے میں ملبوس بے ہوش پڑی تھی۔ صرف چہرے پر سے نقاب اٹھا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ ایک خاص آدمی بھی تھا یہ آدمی شبیرے کے دوست کی طرف سے ساتھ بھیجا جا رہا تھا اس کا نام گوندی تھا۔

ایک بھرا ہوا پستول گوندی کی لمبی قمیص کے اندر صدری میں چھپا تھا اور ایک پستول شبیرے نے قمیص کے اندر پتلون میں چھپا رکھا تھا ان کے ساتھ ایک ٹرنک بھی تھا جس میں شبیرے اور نجمی کے کپڑے وغیرہ تھے اس زمانے میں شناختی کارڈ کا رواج نہیں تھا۔ کراچی سے بحری جہاز میں مسافر ٹکٹ لے کر بیٹھتے اور مشرقی پاکستان پہنچ جاتے تھے۔

ان تینوں کی سیکنڈ کلاس میں نشستیں ریزرو ہو چکی تھیں۔ بندرگاہ پر گوندی نے جیٹی کے اہلکاروں کو بتایا کہ بیگم صاحبہ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے کیونکہ ڈھاکا میں ان کی بیٹی کا کار کا حادثہ ہو گیا ہے۔ نجمی کو اسٹریچر پر ڈال کر جہاز میں

پہنچا دیا گیا۔ شیرا کوٹ پتلون میں اسٹریچر کو سنبھالے رونی صورت بنائے ساتھ ساتھ چل رہا تھا وہ بار بار آسمان کی طرف دیکھ کر آہ بھر لیتا تھا۔ کیبن میں نجمی کو برتھ پر لٹا دیا گیا تو شیرے نے سکھ کا سانس لیا ماتھے سے پسینہ پونچھ کر گوندی سے بولا۔

"گوندی جہاز چلنے میں کتنی دیر ہے ابھی؟" کوئی دو گھنٹے بعد جہاز کے انجن اسٹارٹ ہوئے اور کیبن کے فرش اور دیواروں میں ہلکی ہلکی لرزش پیدا ہوئی تو شیرا کیبن سے باہر نکل کر کاریڈور میں جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ کافی بڑا جہاز تھا۔ نیچے جیٹی پر لوگ ہاتھ ہلا ہلا کر اپنے احباب کو رخصت کر رہے تھے۔

جہاز آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔ شیرے نے پتلون قمیض پہن رکھی تھی اسے کوئی دور سے بالکل نہیں پہچان سکتا تھا۔ اب اگر وہ پہچان بھی لیا جاتا تو زمان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ جہاز کافی پیچھے چلا گیا تو شیرا بھی کیبن میں آ گیا بڑی بڑی مونچھوں والا اس کے دوست کا دوست گوندی برتھ پر اکڑوں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی انگوٹھیوں کے نگینے چمک رہے تھے۔ یہ اونچا لمبا جوان تھا اور شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔ بالوں کے پٹے گردن تک تھے۔ گلے میں چاندی کا تعویذ تھا اور سیاہ واسکٹ پہن رکھی تھی۔ اس نے دوسری برتھ پر بے ہوش نجمی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"لالہ! اب اس کا برقعہ اتار دو ذرا اسے ہوا لگے۔" شیرا بولا۔

"ذرا جہاز کو کھلے سمندر میں پہنچ جانے دو۔" جہاز کھلے سمندر میں داخل ہوا تو شیرے نے بے ہوش نجمی کا برقعہ اتار کر ایک طرف تہہ کر کے رکھ دیا۔

جہاز کے ڈاکٹری عملے کی ایک نرس نے آ کر نجمی کا ٹمپریچر دیکھا اسے ٹیکہ لگایا پھر گلوکوز لگا کر چلی گئی۔ جہاز چاٹگام کی طرف رواں تھا جو بیس گھنٹوں کے بعد نجمی کو ہوش آ گیا اس نے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ سب سے پہلے اس کی نظر گوندی پر پڑی۔ اس بڑی بڑی مونچھوں والے آدمی کو اس نے شیرے کے دوست کے ڈیرے پر دیکھا ہوا تھا۔ اس نے شیرے کی طرف دیکھ کر نقاہت بھری آواز میں پوچھا

کہ تم نے مجھے بے ہوش کیوں کیا؟ شیرے نے کہا۔

"یہ ضروری تھا۔ اب تم میری بات غور سے سنو۔" اور پھر شیرے نے اسے بتایا کہ وہ اسے لے کر مشرقی پاکستان جا رہا ہے جہاں وہ دونوں اپنے دشمنوں سے دور رہ کر نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔

"نرس تمہاری دیکھ بھال کر رہی ہے۔ ہم نے انہیں یہی بتایا ہے کہ تم اپنی بچی کے ایکسیڈنٹ کی خبر سن کر بے ہوش ہو گئی تھیں۔ تم بھی یہی ظاہر کرنا۔ تم اس وقت بحری جہاز میں ہو اور جہاز چاٹگام کی طرف جا رہا ہے اگر تم نے کسی کو دیکھ کر شور مچانے کی کوشش کی تو ایک پستول گوندی کے پاس ہے اور ایک بھرا ہوا ریوالور میرے پاس ہے اس سے پہلے کہ تم کسی کو کچھ کہہ سکو دو گولیاں سینے سے پار ہوں گی۔ ہمارے ساتھ جو ہو گا ہم بعد میں دیکھیں گے مگر تم زندہ نہ رہو گی۔"

گوندی نے اپنا پستول واسکٹ کی جیب سے نکال کر نجمی کو دکھایا۔ شیرے نے بھی اپنے ریوالور کی ایک جھلک دکھا دی۔ نجمی سمجھ گئی کہ اب وہ پوری طرح ان کے چنگل میں ہے اور کوئی سوچی سمجھی حکمت عملی ہی اسے ان سے نجات دلا سکتی ہے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"شیرے! میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ میں تیرے ساتھ زندگی بسر کرنے کو تیار ہوں مجھے صرف دو ایک ماہ کی مہلت دے دو۔ میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔ پھر تم مجھ پر اعتبار کیوں نہیں کرتے؟" شیرا اپنے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ نجمی نے کہا۔

"تم نے اپنی مونچھیں کیوں صاف کر دیں؟" شیرے نے سر کو جھٹک کر کہا۔

"ان باتوں کو چھوڑو۔ مونچھیں پھر آ جائیں گی۔ میں نے تمہیں جو کچھ کہا ہے اس کو ذہن میں رکھنا۔ ورنہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔" دروازے پر ٹک ٹک ہوئی شیرے نے گوندی کی طرف دیکھا۔ گوندی نے اٹھ کر کیبن کا دروازہ کھول دیا۔ نرس ٹمپریچر لینے آئی تھی اندر داخل ہوئی نجمی کو ہوش میں دیکھ کر وہ مسکرا دی۔

"بیگم صاحبہ کو ہوش آ گیا ٹھیک ٹھاک کر دو۔" اس نے ٹمپریچر لیا۔ ڈاکٹر کو جواب

کیا اور بولی اب انہیں تھوڑا تھوڑا سوپ پلاتا ہوگا۔"

شیرا بڑا مودب ہو کر پاس ہی کھڑا تھا بولا۔ "ابھی پلاتا ہوں جی۔ اب بخار تو نہیں ہے نا سسٹر جی!" نرس سر سے نفی کا اشارہ کرتے ہوئے کیبن سے نکل گئی اس دوران گونڈی کا ہاتھ جیب میں ہی رہا اور جیب کے اندر پستول کی نالی کا رخ نجمی کی طرف تھا۔ نجمی نے آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ سے کہا۔

"مجھے نیند آ رہی ہے۔" شیرا اور گونڈی کیبن کے باہر آ کر کاریڈور میں جنگلے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ جہاز کھلے بے کراں سمندر میں اپنی منزل کی طرف چلا جا رہا تھا۔ آخر ایک روز جب سورج طلوع ہوا تو دور سے زمین کی سیاہ لکیر نظر آنے لگی۔ جہاز میں ہر ایک کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ چاٹگام کی بندرگاہ آنے والی تھی۔ دوپہر کے بعد جہاز مشرقی پاکستان کی بندرگاہ سے جا کر لگ گیا۔

نجمی کو ایک بار پھر برقعہ اوڑھا دیا گیا۔ اگرچہ اسے نقاب اٹھانے کی اجازت تھی۔ گونڈی اور شیرا نجمی کو درمیان میں لئے جیٹی سے باہر آ گئے۔ نجمی کو معلوم تھا کہ وہ گولیوں کی زد میں ہے۔ لیکن اس نے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ وہ پہلا موقع ملتے ہی کسی نہ کسی طرف فرار ہو جائے گی۔ وہ اپنے وطن میں تھی۔ مشرقی پاکستان کی پولیس اس کی ضرور مدد کرے گی۔

گونڈی نے ایک ٹیکسی کرائی اور دونوں کو ساتھ لے کر ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ جانتا تھا اسے کہاں جانا ہے۔ شیرے کو اس نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ چاٹگام کا ہوائی اڈہ پتنگا شہر سے کافی دور واقع ہے اور اس سے آگے پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا ہے جو ایک طرف کوکس بازار کی طرف اور دوسری طرف کپتائی اور سندربند سے جا ملتا ہے۔ کپتائی کے شمال مشرق میں سنتھال قبیلے کے لوگ آباد ہیں جو چکمہ قبیلے ہی کی ایک شاخ ہیں۔ یہ نیم جنگلی لوگ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ یہاں کرنافلی دریا کے پار بھارت کی سرحد شروع ہو جاتی ہے اور یہ جگہ اسمگلروں کی جنت ہے۔

گونڈی شیرے اور نجمی کو اسی علاقے میں لئے جا رہا تھا۔ جنگل کا علاقہ شروع ہوا تو گونڈی نے ٹیکسی چھوڑ دی اب جنگل میں پیدل سفر شروع ہو گیا یہاں ساگوان بانس اور املی کے درختوں کی بھرمار تھی۔ گونڈی اس علاقے میں کئی بار سفر کر چکا تھا۔

وہ یہاں کے چپے چپے سے واقف تھا۔ وہ انہیں ایسے راستوں سے لے کر جا رہا تھا جہاں جنگلی درندوں کا خطرہ نہیں تھا۔ نجمی کبھی جنگلوں میں پیدل نہیں چلی تھی۔ وہ بہت جلد تھک کر بیٹھ گئی۔ شیرا اور گونڈی کو بھی رکنا پڑا۔ گونڈی نے شیرے کو ایک لے جا کر کہا۔

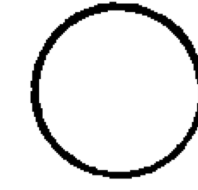
"ہمیں شام ہونے سے پہلے پہلے یہ جنگل پار کر کے کرنافلی گاؤں پہنچ جانا چاہیئے اگر جنگل میں رات آ گئی تو یہاں شیر بہت ہوتے ہیں جو رات کو ہی اپنے شکار کی تلاش میں نکلتے ہیں۔"

شیرے نے کہا میری بیوی تھک گئی ہے میں اس کو زبردستی تو نہیں چلا سکتا۔ گونڈی نے پھنکار کی طرح سانس چھوڑ کر دوسری طرف منہ کر لیا۔ شیرے نے نجمی کو سمجھایا کہ یہ جنگل بڑا خطرناک ہے ہمیں اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے نکل جانا ہوگا۔ نجمی کے لئے شیر اور درندے اتنے خطرناک نہیں تھے جتنے خطرناک اس کو شیرا اور گونڈی لگ رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کسی طرح ان کو جل دے کر جنگل میں بھاگ کر غائب ہو جائے اور پھر واپس چاٹگام کے کسی پولیس اسٹیشن پہنچ کر قانون کی مدد حاصل کرے وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ چل رہی تھی تاکہ شیرے اور گونڈی کے پیچھے رہ جائے اور ایسا ہی ہوا۔ وہ ان دونوں کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ درمیان میں تین چار قدم کا فاصلہ ہوگا۔ نجمی کی دونوں جانب جنگل بڑا گھنا تھا۔ درختوں کے تنے ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے اور ان کے جھاڑ اوپر جا کر ایک دوسرے سے کھل مل گئے تھے وہاں دن کے وقت بھی ہلکا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

نجمی اس حقیقت سے پوری طرح باخبر تھی کہ یہ لوگ سے جنگل میں کسی ایسے مقام پر لئے جا رہے تھے جہاں سے اس کا نکلنا ناممکن ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ راستے

ہی میں کسی جگہ سے فرار ہو جانا چاہتی تھی۔ سوچ سمجھ کر آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔۔۔ دائیں بائیں بھی دیکھتی جاتی تھی۔ ایک مقام پر اس کے اور شیرے گوندی کے درمیان جنگلی جھاڑیاں آ گئیں۔ نجمی نے دائیں جانب دیکھا ادھر درختوں کے بیچ میں ایک چھوٹی سی کھائی تھی جس میں جھاڑ جھنکاڑ کی بھرمار تھی۔ یہ کھائی زیادہ گہری نہیں تھی اور پیچھے کی طرف چلی گئی تھی۔

نجمی نے مزید کچھ سوچے سمجھے بغیر کھائی میں چھلانگ دی اسے کھائی کے اوپر شیرے اور گوندی کے دوڑنے اور ایک دوسرے کو پکارنے کی آوازیں سنائی دیں۔ نجمی نے کھائی میں بے تحاشہ پیچھے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔



نجمی اندھا دھند بھاگتی جا رہی تھی۔ اس کے کپڑے جھاڑیوں میں اُلجھ رہے تھے اس کا دوپٹہ کسی کانٹے دار جھاڑی نے کھینچ لیا تھا۔ کھائی آگے جا کر بائیں جانب مڑ گئی سامنے تھوڑی سی چڑھائی آ گئی نجمی کھائی میں سے باہر نکلی تو سامنے شیرا اور گوندی کھڑے تھے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

شیرے نے آگے بڑھ کر نجمی کو بازو سے کھینچ کر نیچے گرا لیا اور اسے لاتوں اور گھونسوں سے مارنا شروع کر دیا۔ نجمی کی چیخیں نکل گئیں۔ آج تک کسی نے اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ شیرا اسے گندی گالیاں بھی دے رہا تھا نجمی کا دماغ پھٹنے لگا اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"مجھے معاف کر دو۔۔ معاف کر دو۔۔ اب نہیں بھاگوں گی۔" گوندی ریوالور لئے چپ چاپ کھڑا تھا۔ شیرے نے نجمی کو بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور غضب ناک لہجے میں بولا۔

"اب تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو میں پستول کی ساری گولیاں تیرے پیٹ میں اتار دوں گا تم مجھے جانتی نہیں ہو۔ میں اب تک تیرے نخرے اٹھا رہا ہوں میں تیرا

خون بھی کر سکتا ہوں۔ روتے روتے نجمی کی ہچکی بندھ گئی تھی اب انہوں نے اسے آگے لگا لیا۔ نجمی کا سارا جسم دکھ رہا تھا۔ اسے کبھی کسی نے نہیں پیٹا تھا اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ بے بس ہو چکی ہے اور اب خدا ہی اسے ان ظالموں کے چنگل سے نجات دلا سکتا ہے۔ وہ نقاہت کے ساتھ چل رہی تھی۔

شیرے نے اسے ایک بار پھر گالی دے کر کہا۔ "سیدھی ہو کر چلو۔" نجمی کو شیرے سے خوف آنے لگا تھا وہ بڑی مشکل سے سیدھی ہو کر چلنے لگی۔ گوندی آگے ہو گیا وہ راہنمائی کر رہا تھا کیونکہ اسے جنگل کے راستوں کا علم تھا۔ دوپہر کے وقت وہ ایک جگہ رک گئے یہاں ایک چھوٹا سا پہاڑی چشمہ بہہ رہا تھا۔

شیرے نے نجمی سے کہا کہ وہ ادھر منہ ہاتھ دھو لے اور خود گوندی کے ساتھ درختوں کی دوسری طرف چلا گیا۔ گوندی کہنے لگا۔ "یہاں ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنا۔ تھوڑا بہت کھا پی کر ہمیں آگے چل دینا چاہئے۔ میں چاہتا ہوں کہ شام ہونے سے پہلے پہلے ہم کرنانلی گاؤں پہنچ جائیں۔"

گوندی نے تھیلے سے روٹی اور بھینی کالی شیرے نے کچھ روٹی اور بھنی نجمی کو جا کر دی۔ نجمی چشمے کے پاس سر جھکائے بیٹھی تھی شیرے نے محبت سے کہا "میں برا آدمی نہیں ہوں پر تم میری بیوی ہو مجھ سے مقابلہ کرو گی تو میں تیرے ٹکڑے کر دوں گا میری مرضی کے مطابق چلو گی تو تمہیں رانی بنا کر رکھوں گا۔۔۔۔ لو یہ کھا لو ہمارے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔"

شیرا ذرا پرے ہٹ کر گوندی کے ساتھ بیٹھ گیا اور روٹی کھانے لگا۔ جنگل میں دور سے کسی جانور کے بولنے کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ چند لمحے آرام کرنے کے بعد ان کا سفر دوبارہ شروع ہو گیا یونہی چلتے چلتے وہ گھنے جنگل سے نکل کر ایسی جگہ آ گئے جہاں درخت دور دور اگے ہوئے تھے اور بائیں جانب پہاڑیوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ فضا میں حبس تھا، ہوا میں ساگوان اور دیودار کے درختوں کی ہلکی ہلکی مہک رچی ہوئی تھی۔

گونڈی نے سامنے والے درختوں کی طرف اشارہ کر کے کہا، "ان درختوں کے پیچھے اترائی ہے آگے سنتھالوں کی وادی ہے اور اس کے آگے کرنافلی دریا بہہ رہا ہے۔ اسی دریا کے کنارے ہمارے استاد کے منہ بولے بھائی بھلوا کا خفیہ اڈہ ہے تم یہاں چاہے ساری عمر رہنا تمہاری ہوا کی طرف بھی کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔"

شیرے نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے دور درختوں کی طرف دیکھا اور کہا، "تم کس دن واپس جاؤ گے؟" گونڈی نے بتایا، "وہ ہفتہ دس دن ٹھہرے گا۔" نجمی قریب ہی گھاس پر بیٹھی تھی اس کی پسلیاں درد کرنے لگی تھیں۔ وہ اب بے توجہی سے ان کی باتیں سن رہی تھی اس نے اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیا تھا خدا جانے اب اسے اپنے ماں باپ بھائی اور شبانہ کی شکل دیکھنی نصیب بھی ہو گی یا نہیں اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شیرے کا رویہ اب سخت ہو گیا تھا اس نے کرخت آواز میں کہا۔

"چلو اٹھو۔" نجمی جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ان کے ساتھ چلنے لگی۔ بھلوا کا خفیہ اڈا ابھی دور ہی تھا کہ درختوں کے پیچھے سے اچانک چار پانچ نیم وحشی کالے کالے آدمی نیزے اٹھائے نکل کر سامنے آ گئے انہوں نے گونڈی کو پہچان لیا گونڈی نے انہیں سلام کیا۔ ان سے ہاتھ ملایا اور ان کی زبان میں بتایا کہ استاد نے کراچی سے کچھ مہمان بھیجے ہیں بھلوا دادا کے پاس۔۔۔ بھلوا دادا ڈیرے پر ہی ہے کیا؟" نیم وحشی آدمی آگے آگے چلنے لگے۔

دریا کے کنارے کیچڑ اور سال کے گھنے درختوں کے نیچے ایک کھلی جگہ پر چھ سات بانس کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایک طرف زمین سے دو فٹ اونچی مچان اور پتھروں کی دیواروں اور کھپریل کی چھت والا کمرہ بنا ہوا تھا جس کے برآمدے میں بھلوا دھوتی اور واسکٹ پہنے بانس کی چٹائی پر بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ اس نے گونڈی کو دیکھا تو اٹھ کر گلے ملا استاد کا حال پوچھا۔

گونڈی نے کہا "بھلوا دادا! استاد نے یہ دو اپنے مہمان تمہارے پاس بھیجے ہیں یہ تمہارے پاس ہی رہیں گے یہ میاں بیوی ہیں۔" بھلوا نے شیرے سے گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی اپنا بھائی ہی سمجھو۔۔۔ کیا نام ہے تمہارا؟" شیرے نے اپنا نام بتایا تو بھلوا دادا نے شیرے کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔ "ادھر بھی سندر بن کا شیر کبھی کبھی آ جاتا ہے۔" پھر اس نے نجمی سے کہا۔

"بھابی! ادھر تم بے فکر ہو کر رہنا تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔" گونڈی نے الگ لے جا کر شیرے اور نجمی کے بارے میں پوری تفصیلات بیان کر دیں بھلوا دادا ہنس دیا کہنے لگا "پھر کیا ہوا۔۔۔ میاں بیوی نہ بھی ہوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا ہم تو یاروں کے یار ہیں یار کی دوست بھی ہماری بھابی ہوتی ہے۔"

بھلوا دادا نے فوراً مچان والے کمرے میں دو پلنگ رکھوا کر مچھر دانیاں لگوا دیں اور مرغیاں کاٹنے کا حکم دیا۔ ایک جھونپڑی سے ایک پکی عمر کی عورت نکل کر نجمی کے پاس آئی اور اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ اس نے نجمی کو نہلا دھلا کر ساڑھی پہننے کو دی نجمی کا جسم اب زیادہ دکھنے لگا تھا۔

اس عورت نے کہا "میرا نام مرتھا ہے۔۔۔ تمہارا نام کیا ہے؟ تم تو بڑی خوبصورت ہو۔" نجمی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے کالج میں بھی اس کی سہیلیاں اسے یہی کہا کرتی تھیں کہ تم بڑی خوبصورت ہو۔ ندیم بھی اسے یہی کہا کرتا تھا ندیم کا خیال آتے ہی نجمی کا حلق کڑوا ہو گیا وہ اپنے ماں باپ کو یاد کر کے رونے لگی۔

مرتھا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "روتی کیوں ہو؟" اچھا سمجھ گئی ابھی تم نئی نئی ہو میں بھی جب پہلی بار یہاں آئی تھی تو بہت رویا کرتی تھی اب میری طرف دیکھو۔۔۔ میں ہر وقت ہنستی رہتی ہوں۔۔۔ میں بہت خوش ہوں۔ بھلوا مجھے بڑا خوش رکھتا ہے۔۔۔ اری تمہارا آدمی تو جوان ہے۔" اور مرتھا قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

ٹھیک اسی وقت لاہور میں شبانہ بھی نجمی کو یاد کر رہی تھی وہ اپنی گاڑی میں کالج سے واپس اپنی نہر کنارے والی کوٹھی کینال لاج کی طرف آرہی تھی۔ نجمی کی گمشدگی اس کے لئے ایک معمہ بن کر رہ گئی تھی اسے لاپتہ ہونے چار پانچ مہینے ہوئے تھے۔ اس کے والد کا اسی غم میں انتقال ہو گیا تھا، سوتیلی ماں مکان کو تالا لگا کر اپنے آبائی گاؤں چلی گئی۔

ندیم روزانہ کی طرح کالج آتا تھا کبھی کبھی اس کی ملاقات شبانہ سے ہو جاتی تھی وہ کھویا کھویا سا رہتا تھا اب اسے بہت کم قہقہے لگاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ ایک روز شبانہ اس کے کالج پہنچ گئی شبانہ کی چھٹی حس نے بتا دیا تھا کہ ندیم کو نجمی کی گمشدگی کا علم ہے۔ ندیم شبانہ کو دیکھ کر کچھ گھبرا سا گیا کیونکہ وہ خاص طور پر اسے ملنے آئی تھی "میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں ندیم" ندیم سمجھ گیا کہ وہ اس سے کیا باتیں کرنا چاہتی ہے وہ کینٹین میں جا کر بیٹھ گئے۔

شبانہ نے بات شروع کرتے ہی پوچھا۔ "ندیم تم مجھے بتاتے کیوں نہیں کہ نجمی کہاں ہے؟ میں بھی تمہاری طرح اس سے محبت کرتی ہوں۔۔۔ وہ میری ایک ہی سہیلی تھی میں وعدہ کرتی ہوں کہ تم مجھے جو کچھ بتاؤ گے میں اس کا ذکر کسی سے نہیں کروں گی۔"

ندیم کا دل نجمی کے ساتھ کی گئی زیادتی پر اسے ہر وقت ملامت کرتا رہتا تھا وہ بھی چاہتا تھا کہ کسی کے سامنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرے اور شبانہ سے بہتر اور کوئی انسان اس کے لئے موزوں نہیں تھا پھر بھی ندیم نے قسم دے کر شبانہ سے وعدہ لیا کہ وہ کسی سے کوئی بات نہیں کرے گی پھر اس نے شبانہ کو نجمی کے بارے میں ایک ایک بات بیان کر دی۔

شبانہ تو اس کا منہ تکتی رہ گئی جب ندیم چپ ہو گیا تو اس نے کہا "تم نے نجمی کو تلاش کیوں نہیں کیا؟" ندیم گہرا سانس کھینچ کر بولا۔

"شبانہ! میں نے کراچی کا کونہ کونہ چھان مارا۔۔۔ میرے دوست زمان نے بھی نجمی کی تلاش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی بردہ فروش

گروہ کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔" شبانہ نے کہا۔

"اور تم اپنے دوست زمان پر ذرا سا بھی شک کرنے کو تیار نہیں ہو۔۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ساری اسکیم اسی کی تیار کی ہوئی تھی نجمی کو اسی نے گم کیا ہے ضرور اس کا تعلق پیشہ ور بردہ فروشوں سے ہے وہ جرائم پیشہ آدمی ہے تمہیں اس کے خلاف پولیس میں مقدمہ درج کرانا چاہیئے تھا۔"

ندیم نے جلدی سے کہا "خدا کے لئے ایسا پھر مت کہنا شبانہ۔۔۔ وہ ایسا نہیں ہے اس نے تو میری شادی کا سارا بندوبست کر رکھا تھا اور پھر اگر میں اس کے خلاف مقدمہ درج بھی کرا دوں تو کس بناء پر؟ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔" شبانہ سر جھکا کر گہری سوچ میں گم ہو گئی۔ اب تک نجمی نہ جانے کہاں کی کہاں پہنچ چکی ہو گی اس نے ندیم سے کہا۔

"ندیم! تم برا مت ماننا۔۔۔ مگر میں کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ تم نے نجمی کی زندگی ہی برباد نہیں کی بلکہ اس کے سارے خاندان کو تباہ کر دیا ہے تمہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تم اسے گھر سے بھاگنے کے لئے کہو اور پھر اسے بھگا کر ساتھ لے جاؤ تم نے اس کے ساتھ ایسا ظلم کیا ہے کہ میں تمہیں اب کیا کہوں۔" ندیم نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"شبانہ بہن! میرا ضمیر مجھے ہر وقت کچوکے لگاتا رہتا ہے رات کو نجمی کا خیال آتا ہے تو میں اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں مجھے ایک پل چین نہیں پڑتا تم مجھے ایسا نہ کہو میں۔۔۔ میں نے تو صرف نجمی سے شادی کرنے کے لئے یہ سب کچھ کیا تھا۔۔۔ مجھے کیا خبر تھی کہ اس کا ایسا المناک نتیجہ نکلے گا۔" شبانہ نے کہا۔

"اب تمہارا فرض ہے کہ ایک بار پھر کراچی اپنے جرائم پیشہ دوست زمان کے پاس جا کر ایک نئے زاویے سے نجمی کا سراغ لگانے کی کوشش کرو۔۔۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ زمان کو معلوم ہے نجمی کہاں ہے کیونکہ وہ جہاں بھی ہے اسے زمان نے ہی بھجوایا ہے۔"

ندیم خالی خالی نظروں سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا پھر وہ جیسے اپنے آپ بولا۔ "زمان ایسا نہیں کر سکتا۔۔۔ زمان ایسا نہیں کر سکتا۔" شبانہ نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"وہ کر سکتا ہے۔۔۔ تم صرف ایک سال سے اس کے دوست ہو مجھے یقین ہے کہ اسی نے اسکیم بنا کر نجمی کو گم کیا ہے تم ایک بار کراچی جا کر پتہ تو کرو۔۔۔ یہ تمہارا فرض ہے ندیم۔۔۔ نجمی کی زندگی کی تباہی کی آدھی ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے۔"

ندیم قائل ہو گیا۔ اب اس کا ذہن بھی اس طرح سوچنے لگا کہ بہت ممکن ہے زمان کے کسی ساتھی کی نیت خراب ہو گئی ہو اور اس نے دھوکے سے نجمی کو اغوا کر لیا ہو اسے کراچی جا کر زمان سے اس انداز میں ۔۔ کرنی چاہیئے زمان کی نیت پر اب بھی ندیم کو کسی قسم کا شک نہیں تھا اس نے شبانہ سے کہا۔

"شبانہ بہن! میں اسی ہفتے کالج سے چھٹی لے کر کراچی چلا جاؤں گا اور از سر نو تحقیقات کروں گا۔۔۔ اگرچہ زمان ایسا کبھی نہیں کر سکتا لیکن یہ کام اس کے کسی ساتھی کا بھی ہو سکتا ہے تم مطمئن رہو میں اس بار نجمی کا سراغ لگا کر ہی واپس آؤں گا۔"

شبانہ نے ندیم کے اس عزم کو سراہا اور اٹھتے ہوئے کہنے لگی۔ "میں اگلے ہفتے تمہیں ملوں گی خدا کرے کہ تم نجمی کو برآمد کرانے میں کامیاب ہو جاؤ۔۔۔ سنو! اگر کراچی پولیس کی مدد لینی پڑے تو ہچکچانا نہیں۔۔۔ قانون آخر قانون ہوتا ہے پولیس ضرور تمہاری مدد کرے گی۔"

شبانہ واپس اپنے کالج چلی آئی۔ کالج سے وہ دوپہر کے وقت فارغ ہو کر اپنی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئی۔ جون کے دن تھے نہر کنارے پاپلر کے درخت ہرے ہرے پتوں سے بھر گئے تھے۔ گرم لو چل رہی تھی ابھی ساون شروع نہیں ہوا تھا۔ شدید تپش کی وجہ سے مال اور کینال بینک کی سڑکیں پیدل چلنے والوں سے تقریباً خالی تھیں نہر میں ضرور کچھ لڑکے چھلانگیں لگا رہے تھے۔ اپنی کوٹھی کینال لاج والا چھوٹا سا پل عبور کرتے ہوئے شبانہ کی نظر سامنے املتاس کے درخت پر پڑی املتاس کی شاخوں سے

زرد رنگ کے پھولوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ شبانہ کی گاڑی درخت کے قریب سے گزری تو اسے املتاس کی گہری گہری گرم خوشبو آئی۔ دھوپ، تپش اور لو کی وجہ سے املتاس کے درخت کے گرد اس کے زرد پھولوں کی بسنتی روشنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ شبانہ نے گاڑی گیراج میں بند کی اور درختوں کے نیچے سے گزرتی کوٹھی کے ٹھنڈے برآمدے میں آ گئی۔

دروازہ کھول کر سٹنگ روم میں آئی تو اس کی نظر اپنے والد اور بڑے بھائی عقیل پر پڑی وہ دونوں سر جوڑے کونے والے صوفے پر سامنے کوئی فائل کھولے بیٹھے تھے انہوں نے شبانہ کی طرف ایک لمحے کے لئے بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ شبانہ سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے میں آ گئی کمرے کا اے سی چل رہا تھا۔ فضا میں بڑی، لطیف خوشگوار خنکی تھی۔ باہر اور اندر کی فضا میں زمین و آسمان کا فرق تھا اسے ایسے لگا جیسے وہ صحراؤں کی تپتی دھوپ سے نکل کر اچانک کسی پر فضا ٹھنڈے پہاڑی مقام پر آ گئی ہو۔ باتھ روم میں جا کر اس نے منہ ہاتھ دھویا، بالوں میں برش پھیرا دوسرے کپڑے بدلے اور کچن کی طرف جا رہی تھی کہ دوسری منزل کی راہداری میں اسے بھابی مل گئی۔ اس نے کہا۔

"کھانا میرے کمرے میں ہی کھا لینا ــــ کھانا لگ گیا کیا؟" شبانہ نے پوچھا۔

"ہاں" بھابی نے دھیمی آواز میں کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شبانہ بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر آ گئی۔ میز پر کھانا لگ چکا تھا بھابی کچھ چپ چپ سی تھی۔ پیچھے ابو اور بھائی بھی کسی معاملے میں الجھے ہوئے لگتے تھے۔ شبانہ نے کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے بھابی سے پوچھا۔

"آج گھر میں سب چپ چپ سے ہیں۔۔۔ خیریت تو ہے نا بھابی؟" بھابی کی زبانی شبانہ کو معلوم ہوا کہ کاروبار میں زبردست نقصان ہو گیا ہے اور حکومت کی طرف سے نوٹس ملا ہے کہ اگر پندرہ دنوں کے اندر اندر سرکار کے خزانے میں دس لاکھ روپے جمع نہ کرائے گئے تو ساری جائیداد قرق کر لی جائے گی اگر جائیداد کی قرقی سے بھی حکومت کی مطلوبہ رقم پوری نہ ہوئی تو جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔

شبانہ بے انتہا پریشان ہو گئی وہ کھانا نہ کھا سکی نیچے اپنے ابو اور بھائی کے پاس آ گئی معلوم ہوا کہ بھابی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ شبانہ کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے ابو اور بھائی کو سرکاری ٹھیکیداری میں یہ نقصان کیوں اور کیسے ہوا وہ تو اس لئے پریشان تھی کہ اس کے پیارے ابو اور بھائی پر بہت بڑی مصیبت آن پڑی تھی۔ اس زمانے میں دس لاکھ کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔ ابو اور بھائی کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ ابو تو بار بار پانی پی رہے تھے۔

شبانہ نے انہیں حوصلہ دینا چاہا تو وہ بولے "بیٹی! یہ کوٹھی اور شہر والا مکان بیچ کر بھی چھ ساڑھے چھ لاکھ روپے کی ضرورت ہو گی۔" پھر آہ بھر کر بولے۔

"بینک بھی ہمارا اعتبار کرنے کو تیار نہیں ہے اب تو ظفر کو امریکہ فون کرنا پڑے گا اس مصیبت میں شاید وہی ہماری کچھ مدد کر سکے واشنگٹن میں آج کل اس کا لاکھوں ڈالر کا کاروبار ہے ہم صرف اس سے قرض حسنہ ہی لیں گے اللہ نے چاہا تو بہت جلد رقم اسے واپس کر دیں گے۔"

شبانہ کے دل کو چوٹ سی لگی وہ نہیں چاہتی تھی کہ ظفر ایسے آدمی کا احسان لیا جائے مگر وہ اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ اپنے ابو اور بھائی کو اس ارادے سے باز رکھ سکتی۔ ان کے پاس بھی دوسرا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ دس لاکھ کی رقم انہیں کوئی بھی قرض نہیں دے سکتا تھا اسی روز ظفر کو واشنگٹن فون کیا گیا۔

شبانہ کے ابو نے اسے صورتحال سے باخبر کیا تو وہ سمجھ گیا کہ یہ لوگ اس کے دام میں اپنے آپ آ گئے ہیں۔ روپے پیسے کی ظفر کے پاس کمی نہیں تھی وہ کاروباری آدمی تھا اور شبانہ کے ابو اور بھائی سے بھی وہ کاروبار کرنا چاہتا تھا مگر اسے شبانہ کو نیچا دکھانے کا نادر موقع مل گیا تھا اس نے کہا میں لاہور پہنچ رہا ہوں وہاں آ کر بات کروں گا۔" تین دن کے بعد ظفر لاہور پہنچ گیا۔ شبانہ کالج میں تھی کالج سے واپس آئی تو ظفر ڈرائنگ روم میں بیٹھا اس کے ابو اور بھائی سے باتیں کر رہا تھا۔

شام تک یہ میٹنگ ہوتی رہی بعد میں بھابی کی زبانی شبانہ کو پتہ چلا کہ ظفر نے

شبانہ کے ابو کو دس لاکھ کی رقم بھیجنے کی حامی بھر لی ہے لیکن اس کے عوض اس نے اندرون شہر والا مکان اور کینال بینک والی کوٹھی کینال لاج اپنے نام لکھوا لی ہے۔ شبانہ کے ابو نے یہ جائیداد اس لئے بھی ظفر کے نام کر دی کیونکہ شبانہ کی شادی اس کے ایم اے کرنے کے بعد ظفر سے ہونے ہی والی تھی۔

رات کے کھانے پر سبھی لوگ جمع تھے ظفر بڑا خوش تھا۔ شبانہ کے ابو اور بھائی، عقیل خوشامد کی حد تک ظفر کی تعریف کر رہے تھے۔ ظفر پہلے سے زیادہ صحت مند ہو گیا تھا اس کا لباس بھی بہت قیمتی تھا مگر آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے وہ کنکھیوں سے شبانہ کی طرف یوں دیکھ لیتا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اب میں دیکھوں گا کہ تمہیں مجھے تھپڑ مارنے کی جرأت کیسے ہوئی تھی۔ شبانہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بری طرح جکڑ دی گئی ہے اور اسے ماں باپ اور خاندان کی عزت کی قربان گاہ پر چڑھا دیا گیا ہے۔ پہلے اس کا ارادہ تھا کہ وہ ظفر کے ساتھ شادی سے انکار کر دے گی اور بھائی اور ابو کو منا لے گی مگر اب وہ خواہش کے باوجود ایسا نہیں کر سکتی تھی۔

اسے ظفر کی زرخرید لونڈی بنا دیا گیا تھا وہ اس کے سامنے زبان بھی نہیں کھول سکتی تھی اس نے شبانہ کے باپ اور بھائی کو جیل سے بچا لیا تھا اور چاہے دونوں مکان اپنے نام کروا لئے تھے لیکن ان کے عوض دس لاکھ روپے کی ادائیگی کی حامی بھر لی تھی جو انہیں کوئی دوسرا آدمی نہیں دے سکتا تھا۔ کھانے کی میز پر ظفر نے کئی بار شبانہ سے بات کرنے کی کوشش کی مگر شبانہ بیزاری سے ہوں ہاں کہہ کر چپ ہو گئی۔

کھانے کے بعد شبانہ لان میں اپنی بھابی کے پاس بیٹھی جوس پی رہی تھی کہ ظفر امریکی قمیض پتلون میں سگریٹ منہ میں دبائے آن حاضر ہوا۔ "ہائے لیڈیز!" شبانہ کو اس کا انداز تخاطب زہر لگا۔ بھابی آہستہ سے مسکراتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔۔۔ کیونکہ بہرحال شبانہ اور ظفر کی منگنی ہو چکی تھی اور اب تو شادی لازمی بن گئی تھی۔ ظفر آرام کرسی پر دھپ سے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہاں گرمی زیادہ ہے واشنگٹن میں موسم اتنا گرم نہیں ہوتا۔"

شبانہ خاموشی سے جوس کا گلاس ہاتھ میں لئے سامنے دیکھتی رہی۔ ظفر نے ذرا آگے

جھک کر کہا "میں چاہتا ہوں اگر موسم بہار میں تم میرے پاس واشنگٹن آجاؤ۔" شبانہ نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔ ظفر نے سگریٹ گھاس پر پھینک کر اسے پاؤں سے مسل دیا اور بولا۔

"اب تمہیں واشنگٹن آنے سے کوئی نہیں روک سکے گا ویسے میں نہیں چاہتا کہ تم ایم اے کے فائنل ایئر کا امتحان دو اس کی ضرورت نہیں ہے۔" شبانہ کے کان گرم ہو گئے وہ اندر اندر ہی کھولنے لگی آخر وہ نہ رہ سکی اس کے منہ سے نکل ہی گیا۔

"تم کون ہوتے ہو مجھ پر حکم چلانے والے؟ میں ایم اے کروں چاہے نہ کروں۔۔۔" ظفر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اس نے دانت چباتے ہوئے کہا "میں کون ہوتا ہوں۔۔۔ یہ اپنے ابوجان سے پوچھنا تم ایم اے نہیں کرو گی۔" اور یہ کہہ کر ظفر تیز تیز قدم اٹھاتا لان سے چلا گیا۔ شبانہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ ابوجان سے کیا پوچھتی اسے تو سب کچھ معلوم تھا اسے اپنے جسم کے ساتھ لپٹی ہوئی زنجیروں کی جھنکار سنائی دینے لگی تھی یہ وہ زنجیریں تھیں جن کو شبانہ زندگی بھر نہیں توڑ سکتی تھی۔ ظفر واپس چلا گیا اسی ہفتے ظفر نے دس لاکھ روپے بینک کے ذریعے بھجوا دیئے اس روز گھر میں ہر کوئی خوش و خرم تھا۔

ابو کو تو جیسے نئی زندگی مل گئی تھی ان کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ بھائی بھی بے حد خوش تھا اسی روز رقم سرکاری خزانے میں جمع کرا دی گئی اور شبانہ کے ابو اور بھائی تباہی کے گڑھے میں گرتے گرتے بچ گئے۔ ظفر نے واشنگٹن پہنچ کر روپے بھیجنے کے بعد شبانہ کے ابو کو لکھ بھیجا کہ وہ جلدی شادی کرنا چاہتا ہے شبانہ کو ایم اے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں آگے پڑھائی وہ امریکہ میں آ کر بھی پوری کر سکتی ہے۔

ظفر کی خواہش اب حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ ابو اور بھائی نے شبانہ کو صاف صاف کہہ دیا کہ اسے لاہور میں ایم اے کرنے کی بجائے واشنگٹن جا کر ایم اے کرنا ہوگا کیونکہ ظفر وہاں بالکل اکیلا ہے۔ شبانہ گم سم ہو کر رہ گئی وہ کیسے انکار کر سکتی تھی۔ ظفر اس کے چھوٹے بھائی عامر کے بھی تعلیمی اخراجات برداشت کر رہا تھا جو کیلیفورنیا یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا شبانہ نے اپنے آپ کو باپ اور بھائیوں پر قربان کر دیا اور ابو سے کہا کہ وہ جب کہیں گے وہ کالج جانا چھوڑ دے گی۔ ظفر کو ٹیلی فون کیا گیا کہ وہ شادی کے لئے کب لاہور آ سکتا ہے۔

اس نے چھ ماہ بعد کی ایک تاریخ دے دی ایک اعتبار سے شبانہ کی شادی کا دن پکا ہو گیا۔

اس رات شبانہ اپنے بستر میں بہت روئی اسے اپنی والدہ اور بہن غزالہ یاد آئی جو اگر زندہ ہوتیں تو شاید حالات کی شکل یہ نہ ہوتی۔ پھر اسے راحیل کا خیال آیا مگر راحیل تو ایک خیال پرست ہیولا تھا وہ کون تھا، کہاں سے آتا تھا، کہاں چلا جاتا تھا؟ شبانہ کو کچھ علم نہیں تھا وہ اس سے کیا توقع لگا سکتی تھی اور اگر وہ چاہتا بھی تو شبانہ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا وقت گزرتا چلا گیا۔

ندیم اس عرصہ میں نجمی کی تلاش میں کراچی جا چکا تھا۔ وہ سیدھا زمان کے ہوٹل میں گیا۔ زمان نے اسے آتا دیکھا تو بڑے تپاک سے ملا اور فکر مند چہرہ بنا کر پوچھنے لگا۔ "بھابی کا کوئی پتہ چلا؟" ندیم نے کہا۔

"زمان بھائی! میں اسی لئے ایک بار پھر تمہارے پاس آیا ہوں۔۔۔ نجمی تو ایسے گم ہو گئی ہے کہ جیسے اسے آسمان کھا گیا ہو اس کے والد کا پیچھے انتقال ہو گیا ہے۔ سوتیلی ماں اپنے بیٹے کو لے کر گاؤں جا کر آباد ہو گئی آخر وہ کب تک رشتے داروں اور محلے والوں کے طعنے سن سکتی تھی میں نے تو سوچا ہے کہ یہ معاملہ پولیس کو دے دوں۔" زمان چوکس ہو گیا بولا۔

"ندیم۔۔۔ میرے دوست۔۔۔ میرے بھائی پولیس والوں کو کیس دینے سے بڑی بدنامی ہو گی اور پھر تمہارے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں ہے کہ نجمی یہاں سے گم ہوئی ہے دیکھو نا۔۔۔ میں کاروباری آدمی ہوں اگر پولیس مجھ سے آ کر پوچھے گی تو بھائی مجھے اپنا کاروبار بچانے کے لئے یہی کہنا پڑے گا کہ میں نے اس نام کی عورت کو کبھی دیکھا تک نہیں۔۔۔ پولیس تمہیں بھی گھسیٹتی پھرے گی پھر تم نجمی کو اغواء کر کے لائے تھے تم پر بھی کیس چل پڑے گا بہت سی باتیں تمہیں سوجھی نہیں ہوں گی اس کے باوجود یہ کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ نجمی برآمد کر لی جائے گی۔" ندیم کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ نجمی کو اسی ہوٹل کے کسی آدمی نے اغواء کیا ہے۔" زمان نے میز پر مکا مارتے ہوئے کہا۔

"خدا کی قسم اگر میرے ہوٹل کا کوئی آدمی تمہاری طرف یا تمہاری بیوی کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھے تو میں کھڑے کھڑے اس کی آنکھیں نکال دوں۔۔۔ اس کی کھال کھینچ کر رکھ دوں گا۔" اس نے سر کو نفی میں ہلا کر بڑے اعتماد سے کہا۔

"نہیں میرے دوست! یہ کسی باہر کے آدمی کا کام ہے کوئی تمہارے پیچھے یقیناً لاہور سے ہی لگا ہوگا اسے معلوم ہوگا کہ تم لاہور سے بھاگ کر کراچی جا رہے ہو۔۔۔ وہ موقع کے انتظار میں رہا جونہی نجمی بھابی اکیلی ہوٹل سے ذرا دور گئیں اس آدمی نے اسے وہیں دبوچ لیا اتنے دن ہو گئے ہیں یہ کسی تجربے کار گینگ کا ہی کام ہو سکتا ہے میرا کوئی آدمی ایسا کرتا تو وہ ضرور کچھ دنوں کے لئے یہاں سے غیر حاضر ہو جاتا جبکہ ایسا نہیں ہے میرے سب آدمی اسی جگہ ہوٹل میں موجود ہیں۔

ندیم چپ ہو گیا وہ یہ کہہ سکتا تھا اسے تو زمان کے سارے آدمیوں کی پوری طرح سے شناخت بھی نہیں تھی۔ وہ اسی کے ہوٹل میں ٹھہرا تھا اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں اس کی شادی ہونے والی تھی کہ آسمان سے جیسے بجلی گری اور حجلہ عروسی برباد ہو گیا، دلہن غائب ہو گئی اسے زمین کھا گئی یا آسمان نے اٹھا لیا۔

ندیم شکستہ دل لئے دیر تک اپنے کمرے کے پلنگ پر بیٹھا نجمی کو یاد کرتا رہا کہ خدا جانے وہ بدنصیب لڑکی کہاں ہو گی۔ اپنے آپ کو وہ نجمی کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرانے میں حق بجانب تھا اگر وہ اسے مجبور نہ کرتا تو نجمی کبھی اس کے ساتھ گھر سے نہ بھاگتی۔ اس نے نجمی کو مجبور کیا تھا لیکن وہ تو شادی کر کے فوراً واپس اپنے ماں باپ کے پاس جانا چاہتا تھا مگر ہمارے معاشرے میں کسی لڑکی کا گھر سے بھاگنا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی اور یہ معمولی بات تھی بھی نہیں نجمی نے بہت بڑی حماقت کی تھی ندیم کی باتوں میں آ کر اپنے گھر سے بھاگ کر جو لڑکی ایک بار گھر سے نکل جائے یا کا بچہ نیچے گر پڑے پھر اسے کبھی گھونسلے کا ... نصیب نہیں ہوتا۔

نوکر ندیم کے لئے کھانا لے آیا ندیم کو بالکل بھوک نہیں تھی مگر جسم و جاں کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے تھوڑا بہت کھانا ضروری تھا۔ نوکر کھانا رکھ کر جانے لگا تو ندیم نے یونہی اس

سے پوچھا اس ہوٹل میں کتنے نوکر کام کرتے ہیں؟ اس نے تھوڑی سی تعداد بتائی ندیم کو ان آدمیوں کا خیال آ گیا جو نجمی سے اس کے نکاح کے وقت بطور گواہ اچکنیں پہن کر سروں پر ٹوپیاں جما کر آئے تھے وہ بھی زمان کے اپنے آدمی ہی تھے ان میں سے کوئی آدمی ندیم کو کل سے ہوٹل میں دکھائی نہیں دیا تھا اس نے نوکر سے پوچھا۔

"زمان صاحب کے اپنے آدمی بھی ہوٹل میں ہی رہتے ہیں۔" نوکر نے کہا

"صاحب جی یہ تو مجھے معلوم نہیں جی۔" اور وہ کمرے سے نکل گیا۔ ندیم کو اب خیال آنے لگا کہ زمان کے اپنے آدمی کہاں ہیں۔ ان میں سے ابھی تک اسے کوئی ایک بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ کھانا کھانے کے بعد نیچے لابی میں آ گیا کاؤنٹر پر زمان کی جگہ ایک نوکر بیٹھا تھا لوگ ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے یا کھانا کھا کر جا رہے تھے۔ ندیم کاؤنٹر کے پاس بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا تھوڑی دیر بعد جب رش کم ہوا تو ندیم نے کاؤنٹر پر موجود نوکر سے پوچھا۔

"زمان صاحب کہاں گئے ہیں۔" نوکر نے کہا۔

"وہ شاید سکھر گئے ہیں صبح تک واپس آ جائیں گے۔" ندیم سوچنے لگا یہ شخص اچانک سکھر کیوں روانہ ہو گیا ہے؟ کچھ دیر کاؤنٹر کے پاس بیٹھے رہنے کے بعد ندیم ہوٹل کی سیڑھیاں اتر کر باہر چھوٹے سے باغیچے میں آ گیا موسم گرم تھا مگر تھوڑی دیر پہلے ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی چوکیدار چارپائی پر اکڑوں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ ندیم کو اس نے کئی بار زمان کے ساتھ دیکھا تھا وہ اسے اپنے مالک کا گہرا دوست سمجھتا تھا۔ ندیم اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہا۔

"بابا! پچھلی دفعہ میں آیا تھا تو زمان صاحب کے کچھ دوست یہاں ملے تھے۔ اس بار ان میں سے ایک بھی نظر نہیں آ رہا۔ یہ لوگ زمان صاحب کے ساتھ ہی سکھر گئے ہیں کیا۔" چوکیدار بولا۔

"صاحب تو اکیلا ہی سکھر گیا ہے۔ ویسے صاحب کے دوستوں میں سے سبھی یہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔ تم کل لاہور سے آئے ہو۔ پرسوں وہ سب لوگ یہاں موجود تھے۔ ہاں ان میں سے شبیرا اب دکھائی نہیں دیتا۔" ندیم کے کان کھڑے ہو گئے۔ مگر اس نے بڑے

بھو لینے سے پوچھا۔ "شیرا ابھی یہیں کہیں ہوگا۔" چوکیدار نے کہا۔

"یہاں ہوتا تو ضرور آتا۔ وہ تو یہاں آئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ پچھلے کئی ماہ سے وہ غائب ہے۔" ندیم نے بظاہر بے تعلقی سے پوچھا۔ "وہ بیمار ہوگا۔ اپنے گھر لاہور یا حیدر آباد چلا گیا ہوگا۔" چوکیدار نے کہا۔

"اس کا تو یہی ہوٹل گھر تھا۔ اسی ہوٹل کے کمرے میں رہتا تھا وہ۔ میرا خیال ہے زمان صاحب نے اسے کسی لمبے پھیرے پر باہر بھیجا ہے۔" ندیم نے پوچھا۔ "یہ پھیرا کیا ہوتا ہے بابا۔ اب چوکیدار کو احساس ہوا کہ وہ ایسی باتیں کہہ گیا ہے جو اسے نہیں کرنی چاہئے تھیں اس نے زور سے کھنکار کر کہا۔ "ہوٹل کے لئے پنجاب سے گھی اور آٹا لینے ہمارے اپنے آدمی ہی جاتے ہیں شیرا ابھی ادھر ہی گیا ہوگا۔"

اور چوکیدار اٹھ کر پانی پینے کے بہانے دوسری طرف چلا گیا۔ ندیم کو ایک اشارہ ضرور مل گیا تھا کہ زمان کے اپنے ساتھیوں میں سے ایک آدمی شیرا غائب ہے اور زمان کے آدمی کسی جگہ پھیرا لگانے بھی جاتے ہیں ندیم کو کبھی کبھی یہ خیال ضرور آتا تھا کہ اس کا دوست زمان ایک چھوٹے سے ہوٹل کا مالک ہوتے ہوئے اتنے ٹھاٹھ باٹھ سے زندگی بسر نہیں کر سکتا جبکہ ہوٹل میں مسافر بھی اتنے نہیں آتے تھے۔

ندیم نے اس سلسلے میں مزید سراغ لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے پیچھے اپنے کالج میں مزید چھ دن کی چھٹی کا تار روانہ کر دیا۔ شبانہ پہلے بھی کالج میں صرف نجمی کے ساتھ ہی تھوڑا ہنس کھیل لیا کرتی تھی۔ نجمی کی گمشدگی کے بعد اس نے کسی سہیلی سے زیادہ میل جول نہیں بڑھایا تھا لیکن اب جبکہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ ایم اے کا اگلا فائنل سال مکمل نہ کر سکے گی تو وہ اداس اداس رہنے لگی۔ ظفر کو شبانہ کے ایم اے کرنے یا نہ کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صرف اس کی انا کو شکست دینا چاہتا تھا۔ وہ صرف اس کی شخصیت کی خود پسندی اور وقار کو دو ٹکڑے کرنا چاہتا تھا۔

شبانہ اب کالج کے در و دیوار ٹھنڈے پرسکون برآمدوں، سرسبز لان اور کیفے ٹیریا کے باہر اُگے ہوئے سایہ دار نیم کے درختوں اور پھولوں کے ننھے ننھے پودوں سے گونجتی

راہداریوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتی۔ اسے معلوم تھا کہ کچھ دنوں کے بعد یہ تمام مناظر اور یہ پرسکون تعلیمی فضا اس سے ہمیشہ کے لئے چھین لی جائے گی اور اس کے پاس پھر یہاں کی یادیں ہی رہ جائیں گی۔ اس وقت شبانہ کے دل میں خیال آتا کہ کاش وہ دنیا میں اکیلی ہوتی اس کے کوئی ماں باپ نہ ہوتے بہن بھائی نہ ہوتے۔ اسے کسی بت کے آگے قربانی کا بکرا نہ بننا پڑتا۔ آخر اسے کس جرم کی سزا مل رہی تھی؟ کیا اس جرم کی سزا مل رہی تھی کہ وہ قدرت کے حسن اور کائنات کی خوبصورتی کی عاشق تھی اور اس نے اپنے ذہن میں حسن، پاکیزگی، سچائی اور آٹے چاول کی دنیا سے دور لطیف جذبوں کا ایک آئیڈیل بنایا ہوا تھا؟ کیا اس لئے کہ اس نے دنیا داری کے تالاب کی دلدل سے کنول پھول کی طرح اپنا چہرہ باہر نکال رکھا تھا؟

اگر دلدل کے اندر رہنے والوں کو زندہ رہنے کا حق ہے تو دلدل سے باہر رہنے والوں کو بھی زندہ رہنے کا اتنا ہی حق ہے۔ شبانہ اپنے لطیف خوابوں اور روحانی خیالات میں رہنے والی لڑکی تھی۔ اس دنیا سے اس کا رشتہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کے باوجود شبانہ کو اپنے ماں باپ کے جذبوں خیالوں اور خوابوں کا بے حد احترام تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کچھ جذبے کچھ روایتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جنہیں خواہش کے باوجود بھی کبھی نہیں توڑنا چاہیئے۔ اس نے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے جذبات کا ہمیشہ احترام کیا تھا اور وہ مرتے دم تک اسی اصول پر قائم رہنا چاہتی تھی۔ چنانچہ ظفر کے ایماء پر شبانہ کے ابو نے اسے جو حکم دیا۔ شبانہ نے سر خم تسلیم کر لیا تھا زندگی کے بعض مقام ایسے ہوتے ہیں کہ جہاں انسان کی ہار میں ہی اس کی فتح ہوتی ہے۔

شبانہ کو اب راحیل کی یاد شدت سے آنے لگی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ کر اس کے پائپ اور سرخ گلاب کی پنکھڑیوں سے نکلتی خوشبو محسوس کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس کی باتیں سننا چاہتی تھی جو اس دنیا کی باتیں نہیں تھیں۔ شبانہ کو وہ جنت کی باتیں محسوس ہوتی تھیں یعنی اس دنیا سے بہت دور۔۔۔ کسی ایسی سرزمین کی باتیں کہ جہاں زمین نہیں تھی۔ پھول بھی نہیں تھے۔ جہاں خوشبو پھولوں کی کثافت تھی جہاں روشنی زمین کی سرزمین تھی جہاں

صرف ایک احساس تھا خوشبو کا احساس، روشنی کا احساس، سچائی، پاکیزگی اور حسن بے پرداہ کا احساس۔ شبانہ کئی بار لاہور کی لائبریری میں بھی گئی مگر اسے راحیل کے پائپ کی خوشبو نہ آئی۔ ایک روز آسمان پر کالی گھٹائیں چھا گئیں اور ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں۔ شبانہ کا چہرہ کالی گھٹاؤں، ٹھنڈی ہواؤں میں اڑتی املتاس کے زرد پھولوں کی خوشبو اور مکانوں، کمروں سے نکلتی چائے کی مہک کے احساس سے چمک رہا تھا۔ وہ گاڑی نکال کر کینال بینک پر آئی تو ایک سرخ رنگ کی کار اس کے قریب سے ہو کر گزر گئی۔ شبانہ چونکی۔ اسے یوں لگا جیسے کار راحیل چلا رہا تھا۔ اس نے وہیں سے گاڑی ٹرن کی اور سرخ کار کے پیچھے تیز رفتاری سے چلی۔

سرخ گاڑی شبانہ کی نگاہ میں تھی۔ کینال بینک کی پاپولر کے درختوں میں گھری ہوئی سڑک دور تک ویران تھی۔ ساون کی ابر آلود فضا میں درختوں کی شاخیں ٹھنڈی ہواؤں میں دھیرے دھیرے لہرا رہی تھیں۔ بھری ہوئی نہر کا رتیلا ٹھنڈا پانی سکون سے بہہ رہا تھا۔ شبانہ کو یقین تھا کہ سرخ کار میں اس نے راحیل کو دیکھا ہے۔ وہی چوڑے شانے، یونانی ناک سیاہ بالوں میں لہراتی سفید بالوں کی جھلک اور ہونٹوں میں دبا ہوا آبنوسی پائپ۔۔۔۔
یہ سوائے راحیل کے اور کون ہو سکتا تھا؟

شبانہ ایک عجیب سے والہانہ جذبے کے ساتھ سرخ کار کا تعاقب کر رہی تھی یونانی ناک اور کنپٹیوں پر طلوع ہوتی سفید بالوں کی روشنی والے راحیل نے شبانہ کے دل میں زندگی کے سوئے ہوئے جذبوں کو جیسے گہری نیند سے جگا دیا تھا۔ وہ اپنے اندر ایک نئی طاقت نئی تابندگی محسوس کر رہی تھی۔ راحیل کی ایک جھلک دیکھ لینے سے شبانہ کو اپنے تمام غم فکر، تمام مسائل سارے دکھ بے حقیقت لگنے لگے تھے۔ اسے فضاؤں میں پائپ کے تمباکو کی خوشبو اور گلاب کے تر و تازہ سرخ پھولوں کی مہک آنے لگی تھی۔

یہ قدیم وینس کے شاہی باغات اور غرناطہ کے عالی شان محرابی باغیچوں میں کھلے ہوئے پھولوں کی خوشبوئیں تھیں۔ پھول غرناطہ اور وینس کے زوال کے ساتھ ہی مرجھا کر بکھر گئے تھے لیکن ان کی خوشبوئیں زندہ تھیں اور اپنے چاہنے والوں کی تلاش میں سرگرداں تھیں اور اب ان کے کارواں کی ایک بچھڑی ہوئی لہر لاہور کے کینال بینک

کی سڑک پر رواں تھیں۔

سرخ کار کی رفتار تیز تھی۔۔۔ شبانہ نے بھی اپنی گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔۔۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنے خوابوں کا پیچھا کر رہی ہے۔ جیسے وہ اپنے وجود سے بچھڑے ہوئے جذبوں کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ جیسے وہ غروب ہوتے سورج کی کرن ہے اور طلوع ہوتے سورج کی روشنیوں کے سمندر میں گم ہونے جا رہی ہے اس کی نظریں دُور جاتی سرخ کار پر جمی تھیں۔ نہر پر بنا ہوا لکڑی کا چھوٹا سا پل گزر گیا۔

شبانہ نے سرخ کار کو بائیں جانب ٹاہلیوں کے درمیان سے گزرتی کچی سڑک پر مڑتے دیکھا۔۔۔ اس کا چہرہ ان جانی مسرت سے چمک اٹھا۔ یہ راحیل ہی تھا اور نہر کنارے والی پرانی بوسیدہ کوٹھی کی طرف جا رہا تھا جہاں چھوٹی سی ندی کے کنارے سرخ اور نیلے انگور کی بیلیں بانس کی چھت پر جھکی ہوئی تھیں اور جہاں نہر کی طرف سے جو ٹھنڈی ہوا آتی تھی اس میں پانی میں ڈوبی ہوئی گھاس اور موتیے کی خوشبو ہوتی تھی۔

شبانہ نے اپنی گاڑی ٹاہلیوں والی چھوٹی سی کچی سڑک پر موڑی تو سڑک دُور تک خالی تھی۔ راحیل کی کار کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر سڑک پر اڑتی ہوئی ہلکی ہلکی گرد اس بات کی طرف اشارہ کر رہی تھی کہ ابھی ابھی یہاں سے کوئی گاڑی گزری ہے۔ شبانہ نے گاڑی کی رفتار کم کر دی۔ سامنے پرانی کوٹھی کا سنسان برآمدہ اور خاموش صحن تھا۔ شبانہ گاڑی کو کوٹھی کے کشادہ کچے صحن میں لے گئی۔ اس نے دیکھا کہ دائیں جانب جھکی ہوئی چھت والے گیراج کے باہر وہی سرخ گاڑی کھڑی تھی۔ شبانہ نے وہیں ایک طرف اپنی گاڑی کھڑی کر دی۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ویران برآمدے میں آ گئی۔ یوکلپٹس کی شاخ پر ایک بلبل کہیں سے آ کر بیٹھ گئی۔ شاخ تھوڑی دیر جھولنے کے بعد رک گئی۔ شبانہ دوسری بار اس غیر آباد نیم آسیبی کوٹھی میں آئی تھی۔ پہلے اسے یہاں ایک چوکیدار ملا تھا۔۔۔ اب وہ چوکیدار بھی نہیں تھا۔ پہلو کی جانب بڑی نہر میں سے نکلی ہوئی چھوٹی سی نہر تھوڑا سا خم کھا کر کوٹھی کے پیچھے جا رہی تھی۔

کوٹھی کے پیچھے آگے جا کر شاید مالٹوں کے باغ تھے جن کو یہ نہر سیراب کرتی تھی اور انگور اور لوکاٹ کے باغ بھی تھے جن کے خوشے اس نہر کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے تھے۔ سامنے اس کمرے کا دروازہ تھا جہاں شبانہ کو راحیل ملا تھا۔ کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ شبانہ دروازے کے قریب پہنچی تو اسے پائپ کی خوشبو میں گلاب کے پھولوں کی مہک محسوس ہوئی۔ یہ خوشبو نیم وا دروازے میں سے آ رہی تھی۔

اب شبانہ کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے رک گئی۔ آخر وہ ایک ایسے شخص سے ملنے کیوں جا رہی ہے جس نے کبھی اس کے جذباتی مسائل میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ جس نے کبھی اس کے دل کی تپش کو محسوس نہیں کیا۔ جس نے کبھی اس کی آنکھوں میں جھانک کر اس کی روح کے کرب کو نہیں دیکھا۔ جو اس سے بات کرتا ہے تو لگتا ہے کہ وہ اپنے آپ سے گفتگو کر رہا ہے۔ جو اس کی طرف دیکھتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی نظریں شبانہ کے پیچھے کسی کو دیکھ رہی ہیں۔

شبانہ کی انا اور خود پسندی نے اس کے قدم روک لیے۔۔۔ وہ واپس مڑی ہی تھی کہ کمرے کے اندر سے کسی کی آواز آئی۔۔۔ "اندر آ جاؤ شبانہ" یہ راحیل کی آواز تھی یہ گویا شبانہ کے ماضی کی آواز تھی۔۔۔ ان دور دراز جزیروں کی آواز تھی جن کے درختوں کی شاخیں کھلے نیلے سمندروں کی ہواؤں میں لہرا لہرا کر شبانہ کو اپنی طرف بلایا کرتی تھیں۔۔۔ اس کے قدم رک گئے تھے۔۔۔ وہ گویا ماضی اور حال کے درمیان کھڑی تھی۔۔۔ ادھ کھلے دروازے میں پائپ کے تمباکو کے ساتھ گلاب کے پھول کی خوشبو آئی تو شبانہ کمرے میں داخل ہو گئی۔

اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور شگفتگی کا احساس بھی تھا۔۔۔ یہ احساس راحیل کی موجودگی میں ہمیشہ اس کے لاشعور میں موجود رہا تھا۔ وہ اس احساس سے بچنا بھی چاہتی تھی اور اسے اپنی جان کے ساتھ لگا کر بھی رکھنا چاہتی تھی۔۔۔ کمرہ خالی تھا۔۔۔ پرانی طرز کا کشادہ آتشدان ٹھنڈا تھا۔ کارنس پر رفائیل کی پینٹنگ نہیں تھی۔ آبنوسی گول میز پر گرد کی ہلکی سی تہہ جمی ہوئی تھی۔ میز کے وسط میں بلور

کے چبوترے سے گلدان میں گلاب کا تازہ پھول سجا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ شخص اس فضا میں موجود ہے جس کی یادیں سایہ بن کر شبانہ کے ساتھ ساتھ سفر کرتی تھیں۔ وہ کمرے کے عقبی دروازے سے گزر کر دوسری طرف انگور کی بیلوں والے چبوترے سے لان میں آ گئی۔ انگور کی بیلوں سے لدی ہوئی بانس کی چھوٹی سی چھت کے نیچے سبز بید کی میز اور کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ شبانہ اس کے قریب سے گزری تو اس کی نگاہ بے اختیار سرخ اور سیاہ انگور کے ان گچھوں کی طرف اٹھ گئی جو بیل کے جوڑے پتوں میں سے جواہرات کی طرح لٹک رہے تھے۔

ساون کے ابر آلود دن کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ شبانہ کی نگاہیں جس کو ڈھونڈھ رہی تھیں وہ اسے نظر نہیں آ رہا تھا... وہ ٹھنڈے پانی والی چھوٹی سی نہر پر آ گئی... یہاں گلاب گیندا اور موتیا کے پھولوں کے جھاڑ تھے۔ موتیے کے پھول سبز پتوں کے بیچ سفید موتیوں کی طرح چمک رہے تھے... نہر کا پانی گدلا تھا۔ یہ نہر اتنی چھوٹی تھی کہ اسے چھلانگ لگا کر پھلانگا جا سکتا تھا۔

نہر کی دوسری جانب شبانہ نے پہلی بار مالٹوں کے درختوں کی قطاریں دیکھیں وہ نہر کے اس کنارے پر تھوڑا آگے بڑھی تھی کہ اسے پائپ کے تمباکو کی مخصوص خوشبو آئی۔ وہ خوشبو کے ساتھ ساتھ چلتی گلابوں کی بیل کے پیچھے آئی تو اسے راحیل ہری بھری گھاس پر اس طرح بیٹھا نظر آیا کہ اس نے یوکلپٹس کے درخت سے ٹیک لگا رکھی تھی... گہرے کلر کی پتلون، سمر شوز، اطالوی بوسکی کی نیم آستینوں والی قمیض اور گلے میں میرون کلر کا اسکارف... آبنوسی پائپ اس کے ہونٹوں میں دبا تھا جس میں سے نیلے رنگ کے دھوئیں کی پتلی سی لکیر تھوڑی تھوڑی دیر بعد نکل کر غائب ہو جاتی تھی۔

شبانہ کو دیکھ کر وہ تعظیماً اُٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے معلوم تھا تم آؤ گی۔" اس نے پائپ منہ سے نکالتے ہوئے گہری بوجھل آواز میں کہا... شبانہ کے ہونٹ

ذرا سے سکڑ گئے۔ اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں آؤں گی؟ اسے کیوں معلوم ہوا کہ میں آؤں گی؟ آخر میری قسمت میں ہی کیوں لکھا ہے کہ میں اس کے پاس آؤں؟ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ راحیل پائپ جھاڑتے ہوئے بولا۔

"دیکھو نہر کی طرف سے جو ہوا آ رہی ہے اس میں پانی میں ڈوبی گھاس کی خوشبو ہے۔ میرے ساتھ آؤ... ہم انگور کے خوشوں کو دیکھتے ہیں۔"

اس نے شبانہ کا ہاتھ تھاما اور اسے لے کر بانس کی چھت پر چڑھی ہوئی بیلوں کی طرف بڑھا... وہ کہہ رہا تھا۔ "جولائی میں انگور ابھی کچے ہوتے ہیں۔ مگر دیکھو ان پر نیلا اور سرخ رنگ کیسے آ رہا ہے۔ ابھی یہ رنگ پھیکا ہے۔ بارشوں میں ان پر رنگ آ جائے گا اور اگست ستمبر میں یہ گہرے سرخ، گہرے نیلے ہو جائیں گے۔

انگور کی خوشبو اس کے اندر بند ہوتی ہے۔ جب تک اس کے دل کو نہ چیرو وہ اپنی خوشبو کے راز کو افشا نہیں کرتا۔ اسی طرح بعض لوگ اپنی خوشبو کو اپنے اندر اس وقت تک بند رکھتے ہیں جب تک کہ ان کا دل نہیں ٹوٹتا۔"

راحیل بید کی سبز آرام کرسی پر بیٹھ کر پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ شبانہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھی تھی... ساون کی گھٹا جھکی ہوئی تھی لیکن بارش نہیں ہو رہی تھی۔ راحیل نے پائپ سلگایا تو فضا میں قرونِ وسطیٰ کے شاہی محلات ایسی خوشبو پھیل گئی کم از کم شبانہ کے ذہن میں اس خوشبو کی یہی تصویر بنتی تھی۔

شبانہ نے گہرا سانس بھرنے کے بعد اسے اپنی سہیلی نجمی کے بارے میں بتایا کہ اس کے لاپتہ ہونے کے بعد میں اور زیادہ تنہائی محسوس کرنے لگی ہوں۔ راحیل جیسے لاتعلقی سے نجمی کی بات سنتا رہا۔ وہ پائپ کے ہلکے ہلکے کش لگاتا نہر کنارے اگے ہوئے موتیے کے سفید پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔ جب شبانہ نے اپنی تنہائی کا ذکر کیا تو راحیل کے ہونٹ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کھل گئے۔

"تنہائی میں تو انسان نے بہت کچھ حاصل کیا ہے... تم اس سے کیوں ڈرتی ہو؟"

شبانہ نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ ۔ ۔ اس لئے کہ میں گوتم بدھ نہیں ہوں۔ میں اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر جنگلوں میں نہیں جا سکتی۔ اس لئے مجھے تنہائی سے ڈر لگتا ہے۔ ۔ ۔"

راحیل اب بھی مسکرا رہا تھا۔ اس نے انگوٹھے سے پائپ کا تمباکو دباتے ہوئے کہا۔ ۔ ۔ "تم اگر گوتم بدھ نہیں ہو تو یہ اچھی بات ہے۔ ۔ ۔ تم اپنے ماں باپ کو نہیں چھوڑ سکتیں۔ ۔ ۔ یہ بھی اچھی بات ہے۔ ۔ ۔ پھر تم پریشان کس بات سے ہو؟ کیا تمہارے ماں باپ تمہاری شادی کر رہے ہیں؟ لیکن شادی میں بھی تمہارے لئے ایسی کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیئے۔ تم جس قسم کے ماحول میں رہ رہی ہو ایک نہ ایک دن ہر لڑکی کے ساتھ یہ حادثہ ضرور ہوتا ہے۔"

شبانہ کے حلق کا ذائقہ کڑوا سا ہونے لگا تھا۔ ۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ ۔ ۔ اس نے کہا۔ ۔ ۔ "میرے ماں باپ میری شادی ایک ایسی جگہ کرنا چاہتے ہیں جہاں میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔" راحیل نے پائپ ہونٹوں سے الگ کرتے ہوئے شبانہ کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ اسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ اس نے کہا۔ ۔ ۔ "تو پھر تم وہاں شادی کیوں کر رہی ہو؟" شبانہ نے آنکھیں جھکا لیں اور انگلی کے ناخن سے بید کی میز کو کریدتے ہوئے بولی۔

"میں نے انکار کر دیا تو گھر کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ پھر شاید میرا باپ زندہ نہ رہے۔"

راحیل نے کہا۔ "ہر گھر کا شیرازہ ایک نہ ایک دن بکھر جاتا ہے ہر باپ کو ایک نہ ایک دن مرنا ہوتا ہے۔"

شبانہ نے جھنجلا کر کہا۔ "لیکن میں نہیں چاہتی کہ ایسا وقت سے پہلے ہو۔"

راحیل نے پائپ منہ سے لگاتے ہوئے کہا "تو پھر چپکے سے وہاں شادی کر لو جہاں تم شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ اپنے باپ کے لئے یہ قربانی کر گزرو۔ اس سے تمہارے ضمیر کو بڑا سکون نصیب ہو گا۔ اور ضمیر کا سکون ہی جنت ہے۔ اپنی پسند کی

شادی کرنے کے بعد اگر تمہارے ضمیر کو اطمینان نصیب نہ ہوا تو تم اپنی پسند کی ساری شادی شدہ زندگی دوزخ میں بسر کرو گی۔ چھوڑو ان باتوں کو۔ آؤ نہر کے پاس چلتے ہیں۔ دیکھو نہر کا پانی کس قدر سکون سے بہہ رہا ہے۔"

راحیل نے شبانہ کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ لیا اور قریب ہی بہتی چھوٹی سی نہر کے کنارے ٹہلنے لگا۔ "میں جہاں پیدا ہوا تھا وہاں ایسی ہی ایک نہر بہا کرتی تھی۔ وہ نہر لوکاٹ کے ایک باغ میں سے گزرتی تھی۔ جب میں چھوٹا سا تھا تو اس نہر پر کھیلنے جایا کرتا تھا۔ میں لوکاٹ کے ایک کیری رنگ کے گچھے کو بڑے شوق سے دیکھا کرتا تھا جو اپنی ٹہنی سمیت نیچے نہر کی سطح پر جھکا شاید اس میں اپنا عکس دیکھا کرتا تھا۔

ایک روز میں نہر پر گیا تو کیری رنگ کی لوکاٹ کا وہ گچھا درخت کی ٹہنی پر نہیں تھا۔ شاید کوئی لڑکا اسے توڑ کر لے گیا تھا۔ مگر نہر کے شفاف پانی کا آئینہ اسی طرح بہہ رہا تھا۔ دیکھو اس نہر کے پانی کو دیکھو۔ غور سے دیکھو تو آدمی کو لگے گا جیسے وہ خود بھی پانی کی لہروں کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ یہاں دوسرے کنارے لوکاٹ کے باغ ہیں۔ مگر ان کے درمیان سے نہر نہیں گزرتی۔ کبھی میں تمہیں اپنے بچپن کی کہانی سناؤں گا۔ بچپن کے گیت سناؤں گا۔ تمہیں معلوم ہے دنیا میں سب سے زیادہ درد انگیز گیت بچپن کے گیت ہوتے ہیں۔"

شبانہ راحیل کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اب بارش کی نامعلوم سی پھوار پڑنے لگی تھی۔ راحیل نے چہرہ اوپر اٹھا کر گھٹاؤں کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ ایک عجیب و غریب مسرت کے احساس سے چمک رہا تھا۔

اس نے کہا "نیچر کتنی حسین ہے۔ شفاف ہے۔ تم اس کے آر پار دیکھ سکتی ہو وہ اپنا آپ نہیں چھپاتی وہ کپڑے نہیں پہنتی۔ وہ شادی بھی نہیں کرتی۔ پھر ہم کیوں شادی کرتے ہیں؟" راحیل ہنس دیا۔ اس نے شبانہ کی آنکھوں میں جھانک کر کہا "سنہری خوشبو دار چائے اور گلاب کے پھول اور سنہرا رنگ اڑاتی دو گرم

پراسرار آنکھیں اس دنیا میں نیچر کا یہ حسین تحفہ ہے۔ آؤ گلابوں کے پاس بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔"

نہر کنارے جہاں گلاب کے پھولوں کے پودے تھے وہاں ناریل کا ایک چھوٹا سا پیڑ بھی تھا۔ اس کے پاس ہی بانس کی ایک جھاڑی اور کیلے کے دو تین ساتھ ساتھ اُگے ہوئے درخت بھی تھے جن کے پھٹے ہوئے چاک در چاک چوڑے پتے سرنگوں تھے۔ وہ دونوں ان درختوں کے درمیان گھاس پر بیٹھ گئے۔ راحیل نے ناریل کے چھوٹے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ درخت جلاوطنی کی زندگی گزار رہا ہے۔ ناریل بانس کیلا اناناس یہ سب کچھ جلا وطن درخت ہیں یہ جنوب مشرقی ایشیا کی طویل بارشوں والی اندھیری راتوں میں اُگتے ہیں اور سمندروں کی مرطوب ہوائیں انہیں آدھی آدھی رات کو آکر پیار کرتی ہے لیکن ہم نے انہیں زبردستی یہاں لاکر زمین میں گاڑ دیا ہے۔ یہ درخت یہاں صرف اُگتے ہیں، پروان نہیں چڑھتے۔ یہ سارے درخت اُداس ہیں۔ جس طرح تم اُداس ہو جس طرح دوسری کئی لڑکیاں اُداس ہیں۔ تم نے کبھی بانس کی کونپل کو اپنی شاخ پر طلوع ہوتے دیکھا ہے؟ یہ قدرت کی نشانیاں ہیں انہیں دیکھا کرو۔ کیا تمہیں معلوم ہے۔ اناناس ناریل اور سیتا پھل کے درخت بھی آپس میں بیٹھ کر سیلون کی چائے پیتے ہیں؟ میں نے ان درختوں کو جنوب مشرقی ایشیاء کے ساون کی لمبی لمبی جھڑیوں میں ناریل کی پیالیوں میں نیلگری کی ڈھلانوں پر اُگنے والی چائے پیتے دیکھا ہے انہیں آپس میں باتیں کرتے، ہنستے، ایک دوسرے سے محبت کرتے، ایک دوسرے کو محبت بھرے خط لکھتے اور ساون کی بھیگی ہواؤں میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے رقص کرتے دیکھا ہے۔

ہاں شبانہ... درخت بھی ایک دوسرے کو محبت بھرے خط لکھتے ہیں۔ پریم پتر لکھتے ہیں ہر وہ پتا جو درخت کی ڈالی سے ٹوٹ کر گرتا ہے وہ ایک درخت کا دوسرے درخت کے نام محبت بھرا خط ہوتا ہے۔ اس پر کبھی پاؤں نہ رکھنا۔ اس

کا احترام کرنا۔ ہوائیں درختوں کی نامہ بر ہیں۔ وہ ان پتوں کو، ان محبت بھرے خطوں کو، ان پریم پتروں کو اڑا کر ایک درخت سے دوسرے درخت تک پہنچا دیتی ہے ہم ایک دوسرے کو محبت بھرے خط لکھنا بھول گئے ہیں۔ ہماری محبتیں ٹیلیفون کے بے جان تاروں سے شروع ہوتی ہیں اور وہیں ایک دن ڈس کنیکٹ ہو جاتی ہیں۔ کبھی کبھی میں ٹیلیفون کے کھمبوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے ان کے تاروں پر جگہ جگہ چھوٹی سچی آدھ پکی محبتوں کی لاشیں لٹکتی نظر آتی ہیں۔ کبھی ہم زرد نیلے نازک کاغذوں پر محبت بھرے خط لکھ کر انہیں طرح طرح کے عطریات میں بسا کر دھڑکتے دل کے ساتھ نامہ بر کے حوالے کیا کرتے تھے۔ حنا کے عطر میں بسا کر ریشمی رومال بھیجا کرتے تھے۔

درخت اب بھی اپنے محبت ناموں کو سچے پھولوں کا عطر لگا کر نامہ بر ہواؤں کے سپرد کرتے ہیں۔ تم نے کالی داس کی شکنتلا ضرور پڑھی ہو گی تمہیں یاد ہے۔ شکنتلا نے کنول پھول کی پاکیزہ پنکھڑی پر پریم پتر لکھ کر راجہ دشنت کو بھیجا تھا۔ اب نہ وہ شکنتلا رہی نہ کنول کے پھول رہے۔ نہ وہ تو رہا، نہ وہ میں رہا، جو رہی تو بے خبری رہی۔"

راحیل پائپ سلگانے کے لئے خاموش ہو گیا۔ ساون کی دھیمی دھیمی پھوار اسی طرح گر رہی تھی۔ کیلے کے چاک داماں پتے خاموش تھے، سرنگوں تھے۔ راحیل کہہ رہا تھا۔

"محبت کو دور شجاعت چاہیے۔ پنجاب کا بھی ایک دور شجاعت تھا جب مرزا اپنی صاحباں کی محبت کی خاطر لڑتے لڑتے ہلاک ہو گیا تھا۔ تم نے مرزا صاحباں نظم پڑھی ہے؟ جانتی ہو صاحباں اپنے پیر کے مزار پر جا کر کس خواہش کا اظہار کرتی ہے؟ وہ کہتی ہے کہ "اگر میرا محبوب میرے پاس آجائے تو میں پیر کے نام کا بکرا دوں گی۔ کاش میری چھ سات ہمسائیاں مر جائیں اور جو باقی بچیں وہ بیمار پڑ جائیں تاکہ وہ مجھے مرزے کے پاس جاتے نہ دیکھ سکیں۔ کاش اس ہندو کی دکان کو آگ لگ جائے جس کے باہر رات کو دیا جلتا رہتا ہے اور مجھے اپنے محبوب کے پاس جاتے ہوئے اس دکان کے قریب سے گزرنا پڑتا ہے۔ کاش ساری کی ساری گلیاں ویران،

سنسان ہو جائیں اور ان ویران گلیوں میں صرف اور صرف میرا محبوب پھیرا کرے۔"

راحیل مسکرایا اور کہنے لگا۔ "محبت کو دور شجاعت کی ضرورت ہے، سر پھرے شاہ سواروں کی ضرورت ہے۔ جو اپنی محبوبہ کی خاطر زرہ پوش ہو کر ایک پہاڑی سے گھوڑا دوڑاتے دوسری پہاڑی پر کود جائیں اور چکنا چور ہو جائیں اور کبھی نیم روشن چاندنی راتوں میں پھولوں بھری بالکونیوں کے نیچے کھڑے ہو کر گٹار پر محبت کے گیت گائیں۔

یہ شفاف محبتوں کے راستے ہیں شبانہ یہ سچی محبتوں کے آئینے میں عزت، غیرت اور انسانی وقار کے نوشتے ہیں جن پر کبھی از خود رفتہ جیالی محبتوں کی داستانیں لکھی جاتی ہیں۔ اندلس میں یہ ہماری بھی روایت رہی مگر پھر ہم نے اس کتاب کو بند کر دیا اور ہم نے ان جذبوں کو جلا وطن کر دیا۔ جس طرح اناس کا درخت ناریل کا درخت بانس کا درخت جلا وطن کر دیا گیا ہے۔"

راحیل نے سرخ گلاب کا پھول توڑ کر شبانہ کے بالوں میں سجایا اور کہنے لگا بالوں میں گلاب سجانے والوں کو تاریخ کی گرد اپنے ساتھ اڑا کر لے گئی میں تاریخ کی گرد سے نکل کر تمہارے پاس آیا ہوں تمہیں یہ بتانے کہ گلاب کے پھول صرف قبروں پر ڈالنے کے لئے نہیں ہوتے بلکہ خوبصورت بالوں میں سجانے کے لئے بھی ہوتے ہیں۔ . . . ."

جس وقت شبانہ اس ویران پرانی کوٹھی سے باہر نکلی بارش تیز ہو گئی تھی۔ راحیل کوٹھی کے گیٹ پر بارش میں اسے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہہ رہا تھا وہ بارش میں بھیگ رہا تھا پائپ اب بھی اس کے ہونٹوں میں دبا تھا۔

شبانہ نے گاڑی کے بند شیشوں میں سے ہاتھ ہلا کر اسے الوداع کہا۔ اور گاڑی کینال بینک کو جانے والی کچی سڑک پر ڈال دی۔ کچی سڑک کی دونوں جانب شیشم کے درخت بارش میں شرابور تھے۔ شبانہ نے کینال بینک کی سڑک پر آتے ہوئے گھوم کر پیچھے دیکھا پرانی کوٹھی کا گیٹ خالی تھا۔ راحیل وہاں نہیں تھا

گاڑی کو لکڑی کے چھوٹے پل پر سے نکال کر نہر کے دوسرے کنارے پر آ گئی۔ ساون کی موسلا دھار بارش نے نہر کی سطح پر ایک دھند سی پھیلا دی۔ بارش کی اس دھند میں شبانہ ان تمام لفظوں کی شکلیں بنتی دیکھ رہی تھی جو اس نے راحیل کی زبان سے سنے تھے۔ شبانہ اپنی "کینال لاج" والی کوٹھی میں پہنچی تو بھائی نے اسے ایک خط لا کر دیا یہ خط کراچی سے ندیم نے لکھا تھا۔

شبانہ اپنے کمرے میں آ گئی اس نے جلدی سے خط کھول کر پڑھا ندیم نے نجمی اور اس کی گمشدگی کا حوالہ دیئے بغیر لکھا تھا کہ جس کام کے لئے میں کراچی آیا تھا اس کے لئے جان توڑ کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے امید کی ایک ہلکی سی کرن نظر آئی ہے۔ تمہارے اندازے کافی حد تک درست ثابت ہو رہے ہیں۔ کالج سے میں نے مزید ایک ہفتے کی چھٹی لے لی ہے۔ دعا کرو کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکوں۔ تمہارا بھائی ندیم۔

شبانہ نے خط کو دو بار پڑھا پھر تہہ کر کے میز کی دراز میں رکھ دیا۔

اب اس کے خیالات کا رخ نجمی کی طرف مڑ گیا۔ خدا جانے نجمی اس وقت کہاں ہو گی کس حال میں ہو گی۔ نجمی کا المیہ شبانہ کے لئے ناقابل یقین تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس خوبصورت، چنچل اور ہنس مکھ لڑکی کی زندگی برباد ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ ندیم کے ورغلانے میں آ کر یا اپنی کسی خواہش اور جذبات میں بہہ کر گھر کے حصار سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ گھر آج بھی ہم مشرقی لڑکیوں کے لئے ایک حصار ایک مضبوط قلعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ خواہ شادی کرانے کے لئے ہی سہی لیکن کسی لڑکی کا کسی لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگ جانا ایک بھیانک اقدام ہے جس کے نتائج ہر حالت میں بھیانک ترین مرتب ہوتے ہیں۔

شبانہ کو یقین تھا کہ ندیم نے نجمی کو چھوڑا نہیں تھا وہ اس سے چھین لی گئی تھی۔

شبانہ کھڑکی کے پاس بیٹھی دیر تک نجمی کے بارے میں سوچ کر پریشان ہوتی رہی۔ کھڑکی کے باہر آم اور یوکلپٹس کے درختوں میں بارش ہو رہی تھی۔ نچلی منزل سے بھابی کے ملازم کو پکارنے کی آواز آ رہی تھی شبانہ کے بھائی اور ابو ابھی تک گھر

نہیں آتے تھے۔ بھائی اور باپ کی جگہ کون لے سکتا بھلا؟ شبانہ نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ابو اور بھائی کے لئے دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی عامر کے لئے بھی دعا مانگی جو کیلی فورنیا یونیورسٹی میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ جو اگرچہ شبانہ کے ہونے والے خاوند ظفر کا زیر بار احسان تھا لیکن وہ اس کا بھائی تھا۔ پیارا بھائی! چھوٹے بھائی کو یاد کر کے شبانہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

ندیم کراچی میں ابھی تک زمان کے ہوٹل میں ہی تھا۔ زمان اس کی موجودگی سے پریشان تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ اگر ندیم نے پولیس میں رپورٹ کر دی کہ اس کی کزن نجمی زمان کے ہوٹل میں آ کر غائب ہوئی ہے تو زمان کے لئے بے پناہ مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔ اگرچہ زمان نے یہ حوالہ دے کر کہ ایسی رپورٹ درج کرانے سے اس کی اور نجمی کے ماں باپ کی بھی بدنامی ہوگی اور پولیس انہیں بھی گھسیٹتی پھرے گی۔ ندیم کو اس ارادے سے روک دیا تھا تاہم وہ نہیں چاہتا تھا کہ ندیم زیادہ دن اس کے ہوٹل میں ٹھہرے۔

نجمی زمان کے پاس بھی نہیں رہی تھی اسے شیرا اغوا کر کے نہ جانے کہاں لے گیا تھا۔ زمان کو نجمی اور شیرے کے ٹھور ٹھکانے کا کچھ علم نہیں تھا۔ اس نے اپنے طور پر شیرے اور نجمی کا کھوج لگانے کی سر توڑ کوشش کی تھی مگر اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ زمان نے اس سے پہلے جس عورت کو بھی خاص ایجنٹوں کے ذریعے باہر کے ممالک میں فروخت کیا تھا اس کا جعلی نکاح شیرے کے ساتھ ہی پڑھوایا تھا اور فوراً بعد نکاح نامہ اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔

نجمی کے معاملے میں زمان سے تھوڑی سی تاخیر ہو گئی۔ اس نے شیرے پر اعتماد کیا اور شیرا نکاح نامے کے ساتھ نجمی کو بھی لے بھاگا۔ پھر بھی زمان نے اپنے آدمی سارے ملک میں دوڑا دیئے تھے کہ وہ شیرے اور نجمی کو ڈھونڈ نکالیں۔ اس دوران وہ ندیم کو پہلی فرصت میں واپس لاہور پہنچانا چاہتا تھا لیکن وہ اسے صاف اور کھلے لفظوں میں ایسا نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایک دو بار زمان نے ندیم کو دبی زبان میں کہا بھی کہ

کراچی میں اس کی پڑھائی کا ہرج ہو رہا ہے۔ اسے واپس لاہور چلے جانا چاہیئے۔ آخر میں جو کراچی میں بیٹھا ہوں۔ میں نجمی کا سراغ لگا کر چھوڑوں گا۔ ندیم نے اسے بتایا کہ میں نے کالج سے ایک ہفتے کی مزید چھٹی لے لی ہے اور میں خود بھی کراچی میں گھوم پھر کر نجمی کا سراغ لگانا چاہتا ہوں۔ زمان نے بڑی فرمانبرداری سے کہا تھا۔

"ضرور سراغ لگاؤ میرے دوست میرا ہوٹل تمہارے لئے حاضر ہے تم جب تک چاہے یہاں رہ سکتے ہو۔" اس کے ساتھ ہی ساتھ زمان نے اپنا ایک جاسوس ندیم کے پیچھے چھوڑ دیا تھا کہ وہ اس کی نقل و حرکت کی نگرانی کرتا رہے اور زمان کو آ کر ہر شام رپورٹ دے کہ ندیم کہاں کہاں گیا تھا۔

ندیم اس جاسوس سے بے خبر تھا۔ ہوٹل کے چوکیدار کی زبانی اسے اتنا علم ہو چکا تھا کہ زمان کا ایک ساتھی جس کا نام شیرا تھا کئی روز سے غائب ہے۔ اور زمان نے اس کے بارے میں کبھی کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ ندیم نے چاہا کہ وہ زمان سے شیرے کے بارے میں مزید پوچھے لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اس طرح زمان کو شک ہو جائے گا جو ندیم نہیں چاہتا تھا۔

ندیم دن بھر کراچی کی سڑکوں پر پھرتا رہتا۔ اس نے کراچی کے سارے علاقے چھان مارے۔ وہ ایسی بستیوں میں بھی گیا جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ مگر نجمی کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ زمان کو ساری رپورٹ مل جاتی تھی کہ آج ندیم کہاں کہاں گیا ہے۔ ندیم کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ زمان کا ایک خفیہ ٹھکانہ شہر سے بہت دور ایک ویران جگہ پر واقع ہے جہاں اس نے نجمی کو قید میں ڈال رکھا تھا اور جہاں سے شیرا اسے اغوا کر کے مشرقی پاکستان لے اڑا تھا۔

آخر ندیم کی چھٹیاں ختم ہو گئیں اور ایک دن وہ زمان سے اجازت لے کر لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ زمان اسے ٹرین میں سوار کرا کر آیا تو اس نے سکھ کا لمبا سانس لیا۔

لاہور آ کر ندیم شبانہ سے ملا اور اسے بتایا کہ زمان کو بھی نجمی کا کچھ پتہ نہیں

ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ بھی نجمی کے بارے میں بے خبر ہے۔ شبانہ کا دل نہیں مانتا تھا مگر اسے یقین کرنا پڑا۔ اس لئے کہ وہ خود جاکر تحقیقات نہیں کرسکتی تھی ندیم نے ٹھنڈا خشک سانس بھر کر کہا۔

شبانہ بہن میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہتا ہے۔ نجمی کی تباہی کا میں ہی ذمے دار ہوں۔ کاش میں اسے گھر سے بھگا کر نہ لے جاتا۔ اگرچہ میں اسے شادی کرنے کے لئے لے گیا تھا۔ پھر بھی مجھے ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہیئے تھا۔ اگر میں نجمی کو مجبور نہ کرتا تو وہ کبھی گھر سے باہر قدم نہ نکالتی۔ میں نے ایک طرح سے اس کے سارے خاندان کو تباہ کردیا ہے اور ندیم نے اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپالیا لیکن شبانہ نے اسے تسلی کا ایک لفظ بھی نہ کہا۔

ندیم کو یہ ذہنی کوفت اٹھانا چاہیئے تھی۔ یہ اس کی سزا تھی۔ شبانہ کے خیال میں تو اسے اس سے زیادہ سزا ملنی چاہیئے تھی مگر وہ اسے کوئی سزا نہیں دے سکتی تھی۔ اس نے صرف اتنا کہا۔

"ندیم بھائی نجمی تمہاری وجہ سے لاپتہ ہوئی ہے۔ اس کا گھر تمہاری وجہ سے اجڑا ہے۔ اس کا باپ اس غم میں مرگیا۔ ماں بھائی شہر چھوڑ کر چلے گئے۔ تمہارا فرض ہے کہ تم نجمی کو تلاش کرو۔ اس کو گھناؤنے مصائب سے نجات دلاؤ خواہ اس کے لئے تمہیں اپنی جان سے ہاتھ کیوں نہ دھونا پڑے۔"

یہ کہہ کر شبانہ اٹھ کر کلاس روم کی طرف چل دی ندیم ملامت اور اذیت کے شدید احساس کے ساتھ وہیں سر جھکائے بیٹھا آہیں بھرتا رہا۔ یہ اس نے کیا کر دیا تھا۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اس کی ایک ذرا سی بھول نے ایک پورے خاندان کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ حالانکہ اس کی نیت نیک تھی مگر اس نے جو راستہ چنا تھا وہ تباہی کا راستہ تھا۔ ندیم کے دل میں ایک ایسی پھانس اٹک گئی تھی کہ جس نے اس کی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر دیا تھا۔ وہ اٹھا اور بوجھل قدم اٹھاتا یونیورسٹی کیمپس کے لان میں سے گزرنے لگا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب ہم اس حسین مگر بدنصیب اور جذبات کی رو میں بہہ کر اپنی زندگی کو بیچ منجدھار میں لے جانے والی لڑکی نجمی کی خبر لیں کہ رانگامتی اور کرنا مالی کے دیار دار ساگوان اور بانس کے گھنے جنگلوں کی وادی میں اس پر کیا گزر رہی ہے نجمی رانگامتی پہاڑی سلسلے کی ایک گمنام وادی میں دریائے کرنافلی کے کنارے بھلوا اسمگلر کے خفیہ اڈے میں شبیرے کے ساتھ رہ رہی ہے۔ شبیرے کے ساتھ اس کے کراچی کے جگری دوست نے جس آدمی گوندی کو بھیجا تھا۔ وہ واپس جاچکا ہے نجمی کی یہاں پوری طرح نگرانی ہوتی ہے۔

بھلوا کے ڈیرے کی عورت مرتھا نجمی پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے ہے۔ وہی اس کو نہلاتی دھلاتی اور اپنے ساتھ جنگل میں ٹہلاتی ہے۔ نجمی نے ایک بار جنگل میں فرار ہونے کی کوشش کی تھی مگر شبیرے نے اسے بہت مارا تھا اور ایسی گالیاں دی تھیں کہ جن کو سن کر نجمی کے حواس معطل ہوگئے تھے۔ ایک طرح سے فرار کا خیال نجمی نے اپنے دل سے نکال دیا تھا اور اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیا تھا۔ ایک کمزور لڑکی اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

ایک روز نجمی کا اچانک جی خراب ہونے لگا۔ وہ سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ ڈیرے کی عورت مرتھا۔ اس کے پاس آئی۔ وہ فوراً سمجھ گئی کہ لڑکی ماں بننے والی ہے۔ وہ بھاگ کر خوشخبری سنانے شبیرے کے پاس گئی۔ شبیرا یہ خوشخبری ایک مدت سے سننے کا آرزومند تھا۔ اس نے مرتھا کو سو روپے انعام میں دیئے اور بھاگا بھاگا نجمی کے پاس آکر اس کی تیمارداری کرنے لگا۔

جب نجمی کو حقیقت کا احساس ہوا تو اس نے وہیں فیصلہ کرلیا کہ وہ ایک جرائم پیشہ بدمعاش کے بیٹے کی ماں نہیں بنے گی۔ شبیرے نے ڈیرے کے مالک بھلوا اور عورت مرتھا کے تعاون سے نجمی کی نگرانی سخت کر دی۔ اب اسے کھپریل کی چھت والی اپنی کوٹھڑی سے پندرہ بیس قدم سے آگے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ شبیرا اپنے بچے کی آمد پر بہت خوش تھا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر

لیا تھا کہ جب وہ ایک بچے کا باپ بن جائے گا تو نجمی کو ساتھ لے کر چٹا گانگ یا تمال کی جانب سلہٹ کی طرف نکل جائے گا اور وہیں کوئی چھوٹا موٹا شریفانہ کاروبار شروع کر کے باقی زندگی وہیں بسر کرے گا۔ دن گزرتے چلے گئے پھر ۱۹۶۵ء کی جنگ چھڑ گئی۔ نجمی کو اس وقت پتہ چلا جب ایک روز ڈیرے پر افراتفری پھیل گئی پھر اُوپر سے دو جہاز گویا آگ برساتے گزر گئے۔ شیرے نے سب سے پہلے نجمی کو اپنے حصار میں لے لیا۔ ڈیرے کے لوگ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ بھلوا چیخ چیخ کر انہیں اپنے کسی زمین دوز ٹھکانے کی طرف جانے کی ہدایت کر رہا تھا۔

اپنی دردبھری داستان سنا کر اس کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی مگر مرتھا کے سینے میں شاید دل نہیں رہا تھا۔ جرائم پیشہ لوگوں میں رہ کر وہ بھی ان ہی کی طرح بے حس اور سنگ دل ہو گئی تھی۔ اسے نجمی کی داستان غم سن کر اس کو بالوں سے پکڑ کر زمین پر روندا اور دو تین تھپڑ مار کر بولی۔

"پھر کبھی اپنی رام کہانی سنانے کی کوشش کی تو میں شیرے سے کہہ کر تیرے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دوں گی۔" نجمی آنسو بہاتی چپ ہو کر رہ گئی تھی۔ کس قدر مجبور و بے بس ہے عورت ہمارے معاشرے میں۔ نجمی کو اس کا احساس پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اس کی ذرا سی بھول نے اس کی زندگی کو شاید ہمیشہ کے لئے تباہی کے غار میں جھونک دیا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ بھائی اور شبانہ اور کالج کی دوسری سہیلیوں کو یاد کر کے شروع شروع میں بہت روتی تھی۔ مگر اب جیسے آنسو اس کی آنکھوں میں آنے سے پہلے ہی خشک ہو جاتے تھے۔

شیرا ویسے اس کا بہت خیال رکھتا تھا مگر اسے بار بار خبردار بھی کرتا تھا کہ اگر اس نے جنگل میں کسی طرف بھاگنے کی کوشش کی تو وہ اسے اپنے ہاتھوں قتل کر دے گا، وہ ایک جرائم پیشہ خونی آدمی تھا اگرچہ وہ شبانہ کے ساتھ شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتا تھا لیکن نجمی کا شیرے کی موجودگی میں دم گھٹنے لگتا تھا۔ اس نے تو یہ خواب دیکھے تھے کہ اس کی شادی ندیم سے ہو گی۔ دونوں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں گے

اور پھر امریکہ چلے جائیں گے۔

ندیم کے تصور ہی سے نجمی کا حلق کڑوا ہو جاتا۔ کبھی وہ اسے بے گناہ نظر آتا اور کبھی اسے یقین ہو جاتا کہ ندیم ہی اس کی زندگی کی بربادی کا باعث ہے۔ اس کو دوست دشمن کی تمیز ہونی چاہیئے تھی۔ اس نے کیوں زمان کو اپنا دوست سمجھا؟ پھر وہ سوچتی کہ کاش اس کی سوتیلی ماں ندیم سے ہی اس کا رشتہ کرنے پر راضی ہو جاتیں۔ وہ دولت کا لالچ نہ کرتیں۔ اب نجمی کو خیال آتا کہ اگر اس کی سوتیلی ماں اس رشتے پر راضی نہیں تھی تو جہنم میں جاتا ندیم۔ ماں جہاں اس کی شادی کرنا چاہتی تھی وہ وہیں شادی کر لیتی کم از کم اس کی عزت تو محفوظ رہتی۔ اس کی نسل تو محفوظ رہتی۔ اس کی عزت نفس اور شخصیت تو بحال رہتی۔ لیکن اب پچھتانے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔

نجمی سیدھے راستے پر چلتی چلتی بہک کر ایک ایسی راہ پر چل نکلی تھی جہاں اسے دور نسل در نسل تک سوائے اندھیروں کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اگر وہ کسی طرح وہاں سے بھاگ کر ڈھاکہ پہنچ کر پولیس کی پناہ میں آ جاتی ہے اور وہ اسے واپس لاہور بھیج دیتے ہیں تو معاشرہ اسے وہ مقام ابھی نہیں دے گا جس مقام سے وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑی تھی۔

شیرے کے پاس جو نکاح نامہ تھا اس پر نجمی کے باقاعدہ دستخط تھے اور شیرا اسے عدالت سے بھی واپس لا سکتا تھا۔ ویسے بھی وہاں رہ کر نجمی پر یہ انکشاف ہو گیا تھا کہ ان لوگوں کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں اور پولیس کے بعض عناصر ان سے باقاعدہ ماہانہ وصول کرتے ہیں۔

بہت جلد نجمی کو پتہ چل گیا کہ ہندوستان نے پاکستان پر حملہ کر دیا ہے۔ اور مغربی پاکستان اور (اس وقت کے) مشرقی پاکستان میں بھی پاک فوج کے جیالے سپاہی دشمن کے مقابلے پر ڈٹ گئے ہیں۔ نجمی کو اسی روز مارتھا کے ساتھ بھلوا اسمگلر کے زمین دوز ٹھکانے میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ جگہ دریائے کرنافلی کے کنارے پر تھوڑی دور ہی تھی مگر ایک جھاڑیوں سے بھرے ہوئے ٹیلے کے نیچے ایک خفیہ

غار میں واقع تھی۔ یہ غار اگرچہ قدرتی تھا مگر بھلوا کے آدمیوں نے اس کے اندر دیواریں کھود کر چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنا ڈالی تھیں۔ ایک جانب خفیہ شگاف میں سے اندر ہر وقت تازہ ہوا آتی رہتی تھی۔ غار کے دہانے کو جنگلی جھاڑیوں اور گھاس پھونس سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ اس غار میں پہلے ہی سے اسمگلنگ کا مال بھرا ہوا تھا۔ جتنے روز جنگ جاری رہی یہ لوگ اسی جگہ چھپے رہے۔ دن میں دو ایک بار نجمی کو گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لئے غار سے باہر نکال کر ٹہلایا جاتا۔

یہ علاقہ سرحد پر تھا۔ دریا کی دوسری جانب بھارت کا بارڈر شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں سے پاکستان کی جنگلی کشتیاں ایک دو بار گزریں تو نجمی کے دل میں آیا کہ وہ بھاگ کر اپنے فوجیوں کے پاس چلی جائے وہ اسے ضرور پناہ دیں گے اور اسے اس گھناؤنی زندگی سے نجات مل جائے گی لیکن اس پر پہرہ اتنا کڑا تھا کہ دور سے کسی جنگلی کشتی کی آواز آتے ہی شیرا نجمی کو پکڑ کر غار میں لے جا کر بند کر دیتا تھا۔

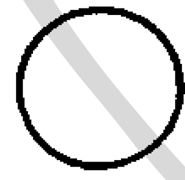
جنگ ختم ہو گئی کچھ دنوں بعد یہ لوگ بھی غار سے نکل کر اپنے پرانے اڈے پر آ گئے۔ دو مہینے گزر گئے۔ نجمی کی بے چینیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اپنے جسم میں پلتے ہوئے گناہ سے کیسے نجات حاصل کرے۔ آخر اس نے دل میں ایک ایسا فیصلہ کیا جو اس کی زندگی کے لئے خطرناک بھی ہو سکتا تھا مگر وہ اپنی زندگی سے بھی تنگ آ گئی تھی۔ اس میں خود کشی کرنے کی ہمت نہیں تھی لیکن جو فیصلہ اس نے کیا اس پر عمل کرتے ہوئے اگر وہ مر بھی جائے گی تو وہ پروا نہیں کرے گی۔

اب اسے مارتھا کوٹھری سے نکال کر جنگل میں کچھ دور ٹہلانے لے جاتی تھی۔ نجمی اس دوران ان لوگوں کی بنگلہ بولی اچھی طرح سمجھنے لگی تھی اور کچھ کچھ بول بھی لیتی تھی وہ اپنے خطرناک فیصلے پر عمل کرنے کے لئے کسی موقع کی تلاش میں رہی۔ مارتھا جب اسے ٹہلانے لے جاتی تو اس کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ نہاتے وقت بھی وہ اس پر نگاہ رکھتی تھی۔

یہ عورت ایک بلا بن کر نجمی سے چمٹ گئی تھی اس کے باوجود نجمی کو ایک موقع مل گیا۔ نجمی نے کوٹھری اور تالاب کے درمیان ایک ٹیلے کو چن لیا تھا اس ٹیلے کی اونچائی تیس پینتیس فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ ایک روز تالاب سے نہا کر واپس آتے ہوئے نجمی نے مارتھا سے کہا میرا دل اس ٹیلے پر چڑھ کر ٹھنڈی ہوا میں بیٹھنے کو کرتا ہے میرے ساتھ آؤ مارتھا۔ . . . مارتھا راضی ہو گئی۔

نجمی آہستہ آہستہ ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگی۔ مارتھا اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ ٹیلے کی چوٹی پر پہنچ کر نجمی نے گہرا سانس لے کر کہا مارتھا! یہاں ہوا کتنی خوشگوار ہے اور پھر ٹیلے کے کنارے پر آ کر نیچے دیکھنے لگی۔ مارتھا نے کہا۔

"آگے مت ہونا پیچھے ہٹ جاؤ۔" نجمی نے کہا دیکھو نیچے ترناری کے پھول کتنے سندر لگتے ہیں۔" اور یہ کہہ کر یہ ظاہر کیا جیسے اس کا پاؤں پھسل گیا ہے اور وہ چیخ مار کر نیچے گر پڑی۔ نجمی نے اپنے آپ کو خود گرایا تھا۔ نیچے اگرچہ اونچی اونچی جنگلی گھاس تھی مگر ٹیلے کی بلندی کم نہیں تھی زمین پر گرتے ہی نجمی بے ہوش ہو گئی۔



نجمی کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ مارتھا نے شور مچا دیا۔ اس کے شور کی آواز سن کر بھلوا، شیرا اور دوسرے لوگ بھاگ کر وہاں آ گئے۔ شیرے نے اپنی بیوی کو خون میں لت پت دیکھا تو گھبرا گیا۔ اسی وقت نجمی کو چارپائی پر ڈال کر رانگامتی کی ڈسپنسری میں لے جایا گیا۔

وہاں کا بنگالی ڈاکٹر بھلوا کا دوست تھا اس نے فوراً نجمی کو فرسٹ ایڈ دی اور دو تین انجکشن لگا دیئے۔ شیرا اپنے ہونے والے بچے کے بارے میں پریشان تھا۔ ڈاکٹر کو اسی وقت پتہ چل گیا تھا کہ لڑکی کا بچہ ضائع ہو گیا ہے۔ مگر اس نے شیرے کو اس وقت یہی کہا کہ وہ معائنہ کرنے کے بعد ہی بتا سکے گا۔ نجمی پیٹ کے بل گری تھی اس کی ہڈی کوئی نہیں ٹوٹی تھی مگر سر بائیں جانب سے پھٹ گیا تھا اور چہرہ

اس طرف سے سوچ گیا تھا۔ بھلوا اور اس کے آدمی تو واپس اپنے ڈیرے پر چلے گئے مگر شبیرا اور مرتھا وہیں ڈسپنسری کے عقبی کمرے میں بے ہوش نجمی کے پاس ہی بیٹھے رہے۔ بنگالی ڈاکٹر نے مرتھا کو ایک طرف لے جا کر پوچھا۔ یہ آدمی اس کا خاوند ہے کیا؟

مرتھا نے کہا۔ "ہاں کیوں کیا بات ہے؟" بنگالی ڈاکٹر نے کہا۔

"اگر میں اسے یہ بتا دوں کہ بچہ ضائع ہو گیا ہے اور اس کی بیوی اب کبھی کسی بچے کی ماں نہ بن سکے گی تو اسے زیادہ صدمہ تو نہیں ہو گا۔" مرتھا نے سر جھٹک کر کہا۔

ڈاکٹر یہ بات آج نہیں تو کل بتانی پڑے گی۔ آپ اسے بتا دو خود ہی بتا دو۔ کچھ بھی نہیں ہو گا۔" تب ڈاکٹر نے شبیرے کو ایک طرف لے جا کر سب کچھ بتا دیا۔ وہ ڈاکٹر کا منہ تکنے لگا۔ اس بات کا خدشہ اسے ضرور تھا کہ اتنی بلندی سے نجمی گری ہے بچے کو ضرور نقصان پہنچا ہو گا لیکن یہ بات اس کے لئے صدمے کا باعث تھی کہ اب نجمی کبھی ماں نہ بن سکے گی۔ اس خوبصورت لڑکی کو وہ صرف اس لئے اپنے دوست سے چھین کر اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر اس سے ہمیشہ کی خونی دشمنی مول لے کر یہاں لے آیا تھا کہ وہ اس کے بچوں کی ماں ہو گی اور وہ اس کے ساتھ شریفانہ زندگی کا آغاز کرے گا۔ جیسا بھی اس کا خواب تھا وہ خاک میں مل گیا تھا۔

اس نے بنگالی ڈاکٹر سے کہا کہ وہ ایک بار پھر معائنہ کرے۔ بنگالی ڈاکٹر نے شبیرے کو یقین دلایا کہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ غلط نہیں ہے۔ شبیرے نے سوچا کہ وہ کسی دوسرے ڈاکٹر کو دکھائے گا۔

شبیرا نجمی کی تیمار داری میں لگ گیا۔ دوسرے روز نجمی کو ہوش آیا تو ڈاکٹر کی ہدایت کے برخلاف مرتھا نے نجمی کو بتا دیا کہ وہ اب کبھی ماں نہ بن سکے گی۔ نجمی کے لئے یہ جان لیوا خبر تھی۔ وہ صرف ایک جرائم پیشہ خاوند کے بچے کی ماں نہیں بننا چاہتی تھی اس نے آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ آہستہ سسکیاں بھرنے لگی۔ پندرہ بیس دن کے بعد نجمی صحت یاب ہو گئی۔

شبیرا اسے ڈیرے پر لے آیا۔ اس نے بھلوا سے بات کی کہ وہ نجمی کو کسی دوسرے ڈاکٹر کو دکھانا چاہتا ہے۔ بھلوا نے کہا۔ "کپتائی میں میری ایک تجربہ کار لیڈی ڈاکٹر واقف ہے۔ تم کل اپنی بیوی کو لے کر میرے ساتھ چلنا۔"

کپتائی رانگامتی کی وادی میں ایک اچھا خاصہ قصبہ تھا جو بعد میں ڈیم بننے سے زیر آب آگیا۔ اس کے شمال میں اوپر کی طرف ایک ٹیلے پر بنگالی لیڈی ڈاکٹر کا گھر تھا۔ یہ لیڈی ڈاکٹر کئی سالوں سے وہاں پریکٹس کرتی تھی۔ بھلوا اور شبیرا نجمی کو لے کر اس کے کلینک میں آگئے۔ بنگالی لیڈی ڈاکٹر نے نجمی کا بغور معائنہ کیا اور وہی کچھ بتایا جو بنگالی ڈاکٹر نے انہیں بتایا تھا۔ شبیرے نے پوچھا۔

"کیا بچہ پیدا ہونے کی کوئی امید نہیں ہے؟"

لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ "بھگوان اگر چاہے تو امید ہو سکتی ہے۔ ویسے تمہاری بیوی کی کوکھ بالکل ختم ہو چکی ہے۔ اب تمہیں اس عورت سے بچے کی امید نہیں رکھنی چاہئے۔"

نجمی کو تو جو صدمہ پہنچا وہ اپنی جگہ تھا لیکن اب شبیرے نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ وہ ایک بانجھ عورت کے لئے اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکتا تھا کہ گھر سے بے گھر ہو جائے۔ جلا وطنی مول لے اور ہمیشہ خطروں میں گھرا رہے۔ اس نے سوچا کہ کراچی تو اب اسے واپس جانا نہیں ہے۔ اس عورت نجمی کو اپنے ساتھ ساتھ لگائے رکھنا بیکار ہے بہتر یہی ہے کہ وہ ملک برما کی طرف نکل جائے۔ وہاں کسی لڑکی سے شادی کر کے نئی زندگی شروع کرے۔ مگر وہ نجمی کو یونہی ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ نجمی کو چھوڑے تو وہ واپس کراچی یا لاہور جا کر اس کے خلاف رپورٹ درج کرا دے اور پولیس اس کی تلاش میں رانگامتی پہنچ جائے۔ سب سے پہلے اس نے یہ پتہ کرایا کہ وہ برما کیسے جا سکتا ہے۔ بھلوا نے اسے یقین دلایا کہ وہ اسے رنگون پہنچانے میں اس کی مدد کرے گا۔ پھر اس نے شبیرے سے کہا۔

"تمہارے ساتھ تمہاری بیوی ہو گی۔ کیا وہ برما کے دشوار گزار جنگلوں میں سفر کر لے گی؟"

"شبیرے نے کہا میں اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا رہا۔" بھلوا اس کا منہ تکنے لگا تو کیا تم اپنی بیوی کو چھوڑ جاؤ گے؟" شبیرے نے سگریٹ جلایا اور بھلوا کی طرف دیکھ کر بولا۔

"میں اسے طلاق دے کر جاؤں گا۔ وہ اب بچہ پیدا نہیں کر سکتی۔ وہ میرے کسی کام کی نہیں ہے۔ میں ایسی بیوی چاہتا ہوں جو میرے بچوں کی ماں بن سکے۔" بھلوا نے تعجب سے پوچھا۔

"مگر اس کا تو یہاں کوئی نہیں ہے۔ تم اسے واپس کراچی پہنچاؤ گے کیا؟" نہیں شبیرے نے سگریٹ کا کش لگا کر کہا۔

"وہ کراچی واپس جا کر میرے لئے مصیبت کھڑی کر سکتی ہے میں اسے تمہارے حوالے کر جاؤں گا۔ اس کے عوض تم مجھے صرف اتنی رقم دے دو کہ میں برما جا کر کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر سکوں۔ مجھے معلوم ہے تمہیں ایسی لڑکیوں کی ضرورت رہتی ہے۔ میں آج ہی اسے طلاق دے رہا ہوں۔" اسی روز شبیرے نے نجمی کو طلاق دے دی مگر اس وقت نجمی وہاں موجود نہیں تھی۔ صرف بھلوا اور بھلوا کا ایک ساتھی بطور گواہ اس کے پاس موجود تھا پانچ ہزار روپے میں سودا طے ہو گیا۔ شبیرے نے نکاح نامہ پر طلاق کے تین حرف لکھ کر دستخط کر دیئے اور نکاح نامہ بھلوا کے حوالے کر دیا بھلوا نے اسے پانچ ہزار کی رقم ادا کر دی۔

شام کو جب مرتھا نے نجمی کو بتایا کہ اس کے خاوند نے اسے طلاق دے دی ہے وہ بہت خوش ہوئی۔ وہ اس عادی مجرم سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن جب مرتھا نے اسے یہ بتایا کہ بھلوا نے اسے شبیرے سے پانچ ہزار روپوں کے عوض خرید لیا ہے تو نجمی کا دل بیٹھ گیا۔

وہ گڑھے سے نکل کر کنوئیں میں گر گئی تھی۔ شبیرے کے ساتھ بیوی کی حیثیت سے رہتے ہوئے اسے امید تھی کہ وہ کبھی نہ کبھی فرار ہو جائے گی لیکن بھلوا اسمگلروں اور جرائم پیشہ افراد کے پورے گروہ کا سردار تھا اور وہ بے حد سنگدل اور ظالم

شخص تھا۔ سارے مشرقی پاکستان میں اس کے آدمی پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے چنگل سے نکلنا آسان کام نہیں تھا۔ نجمی دل کو پکڑ کر رہ گئی۔ وہ شبیرے سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس نے اگر طلاق دینی تھی تو پھر اسے بھلوا کے پاس فروخت کیوں کیا؟ اسے واپس کیوں نہیں جانے دیا۔

ابھی شام کی سنہری روشنی باقی تھی کہ نجمی نے شبیرے کو دیکھا۔ وہ کوٹھری کے سامنے درخت تلے بیٹھا اپنا پستول صاف کر رہا تھا۔ نجمی اس کے پاس جا کر بولی۔ "تم نے مجھے طلاق کیوں دی شبیرے؟"

شبیرے نے کوئی توجہ نہ دی اور پستول کی نالی صاف کرتا رہا۔ نجمی نے کہا "اگر مجھے طلاق دے دی تھی تو پھر اس بدمعاش کے پاس کیوں فروخت کیا۔ کیا لوگ اپنی بیویوں کو بیچ دیا کرتے ہیں۔"

شبیرے نے غصیلی نگاہوں سے نجمی کی طرف دیکھا اور بولا۔ "تم میری بیوی نہیں ہو۔ تم میرے بچے کی ماں نہیں بن سکتیں اس لئے میرے ساتھ نہیں رہ سکتیں۔"

"تو پھر مجھے لاہور کیوں نہیں بھیج دیتے۔" نجمی نے کہا۔

شبیرا غرایا "بکواس بند کرو۔ تمہیں لاہور بھیج کر میں اپنی قبر آپ نہیں کھودوں گا۔ اب تم بھلوا کی عورت ہو اس کے پاس جاؤ۔ وہ جیسا چاہے تمہارے ساتھ سلوک کرے۔ مجھے اس سے کوئی لینا دینا نہیں۔"

یہ کہہ کر شبیرے نے پستول کو صاف کر کے واسکٹ کی جیب میں ڈالا اور اٹھ کر درختوں کی طرف چل دیا۔ نجمی اس کے پیچھے پیچھے گئی۔ وہ اسے بار بار کہہ رہی تھی "شبیرے تم نے میری زندگی برباد کی ہے۔ اب تم مجھے یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر نہیں جا سکتے مجھے واپس لاہور بھجوا دو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے واپس لاہور پہنچا دو میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔"

شبیرا رک گیا۔ وہ غضبناک نظروں سے نجمی کو دیکھنے لگا "میں تم کو یہاں اس لئے لایا تھا کہ تمہارے ساتھ ایک شریف آدمی بن کر زندگی شروع کر دوں۔ مجھے

صرف اپنے بچّے کی پیدائش کا انتظار تھا پھر میں تمہیں اور اپنے بچّے کو لے کر شاید پر بابا سنگا پور کی طرف چلا جاتا مگر تم نے میرے بچّے کو ہلاک کر دیا۔ ہاں۔ میں جانتا ہوں۔ تم جان بوجھ کر ٹیلے سے گری تھیں میں کوئی بچہ نہیں ہوں لیکن قدرت نے تم سے انتقام لیا اور تیری کوکھ بنجر کر دی۔ اب تو کبھی کسی بچّے کی ماں نہ بن سکے گی۔"

نجمی نے عاجزی سے کہا۔ "مگر تم نے مجھے بیچا کیوں؟"

شیرے نے غرّاتے ہوئے کہا "تو کیا میں بنجر زمین کے ٹکڑے کو اپنے ساتھ ساتھ لئے پھرتا رہوں؟ تم اگر چاہو تو بھلوا سے بیاہ کر سکتی ہو۔ وہ بڑی عمر کا ہے تو کیا ہوا۔ وہ تمہارا بڑا خیال رکھے گا۔"

شیرا درختوں کے درمیان جو پگڈنڈی تھی اس پر چلنے لگا۔ نجمی اس کے پیچھے چلی آ رہی تھی اس نے کہا۔ "شیرے! مجھے تم سے اس قسم کی اُمید نہیں تھی کہ تم مجھے بیچ دو گے۔"

شیرے نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جھاڑیوں کے درمیان چلتا چلا گیا۔

نجمی آگے بڑھتے ہی لگی تھی کہ پیچھے سے اس کے نئے مالک بھلوا نے آواز دی "اری تو کہاں جا رہی ہے۔ چل واپس آ اب تیرا اس سے کوئی سمبندھ نہیں رہا۔" بھلوا نے مرتھا کو اشارہ کیا۔

مرتھا تیز تیز قدموں سے بڑھی اور نجمی کو بازو سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے پیچھے لے آئی۔ اتنے میں درختوں میں سے پستول کے فائر کی آواز آئی۔ پھر شیرے کی چیخ بلند ہوئی۔ بھلوا مرتھا اور دوسرے لوگ بھاگ کر اِدھر گئے۔ نجمی وہیں کھڑی رہی اسے شیرے کی چیخ کی آواز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ شیرا زمین پر اپنی پنڈلی کو دونوں ہاتھوں سے دبائے پڑا کراہ رہا تھا اور اس کے سامنے ایک سیاہ کالا ناگ پھن اٹھائے پھنکاریں مار رہا تھا۔ لوگوں نے سانپ پر پتھر اور لاٹھیاں برسانی شروع کر دیں۔

سانپ کو وہیں مار دیا گیا مگر وہ شیرے کو ڈس چکا تھا اور اپنی پنڈلی پر شیرے کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔

شیرے کا جسم سُن ہونے لگا تھا۔ اس کا حلق بند ہو رہا تھا۔ بھلوا اور اس کے آدمی شیرے کو اٹھا کر برآمدے میں لے آئے۔ بھلوا نے چلّا کر کہا۔ "گھی کا کنستر لاؤ۔ جلدی کرو۔" مگر گھی کا کنستر آنے سے پہلے شیرے کے ناک کان اور منہ سے سیاہ خون ابل ابل کر بہنا شروع ہو گیا۔ ناگ بہت زہریلا تھا۔ پانچ منٹ کے اندر شیرے کے مردہ جسم نے پھولنا شروع کر دیا۔

بھلوا اور اس کے آدمیوں نے وہیں ایک گڑھا کھود کر لاٹھیوں کی مدد سے شیرے کی لاش کو گڑھے میں گرا کر زمین میں دفن کر دیا۔ نجمی کو شیرے کی موت کا کوئی افسوس نہ ہوا۔ وہ اُلٹا دل میں اسے بد دعائیں دے رہی تھی کہ وہ مرنے سے پہلے اسے بدمعاشوں کے سردار کے پاس فروخت کر گیا تھا۔ نجمی کا نیا مالک شیرے سے زیادہ سخت گیر نکلا۔

شیرے نے تو پھر بھی اسے کافی آزادی دے رکھی تھی اور اس کی خاطر داری بھی کر لیتا تھا مگر بھلوا نے اسے کوٹھری میں بند کر کے رکھ دیا۔ اسے کوٹھری سے باہر نکلنے کی دن میں صرف ایک بار اجازت تھی اور اس وقت بھی مرتھا کے بجائے ایک بدمعاش پستول لٹکائے اس کے پیچھے پیچھے ہوتا تھا۔ نجمی تالاب پر نہاتی تو یہ بدمعاش جھاڑی کی اوٹ میں پستول لئے بیٹھا رہتا تھا۔ جس کوٹھری میں نجمی قید تھی اس کے دروازے پر تالا پڑا رہتا تھا۔

ایک روز مرتھا نے بھلوا سے کہا۔ "دادا! تم اس لڑکی سے بیاہ کیوں نہیں کر لیتے؟" بھلوا نے کہا۔

"بیاہ کرنے سے مجھے کیا ملے گا؟ وہ تو بانجھ ہے بانجھ۔" مرتھا نے پوچھا "تو پھر اسے یہاں کس لئے بند کر رکھا ہے تو نے؟"

بھلوا بولا۔ "کسی اچھے سے گاہک کا انتظار کر رہا ہوں۔ پانچ ہزار میں خریدی ہے اوپر میں چار ہزار نہ سہی دو اڑھائی ہزار تو ضرور کماؤں گا۔"

نجمی اس سازش سے بے خبر تھی لیکن اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ

اسے قید میں کیوں ڈال دیا گیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ بھلوا نے اگر اسے شبیرے سے خریدا ہے تو وہ اس سے شادی کرے گا۔ مگر ایسے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ بہت جلد یہ معمہ حل ہو گیا۔ ایک شام نجمی کو کھانا کھلا کر مرنخا باہر گئی تھی۔ کوٹھری میں مٹی کے تیل کا لیمپ جل رہا تھا۔

نجمی اس حبس آلود کوٹھری میں بے چینی سے بانس کی چارپائی پر پہلو بدلتی ہوئی پنکھا جھل رہی تھی کہ باہر دروازے کا تالا کھلنے کی آواز آئی اور بھلوا کے ساتھ ایک سیاہ گھنگریالے بالوں والا بڑی بڑی مونچھوں والا ریچھ نما آدمی کوٹھری میں داخل ہوا نجمی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بھلوا نے مسکرا کر کہا۔ "بیٹی رہو چندا یہ اپنا ہی آدمی ہے۔"

مونچھوں والا آدمی نجمی کو اوپر سے نیچے تک گھورنے لگا۔ بھلوا بولا۔ "یہ ہے جی چندا۔ بڑی سگھڑ ہے گھر کا کام کاج جانتی ہے۔ مہمانوں کی آؤ بھگت کرنے میں تو اس کا جواب نہیں ہے۔"

مونچھوں والے آدمی نے آگے بڑھ کر نجمی کے بازو کو پکڑ کر دو ایک بار دبایا۔ نجمی نے جلدی سے اپنا بازو کھینچ لیا۔ بھلوا نے اپنی زبان میں نجمی کو گالی دے کر کہا۔ "اب تجھے انہی کے پاس رہنا ہوگا۔ ہاتھ کیوں کھینچتی ہے ری چندا؟"

نجمی کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آ گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ اسے بھیڑ بکری کی طرح آگے فروخت کیا جا رہا ہے۔ بھلوا نے مونچھوں والے ہٹے کٹے آدمی سے پوچھا۔ "کیوں موجمدار جی کھرا مال ہے نا؟"

مونچھوں والا موجمدار "ہوں" کہہ کر بھلوا کے ساتھ کوٹھری سے باہر نکل گیا باہر سے دروازے پر تالا ڈال دیا گیا۔ نجمی گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی۔ اس کی زندگی کا ایک بھیانک دور ختم ہوا تھا اور اب دوسرا بھیانک ترین دور شروع ہونے والا تھا۔ یا اللہ میرے گناہ بخش دے مجھے موت دیدے میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔ لیکن نجمی کو زندہ رہنا تھا۔ ہر حال میں زندہ رہنا تھا۔ اس لئے کہ وہ خودکشی نہیں کر سکتی تھی

خودکشی کرنے کے لئے وہ اپنے اندر ہمت نہیں پا رہی تھی۔

مونچھوں والے بردہ فروش موجمدار نے بھلوا کو نجمی کے سات ہزار روپے نقد ادا کر دیئے۔ دریا میں اس کے آدمی کشتی میں تیار بیٹھے تھے۔ انہیں رات کے اندھیرے میں دریا پار کر کے انڈیا کی سرحد میں واپس چلے جانا تھا۔ یہ بھارت کے اسمگلر اور بردہ فروش تھے اور ان کا کام بارڈر پر اسمگلنگ کرنا اور غریب بے سہارا عورتوں کو خرید کر آگے کلکتے کے بردہ فروشوں کے ہاں فروخت کر دینا تھا۔ بھلوا نے موجمدار سے کہا۔ "یہاں چندا آواز نہیں نکال سکتی کشتی میں جانے کے بعد میری ذمے داری نہیں ہے۔ تم جانو اور تمہارا کام مگر میرا نام کہیں نہیں آئے۔"

موجمدار نے مونچھوں پر انگلی چلاتے ہوئے کہا۔ "بھلوا تم بھی جانتے ہو یہ ہمارا نیا پھیرا نہیں ہے۔ چندا ایسی کئی لڑکیوں کو میں انڈیا لے جا کر ٹھکانے لگا چکا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔"

آدھی رات کو بھلوا کے دو آدمی دندناتے ہوئے کوٹھری میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی نجمی کے ہاتھ پیچھے باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس کر رومال سے باندھ دیا اور پھر اسے اٹھا کر دریا کی طرف لے چلے۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ نجمی کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ اسے موقع مل بھی جاتا تو کیا کر سکتی تھی۔ وہ تو جرائم پیشہ مردوں کے ہاتھوں میں ایک بکاؤ مال ایک بے بس و مجبور جانور بن کر رہ گئی تھی۔

دریا کنارے کشتی تیار کھڑی تھی۔ موجمدار کے آدمی وہاں موجود تھے۔ اندھیرے میں انہوں نے کچھ سائے اپنی طرف بڑھتے دیکھے تو جلدی سے کشتی سے نکل کر باہر آ گئے۔ کشتی میں پٹ سن کا ڈھیر لگا تھا۔ نجمی کو پکڑ کر اس ڈھیر کے نیچے چھپا دیا گیا۔ موجمدار نے خنجر نکال کر نجمی کی گردن پر رکھا اور کہا۔ "زیادہ ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش کی تو گردن پر چھری پھیر دوں گا۔ میں کئی لڑکیوں کو اس طرح قتل کر کے ان کی لاشیں دریا میں پھینک چکا ہوں۔"

نجمی سہم گئی اس کے اوپر دھان کے ریشے ڈال دیئے گئے۔ کشتی دریا میں چل

نکلی کچھ دُور تک وہ دریا کے کنارے کنارے چلتی رہی۔ پھر اس کا رُخ دریا کے دوسرے کنارے کی طرف ہوگیا۔ رانگامٹی کے دامن میں مشرق کی جانب دریائے کرنافلی کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں ہے۔ اس کے دوسرے کنارے پر ایک جانب سندر بن ہے اور دوسری جانب بانس کے جنگلوں میں سے ہلی کے مقام کی طرف راستہ جاتا ہے ان لوگوں کی منزل ہلی تھی۔

کشتی رات کے اندھیرے میں دائیں جانب والے بانس کے جنگل کے کنارے جالگی۔ جلدی جلدی آدمی نیچے اُترے۔ نجمی کو دھان کے نیچے سے نکالا وہ ادھ موئی سی ہورہی تھی۔ اس کے منہ میں جو کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اس سے اس کا دم گھٹ رہا تھا اس نے موجمدار کی طرف دیکھ کر اپنے منہ کی طرف اشارہ کیا۔ موجمدار نے بڑھ کر نجمی کے منہ سے کپڑا کھینچ لیا۔

نجمی نے بے اختیار گہرا سانس بھرا اور بنگلہ میں بولی۔ "میرا منہ کھلا رہنے دو۔ میں کوئی آواز نہیں نکالوں گی۔ اب میں کس کو مدد کے لئے پکار سکتی ہوں۔" اندھیرے میں نجمی کو موجمدار کے دانت نظر آئے۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ سرگوشی میں بولا۔

"اب اُونچی آواز میں کوئی بات نہ کرنا۔ بس خاموشی سے چلتی رہو میرے ساتھیوں کے ہاتھوں میں ڈاہ ہیں تم خوب جانتی ہو ڈاہ ایک پل میں آدمی کے دو ٹکڑے کر دیتا ہے چلو۔"

نجمی کے ہاتھ ابھی تک پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ جنگل میں کچھ دُور چلنے کے بعد ایک جھونپڑی آگئی۔ جھونپڑی کے باہر مٹی کے تیل کا لیمپ روشن تھا۔ دو پراسرار آدمی جھونپڑی سے باہر نکل آئے۔ موجمدار نے نجمی کو جھونپڑی کے اندر بھجوا دیا اور خود باہر زمین پر بیٹھ کر ان آدمیوں سے باتیں کرنے لگا۔ جھونپڑی والے آدمیوں نے موجمدار کو بتایا کہ آگے ہلی تک راستہ صاف ہے۔ اپنا ایک آدمی تمہارے ساتھ جائے گا۔ موجمدار نے جیب سے کچھ نوٹ نکال کر ان آدمیوں میں بانٹ دیئے۔ اس کے بعد نجمی اور آدمیوں کو ساتھ لیا اور جنگل میں ایک دشوار گزار راستے پر چل پڑا۔ یہاں اُونچی گھاس اور

جنگلی جھاڑیوں کی بھرمار تھی۔ ایک گھنٹے تک یہ لوگ جنگل میں چلنے کے بعد ایک ندی کے کنارے آگئے۔ یہاں ایک کشتی موجود تھی۔ اب ندی میں کشتی پر سفر شروع ہوگیا۔ یہ ندی جنگل کے مختلف موڑ مڑتی ایک کھلے میدان میں نکل آئی۔

اندھیری رات کو آسمان پر کھلے ہوئے ستارے روشن کرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے مگر ان لوگوں کو اپنے راستے کا پورا علم تھا۔ آگے بارڈر قریب تھا انہوں نے ایک برساتی نالے میں سے گزر کر بارڈر کراس کر لیا۔ ہلی کا چھوٹا سا گاؤں ان کی بائیں جانب رہ گیا تھا۔ یہاں انہیں انڈین بارڈر فورس کے دو سپاہیوں کو پانچ پانچ سو روپے اور ایک ایک ٹرانسسٹر رشوت کے طور پر دینا پڑا اور وہ بھارت کی سرزمین میں داخل ہوگئے تھکاوٹ کے مارے نجمی بے حال ہو رہی تھی۔

انڈیا کا بارڈر کراس کرنے کے بعد موجمدار نے اپنے پر پرزے نکال لئے۔ اس جگہ ان کا ایک ٹھکانہ تھا جہاں اُنہوں نے رات کا باقی حصہ بسر کرنا تھا۔ نجمی کا ایک پاؤں چارپائی کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ جھگی کے باہر ایک آدمی پہرے پر بھی موجود تھا۔ نجمی تو چارپائی پر گرتے ہی جیسے بے ہوش ہوگئی۔ نجمی کی آنکھ کھلی تو کوٹھڑی میں گھپ اندھیرا تھا۔ پہلے تو کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے حواس میں آگئی۔

اس کے کانوں میں دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی وہ چارپائی پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا ایک پاؤں چارپائی کی پائنتی کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ نجمی کو علم ہو چکا تھا کہ وہ موجمدار اور اس کے جرائم پیشہ ساتھیوں کے ہمراہ بارڈر کراس کر کے بھارت میں آگئی ہے۔ وہ غیر قانونی طور پر انڈیا میں داخل ہوئی ہے اور یہ بدمعاش یا تو اسے کسی دوسرے کے ہاتھ آگے بیچ دے گا یا اسے گناہ کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے گا۔

نجمی گناہ کی اس اتھاہ دلدل میں گرنے سے پہلے وہاں سے فرار ہونے کی ایک آخری کوشش ضرور کرنا چاہتی تھی۔ وہ اگرچہ انڈیا کبھی نہیں آئی تھی مگر وہ ایک پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ بھارت کے کسی بڑے شہر میں پاکستان

کے قونصل خانے یا سفارت خانے میں کسی طرح پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تو اس کے بھیانک مصائب کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ وہ کان لگا کر آدمیوں کی آوازیں سننے لگی۔

ان میں سے ایک آواز مونچھوں والے موجمدار کی تھی۔ وہ کسی کے ساتھ دھیمی آواز میں باتیں کر رہا تھا لگتا تھا کہ یہ دونوں شخص کوٹھڑی کی دیوار یا دروازے کے بالکل قریب بیٹھ کر باتیں کر رہے ہیں۔ وہ بنگلہ زبان میں بول رہے تھے اور نجمی اب اس زبان کو اچھی طرح سمجھ لیتی تھی اور ٹوٹی پھوٹی بول بھی لیتی تھی۔ نجمی ہمہ تن گوش ہو گئی۔ باہر چونکہ رات گہری اور خاموش تھی اس لئے وہ آوازوں کو آسانی سے سن سکتی تھی۔ موجمدار کہہ رہا تھا۔

"میں اسے کالی پور والے اڈے پر ہی رکھوں گا تم شہر جا کر بھیکم کو خبر کر دینا میں چورنگی والوں کے ساتھ سودا نہیں کرنا چاہتا۔ مال خوبصورت بھی ہے اور جوان بھی میں پوری رقم وصول کروں گا۔" دوسرے آدمی کی آواز آئی۔

"دادا! بھیکم اپنی کمیشن بہت لے گا۔" موجمدار نے جواب میں کہا۔

"لیکن وہ مال لکھی بائی کے ہاں بکوا دے گا۔ سوناگاچی میں اس کی زیادہ، قیمت نہیں پڑے گی۔ وہ جاتے ہی یہ اعتراض کرنے لگتے ہیں کہ لڑکی کو گانا بجانا ڈانس کرنا سکھانا پڑے گا۔ لکھی بائی مال دیکھ کر اچھی قیمت دیدے گی۔"

نجمی سمجھ رہی تھی کہ اسے ایک بار پھر آگے کسی کے ہاتھ بیچنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ سوناگاچی کلکتے کا سب سے بڑا بازار حسن ہے۔ اور لکھی بائی شہر کے سب سے بڑے زیر زمین فیشن ایبل اڈے کی سرغنہ عورت ہے۔ جہاں سب معاملے ٹیلی فون پر طے ہوتے ہیں۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ اسے زیادہ سے زیادہ دام لے کر کسی ایسی جگہ فروخت کیا جا رہا ہے جہاں ایک امیر آدمی اسے زر خرید لونڈی بنا کر اپنے گھر میں رکھ لے گا اور جہاں اس کی کوئی شنوائی نہیں ہو گی۔ اور وہ زندہ درگور ہو جائے گی۔

موجمدار کی باتوں سے اسے اتنا اندازہ ہو گیا کہ کالی پور نام کا ریلوے اسٹیشن وہاں سے قریب ہی ہے اور یہ لوگ ایک دن اسی جگہ گزار کر دوسرے دن رات

کے وقت وہاں سے کلکتے لے جانے والے ہیں۔ نجمی نے اپنے دل و دماغ سے مایوسی اور حسرت و یاس کے تمام جذبات کو نکال باہر پھینکا اور اپنے ذہن کی پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے وہاں سے فرار ہونے کے منصوبے پر غور کرنا شروع کر دیا۔

دن چڑھا تو موجمدار نے خود کوٹھڑی میں آ کر نجمی کے پاؤں کی رسی کھولی اور کہا۔ "میرا آدمی تمہیں تالاب پر لے جائے گا۔ جا کر اشنان کرو پھر ناشتہ کر کے یہاں آرام کرنا۔ ایک بات دھیان سے سن رکھو جندرا۔ بھاگنے کی کوشش فضول ہو گی۔ اس سارے علاقے میں میرے آدمی پھیلے ہوئے ہیں۔ چلو۔ باہر نکلو۔"

نجمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس سر جھکائے کھڑی رہی۔ موجمدار نے نجمی کو بالوں سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور گرج کر کہا۔

"کیا تم سنتی نہیں ہو میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

نجمی نے انہیں کی زبان میں آہستہ سے کہا۔ "میں کہیں نہیں جاؤں گی۔" "شاباش!" موجمدار نے نجمی کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ ایک دھوتی پوش کالا کلوٹا ہندو بنگالی جس نے ہاتھ میں ڈاہ پکڑ رکھا تھا۔ نجمی کو نزدیکی تالاب پر لے گیا۔ اس نے تالاب کی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "ادھر جاؤ۔ ہم ادھر پہرہ دے گا۔ بھاگے گا تو اس ڈاہ سے ٹکڑے کر دے گا۔"

تالاب سے نہا کر واپس آنے کے بعد نجمی نے ارد گرد گہری نظر سے جائزہ لیا یہ جگہ کسی ویران علاقے میں واقع تھی جہاں ایک طرف ناریل کے درختوں کی قطار اندر تک چلی گئی تھی اور دائیں جانب اونچی نیچی زمین پر جگہ جگہ جنگلی جھاڑیوں اور سوکھی گھاس اگ رہی تھی۔ دور نجمی کو کچھ کھمبے نظر آئے جو شاید ٹیلی فون کے کھمبے تھے۔ یہ مشرق کی طرف جا رہے تھے۔

کوٹھڑی میں واپس آئی تو اسے ابلے ہوئے چاول اور مچھلی کا سالن دیا گیا۔ ناشتے کے بعد اس کا ایک پاؤں چارپائی سے باندھ دیا گیا۔ نجمی چارپائی پر لیٹ گئی اور فرار ہونے

کے بارے میں غور کرنے لگی۔ اس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ ایک بار اپنی زندگی داؤ پر لگا دینا چاہتی تھی۔ وہ ان جرائم پیشہ لوگوں کے چنگل سے نکل کر کسی نہ کسی طرح کالی پور ریلوے اسٹیشن پہنچنا چاہتی تھی۔ وہاں کے اسٹیشن ماسٹر کو بھی اپنی بپتا سنا کر اس سے مدد لے سکتی تھی پھر اسے خیال آیا کہ وہ تو پاکستانی ہے اور اس کے پاس پاسپورٹ بھی نہیں ہے۔ اسٹیشن ماسٹر تو اسے پولیس کے حوالے کر دے گا۔ یہاں کی پولیس ہندو ہے۔ خدا جانے وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ اسے غیر قانونی طور پر انڈیا میں داخل ہونے کے جرم میں قید کی سزا ہو جائے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا اسے پاکستانی جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لیا جائے اور پھر خدا جانے اس کو کیسی کیسی اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا جائے۔

نہیں نہیں نجمی نے سوچا۔ اسے کلکتے پہنچ کر پاکستانی قونصل خانے میں جانے کی کوشش کرنی ہو گی۔ کلکتے میں مسلمان بنگالی بھی ہیں وہ ضرور اس کی مدد کریں گے۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کلکتے میں پاکستان کا قونصل خانہ ہے بھی کہ نہیں۔ اسی اُدھیڑ بن میں سارا دن گزر گیا۔

شام کو ایک بار پھر نجمی کو تالاب پر لے جایا گیا۔ اس دفعہ نجمی نے اپنی کوٹھری کا بھی بغور جائزہ لیا۔ یہ بانس کی چار دیواری والی جھونپڑی نما کوٹھری تھی جس پر ناریل کی شاخوں کی ڈھلانی چھت پڑی تھی۔ کوٹھری کے عقب کی جانب نشیب تھا۔ آگے جا کر زمین پھر اونچی ہو کر ہموار ہو گئی تھی۔ اس سے آگے جنگلی جھاڑیوں اور کہیں کہیں اُگے ہوئے ناریل کے چھریرے درختوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو دُور بجلی یا ٹیلیفون کی تاروں کے کھمبوں تک چلا گیا تھا۔

رات کو ایک بار پھر نجمی کو مچھلی اور اُبلے ہوئے چاول کھانے کو دیئے گئے اسی رات کے پچھلے پہر ان لوگوں کو وہاں سے آگے روانہ ہونا تھا۔ شام ہوتے ہی یہ لوگ باہر کسی نشہ آور مشروب کا مٹکا کھول کر بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ان کی آوازیں بلند ہو گئیں اور وہ آپس میں واہیات باتیں کرنے لگے۔

نجمی کے پاؤں میں جو رسی بندھی تھی وہ اتنی لمبی تھی کہ وہ چارپائی سے اتر کر صرف دو قدم آگے چل سکتی تھی۔ چارپائی بانس کی تھی۔ نجمی نے اسے اٹھا کر کوٹھری کے بانس کے دروازے کے قریب کیا اور سوراخ سے جھانک کر باہر دیکھا۔ چار آدمی تھوڑے فاصلے پر سامنے گھاس پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ناریل کے پیالوں میں مشروب پی رہے تھے۔ ایک طرف لالٹین زمین پر رکھی تھی۔ اس کی دھیمی روشنی میں نجمی نے موجمدار کو دیکھا کہ وہ بھی ان لوگوں کے درمیان بیٹھا لہک لہک کر باتیں کر رہا تھا۔

نجمی دل میں دعائیں مانگنے لگی کہ یہ لوگ پی پی کر اسی جگہ بے ہوش ہو جائیں۔ اس نے چارپائی درمیان میں کھسکا لی اور رسی کی گانٹھ کو غور سے دیکھنے لگی۔ رسی پٹ سن کی تھی۔ اس کی دو گانٹھیں نجمی کے پاؤں میں لگی تھیں اور دو تین گانٹھیں پائنتی کی طرف بانس کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔

نجمی نے اپنے پاؤں میں لگی گانٹھوں کو کھولنے کی کوشش شروع کر دی۔ اسے بہت جلد احساس ہو گیا کہ گانٹھیں اتنی پختہ ہیں کہ وہ اسے صبح تک بھی کوشش کرتی رہے تو کھول نہیں سکے گی۔ مگر اسے ہر حالت میں انہیں کھولنا اور اسی رات وہاں سے فرار ہونا تھا۔ اس نے کوٹھری میں نگاہ دوڑائی۔۔۔ مگر اس نے دن کے وقت بھی دیکھ لیا تھا کہ کوٹھری میں سوائے بانس کی چارپائی کے دوسری کوئی چیز نہیں تھی۔

باہر سے اب کسی کے بے سرے بنگلہ گانے کی آواز آ رہی تھی۔ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ باہر بیٹھے آدمیوں کی آوازیں مدھم پڑتی گئیں پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ نجمی نے پاؤں کی رسی کھولنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ وہ رسی کو پائنتی کے بانس سے رگڑنے لگی۔ دروازے کے باہر آہٹ ہوئی۔۔۔۔

نجمی نے جلدی سے ہاتھ پیچھے ہٹا لیا اور چارپائی پر خاموشی سے لیٹ گئی۔ بانس کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ نجمی نے لیٹے لیٹے پلٹ کر دیکھا یہ موجمدار نہیں تھا۔ اس کا ایک ساتھی تھا۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ نجمی جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ آدمی بھی جلدی سے زمین پر بیٹھ گیا پھر تیزی سے لپک کر چارپائی پر دونوں ہاتھ رکھ کر سرگوشی

میں بولا۔

"چندا بائی... میں تمہیں... عیش کراؤں گا... میرے ساتھ... چندا بائی... میرے ساتھ... عیش کراؤں گا رے... میرے ساتھ بھاگ چل... چل... نکل چل..."

اسے بہت چڑھی ہوئی تھی... اس کے منہ سے بات صحیح نہیں نکلتی تھی، وہ گردن طوطے کی طرح گھما رہا تھا۔ اچانک نجمی کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح چمکا... اس نے اس ہندو بنگالی کے ہاتھ تھام لئے اور آہستہ سے بنگلہ میں بولی "مجھے یہاں سے نکال لے چل... میں ساری زندگی تیری خدمت کروں گی..."

آدمی نے سینہ پھلا دیا اور ہلکی سی ہچکی لی اور بولا "چندا رانی... تو رانی ہے... شی... خاموش... بول نہیں... سالا موجمدار نہ سن لے... سالا کہاں سنے گا... میں نے سب کو بہت پلا دی ہے... چندا چل میرے ساتھ بھاگ چل..."

نجمی نے اسے پاؤں کی رسی دکھائی... وہ دانتوں سے رسی کی گانٹھیں کھولنے لگا۔ خدا جانے اس دبلے پتلے ہندو بنگالی میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ اس نے چند لمحوں میں رسی کھول ڈالی۔ نجمی چارپائی سے نیچے اتر آئی۔ وہ آدمی نجمی کو پیچھے کھینچ کر بولا...

"شی! چندا رانی... شی... جلدی نہ کر... مجھے دیکھ آنے دو..." اور وہ لڑکھڑاتا ہوا کوٹھڑی سے باہر نکل گیا... اس کے فوراً ہی بعد اندر آ گیا۔ اور دونوں بازو کھول کر بولا۔ وہ سالے بے ہوش پڑے ہیں... دھت... میں نے جان بوجھ کر انہیں زیادہ پلا دی تھی..."

وہ خود بھی زیادہ چڑھائے ہوئے تھا اسے اس کا احساس نہیں تھا۔ وہ بار بار لڑکھڑا جاتا تھا۔ نجمی کے لئے یہ صورت حال بہت فائدہ بخش تھی۔ بجائے اس کے کہ وہ آدمی نجمی کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے جاتا۔ نجمی نے اس کا بازو پکڑا اور اسے کوٹھڑی سے نکال کر ایک طرف چلانے لگی۔ باہر لالٹین کی لو بہت دھیمی کر دی

گئی تھی۔ یہ سب کچھ اس آدمی نے ہی کیا تھا کیونکہ وہ رات کو نجمی کو وہاں سے بھگا کر لے جانا چاہتا تھا۔ گھاس پر موجمدار اور اس کے باقی ساتھی اوندھے پڑے تھے۔

نجمی اپنے عاشق صادق کو سنبھالے نشیب کی طرف اندھیرے میں بڑھی تو عاشق صادق لڑکھڑا کر گر پڑا... گرتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور آگے پیچھے یوں ڈولنے لگا جیسے طوفانی سمندر میں جہاز کے عرشے پر کھڑا ہو۔ نجمی اس جگہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی وہ شور مچا سکتا تھا۔ اس نے اپنے محبوب کو تھام لیا۔ وہ نجمی کا سہارا لئے لڑکھڑا لڑکھڑا کر چل رہا تھا اور ساتھ ساتھ بار بار اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر نجمی کو خاموش رہنے کا اشارہ بھی کرتا جاتا تھا۔ آگے نشیب تھی یہاں آتے ہی وہ ایسا لڑکھڑایا کہ زمین پر لوٹنیاں کھاتا دُور نیچے تک چلا گیا۔ نجمی بھاگ کر اس کے پاس آ گئی کہ اگر وہ شور مچائے تو وہ اس کا منہ بند کر دے۔

یہ خدشہ بے بنیاد تھا کیونکہ اسے اتنی ہوش نہیں رہی تھی وہ بے سدھ اور بے ہوش پڑا تھا۔ نجمی نے دل ہی دل میں اس عاشق صادق کا شکریہ ادا کیا اور سامنے والے میدان کی چڑھائی چڑھ کر اُوپر ناریل کے درختوں میں آ گئی۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے جیسے وہ بھی نجمی کے اس عجیب و غریب فرار کو دلچسپی سے تک رہے ہوں۔

نجمی نے دُور کھمبوں کی قطار کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ نسواری رنگ کی دھوتی نما ساڑھی میں ملبوس تھی۔ پاؤں میں ربڑ کی چپل تھی جو اسے تیزی سے بھاگنے سے روک رہی تھی۔ اس نے چپل اتار کر ہاتھ میں پکڑی اور اندھا دھند بھاگنے لگی۔ بہت جلد اس نے میدان پار کر لیا اور ناریل کے درختوں کی قطار کے پاس آ گئی۔ زمین پر سوکھی گھاس تھی اور اندھیرے میں جھاڑیاں آسیبی سایوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ نجمی ان کے درمیان بھاگتی گئی۔ جب تھک جاتی تو بیٹھ کر تھوڑی دیر سانس درست کرتی اور پھر بھاگنا شروع کر دیتی۔ فرار کا یہ اس کا شاید آخری موقع تھا۔ وہ اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے جرائم پیشہ لوگوں کی گناہ آلود زندگی سے جتنی

دُور ہو سکے دُور ہو جانا چاہتی تھی۔

آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا مگر نجمی کو انہیں دیکھنے کی فرصت نہیں تھی اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ سوکھی گھاس اس کے پاؤں کے تلوؤں کو تکلیف دے رہی تھی مگر نجمی اس سے بے نیاز بھاگی جا رہی تھی۔ اس نے اونچا نیچا میدان عبور کر لیا۔ ناریل کے درختوں کی قطار بہت پیچھے رہ گئی تھی۔

وہ ٹیلی فون کے کھمبوں کے پاس آ گئی۔ یہاں دھان کے کھیت تھے۔ جنوب مغرب کی طرف اسے دور روشنی سی جھلملاتی دکھائی دی۔ ضرور ادھر کوئی آبادی ہو گی۔ یہ سوچ کر نجمی اس روشنی کی طرف دوڑنے لگی۔ اب وہ بہت تھک گئی تھی اور اس سے بھاگا نہیں جاتا تھا۔ موجمدار اور اس کے آدمی اگرچہ بے سدھ پڑے تھے مگر ممکن تھا کہ وہ ہوش میں آ جائیں اور موجمدار اسے وہاں نہ پا کر اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہو... اس لئے نجمی راتوں رات اس خطرناک علاقے سے نکل جانا چاہتی تھی۔ دوڑنے کی اس میں سکت نہیں تھی۔

وہ تیز تیز چلنے لگی... تھوڑی دیر بعد وہ تیز چلتے ہوئے بھی تھک گئی۔ وہیں بیٹھ کر ہانپنے لگی۔ جسم پسینے سے بھر گیا تھا۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ اس نے ساڑھی کے پلو سے منہ پونچھا۔ . ذرا سانس ٹھیک ہوا تو اٹھی اور روشنی کی طرف چلنے لگی جواب قریب آ گئی تھی۔ یہ ایک نہیں دو تین روشنیاں تھیں۔ اصل میں یہ ایک چھوٹی نیم پختہ سڑک تھی جو کالی پور کی منڈی سے نکل کر آگے کشن گام کے قصبے تک چلی گئی تھی۔ سڑک پر آ کر نجمی کو کچھ تسلی ہوئی کہ وہ انسانی آبادی میں پہنچنے والی ہے۔ اس وقت رات کے ڈیڑھ بجے کا سماں تھا۔ ٹھنڈی مرطوب ہوا چلنے لگی تھی۔

سڑک کے کنارے کافی فاصلوں پر دھیمی روشنی والے بلب روشن تھے۔ راستے میں نجمی نے ایک تالاب دیکھا... مگر اس کا پانی بہت نیچے جا کر تھا اور سیڑھیاں، غائب تھیں۔ اندھیرے میں نجمی نے تالاب تک پہنچ کر پانی پینے کا خطرہ مول نہ لیا۔

وہ سڑک کے کنارے کنارے جس طرف اندھیرا تھا اس جانب چل رہی تھی

کبھی کبھی وہ پیچھے مڑ کر بھی دیکھ لیتی تھی۔ اس کی پنڈلیاں درد کرنے لگی تھیں۔ اب وہ قدم قدم چل رہی تھی۔ جب کھمبے کی روشنی آتی تو وہ جھاڑیوں کے پیچھے سے ہو کر نکل جاتی... یونہی چلتے چلتے آخر اس نے دُور جھلملاتی روشنیوں کو دیکھا جو پہلے تو دور ستاروں کی طرح ٹمٹماتی رہیں پھر آہستہ آہستہ اُبھر کر سامنے آ گئیں۔ یہ چھ سات روشنی کے نقطے تھے جن میں سے کچھ سرخ روشنیاں تھیں۔ اچانک نجمی کو خیال آیا کہ یہ ضرور کوئی ریلوے اسٹیشن ہوگا اور یہ ریلوے سگنل کی سرخ بتی ہے۔

ریلوے اسٹیشن کے خیال سے نجمی میں ایک نیا حوصلہ آ گیا۔ وہ یہاں سے کسی بھی ٹرین میں بیٹھ کر کلکتے جا سکے گی۔ اس نے دوبارہ سگنل کی بتی کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ تھوڑا بھاگنے کے بعد وہ تھک گئی۔ اب پھر وہ قدم قدم چل رہی تھی۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ ریلوے لائن پر آ گئی جو سیدھی ایک چھوٹے سے اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی جہاں کچھ سرخ اور زرد بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ نجمی تیز تیز چلنے لگی۔ ریلوے اسٹیشن قریب آیا تو اس نے اپنی رفتار مدھم کر لی۔

اسے یہ خطرہ بھی محسوس ہوتے لگا تھا کہ کہیں ریلوے والے موجبدار کے جاننے والے نہ ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ میرے آدمی اس علاقے میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں یہ ریلوے اسٹیشن چھوٹا تھا اور اس کا صرف ایک ہی پلیٹ فارم تھا۔ کہیں کہیں پلیٹ فارم پر روشنی ہو رہی تھی۔

اندھیرے میں نجمی بنگلہ میں لکھا ہوا اسٹیشن کا نام نہ پڑھ سکی۔ پلیٹ فارم کے شروع میں ہی نلکا لگا تھا۔ نجمی نلکا کھول کر صدیوں سے پیاسے انسان کی طرح پانی پر ٹوٹ پڑی پانی پیا... منہ دھویا... گردن پر پانی ڈالا... پاؤں دھوئے اور ساڑھی سے منہ پونچھ رہی تھی کہ کسی نے بنگلہ میں پوچھا۔ "کون ہو تم!" نجمی کا دل زور سے دھڑکا... اس نے پلٹ کر دیکھا۔

نجمی کے پیچھے ایک ہندو بنگالی کھڑا اسے گھور کر دیکھ رہا تھا۔ ہندو اس لئے کہ اس کے ماتھے پر سیندور کا تلک لگا تھا۔ یہ پکی عمر کا دبلا پتلا آدمی تھا جس نے دھوتی کرتہ پہن رکھا تھا۔ جرائم پیشہ لوگوں میں رہتے ہوئے نجمی میں ایک بے باکانہ اعتماد بھی پیدا ہو گیا تھا۔ اس ہندو بنگالی نے بنگلہ زبان میں نجمی سے پوچھا تھا کہ "کون ہو تم؟" نجمی نے شاید پہلی بار ایک غیر مرد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تیز لہجے میں بنگلہ میں ہی جواب دیا۔

"تم پوچھنے والے کون ہو؟ یہیں ٹھہرو میں ابھی پولیس کو بلاتی ہوں۔"

ہندو بنگالی ایک دم نرم ہو گیا ہاتھ باندھ کر بولا۔

"بیٹی میں نے تو اس لئے پوچھا تھا کہ تم اکیلی ہو اور یہ بارڈر ایریا ہے یہاں بدمعاش لوگ بہت پھرتے ہیں تمہارا پتی تمہارے ساتھ نہیں کیا؟"

نجمی نے کوئی جواب نہ دیا اور صبح کی پھیلتی روشنی میں نیم ویران دیہاتی ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر چل پڑی۔ پلیٹ فارم کی ٹین کی چھت کے نیچے دو چار لوہے کے بنچ بچھے تھے جن پر چند ایک مسافر بیٹھے گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔

نجمی کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ جتنی جلدی ہو سکے اس خطرناک علاقے سے نکل کر کلکتے پہنچ جائے۔ کلکتہ بڑا شہر تھا۔ وہ اتنے بڑے شہر میں آسانی سے گم ہو سکتی ہے وہ کلکتے پہنچ کر پاکستانی قونصلیٹ سے رابطہ پیدا کرنا چاہتی تھی تاکہ وہاں پناہ حاصل کر کے واپس پاکستان جا سکے۔ جو بات اسے پریشان کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ جن لوگوں سے وہ بھاگ کر آئی ہے کہیں وہ یہاں نہ پہنچ جائیں۔ نجمی اکیلی ہی نہیں تھی بلکہ اس کے پاس چند روپوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہاں سے کلکتے تک کا کرایہ کتنا ہے۔ اسی ادھیڑ بن میں نجمی پلیٹ فارم کے واحد ٹی اسٹال کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا پکی عمر کا ہندو بنگالی ایک بنچ پر کسی موٹی عورت کے پاس بیٹھا بستر کو رسی سے باندھ رہا تھا۔ نجمی کو یہ عام گھریلو قسم کا آدمی لگا جو اپنی بیوی کے ساتھ سفر کر رہا تھا اور اس نے ممکن ہے محض ہمدردی کی خاطر نجمی سے پوچھ لیا ہو کہ وہ کون ہے اور کہاں جا رہی ہے۔ وہ اکیلی کیوں ہے نجمی نے سوچا کہ اس آدمی اور اس کی بیوی کی حفاظت کی چھتری میں وہ کلکتے تک سفر کر سکتی ہے۔ مگر اب وہ خود اس ہندو بنگالی کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ اسٹال کے پاس لوہے کے کھمبے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔

اتنے میں وہی ہندو بنگالی اپنی موٹی بیوی سے کچھ پیسے لے کر انہیں گنتا، ہوا اسٹال کی طرف آیا۔ نجمی گوشۂ چشم سے اسے تک رہی تھی۔ اسٹال پر آ کر

اس نے مٹی کے آبخوروں میں چائے ڈلوائی اور انہیں ہاتھوں میں تھام کر واپس جانے لگا تو نجمی کے پاس آ گیا۔

"بیٹی کیا تم ہمارے ساتھ چائے نہیں پیو گی؟ میری بیوی بھی تمہارا پوچھ رہی تھی کہ یہ بچی اکیلی کیوں بیٹھی ہے اسے بھی چائے پلا دو۔"

نجمی خود اس فیملی کے پاس جانا چاہتی تھی وہ اُٹھ کر ہندو بنگالی کے پاس آ گئی اور بولی۔

"میرے پاس پیسے ہیں میں چائے لیتی ہوں۔"

ہندو بنگالی بڑے اخلاق سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے بیٹی! تم کو اپنی بیٹی کہا ہے اب باپ کا فرض بنتا ہے کہ وہ بچی کو چائے پلائے۔"

اس نے نجمی کے لئے بھی چائے لی اور اپنی بیوی کے پاس آ گیا۔ نجمی نے اس کی بیوی کو غور سے دیکھا۔ سیدھے سادے نین نقش والی گہرے سانولے رنگ کی ادھیڑ عمر بھاری بدن والی بنگالی عورت تھی۔

اس کے ماتھے پر بھی بندی لگی تھی۔ اس نے نجمی کو اپنے پاس بٹھا لیا اور تھیلے میں سے بوندی کا لڈو نکال کر نجمی کو دیا۔ ایک لڈو اپنے خاوند کو بھی دیا نجمی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹی تمہارا نام کیا ہے؟ تم کہاں جا رہی ہو؟ تمہارا پتی دیو ساتھ نہیں آیا؟"

نجمی نے ایک گہری نگاہ پلیٹ فارم کے آخری جنگلے پر ڈالی۔ اسے ہر لمحہ خطرہ لگا تھا کہ موجمدار یا اس کا کوئی آدمی وہاں نہ آ جائے۔ پھر بولی۔

"موسی! میرا نام چندا ہے میرے آدمی نے مجھے مار کر گھر سے نکال دیا ہے اب کلکتے جا رہی ہوں۔"

بنگالی عورت نے پوچھا۔

"کلکتے میں تیرا کوئی بھائی بند ہے کیا؟"

نجمی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"وہاں تو میرا کوئی بھی نہیں ہے مگر کسی آشرم میں رات گزار لیا کروں گی۔ دن میں لوگوں کے گھروں کا کام کاج کر لیا کروں گی۔"

بنگالی عورت نے نجمی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بیٹی چندا! کلکتہ تو بہت بڑا شہر ہے وہاں تمہیں کسی آشرم کا کیسے پتہ چلے گا۔ کیا تم پہلے کبھی کلکتے گئی ہو؟"

نجمی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ہندو بنگالی کہنے لگا۔

"بیٹی! ایسا کرنا کہ تم کلکتے پہنچ کر ہمارے گھر چلی چلنا۔ ہم بھی کلکتے جا رہے ہیں۔ میں ایک دفتر میں چپڑاسی ہوں میرا چھوٹا سا کوارٹر ہے جو دفتر کی طرف سے ملا ہوا ہے۔"

اس کی بیوی نے بڑی شفقت سے کہا۔

"ہم تمہیں وہاں کوئی کام بھی دلوا دیں گے اور تمہارا کسی آشرم میں ٹھہرانے کا بندوبست بھی کر دیں گے۔"

ہندو بنگالی چائے کے سکورے کا آخری گھونٹ چڑھا کر بولا۔ "ہماری کوئی اولاد نہیں ہے بیٹی۔ چند روز ہمارے ہاں رہ لو گی تو ہمیں بڑی خوشی ہو گی آگے تمہاری مرضی ہے ہم تمہیں مجبور نہیں کر سکتے۔"

بنگالی عورت کہنے لگی۔ "تم اپنے خاوند کے پاس واپس کیوں نہیں چلی جاتیں۔ خاوند تو مارا پیٹا ہی کرتے ہیں تم کہو تو ہم تمہیں تمہارے خاوند کے پاس لے چلیں؟ ہم اسے سمجھائیں گے۔"

نجمی نے جلدی سے کہا "نہیں نہیں اب میں اس کے پاس نہیں جاؤں گی وہ مجھے ہر روز تاڑی پی کر مارتا ہے میں اسے چھوڑ آئی ہوں۔ میں کلکتے جا کر محنت مزدوری کر کے پیٹ پال لوں گی۔ بھگوان میری مدد کرے گا یہ بھی اچھا ہوا کہ میرے کوئی اولاد نہیں ہے۔"

ہندو بنگالی نے جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور اپنی بیوی کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔

”رانی! چندا بیٹی ٹھیک کہتی ہے اس کا پتی تاڑی پی کر اسے پھر مارنا پیٹنا شروع کر دے گا اور یہ پھر گھر سے بھاگ جائے گی۔ ابھی تو اچھا ہوا کہ ہم اسے مل گئے ورنہ تم جانتی ہی ہو کہ یہاں کسی اکیلی لڑکی کا گھر سے یوں نکل آنا کتنی خطرناک بات ہوتی ہے۔“

”لو بیٹی برفی کھاؤ۔“

نجمی تھوڑی تھوڑی دیر بعد پلیٹ فارم کے آخری کنارے کو دیکھ لیتی تھی جہاں اب سنہری دھوپ چمک رہی تھی۔ ابھی تک موجمدار کے آدمیوں میں سے کوئی نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ ابھی تک جھونپڑی کے باہر دھت پڑے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ لوگ نجمی کی تلاش میں کسی دوسری طرف نکل گئے ہوں۔

نجمی نے ہندو کے ہاتھ سے برفی لے لی اور کھانے لگی۔ اس ہندو بنگالی نے اپنا نام ہریل بتایا اور بیوی کا نام پدماوتی جس کو وہ پیار سے رانی کہہ کر پکارتا تھا نجمی نے ہریل سے کہا۔

”دادا میں تھوڑا بہت پڑھ لکھ بھی لیتی ہوں مجھے کوئی لکھنے پڑھنے کی نوکری دلا دو گے؟“

ہریل نے مسکرا کر کہا۔ ”اری بیٹی کیوں نہیں دلا دوں گا۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ تم پڑھ لکھ بھی لیتی ہو۔“

اس کی بیوی نے بات کاٹ کر کہا۔

”اجی تم سیٹھ بندو سے کہہ کر بچی کو اس کے اسکول میں رکھوا دینا۔“

ہریل جیسے چونک کر بولا۔

”ارے ہاں تم نے خوب یاد دلایا سیٹھ بندو کا تو اپنا لڑکیوں کا اسکول ہے۔“

پھر نجمی کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔

”چندا بیٹی! بس تمہارا کام ہو گیا سمجھو۔ تمہاری تنخواہ بھی سو روپے تک کرا دوں گا“

نجمی نے بظاہر خوشی کا اظہار کیا مگر اندر سے وہ پریشان تھی وہ جتنی جلدی ہو سکے اس ویران دیہاتی اسٹیشن سے دور نکل جانا چاہتی تھی۔ دن چڑھتا جا رہا تھا یقینی بات تھی کہ اب تک وہ لوگ ہوش میں آ چکے ہوں گے اور جب مونچھوں والا بردہ فروش موجمدار جھونپڑی میں نجمی کو نہیں پائے گا تو زخمی ریچھ کی طرح اپنے آدمیوں کو لے کر اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہو گا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پلیٹ فارم کے آخری کنارے کی طرف دیکھ لیتی تھی جہاں ڈھلوان کے بعد درختوں کی قطار میں ایک کچی، پکی ڈنڈی دور تک جاتی تھی۔

یہ پگ ڈنڈی ابھی تک خالی تھی مگر کسی بھی لمحے یہاں موجمدار اور اس کے آدمیوں کے بھیانک چہرے نمودار ہو سکتے تھے۔ اگرچہ نجمی اس غریب ہندو بنگالی فیملی میں اپنے آپ کو کسی حد تک محفوظ محسوس کر رہی تھی مگر یہ لوگ اسے موجمدار کے آدمیوں سے نہیں بچا سکتے تھے۔ ہریل کہہ رہا تھا۔

”لیکن چندا بیٹی میں اب بھی تمہیں یہی کہوں گا کہ کلکتے پہنچ کر اپنے آدمی کو بھی وہیں بلوا لینا۔ عورت کی شوبھا اپنے پتی کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔“

نجمی نے کسی قدر بے چینی سے پوچھا۔

”دادا منی گاڑی کب آئے گی؟“

ہریل نے دور درختوں کی طرف دیکھا اور بولا۔

”گاڑی آ گئی ہے بیٹی وہ دیکھو تاڑ کے درختوں کے اوپر دھواں۔“

دو ایک مزدور قلی پلیٹ فارم پر آ کر بیٹھ گئے چند ایک مسافر جو وہاں تھے اپنا اپنا سامان سنبھالنے لگے۔ نجمی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا اسے شدید خطرہ تھا کہ کہیں عین موقع پر موجمدار اپنے آدمیوں کو لے کر نہ آ جائے۔ گاڑی بھی کالی پور کی طرف سے آ رہی تھی۔ اس گاڑی میں بھی ان لوگوں کی موجودگی کا امکان تھا۔ ہریل کی موٹی بیوی رانی نے نجمی کی طرف دیکھ کر ذرا سا مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بیٹی تو کہاں پیدا ہوئی تھی میرا مطلب ہے کہ تمہاری بنگلہ زبان صاف نہیں ہے

تم کہیں بہار کی رہنے والی تو نہیں ہو بیٹی؟"

نجمی واقعی ابھی اتنی روانی سے بنگلہ زبان نہیں بول سکتی تھی۔ اگرچہ اس نے اس زبان پر کافی عبور حاصل کر لیا تھا مگر پھر بھی وہاں کے رہنے والوں کی طرح نہیں بولتی تھی نجمی نے دور گاڑی کے انجن کے دھوئیں کی طرف نگاہیں جما رکھی تھیں۔ ہریل کی بیوی رانی کا سوال اسے بہت برا لگا مگر اس کا جواب ضروری تھا کہنے لگی۔

"میری پیدائش پٹنہ میں ہوئی ہے موسی۔ ماں باپ بچپن ہی میں مر گئے۔ چاچا کے ہاں رہی جو بنگلہ کے ساتھ ساتھ بہاری بھی بولتے تھے۔"

یوں نجمی نے بات کو ٹال دیا۔ اب ریل گاڑی کا انجن دھواں اڑاتا اسٹیشن کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا جب وہ پلیٹ فارم میں داخل ہوا تو زمین ہلنے لگی۔ نجمی نے منہ دوسری طرف کر لیا کہ اگر ریل گاڑی میں موجمدار کے آدمی ہوں تو وہ اسے نہ دیکھ لیں۔ پسنجر ٹرین تھی چند ایک مسافر سامان اور بچوں کے ساتھ شور مچاتے ایک دوسرے کو چیخ چیخ کر آوازیں دیتے ٹرین سے اترے۔

نجمی کی ٹکٹ ہریل بیچ میں جا کر لے آیا تھا۔ انہوں نے بھی تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں گھس کر اپنے لئے جگہ بنا لی۔ ٹرین میں کافی رش تھا۔ جب تک ٹرین اسٹیشن پر رکی رہی نجمی نے ساڑھی کے پلو سے اپنا آدھا منہ ڈھانپے رکھا۔

خدا خدا کر کے ٹرین چلی۔ نجمی کی جان میں جان آئی۔ کلکتہ وہاں سے کافی دور تھا اور شام کے قریب ٹرین وہاں پہنچنی تھی۔ پسنجر ٹرین تھی ہر اسٹیشن پر رک جاتی۔ جب بھی ٹرین رکتی نجمی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگتا مگر اس گاڑی میں بدمعاش موجمدار کے آدمی نہیں تھے۔ تین چار اسٹیشن چھوڑنے کے بعد ٹرین کی رفتار تیز ہوگئی۔ اس لئے کہ اگلا اسٹیشن کافی دور تھا۔

راستے میں کئی ندی نالے آئے ایک دریا بھی آیا دوپہر کو گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو ہریل پلیٹ فارم پر اتر کر کھانے کو چاول اور مچھلی لے آیا۔ سہ پہر تک ٹرین جنگلوں، اونچے نیچے میدانوں، کھیتوں اور تاڑ اور ناریل کے درختوں کے بیچ میں

سے گزرتی چلی گئی۔ تیسرے پہر کے بعد جب دن ڈھلنا شروع ہوا تو بڑے شہر کے مضافات دکھائی دینے لگے۔ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ ٹرین کلکتے کے دوسرے بڑے ریلوے اسٹیشن سیالدہ کے چھتے ہوئے کشادہ اور بارونق پلیٹ فارم میں داخل ہوگئی۔

نجمی نے لاہور میں کلکتہ شہر کے بارے میں سن رکھا تھا کہ بھارت کا یہ بھی بمبئی کی طرح ایک بڑا شہر ہے آج وہ کلکتے کو پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر لوگوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ نجمی کے دل کو حوصلہ ہوا کہ یہاں وہ آسانی سے تلاش نہیں کی جا سکے گی۔ یہ سوچ کر کہ اس شہر میں پاکستان کا قونصلیٹ ہے نجمی کو بڑی تسلی ہوئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی منزل کے قریب پہنچ گئی ہے پاکستانی قونصلیٹ والے اسے ضرور پناہ دیں گے اور اسے لاہور بھی پہنچا دیں گے۔ ہریل اور اس کی بیوی رانی نجمی کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔

ہریل نے بستر سر پر اٹھا رکھا تھا اس کی موٹی بیوی رانی اسے بار بار کسی بات پر ڈانٹ رہی تھی۔ نجمی کو ہریل پر بڑا ترس آیا بے چارہ اپنی بیوی کے آگے زبان نہیں ہلا سکتا تھا۔ اسٹیشن پر بہت رش تھا۔ اسی رش میں سے گزرتے وہ اسٹیشن سے باہر آ گئے۔

نجمی نے دیکھا کہ ایک کشادہ سڑک پر کاریں رکشے اور بسیں اور لوگ دوڑے چلے جا رہے تھے موسم زیادہ گرم نہیں تھا یہ سب کے سب دھوتی پوش ہندو بنگالی تھے۔ کئی ایک کے کاندھوں سے چھتریاں لٹک رہی تھیں۔ بڑی بڑی اونچی عمارتیں کھڑی تھیں۔ ہریل نے بستر اتار کر نیچے رکھ دیا اور دھوتی کے پلو سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔

"یہاں سے ہمارا کوارٹر زیادہ دور نہیں ہے ادھر سے دو تالی بس میں بیٹھیں گے۔"

دو تالی سے مراد بس نمبر بیس تھی۔ یعنی ہاتھ کی تالی کو اگر دوبارہ بجایا جائے تو

پورے ملک میں کا عدد بنتا ہے کلکتے اور رنگون میں بھی تالی کی اصطلاح بڑی عام ہے نجمی نے تالی کا لفظ پہلے بھی سن رکھا تھا۔ آخر بیس نمبر بس آکر رک گئی۔ بس پہلے ہی سواریوں سے بھری ہوئی تھی بڑی مشکل سے نجمی بھی ہریل اور اس کی بیوی کے ساتھ بس میں بیٹھ گئی۔

بس روانہ ہو گئی۔ بس کی کھڑکی سے نجمی کلکتہ شہر کے بازاروں، سربفلک عمارتوں اور بڑی بڑی سجی سجائی دکانوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ بس ہر اسٹاپ پر تھوڑی دیر کو رکتی اور آگے روانہ ہو جاتی۔ ہریل نے کہا تھا ہمارا کوارٹر یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے مگر ابھی تک ان کا کوارٹر نہیں آرہا تھا۔ نجمی کی بے چینی بھانپتے ہوئے ہریل نے نجمی سے کہا۔

"بس ہمارا محلّہ آرہا ہے یہ خضر پور جیٹی کی طرف ہے مگر تمہیں کیا معلوم کہ خضر پور جیٹی کہاں ہے تم تو پہلی بار کلکتے آرہی ہو۔"

ہریل کی بیوی نے پوچھا۔

"چندا بیٹی! کیسا لگا کلکتہ پسند آیا؟"

نجمی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں موسی بہت پسند آیا مگر خضر پور جیٹی کتنی دُور ہے ابھی؟"

"بس ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔" ہریل نے بیڑی نکالتے ہوئے کہا۔

جیٹی کے لفظ سے نجمی سمجھ گئی کہ یہ علاقہ دریائے ہگلی کے قرب و جوار میں ہو گا۔ جغرافیے کی کتاب میں اس نے پڑھ رکھا تھا کہ کلکتے میں دریائے ہگلی بہتا ہے جس کو دریائے جمنا بھی کہتے ہیں۔ کلکتے کی بندرگاہ دریائے ہگلی پر ہی واقع ہے۔

سورج غروب ہو رہا تھا کہ نجمی کو ہواؤں میں دریا کی رطوبت محسوس ہوئی بس ایک نسبتاً ویران سے علاقے سے گزر رہی تھی۔ یہاں کوٹھیاں بہت کم تھیں زیادہ تر اونچی ڈھلانی چھتوں والے مال گودام اور بیرکیں سی بنی ہوئی تھیں۔ سڑک پر ناریل اور تاڑ کے چھریرے درخت جھکے ہوئے تھے۔

دریا کی طرف سے آنے والی ہواؤں میں سرکنڈوں اور مچھلی کی ملی جلی بو ملی ہوئی تھی نجمی کو بدمعاش موجمدار اور اس کے آدمیوں کے چنگل سے نکل آنے کی بہت خوشی ہو رہی تھی اب وہ چاہتی تھی کہ جلدی سے رات گزرے اور دوسرے دن صبح صبح ہی وہ کسی ٹیکسی والے یا رکشا والے سے پتہ پوچھ کر پاکستانی قونصل جنرل کے دفتر میں پہنچ جائے اور انہیں اپنی دکھ بھری کہانی بیان کرے اور پھر ان کی مدد سے وہ پاکستان اپنے ماں باپ کے پاس پہنچنے کی کوشش کرے اس نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ جو گزر چکی سو گزر چکی اب خواہ کتنی ہی بدنامی ہو وہ اپنے ماں باپ کے قدموں میں زندگی گزارے گی۔ بس ایک موڑ پر پہنچ کر رک گئی۔

یہ علاقہ شہر سے کافی دور معلوم ہوتا تھا۔ شام کا اندھیرا ابھی نہیں چھایا تھا دور تاڑ کے چھدرے درختوں کے پیچھے ایک اونچی عمارت نظر آرہی تھی۔ ہریل اور اس کی موٹی بیوی نے نجمی کو ساتھ لیا اور سڑک سے اُتر کر ایک پگڈنڈی پر ہو گئے۔ ہریل نے بستر اپنے سر پر اٹھا لیا تھا وہ کہہ رہا تھا۔

"بس وہ سامنے والے درختوں میں ہمارا کوارٹر ہے کلکتہ میں کوئی کھولی بھی مل جائے تو بڑے دھن بھاگ ہوتے ہیں۔"

پگڈنڈی ایک طرف درختوں میں گھومی تو سامنے ڈھلوان چھت والا دو منزلہ مکان ایک طرف کو جیسے جھکا ہوا موجود تھا۔ ہریل کی بیوی رانی آگے آگے تھی نجمی اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ رانی بولی۔

"مالک نے ہمیں نچلی منزل کے دو کمرے دے رکھے ہیں اُوپر والی منزل میں اس کا گودام ہے۔"

ہریل نے سر پر بستر اٹھا رکھا تھا جس کی وجہ سے اس کا سانس پھول رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"بیٹی! ہم دونوں کے لئے تو ایک کمرہ ہی کافی تھا اب تو ہمارے پاس دو کمرے ہیں۔ تم اگر چاہو تو ایک کمرے میں ڈیرہ جما لینا۔"

ہریل کی موٹی بیوی نے مکان کا تالا کھولا۔ اندر ایک چھوٹا سا صحن تھا جس میں پیپل کا درخت اگا تھا۔ صحن کی دیواریں بارش کی وجہ سے سیاہ ہو رہی تھیں۔ سامنے دو کمرے تھے ان کے درمیان سے ایک زینہ اُوپر والی منزل کو جاتا تھا۔ مکان کے پچھلے برآمدے میں ایک جانب غسل خانہ اور دوسری جانب کچن تھا۔ کمرے بوسیدہ اور سیل زدہ، تھے۔ ہر کمرے میں ٹین کے صندوقوں کے درمیان بانس کی چارپائی بچھی تھی۔

ایک کمرے میں چٹائیوں کے فرش پر تین میلے کچیلے تکیے اوندھے پڑے تھے نجمی کو اس گھر کی فضاء سخت ناگوار لگی۔ مگر اس نے تو یہاں ایک رات ہی گزارنی تھی۔ دوسرے دن اس نے وہاں سے پاکستانی قونصل خانے جانے کا عہد کر رکھا تھا۔ ہر کمرے کی دیواروں پر کالی دیوی کی فریم کی ہوئی تصویریں لگی تھیں۔ اس دیوی کو ہریل اور رانی درگا دیوی کہہ کر پکارتے تھے۔

اُنہوں نے آتے ہی درگاہ دیوی کی تصویر کے آگے ہاتھ جوڑ کر سر جھکایا لوبان سلگایا اور نجمی سے بھی ماتھا ٹیکنے کو کہا۔ نجمی نے بادل نخواستہ درگا دیوی کی تصویر کو پرنام کیا اور پھر نہانے کے لئے غسل خانے کی طرف چلی گئی۔

رات کو انہوں نے عقبی برآمدے میں ناریل کی چٹائی پر بیٹھ کر دال بھات کھایا۔ نجمی کو انہوں نے سونے کے لئے وہ کمرہ دیا جس میں چٹائیوں کا فرش بچھا تھا۔ نجمی کو اس بات کا بڑا اطمینان تھا کہ وہ بدمعاش بردہ فروش موجمدار کے پنجے سے نکل آئی ہے۔ یہ اتنا بڑا شہر تھا کہ نجمی کا پتہ چلانا نجمی کے خیال میں کوئی آسان بات نہیں تھی۔ جب وہ کمرے میں اکیلی رہ گئی تو اس نے پوٹلی کھول کر دیکھا۔ اس کے پاس صرف سات روپے رہ گئے تھے۔ ان روپوں سے وہ ٹیکسی کروا کر پاکستانی قونصل خانے پہنچ سکتی تھی۔ اگر پیسے کم ہوئے تو وہ قونصل خانے میں اپنے پاکستانی بھائیوں سے لے سکتی تھی۔

پاکستان کا تصوّر اس وقت نجمی کو جیسے جنّت کا تصوّر معلوم ہوتا تھا۔ اسے اپنے المناک مصائب کا دور ختم ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ہریل اور اس کی بیوی

سے پاکستانی قونصل خانے کے بارے میں پوچھنے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔ اس خیال سے نجمی کو نیند نہیں آ رہی تھی کہ کل اس وقت وہ پاکستانی قونصل خانے میں اپنے ہمدرد بھائیوں کے درمیان ہو گی۔

وہ چٹائی پر لیٹ گئی۔ کمرے میں صرف ایک بلب جل رہا تھا جس کی روشنی بہت کمزور تھی۔ چھت کے ساتھ پنکھا بڑی دھیمی رفتار سے چل رہا تھا نجمی جس وقت کھانا کھا کر اس کمرے میں آئی تھی اور ہریل اور اس کی بیوی دوسرے کمرے میں گئے تھے تو اس وقت رات کے دس بج رہے تھے یہ ٹائم ہریل نے صندوق میں سے ٹائم پیس نکال کر نجمی کو بتایا تھا۔ ہریل نے نجمی کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"چندا بیٹی آرام کرو تم بہت تھک گئی ہو۔ کل تمہیں سیٹھ بندو کے اسکول لے چلوں گا۔" نئی جگہ اور نامانوس فضاء کے باعث نجمی کی نیند غائب تھی اس کے باوجود کچھ دیر گزرنے کے بعد نجمی کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں۔ عجیب وحشت ناک جنگلوں میں سے بھاگتی ہوئی وہ اسٹیشن تک آئی تھی۔

اس کا جسم تھکان سے اب بھی چور تھا۔ اس پر غنودگی طاری ہونا شروع ہو گئی اس نے ہلکی سی جھپکی لی تھی کہ ایک آہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ یہ آہٹ ایسی تھی جیسے کسی نے صحن کا دروازہ کھول کر بند کیا ہو۔ نجمی نے کان لگا دیئے۔ باہر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دور بندرگاہ کی طرف سے ایسی آواز آ رہی تھی جیسے کوئی کسی جگہ ہتھوڑا چلا رہا ہو۔

یہ آواز بڑی دھیمی اور وقفے وقفے سے آ رہی تھی۔ نجمی کو جب دوسری بار کچھ سنائی نہ دیا تو وہ اسے اپنا وہم سمجھ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے کوشش کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ آنکھیں بند کرنے کی دیر تھی کہ وہ گہری نیند میں کھو گئی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کب تک سوئی ہو گی کہ اچانک جیسے کسی کھٹکے سے اس کی آنکھ ایک بار پھر کھل گئی۔ نجمی خواب آلود آنکھیں کھولے چھت کو تک رہی تھی۔ وہ اندازہ نہیں کر پا رہی تھی کہ یہ کس چیز کا کھٹکا تھا جس کی وجہ سے

اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ باہر موت جیسی خاموشی طاری تھی۔ بندرگاہ کی طرف سے آنے والی دھیمی آواز بھی اب بند ہو چکی تھی۔ نجمی نے ایک بار پھر اسے اپنا وہم سمجھ کر آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ اسے کمرے کے باہر انسانی قدموں کی چاپ سنائی دی یہ آواز دروازے کے پاس آکر رک گئی۔ نجمی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

اس نے جسم پر ساڑھی کو درست کیا اور ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ آنکھیں بند دروازے پر جمی تھیں۔ وہ سمجھ گئی کہ کسی خطرے میں گھر گئی ہے۔ کمرے میں کوئی کھڑکی بھی نہیں تھی۔ صرف ایک ہی روشندان تھا جو فرش سے کافی اُونچا چھت کے قریب تھا۔ نجمی نے اندر سے چٹخنی لگا رکھی تھی۔ اس نے سوچ لیا کہ خواہ کچھ ہو جائے وہ دروازہ نہیں کھولے گی۔

اتنے میں فضا کے سناٹے میں دروازے کے باہر اسے ہریل کی بیوی رانی کی آواز سنائی دی۔ وہ درد بھری آواز میں کہہ رہی تھی۔

”چندا بیٹی تمہارے دادا منی کو کچھ ہو گیا ہے۔ بھگوان کے لئے اسے آکر دیکھو۔ وہ بے ہوش پڑا ہے۔“

رانی نے سسکیاں بھرنی شروع کر دیں نجمی کا آدھے سے زیادہ خوف دور ہو گیا۔ وہ تو خواہ مخواہ گھبرا گئی تھی۔ مگر ہریل دادا کیوں بے ہوش ہو گیا ہے؟ یہی سوچتی نجمی اٹھی اور اس نے دروازہ کھول دیا دھڑاک سے دروازے کو ایک طرف کرتے دو ہٹے کٹے آدمی اندر گھس آئے۔ رانی ان کے پیچھے ہو گئی تھی انہوں نے آتے ہی نجمی کو دبوچ کر چٹائی پر گرا لیا۔ ایک نے اس کے منہ پر کپڑا کس کر باندھا اور دوسرے نے اس کی ٹانگیں اور بازو رسی سے باندھے۔ نجمی بوکھلائی ہوئی آنکھوں سے انہیں تکنے لگی۔ رانی نے اندر داخل ہو کر کہا۔

”چاہے اسے اُوپر والے گودام میں بند کر دو چاہے تو ابھی لے جاؤ۔“

دونوں آدمیوں میں سے ایک نے نجمی کو اٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈال لیا اور بولا۔

”روپا جب مال کے پیسے چکا دیتا ہے تو اسے اٹھا کر لے جاتا ہے بائی۔“

اس آدمی کا نام روپا تھا وہ اپنے ساتھی کے ہمراہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ نجمی کا منہ اس طرح بند کر دیا گیا تھا کہ وہ چیخ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کر کے اپنی گردن نیچے ڈال دی شاید اس کی اذیتوں اور بھیانک مصائب کا ایک نیا دور شروع ہونے والا تھا۔

دونوں آدمی رات کے اندھیرے اور سناٹے میں مکان کے صحن میں آئے تو وہاں ہریل موجود تھا۔ وہ آہستہ سے بولا۔

”اسے لے جا رہے ہو تو جیٹی کی پہلی چونگی سے مت جانا۔ ادھر رات کو سپاہی راؤنڈ پر ہوتے ہیں۔“

روپا نے اسے گالی دے کر کہا۔ ”ہمیں معلوم ہے کدھر سے جانا ہے۔“

مکان سے کچھ فاصلے پر ایک ٹیکسی کھڑی تھی جو خالی تھی۔ نجمی کو پچھلی سیٹ پر گرا دیا گیا۔ اس کے ساتھ روپا کا دوسرا ساتھی جس کو روپا کالی کہہ کر پکارتا تھا بیٹھ گیا۔ روپا خود اسٹیئرنگ پر جا بیٹھا۔ اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی کو کچے سے نکال کر بڑی سڑک پر ڈال دیا۔

نجمی نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ آنکھیں بند کرنے کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی ٹیکسی طوفانی رفتار کے ساتھ دوڑی جا رہی تھی۔ نجمی نے دو ایک بار آنکھیں کھول کر ٹیکسی کی چھت کو دیکھا۔ سڑک کی روشنیوں کا عکس چھت پر سے تیزی سے گزر جاتا اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ کون سا علاقہ ہے۔ وہ کہاں سے گزر رہی ہے اور اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔

ہریل دادا اور رانی نے اسے آگے بیچ دیا تھا جس شخص نے اسے خود بیٹی کہہ کر پکارا تھا اس نے اس کا سودا کر دیا تھا۔ ایک ایک کر کے نجمی کے دل میں اخلاقی قدروں کے شیشے چور چور ہو رہے تھے۔ انسانی رشتوں پر سے اس کا اعتماد اُٹھتا چلا جا رہا تھا۔ ان مقدس رشتوں کا وہ اپنی آنکھوں کے سامنے خون ہوتا دیکھ رہی تھی

کسی وقت اس کا خون انتقام کی آگ سے بھڑک اٹھتا۔ لیکن یہ آگ سوائے اسے ہی جلانے کے اور کچھ نہیں کر رہی تھی۔

روپا گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کا ساتھی کالی نجمی کے تقریباً اوپر بیٹھا ہوا تھا۔ نجمی کا ایک پورا بازو اس کے نیچے دبا ہوا تھا۔ روپا نے تیز آواز میں کالی کو گالی دے کر بنگلہ میں کہا۔

”وہ تیری ماں وہاں پر ہو گی اس وقت؟“

کالی نے فوراً جواب دیا۔

”دادا وہ کیوں نہیں ہو گی میں نے اسے تھوڑی دیر پہلے اطلاع کروا دی تھی کہ ہم مال لے کر آ رہے ہیں۔“ وہ اڈے پر پہنچ جائے۔

دونوں ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔ ٹیکسی خدا جانے کلکتے کے کون سے علاقے میں سے گزر رہی تھی اب سڑکوں کی روشنیوں کے عکس بھی ٹیکسی کے اندر چھت پر نہیں پڑ رہے تھے۔ کوئی ٹرک تیزی سے ٹیکسی کے قریب سے گزر گیا۔ اس کی ہیڈ لائٹس کی روشنی پڑی تو کالی نے نجمی کے اوپر اپنی چادر ڈال دی۔

کافی دیر تک سڑکوں پر دوڑنے کے بعد ٹیکسی کی رفتار دھیمی ہونے لگی اور پھر وہ ایک موڑ گھوم کر غیر ہموار سڑک پر آ گئی۔ پہلی بار نجمی کو دھچکے لگنے لگے دور کسی جانب سے رات کے سناٹے میں کسی کتے کے بھونکنے کی آواز تھوڑی دیر بلند ہو کر غائب ہو گئی۔ ٹیکسی نے تیزی سے ایک اور موڑ کاٹا اور پھر جیسے ایک گیراج میں پہنچ کر رک گئی۔

روپا نے انجن بند کر کے دروازہ کھولا اور بولا۔

”نکال اس سالی کو باہر اور ادھر لے چل وہ تمہاری ماں یہاں کہیں نہیں ہے کالی۔“

کالی نے نجمی کو سیٹ پر اٹھا کر بٹھا دیا۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں کھول دیئے منہ پر کپڑا بندھا رہنے دیا۔ کالی نے زور سے ایک طمانچہ نجمی کے منہ پر مارا۔ نجمی کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ ساتھ ہی کالی نے اسے گالی دے کر کہا۔

”میرے آگے آگے چل۔“

اور اس نے دروازہ کھول کر نجمی کو باہر کھڑا کر دیا۔ یہ ایک گیراج تھا۔ نجمی کا سر چکرانے لگا تھا۔ منہ پر کپڑا بندھا ہونے کی وجہ سے وہ کتنی دیر سے مسلسل ناک سے سانس لے رہی تھی۔ اس کا سانس یوں پھول رہا تھا جیسے وہ بھاگتی ہوئی آ رہی ہو۔ چکر آنے کی وجہ سے وہ گرنے لگی تو اس نے ٹیکسی کے دروازے کو تھام لیا۔ روپا نے گیراج کے اندر ہی بنا ہوا ایک چھوٹا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

”اسے پیچھے لے آ تیری ماں لکھی بائی کی گاڑی باہر نہیں تھی۔“

کالی نے نجمی کو سہارا دیا پھر اس کو بازو سے پکڑ کر آگے کو دھکیل دیا۔

”آگے آگے چل ری سیدھی۔ ہم تیری ایسی عورتوں کو خوب جانتے ہیں چل“

گیراج کے اندر والا دروازہ ایک تنگ و تاریک کمرے میں کھلتا تھا۔ روپا نے کمرے میں آتے ہی بتی روشن کر دی۔ نجمی کی آنکھیں چکا چوند سی ہو گئیں۔ روپا نے اسے اپنے پلنگ پر دھکا دے کر پھینک دیا۔

”یہاں لیٹ جا ری چندا۔“

کمرے کی فضا میں گھٹن اور عجیب قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ نجمی پلنگ پر سمٹی ہوئی پڑی تھی۔ روپا نے جیب سے ڈبی نکال کر سگریٹ سلگایا اور لوہے کی کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”کالی باہر جا اور اپنی ماں لکھی بائی کو دیکھ۔ اگر وہ نہ آئی تو میں ساری رقم تم سے دھرا لوں گا۔“

کالی اپنے بالوں کو جھٹکتا ہوا دروازے میں سے واپس گیراج میں چلا گیا۔

روپا لوہے کی کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ کمرے میں چھت کے ساتھ لٹکتا ہوا بلب روشن تھا۔ روپا کے بال کالے سیاہ گھنگھریالے تھے اس نے دھاریدار ٹی شرٹ اور میلی کچیلی پتلون پہن رکھی تھی۔ کلائی پر سنہری زنجیر چمک رہی تھی۔ اس نے گردن گھما کر نجمی کی طرف دیکھا اور سگریٹ کا کش لگا کر

دھواں چھوڑا اور بولا۔

"کیوں ری اس سے پہلے تو کس کے پاس تھی؟ تیرا اس میں سے کوئی بچہ وچہ تو نہیں ہے؟ ہے تو ابھی بتا دے؟"

نجمی نے اپنے منہ پر بندھے ہوئے کپڑے کی طرف اشارہ کیا۔ روپا نے اٹھ کر نجمی کے منہ پر بندھا ہوا کپڑا کھول دیا۔ نجمی کو ایسے لگا جیسے وہ قبر کی فضا سے نکل کر ایک دم کھلی فضا میں آ گئی ہو۔ روپا ایسے جرائم پیشہ افراد کی باتیں سن سن کر نجمی ان کی نفسیات سے کافی حد تک واقف ہو گئی تھی۔ ایک بات اس کے ذہن میں واضح ہو گئی تھی کہ ان کے آگے رونے دھونے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ان پر کسی دوسرے طریقے سے ہی اثر ڈالا جاتا ہے۔

نجمی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "مجھے پہلی بار اٹھایا گیا ہے۔ میں ایسی ویسی عورت نہیں ہوں۔" روپا نے نجمی کو گھور کر دیکھا۔ پھر طنزیہ انداز میں ہنسا اور چٹکی سے سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر بولا۔ "سب یہی کہا کرتی ہیں سالیاں کئی کئی مردوں کے ہاتھوں میں بک چکی ہوتی ہیں اور کہتی ہیں ہمیں پہلی بار اٹھایا گیا ہے۔"

نجمی پلنگ پر اٹھ کر بیٹھنے لگی تو روپا نے ڈانٹ کر اسے ایک فحش گالی دی اور کہا۔

"اسی طرح لیٹی رہ۔۔۔"

نجمی وہیں سہم کر لیٹ گئی۔ اتنے میں باہر کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ روپا اٹھ کر گیراج والے دروازے میں سے جھانکنے لگا۔ گاڑی کا انجن بند ہو گیا تھا۔ کالی نے گیراج میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"روپا! لکھی بائی آ گئی ہے۔"

"اسے آنے دے اس سالی کو بھی۔"

یہ کہہ کر روپا واپس کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ کالی اندر آیا اس کے پیچھے پیچھے ایک بھاری بھرکم عورت تھی جس نے پھولدار ساڑھی پہن رکھی تھی۔ عمر پچاس سے اوپر

ہو گی۔ چہرے سے کرختگی اور سنگدلی ٹپکتی تھی اس کے ہاتھ میں سگریٹ تھا اور پان چبا رہی تھی۔ آتے ہی نجمی کو قریب سے جھک کر دیکھا۔ اس کی پسلیوں میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولا۔ انگلی سے آنکھوں کے پپوٹوں کو کھول کر گھورا پھر ہوں کہہ کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

روپا بولا۔

"لکھی بائی! روپا ہمیشہ کھرا مال بیچتا ہے۔ لڑکی کی عمر بیس سال سے اوپر نہیں گوری چٹی بھی ہے جسم بھی سڈول ہے۔ تجھ سے جو سودا ہوا ہے میں اس سے ایک ہزار روپے زیادہ لوں گا۔"

لکھی بائی نے سگریٹ کا کش لگا کر گل جھاڑا اور نرمی سے بولی۔

"جتنی رقم تم نے مانگی تھی وہ میں لے آئی ہوں۔ گاڑی میں پڑی ہے جا کر تھیلا اٹھا لاؤ۔ یہ لو چابی۔"

لکھی بائی نے پرس میں سے گاڑی کی چابیاں نکال کر روپا کی طرف بڑھائیں روپا کچھ دیر لکھی بائی کو تکتا رہا پھر چابیوں کا گچھا ہاتھ بڑھا کر لے لیا اور بولا۔

"سوچ لو لکھی بائی تمہیں آگے بھی مجھ سے کام پڑے گا۔"

لکھی بائی نے نجمی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"تم کو معلوم ہے ہمیں اس پر ابھی کتنی محنت کرنی پڑے گی گانا بجانا نہ سہی کم از کم ڈانس تو سکھانا پڑے گا۔ پھر اس کی چوکیداری بھی کرنی ہو گی۔ ابھی اس میں شرم اور خوف ہے ان دونوں چیزوں کو اس کے اندر سے نکال پھینکنا ہو گا۔ ایسے ہی اس کو آگے سپلائی نہیں کرنا مجھے۔"

روپا بدمعاش سر کو جھٹک کر باہر نکل گیا۔ نجمی ایک دلدل سے نکل کر دوسری دلدل میں گر پڑی تھی۔ یہاں سے وہ کیسے نکل سکے گی؟ یہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ لکھی بائی نجمی کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی اور کالی کی طرف دیکھ کر بولی۔

"ابھی اسے تم لوگ میرے جنگل والے ڈیرے پر پہنچا دو گے۔" کالی نے بیڑی

کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"لکھی بائی تمہارے ساتھ ہمارا یہ ٹھیکہ نہیں ہوا۔"

اتنے میں روپا بدمعاش بھی آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا تھیلا تھا۔ لکھی بائی نے کہا۔ "رقم پوری کر لی تم نے روپا۔"

"کر لی ہے۔ اب تم اسے لے کر یہاں سے چلتی بنو لکھی بائی۔"

کالی بولا۔ "دادا! یہ کہتی ہے مال اس کے جنگل والے ڈیرے میں پہنچانا ہو گا۔"

روپا تنک کر بولا "وہ کس حساب میں؟ تمہارے اپنے آدمی کہاں ہیں؟ وہ بدمعاش تم نے کس لئے پال رکھے ہیں؟"

لکھی بائی سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولی۔

"ان میں سے کوئی بھی اس وقت فارغ نہیں تھا۔ اچھا چلو میں تمہیں اپنے ڈیرے تک مال پہنچانے کے پانچ سو روپے الگ دیئے دیتی ہوں۔"

روپا اسی وقت راضی ہو گیا۔ فوراً نجمی کے منہ پر کپڑا باندھ کر اس کی مشکیں کس دی گئیں اسے گاڑی میں ڈال دیا گیا اور گاڑی لکھی بائی کے خفیہ اڈے کی طرف روانہ ہو گئی۔ پیچھے پیچھے لکھی بائی کی گاڑی آ رہی تھی۔ دونوں گاڑیاں کلکتہ شہر کے مضافات سے نکل کر ویران علاقے میں آ گئیں۔ ایک جگہ سے انہوں نے دریا بھی عبور کیا۔ نجمی کو ایک بار پھر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اوندھا لیٹا کر اس کے اوپر کپڑا ڈال دیا گیا تھا۔

کالی بدمعاش اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ گاڑیاں ایک گھنٹے تک سفر کرتی رہیں اب وہ رات کے اندھیرے میں پٹ سن اور دھان کے کھیتوں اور آبادی سے، بہت دور جنگل کے ایک غیر آباد خطے میں آ گئی تھیں۔ یہاں زمین اونچی نیچی تھی جگہ جگہ جنگلی گھاس اور جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں ناریل کے درختوں میں کسی پرانی مڑھی کا کھنڈر تھا اس سے ذرا آگے ٹوٹی پھوٹی چار دیواری کے اندر ایک ڈھلوان چھت والا بوسیدہ مکان بنا ہوا تھا۔ اس کی کھڑکیوں کے چھجے بڑھے ہو کر ایک طرف کو

جھک گئے تھے اس مکان کے ایک حبس زدہ کمرے میں نجمی کو لکڑی کے پلنگ پر ڈال دیا گیا جس پر صرف پٹ سن کا پتلا سا گدا ہی بچھا تھا۔ پلنگ پر مچھر دانی لگانے کے لئے چار بانس لگے تھے مگر مچھر دانی غائب تھی۔ چھت پر کوئی پنکھا نہیں تھا مچھروں کی بھرمار تھی۔ نجمی کی رسیاں اور منہ پر بندھا ہوا کپڑا کھول دیا گیا۔ روپا کالی چلے گئے لکھی بائی کمرے میں رہ گئی۔

نجمی نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے اور عاجزی سے کہا۔

"موسی! مجھ پر رحم کرو۔ میں ایک شریف عورت ہوں۔"

لکھی بائی پرس میں سے چھوٹا سا چینی پنکھا نکال کر اپنے چہرے کو ہوا دینے لگی اس کی نظریں دروازے پر لگی تھیں۔ نجمی نے ایک بار پھر لکھی بائی سے التجا کی کہ وہ اس کی زندگی کو تباہی کے راستے پر نہ ڈالے لکھی بائی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ برابر دروازے کی طرف تک رہی تھی۔ پھر ایک دم سے چلائی۔

"دھومل! ہیریا! تم لوگ کہاں مر گئے ہو۔"

اور پھر نجمی نے دو ناٹے قد کے گٹھے ہوئے جسم والے کالے کالے آدمیوں کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا جن میں سے ایک کے ہاتھ میں ہنٹر تھا۔

"بائی اب تم جاؤ۔ ہم جانیں ہمارا کام۔"

لکھی بائی کو وہاں سخت گرمی لگ رہی تھی۔ وہ تیز تیز چلتی کمرے سے نکل گئی۔

اس حبس آلود کمرے میں نجمی اور وہ دونوں ہندو بنگالی اکیلے رہ گئے۔ یہاں دیوار کے ساتھ ایک لالٹین لٹک رہی تھی جس کی روشنی ناکافی تھی۔ ایک آدمی نے کمرے کا دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا دی۔

نجمی کا دل کانپ گیا۔ اس پر گھناؤنے مظالم کی ابتدا ہونے والی تھی۔ تھوڑا بہت اعتماد جو نجمی کے پاس تھا وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا اور نجمی اپنے آپ کو ایک انتہائی کمزور اور مظلوم عورت محسوس کرنے لگی۔ دھومل نے ہنٹر کو آہستہ سے پھٹکارا اور ہیریا سے کہا۔

"ہربا! کام شروع کر دو۔"

ہربا نے پہلا کام یہ کیا کہ دھومل کی مدد سے نجمی کے دونوں پاؤں اور ہاتھ پلنگ کے چاروں بانس کے ڈنڈوں سے کس کر باندھ دیئے۔ پھر ہربا نجمی کے سرہانے کی جانب اسٹول رکھ کر بیٹھ گیا اور بنگلہ زبان میں اسے انتہائی واہیات قسم کی گالیاں دینی شروع کر دیں۔ نجمی کو یوں لگا جیسے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جا رہا ہے وہ اپنے کان بند نہیں کر سکتی تھی۔

اس کے دونوں ہاتھ بانسوں سے بندھے ہوئے تھے۔ دس منٹ تک ہربا گالیاں دیتا رہا۔ اس کے بعد اس کی جگہ دھومل اسٹول پر بیٹھ گیا اور اس نے نجمی کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ وہ یوں مشین کی طرح بول رہا تھا جیسے منتر پڑھ رہا ہو۔ یہ نجمی کی برین واشنگ کا ایک طریقہ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ نجمی کی شخصیت میں جو عورت کا تقدس اور حیائی پاکیزگی کا جذبہ ہے۔ وہ تڑپ تڑپ کر جان دیدے۔

نجمی نے آنکھیں بند کر کے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا رکھے تھے۔ پھر اس کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی چیخ جیسے کمرے کی چھت میں شگاف ڈال کر آسمان کی وسعتوں میں گم ہو گئی تھی مگر دھومل اور ہربا پر اس چیخ کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ باری باری مسلسل گالیاں بک رہے تھے۔



سات روز تک نجمی کو پلنگ کے ساتھ باندھے رکھا گیا، صرف غسل خانے میں لے جانے کے لئے تھوڑی دیر کے لئے کھول دیا جاتا۔ نجمی کے پاؤں لڑکھڑا رہے ہوتے تھے۔ اسے ایسی ایسی اذیتیں دی گئیں کہ بعد میں ان کا تصور کر کے بھی نجمی کی روح کانپ اٹھتی تھی اور مردوں کے خلاف نفرت کا لاوا اس کے سینے میں ابلنے لگتا اس دوران اس کے کانوں میں ناشائستہ الفاظ کے زہر گھولنے کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری رہا اسے ساری ساری رات جگائے رکھا جاتا۔ صرف دن میں تھوڑی دیر کے لئے

اس کی مشکیں کھول کر اسے سونے کی اجازت تھی۔ نجمی کا وجود زخموں سے چور چور ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں ہر وقت پتھرائی ہوئی رہتی تھیں۔ وہ احتجاج اور التجائیں بھول چکی تھی اسے اپنے ماں باپ شبانہ ندیم اور لاہور کے اپنے پیار سے چہرے بھی بھولتے جا رہے تھے آٹھویں روز نجمی کو پلنگ سے کھول دیا گیا۔

اب اسے اچھی خوراک دی جانے لگی۔ اسے جی بھر کر سونے کی اجازت مل گئی نجمی بے سدھ پڑی رہتی۔ ایک ہفتے تک اسے عمدہ غذا اور آرام پہنچایا گیا۔ تیسرے ہفتے دھومل اور ہربا ایک ماسٹر جی کو وہاں لے آئے جس نے نجمی کو رقص کی تعلیم دینی شروع کر دی۔

نجمی ذرا تساہل سے کام لیتی تو دھومل اور ہربا اسے گالیاں دیتے، پیٹنے لگتے اسے دبوچ کر جسم کو جلتے ہوئے سگریٹ سے داغا جاتا۔ نجمی کی چیخیں نکل جاتیں۔ ایک مہینے تک ماسٹر جی نجمی کو مجرا کرنا سکھاتے رہے۔ اب لکھی بائی نے بھی وہاں روزانہ آنا شروع کر دیا تھا۔ جب ماسٹر چلا جاتا تو لکھی بائی نجمی کے پاس بیٹھ کر اس سے محبت کا اظہار شروع کر دیتی۔ اسے بتاتی کہ اب وہ ساری زندگی عیش کرے گی۔ اس کی زندگی کا شاندار دور شروع ہونے والا ہے وہ قیمتی کپڑے پہنے زیوروں میں لدی پھنسی رہے گی۔ پھر وہ ایک دم پلٹ کر نجمی کو بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچتی اور غضبناک آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہتی۔

"لیکن اپنے دل میں کبھی بھاگنے کا خیال بھی نہ لانا۔ ہربا اور دھومل ہی میرے پاس نہیں ہیں میرے پالے ہوئے قاتل غنڈوں کی تعداد بہت زیادہ ہے تو کلکتہ میں کیا سارے ہندوستان میں جہاں بھی ہو گی وہ تیری بو سونگھ کر وہاں پہنچ جائیں گے اور تیرے پیٹ میں چاقو گھونپ دیں گے۔"

نجمی کا ذہن اب ماؤف ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ نہ کسی سے التجا کرتی اور نہ کسی کے خلاف احتجاج کرتی تھی۔ ماسٹر جیسے کہتا ڈانس کرتی اس نے کبھی خواب میں بھی رقص نہیں کیا تھا مگر ماسٹر نے اسے مجرے کی طرز پر دو چار توڑے سکھا دیئے تھے

نجمی کسی مشین کی طرح ڈانس کرتی مگر نفرت کی انتقام کی آگ اس کے سینے کے اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ وہ اس خیال کی اندر ہی اندر پرورش کر رہی تھی کہ اسے ایک دن بدلہ لینا ہے انتقام لینا ہے ان لوگوں سے جنہوں نے اس کی عزت نفس سے کھلونا سمجھ کر کھیلا۔

اسے عورت سے کوڑے کرکٹ کا ڈھیر بنا دیا۔ موجمدار، ہربل، کالی، روپا اور ہر بابا یہ سب نجمی کی تباہی و بربادی کے نشان تھے اور اب لکھی بائی جو اسے طوائف بنا رہی تھی۔ جس نے اسے طوائف بنا دیا تھا۔

ویران علاقے میں واقع اس گیراج والے مکان کے کمرے میں نجمی کو رہتے ہوئے اذیتیں سہتے اور اب مجرے کی تعلیم حاصل کرتے اور اب سرمایہ دار تماش بینوں کے دل لبھانے کے نرت بھاؤ سیکھتے تیسرا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ لکھی بائی اب نجمی کو اپنے ساتھ مکان سے باہر نکال کر ٹہلوانے بھی لے جاتی تھی۔

دھوبل اور کالی جیب میں پستولیں لئے ان کے پیچھے پیچھے ہوتے تھے۔ لکھی بائی نے نجمی سے کئی بار پوچھا کہ وہ کالی پور میں اپنے خاوند کا پتہ بتائے تاکہ اس کے آدمی اس کے پاس جا کر اسے نجمی کی قیمت ادا کر آئیں مگر نجمی نے ہر بار یہی کہا کہ اس کا خاوند اسے چھوڑ کر مدت ہوئی چلا گیا ہے اور وہ دنیا میں اکیلی ہے۔ نہ اس کا کوئی رشتہ دار ہے نہ بہن بھائی نہ ماں باپ۔ لکھی بائی کو ابھی تک اس حقیقت کا علم نہیں ہوا تھا کہ نجمی ہندوستان کی رہنے والی بنگالی لڑکی چندرا نہیں بلکہ پنجابی لڑکی ہے جسے مشرقی پاکستان کی سرحد سے انڈیا میں اسمگل کیا گیا تھا۔ امید کی ایک ننھی سی جوت ابھی تک نجمی کے دل کے کسی کونے میں روشن تھی کہ اگر اسے کبھی موقع ملا تو وہ اس گناہ کی دلدل سے نکل کر مشرقی پاکستان یا کلکتے کے پاکستانی قونصل خانے میں جا کر پناہ حاصل کر لے گی۔

نجمی اپنا سب کچھ کھو چکی تھی اس کے پاس سوائے اپنی جان کے اور کچھ بچانے کے لئے نہیں تھا۔ وہ اب کسی وقت لکھی بائی سے ہنس کر بات بھی کر لیتی تھی۔

اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ اپنی تباہی اور بربادی کے ذمے دار افراد سے سنگین بدلہ لینے کا یا وہاں سے فرار ہو کر پاکستانی قونصلیٹ پہنچنے کا۔

لیکن بہت جلد اس کا یہ راز بھی طشت از بام ہو گیا۔ ابھی وہ گیراج والے ویران مکان میں ہی تھی کہ ایک روز مونچھوں والا موجمدار وہاں آ گیا۔ لکھی بائی اس کے ساتھ تھی۔ وہ اسے نیا خریدا ہوا اور منڈی کے لئے تیار کیا ہوا مال دکھانے لائی تھی۔ موجمدار نے نجمی اور نجمی نے موجمدار کو دیکھا تو دونوں جیسے دم بخود سے ہو کر رہ گئے۔ موجمدار نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "لکھی بائی تو یہ ہے تیرا اپنا مال۔"

"ہاں، کیوں تجھے پسند نہیں لڑکی؟" لکھی بائی نے تعجب سے پوچھا۔

موجمدار لکھی بائی کو ساتھ والے کمرے میں لے گیا اور بولا "لکھی بائی۔ یہ لڑکی میں نے مشرقی پاکستان سے خریدی تھی میں ہی اسے انڈیا کا بارڈر کراس کروا کر لایا تھا مگر یہ کالی پور والے ٹھکانے سے فرار ہو گئی۔ میں تو کئی روز سے اس کی تلاش میں تھا۔"

موجمدار نے لکھی بائی کو بتایا کہ یہ لڑکی مشرقی پاکستان کی رہنے والی ہے اور مسلمان ہے۔ اس کے بارے میں کسی نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ اصل میں پنجابن ہے۔ کوئی اسے جھانسہ دے کر اغوا کر کے کراچی لے گیا وہاں اس سے زبردستی بیاہ کر کے مشرقی پاکستان لے آیا اور پھر یہ ہمارے پاس پہنچ ہی گئی۔

"بائی میں نے اس کے بدلے پورے تین ہزار کی رقم ادا کی ہے۔ یہ رقم اب تمہیں مجھے دینی ہوگی۔"

لکھی بائی موجمدار کے آگے رعب نہیں دکھا سکتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ موجمدار ایک خونی بدمعاش ہے۔ کئی آدمیوں کا خون کر چکا ہے۔ ویسے بھی لکھی بائی جس دھندے میں تھی اسے ایسے لوگوں سے بنا کر رکھنی پڑتی تھی۔ وہ یک مشت

موجمدار کو اتنی رقم ادا بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کہنے لگی۔

"موجمدار۔ اگر تو سچ کہہ رہا ہے تو تیری رقم مجھ پر ادھار رہی۔ ابھی تو میرا اس پر خرچ ہی خرچ چل رہا ہے جب یہ دھندے پر بیٹھے گی میں وعدہ کرتی ہوں پہلے تیری رقم ادا کروں گی۔"

یہ لوگ آپس میں دیانت داری سے کاروبار کرتے تھے۔ کوئی کسی کی رقم مارنے کا خطرہ مول نہیں لیتا تھا۔ موجمدار بولا۔

"ٹھیک ہے۔ میں اسے تیرے حوالے کرتا ہوں۔ تو اس سے بے شک دھندا کرا۔ مگر ایک بات کا خیال رکھنا۔ یہ لڑکی بغیر پاسپورٹ کے انڈیا میں لائی گئی ہے۔ یہ پاکستان کی رہنے والی ہے۔ اگر یہ کسی طرح سے بھاگ کر پاکستان کے سفارت خانے والوں کے پاس پہنچ گئی تو نہ صرف یہ کہ لڑکی تیرے ہاتھ سے جائے گی بلکہ اُلٹا بھارتی پولیس تجھے بھی پکڑ کر لے جائے گی۔"

لکھی بائی نے کہا۔ "پولیس کو تو میں ماہانہ دیتی ہوں۔"

موجمدار بولا۔ "پولیس کو مجبوراً ہاتھ ڈالنا پڑے گا۔ کیونکہ یہ انڈیا اور پاکستان کے تعلقات کا معاملہ ہو گا اخبار والے اسے ضرور اُچھالیں گے۔ خاص طور پر کلکتے کے مسلمان بہت شور مچائیں گے۔ اب تو میری بات سمجھ گئی ہو گی۔"

لکھی بائی سوچ میں پڑ گئی پھر کہنے لگی۔ "میں تو اس پر سینکڑوں روپے خرچ کر چکی ہوں۔ اس پر بڑی محنت کی ہے۔ اب یہ بالکل تیار ہو گئی ہے۔ ویسے بھی ایسی خوبصورت اور صحت مند گوری چٹی لڑکی مجھے اتنی آسانی سے نہیں ملے گی۔"

موجمدار بولا۔ "تو گھبراتی کیوں ہے بائی۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں تو ایسا کر کہ اس چندا کے دھندے میں میری دو آنے کمیشن رکھ دے۔ میں جانوں اور میرا کام۔ تو بے فکر ہو جانا۔ چندا تیرے ڈیرے سے اگر مجرا کرنے باہر بھی جائے گی تو میرے آدمی خنجر پستول لئے اس کے ساتھ ساتھ ہوں گے۔ بول تجھے منظور ہے؟"

دو آنے کی کمیشن کا سودا لکھی بائی کے لئے مہنگا نہیں تھا اسے نجمی سے

ہزاروں روپے کے فائدے کی اُمید تھی بلکہ اسے یقین تھا کہ وہ اس گوری چٹی خوبصورت لڑکی کی وجہ سے کسی نہ کسی ریاست کے دیوان یا وزیر کو پھنسا کر اس سے لاکھوں کی رقم حاصل کر سکے گی۔ کہنے لگی۔

"مجھے منظور ہے۔ لیکن میری ایک شرط ہے اگر میں نے اس لڑکی چندا کو کہیں آگے بیچ دیا تو تمہیں پوری رقم میں سے صرف ایک آنہ کمیشن دوں گی۔"

موجمدار ہنستے ہوئے مونچھوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "لکھی بائی۔ تو بڑی سیانی ہے۔ بڑی اصلی اور پکی نائکہ ہے۔ اب میں جاتا ہوں چندا سے میرے بارے میں کوئی بات نہ کرنا۔ تم کب اس لڑکی کو اپنی کوٹھی پر لاؤ گی؟"

لکھی بائی نے کہا۔ "ایک مہینے بعد۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ایک مہینے بعد تمہارے پاس آؤں گا۔"

یہ کہہ کر موجمدار گیراج کے دروازے سے نکل گیا باہر اس کے دو ساتھی گاڑی میں بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ لکھی بائی واپس آئی تو نجمی نے اسے ذرا سا گھور کر دیکھا۔ اسے یقین تھا موجمدار لکھی بائی کو سب کچھ بتا گیا ہو گا۔ مگر لکھی خاموش رہی اور دوسری باتیں کرنے لگی۔ نجمی نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ موجمدار ہی تھا جو مجھے مشرقی پاکستان میں خرید کر یہاں لایا تمہیں وہ سب کچھ بتا گیا ہے۔ میں بھی تمہیں بتائے دیتی ہوں بائی کہ میں مشرقی پاکستان کی رہنے والی ہوں۔ میں مسلمان ہوں۔ ہندو نہیں ہوں اور شریف ماں باپ کی بیٹی ہوں لیکن ایک لڑکے کی محبت میں گرفتار ہو کر اس کے ساتھ گھر سے بھاگنے کی بھیانک غلطی کر بیٹھی جس کا خمیازہ آج تک بھگت رہی ہوں۔"

نجمی نے لکھی کو یہ نہ بتایا کہ وہ پنجاب کی رہنے والی ہے وہ اپنے آپ کو ابھی تک مشرقی پاکستان میں آباد بہار کی رہنے والی ظاہر کر رہی تھی۔ لکھی بائی کو اس قسم کی باتوں اور واقعات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس کے پاس جو لڑکیاں آتی تھیں ان سب کے حالات ایک جیسے ہی ہوتے تھے۔ وہ ایک جیسی کہانیاں ہی دہراتی تھیں

لکھی بائی ان پر قیمتہ خرچ کرتی تھی اور ان سے رقم کماتی تھی۔ لکھی بائی کی کوٹھی پر آئی ہوئی کوئی بھی لڑکی آج تک اس کے چنگل سے فرار نہیں ہو سکی تھی۔ جب وہ دیکھتی کہ لڑکی میں اب پہلے جیسی دلکشی نہیں رہی تو وہ اسے گھٹیا قسم کے دلالوں کے ہاتھ اونے پونے فروخت کر دیتی تھی۔ لکھی بائی کے پالتو غنڈے اس کے مال کی حفاظت کرتے تھے۔ وہ خود بھی ایک جابر اور سنگ دل عورت تھی۔ ساری ساری رات وہ لڑکیوں کے ہاتھ چارپائی کے پایوں کے نیچے رکھ کر اوپر بیٹھی رہتی اور اس کا ضمیر ایک لمحے کے لئے بھی اسے ملامت نہیں کرتا تھا۔

لکھی بائی چھوٹی سی تھی کہ اسے اغوا کر کے اس دھندے میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس کے ضمیر کو بھی رونگٹے کھڑے کر دینے والی اذیتیں دے کر مار دیا گیا تھا۔ اس نے نجمی کی طرف قہر آلود آنکھوں سے دیکھا۔ پھر چٹاخ سے ایک بھرپور طمانچہ نجمی کے رخسار پر مارا اور اسے گالی دے کر کہا۔

"مجھے تیرے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ تو بہار کی نہیں پنجاب کی رہنے والی ہے۔ تو جو کوئی بھی ہے اب میرا مال ہے اور میں اپنے مال کی حفاظت کرنا خوب جانتی ہوں۔ میں نے تجھ پر اپنا وقت اور پیسہ یونہی برباد نہیں کیا۔ ایک بات اپنے دماغ میں بٹھا لے کہ تو نے کلکتے میں کسی مسلمان یا پاکستان والوں کے دفتر میں جانے کی کوشش کی تو میرے آدمی تمہیں اس جگہ شوٹ کر دیں گے۔ تو جہاں بھی جائے گی میرے آدمی بھرے ہوئے پستول لئے سائے کی طرح تیرے ساتھ ساتھ ہوں گے۔ اب ساڑھی بدل ماسٹر آنے والا ہے۔"

نجمی اپنا گال سہلاتی ہوئی اُٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ اس کے دل میں آگ سی لگ رہی تھی۔ کھولتے ہوئے لاوے کا ایک طوفان تھا جو باہر آنے کو بے چین تھا۔ نجمی کی انتقامی فہرست میں لکھی بائی کا نام اب سب سے پہلے نمبر پر آ گیا تھا۔

مزید ایک مہینے تک نجمی کو اس گیراج والے مکان میں رقص کی تعلیم دی گئی۔ اسے تھوڑا تھوڑا گانا بھی سکھایا گیا تھا۔ جب لکھی بائی نے سمجھا کہ اب نجمی کو اس کی

کوٹھی میں منتقل ہو جانا چاہیئے تو وہ ایک دن صبح صبح وہاں آئی۔ ڈھومل اور ہریا کے علاوہ تین دوسرے غنڈے بھی وہاں چوبیس گھنٹے پہرے پر موجود ہوتے تھے۔ لکھی بائی نے انہیں ہدایت کی کہ آج رات نجمی کو لے کر اس کی کوٹھی پر آ جائیں۔ پھر وہ نجمی کے پاس آ گئی اور بولی۔

آج رات تو یہاں سے میری کوٹھی پر جائے گی۔ وہاں تمہیں ہر طرح کا آرام ملے گا۔ وہاں تیری دوسری سہیلیاں بھی ہوں گی۔

اسی رات نجمی کو گیراج والے ویران مکان سے لکھی بائی کی کوٹھی پر منتقل کر دیا گیا۔ یہ کوٹھی دریائے ہنگلی کے کنارے شہر سے کافی دور ایک غیر آباد جگہ پر واقع تھی۔ پرانی بوسیدہ ایک منزلہ کوٹھی تھی جس کے احاطے میں بارش اور دھوپ کی مار کھائی چار دیواری کے ساتھ ناریل اور پپیتے کے درخت اُگے تھے۔

گیٹ کا ایک دروازہ غائب تھا۔ گیٹ کے اوپر بورڈ لگا تھا جس پر بنگلہ اور انگریزی زبان میں "شارٹ ہینڈ اینڈ ٹائپنگ اسکول فار ویمن" لکھا تھا۔ ایک چوکیدار باہر اسٹول پر بیٹھا رہتا تھا۔ نجمی کو شام کے جھٹپٹے میں گیراج والے ویران مکان سے گاڑی میں بٹھا کر اس کوٹھی میں پہنچا دیا گیا۔

ڈھومل اور ہریا بھری ہوئی پستولوں والے ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالے نجمی کے دونوں جانب بیٹھے تھے۔ کوٹھی کے برآمدے میں خالی بنچ پڑے تھے نیم روشن راہداری کی جانب دو اونچی چھت والے کمرے تھے جن میں پرانی وضع کی چھوٹی میزوں پر ٹائپ کی چھ سات مشینیں پڑی تھیں۔ آگے جا کر راہداری بائیں جانب گھوم گئی یہاں ایک دروازے پر تالا پڑا تھا۔ ڈھومل بدمعاش نے تالا کھولا۔

ہریا نجمی کو لے کر اندر داخل ہو گیا۔ یہ کمرہ اسٹور تھا اور کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا تھا۔ یہاں سے ایک تنگ و تاریک زینہ خفیہ دروازے سے نکل کر نیچے جاتا تھا۔ نیچے دو کشادہ تہہ خانے تھے جس تہہ خانے میں نجمی کو لے جایا گیا وہاں قالین کے فرش پر سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ گاؤ تکیے اِدھر اُدھر پڑے ہوئے تھے۔ دیوار کے

[illegible] تین اگالدان رکھے تھے۔ چھت سے لگا بلب جل رہا تھا جس کی روشنی کافی تھی دیواروں پر عورتوں کی نیم عریاں تصویریں لگی تھیں۔ اس تہہ خانے کا بھی ایک دروازہ تھا جو دوسرے نسبتاً چھوٹے تہہ خانے میں کھلتا تھا نجمی کو اس چھوٹے تہہ خانے میں لے جایا گیا۔

یہاں دیواروں کے ساتھ تین پلنگ لگے تھے جن کی مسہریاں لپیٹ کر اوپر ڈال دی گئی تھیں ایک میز پر کچھ چینی کے برتن پڑے تھے۔ ایک تخت دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا تھا۔ دو تین کرسیاں بھی موجود تھیں۔ دھومل نے نجمی کے کپڑوں والا اٹیچی کیس تخت پر رکھتے ہوئے کہا۔

"غسل خانہ ساتھ ہی ہے۔ اب تو آرام کرو۔"

دھومل اور ہریا چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد نجمی نے تہہ خانے کا جائزہ لیا۔ اس تہہ خانے میں کسی کھڑکی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اوپر ایک جانب چھت کے قریب ایک چھوٹا سا ایگزاسٹ فین لگا تھا۔ جسے جاتے ہوئے ہریا بدمعاش نے چلا دیا تھا۔ اس فین کی آواز بہت مدھم تھی۔

نجمی نے منہ ہاتھ دھو کر دوسری ساڑھی پہنی اور پلنگ پر لیٹ گئی۔ میز پر بڑے کالے رنگ کے ٹیبل فین کا رخ پلنگ کی طرف تھا۔ نجمی نے اٹھ کر ٹیبل فین چلا دیا۔ ہوا چلی تو تہہ خانے کا حبس دور ہو گیا۔ فضا میں مرطوب سی بو رچی ہوئی تھی۔ کھانا اسے گیراج والے مکان میں ہی کھلا دیا گیا تھا۔ نجمی پلنگ پر لیٹی اپنے ماضی اور حال کے بارے میں غور کرنے لگی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے جذبات میں وہ پہلے ایسا حساس پن نزاکت اور پچھتاوے کا احساس نہیں رہا تھا۔ اس کی پیاری سہیلی شبانہ کی شکل بھی اسے دھندلی دھندلی نظر آتی تھی۔

ندیم سے اسے کوئی گلہ نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے دل میں ندیم کے لئے وہ پہلی سی محبت بھی محسوس نہیں کرتی تھی۔ نجمی کو وہ بھی ایک ایسا مرد معلوم ہوتا جو کبھی اس سے محبت جتایا کرتا تھا اور پھر ایک اتفاق سے اس سے جدا ہو گیا تھا۔ نجمی

کی نفسیات نے آہستہ آہستہ ایک نیا رخ اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ایک ایسے خوش آشام طوفان سے گزر کر اس تہہ خانے میں آئی تھی کہ اس کے اندر کی قدریں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں جو باقی رہ گئی تھیں۔ وہ ٹوٹ پھوٹ رہی تھیں نجمی جب ان لوگوں کے بارے میں سوچتی جنہوں نے اسے اس مقام تک پہنچایا تھا تو اس کے دل سے بددعاؤں کی جگہ گالیاں نکلنے لگتیں۔ یہ ان گالیوں کی بازگشت تھی جو بڑے التزام کے ساتھ سات روز تک دھومل اور ہریا نے اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کو دی تھیں۔

یہ گالیاں نجمی کے خون میں جیسے زہر بس گئی تھیں۔ ایک خیال نجمی کے ذہن میں ہر بار اپنے پورے جلال اور غضب کے ساتھ نمودار ہوتا تھا اور وہ ان لوگوں سے بدلہ لینے کا خیال تھا جنہوں نے اس کی عزت نفس کو تباہ کیا تھا۔ نجمی کی پوری شخصیت پر اس خیال کا غلبہ تھا۔ یہ غلبہ اس قدر شدید تھا کہ اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ ان لوگوں سے انتقام لئے بغیر یہاں سے فرار ہو گئی تو وہ اپنے آپ کو ساری زندگی معاف نہیں کرے گی۔ غیر شعوری طور پر نجمی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی عزت کے قاتلوں سے بدلہ لئے بغیر اس شہر سے فرار نہیں ہو گی۔

وہ بدلہ کس طرح لے گی؟ اس سوال کا جواب نجمی کے پاس نہیں تھا لیکن اس سوال کے ابھرتے ہی نجمی کا خون کھول اٹھتا اور اس کے سینے میں دہکتا ہوا لاوا باہر نکلنے کو بے تاب ہو جاتا وہ انہی پریشان خیالوں میں غلطاں تھی کہ ساتھ والے تہہ خانے سے ایسی آوازیں آئیں جیسے وہاں کوئی داخل ہوا ہو۔ پھر دھیمی آواز میں کوئی سارنگی بجانے لگا۔ یہ آواز تھوڑی دیر بعد رک گئی۔ کسی نے بنگلہ میں کسی کو آواز دے کر پانی مانگا۔ نجمی سمجھ گئی کہ ساتھ والے تہہ خانے میں محفل رقص و سرور گرم ہونے والی ہے۔ یہاں کی کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں رہی تھی۔

پھر کسی عورت کے ہلکے سے قہقہے کی آواز آئی۔ نجمی خاموشی سے پلنگ پر لیٹی رہی۔ کسی نے دروازے کی باہر سے کنڈی کھولی۔ نجمی نے گردن گھما کر دروازے

ذ طرف دیکھا۔ زرق برق نیلی ساڑھی میں ملبوس ایک سانولے رنگ کی جوان لڑکی مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ نجمی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے بنگلہ میں کہا۔

"اری چندا آرام کر ابھی اٹھنے کی ضرورت نہیں۔" وہ ہنستی ہوئی پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی کمرے میں عطر کی تیز خوشبو پھیل گئی تھی۔ نجمی نے لڑکی کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ خوبصورت نہیں تھی مگر بڑی بنی سنوری تھی۔ آنکھیں ضرور بڑی بڑی تھیں چہرے پر ایک بے باکی اور بے ساختگی تھی۔ اس نے نجمی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔

"میرا نام کملا ہے۔ تیرا نام مجھے معلوم ہے۔ چندا بڑا پیارا نام ہے۔ اری تو نے یہ دھوتی ایسی ساڑھی کیوں پہن رکھی ہے؟"

پھر نجمی کے سر کے ساتھ اپنا سر لگا کر بولی۔

"فکر نہ کر کل تو بھی بنارسی ساڑھی میں گھنے پاتے سے لدی پھندی ہو گی۔"

اور وہ نجمی کو گدگدانے لگی۔ نجمی نے پیچھے ہٹ کر کملا کو گھورا۔ کملا قہقہہ لگا کر اٹھی اور ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"چندا تو بڑی خوبصورت ہے۔ تیرا رنگ بھی گورا ہے تیری تو قسمت کھل جائے گی۔ موسی نے تو ابھی سے تمہاری تعریفیں شروع کر دی ہیں۔"

نجمی نے پلنگ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔

"کون موسی؟"

کملا نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔

"تمہیں نہیں معلوم؟ ارے ہاں تجھے ا... معلوم ہو گا۔ اری ہم بائی جی کو موسی کہتی ہیں۔"

نجمی نے یونہی پوچھا۔

"یہاں اور لڑکیاں بھی ہیں؟"

کملا نے ہنستے ہوئے اپنا سر کرسی کی پشت سے لگا دیا اور بولی۔

"میری چندا جان۔ آہستہ آہستہ سب سے تیری ملاقا... ہو جائے، ویسے یہاں لڑکیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔ کوئی تمہیں اپنا اصلی نام اور تجھ... زندگی کے بارے میں نہیں بتائے گی۔ تم بھی کسی کو کچھ نہ بتانا۔ یہ کملا میرا اصلی نام ...ں ہے۔ میں تمہیں اپنا اصلی نام نہیں بتا سکتی۔ موسی تمہیں سب کچھ سمجھا دے گی۔"

کملا اچانک اٹھی۔ ساڑھی کو ذرا سا ہٹا کر اس نے نجمی کو اپنا پیٹ دکھایا جس پر زخم کا دو تین انچ لمبا نشان تھا۔ نجمی کانپ سی گئی۔ کملا کرسی پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"ایک بار میں نے اپنا اصلی نام کسی کو بتا دیا تھا۔ دھومل نے میرے پیٹ میں چاقو مار دیا۔ ایک مہینہ اسپتال میں پڑی رہی تھی۔ تم ایسی غلطی نہ کرنا۔ بس چندا ہی تمہارا نام ہے۔ یہی یاد رکھنا۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی "اچھا میں جاتی ہوں۔ سیٹھ آ رہا ہو گا۔ آج میری باری ہے مجرا گانے کی۔"

کملا نے ہنستے ہوئے آگے بڑھ کر نجمی کو پیار کیا اور اسی شوخی سے مسکراتی گنگناتی بڑی خوشی کے عالم میں دوسرے تہہ خانے کی طرف چلی گئی۔ نجمی نے ایک گہرا سانس لیا اور سر جھکا لیا۔ اس گہرے سانس میں نجمی کو چنگاریاں چھوٹتی محسوس ہوئی تھیں۔

اس نے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا جس کے باہر کملا کنڈا لگا گئی تھی۔ نفرت اور جذبہ انتقام کی ایک زہریلی لہر نجمی کے سینے سے اٹھی۔ اس کا حلق کڑوا ہو گیا اس نے اپنے جسم پر ایک نگاہ ڈالی۔ یہ وہ جسم نہیں تھا جس کو لے کر وہ لاہور سے چلی تھی۔ اس جسم پر لوگوں کے لگائے ہوئے گہرے گھاؤ تھے جن سے ابھی تک خون ٹپک رہا تھا۔ یہ زخم تب سے لے کر اب تک ہرے تھے ان زخموں پر تم... قاتلوں کے ہاتھوں کے نشان محفوظ تھے۔

نجمی ان ہاتھوں کو پہچانتی تھی اسے ان ہاتھوں کو قلم کرنا تھا تاکہ وہ کسی دوسرے معصوم جسم کی طرف نہ اٹھ سکیں۔ اس سے زیادہ نجمی خاک میں نہیں مل سکتی تھی اب

اسے خاک سے اُٹھا کر ان لوگوں کو مٹاتا تھا جنہوں نے اس کو خاک میں مٹا دیا تھا نجمی پلنگ سے اُٹھ کر تہہ خانے کے فرش پر ٹہلنے لگی۔ وہ دیر تک اضطراب کے عالم میں ٹہلتی رہی۔ رات گزرتی چلی جا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ساتھ والے تہہ خانے سے گھنگروں اور سارنگی طبلے کی آواز آنے لگی۔

کملا نے پہلے بنگلہ کا ایک گانا گایا۔ پھر ایک گھٹیا قسم کی بازاری غزل گانے لگی بیچ بیچ میں کسی آدمی کی داد دینے کی مخمور سی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ نجمی پلنگ پر لیٹ گئی۔ وہ سونے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس کی آنکھوں میں تپش تھی۔ گرم لہروں کا دھواں سا اٹھ رہا تھا۔ شاید آدھی رات گزر چکی تھی کہ مجرے کی آواز بند ہو گئی۔ کبھی کبھی کملا کا شوخ قہقہہ سنائی دے جاتا تھا۔ کسی وقت لکھی بائی کی بھی آواز سنائی دیتی۔ آہستہ آہستہ یہ آوازیں غائب ہو گئیں۔ کوئی نجمی کے کمرے میں نہ آیا وہ سو گئی۔ دوسرے روز اس کی آنکھ کھلی تو چھت والے گول سوراخ میں جہاں ایگزاسٹ فین چل رہا تھا دن کی چمکیلی روشنی اندر آ رہی تھی۔

نجمی کے پاس گھڑی نہیں تھی۔ وہ اُٹھ کر غسل خانے میں گئی۔ آج پہلی بار اس نے بڑے شوق اور اہتمام سے غسل کیا۔ پلنگ پر بیٹھ کر چھوٹا شیشہ سامنے رکھ کر بال سنوارے۔ ہلکا میک اپ کیا جو اسے لکھی بائی کی طرف سے رات ہی کو دیا گیا تھا۔

جب لکھی بائی کمرے میں آئی تو نجمی کو بنا سنورا اور ہلکے میک اپ میں دیکھ کر حیران بھی ہوئی اور خوش بھی ہوئی۔ نجمی نے اسے بنگلہ میں پرنام کیا۔ لکھی بائی نے آگے بڑھ کر اسے غور سے دیکھا۔

"تو پڑھی لکھی ہے نہ اس لئے حالات کو بہت جلد بھانپ گئی ہے۔ اری میرے ساتھ تجھے کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں تجھے عیش کراؤں گی۔ یہ کملا کرشنا اور دوسری لڑکیاں تو تمہارے سامنے کچھ بھی نہیں ہیں اب ناشتہ کر کے بیشک سو جانا میں شام کو تمہارے پاس آؤں گی آج کلکتے کا ایک بہت بڑا مالدار سیٹھ

تجھ سے ملاقات کرنے آ رہا ہے دیکھ چندا میں تجھے ابھی سے کہہ دیتی ہوں وہ جو تجھے انعام دے گا نا۔ اس میں سے تو مجھے اپنی خوشی سے بس تیسرا حصہ دے دینا بس۔ لے سگریٹ پی۔"

نجمی کو لکھی بائی پہلے بھی سگریٹ کا کئی بار کہہ چکی تھی مگر نجمی نے ہر بار انکار کیا تھا لیکن اس روز اس نے سگریٹ لے کر سلگا لیا۔ اسے اچھو آ گیا لکھی بائی مسکراتی ہوئی بولی۔

"ارے ابھی دھواں منہ میں ہی رکھ کر پھینک دیا کر۔ ایک دم سے دھواں نگلے گی تو کھانسی تو آئے گی ہی۔"

دھومل اور ہریا دونوں بدمعاش چوبیس گھنٹے وہیں رہتے تھے۔ ہریا نجمی کے لئے ناشتہ لے کر آ گیا۔ اس نے بھی نجمی کو کچھ کچھ بنے سنورے دیکھا تو خوش ہو کر بولا۔

"اری واہ تیرا تو جوبن چاندنی کی طرح لگ رہا ہے۔"

نجمی نے پہلی بار ہریا کو ڈانٹ دیا۔ ہریا ہکا بکا ادھر اُدھر تکنے لگا۔ نجمی نے بے ضرر سی عام گالی دی اور کہا۔

"ہریا پھر کبھی ایسی بات کی تو میں تیرا خون پی جاؤں گی۔"

ہریا ہنسنے لگا "اری چندا، ہم بھلا ایسی ویسی بات کر سکتے ہیں بس تو یہاں خوش خوش رہ لے ہمیں اور کیا چاہیئے۔"

لکھی بائی نجمی کی اس تبدیلی کو محسوس کرتے ہوئے دوپہر کو بھی اس کو کریدنے آ گئی کہ اس خوشگوار تبدیلی کی اصل وجہ کیا ہے۔ دونوں نے مل کر بڑے تہہ خانے میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ نجمی اب بات کرتے ہوئے مسکرا بھی رہی تھی لکھی بائی نے کھانے کے بعد پان لگاتے ہوئے نجمی سے پوچھ ہی لیا کہ وہ اتنی جلدی کیسے بدل گئی؟

نجمی نے سگریٹ سلگا کر منہ سے دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے گولے باہر پھینکتے ہوئے کہا۔

"موسی جب زندگی اسی ڈھب سے گزرنی ہے تو پھر رونے پیٹنے سے کیا ہوگا ٹھیک ہے میری تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ اب مجھے اسی زندگی میں خوش رہنے کی کوشش کرنی چاہیئے بس یہی سوچ کر میں نے میک اپ بھی کر لیا تھا۔"

لکھی بائی بڑی دور اندیش اور تجربہ کار عورت تھی۔ وہ اتنی جلدی نجمی کے بیان پر یقین نہیں کر سکتی تھی۔ پان منہ میں دبایا اور ہاتھوں سے نجمی کی بلائیں لیتے ہوئے بولی۔

"اری چندا تو دوسری لڑکیوں سے بہت سیانی ہے خوبصورت تو تو ہے ہی۔ یہ تم نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا اور پھر ہم بھی تو محنت مزدوری کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تمہیں تھوڑی سی محنت مزدوری کرنے کا معاوضہ اتنا ملے گا کہ تو حیران رہ جائے گی۔"

لکھی بائی نے نجمی کو پان دیا جو اس نے منہ میں دبا لیا اور سگریٹ کا دھواں نکالنے لگی۔ لکھی بائی ہنس دی۔

"اری تو تو کارخانے کی چمنی کی طرح دھواں نکال رہی ہے۔"

اور بائی نے نجمی سے سگریٹ لے لیا۔

رات کو پڑے تہہ خانے میں پھر وہی محفل سجائی گئی۔ نئی چاندنی بچھ گئی پھولوں کے ہار آ گئے نجمی کو بیش قیمت ساڑھی پہنا کر عطر خلیل میں بسایا گیا۔ سونے کے گہنے پہنائے گئے۔ جو ماسٹر اسے جو سکھاتا تھا وہ ہارمونیم لے کر بیٹھ گیا۔ سارنگی والا ایک بوڑھا بھی آ گیا۔

نجمی کو دوسرے کمرے میں ہی رکھا گیا۔ لکھی بائی خود پاندان کے گاؤ تکیہ کے سہارے چاندنی میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی اور پان لگانے لگی۔ وہ ماسٹر اور سارنگی والے سے کبھی کبھی کوئی بات کر لیتی تھی۔ ان لوگوں پر بھی لکھی بائی کی ظالمانہ طبیعت کلکتے کے پولیس کے اعلیٰ افسران تک رسائی اور اس کے قاتل غنڈوں کا اس قدر دباؤ تھا کہ دونوں سازندوں نے کبھی لکھی بائی سے زیادہ بات نہیں کی تھی۔ بلکہ وہ ہمیشہ خوشامدانہ انداز میں اس کی ہاں میں ہاں ہی ملاتے تھے۔ کشادہ تہہ خانے میں

بھی ایگزاسٹ فین چل رہا تھا۔ اس بیچ میں سے باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ لکھی بائی نے سازندوں کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور اٹھ کر زینہ چڑھ کر کوٹھی کی راہ داری میں آ گئی۔ جب وہ واپس تہہ خانے میں آئی تو نجمی نے دیکھا کہ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا ہندو سیٹھ تھا جس نے سلک کا کرتا پاجامہ پہن رکھا تھا اور گلے میں سفید نگینوں کا ہار تھا۔ جیسا کہ نجمی کو سکھایا گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر اسے آداب کیا اور بیش قیمت ریشمی ساڑھی سمیٹ کر چاندنی پر بیٹھ گئی۔

نجمی نے شاید زندگی میں پہلی بار طوائف کی اداکاری کی۔ یہ اداکاری اتنی مکمل اور پر اثر تھی کہ سیٹھ سو سو کے نوٹ لٹانے لگا۔ نجمی نے مناسب انداز میں نرت بھاؤ کئے بنگلہ کا ایک گانا بھی گایا۔ ساتھ ساتھ جان بوجھ کر اس نے سیٹھ کو کچھ ایسے انداز دکھائے کہ وہ اس کا دیوانہ ہو گیا۔ ویسے بھی ریشمی ساڑھی اور بناؤ سنگھار میں نجمی کا حسن دوبالا ہو گیا تھا۔ سیٹھ جاتے جاتے نجمی کو پانچ ہزار روپے اور سونے کی ایک انگوٹھی دے گیا۔

لکھی بائی بے حد خوش تھی۔ اس نے نجمی سے صرف دو ہزار روپے لے لئے اور انگوٹھی اس کے پاس رہنے دی۔ اس کا ماتھا پیار سے چوم کر کہا "واری جاؤں میری چندا میں دیکھ رہی ہوں تو بھارت ورش کی کسی ریاست کی مہارانی بنے گی تو سونے کا تاج پہن کر راج کرے گی۔"

نجمی کے سینے میں زہر کی وہی لہر ایک بار پھر اٹھ کر اس کے حلق تک آ گئی اس نے گہرا سانس بھرا۔ اس سانس میں آگ کی چنگاریاں تھیں۔ وہ مسکرا کر بولی "موسی میں تو تمہارے پاس ہی رہوں گی مجھے کسی راجے کی رانی نہیں بننا۔"

لکھی بائی نے نجمی کو گلے لگا لیا۔ دھول غنڈہ اور رہبا ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور تعجب سے سر بھی ہلایا۔ لکھی بائی نے نجمی سے کہا۔ "ان دونوں کو دو سو روپے دیدے۔"

نجمی نے کوئی اعتراض نہ کیا اور پرس میں سے سو سو کے چار نوٹ نکال کر

دھول اور ہریا کی طرف پھینک دیئے۔ کچھ روز تک لکھی بائی نجمی کے رویّے کا جائزہ لیتی رہی۔ سیٹھ ہر رات آکر نجمی کا گانا سُنتا اور دولت لٹا کر چلا جاتا۔ لکھی بائی کو کافی حد تک یقین ہو گیا تھا کہ نجمی نے ہتھیار پھینک کر نئی زندگی کو قبول کر لیا ہے۔ دوسری طرف وہ سیٹھ کی آتشی ہوس کو بھی تیز کرنا چاہتی تھی۔

اس نے نجمی کو وہاں سے ایک دوسری کوٹھی میں بھجوا دیا جہاں کملا اور کرشنا رہتی تھیں۔ یہ کوٹھی وہاں سے زیادہ دُور نہیں تھی۔ نجمی کملا کے گلے لگ کر ملی کملا نے نجمی کا تعارف کرشنا سے کرایا۔ وہ بڑی خوش تھی کہ نجمی نے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہے۔ نجمی نے بھی یہی ظاہر کیا اور کہا۔

"کملا ہم اور کر بھی کیا سکتی ہیں۔ بس حساب ہے یہی زندگی ہمارے لئے بہت، اچھی ہے اور پھر بہترین ساڑھیاں پہننے کو ملتی ہیں۔ پرس میں ہر وقت روپے رہتے ہیں بس اس بات کا افسوس ہے کہ موسی مجھے کہیں سیر و تفریح کے لئے ساتھ نہیں لے جاتی مجھے سینما دیکھے مدّت ہو گئی ہے۔"

کرشنا نے نجمی کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ "فکر نہ کر شروع میں ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہوتا تھا۔ جب موسی کو ہم پر بھروسہ ہو گیا تو دیکھ لو اب ہم سیر و تفریح کو بھی جاتی ہیں موسی کے ساتھ۔" نجمی نے بھویں اُوپر اٹھالیں اور کہا۔

"کیا موسی ہمیں کبھی اکیلا نہیں جانے دے گی؟ کملا نے سر کو ذرا سا جھٹک کر کہا۔

اری چندا ہمیں اکیلی باہر جا کر کرنا کیا ہے خواہ مخواہ لوگ پیچھے لگ جاتے ہیں اور پھر پولیس بھی تنگ کرتی ہے۔ یہ کم بخت ہمیں شکل ہی سے پہچان لیتے ہیں۔ کہتے ہیں لائسنس دکھاؤ۔" کرشنا بولی۔

"موسی کے غنڈے بھی تو سائے کی طرح ہمارے ساتھ ہوتے ہیں۔ اکیلی جانے کا فائدہ بھی کیا کہ جب ہم کبھی اکیلی نہیں ہوتیں۔ کلکتے کی پولیس تو موسی کا دم بھرتی ہے۔ تم کچھ کر لو پولیس تمہیں پکڑ کر پھر موسی کے پاس لے آئے گی اور پھر تمہارے پیٹ میں چاقو گھونپ کر ہسپتال میں پہنچا دیا جائے گا۔" کملا جھٹ بولی۔ "میرے ساتھ

گئی تو بھی ہوا تھا۔"

نجمی نے ان کی باتوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ لکھی بائی ہی ان کے لئے ان داتا تھی۔ وہ نہ صرف ان کا واحد سہارا تھی بلکہ وہ اس سے اور اس کے خونی غنڈوں سے بے حد خائف بھی تھیں۔ ویسے بھی کملا اور کرشنا کا دنیا میں سوائے لکھی بائی کے اور کوئی نہیں تھا۔ خدا جانے انہیں کہاں سے اغوا کر کے کب لایا گیا تھا۔ وہ اس بارے میں حیرانی کی حد تک خاموش تھیں۔ انہوں نے نجمی سے بھی کبھی نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں کی رہنے والی ہے اور اسے کس نے کہاں سے اغوا کیا تھا۔ اور وہ لکھی بائی کے اڈے پر کیسے پہنچ گئی۔

ایک بات کا احساس ان کی باتوں سے شدت سے ٹپکتا تھا کہ اگر انہوں نے کسی طرف بھاگ جانے کی کوشش کی تو لکھی بائی کے غنڈے شمشان تک ان کا پیچھا کریں گے اور انہیں ہلاک کر ڈالیں گے۔ بہت جلد نجمی کو پتہ چل گیا کہ لکھی بائی کا کلکتے کے ریڈ لائٹ ایریا سونا گاچی میں بھی ایک چوبارا ہے جہاں وہ باقاعدہ لائسنس کے ساتھ گانا بجانا کراتی ہے۔ یہاں سے وہ اپنی مرضی کے مطابق کسی نہ کسی لڑکی کو ٹرینڈ کرنے کے بعد اپنی سونا گاچی والی بیٹھک پر بھی پہنچا دیتی ہے۔

اس کی بیٹھک پر ہندو لڑکیاں مجرا کرتی تھیں۔ وہ اس کوٹھی میں کبھی نہیں لائی گئی تھیں۔ یہ دریائے ہگلی والی کوٹھی لکھی بائی کا گویا ٹریننگ سینٹر بھی تھا۔ ویسے سونا گاچی میں وہ مارکیٹ سے طوائفیں خرید کر بھی ان کا گانا کراتی تھی۔ نجمی کے ذہن میں اپنے قاتلوں سے انتقام لینے کا ایک دھندلا سا خاکہ ضرور تھا مگر ابھی اسے کوئی واضح راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بہر حال اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ لکھی بائی کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ جانتی تھی کہ لکھی بائی ایک جہاں دیدہ اور عیار عورت تھی۔ وہ اتنی آسانی سے اس پر بھروسہ کرنے والی نہیں ہے۔ لیکن نجمی نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لکھی بائی نجمی کو ایک دوبارہ اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر سینما دکھانے بھی لے گئی

نجمی نے لکھی بائی کی باتوں سے اتنا بھانپ لیا تھا کہ وہ اسے سوناگاچی میں نہیں بٹھانا چاہتی بلکہ اسے کسی ریاست کے راجہ کے ہاں فروخت کر کے منہ مانگی دولت پانے کا منصوبہ بنائے ہوئے ہے۔ نجمی بھی خونی انتقام کے جس منصوبے کو لے کر آگے بڑھ رہی تھی اس میں لکھی بائی کا نام سرفہرست تھا۔

نجمی ایک غیر ملک میں اپنی نادانیوں اور غلطیوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے حالات کی ستم ظریفیوں کا مقابلہ کر رہی تھی اور دوسری طرف رومان پسند اور خوابوں کی دنیا میں رہنے والی شبانہ زندگی کا دریا سرسبز وادیوں کے پھولوں بھرے کنجوں سے نکل کر آگ برساتے آسمان اور دہکتے تپتے صحراؤں میں داخل ہو رہا تھا واشنگٹن میں بیٹھے ظفر نے شبانہ کے والد کو لکھ کر شادی کی تاریخ مقرر کرا لی کینال بینک والی عالی شان کوٹھی "کینال لاج" پہلے ہی وہ اپنے نام کروا چکا تھا۔ شبانہ کو اس نے ایم اے اس لئے نہیں کرنے دیا تھا کہ وہ شبانہ کی انا کو ٹھیس پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ خود معمولی تعلیم یافتہ تھا۔ اس لئے اسے یہ ہرگز گوارا نہیں تھا کہ شبانہ جس سے وہ اپنی بے عزتیوں کا بدلہ لینے کے لئے شادی کر رہا تھا۔ اس سے زیادہ تعلیم حاصل کر کے اس کے پاس آئے۔

شبانہ خوابوں کی دنیا میں رہنے والی خیال پرست نازک مزاج لڑکی تھی۔ مگر اسے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی عزت کا اس حد تک پاس تھا کہ وہ ان کی خاطر نہ صرف اپنے خواب بلکہ اپنی زندگی بھی قربان کر سکتی تھی چنانچہ جب اس کے باپ نے بتایا کہ ظفر سے اس کی شادی کی تاریخ پکّی کر دی گئی ہے تو اس پر جیسے بجلی گر پڑی مگر اس نے اُف تک نہ کی۔ زبان سے اس شادی کے خلاف ایک لفظ تک نہ نکالا۔

شبانہ نے اپنے حق کی حفاظت کرتے ہوئے اس شادی کے خلاف آواز ضرور بلند کی تھی۔ اس نے اپنے بھائی، والدہ اور بڑی بہن غزالہ کے ذریعے اس احتجاج کو اپنے والد تک پہنچا دیا تھا۔ وہ اس رشتے پر نظرثانی کرتے ہی والے تھے کہ

ان پر اچانک ایک مصیبت آن پڑی اور ظفر نے اپنی دولت سے انہیں کاروباری تباہی سے بچا لیا۔ ظفر نے کوٹھی بھی اپنے نام لکھوا لی تھی۔ وہ امریکہ میں شبانہ کے چھوٹے بھائی عامر کو بھی تعلیم دلوا رہا تھا۔

شبانہ کے ابّو ظفر کے اب بھی لاکھوں روپے کے مقروض تھے۔ یہ خاندان، اسی صورت میں بربادی سے محفوظ رہ سکتا تھا کہ شبانہ چپ چاپ ڈولی میں سوار ہو کر ظفر کے گھر چلی جائے۔ اپنے تمام سنہری خوابوں اور حسین سپنوں کو پامال کرتی ہوئی۔ اور شبانہ ایسا ہی کر رہی تھی۔ نجمی نے اخلاقی روایات کو توڑ پھوڑ کر اپنی مرضی کی شادی کرنے کی کوشش کی اور اس کی زندگی تباہی کے راستے پر چل نکلی۔ شبانہ ان روایات کو ساتھ لے کر ان کی پابندی کرتے ہوئے آگے بڑھی اور تباہی اس کا مقدّر بن گئی اس کے سارے خواب ٹوٹ کر بکھر گئے۔ اسے سوائے اندھیروں کے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر کون جیتا کون ہارا؟

شبانہ کی شادی میں ایک مہینہ باقی رہ گیا تھا۔ "کینال لاج" میں شادی کی تیاریاں جاری تھیں۔ شبانہ کی بھابھی اور اس کی پھوپھی کی لڑکیاں ان تیاریوں میں پیش پیش تھیں۔ دُلہن کے لئے جوڑے بنوائے جا رہے تھے۔ شبانہ کے بھائی اور ابو نے بینک سے مزید قرض لے کر زیورات کے سیٹ بھی تیار کروا لئے تھے۔

شبانہ ان تمام تیاریوں سے بے تعلق ظفر کے ساتھ گزاری جانے والی زندگی، کے نشیب و فراز پر سوچتی رہتی وہ ظفر کو ناپسند کرتی تھی۔ ظفر اس سے انتقاماً شادی کر رہا تھا۔ صرف شبانہ کو نیچا دکھانے کے لئے اس کی انا اور شخصی وقار کو ٹھیس پہنچانے کے لئے۔ شبانہ اپنے خاندان کے ناموس کی خاطر خاموشی سے اپنے مقتل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کالج اس نے چھوڑ دیا تھا۔

ان ہی دنوں شبانہ کے بڑے بھائی عقیل کو کاروبار کے سلسلے میں سلہٹ جانا پڑا۔ شبانہ کا دل مشرقی پاکستان جانے کو مچل اٹھا۔ وہ اس سے پہلے وہاں دو ایک بار ہی گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ناریل اور دیودار کے جنگل لہرانے لگے اور دریائے پدما کی موجوں پر کشتیاں کھینے والے مچھیروں کے میٹھے گیت کانوں میں رس گھولنے لگے۔ اس نے سوچا کہ اب وہ امریکہ چلی جائے گی جانے زندگی کا کیا انداز ہوگا اس کے بعد پھر کبھی نہ وہ ایک بار مشرقی پاکستان کی مرطوب ٹھنڈی ہواؤں میں سیر کرے۔ اس نے عقیل بھائی کے ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی تو

عقیل شبانہ کی دلجوئی کی خاطر اسے ساتھ لے جانے پر تیار ہو گیا سلہٹ میں عقیل کے ایک گہرے دوست کی فیملی رہائش پذیر تھی۔

چنانچہ ایک روز شبانہ اپنے بھائی کے ساتھ پی آئی اے کے طیارے میں ڈھاکہ جانے کے لئے سوار ہو گئی ڈھاکہ پہنچ کر انہوں نے ڈھاکہ کے کملاپور ریلوے جنکشن سے سلہٹ جانے والی ٹرین پکڑی اور سلہٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ستمبر کا آغاز ہو چکا تھا مشرقی پاکستان کا آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا کسی ریلوے اسٹیشن سے گزرتے ہوئے بارش شروع ہو جاتی تو شبانہ کھڑکی سے باہر ہرے بھرے سبزے لہلہاتے دھان کے کھیتوں اور ناریل و تاڑ کے جھنڈوں کو دیکھتی۔ اسے ایک عجیب طرح کی سرمدی خوشی محسوس ہوتی۔ یہ خوشی تمام خوشیوں سے نرالی تھی۔ نہ اس کا کوئی نام تھا، نہ اس کی کوئی قیمت تھی۔ نہ اس کا کوئی آغاز تھا اور نہ اس کی کوئی انتہا تھی۔ یہ بادلوں سے بارش کی ٹھنڈی شفاف بوندیں بن کر جیسے شبانہ کے دل کے کنول کی پنکھڑیوں پر گرتی محسوس ہوتی تھی۔ یہ خوشی تمام رنگوں خوشبوؤں اور شکلوں سے بے نیاز تھی۔

بارش میں بھیگتی ٹرین تالاب میں کھلے ہوئے کنول کے پھولوں ڈھلوان چھتوں والے مکانوں اور سنبل کے کیسری پھولوں والے گنجان درختوں کو پیچھے چھوڑتی اپنی منزل کی طرف دوڑی چلی جا رہی تھی۔ شبانہ کا جی چاہا کاش وہ ساری زندگی اسی طرح گاڑی میں سفر کرتے گزار دے۔ بارش ہوتی رہے۔ ٹرین چلتی رہے اور کنول کے پھولوں سے بھرے ہوئے تالاب اور ناریل کے جھنڈ اور کیسری پھولوں والے سنبل کے درخت گزرتے چلے جائیں اور یہ سفر کبھی ختم نہ ہو ان دلکش مناظر کو دیکھ کر شبانہ کو بے اختیار پر اسرار راحیل کا خیال آ گیا۔

کیا وہ سلہٹ میں اسے ملے گا؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تھا مگر ایسا کبھی کبھی ہو جایا کرتا تھا۔ اسے لگتا کہ پر اسرار راحیل اس کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا ہے۔ محبت اور رومانس کی ایک پاکیزہ مہکتی لہر کی طرح وہ اس کے سر پر اپنا سایہ کئے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔

ٹرین سلہٹ کی طرف چلی جارہی تھی۔ شبانہ ایک رات کے بعد راستے میں آنے والے اسٹیشنوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسے اسٹیشنوں کے نام یاد نہیں تھے بارش میں دھل کر ہر شے پہلے سے زیادہ خوبصورت ہوگئی تھی۔ جب وہ سلہٹ پہنچے اس وقت شام ہو رہی تھی۔ عقیل بھائی کے دوست کی فیملی انہیں لینے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھی عقیل نے ٹیلیفون پر انہیں بتا دیا تھا کہ میری بہن شبانہ بھی میرے ساتھ آرہی ہے۔

اس فیملی سے شبانہ کی لاہور میں دو تین بار ملاقات ہو چکی تھی۔ یہ لوگ وزیرآباد کے رہنے والے تھے اور ایک مدت سے سلہٹ میں چائے کا بزنس کر رہے تھے سلہٹ شہر کے مضافات میں چائے کے باغات کے قریب ہی ان کی ایک خوبصورت کوٹھی تھی۔ یہ کوٹھی انہوں نے خود بنوائی تھی۔

عقیل بھائی کے ان دوست صاحب کا نام چودہری خدا داد تھا۔ عقیل بھائی سے عمر میں چار پانچ سال بڑے تھے۔ چھوٹی سی فرنچ کٹ داڑھی بھاری جسم سر پر جناح کیپ ہاتھ میں چھڑی بڑے خوش اخلاق اور ہنس مکھ تھے۔ ان کی اولاد کوئی نہیں تھی۔ دونوں میاں بیوی تنہا کوٹھی میں ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔ بیوی کو شبانہ بھابھی کہہ کر پکارا کرتی تھی۔ گوری چٹی خاتون تھیں۔ سنہری فریم والی عینک لگاتی تھیں اور سر سے دوپٹہ کبھی نہیں گرنے دیتی تھیں۔ نماز روزے کی پابند۔ وزیرآباد میں انہوں نے اپنی کافی جائیداد بنائی ہوئی تھی اور وزیرآباد میں کئی رفاہی اداروں کی سرپرستی کرتے تھے۔

چودہری صاحب اور بھابھی نے شبانہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے پیار کیا۔ عقیل بھائی سے گلے ملے اور گاڑی میں بیٹھ کر اپنی کوٹھی کی طرف روانہ ہوگئے۔ راستے میں بھابھی اور ان کے میاں نے عقیل کو شبانہ کی ہونے والی شادی کی مبارکباد بھی دی چودہری صاحب بولے۔

"بھئی ہم نے تو لاہور آنے کی ساری تیاریاں مکمل کر رکھی ہیں۔"

عقیل نے کہا۔ "چودہری صاحب آپ بھابھی صاحبہ کو لے کر تین چار روز پہلے ہی

آجائیے گا آپ کی وہاں ضرورت ہوگی۔"

چودہری صاحب نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہیں پہلے آئیں گے بھئی۔ ہماری اپنی بیٹی کی شادی ہے۔ شبانہ تو ہمیں اپنی بچیوں کی طرح پیاری ہے۔"

بھابھی نے شبانہ کی طرف مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے جیسور سے تمہارے لئے سچے ریشم کی ساڑھیاں منگوائی ہیں۔ تم ساڑھی پسند کرتی ہو نا شبانہ بیٹی؟"

شبانہ نے آہستہ سے سر ہلا کر کہا۔ "جی ہاں۔" وہ موٹر کی کھڑکی سے باہر گیلی سڑک کے کنارے ہوا میں جھومتے ناریل کے درختوں کو تک رہی تھی جن کے پیچھے بادلوں کا رنگ شام کے جھٹپٹے میں گہرا سرمئی ہوتا جارہا تھا۔ بارش نہیں ہو رہی تھی مگر آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ بنگلے پر نوکروں نے کھانا وغیرہ تیار کر رکھا تھا۔ اس بنگلے میں آکر شبانہ کو ہمیشہ سکون اور مسرت کا احساس ہوا تھا۔

سلہٹ کے مضافات میں ایک پہاڑی ٹیلے پر بنا ہوا یہ خاموش اور تنہا بنگلہ تاڑ اور ناریل کے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک جانب ڈھلان پر بانس کے دس بارہ درخت ساتھ ساتھ اُگے ہوئے تھے جن کی وجہ سے وہاں ہر وقت ٹھنڈا ٹھنڈا سبز اندھیرا سا پھیلا رہتا تھا۔

شبانہ کو یہ کنج بڑا پسند تھا جب بھی وہ یہاں آتی اس کنج میں آکر ضرور بیٹھا کرتی تھی پتھر کی چند ایک سیڑھیاں ٹیلے کے اوپر بنگلے تک جاتی تھیں۔ بنگلے میں روشنی ہو رہی تھی۔ لان میں بید کی کرسیاں لگی تھیں۔ برآمدے میں بھی دیوار کے ساتھ بید کے صوفے پڑے تھے۔

بید کی میز پر رکھے گلدان میں ٹراپیکل پودے کے چوڑے پتے سر جھکائے خاموش تھے فضاء میں ایک ایسی مرطوب خوشبو سی رچی ہوئی تھی جس میں بانس ناریل اور چائے کی ملی جلی مہک تھی۔ جاتے ہی انہیں سلہٹ کے انناس کا شربت پلایا گیا پھر انہوں نے منہ ہاتھ دھوئے اتنی دیر میں نوکروں نوکرانیوں نے کھانا لگا دیا تھا کھانے پر خوب باتیں ہوئیں۔

بھابھی شبانہ سے شادی پر خریدے گئے جوڑوں کی باتیں کرتی رہی شبانہ ہوں ہاں میں جواب دیتی گئی۔ چودھری صاحب عقیل بھائی سے کاروبار کی باتیں کرتے رہے کھانے کے بعد چائے کا دور چلا۔ یہ سلہٹ کی خاص بلینڈ کی ہوئی چائے تھی۔

اس وقت شبانہ کو پراسرار راحیل کی بہت یاد آئی۔ وہ چائے کا مسافر تھا۔ چائے کی خوشبو اس کے ساتھ ساتھ سفر کرتی تھی۔ چائے اور سرخ گلاب کے پھول۔ سرخ گلاب کے پھول تو وہاں نہیں تھے مگر سلہٹ کی نازک لطیف پاکیزہ اور محبت کرنے والی محبت کی یاد دلانے والی محبت میں ڈوب جانے والی چائے موجود تھی۔

جس وقت یہ لوگ چائے پی رہے تھے تو شبانہ کو عجیب دلنواز سی آواز سنائی دی۔ وہ اس آواز سے مانوس تھی۔ وہ چائے پیتے ہوئے ہمہ تن گوش ہوگئی۔ پھر عقیل بھائی چودھری صاحب اور بھاوج صاحبہ کی آوازیں چھٹ کر پرے ہٹ گئیں اور شبانہ نے اس مانوس آواز کو بالکل صاف سن لیا۔ یہ بارش کی آواز تھی۔ لان میں بارش شروع ہوگئی تھی۔

چائے کی پیالی شبانہ کے ہاتھ میں تھی۔ پیالی میں پڑی چائے بھی جیسے ہمہ تن گوش تھی اور بارش کی آواز کو غور سے سن رہی تھی۔ چائے بارش اور بانس کے درخت اور غروب ہوتی شام کے سائے طلوع ہوتی برسات کی اندھیری رات کے گیلے سایوں میں جذب ہو رہے تھے۔

شبانہ چائے کی پیالی لے کر ڈائننگ روم سے نکل کر برآمدے میں آگئی اب وہ بارش کے قریب تھی۔ اب بارش اس کے قریب تھی۔ یہ جنوب مشرقی ایشیا کی بارش تھی بارش جنوب مشرقی ایشیا میں پیدا ہوئی ہے۔ پہلی بار بارش کا جنم جنوبی جنگلوں میں ناریل اور بانس کے جھنڈوں میں ہوا اور اس نے چائے کے باغوں کے قریب اناناس کے پودوں کے درمیان اپنی آنکھیں کھولیں۔

سلہٹ کی ابر آلود مرطوب ہواؤں نے شبانہ کے پریشان اور الجھے ہوئے ذہن کو بے حد سکون بخشا۔ دوسرے روز وہ چائے کے باغوں کی سیر کو گئی۔ ٹیلے

کی ڈھلانوں پر چائے کی پھولی ہوئی سرسبز جھاڑیاں ساتھ ساتھ قطاروں میں اوپر تک چلی گئی تھیں۔ مزدور لڑکیاں کہیں کہیں ٹوکرے پیچھے باندھے چائے کی پتیاں چن رہی تھیں بھابھی شبانہ کے ساتھ تھی۔ یہاں اس کے خاوند چودھری صاحب کا ایک ڈیرہ تھا جس کا ایک کمرہ مہمانوں کو چائے پیش کرنے کے لئے مخصوص تھا۔

شبانہ نے بھابھی سے پوچھا کہ چائے چننے والی لڑکیوں کو دن میں کتنی مزدوری ملتی ہے؟ بھابھی نے اپنی بیش قیمت ساڑھی کا ریشمی پلو سر کے اوپر جماتے ہوئے کہا۔

"یہ تو چودھری صاحب کو ہی معلوم ہے۔"

چائے کے کمرے میں شبانہ اور بھابھی کو چائے اور بسکٹ پیش کئے گئے۔ مگر شبانہ کا دل اداس ہوگیا تھا۔ اس نے پیالی میں دیکھا۔ چائے بھی اداس تھی۔ چائے کس لئے اداس تھی؟ شاید اس لئے کہ یہ چائے ان میلے کچیلے کپڑوں والی عورتوں کے نصیب میں نہیں تھی جن کے محنت کش ہاتھوں نے گھنٹوں باغ میں جھاڑی جھاڑی کے پاس جا کر اس چائے کی پتیوں کو چنا تھا۔ یہ بڑی قیمتی چائے تھی۔ یہ چائے کے پھولوں کی چائے تھی۔ چائے کے پھولوں کی چائے سب سے افضل ہوتی ہے۔ دوسرا درجہ چائے کی پتی کا ہے اور تیسرے درجے کی چائے پودوں کے ڈنٹھلوں سے بنائی جاتی ہے۔

شبانہ کو چائے کے پھولوں کی چائے پیش کی گئی تھی اس چائے میں چائے کی پتیاں چننے والیوں کے دردانگیز گیتوں کی اداس آواز تھی۔ یہ آواز چائے کی بھاپ کی لہروں کے ساتھ بلند ہو کر شبانہ کے کانوں کو چھو کر جیسے آہیں بھرتی گزر رہی تھی۔

شبانہ چائے چننے والیوں کے لئے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ یہ کام اس کا نہیں تھا یہ کام چودھری صاحب کا تھا جس نے کل ہی اپنی بیوی کو سات ہزار روپے کی ریشمی ساڑھی خرید کر دی تھی۔ اس کے بعد چائے کے باغ میں شبانہ کا جی نہ لگا۔

رات کا کھانا مسز چوہدری کی ایک سہیلی کے ہاں تھا یہ سہیلی بنگالی خاتون تھیں۔ ان کا بنگلہ بھی ایک ٹیلے کے ٹیرس پر تھا۔ اس کتابی چہرے اور موٹی موٹی آنکھوں والی باوقار بنگالی خاتون کا نام نورالنساء تھا۔ اس کا امیر کبیر کاروباری بنگالی خاوند اسے نور

کہہ کر پکارتا تھا۔ شبانہ اس سے پہلے بھی نور سے مل چکی تھی۔ اس نے شبانہ کے لئے خاص طور پر تین چار قسم کی مچھلی پکوائی تھی۔

شبانہ اپنے بھائی عقیل، عقیل کے دوست چودھری صاحب اور ان کی بیگم کے ساتھ بیگم نور کے بنگلے میں داخل ہوئیں تو گیٹ پر ان کی چھوٹی بیٹی جنگیر میں چنبیلی کے پھولوں کے ہار لئے کھڑی تھی۔ اس نے باری باری سب مہمانوں کے گلے میں ہار پہنائے۔ بیگم نور ان کے خاوند ان کی بڑی بیٹی، بیٹی کے بچے سب استقبال کو وہاں موجود تھے۔ اس شام بھی سلہٹ کا آسمان ابر آلود ہی تھا مگر بارش نہیں ہو رہی تھی۔ فضا میں کسی قدر حبس تھا مگر بنگلے کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں پہنچتے ہی حبس کا احساس ختم ہو گیا۔ شبانہ کو محسوس ہوا کہ وہ جنوب مشرقی ایشیاء کے کسی شہر میں نہیں بلکہ کسی سرد شمالی شہر میں آ گئی ہے۔

اُنہوں نے کچھ دوسری مہمان خواتین بھی بلائی ہوئی تھیں۔ بہت جلد کمرے کی ایئر کنڈیشنڈ فضا، چنبیلی یورپ کی عطریات پرفیومز اور کلونوں کی ملی جلی خوشبوؤں سے بھر گئی۔ بنگالی خواتین رنگ برنگی ریشمی ساڑھیوں میں ملبوس تھیں۔ ان کے ماتھوں کی بندیاں چمک رہی تھیں۔ مشرقی پاکستان کی مسلمان بنگالی خواتین میں بھی سرخ بندیا لگانے کا بڑا رواج تھا۔ ان میں کچھ کے رنگ سانولے اور کچھ کے کندنی تھے۔ کسی نے ٹیپ ریکارڈر پر قاضی نذرالاسلام کے گیت کی ٹیپ لگا دی نور کا خاوند قاضی نذرالاسلام کے گیت کا اُردو ترجمہ کرتا جاتا تھا بنگلہ گیتوں کی مدھر لے شبانہ کو شروع ہی سے بڑی فکر انگیز لگتی تھی۔

قاضی نذرالاسلام کا گیت ایک خاص دھن میں تیار کیا گیا تھا جسے پری نذرل گیتی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ صنف موسیقی رابندر ناتھ ٹیگور کے رابندر سنگیت کے مقابلے میں ایجاد کی گئی تھی۔ گول چہرے اور لمبے سیاہ بالوں اور سیدھی مانگ والی بنگالی لڑکی جہاں آرا شبانہ کو بڑی پیاری لگی۔ اسے شبانہ نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ چٹاگانگ سے اپنی آنٹی کے پاس آئی ہوئی تھی۔ اس نے شبانہ سے کہا۔

"ہمارے گھر چٹاگانگ چلیں نا۔ میری ممی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ ہمارے گھر کے باغ میں انناس کے پودے لگے ہیں۔ ہم آپ کو تازہ انناس کھلائیں گے۔"

شبانہ نے تصوّر میں اس گھر کے باغ کو دیکھا جہاں انناس کے نیم قد پودے بارش میں بھیگ رہے تھے اور جن کی جھاڑیوں کے اندر سنہری انناس بارش سے چھپنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ جہاں آرا چٹاگانگ میں میڈیکل کے دوسرے سال کی طالبہ تھی۔ وہ اُردو بھی بول لیتی تھی۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا تو بیگم نور نے نوکر کو اشارہ کیا۔ نوکر دوسرے کمرے سے ہارمونیم اُٹھا لایا۔ سب سے پہلے ہارمونیم ایک بنگالی خاتون کے آگے میز پر رکھا گیا۔ اُنہوں نے علامہ اقبال کی نظم گا کر سنائی پھر ہارمونیم دوسری خاتون کے سامنے آ گیا۔ اُنہوں نے ہارمونیم بجاتے ہوئے سوھنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد گا کر سنایا۔ آخر میں ہارمونیم ایک دُبلی پتلی بنگلہ خاتون کے سامنے رکھا گیا۔

اس نے ایک قدیم بنگلہ لوک گیت گانا شروع کیا جہاں آرا شبانہ کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ وہ اسے گیت کا ترجمہ کر کے آہستہ آہستہ سناتی جاتی تھی۔ خاتون کی آواز میں عجیب طرح کا درد اور سوز تھا۔ خنک اور اداس آواز تھی۔ جب شبانہ نے گیت کا ترجمہ سُنا تو وہ اس سے بہت متاثر ہوئی۔ لوک گیت چاہے کسی زبان میں ہوں ہمارے جذبات کے حقیقی ترجمان ہوتے ہیں۔ بنگلہ لوک گیت کسی ہرنی کے بارے میں تھا جس کو شکاری شکار کر کے لے جا رہا ہے اور ہرنی دور کھڑے اپنے ساتھی ہرنوں اور ہرنیوں سے باتیں کر رہی ہے۔

شنگیر شنگی را بھائی
کوئی اوہر نیاز ٹھائیں
دودھیر شیشوراکھی نے جتنے رے
کی شیل ماری لی بھائی تیر ندانرے رے

"او میرے ساتھیو اور بھائیو! میرے ہرن سے کہنا کہ وہ دودھ پیتے بچے

کو جتن سے پالے پوسے۔ کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تو نے او بھائی تیر انداز“

جنمیر منتو دیکھا ننا
بلو تارے آ رہے نہ
پھرائی لوسکل سادھ شکاریہ بانے رے
کی شیل ماری لی بھائی تیر ندانے رے

”جنم بھر درشن اور بات چیت اب نہ ہو گی اسے بتا دینا۔
لو اب خاتمہ ہوا سب امنگوں کا رے
کیسے تیکھے تیر سے گھائل کر دیا ہے تو نے
او بھائی تیر ندازے رے

اس بنگلہ گیت نے وہاں سب کو متاثر کیا۔ ایک لمحے کے لئے سب کے چہروں پر سنجیدگی طاری ہو گئی۔ ان میں ہرنی بھی تھی جس کو شکاری کا تیر لگا تھا اور وہ شکاری بھی تھا جس نے ہرنی کو گھائل کیا تھا ہرنی آم کے پیڑ تلے کھڑی تھی۔ کسی طرف سے آیا شکاری؟ ہرن ہرنی کو اکیلا چھوڑ کر چل دیا۔

شبانہ کی آنکھوں کے کنارے آنسوؤں سے بھر گئے۔ وہ اٹھ کر لان کے ٹیرس کے جنگلے کے پاس آ گئی ایئرکنڈیشنڈ کمرے سے نکل کر رات کی کھلی فضاء میں آتے ہی شبانہ کو محسوس ہوا جیسے وہ زخمی ہرنی کے پاس آ گئی ہے اور فضاء اس کی گرم آہوں سے نیم گرم ہے کمرے سے ہارمونیم کی دھیمی دھیمی آواز کے ساتھ کسی اور عورت کے گانے کی آواز آ رہی تھی۔ ہرنی کی فریاد دم توڑ چکی تھی۔

سلہٹ کے آسمان پر مرطوب رات کے ستارے چاندنی کے زیوروں کی طرح چمک رہے تھے۔ اسے بے اختیار پراسرار راحیل کی یاد آنے لگی وہ ستاروں پھولوں بارشوں کا باشندہ تھا۔ یہ اس کے ملک کی چیزیں تھیں۔ مگر وہاں وہ موجود نہیں تھا۔

شبانہ اسے اپنی شادی کی خبر بتانا چاہتی تھی۔ اسی مہینے شبانہ کی شادی ہونے

والی تھی پھر وہ امریکہ چلی جائے گی۔ راحیل کو کیسے خبر ہو گی؟ کیا وہ کبھی اس سے ملنے امریکہ آئے گا نہیں اسے امریکہ آ کر شبانہ کی حالت زار کو نہیں دیکھنا چاہیئے۔ شبانہ آسمان کی طرف تکنے لگی۔ جانے کیوں دور ایک جھلملاتے ستارے کو دیکھ کر شبانہ کو اپنی پیاری سہیلی نجمی کا خیال آ گیا۔

نجمی کی گمشدگی اس کے لئے ایک معمہ بن گئی تھی۔ یہ معمہ ایک اندوہناک حقیقت بھی تھا۔ شبانہ اپنی پیاری اور بدنصیب سہیلی کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ کہاں ہو گی؟ کس حال میں ہو گی؟ شبانہ اس کے بارے میں یہی سوچ سکتی تھی۔ یہ دو ایسے سوال تھے جن کے جواب اس کے پاس نہیں تھے۔

”ہیلو!“ پیچھے سے کسی کی آواز آئی۔

لان کے ٹیرس میں کوئی بتی روشن نہیں تھی۔ یہاں صرف سامنے والے برآمدے میں جلتی بتیوں کی روشنی ہی آ رہی تھی۔ شبانہ نے پلٹ کر دیکھا چٹا گانگ کی میڈیکل اسٹوڈنٹ جہاں آراء اپنی ساڑھی سنبھالتی اس طرف بڑھ رہی تھی۔

”تم یہاں کیوں آ گئیں شبانہ۔ یہاں تو حبس ہے۔“

شبانہ مسکرا دی جہاں آراء اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ دور نیچے سلہٹ شہر کے بنگلوں کی روشنیاں ٹیلے کے نشیب میں ادھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ فضاء میں رات کی رانی کی ایک لہر کسی وقت کسی جانب سے آ کر گزر جاتی تھی۔ شبانہ نے کہا۔

”مجھے نیچرل فضاء زیادہ پسند ہے۔“

جہاں آراء اپنے چھوٹے سے رومال سے ماتھے پر آیا ہوا ہلکا ہلکا پسینہ پونچھتی ہوئی بولی۔

”تم کبھی کبھی یہاں آتی ہو ناں۔ اس لئے۔ ستمبر کی راتیں ادھر بڑی حبس آلود ہوتی ہیں تم لاہور کب جا رہی ہو؟ میں نے لاہور کی بہت تعریف سنی ہے دیکھو میں اتنی بڑی ہو گئی ہوں مگر ابھی تک لاہور نہیں دیکھا۔“

شبانہ نے آہستہ سے اپنی ساڑھی کے پلو کو کاندھے پر درست کیا اور بولی "کبھی آؤ ناں لاہور۔ آج کل تو لاہور میں بڑا اچھا موسم شروع ہو رہا ہے۔"

جہاں آراء نے کہا۔ "میں دسمبر میں آؤں گی ہمیں دسمبر کی چھٹیاں ہوں گی ناں۔"

شبانہ نے اسے یہ کہنا پسند نہ کیا کہ دسمبر میں وہ لاہور میں نہیں بلکہ واشنگٹن میں ہو گی۔ وہ صرف ایک ہلکا سا گہرا سانس بھر کر رہ گئی۔ جہاں آراء کہہ رہی تھی۔

"میں نے سنا ہے تم انگریزی میں ایم اے کر رہی ہو تمہیں بھی تو دسمبر میں چھٹیاں ہوں گی۔ تم دسمبر میں چٹاگانگ آ جاؤ۔ میں تمہیں لینے ایئر پورٹ پر آؤں گی۔

ہمارا بنگلہ بڑی پر فضا جگہ پر ہے ہمارا ایک مکان رانگامانی میں بھی ہے۔ تم آؤ گی تو ہم رانگامانی جانے کا پروگرام بنائیں گے۔ وہاں میرے ڈیڈی کا اپنا جنگل ہے۔" شبانہ نے پوچھا۔

"رانگامانی کہاں ہے؟"

جہاں آراء بولی "چٹاگانگ سے دور پہاڑی علاقے میں ہے وہاں اس کی دوسری طرف دریائے کرنافلی بہتا ہے۔ ساتھ ہی سندربن ہے۔ سندربن کے شیروں کی تصویر تم نے ضرور دیکھی ہو گی۔ زرد دھاری دار شیر اسے بنگال ٹائیگر بھی کہتے ہیں۔ رانگامانی میں چکمہ لوگ رہتے ہیں۔"

شبانہ نے یونہی کہہ دیا۔ "سنا ہے سندربن میں رات کو پریاں اترتی ہیں۔"

جہاں آراء ہنس پڑی۔ "میں میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ بھلا میں اس قسم کی باتوں پر کیسے یقین کر سکتی ہوں۔"

شبانہ نے کہا۔ "مگر میں نے ایک جگہ پڑھا تھا کہ سندربن کی پریاں کرنافلی کے کنارے آ کر نہاتی ہیں اور پھر ساری رات ان کا رقص جاری رہتا ہے۔"

جہاں آراء نے شبانہ کو گردن جھکا کر دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ "کیا تم کو بچوں کی کہانیاں بہت پسند ہیں؟ سندربن میں رات کو پریاں تو نہیں لیکن آدم خور شیر ضرور اپنی کچھاروں سے نکل کر کرنافلی دریا پر پانی پینے جاتے ہیں۔ ہاں سندربن میں چکمہ

قبیلے کے لوگ ضرور رہتے ہیں۔ ان کی عورتیں پورن ماشی کی رات کو آگ کے الاؤ کے گرد ساری رات رقص کرتی رہتی ہیں۔" شبانہ بولی۔

"وہی پریاں ہوں گی۔ پریاں بھی تو عورتیں ہی ہوتی ہیں اور سب عورتیں پریاں ہوتی ہیں کوئی رقص کرتی ہے۔ کوئی خودکشی کرتی ہے۔"

جہاں آراء نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "شاید ایسا ہو مگر تم وعدہ کرو کہ دسمبر میں ہمارے ہاں ضرور آؤ گی۔"

شبانہ خاموش رہی۔ وہ نشیب میں دور کوٹھیوں میں جگمگاتی روشنیوں کو تک رہی تھی جہاں آراء کے لباس سے کسی بڑے قیمتی عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ شبانہ نے پوچھا۔

"تم نے کونسی خوشبو لگا رکھی ہے؟"

جہاں آراء نے شبانہ کا ہاتھ پکڑ کر کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ "بھئی اسے سی میں چلو۔ میرا تو یہاں دم گھٹ رہا ہے۔"

اور شبانہ کو زخمی ہرنی کا گیت یاد آ گیا جہاں آراء اس درد بھرے گیت کو جیسے فراموش کر چکی تھی۔ تین روز سلہٹ میں رہ کر شبانہ اپنے بھائی عقیل کے ساتھ ڈھاکہ روانہ ہو گئی ڈھاکہ میں عقیل کو ایک دن گزارنا تھا۔ یہاں بھی عقیل کی ایک دوست فیملی گلشن کے علاقے میں رہتی تھی۔ یہ بنگلہ فیملی تھی۔

ان لوگوں نے شبانہ کو دریا کی سیر کرائی سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے شبانہ ایک کشتی میں بیٹھ کر دریا کی سیر کو نکل گئی بنگلہ فیملی کی دو عورتیں اس کے ساتھ تھیں۔ غروب ہوتے سورج کی روشنی میں دریا کی لہریں سونے [illegible] رہی تھیں شبانہ کا ڈھاکہ میں جی نہ لگا یہاں کافی رش اور شور تھا۔ رات کو [illegible] میں موسلا دھار بارش ہوئی دوسرے دن صبح صبح کی فلائٹ میں شبانہ کو عقیل بھائی کے ساتھ واپس لاہور جانا تھا۔

بنگلہ فیملی کی گاڑی میں بیٹھ کر وہ لوگ ایئر پورٹ پر آ گئے۔ ڈھاکہ میں پو پھٹنے کا وقت تھا بارش پچھلی رات رک گئی تھی۔ سڑکوں پر کہیں کہیں پانی کھڑا تھا۔ ایئر پورٹ

پر قدرے رونق تھی۔ بنگلہ فیملی الوداع کہہ کر چلی گئی عقیل اور شبانہ لاؤنج میں آ گئے پھر بورڈنگ کارڈ لیا اور جہاز میں آ کر سوار ہو گئے ٹھیک وقت پر جہاز ٹیک آف کر گیا شبانہ کی قسمت میں ایک بار مزید ڈھاکہ آنا لکھا تھا۔ لیکن اس بار شبانہ پر کیا گزرنے والی تھی؟ اس کی شبانہ کو خبر نہیں تھی۔

ڈھاکہ ایئر پورٹ سے اڑان بھرتے ہی پی آئی اے کے جہاز نے ایک چکر لگایا پھر ایک طرف کو جھک گیا پھر سیدھا ہوا۔ ڈھاکہ ایئر پورٹ پر ہمیشہ ایسا ہوتا تھا۔ پھر اس نے اپنا رُخ لاہور کی طرف متعین کر لیا اور ایک خاص رفتار سے پرواز کرنے لگا وقت بھی شاید اسی رفتار سے اڑا جا رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے شبانہ کی شادی کا دن آ گیا۔

ظفر ایک ہفتہ پہلے ہی واشنگٹن سے لاہور آ گیا تھا وہ گردن اکڑائے کینال لاج والے بنگلے کے کمروں میں چلتا پھرتا تھا۔ شبانہ کے مشرقی پاکستان سے لاہور واپس آنے پر وہ اپنی ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں آ گیا جو اس نے شادی کی خاطر کرائے پر لے لی تھی۔ اس کے خاندان والے بھی شہر سے اُٹھ کر اسی کوٹھی میں آ گئے تھے شادی کے نغمے کوٹھی میں گونج اُٹھے۔ سب رسمیں پوری کی گئیں۔ شبانہ کو دُلہن بنانے والی نہ اس کی بہن غزالہ تھی نہ اس کی پیاری سہیلی نجمی ہی وہاں پر تھی۔

پھر شادی کا دن آ گیا۔ شبانہ چپ تھی اسے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اپنے وجود سے نکل کر دُور کھڑی یہ سارا تماشا دیکھ رہی ہے۔ وہ ایک روز پہلے گاڑی لے کر ڈولٹن مارکیٹ والی پرانی لائبریری میں گئی یہاں اس نے پہلی بار پُراسرار راحیل کو دیکھا تھا جافری والی میز خالی تھی۔

میز پر گلاب کا کوئی باسی پھول نہیں تھا وہاں گلاب کی خوشبو سے لپٹی ہوئی پائپ کی خوشبو بھی نہیں تھی کتابوں کی قد آدم الماریاں اپنے سینے میں ہزاروں محبتوں کے الم انگیز واقعات چھپائے خاموش کھڑی تھیں۔ شبانہ بوجھل قدموں سے لائبریری سے نکل کر گاڑی میں بیٹھی اور یونیورسٹی کیمپس والی نہر پر آ گئی لکڑی کے پُل کے قریب

سے نکل کر وہ پرانی کچی کوٹھی کی طرف آ گئی۔ کوٹھی پہلے سے زیادہ ویران لگ رہی تھی اس کے کمروں پر تالے پڑے تھے کوئی چوکیدار بھی شبانہ کو وہاں نظر نہ آیا ایک عجیب طرح کا حسرت ویاس تھا وہاں کی فضاء میں۔ شبانہ دل میں اپنی شکستہ محبت کا درد چھپائے واپس اپنی کوٹھی میں آ گئی تھی۔ اس کے بعد وہ گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔

شام کو ماڈل ٹاؤن سے اس کی بارات آئی شبانہ کے کالج کی سہیلیاں، رشتے دار لڑکیاں اور کینال بینک والے بنگلوں کی خواتین اس کے اردگرد بیٹھی تھیں۔ شبانہ دُلہن بنی ہوئی تھی وہ سر جھکائے بیٹھی تھی جب اسے دُولہا کے ساتھ سجی سجائی کار میں بٹھایا جانے لگا تو شبانہ اپنے ابو کے گلے لگ کر بہت روئی اس کے ابو کی بھی ہچکی بندھ گئی عقیل بھی سر جھکائے آنسوؤں بھری آنکھوں کو لئے خاموش کھڑا تھا وہ جانتے تھے کہ شبانہ نے ان کے لئے کتنی بڑی قربانی دی ہے۔

ظفر امریکی سوٹ میں ملبوس سہرے کی جھالر کو ایک طرف اٹھائے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ لئے کار کے دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ جیسے اس نے کوئی شہر فتح کیا ہو کسی آہن پوش قلعے کو توڑ کر اس کی دیوار پر اپنی فتح کا جھنڈا لہرا دیا ہو۔ شبانہ دُلہن بنی کار میں بیٹھ کر ظفر کے ساتھ ماڈل ٹاؤن کی طرف چل دی اور کینال لاج میں اس کا کمرہ خالی رہ گیا کمرے کی کھلی کھڑکی اپنے دونوں کیواڑ کھولے شبانہ کو آواز دیتی رہ گئی۔

لان کے یوکلپٹس کے درختوں نے اپنی شاخوں کو ہلا ہلا کر شبانہ کو آخری بار الوداع کہا ایک ہفتہ لاہور میں رہنے کے بعد ظفر واپس واشنگٹن چلا گیا شبانہ کو ویزے وغیرہ کی ضروری دفتری کارروائیوں کے بعد امریکہ روانہ ہونا تھا وہ ماڈل ٹاؤن میں اپنے سسرال والوں کے پاس ہی رہی دن میں کسی وقت اس کا بھائی اور ابو اسے ملنے آ جاتے آخر واشنگٹن سے ضروری کاغذات امریکن قونصل والوں کے پاس پہنچ گئے اور دو ہفتوں کے بعد شبانہ اپنے بھائی عقیل کے ساتھ واشنگٹن روانہ ہو گئی۔

امریکہ کی جانب شبانہ کا یہ پہلا سفر تھا اسے نہ امریکہ سے کوئی دلچسپی تھی نہ ظفر

سے جو وہاں اس کا انتظار کر رہا تھا ایئر پورٹ پر اس کے سسرال والے اس کے ابو بھابھی اور کالج کی سہیلیاں بھی موجود تھیں مگر ان میں نجمی نہیں تھی۔ اس روز شبانہ کو نجمی بہت یاد آئی۔

شبانہ ان سب سے رخصت ہو کر آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ جہاز میں سوار ہو کر کراچی کی طرف پرواز کر گئی کراچی میں انہیں پی آئی اے کی انٹرنیشنل فلائٹ کے ذریعے رات کے چار بجے روانہ ہونا تھا رات پونے تین بجے عقیل بھائی اور شبانہ انٹرنیشنل لاؤنج میں آ گئے وہاں کئی غیر ملکی چہرے نظر آئے۔

شبانہ بھائی کے ساتھ ایک کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گئی پھر وہ بھائی کے ساتھ چلتی گیٹ میں سے گزر کر طیارے کی طرف چلنے لگی نومبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا کراچی کی رات خنک تھی پی آئی اے کا جمبو جیٹ اپنے عظیم پر پھیلائے پوپھٹے کے جھٹ پٹے میں رن وے سے ہٹ کر کھڑا تھا جمبو جیٹ میں شبانہ کا یہ پہلا سفر تھا عقیل نے ایئر سک نس کی گولیاں اپنے پاس رکھ لی تھیں اور دو گولیاں اس نے شبانہ کو لاؤنج سے روانہ ہوتے وقت کھلا دی تھیں ٹھیک وقت پر عظیم جمبو جیٹ ٹیک آف کر گیا۔

کراچی سے فرینکفرٹ تک تقریباً سوا سات گھنٹے کی فلائٹ تھی شبانہ کی سیٹ کھڑکی کے پاس ہی تھی عقیل بھائی اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ جہاز اتنی بلندی پر تھا کہ شبانہ کو نیچے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے جہاز خلاء میں رک گیا ہے اور وہ کہیں نہیں جا رہی اسے راحیل کا خیال آ گیا اسے کون بتائے گا کہ شبانہ کی شادی ہو گئی ہے؟

شبانہ نے آنکھیں بند کر کے سر سیٹ کے ساتھ لگا دیا پھر وہ سو گئی دو گھنٹے تک سوئی رہی جب آنکھ کھلی تو باہر دن کی گلابی روشنی پھیلی ہوئی تھی عقیل نے اسے بتایا۔

"ہم خلیج کے ملکوں کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔"

شبانہ نے کھڑکی کے شیشے میں سے نیچے دیکھا۔ اسے سوائے دھندلی دھندلی بھوری اور سیاہ پہاڑیوں کی لکیروں کے اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ جہاز میں اس کی طبیعت

خراب نہیں ہوئی تھی مگر وہ بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی۔ وہ اٹھ کر باتھ روم تک گئی۔ واپس آ کر پھر سو گئی۔ اس کے بعد شبانہ کی آنکھ کھلی تو عقیل بھائی نے کہا۔

"ہم یورپ کے علاقے میں داخل ہو گئے ہیں شبانہ۔"

شبانہ نے کھڑکی میں سے نیچے جھانکا۔ اسے دور بہت دور نیچے شطرنج کی بساط کی طرح چھوٹے چھوٹے کھیت اور کہیں کہیں سرخ چھتوں والے کاٹج نظر آ رہے تھے پھر جہاز میں اعلان ہوا کہ ہم تھوڑی ہی دیر میں فرینکفرٹ کے ایئر پورٹ پر پہنچنے والے ہیں برائے مہربانی حفاظتی پیٹیاں باندھ لیجئے اور سگریٹ بجھا دیجئے شکریہ۔

فرینکفرٹ میں بارش ہو رہی تھی۔ شبانہ جہاز سے نکل کر چھتی ہوئی راہداری میں سے گزرتی ٹرانزٹ لاؤنج میں آئی تو اسے شدید سردی کا احساس ہوا۔ عقیل پہلے بھی کئی بار یورپ اور امریکہ کا سفر کر چکا تھا۔ اس نے پہلے ہی سے شبانہ کے لئے فر کا گرم لمبا کوٹ اور مفلر نکال کر اسے دے دیا تھا۔ ان گرم کپڑوں میں بھی شبانہ کو سردی لگ رہی تھی۔ حیرانی کی بات تھی کہ فرینکفرٹ کا ٹرانزٹ لاؤنج ہیٹڈ نہیں تھا۔ لال چہروں والے مرد اور زرد بالوں والی عورتیں ادھر ادھر چل پھر رہی تھیں۔

شبانہ شیشے کی بلند و بالا دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ بارش میں ایک جہاز پر سامان لادا جا رہا تھا۔ موٹر ٹرالیاں اور نیلے رنگ کی ویگنیں بڑے نظم و ضبط سے آ جا رہی تھیں۔ دیوار کے موٹے شیشے کی وجہ سے شبانہ کو ان موٹر گاڑیوں کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اسے بارش کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ پہلی بار شبانہ بارش کو گرتے دیکھ رہی تھی مگر اس کی آواز نہیں سن رہی تھی۔

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی خاموش فلم دیکھ رہی ہے۔ اس نے بارش کی آواز سے ہمیشہ ہی محبت کی تھی اور یہ آواز اس سے جدا ہو رہی تھی۔ دیوار کے اتنے موٹے شیشے بھی یورپ کی سردی کو روکنے میں ناکام ہو رہے تھے۔ شبانہ کو سردی لگنے لگی۔ عقیل بھائی اسے ایک اسٹال پر لے گئے جہاں انہوں نے گرم گرم کافی پی کافی پینے سے شبانہ کو سکون محسوس ہوا۔ اسے بے اختیار آج سے پانچ سو برس پہلے سے

جرمن کاؤنٹوں کے وہ قدیم قلعے یاد آ گئے جن کی نیم روشن راہداریوں میں خادمائیں بے آواز قدموں سے چلا کرتی تھیں اور جہاں آتشدانوں کے پاس اونچی گدے دار کرسیوں پر بیٹھ کر کاؤنٹ اپنی بیگم کے ساتھ چائے پیتے ہوئے ایرانی قالینوں پر اپنے بچوں کو کھیلتے دیکھا کرتے تھے۔

لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر شبانہ کو انیسویں صدی کے برطانوی شاعر یاد آئے اور اس کا جی چاہا کہ وہ لندن اور مضافات کے قدیم پرسکون قبرستانوں میں جا کر ان شاعروں کی قبروں کو دیکھے کہ کیا آج بھی خزاں میں ان کی تربتوں پر درختوں کے زرد پتے گرتے ہیں۔

لندن سے واشنگٹن تک کا سفر کافی طویل تھا۔ شبانہ آہستہ آہستہ مغربی موسم اور وہاں کی فضا سے مانوس ہوتی جا رہی تھی۔ لاہور سے لندن تک جہاز بھرا ہوا تھا لندن سے آگے جہاز میں بہت کم مسافر رہ گئے۔ انہیں بتایا گیا کہ جہاز نیویارک کے ایئرپورٹ پر شام کے سات بجے پہنچے گا۔ یہ ساری پرواز سمندر کے اوپر تھی۔ شبانہ سو گئی۔ دو ایک گھنٹے سونے کے بعد اس کی آنکھ کھل گئی۔

جہاز کی پرواز جاری تھی۔ دوپہر کا کھانا آ گیا۔ کھانا کھانے کے بعد شبانہ پھر سو گئی اس کے ذہن میں طرح طرح کے خدشے اور اندیشے آ رہے تھے۔ امریکہ پہنچ کر ظفر کا اس کے ساتھ کیسا سلوک ہو گا۔ لاہور میں اس کے ساتھ دو ایک روز گزار کر شبانہ نے محسوس کیا تھا کہ ظفر کا رویہ سرد مہر اور متکبرانہ ہے۔ اس نے بھی ظفر کی خوشامد نہیں کی تھی۔ لیکن اس نے بے تعلقی اور نفرت کا اظہار بھی نہیں کیا تھا۔

امریکہ کا براعظم شروع ہوا تو جگہ جگہ روشنیاں نظر آنا شروع ہو گئیں۔ امریکہ کے وقت کے حساب سے شام کے سات بج رہے تھے کہ جہاز نیویارک کے جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ کی روشنیوں سے جگمگاتی فضاؤں میں آہستہ آہستہ اترنا شروع ہو گیا۔ شبانہ پہلی بار نیویارک کی روشنیوں کو دیکھ رہی تھی۔ یہ سچ مچ روشنیوں کی دنیا تھی جہاز رن وے پر اتر آیا۔

جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ پر ہر طرف روشنیاں ہی روشنیاں تھیں جن میں گورے مردوں اور عورتوں کے ہیولے گھوم پھر رہے تھے۔ شبانہ ان کا مشاہدہ کرتی عقیل بھائی کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ عقیل اسے نیویارک کے بارے میں بتاتا جا رہا تھا۔ یہاں سے انہیں نو بجے ٹی ڈبلیو اے واشنگٹن تک کی فلائٹ مل گئی۔ ٹی ڈبلیو اے اندرونی پرواز والا جہاز چھوٹا تھا۔

شبانہ نے محسوس کیا کہ پی آئی اے کی جو ایئربسیں پاکستان کی اندرونی پرواز کے لئے استعمال ہوتی تھیں وہ ان جہازوں سے زیادہ کشادہ اور آرام دہ تھیں۔ لال لال چہروں والی امریکی ایئرہوسٹس ہر ایک کو دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ مسافروں کو فوم کے تکیے دے رہی تھیں۔ یہ ایک گھنٹے سے بھی کم وقت کی پرواز تھی۔ عقیل بھائی نے شبانہ کو بتایا کہ ڈلیس ایئرپورٹ پر ظفر آیا ہوا ہو گا۔ انہوں نے چلنے سے پہلے ٹیلی گرام بھی دے دیا تھا۔ اور اسے فون بھی کر دیا تھا۔

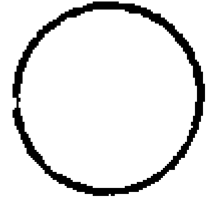
نیویارک ایئرپورٹ سے عقیل بھائی نے ظفر کے واشنگٹن والے مکان پر فون کیا تو کسی امریکی خاتون نے اسے بتایا کہ مسٹر ظفر ایئرپورٹ پر گئے ہوئے ہیں۔ عقیل نے شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔ یہ امریکی خاتون ظفر کی ملازمہ کے سوا اور کون ہو سکتی تھی؟ امریکہ میں ظفر ایسا سرمایہ دار کاروباری آدمی ہی ایک امریکی خادمہ کا بوجھ اٹھا سکتا ہے۔

شبانہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اسے نیچے روشنیاں اس طرح دکھائی دے رہی تھیں جیسے کسی نے ستارے توڑ کر بکھیر دیئے ہوں۔ جہاز واشنگٹن کی ڈلیس ایئرپورٹ پر اتر آیا۔ یہاں لندن کے مقابلے میں زیادہ سردی تھی۔ ظفر لاؤنج کے باہر موجود تھا اس نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر اس نے عقیل بھائی اور شبانہ سے ہاتھ ملایا۔ پھر پوچھا۔

"راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔" شبانہ جواب دینے ہی والی تھی کہ عقیل بھائی بول پڑے۔

"بالکل نہیں بالکل نہیں۔ بڑے سکون سے سفر کٹا۔ کیوں شبانہ؟" شبانہ نے اثبات

میں سر ہلا دیا۔ ظفر اس شان سے آگے آگے چل رہا تھا جیسے وہ عقیل اور شبانہ کو اپنا مقدر علاقہ دکھانے والا ہو۔ اس نے شبانہ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ شبانہ ایک آہ بھر کر رہ گئی۔ خدا جانے اس شہر میں اس کے ساتھ کیا گزرنے والی تھی۔



خزاں کی بارش

بادل ڈکیت



واشنگٹن میں سارا دن بارش ہوتی رہی تھی۔ آسمان اس وقت بھی ابر آلود تھا۔ جب ظفر شبانہ اور عقیل بھائی کو لے کر ایئرپورٹ کی پارکنگ پلیس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شبانہ گرم کوٹ میں تھی اس نے مفلر بھی لپیٹ رکھا تھا۔ پھر بھی اسے اتنی سردی محسوس ہو رہی تھی کہ اس کے دانت بجنے لگے۔ پارکنگ پلیس میں ہزاروں گاڑیاں کھڑی تھیں ظفر کی شیورلیٹ بڑی گاڑی کافی دور کھڑی تھی۔

گاڑی کی فضا باہر کی نسبت گرم تھی۔ شبانہ سمٹ کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی ظفر نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا، "آج یہاں کافی سردی ہے برف کا سیزن شروع ہوچکا ہے۔"

اس نے گاڑی کا ہیٹر آن کر دیا۔ گاڑی پارکنگ پلیس سے نکل کر ایئرپورٹ کی حدود سے باہر آئی تو شبانہ کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ آتشدان کے پاس بیٹھی ہے سردی کا احساس ختم ہو گیا تھا گاڑی واشنگٹن کی کشادہ سڑک پر دوڑی جا رہی تھی۔ ظفر کا تھری بیڈ روم والا گارڈن ہاؤس فالز چرچ کے علاقے میں سیون کارنر کے عقب والے علاقے میں تھا۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے انہیں تقریباً پون گھنٹہ لگ گیا۔ سارے راستے میں روشنیاں تھیں گاڑی دریائے پوٹامک کے ساتھ ساتھ چلنے لگی تو ظفر نے شبانہ کو بتایا کہ یہ واشنگٹن کا پوٹامک دریا ہے۔

سیون کارنر کا بہت بڑا چوک آیا تو شبانہ نے دیکھا کہ سات جانب سے سڑکیں آکر وہاں مل رہی تھیں ٹریفک سگنلز کا ایسا انتظام تھا کہ کسی گاڑی کو وہاں دو منٹ سے زیادہ نہیں رکنا پڑتا تھا سیون کارنر والے چوک سے نکل کر ظفر نے گاڑی

ولسن بلیوارڈ پر ڈال دی۔ دائیں بائیں بلند و بالا ہائی رائیز عمارتیں دیکھ کر شبانہ کو عجیب سا احساس ہوا۔ ٹاؤن ہاؤسز اور دوسری عمارتوں کے اپارٹمنٹ روشنیوں سے جگمگا رہے تھے۔ ان سڑکوں پر دکانیں نہیں تھیں۔ کچھ ریستوران شبانہ نے دیکھے جن کے نیون سائنز جھلملا رہے تھے۔ ولسن بلیوارڈ پر آنے کے تھوڑے ہی دیر بعد ان کے بائیں جانب کیولرز اپارٹمنٹ کی ہائی رائیز بلڈنگ آ گئی یہاں سے ظفر نے گاڑی کو میکنلے انٹرسیکشن سے دائیں جانب موڑ لیا یہ سیون کارنرز اپارٹمنٹس والی سڑک تھی جو گھوم کر آگے روٹ سیون میں مل جاتی تھی۔ یہاں ایک طرف سیون کارنرز ڈیپارٹمنٹل اسٹورز کی دو منزلہ عمارت تھی دوسری جانب سیف وے فوڈ اسٹور تھا۔

یہاں سے چوک پار کیا تو بائیں طرف روشنیوں میں گارڈن ہاؤسز شروع ہو گئے یہ باغیچوں میں گھرے ہوئے کاٹیج ٹائپ کے خوبصورت مکان تھے جن کی چھتیں ڈھلوان تھیں۔ ایسے میں ایک خوبصورت اور کشادہ باغیچے والے گارڈن ہاؤس میں ظفر نے گاڑی موڑ دی گاڑی گیٹ کے اندر جا کر سیدھی چھتے ہوئے گیراج میں رک گئی۔

ایک نیگرو ملازم نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور شبانہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے اسے یو آر ویل کم لیڈی کہہ کر اس کا خیر مقدم کیا شبانہ کو ساتھ لئے بڑی شان سے اٹھلا اٹھلا کر چلتا ہاتھ میں چابیاں گھماتا ظفر گارڈن ہاؤس کا پہلے جالی دار دروازہ اور پھر دوسرا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

مکان کی فضاء نیم گرم تھی یہ سنٹرلی ہیٹڈ تھا جیسا کہ واشنگٹن کے سبھی اپارٹمنٹ ہاؤسز، کاٹیج اور اسٹور ہوتے ہیں۔ سٹنگ روم خالص امریکی انداز میں سجایا گیا تھا۔ شبانہ نے ایسے کمرے امریکی فلموں میں بہت دیکھ رکھے تھے فضاء میں کسی پرفیوم کی ہلکی ہلکی مہک رچی ہوئی تھی دبلی پتلی نیگرو خادمہ ایپرن باندھے جلدی سے سٹنگ روم میں آ گئی۔ وہ پورے دانت کھولے مسکرا رہی تھی اس نے بھی شبانہ کو گرمجوشی سے خوش آمدید کہا عقیل بھائی صوفے پر دراز ہو گئے۔

"سوزن! کھانا لگا دیا گیا؟"

"یس مسٹر احمد۔"

اور وہ تیزی سے ڈائننگ روم کی طرف گھوم گئی ظفر نے عقیل کی طرف دیکھ کر کہا "بھائی جان آپ کو بیڈ روم بتانے کی ضرورت نہیں وہی بیڈ روم جہاں آپ پہلے بھی آ کر ٹھہرا کرتے ہیں۔" اور عقیل مسکرا دیا۔

"ہاں۔۔۔ ارے یہ تو مجھے اپنے گھر کی طرح یاد ہے۔ شبانہ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے ناں؟"

شبانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں بھائی۔" ظفر نے شبانہ کی طرف دیکھا کہنے لگا۔

"جیٹ کا اثر ہوتا ہے رات آرام کرو گی تو طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی آؤ کھانا کھا لیں۔"

شبانہ کو واقعی بھوک نہیں تھی اس کو ہلکے ہلکے چکر آ رہے تھے اس نے کہا۔ "میرے سر میں درد ہے اور بھوک بھی نہیں آپ لوگ کھا لیں میں آرام کروں گی۔"

ظفر نے قدرے ترش روئی سے کہا۔ "اور یہ میں نے جو اتنا کھانا پکوا رکھا ہے وہ کون کھائے گا۔"

عقیل نے بھی ظفر کے لہجے کی سختی کو محسوس کیا جلدی سے بولا۔ "چلو شبو ظفر ٹھیک کہتا ہے بھئی اس نے تو اتنے شوق سے تمہارے لئے کھانا بنوایا ہے آج ذرا امریکی کھانا بھی تو کھا کر دیکھو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

شبانہ جھکے سے اٹھ کر ظفر کے ساتھ ڈائننگ روم میں آ گئی۔ آبنوسی رنگ کی بیضوی میز پر قسم قسم کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ کینڈل لائٹس روشن تھیں۔ خادمہ سوزن ایک طرف کھڑی تھوڑا تھوڑا مسکرا رہی تھی۔ شبانہ نے اس گارڈن ہاؤس میں داخل ہوتے ہوئے محسوس کیا تھا کہ وہاں کی فضاء بند بند سی ہے اور پرفیوم کی مہک کے ساتھ گرم مسالوں کی خوشبو بھی پھیلی ہوئی ہے ایسا لگتا تھا کہ یہ خوشبوئیں باہر نہیں نکل رہیں اور ان کی وجہ سے ڈائننگ روم کی فضاء خاصی بوجھل تھی۔ شبانہ کا

جی چاہا کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے باہر کھلی ہوا میں نکل جائے یا کھڑکی کھول دے مگر وہاں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ شیشے کی ریلنگ والا دروازہ ضرور تھا جو باہر باغیچے میں کھلتا تھا مگر اس وقت اس پر بھاری پردہ گرا ہوا تھا۔

ظفر سب سے پہلے ڈائننگ ٹیبل کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا امریکہ میں اتنے برس گزارنے کے باوجود بھی وہ ادب و آداب سے بے بہرہ ہی تھا۔ مگر شبانہ نے محسوس کیا کہ اس نے جان بوجھ کر پہلے شبانہ کے بیٹھنے کا انتظار نہیں کیا۔ کیا وہ اسے ذلیل کرنا چاہتا تھا؟ شبانہ انہی خیالوں میں الجھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ بلوریں گلاس میں سے ایپرن نکال کر شبانہ نے اپنی گود میں رکھ لیا۔

ظفر نے مسکرا کر جیسے طنزیہ انداز میں کہا۔ "یہ انگریزوں کا ایٹی کیٹ ہے امریکہ میں نہیں چلتا یہاں تو ٹیشو پیپر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔"

اور ظفر نے تیزی سے دو تین ٹیشو پیپر اٹھا کر ان سے اپنے ہونٹ پونچھے۔ انہیں گولا سا بنا کر کوڑے والے ٹریش بیگ میں پھینکا اور سوزن کو کھانا بڑھانے کا اشارہ کیا عقیل بولا۔

"ظفر بھائی تم نے تو پلاؤ بھی پکوا رکھا ہے۔ میرا خیال ہے سوزن اب پاکستانی کھانے پکانے میں ماہر ہو گئی ہے۔"

سوزن اپنا نام سن کر مسکرانے لگی ظفر نے کہا۔ "یہ کہاں پلاؤ پکا سکتی ہے اس کی بڑی بریفنگ کی ہے پھر بھی نہیں پکا سکی۔ اب شبانہ آ گئی ہے یہ خود ہی پکایا کرے گی میں تو امریکی کھانے کھا کھا کر تنگ آ گیا ہوں۔"

شبانہ اپنی پلیٹ میں چمچے سے پلاؤ ڈال رہی تھی وہ سوچنے لگی کیا وہ پلاؤ پکا سکے گی؟ اس نے گھر پر کبھی کچھ نہیں پکایا تھا ہاں چائے یا آملیٹ ضرور بنا لیتی تھی اس نے نوکروں اور خانساموں میں آنکھ کھولی تھی جب کہ ظفر نے لاہور کے اندر جس مکان میں آنکھ کھولی تھی وہاں اس کی والدہ چولہے کے آگے بیٹھ کر روٹیاں اور ساگ پکاتی تھی اور ظفر وہیں پیڑھی پر بیٹھ کر کھایا کرتا تھا۔ شبانہ نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح پلاؤ پکانا سیکھ لے گی آخر وہ عورت تھی اور ہر عورت میں کھانا پکانے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔

ظفر نے تھوڑا سا پلاؤ کھانے کے بعد پلیٹ پرے رکھ دی اور ٹشو پیپر سے ہونٹ پونچھتے ہوئے بولا۔ "سوزن ساری زندگی پلاؤ نہیں پکا سکتی۔" وہ چونکہ پنجابی میں بات کر رہا تھا اس لئے سوزن نہ سمجھ سکی مگر اپنا نام سن کر مسکرا دی وہ سمجھی کہ شاید اس کے کھانے کی تعریف کی جا رہی ہے کونے میں کیبنٹ پر رکھے ٹیلیویژن پر ایک سنہری بالوں والی خوبصورت عورت مسکراتے ہوئے خبریں پڑھ رہی تھی۔

ظفر نے مرغ روسٹ کی ایک ٹانگ اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے سوزن کی طرف دیکھا اور کہا "ہنی اسے چینل فور لگاؤ۔"

سوزن ٹیلی ویژن سیٹ کے پاس گئی اور چینل فور لگا دیا وہاں فینسی ڈریس میں ملبوس نیگرو اور گوری امریکی لڑکیاں میوزک کی دھن پر تھرک تھرک کر رقص کر رہی تھیں ظفر بھی رقص کی دھن پر سر دھننے لگا روسٹ مرغ ٹانگ پر ٹومیٹو ساس ڈالتے ہوئے بولا۔ "میوزک تو امریکہ میں ہے بس۔ ایک دم سے خون گرم ہو جاتا ہے۔"

شبانہ خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ وہ ایک نوالے کو چار حصوں میں تقسیم کر کے کھا رہی تھی۔ اس کا سر ابھی تک چکرا رہا تھا۔ عقیل بھائی ظفر کے ساتھ اس کے کاروبار کے بارے میں گفتگو کرنے لگا تھا۔ ظفر اسے بتا رہا تھا کہ میں نے ایک اور اسٹیٹ ایجنسی میں شیئر خرید لئے ہیں۔ شبانہ نے اپنے چھوٹے بھائی عامر کے بارے میں پوچھا تو ظفر نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"سان فرانسسکو میں ہے۔ بڑے مزے میں ہے خوب پڑھائی کر رہا ہے۔ میں اسے ہر ماہ ہزار ڈالر بھیج دیتا ہوں۔ کبھی کبھی فون بھی آ جاتا ہے۔"

شبانہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "کیا میں اسے یہاں سے فون کر سکتی ہوں"

ظفر نے پلٹ کر شبانہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ اور بے تاثر

عادی تھا۔ بولا ”پہلے کھانا تو کھالو۔ کھانا میں نے تمہارے لئے بنوایا ہے۔“

عقیل نے فوراً مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بھئی ظفر ہمیں تو کھانا بہت مزے دار لگا۔“

شبانہ کو اپنے بھائی کی بے بسی پر رونا آگیا۔ وہ ظفر کے سخت رویے کو سمجھ رہا تھا مگر اپنی بہن کی وجہ سے اور اس بھاری رقم کی وجہ سے جو شبانہ کے بھائی اور والد نے ظفر سے قرض لے رکھی تھی، اس کی خوشامد کرنے پر مجبور تھا۔ کھانے کے بعد کافی آگئی۔ کافی پینے سے شبانہ کی طبیعت قدرے سنبھل گئی۔

ظفر اندر اُٹھ کر کارنر ٹیبل کی طرف گیا اور وہاں سے ٹیلیفون اور چھوٹی نوٹ بک اُٹھا کر شبانہ کے سامنے رکھ کر بولا۔ ”بھائی کو فون کر لو۔ فکر نہ کرنا۔ چاہے ایک گھنٹے تک بات کرو۔ یہ لاہور نہیں ہے۔“

عقیل کافی کی پیالی اُٹھا کر صوفے پر جا بیٹھا۔ وہ خاموش تھا۔ اس کے دل پر اپنی بہن کے بارے میں جو گزر رہی تھی وہ اس کا ذکر کسی سے نہیں کر سکتا تھا۔ نہ ظفر سے نہ شبانہ سے اور نہ اپنے والد صاحب سے۔ ظفر نے نوٹ بک میں سے وہ صفحہ کھول کر شبانہ کے سامنے کر دیا جس پر اس کے بھائی عامر کا ٹیلیفون نمبر لکھا تھا۔

”پہلے یہ نمبر ڈائل کرنا۔ یہ لانگ ڈسٹینس کال ہے پھر یہ عامر کا نمبر ہے۔“

شبانہ کا جی چاہا کہ وہ نوٹ بک بند کر کے پرے پھینک دے اور عامر کو فون نہ کرے۔ مگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے نمبر ڈائل کئے۔ دوسری طرف سے گھنٹی کی آواز آنے لگی۔ پھر کسی نے انگریزی میں کہا۔ ”عامر ہیئر۔“

بھائی کی آواز سن کر شبانہ کی آنکھوں میں ایک دم سے آنسو آ گئے مگر وہ انہیں باہر نہیں لا سکتی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”عامر! میں شبو بول رہی ہوں۔ ہاں۔ وعلیکم السلام ہاں ہاں ہم ابھی تھوڑی دیر ہوئے آئے ہیں۔ عقیل بھائی بھی ساتھ ہیں۔ ابو بالکل ٹھیک ہیں۔ تم کیسے ہو اچھا۔ خدا کا شکر ہے لو بھائی جان سے بات کرو۔“

شبانہ نے عقیل بھائی کو فون دے دیا۔ ظفر صوفے پر بیٹھا کافی پیتے ہوئے ایسی

نظروں سے عقیل اور شبانہ کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے کوئی آقا اپنے غریب رشتہ داروں کو دیکھتا ہے۔ سوزن نے جھک کر ظفر سے کہا۔ ”میں نے بیڈ روم سیٹ کر دیا ہے اب میں جا رہی ہوں۔“

ظفر نے کافی کی پیالی ملازمہ سوزن کو دیتے ہوئے کہا ”او کے سوزن گڈ نائٹ۔“

سوزن بھی گڈ نائٹ کہہ کر کچن کی طرف چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد یہ دُبلی پتلی نیکھی نیلی آنکھوں والی نیگرو لڑکی گیراج سے اپنی کار نکال کر اپنے اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہو گئی عقیل، ظفر کے پاس آکر بیٹھ گیا اور باتیں کرنے لگا۔ شبانہ اپنے بھائی سے فون پر گفتگو کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”ضرور عامی ضرور۔ تم دو ایک دن کے لئے میرے پاس آجاؤ۔“

ظفر نے وہیں سے آواز بلند کر کے کہا۔ ”اس کی پڑھائی کا جو حرج ہوگا۔“

عقیل خاموشی سے ٹیلیویژن پر رقص کرتی عورتوں کو دیکھتا رہا۔

شبانہ کے چہرے کی بشاشت غائب ہو گئی۔ اس نے اپنے خاوند ظفر کا جملہ سن لیا تھا۔ ہلکا سا سانس بھر کر بولی۔ ”تمہاری پڑھائی کا حرج ہوگا عامی۔ تم چھٹیوں میں آ جانا۔ میں تو اب یہیں ہوں۔“

پھر شبانہ نے فون بند کر دیا۔ وہ سست قدم اٹھاتی آئی اور صوفے پر بیٹھ گئی ظفر نے کہا۔ ”آؤ میں تمہیں بیڈ روم دکھاتا ہوں۔ تم تھکی ہوئی ہو جا کر آرام کرو۔“

ظفر شبانہ کو بیڈ روم میں لے گیا۔ ڈبل بیڈ والا یہ کمرہ کسی تیز پرفیوم سے مہک رہا تھا۔ اسی پرفیوم کی وجہ سے بیڈ روم کی فضا بوجھل ہو رہی تھی۔ کلوزٹ میں سے ظفر نے شبانہ کا اٹیچی کیس نکال کر پلنگ پر رکھ دیا اور کلوزٹ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”یہاں کپڑے ٹانگنے اور سوٹ کیس اور جوتے وغیرہ رکھنے کے لئے اس قسم کے کلوزٹ ہوتے ہیں۔ کپڑے اور جوتے باہر مت یونہی ڈال دیا کرنا۔ اب تم کپڑے تبدیل کر کے لیٹ جاؤ۔“

بیڈ روم میں بھی ایک چھوٹا سا کلر ٹی وی میز پر رکھا ہوا تھا۔ ظفر نے میز پر سے

ریموٹ کنٹرول اٹھا کر اس کا بٹن دبا دیا۔ ایک زوردار جھنکار کے ساتھ ٹی وی پر یکدم لڑکیوں کا رقص شروع ہو گیا۔ شبانہ نے کہا۔

"ذرا آواز کم کر دیں پلیز!"

ظفر نے ٹی وی آف کر دیا اور ریموٹ کنٹرول پلنگ کی سائڈ ٹیبل پر پھینک کر بولا۔ "یہ امریکہ ہے۔ یہاں تیز میوزک کو پسند کیا جاتا ہے۔ تیز بولنے والوں کو پسند کیا جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر ظفر کمرے سے نکل گیا۔ شبانہ اٹیچی کیس میں سے کپڑے نکالنے لگی۔ ظفر سے وہ ایسے ہی رویے کی توقع کر رہی تھی۔ اس کا دل ضرور بھر آیا مگر وہ ایک مشین کی طرح کپڑے نکال کر پلنگ پر رکھتی گئی۔ اس نے حالات سے پوری طرح سمجھوتہ کر لیا تھا اور اپنے سینے پر پتھر رکھنے کے لئے تیار ہو کر ظفر کے پاس آئی تھی۔ اس نے عہد کر رکھا تھا کہ وہ ہر قسم کا ظلم و ستم برداشت کرے گی مگر زبان سے اُف تک نہ کرے گی اور کبھی اپنے ابو اور بھائی کو اپنے دل کے زخم نہیں دکھائے گی۔

عقیل بھائی اپنے بیڈ روم میں جا کر سو گئے۔ ظفر نے نائٹ ڈریس یا سلیپنگ سوٹ پہنا اور سبز شربت کا گلاس لے کر شبانہ کے پاس آ گیا۔ شبانہ نے ظفر کے ہاتھ میں سبز رنگ کا مشروب دیکھا تو سمجھ گئی کہ اس میں کیا ہے۔ وہ بستر میں لیٹی سونے کی کوشش کر رہی تھی مگر اجنبی۔۔ بالکل ہی اجنبی جگہ اور بند بیڈ روم ہونے کی وجہ سے اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے شیشوں میں سے یوکلپٹس کے درخت دیکھنا چاہتی تھی مگر یوکلپٹس کے درخت بہت پیچھے رہ گئے تھے۔

ظفر نے بیڈ روم کا دروازہ لاک کیا اور پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا۔ گلاس اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھا اور ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا کر ٹیلی ویژن آن کر دیا۔ ٹیلی ویژن پر کوئی انگریزی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ وہ مشروب کے گھونٹ بھرنے لگا۔ پھر شبانہ کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"یہ یہاں کے عام مشروب ہیں اگر تم بھی چاہو تو پی سکتی ہو۔ یہاں اسے برا نہیں سمجھا جاتا۔ یہ لاہور نہیں ہے امریکہ ہے۔"

شبانہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ ظفر کی نگاہیں ٹی وی پر جمی تھیں پھر اس نے گلاس میز پر رکھ دیا اور سلیپنگ سوٹ کی جیب میں سے سفید رنگ کا مڑا تڑا رومال نکالا اسے شبانہ کی طرف پھینک کر بولا۔ "اسے باتھ روم میں جا کر صابن سے اچھی طرح دھو کر استری کر دو۔ میں یہاں ٹشو پیپر زیادہ استعمال نہیں کرتا۔"

شبانہ جلدی سے اٹھی۔ رومال لے کر باتھ روم میں چلی گئی۔ وہ صابن سے رومال دھو رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ اس نے آنکھوں پر پانی کا چھینٹا مارا اور اپنے دل سے کہا۔ "نہیں۔ آنسو نہیں بہانا۔ کچھ بھی گزر جائے اپنے خاوند کی خدمت کرنی ہے۔ اب یہی تیری زندگی کا مقصد ہے۔"

بیڈ روم کے کونے میں اسٹینڈ پر استری پڑی تھی۔ شبانہ سوئچ اون کر کے گیلے رومال پر استری پھیرنے لگی تو ظفر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "سٹیم کا بٹن مت دبانا یہ امریکی استری ہے۔ معلوم ہے سٹیم کا بٹن کہاں ہے؟ ٹھہرو میں تمہیں بتاتا ہوں۔"

ظفر مشروب کا سارا گلاس ختم کر چکا تھا۔ وہ بستر سے اٹھ کر شبانہ کے پاس آیا۔ استری کے ایک بٹن پر انگلی رکھ کر بولا۔ "یہ سٹیم کا بٹن ہے۔ اس کو دباؤ تو اندر سے اپنے آپ کپڑے کو نم ملنے لگتا ہے۔ رومال بہت گیلا ہے۔ اس کو ذرا نہیں پڑا رہنے دو۔ تم گھر میں اس طرح گیلے کپڑوں پر ہی استری کیا کرتی تھیں؟"

شبانہ نے کہا۔ "میں نے سوچا رومال ہے جلدی سوکھ جائے گا۔"

ظفر خالی گلاس لے کر بیڈ روم کے دروازے کی طرف بڑھا۔

"رومال ہے تو کیا ہوا۔ داغ پڑ گیا تو کون ذمہ دار ہوگا۔" وہ بیڈ روم سے نکل گیا۔ شبانہ رومال کو ہوا میں لہرا کر سکھانے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں ظفر واپس آ گیا۔ اس کا گلاس سبز مشروب سے بھرا ہوا تھا۔ آتے ہی اس نے شبانہ کی طرف دیکھا اور بولا۔

"بس بس اب لاہور کی طرح اسے ہوا میں مت سکھاؤ۔ کر دو استری۔ مجھے رومال جلدی چاہیے۔"

شبانہ رومال استری کر کے پلنگ پر آ گئی۔ اس نے رومال ظفر کی طرف بڑھایا۔

اور ذرا سا مسکرا کر بولی "آپ پرفیوم کون سا لگاتے ہیں۔"

ظفر نے ٹی وی بند کر کے ریموٹ کنٹرول ہاتھ سے رکھ دیا اور سگریٹ سلگا کر سر پلنگ کی پشت سے لگا دیا۔ سگریٹ کا ہلکا سا کش لگا کر بولا۔ "تمہیں اچھا لگا یہ سینٹ؟"

ہاں۔ شبانہ نے با دل نخواستہ کہا۔ حالانکہ جو پرفیوم ظفر نے چلو بھر بھر کر اپنی گردن اور چہرے پر لگا رکھی تھی اس کی وجہ سے بیڈ روم کی فضا بے حد بوجھل ہو رہی تھی اور شبانہ کا سر درد کرنے لگا تھا۔ عقیل بھائی کے سامنے تو ظفر نے پھر بھی شبانہ کے ساتھ نسبتاً بہتر سلوک کیا لیکن جب وہ واپس پاکستان چلے گئے تو ظفر نے شبانہ کے ساتھ نوکروں ایسا سلوک شروع کر دیا۔

وہ بات بات پر شبانہ کو طنز کرتا۔ اس کی تعلیم کا مذاق اڑاتا۔ شبانہ انگریزی پڑھ لکھ سکتی تھی مگر اسے انگریزی میں بات کرنے کی مشق نہیں تھی۔ علاوہ ازیں امریکہ میں بولی جانے والی انگریزی شبانہ کی سمجھ میں کم آتی تھی۔ ظفر طنزیہ لہجے میں کہتا۔ "تم نے پندرہ جماعتیں نقل مار کر پاس کی ہیں کیا فائدہ تمہارے کینیرڈ کالج میں پڑھائی کرنے کا جب تم انگریزی آسانی سے نہیں بول سکتیں۔"

ظفر اپنے رومال اور بنیان قمیض تولیے شبانہ سے دھلواتا۔ وہ اس سے بوٹ بھی پالش کرواتا۔ سوزن کے ہوتے ہوئے بھی شبانہ کی یہ ڈیوٹی لگا دی گئی تھی کہ وہ خود پلنگ پر بستر لگائے۔ پہلے دن شبانہ ٹھیک طرح سے پلاؤ نہ بنا سکی تو ظفر نے مشروب پی کر اسے سخت برا بھلا کہا۔

"تمہیں کسی نے کھانا پکانا نہیں سکھایا؟ کیا کرتی رہی ہو تم اپنے گھر میں؟ بس سرخی پاؤڈر لگا کر گاڑی میں سیر سپاٹے ہی کرتی رہی ہو؟"

ایک رات ظفر نے مشروب پی کر شبانہ کو لاہور والی وہ شام یاد دلائی جب اس نے ظفر کو "شٹ اپ" کہا تھا اور منگنی کی انگوٹھی واپس پھینک کر چلی گئی تھی۔ پہلے تو وہ زہریلے انداز میں بولتا رہا اس کے بعد اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ پھر وہ پلنگ سے اتر کر قالین پر بے چینی اور غصے کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ وہ ساتھ ساتھ نفرت بھرے انداز میں بڑ

بڑا رہا تھا۔ "اگر اتنا غرور تھا تو پھر باپ سے کہہ دینا تھا کہ وہ مجھ سے دس لاکھ روپے قرض نہ لے۔ میرے ساتھ شادی کرنے سے انکار کیوں نہیں کر دیا پھر؟ کہاں گئی تھی تمہاری وہ اکڑی ہوئی گردن؟"

ظفر شبانہ کی بے عزتی کرتا رہا اور شبانہ سر جھکائے روتی رہی۔ آنسو بہاتی رہی۔ اس پر ظفر غضبناک ہو گیا اس نے شبانہ کو بالوں سے پکڑ کر بستر پر گرا دیا اور اس کی گردن دباتے ہوئے چلایا۔ "آنسو بہا کر مجھے ظالم ثابت کرنا چاہتی ہو؟ ہیں؟ بولو؟ کیا میں ظالم ہوں؟ فون کروں تمہارے باپ کو لاہور؟"

شبانہ کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ ظفر نے جھٹک کر اسے پرے گرا دیا اور پلنگ کے بجائے نیچے قالین پر ہی چادر بچھا کر لیٹ گیا اور شبانہ کے باپ اور بھائیوں کو برا بھلا کہنے لگا اس نے عامر کو بھی گالیاں دیں کہ اس کے ٹکڑوں پر سان فرانسسکو میں پل رہا ہے۔ شبانہ پلنگ پر بت بنی بیٹھی سب کچھ سنتی رہی۔ وہ اونچی آواز میں رو بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے رونے سے ظفر مشتعل ہو جاتا تھا۔

شبانہ نے اپنا ہونٹ دانتوں تلے دبا رکھا تھا اور اپنی ہچکیوں کو روکے دم سادھے تھی واشنگٹن کی رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا چلا گیا۔ لاہور سے باپ اور بھائی کا خط آتا تو شبانہ جواب میں یہی لکھتی کہ وہ واشنگٹن میں بڑی خوش ہے۔ ظفر اس کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ ہفتے میں دو ایک بار سان فرانسسکو سے عامر بھائی کا بھی فون آ جاتا لیکن شبانہ کو اجازت نہیں تھی کہ وہ عامر کو فون کرے۔ شبانہ کو اذیت دینے کا یہ بھی ایک طریقہ تھا۔

ظفر نے اسے ملازمہ سوزن اور نیگرو خادم سے بھی زیادہ بات کرنے سے منع کر رکھا تھا شبانہ کو صرف اتنی اجازت تھی کہ وہ دن میں ایک آدھ بار قریبی اسٹور میں جا کر سودا سلف خرید لے۔ وہ اکیلی گھومنے پھرنے یا علاقے کے روز گارڈن میں سیر کے لئے بھی نہیں جا سکتی تھی۔ ظفر سارا دن اپنے کاروبار کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتا۔ کبھی کبھی وہ آدھی رات کو لڑکھڑاتا ہوا گھر میں داخل ہوتا۔ شبانہ اسے سنبھالنے کی کوشش کرتی

تو وہ اسے گالیاں دینی شروع کر دیتا۔ ایک رات وہ اپنے ساتھ ایک امریکی عورت کو لے آیا دونوں بیڈروم میں بیٹھے قہقہے لگاتے رہے اور شبانہ کچن میں ان کے لئے ویفر تیار کرتے ہوئے چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی۔ پھر ظفر کا یہ معمول بن گیا۔ وہ کسی نہ کسی امریکی خاتون کو گھر میں لے آتا اور شبانہ سے اس کی خدمت کرواتا۔

چھٹیوں میں عامر تین دن کے لئے سان فرانسسکو سے شبانہ کے پاس آیا تو اس کی آنکھوں میں پڑے ہوئے حلقوں کو دیکھ کر بولا۔ "آپی۔ کیا تم بیمار رہی ہو؟"

شبانہ نے مسکراتے ہوئے عامر کے سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور بولی۔ "نہیں تو میں بیمار کیوں ہونے لگی؟ ظفر میرا اتنا خیال رکھتے ہیں پھر میں کیوں بیمار ہونے لگی؟"

ظفر کو عامر کا وہاں رہنا پسند نہیں تھا وہ اسے کئی بار کہہ چکا تھا کہ تمہیں وہیں رہ کر پڑھائی کرنی چاہیئے تھی۔ تمہاری پڑھائی بڑی مہنگی ہے۔ تم پر ڈالر خرچ ہو رہے ہیں۔ عامر خاموش رہا شبانہ بھی چپ رہی۔ وہ کوئی جواب نہیں دے سکتے تھے۔ عامر بیچارہ تو صرف تین دنوں کے لئے اپنی بہن کے پاس آیا تھا اور وہ بھی چھٹیوں میں۔ لیکن ظفر نے ایک بار مشروب والی حالت میں عامر کے سامنے بھی شبانہ کی بے عزتی کر دی۔

عامر کو بے حد صدمہ ہوا۔ اگلے روز شبانہ نے عامر سے کہا۔ "ظفر صاحب کبھی کبھی موڈ میں ہوں تو بہک جاتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ تم ان کی باتوں کو دل میں نہ لگانا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

عامر واپس جانے لگا تو شبانہ اسے چھوڑنے نیشنل ایئرپورٹ پر گئی۔ اس نے عامر کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ "مجھ سے وعدہ کرو کہ جو کچھ تم نے یہاں دیکھا یا سنا ہے اس کا ذکر عقیل بھائی اور ابوجان سے نہیں کرو گے کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ ظفر صاحب مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ میرا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ بس کبھی کبھی بہک جاتے ہیں اور کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ تم اس کی وجہ سے ابوجان کو پریشان کرو۔"

عامر کا چہرہ فکرمند تھا۔ اس نے شبانہ سے وعدہ کیا کہ وہ کسی سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ عامر کا جہاز ٹیک آف کر گیا تو شبانہ نے آنکھیں بند کر کے اپنے پیارے

بھائی کی سلامتی کی دعا مانگی اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔۔؟

وقت واشنگٹن میں بھی گزر رہا تھا اور وقت کلکتے میں بھی گزر رہا تھا۔ واشنگٹن میں شبانہ ایک شریف اور وفادار بیوی بن کر دکھ کے دن گزار رہی تھی اور کلکتے میں نجمی ایک طوائف کی حیثیت سے الم انگیز حالات سے گزر رہی تھی۔ خوشی اور سکھ نہ وفادار عورت کے دامن میں تھا اور نہ ہرجائی عورت کی قسمت میں تھا۔ دونوں مختلف ماحول میں اپنی اپنی قسم کے دکھ جھیل رہی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ شبانہ صبر شکر کر کے بیٹھی تھی جبکہ نجمی کے دل میں اپنے قاتلوں سے خونی انتقام لینے کا لاوا کھول رہا تھا۔

ابھی تک یہ لاوا نجمی کے سینے کے اندر ہی اندر ابل رہا تھا۔ اسے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اگرچہ نجمی نے وہاں سے فرار ہونے کے خیال کو ایک خاص مدت تک یعنی اپنے دشمنوں سے بھیانک انتقام لینے تک ملتوی کر دیا تھا پھر بھی وہ باہر نکلتی تو لکھی بائی کے آدمی پستول جیب میں چھپائے سائے کی طرح نجمی کے ارد گرد منڈلاتے رہتے تھے۔ لکھی بائی اس لئے بھی نجمی کے بارے میں محتاط تھی کہ بدمعاش موجمدار نے اسے بتا دیا تھا کہ نجمی پاکستان سے اغوا کر کے لائی گئی تھی اور وہ یہاں پاکستانی سفارت خانے میں پناہ حاصل کرنے کی کوشش کر سکتی ہے۔

نجمی لکھی بائی کے لئے لکشمی دیوی بن کر آئی تھی۔ وہ اب تک نجمی کی وجہ سے لاکھوں روپے کروڑ پتی سیٹھوں سے ہتھیا چکی تھی اور اب وہ اس کا سودا بھاری رقم کے عوض کسی راجہ سے کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی۔

نجمی کو لکھی بائی دو ایک بار اپنی سونا گاچی والی بیٹھک میں بھی لے گئی۔ اب نجمی گانے بجانے اور مجرا کرنے میں طاق ہو گئی تھی۔ اگرچہ وہ اداکاری کر رہی تھی اور خود اپنے آپ سے الگ ہو کر اپنا مجرا دیکھتی اور گانا سنتی تھی۔ سونا گاچی والی بیٹھک میں کبھی کبھی موجمدار کے علاوہ روپا بدمعاش اس کا ساتھی ہریا، کالی بدمعاش اور ہر پل بھی وہاں آ جاتے تھے۔ یہی لوگ نجمی کی تباہی کے ذمہ دار تھے۔ ان ہی سے نجمی کو انتقام لینا تھا اور وہ ان سے انتقام لینے کی گھڑی کا انتظار کر رہی تھی۔

ایک روز نجمی لکھی بائی کی دوسری کوٹھی میں اپنے کمرے میں رات کے وقت اکیلی بیٹھی تھی کہ اچانک اسے اپنے پہلے محبوب ندیم کی یاد آ گئی۔ ندیم کا چہرہ اس کے سامنے تھا بھولا بھالا، خوبصورت، معصوم چہرہ، ندیم کا کوئی قصور نہیں تھا۔ نجمی نے سوچا کیوں نہ وہ اسے ایک خط لکھ کر بتا دے کہ وہ کلکتے میں ہے۔ اپنے باپ کے بارے میں نجمی کو پاکستان میں ہی پتہ چل گیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے گھر سے فرار ہونے کے صدمے کی تاب نہ لا کر مر گیا ہے اور سوتیلی ماں اپنے بیٹے کو لے کر لاہور سے چلی گئی ہے۔

لاہور میں نجمی کے دو ہی رشتے دار تھے جن کو خط لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ یہ وہ رشتے دار تھے جو اپنے قریبی عزیزوں کی تباہی پر خوش ہوتے ہیں اور بغلیں بجاتے ہیں اور سر ہلا ہلا کر کہتے ہیں دیکھا ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس کا انجام یہی ہوگا۔

نجمی کا دل ندیم کو خط لکھنے کے لئے تڑپ اٹھا۔ اسے معلوم تھا کہ پاکستان ڈاک جاتی ہے۔ اس نے اسی وقت پیڈ نکال کر انگریزی میں ندیم کو خط لکھا اور لفافے میں بند کر دیا خط میں اس نے صرف اتنا لکھا "ندیم۔ تم میرا خط پا کر ضرور حیران ہو گے۔ مگر میں زندہ ہوں اور کلکتے میں ہوں اگر کبھی کلکتے آنا ہو تو مجھے ضرور ملنا۔ نیچے اپنا پتہ لکھ رہی ہوں۔ تمہاری بدنصیب نجمی" لفافے پر نجمی نے ندیم کے گھر کا پتہ انگریزی اور اردو دونوں میں لکھ دیا۔

دوسرے روز وہ شاپنگ کرتے ایک اسٹور میں گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اس اسٹور میں ڈاک کے ٹکٹ بھی مل جاتے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ لکھی بائی کے مسلح غنڈے سائے کی طرح اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ کاؤنٹر پر جا کر اس نے فیس کریم اور سرخ بندیا کا ایک پیکٹ خریدا پھر پرس میں سے لفافہ نکال کر کاؤنٹر پر کھڑے لڑکے کی طرف کھسکاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"میرا ایک کام کر دینا بھائی۔ اس خط پر ٹکٹ لگا کر پوسٹ کر دو۔ یہ پاکستان جائے گا۔"

کاؤنٹر والا نجمی کو جانتا تھا۔ یہ بہاری نوجوان تھا اور نجمی کے ساتھ ہمیشہ خوش اخلاقی

سے پیش آتا تھا۔ اس نے لفافہ لے کر نیچے دراز میں رکھ لیا اور مسکرا کر بولا۔ "میں پوسٹ کر دوں گا چندرا بائی۔ تم فکر مت کرو۔"

نجمی نے پرس میں سے سو کا نوٹ نکال کر نوجوان کو دیا اور بولی۔ "اس میں سے ٹکٹ کے پیسے کاٹ کر باقی تم رکھ لینا انکار نہ کرنا۔ یہ میں اپنی خوشی سے تمہیں دے رہی ہوں اور ہاں وہ ساڑھی تو دکھانا۔"

کاؤنٹر نوجوان نے سو کا نوٹ بھی دراز میں رکھ لیا اور خانے میں سے ساڑھی نکال کر نجمی کے آگے پھیلا دی۔ میسور کا کام ہوا ہے اس پر۔ یہ آپ کو خوب سجے گی۔

نجمی نے وہ ساڑھی بھی خرید لی اور واپس چل دی۔ کاؤنٹر والا نوجوان بڑا سچا نکلا۔ اس نے لفافے پر ٹکٹ چسپاں کئے اور دوپہر کی چھٹی کے وقت خود اسکوٹر پر بیٹھ کر ڈاک گھر گیا اور لفافہ پوسٹ کر دیا۔

ندیم شبانہ کے جانے کے بعد بالکل ہی اکیلا رہ گیا تھا۔ کالج میں اب اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ نجمی کا خیال ہر وقت اس کے ذہن پر چھایا رہتا۔ وہ اپنے آپ کو اس کی بربادی کا ذمے دار سمجھتا تھا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ نجمی جہاں کہیں بھی ہے قید و بند کی زندگی گزار رہی ہوگی۔ ورنہ وہ ضرور واپس آ جاتی۔ فائنل امتحانات کا وقت آ گیا۔ ندیم نے دو پرچے ہی دیئے تھے کہ ایک روز گھر آیا تو اس کی ماں نے اسے ایک لفافہ دیا۔

"تمہارا خط آیا ہے ندیم۔"

لفافے پر انگریزی اور اردو میں اس کا پتہ لکھا تھا۔ ندیم نے غور سے دیکھا تو ٹکٹ انڈیا کا لگا تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے دروازہ بند کیا اور جلدی سے لفافہ پھاڑ کر خط نکالا خط پڑھتے ہی وہ پلنگ پر بیٹھ گیا اور خط کو آنکھوں سے لگا کر رونے لگا۔ اس نے کئی بار خط پڑھا۔ ہر بار اسے آنکھوں سے لگایا۔ نیچے نجمی نے اپنے آپ کو "بدنصیب نجمی" لکھا تھا۔ یہ لفظ ندیم کے دل میں تیر بن کر چبھ گیا تھا نجمی کلکتے کیسے پہنچ گئی؟ وہ وہاں یقیناً دکھی زندگی بسر کر رہی ہے۔ ندیم کا دل نجمی سے ملنے اس کی مدد کرنے اور اسے واپس پاکستان لانے کو بے تاب ہو گیا۔ اس نے اسی

وقت فیصلہ کرلیا کہ وہ انڈیا جائے گا۔ پاسپورٹ اس کے پاس موجود تھا۔ مگر انڈیا کا ویزا لگنا مشکل تھا۔ اس لئے کہ ندیم کا کوئی رشتے دار یا جاننے والا بھارت میں نہیں تھا۔

ندیم نے ویزے کے لئے تگ و دو شروع کردی۔ بہت جلد اسے محسوس ہوگیا کہ جب تک بھارت میں اس کا کوئی رشتے دار یا دوست فیملی اسے خط لکھ کر نہیں بلائے گی اسے ویزا نہیں مل سکے گا۔ ندیم نے سوچا کہ وہ رات کے اندھیرے میں باڈر کراس کر جائے گا۔ لیکن یہ کام بڑا خطرناک تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد باڈر پر سیکورٹی بے حد سخت کردی گئی تھی۔

ندیم اسی پریشانی میں تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ زائرین کا ایک گروہ کسی مقدس مقام کی زیارت کے لئے دلی جارہا ہے۔ اس گروہ کے منتظم صاحب کو ندیم جانتا تھا۔ سیاہ بادلوں میں امید کی سنہری کرن چمکی۔ وہ پاسپورٹ لے کر بھاگم بھاگ منتظم صاحب کے پاس پہنچا اور کہا کہ مجھے بھی اس جماعت میں شامل کرلیجئے۔ میری بڑی حسرت ہے کہ دلی جاکر بزرگان دین کے مزار کی زیارت کروں۔ منتظم صاحب نے ندیم کا پاسپورٹ لے کر اس سے ایک فارم بھروا کر دستخط کروائے اور کہا۔ "تم پرسوں آکر ملنا۔"

ندیم نے دو دن بڑی الجھن میں گزارے۔ نجی سے ملاقات کرنے کا بھی ایک موقع تھا۔ تیسرے دن جب وہ منتظم صاحب کے ڈیرے پر پہنچا تو اس کے پاسپورٹ پر دلی کا ویزا لگ چکا تھا۔ ندیم کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اس نے گھر والوں کو بتا دیا کہ وہ زیارت کے لئے جماعت کے ساتھ دلی جارہا ہے۔ ندیم نے دل میں یہ عزم کر رکھا تھا کہ وہ دلی پہنچ کر جماعت سے الگ ہوجائے گا اور ٹرین میں سوار ہوکر کلکتہ جائے گا او نجی سے مل کر اسے ساتھ لے کر واپس آجائے گا یا اسے کلکتہ میں پاکستانی قونصلیٹ کی حفاظت میں پہنچا دے گا اور خود دلی واپس آکر اپنی جماعت میں شامل ہوجائے گا۔ یہ ایک غیر قانونی بات تھی۔ قانونی طور پر ندیم کو دلی ہی میں رہنا تھا۔ لیکن ندیم ہر حالت میں نجی کو بدنصیبی اور تباہی کے غار سے نکالنا چاہتا تھا۔ جس اقدام کا اس نے فیصلہ کر رکھا تھا اس کے نتائج کی سنگینی سے ندیم بے خبر تھا۔

زائرین کا یہ وفد ایک ہفتے کے لئے بھارت جارہا تھا۔ ندیم نے ایک اٹیچی کیس میں اپنے کپڑے اور دوسرا ضروری سامان رکھا اور وقت مقررہ پر گھر والوں کو خدا حافظ کہہ کر منتظم صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ دوسرے زائر حضرات پہلے سے وہاں موجود تھے۔ دن کے دس بجے یہ قافلہ بھارت کی طرف روانہ ہوگیا۔

ندیم پہلی بار انڈیا جارہا تھا۔ جب ٹرین انڈیا کی سرزمین میں داخل ہوئی تو ندیم کو یقین ہوگیا کہ اب اسے نجی سے ملنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ دلی میں زائرین کو ایک درگاہ شریف کے قریب ہی کیمپوں میں ٹھہرایا گیا۔ تمام زائرین کے پاسپورٹ ضروری کاغذات منتظم صاحب نے اپنے پاس سنبھال کر رکھ لئے تھے۔ ندیم کا پاسپورٹ بھی ان ہی کے پاس تھا۔ مگر ندیم کو پاسپورٹ کی ضرورت نہیں تھی اگرچہ قانونی طور پر دلی سے باہر نہیں جانا چاہیئے تھا۔ مگر ندیم یہ غلطی کر بیٹھا۔ قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے تیسرے دن وہ منہ اندھیرے درگاہ شریف سے نکلا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھا ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ کلکتہ جانے والی گاڑی کے متعلق اس نے کیمپ میں ہی معلومات حاصل کرلی تھیں۔ دلی ریلوے اسٹیشن سے اس نے کلکتہ تک کا تھرڈ کلاس کا ایک ٹکٹ خریدا اور پلیٹ فارم پر آکر بے تابی سے ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔

اس نے محسوس کیا کہ ایک کھدر کے کرتے پاجامے اور صدری والا ادھیڑ عمر آدمی ٹی اسٹال کے پاس کھڑا اسے دیکھ رہا ہے اس آدمی کو ندیم نے اس وقت بھی دیکھا تھا جب وہ کیمپ سے نکل کر سڑک پر آکر ٹیکسی میں سوار ہو رہا تھا۔ ندیم کو پہلے کبھی اس قسم کے حالات سے واسطہ نہیں پڑا تھا چنانچہ اس نے کوئی خیال نہ کیا۔ ٹھیک وقت پر ہوڑہ ایکسپریس آکر پلیٹ فارم پر کھڑی ہوگئی کافی رش تھا ندیم ایک تھرڈ کلاس کے ڈبے میں گھس کر دوسرے مسافروں کے ساتھ بیٹھ گیا۔

وہ درمیان والی قطار میں بیٹھا تھا اس نے گردن گھما کر کھڑکی میں سے باہر پلیٹ فارم پر دیکھا اسے وہ مشکوک آدمی کہیں دکھائی نہ دیا۔ جتنی دیر ٹرین کو وہاں رکنا تھا رکی رہی پھر انجن نے وسل دیا۔ گارڈ نے سیٹی بجائی اور ٹرین چل پڑی۔ غیر شعوری طور پر

ندیم کی آنکھیں ڈبے کے دروازے پر جمی تھیں اس نے اچانک اس کھدر پوش صدری والے مشکوک آدمی کو چلتی ٹرین میں اندر ڈبے میں چڑھتے دیکھا ندیم کا دل کچھ دیر کے لئے زور سے دھڑکا۔ کہیں سی آئی ڈی کا آدمی تو نہیں ہے؟ ٹرین دلی اسٹیشن کے یارڈ سے نکل کر غازی آباد کی طرف جاتے ہوئے رفتار پکڑ رہی تھی۔

ندیم کلکتے پہنچ گیا تھا۔

نجمی نے اپنے خط میں اسے پورا پتہ لکھ دیا تھا۔ یہ خط ندیم کے پاس تھا۔ اس خط پر لکھے ہوئے نجمی کے پتے کو ندیم نے زبانی یاد کر لیا تھا۔ اسٹیشن سے نکلتے ہی ندیم نے ایک خالی ٹیکسی دیکھی اور اس کی طرف بڑھا اس سے پہلے کہ وہ ٹیکسی تک پہنچتا ندیم کو محسوس ہوا کہ ایک آدمی اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ یہ بات ندیم کے لیے کافی پریشان کن تھی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کلکتے شہر میں اس کا داخلہ غیر قانونی ہے۔ وہ زائرین کی ایک جماعت کے ساتھ آیا ہے اور اس کا ویزا صرف دلی تک کے لیے ہے۔ وہ قانونی طور پر دلی سے باہر نہیں جا سکتا لیکن وہ تو آیا ہی نجمی سے ملنے تھا اور نجمی کلکتے میں تھی۔ جو آدمی اس کے پیچھے لگا ہوا تھا اُسے ندیم نے پہلی بار کانپور کے اسٹیشن پر دیکھا تھا۔ ندیم چائے پینے کے لیے کانپور کے اسٹیشن پر اُترا تھا اور وہ ٹی اسٹال کے کاؤنٹر پر کھڑا چائے پی رہا تھا کہ اس کی نظر اس خاص آدمی پر پڑی۔ اس آدمی نے سر پہ گاندھی کیپ پہنی تھی اور کھدر کے کُرتے پاجامے میں ملبوس تھا۔ قد کاٹھ فوجیوں ایسا تھا مگر کندھے جُھکے ہوئے تھے۔ وہ پلیٹ فارم پر لوہے کے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا اور سگریٹ پی رہا تھا۔ جب ندیم کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ ندیم کو شک ہوا کہ یہ آدمی ضرور سیکرٹ سروس کا ہے اور اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ لیکن اگلے دو چار اسٹیشنوں پر وہ ندیم کو پھر دکھائی نہ دیا اس لیے ندیم کو اطمینان ہو گیا کہ اس کا پیچھا نہیں کیا جا رہا۔ لیکن کلکتے پہنچ کر جب وہ ٹیکسی لینے کے لیے بڑھا اور ٹیکسی میں بیٹھنے لگا تو اُسے وہی آدمی پھر دکھائی دیا

وہ فٹ پاتھ پر بڑے عاجزانہ انداز میں اس طرح کھڑا تھا جیسے کسی سواری کی تلاش میں ہو اگر ندیم نے اسے کانپور کے اسٹیشن پر اپنی طرف گھور کر تکتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو وہ کوئی خیال نہ کرتا لیکن ایک تو ندیم غیر قانونی طور پر ایک دشمن ملک میں سفر کر رہا تھا دوسرے اس نے ایک مشکوک آدمی کو دوسری بار اپنے پیچھے لگے ہوئے دیکھ لیا تھا وہ گھبرا گیا۔ یہ گھبراہٹ قدرتی امر تھا۔ وہ دشمن ملک کے اجنبی شہر میں تھا، جب وہ دلی سے ٹرین میں سوار ہوا تھا تو یہ احساس اس کے ذہن پر مسلط ہو گیا تھا کہ وہ کسی وقت بھی پکڑا جا سکتا ہے مگر نجمی کی محبت اسے آگے لیے جا رہی تھی ٹیکسی والے نے ہندوستانی میں پوچھا "بابو کدھر کو جاؤ گے،" ندیم نے پتہ سمجھایا اور جلدی سے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا ٹیکسی آگے روانہ ہو گئی۔ ٹیکسی گنجان علاقے سے نکل کر کشادہ۔۔ سڑک پر آئی تو ندیم نے پیچھے سر گھما کر دیکھا..... پیچھے گاڑیاں چلی آ رہی تھیں۔ ندیم نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ خفیہ محکمے کا کوئی آدمی اس کا پیچھا نہیں کر رہا۔ یہ شخص اس کا وہم تھا۔ ٹیکسی کشادہ سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی خضر پور جیٹی کے پچھلی علاقے میں داخل ہو گئی۔ یہاں دور تک سر بفلک عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک جانب دریائے ہنگلی بہہ رہا تھا ندیم پہلی بار ایسے لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو سفید دھوتی کرتوں میں ملبوس تھے ان کے رنگ گہرے سانولے اور جسم دبلے پتلے تھے۔ یہ کلکتے کے بنگالی تھے۔ یہاں اس نے پہلی بار ناریل کے بے شمار درخت دیکھے۔ یہ درخت سڑک کے کنارے کنارے اُگے ہوئے تھے اور بنگلوں کے احاطوں میں بھی لہرا رہے تھے۔ اس نے رنگ برنگ خوبصورت ساڑھیوں میں ملبوس عورتیں بھی دیکھیں جو فٹ پاتھ پر چل رہی تھیں مگر اس کا دل نجمی کے خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ نجمی، جو اس سے کراچی میں جدا ہو گئی تھی جس کی تلاش میں وہ جگہ جگہ مارا مارا پھر رہا تھا جس کی گمشدگی اس کے لیے ایک تکلیف دہ روح فرسا معمہ بنی ہوئی تھی اور جس کے لیے وہ اپنے آپ کو ذمے دار گردانتا تھا۔ نجمی کس حالت میں ہو گی؟ کیسی ہو گی؟ وہ کراچی سے کلکتے کیسے پہنچ گئی؟ کیا وہ جرائم پیشہ لوگوں کے کسی گروہ کے ہتھے چڑھ گئی ہے؟ ندیم نے اپنے دل میں طے کر رکھا تھا کہ وہ نجمی کو یہاں سے ہر حالت میں نکال کر پاکستان لے جائے گا۔ وہ پاکستانی سفارت خانے سے اس کے لیے مدد حاصل کر لے گا اور چاہے خود

پکڑا جائے مگر نجمی کو پاکستانی سفارت خانے ضرور پہنچا دے گا۔

ٹیکسی اس علاقے میں داخل ہو گئی جہاں نجمی رہتی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ایک جگہ گاڑی کھڑی کر دی اور بولا "صاحب ادھر آپ نے بولا تھا"، جگہ ایڈریس کے مطابق تھی۔ ندیم نے ٹیکسی والے کو رخصت کر دیا۔ سامنے ایک بنگلے کا گیٹ نظر آ رہا تھا۔ گیٹ کے اوپر ٹریننگ سینٹر کا بوسیدہ بورڈ لگا تھا۔ نجمی نے اپنے خط میں اسی بورڈ کا لکھا تھا۔ ندیم کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ نجمی کا سامنا کیسے کرے گا۔ نجمی ظاہر ہے نارمل حالت میں نہیں ہو گی۔ خدا جانے وہ کن حالات میں یہاں پہنچی ہے اور اس کے ساتھ کیسا کیسا بہیمانہ سلوک ہوتا رہا ہے۔ ان تمام حالات کی ذمہ داری ندیم پر عائد ہوتی تھی۔

ندیم دھڑکتے دل کے ساتھ بنگلے کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ لکڑی کے پرانے بنچ پر پرانے چوکیدار بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ ندیم نے اس کے پاس جا کر ہندوستانی میں کہا: "مجھے جیندا سے ملنا ہے" چوکیدار نے کہا "ادھر ٹھہرو میں اندر جا کر پتہ کرتا ہوں۔"

چوکیدار اندر چلا گیا۔ ندیم بنچ پر بیٹھ گیا ابھی اس نے ٹیک ہی لگائی تھی کہ ایک جیپ تیزی سے درختوں کے درمیان سے نکل کر اس کی طرف بڑھی۔ جیپ اس کے پاس آ کر رکی اس میں سے پولیس کے چار مسلح آدمی چھلانگیں لگا کر نکلے اور ندیم کو گھیرے میں لے لیا۔ ندیم ایک دم سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب جو اس نے جیپ کی طرف دیکھا تو وہی کھدر پوش سی آئی ڈی کا آدمی اگلی سیٹ پر سے اتر کر جیپ کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور ٹکٹکی باندھ کر ندیم کو دیکھنے لگا۔ پولیس کے آدمیوں میں ایک نوجوان ہندو بنگالی انسپکٹر بھی تھا۔ اس نے انگریزی میں ندیم سے پوچھا۔ "تم انگریزی جانتے ہو"؟ ندیم کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "ہاں" انسپکٹر نے کہا "تم بنگالی نہیں ہو... تم پنجابی ہو اور مسلمان ہو... ہندوستان کے پنجاب میں کوئی مسلمان نہیں ہے تم کہاں سے آئے ہو؟"

ندیم کا ذہن منتشر ہونے لگا۔ چوکیدار نجمی کو بلانے گیا تھا۔ کوئی دم میں نجمی آنے والی تھی اور یہ لوگ اسے گرفتار کرنے کے منصوبے بنا چکے تھے۔ ندیم نے قدرے بوکھلاہٹ میں کہا: "میں پنجابی ضرور ہوں مگر میں مسلمان نہیں ہوں ہندو ہوں۔ ست پرکاش چڈہ میرا

نام ہے۔ میں یہاں اس ٹرمننگ سنٹر میں ٹائپ کی مشینیں سپلائی کرتا ہوں۔" بنگالی انسپکٹر نے جیپ کے پاس کھڑے سی آئی ڈی کے آدمی کو دیکھا پھر ندیم کی طرف متوجہ ہو کر بولا "اس کا فیصلہ تھانے میں چل کر ہوگا... تمھیں ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا۔"

ندیم نے دیکھا کہ تینوں کانسٹیبل مسلح تھے اور بنگالی انسپکٹر نے ہولسٹر میں سے پستول نکال لیا تھا۔ ندیم نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور احتجاج کرتے ہوئے بولا "آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے میں ہندو بنگالی ہوں ست پرکاش چڈہ...... آخر آپ لوگ مجھے کیوں پریشان کر رہے ہیں؟" اب سی آئی ڈی والا قریب آگیا اس نے ندیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پنجابی میں کہا "تم ہمارے قبضے میں آچکے ہو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہتھیار ڈال دو۔"

اس کے ساتھ ہی سپاہیوں نے ندیم پر جیسے ایک دم سے حملہ کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کو اٹھا کر جیپ میں ڈالا اور پولیس اسٹیشن کی طرف چل دیئے۔ ندیم کوئی ماہر اور تجربہ کار کمانڈو نہیں تھا وہ پولیس کے آگے بے بس ہو گیا سارے کے سارے مسلح تھے۔ ندیم نے حسرت و یاس کے عالم میں بنگلے کے گیٹ کی طرف دیکھا جہاں تھوڑی ہی دیر بعد اس کی محبوبہ نجمی آنے والی تھی وہ ابھی تک نہیں آئی تھی اور جیپ گھوم کر دوسری سڑک پر چڑھ گئی۔

ندیم کو لے کر تھانے کی گاڑی تھانے کی طرف روانہ ہو گئی۔ نجمی جب اپنے کمرے سے نکل کر بنگلے کے گیٹ پر آئی تو وہاں کوئی نہیں تھا اس کی پیاسی آنکھیں ندیم کو تلاش کر رہی تھیں مگر وہ اسے کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ چوکیدار بھی نجمی کے ساتھ ہی باہر آیا تھا اس نے نجمی کو بتایا کہ اس سے ملنے جو نوجوان آیا تھا وہ تھوڑی دیر پہلے گیٹ کے پاس ہی کھڑا تھا نجمی نے اس سے ایک بار پھر ندیم کا حلیہ پوچھا۔ چوکیدار نے جو حلیہ بتایا وہ ندیم ہی کا تھا۔ ویسے بھی وہ ندیم ہی ہو سکتا تھا نجمی نے ندیم کو خط لکھ کر پاکستان سے بلایا تھا مگر وہ کہاں غائب ہو گیا؟ وہ نجمی سے ملنے اتنی دور سے آیا تھا اسے ملے بغیر کیسے واپس جا سکتا تھا بنگلے کے سامنے والی کچی سڑک دور تک ویران تھی وہاں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جس سے نجمی ندیم کے بارے میں پوچھتی۔ اس نے چوکیدار سے کہا "بڑی سڑک تک جا کر دیکھو شاید صاحب ادھر چلا گیا ہو۔" چوکیدار فوراً بڑی سڑک کی طرف دوڑا۔ نجمی کا دل بے چین تھا۔ دماغ میں طرح طرح کے پریشان کن خیالات ابھر رہے تھے۔ ندیم کہاں جا سکتا ہے کہیں اسے پولیس نے تو نہیں پکڑ لیا مگر وہ تو اپنے پاسپورٹ پر ویزا لگوا کر آیا ہوگا۔ اچانک نجمی کا دل ڈوبنے لگا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ندیم کو بھارت کا ویزا نہ ملا ہو اور وہ غیر قانونی طور پر انڈیا کا بارڈر کراس کر کے آگیا ہو۔ سی آئی ڈی کے آدمی اس کے پیچھے لگ گئے ہوں اور یہاں پہنچ کر پولیس نے اسے گرفتار کر لیا ہو۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر ایسی بات ہوئی ہے تو پولیس اس کے پاس بھی تحقیقات کرنے آئے گی۔

لیکن پولیس اتنی احمق نہیں تھی۔ پولیس نے نجمی کے شارٹ ہینڈ ٹائپنگ اسکول والے اس بنگلے کو نوٹ کر لیا تھا اور خفیہ طور پر تحقیقات کرنا چاہتی تھی کہ مشتبہ پاکستانی یہاں کس سے ملنے آیا تھا۔ علاقے کا مرہٹہ پولیس انسپکٹر منجریکر جانتا تھا کہ اس بنگلے میں بدنام شہرت کی مالک لکھمی بائی اڈہ چلاتی ہے۔ انسپکٹر کا لکھمی بائی کے ہاں ماہانہ لگا ہوا تھا۔ ماہانہ اپنی جگہ تھا لیکن منجریکر ایک حقیقت شناس پولیس انسپکٹر بھی تھا اور نیشنل سیکورٹی کا معاملہ تھا اسے اچھی طرح علم تھا کہ اگر اوپر افسروں کو علم ہو گیا کہ مشتبہ پاکستانی ملزم کا لکھمی بائی کے ڈیرے سے کچھ تعلق یا رابطہ ہے تو بات نہ صرف یہ کہ منجریکر کے ہاتھ سے نکل جائے گی بلکہ اس کا پول بھی کھل جائے گا۔ جس وقت پولیس اسٹیشن کے ایک کمرے میں مرہٹہ انسپکٹر منجریکر یہ سب کچھ سوچ رہا تھا تو ندیم اس حالت میں سامنے اسٹول پر بیٹھا تھا کہ اس کے سارے کپڑے اتروا دیئے گئے تھے اور ایک آدمی نائیلون کی رسی ہاتھ میں لیے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ انسپکٹر منجریکر سامنے کرسی پر بیٹھا تھا وہ فل وردی میں تھا اور ریوالور اس کی پیٹی کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ یہ حقیقت منجریکر کو معلوم ہو چکی تھی کہ ندیم مسلمان ہے۔ ویسے بھی ندیم نے انسپکٹر منجریکر سے کچھ نہیں چھپایا تھا اس نے نجمی کا نام نہیں لیا تھا اور کہا تھا کہ وہ لاہور کا رہنے والا ہے۔ زائرین کی ایک جماعت کے ساتھ دہلی آیا اور وہاں سے سیر کرنے کے لیے کلکتہ آگیا تھا کیونکہ اس نے کلکتے کی بڑی تعریف سن رکھی تھی۔ مرہٹے انسپکٹر نے ندیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا "تم اس بنگلے پر کس سے ملنے گئے تھے؟" ندیم نے جواب دیا "میں اس بنگلے پر کسی سے

ملنے نہیں گیا تھا۔ میں چونکہ اجنبی تھا۔ یہ سوچ کر اس کچی سڑک پر چل نکلا کہ وہ آگے کسی دوسری بڑی سڑک سے جا ملے گی مگر معلوم ہوا کہ آگے شگلہ آ گیا ہے اور سڑک بند ہو گئی ہے میں واپس جانے کی سوچ رہا تھا کہ آپ کے سپاہیوں نے مجھے دبوچ لیا۔ اور یہاں لے آئے" انسپکٹر منجریکر مسکرانے لگا "تم مجھے بہت شریف نوجوان لگتے ہو..... میں تمہارے بیان پر یقین کرتا ہوں... لیکن صرف ایک بات بتا دو کہ یہاں کلکتے میں تمہارے دوسرے ساتھی کون کون ہیں اور کہاں کہاں خفیہ سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔"

ندیم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ جس بات کا اسے خدشہ تھا وہ درست ثابت ہو رہی تھی۔ ندیم کو پاکستانی جاسوس سمجھا جا رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس کے کسی بیان کو درست تسلیم نہیں کیا جائے گا اور تشدد اور ناقابلِ برداشت اذیتوں کا دروازہ کھلنے والا تھا۔ ندیم نے بھارت میں ایسے بدقسمت نوجوانوں کے اندوہناک واقعات سن رکھے تھے جو باقاعدہ ویزا لے کر بھارت میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے آئے اور بھارتی پولیس نے ذرا سے شبہے میں انھیں پکڑ کر بند کر دیا اور پھر ان کا کہیں نام و نشان بھی نہ ملا۔ اس نے کہا "انسپکٹر صاحب میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہاں میں کسی آدمی کو نہیں جانتا۔ میں تو پہلی بار بھارت آیا ہوں صرف کلکتہ دیکھنے کا شوق مجھے یہاں کھینچ لایا ہے ورنہ میں یہاں کبھی نہ آتا۔"

انسپکٹر منجریکر نے سانس بھرا..... ندیم کے پیچھے کھڑے ہٹے کٹے خفیہ پولیس والے ہندو کی طرف دیکھا اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ خفیہ پولیس والے ہندو نے پلک جھپکتے میں نائیلون کی رسی ندیم کی گردن میں ڈال کر پھرتی سے ایسا بل دیا کہ ندیم کی آنکھیں باہر نکل آئیں اور حلق سے ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے کوئی بکرا ذبح کیا جا رہا ہو۔ انسپکٹر منجریکر نے ہندو سپاہی کو گالی دے کر کہا کہ "پاکستانی کی آواز کیوں پیدا ہو رہی ہے؟" ہندو سپاہی نے رسی کو دوسرا بل دے دیا اب ندیم کی آواز بالکل نہیں نکل رہی تھی مگر آنکھیں باہر کو مزید ابل پڑی تھیں اور چہرے کی رگیں سرخ ہو کر ایسے پھول گئیں کہ جیسے ابھی پھٹ پڑیں گی۔ انسپکٹر نے سگریٹ کا جلتا ہوا سرا ندیم کی گردن پر رکھ دیا۔ ندیم اچھل کر اسٹول سے نیچے گر پڑا۔ اب منجریکر نے ندیم کو ٹھڈوں سے مارنا شروع کر دیا اس کی گردن میں رسی

ویسے ہی پڑی تھی اور سپاہی اس کے پاس ہی فرش پر بیٹھ گیا تھا۔ ندیم کا جسم جیسے انگاروں پر تڑپ رہا تھا۔ انسپکٹر کے حکم پر ندیم کو دوسرے کمرے یعنی دوسرے عقوبت خانے میں لے جایا گیا۔ یہاں اسے لکڑی کے ایک شکنجے میں اس طرح کس دیا گیا کہ اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں رسیاں بندھی تھیں اور رسیاں اسے دونوں طرف سے کھینچ رہی تھیں۔ ندیم کی چیخیں نکل گئیں۔ انسپکٹر منجریکر نے اشارہ کیا سپاہی نے لکڑی کے پہیے پر ہاتھ روک لیا۔ انسپکٹر ندیم کے منہ کے قریب کرسی لے آیا۔ اور سپاہی نے اس کے حکم پر پہیے کو پیچھے گھمایا۔ رسیاں ڈھیلی ہو گئیں۔ ندیم کے بازوؤں اور ٹانگوں کی کھنچی ہوئی ہڈیاں اپنی جگہ پر آ گئیں۔ انسپکٹر نے ندیم سے کہا "دوسروں کی خاطر تم کیوں تکلیف اٹھاتے ہو؟ مجھے صرف تم ان کے نام اور ٹھکانہ بتا دو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا نام بیچ میں نہیں آئے گا۔ ہم تمہارا ذکر تک نہیں کریں گے۔ میں نہ صرف یہ کہ تمھیں آزاد کر دوں گا بلکہ اپنے آدمی کی حفاظت میں تمھیں دلّی تمہاری پارٹی کے پاس پہنچا دوں گا۔"

ندیم کی ہڈی ہڈی دکھ رہی تھی اس کا جسم اکڑ گیا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں بالکل نہیں ہلا سکتا تھا۔ اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا "میں یہاں کسی کو نہیں جانتا... میں جاسوس نہیں ہوں..... میں بے گناہ ہوں۔" ندیم کی آواز ڈوبتی چلی گئی اور پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔ انسپکٹر منجریکر نے دلی کے علاقے کے پولیس اسٹیشن فون کر کے تمام صورتِ حال معلوم کر لی تھی اسے بتایا گیا تھا کہ زائرین کی جماعت میں سے ندیم نام کا ایک نوجوان غائب ہے اور زائرین اپنے طور پر اسے تلاش کر رہے ہیں اور پریشان بھی ہیں۔ انسپکٹر منجریکر نے دلی پولیس ہیڈ کوارٹر میں خفیہ پولیس کے آئی جی سے رابطہ قائم کیا اور اسے بتایا کہ زائرین کی جماعت میں ایک پاکستانی جاسوس بھی آیا تھا جس کو ہم نے کلکتے میں گرفتار کر لیا ہے۔ جب تک ہمیں اس سے مفید معلومات حاصل نہیں ہو جاتیں ہم اسے کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑ سکتے مگر زائرین کی پارٹی تین روز کے بعد واپس جانے والی ہے۔ آئی جی انٹیلیجنس نے مرہٹے انسپکٹر کو فون پر حکم دیا "پاکستانی جاسوس کو دلّی پہنچا دیا جائے یہاں وہ جس کے پاس آیا تھا اس کو بھی گرفتار کر لو پاکستانی ایجنٹ سے پوچھ گچھ ہم کریں گے۔"

انسپکٹر منجریکر نے یس سر کہہ کر فون کر دیا۔ دوسرے روز شام کی گاڑی میں ندیم کو سیکورٹی کی پوری ایک گارڈ کی نگرانی میں دلی روانہ کر دیا گیا۔ ندیم پر اس قدر تشدد کیا گیا تھا کہ اسے بالکل ہوش نہیں تھا کہ اسے کہاں سے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ دلی انٹیلیجنس کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت کا ایک تہہ خانہ ندیم کا انتظار کر رہا تھا یہاں صرف فرش پر ایک میلی کچیلی دری بچھی ہوئی تھی اور چھت کے ساتھ ایک بلب جل رہا تھا۔ ندیم کو یہاں پھینک دیا گیا۔ آئی جی انٹیلیجنس ملہوترا کے حکم پر ندیم کی تین دن تک دیکھ بھال کی گئی اسے اچھا کھانا اور طبّی امداد دی گئی۔ چوتھے روز جب ندیم اپنے ہوش و حواس میں واپس آچکا تھا تو ایک سکھ انسپکٹر عام کپڑوں میں تہہ خانے میں داخل ہوا وہ مسکرا رہا تھا۔ ندیم کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی شفقت سے پنجابی میں کہنے لگا" میں جانتا ہوں تم بے قصور ہو..... تمھیں خواہ مخواہ لوگوں نے اپنے جال میں پھنسا لیا ہے تمھاری تو شکل بتا رہی ہے کہ تم جاسوس نہیں ہو۔"

ندیم کی آنکھوں میں آنسو آگئے اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا" سردار جی! ان لوگوں نے مجھ پر بڑا تشدد کیا ہے میں جاسوس نہیں ہوں میں تو دلی سے کلکتہ شہر دیکھنے چلا گیا تھا بس یہی میرا قصور ہے۔"

سکھ انسپکٹر بھاری بھرکم تھا اور اس نے نسواری رنگ کی پگڑی اور واسکٹ کے نیچے نیلے رنگ کی پتلون پہنی ہوئی تھی اس نے ندیم کو تسلّی دی اور کہا" مجھے تو تمھاری شکل دیکھتے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ تم جاسوس نہیں ہو تمھیں خواہ مخواہ پھنسا لیا گیا ہے تم سے پہلے بھی یہاں ایک پاکستانی نوجوان آیا تھا اس کو بھی عیار لوگوں نے اپنے جال میں الجھا لیا تھا مگر ہم نے اسے فوراً چھوڑ دیا۔ بلکہ اسے بارڈر کراس بھی کرا دیا تھا اس نے ہمیں اپنے ساتھیوں کے نام اور ایڈریس بتا دیئے تھے مگر قسم ہے واہے گرو کی ہم نے کسی کو اس کا آج تک نام تک نہیں بتایا۔ میں تمھیں بھی اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔"

ندیم نے عاجزی سے کہا" مگر سردار جی! میرا تو کسی گروہ سے کوئی تعلق نہیں ہے مجھے کسی نے اپنے جال میں نہیں پھنسایا میں تو بالکل بے قصور"

سکھ انسپکٹر مسکراتا رہا اس نے ندیم کے شانے کو آہستہ سے تھپتھپایا اور اٹھ کر چلا گیا۔ ندیم نے ٹھنڈا سانس بھرا اور سر جھکا لیا۔ وہ کس مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ اس نے اپنا سر خدا کے حضور جھکا دیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر اس سے دعا مانگنے لگا کہ اے خدا میرے گناہ معاف کر دے میں تم سے ہاتھ باندھ کر معافی کی بھیک مانگتا ہوں۔ ندیم دیر تک روتے روتے خدا کے حضور دعائیں مانگتا رہا۔ رات کو اسے بڑا مرغن کھانا دیا گیا۔ ندیم کا اسے ہاتھ لگانے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ آج اسے مرغن کھانا دیا جا رہا ہے اور کل خدا جانے اس کا کیا حال ہوگا اس نے کھانا کھا لیا اور چارپائی پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسے اپنے ماں باپ اور بہن کا خیال آگیا اس کی پارٹی واپس جانے والی ہوگی۔ جب وہ اس پارٹی کے ساتھ وطن واپس نہ پہنچا تو اس کے ماں باپ اور بہن کا جو حال ہوگا اس کا ندیم بخوبی اندازہ کر سکتا تھا۔ اس کی چھٹی حس اسے بتا رہی تھی کہ وہ ایک ایسے دلدل گڑھے میں گر گیا ہے کہ جہاں سے اس کا باہر نکلنا اب تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ پھر اسے نجمی کا خیال آگیا۔ نجمی کے ساتھ ندیم نے ظلم کیا تھا کہ اسے گھر سے بھگا کر کراچی لے گیا۔ نجمی نے صرف اس کی محبت میں آکر ایسا کیا تھا لیکن اگر ندیم اسے مجبور نہ کرتا تو وہ کبھی گھر سے باہر قدم نہ رکھتی۔ قدرت اب ندیم سے اس ظلم کا بدلہ لے رہی تھی۔ ندیم نے لیٹے لیٹے آنکھیں بند کر کے ہاتھ باندھ لیے اور ایک بار پھر کپکپاتے ہونٹوں اور آنسوؤں بھری پلکوں کے ساتھ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔

اس پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ تین دن کی دیکھ بھال اور اچھی خوراک نے اسے کافی حد تک صحت مند کر دیا تھا۔ اس نے اپنا آپ نیند کی آغوش میں ڈال دیا تھا۔ وہ بمشکل دو تین منٹ ہی سویا ہوگا کہ کسی نے اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ اس کے کانوں میں آواز آئی
" چلو باؤ جی.... تم سے تمھارا باپ ملنے آیا ہے لاہور سے۔"

ندیم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اس کے سامنے پھولی ہوئی مونچھوں والا ایک لمبا تڑنگا آدمی کھڑا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ندیم سمجھ گیا کہ تشدد کا نیا مرحلہ شروع ہونے والا ہے۔ اس کا والد لاہور سے یہاں کیسے آسکتا تھا اس نے سر جھکا لیا۔ لمبے تڑنگے آدمی نے اسے بازو سے

پکڑ کر اٹھایا اور دروازے کی طرف دھکیل دیا پھر وہ اسے ساتھ والے تہہ خانے میں لے آیا: یہاں ایک کمزور روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ لوہے کی ایک کرسی لگی ہوئی تھی۔ فرش کے وسط میں لکڑی کا ایک اسٹول پڑا تھا اور اس کے اوپر چھت کے کنڈے سے کے ساتھ ایک رسہ لٹک رہا تھا۔ ندیم کو یہ تہہ خانہ پھانسی گھر لگا وہ سہمی ہوئی نظروں سے رسے کو تکنے لگا۔ مونچھوں والے آدمی نے کہا "یہاں اسٹول پر بیٹھ جاؤ ابھی تمھارا باپ آکر تم سے ملتا ہے۔"

وہ دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ ندیم کا جسم ٹھنڈا ہونے لگا تھا اس قسم کے حالات سے پہلی بار اس کا پالا پڑ رہا تھا۔ اس کا ذہن سنسنانے لگا۔ ہاتھ پیر جیسے سُن ہو گئے وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کے پیچھے دروازہ بند تھا۔ دروازہ کھلا اور اسے بھاری جوتوں کی آواز سنائی دی ندیم نے بے کسی کے عالم میں گردن آہستہ سے گھما کر پیچھے دیکھا۔ آگے آگے پولیس کے حوالدار کی وردی میں ملبوس ایک ناٹے قد کا ادھیڑ عمر آدمی تھا اور اس کے پیچھے دو آدمی تھے جو پاؤں سے ننگے تھے اور جن کے چہروں سے سنگدلی اور درندگی ٹپک رہی تھی۔ حوالدار لوہے کی کرسی دیوار سے ذرا آگے کھینچ کے اس پر بیٹھ گیا۔ دونوں جلاد اسٹول کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ندیم سے رہا نہ گیا۔ اس نے گڑگڑا کر کہا "اچھا ہے مجھے ایک ہی بار پھانسی کیوں نہ دیدو..... اس عذاب سے تو نجات مل جائے گی۔"

ادھیڑ عمر حوالدار کے ہاتھ میں بید تھا جس کو وہ آہستہ آہستہ اپنے گھٹنے پر مار رہا تھا۔ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "پھانسی تو ہم اس کو دیتے ہیں جو ہمارا دشمن ہو..... ہم تمھیں اپنا دشمن نہیں سمجھتے۔ دشمن وہ ہیں جو تمھیں دولت کا لالچ دے کر یہاں لائے ہیں ہم تو صرف انھیں پکڑنا چاہتے ہیں۔" پھر وہ اٹھا ایک جلاد نے لوہے کی کرسی اٹھائی اور جہاں ندیم زمین پر بیٹھا تھا اس کے قریب لا کر رکھ دی۔ ادھیڑ عمر حوالدار اس پر بیٹھ گیا اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ندیم کو دیا اور بولا "لو سگریٹ پیو..... ہم تمھیں کچھ نہیں کہنا چاہتے یہ رسہ تو ہم نے ان لوگوں کے لیے لٹکا رکھا ہے جنھوں نے تمھیں دھوکا دے کر کلکتے بلایا تھا" ندیم نے سگریٹ کا پیکٹ واپس کر دیا اور بے بسی سے کہنے لگا "میں آپ لوگوں کو کیسے یقین

دلاؤں کہ میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں یہاں بالکل اجنبی ہوں مجھے کسی نے یہاں نہیں بھیجا۔" آخری جملہ اس کے منہ میں ہی تھا کہ حوالدار نے ندیم کی کمر پر اتنے زور سے بید کی ضرب لگائی کہ اس کی چیخیں نکل گئیں اور وہ فرش پر درد کی شدت کے مارے تڑپنے لگا۔ حوالدار اس پر بید برسانے لگا۔ ندیم نے اس کا بید پکڑ لیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا "میں جاسوس نہیں ہوں..... مجھے معاف کر دو..... مجھے نہ مارو..... مجھے نہ مارو....."

حوالدار ایک لمحہ وہ عفریت کی طرح اس کے سر پر کھڑا ہانپ رہا تھا۔ اس نے اپنی بید کھینچ لی اور اپنے آدمیوں کو اشارہ کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا سانس پھول گیا تھا دونوں جلادوں نے ندیم کے دونوں پاؤں رسے سے باندھے۔ دوسری طرف سے رسہ کھینچا اور ندیم چھت کے ساتھ الٹا لٹک گیا۔ یہ اذیت پندرہ بیس منٹ تک جاری رہی۔ ندیم کا سارا خون اس کی آنکھوں اور چہرے پر جمع ہو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کے جسم کا سارا خون اس کی آنکھوں کے راستے بہنے والا ہے اسے اپنی بینائی غائب ہوتی محسوس ہو رہی تھی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور خدا سے موت کی دعائیں مانگنے لگا۔ اب حوالدار کرسی سے اٹھا اور ندیم کی ٹانگوں پر بید کی ضربات لگانی شروع کر دیں۔ ندیم کے جسم میں روح جیسے پھڑپھڑا رہی تھی۔ وہ باہر نکلنے کو بیتاب تھی اسے حوالدار کی آواز سنائی دی۔

"اگر تم ہمیں اپنے ساتھیوں کے نام بتا دو تو ہم تمھیں ابھی نیچے اتار دیں گے۔ بتاؤ کون ہیں وہ لوگ؟ یہاں ان کا ٹھکانا کہاں ہے؟ تمھارا ڈیڈ سپاٹ کلکتہ میں کس جگہ پر ہے؟"

ندیم کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کی گردن جیسے ٹوٹنے لگی تھی۔ ٹانگوں سے سارا خون نکل کر اس کے سر میں جمع ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اسے بید کی ضربوں کا زیادہ احساس نہیں ہو رہا تھا اس کے کانوں میں سیٹیاں بجنے لگی تھیں۔ اسے حوالدار کی آواز بھنبھناہٹ کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ ندیم کے بازو کٹی ہوئی شاخوں کی طرح فرش کی جانب لٹک رہے تھے۔ حوالدار نے ہاتھ روک لیا اور بولا۔

"یہ اس طرح نہیں بولے گا۔ اسے دھرتی ماتا کی گود میں ڈال دو۔"

فوراً اسے کھول دیا گیا۔ ندیم کٹے ہوئے درخت کی طرح بے حس و حرکت فرش پر چت پڑ گیا۔

اسے اپنا جسم لکڑی کی طرح سخت اور برف کی طرح ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا۔ دونوں آدمیوں نے اسے بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف گھسیٹا اور ساتھ والی کوٹھڑی میں لے آئے۔ اس کوٹھڑی کے عین درمیان میں قبر کی طرح کا ایک گڑھا کھدا ہوا تھا جس کے اوپر لکڑی کا تختہ ڈال دیا گیا تھا۔ انھوں نے تختہ اٹھا کر ایک طرف کر دیا اور ندیم کو قبر میں گرا دیا۔ ندیم ایک لاش کی طرح قبر میں گر پڑا۔ اوپر سے فوراً تختہ لگا کر قبر کو بند کر دیا گیا۔ ندیم کی آنکھیں کھلی تھیں۔ قبر میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ جسم کا دوران خون نارمل ہوا تو ندیم نے محسوس کیا کہ قبر اتنی تنگ ہے کہ وہ اپنی ٹانگیں نہیں پھیلا سکتا۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

قبر میں حبس تھا اور تھوڑی ہی دیر بعد ندیم کے لیے سانس لینا مشکل ہو گیا۔ وہ منہ کھول کر ایسے تیز تیز سانس لینے لگا جیسے ہانپ گیا ہو۔ اب اس پر چیونٹیوں نے حملہ کر دیا۔ شاید اس قبر نما گڑھے میں چینی یا گڑ ڈالا ہوا تھا تاکہ اس پر چیونٹیاں آ جائیں۔ چیونٹیاں ندیم کی قمیض کے اندر پہنچ گئی تھیں اور اسے بری طرح کاٹ رہی تھیں۔ وہ انھیں ہاتھ سے ایک جگہ مارتا تو وہ دوسری جگہ اسے کاٹنے لگتیں۔ گڑھے میں بے شمار چیونٹیاں اور دوسرے کیڑے مکوڑے تھے۔ یہ عذاب ندیم کی برداشت سے باہر تھا۔ اس نے چیخ چیخ کر کہا "مجھے باہر نکالو، مجھے باہر نکالو۔"

مگر کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسے گڑھے سے باہر نکالنے کے لیے نہیں ڈالا گیا تھا۔ پھر اسے قدموں کے باہر جانے کی آواز آئی اور کوٹھڑی میں سناٹا چھا گیا۔ چیونٹیوں اور کیڑے مکوڑوں کے ساتھ اس کی جنگ جاری تھی۔ چیونٹیاں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ وہ انھیں مسلنے کی کوشش کرتا اور وہ نہ جانے کہاں سے نکلی چلی آ رہی تھیں۔

خدا جانے کتنی دیر کے بعد ندیم چیونٹیوں کی کافی تعداد کو کچلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب اسے صرف اِکا دُکا چیونٹی ہی کاٹتی تھی مگر وہ ایک نئے عذاب میں مبتلا ہو چکا تھا۔ قبر نما گڑھے میں تختے کے ایک باریک سوراخ سے تازہ ہوا کی صرف اتنی مقدار اندر آ رہی تھی کہ ندیم کے پھیپھڑے دھونکنی کی طرح چل رہے تھے کوئی دو گھنٹے کے بعد تختہ اوپر سے ہٹا۔ پھر اسے گڑھے سے باہر نکال دیا گیا۔ ندیم زمین پر اوندھا پڑا ابھی تک ہانپ رہا تھا۔ اُسے اسی حالت میں چھوڑ کر

حوالدار اور دونوں جلّاد کوٹھڑی کو تالا لگا کر چلے گئے۔ دلی انٹیلی جینس کے آئی جی ملہوترا نے اس دوران وزارتِ داخلہ سے خصوصی اجازت نامہ حاصل کر لیا تھا۔ اس نے اس اجازت نامے کے حوالے سے بارڈر سیکورٹی فورس کے چیف کو ہدایت کر دی کہ زائرین کی جو پارٹی واپس پاکستان جا رہی ہے اس میں ایک آدمی کم ہے اور پارٹی سے اس بارے میں کسی قسم کی پوچھ گچھ نہ کی جائے اور یہ ظاہر کیا جائے کہ جتنے آدمیوں کی نفری گئی تھی اتنے ہی آدمی واپس پاکستان جا رہے ہیں۔۔

دوسری طرف نجمی کی پریشانیوں میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب انسپکٹر منجریکر اس سے ملنے لکھی بائی کے خفیہ بنگلے پر آیا۔ نجمی یعنی چندا ابھی وہاں موجود تھی۔ نجمی کا دل کہہ رہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے اس نے مرہٹہ انسپکٹر کے چہرے سے بھانپ لیا تھا کہ وہ کسی راز کی بُو پا کر وہاں آیا ہے لکھی بائی نے معمول کے مطابق انسپکٹر منجریکر کی آؤ بھگت کی۔ اسے چائے اور رس گلے پیش کیے اور ادھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ نجمی تخت پر لکھی بائی کے ساتھ میٹھی چھالیہ کتر رہی تھی۔ یہ تو ہم آپ کو پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ نجمی اس ماحول سے مطابقت تو کسی صورت میں بھی نہیں کر سکتی تھی لیکن اس نے وقتی طور پر اپنے آپ کو لکھی بائی کی مذموم خواہشات کے حوالے کر دیا تھا اور دل میں یہ عزم لیے ہوئے تھی کہ وہ ان تمام مردوں سے عبرت ناک بدلہ لے گی جنھوں نے اسے اس حالت تک پہنچایا تھا۔ ان میں ڈھول اور ہریا بدمعاش بھی تھے۔

مونچھوں والا درندہ صفت بدمعاش موجدار بھی تھا۔ خضر پور جیٹی کے گوالہ والا روپا بدمعاش بھی تھا جس نے اسے لکھی بائی کے پاس فروخت کیا تھا اور اس کی عزت سے کھیلتا رہا تھا۔ نجمی کے اندر ہی اندر انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ لاوا کھول رہا تھا۔ یہ آتش فشاں لاوا کسی مناسب موقع کے انتظار میں تھا۔ نجمی کو اب سب سے زیادہ پریشانی ندیم کی تھی جو کلکتہ پہنچنے کے بعد نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ وہ اس سے ملنے اس کے بنگلے تک آیا تھا مگر اس کے بعد خدا جانے اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ نجمی کو شک تھا کہ اسے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ ان دنوں بھارتی حکومت نے یہ جھوٹا پروپیگنڈہ شروع کر رکھا تھا کہ ہمسایہ ملک سے تخریب کار آ کر بھارت میں دھماکے کر رہے ہیں اور ملک میں انتشار پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انسپکٹر منجریکر کی زبان سے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ پولیس کو چوکس کر دیا گیا ہے اور ان پاکستانی تخریب کار جاسوسوں کو پکڑنے کیلئے ملٹری

انٹیلی جینس بھی حرکت میں آگئی ہے۔ انسپکٹر منجریکر پیالی میں چمچ ہلا رہا تھا لکھی بائی اس کے لیے پان لگا رہی تھی۔ نجمی نے چائے بنا کر لکھی بائی کو دی۔ انسپکٹر منجریکر نے چائے کا گھونٹ پی کر کہا۔

"بائی جی! تمھاری چندا چائے بنانے میں استاد ہو گئی ہے۔"

لکھی بائی نے مسکراتے ہوئے کہا "چندا تو اب کھانا بھی بڑا اچھا پکانے لگی ہے کبھی ہمارے ہاں کھانا کھایئے۔"

انسپکٹر منجریکر نے جیسے لکھی بائی کی بات بالکل نہیں سنی تھی وہ نجمی کو مسلسل گھور رہا تھا۔ نجمی کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا کہ کوئی نئی مصیبت آنے والی ہے وہ اپنا پیالہ ہاتھ میں تھامے خاموشی سے چائے پینے لگی۔ انسپکٹر منجریکر نے لکھی بائی سے کہا "لکھی بائی! میں اگر آج رات کے لیے تمھاری چندا کو اپنے ساتھ تھانے لے جاؤں تو تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

نجمی کے ہاتھ میں پیالی کانپ گئی۔ لکھی بائی کا ہاتھ بھی پان لپیٹتے لپیٹتے وہیں رک گیا۔ اس نے خشمگیں نظروں سے پولیس انسپکٹر کی طرف دیکھا اور بولی "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ چندا کا تھانے میں کیا کام؟ اور پھر اس ماہ کی رقم دوسری تاریخ کو ہی دے دی گئی تھی۔ پھر تم اسے تھانے کیوں لے جاؤ گے؟"

انسپکٹر منجریکر نے ہاتھ بش شرٹ کی جیب میں ڈالا اور ایک سرکاری حکم نامے کی نقل سامنے رکھی اور بولا "مجھے کچھ معلوم نہیں لکھی بائی۔ اسے پڑھ لو۔ یہ آئی جی پولیس کا حکم نامہ ہے انھوں نے چندا کو پولیس اسٹیشن بلایا ہے۔"

لکھی بائی کا تو پارہ چڑھ گیا۔ اس نے انسپکٹر کو سنانی شروع کر دیں کہ وہ ہر پولیس والے کو ماہانہ دیتی ہے پھر اسے کیوں تنگ کیا جاتا ہے۔ کیا اب دلی کے آئی جی صاحب کا بھی ماہانہ لگا دوں؟ چلو یونہی سہی، اس سے پوچھو وہ کیا لے گا؟ میں اس کا بھی بندوبست کر دوں گی۔ انسپکٹر منجریکر اٹھ کھڑا ہوا۔ دروازے کی طرف جا کر اس نے آواز دی۔ چار مسلح پولیس کے سپاہی اندر آ گئے۔ منجریکر نے کہا "لکھی بائی میں مجبور ہوں۔ یہ ہمارے افسر کا حکم ہے۔ چندا کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ سپاہی نجمی کی طرف بڑھے۔ نجمی کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے! اس کی نظریں مرہٹہ انسپکٹر منجریکر پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے موت کی فہرست میں انسپکٹر منجریکر کا نام بھی لکھ لیا۔ پولیس نجمی کو اپنے ساتھ باہر لے گئی۔

مرہٹہ انسپکٹر منجریکر نے نجمی کو تھانے میں لے جا کر اپنے کمرے میں بٹھا دیا بظاہر وہ اس کے ساتھ بڑی شائستگی سے پیش آیا اس نے نجمی کے لیے چائے منگوائی اور کہنے لگا "چندا بائی! آئی جی صاحب کے آرڈر کی وجہ سے میں مجبور تھا ورنہ تمھیں یہاں کبھی نہ لاتا۔"

نجمی نے منجریکر کی طرف تجسس کی نظروں سے دیکھا اور پوچھا "کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ مجھے یہاں کس لیے بلایا گیا ہے؟"

انسپکٹر منجریکر نے کندھے سکیڑتے ہوئے کہا "یہ تو آئی جی صاحب ہی جانتے ہیں..... ویسے میرا خیال ہے کہ وہ کلکتے کی رقص و سرود کرنے والیوں کو ذاتی طور پر کچھ ہدایات دینا چاہتے ہیں۔ کل سوناگاچی کی ایک بائی کو بلایا تھا۔"

نجمی کو انسپکٹر کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ معاملہ سوائے ندیم کے اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ ان لوگوں نے یقینی طور پر اسے گرفتار کر لیا ہے اسلیئے اسے پوچھ گچھ کے لیے بلایا گیا ہے۔ آئی جی وغیرہ کا محض ڈھونگ ہے۔ نجمی خاموشی سے چائے پینے لگی۔ اس نے صرف اتنا پوچھا کہ مجھے یہاں کب تک رہنا ہوگا۔ انسپکٹر منجریکر بولا "بس آئی جی صاحب آتے ہی ہوں گے..... دو منٹ اسی کمرے میں تم سے کوئی بات کریں گے اور ہمارا آدمی تمھیں واپس چھوڑ آئے گا۔"

نجمی چپکی بیٹھی چائے پیتی رہی۔ انسپکٹر منجریکر اٹھ کر باہر نکل گیا۔ نجمی کا دل کسی آنے والے خطرے کو محسوس کر کے معمول کی رفتار سے کچھ زیادہ ہی دھڑکنے لگا تھا کسی لمحے اسے خیال آتا کہ یہ محض اس کا وہم ہے..... ممکن ہے ندیم کو ان لوگوں نے گرفتار نہ کیا ہو وہ خطرے

کی بُو پا کر خود ہی بنگلے کے گیٹ سے کسی طرف فرار ہو گیا ہو..... لیکن ایسی صورت حال اگر ہوتی تو ندیم کو دوسرے دن اس سے ملنے دوبارہ آنا چاہیئے تھا۔ اس کے ساتھ ہی نجمی کو خیال آیا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ جو نوجوان اس سے ملنے آیا تھا وہ ندیم نہ ہو۔ اس سے ملتی جلتی شکل والا کوئی دوسرا نوجوان ہو..... اس خیال نے نجمی کے ذہنی تناؤ کو کسی قدر کم کر دیا اس نے اپنے پرس میں سے چھوٹا شیشہ نکال کر اپنے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی مزید ہلکی سی تہہ جمائی وہ پرس بند کر رہی تھی کہ انسپکٹر منجریکر کمرے میں داخل ہوا اور آتے ہی بولا۔

"آؤ چندا آئی جی صاحب تمھیں بلا رہے ہیں۔"

چندا اس کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئی تیسرے پہر کا وقت تھا۔ دفتر خالی خالی سا تھا کہیں کہیں کسی کمرے کے باہر کوئی سپاہی کھڑا دکھائی دے جاتا تھا۔ انسپکٹر منجریکر چندا کو لے کر برآمدوں سے گزر تا سیڑھیاں اتر کر ایک زمین دوز کمرے میں آ گیا۔ اسی کمرے میں زمین پر ناریل کی چٹائی بچھی تھی اور دیوار کے ساتھ دو کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ "تم کرسی پر بیٹھو آئی جی صاحب ابھی آتے ہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں میری جان انھیں صرف دو ایک ہی باتیں کرنی ہیں تم سے..... میرا خیال ہے کہ اوپر سے کوئی خاص ہدایت آئی ہے۔"

اتنا کہہ کر انسپکٹر کمرے سے چلا گیا۔ نجمی نے کمرے کا جائزہ لیا، ویران ویران سا کمرہ تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے دیوار کے ساتھ لگی بریکٹ والا بلب روشن کر دیا گیا تھا۔ نجمی نے خاص بنگالی ریشمی ساڑھی پہن رکھی تھی جس کا باڈر جامنی رنگ کا تھا ماتھے پر تلک بھی لگا رکھا تھا۔ کمرے میں اکیلی بیٹھے بیٹھے دس پندرہ منٹ گزر گئے تھے کہ اسے جلدی جلدی سیڑھیاں اترنے کی آواز آئی۔ نجمی سمٹ کر بیٹھ گئی۔ یہ انسپکٹر منجریکر تھا اس نے ہاتھ میں خاکی رنگ کا ایک لفافہ تھام رکھا تھا۔ لفافہ اس نے نجمی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آئی جی صاحب کو ایک ضروری میٹنگ میں جانا پڑ گیا ہے انھوں نے تمھارے لیے یہ خط بھیجا ہے اس میں وہ تمام باتیں لکھی ہیں جو وہ تم سے کرنا چاہتے تھے۔" نجمی ابھی تک بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکی تھی اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھنے لگے تھے۔ لفافہ بند تھا انسپکٹر منجریکر کرسی کھینچ کر بالکل اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

"کھول کر پڑھ لو..... بنگلہ میں لکھا ہے تم بنگلہ پڑھ لیتی ہو۔"

نجمی نے لفافے کو کھولا اس میں ایک سفید کاغذ تہہ کیے ہوئے تھا اس نے کاغذ باہر نکال کر کھولا تو اندر سے ایک تصویر نیچے اس کے دامن پر گر پڑی نجمی نے تصویر اٹھا کر دیکھی تو اس کا دل اچھل کر اس کے حلق کے قریب آ گیا۔ یہ ندیم کی تصویر تھی۔ انسپکٹر منجریکر نے یہ تصویر خاص طور پر تھانے میں اس وقت اتاری تھی جب ندیم کو پہلی بار وہاں لایا گیا تھا اور شدید تشدد کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا تھا تصویر میں ندیم فرش پر بیہوش پڑا تھا۔ انسپکٹر نے اپنی نگاہیں نجمی کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں اس نے وہ بات نجمی کے چہرے پر پڑھ لی تھی جو وہ پڑھنا چاہتا تھا قدرتی طور پر ندیم کی بے ہوشی کی حالت میں لی گئی تصویر کو دیکھتے ہی نجمی کا اوپر کا سانس اوپر رہ گیا اور اس کے منہ سے حیرت اور درد کی ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی نجمی کو احساس ہو گیا کہ اس سے شدید غلطی ہو گئی ہے۔ انسپکٹر منجریکر نے سنجیدہ آواز میں پوچھا "چندا یہ آدمی تم سے کس سلسلے میں ملنے آیا تھا؟" نجمی ساری بات سمجھ گئی تھی اس سے ایک غلطی بھی ہو گئی تھی۔ اب لے دے کے اسے اپنے آپ کا بچاؤ کرنا تھا، ندیم کا بچاؤ کرنا تھا۔ اس نے تصویر کو انسپکٹر کی گود میں پھینکتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیا معلوم کہ یہ کون ہے میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا اگر یہ آیا بھی ہو گا تو میں ایک ناچنے گانے والی ہوں میرے بنگلے پر کوئی بھی اپنی جیب میں چاندی کے سکے ڈال کر آ سکتا ہے۔"

انسپکٹر نے ندیم کی تصویر کو نجمی کی آنکھوں کے سامنے کر دیا اب اس کی آواز میں کرختگی اور تحکم تھا۔

"چندا یہ مت بھولو کہ تم کہاں بیٹھی ہو۔ میں تمھیں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت تم پاکستانی جاسوسوں کے گروہ سے ساز باز رکھنے کے الزام کی زد میں ہو اور یہ کس قدر شدید اور خطرناک جرم ہے اس کا اندازہ شاید تمھیں نہیں ہے..... تمھارے حق میں یہی بہتر ہے کہ مجھے راز داری میں لیتے ہوئے میرے کان میں بتا دو کہ یہ آدمی تمھیں کس سلسلے میں ملنے آیا تھا اور اس کے دوسرے ساتھی شہر میں کہاں مقیم ہیں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے صاف بیانی سے کام لیا تو میں تمھیں اس سنگین کیس میں سے ایسے باہر نکال لوں گا جیسے کوئی مکھن میں سے بال نکال لیتا ہے۔" نجمی اب کوئی چھوٹی موٹی قسم کی گھریلو عورت نہیں تھی وہ کئی پتن تیر چکی تھی۔ کئی گڑھوں کھڈوں اور دلدلوں میں گر کر ابھر چکی تھی اس پر اس قدر تشدد ہو چکا تھا کہ اس کا بدن اب اس تشدد

کا عادی ہو گیا تھا اور پولیس کا تشدد اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا اسے اگر کوئی خیال تھا تو صرف یہ کہ ندیم کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائے۔ اس نے انسپکٹر منجریکر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "انسپکٹر تم مجھے بے وقوف بنا کر خواہ مخواہ اس کیس میں الجھانے کی کوشش مت کرو... میں تم ایسے کئی پولیس افسروں کو بھگت چکی ہوں۔ میں نے ایک بار تمھیں کہہ دیا ہے کہ میں اس آدمی کو بالکل نہیں جانتی۔"

انسپکٹر منجریکر بھی کوئی اناڑی پولیس آفیسر نہیں تھا وہ چندا کو بھی ایک عرصے سے جانتا تھا وہ جس علاقے میں لکھی بائی کے ساتھ رہتی تھی انسپکٹر اس علاقے کی ساری اونچ نیچ اور وہاں کے رہنے والوں اور والیوں کی نفسیات سے واقف تھا اس نے چندا کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پیار سے بولا "تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ تم نے جو کہا ہے میں اسے مان لیتا ہوں چلو چھٹی ہوئی بات ختم کرو میں تمھارے لیے چائے منگواتا ہوں۔" نجمی اٹھ کھڑی ہوئی۔۔
"شکریہ.... میں بہت چائے پی چکی ہوں اب میں واپس جاؤں گی۔"

نجمی نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا۔ اس نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ انسپکٹر منجریکر نے اتنے زور سے اُلٹے ہاتھ کا تھپڑ نجمی کے رخسار پر مارا کہ اس کی آواز سے کمرے کی فضا گونج اٹھی اور نجمی کے منہ سے چیخ نکل گئی اور ناریل کی چٹائی پر جا گری۔ انسپکٹر منجریکر نے گالیوں اور ٹھوکروں کی بوچھاڑ کر دی۔ نجمی کے بال بکھر گئے پرس دور جا گرا وہ بوکھلا گئی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ انسپکٹر کے ٹھڈوں سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ انسپکٹر اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا کمرے کے کونے میں لے گیا اور اسے دیوار کے ساتھ دھکیلتے ہوئے گالی دے کر بولا "تم پاکستانی جاسوس ہو.... تمھارا پاکستانی جاسوسوں سے گہرا رابطہ ہے۔ تم بھارت دیش کی دشمن ہو.... ہمارے پاس ثبوت موجود ہیں جو تمھیں پھانسی کے تختے تک لے جا سکتے ہیں... تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو۔"

نجمی چہرہ ہاتھوں میں چھپائے بے اختیار رو رہی تھی۔ کچھ بھی تھا مگر ابھی تک وہ ایک نازک عورت ضرور تھی۔ اس کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی مگر نازک جسم ضربات کی چوٹوں سے درد بھی کر رہا تھا اور آنکھیں ذلت کے احساس سے اشکبار بھی تھیں۔ اس نے ساڑھی کے پلّو

سے اپنے آنسو پونچھے اور انسپکٹر کی طرف شعلہ بار آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا "تم جتنا چاہے مجھ پر ظلم کر سکتے ہو.... لیکن جو بات مجھے معلوم نہیں وہ میں تمھیں کیسے بتا سکتی ہوں۔ میں عدالت میں بھی یہی کہوں گی کہ میں اس آدمی کو نہیں جانتی.... نہیں جانتی۔"
انسپکٹر منجریکر نے نجمی کو ایک اور بھرپور تھپڑ رسید کیا۔ نجمی کی چیخ نکل گئی۔ "حرامزادی! عدالت میں لے جانے سے پہلے تمھیں پولیس کے ریمانڈ کا سامنا کرنا ہو گا اور تم خوب جانتی ہو کہ ریمانڈ کے نام سے بڑے بڑوں کا کلیجہ دہل جاتا ہے۔"

نجمی کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس ہندو مرہٹہ انسپکٹر کا چہرہ نوچ لے، اس کی گردن پھاڑ کر اس کا خون پی جائے، اس کے جسم کے پرزے اڑا دے مگر وہ ابھی مجبور تھی ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا جب وہ ایسا کر سکتی تھی۔ بہر حال نجمی نے اپنے دل میں اس ہندو مرہٹے انسپکٹر کا نام لکھ کر نیچے سرخ نشان لگا دیا تھا۔ جب وہ وقت آیا جس کا نجمی کو انتظار تھا تو وہ سب سے پہلے اس مرہٹے کو اپنے انتقام کا نشانہ بنائے گی۔ ایک بار نہیں کئی بار اس سے انتقام لے گی۔ عبرتناک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا انتقام.... نجمی کے اندر ایک بھیانک خوفناک اور پتھر کے دل والی قاتلہ پروان چڑھ رہی تھی۔ باہر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ انسپکٹر نے وہیں سے چلا کر پوچھا "کون ہے؟" باہر سے کانسٹیبل کی آواز آئی "سر ایک منٹ کے لیے تشریف لائیے"۔ انسپکٹر منجریکر اپنی وردی کو ٹھیک کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر کانسٹیبل مراری بھٹناگر کھڑا تھا وہ انسپکٹر کو ایک طرف لے گیا اور بولا "سر لکھی بائی اپنے وکیل کو ساتھ لے کر آئی ہے میں نے اسے برآمدے میں بٹھا دیا ہے۔"
انسپکٹر منجریکر نے جیب سے کنگھی نکال کر اپنے بالوں میں پھیری اور ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ دروازے کو تالا لگا دے اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر برآمدے میں سے گزرنے لگا جب وہ اپنے آفس والے برآمدے میں آیا تو اس نے دیکھا کہ لکھی بائی سفید ساڑھی میں ملبوس بنچ پر بیٹھی ہے اس کا بنگالی وکیل ساتھ میں ایک فائیل لیے پاس ہی کھڑا ہے۔ انسپکٹر منجریکر کو آتے دیکھ کر لکھی بائی اٹھ کھڑی ہوئی اس کا چہرہ غصے سے بھرا ہوا تھا۔ وکیل نے انگریزی میں کہا "انسپکٹر میں وویکا ناتھ ایڈووکیٹ ہوں آپ نے میری موکلہ چندا کو حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے میں اپنی موکلہ کی مختار کو ساتھ لایا ہوں۔ وہ آپ کے خلاف آپ کے تھانے میں مقدمہ درج کروانا چاہتی ہیں۔"

انسپکٹر منجر یکر نے غور سے وکیل کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے کہا "پلیز میرے ساتھ اندر تشریف لے آئیں، تم بھی لکھی بائی ...." کمرے میں آنے کے بعد جب وکیل اور لکھی بائی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو انسپکٹر نے اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے کہا "مسٹر ایڈووکیٹ آپ کو معاملے کی سنگینی کا علم نہیں ہے۔"

اس پر لکھی بائی پھٹ پڑی "تم کون ہوتے ہو میری بچی کو بند کرنے والے .... آئی جی صاحب نے بلایا ہے تو چلو مجھے آئی جی صاحب کے پاس لے چلو.... میں خود ان سے پوچھتی ہوں کہ ہمارا کیا جرم ہے.... کیا ہم ٹیکس ادا نہیں کرتے؟ کیا ہم اپنے لائسنس کی فیس ہر بار سرکاری خزانے میں جمع نہیں کرواتے؟ کیا قصور کیا ہے میری بچی نے؟"

انسپکٹر منجر یکر نے ہاتھ کے اشارے سے لکھی بائی کو خاموش رہنے کے لیے کہا۔ بنگالی وکیل نے رومال سے اپنے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ صاف کرنے کے بعد کہا "انسپکٹر! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ میری موکلہ کو کس سیکشن کے تحت گرفتار کرکے لایا گیا ہے اور اسے یہ کیوں کہا گیا ہے کہ اسے آئی جی نے بلایا ہے.... کیا میں آئی جی صاحب کا سرکاری حکم نامہ دیکھ سکتا ہوں؟" انسپکٹر منجر یکر جو کچھ کر رہا تھا کلکتہ کے آئی جی پولیس کی ہدایت کے مطابق ہی کر رہا تھا کئی دنوں سے لکھی بائی کے بنگلے کی خفیہ پولیس نگرانی کر رہی تھی۔ انسپکٹر منجر یکر نے آئی جی پولیس کو اعتماد میں لینے کے بعد ہی یہ قدم اٹھایا تھا۔ معاملے کی نوعیت چونکہ سنگین تھی اور اس میں نیشنل سیکورٹی کا معاملہ ملوث تھا اس لیے آئی جی پولیس نے انسپکٹر منجر یکر کو ہر قسم کا اختیار دے دیا۔

انسپکٹر منجر یکر نے وکیل کی طرف متوجہ ہو کر کہا "مسٹر ویکانا تھ! آپ کو ابھی تک علم نہیں ہے کہ آپ جس موکلہ کی وکالت کرنے یہاں آئے ہیں وہ صرف ایک پاکستانی ایجنٹ ہی نہیں بلکہ اس کا بھارت میں مقیم پاکستانی جاسوسوں کے ایک ایسے گروہ سے تعلق ہے جو ایک عرصے سے یہاں ملک دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ یہ معاملہ کس قدر سنگین ہے آپ اس کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور میں یہ بھی آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ چونکہ یہ نیشنل سیکورٹی اور بھارت کی سلامتی کا مسئلہ ہے اس لیے مجھے حکومت کی جانب سے پورے اختیارات حاصل ہیں اور میں آپ کو اور لکھی بائی کو بھی پاکستانی جاسوسہ کی مدد کرنے کے الزام میں گرفتار کر سکتا ہوں۔"

بنگالی وکیل کے تو ہوش اڑ گئے اس کو پسینہ آ گیا۔ لکھی بائی بھی ایک دم جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ اصل معاملہ کیا ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا۔ پاکستانی جاسوسوں کا نام سن کر وہ کانپ گئی تھی۔ کسی بھی ملک میں یہ سب سے سنگین الزام ہوتا ہے اور اس الزام کے تحت پولیس کا محکمہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے۔ لکھی بائی ایک تجربے کار نائیکہ ہی نہیں تھی بلکہ اس قسم کے قانونی نکتوں سے بھی بخوبی واقف تھی۔ وکیل نے تو اپنی فائیل میز پر سے اٹھالی اور معذرت طلب لہجے میں بولا "آئی ایم سوری انسپکٹر! میری موکلہ نے یہ بات مجھے نہیں بتائی تھی.... یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہے میں اس کیس سے دستبردار ہوتا ہوں لکھی بائی.... شکریہ انسپکٹر آپ نے مجھے ایک سنگین غلطی سے بچا لیا۔"

وکیل نے فائیل بغل میں دبائی اور گڈ بائی کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی لکھی بائی نے ہاتھ باندھ لیے اور عاجزی سے بولی "بیٹا اگر یہ بات تھی تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتا دیا؟ میں خود چندا کو تمھارے پاس لے آتی۔ ہم لاکھ برے سہی لیکن اپنے دیش پر آنچ آتے کبھی نہیں دیکھ سکتے لیکن کیا یہ سچ ہے کہ چندا کا تعلق پاکستانی جاسوسوں سے ہے؟ کہیں ایسی بات تو نہیں ہے کہ کوئی پاکستانی جاسوس اس کا گانا سننے آ گیا ہو اور خفیہ والوں نے یہ سمجھ لیا ہو کہ چندا کا ان لوگوں سے کوئی خاص تعلق ہے؟ بیٹا! چندا مجھے ایسی لڑکی نہیں لگتی.... میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔" لکھی بائی کا دل نہیں مانتا تھا کہ چندا کا جاسوسوں سے کوئی تعلق یا رابطہ ہے۔ یہ اسے معلوم تھا کہ چندا اصل میں پاکستان کی رہنے والی ہے اور اسے وہیں سے اغوا کر کے مشرقی پاکستان اور پھر وہاں سے بھارت لا کر فروخت کر دیا گیا تھا لیکن چندا ایک عرصے سے لکھی بائی کے پاس رہ رہی تھی اگر اس کا تعلق جاسوسوں کے کسی گروہ سے ہوتا تو یہ بات لکھی بائی سے چھپی نہ رہ سکتی تھی۔ چندا چوبیس گھنٹے اس کے پاس رہتی تھی اور لکھی بائی ایک جہاندیدہ عورت تھی وہ آدمی کی چال سے اس کے دل کا حال معلوم کر لیتی تھی چنانچہ اب وہ عیاری اور چاپلوسی سے کام لے کر چندا کو کسی طرح اس سنگین الزام سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔

انسپکٹر منجر یکر نے لکھی بائی کو اعتماد میں لیتے ہوئے کہا "لکھی بائی! میں جانتا ہوں کہ تمھارا ان ملک دشمن عناصر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن چندا کے ملوث ہونے کے بارے میں ہمیں کچھ ثبوت ملے

ہیں چنانچہ اب ہم چندا سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں جو بھارت میں باڈر پار سے آ کر تخریب کاری کی سرگرمیوں میں مصروف ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ یہ لوگ یہاں ہمارے بڑے بڑے راشٹریہ کے لیڈروں کو ہلاک کرنے کے لیے ٹریننگ دیکر یہاں بھیجے گئے ہوں گے۔"

لکھی بائی الجھن میں پڑ گئی تھی۔ چندا سے اس کا خون کا کوئی رشتہ نہیں تھا وہ اس میں صرف اس لیے دلچسپی لے رہی تھی کہ ایک رجواڑے کے راجکمار نے چندا کے عوض لکھی بائی کو بھاری معاوضہ دینے کی پیشکش کی تھی۔ لکھی بائی کو کئی نئی لڑکیاں آسانی سے مل سکتی تھیں اور اس کے پاس کئی لڑکیاں موجود بھی تھیں مگر چندا ایسی حسین اور دلکش خدوخال کی لڑکی بڑی مشکل سے ملتی تھی لکھی بائی چندا کو آسانی سے ہاتھ سے نہیں گنوانا چاہتی تھی اس نے کہا، "لیکن بیٹا منجریکر تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کیا تم مجھے نہیں بتاؤ گے؟"

انسپکٹر مسکرایا۔ کہنے لگا، "لکھی بائی میں تمہیں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ ہم نے ایک پاکستانی جاسوس پکڑا ہے جس نے چندا بائی کا نام لیا ہے اور جو اس سے ملنے تمہارے دریائے ہگلی والے پرانے بنگلے پر آیا تھا۔"

لکھی بائی نے کانوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور بولی "ہے بھگوان! یہ میں کیا سن رہی ہوں...... میری چندا کو یہ کیا ہو گیا۔ بیٹا میں پھر بھی کہوں گی کہ چندا بڑی بھولی ہے.... وہ کسی کے بہکاوے میں آ گئی ہو گی۔ تم اسے میرے ساتھ کر دو میں اس سے سب کچھ پوچھ لوں گی.... وہ مجھے بتا بھی دے گی اس نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔" انسپکٹر منجریکر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا، "نہیں بائی جی! آئی ایم سوری.... میں چندا کو ابھی تمہارے ساتھ نہیں بھیج سکتا ہمیں اپنی کارروائی پوری کرنی ہے۔ یہ نیشنل سیکورٹی کا معاملہ ہے لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر چندا نے ہمیں پاکستانی جاسوسوں کے نام اور ٹھکانے بتا دیئے تو میں اسے وعدہ معاف گواہ بنانے کی بھرپور کوشش کروں گا۔ اب تم جا سکتی ہو مجھے ایک ضروری میٹنگ میں جانا ہے۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر منجریکر نے میز پر سے اپنی ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھی اور کمرے کی چق اٹھا کر باہر نکل گیا۔ لکھی بائی مایوسی کے عالم میں کچھ دیر وہیں گم سم ہو کر بیٹھی رہی۔ کئی لاکھ کی رقم اس کے ہاتھ سے یونہی جا رہی تھی اس سے بہتر تھا کہ وہ پچھلے ماہ ہی چندا کو راجکمار کے حوالے کر کے اس سے رقم وصول

کر لیتی اس کے بعد جو کچھ ہوتا راجکمار کی ذمہ داری ہوتی کم از کم وہ تو اپنی رقم وصول کر چکی ہوتی۔ اب بھی لکھی بائی اتنی آسانی سے یہ نقصان برداشت کرنے والی نہیں تھی روپیہ اس کا دیوی دیوتا تھا۔ روپے کی خاطر اس نے اپنی عزت کا سودا کیا تھا اور دوسروں کی عزتوں کے سودے کرتی رہی تھی۔ زندگی بھر اس نے روپے ہی کی پوجا کی تھی پھر وہ اتنا بڑا نقصان بھلا کیسے برداشت کر سکتی تھی اگرچہ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ جاسوسی کے سلسلے میں خود بھی نہ کہیں الجھ جائے۔ مگر لکھی بائی کی پہنچ اوپر بڑی دور دور تک تھی اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ چندا کو اس گڑھے سے نکالنے کی بھرپور کوشش ابھی سے شروع کر دے گی۔

لکھی بائی امید و بیم کے عالم میں واپس اپنے بنگلے پر آ گئی۔ وہاں کملا اور کرشنا موجود تھیں اور اس کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ لکھی بائی نے چندا پر لگائے گئے جاسوسی کے الزام کے بارے میں کوئی بات نہ کی بس اتنا ہی کہا کہ پولیس اس سے زیادہ پیسے مانگ رہی ہے اس نے فوراً ہی اپنے کمرے میں جا کر اعلیٰ افسروں سے رابطہ قائم کرنا شروع کر دیا۔ وہ بڑی عقلمندی سے بات کرتی معاملے کی سنگینی کو وہ خوب جانتی تھی جس اعلیٰ آفیسر یا وزیر سے اس نے بات کی یہی موقف اختیار کیا کہ چندا کو محض اس لیے پکڑا گیا ہے کہ میں پولیس کو خوش نہیں رکھتی۔ ہر اعلیٰ آفیسر نے وعدہ کیا کہ وہ اس کی مدد کرے گا بعض بنگالی آفیسرز کو کیس کی نوعیت کا علم تھا وہ جانتے تھے کہ لکھی بائی کی مدد کرنا ان کے بس میں نہیں ہے لیکن وہ لکھی بائی کو ناراض بھی نہیں کر سکتے تھے چنانچہ انھوں نے بھی یہی وعدہ کیا کہ وہ اس کی خاطر اپنی جان لڑا دیں گے۔

دوسری طرف منجریکر نے آئی جی سے مشورہ کرنے کے بعد نجمی کو کلکتہ سنٹرل جیل کے خصوصی زنانہ وارڈ میں منتقل کر دیا۔ نجمی پر اب تشدد نہیں کیا جاتا تھا اسے الگ کوٹھری میں رکھا گیا تھا اور اسے کھانے پینے کے لیے مناسب غذا دی جا رہی تھی اس حسن سلوک کی وجہ اصل میں یہ تھی کہ انسپکٹر منجریکر نے آئی جی سیکرٹ پولیس سے مل کر ایک خاص منصوبہ تیار کیا تھا منصوبہ یہ تھا کہ نجمی اور پاکستانی جاسوس ندیم کی اچانک ملاقات کروائی جائے پھر اس کا ردعمل دیکھا جائے اور جو کچھ وہ باتیں کریں اُن کو ٹیپ کر لیا جائے۔ قدرتی بات تھی کہ ان لوگوں کو ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا۔

اس منصوبے کے تحت سینٹرل جیل میں ندیم کے ساتھ بھی اچھا سلوک کیا جانے لگا۔ ان معنوں

میں اسے مناسب غذا ملنا شروع ہو گئی تاکہ جب وہ نجمی سے ملے تو اس حالت میں ہو جس حالت میں وہ اسے ملاقات کرنے اس کے بنگلے پر گیا تھا۔ ایک ہفتے بعد ندیم کو سیکورٹی گارڈ کی انتہائی سخت نگرانی میں دلی سے کلکتہ لاکر جیل کی ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ ندیم یہی سمجھ رہا تھا کہ اس پر کلکتہ میں مقدمہ چلایا جا رہا ہے اب اسے اپنے ماں باپ اور بہن کا خیال زیادہ... ستانے لگا تھا۔ نجمی کا غم تو اس کی جان کو اس وقت سے لگا ہوا تھا جب سے وہ کراچی سے غائب ہوئی تھی۔ لیکن اب ہر وقت وہ یہ سوچ کر پریشان رہتا کہ اس کی جدائی میں اس کے ماں باپ کا کیا حال ہو رہا ہوگا پھر اسے خیال آتا کہ انھوں نے حکومت کو اس کے بھارت سے واپس نہ آنے کے بارے میں ضرور درخواست دی ہوگی شاید حکومت اس کو رہا کروانے کیلئے کوشش کرے۔

دوسری جانب نجمی زنانہ جیل کی کوٹھری میں بیٹھی یہ سوچ رہی تھی کہ ندیم کی جو اسے تصویر دکھائی گئی تھی اس میں وہ بیہوش پڑا تھا۔ ان لوگوں نے اس پر بڑا تشدد کیا ہوگا۔ نجمی کا دل بار بار بھر آتا مگر وہ ندیم کے لیے کچھ نہ کر سکتی تھی وہ خود مصیبت میں پھنس چکی تھی۔ اسے زنانہ جیل میں آئے چار یا پانچ دن گزر چکے تھے۔ ایک روز صبح کے وقت انسپکٹر منجر یکر پولیس کی بند گاڑی میں اپنی گارڈ کے ساتھ زنانہ جیل میں داخل ہوا۔ اس نے چندا کو ساتھ لیا اور یہ کہہ کر جیل کے اے کلاس والے وارڈ کی طرف چل پڑا کہ لکھی بائی اس سے ملاقات کرنے آئی ہے۔ اے کلاس وارڈ میں دو کوارٹر نما کمرے تھے۔ ایک کمرے میں پلنگ، میز کرسی وغیرہ لگی تھی۔ انسپکٹر منجر یکر نے چندا کو کمرے میں بٹھایا اور بولا "میں لکھی بائی کو بھیجتا ہوں.... مگر ملاقات کا وقت زیادہ نہیں ہے"

نجمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ انسپکٹر منجر یکر کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ نجمی کے ساتھ کچھ روز سے کوئی تشدد نہیں کیا گیا تھا اور اسے خوراک بھی ٹھیک ٹھاک مل رہی تھی لیکن وہ قید میں تھی۔ ایک کوٹھڑی میں اسے مسلسل رکھا جا رہا تھا۔ اسے شام کے وقت ایک گونگی بہری عورت کے ساتھ کوٹھری سے باہر نکال کر تھوڑی دیر ٹہلنے کی اجازت تھی۔ گونگی بہری عورت کے ساتھ بات کر کے وہ اپنے دل کا تھوڑا سا بوجھ بھی ہلکا نہیں کر سکتی تھی۔

لکھی بائی سے ملاقات کا سن کر اسے خوشی ضرور ہوئی تھی کہ شاید اس نے نجمی کی ضمانت کا کوئی بندوبست کر لیا ہو۔ وہ پلنگ پر بیٹھی اس اے کلاس کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ یہ کمرہ جیل

کی کوٹھڑی سے بہت مختلف تھا یہاں ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ باتھ روم بھی ساتھ ہی تھا چھت کے ساتھ پنکھا بھی لگا ہوا تھا مگر اس کمرے میں خفیہ مائیکروفون لگائے گئے تھے۔ اس کا نجمی کو علم نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک مائیکروفون باتھ روم میں چھپا دیا گیا تھا اور دو بڑے طاقتور مائیکروفون کمرے میں ایسی جگہ چھپائے گئے تھے کہ آدمی کمرے میں کہیں بھی کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر بات کرے اسے سنا جا سکتا تھا۔ نجمی نے باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا، بال درست کیے، پرس میں سے سامان نکال کر تھوڑا اپنے چہرے کو ٹھیک کیا اور کمرے میں واپس آکر پلنگ پر نیم دراز ہو گئی۔ اسے لکھی بائی کا انتظار تھا۔ وہ دل میں دعائیں مانگنے لگی کہ کاش لکھی بائی نے اس کی ضمانت کا انتظام کر دیا ہو۔ ویسے وہ دل میں حیران ضرور تھی کہ ابھی تک لکھی بائی نے اس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا تھا اور وہ اس سے ملاقات کرنے بھی نہیں آئی تھی پھر وہ یہ سوچ کر چپ ہو جاتی کہ چونکہ اس پر الزام بڑی سنگین نوعیت کا ہے اس لیے شاید لکھی بائی نے بھی اسے چھوڑ دیا ہو۔

دوسری طرف ندیم کو یہ کہہ کر وہاں لایا گیا تھا کہ وہاں ایک سرکاری افسر اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔ ندیم کو انسپکٹر منجر یکر خود اس کمرے کے برآمدے تک لایا جس میں نجمی بیٹھی لکھی بائی کی راہ دیکھ رہی تھی منجر یکر نے بند دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تم اندر جاؤ..... میں تھوڑی دیر بعد آکر تمھیں لے جاؤں گا۔"

نجمی کو برآمدے میں کسی کے قدموں کی آواز آئی شاید لکھی بائی آگئی تھی مگر یہ زنانہ جوتوں کی چاپ نہیں تھی ہو سکتا ہے انسپکٹر منجر یکر آیا ہو یہ سوچ کر نجمی پلنگ پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ندیم بند دروازے کے آگے آکر رک گیا وہ سوچ رہا تھا کہ خدا جانے اب اسے کس مصیبت میں الجھایا جا رہا ہے۔ کئی روز سے ندیم پر بھی تشدد کا سلسلہ منقطع تھا اور اسے بھی مناسب غذا فراہم کی جا رہی تھی اور وہ اس سہولت کو عارضی اور کسی آنے والے بڑے تشدد اور بھیانک اذیت کا پیش خیمہ سمجھ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ سامنے نجمی پلنگ پر بیٹھی تھی ایک مدت کے بعد وہ نجمی کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ دونوں ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ دونوں پر جیسے سکتے کا عالم تھا۔ وقت بھی شاید رک گیا تھا۔ ایک دوسرے کے سامنے آکر دونوں ہی یہ بھول گئے کہ کہیں یہ کوئی سازش تو نہیں ہے، کہیں انھیں کسی جال

میں تو نہیں الجھایا جا رہا۔ ان کی آنکھیں ایک دوسرے کے مقابل تھیں۔ نظریں ایک دوسرے میں جذب ہو چکی تھیں۔ نجمی جیسے کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر پلنگ سے اٹھی.... پرس اس کی گود سے نیچے گر پڑا اسے ارد گرد کا کوئی شعور نہیں تھا اس کا محبوب سامنے تھا اور بس یہی اس کے لیے کافی تھا۔ ندیم کے قدم بھی اپنے آپ نجمی کی طرف اٹھنے لگے بمشکل دو سیکنڈ کا وقت گزرا ہو گا۔ لیکن ان دونوں کو محسوس ہو رہا تھا جیسے انھیں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے صدیاں گزر گئی ہیں۔ اور پھر دریا کے دونوں بچھڑے ہوئے کنارے ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے جیسے ہزار ہا برس سے بچھڑے ہوئے ستاروں کا ملاپ ہو رہا تھا، جیسے ایک دوسرے کے ملاپ کی پیاسی ندیاں سنگلاخ ویرانوں اور تپتے صحراؤں کے طویل سفر کے بعد ایک سنگم پر ایک دوسرے سے آن ملی ہوں۔ دونوں ایک دوسرے سے مل گئے تھے، دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے دونوں کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ نہ اوپر آسمان تھا نہ نیچے زمین تھی، نہ کوئی خلاء تھا نہ کوئی فضا تھی۔ انسپکٹر منجریکر کے ساتھ انٹیلی جینس کا ایک اور آفیسر بھی تھا دونوں بند روشندان کے سوراخ میں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ یہی دیکھنا چاہتے تھے۔

ندیم نے نجمی کو پلنگ پر سہارا دیکر بٹھایا۔ وہ کیا کہے؟ کیا بولے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ نجمی کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو بہہ رہے تھے۔ ندیم نے نجمی کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "مجھے معاف کر دو نجمی.... میں تمہارا گنا ہگار ہوں۔"

ایک عرصے کے بعد نجمی نے ندیم کی آواز سنی تھی وہ اپنے تمام زخم بھول گئی تھی۔ ندیم کی شیریں آواز اس کے محبوب کی آواز تھی۔ اس نے ندیم کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی طرف آنسوؤں بھری پلکیں اٹھا کر بولی "ندیم تم کہاں تھے" اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ندیم کے بھی آنسو نکل پڑے۔ جب ذرا دل کا غبار ہلکا ہوا تو اچانک نجمی کو خیال آیا کہ کہیں یہ کوئی چال نہ ہو۔ آخر ان دونوں کی ملاقات کس لیے کرائی جا رہی ہے۔ ندیم کچھ کہنے لگا تھا کہ نجمی نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ مگر اب بولنے یا نہ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ انڈین انٹیلی جینس والوں کو جو معلوم کرنا تھا، وہ معلوم کر چکے تھے۔ وہ ان دونوں کا پہلا ردّ عمل دیکھنا چاہتے تھے ان کی باتوں کے بارے میں انہیں بھی معلوم تھا کہ وہ محتاط ہو جائیں گے وہ تو ان دونوں کو ایجنٹ سمجھ رہے تھے اور ایجنٹ آہٹ پا

کر یا سازش کی بو سونگھ کر بہت چوکنے ہو جاتے ہیں۔ نجمی نے آہستہ سے کہا "تمھیں پاکستان کے لیے جاسوسی کرنے کے الزام میں پکڑا گیا ہے۔ تم مجھے ملنے آئے تھے؟"

"ہاں" ندیم نے بھی سرگوشی میں جواب دیا "میں تم سے ملنے لاہور سے آیا تھا۔ صرف تم سے ملنے مجھے تمہارا خط ملا تو میں بہت رویا بہت خوش بھی ہوا پھر زائرین کی ایک پارٹی کے ساتھ دلی پہنچا اور وہاں سے بھاگ کر کلکتہ آ گیا یہاں تمھارے مکان کے باہر پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا اور ابھی تک پولیس کی حراست میں ہوں۔"

نجمی نے ایک بار پھر ندیم کے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ دی اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا وہ جانتی تھی کہ ان کو نہ صرف دیکھا جا رہا ہو گا بلکہ ان کی باتیں بھی ٹیپ ہو رہی ہوں گی۔ مگر وہ گفتگو کیے بغیر رہ بھی نہیں سکتے تھے۔ نجمی نے کہا "تم نے پولیس کو کیوں نہیں بتا دیا کہ تم مجھ سے ملنے آئے تھے۔ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ تم میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔"

چونکہ ان کی محبت اور تعلقات کا راز فاش ہو چکا تھا اس لیے نجمی نے سوچا کہ اب وہ یہی موقف اختیار کرے گی اسے پاکستان سے اغوا کر کے مشرقی پاکستان لایا گیا وہاں اس کی شادی ایک ایسے بدکار انسان سے کر دی گئی جس نے اسے کلکتے کے ایک بدمعاش موجمدار کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ وہ ندیم سے محبت کرتی تھی ندیم بھی اس سے پیار کرتا تھا اس نے ندیم کو خط لکھ کر اپنا ایڈریس دیا اور وہ اس سے ملنے بغیر ویزے کے کلکتے آ گیا۔ اس نے ندیم کو بھی یہی تلقین کی کہ جو سچی بات ہے وہ ہمیں بیان کر دینی چاہیئے۔ ندیم نے نجمی کا ہاتھ چوم لیا اور بولا "میں اب غلط بیانی سے کام نہیں لوں گا.... میرا جاسوسی سے کوئی تعلق نہیں ہے.... میں تم سے پیار کرتا ہوں اور یہی پیار مجھے یہاں کھینچ لایا ہے۔"

یہ باتیں انسپکٹر منجریکر اور انڈین انٹیلی جینس کا دوسرا آفیسر بھی کانوں سے ہیڈ فون لگائے سن رہے تھے۔ نجمی اور ندیم کی باتیں ایک دوسرے کمرے میں ٹیپ پر ریکارڈ بھی ہو رہی تھیں۔ انسپکٹر منجریکر نے کانوں سے ہیڈ فون اتار کر نیچے رکھا، آہستہ سے اٹھا اور چھت پر سے دبے پاؤں گزر کر دوسری جانب کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔

ندیم اور نجمی ایک دوسرے کے قریب بیٹھے گزری محبتوں کے حسین اور درد بھرے دکھی لمحات کی

یادوں میں گم تھے کہ دروازہ کھلا اور انسپکٹر منجریکر اندر داخل ہوا اس نے ندیم کی طرف متوجہ ہو کر کہا "تمہارے ڈرامے کا وقت ختم ہو گیا ہے میرے ساتھ چلو۔"

نجمی خالی خالی نظروں سے ندیم کو تک رہی تھی۔ انسپکٹر منجریکر ندیم کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ برآمدے سے گزر کر وہ رک گیا اور اس نے ندیم کو اپنی گارڈ کے سپاہیوں کے حوالے کر کے کہا "تم اسے لے کر گاڑی میں بیٹھو میں آ رہا ہوں۔" نجمی پلنگ پر سر جھکائے بیٹھی ندیم سے ملاقات کے سنہری لمحوں میں گم تھی کہ انسپکٹر منجریکر اس کے پاس آ کر رک گیا نجمی نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ انسپکٹر منجریکر نے اچانک نجمی کو ایک تھپڑ مارا اور کہا "پولیس تمھاری ان باتوں میں آنے والی نہیں ہم جانتے ہیں تم دونوں ڈرامہ کر رہے تھے... لیکن یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تم ایک دوسرے کو جانتے ہو اور ندیم تم ہی سے ملنے یہاں آیا تھا۔" نجمی پلنگ پر گہری خون آشام نظروں سے اس مرہٹے انسپکٹر کو دیکھ رہی تھی۔

- - - - -

نجمی اور ندیم سے پولیس نے الگ الگ پوچھ گچھ شروع کر دی۔ دونوں نے ایک ہی موقف اختیار کیا جو ایک حقیقت بھی تھی۔ نجمی نے پولیس کو یہ بات ضرور بتا دی کہ اسے چند سال پہلے لاہور سے اغوا کر کے مشرقی پاکستان پہنچا یا گیا اور پھر موجمدار نامی ایک بنگالی بدمعاش نے اسے کلکتے لا کر خضر پور جیٹی کے روپا نامی بردہ فروش کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ پولیس نے ان سب کو تھانے بلا کر تحقیقات کی تو انھوں نے نجمی کے بیان کی تصدیق کر دی ندیم کے بیان پر پولیس کو یقین نہیں آ رہا تھا انٹیلی جنیس کو شبہ تھا کہ ندیم کا تعلق پاکستانی ایجنٹوں کے گروہ سے ہے وہ نجمی سے محبت ضرور کرتا ہو گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ نجمی کو ندیم کی بھارت دشمن سرگرمیوں کا علم نہ ہو لیکن ندیم کے بارے میں اس شبہے کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ محض اپنی محبوبہ سے ملنے کلکتے آیا تھا۔ کوئی بھی پڑھا لکھا نوجوان جو ویزا پاسپورٹ کی قانونی پابندیوں سے واقف ہو ایسا خطرناک قدم نہیں اٹھا سکتا سوائے اس کے کہ وہ کسی اہم ترین اور سنگین مشن پر وہاں آیا ہوا ہو۔ کلکتے میں ہی انٹیلی جنیس کے افسروں کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں ندیم اور نجمی کے سلسلے میں تمام تحقیقات اور رپورٹوں اور دونوں کے بیانات کا پوری تفصیل سے جائزہ لیا گیا دو گھنٹے کی سوچ بچار کے بعد اسی میٹنگ میں یہی فیصلہ کیا گیا کہ فی الحال چندا کو رہا کر کے لکھی بائی کے پاس بھیج دیا جائے اور اس کی مکمل نگرانی کی جائے۔ لکھی نے ایک اہم کام یہ کیا تھا کہ سال بھر پہلے چندا کو کسی نہ کسی طریقے پر افسروں سے مل ملا کر بھارتی شہریت دلا دی تھی۔ اور اس کا شناختی کارڈ بھی بنوا دیا تھا۔ پولیس اب یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ نجمی کو واپس پاکستان دھکیل دیا جائے۔ پولیس کو ابھی تک اس بات کا پوری طرح یقین نہیں تھا کہ چندا یعنی نجمی کے پاس کسی نازک محکمے کے خفیہ راز نہیں ہیں ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا

کیا گیا کہ ندیم کو دلی جیل میں ہی رکھا جائے اور اس سے مزید پوچھ گچھ کی جائے۔ پولیس ندیم کو کسی حال میں رہا کرتے اور واپس پاکستان بھیجنے پر تیار نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی ایسے لوگوں کو پولیس نے پکڑ کر دلی، امرتسر اور لدھیانہ کی جیلوں میں ڈال رکھا تھا جو باقاعدہ پاسپورٹ پر اپنے عزیزوں سے ملنے آئے تھے مگر ان پر جاسوسی کا الزام لگا کر گرفتار کر لیا تھا۔ ایسے لوگوں کا وہاں کوئی والی وارث نہیں تھا۔ کوئی مسلمان وکیل بھی ان کی ضمانت کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ ان پر جیل میں بے پناہ تشدد کیا جاتا ان سے بھنگیوں ایسے کام لیے جاتے۔ دن میں ایک وقت دو سوکھی روٹیاں دی جاتیں۔ یہ لوگ کئی کئی سال سے بھارتی جیلوں میں پڑے سڑ رہے تھے۔

ندیم کو بھی تھانے سے دلی سینٹرل جیل کی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں منتقل کر دیا گیا۔ لاہور میں ندیم کے والدین انتہائی تشویش میں مبتلا تھے۔ انھوں نے زائرین کی جماعت کے منتظم اعلیٰ سے پوچھا تو اس نے کہا کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ ندیم کہاں اور کیسے گم ہو گیا۔ "ایسا لگتا ہے کہ وہ یا تو اپنے طور پر دلی سے باہر کسی دوسرے شہر میں نکل گیا اور پولیس نے اسے پکڑ لیا مگر حیرانی کی بات یہ ہے کہ ہمیں پولیس نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا یا ہم سے ندیم کی گمشدگی پر کوئی پوچھ گچھ بھی نہیں کی گئی.... باڈر پر بھی اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا کہ ہماری پارٹی کا ایک آدمی کم کیوں ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ بھارتی پولیس نے اسے جاسوسی کے الزام میں پکڑا ہے اور بھارتی پولیس کے ایماء پر ہی ہم سے باڈر پر کوئی پوچھ گچھ نہیں کی۔"

ندیم کے والدین نے حکومت سے فریاد کی۔ حکومت کی طرف سے بھارتی سفارتخانے کو لکھا گیا، احتجاج کیا گیا مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا بھارتی سفارتخانے سے بھی یہی جواب ملا کہ اس بارے میں سفارت خانہ بھارتی وزارت خارجہ سے خط و کتابت کر رہا ہے۔ ماں باپ اور بہن رو پیٹ کر اس امید پر صبر کر کے بیٹھ رہے کہ اگر خدا کو منظور ہوا تو ان کا بیٹا اور بھائی ایک نہ ایک روز ان سے آن ملے گا۔ ندیم کو بھی اپنے ماں باپ کی یاد بہت ستاتی تھی مگر اسے یقین ہو گیا تھا کہ بھارتی حکومت اب اسے رہا نہیں کرے گی، اس پر کبھی مقدمہ بھی نہیں چلایا جائے گا۔ جیل میں پہنچنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ بھارت کی جیلوں میں ایسے کئی بے گناہ مسلمان نوجوان برس ہا برس سے پڑے ہیں جن پر جاسوسی کا الزام لگا کر قید میں ڈال دیا گیا ہے اور ان کا کوئی والی وارث نہیں ہے۔ ندیم کو اپنا بھیانک انجام اپنے سامنے نظر آ رہا تھا مگر وہ اس انجام کے لیے تیار نہیں تھا۔ پولیس اسے جس قدر اذیت دے سکتی تھی دیتی رہی ندیم کے جسم پر جگہ جگہ دہکتے سگرٹیوں کے جلنے ہوئے نشان تھے، اسے کئی کئی گھنٹے الٹا لٹکائے رکھا، اس کے سینے پر برف کی سل باندھی گئی تھی، اسے مرغن غذائیں کھلا کر ساری رات اور پھر دن بھر جگا کر رکھا گیا، اس کے پیٹ میں پمپ سے زبردستی پانی بھرا گیا اور اس کا پیٹ کئی بار پھٹتے پھٹتے رہ گیا۔ اس کے ناخنوں میں سوئیاں چبھوئی گئیں، اس کی ٹانگوں اور بازوؤں کو لکڑی کے شکنجوں میں جکڑ کر اس حد تک کھینچا گیا کہ اس کی ہڈیوں کے جوڑ الگ ہوتے ہوتے رہ گئے ندیم نے تمام اذیتوں کو برداشت کر لیا سارا تشدد سہہ لیا لیکن اس نے ایک بار بھی اس الزام کو تسلیم نہ کیا کہ وہ پاکستانی جاسوس ہے۔ اگرچہ پولیس کو ندیم سے کوئی بھی معلومات حاصل نہ ہو سکی تھی لیکن پولیس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ندیم کو رہا نہیں کیا جائے گا چنانچہ اسے غیر معینہ مدت کے لیے دلی کی سینٹرل جیل کی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا۔ اب اس پر تشدد نہیں کیا جاتا تھا مگر اس کے ساتھ عام قیدیوں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا اسے گالیاں دی جاتیں۔ ذرا ذرا سی بات پر وارڈن اور سپاہی اسے زدوکوب کرنا شروع کر دیتے۔ ان تمام باتوں نے ایک تو ندیم کو سخت جان بنا دیا دوسرے اس کے دل میں خوف اور اندیشوں کو دور کر کے اس میں سنگ دلی اور جرأت پیدا کر دی یہ سنگ دلی ظلم و تشدد کے خلاف تھی۔ اب ہر وقت اس کے دل میں ایک ہی خیال جاگزیں رہتا کہ اسے دلی کی سینٹرل جیل سے کسی نہ کسی طرح فرار ہونا ہے اور فرار ہو کر باڈر کراس کر کے اپنے وطن پاکستان پہنچنا ہے۔ کیونکہ اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ انڈین پولیس اور جیل کے حکام اسے بیس سال بعد بھی آزاد نہ کریں گے۔

کبھی کبھی وہ نجمی کو یاد کر کے اداس ہو جاتا۔ یہ سوچ کر اس کے ضمیر پر ایک بوجھ سا پڑ جاتا کہ نجمی کو اس حال تک پہنچانے میں اسی کا ہاتھ ہے۔ نجمی نے اسے اپنی نجی زندگی کے بارے میں صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ایک بنگالی عورت کے ہاں ملازم ہے جس کا نام سکھی بائی ہے اور جس نے ٹائپ وغیرہ کا ایک ادارہ کھول رکھا ہے۔ نجمی نے اپنی حقیقی زندگی اور گناہ آلود شب و روز کو ندیم پر ظاہر نہیں کیا تھا اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

شبانہ کی طرف ہم ذرا بعد میں جائیں گے اس وقت وہ واشنگٹن میں اپنے شوہر کے ساتھ ایک

پُر اذیت زندگی بسر کر رہی ہے اس کا خاوند احساس کمتری کا شکار ہے اور شبانہ کے ساتھ اس نے شادی صرف اسی غرض سے کی تھی کہ شبانہ اس سے نفرت کرتی تھی اور اس نے اس کی دو ایک بار بے عزتی بھی کی تھی۔ اب وہ گن گن کر شبانہ سے بدلے لے رہا تھا اور شبانہ شدید ذہنی اذیت کا شکار تھی مگر اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی عزت کو سینے سے لگائے اپنے ظالم شوہر ظفر کی تمام زیادتیوں کو برداشت کر رہی تھی۔ ابھی تک اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ شبانہ کا باپ اپنے داماد کا مقروض تھا اور لاہور والی کوٹھی "کینال لاج"، بھی ظفر نے خرید کر اپنے نام کروا لی تھی۔

شبانہ کو ہم تھوڑی دیر کے لیے اس کے حال پر چھوڑ کر ندیم اور نجمی کی طرف آتے ہیں۔ نجمی کو کلکتہ پولیس نے رہا کر دیا تھا۔ انسپکٹر منجریکر نے چندا کو لکھی بائی کے حوالے کرتے ہوئے خاص طور پر اسے ایک طرف لے جا کر کہا تھا "چندا تمھارے پاس ہی رہے گی .... پولیس کی طرف سے یہ تمھیں حکم ہے کہ چندا تمھیں چھوڑ کر اور کسی کے پاس نہیں جائے گی جب تک تمھیں کوئی دوسرا حکم نہیں ملتا چندا تمھارے پاس ہی رہے گی اس کا ذکر تم چندا سے نہیں کرو گی۔"

لکھی بائی سر پیٹ کر رہ گئی۔ چندا کے واپس آنے کی اسے خوشی بھی تھی کہ اس کا دھندا چلتا رہے گا مگر دھندا تو وہ چلاتی ہی رہتی تھی وہ تو چندا کو راجکمار کے پاس فروخت کر کے لاکھوں روپے کمانا چاہتی تھی لیکن پولیس کے احکامات کے آگے وہ مجبور ہو گئی۔ اب لازمی طور پر کچھ عرصے کے لیے ہی سہی مگر اسے نجمی کو اپنے پاس ہی رکھنا تھا اور وہ اس کا کہیں بھی سودا کر کے مال اکٹھا نہیں کر سکتی تھی۔ لکھی بائی نے اتنا ضرور کیا کہ نجمی کو چھوٹے چھوٹے ناچ گانے سے الگ کر لیا اور اس کی صحت کا خاص خیال رکھنا شروع کر دیا تاکہ سال دو سال بعد جب پولیس اسے اجازت دے تو نجمی کا حسن برقرار ہو اور وہ راجواڑے کے راجکمار سے منہ مانگا انعام یا دام حاصل کر سکے۔ راجکمار کو سال ڈیڑھ سال کے لیے ٹالنے کا فن لکھی بائی خوب جانتی تھی۔ سیکرٹ سروس کے آدمی باقاعدہ نجمی کی نگرانی پر لگا دیئے گئے تھے وہ جس بنگلے میں بھی ہوتی خفیہ پولیس والے اس بنگلے کی نگرانی کرتے۔ نجمی شہر میں جہاں جاتی اس کا پیچھا کیا جاتا، اسے نگاہ میں رکھا جاتا اور خفیہ پولیس کے آدمی ہر روز انسپکٹر منجریکر کو فل رپورٹ دیتے۔ انسپکٹر منجریکر اب بھی ہفتے میں ایک بار شام کو لکھی بائی کے ویران بنگلے میں تہہ خانے

میں آکر نجمی کا گانا سُنتا تھا۔ نجمی کے ساتھ بظاہر اس مرہٹے پولیس انسپکٹر کا سلوک ایسا ہی تھا جیسے نجمی کے بارے میں اس کے دل میں اب کوئی شکوک و شبہات نہیں ہیں لیکن نجمی اس سے ندیم کے بارے میں نہیں پوچھ سکتی تھی اسے کچھ علم نہیں تھا کہ ندیم کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ اتنا اسے احساس تھا کہ پولیس نے اسے ہرگز ہرگز رہا نہیں کیا ہوگا اور وہ بھارت کے کسی نہ کسی شہر کی جیل میں ہی ہوگا۔ نجمی بادل نخواستہ انسپکٹر منجریکر کے آگے گاتی اور ناچتی تھی اسے اس ہندو انسپکٹر سے شدید نفرت تھی۔ اس کے لگائے گئے زخموں کے نشان نجمی کے دل پر ابھی تک تازہ تھے۔ نجمی کے دل پر ان تمام زخموں کے نشان بھی تازہ تھے جو لوگوں نے اسے لگائے تھے۔ وہ لوگ بھی نجمی کے سامنے تھے جنھوں نے اس پر بہیمانہ تشدد کیا تھا اور اس کے ساتھ زندگی کی تھی وہ ایک ایک کو اس وحشت ناک اور عبرتناک طریقے سے قتل کرنا چاہتی تھی کہ وہ سسک سسک کر مریں۔ لیکن ابھی تک نجمی کو موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ابھی تک یہ بات بھی واضح نہیں تھی کہ یہ موقع کس قسم کا ہوگا؟ اس کی نوعیت کیا ہوگی؟

دوسری طرف ندیم جیل سے فرار ہونے کی ترکیبوں پر غور کرتا رہتا تھا۔ اسے دلی کی جیل میں آئے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ خوراک اسے واجبی سی ملتی تھی۔ صبح کو چائے کا ایک مگ سوکھی روٹی کے ساتھ اور رات کو کبھی کچھ مل جاتا اور کبھی اسے بھوکے ہی سونا پڑتا تھا۔ اب اسے اتنی اجازت تھی کہ وہ کوٹھڑی سے نکل کر جیل کے احاطے میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ دن میں ایک بار ورزش کرتا اور ایک آدھ سگریٹ کسی سے لے کر پی لیتا تھا۔ اس دوران بھی پہرے دار اس کے قریب ہی منڈلاتے رہتے تھے۔ اسے دوسرے قیدیوں کے ساتھ زیادہ گھل مل کر باتیں کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کی کوٹھڑی کے ورانڈے کے باہر جو سکھ سپاہی پہرہ دیتا تھا اس سے باتوں ہی باتوں میں ندیم نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ رائفل کی گولی اس کا سیفٹی کیچ کھینچ کر کس طریقے سے چلائی جاتی ہے۔ اس کا لباس بھی قیدیوں جیسا تھا۔ اکتوبر کا مہینہ گزر چکا تھا نومبر شروع ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی سردی بھی شروع ہو گئی تھی۔ رات کو ندیم میلا کچیلا کمبل اوڑھ کر پھٹے ہوئے کمبل پر پڑ کر سو جاتا اسے مچھر اور کھٹمل بھی بہت پریشان کرتے مگر وہ آہستہ آہستہ ان تکلیفوں کا عادی بن گیا تھا۔ دن کے وقت جب اسے ورزش کے لیے احاطے میں لایا جاتا تو وہ کنکھیوں سے جیل کی دیوار کا بار بار جائزہ لیتا یہ دیوار کچی تھی مگر کافی اونچی تھی۔

اور سیڑھی کے بغیر اس کو پھاندنا ناممکن تھا۔ ندیم نے دیوار کو پھاندنے کے سلسلے میں بہت غور و فکر کیا اسے کوئی رستہ نظر نہ آیا کوئی ترکیب سجھائی نہ دی وہ دوسرے طریقوں پر غور کرنے لگا کوئی دوسرا طریقہ بھی اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا اسے سوائے ورزش کے اوقات کے باقی کسی وقت بھی اپنی تنگ و تاریک کوٹھری سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ پھانسی کی کوٹھری تھی اور اس کے آگے ایک چھوٹا سا ورانڈہ تھا جس کے دونوں جانب لوہے کے سلاخ دار دروازے لگے تھے جیل میں زیادہ تر سکھ قیدی تھے جو دن بھر شور مچاتے رہتے تھے کچھ ہندو مسلمان قیدی بھی تھے جو مختلف جرائم کی پاداش میں ملی ہوئی سزائیں کاٹ رہے تھے۔ نومبر کا مہینہ بھی گذر گیا۔ دسمبر میں دلی میں کڑاکے کی سردی پڑنے لگی اب ندیم کو دن کے وقت تھوڑی دیر کے لیے دھوپ میں بھی لایا جانے لگا۔ صورت شناسائی تو سبھی قیدیوں سے رہی لیکن فقیریا نامی دلی کے ایک مسلمان قیدی سے ندیم کی اکثر گفتگو ہوا کرتی۔ ایسا لگتا تھا کہ پولیس والے ندیم کو بھول گئے ہیں اور یا پھر اسے ہمیشہ کے لیے جیل میں ڈال دیا گیا ہے کہ ایک روز یہیں مر کھپ جائے گا جس طرح کہ ندیم کو ایک قیدی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ جو نام نہاد پاکستانی جاسوس مرجاتا ہے اسے وہیں گڑھا کھود کر دبا دیا جاتا ہے اور پھر لوگ اس کا نام بھی بھول جاتے ہیں۔ شاید اس وجہ سے اب ندیم کی جیل کے اندر کڑی نگرانی نہیں ہوتی تھی۔

دلی کا فقیریا نام کا قیدی جوان آدمی تھا جسم دُبلا پتلا تھا اس کا تعلق دلی کے ایک جرائم پیشہ گروہ سے تھا اس نے دشمنی میں آ کر ایک آدمی کا خون کیا تھا اور جیل میں دس برس کی قید کاٹ رہا تھا۔ اسے جیل میں آئے سات برس گذر چکے تھے وہ بڑا ہنس مکھ تھا اور قیدیوں سے لے کر جیل کے پہریداروں اور سپاہیوں تک سے ہلکا پھلکا مذاق کر لیا کرتا تھا۔ جیل کے اندر تقریباً سبھی قیدیوں کو معلوم تھا کہ ندیم پاکستانی جاسوس ہے اور دوسرے پاکستانی جاسوسوں کی طرح غیر معینہ مدت کے لیے بغیر مقدمہ چلے جیل میں بند ہے۔ اس جیل میں ندیم کے سوا کوئی دوسرا پاکستانی جاسوس نہیں تھا۔ فقیریئے نے ایک روز ندیم سے بڑا فضول سا مذاق کیا۔ ندیم کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ خاموش رہا۔ یہاں اسے دن میں چھوٹی موٹی مشقت بھی کرنی پڑتی تھی۔ چونکہ وہ پڑھا لکھا تھا اس لیے اس سے رجسٹروں پر لکیریں ڈالنے اور پھٹی ہوئی فائلوں کی مرمت اور رجسٹروں کی جلد بندی کا کام لیا جاتا تھا۔ ان رجسٹروں میں

قیدیوں کے نام اور پتے اور مقدمات کی نوعیت اور جرائم وغیرہ کی تفصیل درج ہوتی تھی۔ ندیم کو ان رجسٹروں کے مندرجات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ فقیریا ندیم سے ہر بار مذاق کرتا۔ ایک بار ندیم نے اسے ڈانٹ دیا اس پر فقیریا لڑائی پر آمادہ ہو گیا۔ قیدیوں نے بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ اس واقعے کے تین دن بعد ندیم اپنی کوٹھری کے سامنے والے احاطے میں دھوپ میں زمین پر بیٹھا لکیریں کھینچ رہا تھا کہ کوئی شے عقب سے اس کے پاس آن گری۔ ندیم نے دیکھا یہ ایک چھوٹی سی پوٹلی تھی ایک انڈے کے برابر اس کا سائز تھا۔ ندیم نے گردن اٹھا کر جدھر سے پوٹلی آئی تھی اُدھر دیکھا کچھ فاصلے پر فقیریا زمین پر آلتی پالتی مارے دھوپ میں بیٹھا سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ پوٹلی کو کھول کر دیکھو۔ ندیم نے پوٹلی کو کھولا تو اس میں سے کاغذ میں لپٹا ہوا کھوئے کا پیڑا نکلا۔ ندیم نے ایک بار پھر فقیریئے کی جانب دیکھا اس نے ہاتھ منہ کی جانب لے جا کر اشارہ کیا کہ اسے کھا جاؤ اور مسکرانے لگا۔ اگرچہ ندیم کی فقیریئے کے ساتھ تناتنی تھی مگر ندیم کو اتنا ضرور احساس تھا کہ فقیریا دل کا برا نہیں ہے اور صاف گو انسان ہے۔ ندیم نے پیڑا کھا لیا بے حد مزیدار، میٹھا اور لذیذ پیڑا تھا۔ ندیم نے ہاتھ ماتھے کے قریب لے جا کر فقیریئے کا شکریہ ادا کیا۔ فقیریئے نے مسکراتے ہوئے منہ دوسری طرف کر لیا۔

اس کے بعد ندیم اور فقیریئے کی دوستی ہو گئی۔ اب وہ آپس میں بات چیت بھی کر لیتے تھے۔ ندیم کو فقیریئے سے بلکہ وہاں کسی سے بھی کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ اس پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام ہے جس کا اعتراف ندیم نے کبھی نہیں کیا۔ فقیریئے کو بھی ندیم نے یہی بتایا کہ وہ بے گناہ ہے۔ لاہور کے ایک کالج میں پڑھتا تھا، ایک لڑکی سے اسے محبت ہو گئی جس کو بردہ فروش اغوا کر کے مشرقی پاکستان لے گئے اور وہاں سے اسے کلکتے پہنچا دیا گیا۔ کلکتے سے اس کی محبوبہ نے کسی طرح اسے خط لکھ کر اپنا پتہ بتایا اور وہ زائرین کی ایک جماعت میں شامل ہو کر دلی پہنچا اور وہاں سے فرار ہو کر کلکتے پہنچ گیا مگر خفیہ پولیس اس کا پیچھا کر رہی تھی اور اسے کلکتے میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد اس پر بے پناہ تشدد کیا گیا۔ اذیتیں دی گئیں کہ وہ پاکستانی جاسوس ہونے کا اعتراف کر لے اور انھیں اپنے دوسرے جاسوس ساتھیوں کے نام بتا دے لیکن اسے تو کچھ بھی معلوم نہ تھا وہ تو بھارت میں اجنبی تھا۔ وہ کسی کا نام کیا بتاتا؟ اور اب اسے بغیر مقدمہ

چلائے جیل میں سڑنے کے لیے ڈال دیا گیا ہے۔ فقیریا بڑے غور سے ندیم کا بیان سن رہا تھا۔ ندیم نے فقیریئے سے ہر موضوع پر بات کی مگر اس پر یہ کبھی بھی ظاہر نہ کیا کہ وہ جیل سے فرار ہونا چاہتا ہے اور اس کے لیے سوچ بچار کرتا رہتا ہے۔ ندیم کو یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں فقیریا سرکاری آدمی نہ ہو۔ جیل میں ایسے لوگ بھی قیدیوں کی شکل میں چھوڑ دیئے جاتے ہیں جو قیدیوں کے دلوں کے راز معلوم کر کے انھیں جیل کے حکام کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ندیم نے اسی لیے فقیریئے سے ابھی تک اپنے فرار کے بارے میں ذکر تک نہیں کیا تھا وہ اپنے طور پر فرار کے طریقوں پر غور کرتا رہتا تھا۔ کوئی ترکیب اس کے ذہن میں نہیں آرہی تھی۔ دو ایک بار اسے خیال بھی آیا کہ فقیریئے کو اپنا ہم راز بنا لے۔ یہ شخص اتنی دیر سے جیل میں قید ہے اور پھر دلی کا رہنے والا ہے وہ ندیم کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ سوچ کر ندیم نے ہمیشہ اس خیال کو اپنے دل سے نکال دیا کہ فقیریا کہیں پولیس کا آدمی نہ ہو۔ دسمبر کا مہینہ بھی گزر گیا جنوری شروع ہو گیا اس دوران ندیم کی نگاہ ایک ٹرک کا جائزہ لیتی رہی تھی یہ ٹرک جیل والوں کا نہیں تھا شاید باہر سے کرائے پر حاصل کیا گیا تھا یہ ٹرک جمعرات اور پیر کے دن دوپہر کے وقت جیل کے احاطے میں آکر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جاتا تھا اس ٹرک میں جیل کے قیدیوں کے میلے کپڑے، چادریں اور جیل کے آفس کے میز پوش وغیرہ دھلنے کے لیے لے جائے جاتے تھے۔ آتی دفعہ ٹرک میں سبزیاں، پیاز وغیرہ لدے ہوتے تھے جنھیں جیل کے احاطے میں ہی قیدی ٹوکروں میں بھر کر رسوئی (باورچی خانہ) کی طرف پہنچا دیتے تھے اگرچہ اس ٹرک میں سوار ہو کر فرار ہونا تقریباً ناممکن تھا لیکن ندیم کو محسوس ہوا کہ سوائے اس ٹرک کے دوسری کوئی شے اسے جیل سے باہر نہیں پہنچا سکتی۔ اس نے اسی لائن پر سوچنا شروع کر دیا۔ کالج کے زمانے میں اس نے قیدیوں کے فرار کی بہت سی کہانیاں رسالوں، کتابوں میں پڑھی تھیں وہ سب ایک ایک کر کے اسے یاد آرہی تھیں جیل کی دیوار اتنی اونچی تھی کہ ندیم اسے کبھی نہیں پھاند سکتا تھا۔ یہ بہت بڑی جیل تھی اور اس میں سیکورٹی کا بھی بہت سخت انتظام تھا چھ واچ ٹاور تھے جہاں سرچ لائٹیں نصب تھیں۔ ظاہر ہے خطرے کے وقت چیخ چیخ کر شور مچانے والے الارم بھی لگے ہوں گے۔۔۔

واچ ٹاور پر ہر وقت مسلح سپاہی موجود رہتے تھے۔ دن کے وقت بھی اور رات کے وقت بھی۔ جیل کے دو آہنی دروازے تھے ایک دروازہ احاطے میں تھا دوسرا احاطے میں سے گزرنے کے بعد آتا تھا

دونوں آہنی دروازے بلند قامت تھے ان پر مسلح سپاہی بندوق لیے ہر وقت موجود رہتا تھا یہی وجہ تھی کہ ندیم نے دیوار پھاندنے یا ان دروازوں میں سے کسی طرح اپنی ظاہری شکل میں گزرنے کا خیال دل سے نکال دیا تھا لے دے کے صرف اس ٹرک پر اس کی ساری امیدیں مرکوز ہو گئی تھیں۔ یہ ٹرک ہفتے میں دو بار آتا تھا اور احاطے میں کوئی ایک گھنٹہ کھڑا رہتا تھا۔ پہلے اس میں لدی ہوئی ترکاریاں وغیرہ اتاری جاتیں اور پھر جیل کے مختلف کمروں سے میلے کچیلے کپڑوں کے گٹھڑ لا کر ٹرک میں بھر دیئے جاتے اس کام میں کبھی گھنٹہ اور کبھی ڈیڑھ گھنٹہ لگ جاتا۔ اس دوران ٹرک کا سکھ ڈرائیور وہاں موجود نہیں رہتا تھا۔ وہ شاید جیل کی کینٹین میں چائے وغیرہ پینے یا کھانا کھانے چلا جاتا تھا۔ ٹرک کا کلینر کوئی نہیں تھا ٹرک اوپر سے کھلا تھا صرف ڈرائیور کی سیٹ والا حصہ ڈھکا ہوا تھا سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ندیم اس ٹرک تک کس طرح پہنچے کیونکہ جس وقت ٹرک احاطے میں داخل ہوتا تھا ندیم اپنی کوٹھری والے برآمدے سے نکل کر دیوار کے ساتھ دھوپ میں بیٹھا سگریٹ بیڑی پی رہا ہوتا تھا۔ اس وقت دھوپ اس کی کوٹھری والے احاطے کی دیوار کے ساتھ بھری ہوتی تھی اور ندیم وہاں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا ہوتا تھا۔ جلد سازی وغیرہ کا کام وہ بارہ بجے تک ختم کر دیتا تھا اس کے بعد دھوپ میں آکر بیٹھ جاتا پہریدار بھی اس وقت کھانا وغیرہ کھانے چلا جاتا اس وقت وہاں اس کی جگہ پر کوئی دوسرا پہریدار نہیں ہوتا تھا اصل میں ندیم کے امن پسند رویئے اور حسن اخلاق کے باعث اسے جیل کے اندر اب کافی چھوٹ دیدی گئی تھی۔

وہ بھی جان بوجھ کر باتوں باتوں میں قیدیوں یا پہریدار سپاہیوں سے یہی کہا کرتا کہ اب تو ساری زندگی اس جگہ گزارنی ہے اب تو مجھے جیل کے ماحول سے بڑا لگاؤ ہو گیا ہے یہ جگہ چھوڑ کر جانے کو دل ہی نہیں کرتا وغیرہ اس کے یہ خیالات بہرحال جیل کے وارڈنوں اور سپرنٹنڈنٹ تک پہنچ جاتے تھے لہذا اسے تھوڑی سی آزادی دیدی گئی تھی اب اپنے کوٹے کا کام ختم کرنے کے بعد اسے اجازت تھی کہ وہ احاطے میں چہل قدمی کر سکتا تھا۔ وہ کچھ دیر فقیریئے کے پاس بھی دھوپ میں بیٹھ کر گپ شپ لڑاتا اس نے فقیریئے کو بھی یہی تاثر دیا تھا کہ جیل میں اس کا جی لگ گیا ہے اب پاکستان جانے کا خیال بھی اس نے دل سے نکال دیا ہے ایک روز فقیریئے نے چڑ کر کہا ,,تم کیسے پاکستانی ہو کہ کی جیل سے دل لگا بیٹھے مجھے تمہارے پاکستانی ہونے پر شک ہے ,,

ندیم نے سر کو نفی کے انداز میں جھٹکتے ہوئے کہا "جب ساری زندگی اسی جیل میں ہی گزارنی ہے تو پھر یہی بہتر نہیں ہے کہ یہاں جی لگا لیا جائے؟" فقیر یئے نے سگریٹ کا کش لگا کر کہا۔

"یہ کہو نا پھر.... یہ تو نہ کہو کہ تمھارا دل یہاں لگ گیا ہے اور پاکستان کا خیال ہی نہیں آتا میرے یار اپنا وطن اپنا ہوتا ہے۔ میں پاکستان کبھی نہیں گیا لیکن مجھے اس ملک سے عقیدت ہے۔"

ندیم خاموشی سے فقیر یئے کی گفتگو سنتا رہا۔ وہ فقیر یئے کو اپنا ہم خیال نہیں بنانا چاہتا تھا۔ ابھی تک اسے اس پر اعتماد نہیں تھا۔ ندیم نے اپنی ساری توجہ جیل میں آنے والے ٹرک کی آمد و رفت کے اوقات وہاں کھڑے رہنے کے دورانیے اور سکھ ڈرائیور کی نقل و حرکت پر مرکوز کر دی۔ جنوری کا مہینہ بھی گزر گیا۔ ندیم کو اس دوران ٹرک اور اس کے ڈرائیور کی نقل و حرکت کے اوقات زبانی حفظ ہو گئے۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ جیل میں اس کی کسی نے خبر تک نہیں لی تھی۔ پولیس نے اسے ایک بار بھی مزید پوچھ گچھ کے لیے نہیں بلایا تھا۔ یہ بات ندیم کے حق میں اچھی ہی تھی۔ اسے پورے اطمینان سے اپنے فرار کے منصوبے پر غور کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ ندیم نے دیکھا کہ ہر ہفتے ٹرک سے سبزیاں اتارنے والے قیدی بدل دیئے جاتے ہیں۔ جب ٹرک میں میلے کپڑوں کے گٹھڑ لاد دیئے جاتے ہیں تو کم از کم پندرہ منٹ تک ٹرک احاطے میں اکیلا کھڑا رہتا ہے سکھ ڈرائیور اس کے پندرہ بیس منٹ کے بعد آتا ہے۔ ٹرک کا دروازہ کھول کر اس میں سوار ہوتا ہے اور ٹرک کو بیک کر کے جیل کے احاطے والے آہنی دروازے کی طرف لے جاتا ہے۔ پہریدار کو کھڑکی میں سے ہاتھ نکال کر کوئی پرچی تھماتا ہے۔ پہریدار ٹرک کے پیچھے آ کر رسمی طور پر میلے کپڑوں کے گٹھڑوں پر ایک اڑتی ہوئی نظر ڈالتا ہے اور ٹرک کو باہر جانے کی اجازت مل جاتی ہے۔ ندیم نے اس بات پر غور کرنا شروع کر دیا کہ کیا کسی طرح سے اس کی ڈیوٹی ٹرک میں میلے کپڑوں کے گٹھڑ لادنے والوں میں نہیں لگ سکتی۔ بہت جلد اس نے معلوم کر لیا کہ یہ ڈیوٹی صرف ایسے قیدیوں کی لگائی جاتی ہے جو سال بھر کی یا زیادہ سے زیادہ دو سال کی سزا کاٹ رہے ہیں لمبی سزائیں کاٹنے والوں کو ٹرک کے نزدیک بھی نہیں آنے دیا جاتا۔ اس کے باوجود فقیر یا سگریٹ پیتا ٹرک کی جانب نکل جاتا تھا اور سبزیوں کے ٹوکرے اتارنے والوں سے ہنس ہنس کر مذاق کی باتیں کیا کرتا تھا۔ ندیم کافی سوچ بچار کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا کہ ٹرک میں سوار ہونے کا صرف ایک ہی موقع ہو سکتا ہے یعنی جب ٹرک میں میلے کپڑوں کے گٹھڑ لد چکے ہوتے ہیں اور پندرہ بیس منٹ کے لیے

ٹرک کے آس پاس کوئی نہیں ہوتا۔ سکھ ڈرائیور بھی کہیں کینٹین میں میٹھا چائے وغیرہ پی رہا ہوتا ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ اس وقفے کے دوران ٹرک تک کس طرح جائے۔ اگر وہ ٹرک میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ جہاں ٹرک احاطے کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے وہاں سامنے جیل کی بیرکیں ہیں اور وہاں دوسرے قیدی مشقت وغیرہ میں مصروف ہوتے ہیں۔ پہریدار بھی ادھر اُدھر چل پھر رہے ہوتے ہیں۔ بیلدار بھی ہوتے ہوں گے۔ ندیم کو آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے اور اگر وہ ایک بار پکڑا گیا تو پھر اس پر بہت سختی کی جائے گی۔ ممکن ہے اسے کوٹھڑی میں دن بھر بند رکھا جائے یہ ایک بہت بڑا مرحلہ تھا مگر ندیم نے اس مرحلے میں سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کا عزم کر رکھا تھا۔

اس کے دل میں کئی بار خیال آیا کہ اس سلسلے میں فقیر یئے کو وہ اپنا ہم راز بنا لے۔ فقیر یا وہاں جیل کے پہریداروں میں بھی بڑا مقبول تھا۔ وہ آزادی سے جیل کے اندر چل پھر لیتا تھا۔ فقیر یا ندیم کی کچھ نہ کچھ مدد کر سکتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اسے کوئی مفید مشورہ ہی دیدے۔ کوئی نئی راہ سمجھا دے لیکن ندیم فرار کے راز کو اس پر ظاہر کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ اسی کشمکش میں جنوری کا آدھا مہینہ بھی گزر گیا۔ اب ندیم کی طبیعت بے چین ہونے لگی۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں ٹرک کے اوقات نہ تبدیل کر دیئے جائیں۔ اگرچہ ایسا ہوتا نظر نہیں آتا تھا لیکن ندیم کو وہم ہونے لگا تھا۔ اگر فرض کر لیا کہ ٹرک دن کی بجائے شام کو آنے لگتا ہے تو پھر ندیم کے وہاں سے فرار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ سورج غروب ہوتے ہی اسے کوٹھڑی میں بند کر دیا جاتا تھا۔ ایسا تو وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جیل میں دھنا دھن گولیاں چلاتا فلم کے ہیرو کی طرح جیل سے فرار ہو جائے۔ یوں اس کے جسم کو چھلنی کر دیا جاتا۔ وہاں تو کوئی پہریدار ایسا نہیں تھا جس کے کاندھے سے بندوق نہ لگی ہوئی ہو اور فقیر یئے نے اسے بتایا تھا کہ ان کی بندوقیں ہر وقت بھری رہتی ہیں۔ فقیر یئے نے کہا تھا "ایک بار عمر قید کے ایک سکھ قیدی نے پستول دکھا کر وارڈن کو آگے لگا لیا۔ مگر وارڈن اسے جل دے کر ایک طرف ہو گیا اور سپاہیوں نے فائرنگ کر کے سکھ قیدی کی دونوں ٹانگوں کو اس بری طرح سے چھلنی کر دیا کہ ہسپتال میں اس کی دونوں ٹانگوں کو کاٹ دینا پڑا۔"

یہ تمام باتیں ندیم کے پیش نظر تھیں۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں فقیر یا سے دلی شہر کا ضرورت کے مطابق حدود اربعہ بھی معلوم کر لیا تھا۔ کیونکہ اگر وہ جیل سے فرار ہو کر باہر جاتا ہے تو اسے کوئی

ایسا راستہ اختیار کرنا چاہیئے تھا جو اسے جیل سے دور کسی محفوظ علاقے میں پہنچا دے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ انجانے پن میں کسی ایسی سڑک پر چل دے جو آگے جا کر کسی فوجی علاقے میں یا کسی پولیس اسٹیشن کے احاطے میں جا نکلے۔ ایک دن وہ فقیریئے سے پوچھ رہا تھا کہ وہاں سے ریلوے اسٹیشن کتنی دور ہے اور کس طرف ہے تو فقیریئے نے معنی خیز نگاہوں سے ندیم کی طرف دیکھا اور بولا:-

"کیا بات ہے استاد تم یہاں سے فرار ہونے کے بارے میں تو نہیں سوچ رہے ہو؟"

ندیم نے فوراً نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "بالکل نہیں یہاں سے بھلا کوئی فرار ہو سکتا ہے۔"

فقیریئے نے کہا۔ کیوں نہیں ہو سکتا۔ آدمی کے اندر حوصلہ ہونا چاہیئے فرار ہونے کے ایک لاکھ طریقے ہیں۔"

ندیم نے بظاہر مذاق کے انداز میں پوچھا "چلو تم کوئی ایک بتا دو۔"

فقیریا سنجیدہ ہو گیا اس وقت ان کے قریب کوئی جمعدار یا حوالدار بھی نہیں تھا کہنے لگا "اپنے خدا کی قسم کھا کر کہو کیا تم یہاں سے بھاگنا چاہتے ہو۔؟"

ندیم ابھی تک اسے اپنا ہاتھ نہیں پکڑا رہا تھا۔ نہ اس کا ہاتھ پکڑ رہا تھا اسے فقیریئے پر اعتماد نہیں تھا کہنے لگا۔ "فقیریئے یہ بتاؤ کہ کون ایسا قیدی ہے جو جیل میں ہی رہنا پسند کرتا ہے۔ اور جیل سے بھاگنا نہیں چاہتا۔"

فقیریا بولا۔ "مثلاً میں ہوں میری مثال لے لو میں جیل میں ہی رہ کر اپنی سزا پوری کرنا چاہتا ہوں۔ تم پوچھو گے میں کیوں نہیں جیل سے فرار ہونا چاہتا جبکہ مجھے یہاں سے فرار ہونے کے کئی راستے معلوم ہیں تو میں کہوں گا کہ میں اس لیے فرار نہیں ہونا چاہتا کہ میں اسی شہر دلی کا جدی پشتی رہنے والا ہوں میرے ماں باپ بہن بھائی رشتہ دار اور سبھی اسی شہر میں آباد ہیں آج میں یہاں سے فرار ہوتا ہوں اور شام کو پولیس میرے ماں باپ یا بہن بھائیوں کو پکڑ کر تھانے لے جائے گی۔ ان پر تشدد کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ میں کہاں جا سکتا ہوں کس کے پاس چھپ سکتا ہوں یا پھر پولیس ان سے سیدھے سبھاؤ پوچھے گی کہ فقیریا تمہارے پاس کہیں چھپا ہوا ہے اسے پیدا کرو۔ میں اپنے رشتہ داروں اور اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کسی کے پاس بھی نہیں ہوں گا مگر پولیس انھیں مار مار کر بے حال کر دے گی۔ میں بدمعاشی میں پٹ چکا ہوں ہماری سفارش کرنے والا بھی کوئی

نہیں ہے یوں میں جیل سے بھاگ کر اپنے ماں باپ کے پاس بھی نہیں جا سکتا۔ مجھے ظاہر ہے بھارت کے شہروں میں دربدری کرنی ہو گی۔ پولیس سے چھپتے پھرنا ہو گا۔ تو میرے بھائی تم سے کہوں گا کہ اگر میں یہاں سے بھاگ کر بھی اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کی شکل نہیں دیکھ سکتا۔ بلکہ الٹا میری وجہ سے انھیں شدید تکلیف پہنچ سکتی ہے تو پھر جیل سے بھاگنے کا کیا فائدہ ہوا اس سے بہتر ہے کہ چپکے سے اپنی سزا کاٹوں اور اچھے چال چلن کی وجہ سے جو تھوڑی بہت رعایت ملتی ہے حاصل کروں اور ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ جاؤں ٹھیک ہے نا۔ مگر تمہیں جیل سے فرار ہونا چاہیئے کیونکہ یہ ملک تمہارا ملک نہیں ہے تمہیں یہاں سے کسی دوسرے ملک میں جانا ہے جہاں پر یہاں کی پولیس، یہاں کا قانون تمہارا پیچھا نہیں کر سکتا۔ اگر تم اپنی باقی زندگی یہاں کی جیل میں پڑے سڑنا چاہتے ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ تم بزدل ہو۔ یہاں سے فرار ہونا تمہارا فرض ہے۔ اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟"

ندیم سوچ میں پڑ گیا کیا وہ فقیریئے سے صاف صاف کہہ دے کہ وہ دو ماہ سے فرار کا منصوبہ بنا رہا ہے کہیں وہ مخبری تو نہیں کر دے گا وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ فقیریئے نے خود ہی مطلع صاف کر دیا۔ کہنے لگا "میرے بھائی تم مسلمان ہو پاکستان کے رہنے والے ہو جس سے ہمیں بھی محبت ہے ایک بات میری دل پہ نقش کر لو۔ فقیریا مرنا گوارا کر لے گا مگر تیرا راز کسی کو نہیں بتائے گا۔ تم پوچھو گے کیوں؟ اس لیے کہ فقیریا نے تجھے اپنا دوست کہہ دیا ہے اور ہم چاہے جتنے برے ہوں دوست کو دھوکا نہیں دیتے۔"

اب ندیم کے پاس کوئی دلیل باقی نہ تھی۔ اس نے فقیریئے کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا اور بولا۔

"فقیریئے بھائی! اب میں تم سے کچھ نہیں چھپا سکتا۔ میں واقعی یہاں سے تنگ آ چکا ہوں اور بھاگ جانا چاہتا ہوں مگر جب دیکھتا ہوں کہ یہاں سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے تو صبر شکر کر کے بیٹھ جاتا ہوں۔"

فقیریئے نے جیب سے دو سگریٹ نکال کر دونوں کو منہ میں دبا کر ایک ساتھ سلگایا ایک سگریٹ اپنے منہ میں رہنے دیا اور دوسرا ندیم کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک لمبا کش لگا کر دھواں چھوڑنے کے بعد

دائیں بائیں دیکھ کر تسلی کر لی کہ ان کی باتیں کوئی نہیں سن رہا۔" ندیم بھائی! تم ابھی بچے ہو میری عمر ان ہی جھمیلوں میں گزری ہے اور گزر جائے گی۔ اگر تم فرار ہونا چاہتے ہو تو راستہ میں تبا دیتا ہوں۔۔"

ندیم اس کا منہ تکنے لگا۔ فقیریئے نے اس یقین کے ساتھ یہ بات کہی تھی جیسے سامنے جیل کا گیٹ کھلا ہوا ہے اور وہ ندیم کو اشارہ کرے کہ جاؤ بھاگ جاؤ۔ ندیم نے اب اسے ٹرک کے بارے میں تبا دیا۔ فقیریا مسکرایا استاد اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دیر سے فرار کے منصوبے تیار کر رہے ہو۔ نہیں میرے بھائی ٹرک والے کام میں جان کا خطرہ ہے اور تم پکڑے بھی جاؤ گے اس لیے کہ ٹرک جب جیل کے دوسرے گیٹ سے نکل کر باہر جاتا ہے تو اسے روک دیا جاتا ہے اور سپرنٹنڈنٹ کی نگرانی میں ٹرک کے پیچھے لدی ہوئی میلے کپڑوں کی گٹھڑیوں پر کھولتا ہوا گرم پانی ڈال دیا جاتا ہے تاکہ اگر کوئی قیدی پہرے داروں کو رشوت وغیرہ دے کر ان گٹھڑیوں میں چھپ کر فرار ہونے کی کوشش کرے تو گرم پانی کی وجہ سے اس کا پتہ چل جائے۔" ندیم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی وہ اس منصوبے پر عمل نہیں کر سکا تھا۔ اس نے فقیریئے سے پوچھا "تم مجھے کونسا طریقہ تبا سکتے ہو؟" فقیریئے نے سگریٹ کا کش لگا کر کہا "ایک ایسا طریقہ کہ تم پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں جیل کی چار دیواری سے باہر ہو گے۔"

٭ ٭ ٭

فقیریا سگریٹ کا کش لگا کر بولا "ابھی بہت ٹائم ہو گیا ہے۔ ہمارا زیادہ دیر یہاں ٹھہر کر باتیں کرنا ٹھیک نہیں ہے دوسروں کو شک پڑ سکتا ہے۔ تم اب کوٹھڑی میں جاؤ۔ میں تمھیں یہاں سے فرار کی ترکیب کل دوپہر کو بتاؤں گا۔۔" فقیریا یہ کہہ کر اٹھا اور بہادر شاہ ظفر کا شعر گنگناتا اپنی بیرک کی طرف چلا گیا۔ ندیم بھی اٹھ کر اپنی کوٹھڑی میں آ گیا۔ رات کو دیر تک اسے نیند نہ آئی۔ وہ یہی سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہا کہ فقیریئے کو اس کے دل کا حال معلوم ہو گیا ہے لیکن وہ وارڈن کو تو نہیں تبا دے گا کہ یہ پاکستانی جاسوس یہاں سے فرار ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے اس طرح سے ندیم پر سختی آ سکتی تھی۔ اسے ایک ماہ کے لیے قید تنہائی میں بھی ڈالا جا سکتا تھا۔ خدا خدا کر کے رات گزر گئی دن نکل آیا۔ ندیم نے جلد سازی کا کام شروع کر دیا۔ دوپہر تک اس نے اپنے کوٹے کا سارا کام ختم کر دیا۔ کوٹھڑی میں ہی ابلی ہوئی بد ذائقہ سبزی کے ساتھ دو سوکھی ہوئی روٹیاں کھائیں اور معمول کے مطابق جمعدار اسے احاطے میں لے گیا جہاں گرم گرم دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ندیم دیوار کے ساتھ لگ کر دھوپ میں بیٹھ گیا۔ اس کے جوڑ جوڑ کو دھوپ کی گرمائش پہنچی تو اسے بے حد سکون ملا۔ اس کی نظریں فقیریئے کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس کو ایک طرف سے ہنسی ٹھٹھے کی آواز سنائی دی۔ فقیریا ہر ایک سے ہنسی مذاق کرتا فقرے چست کرتا احاطے کی دھوپ میں نکل آیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ ندیم کے پاس بھی آ گیا۔ دور ہی سے اسے سلام کیا اور حال چال پوچھا اور بولا۔

"کیوں میاں آج کتنی جلدیں باندھیں ارے یار میرے تو باہر جا کر جلد سازی کی دکان کھول سکتا ہوں یہ لے اسی خوشی میں سگریٹ کا کش لگا" فقیریا اسی بہانے ندیم کے قریب آ گیا۔ اس نے اپنا

جلتا ہوا سگریٹ ندیم کی طرف بڑھایا اور اس کے قریب ہی دھوپ میں ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں سامنے جیل کی دیوار کی جانب جمی تھیں۔ آہستہ سے بولا ”تم ضرور سوچ رہے ہوگے کہ کہیں فقیریئے نے وارڈن کو تو نہیں بتا دیا۔ پاکستانی جاسوس بھاگنے والا ہے۔“

فقیریا ہنس دیا ”تم پوچھو گے مجھے کیسے پتہ چلا؟ میں کہوں گا کہ سب ہی ایسا سوچتے ہیں! لیکن بھائی فقیریا مرد کا بچہ ہے۔ حق اور انصاف کی خاطر اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہے۔ وہ تم سے غداری کیسے کرے گا۔ اب سن میں تمھیں یہاں سے بھاگنے کی ترکیب بتاتا ہوں۔ میری ملاقات ہر جمعے کو آتی ہے۔ ماتا پتا اور بھائی بہن تو مہینے میں ایک بار ہی آتے ہیں مگر میرا یار راجو ہر جمعے کو مجھ سے ملنے کو آتا ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔ وہ تمھاری مدد کرے گا۔“ ندیم اس کا منہ تک رہا تھا۔ پھر دیوار کی طرف منہ کر کے بولا ”وہ میری کیا مدد کرے گا فقیریئے؟ وہ تو جیل سے باہر ہے۔ میں جیل کے اندر ہوں۔“ فقیریا بولا ”میری بات خاموشی سے سنتے جاؤ۔ یہاں جہاں تمھاری کوٹھری ہے اس کے عقب میں بھی ایک احاطہ ہے اس احاطے کی دیوار کے ساتھ املی کا ایک بڑا درخت ہے۔ اس درخت کی شاخیں جیل کی دیوار کے بالکل اوپر آئی ہوئی ہیں۔ پہلے ان شاخوں کو ہر مہینے کاٹ دیا جاتا تھا مگر اب دو مہینے گزر گئے ہیں ان شاخوں کو نہیں کاٹا گیا۔ تمھارا کام یہ ہے کہ اس درخت پر رات کے اندھیرے میں چڑھ کر جیل کی دیوار پر آتے کر دوسری طرف کود جاؤ۔ دوسری طرف میرا یار راجو موجود ہوگا۔ باقی وہ خود سنبھال لے گا۔“

ندیم کو ہنسی آ گئی۔ فقیریئے نے اس ہنسی کو پسند نہیں کیا تھا۔ ندیم نے فوراً معذرت کرتے ہوئے کہا ”فقیریا بھائی معاف کرنا مجھے اس لیے ہنسی آ گئی تھی کہ یہ تو بگلے کی آنکھ پر موم لگا کر اسے پکڑنے والی ترکیب ہے۔ بھلا میں رات کے اندھیرے میں اپنی کوٹھری سے نکل کر دروازے کا تالا کھول کر املی کے درخت کے پاس کیسے پہنچوں گا؟ کیا سارے پہریدار اور جمعدار سو رہے ہوں گے؟“

فقیریئے نے کہا ”ہاں سو رہے ہوں گے بلکہ بے ہوش ہوں گے۔ سنو یہ سب جمعدار اور پہریدار اور سپاہی نشہ کرتے ہیں؟ انھوں نے مجھے اتنی آزادی کیوں دے رکھی ہے؟ صرف اس لیے کہ میں ان کا نشہ پورا کرتا ہوں۔ میں انھیں یہاں آدھی سے بھی کم قیمت پر چرس، کوکین اور شراب ولایتی سپلائی کرتا ہوں۔ یہ مال باہر سے میرا یار راجو لا کر دیتا ہے۔ میں چرس سے بھرے

ہوئے سگریٹ ان لوگوں کو دیتا ہوں۔ باہر ایک سگریٹ کی قیمت ایک روپیہ ہے جبکہ میں انھیں یہاں چار آنے میں سپلائی کرتا ہوں اور میری چرس بھی خالص ہوتی ہے۔ صرف اس لیے کہ یہاں میں قید کے باقی دن پورے کر سکوں اور میری رپورٹ بھی اچھی جائے اور مجھے چھوٹ مل جائے۔ اس جمعہ کو میرا یار راجو ملاقات کے لیے آئے گا تو میں اسے ساری بات سمجھا دوں گا ساری اسکیم بتا دوں گا اور اس سے اگلی دفعہ تین ایسے سگریٹ لانے کو کہوں گا جن میں کچھ ملا ہوا ہوگا۔ صرف تین سگریٹ ہی کافی ہوں گے۔ ایک سگریٹ تمھارے وارڈ کا جمعدار لے گا۔ دوسرا احاطے میں رات کو املی کے درخت کے قریب پہرہ دینے والا لے گا۔ تیسرا سگریٹ میں تمھارے وارڈ کے سامنے جو سپاہی پہرہ دیتا ہے اس کو دے دوں گا۔ یہ لوگ ضرور رات کو چرس والے سگریٹ پی کر پہرہ دیتے ہیں۔ اگر چرس نہ پئیں تو یہ ایک جگہ جم کر بیٹھ ہی نہیں سکتے۔ چرس کا سگریٹ پی کر وہ مست ہو جاتے ہیں اور پھر اسٹول پہ بیٹھے ٹکٹکی باندھے جیل کی اندھیری دیوار کو تکتے رہتے ہیں۔

ندیم نے کہا... ”لیکن میری کوٹھری کا تالا کون کھولے گا؟ فقیریا سگریٹ کو دور پھینکتے ہوئے ادھر اُدھر تکنے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا ”یہ کام میں کروں گا۔ کیونکہ میں ہی ان جمعداروں کو رات کے وقت نشے والے سگریٹ دیا کرتا ہوں۔ دن کے وقت یہ سگریٹ اپنے پاس رکھتے ہوئے گھبراتے ہیں کیونکہ انھیں پکڑے جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ میں جب رات کے وقت تمھارے جمعدار کو سگریٹ دینے آؤں گا تو اسے کسی بہانے تمھاری کوٹھری والے برآمدے میں لے آؤں گا اور اس وقت تک اُسے اس برآمدے میں ہی رکھوں گا جب تک کہ وہ سگریٹ کے چار پانچ کش نہیں لگا لیتا۔ چار پانچ کش چرس والے سگریٹ کے بہت ہوتے ہیں۔ زیادہ کش لگانے سے انسان کی موت بھی واقع ہو جاتی ہے اس کے بعد میں جو کروں گا تم خود ہی دیکھ لو گے۔“

ندیم کو فقیریئے کا بھی بہت خیال تھا۔ اس نے کہا ”فقیریئے بھائی ایسا نہ ہو کہ بعد میں تم پر کوئی مصیبت پڑ جائے۔“

فقیریا بولا ”اول تو یہ تینوں جمعدار رات بھر بیہوش رہیں گے بلکہ صبح کو بھی بیہوش ہی ہوں گے جب یہاں تمھارے جیل توڑ کر بھاگنے کا شور مچے گا تو ثبوت بیہوش جمعدار وہیں پڑا ہوگا سب

کو معلوم ہو جائے گا کہ جمعداروں نے رات کو نشہ زیادہ کر لیا اور بے ہوش ہو گئے اور پاکستانی جاسوس کو فرار کا موقع مل گیا۔ اس میں میرے پھنسنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پھر وارڈرن سے لیکر حوالداروں تک سب مجھ سے شراب اور چرس لے کر پیتے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ اگر مجھ پہ ہاتھ ڈالا تو میں عدالت میں صاف بتا دوں گا کہ جمعدار کیا مجھ سے تو وارڈن بھی چرس لے کر پیتے ہیں، تم میری بات چھوڑو۔ پرسوں جمعہ ہے راجو میرا یار آ رہا ہے۔ میں سب کام پکا کر دوں گا۔ تم اب صرف ایسا کرنا کہ اس دوران مجھ سے احاطے میں زیادہ بات چیت مت کرنا۔ میں بھی تمھارے پاس کم آیا کروں گا اب میں جاتا ہوں۔"

فقیریا اپنے چمکیلے سیاہ بالوں میں کنگھی کی طرح انگلیاں پھیرتا دوسری طرف چل دیا۔ دن گزرتے چلے گئے۔ جمعہ کا دن بھی آ گیا۔ ہفتے کی دوپہر کو فقیریا دھوپ سینکنے احاطے میں آیا تو کچھ دیر ادھر ادھر منڈلانے اور قیدیوں اور جمعداروں سے چہلیں کرنے کے بعد ندیم کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی بولا "سب کام ٹھیک ہو گیا ہے تم آج رات یہاں سے فرار ہو رہے ہو۔" یہ سننا تھا کہ ندیم کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے اس کا دل کچھ زیادہ ہی زور سے دھڑکنے لگا وہ فقیریئے سے کہنا چاہتا تھا کہ تاریخ کچھ آگے نہیں ڈال سکتے؟ مگر اس کی زبان سے یہ الفاظ نہ نکل سکے۔ فقیریا کہہ رہا تھا "خاص تین سگریٹ میری جیب میں الگ پڑے ہیں ان میں میرے یار راجو نے بڑے حساب کتاب سے کچھ ملایا ہے اس نے ملاقات کے وقت کہا تھا کہ اس کا تیسرا کش کوئی مائی کا لعل ہی کھینچ سکتا ہے۔ میں نے اس سے پورا پروگرام طے کر لیا ہے میں تمھارے وارڈ میں رات کے ٹھیک دس بجے سگریٹ لے کر آؤں گا۔ جمعدار کو سگریٹ سپلائی کرنے کا میرا ٹائم یہی ہے۔ میں تمھارے وارڈ والے جمعدار سپاہی کو آج رات باہر آنے کا موقعہ نہیں دوں گا وہ تمھاری کوٹھڑی کے داہنے والے برآمدے میں ہی ہو گا اور میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔

اس کے بعد کا کام میرا ہے تم جب کوٹھڑی سے نکلو گے تو میں تمھارے ساتھ نہیں ہوں گا کوٹھڑی کے عقبی احاطے میں اندھیرا نہیں ہوتا سامنے دیوار والا بلب روشن ہوتا ہے مگر تم گھبرانا بالکل نہیں کیونکہ احاطے اور بیرک کے سامنے والے دونوں پہریدار اپنی اپنی جگہ پر بے ہوش پڑے ہوں گے تم جتنی جلدی ہو سکے املی کے درخت پر چڑھ کر اس کی شاخوں کو پکڑ کر جیل کی دیوار پر اتر جانا ٹھیک اس جگہ جیل کی دیوار کے دوسری جانب کھائی کی جھاڑیوں میں ایک شخص تمھارے انتظار میں چھپ کر بیٹھا ہو گا۔ وہ تمھیں اپنے ساتھ لے کر جائے گا۔ آگے کیا کرنا ہے؟ یہ تم اسے بتا دینا۔ وہ ہر طرح سے تمھاری مدد کرے گا۔ آدمی بدمعاش اور چھرے باز ہے مگر یہ اس کا پیشہ ہے۔ دل کا بڑا نیک ہے میں نے اسے تمھارا حلیہ بھی بتا دیا ہے اس کا حلیہ تمھیں اندھیرے میں کیا معلوم ہو گا۔ بہر حال تم سے وہ صرف اتنا پوچھے گا۔ لاہور سے آئے ہو؟ تم اس کے جواب میں کہنا نہیں میں چاندنی چوک سے آ رہا ہوں بس یہی تمھاری اور راجو یعنی میرے یار کی شناخت ہو گی مگر میں تم سے ایک بات کا وعدہ ضرور لینا چاہوں گا اور وہ یہ کہ اگر بدقسمتی سے یہ پروگرام غلط ہو جائے اور کسی غلطی یا اتفاق سے پکڑے جاؤ تو کسی کے آگے میرا یا میرے یار کا نام مت لینا۔ اس کی وجہ تم نہ پوچھو۔ بس مجھے یقین دلا دو کہ تم مر جاؤ گے مگر میرا نام زبان پہ نہیں لاؤ گے۔ ندیم کے دل میں فقیریئے کا بے حد احترام پیدا ہو گیا تھا اس نے کہا "فقیریئے بھائی تمھیں یقین دلانے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ میں تمھارے ہی الفاظ دہراتے ہوئے کہوں گا کہ میں مر جاؤں گا مگر تم لوگوں کا نام میری زبان پہ نہیں آئے گا۔"

فقیریا کان میں انگلی ڈال کر ہلانے لگا۔ ندیم نے کہا "تم میرے لیے جو کچھ کر رہے ہو۔ جتنا بڑا خطرہ مول لے رہے ہو۔ تمھارا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس بھی الفاظ نہیں ہیں۔" فقیریئے نے کسی قدر جذباتی ہو کر کہا "میں جو کچھ کر رہا ہوں۔ وہ اس لیے کہ میں نے زندگی میں کبھی کوئی اچھا کام نہیں کیا۔"

فقیریئے کی آواز بھرا گئی۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور صرف اتنا کہہ کر چل دیا کہ آج رات دس بجے تیار رہنا۔ ندیم وہیں دھوپ میں بیٹھا اپنی پنڈلیوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس کے دل میں ایک ہیجان سا بپا تھا۔ جیسے سمندر کی شوریدہ سر لہریں چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر شور مچا رہی ہیں کہیں وہ پکڑا نہ جائے۔ کہیں مارا نہ جائے۔ کہیں اس کے جیل کی دیوار پر اترتے ہی واچ ٹاور کی لائیٹس روشن نہ ہو جائیں۔ خطرے کے بھونپو نہ چیخنے لگیں۔ فائرنگ نہ شروع ہو جائے۔ طرح طرح کے وسوسے اس کے دل میں سر اٹھانے لگے تھے۔ وہ اٹھ کر دھوپ میں ٹہلنے لگا۔ ایکبار اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ فقیریا کو جا کر منع کر دے کہ وہ رات کو اس کے وارڈ میں نشہ آور

ایسی آوازیں رات کے سناٹے میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ندیم کو ایسے تمباکو کی بو محسوس ہوئی جس میں عجیب سی بو ملی ہوئی تھی یہ کچھ کچھ چرس کی بو سے ملتی جلتی تھی اس کے بعد گہری خاموشی طاری ہو گئی اس خاموشی سے ندیم کے دل میں ہول سے اٹھنے لگے یہ ایسی خاموشی تھی کہ جو بم پھٹنے سے آدھے سیکنڈ پہلے کی خاموشی ہوتی ہے۔ ندیم نے اپنا سانس روک لیا پھر وہ آہستہ سے کمبل پرے کر کے اٹھا اور دبے پاؤں سلاخوں کی طرف بڑھا ابھی وہ سلاخوں سے دور ہی تھا کہ اچانک کوٹھڑی کے سامنے فقیریئے کی شکل نمودار ہوئی اس کے ہاتھ میں چابیوں کا چھلا تھا اور وہ جلدی جلدی تالے میں چابیاں آزما رہا تھا۔ آخر ایک چابی لگ گئی۔ فقیریئے نے تالا کھول کر کنڈی ایک طرف ہٹائی اور دروازہ کھول دیا ندیم باہر نکل آیا سخت سردی تھی ندیم نے جیل کا بھورے رنگ کا پوری آستینوں والا بوسیدہ سوئٹر پہن رکھا تھا باقی کپڑے جیل کی وردی اور پاؤں میں چپل تھی۔ فقیریئے نے اس کے کان میں کہا ”پیچھے مڑ کر مت دیکھنا جس طرح کہا ہے اسی طرح کرنا، اللہ کے حوالے۔“

ندیم دبے پاؤں چلتا برآمدے سے نکل کر عقبی احاطے کی طرف گھوم گیا اس کے جاتے ہی فقیریئے نے جیب سے رومال نکال کر تالے کو رگڑ کر اس پر لگے اپنی انگلیوں کے نشان صاف کیے اور تالے کو نیچے فرش پر رکھ دیا پھر اسی رومال سے دروازے کی سلاخوں کو اچھی طرح سے صاف کیا اور برآمدے سے نکل گیا۔ پہریدار برآمدے میں اسٹول کے پاس ہی فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ اسپیشل سگریٹ اس کے پاس ہی پڑا تھا۔ فقیریئے نے سگریٹ بجھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا اسی جیب سے دوسرے دونوں پہریداروں کے بجھے ہوئے آدھے آدھے سگریٹ بھی بجھنے کے بعد اس کی جیب میں پڑے تھے۔ فقیریا ان سگریٹوں کے ثبوت بے ہوش پہریداروں کے پاس نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اگرچہ جیل کے آدمیوں کو صرف فقیریا ہی چرس والے سگریٹ سپلائی نہیں کرتا تھا یہ لوگ باہر سے بھی منشیات منگوا لیا کرتے تھے تاہم فقیریا خاص طور پر ان سگریٹوں کے بجھے ہوئے ٹکڑے وہاں نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

ندیم جب احاطے کی دیوار کی طرف بڑھا تو اس کو دیوار کے ساتھ جلتے بلب کی کمزور روشنی میں دوسرا پہریدار بھی بے ہوش پڑا دکھائی دیا۔ غیر شعوری طور پر وہ جھک کر چلنے لگا۔ املی کا درخت

اب اس کے سامنے تھا اگرچہ پہریدار بے ہوش پڑا تھا پھر بھی اُسے جیل کی مغربی دیوار کے واچ ٹاور سے دیکھا جا سکتا تھا عقب سے آتی ہوئی گولی اسکا کام تمام کرنے کے لیے کافی تھی۔ ندیم کی رفتار میں تیزی آ گئی وہ بھاگ کر درخت کے پیچھے آ گیا۔ درخت کے تنے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر وہ اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ تنا کھردرا تھا اور کہیں کہیں سے ٹوٹی ہوئی شاخ کا کٹا ہوا حصہ باہر نکلا ہوا تھا۔ ندیم کو اوپر چڑھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی مگر یہ اس کی زندگی اور موت کا مسئلہ تھا اس نے چپل اتار کر اپنے پاجامے میں اڑس لی تھی۔ آخر وہ درخت کی اوپر والی کٹی ہوئی شاخ کے ٹنڈ کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک جھکولا سا دیا اور درخت کی پہلی شاخ کے ساتھ اپنی ٹانگیں پھنسا دیں اس جدوجہد میں اسے پانچ سات منٹ لگ گئے۔ ایک شاخ میں سے دوسری شاخ پر ہوتا ہوا وہ درخت کی اس شاخ پر آ گیا جو جیل کی دیوار کے اوپر لٹک رہی تھی۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں درخت کی شاخ ٹوٹ نہ جائے بڑی احتیاط سے اس نے شاخ کو نیچے جھکانا شروع کیا اور پھر خدا کا نام لے کر اس کے ساتھ خود بھی نیچے لٹک گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اوپر درخت کی ٹہنی کو پکڑ رکھا تھا اور اس کے پاؤں جیل کی دیوار سے کوئی تین فٹ اونچے تھے۔ ندیم نے آہستہ سے درخت کی ٹہنی کو چھوڑ دیا۔ وہ دیوار کے اوپر گرتے ہی بیٹھ گیا۔ جیل کی دیوار دو تین فٹ چوڑی تھی اور اسے اوپر سے گول کر دیا گیا تھا۔ ندیم نے دیوار کی دوسری طرف دیکھا نیچے ایک کھائی تھی جس میں گھنی جھاڑیاں رات کی تاریکی میں ایسے نظر آ رہی تھیں جیسے کالے کالے ہاتھی کالے کمبل اوڑھے بیٹھے ہوئے ہوں۔ یقیناً انہی جھاڑیوں میں فقیریئے کا دوست راجو چھپا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ شاید وہ اسے دیکھ بھی رہا تھا۔ دیوار کافی بلند تھی لیکن ندیم کے پاس سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ اس نے بے دھڑک جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دی۔ جھاڑیوں میں گرتے ہی کسی نے اسے تھام لیا اور سہارا دے کر اٹھایا اور پھر گھسیٹتا ہوا ایک طرف اندھیرے میں لے گیا اور سرگوشی میں پوچھا ”لاہور سے آئے ہو؟“ ندیم نے ہانپتے ہوئے جواب دیا ”نہیں میں چاندنی چوک سے آ رہا ہوں۔“ اس آدمی نے سرگوشی میں کہا ”میں راجو ہوں فقیریئے کا یار... تمھیں چوٹ تو نہیں لگی؟“ ندیم جھاڑیوں پر دائیں رخ گرا تھا۔ ہڈی وغیرہ بچ گئی تھی مگر گردن پر جھاڑیوں کی شاخیں کانٹوں کی طرح لگی تھیں ندیم نے کہا ”نہیں“

راجو نے اُسے بازو سے پکڑ لیا اور کھینچتا ہوا کھائی کی سامنے والی ڈھلان کی طرف بڑھا یہاں اگرچہ اندھیرا تھا مگر جنوری کی سخت سرد اندھیری رات میں آسمان چمکیلے ستاروں سے بھرا ہوا تھا اور اس کی پھیکی پھیکی روشنی میں جھاڑیوں کے خاکے سے نظر آ رہے تھے۔ کھائی کی ڈھلان چڑھ کر وہ دوسری طرف کچے راستے پر نکل آئے۔ راجو نے دھیمی آواز میں کہا ”میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ .... رُکنا بالکل نہیں۔“

وہ کچے راستے کو چھوڑ کر درختوں کے ایک ذخیرے میں گھس گیا۔ یہاں کافی اندھیرا تھا مگر ندیم کی آنکھیں اب اندھیرے کی عادی ہو گئی تھیں۔ درختوں میں کافی دور تک وہ تقریباً بھاگتے چلے گئے۔ درختوں کا سلسلہ ختم ہوا تو سامنے ایک کھلا میدان آ گیا جس کے دوسرے کنارے پر دُور کچھ مکانوں کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ جیل کی جانب سے گھنٹے کی آواز سنائی دی۔ رات کے ساڑھے دس بج گئے تھے۔ گھنٹے کی آواز پر ندیم کا دل زور سے دھڑک اٹھا اسے یوں لگا جیسے جیل میں خطرے کا الارم چیخ اٹھا ہو مگر یہ اس کا وہم اور خوف تھا۔ جیل میں ابھی تک کسی کو اس کے فرار کا علم نہیں ہوا تھا۔

وہ دونوں میدان کے درمیان میں سے ہو کر گزرنے کی بجائے میدان کے کنارے کنارے ہو کر چل رہے تھے۔ راجو خاموش تھا۔ اندھیرے میں چلتے چلتے ندیم نے اس کا جائزہ لیا وہ فقیریے ہی کی طرح درمیانے قد اور چھریرے بدن کا آدمی تھا اس نے سوئٹر کے ساتھ اپنے سر پر اونی ٹوپی جما رکھی تھی وہ تیز تیز چل رہا تھا اور زیادہ عمر کا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میدان کے کنارے خدا جانے کس قسم کے درخت تھے کہ ان کی شاخیں کافی اوپر جا کر تنوں سے نکلتی تھیں آگے ایک گندا نالہ آ گیا اس پر لکڑی کا ایک چھوٹا سا پُل تھا۔ راجو نے ہاتھ سے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا ندیم اس کے پیچھے پیچھے چلتا گندے نالے کے پل پر سے گزر گیا دوسری طرف ڈھلان تھی اور گھاس شبنم کی وجہ سے گیلی تھی۔ ندیم کے پاؤں اور پائنچے شبنم میں بھیگ گئے تھے۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ آخر وہ کب تک پیدل چلتے رہیں گے انہیں تو اس مقام سے جتنی جلدی ہو سکے نکل جانا چاہیئے تھا مگر وہ خاموش رہا۔ جہاں سے وہ اندھیرے میں گزر رہے تھے وہ چھوٹا سا کچا راستہ تھا جس پر درخت نہیں تھے۔ کچھ فاصلے پر کسی آبادی کی روشنیاں جھلملاتی نظر آنے لگی تھیں۔ رات

بڑی سرد تھی لیکن ندیم کو پسینہ آنے لگا تھا۔ اس کے کپڑے ابھی تک جیل کے ہی تھے۔ ندیم کو ٹرک کے گزرنے کی آواز سنائی دی۔ شاید اس بستی کے پیچھے کوئی سڑک تھی۔ بستی قریب آ رہی تھی۔ کچا راستہ ختم ہوا تو ایک درخت کے پیچھے ندیم کو اندھیرے میں ایک چھوٹی سی گاڑی کھڑی دکھائی دی۔ ادھر سے ایک انسانی سایہ ان کی طرف لپکا۔

”راجو“ اس سائے نے قریب آ کر کہا ”کام ہو گیا ہے؟“ ”ہاں“ راجو نے کہا ”کپڑے لاؤ۔“ وہ انسانی سایہ گاڑی کی طرف تیزی سے بڑھا۔ راجو نے ندیم کا بازو پکڑ کر روکا اور بولا ”یہاں تم کپڑے بدل لو۔“ اس کا ساتھی گاڑی میں سے کپڑے لے آیا۔ یہ پاجامہ قمیض، سوئٹر اور ایک کوٹ کے ساتھ کرمچ کا جوتا تھا۔ ندیم نے تیزی سے جیل کے کپڑے اتار کر دوسرے کپڑے پہن لیے اور چپل سے بھی نجات حاصل کر لی۔ راجو نے ساتھی سے کہا ”اسے اٹھا لو“ جیل کے کپڑے ایک چادر میں لپیٹ کر لفافے میں ڈال لیے گئے۔ گاڑی پرانی سی تھی اور اس کی نشستیں پھٹی ہوئی تھیں۔ راجو نے ندیم سے کہا ”پچھلی سیٹ پر لیٹ جاؤ چپکے سے۔“ ندیم نے ایسے ہی کیا۔ گاڑی کا انجن چیخ اٹھا۔ ندیم کا دل ایک بار پھر زور سے دھڑکنے لگا۔ گاڑی کسی نامعلوم منزل کی طرف چل پڑی۔ وہ کچے راستے پر دھچکوں کے ساتھ چلتی رہی۔ ندیم سمٹ کر پچھلی سیٹ پر پڑا رہا۔ گاڑی کچے راستے سے نکل کر پکی سڑک پر آ گئی اور اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ گاڑی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے گاڑی میں زیادہ ٹھنڈ نہیں تھی۔ گاڑی جب سڑک پر لگے کسی کھمبے کے قریب سے گزرتی تو ایک پل کے لیے گاڑی کے اندر روشنی ہو جاتی اور پھر اندھیرا چھا جاتا۔ ندیم نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ کامیابی کے ساتھ اپنی جان سلامت لے کر کافروں کی جیل سے نکل آیا تھا اس کا دل فقیریئے کے لیے محبت بھرے جذبات سے لبریز تھا۔ اگر فقیریا اس کی مدد نہ کرتا تو ندیم کے لیے دلّی کی جیل سے فرار ہونا ناممکن تھا۔ گاڑی سڑک پر پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ ایک ٹرک تیزی سے گزر گیا پھر ایک دو گاڑیاں بھی نکل گئیں معلوم ہونے لگا کہ گاڑی کسی مضافاتی بستی سے گزر رہی ہے۔ ندیم کو باہر سے کسی آدمی کی کسی کو پکارنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ یہ آوازیں دور ہوتی گئی تھیں۔ اب کھمبے کی روشنیاں گاڑی پر پل بھر کے لیے نہیں چمک۔ رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ گاڑی ایک بار پھر کسی غیر آباد علاقے [illegible]ت

چلی جا رہی ہے۔ ندیم کے لیے دلی ایک اجنبی شہر تھا۔ زائرین کے ساتھ وہ آیا تھا تو صرف بستی نظام الدینؒ تک ہی پھرتا رہا تھا پھر وہاں سے بھاگا تو ٹیکسی میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن تک گیا تھا مگر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ کافی بڑا شہر ہے۔ راجو اپنے ساتھی کے پاس اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے پہلی بار پیچھے گردن گھما کر کہا "تم اب بے تنک اٹھ کر بیٹھ جاؤ۔" ندیم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اس نے شیشے میں سے باہر دیکھا علاقہ واقعی غیر آباد تھا۔ دائیں جانب دور کسی سڑک اور آبادی کی روشنیاں کہیں کہیں جھلملا رہی تھیں۔ سڑک کی بائیں جانب گھپ اندھیرا تھا۔ گاڑی کی رفتار کافی تیز تھی۔ یہ سڑک کوئی.... ہائی وے لگتی تھی کیونکہ کافی کشادہ اور ہموار سڑک تھی۔ ایک جگہ پل پر گاڑی چڑھی تو راجو نے اپنے ساتھی سے گاڑی کی رفتار کم کرنے کے لیے کہا۔ گاڑی پل کے ایک طرف رک گئی اور راجو دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ یہاں پل کے کنارے خشک جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں یہ کسی خشک ندی یا نالے کا پل تھا۔ راجو نے ندیم کے جیل والے کپڑوں کی گٹھڑی خشک جھاڑیوں میں رکھی اور جیب سے ماچس نکال کر جھاڑیوں کو آگ لگا دی چپلیں دلدل میں چھپا دیں پھر جلدی سے گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا اور گاڑی ایک بار پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئی۔ ندیم کو کچھ خبر نہیں تھی کہ یہ لوگ اسے کہاں لے جا رہے ہیں لیکن اتنا اسے ضرور معلوم تھا کہ وہ اسے کسی خفیہ اور محفوظ مقام پر چھپانے کے لیے لے جا رہے ہیں کیونکہ سب سے پہلے ندیم کا کسی خفیہ مقام پر چھپے رہنا ضروری تھا اس کے فرار کا علم ہو جانے کے بعد شہر میں مشتبہ اڈوں پر ضرور چھاپے پڑتے اور پولیس اس کی تلاش میں لازمی طور پر سرگرم ہونے والی تھی۔ ندیم کو نجمی کا خیال آ گیا۔ پولیس نجمی کے پاس بھی ضرور جائے گی کہ شاید میں جیل سے بھاگ کر اسی کے پاس گیا ہوں گا۔

گاڑی سڑک سے ہٹ کر ایک کچے راستے پر مڑ گئی پھر ادھر اُدھر سے گھومتی مڑتی چکر کھاتی ایک جگہ رک گئی۔ ندیم نے کھڑکی کے ٹھنڈے شیشے کے ساتھ منہ لگا کر باہر دیکھنے کی کوشش کی مگر اسے سوائے درختوں کے کچھ نظر نہ آیا۔ راجو اور اس کا ساتھی ڈرائیور باہر نکل آئے۔ راجو نے ندیم کو بھی باہر آنے کے لیے کہا۔ یہاں ایک جھکی ہوئی چھت والا شیڈ بنا ہوا تھا جس کے عقب میں ایک مکان نظر آیا۔ مکان کے آگے ایک صحن تھا جہاں ایک بھینس بندھی تھی اندھیرے میں ندیم کو اس کی آنکھیں ٹارچ کی طرح چمکتی نظر آئیں۔ مکان کا دروازہ کھڑکیاں سب بند تھیں۔

باہر کوئی روشنی بھی نہیں ہو رہی تھی۔ راجو نے دروازے پر جا کر آہستہ سے دستک دے کر کہا۔ "میں ہوں راجو.... دروازہ کھولو" ندیم اس کے پیچھے تھا۔ راجو کا دوسرا ساتھی پیچھے گاڑی کے پاس ہی تھا۔ دروازہ آہستہ سے کھل گیا اور ایک زنانہ آواز آئی "دروازہ کھلا ہے" راجو نے ندیم کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ مکان کی ڈیوڑھی کی فضا باہر جنوری کی سرد رات کے مقابلے میں گرم تھی۔ یہاں بھی کوئی روشنی نہیں تھی۔ راجو نے غصے میں کہا "بتی تو جلا دی ہوتی" اس نے جیب سے چابی نکال کر بیٹھک کا تالا کھولا اور دروازے کا ایک پٹ کھول کر اندر گیا۔ ٹک کی آواز کے ساتھ بیٹھک کی بتی روشن ہو گئی۔ ندیم بیٹھک میں آ گیا یہاں دیوار کے ساتھ پرانی وضع کا پلنگ بچھا تھا۔ جس پر پھولدار چادر بچھی تھی اور نسواری رنگ کی بڑی رضائی تہہ کر کے رکھی ہوئی تھی۔ دیواروں پر بھارتی فلم ایکٹرسوں کی فریم کی ہوئی تصویریں لگی ہوئی تھیں، فرش پر صف بچھی تھی، کونے میں ایک گول تپائی پر پیتل کے گلدان میں کاغذی پھول سج رہے تھے۔ کارنس کے اوپر راجو ہی کی ایک چوکور تصویر شیشے میں جڑی ہوئی دیوار سے ٹنگی تھی۔ راجو کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور ندیم سے بولا "تم یہاں آرام کرو باقی کوئی فکر نہ کرنا.... تم فقیر بیٹے کے نہیں میرے بھی بھائی ہو..... تم لیٹ جاؤ میں تمھارے لیے روٹی لاتا ہوں" ندیم نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ "اسے بھوک بالکل نہیں ہے صرف پیاس لگ رہی ہے" راجو جلدی سے باہر نکل گیا۔ ندیم پاؤں اوپر اٹھا کر پلنگ پر بیٹھ گیا اور رضائی کھول کر اپنے اردگرد لپیٹ لی۔ اسے یہاں بے حد سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ راجو پیتل کے جگ میں پانی بھر کر لے آیا اس نے ندیم کو پانی دیا اور بولا "یہاں تمھاری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ غسل خانہ ڈیوڑھی میں ساتھ ہی ہے اب تم آرام کرو صبح بات کریں گے.... دروازہ اندر سے بند کر لینا" یہ کہہ کر راجو باہر نکل گیا۔ ندیم نے اٹھ کر دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ ندیم نے بیٹھک کا جائزہ لیا اس کی کھڑکیاں بند تھیں اور ان پر پھولدار پردے گرے ہوئے تھے۔ صرف روشندان کھلا تھا۔ ندیم نے کوٹ اتار کر کرسی پر رکھا اور بتی بجھا کر لحاف میں گھس گیا اس نے آنکھیں بند کر لیں اور آنکھوں میں جو تارے سے چمکنے لگے تو ان تاروں میں سے نجمی کا اداس چہرہ ابھر آیا اور اس نے ندیم سے کہا "ندیم کیا مجھ سے ملنے نہیں آؤ گے؟ میں بڑی اداس ہوں۔"

دلی میں راجو پٹے باز کے مکان پر ندیم کو ایک دن اور ایک رات گزر گئی تھی۔ آدھی رات تو وہ جیل سے فرار ہو کر آیا تھا۔ اس سے اگلا دن اور اگلی رات بھی گزر گئی۔ اس دوران راجو صرف ایک بار شام کو اس سے تھوڑی دیر کو ملنے آیا اور اسے یہ کہہ کر چلا گیا کہ پولیس بڑی سرگرمی سے اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے اور اسے یہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل کیا جائے گا۔ ندیم دن رات اس چھوٹی سی بیٹھک میں بسر کرتا۔ کھانے کی چنگیر ایک عورت بیٹھک کا دروازہ ذرا سا کھول کر پکڑا دیتی تھی۔ ندیم کو اس کا صرف ہاتھ ہی نظر آتا تھا۔ دوسری رات بھی جب گزر گئی اور دن کافی نکل آیا تو دروازے پر خاص دستک ہوئی۔ یہ راجو تھا۔ اندر آتے ہی اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ اس کے ہاتھ میں دلی کا ایک ہندی میں چھپا ہوا اخبار تھا۔ اس اخبار میں ندیم کی ایک تصویر چھپی تھی جس میں اس نے جیل کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ راجو ہندی پڑھ لکھ سکتا تھا۔ اس نے ندیم کو بتایا کہ جیل سے اس کے فرار کی خبر تصویر کے ساتھ چھپ گئی ہے اور پولیس کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ جو کوئی اس مفرور پاکستانی کو گرفتار کروانے میں مدد دے گا یا اس کے خفیہ ٹھکانے کی اطلاع دے گا اسے دس ہزار روپے انعام دیا جائے گا۔ راجو چارپائی پر بیٹھ گیا۔ پھر ندیم کی طرف دیکھ کر کہنے لگا ”پہلی بات تو یہ ہے کہ تم داڑھی مونچھ بڑھا لو۔ تاکہ تمہارا حلیہ کسی قدر بدل جائے۔ سر کے بالوں کے لمبے پٹے رکھ لو۔ لباس بھی درویشوں ایسا پہن لو۔ یہ جگہ اگرچہ شہر سے دور ہے اور میں خود یہاں سال میں ایک آدھ بار ہی پھیرا مارتا ہوں۔ پھر بھی خطرہ ہے کہ پولیس میرا پیچھا کرتے یہاں تک نہ چلی آئے کیونکہ میں بہرحال اچھی شہرت کا مالک نہیں ہوں۔ میرے یار فقیریئے نے تمہیں ضرور بتا دیا ہو گا میں یہاں راجو پٹے باز عرف چھرے مار مشہور ہوں تین بار جیل

بھی کاٹ چکا ہوں۔ ابھی تک پولیس میرے دلی والے اڈے پر نہیں آئی لیکن وہ ضرور آئے گی چھاپہ نہیں مارے گی بلکہ اپنے خفیہ آدمی میرے پیچھے لگا دے گی۔ تم آج کا دن یہاں گزارو۔ رات کے پچھلے پہر میں تمہیں یہاں سے لے چلوں گا۔“ ندیم نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا ”کیا میرے لیے یہ بہتر نہیں کہ میں یہاں سے کلکتے بھاگ جاؤں“۔ احمد خان ذرا سا مسکرایا پھر کہنے لگا ”تم واقعی اناڑی ہو۔ فقیریئے نے تمہارے بارے یہی کہا تھا کہ پہلی بار اس قسم کی بک بک میں پھنسا ہے اس نے مجھے تمہاری کلکتے والی عورت کی کہانی بھی سنا دی تھی جس کے عشق میں تم پاکستان سے چل کر یہاں آئے تھے تمہارا کیا خیال ہے کہ پولیس تمہاری اس کلکتے والی کے پاس نہیں گئی ہو گی؟ میاں بھائی وہاں تو ہر طرف خفیہ پولیس والے پھیل گئے ہوں گے۔ تم وہاں گئے نہیں اور پکڑے گئے۔ میری طرف سے بے شک آج ہی چلے جاؤ۔“

ندیم نے خاموش ہو کر سر جھکا لیا راجو ٹھیک کہہ رہا تھا۔ راجو چارپائی سے اٹھا۔ اخبار تہہ کر کے جیب میں رکھا اور بولا ”مجھے معلوم نہیں جیل میں میرے یار فقیریئے پر کیا گزر رہی ہو گی۔ ممکن ہے شک کی بنا پر اسے بھی دھر لیا گیا ہو۔ کیونکہ جیل والوں کو وہ بھی چرس سپلائی کرتا ہے اور پہریدار زیادہ چرس یا اسپیشل سگریٹ پینے سے ہی بے ہوش ہوئے تھے۔ بہرحال میں رات کو دو بجے کے بعد آؤں گا۔ بس تم یہاں سے باہر مت نکلنا۔ یہاں تمہیں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ یہ میری ایک دوست کا گھر ہے۔ میں نے اس سے خفیہ شادی کر رکھی ہے۔“

اور راجو ندیم کو آنکھ مار کر جھومتا ہوا باہر نکل گیا۔ بیٹھک کی کارنس پر ایک چھوٹا سا ٹائم پیس پڑا تھا۔ اس تنہائی میں ندیم کا یہی ایک ساتھی تھا جو اسے ہر لمحے کا احساس دلاتا رہتا تھا۔ دوپہر کو پھر خاص دستک ہوئی۔ یہ راجو کی نہیں بلکہ کھانے کی دستک تھی۔ ندیم نے جلدی سے اٹھ کر کنڈی اتار دی۔ وہ خود دروازہ نہیں کھولتا تھا۔ دوسری طرف سے راجو کی ”بیوی“ نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور چنگیر آگے بڑھا دی۔ ندیم نے چنگیر پکڑ لی اور دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ پانی کی صراحی اور گلاس بیٹھک میں موجود ہی تھے۔ کھانا کھانے کے بعد ندیم موٹا کمبل اوڑھ کر سو گیا۔ وہ دیر تک سویا رہا۔ جب آنکھ کھلی تو روشندان میں دن کی روشنی بہت پھیکی پڑ چکی تھی۔ اس نے ٹائم پیس کی طرف دیکھا سہ پہر کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ سونے سے اس کے اعصاب کو کافی سکون ملا تھا۔ جیل کا گھاس پھوس

کھانے کے بعد اسے دو روز سے گھر کا کھانا مل رہا تھا جس کے باعث اس کی کھوئی ہوئی طاقت کافی حد تک بحال ہو گئی تھی۔ پانچ بجے پُراسرار نسوانی آواز نے اسے چائے کی گرما گرم پیالی پکڑا دی۔ رات کا کھانا بھی مزیدار تھا اور اس پُراسرار خاتون نے کوفتے پکائے تھے۔ ندیم یہ سوچے بغیر کہ اسے رات دو بجے تک جاگنا ہے سارے کے سارے کوفتے کھا گیا۔ جوان لڑکا تھا بھوک خوب لگی تھی ویسے بھی ایک عرصے کے بعد اسے گھر کا کھانا ملا تھا۔ بیٹھک میں کمزور سا بلب جل رہا تھا۔ اندر ریڈیو تک نہیں تھا۔ راجو نے ندیم کو ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ ٹھیک نو بجے رات بتی بجھا دیا کرے۔ نو بجے بتی بجھانے کے بعد ندیم چارپائی یا پلنگ پر دونوں موٹے کمبل اوڑھ کر ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا وہ سگریٹ پینے لگا۔ ٹائم پیس اس کے پاس ہی کارنس پر رکھا ہوا تھا۔ کارنس کے نیچے پلنگ بچھا تھا۔ اب مرغن غذا نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا اور ندیم اونگھنے لگا۔ اسے نیند آنے لگی تھی۔ وہ سونا نہیں چاہتا تھا کیا خبر وہ نیند میں بے ہوش پڑا رہے اور راجو دستک دیتا رہ جائے۔ وہ زیادہ زور سے بھی دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتا تھا۔ ندیم آواز دے کر چائے بھی نہیں منگوا سکتا تھا۔ کیا خبر خاتون خانہ بھی سو گئی ہو۔ اس نے نیند کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ اس جنگ میں وہ بار بار پہلے سے زیادہ اونگھنے لگا۔ جونہی اس کا سر اونگھتے ہوئے ڈھلکتا وہ جلدی سے سر کو جھٹک کر آنکھیں کھول دیتا اسی طرح اونگھتے جاگتے وقت گزرتا گیا۔ ایک بار اس نے ٹائم پیس کو غور سے دیکھا۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ دو بجنے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ ندیم کو بڑا اطمینان ہوا کہ آخر اس نے نیند پر فتح پا لی تھی۔ جونہی اس نے اطمینان کا سانس لیا نیند کی ایک گہری لہر نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ وہیں پلنگ پر گردن ڈھلکا کر خواب خرگوش میں کھو گیا۔ ایک تو جوانی کی نیند تھی۔ دوسرے اس نے جیل اور تھانوں میں بہت رتجگا کیا تھا۔ بہت اذیتیں برداشت کی تھیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ٹھیک دو بجے رات جب راجو نے دروازے پر اپنی مخصوص دستک دی تو ندیم کی آنکھ کھل گئی شاید اس کی چھٹی حس نے اسے بیدار کر دیا تھا کیونکہ یہ خیال اس کے حواس پر سوار تھا کہ اُسے رات کے دو بجے تک جاگتے رہنا ہے۔ ندیم جلدی سے کمبل پرے ہٹا کر پلنگ سے اٹھا اور دروازے کے ساتھ منہ لگا کر بولا "کون؟" دوسری طرف سے راجو نے کہا "میں ہوں۔" ندیم نے دروازہ کھول دیا۔ راجو اپنے ساتھ کچھ کپڑے لایا تھا۔ آتے ہی بولا "انھیں پہن لو۔ تمھیں ابھی میرے ساتھ چلنا ہے۔" کپڑوں میں ایک کھدر کا کھلا

کرتا، کھلی مہری کا پاجامہ، ایک گرم سویٹر، گرم واسکٹ اور ایک کمبل تھا۔ ندیم نے جلدی سے یہ لباس پہن لیا۔ راجو کہنے لگا "تمھاری داڑھی کا خط وہاں جا کر ہو جائے گا اچھا کیا تم نے شیو نہیں کی۔ اب ہم یہاں سے الگ الگ باہر نکلیں گے۔ پہلے میں جاؤں گا۔ تم ایسا کرنا کہ مکان کے دروازے سے نکلتے ہی بائیں جانب ہو جانا آگے احاطے کا عقبی دروازہ ہے یہ دروازہ کھلا ہو گا۔ اس دروازے سے نکلو گے تو سامنے نیم کا پیڑ آئے گا۔ اس کے آگے ذرا سی ڈھلان ہو گی۔ اور گندی نالی بہہ رہی ہو گی۔ اس نالی کو پار کرو گے تو آگے ایک کچی پگ ڈنڈی آ جائے گی جس کی ایک جانب گودام کی دیوار ہو گی تم اس دیوار کے ساتھ دائیں طرف چلتے جانا۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا لکڑی کا پل آئے گا وہاں سے میں تمھارے ساتھ ہو جاؤں گا۔ اب میں جاتا ہوں۔"

راجو اٹھا اور بیٹھک سے نکل گیا ندیم پلنگ پر بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر اس کا دل معمول کی رفتار سے ذرا زیادہ ہی دھڑکنے لگا تھا۔ اس قسم کے خطرناک حالات سے پہلے اسے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اسے اس وقت بھی نجمی کا خیال آ رہا تھا۔ خدا جانے وہ کس حال میں ہو گی۔ کہیں پولیس اُسے تنگ تو نہیں کر رہی ہو گی۔ ندیم اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کے جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے جسم کو کمبل میں اچھی طرح سے لپیٹا اور دروازہ کھول کر دبے پاؤں چلتا ڈیوڑھی میں آ گیا۔ اس نے یہیں سے احتیاط شروع کر دی تھی۔ ڈیوڑھی میں اندھیرا تھا دروازہ بھی بند تھا۔ ندیم نے ڈیوڑھی کا دروازہ تھوڑا سا کھول کر باہر دیکھا۔ سرد ہوا اس کی پیشانی سے لگی اسے جھرجھری سی آ گئی۔ دلی کی یہ رات بڑی سرد تھی۔ باہر اندر کی نسبت گھپ اندھیرا تھا۔ تاروں کی دھیمی دھیمی روشنی میں درختوں وغیرہ کے خاکے ضرور دکھائی دے رہے تھے۔ جیسا راجو نے اسے کہا تھا اس نے ویسے ہی کیا۔ بیٹھک سے نکلتے ہی وہ بائیں جانب ہو گیا۔ آگے مکان کا پچھلا صحن تھا۔ یہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ احاطے کا لکڑی کا چھوٹا سا دروازہ آدھا کھلا تھا۔ ندیم اس دروازے سے نکلا تو سامنے اندھیرے میں ایک بہت بڑا گنجان درخت نظر آیا۔ یہی نیم کا درخت ہو سکتا تھا۔ وہ درخت کے نیچے سے خاموشی سے گزرتا ہوا آگے گیا تو آگے معمولی سی ڈھلان تھی جس کے درمیان ایک نالی بہہ رہی تھی۔ نالی میں پانی رات کے اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا۔ وہ نالی پار کر کے دوسری طرف گیا تو اسے ایک کچی پگڈنڈی مل گئی جو مشرق سے مغرب کی طرف جاتی تھی۔ دور اسے کسی عمارت کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ندیم پگڈنڈی پر اس طرف چلا جدھر ایک

اونچی دیوار پابندی کے ساتھ ساتھ مشرق کی جانب چلی گئی تھی یہی گودام کی دیوار تھی۔ ندیم دیوار کے سائے میں بالکل ساتھ لگ کر آگے چل پڑا۔ تھوڑی دور چلا ہوگا کہ اسے اندھیرے اور ستاروں کی پھیکی روشنی میں ایک ہیولا سا دکھائی دیا۔ راجو نے اسے اسی جگہ ملنے کو کہا تھا۔ ندیم ہیولا کی ایک جانب ہو کر دیوار کے ساتھ لگ کر رک گیا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دائیں بائیں دیکھنے لگا اسے اپنے پیچھے کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ ندیم نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ یہ راجو تھا۔ اس نے سر پر اونی ٹوپی جمائی ہوئی تھی۔ قریب آتے ہی سرگوشی میں بولا "پانچ قدم کا فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔" دونوں ایک چھوٹے سے غیر ہموار میدان میں سے گزر کر ایک سڑک پر آگئے۔ یہاں سڑک کی دونوں جانب اونچے اونچے درخت رات کے اندھیرے اور ٹھٹھرتی ہوئی خاموشی میں ساکت کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک درخت کے نیچے کار پہلے سے موجود تھی۔ راجو اس کار میں جا کر بیٹھ گیا۔ ندیم قریب آیا تو دیکھا کہ یہ وہی گاڑی تھی جو اسے جیل سے فرار کروا کر لائی تھی۔ ڈرائیور بھی اسی رات والا تھا۔ گاڑی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ ندیم پچھلی سیٹ پر راجو کے ساتھ بیٹھ گیا۔ گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہوا اور وہ سڑک پر روانہ ہوگئی۔ سڑک کا ایک موڑ آیا۔ گاڑی دائیں جانب گھوم گئی۔ رات کے تین بجے تھے۔ سخت سردی پڑ رہی تھی چاروں طرف ہُو کا عالم طاری تھا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن نہیں کی گئی تھیں صرف سائیڈ کی بتیاں روشن تھیں۔ ندیم کے لیے یہ اجنبی علاقے تھے۔ وہ یہاں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ دلی شہر کے بارے میں اس نے بہت کچھ سنا تھا کہ وہاں مغلیہ سلطنت کی بہت سی پرانی عمارتیں ہیں مگر ابھی تک اسے ایسی کوئی عمارت نہیں دکھائی دی تھی۔ اس سڑک کے دونوں جانب بھی بڑے بڑے درخت تھے۔ سڑک دور تک خالی تھی ایک جگہ گاڑی موڑ کاٹ کر ایک کچے راستے پر چل پڑی۔ وہ ایک ٹیلے کے قریب سے گزرے اندھیرے میں ندیم کو اس ٹیلے کے اوپر ایک گنبد کا خاکہ سا نظر آیا۔ شاید یہ کسی پرانی عمارت کا کھنڈر تھا۔ راجو خاموش تھا۔ دونوں میں سے کسی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ گاڑی ٹیلے کو پیچھے چھوڑتی ہوئی ایک درخت کے نیچے آ کر رک گئی۔ راجو نے کھڑکی کا شیشہ اتار دیا اور ندیم سے کہا "وہ سامنے تم ایک کوارٹر دیکھ رہے ہو۔ اس کے باہر کوئی روشنی نہیں ہے۔ میں پہلے وہاں جاؤں گا میرے جانے کے پانچ منٹ بعد تم گاڑی سے نکل کر کوارٹر کی طرف چلے آنا۔ میں تمھیں کوارٹر کے دروازے کے اندر ملوں گا۔ دروازہ کھلا

ہوگا۔" راجو دروازہ کھول کر نکلا اور اندھیرے میں گرم چادر کو جسم کے گرد اچھی طرح سے لپیٹتے ہوئے کوارٹر کی طرف روانہ ہوا۔ پانچ منٹ تک ندیم گاڑی کے اندر ہی بیٹھا رہا۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور بھی خاموش بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ انھیں سگریٹ پینے کی سخت ممانعت تھی۔ ندیم آنکھیں گھورتے اندھیرے میں کوارٹر کے ابھرے ہوئے خاکے کو دیکھ رہا تھا۔ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی نے اندھیرے میں اپنی کلائی پر جھک کر ٹائم دیکھا اور بولا "اب تم جاؤ۔" ندیم نے دروازہ کھولا اور جلدی سے باہر نکل گیا اندھیرے میں کمبل میں لپٹا لپٹایا اسی طرح چل دیا۔ کوارٹر کے قریب پہنچ کر اسے برآمدہ دکھائی دیا۔ برآمدے میں اندھیرا تھا۔ سامنے ہی دروازہ تھا۔ ندیم نے اسے آہستہ سے دبایا۔ دروازہ اندر کو کھل گیا۔ اندر بھی اندھیرا تھا۔ راجو کی آواز آئی "بائیں جانب ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔" اب ندیم کو اندھیرے میں راجو کا ہیولا نظر آنے لگا۔ راجو نے آگے بڑھ کر دروازے کی اندر سے کنڈی لگادی اور بولا "میرے ساتھ آجاؤ۔"

یہ کمرہ پرانے بارکوں ایسا تھا وہ ایک اور دروازے میں سے گزر گئے۔ دوسری طرف ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جس میں خدا جانے کیا کیا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ راجو کوٹھری میں آتے ہی ندیم کی طرف متوجہ ہو کر بولا "یہ جگہ کونسی ہے؟ یہاں کیا ہوتا ہے؟ اس سے تمھیں کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ اس کوٹھری کے نیچے ہمارا ایک خفیہ تہہ خانہ ہے اگر تم عام حالات میں ہم سے ملتے تو تمھیں اس تہہ خانے کے بارے کبھی علم نہیں ہو سکتا تھا لیکن اب حالات دوسرے ہیں اور تم فقیر چیتے کے دوست ہو اور فقیر چیتے کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔" اتنا کہہ کر راجو نے ایک جگہ سے لکڑی کے پھٹوں کو ایک طرف ہٹایا اور فرش پر بیٹھ کر ایک جگہ سے تختے کو اوپر اٹھایا یہاں سے ایک زینہ نیچے تہہ خانے میں جاتا تھا۔ تہہ خانہ زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ یہاں گھپ اندھیرا تھا مگر ندیم کو محسوس ہوا کہ ایک طرف سے تازہ ہوا اندر داخل ہو رہی ہے۔ راجو نے جیب سے موم بتی نکال کر جلائی۔ موم بتی کی روشنی میں ندیم نے تہہ خانے کا جائزہ لیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران سا ہوا کہ وہاں فرش پر دری بچھی تھی اور دری پر تکیے بھی پڑے تھے۔ کونے میں لکڑی کی چھوٹی سی میز رکھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی اگالدان پڑا تھا۔ راجو نے موم بتی میز پر جما دی اور ندیم کے پاس ہی دری پر بیٹھ گیا۔ یہاں زیادہ سردی نہیں تھی۔ ندیم نے کمبل کندھوں سے اتار کر نیچے کر لیا۔ راجو بولا "یہ ہماری ایک خاص خفیہ جگہ ہے یہاں ہم کیا کرتے

ہیں اور کس لیے کبھی کبھی یہاں آتے ہیں؟ یہ کبھی پوچھنا بھی نہیں اور جب یہاں سے چلے جاؤ تو کسی سے اس تہہ خانے کا ذکر بھی نہ کرنا۔"

ندیم نے کہا "خان جی! میں محسن کش نہیں ہوں کہ جو میرے ساتھ اتنا ایثار کرے میں اس کا نام پولیس کے آگے زبان پر لاؤں۔ مر جاؤں گا مگر آپ لوگوں میں سے کسی کا نام تک نہیں لوں گا۔" راجو نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر دو سگریٹ نکال کر منہ میں دبائے انھیں سلگایا۔ ایک سگریٹ ندیم کو دیا۔ دوسرے سگریٹ کا خود کش لگایا اور دھواں نکالتے ہوئے بولا "اب میاں بھائی یہ بتاؤ کہ تم کہاں جانا چاہتے ہو؟ اگر تم بارڈر کراس کر کے واپس پاکستان جانا چاہتے ہو تو اس کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے لیکن میں تمہیں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ کلکتے جانے کا خیال دل سے نکال دو۔ وہاں تم ضرور پکڑے جاؤ گے۔ ایک تو تمھیں بنگالی زبان نہیں آتی۔ دوسرے وہاں تم جس عورت کی خاطر جاؤ گے اس کی نگرانی ہو رہی ہو گی۔ جس کا مطلب یہ ہو گا کہ تمھارے ساتھ اس عورت کو بھی پولیس پکڑے گی اور اس پر بھی پاکستان کے لیے جاسوسی کرنے کا الزام لگا دیا جائے گا۔ اور یہ یہاں بہت بڑا الزام ہوتا ہے کوئی مسلمان جب اس الزام میں پکڑ لیا جاتا ہے تو پھر اس کی لاش بھی نہیں ملتی۔"

ندیم سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتے ہوئے نجمی اور صرف نجمی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگر وہ بارڈر کراس کر کے کسی نہ کسی طرح واپس پاکستان پہنچ بھی جاتا ہے تو کیا اس کا ضمیر نجمی کو اس بے کسی اور بے بسی کے عالم میں کلکتے چھوڑ آنے پر کچوکے نہیں لگائے گا؟ نجمی کے ساتھ اس نے پہلے ہی بہت زیادتیاں کی ہیں۔ اس کی زندگی کی تباہی کا وہی ذمے دار ہے۔ اب وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو ہندوستان میں آیا ہی اس لیے تھا کہ یہاں سے نجمی کو نکال کر لے جائے گا۔ سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے ندیم نے راجو کی طرف دیکھا اور کہا "خان جی! اللہ گواہ ہے میں ہندوستان آیا ہی اس لیے تھا کہ اپنی محبوبہ کو کلکتے سے نکال کر پاکستان لے جاؤں گا۔ آپ کو شاید فقیریئے نے یہ نہیں بتایا کہ جس لڑکی کی خاطر میں نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ اتنی اذیتیں اور تشدد برداشت کیا ہے میں اس سے محبت کرتا ہوں اور اس کی بربادی کی ساری ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ ہم شادی کرنے کراچی گئے تھے کہ اسے بدمعاشوں نے اغوا کر لیا بلکہ

میرے ہی ایک دوست نے مجھے دھوکا دیا اور نجمی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں اغوا ہوتی فروخت ہوتی یہاں پہنچ گئی۔" راجو ندیم کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا "تم ابھی نوجوان ہو۔ تمھاری محبت میں جوش ہے ہوش نہیں ہے۔ تم جن حالات میں گھر چکے ہو وہ کتنے سنگین ہیں تمھیں اس کا احساس نہیں ہے شاید۔ تم اپنے وطن میں نہیں ہو۔ تم ایک دشمن ملک میں ہو جہاں پولیس تمھارے خون کی پیاسی ہے۔ وہ خونخوار درندوں کی طرح تمھاری تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔ وہ تمھیں پاکستانی جاسوس سمجھتی ہے اور اس بار تم پکڑے گئے تو وہ تمھیں زندہ نہیں چھوڑیں گے تمھیں گولی مار دیں گے اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہو گا۔ میں تمھیں صرف ایک مشورہ دوں گا۔" راجو نے سگریٹ کا کش لیا اور بولا "تم بارڈر کراس کرنے یا کلکتہ جانے کی بجائے دلی میں ہی اپنے سفارت خانے میں چلے جاؤ۔ وہ تمھارے ملک کا سفارت خانہ ہے۔ وہ لوگ ضرور تمھاری مدد کریں گے۔" ندیم نے پہلے بھی اس نقطے پر غور کیا تھا۔ اسے ہر بار یہی محسوس ہوا کہ اگر وہ اپنے سفارت خانے میں جا کر پناہ لیتا ہے تو وہ اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکے گا۔ جس لڑکی کی اس نے زندگی تباہ کی تھی اور جسے لاہور کے ایک شریف گھر سے اٹھا کر گناہ آلود ماحول میں پہنچا دیا تھا اب اس کا فرض تھا کہ وہ اسے اس دلدل سے نکال کر اپنے ساتھ واپس لے جائے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے ملک کا سفارت خانہ اس کی مدد کرنے پر شاید آمادہ ہو جائے مگر نجمی کے سلسلے میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ سفارتی تعلقات کی نوعیت بڑی نازک ہوتی ہے اور کوئی بھی سفارت کار جس ملک میں وہ متعین ہو اس ملک کے ساتھ تعلقات خراب کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ ساری باتیں ندیم کے ذہن میں تھیں۔ جب اس نے راجو سے کہا "خان صاحب! یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ میں نجمی کو یہاں چھوڑ کر واپس نہیں جاؤں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ ہمارا سفارت خانہ شاید مجھے پناہ دے دے لیکن نجمی کے سلسلے میں وہ یقیناً مجبور ہو گا اور اگر سفارت خانے کی جانب سے نجمی کو حاصل کرنے کے لیے بھارتی حکومت کو کچھ لکھا بھی گیا تو بھی کچھ نہیں ہو گا۔ یقینی طور پر کلکتہ پولیس نجمی کو فوراً گرفتار کر کے غائب کر دے گی کیونکہ ہمارے سفارت خانے کی جانب سے نجمی میں دلچسپی لینے کا مطلب یہ ہو گا کہ یقینی طور پر نجمی کا تعلق کسی ایسے گروہ سے ہے جو پاکستان کے لیے جاسوسی کرتا ہے۔

راجو نے پوچھا "تو پھر تم کیا چاہتے ہو؟ کیونکہ یہاں تم زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتے تمھیں یہاں سے کسی طرف جانا ہی پڑے گا۔" جب ندیم نے فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا کہ وہ کلکتے جاکر نجمی سے ملنا اور اسے وہاں سے نکال کر کسی نہ کسی طرح مشرقی پاکستان لے جانے کی کوشش کرنا چاہتا ہے تو راجو چپ ہوگیا۔ راجو ندیم کی اگرچہ ہر طرح کی مدد کرنا چاہتا تھا اور کر رہا تھا اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو اور فقیریئے کو بھی کسی شدید خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ جب ندیم نے اسے کلکتے جانے کا فیصلہ دے دیا تو راجو نے کہا "اگر تم کلکتے جانے پر ہی تل گئے ہو تو میں تمھیں نہیں روکوں گا کیونکہ یہ تمھارے عاشقانہ جذبات اور تمھارے ضمیر کا معاملہ ہے۔ ندیم نے راجو کا ہاتھ پکڑ کر کہا "خان صاحب! میں آپ کے اور فقیریئے کے احسانوں کے بوجھ تلے پہلے ہی بہت دبا ہوا ہوں لیکن میں آپ سے ایک مدد کا ضرور طلب گار ہوں گا۔ کیا آپ کلکتے میں مجھے کوئی ایسا آدمی بتا سکتے ہیں جو آپ کا دوست بھی ہو اور جو مجھے اور نجمی کو وہاں سے نکال کر مشرقی پاکستان کا بارڈر کراس کروا سکے؟ راجو سوچ میں پڑ گیا۔ کلکتے میں اس کا ایک ایسا جگری یار موجود تھا جو ان دونوں محبت کرنے والوں کی مدد کر سکتا تھا لیکن راجو یہ سوچنے لگا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ معاملہ الٹ جائے اور ان کے ساتھ اس کا کلکتے والا دوست بھی گرفتار ہو جائے۔ پھر بات پیچھے کی طرف چلتی ہوئی فقیریئے اور راجو تک بھی پہنچ سکتی تھی۔ ندیم سمجھ گیا کہ راجو کیا سوچ رہا ہے اس نے بھرپور عزم کے ساتھ کہا "خان صاحب! ایک بات آپ اپنے دل میں نقش کر لیں کہ اگر میں خدانہ کرے پکڑا گیا تو پولیس چاہے مجھ پر جس قدر تشدد کرے۔ وہ اذیتیں دے کر مجھے مار ڈالے مگر میں خدا کو حاضر ناظر جان کر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری زبان پر آپ کا بھائی فقیریئے کا یا آپ کے کلکتے والے دوست کا نام کبھی نہیں آئے گا۔ اور نجمی کو تو میں آپ کے بارے میں یا آپ کے کلکتے والے دوست کے بارے میں ایک لفظ نہیں بتاؤں گا۔ کیا آپ کو اب بھی مجھ پر یقین نہیں آیا؟"

راجو بھی جذباتی آدمی تھا۔ یہ لوگ واقعی بڑے جذباتی ہوتے ہیں اور جذبات میں آکر ایسے ایسے کارنامے انجام دے جاتے ہیں کہ جن کے بارے میں دوسرا آدمی کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا راجو نے ندیم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دبایا اور بولا "اگر تم نے یہ عہد ہی کر لیا ہے تو میں تمھاری ضرور مدد کروں گا۔ کلکتے میں میرا ایک جگری یار رہتا ہے۔ وہ میرے کہنے پر تمھاری اسی طرح مدد کرے گا جس طرح میں

اپنے یار فقیریئے کے کہنے پر تمھاری مدد کر رہا ہوں اپنے کلکتے والے دوست کے بارے میں تمھیں بعد میں بتاؤں گا۔ سب سے پہلے تمھیں یہاں سے نکال کر کلکتے والی ٹرین میں سوار کروانے کا مسئلہ ہے میرے آدمیوں نے مجھے آج صبح ہی بتایا تھا کہ تمھاری تلاش میں اور تمھاری گرفتاری کے لیے ہوائی اڈے، بس کے اڈوں اور ریلوے اسٹیشن پر بھاری تعداد میں خفیہ پولیس والوں کو لگا دیا گیا ہے ان کے پاس تمھاری تصویریں بھی ہیں اس حلیے میں پکڑے گئے تو فوراً گرفتار کر لیے جاؤ گے ابھی تمھاری داڑھی کے بال زیادہ نہیں بڑھے تم کو نقلی داڑھی مونچھ لگائی گئی تو وہ کسی بھی وقت تمھارا بھانڈا پھوڑ سکتی ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم داڑھی مونچھ کے بالوں کے بڑھنے تک اسی جگہ چھپے رہو۔"

ندیم نے کہا "لیکن اس کے لیے تو کافی وقت درکار ہے کم از کم ایک مہینہ لگ جائے گا۔"

"ایک مہینہ تو کم از کم لگ ہی جائے گا۔" راجو نے سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا۔

ندیم بولا "کیا میں کوئی دوسرا بھیس بدل کر یہاں سے نہیں نکل سکتا۔"

راجو نے کہا "مگر تم اپنے چہرے کو کہاں اور کیسے چھپاؤ گے؟" تم اتنے تجربہ کار جاسوس نہیں ہو کہ جوگی سادھو کا بھیس بدل کر اس بھیس کو نبھا سکو۔ تم ہندی بھی نہیں جانتے اور یہاں کے سادھو لوگ تو ایسی ہندی بولتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ اور پھر جوگی سادھوؤں کے سلسلے میں خفیہ پولیس والے زیادہ مشکوک ہوتے ہیں۔ میری رائے تو یہی ہے کہ تم یہاں مہینہ ڈیڑھ مہینہ رہ کر اپنی داڑھی کے بال بڑھاؤ۔ پھر داڑھی کا خط بنواؤ۔ اور کسی دیندار مولوی کا حلیہ بنا کر ویسے ہی لباس میں یہاں سے ٹرین میں بیٹھ کر کلکتے کی طرف روانہ ہو جاؤ۔"

ندیم نے پوچھا "خان صاحب! کیا ٹرین کے علاوہ کوئی ایسا طریقہ سفر کا نہیں ہے؟" اس پر راجو جیسے کچھ سوچنے لگا چند لمحوں تک وہ خاموش رہا۔ پھر بولا "اس پر غور کیا جا سکتا ہے۔ میں حیران ہوں کہ مجھے پہلے اس کا خیال کیوں نہیں آیا۔ ایک بات ہے اب مجھے خیال آرہا ہے کہ دلی سے رات کے وقت لکھنؤ کے لیے سبزیوں کے ٹرک روانہ ہوتے ہیں۔ میرا ایک یار ٹرک ڈرائیور ہے۔ وہ ایک آڑھتی کا مال لے کر ہفتے میں دو بار دلی سے لکھنؤ جاتا ہے۔ تم اس کے ساتھ لکھنؤ تک تو جا سکتے ہو اس سے آگے وہ تمھیں ایسے ٹرک میں بٹھا دے گا جو تمھیں کلکتے لے جائے گا

وہاں سے مال لے کر ٹرک کلکتے بھی جاتے ہیں۔ لیکن ایک بات تمھیں بتائے دیتا ہوں بھائی کہ آگے تمھیں اپنی ذمہ داری پر سفر کرنا ہوگا۔ اگر پکڑے گئے تو اپنے عہد کو یاد رکھنا ہمارا نام مت لینا۔“

ندیم نے ایک بار پھر راجو کو یقین دلایا کہ حالات چاہے بد سے بدتر ہو جائیں وہ کسی کا نام نہیں لے گا اور یہی کہے گا کہ وہ اپنے طور پر کسی جیل کی دیوار پھلانگ کر بھاگا تھا اور اتنے دن دلی کے قبرستانوں میں چھپا رہا تھا۔

راجو نے کہا ”اب یہاں کی صورتِ حال یہ ہے کہ تم سارا دن اس تہہ خانے میں چھپے رہو گے صرف رات کو میں خود آکر تمھیں یہاں سے نکال کر اوپر والے کمرے میں تھوڑا ٹہلاؤں گا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے تمھیں یہاں سے نکالنے میں کچھ دن لگ جائیں۔ میں آج دن میں اپنے دوست سے ملوں گا اس سے بات کروں گا اسے سب کچھ سمجھا دوں گا پھر وہ جس پھیرے پر کہے گا تمھیں اس کے ساتھ روانہ کر دوں گا۔ تمھارے لیے کھانا بھی میں خود لے کر آؤں گا آج تو دن کے وقت میں تمھارے لیے کھانا لے آؤں گا۔ اس کے بعد ہمیشہ رات کو آیا کروں گا۔ یہ کونے میں پانی کا بھرا ہوا مٹکا پڑا ہے۔ یہ پانی باسی نہیں ہے۔ باتھ روم اوپر والے کمرے میں ہے۔ میں دن کے وقت آکر تمھیں اوپر لے چلوں گا۔ اب میں جاتا ہوں۔“

راجو چلا گیا ندیم نے جو فیصلہ کیا تھا اس سے اس کا ضمیر مطمئن ہو گیا تھا اسے ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا وہ نجمی کو اس کے بُرے حال پر چھوڑ کر اپنی جان بچا کر وہاں سے نہیں بھاگ سکتا تھا اسے نجمی کو ساتھ لے جانا تھا اسے پوری امید تھی کہ اگرچہ حالات کسی طرح سے سازگار نہیں ہیں اور مشن بے حد مشکل ہے لیکن وہ اللہ کی مدد سے ضرور اپنے مشن میں کامیاب ہوگا اور نجمی کو دلدل کے اس گڑھے سے ضرور نکال کر لے جائے گا وہاں سے مشرقی پاکستان کے بارڈر تک پہنچنا آسان تھا۔ یہاں سے وہ نجمی کو لے کر مغربی پاکستان کا بارڈر کراس نہیں کر سکتا تھا۔ ندیم کا جسم نیند کی لہروں پر ڈول رہا تھا وہ کمبل اوڑھ کر وہیں دری پر تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا اور بہت جلد گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

وہ دن نکلنے تک سویا رہا جب اس کی آنکھ کھلی تو پہلی بار اس نے وہ روشندان دیکھا جہاں

سے رات کے وقت تہہ خانے میں تازہ ہوا آتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ روشندان کم اور چوکور سوراخ زیادہ تھا اس کے آگے جھاڑیاں سی نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً یہ سوراخ کسی گڑھے میں کھلتا ہوگا جسے خشک جھاڑیوں سے ڈھانپ دیا ہوگا۔ یہ جرائم پیشہ لوگوں کا گروہ تھا جن کے دل کنول کے پھول کی طرح صاف اور دوستی کے جذبات سے لبریز تھے۔ خدا جانے اس تہہ خانے میں وہ منشیات کا اسٹاک رکھتے تھے یا جوا کراتے تھے۔ ندیم کو ان لوگوں کے اس پہلو سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ راجو اسے اپنی کلائی کی گھڑی دے گیا تھا۔ ندیم نے گھڑی دیکھی اس وقت دن کے دس بج رہے تھے اسے چائے کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ روشندان میں سے دن کی روشنی بس اتنی ہی آ رہی تھی کہ ندیم کو گھڑی کی سوئیاں جھک کر بڑے غور سے دیکھنی پڑتی تھیں۔ تھوڑی دیر گزری ہوگی کہ اسے اوپر والے کمرے میں کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ ندیم ہمہ تن گوش ہو گیا۔ آواز کوٹھری کے فرش اور تہہ خانے کی چھت پر آکر رک گئی پھر تختے کو اٹھانے کی آواز آئی یہ راجو کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ ندیم کمبل پرے کر کے چوکس ہو کر بیٹھ گیا یہ کوئی پولیس کا آدمی بھی ہو سکتا تھا۔ ندیم تیزی سے اٹھ کر تہہ خانے کی سیڑھیوں کی ایک طرف ہو کر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اگر راجو کے علاوہ کوئی دوسرا آدمی ہو تو وہ اسے وہیں دبوچ کر نیچے گرا دے مگر یہ راجو ہی تھا اس نے رومال میں بندھی ہوئی روٹی وغیرہ اٹھا رکھی تھی وہ دیکھتے ہی بولا

”خدا کا شکر ہے فقیریئے پر کوئی زد نہیں پڑی میں آج صبح اس سے ملاقات کر کے آیا ہوں۔ وہ تمھارا بہت پوچھ رہا تھا۔“ ندیم نے تشویش کے انداز میں پوچھا ”بھائی فقیریئے پر ان لوگوں کو شک تو نہیں پڑا؟“

راجو روٹی کا رومال کھولتے ہوئے بولا ”اس سے سپرنٹنڈنٹ جیل نے پوچھ گچھ ضرور کی تھی مگر فقیریئے نے صاف انکار کر دیا کہ وہ چرس بھرے سگریٹ بالکل سپلائی نہیں کرتا۔ اس کے حامی وارڈن اور دوسرے اہلکاروں نے بھی تصدیق کی کیونکہ انھیں فقیریئے سے بہت سستا نشہ میسر آجاتا تھا۔ وہ کیسے اس پر الزام لگا سکتے تھے۔ یوں فقیریا بچ گیا۔“

ندیم نے اطمینان کا سانس لیا اور پوچھا ”میرے بارے میں وہ ضرور پریشان ہوگا۔“ راجو نے کہا ”وہ کیوں پریشان ہونے لگا بھلا؟ کیا اسے معلوم نہیں کہ تم میرے پاس ہو بس وہ یہی

پوچھ رہا تھا کہ تم نے یہاں سے کدھر جانے کا پروگرام بنایا ہے وہ تو مجھے کہہ رہا تھا کہ ندیم کو بارڈر کراس کرا دو۔ میں نے اسے بتایا کہ ندیم کلکتے جانا چاہتا ہے اس پر وہ ضرور پریشان ہوا تھا لیکن جب میں نے ساری بات کھول کر بیان کی تو وہ چپ ہو گیا۔ آخر میں یہی کہا کہ ندیم ہمارا مسلمان بھائی ہے جہاں وہ جانا چاہتا ہے اسے حفاظت سے وہاں تک پہنچا دینا۔"

ندیم نے ایک بار پھر فقیر بیٹے کا شکریہ ادا کیا۔ راجو کھانے میں خشک بھنی ہوئی مچھلی کباب اور روٹیاں لایا تھا روٹیاں اور کباب کافی تھے وہ کہنے لگا "میں ناشتہ کر کے آیا ہوں یہ کھانا کل شام تک کے لیے کافی ہے کل رات کو میں پھر تمہارے لیے کچھ نہ کچھ بنا کر لیتا آؤں گا۔"

وہ ساتھ ایک چھوٹی تھرمس میں چائے بھی بھر کر لایا تھا ندیم نے تھوڑا سا کھانا کھایا اور دونوں چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ ندیم کے پوچھنے سے پہلے ہی راجو نے کہا "میں ابھی اپنے اس دوست سے نہیں مل سکا جو تمھیں اپنے ٹرک میں بٹھا کر لکھنؤ لے جائے گا دوپہر کو اس سے ملوں گا اور پھر کل شام کو تمہارے پاس آ کر تفصیل بتاؤں گا۔ آؤ میں تمھیں اوپر باتھ روم دے پاؤں۔"

باتھ روم اوپر والی کوٹھڑی کے ساتھ ہی تھا جب ندیم باتھ روم سے منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلا تو راجو اسے دوبارہ واپس نیچے تہہ خانے میں لے آیا اور کہنے لگا کہ تم اگر چاہو تو خود تہہ خانے کا تختہ اوپر اٹھا کر باتھ روم میں جا سکتے ہو میں نے اوپر لکڑی کے بھاری تختے اٹھا لیے ہیں صرف خالی بوریاں ہی ڈال دی ہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر راجو چلا گیا۔ ندیم اپنے الجھے ہوئے اضطراب انگیز خیالات میں غوطہ زن ہو گیا اس کے سامنے بلا شبہ ایک خطرناک مرحلہ تھا چاروں جانب اوپر زمین پر انڈین انٹیلی جنس اور پولیس کا جال بچھا ہوا تھا وہ کہیں بھی کسی بھی وقت اس جال میں الٹ کر پکڑا جا سکتا تھا اور اس بار پکڑے جانے کا مطلب سوائے ایک اذیت ناک موت کے اور کچھ نہیں تھا انڈین انٹیلی جنس اس دفعہ یہ سوچ کر تشدد نہیں کرے گی کہ اسے زندہ بھی رکھنا ہے اس کی موت یقینی تھی ندیم نے سگریٹ سلگا لیا اور نیم روشن تہہ خانے میں کمبل اوپر کر کے لیٹ گیا۔ اس کے ذہن میں نجمی کی اداس شکل گردش کر رہی تھی کیا وہ نجمی کو دشمن کے بچھائے ہوئے جال سے نکال کر بارڈر کراس کرا سکے گا؟ اس سوال کا جواب ندیم کے پاس نہیں تھا۔

٭ ٭ ٭

دوسرے دن رات کے آٹھ بجے کے قریب راجو تہہ خانے میں آ گیا۔ وہ ندیم کے لیے مزید کھانا لایا تھا۔ کھانے کا تھیلا ایک طرف رکھتے ہوئے راجو اپنی اونی ٹوپی اتارتے ہوئے بولا... "میرا خیال تھا کہ چھدا ابھی حامی نہیں بھرے گا وہ دوسرے یا تیسرے پھیرے پر تمھیں ساتھ لے جائے گا مگر قسمت تیری یاوری کر رہی ہے۔ ندیم بھائی... چھدا تمھیں اس ہفتے کے پھیرے پر ہی ساتھ لے جانے کو تیار ہو گیا ہے۔" چھدا اس ڈرائیور کا نام تھا جو راجو اور فقیر بیٹے کا مشترکہ دوست تھا اور جو دلی سے سبزیوں کا بھرا ہوا ٹرک لے کر ہفتے میں دو بار میرٹھ جاتا تھا۔ راجو نے کہا... "تم پرسوں چھدے کے ساتھ دلی سے لکھنؤ کی طرف روانہ ہو جاؤ گے... وہ رات کے گیارہ بجے دلی اڈے سے روانہ ہوتا ہے مگر تم دلی والے اڈے سے ٹرک میں نہیں بیٹھو گے۔ تمھیں دلی سے باہر غازی آباد والی سڑک کے پاس ایک جگہ سے اٹھایا جائے گا وہاں تک تمھیں میں لے کر جاؤں گا۔ اب تمھیں پہلا کام تو یہ کرنا ہو گا کہ میں کل رات سیفٹی ریزر وغیرہ لاؤں گا تم اپنے سر کے سارے بال مونڈ ڈالو گے۔ مونچھوں اور داڑھی کے خط بناؤ گے اس کام میں میں تمہاری مدد کروں گا۔ تمھیں بنگالیوں ایسا کرتہ پاجامہ پہننا ہو گا اور اوپر سویٹر اور گرم شال اوڑھ لو گے۔ سویٹر تم کلکتے پہنچ کر کسی جگہ پھینک دینا کیونکہ وہاں اتنی سردی نہیں ہو گی۔ گرم شال تم مسلمان بنگالیوں کی طرح اپنے کاندھے پر ڈالے رکھنا۔ ایک تسبیح بھی میں تمھیں لا دوں گا جو تم اپنے گلے میں ڈال لینا لیکن کوشش کرنا کہ تم دن کے وقت زیادہ لوگوں کے سامنے نہ جاؤ تمھیں اپنی معشوقہ تک پہنچنے کے لیے جو کچھ بھی کرنا پڑے وہ شام ہونے کے بعد ہی کرنا تمہاری تصویر بنگال میں بھی پہنچ گئی ہے اور کلکتہ پولیس کی تم حراست میں بھی رہے ہو۔ وہاں تمہارے پہچانے جانے کا خطرہ زیادہ ہے۔ اس لیے تمھیں وہاں زیادہ احتیاط کی ضرورت پڑے گی

دوپہر تک راجو ندیم کے پاس بیٹھا ایسی ہی باتیں کرتا رہا پھر اگلے روز شام کو آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ ندیم نے کسی نہ کسی طرح وہ رات اور دوسرا دن بھی گزار لیا۔ دوسرے دن کی شام ہوئی تو راجو آ گیا وہ اپنے ساتھ سیفٹی ریزر کی بجائے اُسترا لایا تھا۔ ایک گٹھڑی میں ندیم کے لیے بنگالی طرز کا کھدر کا کُرتا پاجامہ اور گرم شال اور تسبیح وغیرہ تھی۔ ایک بنگالی طرز کی چپل بھی تھی۔ راجو نے خود ہی ندیم کے سر کے سارے بال اتار کر ٹنڈ کر دی پھر جس طرح سے بھی ہو سکا اس کی تھوڑی بڑھی ہوئی داڑھی اور مونچھوں کے خط بنا ڈالے۔ ندیم نے بنگالی کرتا پاجامہ اور گرم شال وغیرہ دیکھے اور راجو اس کے لیے جو تکلیف اٹھا رہا تھا اس کے لیے شکریہ ادا کیا۔ راجو نے ایک سگریٹ سلگا کر ندیم کو دیا اور دوسرا سگریٹ خود ہونٹوں میں دبا کر کش کھینچتے ہوئے کہا.....

"میاں بھائی شکریہ کس بات کا؟ بھائی بھائی کی مدد کیا ہی کرتے ہیں.... اب جو کچھ میں کہوں غور سے سنو۔" راجو نے ایک کش اور لگایا اور بولا..." پہلے تم کھانا کھا لو میں تھرمس میں سے چائے نکال کر پیتا ہوں۔ اس کے بعد گفتگو ہو گی۔ آج تمھارے لیے دلی کی خاص نہاری اور گولہ کباب لایا ہوں۔ ساتھ پراٹھے بھی ہیں۔" ندیم نے بڑے شوق سے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ راجو چائے پیتا رہا۔ جب ندیم کھانا کھا چکا اور چائے پینے لگا تو راجو بولا...." اب سنو.... کل رات میں تمھارے پاس رات کے ٹھیک نو بجے آؤں گا یہاں سے میں تمھیں اپنے ساتھ نازی آباد والی سڑک پر اس مقام تک لے جاؤں گا جہاں میرے یار چھدے کا ٹرک پہلے سے موجود ہو گا۔ اس نے ٹرک کا بونٹ کھول کر اسے مرمت کے بہانے کھڑا کر رکھا ہو گا.... اس کا کلینر بھی اس کے ساتھ ہو گا۔ کلینر کو اس نے کچھ نہیں بتایا ہے ہم ٹرک سے دور ایک خاص جگہ کھڑے ہو جائیں گے کیونکہ اس کا کلینر مجھے جانتا ہے میں اسے اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔ چھدا خود ہی ٹھیک وقت پر ہمارے پاس آ جائے گا میں تمھیں اس کے حوالے کر کے فوراً واپس چلا جاؤں گا وہ اپنے کلینر سے تمھارے بارے میں یہ کہے گا کہ تم نے اسے لکھنؤ تک جانے کے لیے پچاس روپے ادا کیے ہیں اور چونکہ تمھاری ماں لکھنؤ میں بیمار ہے اور تمھیں کوئی بس یا ٹرین نہیں ملی اس لیے تم اس ٹرک میں لکھنؤ جلدی سے جلدی پہنچنا چاہتے ہو.... وہاں سے چھدا تمھیں خود ہی سمجھا دے گا تم اپنا نام مولوی باقر بتاؤ گے اس کی ضرورت تو نہیں پڑے گی۔ لیکن راستے میں بالفرض اگر کلینر یا کسی دوسرے شخص نے تم سے تمھارا نام پوچھ لیا تو مولوی باقر

ہی بتانا.... اس نام کو ذہن میں اچھی طرح سے یاد کر لینا تم لکھنؤ کے سیٹھانی محلّے کے رہنے والے ہو۔ وہاں اسلامیہ مکتب میں بچوں کو اردو پڑھاتے ہو۔ تمھاری صرف ایک ماں ہی زندہ ہے جو بیمار ہے۔ تم دلی کسی درسگاہ کی زیارت کو آئے تھے تمھیں تمھاری اماں کی بیماری کی خبر ملی اور تم راتوں رات واپس اپنے گھر جا رہے ہو۔"

ندیم نے یہ ساری باتیں اچھی طرح سے یاد کر لیں۔ راجو دوسرے دن رات کو نو بجے آنے کا کہہ کر چلا گیا وہ رات اور اس سے اگلا دن بھی گزر گیا دوسرے دن رات کو ندیم نے کھدر کا بنگالی کُرتہ پاجامہ اور اس کے اوپر سویٹر پہن لیا تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا۔ داڑھی مونچھ کے خط بنے ہوئے تھے۔ اس کے پاس آئینہ نہیں تھا۔ لیکن اس نے اپنے سر اور چہرے پر ہاتھ پھیر کر اندازہ لگا لیا کہ اس کا حلیہ کافی بدل گیا ہے اور صرف قریب سے دیکھنے پر ہی اسے کوئی پہچان سکے گا۔ تسبیح اس نے اپنی کلائی کے ساتھ لپیٹ لی تھی۔ ٹھیک نو بجے لسے اوپر کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی یہ راجو ہی تھا۔ اب ندیم اس کے قدموں کی چاپ پہچاننے لگا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ نیچے تہہ خانے میں آ گیا۔ ندیم نے موم بتی روشن کر رکھی تھی اسے بالکل تیار دیکھ کر راجو بولا...." میں تمھارے لیے ایک گول اونی ٹوپی بھی لایا ہوں اسے پہن لو۔" اس نے جیب سے نسواری رنگ کی ایک گول اونی ٹوپی نکال کر ندیم کو دی جو اس نے اپنے سر پر پہن لی۔ یہ اس کے کانوں تک آ گئی "اب میرے ساتھ آ جاؤ" اور ندیم اس کے ساتھ تہہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی کوٹھڑی اور پھر وہاں سے کوارٹر کے بڑے بیرک نما کمرے میں سے گزر کر کوارٹر کے باہر آ گیا۔ کتنے دنوں بعد وہ کھلی سرد فضا میں آیا تو اسے شدید سردی کا احساس ہوا.....

اس نے اپنا کمبل وہیں چھوڑ دیا تھا اور سویٹر کے اوپر گرم شال اوڑھ رکھی تھی۔ راجو اسے لے کر غیر ہموار میدان کو عبور کر کے چھوٹی کچی سڑک پر آ گیا.... آج رات وہ گاڑی کی بجائے اپنے ساتھ موٹر رکشا لایا تھا.... موٹر رکشا بھی اس کا دھن کالری والا آدمی ہی چلا رہا تھا یہ اس کا اپنا آدمی تھا۔ یہی آدمی ندیم کو جیل سے پہلے والے تہہ خانے تک لایا تھا۔ ندیم اور راجو رکشے میں سوار ہو گئے اور رکشا کچی سڑک پر سے ہوتا ہوا پکی سڑک پر آ گیا.... شروع رات تھی اس سڑک پر ٹریفک چل رہی تھی مگر رات کا وقت تھا اور وہاں روشنیاں زیادہ نہیں تھیں.... خدا جانے رکشا کون کون

بارونق سڑکوں پر سے ہوتا ہوا ایک ایسی کشادہ سڑک پر آگیا جہاں ٹرک بھی چل رہے تھے راجو نے ندیم کی طرف جھک کر کہا..."یہ سڑک سیدھی دلی سے کلکتے کو جاتی ہے اسے جی ٹی روڈ بھی کہتے ہیں... ہندوؤں نے اس کا نام کچھ اور ہی رکھ چھوڑا ہے" بڑی سڑک پر رکشا دیر تک سفر کرتا رہا۔ ندیم نے پوچھا..."ابھی غازی آباد کتنا دور ہے" تو راجو بولا..."فکر نہ کرو ہم اپنی منزل پر پہنچنے ہی والے ہیں جو کچھ میں نے تمھیں بتایا ہے اسے اچھی طرح سے یاد کر لیا ہے نا تم نے؟ تمھارا نام مولوی باقر علی ہے تم لکھنؤ کے سیٹھانی محلے کے اسلامیہ مکتب میں استاد ہو۔ تمھاری والدہ بیمار ہے اور تم جلدی سے جلدی اپنے گھر پہنچنا چاہتے ہو" ندیم نے سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا کہ اس نے سب کچھ رٹ لیا ہے۔ رکشے کی رفتار ہلکی ہو گئی... ڈرائیور نے راجو سے کہا..."خان صاحب! چھدے کا ٹرک سڑک کی ایک طرف کھڑا ہے۔" راجو نے کہا..."ٹھیک ہے تم اس سے پچاس قدم پیچھے سڑک کے کنارے درختوں میں رکشا کھڑی کر دو" اس کے ساتھی ڈرائیور نے ایسا ہی کیا... رکشا درختوں کے نیچے اندھیرے میں رک گیا۔ راجو اور ندیم نیچے اتر آئے... راجو نے کوٹ کی جیب میں سے ایک رومال نکال کر ندیم کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا..."اس میں ایک ہزار روپے ہیں میں اس سے زیادہ نہیں کر سکا... مجھے افسوس رہے گا اسے قبول کر لو" ندیم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے... وہ دلی کے ان مخلص اور اسلام کے نام پر اپنی زندگیوں کو موت کے منہ میں ڈالنے والے انسانوں کے جذبے سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ اس نے راجو کا ہاتھ تھام لیا اور جذبات سے بھری ہوئی آواز میں بولا......"بھائی راجو! تمھارے یہ ایک ہزار میرے لیے انمول ہیں، میں تمھارا اور رفیق بیٹے کا احسان ساری زندگی ادا نہیں کر سکوں گا۔" راجو نے ندیم کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دباتے ہوئے کہا..."ارے میاں بھائی کیسی باتیں کر رہے ہو... یہ تو ہمارا فرض تھا کیا انسان اپنا فرض پورا نہیں کیا کرتے؟ چاہے فرض پورا کرنے کے لیے جان کی بازی ہی کیوں نہ لگانی پڑے... اچھا اب تم ادھر درختوں کے پیچھے جاؤ... چھدے نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ وہ دیکھو اس کے ٹرک کا بونٹ کھلا ہے کلینر اس پر جھکا ہوا ہے اور وہ ہماری طرف آ رہا ہے۔" ایک اونچا لمبا چھریرے بدن کا آدمی جس نے پھولی ہوئی گرم جرسی پہن رکھی تھی۔ اپنے دونوں ہاتھ گرم پتلون کے پہلوؤں سے رگڑتا ان کی طرف بڑھ رہا

تھا قریب آ کر وہ جلدی سے راجو کی بائیں جانب ہو گیا اور ندیم کی طرف اندھیرے میں گھور کر دیکھنے لگا..."یہ نوجوان ہے مولوی باقر علی عرف ندیم میاں" راجو نے کہا..."ہاں چھدے... اب جیسے تمھیں سمجھایا ہے ویسے ہی کرنا۔ لکھنؤ پہنچ کر اسے اپنے دوست کے ساتھ کر دینا جو اسے کلکتے پہنچا دے گا" چھدا بولا..."تم فکر نہ کرو لالہ... اسے کلکتے پہنچا ہی سمجھو۔" اب راجو نے جیب سے ایک تہہ کیا ہوا چھوٹا سا رقعہ نکال کر ندیم کو دیا اور بولا..."کلکتے میں ذکریا اسٹریٹ مسلمانوں کا علاقہ ہے۔ اس علاقے میں پرانے امرتسر کے کشمیری بھی آباد ہیں۔ یہ لوگ شالوں کا دھندا کرتے ہیں۔ وہاں کا ایک مشہور ہوٹل امجدیہ ہوٹل ہے تم یہ رقعہ اس ہوٹل کے مالک جبار علی کو جا کر دے دینا جبار علی کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں، رنگ سانولا ہے، بدن اکہرا ہے اور ناک پر جلے ہوئے زخم کا داغ ہے یہ رقعہ صرف اسی کو دینا۔ یہ رقعہ پڑھ کر وہ تمھیں ایک ایسے شخص سے ملوا دے گا جو تمھارے بنگال کا بارڈر کراس کرانے کا بندوبست کر دے گا اب تم جا کر ٹرک میں بیٹھو... چھدے! تو بھی اب جا بیٹھ کلینر کو شک نہ ہو جائے۔" ندیم رقعہ ہاتھ میں لیے کھڑا تھا کہ راجو جلدی سے رکشے میں بیٹھ گیا اور رکشا واپس روانہ ہو گیا۔ چھدے نے ندیم سے کہا..."آجاؤ بابو جی میرے ساتھ۔ کلینر نے پوچھا تو وہی بتانا جو راجو نے تمھیں اور مجھے بتایا ہے۔" راجو نے ندیم کو جو کچھ بتایا تھا وہ اسے زبانی حفظ ہو گیا تھا مگر کلینر نے اس سے کچھ نہ پوچھا۔ جب وہ ٹرک کے قریب گیا تو کلینر نے اپنے استاد کی طرف دیکھا۔ چھدے نے کہا..."مولوی صاحب ہیں ان کی والدہ بیمار ہے جلدی لکھنؤ پہنچنا چاہتے ہیں۔ چل پیچھے جا کر اینٹ نکال اور پیچھے ہی ٹوکروں میں بیٹھ جا۔" چھدے نے ندیم کو ٹرک میں اپنی ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ بٹھا لیا اور تھوڑی دیر بعد ٹرک لکھنؤ کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ ٹرک میں یہ کافی لمبا سفر تھا۔ ساری رات ٹرک شاہراہ پر چلتا رہا مشرق میں صبح کا اجالا نیلے غبار کی شکل میں ابھر رہا تھا کہ ٹرک بریلی پہنچا۔ یہاں ٹرک اڈے میں رک گیا۔ چھدے نے راستے میں ندیم کو بہت سی باتیں سمجھا دی تھیں کہ اسے راستے میں کیا کچھ کرنا ہو گا۔ چنانچہ بریلی پہنچتے ہی ندیم ٹرک سے اتر کر چائے کے ہوٹل کی طرف آ گیا یہاں اس نے منہ ہاتھ دھویا اور چائے منگوائی۔ تھوڑا بہت ناشتہ کیا اور پھر اڈے کی مسجد میں صبح کی نماز پڑھنے چل دیا۔ وہ اس وقت تک مسجد میں ہی بیٹھا رہا جب تک کہ چھدا وہاں نہیں آیا۔ چھدے کے ساتھ وہ واپس

ٹرک میں آکر بیٹھ گیا اور ٹرک اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ مراد آباد راتوں رات گزر گیا تھا اور چھیدے نے جان بوجھ کر وہاں ٹرک نہیں روکا تھا۔ اب آگے شاہجہان پور کا شہر آتا تھا۔ اس کے بعد لکھنؤ... دوپہر کا کھانا انھوں نے شاہجہان پور میں کھایا... یہاں بھی چھیدے نے ندیم کو ایک مسجد دکھادی اور جتنی دیر ٹرک وہاں کھڑا رہا ندیم مسجد میں ہی بیٹھا تسبیح پھیرتے ہوئے خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہا۔

شام ہو رہی تھی کہ ٹرک لکھنؤ کے مضافات میں داخل ہو گیا۔ اس شہر کے بارے میں ندیم نے بہت کچھ سن رکھا تھا اگر وہ عام حالات میں یہاں آتا تو اس شہر کی ضرور سیر کرتا لیکن اب صورت حال دوسری تھی۔ شہر میں جگہ جگہ روشنیاں ہو رہی تھیں۔ ٹرک جی ٹی روڈ پر سے گزرتا ہوا بہت بڑی سبزی منڈی کے احاطے میں داخل ہو کر ایک طرف رک گیا جیسا کہ چھیدے نے ندیم کو ہدایت دی تھی ٹرک کے رکتے ہی ندیم اگلی سیٹ پر سے اترا اور ایک کھمبے کے پاس چبوترے پر جا کر شال اچھی طرح سے لپیٹ کر بیٹھ گیا۔ یہاں سردی تھی کوئی دس منٹ کے بعد چھیدا اسے اپنی طرف آتا دکھائی دیا وہ اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے ندیم کے قریب سے گزر گیا سبزی منڈی میں کئی دوسرے ٹرک بھی کھڑے تھے جن میں سے سبزیوں کے ٹوکرے اور بڑے بڑے گٹھڑ نیچے اتارے جا رہے تھے۔ جگہ جگہ بلب روشن تھے ایک جانب چائے خانوں کی قطار تھی جہاں ڈرائیور اور دوسرے لوگ بیٹھے چائے وغیرہ پی رہے تھے۔ فلمی گانوں کی ریکارڈنگ بھی ہو رہی تھی۔ ندیم کے لیے لکھنؤ شہر بالکل اجنبی تھا دو سکھ آپس میں پنجابی میں باتیں کرتے اس کے قریب سے گزر گئے۔ انھوں نے ندیم کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ندیم کی نظریں دس بارہ قدم آگے چلتے چھیدے پر تھیں۔ وہ ایک سڑک پر آ کر رک گیا سڑک پر خاصی رونق تھی لوگ آجا رہے تھے۔ ندیم کو ایک سپاہی نظر آیا جو چھڑی ہاتھ میں لیے ایک دکان کے باہر کھڑا لوگوں کو آتے جاتے دیکھ رہا تھا۔ ندیم ایک طرف کو سمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ چھیدا بھی سڑک کے کنارے کھڑا شاید کسی سواری کا انتظار کر رہا تھا اتنے میں اس نے ایک خالی رکشے کو اشارے سے روکا اسی میں بیٹھا اور رکشا لے کر ندیم کے پاس آگیا۔ ندیم جلدی سے اس میں سوار ہو گیا اور رکشا آگے کو چل دیا۔ چھیدے نے ندیم سے کوئی بات نہ کی۔ رکشا بارونق بازاروں میں سے گزرتا ایک کشادہ سڑک پر آ گیا اس سڑک کی دونوں جانب اونچی

اونچی عمارتیں تھیں جن میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ کاریں، تانگے اور رکشے اس کے قریب سے سڑک پر گزر رہے تھے۔ سڑک طویل تھی کافی آگے جا کر رکشے نے ایک موڑ کاٹا اور اس سے نسبتاً خاموش سڑک پر آگیا اس سڑک کی ایک جانب کوٹھیاں بنگلے تھے اور دوسری جانب میدان تھا جو ندیم کو کھیل کا میدان لگا۔ رکشا یہاں سے بھی آگے گزر گیا پھر دریا کا پل آگیا یہ گومتی کا دریا تھا اس کا پل کافی چوڑا اور عظیم الشان تھا جگہ جگہ کھمبوں پر بلب روشن تھے۔ اندھیرے میں ندیم نے دیکھا کہ دریا کی سطح پر پل کی روشنیاں منعکس ہو رہی تھیں۔ چھیدا بولا... "مولوی جی! خدا نے چاہا تو آپ کی والدہ اب بالکل ٹھیک ہوں گی" شاید یہ جملہ وہ رکشا ڈرائیور کو سنانا چاہتا تھا۔ ندیم نے کہا "اللہ فضل کرے گا.... اللہ فضل کرے گا۔" چھیدے نے ندیم کا ہاتھ اس طرح سے دبایا جیسے کہہ رہا ہو تم نے بالکل ٹھیک ٹھیک جواب دیا شاباش..... پل پر سے اترنے کے بعد رکشا بڑی سڑک چھوڑ کر ایک ایسی چھوٹی سڑک پر آگیا جہاں اتنی روشنی نہیں تھی اس کی دونوں جانب ایک منزلہ کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ ہر کوارٹر کے باہر ایک بتی جل رہی تھی۔ سردی کی وجہ سے یہاں کے لوگ باہر برآمدوں میں بیٹھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ان کوارٹروں کے عقب میں کسی عمارت پر نیون سائن کی روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔ اس علاقے سے بھی رکشا نکل گیا۔ ندیم نے اپنی بائیں جانب دیکھا تو ادھر سے سڑک کے ساتھ ساتھ لگے کھمبوں کی طویل قطار دکھائی دی جس کی روشنیاں دور تک چلی گئی تھیں۔ یقیناً یہ جی ٹی روڈ تھی اور چھیدا کافی آگے جا کر ایک بار پھر جی ٹی روڈ یعنی لکھنؤ سے کلکتے جانے والی بڑی شاہراہ کے قریب نکل آیا تھا مگر یہ سڑک کافی فاصلے پر تھی اور رکشا اس کی دائیں جانب یعنی مخالف سمت ایک مضافاتی بستی کے کنارے جا کر رک گیا۔ چھیدے نے اترتے ہوئے ندیم سے کہا... "آئیے مولوی صاحب! آپ کا گھر آگیا فکر نہ کریں والدہ صاحبہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں گا۔" ندیم رکشے سے اتر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا اور بولا "بس اللہ سے دعا کیجئے بھائی صاحب" اتنی دیر میں چھیدے نے رکشے والے کو کرایہ ادا کیا اور وہ رکشے کو بیک کر کے جدھر سے آیا تھا ادھر کو چل دیا۔ چھیدے نے ندیم کے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "واہ میرے یار تم نے تو کمال کر دیا اگر تم نے اسی ہوشیاری اور سمجھداری سے کام لیا تو تم بڑی سلامتی کے ساتھ کلکتے پہنچ جاؤ گے" ندیم نے پوچھا... "کیا مجھے یہاں سے کلکتے کے لیے ٹرک

پکڑنا ہوگا۔" چھدے نے ندیم کا بازو پکڑ کر بستی کی طرف چلتے ہوئے کہا....." میرے بھائی! اتنی جلدی ٹرک کہاں ملے گا؟ تمھیں آج رات اور کل کا دن یہاں ایک مکان میں بسر کرنا ہوگا۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں یہاں کوئی تمھاری ہوا کی طرف بھی نہیں دیکھ سکتا تم بالکل محفوظ ہوگئے ہو۔" وہ بستی میں داخل ہونے کی بجائے اس کے عقب کی طرف آگئے۔ یہاں باہر میدان میں بڑے بڑے گڑھے تھے جن میں کوڑا کرکٹ بھرا پڑا تھا۔ چھدا کہہ رہا تھا...." وہ سامنے والی جو ٹرک دیکھ رہے ہو یہ سیدھی کلکتے کو جاتی ہے یہیں گڈز ٹرانسپورٹ والوں کا گودام ہے اور یہیں سے میرا دوست چاند خان ٹرک میں مال بھر کر کلکتے جاتا ہے وہ ہفتے میں صرف ایک پھیرا آنے جانے کا لگاتا ہے کیونکہ کلکتہ یہاں سے کافی دور ہے اور بیچ میں ایک رات بھی پڑتی ہے جو تمھیں بنارس یا گیا شہر میں بسر کرنی ہوگی۔" ندیم نے پوچھا...." کیا آپ نے اسے میرے بارے میں کچھ بتایا ہے؟" چھدا ہنس دیا۔ بولا...." ابھی تو میں اسے ملا بھی نہیں بس بتانا کیا ہے ابھی دو باتیں کر دوں گا اور تمھیں اس کے حوالے کر دوں گا۔" ندیم کو فکر لگی تھی کہ کہیں اس کا راز نہ کھل جائے اور کوئی پولیس کے اعلان شدہ انعام کی رقم کے لالچ میں آکر اسے پولیس کے حوالے نہ کر دے۔ اس نے دبی زبان میں کہا...." آپ کا یہ دوست قابل اعتبار ہی ہوگا۔"

چھدے نے کہا...." اگر قابل اعتبار نہ ہوتا تو میں تمھیں کبھی اس کے پاس لے کر نہ آتا۔ میرے بھائی ہمارے یار تو یار پر جان نچھاور کر دیتے ہیں اور یہ میرا یار جس کا نام چاند خان ہے کھرا اور نرا آدمی ہے۔ اس نے میری خاطر میرے ایک دشمن کو چاقو بھی مار دیا تھا.... تم بالکل فکر مت کرو چاند خان تمھیں اپنی حفاظت میں کلکتے پہنچا دے گا آگے تم جانو تمھارا کام..... بستی کے کونے میں ایک گلی کی نکڑ پر ایک گھنا پیڑ تھا یہاں ایک کوارٹر نما مکان کی عقبی دیوار کے ساتھ ایک بلب جل رہا تھا جس کی روشنی میں نیچے ڈھلان اور گڑھے میں کوڑا کرکٹ نظر آتا تھا۔ اس گڑھے میں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا جو سردی کی وجہ سے زیادہ اوپر نہیں جا رہا تھا اس کوارٹر کا دروازہ گلی میں تھا۔ چھدا گلی میں پہنچ کر رک گیا اس نے ندیم کو باہر ہی رکنے کو کہا اور خود کوارٹر کا دروازہ ذرا سا کھول کر ڈیوڑھی میں داخل ہوگیا یہاں اس نے چاند خان کو آواز دی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ ندیم کو باہر سردی محسوس ہونے لگی تھی گرم شال اور سویٹر لکھنؤ شہر کی رات کی سردی کا

مقابلہ کرنے کے لیے کافی نہیں تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ ہو کر کھڑا ہوگیا۔ کوئی تین منٹ کے بعد چھدا کوارٹر سے باہر آیا اور اسے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ ایک کمرے میں بھوری آنکھوں اور گوری رنگت والا چوڑا چکلا آدمی انگیٹھی پلنگ کے پاس رکھے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں اور بال گنگریالے تھے عمر چالیس سے کچھ اوپر ہوگی۔ ندیم کی طرف اس نے ایک پل کے لیے گھور کر دیکھا۔ ندیم نے سلام کیا اور اس نے ندیم سے ہاتھ ملایا اور کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر چھدے کی طرف متوجہ ہو کر مسکراتے ہوئے بولا...." تم جو پینا چاہو میرے پاس موجود ہے۔" چھدا سگریٹ سلگا رہا تھا کہنے لگا....." چاند خان پیارے! مال ابھی ٹرک ہی میں بھرا ہے۔ ابھی جا کر اسے اتروانا ہے۔ تم میرے مہمان کو سنبھال لو میں ابھی کل کا دن بھی لکھنؤ میں ہی ہوں۔" چاند خان اپنی پنڈلیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا...." مگر میں تو کل رات مال لے کر جا رہا ہوں۔ چھدا بولا.... تو پھر کیا ہوا پیارے۔ واپس آؤ گے تو محفل جما لیں گے۔ اگلے پھیرے پر سہی۔ چھدا اٹھ کھڑا ہوا۔ چاند خاں نے کہا.... کیا چائے بھی نہیں پیو گے؟" چھدے نے کہا.... وہ سالا شام لال کوئی ہیرا پھیری نہ کر جائے۔ بڑا چالاک آدمی ہے۔ میرا اڈے پر پہنچنا ضروری ہے۔" اس نے ندیم کے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا....." پیارے! اب تم چاند خاں کے سپرد ہو کسی قسم کا فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس کلکتے پہنچے ہی سمجھو۔" چھدا چاند خان سے ہاتھ ملا کر جانے لگا تو چاند خان نے پوچھا کہ فقیریے کی کتنی قید باقی رہ گئی ہے۔ چھدے نے کہا...." یہی کوئی تین ایک سال کی قید باقی ہے اسے یوں چٹکی بجاتے گزر جائیں گے..... اچھا السلام علیکم۔" ندیم کرسی پر خاموش بیٹھا تھا۔ انگیٹھی کی وجہ سے اب سردی کا احساس ختم ہوگیا تھا۔ چاند خان نے پلنگ کے سرہانے کے نیچے سے اعلیٰ قسم کے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر کھولا اور ندیم کی طرف بڑھا کر بولا...." سگریٹ پیو۔" ندیم نے شکریئے کے ساتھ سگریٹ سلگا لی۔ چاند خان پلنگ پر سے اٹھا گرم چادر کاندھے پر اوڑھی اور چپل پہنتے ہوئے کہنے لگا...." میرے ساتھ آؤ تمھیں وہ کمرہ دکھا دوں جہاں تم رات کو سوگے۔" یہ کمرہ بیٹھک کے ساتھ ہی تھا بیچ میں ایک چھوٹا سا دالان پڑتا تھا۔ اس دالان میں ایک طرف غسل خانہ تھا جس کے باہر چوکی اور بالٹی رکھی ہوئی تھی کمرے میں چارپائی پر بستر تہہ کر کے رکھا ہوا تھا۔ چارپائی کے پاس ہی لوہے کی چھوٹی سی گول میز

بھی تھی۔ کارنس پر کاغذ کے پھولوں کا گلدستہ لکڑی کے گلدان میں لگا تھا۔ چاند خان نے بستر کھول دیا اور بولا... "تم آرام کرو... میں تمہارے لیے کھانا لاتا ہوں۔" ندیم بستر پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔ اس نے لحاف اوپر کر لیا اسے بہت سکون کا احساس ہوا کتنے اچھے تھے یہ لوگ اور کس طرح اس کے کام آ رہے تھے۔ رات اور دن بھر کے ٹرک کے سفر کے بعد ندیم کا سر چکرا رہا تھا اور وہ بڑی جلدی سو جانا چاہتا تھا۔ اسے بھوک بھی لگی ہوئی تھی۔ چاند خان اس کے لیے خود کھانا لے کر آیا اس نے اپنے سامنے ندیم کو کھانا کھلایا اور بولا... "غسل خانہ دالان میں بالکل سامنے ہے یہاں بے فکر ہو کر سونا کوئی تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا اب تم جاؤ میں صبح ناشتے کے وقت ملوں گا اندر سے کنڈی لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

چاند خان چلا گیا... ندیم نے دروازہ بند کر لیا اور اندر سے کنڈی نہ لگائی اس نے گرم شال ایک طرف رکھ دی اور بستر میں گھس کر لحاف اوڑھ لیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ نیند میں ڈوب گیا تھا اور بے خبر ہو کر گہری نیند سو رہا تھا۔ اسے کمرے کی بتی بجھانی بھی یاد نہیں رہی تھی۔ ندیم اگلے روز دس بجے دن چڑھنے تک سویا رہا اس دوران چاند خان دوبارہ آ کر اسے دیکھ گیا تھا۔ سوا گیارہ بجے تک ندیم نہا دھو کر فارغ ہو چکا تھا کہ چاند خان اس کے لیے پوری حلوے کا ناشتہ لے آیا۔ چینک میں گرم گرم چائے بھی تھی۔ چاند خان اپنی پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے بولا... "میں ناشتہ کر چکا ہوں صرف چائے پیوں گا۔" وہ خاموشی سے چائے پینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا... "کلکتے میں تمہیں امجدیہ ہوٹل جانا ہے مجھے یہی بتایا گیا ہے کیا تم پہلے کبھی اس علاقے میں گئے ہو؟" ندیم نے کہا... "بالکل نہیں گیا خان صاحب بس دریا کے کنارے والی ایک آبادی تک ہی گیا تھا۔" "کوئی بات نہیں۔" چاند خان نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "میں خود تمہیں امجدیہ ہوٹل تک چھوڑ آؤں گا ہم آج رات روانہ ہو جائیں گے۔ دوسرے دن رات کو کلکتے پہنچیں گے۔ میں اسّی میل سے کم پر ٹرک نہیں چلاتا۔ پھر بھی کلکتے پہنچتے پہنچتے رات ہو ہی جاتی ہے۔" دوپہر کو چھیدا بھی ندیم سے ملنے آ گیا اس نے ندیم سے کہا... "مال پانی کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔" ندیم نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس کے پاس کافی پیسے ہیں۔ چاند خان نے کہا... "تم ہمارے یار کے یار ہو جس چیز کی ضرورت ہو بے دھڑک

مانگ لینا۔" ندیم نے چاند خان کا بھی شکریہ ادا کیا۔ دوپہر کے بعد ندیم نے شام تک آرام کیا رات کا کھانا چاند خان نے اڈے پر جا کر کھایا اور ندیم نے کمرے میں کھا لیا۔ چاند خان اپنے ٹرک کی روانگی کے انتظامات کے لیے گیا ہوا تھا وہ رات کے دس بجے واپس آیا اس نے چھیدے کی طرح ندیم سے ایسی کوئی بات نہ کی کہ کلینر پوچھے تو یہ کہنا اور یہ نہ کہنا۔ ٹھیک گیارہ بجے رات چاند خان نے ندیم کو ساتھ لیا اور اندھیری رات میں کوارٹر سے نکل کر جی ٹی روڈ والے اڈے کی طرف روانہ ہو گیا یہ گڈز ٹرانسپورٹ کا اڈا تھا اور یہاں دو بڑے بڑے اونچی چھت والے گودام مال سے بھرے ہوئے تھے۔ یہاں وہاں احاطے میں کئی ٹرک کھڑے تھے ایک جگہ آگ کا الاؤ جلا کر کچھ کلینر بیٹھے سگریٹ وغیرہ پی رہے تھے۔ چاند خان کے ٹرک پر مال لادا جا چکا تھا اور اس کا کلینر اس کے اوپر ترپال باندھ رہا تھا۔ چاند خان نے چاروں طرف گھوم کر ٹرک کا جائزہ لیا۔ کلینر کو کچھ ہدایات دیں اور ندیم سے کہا... "تم اگلی سیٹ پر جا کر بیٹھ جاؤ۔" ندیم ٹرک کی کھڑکی کھول کر ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹھنڈ بہت تھی سرد ہوا بھی چل رہی تھی۔ چاند خان نے خاص طور پر ٹرک کے پیچھے کلینر کے لیے ایک چھوٹی سی جگہ بنا دی تھی۔ کلینر کو وہیں بیٹھ کر کلکتے تک سفر کرنا تھا۔ نہ چاند خان نے ندیم سے ذکر کیا اور نہ ندیم نے اس سے پوچھا کہ اس نے کلینر کو اس کے بارے میں کیا کہا ہے۔ چاند خان ندیم کو زیادہ دلیر آدمی لگا۔ ٹھیک بارہ بجے رات ٹرک اڈے سے نکل کر جی ٹی روڈ پر آ گیا اس کا رخ کلکتے کی طرف تھا۔ سڑک دور تک خالی تھی کبھی کبھی کوئی ٹرک ضرور قریب سے گزر جاتا تھا۔ کشادہ سڑک پر آتے ہی ٹرک نے اسپیڈ پکڑ لی اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ کچھ دیر تو ندیم سڑک پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ پھر اسے نیند آ گئی اور وہ کھڑکی سے سر لگا کر سو گیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو ٹرک ایک شہر کی روشنیوں بھری سڑک سے گزر رہا تھا۔ چاند خان نے کہا... "ہم کانپور شہر سے گزر رہے ہیں۔" ندیم کھڑکی کے شیشے سے لگ کر کانپور شہر کی روشنیوں کو تکنے لگا۔ ٹرک شہر سے باہر آیا تو سامنے پھر وہی خاموش کشادہ جی ٹی روڈ... ندیم کی پھر آنکھ لگ گئی جب اس کی آنکھ کھلی تو دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور آس پاس کارخانوں کی اونچی اونچی چمنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ٹرک کی رفتار مدھم ہو گئی تھی۔ چاند خان نے ندیم کی طرف مسکرا کر ایک نگاہ ڈالی اور سامنے

سڑک پر نظر جماتے ہوئے بولا.....

"اچھا کیا تم نے نیند پوری کر لی ہم نہیں سو سکتے ہمیں رات بھر جاگنا پڑتا ہے مگر بنارس میں پوری رات آرام کریں گے۔" ندیم نے پوچھا....." یہ کونسا شہر ہے؟" چاند خان بولا... "یہ الہ آباد ہے۔ یہاں کے امرود بڑے مشہور ہیں۔ گوری گوری میموں ایسے امرود ہوتے ہیں یہاں ہم ناشتے کے لیے تھوڑی دیر رکیں گے۔" ٹرک شہر کی گنجان اور ٹریفک سے بھری ہوئی سڑکوں پر سے گزرتا ٹرانسپورٹ کے اڈے پر جا کر رک گیا۔ ندیم کو خطرہ تھا کہ کہیں کوئی پولیس والا اسے پہچان نہ لے اگرچہ اس کا حلیہ اب بالکل مختلف تھا خط کشیدہ داڑھی منڈے ہوئے سر پر جمی ہوئی اونی ٹوپی اور کھدر کا بنگالی ٹائپ کا کرتہ پاجامہ اور شال ... پھر بھی جوں جوں کلکتہ قریب آ رہا تھا اس کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ پہلی بار اسی شہر میں گرفتار ہوا تھا اور وہاں اس پر پولیس نے بے پناہ مظالم ڈھائے تھے۔ کلکتے کا مرہٹہ انسپکٹر پولیس منجر مکھ تو ندیم کو کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ اس نے اس پر بے پناہ تشدد کیا تھا۔ چاند خان نے ندیم کی طرف دیکھا شاید وہ اس کے ذہنی ہیجان کو بھانپ گیا تھا۔ چھدے نے ندیم کے بارے میں چاند خان کو سب کچھ بتا دیا ہوا تھا۔ کہنے لگا... "ہم سامنے والے ہوٹل میں جا کر ناشتہ کریں گے۔ وہاں تمھیں نہانے کے لیے گرم پانی بھی مل جائے گا تم کسی قسم کی فکر نہ کرو جب تک تم میرے ساتھ ہو تمھاری ہوا کی طرف بھی کوئی نہیں دیکھ سکتا۔" اڈے کے پاس جو ہوٹل تھا وہ درمیانے درجے کا تھا اور وہاں زیادہ تر ڈرائیور ہی ناشتہ اور کھانا وغیرہ کھاتے تھے۔ یہاں ندیم نے گرم پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ دانتوں کو منجن سے خوب صاف کیا۔ پھر چاند خان کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ چائے پیتے ہوئے ندیم بار بار ہوٹل کے باہر دیکھ لیتا کہ کہیں کوئی پولیس یا خفیہ پولیس والا تو اس کے پیچھے نہیں لگا ہوا.... وہ چاہتا تھا کہ جلدی جلدی وہاں سے نکل جائے۔ بڑے شہروں سے اسے ہول آنے لگا تھا کیونکہ بڑے شہروں میں پولیس اور خفیہ پولیس کی نفری زیادہ ہوتی ہے اور ویسے بھی یہ شہر کلکتے کے قریب تھا ایک گھنٹے بعد ٹرک آگے روانہ ہو گیا راستہ میں دوپہر کے وقت ایک بستی میں سڑک کے کنارے انھوں نے کھانا کھایا اور پھر سفر شروع کر دیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا کہ دور سے بنارس شہر کے مندروں کے کلس اور عالمگیری مسجد کے مینار نظر آنے

لگے۔ پھر ٹرک دریائے گنگا کے پل پر سے گزر کر بنارس شہر میں داخل ہو گیا یہاں انھیں رات بسر کرنا تھی۔ چاند خان نے ٹرک اپنی ٹرانسپورٹ کمپنی کے اڈے میں کھڑا کیا۔ کلینر کو وہیں چھوڑا اور ندیم کو لے کر قریب ہی ایک بستی میں آ گیا۔ یہاں اس کا ایک گہرا دوست رہتا تھا یہ دوست بھی پٹھان مسلمان تھا۔ اور خان جی کے نام سے مشہور تھا

چاند خان نے ندیم کا تعارف یہ کہہ کر کروایا کہ یہ میرے دوست کا لڑکا ہے اور اسے آنسول جانا ہے جہاں یہ اسکول میں پڑھتا ہے۔ چاند خان کے دوست نے ندیم میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ وہ چاند خان کی طرف متوجہ ہو کر بولا... "تمھارے پینے کے لیے آج ایک اسپیشل شے رکھی ہوئی ہے پیارے....." چاند خان کو ندیم کی فکر تھی کہنے لگا...." میرا دوست بھی رات یہیں بسر کرے گا۔" چاند خان کے دوست نے کہا...." ارے تم نے یہ کیسی بات کہہ دی... تمھارا مہمان میرا مہمان.... سارا گھر خالی ہے اوپر والے چوبارے میں بستر لگا ہے کھانا کھا کر آرام کرے۔" پھر آنکھ مار کر بولا... تمھارا دوست بھی....." اور ساتھ ہی ہنسنے لگا۔ چاند خان نے ندیم کی طرف دیکھا۔ ندیم نے کہا...." جی نہیں شکریہ۔" ندیم کو شروع رات میں ہی کھانا کھلا کر اوپر چوبارے میں بھیج دیا گیا اور چاند خان اور اس کا خان جی "اسپیشل شے" کھول کر بیٹھ گئے۔ ندیم چوبارے میں بستر میں لحاف کے اندر گھسا ان کے قہقہے اور باتیں کرنے کی آوازیں سن رہا تھا۔ وہ نیند کی لہروں پر جھول رہا تھا کہ اچانک اسے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ ندیم ہوشیار ہو کر ہمہ تن گوش ہو گیا۔ دروازہ کھول کر چاند خان کے دوست خان جی نے کہا "آئیے تھانیدار جی آئیے آپ بھی بہتی گنگا میں سے چو پنج بھر لیں" تھانیدار کا لفظ سنتے ہی ندیم کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی وہ بستر میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور کان نیچے سے آنے والی آوازوں پر لگا دیئے۔ تھانیدار کہہ رہا تھا..." خان جی اس وقت میں ایک ضروری کام سے آیا ہوں....." تو باہر کیوں کھڑے ہیں اندر آ جائیے نا آپ ہی کا گھر ہے" اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ ندیم کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ کہیں یہ تھانیدار اسے گرفتار کرنے تو نہیں آیا ہے؟

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ندیم کے لیے یہ لمحے بے حد جان لیوا تھے۔

نچلی منزل میں تھانیدار آیا ہوا تھا۔ ظاہر ہے اس کے ساتھ دو تین کانسٹیبل بھی ہوں گے اور یہ سب کے سب مسلح ہوں گے۔ کسی نے تھانے میں مخبری کر دی ہوگی کہ مفرور پاکستانی جاسوس چاند خان کے مکان میں چھپا ہوا ہے اور اب پولیس اسے گرفتار کرنے وہاں پہنچ گئی ہے۔ ندیم بے چین ہو کر پلنگ سے نیچے اتر آیا۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس کی ایک کھڑکی گلی کی طرف کھلتی تھی جو اس وقت بند تھی۔ ندیم دبے پاؤں چل کر کھڑکی کے پاس آیا۔ کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر نیچے جھانکا۔ یہ کھڑکی گلی کے فرش پر سے کوئی بیس بائیس فٹ اونچی تھی۔ یہاں سے چھلانگ لگانے پر اندر پولیس کو یقیناً پتہ چل جاتا۔ اور پھر ندیم کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جانے کا بھی خطرہ تھا۔ کیونکہ گلی کا فرش پختہ تھا۔ گلی میں اندھیرا تھا۔ نیچے بیٹھک میں سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی مگر ندیم کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اچانک ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا اور ایک کانسٹیبل جس نے بندوق اٹھا رکھی تھی، مکان کے باہر گلی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اب ندیم کے لیے یہ راستہ بھی بند ہو گیا تھا۔

اس نے کھڑکی آہستہ سے بند کر دی اور کمرے سے باہر نکل کر سخت سردی میں دالان میں آ گیا۔ چھوٹا سا دالان تھا جس کی مشرقی دیوار کے ساتھ ایک سیڑھی اوپر چھت کو چلی گئی تھی۔ ندیم دبے پاؤں چلتا سیڑھی کے پاس آیا اور آہستہ آہستہ پاؤں رکھتا اوپر چھت پر آ گیا۔ وہ زمین سے اور بلندی پر آ گیا تھا۔ اس نے منڈیر پر سے جھانک کر دیکھا۔ ایک جانب وہی گلی تھی جس میں کوڑا کرکٹ ابھی تک [illegible] رہا تھا۔ ایک جانب دوسرے گھر کی دیوار تھی جو مزید اوپر چلی گئی تھی۔ اور تیسری جانب گلی تھی۔ اس نے نیچے دیکھا کانسٹیبل گلی میں موجود تھا اور سردی سے بچنے کے لیے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔

ندیم کو یہ خیال بھی آیا کہ چاند خان جرائم پیشہ آدمی ہے۔ پولیس والوں سے ایسے آدمیوں کے بڑے تعلقات ہوتے ہیں۔ ممکن ہے یہ تھانیدار کو اپنے اعتماد میں لے کر واپس روانہ کر دے۔ لیکن معاملہ ایک پاکستانی جاسوس کا تھا۔ یہ بات اتنی سنگین تھی کہ پولیس خان جی اور اس کے ساتھ میں چاند خان کو بھی گرفتار کر سکتی تھی۔ چھت پر سے چھلانگ نہیں لگائی جا سکتی تھی۔ ندیم کے اعصاب تن گئے تھے۔ وہ دبے پاؤں سیڑھیاں اتر کر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ اسے سردی کا بھی احساس نہیں رہا تھا۔

اسے گلی میں تھانیدار اور چاند خان کی آوازیں سنائی دیں۔ شاید وہ باہر آ گئے تھے۔ ندیم لپک کر کھڑکی کے ساتھ جا لگا۔ کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ اب اسے بجھا کر وہ خواہ مخواہ پولیس کو خبردار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کھڑکی کے پٹ کے ساتھ کان لگا دیئے۔ تھانیدار کہہ رہا تھا۔

"خان جی! اگر کل تک آپ نے مطلوبہ ملزم ہمارے حوالے نہ کیا تو پھر نتیجے کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔"

ندیم کا جسم پتھر کی طرح سن ہو گیا۔ چاند خان کے دوست کی آواز آئی۔

"رانا جی! تم فکر نہ کرو۔ کل دوپہر سے پہلے پہلے تمہارا آدمی تمہارے پاس تھانے پر موجود ہوگا۔"

ندیم کا دل بیٹھنے لگا۔ ضرور ان لوگوں نے انعام کے لالچ میں آ کر اسے پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آخر دس ہزار کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں تھی اور ان کی نیت بدلتے دیر نہیں لگی۔ اس نے ذرا سا پٹ کھول کر نیچے گلی میں دیکھا۔ ایک وردی پوش تھانیدار اور تین کانسٹیبل گلی میں سے گزرتے ہوئے دوسری طرف اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ ندیم نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یہاں سے غائب ہو جائے گا۔ یہ لوگ تو کل اوپر آ کر اسے رسیوں میں جکڑ کر کونے میں پھینک دیں گے۔ مگر یہ کیونکر ہو سکتا تھا۔ انعام کی رقم کا تو ان لوگوں کو پہلے سے علم تھا مگر اب تھانیدار کے آنے کے بعد انہوں نے ندیم کو پولیس کے حوالے کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔

ندیم اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ اسے سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ ندیم [illegible] سے دروازے کی ایک طرف ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور [illegible] اندر [illegible] ندیم [illegible] دبوچنے ہی والا تھا کہ چاند خان ایک دم دوسری طرف ہٹ گیا اور ندیم کو حیرت زدہ نظروں سے

ٹپکنے لگا۔

"یہ تم کیا کرنے والے تھے؟"

ندیم نے طیش کے عالم میں کہا۔

"اور تم لوگ کیا کرنے والے ہو؟ تم لوگوں نے دس ہزار کے عوض ۔۔۔۔۔ اپنے کردار کا سودا کیا ہے۔ میں نے تمھارے دوست کی اور تھانیدار کی ساری بات سُن لی ہے۔ ٹھیک ہے اگر تم مجھے پولیس کے حوالے کرنا چاہتے ہو؟ اگر تم نے بھی میرے اعتماد کو صدمہ پہنچانا ہے تو میں تیار ہوں۔ لیکن اتنا یاد رکھو کہ اس کے بعد میرا انسانی دوستی پر سے اعتماد اٹھ جائے گا۔"

چاند خان بولا

"میرے دوست کا خدشہ بالکل درست تھا۔ اس نے مجھے اوپر بھیجا ہے کہ ہو سکتا ہے تم جاگ رہے ہو اور تم نے تھانیدار کی گفتگو سن لی ہو۔ تم بالکل بچے ہو۔ لگتا ہے تم نے ابھی دوست نہیں دیکھے۔ یا تمھیں ابھی تک کوئی مرد دوست نہیں ملا۔"

اس کے بعد چاند خان نے ندیم کو بتایا کہ سارا قصہ ایک بدمعاش کا ہے۔ جو ایک آدمی پر قاتلانہ حملہ کر کے فرار ہو گیا ہے اور پولیس اس کی تلاش میں میرے دوست کے مکان تک آئی تھی۔ کیونکہ ملزم میرے دوست کے ڈیرے کا خاص آدمی ہے۔ تھانیدار بھی میرے دوست کا اپنا آدمی ہے اور اس سے باقاعدہ ماہانہ وصول کرتا ہے۔

چنانچہ اس نے خاص طور پر آکر میرے دوست کو خبردار کیا ہے کہ آئی جی پولیس خود اس کیس میں دلچسپی لے رہا ہے اس لیے مفرور ملزم کو تھانے پیش کر دے بعد میں اس کی ضمانت کرا دی جائے گی۔ تمھارا تو اس میں کہیں ذکر تک نہیں آیا۔"

ندیم نے سب سے پہلے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد اس نے چاند خان سے بے حد معذرت طلب کی اور کہا کہ چونکہ وہ خود مفرور پاکستانی جاسوس ہے اور پولیس اس کی تلاش میں ہے اس لیے تھانیدار کو دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر وہ گھبرا گیا اور خواہ مخواہ اتنے اچھے دوستوں پر شک کر بیٹھا۔

چاند خان نے ندیم کے کندھے کو تھپتھپا کر کہا۔

"کوئی بات نہیں میرے بھائی۔ تمھیں ابھی دوستوں کا تجربہ نہیں ہے۔ سو جاؤ۔ رات کو تمھیں اٹھنا بھی ہے۔" "اور ہاں اطمینان رکھو میں اپنے دوست کو اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

چاند خان چلا گیا۔ ندیم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بلا ٹل گئی تھی اور ابھی تک پولیس کی گرفت سے آزاد تھا۔ چاند خان اور اس کے دوست خان جی کے بارے میں ندیم کے دل میں جو بدگمانی پیدا ہوئی تھی اس کا ندیم کو ضرور افسوس تھا۔ وہ بستر میں دبک گیا۔ بتی اس نے نہیں بجھائی تھی۔ اندر سے کنڈی بھی نہیں لگائی تھی۔ ندیم پلنگ سے ٹیک لگائے ہی اونگھتا رہا اور اسی عالم میں روانگی کا وقت آ گیا۔ نیچے سے چاند خان اوپر آیا۔ اس نے ندیم سے کہا۔

"تم ابھی تک سو رہے ہو۔ دن نکلنے والا ہے۔ تیاری پکڑو۔ ہمیں اب روانہ ہونا ہے بنارس سے آگے۔"

یہ کہہ کر چاند خان چلا گیا۔ ندیم جلدی سے اٹھا۔ باتھ روم میں جا کر اس نے منہ ہاتھ دھویا اور واپس پلنگ پر آکر بیٹھ گیا پھر اس نے کھڑکی کھول دی۔ باہر دن کا اجالا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا اور کھڑکی میں سے سرد ہوا اندر آنے لگی تھی۔ ندیم نے اٹھ کر کھڑکی بند کر دی۔ نیچے سیڑھیوں سے اسے چاند خان کی آواز آئی۔

"نیچے آجاؤ دوست۔"

ندیم نے شال اپنے گرد لپیٹی اور سیڑھیاں اتر کر نچلے کمرے میں آ گیا۔ یہاں چاند خان اور اس کا دوست پہلے سے موجود تھے۔ چاند خان کے دوست خان جی نے ندیم کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا "رات ایک تھانیدار مجھ سے ملنے آیا تھا۔ معاملہ کچھ اور تھا۔ میں نے سوچا کہیں تم اس کی آواز سُن کر گھبرا گئے ہو۔ فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ لو ناشتہ کر لو۔"

ندیم نے ان کے ساتھ مل کر ناشتہ کیا۔ جلدی جلدی چائے پی اور خان جی سے مصافحہ کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور چاند خان کے ساتھ کوارٹر سے نکل کر گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کے اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستہ بھر چاند خان اپنے اس بنارس والے دوست کی تعریفیں کرتا رہا۔

"بڑا سچا مسلمان اور جی دار دوست ہے۔ اپنے دوست کے لیے جان بھی قربان کر سکتا ہے۔"

بنارس سے ٹرک کلکتہ کی طرف چل پڑا۔ دن کے دس بجے وہ صوبہ بہار کے مشہور تاریخی شہر گیا پہنچے

یہ وہ شہر تھا جہاں، آج سے اڑھائی ہزار سال پہلے مہاتما بدھ کو بڑ کے درخت تلے گیان حاصل ہوا تھا۔ یہاں سے وہ دھنباد اور پھر آسنسول پہنچے تو صوبہ بنگال کی سرحد شروع ہو گئی تھی۔ اور پیپل کے درختوں کی جگہ تاڑ اور ناریل کے درختوں نے لے لی تھی۔ آسنسول کے آگے درگاہ پور، بردوان اور پھر کلکتہ شہر آ جاتا ہے۔ چاند خان یہ ساری تفصیلات ندیم کو بتاتا جا رہا تھا۔ بنگال میں داخل ہوتے ہی ندیم انتہائی محتاط ہو گیا تھا۔ یہاں سردی بھی تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خوشگوار حرارت آ گئی تھی۔ ندیم نے سوئیٹر اور کوٹ اتار دیا تھا۔ صرف شال کندھوں پہ رہنے دی تھی اور سر پر اونی ٹوپی اوڑھے رکھی تھی۔ کیونکہ اس حلیے میں بہت کم پہچانے جانے کا امکان تھا۔ سہ پہر کے چار بج رہے تھے کہ ٹرک بردوان شہر کی مضافات میں داخل ہو گیا۔ سڑک پر ٹریفک بڑھ رہی تھی۔ مسافر بسیں اور ٹرک بھی آتے جاتے مل جاتے تھے۔

ندیم سیٹ میں ذرا نیچے ہو کر بیٹھا تھا۔ سامنے سے ایک ٹرک آ رہا تھا اس ٹرک نے بتیاں تین بار جلا کر بجھا دیں تھیں۔ اس سگنل کو دیکھتے ہی چاند خان نے بریک لگانی شروع کر دی۔ ٹرک کی رفتار دھیمی ہونے لگی۔ ندیم کچھ پریشان سا ہو گیا۔ چاند خان نے ٹرک کو سڑک کے کنارے کچے پر اتار دیا اور ایک جانب درختوں کے پیچھے روک کر بریک لگا دی اور بولا۔

"آگے پولیس ہے۔ جو ٹرک ہمارے قریب سے گزرا تھا اس نے خطرے کا سگنل دیا ہے۔"

ندیم کا حلق پولیس کا نام سن کر خشک ہو گیا۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ چاند خان نے نیچے اتر کر کلینر سے کہا۔

"بونٹ اٹھا کر پانی ڈالو ریڈی ایٹر میں۔"

وہ ندیم کو ٹرک کے عقب میں درخت کے پیچھے لے آیا اور بولا۔

"پولیس یونہی یہاں چیکنگ نہیں کر رہی۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ تمھاری تلاش میں ہے۔ لیکن یہ میرا وہم بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے اس کی پوری خبر منگوانی ہو گی تم ٹرک کے پیچھے کلینر والی جگہ میں جا کر چھپ جاؤ۔ میں کلینر کو آگے بھیج کر پتہ کرواتا ہوں۔"

ندیم اسی وقت درخت کے پیچھے سے نکل کر ٹرک کے عقب میں اچھل کر پچھلی سیٹ میں گھس گیا۔ یہ سیٹ ایسی تھی کہ سامان کے درمیان میں بنائی گئی تھی اور وہاں اگر آدمی بیٹھ جائے تو باہر

نظر نہیں آتا تھا۔ اتنی دیر میں چاند خان نے کلینر کو ایک ٹرک میں سوار کروا کر آگے روانہ کر دیا۔ وہ خود بونٹ پر چڑھا یونہی انجن میں ہاتھ اِدھر اُدھر چلانے لگا جیسے ٹرک خراب ہو گیا ہو اور وہ اس کی مرمت کر رہا ہو۔ اس دوران وہ ندیم کے پاس ایک لمحے کے لیے بھی نہیں گیا۔ ندیم مال سے بھرے ہوئے کھوکھوں اور بڑے بڑے گٹھڑوں کے درمیان سمٹ کر بیٹھا رہا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ بنگال میں اس کے لیے خیریت نہیں ہے۔ کیونکہ پولیس کو معلوم تھا کہ ندیم دلی کی جیل سے بھاگ کر یا تو باڈر کراس کر کے پاکستان جانے کی کوشش کرے گا اور یا اپنی محبوبہ سے ملنے کلکتے کا رخ کرے گا۔ انھوں نے باڈر پر بھی سیکورٹی کو خبردار کر دیا ہوگا اور یہاں بھی دلی سے آنے والی گاڑیوں کی چیکنگ شروع کر دی تھی۔ وقت رک رک کر گزر رہا تھا۔ سورج مغرب کی طرف غروب ہو رہا تھا۔ دن کی روشنی ماند پڑتی جا رہی تھی۔ ندیم کو سڑک پر سے گاڑیوں کے گزرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اسے یہ دھڑکا بھی لگا تھا کہ کہیں پولیس یہاں تک نہ پہنچ جائے۔ پھر وہ کیا کرے گا؟ وہ یہاں سے بھاگ کر جدھر جائے گا پولیس اسے پکڑ لے گی۔ پیچھے سے اس پر گولیاں برسنا شروع ہو جائیں گی۔ وہ غیر ملکی جاسوس تھا اس پر یہی الزام لگایا گیا تھا اور اسے گولی مار دینا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔

اتنے میں ایک بس ٹرک سے تھوڑی دور آ کر رک گئی۔ اس میں سے کلینر نیچے اتر کر سیدھا اپنے استاد چاند خان کے پاس آیا۔ کچھ دیر اس سے باتیں کرتا رہا۔ چاند خان نے اسے انجن میں کوئی پیچ لگانے کو کہا اور خود ٹرک کے پیچھے آ گیا۔ اسے ندیم دکھائی نہیں دے رہا تھا اس نے اس کا نام لے کر کہا۔

"اسی جگہ بیٹھے رہو۔ میں ٹرک کو دوسری طرف لے جا رہا ہوں۔"

ندیم کے منہ سے اپنے آپ نکل گیا "وہ..... وہ کیا خبر لایا ہے؟" چاند خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرک کا انجن سٹارٹ ہوا اور وہ درختوں میں سے بیک ہو کر ایک طرف گھوم کر سڑک پر آیا اور دوسری طرف آ کر درختوں کے درمیان ایک ویران راستے پر چلنے لگا۔ چاند خان کو ان سارے راستوں کا علم تھا۔ وہ ٹرک کو آہستہ آہستہ غیر ہموار جگہوں سے نکالتا ہوا ایک پرانے مکان کی دیوار کے قریب لے آیا۔ یہاں اس نے ٹرک کھڑا کیا اور اتر کر کلینر سے کہا۔

"انجن گرم ہو گیا ہے اس میں پانی ڈالو۔"

اس کے ساتھ ہی ندیم کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ یہاں اونچے اونچے گھنے چھتاروں والے درخت غروب ہوتے سورج کی الوداعی روشنی سے جدا ہو رہے تھے اور ہلکا ہلکا اندھیرا اس ملگجی کی روشنی کی جگہ لے رہا تھا۔ شاید وہ نیم کا گھنا درخت تھا جس کے نیچے چاند خان بیٹھ گیا اور ندیم کو بھی اس نے اپنے پاس بٹھا لیا۔ کہنے لگا۔

"کلینر نے مجھے بتایا کہ پولیس کسی مفرور ملزم کی تلاش میں آگے سڑک پر چیک پوسٹ قائم کیے ہوئے ہے اور مفرور ملزم کی سرگرمی سے تلاش جاری ہے۔ اسے صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ ملزم خطرناک ہے اور جیل توڑ کر بھاگا ہوا ہے۔ اب تم بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ جہاں تک میرا قیاس ہے یہ بنگال کی پولیس تمہاری ہی تلاش میں یہاں چیکنگ کر رہی ہے۔ میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ اگر پولیس واقعی تیری تلاش میں ہے تو یقینی بات ہے کہ تم گرفتار کر لیے جاؤ گے اور تمہارے ساتھ میں بھی پکڑ لیا جاؤں گا۔"

ندیم کا رنگ اڑ چکا تھا۔ منزل قریب آتے آتے اس سے ہزاروں میل دور ہو گئی تھی۔ کیا وہ واپس چلا جائے؟ مگر واپس کہاں جائے گا جس کے پاس بھی جائے گا وہاں زیادہ دیر تک نہ رہ سکے گا۔ دوسری صورت میں اسے کسی بھی مکان میں قید ہو کر وقت گزارنا ہوگا۔ کیا وہ اتنی دیر تک کسی کے پاس چھپ سکے گا کہ حالات کے معمول پر آنے کا انتظار کر سکے؟ نہیں کوئی بھی اس کے لیے اتنا بڑا رسک نہیں لے گا۔ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ پہ مجبور ہے وہ انہی خیال میں الجھا ہوا تھا کہ چاند خان بولا۔

"اب میرے خیال میں دو ہی صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ تم یہیں سے کسی بس میں سوار ہو کر واپس دلی چھیدے کے پاس چلے جاؤ۔ جب حالات ٹھیک ہو جائیں۔ ذرا امی جمی ہو جائے تو پھر بنگال میں داخل ہونے کی کوشش کرو۔ لیکن اگر تم واپس نہیں جانا چاہتے ہو اور تمہیں ہر حالت میں کلکتہ پہنچنا ہی ہے تو اس کی بھی ایک صورت ہے" ندیم نے فوراً پوچھا۔

"وہ صورت کونسی ہے خان صاحب؟ میں ہر حالت میں کلکتہ میں داخل ہو جانا چاہتا ہوں۔"

چاند خان بولا "وہ صورت یہ ہے کہ امجدیہ ہوٹل کے مالک جبار علی کے نام جو رقعہ تمہارے پاس ہے وہ اور ساری نقدی مجھے دیدو۔ میں یہ نقدی اور تمہارا خط امجدیہ ہوٹل کے مالک

جبار علی کے پاس تمہاری امانت کے طور پر رکھوا دوں گا۔ خط پڑھ کر جبار بھائی سب سمجھ جائیں گے۔"

ندیم بولا "اور میں کلکتہ کیسے پہنچوں گا۔؟"

چاند خان نے کہا "اس کے لیے تمہیں ایک خاص راستے سے کچھ پیدل سفر اور کچھ چھوٹی ٹرین پر سفر کر کے اکیلے کلکتہ پہنچنا ہوگا۔ راستہ میں تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ ادھر پولیس کا بھی زیادہ خطرہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ تم زیادہ تر بنگال کے دیہات میں سفر کرو گے۔ اگر تم اس تجویز پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو تو میں تمہیں سارا راستہ اور روٹ سمجھا دیتا ہوں۔"

ندیم نے جھٹ حامی بھر لی۔ بہرحال کلکتہ ہی پہنچنا اس کے لیے مناسب تھا۔ خطرہ تو واپس جاتے میں بھی تھا۔ وہ کہیں بھی پکڑا جا سکتا تھا۔ چنانچہ وہ دیہاتی راستے سے کلکتہ جانے پر تیار ہو گیا۔ اب چاند خان نے اسے روٹ سمجھانی شروع کر دی۔

"میں یہ ٹرک اسی لیے اس بادی کے پاس لایا ہوں۔ یہ جو پگڈنڈی درختوں میں سے گزر کر مشرق کی طرف جا رہی ہے یہ یہاں سے دو اڑھائی کوس تک ایسے ہی درختوں سے بھرے ہوئے غیر ہموار میدان میں سے گزرتی ہے۔ آگے ایک ندی آ جائے گی اس ندی کی دوسری جانب ایک گاؤں ملے گا۔ وہاں سے ایک کچا راستہ پھر مشرق کی طرف جاتا ہے۔ اسی راستے پر ایک گھنٹہ پیدل چلنے کے بعد ایک بڑا قصبہ آ جاتا ہے۔ سندرا دتی اس قصبے کا نام ہے۔ یہ سارا علاقہ میرا دیکھا بھالا ہے وہاں سے جنوب کی طرف ایک راستہ دو والا نام کے دیہاتی ریلوے اسٹیشن کو جاتا ہے۔ یہاں چھوٹی ریلوے لائن والی ٹرین چلتی ہے۔ اگر تم خیریت سے دو والا اسٹیشن پہ پہنچ گئے تو وہاں سے تمہیں رات کے دو بجے کے قریب ماتا پور کے لیے چھوٹی ریل گاڑی ملے گی۔ تم اس گاڑی میں سوار ہو جانا یہ گاڑی چار بجے صبح لکھیا پور پہنچتی ہے جہاں سے تمہیں سیالدہ کے لیے کسی نہ کسی وقت کوئی نہ کوئی براڈ گیج کی پسنجر ٹرین مل جائے گی۔ سیالدہ کلکتہ ہی کا ایک ریلوے اسٹیشن ہے۔ یاد رکھنا کلکتہ کے دو ریلوے اسٹیشن ہیں۔ ایک سیالدہ ایک ہوڑہ۔ تم سیالدہ اسٹیشن پر اترو گے وہاں سے تم ٹیکسی لے کر شام کے وقت ذکریا اسٹریٹ آ جانا اور کسی سے بھی پوچھو گے تو ذکریا اسٹریٹ میں تمہیں امجدیہ ہوٹل پہنچا دے گا۔ یہ ہوٹل مسجد ناخدا کے پیچھے ہے۔ تمہاری ساری رقم امجدیہ ہوٹل کے مالک کے پاس تمہاری امانت کے طور پر موجود ہوگی اور تمہارا خط

ہو اسے مل گیا ہو گا اس کے بعد تم بانو اور جبار علی جانے۔ تم ضرورت کے لیے اپنے پاس سو روپیہ رکھ لینا۔ اتنی رقم کلکتہ پہنچنے کے لئے کافی سے زیادہ ہو گی۔"

ندیم پہلے ہی تیار تھا۔ وہ خود چاہتا تھا کہ پولیس کی نظروں سے بچنے کے لیے بڑی شاہراہوں کی بجائے اب دیہاتوں اور ویران علاقوں میں سفر کرتا ہوا کلکتہ پہنچے۔ کیونکہ یہاں سیکورٹی بہت سخت تھی اور پولیس اس کی تلاش میں پوری طرح چوکس ہو چکی تھی۔ اس نے چاند خان سے پانچ پانچ اور روپے روپے کے نوٹوں کی شکل میں اپنے ہزار روپے میں سے ایک سو روپے کی رقم لے کر اپنے کرتے کی جیب میں رکھ لی اور چاند خان کے بتائے ہوئے راستے کو ایک بار پھر ذہن میں اچھی طرح سے بٹھا لیا۔ چاند خان نے کہا "تمہیں شام کا اندھیرا گہرا ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

ندیم نے جبار علی کے نام دیا ہوا احمد خان کا خط اور ایک سو کم ایک ہزار روپیہ چاند خان کے حوالے کر دیا اور اسی پگڈنڈی کی طرف دیکھا جہاں اونچے درختوں کے درمیان اندھیرے کے ہلکے ہلکے سائے سرگوشیاں کرنے لگے تھے۔ چاند خان نے خط اور کرنسی نوٹ اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں سنبھال کر رکھ لیے اور اٹھتے ہوئے بولا "اب جتنی جلدی ہو سکے نکل چلو۔ اللہ تمہارا نگہبان ہو۔ راستہ یاد رکھنا اگر بھول گئے تو کسی مصیبت میں پھنس سکتے ہو۔ بات ہندوستانی میں کرنا اور اپنے آپ کو بہار کا رہنے والا بتانا۔" چاند خان نے ایک بار پھر ندیم کو خدا حافظ کہا اور اپنے ٹرک کی طرف بڑھتے ہوئے کلینر کو آواز دی۔

"ابے پانی ڈال دیا انجن میں، جلدی کر دیر ہو رہی ہے۔"

ندیم درختوں میں گھری ہوئی اس پگڈنڈی پر آگیا جس پر اسے مشرق کی جانب اڑھائی کوس تک پیدل چلنا تھا۔ وہ تیز تیز چل رہا تھا تاکہ رات گہری ہونے سے پہلے پہلے دو والا ریلوے اسٹیشن تک پہنچ جائے۔ دوسری طرف چاند خان ٹرک کو لے کر جی ٹی روڈ پر آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے دور سے کچھ ٹرک اور گاڑیاں سڑک کے کنارے کھڑی نظر آئیں۔ سڑک کے درمیان میں پولیس والے کھڑے گاڑیوں کو ایک طرف رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ چاند خان نے بھی اپنا ٹرک دوسری گاڑیوں کے پیچھے لگا دیا۔ کلینر اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وہ معاملے کی

تہہ تک پہنچ گیا تھا مگر وہ اپنے استاد کا فدائی تھا اور مخبری کرنے کے بارے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ چاند خان کی باری بھی آگئی۔ پولیس کی بھاری تعداد وہاں موجود تھی۔ بنگالی ہیڈ کانسٹیبل نے چاند خان کو کاغذ دکھانے کے لیے کہا۔ چاند خان ہمیشہ کاغذ ٹھیک رکھتا تھا۔ اسی دوران انسپکٹر اس کے پاس آگیا اس نے غور سے چاند خان کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک نوٹ بک تھی جس پر وہ بار بار نگاہ ڈال رہا تھا۔ ظاہر ہے اس نوٹ بک میں مفرور پاکستانی جاسوس کی تصویر ہوگی۔ آخر یہ بات کھل کر سامنے آگئی۔ بنگالی انسپکٹر پولیس نے چاند خان کو ایک طرف لے جا کر اسے نوٹ بک میں رکھی ہوئی ندیم کی تصویر دکھائی اور پوچھا۔

"اس آدمی کو تم جانتے ہو؟"

تصویر ہو بہو ندیم کی تھی۔ یہی تصویر اخباروں میں چھپی تھی۔ چاند خان نے تصویر کو جھک کر غور سے دیکھا اور بولا۔

"نہیں سر۔ میں نے اس آدمی کو نہیں دیکھا۔"

یہی تصویر ٹرک کے کلینر کو بھی دکھائی گئی۔ کلینر نے بھی نفی میں جواب دیا۔ چاند خان کے ٹرک کی تلاشی لی گئی کہ اس میں کوئی آدمی تو نہیں چھپا ہوا اور پھر اسے گزر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ چاند خان کی جیب میں وہ خط تھا جو احمد خان نے ندیم کے بارے میں کلکتہ کے جبار علی کے نام لکھا تھا۔ اگرچہ اس میں ندیم کا نام نہیں لکھا گیا تھا اس کے باوجود یہ خط چاند خان کو زندگی کی سب سے بڑی مصیبت میں پھنسا سکتا تھا۔ جب تک وہ پولیس انسپکٹر کے پاس رہا اس کا دل بری طرح دھڑکتا ہی رہا جب وہ ٹرک لے کر دوبارہ جی ٹی روڈ پر چڑھا تو چاند خان نے خدا کا شکر ادا کیا۔ بہت بڑی بلا ٹل گئی تھی۔ اس نے بڑی عقلمندی کی تھی کہ ندیم کو راستے میں ہی اتار دیا تھا۔ اس کا شبہ بالکل درست نکلا تھا پولیس اس کی تلاش میں چیکنگ کر رہی تھی۔ کلینر بولا۔

"خان جی! بابو کلکتہ پہنچ جائے گا نا؟ کہیں راستے میں بھٹک تو نہیں جائے گا؟"

چاند خان نے کلینر کو جھڑک دیا تھا اور کہا۔

"خبردار جو بابو کا پھر ذکر کیا۔ خاموش بیٹھے رہو۔"

ٹرک بردوان کے بارونق علاقے میں سے گزر رہا تھا۔ اب کلکتہ زیادہ دور نہیں تھا۔

دوسری طرف ندیم ندی پار کرنے کے بعد سندراوتی نام کے قصبے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ بنگال کے گاؤں یا قصبے زیادہ تر جھگیوں، ڈھلوان چھتوں والے اک منزلہ مکانوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں ان قصبوں میں زمینداروں اور جاگیرداروں کی دو منزلہ حویلیاں بھی نظر آ جاتی ہیں جن کے احاطے کی دیواریں برسات کی وجہ سے سیاہ پڑ چکی ہوتی ہیں۔ ندیم سندراوتی قصبے سے کچھ پرے ہی آگے گزر گیا۔ اب رات پڑ چکی تھی اور اندھیرا چاروں طرف چھا گیا تھا۔ ندیم دھان کے کھیتوں میں چلتا۔ قصبے کے جنوب کی طرف نکل گیا۔ چاند خان نے اسے جنوب کی طرف جانے کی ہدایت کی تھی۔ وہاں وہ کچا راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا جو اسٹیشن کی طرف جاتا تھا۔ اپنا رخ اس نے جنوب ہی کی طرف رکھا تھا۔ یہاں کھیتوں کے ساتھ ساتھ جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور کہیں کہیں تاڑ کے چھریرے درخت رات کے اندھیرے میں ہلکے نیلے آسمان کے پس منظر میں خاموش کھڑے تھے۔ کچھ دیر کی تلاش کے بعد آخر ندیم کو ایک پگ ڈنڈی جھاڑیوں میں سے ہو کر جنوب کی طرف جاتی نظر آئی۔ وہ اس پگڈنڈی پر چل پڑا۔ وہ کافی دیر تک اس کچے راستے پر چلتا رہا۔ مگر اسے نہ تو دور کہیں کسی ریلوے سگنل کی بتی نظر آئی اور نہ ہی دور سے ریل کے انجن کی سیٹی ہی سنائی دی اسے خیال آیا کہ کہیں وہ راستے سے بھٹک تو نہیں گیا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، مگر وہ کوئی اندازہ نہ لگا سکا۔ چاند خان اس راستے سے اچھی طرح واقف تھا۔ قصبہ کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ ستاروں کو راہنما بنا کر ندیم جنوب کی سمت میں چل رہا تھا۔ دور سے بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز آنے لگی۔ ندیم رک گیا۔ تھوڑی دیر بعد سامنے اندھیرے میں سے ایک بیل گاڑی نمودار ہوئی۔ جب وہ قریب آئی تو ندیم نے بنگالی گاڑی بان سے پوچھا کہ دووالا ریلوے اسٹیشن کتنی دور ہوگا۔ گاڑی بان نے گاڑی روک لی اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی جس سے پیچھے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"جیادہ دور نہیں۔"

ندیم نے گاڑی بان کا شکریہ بھی ادا نہ کیا اور پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ وہ بنگلہ زبان سے ناواقف تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو اس کا علم ہو۔ پگڈنڈی آگے جا کر ایک کچی سڑک میں بدل گئی۔ اب اسے پہلی بار دور تاڑ کے درختوں کے عقب میں سگنل کی سرخ بتی دکھائی دی۔ ندیم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ ٹھیک راستے پر جا رہا تھا۔ یہ چھوٹی لائن کا ایک دیہاتی ریلوے اسٹیشن تھا۔ پلیٹ فارم

رات کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف اسٹیشن کی ڈیوڑھی کے آگے دائیں بائیں کھمبوں پر دو بلب روشن تھے۔ کہیں کوئی مسافر نہیں تھا۔ دفتر کا کمرہ بھی بند تھا۔ گیٹ کے پاس ایک بنگالی بوڑھا بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ ندیم نے اس سے کلکتہ جانے والی گاڑی کے بارے میں پوچھا تو وہ کسی قدر حیرت سے بولا کہ گاڑی تو رات کے دو بجے آئے گی۔ ندیم خاموشی سے پلیٹ فارم پر آ کر ایک خالی بینچ پر بیٹھ گیا۔ موسم خشک تھا مگر سردی بالکل نہیں تھی۔ کھانے پینے کا وہاں کوئی سلسلہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ اسٹیشن ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں کبھی کوئی گاڑی نہیں آئی۔ ندیم چادر کی بکل مار کر بینچ پر بیٹھا اسٹیشن کی ڈیوڑھی والے گیٹ کو دیکھ رہا تھا۔ جو بوڑھا وہاں بیٹھا بیڑی پی رہا تھا وہ وہیں فرش پر لیٹ گیا تھا۔ پہلے ندیم نے سوچا کہ اس سے پوچھے کہ یہاں کہیں سے چائے وغیرہ مل جائے گی مگر ایک تو وہ بنگلہ نہیں جانتا تھا دوسرے اسے خدشہ تھا کہ کہیں اس پر شک نہ پڑ جائے سگریٹ ندیم کے پاس موجود تھے۔ اس نے سگریٹ سلگا لیا۔ ابھی گاڑی کے آنے میں بہت دیر تھی۔ یہ شروع رات کا وقت تھا۔ گھڑی ندیم کے پاس نہیں تھی۔ دو تین سگریٹ پھونکنے کے بعد ندیم نے سوچا کہ اسے کچھ دیر کے لیے نیند کر لینی چاہیئے۔ وہ بینچ پر لیٹ گیا۔ مگر اسے نیند بالکل نہ آئی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ چاروں طرف ایک پُراسرار سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی وقت ندیم کو اس سناٹے سے خوف محسوس ہونے لگتا۔ جیسے پولیس اس کی تلاش میں اسٹیشن کی طرف بڑھ رہی ہو۔ جس بینچ پر وہ بیٹھا تھا وہ اندھیرے میں تھا۔ وہ پلیٹ فارم سے اتر کر سامنے والے کھیتوں میں چلا گیا۔

یہاں اسے کسی قدر تحفظ کا احساس ہوا۔ کم از کم یہاں اسے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ کھیت جوار کا تھا اور ایک جگہ سے اس کی کٹائی ہو چکی تھی۔ ندیم وہاں بیٹھ گیا۔ لیکن رات کے دو بجنے میں ابھی بڑا وقت تھا۔ بیٹھے بیٹھے جب وہ تھک گیا تو اٹھ کر کھیت کے کنارے ٹہلنے لگا۔ اسے بھوک اور پیاس بھی لگ رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر اسے اندھیرے میں ایک کوارٹر سا دکھائی دیا۔ وہ اس طرف چل پڑا معلوم ہوا کہ یہ ٹیوب ویل ہے۔ دروازے پر تالا پڑا تھا اور ٹیوب ویل بند تھا۔ باہر چوبچے میں تھوڑا سا پانی جمع تھا لیکن ندیم نے وہ پانی پینا پسند نہ کیا۔ یہ پانی گندا بھی ہو سکتا تھا۔ وہ چوبچے کی منڈیر پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ عجیب واہیات ریلوے اسٹیشن تھا کہ دو بجے سے پہلے وہاں کوئی گاڑی نہیں آتی تھی۔ سگریٹ بھی ختم ہو گیا۔ ندیم نے سگریٹ زمین پر پھینکا اور

اٹھ کر کھیتوں کی طرف واپس چلنے لگا۔ وہ کھیت کی پگڈنڈی پر چل رہا تھا کہ اُسے انسانی آواز سنائی دی۔ وہ جلدی سے اونچی فصل کے عقب میں بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں وہ آنکھیں پھاڑے اس طرف تکنے لگا جدھر سے اسے انسانی آواز سنائی دی تھی۔ آواز تو اُسے پھر سنائی نہ دی لیکن اس نے سامنے والے کھیتوں میں سے دو انسانی سایوں کو ابھرتے دیکھا۔ یہ سائے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ندیم نے اپنے آپ کو فصل کے اندر چھپا لیا۔ قریب آنے پر معلوم ہوا کہ یہ ایک عورت اور مرد تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال رکھا تھا اور مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے چلے آ رہے تھے۔ وہ بنگلہ زبان بول رہے تھے جو ندیم نہیں سمجھ سکتا تھا۔ دونوں کے لباس دیہاتی قسم کے تھے۔ جب وہ ندیم کے قریب سے ہو کر پگڈنڈی پر سے گزرے تو ندیم نے اپنا سانس روک لیا۔ عورت بھی ایک دم سے یہاں رُک گئی۔ اس نے ایک کھیت کی طرف اشارہ کیا۔ یہ کھیت اس کھیت کے سامنے کچھ فاصلے پر تھا جس کی فصل میں ندیم چھپا بیٹھا تھا۔ مرد نے بنگلہ میں کچھ کہا اور وہ دونوں سامنے والے کھیت کی طرف چل دیئے۔ اس کھیت میں بھی کوئی اونچی فصل اُگی ہوئی تھی۔ جب وہ دونوں اندھیرے میں ندیم کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو وہ فصل کے اندر ہی اندر سے ہوتا ہوا ریلوے اسٹیشن کی طرف نکل آیا۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ وہ پلیٹ فارم پر ہی بیٹھا رہے۔ ندیم واپس پلیٹ فارم والے بنچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اب رات کچھ زیادہ خنک ہو گئی تھی۔ ندیم نے چادر کو جسم کے گرد اچھی طرح سے لپیٹ لیا اور بنچ پر نیم دراز ہو گیا۔ بھوک کی وجہ سے اسے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ ویسے بھی وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک ایسے علاقے میں داخل ہو چکا تھا جہاں پولیس اس کی تلاش میں تھی۔ اس حقیقت سے چشم پوشی اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال سکتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے تھک جاتا تو اٹھ کر بنچ کے پیچھے پلیٹ فارم کے اندھیرے میں ٹہلنا شروع کر دیتا۔ وقت جیسے ایک جگہ تھم گیا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ رات کتنی گزر چکی ہے۔

آخر وہ لمحہ بھی آ گیا جب ڈیوڑھی کے اندر کی بتی روشن ہو گئی۔ ندیم نے دیکھا کہ دبلا پتلا دھوتی پوش بنگالی جمائیاں لیتا ہوا اسٹیشن کے دفتر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے تالا کھولا اور اندر چلا گیا۔ دفتر کی بتی بھی جل اٹھی۔ یہ دفتر بھی تھا اور ٹکٹ والی کھڑکی بھی اس جگہ تھی۔ اب اِکا دُکا

مسافر بھی پلیٹ فارم پر آ کر بیٹھ گئے۔ ندیم نے جیب سے دس روپے کے پانچ نوٹ نکال کر اپنے ہاتھ میں رکھ لیے اور ٹکٹ لینے ڈیوڑھی میں آ گیا۔ اس نے ہندوستانی میں پوچھا کہ کلکتہ کا کرایہ کتنا ہے ٹکٹ بابو نے اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا اور میز پر رکھی ہوئی چیزیں اٹھا کر دوسری طرف رکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی اور وہ جیسے خواب میں چل پھر رہا تھا۔ اپنے آپ ہی وہ ٹکٹ والی کھڑکی کے پاس آ گیا اور ندیم کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"ستره روپے نکالو۔"

ندیم نے جلدی جلدی سے دس دس کے دو نوٹ کھڑکی میں آگے بڑھا دیئے۔ ٹکٹ لیتے وقت ندیم نے سامنے دیوار سے لگی گھڑی کو دیکھا۔ رات کا سوا ایک بج چکا تھا۔ وہ پلیٹ فارم پر آ کر بیٹھ گیا۔ ٹرین کے آنے میں ابھی پون گھنٹہ باقی تھا۔ مگر ندیم کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ پون گھنٹہ پانچ منٹ میں گزر جائے گا۔ وہ سگریٹ پینے لگا۔ خالی پیٹ تمباکو اسے زیادہ تلخ لگ رہا تھا۔ جس طرف سے گاڑی آنے والی تھی اُدھر کچھ فاصلے پر سگنل کا کھمبا لگا تھا جس پر زرد روشنی ہو رہی تھی۔ اگر اسی سگنل کو سامنے کے رُخ سے دیکھا جاتا تو بتی سُرخ ہوتی۔ سگنل ابھی گرا ہوا نہیں تھا۔ پلیٹ فارم پر کچھ اور مسافر آ گئے تھے۔ شاید یہ قریبی قصبے اور دیہات سے آئے تھے۔ ندیم چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ آخر سگنل ڈاؤن ہو گیا اور زرد روشنی بجھ گئی۔ دوسری جانب سے بتی یقیناً سبز ہو گئی ہو گی۔ ندیم نے سگریٹ پھینک دیا تھا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد زور سے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ پھر تھوڑی دیر بعد انجن کی روشنی نظر آنے لگی۔ گاڑی ایک موڑ کاٹ کر نمودار ہوئی تھی۔ انجن کی روشنی کافی تیز تھی۔ ندیم اٹھا اور ڈیوڑھی میں ایک طرف اوٹ میں ہو کر کھڑا ہو گیا۔ وہ انجن کی روشنی کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ انجن شور مچاتا پلیٹ فارم پر سے گزر گیا۔ ندیم نے دیکھا کہ ٹرین کے ڈبوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ یہ ٹرین عام ٹرین سے قدرے چھوٹی تھی اور اس کے ڈبے کشادہ نہیں تھے۔ اکثر مسافر سو رہے تھے۔ ندیم بھی ایک تھرڈ کلاس کے ڈبے میں دوسرے مسافروں کے ساتھ گھس کر ایک طرف کونے میں بیٹھ گیا۔ اس نے چادر اپنے سر پر کر لی اور سر یوں جھکا لیا جیسا کہ سو رہا ہو۔ مگر وہ پوری طرح چوکس تھا اور کنکھیوں سے ایک ایک مسافر کا اور پلیٹ فارم کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہاں اُسے پولیس کا کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر آگے پولیس ہو

خطرہ تھا۔ کیونکہ آگے کلکتہ تھا۔ یہ ٹرین لکھیا پور سے ہوتی ہوئی ماتا پور کی طرف نکل جاتی تھی۔ لکھیا پور ٹرین کو دو گھنٹے بعد پہنچنا تھا جہاں سے ندیم نے کلکتہ کے لیے براڈ گیج ٹرین پکڑنی تھی۔ انجن نے سیٹی دی اور ٹرین پلیٹ فارم سے کھسکنے لگی۔ کچھ دور جا کر ٹرین نے اسپیڈ پکڑ لی۔ جوں جوں ٹرین لکھیا پور کے قریب پہنچ رہی تھی۔ ندیم کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ لکھیا پور جنکشن تھا اور کلکتہ وہاں سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ اس وقت صبح ہو رہی ہوگی اسٹیشن پر پولیس ضرور موجود ہوگی۔ اخبار میں چھپی ہوئی تصویر اور انعام کی بھاری رقم کی وجہ سے ندیم کو بے حد تشویش تھی۔ اگرچہ اس نے اپنا حلیہ کافی بدل لیا ہوا تھا مگر پھر بھی وہ پہچانا جا سکتا تھا۔ میٹر گیج ٹرین رات کے اندھیرے میں ویران ویران چھوٹے اسٹیشن چھوڑے جا رہی تھی صرف ایک اسٹیشن پر رکی۔ اس کے بعد جب پو پھٹنے لگی تو دور لکھیا پور جنکشن کے سگنل کی سبز سرخ روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ یہ اس نے اچھا کیا تھا کہ دو والا اسٹیشن ہی سے کلکتہ تک کا ٹکٹ لے لیا تھا۔ ٹرین لکھیا پور اسٹیشن کے بڑے پلیٹ فارم پر آ کر رک گئی۔ ندیم اپنی نشست پر ہی دبکا بیٹھا رہا۔ کیونکہ کچھ مسافر ڈبے میں سوار ہو رہے تھے۔ ندیم نے بیٹھے بیٹھے باہر پلیٹ فارم کا جائزہ لے لیا تھا۔ ادھر اسے پولیس کا کوئی بھی سپاہی نظر نہیں آیا تھا۔ پلیٹ فارم دوسری طرف تھا۔ اسے سامنے والے پلیٹ فارم پر ایک گاڑی کھڑی نظر آ رہی تھی۔ اس میں مسافر بھی سوار تھے اور پلیٹ فارم پر لوگ چل پھر رہے تھے۔ یقیناً یہی گاڑی کلکتہ جا رہی تھی۔ ندیم ٹرین کی دوسری جانب ریلوے لائن میں اترا اور سامنے والے پلیٹ فارم پر چڑھ گیا۔ بنچ پر بیٹھے ہوئے ایک آدمی سے پوچھا کہ سیالدہ یہی گاڑی جائے گی۔ اس آدمی نے بتایا کہ گاڑی تو یہی ہے مگر اس کے انجن میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے دو گھنٹے لیٹ چلے گی۔ اس دوران ندیم پلیٹ فارم کا جائزہ لے چکا تھا۔ ریلوے اسٹیشن کے دو سپاہی پلیٹ فارم نمبر ایک کے گیٹ کے پاس کھڑے تھے۔ ادھر کوئی سپاہی نہیں تھا۔ سی آئی ڈی والا بھی شاید وہاں کوئی نہیں تھا۔ ورنہ یہ لوگ اجنبی چہرے کی طرف ضرور گھور گھور کر دیکھتے ہیں۔ یہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ندیم نے عافیت اسی میں سمجھی کہ بجائے پلیٹ فارم پر پھرنے کے ٹرین میں کسی جگہ جم کر بیٹھ جانا چاہیے۔ وہ تھرڈ کلاس کے ایک ایسے ڈبے میں گھس گیا جس میں رش نسبتاً زیادہ تھا اور سامان بھی کافی بھرا ہوا تھا۔ وہ سامان کے پیچھے

اس سمت بیٹھ گیا جدھر پلیٹ فارم نہیں تھا۔ عجیب اتفاق کی بات ہوئی کہ وہ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ لائن کے پار سامنے والے پلیٹ فارم پر کھڑے سانولے رنگ کے ایک دبلے پتلے کھدر پوش آدمی نے اسے گھور کر دیکھنا شروع کر دیا۔ ندیم نے توجہ دوسری طرف کر لی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے دوبارہ آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ وہ کھدر پوش لوہے کے کھمبے کے ساتھ لگا بیڑی پیتے ہوئے برابر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

گاڑی کلکتے کے مضافات میں داخل ہو گئی تھی۔

ندیم تھرڈ کلاس کے ڈبے میں اس طرح بیٹھا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو دوسرے مسافروں میں چھپا رکھا تھا۔ ندیم کو اس کھدر پوش بنگالی کا مسلسل خطرہ لگا ہوا تھا جس نے اسے لکھیا پور جنکشن کے سامنے والے پلیٹ فارم سے گھور کر دیکھا تھا۔ یہ انٹیلی جنس کا آدمی بھی ہو سکتا تھا۔ کلکتہ انٹیلی جنس اور پولیس کے لیے ندیم کا چہرہ جانا پہچانا تھا۔ ندیم کلکتہ پولیس کی حراست میں رہ کر ایسی شدید اذیتیں اٹھا چکا تھا کہ انھیں یاد کر کے آج بھی اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ خاص طور پر مرہٹہ پولیس انسپکٹر منجریکر نے اس پر بھیانک تشدد کیا تھا۔ سونا گاچی تھانے کے تقریباً سبھی پولیس اور انٹیلی جنس والے اس کی شکل سے واقف تھے اگرچہ ندیم نے داڑھی بڑھالی تھی۔ اس کے باوجود وہ پہچانا جا سکتا تھا۔ یقینی بات تھی کہ دوسرے علاقے کی پولیس اور سی آئی ڈی والوں کو ندیم کی تصویریں دکھا دی گئی ہوں گی۔ پولیس بڑی سرگرمی سے اس کی تلاش میں تھی۔ اس پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام تھا اور یہ بھارت میں قتل سے بھی بڑا جرم تصور کیا جاتا ہے۔ ٹرین معمولی رفتار کے ساتھ کلکتے کے دوسرے بڑے ریلوے اسٹیشن سیالدہ کے پلیٹ فارم کی طرف بڑھتے ہوئے ریلوے یارڈ میں بچھے ہوئے لائنوں کے بہت بڑے جال پر سے گزر رہی تھی۔ لکھیا پور جنکشن کے بعد ندیم کو وہ سی آئی ڈی والا کھدر پوش پھر دکھائی نہیں دیا تھا۔ ٹرک ڈرائیور چاند خان کے ساتھ ہی کلکتے پہنچ چکا ہو گا۔ اگر بردوان شہر کے باہر پولیس کی چیک پوسٹ نہ ہوتی تو اس وقت تک ندیم بھی چاند خان کے ساتھ کلکتے پہنچ چکا ہوتا۔ مگر بردوان شہر کے باہر جی ٹی روڈ پر ہر گاڑی کی زبردست چیکنگ ہو رہی تھی جس کی وجہ سے چاند خان نے ٹرک پیچھے ہی ایک طرف روک لیا اور ندیم سے کہا کہ کھیتوں اور میدانوں سے گزر کر لکھیا پور جنکشن سے کلکتہ جانے والی گاڑی پکڑے اور کلکتے میں امجدیہ ہوٹل کے مالک جبار علی سے جا کر ملے۔ چاند خان نے ندیم سے ایک ہزار روپیہ اور وہ رقعہ بھی لیکر اپنے پاس لے کر رکھ لیا جو دلّی والے راجو نے اس کے نام لکھ کر دیا تھا۔ اور جس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ندیم ایک بے قصور پاکستانی نوجوان ہے جو اپنی محبوبہ کی تلاش میں ہے اور پاکستان سے دلّی اور پھر دلّی سے کلکتے پہنچا اور پولیس نے اسے پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام لگا کر گرفتار کر لیا۔ اب یہ جیل سے فرار ہو کر تمھارے پاس آ رہا ہے اسے کسی طریقے سے مغربی بنگال کی سرحد پار کروا کر مشرقی پاکستان پہنچا دو۔

جس وقت ٹرین ریلوے یارڈ میں پہنچی تو پو پھٹ رہی تھی۔ ندیم نے ڈبے میں اپنے اپنے سامان کو سنبھالتے مسافروں کے چہروں کو دیکھا ان میں اسے اس کھدر پوش آدمی کا چہرہ کہیں نظر نہ آیا جس نے لکھیا پور جنکشن پر اسے مسلسل گھور کر دیکھا تھا۔ ندیم نے کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر دیکھا سیالدہ کا اسٹیشن اور اس کا یارڈ بہت بڑا تھا۔ ہر طرف روشنیاں ہو رہی تھیں۔ ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہونے لگی تو ندیم نے سر اندر کر لیا اور دروازے کے کونے میں لگ کر بیٹھ گیا۔ ٹرین شور مچاتی پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی۔ مسافروں نے دروازے کی طرف ہلّہ بول دیا۔ ندیم بھی ان میں گھس گیا اور انہی کے ریلے کے ساتھ ڈبے سے نکل کر تھرڈ کلاس والے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسے یہاں سے لوئر چیت پور روڈ پر مسجد ناخدا کے عقب میں واقع امجدیہ ہوٹل جانا تھا۔ ابھی روشنی پوری طرح سے نہیں پھیلی تھی لیکن ندیم کو یقین تھا کہ امجدیہ ہوٹل بھی دوسرے بڑے ریستورانوں کی طرح منہ اندھیرے کھل جاتا ہو گا اور نوکر صفائی وغیرہ میں مصروف ہوں گے امجدیہ ہوٹل ایک بڑا ریستوران بھی تھا جس کی بریانی، پلاؤ، قورمہ اور روغنی نان دور دور تک مشہور تھے جو لوگ کلکتے میں رہ چکے ہیں انھیں معلوم ہو گا کہ امجدیہ ہوٹل اور مسجد ناخدا کا علاقہ مسلمانوں کا گڑھ ہے اور وہاں پاکستان کے بننے سے پہلے امرتسر اور لدھیانہ کے کشمیری شال باف کا کاروبار کرتے تھے یہ لوگ گرم پشمینے کی شالوں کی دھلائی، فروخت اور رفوگری کا کام کرتے تھے۔ یہ لوگ سال میں چھ مہینے یہاں آ کر رہتے تھے۔ کاروبار کرتے اور پھر واپس امرتسر چلے جاتے۔ صرف وہی لوگ

وہاں رہ جاتے جن کی وہاں زکریا اسٹریٹ میں کشمیری شالوں اور نوادرات کی اپنی دکانیں تھیں۔ پاکستان بننے سے پہلے حسین شہید سہروردی اس علاقے میں اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ یہاں کے امرتسری کشمیری بڑے دلیر تھے اور ان کے دلوں میں اسلام اور پاکستان کی خاطر جان قربان کر دینے کا جذبہ ہر وقت موجزن رہتا تھا۔ ندیم کے لیے لوئر چیت پور روڈ کے پاس زکریا اسٹریٹ اور مسجد ناخدا والا علاقہ اجنبی تھا۔ کلکتے میں ویسے بھی ندیم نے زیادہ وقت جیل اور حوالات میں ہی بسر کیا تھا جہاں اس پر گھناؤنا تشدد ہوتا رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں ندیم میں کافی تبدیلی آ گئی تھی۔ اب وہ لاہور والا ناتجربہ کار اور نازک خیال کالج اسٹوڈنٹ نہیں تھا بلکہ اس میں ایک مہم جو اور کمانڈو ایسی سخت جان پیدا ہو گئی تھی۔ بنگلہ زبان وہ پوری طرح سمجھ سکتا تھا۔ اگرچہ روانی سے بول نہیں سکتا تھا۔ کلکتے کے اسٹیشن سیالدہ سے وہ خیریت کے ساتھ باہر نکل آیا۔ بھارت کے صوبے مغربی بنگال کا دارالحکومت اور بہت بڑا شہر کلکتہ نیند سے بیدار ہو رہا تھا۔ ستارے بجھ گئے تھے اور ان کی جگہ آسمان پر سلیٹی رنگ کی پھیکی روشنی کا غبار پھیل رہا تھا۔

سڑک کی دونوں جانب کھمبوں پر بتیاں ابھی تک روشن تھیں۔ کچھ مسافر قریبی بس اسٹاپ پر کھڑے ہو گئے۔ ندیم بھی ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی پوری طرح بیدار آنکھیں دن کے پھیلتے اجالے میں چاروں طرف غور سے ایک ایک آدمی کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ سی آئی ڈی والا کھدر پوش اسے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا اس بات کی ندیم کو بڑی تسلی تھی۔ مگر وہاں بس اسٹاپ پر زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں تھا کیونکہ سامنے ہی سیالدہ اسٹیشن کی عظیم الشان عمارت روشنیوں میں جگمگا رہی تھی اور وہاں پولیس کے کچھ سپاہی بھی ندیم نے دیکھے تھے وہ ان کی نظروں میں آ سکتا تھا۔ ہزار روپیہ چاند خان کے حوالے کرنے کے بعد ندیم نے اپنے پاس سو روپیہ رکھ لیا تھا۔ اس کی آنکھیں ادھر ادھر ٹیکسی کو تلاش کرنے لگیں۔ وہاں ٹیکسی کا ملنا کوئی دشوار بات نہیں تھی۔ سڑک کے پار اسٹیشن کے پلیٹ فارم کے قریب سڑک پر کتنی ہی خالی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ مگر ندیم وہاں سے ٹیکسی لینے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ ایک خالی ٹیکسی بس سٹاپ کے قریب دھیمی رفتار سے گزری تو ندیم نے ہاتھ دے کر اسے روک لیا۔ جلدی سے اس میں سوار ہوا اور سکھ ڈرائیور کو مسجد ناخدا کی طرف چلنے کے لیے کہا۔ امجدیہ ہوٹل کا وہ نام لینا نہیں چاہتا تھا۔

سکھ ڈرائیور نے میٹر اون کیا اور کلکتے کی نسبتاً خالی خالی سڑکوں پر روانہ ہو گیا۔ وہاں سے مسجد ناخدا اتنی قریب نہیں تھی اگر وہ کلکتے کے ہوڑہ اسٹیشن پر اترتا تو فاصلہ زیادہ نہ ہوتا۔ خدا جانے ٹیکسی کہاں کہاں سے گزرتی کافی دیر بعد ایک ایسی سڑک پر آ گئی جس کے وسط میں ٹرام کی لائن بچھی تھی۔ ندیم نے ڈرائیور سے پوچھا کہ مسجد ناخدا ابھی کتنی دور ہے؟ سکھ ڈرائیور بولا "ہم لوئر چیت پور روڈ سے گزر رہے ہیں مسجد ناخدا قریب ہی ہے۔" پھر اس نے پنجابی زبان میں ندیم سے پوچھا کہ وہ پنجاب سے آ رہا ہے؟ ندیم "ہوں" کہہ کر چپ ہو گیا۔ یہ کلکتہ کا قدرے گنجان علاقہ تھا۔ ٹیکسی ایک سینما ہاؤس کے سامنے سے گزری جس کی پیشانی پر مون لائٹ سینما لکھا تھا۔ یہاں اب دن کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ سڑک پر ٹریفک بھی شروع ہو گئی تھی۔ یہاں زیادہ تر رہائشی فلیٹ تھے۔ ٹیکسی ایک کشادہ گلی کے کونے پر جا کر رک گئی۔ گلی میں ایک جانب ندیم کو ایک مسجد کا بڑا محرابی دروازہ اور اونچے اونچے مینارے دکھائی دیے۔ سکھ ڈرائیور نے کہا "یہ مسجد ناخدا ہے باؤ جی۔" ندیم نے کرایہ ادا کیا اور بند دکانوں کے ساتھ ساتھ ہو کر مسجد کے دروازے کی طرف چلنے لگا۔ وہ مسجد کے دروازے کے سامنے سے گزر کر ساتھ والی گلی میں داخل ہو گیا۔ یہاں کچھ...... دکانیں اسے ایسی ملیں جن کے اندر کچھ لوگ بڑے بڑے مٹکوں میں شالیں ڈالے انھیں پاؤں سے کچل رہے تھے۔ مٹکوں میں سے ریٹھوں کی جھاگ اڑ اڑ کر باہر گر رہی تھی۔ ندیم نے ایک آدمی سے امجدیہ ہوٹل کا پتہ پوچھا۔ اس نے ایک جانب اشارہ کیا اور دیوار پر دونوں ہاتھ ٹکائے پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

ندیم گلی میں سے گھوم کر مسجد ناخدا کی عقبی بازار نما گلی میں آیا تو اس کی نظر ایک دو منزلہ عمارت پر پڑی جس کے باہر امجدیہ ہوٹل اردو میں لکھا ہوا تھا۔ ندیم ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ نوکر ہوٹل کا فرش دھو رہے تھے۔ سنگ مرمر کی گول کرسیاں اور میز ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوئے تھے ایک لڑکا کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا کاؤنٹر کے شیشے کو پرانے کپڑے سے چمکا رہا تھا۔ دوسری جانب چبوترے پر انگیٹھیوں میں آگ روشن کر دی گئی تھی۔ ایک انگیٹھی پر بڑا تسلہ چڑھا ہوا تھا۔ جس میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ کئی پتیلے، چائے کی چینکیں، شیشے کے گلاس اور پیالیاں ایک طرف فرش پر پڑی تھیں۔ ندیم کو بتایا گیا تھا کہ امجدیہ ہوٹل کے مالک جبار علی سے اسے ملنا ہو گا

ندیم کو یقین تھا کہ اس کے ساتھی ٹرک ڈرائیور چاند خان نے جبار علی کو راجو کا خط پہنچا دیا ہوگا۔ اور خود بھی اسی ہوٹل میں ہوگا۔

ندیم نے گلی کے آر پار دیکھا یہ کافی کشادہ گلی تھی جو چھوٹا سا بازار لگتی تھی۔ کلکتے میں اس قسم کے چھوٹے بازاروں کو گلی ہی کہا جاتا ہے۔ یہی شاید زکریا اسٹریٹ تھی۔ گلی میں بہت کم لوگ تھے ایک دبلا پتلا بنگالی بوڑھا اپنے سر پہ ناریلوں کا ٹوکرا اٹھائے ندیم کے سامنے سے گزر گیا۔ پھر ایک ملازمہ قسم کی بنگالی عورت ہاتھ میں تھیلا پکڑے گزر گئی اسے کوئی مشتبہ شخص اپنی طرف گھورتا نظر نہ آیا۔ ندیم نے اللہ کا نام لے کر سڑک پار کی گلی عبور کی اور سیدھا امجدیہ ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ جو لڑکا کاؤنٹر پر سجے ہوئے شیشے کے جام صاف کر رہا تھا اس نے بنگلہ میں کہا کہ ابھی چائے نہیں ملے گی۔ ندیم نے آہستہ سے قریب جا کر اردو میں کہا کہ مجھے جبار علی صاحب سے ملنا ہے وہ کہاں ہوں گے لڑکے نے ایک بوڑھے بنگالی ملازم کو آواز دے کر بلا لیا۔ بوڑھے بنگالی نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں ندیم سے پوچھا کہ وہ سیٹھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ ندیم نے کہا کہ وہ پنجاب سے آیا ہے اور سیٹھ کے نام اس کے بھائی کا پیغام لایا ہے۔ بوڑھے نے ندیم کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہوٹل کے بڑے کمرے میں جگہ جگہ سنگ مرمر کی چھوٹی چھوٹی میزیں اور کرسیاں رکھی جا رہی تھیں۔ پیچھے ایک زینہ اوپر والی منزل کو جاتا تھا۔ بوڑھا بنگالی اس زینے پر سے ہوتا ہوا ندیم کو دوسری منزل میں لے گیا یہاں ایک چھوٹا دالان تھا سامنے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ مگر اندر سے دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ بوڑھے بنگالی ملازم نے بند دروازے کے پاس جا کر بنگلہ میں کہا سیٹھ صاحب پنجاب سے کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔ اندر سے آنے والی آوازیں ایک دم بند ہو گئیں پھر دروازہ کھلا اور ایک بھاری بھرکم جسم والا سرخ و سفید ادھیڑ عمر آدمی نمودار ہوا جس نے سفید شلوار اور سلک کی قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے بھاری اور پھولے ہوئے تھے۔ سر کے گھنگریالے سیاہ بالوں میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔ بھرے بھرے چہرے والے اس آدمی کی شکل بتا رہی تھی کہ کبھی یہ خوبصورت نوجوان رہ چکا ہے اس نے ندیم کی طرف گھور کر دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے نوکر کو چلے جانے کو کہا۔ جب بوڑھا بنگالی ملازم نیچے سیڑھیاں اتر گیا تو اس شخص نے پنجابی میں ندیم سے پوچھا کہ اس کا نام کیا ہے؟ ندیم نے تسلی کے لیے سوال کیا "کیا آپ ہی سیٹھ جبار علی ہیں؟" سیٹھ

نے اثبات میں آہستہ سے سر ہلایا تو ندیم نے کہا۔

"میرا نام ندیم ہے۔" اس پر پیچھے سے چاند خان کی آواز آئی "سیٹھ اسے اندر لے آؤ۔" جبار علی نے ندیم کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ کمرے میں چاند خان پہلے سے موجود تھا۔ اس نے اٹھ کر ندیم کو گلے لگا لیا اور پہلا سوال یہی کیا کہ اسے کسی نے یہاں آتے دیکھا تو نہیں ہے۔ ندیم نے گردن ایک طرف جھکاتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ میرا تعاقب نہیں کیا جا رہا تھا ویسے لکھیا پور جنکشن پر ایک آدمی نے ضرور میری طرف گھور کر دیکھا تھا۔" ڈرائیور چاند خان نے جبار علی سے ندیم کا معمولی سا تعارف کرایا۔ تفصیل وہ پہلے ہی جبار سیٹھ کو بتا چکا تھا۔ جبار سیٹھ کو دلی والے اپنے جگری دوست راجو کا خط بھی پہنچا دیا گیا تھا۔ جبار سیٹھ چارپائی پر پاؤں اٹھا کر بیٹھ گیا۔ ندیم سامنے والے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ چھت والا پنکھا بڑی سست رفتار سے چل رہا تھا۔ کلکتے کا موسم زیادہ گرم نہیں تھا پھر بھی گھروں میں پنکھے چل رہے تھے۔ جبار سیٹھ نے ندیم کو کریون اے کا سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔

"چاند خان نے رات کو ہی مجھے راجو کا خط پہنچا دیا تھا ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ٹرین میں تو تمہارا کوئی تعاقب نہیں کر رہا تھا۔؟"

ندیم نے سگریٹ کا ہلکا سا کش لگایا اور ذرا آگے کو جھک کر بولا "جہاں تک میرا خیال ہے میرا تعاقب نہیں کیا گیا بس لکھیا پور کے جنکشن پر ایک کھدر پوش بنگالی نے میری طرف گھور کر دیکھا تھا اس کے بعد وہ آدمی مجھے کہیں نظر نہیں آیا ہو سکتا ہے وہ سی آئی ڈی کا آدمی نہ ہو اور اس نے ویسے ہی مجھے گھور کر دیکھا ہو۔" جبار سیٹھ نے سگریٹ کا کش لگایا اور کہنے لگا "بہرحال تمہیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تمہارے بارے میں یہاں اخباروں میں بھی کافی خبریں آ چکی ہیں۔ تمہاری تصویر بھی بڑے اخباروں میں چھپوا رکھی ہے تم نے اچھا کیا جو تھوڑی سی داڑھی بڑھا لی ہے پھر بھی تم پہچانے جا سکتے ہو۔ پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام کوئی معمولی الزام نہیں ہے اور پھر تم پولیس کی حراست سے فرار بھی ہو چکے ہو۔ ابھی تک پولیس نے زکریا سٹریٹ کے علاقے میں کہیں چھاپہ نہیں مارا۔ لیکن یقینی بات ہے کہ یہاں انٹیلی جنس کے آدمی ضرور نگرانی کر رہے ہوں گے کیونکہ یہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دلی پولیس کی گارڈ اور انٹیلی جنس کا گروپ تمہاری تلاش میں یہاں

کلکتے پہنچ چکا ہو۔"

جبار سیٹھ کو ندیم کے بارے میں ایک ایک تفصیل معلوم تھی۔ کچھ اس نے اخباروں میں پڑھ لی تھی اور باقی کی تفصیلات اسے چاند خان نے بتا دی تھیں۔ ندیم خاموشی سے جبار سیٹھ کی باتیں سن رہا تھا جب وہ خاموش ہوا تو ندیم نے کہا۔ "جیسا کہ راجو نے بھی آپ کو لکھا ہو گا میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ..."

جبار سیٹھ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ستمبر کی جنگ کے بعد مشرقی پاکستان کا بارڈر کراس کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ سرحد پار کروانے سے میرا براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے میں یہاں شرافت سے اپنا کاروبار کر رہا ہوں لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر پاکستان سے آیا ہوا کوئی مسلمان مشکل میں پھنس جائے تو اس کی مدد ضرور کرتا ہوں۔ راجو میرا دوست ہے تم اس کا خط نہ بھی لاتے تو میں کسی نہ کسی طرح تمھاری مدد ضرور کرتا لیکن اب راجو کی وجہ سے مجھ پر تمھاری مدد فرض بن گئی ہے.... میرے کچھ دوست ایسے ہیں جو سرحد پار کروا سکتے ہیں۔ میں ان سے بات کروں گا اتنا مجھے ضرور معلوم ہے کہ ستمبر کی جنگ کے بعد سرحدوں پر دونوں جانب سیکورٹی فورس بڑھا دی گئی ہے اور اسمگلر بھی ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھے ہوئے ہیں لیکن نا امید ہونے کی ضرورت نہیں کچھ وقت گزرنے پر یہ سختی ختم ہو جائے گی۔"

ندیم اکیلا سرحد پار کر کے مشرقی پاکستان نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ نجمی کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اسی مقصد کو ذہن میں لے کر وہ کلکتے آیا تھا۔ نجمی کی زندگی اس کی وجہ سے برباد ہوئی تھی اور اب ندیم اسے گناہوں کی دلدل سے نکال کر کسی حد تک اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے دل میں فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ نجمی کو کلکتے سے نکال کر ڈھاکہ لے جائے گا اور وہاں اس سے شادی کرے گا۔ وہ جبار سیٹھ سے اس ضمن میں بات کرنا چاہتا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ ابھی سرحد پار کرنا مشکل ہے تو اس نے نجمی کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ جبار سیٹھ کہنے لگا۔ "تمھارا میرے ہاں رہنا ٹھیک نہیں... جب تک کہ سرحدوں پر آنا جانا پھر سے ٹھیک نہیں ہو جاتا اتنی دیر تک تمھیں کسی دوسری جگہ رہنا ہو گا۔ میں اس کا بندوبست کروں گا۔ اس وقت تم نہا دھو کر ناشتہ وغیرہ کر لو۔" پھر اس نے ندیم کے لکھنؤ کے ساتھی چاند خان ٹرک ڈرائیور کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔ "تم واپس ٹرک لے کر کب جا رہے ہو؟"

چاند خان نے اسے بتایا کہ وہ اسی دن رات کو مال لے کر لکھنؤ چلا جائے گا۔ جبار سیٹھ نے

اسے ہدایت کی کہ وہ کسی طریقے سے راجو تک یہ پیغام پہنچا دے کہ جیسا اس نے کہا ہے ویسے ہی ہو گا۔ چاند خان نے آخری بار ندیم کو تسلی دی اسے گلے لگایا اور رخصت ہو گیا۔ جبار سیٹھ اس کے ساتھ باہر دالان تک گیا جب چاند خان چلا گیا تو جبار سیٹھ واپس کمرے میں آ گیا اور ندیم کی طرف دیکھ کر بولا۔ "جب تک میں نہ آؤں تم اس کمرے سے باہر مت نکلنا۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ ندیم کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ اسے طرح طرح کے پریشان خیالوں نے گھیر لیا اس کا خیال بار بار نجمی کی طرف جاتا وہ بھی اسی شہر میں تھی اور جس فضا میں ندیم سانس لے رہا تھا نجمی بھی اسی فضا میں سانس لے رہی تھی۔ وہ اڑ کر اس کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ مگر نہیں جا سکتا تھا۔ جیل میں اسے صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ پولیس نے نجمی کو رہا کر دیا ہے مگر اس کی مسلسل نگرانی کی جا رہی ہے۔ دلی پولیس بھی کلکتے پہنچ گئی ہو گی۔ کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ ندیم فرار ہو کر نجمی کے پاس ضرور جائے گا۔ ندیم مونڈھے پر سے اٹھ کر پلنگ کی پٹی سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ ساری رات پریشانی کے عالم میں سفر میں گزری تھی۔ بیچ میں تھوڑی دیر کے لیے ہی اس کی آنکھ جھپکی تھی اسے نیند آ رہی تھی مگر وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ جبار سیٹھ نے اسے نہانے اور ناشتہ کرنے کے لیے کہا تھا۔ ندیم نے کمرے کا جائزہ لیا غسل خانہ کمرے کے اندر ہی تھا وہ خود بھی نہانا چاہتا تھا۔ وہ اٹھا اور غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب نہا کر باہر نکلا تو کافی حد تک تازہ دم ہو گیا تھا۔ نیچے سڑک پر سے اب ٹریفک کے شور کی آواز آنے لگی تھی۔ چند لمحے کے بعد جبار سیٹھ کمرے میں آیا۔ دروازہ بند کر کے بولا۔ "میرے ہوٹل کے نوکروں نے تمھیں دیکھ لیا ہے۔ ایسی فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے انھیں یہی بتایا ہے کہ میرے ایک جاننے والے کا بھائی ہے آج شام واپس چلا جائے گا....... میرا اندازہ تو یہی ہے کہ ان میں سے کسی نے تمھیں نہیں پہچانا۔" باہر سے نوکر کی آواز آئی۔ "سیٹھ صاحب ناشتہ لے آیا ہوں۔" سیٹھ جبار خود اٹھ کر باہر دالان میں گیا اور ناشتے کی ٹرے نوکر سے لے کر اندر آ گیا۔ "ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا کہ میرا کوئی جاننے والا میرے پاس آیا ہو اور میں اس کا ناشتہ خود لے کر کمرے میں جاؤں۔ یہ بات میرے نوکروں کو شک میں ڈال سکتی ہے میرے نوکر زیادہ تر مسلمان ہیں۔ مگر دو ہندو بنگالی بھی ہیں..... خیر کوئی بات نہیں جو ہو گا

دیکھا جائے گا تم ناشتہ کرو میں تمہارے لیے کسی مناسب جگہ کا بندوبست کرنے جاتا ہوں جہاں تم محفوظ ہو کر رہ سکو،، جبار سیٹھ چلا گیا۔ ندیم ناشتہ کرنے لگا پہلی بار وہ باہر تالا لگا گیا تھا اس نے جاتے ہوئے ندیم کو یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ وہ اندر سے کوئی کھڑکی وغیرہ نہ کھولے ناشتے میں پوُری حلوہ اور قیمے کا قتلہ بھی تھا۔۔۔۔ چائے کی بھری ہوئی چینک بھی ساتھ ہی تھی ندیم کو سخت بھوک لگی تھی اس نے جی بھر کر ناشتہ کیا اور پھر پلنگ پر لیٹتے ہی گہری نیند میں کھو گیا۔ اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب خود جبار سیٹھ اسے جگا رہا تھا۔ وہ کاندھے پر ہاتھ رکھے اسے آہستہ آہستہ ہلا رہا تھا۔ ندیم نے آنکھیں کھول دیں۔ خواب میں وہ اپنی والدہ اور والد کے پاس پہنچا ہوا تھا اسے یوں لگا جیسے اب بھی وہ لاہور میں اپنے گھر پہ ہی ہے مگر بہت جلد یہ سحر ٹوٹ گیا جب اس نے سیٹھ جبار کا بھرا بھرا چہرہ اور غلافی آنکھیں اپنے اوپر جھکی ہوئی دیکھیں۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ جبار سیٹھ نے کہا۔

،، نیچے بازار کے کونے میں داہنی جانب ایک بند جیپ کھڑی ہے اس کا پچھلا کینوس کا دروازہ کھلا ہے اس میں جا کر بیٹھ جاؤ۔ ڈرائیور کی ساتھ والی سیٹ پر مت بیٹھنا۔ ڈرائیور تمھیں شہر سے باہر ایک چھوٹے تالاب کے کنارے والے مکان میں لے جائے گا۔ ڈرائیور سے کوئی بات نہ کرنا اور اس مکان میں گھس کر بیٹھ جانا اور میرا انتظار کرنا جلدی کرو۔،،

ندیم نے اپنے آپ کو ٹھیک کیا۔۔۔۔ آنکھوں پہ ہاتھ پھیرا اور اللہ کا نام لے کر نیچے اتر گیا۔ بازار میں داہنی جانب نظر اُٹھائی کونے میں جہاں کشادہ گلی بڑی سڑک سے ملتی تھی وہاں اسے ایک خاکی رنگ کی بند جیپ کھڑی نظر آئی۔ گلی میں دھوپ مکانوں کے اوپر تک چلی گئی تھی لگتا تھا دن کا تیسرا پہر ہو گیا ہے وہ کافی دیر تک سویا رہا تھا۔ ندیم لمبے لمبے ڈگ بھرتا گلی کے آخری کنارے پر جیپ کے قریب گیا۔ پچھلا کینوس کا دروازہ کھولا اور اندر جا کر بیٹھ گیا۔ جیپ چاروں طرف سے بند تھی۔ اندر ڈرائیور کی سیٹ کے پیچھے ایک چھوٹی سی کینوس کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ ڈرائیور شکل وصورت سے بنگالی نہیں پنجابی لگتا تھا۔ اس نے گردن گھما کر ندیم کو دیکھا پھر سیدھا ہو کر اس طرح بیٹھ گیا کہ کھڑکی اس کی پیٹھ کے پیچھے چھپ گئی۔ اس کے ساتھ ہی انجن اسٹارٹ ہوا اور جیپ تیزی سے ایک طرف نکل کر سڑک پر آ گئی۔ مختلف سڑکوں اور ٹریفک کے شور میں

ڈوبے ہوئے بازاروں میں سے گزرتی جیپ ایک کشادہ سڑک پر آ گئی۔ ندیم نے اپنی سیٹ کے پیچھے کینوس کی دیوار کے سوراخ میں سے باہر دیکھا۔ کلکتے کی یہ سڑک کافی چوڑی تھی اور دور سامنے کنارے پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اونچی اونچی عمارتیں کھڑی تھیں۔ سڑک پر سے کاریں اور بسیں گزر رہی تھیں۔ یہ سڑک کافی طویل تھی۔ پھر جیپ بائیں جانب گھوم کر ایک ایسی سڑک پر آ گئی جس کی ایک جانب وسیع گراؤنڈ تھا۔ گراؤنڈ میں فٹ بال کا کھیل ہو رہا تھا یہاں سے بھی جیپ آگے نکل گئی۔ تیسرے پہر کی نیم سنہری روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جیپ اب دریائے ہگلی کے پل پر سے گزر رہی تھی۔ دریا بھی پیچھے رہ گیا کچھ اونچی اونچی چمنیوں والے کارخانے آئے وہ بھی پیچھے رہ گئے۔ جیپ بڑی سڑک پر سے اُتر کر ایک کچے راستے پر چل رہی تھی۔ یہاں جس طرف ندیم بیٹھا تھا اس طرف پہلے تو کھیتوں کا سلسلہ دور تک ساتھ ساتھ چلتا گیا پھر ایک جھیل گزر گئی جس کے کنارے گھنے درخت کھڑے تھے جیپ کئی موڑ کاٹ کر ایک ویران سے جنگلی علاقے میں آ گئی تھی۔ یہاں نہ کھیت تھے نہ کوئی مکان۔۔۔۔ بس جنگلی جھاڑیاں، تاڑ، ناریل اور املی کے درخت جگہ جگہ اُگے ہوئے تھے زمین ناہموار تھی جیپ کی رفتار آہستہ ہو گئی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ کوئی باقاعدہ سڑک نہیں ہے۔ مٹی بھی اُڑ رہی تھی۔ ندیم نے عقبی دروازے کا تھوڑا سا پردہ اٹھا کر پیچھے دیکھا۔ جیپ ایک جنگل سے گزر رہی تھی۔ جنگلی جھاڑیاں اور اونچی نیچی خشک گھاس جگہ جگہ اگی ہوئی تھی۔ جیپ جس کچے راستے سے گزر رہی تھی وہاں سے مٹی اُڑ رہی تھی۔ بہت جلد جیپ نے ایک موڑ کاٹا تو وہ سایہ دار درختوں کے نیچے آ گئی۔ یہاں دن کی روشنی کم ہو گئی۔ زمین بھی کچی نہیں تھی بلکہ گیلی گیلی تھی اور اس پر گھاس اُگ رہی تھی۔ ندیم پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ جیپ ہچکولے کھا رہی تھی۔

کچھ منٹ جنگل میں اسی طرح دھیمی رفتار سے دھچکے کھاتے جیپ چلتی چلی گئی۔ آخر وہ ایک طرف گھوم کر رک گئی۔ انجن غرا رہا تھا۔ انجن کو ڈرائیور نے بند نہیں کیا تھا۔ ڈرائیور اگلی سیٹ سے باہر نکل گیا۔ ندیم نے عقبی دروازے کو کھول دیا۔ جیپ کے اندر جنگل کی تر و تازہ مرطوب ٹھنڈی ہوا کا جھونکا داخل ہوا۔ ندیم جیپ سے باہر نکل آیا۔ ڈرائیور نے اردو میں کہا ” وہ ہے سامنے مکان،، اس سے آگے اس نے کچھ بھی نہ کہا اور جیپ میں سوار ہو کر جدھر سے آیا تھا اُدھر کو

چل دیا۔ جب جیپ درختوں میں غائب ہو گئی تو ندیم نے مکان کی طرف نگاہ ڈالی یہ اک منزلہ ٹین کی ڈھلانی چھت والا کوارٹر ایک تالاب کے کنارے زمین سے کوئی چار فٹ اونچی مچان پر بنا ہوا تھا۔ آگے بانسوں کو جوڑ کر چھوٹا سا لکڑی کا برآمدہ بنا دیا گیا تھا۔ اس مکان کی دیواریں بھی لکڑی کی تھیں اور آدھے مکان پر کوئی جنگلی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ ندیم آگے بڑھا۔ کوارٹر کا دروازہ بند تھا اور باہر صرف کنڈی لگی ہوئی تھی۔ ندیم مختصر سے لکڑی کے برآمدے سے گزر کر دروازے کے پاس آیا۔ اسے کھول کر اندر دیکھا یہ لکڑی کے فرش والا ایک مختصر سا کمرہ تھا جس میں ایک طرف چارپائی پر بستر تہہ کر کے رکھا ہوا تھا۔ کونے میں پرانی سی چھوٹی گول میز اور کرسی پڑی تھی۔ اندر آکر ندیم کو معلوم ہوا کہ ایک دروازہ پیچھے بھی کھلتا ہے وہ دروازہ کھول کر دوسری طرف آیا تو یہاں دائیں بائیں آمنے سامنے جو جھونپڑیاں سی جھاڑیوں اور درختوں کے بیچ بنی ہوئی تھیں ان میں سے ایک غسل خانہ تھا جہاں ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا۔ صابن، تولیہ، کنگھی سب کچھ موجود تھا دوسری جھونپڑی میں تیل کا چولھا اور کچھ برتن پڑے تھے۔ ندیم کو اس خیال سے گھبراہٹ سی محسوس ہوئی کہ شاید اسے یہاں کافی دیر رہنا پڑے گا۔ اسے پیاس محسوس ہو رہی تھی اس نے صراحی میں سے پانی نکال کر پیا اور چارپائی والے کمرے میں آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور کمرے کا ایک بار پھر جائزہ لیا۔ یہاں بجلی نہیں تھی۔ طاق میں موم بتیوں کا ایک پیکٹ اور ماچس پڑی تھی۔ وہ اُٹھ کر باہر نکل آیا۔ اس کوارٹر کے چاروں طرف جنگل ہی جنگل تھا۔ رات کو یہاں کوئی شیر چیتا آ گیا تو کیا ہو گا؟ ہر طرف گہری خاموشی چھا رہی تھی۔ اس خاموشی میں کبھی کبھی کسی پرندے کے بولنے کی آواز تھوڑی دیر کے لیے بلند ہو کر خاموش ہو جاتی تھی۔ ندیم کو ایسے محسوس ہوا جیسے اسے قید تنہائی میں ڈال دیا گیا ہے۔ لیکن حالات کچھ ایسا رُخ اختیار کر چکے تھے کہ یہ قید تنہائی قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ سورج غروب ہونا شروع ہوا تو ندیم کو جیپ کے انجن کی آواز سنائی دی وہ کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ وہی کینوس کے فریم والی جیپ سامنے والے درختوں میں آکر کھڑی ہو گئی۔ جبار سیٹھ خود اسے چلا رہا تھا وہ نیچے اُتر آیا۔ پیچھے کی طرف جا کر اس نے ایک بڑا تھیلا باہر نکال کر پکڑا اور ندیم کے قریب آکر بولا " جیپ کی آواز پر تمھیں اس طرح باہر نہیں نکلنا چاہیے تھا..... اگر میری جگہ پولیس کی جیپ ہوتی تو کیا کرتے؟" وہ اپنے ساتھ ندیم کے لیے کھانا،

چائے کی بھری ہوئی تھرمس اور کچھ پھل لایا تھا۔ ندیم کے آگے کھانا کھول کر کہنے لگا۔

"میرے مخبروں نے مجھے خبر دی ہے کہ دلی سے پولیس کی ایک گارڈ کلکتہ پہنچ گئی ہے جس میں سی آئی ڈی کے تین تجربہ کار انسپکٹر بھی شامل ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمھاری تصویریں کلکتہ سٹی کے تمام تھانوں میں پہنچا دی گئی ہیں اور سوناگاچی میں لکھی بائی کے کوٹھے اور دریائے ہگلی والی اس کی پرانی کوٹھی کے گرد بھی سی آئی ڈی والوں کی نفری میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔

ندیم خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ اب یہ باتیں اس کے لیے روزمرّہ کا معمول سا بن کر رہ گئی تھیں۔ پولیس والوں کی طرف سے دی گئی گھناؤنی جسمانی اذیتوں، جیل سے فرار اور سخت جان زندگی نے اسے کافی حد تک بے حس بنا دیا تھا۔ کوئی خیال اگر اس کے دل میں گداز پن پیدا کرتا تھا تو وہ نجمی کا خیال تھا جس کی زندگی محض اس کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئی تھی۔ ندیم کو اپنے اس گناہ کا اتنی شدت سے احساس تھا کہ اگر وہ دس بار مر کر بھی نجمی کے ساتھ کیے گئے ظلم کا کفارہ ادا کر سکتا تو وہ اس پر تیار تھا اگرچہ اس سارے الم انگیز کھیل میں اس کی نیت بالکل نیک تھی اس کے باوجود محض اس کے کہنے پر نجمی نے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑا تھا اور ایک ایسی گہری کھائی میں جا گری تھی کہ جہاں سے اس کا نکلنا اتنا آسان کام نہیں تھا جتنا کہ ندیم سمجھ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے سیٹھ جبار کی باتیں سنتا رہا اس نے بیچ میں صرف اتنا کہا " آپ کے خیال میں مجھے یہاں کتنے دنوں تک رہنا پڑے گا سیٹھ صاحب؟" جبار سیٹھ کوارٹر کے اندر چارپائی پر ٹانگیں اوپر کر کے بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اس کے منہ میں سونفی پان تھا جس کی ہلکی ہلکی خوشبو کمرے میں پھیل رہی تھی۔ کہنے لگا "کچھ نہیں کہا جا سکتا ابھی میں ان لوگوں سے نہیں مل سکا جنھوں نے تمھیں سرحد پار کروا کر مشرقی پاکستان پہنچانا ہے یہ تو ان سے مل کر ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہاں تمھیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہو گی کھانا تمھیں روزانہ صبح کو پہنچ جایا کرے گا۔ پیچھے کچن میں بھی آگ وغیرہ کا انتظام ہے مٹی کے تیل کا چولھا اور بوتل بھی تیل سے بھری ہوئی ہے چائے کی پتی چینی وغیرہ سب کچھ ہے ویسے چائے سے بھری ہوئی بڑی تھرمس روزانہ یہاں کھانے کے ساتھ ہی پہنچ جایا کرے گی۔"

ندیم نے کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھوئے اور سگریٹ سلگا کر بولا "سیٹھ صاحب آپ نے مجھے

یہاں پناہ دے کر مجھ پر بڑا احسان کیا ہے ..... میں آپ کے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔"

جبار سیٹھ نے ہاتھ کو تھوڑا سا اوپر اٹھا کر ایک طرف ہلایا اور بولا "اس میں احسان کی کوئی بات نہیں ہے بیٹے ..... ایک تو تم پاکستانی ہو ... مسلمان ہو ..... دوسرے مصیبت میں ہو اور اوپر سے میرے جگری یار راجو نے تمھیں میرے پاس بھیجا ہے۔ اب تم خود ہی اندازہ لگا لو کہ مجھ پر تمھاری کتنی بھاری ذمے داری پڑ گئی ہے۔"

ندیم نے پوچھا ..... "ویسے آپ کا اندازہ کیا کہتا ہے کب تک سرحد پر حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔"

جبار سیٹھ نے آنکھیں سکیڑیں اور سگریٹ کا کش لگا کر بولا "یہ میں کالیے سے مل کر ہی کچھ کہہ سکوں گا ویسے میں نے آج رات اسے بلایا ہوا ہے۔ کالیا بھاری مسلمان ہے دوستوں کے لیے جان قربان کرنے پر تیار ہو جاتا ہے پاکستان سے اسے بھی بہت عشق ہے میری طرح ..... لاؤ تمھارے لیے چائے ڈال دوں۔"

جبار سیٹھ نے پلاسٹک کے گلاسوں میں تھرمس میں سے چائے نکال کر ڈالی۔ ندیم بھی گہری سوچ میں گم چائے پینے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سیٹھ جبار کو نجمی کے ساتھ لے جانے کے بارے میں کچھ بتا دے یا ابھی نہیں؟ ندیم یہ سوچ ہی رہا تھا کہ جبار سیٹھ نے خود ہی اس موضوع کو چھیڑ دیا۔ چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد اس نے ندیم سے پوچھا۔

"جس عورت کی خاطر تم نے یہ سارا جھنجھٹ مول لیا، اتنی مصیبتیں اٹھائیں، پولیس کی اذیتیں برداشت کیں کیا اسے تم کلکتے کے گناہ بازار میں ہی چھوڑ جاؤ گے؟"

ندیم جبار سیٹھ کا منہ تکنے لگا۔ وہ ندیم اور نجمی کے المناک رومان سے پوری طرح واقف تھا اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ راجو نے جبار سیٹھ کو جو خط لکھا تھا اس میں اس کی وضاحت کر دی تھی کہ نوجوان ندیم لاہور سے بھارت کس مقصد کو لے کر آیا ہے دوسری وجہ یہ تھی کہ جبار سیٹھ کا براہ راست نہ سہی مگر کلکتے کے جرائم پیشہ افراد سے تعلق ضرور تھا اور جب اخباروں میں پاکستانی جاسوس ندیم کی خبریں چھپیں تو جبار سیٹھ کو ساری کہانی معلوم ہو گئی۔

علاوہ ازیں سوناگاچی میں منشیات کا دھندا کرنے والوں نے بھی جبار سیٹھ کو چندا عرف نجمی کے بارے میں کافی کچھ بتا دیا تھا۔ ندیم نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ جبار سیٹھ خود ہی بولا "ہم سے بھی ایک پاکستانی عورت کی یہ بے عزتی برداشت نہیں ہو رہی مگر ہم یہاں بہت مجبور ہیں ہمارا سارا کاروبار اسی جگہ پر ہے ہمارے بچے اسی ملک میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ہمیں ایک ایک قدم ہزار بار سوچ کر اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود میں تم دونوں کو بارڈر کراس کروانے کی پوری کوشش کروں گا ..... کیا تم اس چندا نام کی مسلمان عورت کو اپنے ساتھ مشرقی پاکستان لے جانے پر تیار ہو۔؟"

ندیم نے جبار سیٹھ کا ہاتھ تھام لیا اور انکساری سے بولا "سیٹھ صاحب میں چندا کو یہاں گناہ کی دلدل میں کیسے چھوڑ کر جا سکتا ہوں میں اسے ضرور اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں ..... یہ بات تو میں خود آپ سے کرنے والا تھا۔"

جبار سیٹھ نے پیالی نیچے رکھ دی کریون اے سگریٹ کا کش لگایا اور پان کو ایک گال میں چباتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے تمھیں ایسا ہی کرنا چاہیے تمھاری محبوبہ چندا کو لکھی بائی کے اڈے سے نکالنا سخت مشکل کام ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ کلکتہ سی آئی ڈی اس کی نگرانی کر رہی ہے۔ لکھی بائی کے سوناگاچی والے کوٹھے اور دریائے ہگلی والے اسکول کی پرانی کوٹھی کے باہر ہر وقت دو چار انٹیلی جنس کے آدمی موجود ہوتے ہیں۔ چندا جہاں جاتی ہے یہ لوگ اس کے پیچھے پیچھے جاتے ہیں اس کے باوجود میں پوری کوشش کروں گا کہ چندا کو میرے اسمگلر دوست کے آدمی یہاں سے کسی طرح نکال کر تمھارے ساتھ سرحد پار کرا دیں۔"

ندیم نے قدرے مضطرب لہجے میں پوچھا "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ چندا کو بھی اسی جگہ چھپا دیا جائے۔؟"

جبار سیٹھ نے ندیم کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھیں ذرا سی سکیڑیں اور کہا "میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کبھی میں اس قسم کے خطروں میں کود جایا کرتا تھا لیکن جب سے میرے بچے جوان ہوئے ہیں میں ایسا نہیں کرتا ..... میں نے بڑی مشکل سے پولیس کے ریکارڈ میں اپنی فائلیں داخل دفتر کروائی ہیں ..... میں انھیں دوبارہ نہیں کھلوانا چاہتا ..... ہاں اتنا ضرور وعدہ کرتا ہوں کہ

تم دونوں کو جس طرح بھی ہو سکا مشرقی پاکستان پہنچا دوں گا۔"

ندیم نے کہا "تو پھر ایک مہربانی کریں کہ نجمی یعنی چندا کو یہ اطلاع پہنچا دیجیے کہ میں خیریت سے ہوں..... وہ میرے بارے میں بڑی فکر مند ہو گی۔"

جبار سیٹھ نے وعدہ کیا کہ وہ چندا کو یہ خبر پہنچا دے گا۔ جبار سیٹھ دوسرے دن کھانا لے کر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ندیم نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا اور نجمی کی سوگوار یادوں میں کھو گیا۔ نجمی نے اب ہفتے کی شام کو لکھی بائی کے اشارے پر سوناگاچی والی بیٹھک میں مجرا شروع کر دیا تھا مگر وہ پہلے جیسی نجمی نہیں رہی تھی اب وہ ایک تجربہ کار نڈر اور بے باک طوائف بن چکی تھی جس کے سینے میں ہر وقت ان لوگوں سے بھیانک انتقام لینے کی آگ سلگتی رہتی تھی۔ جنھوں نے اس کے ساتھ بہیمانہ اور اخلاق سوز سلوک کیا تھا۔ ان میں گل مچھوں والا موحیمدار سرفہرست تھا اس کے بعد جعفر، لورجیٹی کے کوارٹر والے روپا اور کالی بدمعاش تھے جنھوں نے لکھی بائی کے کہنے پر نجمی کے ذہن میں مسلسل تین دن تک غلیظ گالیوں کا زہر گھولا تھا۔ اسی فہرست میں لکھی بائی کا نام بھی شامل تھا جو بھولی بھالی لڑکیوں کو خرید کر انھیں طوائف بنا دیتی تھی۔ نجمی کسی موقع کے انتظار میں تھی ابھی تک اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ موقع کس قسم کا ہو گا کہ وہ ان تمام بدمعاشوں اور انسانیت کے قاتلوں سے ایک ساتھ بدلہ لے سکے گی۔

جب پولیس انسپکٹر منجریکر نے اسے حوالات سے رہا کر دیا اور نجمی واپس لکھی بائی کے پاس آ گئی تو نجمی کو اس دن سے ندیم کی فکر لگی تھی کہ خدا جانے جیل میں اس کے ساتھ پولیس کس قسم کا وحشیانہ سلوک کر رہی ہو گی پھر جب اس نے سنا کہ ندیم جیل سے فرار ہو گیا ہے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا لیکن ساتھ ہی اس پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ انٹیلی جنس کے آدمی اس کی مسلسل نگرانی کرتے لگے ہیں۔ لکھی بائی تو چندا سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی وہ اسے کہیں نہ کہیں فروخت کرنے پر تیار ہو گئی تھی لیکن انسپکٹر منجریکر نے لکھی بائی کو سختی سے منع کر دیا اور کہا "چندا کا تعلق پاکستانی جاسوسوں کے ایک گروہ سے ہے اس گروہ کا سراغ لگانا چاہتے ہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ چندا تمھارے کوٹھے پر ہی رہے ہمیں یقین ہے کہ ان پاکستانی جاسوسوں میں سے کوئی نہ کوئی اسے ملنے یہاں ضرور آئے گا یا چندا خود ان سے ملنے جائے گی ہم اس کی برابر نگرانی کر رہے

ہیں۔" لکھی بائی سر پکڑ کر رہ گئی۔ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر واقعی چندا کا تعلق پاکستانی جاسوسوں کے کسی گروہ سے ہے تو کہیں لکھی بائی خود کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے لیکن وہ چندا کو پولیس کی ہدایت کے مطابق اپنے پاس رکھنے پر مجبور تھی اس نے اب اسے سوناگاچی والے کوٹھے پر بھی بھیجنا شروع کر دیا یہ بھی پولیس کے اشارے پر کیا گیا تھا۔ انسپکٹر منجریکر کو یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی پاکستانی جاسوس کسی تماش بین کے بھیس میں چندا کے پاس ضرور آئے گا۔ دوسری طرف جب جبار سیٹھ کے آدمی نے نجمی کو خفیہ طور پر یہ خبر پہنچائی کہ ندیم کلکتے میں ہی ہے اور خیریت سے ہے تو نجمی کا دل ندیم سے ملنے کے لیے تڑپ اٹھا جس آدمی نے اسے ندیم کے بارے میں بتایا تھا نجمی نے اس سے کسی نہ کسی طرح یہ بھی معلوم کر لیا کہ ندیم کلکتے کے مشرقی جنگل میں کہاں چھپا ہوا ہے۔ اب محبت کے جوش میں آ کر نجمی نے یہ حماقت کی کہ ایک روز منہ اندھیرے دریائے ہگلی والی پرانی کوٹھی سے باہر نکلی سڑک پر آ کر ٹیکسی پکڑی اور ندیم کی خفیہ کمین گاہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ انٹیلی جنس کا ایک آدمی دوسری ٹیکسی میں اس کا تعاقب کر رہا ہے۔

ــ ــ ٭ ــ ــ

نجمی نے چلتے وقت ایک چھوٹا پستول اپنی ساڑھی میں اڑس لیا۔ چاقو اور پستول اب اس کے لیے کوئی انوکھی شے نہیں رہے تھے وہ جس ماحول میں رہ رہی تھی وہاں دوسرے تیسرے دن چاقو اور پستول چلتے ہی رہتے تھے۔ دھوبل بدمعاش نے خود نجمی کو کمانی دار چاقو کھولنا اور اس سے دشمن کے پیٹ میں نیچے سے اوپر وار کرنا اور پستول سے فائر کرنا سکھا دیا تھا تاکہ وقت آنے پر نجمی اپنی یعنی چندا اپنا بچاؤ کر سکے۔ نجمی کو اس ٹریننگ کی ضرورت بھی تھی۔ وہ خود چاقو اور پستول چلانا سیکھنا چاہتی تھی۔ اور وہ اس میں کافی ماہر ہو گئی تھی کیونکہ ایک نہ ایک دن اسے دھوبل سمیت ان سب بدمعاشوں سے اپنی عزت کو تار تار کرنے کا انتقام لینا۔

نجمی یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔ وہ شہر میں جہاں بھی جاتی ہے سی آئی ڈی والا اس کے پیچھے لگا ہوتا ہے۔ جس وقت اسے ندیم کی خفیہ کمین گاہ کا سراغ ملا اور اس نے ندیم سے فوراً ملنے کا فیصلہ کیا تو وہ شدید جذباتی ہیجان میں تھی۔ وہ یہ بھول گئی تھی کہ انٹیلی جنس والے اس کا تعاقب کریں گے۔ جب وہ کوٹھی کے گیٹ پر آئی تو اسے احساس ہوا کہ وہ پولیس کی نگرانی میں ہے۔ واپس اپنے کمرے میں جا کر الماری میں سے چھوٹا جرمن پستول نکال کر اس کے میگزین کو چیک کیا۔ اسے ساڑھی میں چھپایا اور کوٹھی سے نکل کر سڑک پر آ گئی نکھی بائی نے آدھی رات تک سونا گاچی میں دوسری طوائفوں کے ساتھ ڈیوٹی دی تھی اور تماش بینوں سے نوٹ وصول کیے تھے چنانچہ وہ اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہی تھی۔ نجمی نے رات ہی کو یہ پروگرام بنا لیا تھا کہ وہ منہ اندھیرے ندیم سے ملنے اس کی خفیہ کمین گاہ کی طرف روانہ ہو گی۔ نجمی کلکتے کے چپے چپے سے واقف ہو چکی تھی۔ بنگلہ زبان وہ روانی سے بول لیتی تھی۔ بنگال کی مرطوب ہوا

میں رہتے ہوئے اس کا رنگ جو لاہور میں گورا ہوا کرتا تھا سانولا ہو گیا تھا۔

ٹیکسی منہ اندھیرے جاگتی، بیدار ہوتی فضا میں دریائے ہگلی پر بنے ہوئے ہوڑہ برج کی طرف دوڑی چلی جا رہی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ انٹیلی جنس کا آدمی اس کا تعاقب نہ کرتا۔ یہ ایک ہندو جس کا تعلق جبل پور کی پولیس انٹیلی جنس سے تھا۔ اگرچہ دبلا پتلا پکی عمر کا تھا مگر انتہائی زیرک اور تجربے کار تھا اور جس کے پیچھے لگ جاتا تھا اسے کیفر کردار تک پہنچا کر ہی چھوڑتا تھا۔ اس کی ڈیوٹی آدھی رات کے بعد نکھی بائی کی دریا والی کوٹھی کے باہر شروع ہوتی تھی۔ وہ عام شہریوں کے لباس میں ملبوس کوٹھی سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک جگہ جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھا تھا۔ رات کا پچھلا پہر بھی گزر گیا۔ منہ اندھیرے کا سماں ہوا تو اس نے ایک ساڑھی پوش... عورت کو کوٹھی کے گیٹ تک آتے دیکھا۔ سی آئی ڈی والا چوکس ہو گیا اور غور سے کوٹھی کی طرف دیکھنے لگا۔ عورت کو اس نے پہچان لیا۔ یہ چندا طوائف یعنی نجمی تھی جس کی نگرانی پر اسے مامور کیا گیا تھا۔ چندا کو اس نے گیٹ پر آ کر ایک پل کے لیے رکتے اور پھر واپس کوٹھی کے اندر جاتے دیکھا۔ سی آئی ڈی والا نظریں جمائے وہیں بیٹھا رہا۔ چند لمحوں کے بعد چندا یعنی نجمی دوبارہ نمودار ہوئی اور کوٹھی سے نکل کر درختوں کے نیچے سے ہوتی ہوئی بڑی سڑک پر آ گئی۔ سی آئی ڈی والا ہندو بھی جھاڑیوں میں سے نکل آیا۔ ایک خاص فاصلہ رکھ کر اس نے نجمی کا تعاقب شروع کر دیا۔ رات کو ایک ٹیکسی سڑک سے ہٹ کر درختوں کے نیچے ہر وقت موجود رہتی تھی۔ یہ ایک طرح سے پولیس ہی کی تحویل میں تھی تاکہ بوقت ضرورت ٹیکسی تلاش نہ کرنی پڑے۔ جب سی آئی ڈی والے ہندو نے چندا یعنی نجمی کو دیکھا کہ وہ سڑک پر آ کر کھڑی ہو گئی ہے اور کسی ٹیکسی وغیرہ کے انتظار میں ہے تو اچانک اس کے دل میں ایک اسکیم کا خیال آیا۔ اس وقت منہ اندھیرے کا وقت تھا اور دن کی روشنی پوری طرح نہیں پھیلی تھی۔ سی آئی ڈی والا ہندو جھاڑیوں اور درختوں کے عقب سے تیز تیز چلتا سڑک کے پیچھے ان درختوں میں آ گیا جہاں پولیس کی حاصل کردہ ٹیکسی رات کو ہر وقت موجود رہا کرتی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور پچھلی سیٹ پر گہری نیند سو رہا تھا۔ ہندو سی آئی ڈی والے نے اسے جگایا اور کہا کہ وہ اسی جگہ اس کا انتظار کرے خود ٹیکسی میں بیٹھا اور ٹیکسی کو درختوں میں سے نکال کر سڑک پر لے آیا۔ ڈرائیور نیند میں تھا ٹیکسی سے نکل کر وہیں درخت کے نیچے لیٹ گیا اور گہری نیند میں کھو گیا۔ انٹیلی جنس ہندو

سپاہی سفید کپڑوں میں تھا اور اس نے اپنا آپ وہاں کسی کو نہیں دکھایا تھا۔ نجمی بھی اس کی شکل سے ناواقف تھی۔ سفید پوش سپاہی نے دیکھا کہ نجمی سڑک کے کنارے سیدھی چلی جا رہی تھی۔ اسے اپنے عقب میں گاڑی کی آواز سنائی دی تو رک کر پیچھے دیکھا اور ٹیکسی کو ہاتھ کے اشارے سے رکنے کا اشارہ کیا۔ انٹیلی جنس والے سپاہی کو یہی چاہیئے تھا۔ نجمی کے قریب جا کر اس نے ٹیکسی روک دی اور یونہی ایک جمائی لے کر بنگلہ میں بولا ”میں اڈے پر جا رہا ہوں۔ زیادہ دور نہیں لے جا سکوں گا۔“

نجمی نے اسے ڈرائیور ہی سمجھا اور جلدی سے کہا۔ ”میری ماتاجی بہت بیمار ہیں۔ ہوڑہ برج کے پار وہ رہتی ہیں تم مجھے وہاں تک پہنچا دو۔ میں تمھیں سو روپے کرایہ دوں گی۔“

سی آئی ڈی والے نے اداکاری کرتے ہوئے جیسے با دل نخواستہ کہا ”بیٹھ جاؤ۔ اب تم نے ماں کی بیماری کا کہہ دیا ہے کیا کروں۔ تمھیں پہنچانا ہی پڑے گا۔“

نجمی ٹیکسی میں پیچھے بیٹھ گئی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ جس آدمی کو وہ ٹیکسی ڈرائیور سمجھ رہی ہے اصل میں وہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے۔ ٹیکسی خالی سڑک پر ہوڑہ برج کی طرف دوڑنے لگی۔ یہاں سے ہوڑہ برج زیادہ دور نہیں تھا۔ پہلے پہل دریائے ہگلی پر بنا ہوا ہوڑہ برج کشتیوں سے تیار کیا گیا تھا لیکن بعد میں کشتیوں کے پل کی جگہ لوہے کا ایک بڑا پل بنا دیا گیا تھا۔ سی آئی ڈی والا عام ٹیکسی ڈرائیوروں کی طرح خاموشی سے ٹیکسی چلا رہا تھا۔ ہوڑہ برج پر پہنچ کر اسے خیال آیا کہ اس سے بڑی سخت غلطی ہو گئی ہے اسے چاہیئے تھا کہ وہ ٹیکسی کے اصلی ڈرائیور کو ہدایت کر آتا کہ وہ پولیس اسٹیشن جا کر خبر کر دے کہ میں دریائے ہگلی والی بڑی سڑک پر چندا کا پیچھا کر رہا ہوں۔ مگر اب وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس ٹیکسی میں وائرلیس کا بھی انتظام نہیں تھا۔ لیکن سی آئی ڈی والا یہ سوچ کر خاموش رہا کہ وہ اس پاکستانی جاسوس کے ٹھکانے کا پتہ چلا کر ہی واپس آئے گا جس سے ملنے چندا جا رہی ہے۔ اسے یقین تھا کہ چندا منہ اندھیرے جو اس طرح کوٹھی سے نکلی ہے تو یقینی طور پر پاکستانی جاسوسوں کے گینگ کے کسی جاسوس سے ملنے جا رہی ہے۔ ٹیکسی نے دریائے ہگلی کا ہوڑہ برج پار کیا تو سی آئی ڈی والے نے پیچھے دیکھے بغیر چندا سے پوچھا ”اب کدھر چلنا ہے؟“

اسی دوران نجمی بار بار پیچھے دیکھتی رہی تھی۔ اسے بڑی تسلی تھی کہ کوئی سی آئی ڈی والا اس کا تعاقب نہیں کر رہا۔ کوئی گاڑی اس کے عقب میں پیچھا کرتی نہیں آ رہی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ جس انٹیلی جنس والے سے بچ کر نکلی ہے وہی اس ٹیکسی کو چلا رہا ہے۔ نجمی نے جبار سیٹھ کے آدمی سے ندیم کی کمین گاہ کے راستے کی ایک ایک تفصیل معلوم کر لی تھی۔ یہ معلومات حاصل کرنے کے لیے نجمی کو رشوت دینی پڑی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ ٹیکسی ڈرائیور دور تک اس کے ساتھ جائے۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ ٹیکسی کہاں چھوڑ دینی ہو گی۔ اس نے دائیں جانب ایک چھوٹی سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”اس طرف چلو۔ چمن باڑی کی طرف۔“

سی آئی ڈی والے نے چمن باڑی کو جانے والی سڑک پر گاڑی ڈال دی۔ اب مشرقی آسمان پر طلوع ہوتے سورج کی گلابی روشنی پھیل رہی تھی۔ ٹیکسی بہت جلد کھیت کھلیانوں کو پیچھے چھوڑ کر نسبتاً ویران سے علاقے میں آ گئی اور کارخانوں کی اونچی اونچی چمنیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ سی آئی ڈی والا سوچ رہا تھا کہ چندا ضرور جاسوسوں کے خفیہ اڈے کی طرف جا رہی ہے۔ جب ایک جگہ سڑک کا موڑ آیا تو نجمی نے گاڑی رکوا دی۔ پرس میں سے سو روپے کا نوٹ نکال کر ٹیکسی ڈرائیور کو دیا اور جلدی سے دروازہ کھول کر نکلی اور بولی ”بس یہاں سے ماتاجی کا مکان قریب ہی ہے۔ تمھارا دھنیاواد بھائی۔“

سی آئی ڈی والے نے بناوٹی جمائی لے کر کہا ”میری طرف سے ماتاجی کا حال پوچھنا بہن۔“

نجمی سڑک سے اتر کر درختوں میں آ گئی اور ایک طرف تیز تیز چلنے لگی۔ یہاں تاڑ ناریل اور سنبل کے گھنے درختوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ سنبل کے درخت اتنے گھنے تھے کہ ان کے نیچے دھوپ بڑی مشکل سے پہنچ رہی تھی۔ یہاں چاروں طرف گھنی ٹھنڈی چھاؤں تھی۔ نجمی کو معلوم تھا کہ ان درختوں کے پار ناریلوں کا ایک گنجان باغ آئے گا۔ اس کے بعد وہ پرانا تالاب ہے۔ جس کے کنارے والے پرانے کوارٹر میں ندیم چھپا ہوا ہے۔ ندیم کے قرب میں آ کر نجمی کا دل فرطِ محبت سے دھڑکنے لگا تھا۔ انٹیلی جنس والا نجمی کا پیچھا کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے وہاں سے تو ٹیکسی موڑ لی تھی مگر کچھ دور جا کر ٹیکسی کو سڑک کے کنارے ایک جگہ جھاڑیوں کے نیچے کھڑا کیا اور کچھ فاصلہ رکھ کر نجمی کا تعاقب شروع کر دیا۔ نجمی نے ساڑھی کا پلو اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیا تھا۔

اس کے پاؤں میں چبھ رہی تھی۔ وہ جھاڑیوں اور خشک گھاس میں سے گزرتی سنبل اور تاڑ کے درختوں میں سے نکل کر ناریلوں کے گنجان باغ میں آگئی۔ ناریل کے ٹیڑھے میڑھے بیدے درختوں کا ایک سلسلہ تھا جو دور تک چلا گیا تھا۔ زمین پر کئی جگہ ناریل گرے پڑے تھے۔ یہاں سورج کی ترچھی کرنیں پڑ رہی تھیں۔ ندیم کے قریب ہونے کے احساس سے نجمی کے اندر ایک نئی طاقت آگئی تھی۔ اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ انٹیلی جنس والا ہندو برابر نجمی کا تعاقب کرتا پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔ وہ درختوں کی آڑ لیتا چلا آرہا تھا۔ نجمی کو اس نے اپنی نظروں میں رکھا ہوا تھا۔ اس ہندو انٹیلی جنس کے حوالدار کو اس بات کی بہت خوشی ہو رہی تھی کہ آج وہ پاکستانی جاسوسوں کے گینگ کا ٹھکانہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور اس کارنامے پر محکمے کی طرف سے اسے یقینی طور پر ترقی مل جائے گی۔ آگے قسمت اپنے دامن میں اس کے لیے کیا لیے بیٹھی تھی اس کی اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ ناریلوں کا باغ ختم ہو گیا۔ نجمی کو تالاب کے کنارے جھاڑیوں اور درختوں میں سے کوارٹر کی ڈھلانی چھت نظر آئی تھی اس کا دل خوشی سے تیز تیز دھڑکنے لگا۔ وہ تالاب کے پاس آئی تو اچانک اسے اپنے عقب میں جھاڑیوں کی سرسراہٹ سنائی دی جیسے کوئی جنگلی جانور اس کی طرف بڑھ رہا ہو۔ نجمی نے ایک دم سے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو ایک آدمی کا چہرہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ نجمی کے جسم میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ ایک پل کے اندر اندر اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اور تعاقب کلکتہ پولیس کی انٹیلی جنس کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا اور اس کم بخت نے وہ کوارٹر بھی دیکھ لیا ہے جہاں ندیم چھپا ہوا ہے۔ نجمی یوں بیٹھ گئی جیسے کانٹا چبھ گیا ہو۔ اس نے ایک سیکنڈ کے اندر اندر فیصلہ کر لیا تھا کہ ندیم کی زندگی بچانے کے لیے اب اسے کیا کرنا ہو گا۔

وہ اٹھی اور کوارٹر کی جانب جانے کی بجائے تالاب کی طرف چل دی یہاں کنارے کنارے کانٹے دار جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ جب وہ پوری طرح سے ان جھاڑیوں کی اوٹ میں آگئی تو نجمی نے اپنی پارٹی میں چھپایا ہوا جرمن پستول نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس پستول سے وہ دھرم مل بدمعاش کی زیر ہدایت کئی فائر نشانے پر لگا چکی تھی۔ نجمی جھاڑیوں میں بیٹھ گئی اور کسی جنگلی چیتے کی طرح بازوؤں اور گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی ان جھاڑیوں سے نکل کر دوسری سامنے والی جھاڑیوں کی

اوٹ میں ہو کر اس طرح سمٹ کر بیٹھ گئی کہ اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا مگر وہ جھاڑیوں کے پیچھے سے سامنے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ سی آئی ڈی والا ادھر سے ضرور گزرے گا اس کی آنکھیں درختوں میں سے ان جھاڑیوں کی طرف آتی پگڈنڈی پر لگی تھیں۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور انگلی ٹریگر پر تھی۔ نجمی سب سے پہلے اس بات کی تسلی کرنا چاہتی تھی کہ جس آدمی کو اس نے اپنے پیچھے دیکھا تھا اور جس نے جلدی سے خود کو درخت کے عقب میں چھپا لیا تھا۔ کیا وہ واقعی انٹیلی جنس کا آدمی ہی ہے اور اس کے تعاقب میں ہی لگا ہوا ہے یا کوئی چور اچکا بدمعاش قسم کا آدمی ہے جو عورت کو جنگل میں اکیلی دیکھ کر اسے اغوا کرنا چاہتا ہے نجمی بڑے غور سے آنکھیں کھولے تالاب کی طرف آتی پگڈنڈی کو تک رہی تھی۔ اچانک اسے ایک آدمی جھکا جھکا درختوں کی اوٹ سے نکل کر تالاب کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ نجمی کو ایسے لگا جیسے اس آدمی کو اس نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ جب وہ چند قدم مزید آگے آیا تو نجمی کا سارا بدن خوف سے ایک لمحے کے لیے سرد ہو گیا۔ یہ وہی ٹیکسی ڈرائیور تھا جو اسے لے کر اس جنگل تک آیا تھا۔ تو کیا یہ انٹیلی جنس کا آدمی تھا؟ اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ نجمی نے سوچا۔ اگر وہ نجمی کو محض اغوا کرنے کی خاطر اس کے پیچھے لگا ہوتا تو وہ اب تک اسے بڑی آسانی سے اغوا کر چکا ہوتا۔ نجمی کو اس آدمی کے ہاتھ میں اب ریوالور بھی دکھائی دیا۔ نجمی کا جسم جو ایک لمحے پہلے خوف سے سرد ہو گیا تھا اب انتقام کی آگ میں بھڑک اٹھا۔ یہ آدمی ندیم کی کمین گاہ کا سراغ لگانے کے لیے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے نجمی اور ندیم کو اپنی بربریت کا نشانہ بنایا تھا اور اب وہ ندیم کو گرفتار کر کے پھانسی کے تختے تک لے جانا چاہتا تھا۔ نجمی کا پستول والا ہاتھ اوپر اٹھا اور نالی جھاڑیوں میں سے ذرا سی باہر نکل آئی۔ انٹیلی جنس کا ہندو حوالدار پھونک پھونک کر قدم رکھتا۔ جھکے جھکے جھاڑیوں کے قریب آگیا تھا اس کی نظریں جھاڑیوں کی بجائے کوارٹر کی طرف تھیں۔ اس کے خیال میں جیندا یعنی نجمی اسی کوارٹر کے اندر گئی تھی۔ وہ کوارٹر کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔

جونہی وہ نجمی کے قریب سے گزرنے لگا نجمی نے اس کی چھاتی کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ دھماکے کی آواز سے جنگل گونج اٹھا۔ درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے پھڑپھڑا کر اڑ گئے۔ گولی پستول میں سے نکل کر سی آئی ڈی کے ہندو حوالدار کی چھاتی کی بجائے اس کی گردن میں لگی تھی اور

ہنسلی کی ہڈی کو توڑتی ہوئی دوسری طرف سے نکل گئی تھی۔ اس آدمی کو جوابی فائر کرنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ اگر نجمی کا نشانہ ٹھیک رہتا اور گولی اس شخص کے سینے میں لگتی تو بہت ممکن تھا کہ وہ جھاڑیوں میں ریوالور سے جوابی فائر داغ دیتا۔ لیکن نجمی کی خوش قسمتی تھی کہ اس کا نشانہ چوک گیا تھا اور گولی دشمن کی گردن میں گھس کر اس کی ہنسلی کی ہڈی کو توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ وہ شخص منہ کے بل گرا اور وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ گولی کی آواز سن کر ندیم کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ نجمی نے جھک کر سی آئی ڈی کے ہندو حوالدار کی لاش کو دیکھا۔ یہ نجمی کا پہلا قتل تھا۔ اسے یہ محسوس کر کے سخت تعجب ہوا کہ اس قتل کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس پر کسی قسم کا خوف یا دہشت طاری نہیں ہوئی تھی۔ قتل کی بڑی دہشت ہوتی ہے اور قاتل پر قتل کے فوراً بعد ایک ہیجان خیز کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن نجمی کے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ ہندو بھی ان وحشی درندوں میں سے ایک تھا جو اس کی حیا باختگی کا باعث تھے۔ بلکہ الٹا نجمی کو تسکین سی ہو رہی تھی کہ اس نے اپنے پہلے دشمن سے بدلہ لے لیا ہے۔ وہ لاش پر سے ہٹ گئی۔ اس نے جھاڑیوں سے نکل کر کوارٹر کی طرف دیکھا۔ ندیم گھبراہٹ کے عالم میں جھاڑیوں کی طرف چلا آ رہا تھا۔ کیونکہ پستول کے فائر کی آواز اسی طرف سے آئی تھی۔ اپنے سامنے پستول ہاتھ میں لیے نجمی کو دیکھ کر وہ وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ نجمی دوڑ کر اس کی طرف آئی اور لاش کی طرف اشارہ کر کے بولی: ”یہ میرا تعاقب کر رہا تھا۔ یہ تمہیں پکڑوانے آیا تھا۔“

ندیم نے نجمی کو اپنے ساتھ لگا لیا پھر جلدی سے اسے کوارٹر کے اندر لے گیا۔ نجمی کا دل ندیم کو اس کے جسم میں جگہ جگہ دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا۔ ندیم نے نجمی کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے تسلّی دی اور کہا: ”جو ہونا تھا وہ ہو گیا مگر۔ مگر یہ کون تھا اور تم یہاں کیسے آ گئیں؟“

نجمی نے ندیم کو شروع سے لے کر آخر تک ساری کہانی کھول کر بیان کر دی۔ ندیم اٹھ کھڑا ہوا کہنے لگا: ”تم نے جو کچھ کیا ہے تمہیں یہی کرنا چاہیئے تھا۔ اب ہمیں اس شخص کی لاش اور پیچھے سڑک پر کھڑی گاڑی دونوں کو ٹھکانے لگانا ہوگا۔ جبار سیٹھ ایک گھنٹے بعد یہاں جیپ لے کر آ جائے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے اس قتل کا علم ہو۔“

”یہ جبار سیٹھ کون ہے ندیم؟“ نجمی نے پوچھا۔ ندیم نے بھی اپنے فرار کی ساری داستان بیان کر

دی۔ نجمی نے پستول اپنی ساڑھی میں چھپا لیا تھا۔ کہنے لگی: ”ان دونوں سے پیچھا چھڑانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ لاش کو ٹیکسی میں ڈال کر کسی ٹیلے سے نیچے گرا دیا جائے گاڑی لاش سمیت جل کر راکھ ہو جائے گی۔ مگر ٹیکسی یہاں سے کافی دور سڑک پر کھڑی ہے۔“

ندیم بولا: ”خواہ کچھ بھی ہو۔ ہمیں لاش کو اٹھا کر گاڑی تک لے جانا ہوگا۔ یہ کام میں خود کروں گا۔ تم یہیں بیٹھی رہو۔“

پھر ندیم نے نجمی سے وہ جگہ پوری تفصیل سے دریافت کی جہاں ٹیکسی واپس کر کے یہ ہندو سی آئی ڈی والا بظاہر شہر کی طرف روانہ ہوا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اس نے وہاں سے قریب ہی کسی جگہ گاڑی کھڑی کی ہو گی۔ ندیم نے لاش کو قریب سے دیکھا اس کی گردن پر خون کے لوتھڑے جمے ہوئے تھے۔ گھاس پر جہاں گردن پڑی تھی خون گول دائرے کی شکل میں جم گیا تھا اور مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ ندیم نے لاش کی گردن پر مٹی ڈال کر جھاڑیوں کی ٹہنیاں باندھیں زمین پر جہاں خون بکھرا ہوا تھا مٹی ڈال کر ایک ڈھیری سی بنا دی۔ لاش دبلی پتلی تھی۔ ریوالور ابھی تک لاش کے ہاتھ میں تھا۔ ندیم نے رومال سے پکڑ کر ریوالور لاش کی جیب میں ڈال دیا۔ ایسا ندیم نے اس لیے کیا تھا کہ اگر بدقسمتی سے کھڈ میں کار گرنے کے بعد نذر آتش نہ ہوئی تو ریوالور پر اس کی انگلیوں کے نشان باقی نہ رہ جائیں لاش کے کپڑوں پر ندیم کی انگلیوں کے نشانات ملنے کے امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ جنگل میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پرندے دوبارہ درختوں کی ٹہنیوں پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ ندیم نے ایک بار پھر کوارٹر میں آ کر نجمی کو کمرے کے اندر ہی بیٹھے رہنے کی تلقین کی۔ دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی لگائی لاش کو اٹھا کر کاندھے پر ڈالا اور ٹیکسی کی طرف چل پڑا۔ شروع میں تو لاش ہلکی پھلکی لگی مگر ناریلوں کے باغ سے نکلتے نکلتے ندیم پسینے میں شرابور ہو گیا اور اس کی ٹانگیں تھک گئیں۔ ایک جگہ لاش کو زمین پر رکھ کر ندیم تھوڑا سستایا اور دوبارہ لاش کو کاندھے پر ڈال کر سنبل اور تاڑ کے درختوں والے سلسلے میں داخل ہو گیا۔ اسے بس ایک ہی خطرہ تھا کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ مگر ابھی تک کوئی کسان یا راہ گیر اس کی راہ میں نہیں آیا تھا۔ ندیم درختوں کے عقب میں ہو کر چل رہا تھا۔ چند قدم چل کر وہ رک جاتا لاش کو زمین پر ڈال دیتا چاروں طرف کا جائزہ لیتا اور لاش اٹھا کر دوبارہ روانہ ہو جاتا۔ ایک جگہ گھاس پر وہ لاش کو کافی دور

تک ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا بھی لے گیا۔ آخر وہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں سے اسے شہر کی طرف جاتی کچی سڑک نظر آنے لگی۔ ندیم نے لاش کو وہیں درختوں میں ڈالا اور خود سڑک پر آ گیا۔ چند قدم پیچھے اسے ایک جگہ سڑک سے اتر کر ٹیکسی کھڑی دکھائی دی۔

ٹیکسی خالی تھی۔ یہ کچی سڑک ایک جنگل کے کنارے پر واقع تھی اور عام گزرگاہ نہیں تھی لیکن یہاں پر دن نکلنے کے بعد وہ مزدور نظر آجاتے تھے جو آگے جنگل میں جا کر لکڑیوں کی کٹائی کرتے تھے۔ مگر ندیم کی خوش قسمتی تھی کہ ان میں سے کوئی مزدور ابھی تک دکھائی نہیں دیا تھا۔ ندیم ٹیکسی اسٹارٹ کر کے اسے آگے لے آیا۔ پھر بھاگ کر درختوں میں گیا۔ لاش جھاڑیوں میں پڑی تھی اسے اٹھا کر ٹیکسی کی پچھلی نشستوں پر رکھ کر اوپر جھاڑیاں وغیرہ توڑ کر رکھ دیں اور ٹیکسی کو اسٹارٹ کر کے ندیم آگے لے گیا یہ جگہ سطح مرتفع قسم کی تھی مگر کوئی اونچا ٹیلا کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ کوئی گہری کھڈ بھی وہاں پر موجود نہ تھی۔ ندیم نے گاڑی کچی سڑک سے اتار کر درختوں کے نیچے کھڑی کر دی۔ ادھر اُدھر سے خشک لکڑیاں ٹہنیاں گھاس پھوس جمع کر کے گاڑی کے انجن اور پٹرول والی ٹینکی کے نیچے ڈھیر لگا دیا اور پھر جیب سے ماچس نکال کر جلائی اور گھاس پھونس کو آگ لگا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹیکسی نے آگ پکڑ لی۔ ندیم دوڑ کر جنگل کے درختوں کے نیچے چلا گیا۔ اب وہ دھماکے کا انتظار کر رہا تھا جس نے ٹیکسی کو شعلوں میں تبدیل کر کے لاش کی ہڈیوں کو بھی جلا کر راکھ بنا دینا تھا۔ آگ جب پٹرول کی ٹینکی تک پہنچی تو ایک زوردار دھماکہ ہوا اور گاڑی کو زرد، سرخ اور نیلے شعلوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی ندیم اپنے کوارٹر کی طرف دوڑ پڑا۔

نجمی کوارٹر میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ ندیم اندر آیا تو اس نے کہا میں نے دھماکے کی آواز سن لی تھی۔ گاڑی کو پوری طرح آگ لگ گئی تھی نا۔" ندیم نے دروازہ بند کر دیا۔ اور چارپائی پر بیٹھتے ہوئے ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگا "ساری گاڑی آگ کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔"

نجمی اس کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گئی اس نے ندیم کے ہاتھ کو پکڑ کر چوما پھر اپنی آنکھوں سے لگایا اور پھوٹ کر رونے لگی۔ ندیم نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔ وہ کہاں سے کہاں آ پہنچے تھے۔ اک ذرا سی ناسمجھی اور لغزش نے انھیں

کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور تھے۔ اس نے اپنی قمیض کے دامن سے نجمی کے آنسو پونچھے اور کہا "جبار میمھ سے میں نے ساری بات کر لی ہے تم میرے ساتھ چلو گی۔ وہ ہم دونوں کو مشرقی پاکستان پہنچا دے گا۔ بس کچھ دنوں کی بات ہے۔ بارڈر پر ان دنوں سیکورٹی سخت ہے حالات ٹھیک ہوتے ہی وہ ہمیں بارڈر کراس کرا دے گا۔ مشرقی پاکستان ہمارا پاکستان ہے ہم وہاں سے لاہور جا کر شادی کر لیں گے۔" نجمی نے ندیم کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اس کی آنکھوں سے جیسے شعلے اور چنگاریاں سی نکلنے لگی تھیں۔ اس نے گہرا سانس لیا اور بولی۔

"ندیم! میں ان لوگوں سے ظلم کا بدلہ لیے بغیر یہاں سے واپس نہیں جا سکتی جنھوں نے میری زندگی کو برباد کیا ہے جنھوں نے میرے گوہر عصمت کو خاک و خون میں ملایا ہے جن کے ظلم و ستم کی وجہ سے آج میں اس حال تک پہنچی ہوں۔"

ندیم اس کا منہ تکنے لگا اسے یقین نہیں تھا کہ نجمی ایسی بات بھی کرے گی اس نے نجمی کا ہاتھ تھام لیا اور بولا "نجمی! پھر تو سب سے پہلے تمھیں مجھ سے انتقام لینا چاہیے۔ مجھ سے بدلہ لینا چاہیے کیونکہ تمھاری بربادی کی اصل وجہ میں ہوں۔" نجمی نے ندیم کی طرف آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا اور بولی۔

"نہیں ندیم! جب میں تمھارے کہنے پر اپنے لاہور والے گھر سے نکل کر ریلوے اسٹیشن کی طرف چلی تھی تو اس میں میرا اپنا ارادہ بھی شامل تھا تم نے مجھے ورغلایا نہیں اور پھر میں تم سے شادی کرنے گھر سے نکلی تھی میری غلطی صرف اتنی تھی کہ جو کام مجھے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی رضامندی سے کرنا چاہیے تھا اسے میں نے خود انجام دینے کی کوشش کی تھی اور میں گھر سے بھاگ گئی جو کسی صورت میں کسی بھی لڑکی کو نہیں کرنا چاہیے لیکن یہاں میں جن لوگوں سے انتقام لینا چاہتی ہوں انھوں نے مجھے بے بس کر کے میرے ساتھ بربریت کا سلوک کیا ہے۔ مجھے وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا ہے میرے سینے میں انتقام کا لاوا دہک رہا ہے۔ جب تک میں ان تمام لوگوں سے اپنے اوپر کیے گئے ظلم و تشدد کا بدلہ نہیں لے لوں گی۔ مجھے مرنے کے بعد بھی چین نصیب نہیں ہو گا۔"

ندیم کے لیے یہ ایک نئی الجھن پیدا ہو گئی تھی اس نے نجمی کو بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن نجمی اپنی ضد پر اڑی رہی اس نے آخری بار بھی یہی کہا کہ میں جب تک اپنی عزت برباد کرنے والوں کی

لاشیں اپنے سامنے خاک و خون میں تڑپتی نہ دیکھ لوں گی یہ ملک چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ ندیم کچھ کہنے ہی والا تھا کہ باہر جنگل میں دور سے جیپ کی آواز سنائی دی۔ وہ چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا "جبار سیٹھ آ رہا ہے تم پچھلے دروازے سے نکل کر درختوں میں کہیں چھپ کر بیٹھ جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے تمہارا پتہ چلے وہ زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہرے گا جلدی کرو۔"

نجمی کمرے کے پچھلے دروازے سے گزر کر کچن اور باتھ روم کے درمیان سے ہوتی سنبل اور تاڑ کے اونچے اونچے درختوں میں آ گئی یہاں خود رو جھاڑ جھنکاڑ کی بھرمار تھی۔ جھاڑیاں قد آدم تھیں نجمی کو بھی ان جنگلوں کا کافی تجربہ ہو چکا تھا وہ ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گئی پستول ابھی تک اس نے ساڑھی میں ہی چھپا رکھا تھا اسے جیپ کے کھڑے ہونے اور پھر انجن بند ہونے کی آواز آئی۔ ندیم دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ جبار سیٹھ کل کی طرح کھانا اور چائے سے بھری ہوئی تھرمس اپنے ساتھ لایا تھا۔ ندیم نے آگے بڑھ کر تھیلا اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ جبار سیٹھ نے سلک کی قمیض اور کالی کنی والی بنگالی دھوتی باندھ رکھی تھی کریون اے کی ڈبی اور سنہرا لائٹر اس کے ہاتھ میں تھا۔ گلے میں سونے کی زنجیریں تھیں اور وہ پان چبا رہا تھا اس نے اردگرد ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پوچھا "کوئی یہاں آیا تو نہیں؟" ندیم نے کوارٹر کے اکیلے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "یہاں کون آ سکتا ہے سیٹھ بھائی بس میں ہی یہاں اکیلا بیٹھا ہوں اور جانے ابھی کب تک یہاں بیٹھنا ہوگا۔"

ندیم نے نجمی کے جانے کے بعد اچھی طرح سے کمرے کا جائزہ لے لیا تھا کہ اس کی کوئی نشانی وہاں نہ رہ گئی ہو۔ نشانی کیا ہو سکتی تھی۔ نجمی تو سوائے بھرے ہوئے پستول کے کچھ بھی اپنے ساتھ نہیں لائی تھی۔ اس نے تو خوشبو بھی نہیں لگا رکھی تھی جس کا ہلکا سا اثر کمرے کی فضا میں باقی رہ جاتا۔ ندیم سوچنے لگا نجمی کس قدر بدل چکی ہے۔ سیٹھ جبار کرسی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ کا گل جھاڑ کر بولا۔

"آج میں تمہارے لیے دو طرح کی مچھلی بنوا کر لایا ہوں۔" ٹھہرو میں کچن سے کل کے برتن اٹھا کر گاڑی میں رکھ دوں۔ ندیم نہیں چاہتا تھا کہ جبار سیٹھ کچن کی طرف جائے وہ جلدی سے اٹھا اور

بولا "آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں میں برتن رکھے دیتا ہوں۔" اور اس سے پہلے کہ جبار سیٹھ کچھ کہتا ندیم تیزی سے دروازہ کھول کر پیچھے کچن میں گیا وہاں تھیلے میں کل کے برتن اس نے باندھ کر رکھے ہوئے تھے۔ تھیلا اٹھا کر بوسیدہ چھت والے کچن سے نکلا تو اس کی نظر اپنے آپ درختوں کی طرف اٹھ گئی۔ درختوں اور جھاڑیوں میں کسی جگہ نجمی چھپی ہوئی تھی ندیم نے برتن لے جا کر جیپ میں رکھ دیئے اور تیز تیز قدم اٹھاتا جبار سیٹھ کے پاس آ گیا۔ ندیم نے ناشتہ کیا اور پھر تھرمس میں سے چائے گلاسوں میں ڈال کر پینے لگے۔ آج ندیم یہی چاہتا تھا کہ جبار سیٹھ وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہرے۔ جبار سیٹھ چائے پیتے ہوئے کہہ رہا تھا "رات میں نے کالیے سے بات کی تھی۔ وہ بھی یہی کہتا ہے کہ آج کل بارڈر پر بڑی سختی ہے ہمیں کچھ روز انتظار کرنا ہوگا اور وہاں میں نے تمہاری معشوق تک اپنے خاص آدمی کے ہاتھ یہ پیغام بھجوا دیا تھا کہ تم جیل سے فرار ہونے کے بعد خیریت سے ہو اور کلکتہ سے سو میل دور کسی خفیہ جگہ پر محفوظ ہو اس سے زیادہ تمہاری عورت کو کچھ نہیں بتایا گیا۔

ندیم نے دل میں سوچا اسے کیا معلوم کہ جس عورت کی وہ بات کر رہا ہے وہ عین اس وقت اسی کوارٹر کے پیچھے درختوں میں چھپ کر بیٹھی ہوئی ہے اس نے جبار سیٹھ کا شکریہ ادا کیا اور بولا "سیٹھ صاحب میں یہی چاہتا ہوں کہ بارڈر کراس کرتے وقت اپنی ہونے والی بیوی کو بھی ساتھ ہی مشرقی پاکستان لیتا جاؤں وہاں جا کر میں اس سے شادی کر لوں گا۔"

جبار سیٹھ نے کہا "یہ تو بڑا نیک ارادہ ہے جنداکی تو زندگی سنور جائے گی میں اس کام میں تمہارا پورا پورا ساتھ دوں گا بس کچھ روز تمہیں یہاں تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ ستمبر کی جنگ کے بعد سرحدوں کی حالت پہلے جیسی نہیں رہی۔ بھارت کو اس جنگ میں بہت ہزیمت اٹھانی پڑی ہے اس لیے بارڈر پر سیکورٹی سخت کر دی گئی ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو کالیا بڑا تجربہ کار اور باا‌ثر آدمی ہے۔ ذرا حالات ٹھیک ہوئے تو چٹکی میں تم دونوں کو بارڈر کراس کرا دے گا۔ میں تمہاری جنداکو بھی کسی نہ کسی طریقے سے بارڈر پر پہنچا دوں گا بشرطیکہ وہ تیار ہو گئی تو۔"

ندیم نے اپنے گلاس میں تھرمس سے چائے ڈالتے ہوئے کہا "وہ میرے ساتھ جانے پر ضرور راضی ہو جائے گی اس سے بڑھ کر اس کے لیے اور کیا بات ہو سکتی ہے۔"

مگر ندیم کے چہرے پر جو تاثرات اس وقت تھے وہ اس کے جملے کی تردید کر رہے تھے کیونکہ نجمی اپنے دشمنوں کی لاشیں خاک و خون میں تڑپائے بغیر اس کے ساتھ جانے پر راضی نہیں ہوئی تھی۔ ندیم بڑا حیران تھا کہ نجمی یہ کس طرف چل پڑی ہے۔ وہ ایسا کس لیے سوچتی ہے؟ شاید ندیم کو اس حقیقت کا احساس نہیں تھا کہ عورت کے لیے اس کا گوہر آبرو کس قدر انمول اور نازک ہوتا ہے اور وہ اس گوہر بے مثل کے لیے اپنی جان تک کیوں قربان کر ڈالتی ہے۔ جبار سیٹھ نے دوسرا سگریٹ لائٹر سے جلاتے ہوئے ایک گہرا کش لگایا اور کہنے لگا۔ "رات کو یہاں جنگل میں جانوروں کی آوازیں ضرور آتی ہوں گی۔ میں آج تمہارے لیے ایک کمانی دار چاقو لیتا آیا ہوں" اور جبار سیٹھ نے جیب میں سے کمانی دار چاقو نکال کر اسے کھولا تو اس میں سے کڑ کڑ کی آواز آئی۔

"اگر کوئی خطرناک جانور ادھر آ جائے تو تم اس سے اپنی حفاظت کر سکو گے۔ خبردار رات کو باہر آگ کا الاؤ روشن مت کرنا" پھر جبار سیٹھ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا "یہ چاقو تم اپنے پاس رکھو اور یہیں بیٹھو میں باہر جا کر جائزہ لیتا ہوں۔ ویسے اس علاقے میں کبھی کوئی نہیں آتا۔ یہ کوارٹر میں نے اپنے مال گودام کے لیے خرید رکھا ہے۔"

جبار سیٹھ اٹھ کر باہر نکل گیا ندیم گھبرایا کہ کہیں جبار سیٹھ نجمی کو نہ دیکھ لے۔ وہ یہ کہتا ہوا باہر آ گیا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ علاقہ بالکل سنسان ہے مگر جبار سیٹھ اتنی دیر میں سنبل کے درختوں کی طرف جا چکا تھا۔ ندیم بھی دوڑ کر اس کے پاس آ گیا۔ جبار سیٹھ کا یہ سارا علاقہ دیکھا بھالا تھا پھر بھی وہ ایک ایک جھاڑی کو دیکھتا جا رہا تھا۔ ندیم کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ نجمی کس جگہ چھپی ہوئی ہے پھر بھی اُسے یقین تھا کہ نجمی جہاں کہیں بھی ہے ان کی آوازیں بھی سن رہی ہو گی اور شاید انھیں دیکھ بھی رہی ہو وہ ضرور ان کی نظروں سے اوجھل رہنے کی کوشش کرے گی۔ نجمی کوارٹر کے عقبی درختوں کے نیچے ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھی تھی کہ اس نے ندیم اور سیٹھ جبار کو جنگل میں آتے دیکھا وہ باتیں بھی کر رہے تھے۔ نجمی جلدی سے رینگتی ہوئی دوسری طرف جھاڑیوں کے پیچھے چلی گئی۔ ندیم پریشان تھا کہ کہیں اچانک کسی جھاڑی کے پیچھے نجمی نظر نہ آ جائے۔ وہ بار بار سیٹھ جبار کو واپس کوارٹر میں چلنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ جبار سیٹھ رک گیا ندیم کی طرف گھور کر دیکھا اور بولا "تم مجھے کچھ گھبرائے ہوئے سے لگتے ہو کیا بات ہے؟" ندیم نے سر پر ہاتھ پھیرتے

ہوئے مسکرانے کی کوشش کی اور کہا "گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں سیٹھ صاحب آپ کے ہوتے ہوئے مجھے گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو صرف اس لیے کہہ رہا تھا کہ کہیں ہمیں کوئی دیکھ نہ لے۔" سیٹھ جبار آگے بڑھتے ہوئے بولا "اسی لیے میں نے تمہیں کوارٹر میں رہنے کے لیے کہا تھا مجھے کوئی دیکھ بھی لے گا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا" درختوں اور خود رو جھاڑیوں میں کچھ دیر گھومنے کے بعد جبار سیٹھ واپس ہو گیا کوارٹر میں جانے کی بجائے وہ اپنی جیپ کی طرف آیا اور بولا۔ "میں جاتا ہوں کل اسی وقت تمہارے لیے کھانا لے کر آؤں گا میرا خیال ہے تمہیں زیادہ سے زیادہ تین چار دن ہی یہاں رہنا پڑے گا کالیا تمہارے بارڈر کراس کروانے کا کوئی خاص بندوبست کر رہا ہے۔"

جبار سیٹھ جیپ میں بیٹھ گیا انجن اسٹارٹ کیا اور جیپ کو درختوں میں سے نکال کر غیر ہموار زمین پر ناریل کے درختوں کی طرف چل دیا۔ جب جیپ ندیم کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ بھاگ کر کوارٹر کے پیچھے آیا اس نے آہستہ سے نجمی کو آواز دی۔ نجمی جھاڑیوں میں سے نکل آئی۔ قریب آ کر بولی "یہ ہے تمہارا سیٹھ؟ یہ تو میرا گانا سننے کبھی کبھی آیا کرتا ہے۔"

ندیم کو اس جملے سے بڑا دکھ ہوا اس کی قسمت میں یہ جملہ سننا بھی لکھا تھا کہ نجمی اسے یہ بتائے کہ فلاں سیٹھ اس کا گانا سننے آتا ہے وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ کوارٹر میں آ کر اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور ایک بار پھر نجمی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس کے ساتھ بارڈر کراس کر کے مشرقی پاکستان چلی جائے کیونکہ سیٹھ جبار نے بھی وعدہ کر لیا ہے کہ اس کا آدمی ان دونوں کو بارڈر کراس کرا دے گا۔ نجمی نے ساڑھی میں چھپا ہوا چھوٹا پستول نکال کر میز پر رکھ دیا اور اس پر اپنے ہاتھ جما کر بولی "اس پستول سے میں ایک آدمی کا خون کر چکی ہوں یہ خون میں نے تمہاری زندگی بچانے کے لیے کیا ہے۔ اب مجھے کچھ خون اپنی زندگی کی تباہیوں کا بدلہ لینے کے لیے کرنے ہیں اور جب تک میں ان لوگوں کو خاک و خون میں نہلا نہیں دوں گی۔ میں بھارت کی سرحد عبور نہیں کروں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" اور اس کے ساتھ ہی نجمی نے پستول اٹھایا اور اسے واپس اپنی ساڑھی میں چھپا لیا۔ ندیم خاموش ہو گیا وہ سمجھ گیا تھا کہ نجمی کو مزید سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں اس وقت ندیم کو نجمی ایک خونخوار وحشی ڈاکو لگ رہی تھی جو اپنے دشمنوں کا خون پینے کے لیے بے چین ہو

نجمی اٹھی اور کہنے لگی "اب میں جاتی ہوں کل آدھی رات کے بعد تم سے ملنے پھر آؤں گی۔" ندیم نے جلدی سے کہا "نجمی یہ غلطی مت کرنا ابھی تم اپنی جگہ پر ہی رہو۔ ہم انٹیلی جنس کے آدمی کا خون کر چکے ہیں۔ پولیس چوکس ہو گئی ہو گی۔ تمھیں اس وقت بھی بڑی ہوشیاری سے واپس جانا ہو گا۔" نجمی نے مسکرا کر ندیم کی طرف دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ میں آہنی عزم کی جھلک نمایاں تھی کہنے لگی۔

"میں گناہ کی تاریک غاروں میں سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہوں ندیم میں تو ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے ہاتھ میں اپنی جان لیے پھر رہی ہوں۔ تم فکر نہ کرو جب تک میں اپنے دشمنوں کو موت کے گھاٹ نہیں اتار لیتی خود نہیں مروں گی۔"

- - ☆ - -

نجمی نے ندیم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا۔

"میں کل آدھی رات کے بعد آنے کی پوری کوشش کروں گی۔ لیکن کیا تم میرے بغیر پاکستان چلے جاؤ گے۔"

ندیم نے بوجھل دل کے ساتھ کہا۔

"میں تمھارے بغیر پاکستان کیسے جا سکتا ہوں نجمی میں تو آیا ہی تمھیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تھا۔"

پھر ندیم نے بڑی محبت سے نجمی کے ہاتھ کو چوم لیا اور کہا "میری بات مانو نجمی۔ جو تم سوچ رہی ہو اس میں کیا ہو گا؟ اس کا نتیجہ بڑا بھیانک بھی نکل سکتا ہے۔ تم اس پوزیشن میں نہیں ہو کہ ان سب لوگوں سے اپنی بربادیوں کا بدلہ لے سکو تمھاری ساری زندگی پڑی ہے۔ میرے ساتھ واپس پاکستان چلی چلو۔ ہم وہاں جاتے ہی شادی کر لیں گے۔"

نجمی دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ فوراً پیچھے کھینچ لیا اور ندیم کی طرف دیکھ کر بولی "میرے دل کے زخموں کو تم نہیں سمجھ سکو گے ندیم میرے جسم کے ٹکڑوں کو جگہ جگہ کاٹ کر پھینکا گیا ہے مجھے بار بار قتل کیا گیا ہے۔ میرے اندر لاوا کھول رہا ہے تم پاکستان چلے جاؤ۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

یہ کہہ کر نجمی باہر نکل گئی۔ ندیم جیسے بے بسی کے عالم میں دروازے میں کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ نجمی ساڑھی کا پلو اپنی کمر کے گرد باندھے تیز تیز قدموں سے درختوں اور جھاڑیوں میں سے گزرتی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ نجمی کا انگ انگ جیسے انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ اس نے وہ

جگہ دیکھی جہاں اس نے اپنی زندگی کا پہلا قتل کیا تھا جہاں ہندو حوالدار کا خون گرا تھا وہاں ندیم نے مٹی کی ڈھیری بنا دی تھی مگر مکھیاں اب بھی اس ڈھیری پر بھنبھنا رہی تھیں ۔ نجمی نے ٹھوکر مار کر ڈھیری منتشر کر دی اور ناریلوں کے باغ کی طرف نکل گئی ۔ دن کافی نکل آیا تھا ۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ انٹیلی جنس کے جس حوالدار کو اس نے قتل کر دیا ہے ۔ اس کی جگہ لینے دن کے نو ساڑھے نو بجے دوسرا آدمی آئے گا نجمی اس سے پہلے اپنے دریا والے بنگلے میں پہنچ جانا چاہتی تھی وہ جتنی تیز چل سکتی تھی چلتے ہوئے پکی سڑک پر آ گئی یہاں ٹیکسی کے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ۔ یہ علاقہ شہر سے باہر جنگل کے ذخیروں کے قریب کا علاقہ تھا ۔ نجمی سڑک کے کنارے چلتی چلی گئی ۔ جب اسے دور سے ہگلی پار کے کارخانوں کی چمنیاں نظر آنے لگیں تو اس نے اپنی رفتار تیز کر دی ۔ اسے پسینہ آ رہا تھا پستول ابھی تک اس کی ساڑھی میں چھپا ہوا تھا ۔ آگے ایک چوراہا آ گیا ۔ یہاں ٹریفک چل رہی تھی ۔ خوش قسمتی سے اسے ایک خالی ٹیکسی مل گئی جس میں بیٹھ کر وہ اپنے پرانے بنگلے کے قریب دریائے ہگلی کی جانب آ گئی یہاں اس نے ٹیکسی چھوڑ دی اور دریا پر آ کر ادھر اُدھر دیکھا دور کچھ ماہی گیر دریا میں کشتی اتار رہے تھے ۔ نجمی نے یہاں دریا میں غسل کیا ۔ سر دھویا اور پھر گیلے بالوں کو نچوڑتی لکھی بائی کے پرانے بنگلے کی طرف چل پڑی ۔ بنگلہ چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا ۔ نجمی نے اس مقصد کے لیے دریا میں غسل کیا تھا کہ وہ لکھی بائی سے یہ کہہ سکے کہ وہ صبح اٹھ کر دریا پر نہانے چلی گئی تھی اور اگر کوئی سی آئی ڈی والا اسے دیکھ بھی رہا ہو تو یہی سمجھے کہ چندا دریا پر نہانے چلی گئی تھی مگر وہاں مقتول سی آئی ڈی والے کی جگہ لینے ابھی دوسرا آدمی نہیں آیا تھا ۔ بنگلے میں نجمی پہنچی تو لکھی بائی ابھی تک سو رہی تھی ۔ نوکرانی سے نجمی چائے لانے کا کہتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی اس سے کوئی دس پندرہ منٹ بعد تھانے سے انٹیلی جنس کا دوسرا آدمی مقتول حوالدار کی جگہ لینے ایک سادھو کے بھیس میں وہاں پہنچ گیا اسے اپنا ساتھی دکھائی نہ دیا تو اس کی تیز نگاہیں اردگرد کا جائزہ لینے لگیں ۔ پھر یہ سی آئی ڈی والا سادھو کے بھیس میں سڑک پر اس مقام پر آ گیا جہاں انھوں نے کرائے کی ٹیکسی رات بھر کے لیے رکھی ہوئی تھی ٹیکسی وہاں موجود نہیں تھی ۔ مگر اس کا ڈرائیور پریشانی کے عالم میں درختوں کے نیچے کھڑا تھا ۔ ٹیکسی ڈرائیور انٹیلی جنس کے سارے سپاہیوں کو جانتا تھا ۔ سادھو کے بھیس میں سی آئی ڈی والے نے ٹیکسی ڈرائیور سے

اس کی ٹیکسی اور اپنے ساتھی کے بارے میں پوچھا تو ڈرائیور نے کہا ۔

"سر! منہ اندھیرے حوالدار صاحب میری ٹیکسی لے کر چلے گئے تھے ۔ اور مجھے یہاں اُتار گئے تھے ۔"

سادھو اسی وقت تھانے پہنچ گیا ۔ مقتول حوالدار کی تلاش شروع ہو گئی ۔ مگر وہ کہاں مل سکتا تھا ۔ انسپکٹر منجر یکر نے ٹیکسی ڈرائیور کو بلا کر اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی کہ حوالدار کے ساتھ دوسرا کوئی آدمی تو نہیں تھا ؟ کیا وہ کسی عورت کے تعاقب میں گیا تھا ؟ کیا آگے بھی کوئی ٹیکسی جا رہی تھی ؟ ٹیکسی ڈرائیور نے یہی کہا کہ وہ نیند میں تھا ۔ حوالدار صاحب نے اسے ٹیکسی سے باہر نکلنے اور اسی جگہ رہنے کی ہدایت کی اور خود ٹیکسی لے کر چلے گئے ۔ عجیب معمّہ بن گیا تھا ۔ جسے انسپکٹر منجر یکر بھی حل نہیں کر پا رہا تھا ۔ اس کے حکم سے لکھی بائی کی دریائے ہگلی والی کوٹھی اور سوناگاچی والے کوٹھے کی نگرانی سخت کر دی گئی ۔ سی آئی ڈی کے آدمیوں کی نفری میں بھی اضافہ کر دیا گیا ۔ اس دوران مقتول حوالدار کی تلاش برابر جاری رہی لیکن اس کا کچھ پتہ نہ چل سکا ۔ جس روز مقتول حوالدار گم ہوا تھا اسی شام کو انسپکٹر منجر یکر لکھی بائی کے پرانے بنگلے پر آیا ۔ وہ سفید کپڑوں میں تھا اور یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ اس روز چندا گھر سے نکل کر تو نہیں گئی تھی ؟ لکھی بائی نے انسپکٹر منجر یکر کے لیے چائے اور پان منگوایا ۔ نجمی اپنے کمرے میں بناؤ سنگھار کر رہی تھی کیونکہ آج رات کو اسے اس بنگلے کے تہہ خانے میں ان "عزت دار" امیر اور ادھیڑ عمر تماش بینوں کے آگے مجرا کرنا تھا جو سوناگاچی چندا بائی کے کوٹھے پر جا کر اس کا گانا نہیں سن سکتے تھے ۔ انسپکٹر منجر یکر ایک تجربہ کار پولیس آفیسر تھا ۔ بنگلے میں داخل ہوتے ہی اس نے بوڑھی ملازمہ کو ایک طرف لے جا کر یہ معلوم کر لیا تھا کہ چندا صبح صبح دریا پر نہانے گئی تھی اور جب وہ واپس آئی تھی تو دن چڑھا ہوا تھا اور اس کے بال گیلے تھے ۔ مرہٹہ پولیس انسپکٹر منجر یکر لکھی بائی سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا ۔ اس نے لکھی بائی کو یہی کہا کہ وہ یونہی اس سے ملنے آ گیا ہے ۔ لیکن لکھی بائی ایک جہاندیدہ نائیکہ تھی ۔ وہ سمجھ گئی کہ انسپکٹر منجر یکر کسی مار پر آیا ہے اور ضرور کہیں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے ۔ نجمی نے بھی جب اپنے چھوٹے سے کمرے میں ساڑھی بدلتے وقت انسپکٹر کی آواز سنی تو اس کا دل ایک لمحے کے لیے بھی زور سے دھڑکا ۔ وہ خوب جانتی تھی کہ یہ بدمعاش انسپکٹر اسی خفیہ حوالدار کی گمشدگی کی

سراغ رسانی کرنے آیا ہے۔ جس کی ہڈیاں بھی شاید جل کر راکھ ہو چکی ہیں۔ نجمی نے کانوں میں سونے کے قیمتی بندے پہنے۔ گردن اور کانوں کے نیچے اعلیٰ کلون کا اسپرے کیا۔ ایک بار پھر آئینے میں اپنے حسن و جمال کا جائزہ لیا۔ اب نجمی کے چہرے پر وہ لاہور میں کالج کے زمانے والی معصومیت اور نورانی جمال نہیں رہا تھا جو پاکباز اور عفت شعار لڑکیوں کا طرہ امتیاز ہوتا ہے۔ اس کے چہرے کے نقوش قدرے گہرے اور کرخت ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں فطری حیا کی جگہ ایک بے باکی ابھر آئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ جوان تھی اور اس کے سراپا میں ایک ایسی دلکشی تھی کہ کلکتے کے موٹی موٹی توندوں والے سیٹھ اسے دیکھتے ہی اپنی توندیں سنبھالنے لگتے تھے۔ اس دوران نجمی نے یہ کام ضرور کیا تھا کہ اپنے کمرے میں آتے ہی دروازہ بند کر کے پستول کی نالی کو اچھی طرح سے صاف کر کے اس میں تھوڑا سا ے دیا تھا تاکہ بارود کی ہلکی سی بُو بھی باقی نہ رہے۔ یہ پستول اس نے لکھی بائی کی الماری میں وہیں رکھ دیا تھا جہاں وہ رات کو پڑا رہتا تھا۔ جب نجمی بن سنور کر باہر آئی تو انسپکٹر منجریکر اس کی خوبصورتی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں پر انگلی پھیرتے ہوئے نجمی کی طرف ہوس آلود نظروں سے تکتے ہوئے بولا ”لکھی بائی! چندا تو روز بروز سندر ہوتی جا رہی ہے۔“

لکھی بائی پان لگا رہی تھی۔ مسکرا کر بولی ”یہ سب بھگوان کی کرپا ہے۔“

نجمی نے ہاتھ جوڑ کر بدمعاش مرہٹہ انسپکٹر منجریکر کو نمسکار کیا اور لکھی بائی کے پاس تخت پر بیٹھ گئی۔ لکھی بائی نے طشتری میں پان اور چھالیہ لگا کر نجمی کو دی۔ نجمی نے انسپکٹر منجریکر کو بڑے طوائفانہ سلیقے سے پان پیش کیا۔ انسپکٹر منجریکر نے پان اٹھاتے ہوئے نجمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور کہا۔

”تم صبح دریا پر اشنان کرنے بھی جاتی ہو چندا۔“ نجمی اب وہ نجمی نہیں رہی تھی کہ پولیس انسپکٹر سے ایسی بات سن کر گھبرا جاتی یا اس کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا۔ جرائم پیشہ لوگوں، اسمگلروں اور قاتلوں کے ماحول میں رہتے ہوئے اسے ایک عرصہ بیت گیا تھا۔ وہ پولیس کے تمام ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف ہو چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس دل کا راز کیسے اگلواتی ہے۔ نجمی نے انٹیلی جنس کے ہندو حوالدار کو قتل کیا تھا اور اسے اس پر کوئی ندامت، گھبراہٹ اور پریشانی نہیں تھی وہ اگر زندہ ہو کر

اس کے سامنے آ جاتا تو وہ ایک بار پھر اس کا خون کر سکتی تھی۔ نجمی نے انسپکٹر منجریکر کی طرف گھور کر دیکھا اسے تو ابھی اس مرہٹہ انسپکٹر سے بھی بدلہ لینا تھا۔ اس کا بھی خون کرنا تھا۔ نجمی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”کیوں؟ کیا میں صبح دریا پر اشنان کرنے نہیں جا سکتی؟“ انسپکٹر منجریکر چھالیہ منہ میں ڈالتے ہوئے مسکرایا۔

”کیوں نہیں چندا بائی۔ تم جہاں چاہو جا سکتی ہو۔“ لکھی بائی نے چندا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
”کیا تم صبح دریا پر اشنان کرنے گئی تھیں چندا؟“
”ہاں ماسی۔“ نجمی نے اپنے لیے پان لگاتے ہوئے کہا۔ ”صبح دریا پر نہانے کو بہت جی چاہ رہا تھا۔“

انسپکٹر منجریکر کو پتہ چل چکا تھا کہ چندا یعنی نجمی دریا پر صبح صبح نہانے گئی تھی مگر دن چڑھے واپس لوٹی تھی۔ مگر اس نے یہ بات وہاں نہ دہرائی۔ چندا سے اس وقت کچھ پوچھنا مناسب خیال نہ کیا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر وہاں سے اٹھ آیا۔ انسپکٹر منجریکر کے جانے کے بعد لکھی بائی نے نجمی کو ہلکی سی ڈانٹ کے ساتھ کہا ”مت جایا کرو دریا پر صبح صبح۔ ایسی کونسی بات تھی۔ بہاری سے کہہ دیتیں وہ تمہیں جمنا کے پانی کی گاگر بھر کر یہاں لا دیتا۔ تمہیں معلوم نہیں پولیس والوں نے ہمارے پیچھے سی آئی ڈی والے چھوڑ رکھے ہیں بھگوان ہی ان کو سمجھے۔ میں تو بڑی کٹھنائی میں پھنس گئی ہوں۔“

نجمی نے دل میں کہا کہ لکھی بائی ابھی تم پر کٹھنائی آئی ہی نہیں۔ ابھی سے کیوں گھبرا رہی ہو۔ نوکر بہاری نے آ کر بتایا کہ سیٹھ کی گاڑی باہر آ گئی ہے۔ لکھی بائی نے چندا کو مجرے والے کمرے میں چل کر بیٹھنے کو کہا اور خود کلکتے کے مشہور جوہری کے سواگت کے لیے باہر کی طرف بڑھی۔

انٹیلی جنس کے حوالدار کا ٹیکسی سمیت گم ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ کلکتے کی ساری پولیس حرکت میں آ گئی تھی۔ مضافات کے سارے ویران علاقوں کو چھانا پھٹکا جا رہا تھا۔ امجدیہ ہوٹل والا سیٹھ جبار بھی ندیم کو شہر کے ایک مضافاتی ویران علاقے میں چھپانے کے بعد غافل نہیں بیٹھا تھا اس نے اپنے خاص آدمی علاقے میں چھوڑ رکھے تھے۔ جبار سیٹھ نے اپنی اولاد کے جوان ہونے کے بعد اگرچہ منشیات کا دھندا ترک کر دیا تھا لیکن اسکا ان لوگوں سے ابھی تک رابطہ تھا جو پولیس کے مخبر تھے۔ ان مخبروں نے جبار سیٹھ کو خبر دی کہ کلکتہ انٹیلی جنس کا ایک حوالدار ٹیکسی سمیت غائب ہو گیا ہے وہ

ڈیوٹی پر تھا اور پولیس کو شبہ ہے کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے چنانچہ پولیس سفید کپڑوں میں شہر کے اندر اور باہر ویران علاقوں میں اپنے آدمی کو سرگرمی سے تلاش کر رہی ہے۔ جبار سیٹھ چوکس ہو گیا۔ اس نے دلی والے اپنے جگری یار احمد خان کی یاری نبھانے کے لیے ایسے مفرور قیدی ندیم کو اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ جس پر پاکستان کے جاسوس ہونے کا سنگین الزام تھا اگر ندیم کو پولیس مضافاتی جنگل والے کوارٹر سے برآمد کر لیتی ہے تو جبار سیٹھ اس کے نتائج کی سنگینی سے اچھی طرح باخبر تھا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ پولیس اس نتیجے پر نہ پہنچے کہ "پاکستانی جاسوس" اور مفرور قیدی کو وہاں سیٹھ جبار نے چھپایا تھا۔ جبار سیٹھ نے اسی وقت ندیم کو کسی دوسری جگہ پہنچانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ اسی دن کی بات ہے جس دن صبح صبح نجمی ندیم سے جنگل میں مل کر آئی تھی دھوپ ڈھل چکی تھی۔ کلکتے کے بازاروں میں دفتروں سے واپسی کے باعث ٹریفک زوروں پر تھی۔ سیٹھ جبار نے اپنے اسی راز دار ڈرائیور کو بلایا جو ندیم کو جنگل والے کوارٹر میں چھوڑ کر آیا تھا اسے کچھ باتیں سمجھائیں اور جنگل کی طرف روانہ کر دیا۔ ڈرائیور ادھیڑ عمر مگر گٹھے ہوئے جسم کا بہاری مسلمان تھا اور ایک عرصے سے سیٹھ جبار کی خدمت کر رہا تھا۔ وہ جیپ لے کر فوراً جنگل کی طرف چل پڑا۔

جنگل کے درختوں میں شام ہو رہی تھی سائے اندھیروں میں ڈھلنے لگے تھے۔ درختوں پر پرندوں کا شور گونج رہا تھا۔ ندیم تھرمس میں سے گلاس میں چائے انڈیل کر کوارٹر کے اندر نیم وا کھڑکی کے پاس بیٹھا رات کے بڑھتے ہوئے اندھیروں میں آہستہ آہستہ گم ہوتے درختوں کو دیکھتے ہوئے چائے پی رہا تھا کہ اسے جیپ کی آواز سنائی دی۔ پھر اسے کچے راستے پر جیپ کوارٹر کی طرف آتی نظر آئی وہ حیران ہوا کہ اس وقت سیٹھ جبار کیسے آگیا ہے اسے تو صبح آنا تھا۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ندیم نے چائے کا گلاس ایک طرف رکھ کر کھڑکی بند کر دی اور کمانی دار چاقو کھول کر اپنے ہاتھ میں لے لیا جو جبار سیٹھ اسے اپنی حفاظت کے لیے دے گیا تھا۔ یہ جیپ پولیس کی بھی ہو سکتی تھی۔ ندیم دروازے کا پٹ ذرا سا کھول کر باہر دیکھ رہا تھا۔ جیپ ناریل کے درختوں میں آ کر رک گئی۔ اس کی ہیڈ لائٹس بجھی ہوئی تھیں۔ یہ سیٹھ جبار ہی کی جیپ تھی جب اس میں سے سیٹھ جبار کا ملازم ڈرائیور نکلا تو ندیم نے چاقو بند کر کے اپنی جیب میں ڈال لیا ڈرائیور

لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیدھا کوارٹر کے دروازے پر آگیا۔ ندیم نے دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیور نے اندر آ کر دروازہ بند کیا اور بولا "بابو... سیٹھ نے بولا ہے تمھیں یہاں سے ابھی ایک دوسری جگہ جانا ہوگا۔"

ندیم حوالدار کے قتل سے باخبر تھا۔ اس کی لاش کو ٹیکسی سمیت خود اس نے نذرِ آتش کیا تھا۔ ڈرائیور نے اسے جلدی جلدی صرف اتنا بتایا کہ اس علاقے میں پولیس کے چھاپے کا خطرہ ہے سیٹھ نے مجھے تمھیں یہاں سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے بھیجا ہے۔ ندیم فوراً تیار ہو گیا۔ ویسے بھی خفیہ پولیس والے کے قتل کے بعد یہ جگہ اب محفوظ نہیں رہی تھی۔ ڈرائیور نے جلدی جلدی کھانے کے برتن کپڑے میں باندھے تھرمس گلاس اور دوسری چیزیں اٹھا کر جیپ میں رکھیں۔ چارپائی پر بچھا ہوا بستر بھی اٹھا لیا۔ فرش پر گرے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے بھی صاف کر دیئے۔ کوارٹر کے دروازے کو تالا لگایا اور ندیم کو جیپ میں بٹھا کر واپس روانہ ہو گیا۔ سمجھدار ڈرائیور نے ندیم کو بند جیپ کے اندر بٹھایا تھا۔ جیپ جنگل سے نکل کر ایک کشادہ سڑک پر آ کر مغرب کی طرف دوڑنے لگی۔ ندیم نے کینوس کا پردہ ذرا سا ہٹا کر باہر دیکھا دور کلکتہ شہر کی روشنیوں کے جھرمٹ نظر آرہے تھے جیپ شہر کی طرف جا رہی تھی۔

جیپ مختلف سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی اب شہر میں داخل ہو گئی تھی رات ہو چکی تھی کلکتہ شہر روشنیوں میں جگمگا رہا تھا۔ ندیم جیپ کے اندر سیٹ پر خاموش بیٹھا اپنے ماضی اور مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا کبھی کبھی اسے گمان ہونے لگتا کہ اب وہ کبھی نجمی کو ساتھ لے کر واپس لاہور نہیں جا سکے گا۔ جیپ ایک بار پھر شہر کے گنجان علاقے سے نکل کر نسبتاً غیر آباد علاقے میں داخل ہو گئی۔ ندیم نے کینوس کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ ایک میدان بائیں جانب تھا جس کے کنارے کنارے کھمبوں پر ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ جیپ ایک ڈھلان اتر کر دائیں جانب گھوم گئی یہاں اونچی ڈھلانی چھتوں والے مال گودام سے بنے ہوئے تھے ایک گاڑی تیزی سے پیچھے کی طرف گزر گئی۔ یہاں فضا میں دریائی سرکنڈوں کی مرطوب بو رچی ہوئی تھی۔ یقیناً یہ دریا کے ساحل کا علاقہ تھا۔ اور دریائے ہگلی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ جیپ ان گوداموں کے درمیان ایک تنگ سی گلی میں داخل ہو کر ایک طرف دیوار کے ساتھ رک گئی۔ ڈرائیور جلدی سے نیچے اترا۔ اس نے ندیم کو ساتھ

لیا اور ایک مال گودام کے بڑے دروازے کے پہلو میں چھوٹے دروازے کا تالا کھول کر ندیم کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ یہ علاقہ نیم اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور بالکل سنسان تھا کونے میں ایک مال گودام کی دیوار کے اوپر ایک کمزور روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ ڈرائیور نے اندر آکر جیب سے موم بتی نکال کر جلائی اور اسے ایک خالی کھوکھے کے اوپر لگا دیا۔ ندیم نے دیکھا کہ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے کونے میں خالی کھوکھوں کا ڈھیر لگا پڑا تھا۔ دیوار کے ساتھ بانس کی ایک خالی چارپائی پڑی تھی جس پر دری لپیٹ کر ایک طرف رکھ دی گئی تھی۔ ندیم چارپائی پر بیٹھ گیا ڈرائیور نے ایک چھوٹا سا دروازہ کھول کر کہا۔

"یہ سنڈاس (ٹائلٹ) ہے۔"

اور دروازہ بند کر دیا۔ ڈرائیور نے موم بتیوں کا پیکٹ اور ماچس ندیم کے سامنے کھوکھے پر رکھ دی اور بولا "رات کے وقت سیٹھ خود آکر تمھیں سب کچھ سمجھا دیں گے۔ تم اندر کسی قسم کی آواز پیدا نہ کرنا۔ میں باہر سے تالا لگا کر جا رہا ہوں۔ فکر نہ کرو موم بتی کی روشنی باہر نہیں جائے گی۔ ویسے تم موم بتی کو سنڈاس میں جلا کر اس کا دروازہ تھوڑا سا کھول دو تو زیادہ اچھا ہوگا۔"

اتنا کہہ کر ڈرائیور تیزی سے باہر نکل گیا۔ دروازہ بند کر دیا گیا پھر ندیم کو باہر تالا لگانے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد جیپ اسٹارٹ ہوئی اور اس کی آواز کچھ دور جا کر ختم ہو گئی۔ ندیم کو محسوس ہونے لگا کہ اب شاید اس کی ساری زندگی مفرور حالت میں ہی گزرے گی اور وہ کبھی آزاد فضا میں اپنی مرضی کے مطابق نہ رہ سکے گا۔ ڈرائیور کے جانے کے بعد ندیم نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے موم بتی کھوکھے پر سے اٹھا کر باتھ روم کا ذرا سا دروازہ کھولا اور اس کے اندر پڑی اینٹ پر لگا دی۔ اب موم بتی کی روشنی براہ راست کمرے میں نہیں پڑ رہی تھی۔ یہ کمرہ نہیں بلکہ ایک ڈبہ سا بنا ہوا تھا جس میں صرف ایک ہی ہوادان تھا جو چھت کے قریب دیوار میں بنا تھا۔ حبس کے مارے ندیم کو پسینے آنے لگے مگر وہ اندر بیٹھے رہنے پر مجبور تھا۔ خدا جانے رات کتنی گزر گئی تھی کہ کسی کے قدموں کی چاپ گودام کے دروازے کی طرف بڑھی۔ ندیم چارپائی پر بیٹھا اخبار کے ایک پرانے صفحے سے اپنے آپ کو پنکھا جھل رہا تھا۔ اس کا ہاتھ رک گیا۔ باہر سے کسی نے تالا کھولا۔ ندیم اٹھ کر باتھ روم کی طرف ہو گیا۔ دروازہ آہستہ سے کھلا۔ یہ جبار سیٹھ تھا۔

اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا تھیلا تھا۔ اندر آتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا۔ تھیلا چارپائی کے پاس رکھا اور بولا "تمھیں یہاں تکلیف ضرور ہو گی مگر میں اس کا بھی انتظام کر دوں گا۔ کل تمھیں ایک چھوٹا ٹیبل فین بھی پہنچا دوں گا۔ یہاں بجلی ہے مگر بلب ٹوٹا ہوا ہے۔ بلب تمھیں جلانا بھی نہیں چاہیئے۔ لو کھانا کھا لو۔ میں چائے بھی لایا ہوں۔"

جبار سیٹھ نے کھانا نکال کر ندیم کے آگے رکھا اور اسے بتایا کہ خدا جانے پولیس والوں کا ایک خفیہ حوالدار کہاں غائب ہو گیا ہے کہ پولیس اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔ "میں نے تمھیں اسی لیے یہاں پہنچا دیا ہے۔ پولیس اس جنگل میں بھی پہنچ گئی تھی۔ سنا ہے کہ وہاں کسی جگہ انھیں ٹیکسی کا جلا ہوا ڈھانچہ ملا ہے جس میں کسی انسان کی ہڈیاں بھی پائی گئی ہیں۔ اس بارے میں تمھیں تو کچھ معلوم نہیں؟"

ندیم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "مجھے کچھ معلوم نہیں سیٹھ صاحب میں تو اس روز سے کوارٹر میں بند تھا۔ کسی نے دشمنی میں آکر اس آدمی کو ٹیکسی میں قتل کر کے آگ لگا دی ہو۔"

جبار سیٹھ کہنے لگا "بدبخت کو اسی جگہ قتل کرنا تھا۔ وہ سارا علاقہ پولیس کی تفتیش میں آگیا ہے خیر یہ جگہ بہت محفوظ ہے پنکھے کا انتظام بھی ہو جائے گا۔"

ندیم نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ بھوک سے اس کا برا حال ہونے لگا تھا۔ چائے گلاس میں ڈال کر اس نے سگریٹ سلگایا اب اسے یاد آگیا کہ نجمی نے جاتے ہوئے اسے کہا تھا کہ وہ اگلی رات کو اس سے ملنے آئے گی یہ انتہائی خطرناک بات تھی! ندیم کسی طرح سیٹھ جبار کے واسطے سے نجمی تک یہ پیغام پہنچانا چاہتا تھا کہ وہ اس سے ملنے کے لیے جنگل کا رخ نہ کرے وہ سیٹھ کو یہ بھی نہیں بتانا چاہتا تھا کہ نجمی اس سے ملنے آئی تھی اور رات کو دوبارہ آنے کا وعدہ کر گئی ہے۔ کافی دیر سوچ بچار کرنے کے بعد ندیم نے باتوں ہی باتوں میں جبار سیٹھ سے کہا۔

"سیٹھ جی! چندا کس حال میں ہے؟ کیا آپ اس دوران اس سے ملے تھے؟"

جبار سیٹھ کہ یوں لے سگریٹ کا کش لگا کر بولا "چندا تو سونا گاچی میں رہتی ہے اور میں نے وہاں جانا اب چھوڑ دیا ہے۔ تمھاری خیریت کی اطلاع اسے پہنچا دی گئی تھی۔ کوئی اور پیغام دینا ہو تو وہ بھی بتا دو۔"

ندیم نے فوراً کہا "سیٹھ جی مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ میری تلاش میں گھر سے نکل نہ پڑے بس اسے منع کروا دیجئے گا سرحد پر حالات معمول پر آئے تو میں خود ہی اسے اطلاع کروا دوں گا" جبار سیٹھ نے چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے کہا "برخوردار تمھیں اپنی چندا کے بارے میں کچھ زیادہ ہی غلط فہمی ہے وہ ٹھیک ہے وہ کبھی تمھاری معشوقہ رہی ہو گی مگر اب تو وہ سونا گاچی کی سب سے خوبصورت اور دولتمند طوائف ہے میرا نہیں خیال کہ وہ اتنی دولت، شہرت اور گہما گہمی کی زندگی چھوڑ کر تمھارے ساتھ یہاں سے بھاگنے پر تیار ہو جائے گی۔ ویسے میں تمھارا پیغام اُس کو پہنچا دوں گا۔"

ندیم نے سیٹھ کی بات کا کوئی جواب نہ دیا وہ اسے کیسے بتاتا کہ نجمی یعنی چندا ان خطرناک حالات میں بھی جان کی بازی لگا کر اس سے ملنے جنگل والے کوارٹر میں آ گئی تھی اور صرف اپنے محبوب کی جان بچانے کے لیے اس نے سی آئی ڈی والے ہندو حوالدار کا خون بھی کر دیا تھا۔ ندیم نے سیٹھ جبار سے صرف اتنی گزارش ضرور کی کہ وہ اسے وقت دیکھنے والا کوئی چھوٹا ٹائم پیس ضرور لا دے تاکہ اسے پتہ چل سکے کہ رات یا دن کا کیا بجا ہے۔ جبار سیٹھ نے کہا "کل میں خود دن کے وقت آؤں گا اب میں جاتا ہوں۔ آج کی رات جس طرح بھی ہو سکے گزار لو۔"

جبار سیٹھ باہر تالا لگا کر چلا گیا۔ باتھ روم میں ایک ٹوٹا ہوا شیشہ دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ ایک پرانی قینچی بھی وہاں پڑی تھی۔ ندیم نے موم بتی کی روشنی میں اپنا چہرہ دیکھا اس کی داڑھی مونچھ اور سر کے بال کافی بڑھ گئے تھے۔ یہ بڑی اچھی بات تھی۔ وہ اتنی آسانی سے پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ ندیم نے قینچی سے اپنی مونچھوں کو ہونٹوں کے اوپر سے تراش ڈالا۔ پھر چارپائی پر آ کر لیٹ گیا۔ اب مچھروں نے یلغار کر دی۔ اس نے ایک پتلی سی چادر اوپر کر لی مگر اس میں گرمی لگنے لگی۔ بڑی مشکل سے پہلو بدلتے مچھروں سے جنگ کرتے کبھی جاگتے کبھی سوتے اس نے رات گزار دی چھت والے چھوٹے سے روشندان میں سے دن کی گلابی روشنی اندر آنے لگی۔ اس کے اندازے کے مطابق کوئی دو اڑھائی گھنٹے کے بعد اسے ایک بار پھر باہر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ تالا کھلا اور جبار سیٹھ کی جگہ اس کا ڈرائیور کھانا اور چائے لے کر اندر داخل ہوا۔ ایک چھوٹا ٹیبل فین بھی اس نے اٹھا رکھا تھا۔ دروازہ فوراً بند کر کے اس نے ٹیبل فین اینٹوں کے اوپر رکھ کر دیوار میں اس کا

پلگ لگا دیا۔ ٹیبل فین چلنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا ندیم کو لگی تو اسے جیسے ہوش آ گیا۔ ڈرائیور نے تھیلے میں سے کالے رنگ کا چھوٹا سا ٹائم پیس بھی نکال کر ندیم کو دیا۔ اس وقت دن کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ ڈرائیور نے کہا "سیٹھ جی نے کہلا بھیجا ہے کہ فکر کی کوئی بات نہیں وہ کل آئیں گے۔ میں جاتا ہوں۔"

ڈرائیور نے تازہ کھانے کا لفافہ وہاں رکھ دیا اور رات والے خالی برتن تھیلے میں ڈال کر جس طرح آیا تھا اسی طرح چلا گیا اور جاتے ہوئے باہر پھر تالا لگا گیا۔ ندیم ایک طرح سے قید تنہائی میں پڑ گیا تھا۔ مگر وہ باہر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ اب تو مقتول حوالدار کی جلی ہوئی لاش کا ڈھانچہ بھی پولیس کو مل چکا تھا۔ پولیس پہلے سے زیادہ چوکس ہو گئی ہو گی۔ کھانے میں نان مچھلی اور ساگ کا سالن تھا۔ یہ امجدیہ ہوٹل کا ہی کھانا لگتا تھا۔ چائے کا تھرمس بھی ساتھ تھا۔ ندیم نے کھانا کھا کر چائے پی اور سگریٹ سلگا کر چارپائی پر نیم دراز ہو گیا۔ ٹیبل فین کی ٹھنڈی ہوا اس کے سارے جسم پر پڑ رہی تھی جس سے اسے بے حد فرحت مل رہی تھی۔ وہ دل میں خدا سے دعائیں مانگنے لگا کہ سرحد پر سیکورٹی کم ہو اور نجمی اس کے ساتھ سرحد پار کرنے پر راضی ہو جائے۔

یہ اسی دن کی رات کا ذکر ہے۔ ندیم کلکتہ شہر کے باہر والے ویران علاقے کے ایک گودام کے تنگ و تاریک کمرے میں چارپائی پر لیٹا نجمی کے تصور میں گم تھا۔ دوسری طرف اس کی کالج کے زمانے کی محبوبہ نجمی اور کلکتہ کی چندا بائی رقاصہ سونا گاچی والے اپنے چوبارے میں شہر کے کروڑپتی اوباش ہندو ٹھیکیدار بھٹا چاریہ جی کے سامنے محوِ رقص تھی۔ شراب اڑ رہی تھی۔ موٹا ہندو بنگالی سیٹھ چندا پر سو سو کے نوٹ نچھاور کر رہا تھا جنہیں چندا نازوادا سے اٹھا اٹھا کر نکی بائی کے حوالے کیے جا رہی تھی۔ ہارمونیم بج رہا تھا۔ طبلے پر تال پڑ رہی تھی۔ چندا رقص کر رہی تھی۔

کمرہ بجلی کی روشنی میں جگ مگ کر رہا تھا۔ سارنگی بجانے والا جھوم جھوم کر سارنگی بجا رہا تھا۔ آج کئی دنوں کے بعد ٹھیکیدار سیٹھ گانا سننے آیا تھا۔ اسے ٹھیکیدار سیٹھ سے انعام پانے کی امید تھی۔ چندا خود جام بنا کر موٹے بنگالی سیٹھ کو پیش کرتی۔ سیٹھ کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کا باڈی گارڈ بھی نشے میں جھوم رہا تھا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سونا گاچی کے بازار میں اب شام جیسی رونق نہیں رہی تھی۔ صرف بند کوٹھوں کے اندر ہی مجرہ ہو رہا تھا۔ جہاں شریف نمائش بین اور وہ

لوگ جنھوں نے بعض طوائفوں کو رکھیل بنا کر رکھا ہوتا ہے اور ہر ماہ بھاری رقم خرچ کے لیے دیتے ہیں صرف وہی آدھی رات کے بعد سوناگاچی میں آتے ہیں۔ سیٹھ بھٹاچاریہ بھی چندا کو ہر ماہ پانچ ہزار روپے خرچ کے طور پر دیتا تھا۔ آج وہ اس کا مجرہ سننے آیا تھا تو کوٹھے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا تھا۔ اب دوسرا کوئی تماش بین وہاں نہیں آ سکتا تھا۔ لکھی بائی کی دوسری زرخرید طوائف اور نجمی یعنی چندا بائی رقاصہ کی سہیلی کرشنا کا اوپر والی منزل میں مجرہ ہو رہا تھا۔ وہاں لکھی بائی کا باڈی گارڈ دھومل بدمعاش نگرانی پر مامور تھا۔ نجمی ایک گھٹیا سی پرانی اردو کی کوئی غزل گاتے ہوئے مجرہ کر رہی تھی۔ سیٹھ جھوم جھوم کر سو سو کے نوٹ نچھاور کیے جا رہا تھا کہ بازار میں لکھی بائی کے کوٹھے کے نیچے دو جیپیں آ کر رکیں۔ اوپر طبلے اور گھنگروؤں کے شور میں ان جیپوں کے رکنے کی آواز سنائی نہ دی۔ لکھی بائی خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ سیٹھ پانچ ہزار تو ہر مہینے بھجوا ہی دیتا تھا۔ مگر آج رات وہ دھڑا دھڑ دولت لٹا رہا تھا اور لکھی بائی دونوں ہاتھوں سے سمیٹے جا رہی تھی۔ چندا نرت کرتے ہوئے بدشکل ادھیڑ عمر بنگالی سیٹھ کے قریب آئی تو اس نے اسے کلائی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ چندا نے ایک کافرانہ ادا سے کلائی کھینچی تو موتیے کے پھولوں کا گجرا ٹوٹ کر سیٹھ کے ہاتھ میں رہ گیا۔ سیٹھ نے ہائے مار ڈالا ظالم کا نعرہ لگایا اور نوٹوں کی گڈی کھول کر چندا پر نچھاور کر دی۔ نوٹ چاندنی پر بارش کی طرح گرنے لگے۔ عین اس وقت سیڑھیوں میں بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ طبلے گھنگروؤں اور ہارمونیم کے شور میں بھی گرگ باراں دیدہ لکھی بائی نے یہ آواز سن لی۔ فوراً سمجھ گئی کہ یہ کسی تماش بین کے قدموں کی آواز نہیں ہے۔ اس آواز میں بے باکی تھی۔ لکھی بائی کو پولیس کا خیال آ گیا مگر وہ تو پولیس کو ہر روز ان کا کمیشن باقاعدگی سے پہنچا دیتی ہے۔ پھر یہ کون ہو سکتا ہے؟

دروازے پر باہر سے کسی نے زور سے ہاتھ مارا۔ ساتھ ہی بھاری آواز میں کسی نے تحکمانہ انداز میں کہا "دروازہ کھولو لکھی بائی۔"

نجمی نے رقص کرتے کرتے لکھی بائی کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ یہ کون بدتمیز ہے اسے جا کر سنبھالو باہر ہی سے رخصت کر دو۔ موٹے سیٹھ نے یہ آواز سنی تو چڑھی ہوئی آنکھوں سے بند دروازے کی طرف دیکھ کر غرایا "لکھی بائی یہ کون حرامی اس وقت آیا ہے؟"

باہر سے کسی نے لات مار کر دروازے کی کنڈی اکھاڑ ڈالی۔ دروازہ دھڑاک سے کھل گیا اور

لکھی بائی کا رنگ فق ہو گیا۔ دروازے میں چہرے پر ڈھاٹا باندھے ہاتھوں میں اسٹین گن لیے مان سنگھ ڈکیٹ کھڑا تھا۔ لکھی بائی آسام کی سرحد پر قتل و غارت کرنے والے اس خونی ڈاکو کو جانتی تھی۔ نجمی رقص کرتے کرتے رک گئی اور اپنا لباس درست کرتے ہوئے لکھی بائی کے قریب آ گئی۔ موٹے بنگالی ہندو سیٹھ نے ایک عجیب و غریب بھیانک چہرے اور موٹی مونچھوں اور خونخوار آنکھوں والے آدمی کو سامنے دیکھا تو اس کی گھگھی بندھ گئی۔ اس کے باڈی گارڈ کا بھی رنگ اڑ گیا۔ مان سنگھ نے اسٹین گن کا رخ موٹے سیٹھ کی طرف کر دیا اور کڑک کر بولا "کتے کے بچے تو نے مان سنگھ کو حرامی کہا؟"

اس کے ساتھ ہی اسٹین گن کی نالی میں سے شرارے کوندے تڑاتڑاتی آوازوں کے ساتھ چھ سات گولیاں موٹے بنگالی سیٹھ کے پیٹ میں گھس گئیں اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ خون کے فوارے چلنے لگے۔ لکھی بائی نے چیخ ماری۔ مان سنگھ کے پیچھے اس کا ساتھی داسو بھی تھا۔ اب اس نے برین گن کا ایک برسٹ مارا اور لکھی بائی، سیٹھ کے باڈی گارڈ اور ہارمونیم والے ماسٹر کو بھون کر رکھ دیا۔ سارنگی والا یہ خونیں منظر دیکھ کر وہیں بے ہوش ہو گیا۔

نجمی اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف دوڑی تو مان سنگھ نے آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیا اور داسو کی طرف دھکیل کر بولا "ارے داسو! اس چم چم کو نیچے لے جا رے۔"

داسو نے نجمی کو بالوں سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا سیڑھیوں میں لے گیا۔ مان سنگھ ڈکیٹ اب اوپر جانے والے زینے کی طرف گیا۔ اوپر والے کوٹھے میں مجرا بند ہو گیا تھا۔ نیچے گولیاں چلنے کی آواز سن کر تماش بین چھت پر بھاگ گئے تھے اور رقاصہ کرشنا غسل خانے میں چھپ گئی تھی۔ مان سنگھ نے اسٹین گن کا رخ اوپر والے دروازے کی طرف اٹھا کر ایک برسٹ مارا اور لکھی بائی، سیٹھ بھٹاچاریہ اس کے باڈی گارڈ اور ہارمونیم بجانے والے کی خون میں نہائی ہوئی لاشوں کو دیکھتا ہوا سیڑھیاں اتر کر بازار میں آ گیا۔ بازار پہلے ہی سنسان تھا گولیوں کی آواز سے جو دو چار پولیس والے تھے وہ بھی جان بچاتے کی فکر میں رفو چکر ہو گئے تھے۔ مان سنگھ ڈکیٹ کے دوسرے ڈاکو ساتھی دونوں جیپوں کے باہر برین گنیں اٹھائے پوزیشنیں لیے کھڑے تھے۔ مان سنگھ کا خاص ساتھی داسو نجمی کو جیپ میں لیے بیٹھا تھا اس نے نجمی کے منہ پر کپڑا ٹھونس کر اس کے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے تھے۔ اپنے سردار

مان سنگھ کو آتے دیکھ کر ڈاکو جیپوں میں سوار ہو گئے۔ مان سنگھ بھی جیپ میں بیٹھا اور دونوں گاڑیاں ایک زناٹے سے بازار سے نکل گئیں۔

یہ سب کچھ اتنا جلدی ہو گیا تھا کہ نجمی ابھی تک اپنے حواس کو مجتمع نہیں کر سکی تھی۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ بھاری مونچھوں اور خونخوار آنکھوں والا قوی ہیکل آدمی کون ہے جو اسے اغوا کر کے لیے جا رہا ہے اور جس نے آناً فاناً لکھی بائی اور تین دوسرے انسانوں کا خون کر ڈالا ہے۔ لکھی بائی مان سنگھ ڈکیٹ کو جانتی تھی لیکن نجمی نے مان سنگھ کو وہاں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لکھی بائی کی موت کا نجمی کو افسوس ہوا تھا اس لیے کہ وہ اس بدکار اور معصوم لڑکیوں کی عزت کے سودے کرنے والی مکروہ عورت کو خود ہلاک کرنا چاہتی تھی۔ سب سے بڑی پریشانی اسے یہ تھی کہ یہ ڈاکو لوگ اسے اغوا کر کے کہاں لے جا رہے ہیں؟ یقیناً اس کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا جائے گا۔ نجمی کو ندیم کا خیال آ گیا۔ خدا جانے اسے اس کے اغوا کی خبر بھی ملے گی یا نہیں معلوم نہیں اب ندیم سے کب ملاقات ہو۔ نجمی کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا، ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور داسو ڈاکو نے اسے جیپ کے فرش پر اوندھا ڈال کر اس کی گردن پر اپنا پاؤں رکھا ہوا تھا۔

جیپیں کلکتہ کی جگمگاتی ہوئی مگر ویران کشادہ سڑکوں پر تیزی سے بھاگتی چلی جا رہی تھیں۔ آگے آگے مان سنگھ ڈکیٹ کی جیپ تھی جسے وہ خود چلا رہا تھا یہ رات کے ڈیڑھ یا پونے دو بجے کا وقت ہو گا۔ ڈاکوؤں کی دونوں جیپیں پوری رفتار سے جا رہی تھیں۔ مان سنگھ کو معلوم تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ کئی ایک سڑکوں پر سے گزرنے کے بعد جیپیں دریا پار کر کے ایسے علاقے میں آ گئیں جہاں آبادی کہیں کہیں تھی۔ گنجان شہر پیچھے رہ گیا تھا۔ سڑک پکی نہیں رہی تھی اور یہاں ایک جانب پٹ سن کے کھیتوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کھیتوں کو پیچھے چھوڑ کر مان سنگھ نے جیپ کو ایک ذیلی سڑک پر ڈال دیا۔ یہاں گہرا اندھیرا تھا۔ جیپوں کی بتیاں روشن تھیں۔ یہ ایک کچا راستہ تھا جو آم کے وسیع و عریض باغ میں سے گزرتا تھا۔ آگے بانس کی بنی ہوئی دس بارہ جھگیاں روشنی میں ایک بار دکھائی دے کر غائب ہو گئیں۔ ان غیر آباد ویران علاقوں میں رات کے اندھیرے میں کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کے سفر کے بعد ڈاکوؤں کی جیپیں ایک گھنے جنگل میں داخل ہو گئیں گاڑیوں کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ کیونکہ یہاں اونچی اونچی گھنی خودرو جنگلی جھاڑیوں اور سرکنڈوں کی بھرمار تھی

مگر جیپیں ان جھاڑیوں، سرکنڈوں اور چھوٹے چھوٹے ندی نالوں میں سے گزرتی جنگل میں آگے ہی آگے چلی جا رہی تھیں۔ اس جنگل میں جیپوں کا سفر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہا۔ جنگل ذرا کم گھنا ہوا تو چھوٹے بڑے اونچے نیچے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک جگہ تالاب کے کنارے کسی قدیم مندر کا کھنڈر تھا۔ جیپیں اس کھنڈر کے پاس آ کر رک گئیں۔ مان سنگھ جیپ سے نیچے اتر کر بولا "ارے راموا اور بھیکو۔ گاڑیوں کو پیچھے لے جاؤ۔" نجمی کا بند منہ دکھنے لگا تھا۔ جیپ کے فرش پر اوندھے پڑے پڑے اس کا بدن لکڑی کی طرح ہو گیا تھا۔ اسے مان سنگھ نے بازو سے پکڑ کر جیپ سے نکالا اور منہ میں سے کپڑا کھینچ کر بولا "اری چندا رانی! تیری بڑی تعریف سنی تھی۔ اب میرا گھر بسائے گی ری۔" نجمی نے کوئی جواب نہ دیا اس کا حلق بے حد خشک ہو رہا تھا۔ ڈاکو اب اسے لے کر اونچی نیچی ٹیکریوں اور ٹیلوں کی طرف پیدل چل پڑے۔ وہ کئی گھاٹیوں اور پہاڑیوں کے دروں میں سے گزر کر آخر کار ایک اونچے ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگے۔ یہ ٹیلا آس پاس کے تمام ٹیلوں سے بلند تھا اور اس کی چوٹی پر سے باقی تمام ٹیلوں اور گھاٹیوں وادیوں کا بخوبی جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ ٹیلے کی چوٹی پر زمین ہموار تھی۔ یہاں چھ سات ڈاکو پہلے ہی سے رائفلیں اور برین گنیں لیے اپنے سردار کا انتظار کر رہے تھے۔ نجمی کے تمام زیور مان سنگھ ڈکیٹ نے اتار لیے اور اسے ایک غار میں دھکیل کر غار کے منہ پر لگا ہوا بانس کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ باہر ایک ڈاکو رائفل گود میں لے کر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور بیڑی پینے لگا۔ نجمی کو غار میں دھکیلنے سے پہلے اس کے ہاتھ کھول دیئے گئے تھے۔ اپنے ہاتھوں کو سہلاتے ہوئے وہ غار کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور اپنا سر گھٹنوں پر رکھ دیا اور سوچنے لگی کہ کیا وہ کبھی یہاں سے آزاد ہو سکے گی؟

... ... ⁂ ... ...

کلکتے کی ہیرا منڈی سونا گاچی میں چار انسانوں کے خون سے دہشت پھیل گئی تھی۔ انسپکٹر منجریکر پولیس کی گاڑی لے کر موقع کے آدھ گھنٹہ بعد پہنچا۔ لکھی بائی کی لاش سمیت چاروں لاشیں ویسے ہی پڑی تھیں۔ عینی شاہد صرف سارنگی نواز بوڑھا ہی تھا جو برین گنوں کے برسٹ سے انسانی جسموں کو چھلنی ہوتے دیکھ کر غش کھا گیا تھا۔ وہ ابھی تک اپنے حواس میں نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے انسپکٹر منجریکر کو بتایا کہ مجرا ہو رہا تھا چندا رقص کر رہی تھی کہ دو ڈاکو ایسی شکلوں والے آدمی دروازہ توڑ کر اندر آ گئے انھوں نے آتے ہی فائرنگ شروع کر دی اور میں بے ہوش ہو گیا سارنگی نواز بوڑھے نے ڈاکوؤں کا حلیہ یہی بتایا کہ انھوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے اور ایک ڈاکو کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ اس نے پہلے گولیاں چلائیں۔"

سارنگی نواز کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ڈاکو چندا کو اغوا کر کے لے گئے تھے اس وقت وہ بے ہوش تھا۔ انسپکٹر منجریکر نے جائے واردات کا معائنہ کیا رپورٹ تیار کی اور لاشوں کو اٹھوا دیا۔ آئی جی پولیس نے انسپکٹر منجریکر سے رپورٹ طلب کی۔ انسپکٹر منجریکر نے آئی جی کو بتایا کہ یہ واردات مان سنگھ ڈکیت کی لگتی ہے۔ کیونکہ ان دنوں وہی مدھیہ پردیش سے بنگال کے سرحدی علاقے میں آ کر قتل اغوا اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں کر رہا ہے۔ انسپکٹر منجریکر نے رپورٹ درج کر کے تفتیش شروع کر دی ڈکیت مان سنگھ کو قتل اور اغوا کے اس کیس میں ملوث کر کے انسپکٹر منجریکر نے اپنی جان بچائی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ مان سنگھ قتل اغوا اور ڈاکہ زنی کی ان گنت وارداتوں میں مدھیہ پردیش اور بنگال کی پولیس کو مطلوب تھا اور آج تک کوئی اسے گرفتار نہیں کر سکا تھا۔ پولیس نے اب اپنا وطیرہ بنا لیا تھا کہ اس ضمن میں درج مقدمے کی تھوڑی دیر تفتیش کرنے کے بعد اسے داخل

دفتر کر دیا جاتا۔ بنگال کے آئی جی سمیت کوئی پولیس والا مان سنگھ ڈکیت کے مقابلے پر آنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ انسپکٹر منجریکر کو البتہ چندا کے اغوا کا ضرور افسوس تھا۔

لکھی بائی کے قتل اور چندا کے اغوا کی خبر دوسرے روز صبح صبح ہی جبار سیٹھ کو مل گئی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ ندیم پر اس خبر کا کیا اثر ہوگا۔ چندا اس کی محبوبہ تھی اور وہ اس کی تلاش میں بھاگ آیا تھا اسی کی خاطر اتنی اذیتیں اور تکلیفیں برداشت کی تھیں۔ جبار سیٹھ نے کھانے کا ٹفن تیار کیا اور جیپ میں بیٹھ کر شہر کے باہر والے اس گودام کی طرف چل پڑا جہاں ندیم تنگ و تاریک کمرے میں ٹیبل فین کے سامنے چارپائی پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس عذاب سے اس کی جان کب چھوٹے گی۔ جبار سیٹھ نے جیپ کچھ فاصلے پر بڑے مال گودام کی عقبی دیوار کے ساتھ کھڑی کی اور پیچھے سے ہو کر پیدل چلتا ہوا ندیم والے گودام کے چھوٹے کمرے والے دروازے پر آ کر رک گیا ایک نظر ڈال کر اپنے دائیں بائیں دیکھا اور پھر تالا کھولا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ ندیم اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھا جبار سیٹھ نے ٹفن کیریئر چارپائی کے پاس رکھ دیا اور گہرا سانس لے کر بولا۔ "پہلے تم ناشتہ وغیرہ کر لو۔"

ندیم نے کہا۔ "سیٹھ جی آج آپ بڑی جلدی آ گئے ہیں خیریت تو ہے نا؟"

جبار سیٹھ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"بالکل خیریت ہے دراصل آج مجھے نو بجے ایک ضروری کام سے جانا تھا۔ اور ہاں آج رات میری کالیہ سے پھر ملاقات ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمھارے بارڈر کراس کروانے کا انتظام ہونے والا ہے۔"

ندیم نے ناشتہ کیا۔ پھر وہ گلاسوں میں چائے ڈال کر پینے لگے۔ اب جبار سیٹھ نے ندیم کو ایک ہی سانس میں بتا دیا کہ رات لکھی بائی کا کسی نے خون کر دیا ہے اور چندا اغوا ہو گئی ہے۔ ندیم بھونچکا سا ہو کر رہ گیا اس نے چائے کا گلاس زمین پر رکھ دیا جبار سیٹھ نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ پولیس جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے وہ چندا کو دو ایک روز میں برآمد کر لے گی۔"

ندیم نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔ "سیٹھ" مگر... مگر وہ لوگ کون تھے؟" جبار سیٹھ نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"پولیس کا تو خیال ہے کہ یہ واردات مان سنگھ ڈکیٹ نے کی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مان سنگھ کو جنگل سے نکل کر سوناگاچی میں آ کر واردات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میرے خیال میں یہ علاقے کے کسی بدمعاش کی واردات ہے جو لکھی بائی سے بدلہ لینا چاہتا ہوگا۔"

ندیم سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پولیس کی تفتیش کے معمول سے وہ کافی حد تک واقف ہو چکا تھا اسے معلوم تھا کہ نجمی کو پولیس اب شاید ہی برآمد کرنے میں کامیاب ہو اور اگر یہ کسی ڈاکو کی واردات ہے تو پولیس اس کیس میں کبھی ہاتھ نہیں ڈالے گی اور ایسی صورت میں نجمی کے واپس آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جبار سیٹھ نے ندیم کے کاندھے کو آہستہ سے تھپتھپایا اور کہا۔

برخوردار فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں سوناگاچی میں اس قسم کی وارداتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ پولیس چندا کو جلد برآمد کرے گی۔ ویسے بھی پولیس چندا کو ہاتھ سے نہیں جانے دے گی کیونکہ پولیس کو یقین ہے کہ چندا کا پاکستانی جاسوسوں کے گروہ سے رابطہ ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ پوری کی پوری بنگال پولیس حرکت میں آگئی ہوگی اور کل یا پرسوں تک چندا ضرور برآمد کر لی جائے گی۔"

ندیم اداس اور پریشان ہو گیا تھا جبار سیٹھ کی تسلیوں کے باوجود اس کی پریشانی اور اداسی میں کمی نہ آئی۔ اس کا سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا تھا وہ تو صرف نجمی کو جہنم سے نکالنے وہاں آیا تھا۔ اس نے اس قدر شدید مصائب صرف اس لیے جھیلے تھے کہ وہ ایک نہ ایک روز نجمی کو وہاں سے نکال کر پاکستان لے جائے گا جہاں پہنچ کر وہ اس سے شادی کر کے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کرے گا لیکن تقدیر نے اس کے ساتھ ایک ایسا مذاق کیا تھا جس کا ندیم کو وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ نجمی کو کوئی اغواء کر کے بھی لے جائے گا۔ یہ حقیقت اس سے چھپی ہوئی نہیں تھی کہ پولیس کسی طوائف کے اغواء کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ طوائف کو معاشرے میں وہ مقام ہی حاصل نہیں ہوتا کہ اس کے اغواء کے خلاف پریس بھی آواز بلند کرے چنانچہ پولیس ضابطے کی کارروائی کرنے کے بعد کیس کو داخل دفتر کر دیتی ہے اور محض دکھاوے کے لیے برائے نام تفتیش جاری رکھتی ہے اور جیسا کہ جبار سیٹھ نے بتایا ہے کہ چندا کو کسی مان سنگھ نامی ڈاکو نے اغواء کیا ہے تو ان حالات میں پولیس کبھی اپنے آپ کو خطرے میں نہیں ڈالے گی۔ ندیم یہ سوچ کر مزید پریشان

ہو گیا وہ نجمی کے بغیر واپس پاکستان جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے ہر حالت میں نجمی کو ساتھ لے کر جانا تھا اس نے جبار سیٹھ سے پوچھا۔

"یہ مان سنگھ ڈاکو کہاں ہوتا ہے؟"

جبار سیٹھ نے طنزیہ ہنسی کے بعد جواب دیا۔

"مان سنگھ کوئی وکیل نہیں کہ مجھے اس کا ایڈریس معلوم ہو۔ وہ ایک خونخوار ڈاکو ہے اس کے نام سے پولیس کے بڑے سے بڑے افسر کا خون خشک ہو جاتا ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ ابھی کسی کو یقین نہیں کہ یہ اغواء اور قتل مان سنگھ ڈکیٹ ہی نے کیے ہیں اور اگر یہ واردات مان سنگھ ہی کی ہے تو کیا تم اس کی تلاش میں جاؤ گے؟ پاگل نہ بنو برخوردار.... آج رات میں کلو لیہ سے ملنے والا ہوں۔ خود اس نے مجھے بلایا ہے میرا خیال ہے کہ تمہارے سرحد پار کرانے کا کوئی بندوبست ہو گیا ہوگا۔ میں تمہیں یہی کہوں گا کہ جس طرح بھی ہو سکے یہاں سے اپنی جان بچا کر نکل جاؤ ہاں یہ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر چندا بعد میں واپس آگئی اور وہ راضی ہوئی تو میں اسے بھی سرحد پار کرا کے مشرقی پاکستان بھجوا دوں گا۔"

ندیم کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ نجمی جب اسے جنگل والے کوارٹر میں ملنے آئی تھی تو اس نے ندیم کو بتایا تھا کہ گناہ کے اس ماحول میں صرف کرشنا ایک ایسی لڑکی ہے جو اس کی رازدار بھی ہے اور اس کی ہمدرد بھی ہے وہ بھی طوائف ہے مگر اس کا دل بہت پاک صاف ہے۔ ندیم کو نجمی نے یہ بھی بتایا تھا کہ کرشنا طوائف سوناگاچی میں لکھی بائی کے کوٹھے پر ہی مجرا کرتی ہے اور اس نے کرشنا کو ندیم کے بارے میں سب کچھ بتایا ہے۔ ندیم نے سوچا کہ اسے کسی طریقے سے سوناگاچی جا کر کرشنا طوائف سے ملاقات کرنی چاہیئے وہ چونکہ علاقے کے تمام جرائم پیشہ لوگوں کو جانتی ہو گی اس لیے شاید اسے بتا سکے کہ چندا کو کس نے اغواء کیا ہے ہو سکتا ہے کہ کرشنا نے اس آدمی کو دیکھ بھی لیا ہو مگر پولیس کے خوف کی وجہ سے اپنی زبان بند رکھی ہو۔ ندیم نے اپنے دل کا حال جبار سیٹھ پر ظاہر نہ کیا تھا بظاہر وہ یہی کہتا رہا اب جو اللہ کو منظور ہوگا وہی ہوگا پھر جبار سیٹھ سے باتوں ہی باتوں میں پوچھا۔

"لکھی بائی کا کوٹھا تو بند ہو گیا ہوگا۔"

جبار سیٹھ نے سر کے بالوں کو کھجاتے ہوئے کہا۔

"ان کا دھندا تو چلتا ہی رہتا ہے اس کے ڈیرے میں دوسری طوائفیں بھی ہیں خاص طور پر کرشنا نام کی طوائف چندا کے بعد سب سے زیادہ مشہور ہے پہلے بھی وہ اوپر والے کوٹھے میں مجرا کرتی تھی۔ لکھی بائی کی موت کے بعد یقیناً بدمعاش دھوبل نے سارا کاروبار اپنے ہاتھ میں لے لیا ہوگا۔ وہ لکھی بائی کا خاص آدمی ہے۔ ایک دو روز کاروبار ضرور بند رہے گا۔ میرا خیال ہے کہ پرسوں یا چوتھ کوٹھے پر کرشنا بائی کا مجرا شروع ہو جائے گا۔"

تھوڑی دیر مزید باتیں کرنے کے بعد جبار سیٹھ اگلے روز آنے کا کہہ کر چلا گیا اس کے جانے کے بعد ندیم بے چین ہو کر چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا کمرے کے دروازے تک گیا پھر واپس آیا دوبارہ چارپائی پر بیٹھ گیا نجمی کے اغوا نے اس کے اندر ایک ایسا طوفان برپا کر دیا تھا جس سے نکلنے کا اسے کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ نجمی کو اغوا کرنے والا کون ہے یہ معلوم ہو جانے کے بعد ہی ندیم نجمی کی تلاش میں نکل سکتا تھا۔ اس سلسلے میں اگر کوئی اس کی مدد کر سکتا تھا تو وہ صرف کرشنا ہی تھی۔ جس وقت لکھی بائی کو قتل کر کے نجمی کو اغوا کیا گیا اس وقت کرشنا بائی کوٹھے پر موجود تھی ویسے بھی چونکہ وہ اس دھندے میں عرصے سے زندگی بسر کر رہی تھی اس لیے اسے ایسے مشتبہ لوگوں کا ضرور معلوم ہوگا جو اس قتل اور اغوا میں ملوث ہو سکتے ہیں۔ اس امر کا یہی امکان تھا کہ کرشنا نے اغوا کرنے والوں کو دیکھا ہو۔ کرشنا سے ملنا ضروری ہو گیا تھا اب ندیم یہ غور کرنے لگا کہ وہ کرشنا سے ملاقات کرنے سوناگاچی کس بھیس، کس حلئیے میں جائے داڑھی اور سر کے بال تو پہلے ہی اس کے بڑھے ہوئے تھے۔ وہ سادھو کے بھیس میں بھی جا سکتا تھا لیکن ایک سادھو کو سوناگاچی ایسے بدنام علاقے میں دیکھ کر لوگوں کی نظریں خواہ مخواہ اس کی طرف اٹھ سکتی تھیں۔ نہیں نہیں ندیم نے سوچا اسے ایک عام بنگالی کے لباس میں جانا چاہیئے اسے انسپکٹر منجر بکیر کا ڈر تھا کیونکہ صرف اس کی زیرک نظریں ندیم کو پہلی نظر میں پہچان سکتی تھیں۔ باقی پولیس والے اتنی جلدی اسے داڑھی سر کے بڑھے ہوئے بالوں کے ساتھ شناخت نہیں کر سکتے تھے۔ سوناگاچی میں پولیس اور سی آئی ڈی کے آدمی ضرور پھیلے ہوئے ہوں گے لیکن ندیم کو ان کی اتنی زیادہ فکر نہیں تھی خطرہ اسے صرف

انسپکٹر منجر بکیر سے تھا اور اس کے بارے میں بھی اسے یقین تھا کہ رات کے وقت وہ سوناگاچی کے علاقے میں موجود نہیں ہوگا۔

ندیم کو جبار سیٹھ نے اس کی امانت ایک ہزار روپے واپس دے دی تھی۔ جو ندیم نے اپنے پاس ہی چھپا کر رکھے تھے۔ اس کا لباس ایک پرانی پتلون اور بش شرٹ پر مشتمل تھا جو کافی خستہ حالت میں تھی۔ رات ندیم نے اس ادھیڑ بن میں گزار دی کہ کرشنا سے ملاقات کرنے اسے کب سوناگاچی جانا چاہیئے۔ اور وہ رات کو کیسے جائے گا۔ کیونکہ جبار سیٹھ تو باہر سے تالا لگا کر جاتا ہے۔ اس کا بھی ندیم نے ایک حل سوچ لیا۔ دوسرے روز بھی جبار سیٹھ صبح صبح آ گیا۔ وہ بڑا خوش تھا۔ آتے ہی ٹفن کیرئیر چارپائی کے پاس رکھتے ہوئے بولا۔

"تمہارے لیے خوشخبری لایا ہوں۔ کالیے نے تمہارے بارڈر کراس کرانے کا انتظام کر لیا ہے۔ بس تم تیاری پکڑلو۔ پرسوں آدھی رات کو تمہیں میرے ساتھ یہاں سے نکل چلنا ہوگا۔"

ندیم کے ذہن میں نجمی کی سراغ رسانی کا جو منصوبہ تھا اس کے بارے میں وہ جبار سیٹھ کو کچھ نہیں بتا سکتا تھا لیکن اس نے اتنا ضرور کہا کہ چندا کے بغیر اسے پاکستان واپس جانا عجیب سا لگتا ہے۔ سیٹھ فوراً بولا۔ "بھائی تم پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو تم پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام ہے۔ پولیس نے اخباروں میں تمہاری تصویریں چھاپ رکھی ہیں۔ وہ تمہیں زندہ یا مردہ پکڑنے کے لیے جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے اور تم کو چندا کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ برخوردار یہ موقع تمہیں پھر کبھی نہیں ملے گا۔ جیسے بھی ہو یہاں سے اپنی جان بچا کر مشرقی پاکستان چلے جاؤ۔ چندا برآمد ہو گئی تو میں اسے بھی بارڈر کراس کروا دوں گا۔"

ندیم نے اپنے لباس پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"میرے کپڑے پھٹ گئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ بنگالی لباس میں بارڈر کراس کروں۔ میں آپ کو پیسے دیتا ہوں میرے لیے دھوتی کرتا اور نئی چپل منگوا دیں۔"

سیٹھ جبار ندیم کے رضامند ہو جانے سے بڑا خوش تھا۔ اس کے سر پر سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ جب سے ندیم اس کے پاس آیا تھا سیٹھ کی جان بھی عذاب میں تھی مگر دوست کی دوستی نبھانی بھی ضروری تھی۔ اس نے کہا "میں کل ہی تمہارے لیے بنگالی کپڑے لے آؤں گا تم بالکل فکر نہ کرو۔"

اور ہاں۔ وہ کمانی دار چاقو..... "مجھے واپس کر دو۔" اب تمھیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

ندیم چاقو واپس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نجمی کی تلاش میں نکلنے کے بعد ندیم کو اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اس نے کہا۔

"سیٹھ جی! ابھی تو میں یہیں ہوں۔ چاقو میرے پاس ہی رہنے دیں۔ جاتی دفعہ آپ کو دیتا جاؤں گا۔"

جبار سیٹھ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اب مسئلہ دروازے کو باہر سے تالا لگا کر جانے کا تھا۔ ندیم ناشتہ کرتے ہوئے یہی سوچ رہا تھا۔ سیٹھ جبار ناشتے کے علاوہ معمول کے مطابق دوپہر اور رات کا کھانا بھی ٹفن کیریئر میں بند کر کے لایا تھا۔ اس نے واقعی دلی جیل میں بند فقیرے کی دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔ اس گئے گزرے زمانے میں اس کی دوستی کی مثال قابل تقلید اور ہمیشہ زندہ رہنے والی تھی۔ ندیم نے موقع ملتے ہی کہا۔

"سیٹھ جی! یہ جو باہر سے آپ تالا لگا جاتے ہیں اس سے مجھے بہت زیادہ گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ لگتا ہے میں سچ مچ کہیں قید کر دیا گیا ہوں۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں آتا۔ بالکل ویران جگہ ہے۔ آپ دروازہ کھلا ہی رکھ جائیں تو کوئی قباحت نہیں ہو گی۔ ویسے بھی کبھی آدھی رات کے بعد باہر ذرا سی چہل قدمی کر لیا کروں گا۔"

جبار سیٹھ نے کچھ دیر غور کیا پھر سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا "دن کے وقت گودام کے اس کمرے کا دروازہ کھلا رکھنا مناسب نہیں۔ ایسا کرتا ہوں کہ ابھی تو میں باہر سے تالا لگا جاتا ہوں۔ رات دس بجے میں ڈرائیور کو بھیجوں گا وہ آ کر تالا کھول دے گا۔ تم باہر نکل کر ٹہل لینا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ تالا لگا کر واپس چلا جائے گا۔" یہ تجویز ندیم کے لیے کسی بھی صورت میں قابلِ قبول نہیں تھی اس نے مسکراتے ہوئے کہا "سیٹھ یہ تو قیدیوں کو ٹہلائی کروانے والی بات ہو گی۔ نہیں نہیں آپ بے شک تالا لگا دیا کریں۔" پھر اسکیم کے مطابق دوسرے لمحے بولا۔

"سیٹھ جی! مجھ پر آپ کے اتنے احسان ہیں کہ میں زندگی بھر ان کا بدلہ نہیں چکا سکتا لیکن اگر آپ ایسا انتظام کر دیں کہ یہ جو دو دن باقی رہ گئے ہیں ان میں ڈرائیور شام کو آ کر تالا کھول جایا کرے اور منہ اندھیرے آ کر دوبارہ لگا جایا کرے تو اس میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا۔

دراصل یہاں پڑے پڑے میری ٹانگیں درد کرنے لگی ہیں کہیں میں بیمار نہ پڑ جاؤں۔"

سیٹھ جبار نے اس تجویز کو منظور کر لیا اور حامی بھری کہ اس کا خاص ڈرائیور آج ہی شام اندھیرا ہونے کے بعد آ کر تالا کھول جائے گا اور رات کے پچھلے پہر واپس آ کر تالا پھر سے لگا دے گا۔ ندیم یہی چاہتا تھا۔ اب اس کے سامنے سونا گاچی میں کرشنا بائی کے کوٹھے تک راستہ کھلا تھا ندیم نے لکھی بائی کے قتل کی باتیں شروع کر دیں اور یہ پوچھا کہ یہ سونا گاچی میں مجرے کا دھندا کب تک جاری رہتا ہے۔ جبار سیٹھ نے ہنس کر کہا "ارے بھائی! سونا گاچی کا کیا پوچھتے ہو۔ وہاں راتیں جاگتی ہیں اور دن سوتے ہیں۔ ساری ساری رات بعض کوٹھوں پر مجرا جاری رہتا ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ تمھارے لیے دھوتی، کرتا، چپل خریدنا ہیں اور ہاں میرا ڈرائیور آج ہی رات تالا کھولنے آئے گا تو تمھارے کپڑے اس کے ہاتھ بھجوا دوں گا۔ تمھارے سائز کا مجھے پتہ ہے۔"

ندیم نے سیٹھ جبار کو ہزار روپے میں سے دو سو روپے دینا چاہے تو سیٹھ نے ندیم کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"جب پاکستان پہنچ جاؤ گے تو اس خوشی میں ان پیسوں کی مٹھائی اپنے دوستوں میں بانٹ دینا۔ تم لوگوں کو ابھی معلوم ہی نہیں ہے کہ ہمیں پاکستان سے کس قدر محبت ہے اور ہم اس کی سلامتی کے لیے کتنی دعائیں مانگتے ہیں۔"

ندیم کا دل وفورِ جذبات سے لبریز ہو گیا۔ جبار سیٹھ چلا گیا۔ ندیم سارا دن سونا گاچی جانے کی اسکیمیں بناتا رہا کہ وہ کس طرف سے جائے گا۔ کہاں سے اسے ٹیکسی پکڑنی ہو گی۔ ٹیکسی والے کو کیا کہے گا۔ سونا گاچی ندیم کے لیے اجنبی تھا۔ وہ ابھی تک کلکتے کے اس علاقے میں نہیں گیا تھا مگر یہ اتنا بدنام اور مشہور علاقہ تھا کہ کوئی بھی ٹیکسی والا اسے نام سنتے ہی وہاں پہنچا سکتا تھا۔ شام ہوئی تو ندیم نے نئی موم بتی روشن کر کے باتھ روم میں پڑی اینٹ پر جما دی اب اسے سیٹھ کے ڈرائیور کا انتظار تھا۔ ندیم نے گھڑی دیکھی۔ شام کے سات بجنے والے تھے۔ دروازے کی جھری میں سے اس نے باہر جھانک کر دیکھا ابھی باہر شام کی مدہم مدہم روشنی باقی تھی ٹھیک آٹھ بجے باہر سے تالا کھلنے کی آواز آئی۔ یہ ڈرائیور ہی تھا وہ اپنے ساتھ ایک پیکٹ بھی لایا

تھا۔ اس میں بادامی رنگ کے کھدر کا دھوتی کرتا اور ایک چپل بند تھی۔ ڈرائیور نے تالا اور چابی ندیم کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"بابو یہ تم اپنے پاس ہی رکھو۔ میں منہ اندھیرے واپس آکر پھر سے تالا لگا جاؤں گا۔ بازار سے کچھ منگوانا تو نہیں ؟"

یہاں ندیم کو یہ پوچھنے کا موقع مل گیا کہ وہاں سے بازار کتنی دور ہے اور یہ کلکتہ کا کونسا علاقہ ہے۔ ڈرائیور جانتا تھا کہ ندیم کو آس پاس کے علاقے سے باخبر کرنے میں کوئی نقصان نہیں ہے چنانچہ وہ بولا۔

"یہ کالی گھاٹ کا علاقہ ہے بابو، مگر یہ جگہ کالی گھاٹ کی بستی سے دور ہے۔ یہاں سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر وہ سڑک ہے جو کالی گھاٹ بستی کو جاتی ہے۔ اس کے آگے ایک چوراہا آتا ہے جس کی ایک سڑک خضر پور جیٹی کی طرف ایک سڑک ٹامی گنج کی طرف اور ایک سڑک ڈلہوزی اسکوائر کی طرف جاتی ہے۔ وہاں سے میٹرو سینما کے قریب سے ہو کر ہم لوئر چیت پور روڈ کی طرف نکل جاتے ہیں۔ اگر تم نے سگریٹ، پان منگوانا ہو تو مجھے بتا دو۔ میرے پاس جیپ ہے جو میں نے یہاں سے کچھ فاصلے پر کھڑی کی ہے۔"

ندیم جو معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا اسے مل گئی تھیں۔ سگریٹ کے چھ پیکٹ ابھی اس کے پاس محفوظ پڑے تھے اور پان وہ کھاتا نہیں تھا۔ اس نے ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ان کپڑوں کے لیے میری طرف سے سیٹھ صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا۔ ڈرائیور تالا اور چابی ندیم کے حوالے کر کے واپس چلا گیا۔ ندیم کو اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ سوناگاچی کو وہاں سے کونسا راستہ جاتا ہے۔ وہ صرف قریبی سڑک کا حدود اربعہ معلوم کرنا چاہتا تھا اور وہ اس نے معلوم کر لیا تھا۔ ڈرائیور کے جاتے ہی اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا اور بنگالی دھوتی کرتا باندھ کر اپنے سراپا کو دیکھا۔ وہ بالکل بنگالی معلوم ہوتا تھا۔ باتھ روم میں جا کر اس نے ٹوٹے شیشے میں موم بتی اونچی کر کے اپنی شکل دیکھی۔ انگشت بھر بڑی بڑی داڑھی، ذرا ذرا تراشی ہوئی مونچھیں اور گردن تک گئے ہوئے لمبے بال۔ ندیم کو اپنے اوپر کسی بنگالی اسکول ٹیچر کا گمان ہوا۔ اس نے ایک بنگالی اسکول میں ایسا ہی اسکول ماسٹر دیکھا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ

اس نے چھتری کاندھے سے لٹکا رکھی تھی اور ندیم کے پاس چھتری نہیں تھی۔

ندیم کے پاس صرف آج، کل اور پرسوں کی رات تھی۔ اس سے اگلی رات کو سیٹھ جبار اسے وہاں سے نکال کر کالیے کے پاس لے جانے والا تھا جس نے اسے سرحد پار کروانی تھی۔ اگرچہ ندیم نجمی کے بغیر مشرقی پاکستان کسی صورت میں بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود اس کا کرشنا بائی سے ملنا از حد ضروری تھا کیونکہ تین راتوں کے بعد جب اس نے سیٹھ جبار سے کہہ دیا کہ وہ نجمی کے بغیر انڈیا کا بارڈر کراس نہیں کرے گا تو لازمی بات ہے کہ سیٹھ جبار اسے اپنے پاس رکھ کر مزید خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہوگا کیونکہ یہ اس کی ذمہ داری میں شامل نہیں تھا کہ وہ انڈیا میں ندیم کے مفادات کی حفاظت کرے۔ احمد خان نے اسے یہی لکھا تھا کہ کسی طریقے سے ندیم کو بارڈر کراس کرا کے مشرقی پاکستان بھجوا دیا جائے اور اس کے لیے ہی جبار سیٹھ ساری تگ و دو کر رہا تھا۔ جب ندیم نے مشرقی پاکستان جانے سے انکار کر دیا تو پھر اس کا جبار سیٹھ کے پاس اور اس کے تحفظ میں رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ ندیم نے فیصلہ کیا کہ اسے وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے اور آج رات ہی سوناگاچی پہنچ کر کرشنا بائی سے ملاقات کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ جوں جوں وقت گزر رہا تھا ندیم کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی نجمی اس سے دور سے دور تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی ندیم کے اندر جیسے ایک نئی طاقت امڈ آئی اس کو احساس ہوا جیسے وہ ایک انتہائی اہم مشن کا آغاز کرنے والا ہے۔ تھرمس میں چائے موجود تھی۔ اس نے گلاس میں چائے ڈالی اور چائے پینے لگا۔ چائے ابھی تک گرم تھی۔ گرم گرم چائے نے ندیم کے سوچنے کی طاقت کو سہ چند کر دیا۔ اس وقت رات کے سوا آٹھ بج رہے تھے۔ سوناگاچی کا علاقہ ساری رات جاگتا تھا۔ اس کے لیے رات بارہ بجے کا وقت موزوں رہے گا۔ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں کرشنا بائی گانا بجانا بند کر کے چلی نہ گئی ہو۔ تو کیا وہ رات کے دس بجے جائے؟ اتنی جلدی جانا ٹھیک نہیں تھا۔ اس وقت پولیس وہاں ضرور موجود ہوگی اور وہ پولیس سے جس قدر ممکن ہو بچنا چاہتا تھا۔ آخر سوچ سوچ کر اس نے رات گیارہ بجے وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ سرہانے کے نیچے سے ایک ہزار کے نوٹ ویسے کے ویسے پڑے تھے۔ ان میں زیادہ نوٹ سو سو کے تھے۔ ندیم نے چار نوٹ سو سو کے اور دو نوٹ پچاس پچاس کے نکال کر اپنی جیب

میں رکھ لیے اس کے ساتھ ہی کمانی دار چاقو بھی بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔ کونے میں نسواری رنگ کا بڑا رومال پڑا تھا۔ اس میں ایک بار سیٹھ جبار کھانا باندھ کر لایا تھا اور پھر اسے وہیں بھول گیا تھا۔ ندیم نے رومال کو اٹھا کر جھاڑا اور اسے اپنے گلے میں لپیٹ لیا۔ اس رومال سے اس کا حلیہ مزید کسی حد تک بدل گیا تھا وہ سگریٹ سلگا کر بیٹھ گیا اور رات کے گیارہ بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ گھڑی کی سوئیاں بڑی دھیمی رفتار سے چل رہی تھیں تو بجے ندیم نے ٹفن کیریئر میں سے تھوڑے سے چاول نکال کر کھائے۔ پھر تھرمس والی چائے گلاس میں ڈالی اور پینے لگا۔ چائے پی کر اس نے باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا رومال سے چہرہ پونچھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے میں ایک بار پھر اپنی صورت کا جائزہ لیا۔ وہ پہلی نظر میں واقعی نہیں پہچانا جاتا تھا۔ باہر نکل کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ پیتے ہوئے غور کرنے لگا کہ کیا اتنی رات گئے اسے سڑک پر ٹیکسی مل جائے گی؟ کیوں نہیں ملے گی؟ یہ کوئی معمولی شہر نہیں ہے۔ انڈیا کا ایک بہت بڑا شہر ہے۔ یہاں تو ہر جگہ کوئی نہ کوئی ٹیکسی ضرور مل جاتی ہو گی۔ جب گھڑی نے پورے گیارہ بجائے تو ندیم جلدی سے اٹھا۔ تالا چابی ہاتھ میں لی اپنے آپ کو ایک بار پھر غور سے دیکھا اور اللہ کا نام لے کر دروازہ کھول کر باہر تازہ ہوا میں نکل آیا۔ اتنے دنوں کے بعد رات کی ٹھنڈی تازہ ہوائیں آنے سے اس کے دماغ پر بہت خوشگوار اثر پڑا اور وہ اپنے آپ کو آنے والی مشکلات کے مقابلے کے لیے تازہ دم محسوس کرنے لگا۔

کلکتے کا دھندلا آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ فضا میں اوس کی رطوبت رچی ہوئی تھی۔ کوئی پچاس قدموں کے فاصلے پر گودام کے کونے میں جو بلب جل رہا تھا اس کی روشنی صرف چند فٹ تک ہی محدود تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ گودام کی دیوار بہت اونچی تھی۔ ندیم نے جلدی سے دروازے کو تالا لگایا۔ چابی جیب میں ڈالی اور دل ہی دل میں خداوند کریم سے دعا مانگتا کچی پگڈنڈی پر اس طرف چل پڑا جدھر اسے فاصلے پر روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ روشنیاں کافی دور تھیں اور ضرور کالی گھاٹ کی آبادی کی روشنیاں ہی تھیں۔ جس کچی پگڈنڈی پر وہ چلا جا رہا تھا وہ سکریپ اور کاٹھ کباڑ کے اونچے ڈھیروں میں سے گزرتی تھی آگے بانس کا ایک چھوٹا سا پل آ گیا۔ اس پل کے نیچے نالہ بہہ رہا تھا جس کا پانی اندھیرے کی وجہ سے ندیم کو نظر نہ آیا۔

پل کے آگے ایک بنجر میدان تھا۔ یہاں کٹی ہوئی لکڑیوں اور بانس کے ڈھیر پڑے تھے۔ ندیم تیز تیز چلتا یہاں سے بھی گزر گیا۔ وہ بارہ بجے رات سے پہلے پہلے سونا گاچی پہنچ جانا چاہتا تھا۔

وہ ایک کچی سڑک پر آ گیا جس کی ایک جانب پانی کھڑا تھا اور جھینگر بول رہے تھے۔ یہاں بجلی کا ایک بھی کھمبا نہیں تھا جس کی وجہ سے اندھیرا تھا۔ مگر ستاروں کی دھندلی روشنی میں سڑک دکھائی دے رہی تھی۔ ندیم کی نگاہ دور کالی گھاٹ والی آبادی کی روشنیوں پر لگی تھی۔ یہ راستہ ایک کھلی پکی سڑک سے جا کر مل گیا۔ یہاں درختوں کے بیچ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بجلی کے بلب روشن تھے۔ ایک ٹرک شور مچاتا گزر گیا۔ ندیم کو امید تھی کہ یہاں کوئی نہ کوئی آتی جاتی ٹیکسی اسے ضرور مل جائے گی۔ مگر وہ کسی جگہ رکے بغیر کالی گھاٹ کی طرف چلتا گیا۔ ندیم کو اب اتنی بنگلہ زبان آ گئی تھی کہ وہ دوسروں کو اپنا مطلب سمجھا سکتا تھا۔ پیچھے سے کسی گاڑی کی روشنیاں نظر آئیں تو ندیم کھڑے ہو کر اسے ہاتھ کا اشارہ کرنے لگا کہ شاید لفٹ مل جائے یہ بھی کوئی مال سے لدا ہوا ٹرک تھا۔ جو تیزی سے گزر گیا۔ ندیم پھر آگے چلنے لگا۔ آگے ایک چوک آ گیا جس کے وسط میں بڑے کھمبے پر چار بتیاں روشن تھیں۔ جو سڑک کالی گھاٹ والی روشنیوں کی طرف جاتی تھی ندیم اس سڑک پر آ گیا وہ دو قدم ہی چلا ہو گا کہ اسے اپنے پیچھے گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ یہ خالی ٹیکسی تھی کیونکہ اس کی چھت پر لگا سرخ بلب روشن تھا۔ ندیم سڑک کے بیچ میں کھڑے ہو کر زور زور سے بازو ہلانے لگا۔ گاڑی قریب آ کر رک گئی۔ یہ خالی ٹیکسی ہی تھی اور اسے ایک سکھ ڈرائیور چلا رہا تھا۔ اس نے سر باہر نکال کر خفگی سے کہا۔

"اوئے وچکار کھلوتا ایں مرنا ایں بدیا پترا۔" ندیم نے قریب آ کر اردو میں کہا "سردار جی مجھے سونا گاچی لے چلو بڑا ضروری کام ہے۔" سکھ نے ہنس کر کہا "اوئے ہم کو معلوم ہے تمھیں کیا ضروری کام ہے۔ پر میں سو روپیہ لوں گا۔" ندیم نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر سکھ ڈرائیور کی طرف بڑھایا اور کہا "یہ لو سو روپیہ سردار جی بس جلدی سے مجھے سونا گاچی پہنچا دو میرا بھائی وہاں کھو کھا لگاتا ہے۔ وہ بہت بیمار ہے۔" سکھ ڈرائیور نے سو روپے لے کر صدری کی جیب میں رکھا اور کہا "بہہ جا اوئے اندر" ندیم دروازہ کھول کر پچھلی نشست پر ذرا نیچے ہو کر بیٹھ گیا اور ٹیکسی چل پڑی۔ کلکتے میں ٹیکسی ڈرائیور عام طور پر سکھ ہی ہوتے ہیں

برمی ڈرائیوروں کی طرح یہ بھی تیز رفتاری میں بہت بدنام ہیں۔ جب ندیم نے اسے بتایا کہ اس کے بڑے بھائی کی حالت ٹھیک نہیں اور جلد اس کے پاس پہنچنا چاہتا ہے تو سکھ ڈرائیور نے رفتار مزید تیز کر دی۔ ویسے بھی آدھی رات کے وقت سڑک خالی تھی چنانچہ منٹوں کے بعد ٹیکسی کالی گھاٹ میں سے گزر رہی تھی۔ یہاں سے نکل کر گاڑی شہر کی روشن کشادہ مگر خالی خالی سڑکوں پر آ گئی۔ ندیم کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس علاقے میں سے گزر رہا ہے۔ سکھ ڈرائیور نے شاید پی رکھی تھی۔ وہ گاڑی بھی چلا رہا تھا اور اپنے آپ سے پنجابی میں باتیں کر رہا تھا۔ ٹیکسی اتنی تیز رفتار پہ جا رہی تھی کہ اس کا انجر پنجر کھڑکھڑا رہا تھا۔ ندیم ڈرنے لگا کہ کہیں گاڑی الٹ ہی نہ جائے۔ اس نے اونچی آواز میں ڈرائیور کو رفتار کم کرنے کے لیے کہا۔ سکھ ڈرائیور نے درشتگی سے کہا "ہن کج نہیں ہو سکدا بادشاہو، گڈی میرے ہتھوں نکل چکی اے۔"

ندیم تو دھک سے رہ گیا کہیں گاڑی کے بریک تو فیل نہیں ہو گئے مگر ایسی بات نہیں تھی۔ سڑک کا موڑ کاٹتے ہوئے ڈرائیور نے باقاعدہ بریکوں کا استعمال کیا۔ ایک چیخ کے ساتھ گاڑی گھوم گئی۔ ندیم سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور دل میں خدا سے دعائیں مانگنے لگا۔ گاڑی ایک اونچی روشن عمارتوں والے نسبتاً گنجان علاقے میں داخل ہو چکی تھی جہاں کبھی کبھی کوئی گاڑی یا وکٹوریہ آتے جاتے مل جاتی تھی۔ ٹیکسی کی رفتار کافی کم ہو گئی۔ ندیم نے ایک آدمی کو اس طرح گاڑی میں سوار ہوتے دیکھا کہ وہ لڑکھڑا رہا تھا اور دو آدمی   سہارا دے کر اسے گاڑی میں ڈال رہے تھے۔ ندیم سمجھ گیا کہ سونا گاچی یعنی کلکتے کی ہیرا منڈی کا علاقہ شروع ہو چکا ہے۔ ایک مکان میں اسے ہارمونیم کی آواز سنائی دی۔ سکھ ڈرائیور نے ٹیکسی ایک ایسے بازار میں داخل کرنے کے بعد بجلی کے کھمبے کے پاس روک دی جس کی دو منزلہ عمارت میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں اور بازار میں اکّا دُکّا لوگ آ جا رہے تھے اور کچھ پان، سگریٹ کے کھوکھے بھی روشن تھے جہاں سے اونچے سنگیت کی ریڈیائی گیتوں کی لہریں بلند ہو رہی تھیں۔ کوٹھوں سے ہارمونیم اور طبلے کی تھاپ اور گھنگروؤں کے دھیمے دھیمے چھناکے بھی سنائی دے رہے تھے۔ سکھ ڈرائیور نے گردن پیچھے گھما کر کہا:

"آ گیا تمھارا سونا گاچی بابو چل اُتر جا تو بھی کیا یاد کرے گا۔"

ندیم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ خیریت سے زندہ سلامت اپنی منزل پر پہنچ گیا تھا ٹیکسی

سے نکل کر وہ ایک پان سگریٹ کے کھوکھے کی طرف بڑھا۔ اس کے عین سامنے ایک جگمگاتی دکان میں بنگلہ گانے لگے تھے اور کچھ لوگ بیٹھے چائے وغیرہ پی رہے تھے۔ پان سگریٹ کے کھوکھے پر بھی دو چار آدمی کھڑے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ اگرچہ وہاں پولیس کا کوئی آدمی نہیں تھا پھر بھی ندیم نے قریب جانا مناسب نہ سمجھا اور ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ یہ گلی بھی ہمارے ہاں کی کسی پکی سڑک جتنی کشادہ تھی مگر چونکہ ادھر فلیٹوں کے پچھواڑے لگتے تھے اس لیے سنسان تھی اور جگہ جگہ کچرے کے ڈھیر لگے تھے۔ کلکتہ میں جو گلیاں اونچی رہائشی عمارتوں کے عقب میں واقع ہوتی ہیں۔ انھیں کچرا گلی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ لوگ مکانوں کی پچھلی کھڑکیوں سے ادھر کوڑا کرکٹ پھینک دیتے ہیں۔ جسے کارپوریشن کے بڑے بڑے ٹرک مقررہ وقت پر آ کر اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ ندیم کوڑے کرکٹ کے درمیان سے گزر کر سڑک کی دوسری جانب نکل آیا۔ یہاں بھی کہیں کہیں چوباروں سے گانے بجانے اور مجرے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ندیم کی نظر ایک چھوٹی سی دکان پر پڑی یہ بھی پان، سگریٹ اور سوڈا واٹر کی دکان تھی جس کے آگے رسی سے ایک بلب روشن تھا اور دکاندار گدی پر بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ وہاں کوئی گاہک نہیں تھا۔ ندیم لپک کر وہاں گیا اور جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر کریون اے کے سگریٹ کا پیکٹ طلب کیا۔ بنگالی دکاندار نے سگریٹ ندیم کی طرف بڑھائے نوٹ لے کر ڈبے میں رکھا اور ریزگاری نکالنے لگا۔ ندیم نے سگریٹ نکال کر پوچھا کہ یہاں کرشنا بائی کا چوبارہ کہاں ہے بنگالی دکاندار نے ایک قریبی فلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ سامنے والا کوٹھا ہے کرشنا بائی کا مگر اب تو وہ دھندا اسمیٹ چکی ہو گی۔ لکھی بائی کے قتل کے بعد وہ جلدی کوٹھا بند کر دیتی ہے۔" ندیم نے ریزگاری لے کر جیب میں رکھی اور کرشنا بائی کے چوبارے کی طرف چلا جہاں ابھی تک روشنی ہو رہی تھی۔ یہ چوبارہ بلڈنگ کی دوسری منزل کا ایک فلیٹ تھا۔ نیچے سیڑھیوں میں ایک غنڈہ ٹائپ آدمی دیوار سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے ندیم کو آگے بڑھتا دیکھا تو دیوار سے ٹیک ہٹا دی اور ندیم کے قریب آ کر کرخت لہجے میں پوچھا "کدھر جا رہے ہو بابو۔؟"

٭ ٭ ٭

ندیم کرشنا بائی کے کوٹھے کی سیڑھیوں کے پاس رک گیا۔ غنڈہ ٹائپ بنگالی اس کے قریب آگیا۔ سگریٹ کی راکھ چٹکی سے جھاڑتے ہوئے طنزیہ ہنسی کے ساتھ بولا۔ "ارے اوپر کدھر جاتا ہے دادا۔ چندا بائی کو تو ڈاکو لے گئے۔" ندیم نے جیب سے کمانی دار چاقو نکال کر اسے کھول کر بند کیا اور غنڈے کی طرف جھک کر رازداری سے کہا۔

"کرشنا بائی سے پگار لینے جا رہا ہوں دادا۔"

بنگالی غنڈہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ ندیم ویسے بھی ڈیل ڈول میں اس سے دوگنا تھا۔ فوراً لہجے میں انکساری پیدا کرتے ہوئے بولا۔

"کرشنا بائی دھندا ختم کر چکی ہے۔ مگر وہ ابھی اوپر اپنے کوٹھے پر ہی ہے۔"

یہ کہہ کر غنڈہ بنگالی وہاں سے چل دیا۔ ندیم نے چاقو جیب میں رکھا اور جلدی سے سیڑھیوں میں آگیا۔ پہلی منزل کے دروازے پر تالا لگا تھا۔ سیڑھیوں میں ایک ہلکی روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ اوپر والی منزل کا دروازہ بھی بند تھا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ ندیم نے دروازے کی درز میں سے جھانک کر دیکھا۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا کمرہ تھا چاندنی کا فرش بچھا تھا جس پر موتیے اور گلاب کے پھولوں کی پتیاں ادھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ ایک بوڑھا بنگالی چادر میں ہارمونیم لپیٹ رہا تھا۔ سرخ بھڑکیلی ساڑھی میں ملبوس ایک نوجوان خوبصورت بنگالی عورت چھوٹے سے تخت پر بیٹھی اپنے پاؤں سے گھنگھرو اتار رہی تھی۔ ایک گھنگھرو اس نے اتار کر تخت پر رکھا ہوا تھا دوسرا گھنگھرو بھی اتار کر اس نے تخت پر رکھ دیا اور ایک جمائی لے کر بنگلہ میں بوڑھے بنگالی سے کچھ کہا بوڑھے بنگالی نے جواب میں کچھ کہا اور ہارمونیم کی پیٹی کونے میں لگا دی۔ پھر گاؤ تکیے اٹھا کر کونے

میں رکھنے لگا جہاں پہلے ہی سے کچھ تکیے اور اگالدان پڑے تھے۔ اب ندیم نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ خوبصورت عورت نے جو یقیناً نجمی کی سہیلی اور راز دار کرشنا دیوی ہی تھی بے زاری سے دروازے کی طرف دیکھا اور بوڑھے سے ایک بار پھر بنگلہ زبان میں کچھ کہا۔ بوڑھا دروازے کی طرف آیا ندیم پیچھے ہٹ گیا۔ بوڑھے نے دروازے کو ذرا سا کھول کر ندیم کو دیکھا اور ہندوستانی میں کہا کہ۔

"مجرا بند ہو گیا ہے کل آنا۔" ندیم سنی ان سنی کرتے ہوئے دروازہ کھول کر بیٹھک میں آگیا۔ اسے یوں بے دھڑک اندر آتے دیکھ کر کرشنا بائی سہم سی گئی۔ لکھی بائی کے خون اور نجمی یعنی چندا بائی کے اغوا کے بعد وہاں پہلے ہی سے خوف و دہشت کے سائے منڈلا رہے تھے۔ ندیم کو صورتحال کی سنگینی کا پورا علم تھا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا کرشنا بائی کے پاس گیا اور کہنے لگا۔

"میں ندیم ہوں کرشنا! چندا دیوی کا دوست!"

کرشنا بائی نے یہ سنا تو جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ندیم کو غور سے دیکھا۔ پھر بوڑھے بنگالی سے بنگلہ میں کچھ کہا جس پر بوڑھا سر کو لٹکائے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل میں چلا گیا۔ کرشنا بائی نے دروازے کی کنڈی لگا دی اور ندیم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"مجھے کیسے یقین آئے کہ تم ہی میری سہیلی چندا کے دوست ندیم ہو؟ کیا تم مجھے چندا کا اصلی نام بتا سکتے ہو؟"

جب ندیم نے اسے چندا کا اصلی نام نجمی بتایا اور یہ بھی بتایا کہ کس طرح وہ دونوں لاہور میں پڑھا کرتے تھے اور پھر کس طرح ان کی بدقسمتی کا آغاز ہوا اور وہ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ ندیم نے کرشنا کو یہ نہ بتایا کہ وہ کلکتہ میں کس جگہ چھپا ہوا ہے۔ مگر باقی سب کچھ بتا دیا اور کہا کہ وہ کرشنا سے صرف یہ پوچھنے آیا ہے کہ اس کے خیال میں نجمی کو ڈاکو مان سنگھ نے ہی اغوا کیا ہے؟ کرشنا بائی اب بھی کچھ بتاتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ تب ندیم نے کہا۔

"کرشنا! تم مجھ پر کسی قسم کا شک مت کرو۔ مجھے نجمی یعنی چندا بائی ایک بار ملی تھی اور اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم اس کی رازدار سہیلی ہو اور اگر اس کے بارے میں کبھی کچھ معلوم کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو میں کرشنا بائی کے پاس ہی جاؤں۔"

چندا یعنی نجمی نے کرشنا بائی کو ندیم کا جو حلیہ بتایا تھا وہ نووارد نوجوان پر بالکل ٹھیک بیٹھتا تھا۔

جب کرشنا کو پکا یقین ہو گیا کہ یہی ندیم ہے تو اس نے اداس لہجے میں کہا۔

"یہ قتل ڈاکو مان سنگھ نے ہی کیے تھے اور وہی چندا کو بھی اغوا کر کے لے گیا ہے۔ میں مان سنگھ ڈاکو کو شکل سے پہچانتی ہوں۔ وہ جوگی کے بھیس میں لکھی بائی کے پاس دریائے ہگلی والی کوٹھی میں رات کو آیا کرتا تھا۔"

ندیم نے پوچھا "تمہارے خیال میں مان سنگھ ڈکیٹ، نجمی کو اغوا کرنے کے بعد کہاں لے گیا ہو گا۔؟"

کرشنا بائی ایک لمحے کے لیے جیسے کچھ سوچنے لگی۔ پھر ندیم کی طرف دیکھ کر بولی۔

"مجھے اس کے اڈے کا تو کچھ پتا نہیں پر لکھی بائی سے ایک بار سنا تھا کہ کاکنسر بازار کے جنگل میں درگا دیوی کی باؤلی ہے۔ مان سنگھ کا باؤلی کے پاس کسی ٹیلے میں خفیہ ٹھکانا ہے۔ مگر تم وہاں مت جانا۔ مان سنگھ کے ساتھی بڑے خونی ہیں۔ ادھر کوئی بھولا بھٹکا مسافر بھی چلا جائے تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑتے۔"

ندیم خود بھی کرشنا بائی پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ نجمی کی تلاش میں جائے گا۔ آہ بھر کر بولا۔

"کرشنا! میں نجمی کے پیچھے کیسے جا سکتا ہوں۔ پولیس خود میری تلاش میں ہے اور میں شہر کے کونے کھدروں میں چھپتا پھرتا ہوں۔ اچھا اگر خدا کو منظور ہوا تو کبھی نجمی سے ملاقات ہو جائے گی۔ اب میں چلتا ہوں۔"

کرشنا بائی ندیم کے قریب آ گئی اور کہنے لگی۔

"چندا بڑی بدنصیب ہے اس نے بڑے کشٹ اٹھائے ہیں اور ابھی تک دکھ جھیل رہی ہے۔ اگر چندا ڈاکوؤں کے جنگل سے فرار ہو کر یہاں آنے میں کامیاب ہو گئی تو میں تمھیں یہی کہوں گی کہ تم اسے یہاں سے نکال کر مشرقی پاکستان لے جاؤ۔ یہاں وہ زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکے گی۔"

ندیم نے کرشنا بائی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر کہا۔

"کرشنا! میں کبھی کبھی تمھیں رات کے وقت یہاں آ کر ملتا رہوں گا۔ اگر نجمی کسی طرح یہاں پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تو مجھے ضرور بتا دینا پھر میں اسے یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ میں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔"

ندیم نے کرشنا کا شکریہ ادا کیا اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر دروازے پر آ کر رکا۔ سر باہر نکال کر بازار کا جائزہ لیا۔ آدھی رات کے گزر جانے پر بھی کہیں کہیں کوٹھوں سے گھنگھروؤں کی جھنکار اور گانے کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن بازار تقریباً سنسان تھا۔ ندیم بازار میں آ کر مکانوں کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا دوسرے بازار میں نکل آیا۔ یہاں کونے والی سگریٹوں کی دکان کے پاس کچھ لوگ کھڑے آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ ندیم ان سے کچھ فاصلے پر تیز تیز گزر گیا۔ وہ سوناگاچی کے علاقے سے باہر آیا تو ایک ٹیکسی اس کے قریب سے گزری۔ ندیم نے زور سے آواز دی تو ٹیکسی کچھ دور جا کر رکی پھر الٹی چلتی اس کے قریب آ گئی۔ ندیم اس کے اندر گھس گیا اور ڈرائیور کو اس علاقے کا نام بتایا جس کا شمار کلکتہ شہر کے مضافات میں ہوتا تھا اور جہاں ایک بوسیدہ مال گودام کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں امجدیہ ہوٹل والے سیٹھ جبار نے اسے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ ٹیکسی پون گھنٹے کے بعد کلکتہ کے سنسان بازاروں سے گزرتی مضافات سے تھوڑی دور اس علاقے میں پہنچ کر رک گئی جس کا نام ندیم نے ڈرائیور کو بتایا تھا۔ یہاں ندیم نے ٹیکسی چھوڑ دی اور رات کے اندھیرے اور خاموشی میں مال گودام کی طرف روانہ ہو گیا۔ کوٹھڑی کو وہ تالا لگا گیا تھا۔ وہ تالا کھول کر کوٹھڑی میں آ گیا۔ اور چارپائی پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے۔ یہ بات تو طے تھی کہ وہ نجمی کی تلاش میں کاکنسر بازار والے جنگل کی طرف روانہ ہو جائے گا اور سیٹھ جبار کے آدمی کالیے کے ساتھ انڈیا کا بارڈر کراس کر کے مشرقی پاکستان میں داخل نہیں ہو گا۔ وہ نجمی کے بغیر مشرقی پاکستان کیسے جا سکتا تھا۔ وہ نجمی کو درندوں کے گڑھ سے نکال کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔

یہ اس کی زندگی کا اب سب سے بڑا مقصد تھا اور اس نے اس مقصد میں کامیاب ہونے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ دو دن بعد جبار علی سیٹھ نے ندیم کو اپنے آدمی کالیے کے ساتھ مشرقی پاکستان پہنچانا تھا جس کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ندیم نے نجمی کے پیچھے ڈاکو مان سنگھ کی خفیہ اور خطرناک کمین گاہ پر جا کر وہاں سے نجمی کو نکالنے کا عہد کیا ہوا تھا۔ ندیم چارپائی پر لیٹ گیا۔ نجمی کس حالت میں ہو گی؟ یہ سوچ سوچ کر اس کا ذہن لاوے کی طرح ابل رہا تھا۔ پھر نہ جانے کس وقت اسے نیند آ گئی آنکھ اس وقت کھلی جب باہر کوئی دروازے پر آہستہ آہستہ ٹھک ٹھک کر رہا تھا۔ یہ سیٹھ جبار کا ڈرائیور وعدے کے مطابق دن کے وقت کوٹھڑی کے باہر تالا لگاتے اور ناشتہ لے کر

آیا تھا۔ ندیم نے بند دروازے کی درز میں سے سیٹھ جبار کے ڈرائیور کو دیکھا اور دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیور کے ہاتھ میں گٹھڑی تھی جس میں کھانا وغیرہ بندھا ہوا تھا اس نے آتے ہی ندیم سے تالا اور چابی لے لی اور پوچھا رات کوئی ادھر آیا تو نہیں؟ ندیم نے کہا کہ کوئی نہیں آیا۔ بس میں تھوڑی دیر کے لیے باہر نکل کر ٹہلا تھا۔ ڈرائیور نے بتایا کہ سیٹھ آج رات آئے گا۔ ڈرائیور باہر سے کوٹھری کو تالا لگا کر چلا گیا سارا دن ندیم نے تنگ و تاریک کوٹھری کے اندر ہی گزار دیا۔ اسے سیٹھ جبار کا انتظار تھا وہ اسے صاف صاف بتا دینا چاہتا تھا کہ جب تک وہ نجمی کو ڈاکوؤں کے چنگل سے برآمد نہیں کرے گا بارڈر کراس نہیں کرے گا۔ ندیم سیٹھ جبار کو بتائے بغیر وہاں سے نجمی کی تلاش میں نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ رات کو سیٹھ جبار آیا تو وہ کچھ فکر مند سا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ندیم کے لیے سگریٹ کے چار پیکٹ اور چائے سے بھری ہوئی تھرمس بھی لایا تھا۔ اس نے تھرمس میں سے چائے نکال کر گلاسوں میں ڈالی اور پھر کسی قدر تشویش کے ساتھ کہنے لگا۔

"پولیس تمہاری تلاش میں میرے ہوٹل میں آج آئی تھی۔ مجھے لگتا ہے کسی نے مخبری کر دی ہے لیکن تم مطمئن رہو۔ اول تو پولیس کو میرے ہاں کوئی ثبوت نہیں ملا۔ دوسرے میں نے اوپر مل لیا ہے۔"

ندیم خاموشی سے چائے پیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ سیٹھ جبار نے خود ہی اس کی مشکل حل کر دی۔ چائے کا گلاس ہاتھ میں لیے ندیم کی طرف دیکھ کر بولا۔

"ویسے اب ایک رات کی بات ہے۔ پرسوں منہ اندھیرے کالیا تمہیں یہاں سے لے جائے گا سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ندیم موم بتی کی طرف دیکھ رہا تھا جو قریب ہی غسل خانے کے اندر رکھی ہوئی اینٹ پر جل رہی تھی۔ چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد اس نے سیٹھ جبار کی طرف دیکھے بغیر آہستہ سے کہا کہ وہ بارڈر کراس نہیں کرے گا۔ سیٹھ جبار نے چونک کر ندیم کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر ناراضگی کے تاثرات تھے۔

"کیوں؟ بارڈر کراس نہیں کرو گے تو کہاں جاؤ گے۔ اس جگہ اب تم زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔ پولیس تو شکاری کتوں کی طرح تمہاری بو سونگھتی پھر رہی ہے۔" ندیم نے چائے کا گلاس زمین پر رکھ دیا۔

"سیٹھ جی! چندا کو ڈاکو مان سنگھ اغوا کر کے لے گیا ہے اور میں چندا کے بغیر بارڈر کراس نہیں کر سکتا۔"

سیٹھ جبار کو غصہ آ گیا بولا "تم احمق ہو۔ بیوقوف ہو۔ اگر تمہاری چندا کو مان سنگھ لے گیا ہے تو تم کیا کرو گے؟ جانتے ہو مان سنگھ نے کتنے خون کیے ہیں؟ وہ انسان نہیں درندہ ہے۔ آدم خور ہے۔ تم اس کے قبضے سے اپنی چندا کو قیامت تک نہیں چھڑا سکو گے۔" ندیم نے کہا "چاہے میری جان چلی جائے مگر میں چندا کو مان سنگھ کے چنگل سے چھڑا کر ہی دم لوں گا۔" سیٹھ جبار نے ایک گہرا سانس بھرا اور بولا۔

"دیکھو میاں! مجھ پر میرے دوست نے جو ذمہ داری ڈالی ہے میں اسے ہر حالت میں نبھاؤں گا۔ میں یار کی یاری نبھا رہا ہوں۔ اس نے مجھے لکھا ہے کہ میں تمہیں بارڈر پار کرا دوں اور اس کا میں نے بندوبست کر لیا ہے۔ باقی اگر تم اپنی چندا کی تلاش میں جانا چاہتے ہو تو ایسا تم اپنی ذمہ داری پر کرو گے اور میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا ہاں تم سے اتنا وعدہ ضرور لوں گا کہ اگر تم پکڑے گئے تو پولیس کے آگے میرا نام مت لینا۔"

ندیم نے سیٹھ جبار کی طرف احسان مند نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سیٹھ جی! میں محسن کش نہیں ہوں۔ اگر ایسی گھڑی آ گئی تو مر جاؤں گا پر آپ کا نام زبان پر نہیں لاؤں گا۔"

سیٹھ جبار نے ندیم کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی شفقت کے ساتھ کہا۔

"میرے عزیز! تم نادان ہو۔ مان سنگھ ڈاکو اور اس کے گروہ کو نہیں جانتے۔ یہ بھارت کا سب سے درندہ صفت ڈاکو ہے۔ مدھیہ پردیش میں کئی خون کر چکا ہے اور اب کچھ عرصے سے بنگال میں قتل و غارت گری کر رہا ہے۔ پولیس بھی اس سے ڈرتی ہے۔ بڑے سے بڑا جی دار انسپکٹر پولیس بھی مان سنگھ کی کمین گاہ کے قریب پھٹکنے کی جرأت نہیں کرتا۔ چندا کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ تم کالیے کے ساتھ بارڈر کراس کر کے مشرقی پاکستان چلے جاؤ۔ یہاں تمہاری زندگی بھی شدید خطرے میں ہے۔ تم پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام ہے اور بھارتی پولیس نے تمہیں ایک بار پکڑ لیا تو پھر تمہاری موت یقینی ہے۔"

ندیم خاموشی سے سیٹھ جبار کی باتیں سنتا رہتا۔ جب سیٹھ نے اپنی بات ختم کی تو ندیم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "سیٹھ جی! میں مجبور ہوں میں چندا کی تلاش میں ضرور جاؤں گا اور خدا نے

چاہا تو اسے ظالموں کے پنجے سے نکال لاؤں گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" سیٹھ جبار، ندیم کا منہ تکنے لگا۔ زمین پر سے چائے کا گلاس اٹھا کر دو گھونٹ پیئے، گلاس زمین پر رکھا۔ کرلوں نے کا سگریٹ سلگا کر ایک کش لگایا اور کہا۔

"اگر تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم مان سنگھ کی تلاش میں کہاں جاؤ گے؟ کیا تمھیں معلوم ہے کہ اس کی خفیہ کمین گاہ کہاں پر ہے؟"

ندیم نے کہا "میں نے ایک بار سنا تھا کہ وہ کاکسز بازار کے قریب کسی جنگل میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ رہتا ہے۔"

سیٹھ جبار مسکرا دیا۔ بولا "یہ تمھیں کس احمق نے بتا دیا؟ کاکسز بازار تو مشرقی پاکستان میں ہے۔ ڈاکو مان سنگھ وہاں رہ کر کلکتہ وارداتیں کرنے کیسے آ سکتا ہے۔"

ندیم نے سوچا کہ سیٹھ جبار ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کاکسز بازار تو مشرقی پاکستان میں واقع ہے۔ اس نے سیٹھ جبار سے پوچھا کیا آپ کو اس ڈاکو کے ٹھکانے کا کچھ پتہ ہے؟ سیٹھ جبار نے سگریٹ کے ساتھ دوسرا سگریٹ سلگانے کے بعد کہا۔

"میری اطلاع کے مطابق ڈاکو مان سنگھ اپنے گروہ کے ساتھ کلکتہ شہر کے جنوب مشرق میں ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر جل دھارا جنگل کے اندر ایک ٹیلے کی گھاٹی میں کسی جگہ رہتا ہے۔ مگر یہ سارے کا سارا راستہ بے حد دشوار گزار ہے اور پھر وہاں جگہ جگہ جنگلی درندے رہتے ہیں۔ ایک تو تم نہتے ہو۔ پھر اکیلے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تم وہاں تک پہنچ نہیں سکو گے۔ اگر کسی طرح پہنچنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو مان سنگھ کے آدمیوں کے ہاتھوں قتل ہو جاؤ گے۔ میں اب بھی تمھیں یہی مشورہ دوں گا کہ اس خیال کو دل سے نکال دو اور اپنی جان بچا کر مشرقی پاکستان چلے جاؤ۔"

ندیم کچھ اور ہی سوچ رہا تھا اس نے کہا۔

"کیا آپ مجھ پر ایک مہربانی کر سکتے ہیں؟"

سیٹھ جبار، ندیم کی طرف دیکھنے لگا۔ ندیم نے سرہانے کے نیچے سے سو سو کے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس رقم کے عوض کوئی پرانا پستول اور کچھ گولیاں لا کر دے دیجئے میں آپ کا یہ احسان

بھی ساری زندگی فراموش نہیں کروں گا۔"

سیٹھ جبار نے ندیم کے نوٹوں والے ہاتھ کو پیچھے کر دیا اور کہا۔

"تمھیں پستول اور گولیاں چاہئیں۔ وہ تمھیں مل جائیں گی۔ تم یہ بتاؤ کہ خودکشی کی اس مہم پر کب روانہ ہونا چاہتے ہو۔؟"

یہ خودکشی کی مہم ہی تھی لیکن ندیم کے سینے میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے اور نجمی کو ایک بار پھر زندگی کی مقدس راہوں پر گامزن کرنے کا جذبہ موجزن تھا اُسے اپنے اس پاکیزہ جذبے اور خدا کی ذات پر مکمل بھروسہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ موت کے منہ میں ہاتھ ڈال کر بھی نجمی کو نکال لائے گا اور پھر اسے مشرقی پاکستان اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ضرور قائل کر لے گا۔

اس نے کہا۔

"میں آج رات ہی نکل جانا چاہتا ہوں لیکن مجھے کچھ ضروری چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو میرے پاس ایک پستول کا اور گولیوں کا ہونا ضروری ہے دوسرے میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے میرے سائز کی کوئی گہرے رنگ کی پرانی سی پتلون اور ربڑ کے جوتے اور ایک پرانی چمڑے کی جیکٹ لا دیں یہ کھدر کے کپڑے جنگل اس ایک خطرناک مہم میں زیادہ دیر تک میرا ساتھ نہیں دے سکیں گے۔"

سیٹھ جبار نے سگریٹ کی راکھ کو جھاڑتے ہوئے کہا۔

"ان چیزوں کا بندوبست ہو جائے گا لیکن ان چیزوں سے زیادہ تمھیں ضرورت اس بات کی ہے کہ تم اپنے آپ کو پولیس اور سی آئی ڈی کے آدمیوں سے محفوظ رکھو۔ پولیس تمھاری کھوج میں لگی ہے تمھیں اپنے آپ کو پولیس کی نظروں سے بچاتے ہوئے جل دھارا کے خطرناک جنگلوں میں داخل ہونا ہوگا۔ اس کے بعد تمھارا سامنا ایک ایسے خونی ڈکیٹ سے ہوگا جو گولی پہلے چلاتا ہے اور بات بعد میں کرتا ہے۔"

ندیم نے کہا "سیٹھ جی! قبر میں جو رات آنی ہے اس کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ اگر میری موت ڈاکو مان سنگھ کے ہاتھوں لکھی ہوئی ہے تو اسے نہ آپ روک سکتے ہیں نہ میں روک سکتا ہوں۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ڈاکو مان سنگھ کا باپ بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ آپ مجھے اتنا ضرور گائیڈ کر دیں گے کہ مجھے جل دھارا کے جنگل میں پہنچنے کے لیے کونسا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔"

سیٹھ جبار نے سگریٹ بجھا کر غسل خانے میں پھینکا اور اپنی پشمینے کی کشمیری فر گردن کے گرد لپیٹتے ہوئے بولا۔

"یہ میں تمھیں کل بتاؤں گا۔ میں کل شام کا اندھیرا ہوتے ہی آؤں گا۔ تم تیار رہنا۔"

سیٹھ جبار چلا گیا تو ندیم نے تھرمس میں سے مزید چائے گلاس میں ڈال کر پی اور سگریٹ سلگا کر سوچنے لگا کہ نجمی اس وقت کس عالم میں ہوگی۔ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں، ڈاکو مان سنگھ نجمی کو اغوا کر کے اپنی خفیہ کمین گاہ میں لے گیا تھا۔ نجمی کو اس نے ٹیلے والی غار میں بند کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھ اب کھول دیئے گئے تھے۔ غار کے باہر ساری رات ایک ڈاکو پہرہ دیتا رہا تھا۔ نجمی رات کے پچھلے پہر سو گئی تھی۔ نجمی اب وہ پہلے والی نازک اور بات بات پر ڈر جانے اور آنسو بہانے والی نجمی نہیں رہی تھی۔ حالات نے اس کی نسوانی نزاکت اس سے چھین کر اس کے اندر انتقام کا بارود کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ اب اسے صرف ایک چنگاری دکھانے کی ضرورت تھی۔ جس جس مرد نے اس کے ساتھ جو جو درندہ صفت سلوک کیا تھا۔ وہ اس کے سینے پر نقش تھا۔ اسے ان سب سے اس درندگی کا انتقام لینا تھا۔ مان سنگھ تو ڈاکو تھا۔ اس کا تو کام ہی قتل و غارت گری تھا لیکن نجمی اسے بھی کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ نجمی کو اس غار میں قید ہوئے دو روز گزر گئے تھے۔ دن میں صرف ایک دفعہ دو ڈاکو اسے اپنی نگرانی میں غار سے نکال کر ٹیلے کے دامن میں بہتی ندی پر نہلانے لے جاتے اور جب نجمی نہر میں نہا رہی ہوتی تو دونوں ڈاکو رائفلیں اٹھائے قریبی جھاڑیوں میں سے اسے برابر دیکھ رہے ہوتے تھے۔ رات کو ڈاکو مان سنگھ پستول گلے میں لٹکائے جھومتا جھومتا غار میں آ جاتا اور صبح ہوتے غار سے باہر جاتا۔ نجمی چوبیس گھنٹے وہاں سے فرار ہونے کے منصوبے سوچتی رہتی لیکن بہت جلد اسے محسوس ہو گیا کہ وہ زندہ حالت میں ان ڈاکوؤں سے نجات حاصل نہیں کر سکتی اور ابھی اسے مرنا بھی نہیں تھا کیونکہ اس کے دشمن ابھی زندہ تھے۔ اسے اپنے ان تمام دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ اب ان دشمنوں میں مان سنگھ ڈاکو کا نام بھی لکھ دیا تھا۔ نجمی نے ایک نئی حکمت عملی اختیار کر لی۔ اس نے اپنے آپ کو وقتی طور پر ڈاکو مان سنگھ کے حوالے کر دیا اور اس سے محبت کا اظہار کرنے لگی۔ مان سنگھ ڈاکو محبت کے نام سے ناواقف تھا۔ اس سے اس کے رویے میں صرف اتنی تبدیلی آئی کہ اس نے نجمی کو غار سے باہر نکل کر ڈاکوؤں کے لیے کھانا وغیرہ پکانے

کی اجازت دے دی۔ تیسرے روز ڈاکو مان سنگھ اپنے چار ساتھیوں کو لے کر کہیں واردات کرنے چل دیا۔ پیچھے صرف پانچ سات ڈاکو رہ گئے۔ ان میں مان سنگھ کا شاگرد خاص داسو بھی تھا۔ داسو نے نجمی کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ وہ نجمی کے ساتھ زرخرید لونڈیوں سے بھی بدتر سلوک کرتا۔ نجمی اکیلی اور بے بس تھی۔ مان سنگھ نے نجمی کو غار سے نکلنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ لیکن داسو نے نجمی سے یہ سہولت بھی چھین لی اور اسے صبح شام غار میں ہی بند رکھتا جس کے باہر ایک مسلح ڈاکو پہرے پر موجود رہتا۔ مان سنگھ کو گئے تیسرا روز جا رہا تھا کہ نجمی نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی۔ صبح کے وقت جب دو آدمی اسے اپنی نگرانی میں ندی پر نہانے کے لیے لے گئے تو نجمی نے ندی کے پانی میں ڈبکیاں لگاتے ہوئے نہانا شروع کر دیا۔ یہ ندی کچھ دور جنگل میں بالکل سیدھی جا کر آگے دائیں جانب درختوں میں گھوم گئی تھی۔ نجمی نے سوچا کہ اگر وہ پانی میں غوطہ لگا کر اندر ہی اندر تیزی سے تیرے تو وہ ندی کے موڑ تک جا سکتی ہے۔ چار پانچ دنوں میں اس نے پانی میں ڈبکیاں لگا کر اپنے سانس کو پکا کر لیا تھا۔ اور اپنے اندازے کے مطابق وہ ڈیڑھ منٹ تک پانی کے اندر رہ سکتی تھی اور ڈیڑھ منٹ ندی کے موڑ تک پہنچنے کے لیے کافی تھا۔ مصیبت صرف یہ تھی کہ دونوں ڈاکو جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے اسے نہاتے ہوئے برابر دیکھتے رہتے تھے اور اپنی نگاہ میں رکھتے تھے۔ نجمی نے سوچ رکھا تھا کہ ایک بار وہ ندی کے موڑ تک پہنچ گئی تو پھر ان کے قابو میں نہیں آئے گی اور ندی سے نکل کر جنگل میں بھاگ جائے گی۔ وہاں جنگل اس قدر گھنا اور چھپواں گھاس سے اتنا بھرا ہوا تھا کہ اگر آدمی کسی طرف سے اس میں داخل ہو جائے تو پھر اسے تلاش کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ نجمی نے کپڑے نہیں اتارے تھے اور ساڑھی سمیت ہی ندی میں نہا رہی تھی۔ بیچ بیچ میں وہ جھاڑیوں کے پیچھے کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے دونوں ڈاکوؤں کو بھی دیکھ لیتی تھی۔ ایک دفعہ اس نے ڈاکوؤں کی طرف نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ وہ ندی کی طرف سے نظریں ہٹائے ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ یہی وقت ان کی نظروں سے غائب ہونے کا تھا۔ نجمی نے ڈبکی لی اور پانی کے اندر جاتے ہی مینڈک کی طرح جتنی تیزی سے ٹانگیں اور بازو چلا سکتی تھی چلاتی ہوئی ندی کے بہاؤ کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ پانی کے اندر کافی دیر تک سانس کو بند رکھ سکے گی مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔ بہت جلد اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے پھیپھڑے پھٹ جائیں گے

پھر بھی وہ بازو اور ٹانگیں چلاتی آگے بڑھتی گئی۔ لیکن جب اس کی بند آنکھوں کے آگے نیلے تارے ناچنے لگے اور سینہ پھٹنے والا ہوگیا تو اس نے بے دم سی ہو کر اپنا سر پانی سے باہر نکال لیا تھا کہ رائفل کے فائر کے دھماکے سے جنگل گونج اٹھا اور جیسے گولی نجمی کے کان کے قریب سے ہو کر گزر گئی۔ نجمی نے دیکھا کہ دونوں ڈاکوؤں نے ندی میں چھلانگیں لگا دی تھیں اور کمر تک پانی میں ڈوبے اس کی طرف رائفلیں تانے بڑھ رہے تھے۔ ایک ڈاکو نے نجمی کو گالی دی اور کہا "یہیں کھڑی رہ" نجمی اب کیسے وہاں سے ہل سکتی تھی۔ ڈاکو اسے گھسیٹتے ہوئے اوپر غار کے باہر لے آئے۔ داسو کو جب پتہ چلا کہ نجمی نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی تو اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ نجمی کے منہ سے خون نکلنے لگا اور وہ نیم بے ہوش سی ہو کر زمین پر پڑ گئی۔ داسو نے اسے غار میں پھینکوا کر باہر پہرہ لگوا دیا۔ شام کو مان سنگھ ڈکیٹ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس آیا تو داسو نے اسے بتایا کہ چندا بائی نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ اگر میں وقت پر ہوشیار نہ ہو جاتا تو وہ ہاتھ سے نکل گئی تھی اور اس نے پولیس کو جا کر ہمارے خفیہ ٹھکانے کا سارا نقشہ بتا دینا تھا۔ مان سنگھ کا بھی پارہ چڑھ گیا اس نے نجمی کو مزید زدوکوب کیا اور اس کے پاؤں میں لوہے کی زنجیر ڈال کر اسے غار میں بند کر دیا۔

اب ہم واپس ندیم کی طرف آتے ہیں۔ دوسرے دن شام ہوتے ہی سیٹھ جبار مال گودام والی کوٹھری میں آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک بڑا لفافہ لایا تھا۔ اس میں ندیم کے لیے ایک پرانی سی میل خورے رنگ کی پتلون، ایک نسواری جیکٹ اور کینوس کے جوتے تھے۔ اس نے ایک پستول جیب سے نکال کر ندیم کو دیا اور کہا کہ یہ بارہ بور کا ولائتی پستول ہے۔ ساتھ کچھ گولیاں بھی تھیں۔ ندیم نے پستول کے میگزین کو گولیوں سے بھر لیا۔ اپنے کھدر کے کپڑے اتارے اور پتلون جیکٹ اور کینوس کے بوٹ پہن لیے۔ اس کی داڑھی اور مونچھیں بڑھی ہوئی تھیں۔ بال بھی گردن تک آ گئے تھے۔ سیٹھ جبار نے ندیم کو کینوس کا ایک چھوٹا سا تھیلا بھی دیا جس میں ڈبل روٹی اور بھنی ہوئی مچھلی کے کچھ تلے تھے۔ سیٹھ جبار کہنے لگا۔

"یہ جنگل میں کچھ روز تمہارے کام آئیں گے۔ روپے بھی تم اپنے پاس رکھ لینا۔ ہو سکتا ہے یہ بھی سفر میں تمہاری مدد کریں۔"

ندیم نے سیٹھ جبار سے جل دھارا کے خطرناک جنگلی علاقے کے بارے میں پوچھا کہ "کلکتہ سے اسے کس طرف سے نکلنا ہوگا۔" سیٹھ جبار نے کہا۔

"جل دھارا جنگل تک پہنچنے کا سب سے آسان راستہ تو دریائے ہگلی کا ہے مگر گھاٹ پہ پولیس کے آدمی ہوں گے۔ وہاں تمہارے پکڑے جانے کا خطرہ ہے اسی لیے میں تمہیں دریا کے راستے سفر کرنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔"

اس کے بعد سیٹھ جبار نے تفصیل کے ساتھ ندیم کو سمجھایا کہ وہ کس طرف سے ہو کر جل دھارا کے جنگل میں پہنچ سکے گا اور کونسا راستہ اس کے لیے محفوظ ہوگا۔ اس نے ندیم کو خاص طور پر ہدایت کی کہ وہ دن کے وقت ہرگز سفر نہ کرے۔ صرف رات کے اندھیرے میں سفر کرے۔ ندیم نے سیٹھ جبار کے ساتھ بیٹھ کر رات کا کھانا کھایا اور چائے پی۔ سگریٹ پھونکا۔ اس نے مزید ہدایات حاصل کیں اور پھر چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ سیٹھ جبار کا ڈرائیور جیپ میں اس کے ساتھ آیا تھا۔ جیپ مال گودام سے کچھ دور ایک نالے کی ڈھلان کے قریب کھڑی تھی۔ سیٹھ جبار کہنے لگا۔

"میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ میری جیپ کہاں کھڑی ہو گی۔ ڈرائیور کو سب معلوم ہے کہ تمہیں کس جگہ اتارنا ہے۔ وہاں سے آگے تمہیں کہاں جانا ہوگا یہ بھی تمہیں بتا دیا گیا ہے۔ اب میں تمہیں خدا کے سپرد کرتا ہوں۔"

اس نے ندیم کو گلے لگا کر اسے دعا دی اور دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ میدان صاف ہے تو اس نے ندیم کو نکل جانے کا اشارہ کیا۔ ندیم جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے کندھوں کو جھکائے سر نیچے ڈالے تیزی سے کوٹھری میں سے نکل کر نالے کی طرف اندھیرے میں چل دیا۔ اب شام کا اندھیرا رات کی تاریکی میں گھل مل گیا تھا۔

دور کلکتہ شہر کی عمارتوں اور کارخانوں میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ کسی قریبی کارخانے کے انجن میں سے بھاپ کے خارج ہونے کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ ندیم کو اندھیرے میں نالے کے پل کی دوسری جانب ڈھلان کے قریب جیپ کھڑی نظر آئی۔ سیٹھ جبار کا رازدار ڈرائیور پہلے ہی سے سیٹ پر تیار بیٹھا تھا۔ ندیم کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس نے انجن اسٹارٹ کر دیا۔

اور تھوڑی دیر بعد جیپ اس علاقے سے نکل کر دریائے ہگلی کے جنوب کی طرف پوری رفتار پر بھاگی جا رہی تھی۔ ندیم کلکتہ کے اس علاقے سے کسی حد تک واقف ہو گیا تھا۔ جیپ شہر کی روشنیاں اور آبادی پیچھے چھوڑتی جا رہی تھی۔ جیپ پر کینوس کی چھت پڑی تھی اور کینوس کا دروازہ بھی بند تھا۔ اس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ جس میں سڑک کے کنارے درخت پیچھے بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ یہ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ سامنے سے آتا ہوا ایک ٹرک تیزی سے نکل گیا۔ ڈرائیور خاموش تھا۔ ندیم بھی خاموش تھا۔ دور بائیں جانب کسی بڑی سڑک کے کنارے لگے کھمبوں کی روشنیاں پیچھے جا رہی تھیں۔ پھر یہ روشنیاں غائب ہو گئیں۔ اب جیپ کھیتوں سے گزر رہی تھی۔ سڑک کی دونوں جانب دھان کے کھیت تھے جن کی مرطوب خوشبو ندیم کو صاف محسوس ہو رہی تھی۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے لسے دھان کے کھیت سیاہ دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک ریل کا پھاٹک آ گیا۔ پھاٹک بند تھا۔ ڈرائیور نے بڑبڑاتے ہوئے جیپ ایک طرف کھڑی کر کے روشنیاں بجھا دیں۔ وہ بولا۔

"تم باہر مت نکلنا۔ میں جا کر پتہ کرتا ہوں گاڑی آنے میں کتنی دیر ہے۔"

ڈرائیور جیپ سے اتر کر پھاٹک کے قریب جو چھوٹی سی کوٹھڑی تھی اس کی طرف بڑھا۔ کوٹھڑی کے باہر لالٹین جل رہی تھی۔ ندیم کا جی سگریٹ پینے کو چاہا مگر جیپ میں ماچس کی روشنی کرنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ ندیم جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے خاموش بیٹھا عقابی نگاہوں سے بند پھاٹک کی طرف دیکھتا رہا۔ اتنے میں دور سے ریل کے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ ڈرائیور اندھیرے میں جیپ کی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا "گاڑی آ گئی ہے مال گاڑی ہے بڑے ڈبے ہوں گے۔ ذرا پہلے آتے تو نکل گئے ہوتے" ٹرین دھڑ دھڑاتی شور مچاتی گزر گئی۔ پھاٹک کھلا اور جیپ ریلوے لائن عبور کر کے ایک بار پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئی۔ اب سڑک دائیں طرف گھوم کر غیر ہموار ویرانے میں سے گزر رہی تھی کبھی ڈھلان آ جاتی اور کبھی ہلکی سی چڑھائی آ جاتی۔ لگتا تھا کہ پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا ہے کافی دیر تک جیپ ان راستوں پر دوڑتی رہی۔ سڑک ایک بار پھر ہموار ہو گئی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دائیں بائیں سڑک کے کنارے سوائے جھاڑیوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی دو گھنٹے کے سفر کے بعد جیپ نے ایک کشادہ ندی پر بنے

ہوئے بانس کے پل کو عبور کیا تو سامنے اونچے اونچے درختوں کا سلسلہ جیپ کی روشنی میں دکھائی دیا۔ یہاں سڑک کچی تھی اور جیپ کو ہلکے ہلکے دھچکے لگنے لگے تھے۔ ہوا مرطوب اور ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس مرطوب ہوا میں ساگوان اور تالابوں میں اُگے ہوئے سنگھاڑوں کی کچی مہک رچی ہوئی تھی۔ آخر درختوں کا یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ جیپ ایک بار پھر میدانی علاقے میں داخل ہو گئی تھی۔ ندیم نے دروازے کے پلاسٹک کے شیشے میں سے جھک کر بائیں جانب دیکھا اسے چھوٹے چھوٹے ٹیلے رات کے اندھیرے میں ایسے نظر آئے جیسے قوی ہیکل ہاتھی سر ڈالے سو رہے ہوں۔ یہ ویرانہ بھی گزر گیا۔ جیپ نے ایک موڑ کاٹا اور ایک زنگ آلود چٹان کی اوٹ میں رک گئی۔ ڈرائیور نے جیپ کی روشنیاں بجھا دیں۔ انجن کے بند ہوتے ہی ندیم کو جنگل کی سنسناہٹ سنائی دینے لگی۔ ڈرائیور نے ندیم کو باہر آنے کے لیے کہا۔ ندیم نے جیپ سے اتر کر دائیں بائیں دیکھا۔ ایک طرف بڑی اونچی چٹان تھی اور دوسری جانب جھاڑیاں ہی جھاڑیاں اگی تھیں۔ سامنے ستاروں کی پھیکی روشنی میں درختوں کے دھندلے ہیولے خاموش کھڑے تھے۔ ڈرائیور نے ان درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سامنے اندھیرے میں جو تمہیں درخت اور ان کے پیچھے ٹیلوں کے سائے دکھائی دیتے ہیں یہ چیتل بن کا علاقہ ہے۔ جل دھارا جنگل یہاں سے کافی آگے جا کر ہے یہ اصلی جنگل نہیں ہے۔ چیتل بن میں زیادہ تر ہرن بارہ سنگے اور نیل گائیں ہوتی ہیں۔ ادھر درندے نہیں ہوتے تمہیں راستے میں ایک جھیل ملے گی۔ اس جھیل کے آگے ایک ندی آئے گی۔ جب تم ندی پار کرو گے تو اونچے نیچے ٹیلوں کا علاقہ شروع ہو جائے گا۔ ان ٹیلوں کے پار جل دھارا جنگل آتا ہے۔ وہی تمہاری منزل ہے۔ یہ علاقہ تم راتوں رات پار کر جاؤ تو اچھا ہے۔ کیونکہ یہاں دن کے وقت فاریسٹ محکمے کے گارڈ نظر آ جاتے ہیں اس کے آگے بے شک دن میں بھی سفر کر لینا۔ جل دھارا جنگل میں رات کو سفر مت کرنا کیونکہ وہاں رات کو شیر چیتے شکار کی تلاش میں نکل آتے ہیں۔ اچھا خدا حافظ۔"

ڈرائیور نے ندیم کو خدا کے حوالے کیا اور جیپ واپس گھما کر جدھر سے آیا تھا ادھر کو چل دیا کچھ دیر تک جیپ کے انجن کی آواز سنائی دیتی رہی پھر یہ آواز غائب ہو گئی اور ندیم کو جنگل کے

سناٹے نے گھیر لیا۔ جنگل میں صرف درخت درندے اور حشرات الارض ہی نہیں ہوتے۔ جنگل میں ایسے ایسے بھید چھپے ہوتے ہیں کہ جو آج تک انسان کی سمجھ میں نہیں آ سکے۔ رات کے وقت جنگل ایک آسیب بن جاتا ہے جس کے اندھیرے میں نظر نہ آنے والی روحیں سرگوشیاں کرتی سنائی دیتی ہیں۔ ہر درخت میں سے کسی آسیب کی سرخ آنکھیں جھانکتی نظر آتی ہیں۔ ندیم کو اس سے پہلے جنگل کی راتوں کا تھوڑا بہت تجربہ ہو چکا تھا اس کے سامنے دو مشن تھے ایک تو اسے اپنے آپ کو قانون کی نگاہوں سے چھپانا تھا اور دوسرے نجمی کو خونی ڈاکوؤں کے قبضے سے چھڑا کر لانا تھا۔ نجمی کی محبت اور اس کو بچا کر لانے کے جذبے نے ندیم کے سینے میں ایک نئی طاقت بھر دی تھی۔ اسے اپنے اندر اتنی طاقت محسوس ہو رہی تھی کہ وہ کسی بدروح کو تو کیا کسی بڑے سے بڑے پہاڑ سے بھی ٹکرا کر اسے ریزہ ریزہ کر سکتا تھا۔ اس نے خدا کا نام لیا اور چیتل بن کے درختوں کی طرف چل پڑا۔ اندھیرے اور سناٹے میں درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ہوا بالکل بند تھی درختوں کے نیچے ایک چھوٹا سا جنگلی راستہ آگے کو جا رہا تھا ندیم اس راستے پر چلنے لگا۔ شروع شروع میں اسے اندھیرے میں چلتے وقت دشواری پیش آ رہی تھی لیکن تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں اور اسے ہر شئے کا دھندلا خاکہ نظر آنے لگا۔ جس جنگلی راستے پر ندیم چل رہا تھا وہ کوئی قدرتی پگڈنڈی نہیں تھی بلکہ صاف لگ رہا تھا کہ فاریسٹ ڈیپارٹمنٹ والوں کا بنایا ہوا راستہ ہے۔ ندیم کو ڈرائیور کی ہدایت یاد آ گئی کہ چیتل بن میں محکمہ جنگلات والوں کے گارڈز وغیرہ بھی ہوتے ہیں تاکہ رات کو کوئی جنگل سے درخت وغیرہ کاٹ کر نہ لے جائے۔ ندیم راستے سے اتر کر درختوں کے نیچے سے ہو کر گزرنے لگا۔

یہ درخت زیادہ تر ساگوان کے تھے اور ان کے تنوں میں سے عجیب سی بھینی بھینی ٹھنڈی مہک اٹھ رہی تھی اسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں سے کوئی سانپ نہ نکل آئے۔ سانپ کا خیال آتے ہی ندیم دوبارہ جنگل کے راستے پر آ گیا۔ یہاں درختوں کی شاخیں اوپر جا کر ایک دوسری سے مل گئی تھیں اور ستارے بالکل دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کافی دیر تک چلتے رہنے کے بعد ایک چھوٹی سی جھیل آ گئی یہاں ایک ہرن اندھیرے میں ایک طرف کو ڈر کر بھاگ گیا ندیم جھیل کے کنارے کنارے وہاں سے آگے نکل گیا۔ اب پھر جنگل شروع ہو گیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد ایک ندی آ گئی اس ندی پر

بانس کا چھوٹا سا پل بنا ہوا تھا ندیم ندی کی دوسری طرف آیا تو یہاں درختوں کا گھنا پن تقریباً ختم ہو گیا تھا آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے دکھائی دینے لگے تھے اور آس پاس چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا ندیم کو ان ٹیلوں کے پار جانا تھا کیونکہ جل دھارا کا خطرناک جنگل ان ٹیلوں کے پار تھا اور وہیں مان سنگھ ڈکیٹ کی خفیہ کمین گاہ تھی اب ندیم چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ یہاں پر محکمے والوں کی سڑک ختم ہو گئی تھی۔ ندیم ایک جگہ بیٹھ گیا اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر اس طرح آگے ہاتھ رکھ کر سلگایا کہ دور سے ماچس کا شعلہ نظر نہ آئے۔ سگریٹ پینے سے اس کی تھکان کافی حد تک دور ہو گئی۔ سگریٹ جھاڑیوں میں پھینک کر وہ اٹھا اور ٹیلوں کے درمیان سے ہو کر آگے چل پڑا۔ ٹیلوں کا سلسلہ زلف دراز کی طرح ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ رات ڈھلنے لگی تھی آسمان پر ستاروں نے جھلملانا شروع کر دیا تھا۔ سات ستاروں کی ٹولی آسمان کے وسط سے گزر کر مغرب کی طرف جھک گئی تھی۔ پھر مشرق کی طرف افق پر نیلی روشنی کا غبار سا نمودار ہو گیا۔ یہ صبح کاذب کی اولین جھلکیاں تھیں۔ ندیم نے اردگرد نگاہ ڈالی ٹیلے اور ٹیکریاں ختم ہو رہی تھیں اور دور اسے گھنے درختوں کی سیاہ گہری لکیر نظر آنے لگی۔ یہی جل دھارا کا خطرناک اور دشوار گزار جنگلی سلسلہ تھا جہاں درندوں اور شیر، چیتوں کا خطرہ موجود تھا۔ ندیم نے جیکٹ کے بٹن کھول دیئے تھے اسے پسینہ آ رہا تھا۔ وہ ایک جھاڑی کے پاس اندھیرے میں کچھ دیر سستانے کے لیے بیٹھ گیا مشرق کی جانب سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلنے لگے تھے ان جھونکوں میں گھنے جنگلوں کی مرطوب گہری خوشبو تھی۔ آسمان پر نیلی روشنی کی لہریں سی پھیل رہی تھیں۔ پو پھٹ رہی تھی۔ نیم روشن نیلے مشرقی آسمان کے پس منظر میں دور جل دھارا جنگل کے درختوں کی قطار گہری ہو کر ابھر آئی تھی۔ صبح کی سلیٹی رنگ کی دھندلی روشنی کا غبار چاروں طرف اتر آیا تھا۔ ندیم اٹھا اور جل دھارا جنگل کے درختوں کی طرف چل پڑا۔ ان درختوں کے پیچھے نجمی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

٭٭٭

سورج درختوں کے اوپر آگیا تھا۔ جب ندیم اس سارے جنگل میں داخل ہو گیا۔ اس جنگل کے درخت اتنے گھنے اور گنجان تھے کہ ان کے نیچے دھوپ کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہر طرف قدرتی جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس کی بہتات تھی یہاں کوئی پگڈنڈی نہیں تھی۔ ندیم اپنے ذہن میں ایک سیدھ بنا کر جھاڑیوں کے درمیان اونچی گھاس میں سے گزرنے لگا۔ گھاس کہیں اس کی کمر تک آجاتی اور کہیں اس کے گھٹنوں تک پہنچ رہی تھی شبنم کی وجہ سے گھاس گیلی تھی۔ اس گھاس میں چلنا دشوار تھا۔ ندیم کو ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے میں پون گھنٹہ لگ گیا۔ خدا خدا کر کے اونچی گھاس کا سلسلہ ختم ہوا۔ یہاں زمین نیم پتھریلی اور غیر ہموار تھی۔ ذرا کھلی جگہ آئی تو سامنے اونچے ٹیلوں کے درمیان ایک گھاٹی بل کھاتی چلی گئی تھی۔ ایک تالاب کے کنارے دلدل میں ندیم کو مختلف جنگلی جانوروں کے پاؤں کے نشان نظر آئے۔ ان میں شیر کے پنجوں کے نشان بھی تھے۔ ندیم محتاط ہوگیا۔ اسے یوں لگا جیسے شیر وہیں کسی درخت کے پیچھے چھپا اسے دبوچ لینے کو بے تاب ہے اس نے گھوم کر کچھ فاصلے پر کھڑے ساگوان ناریل اور دیودار کے درختوں کو دیکھا۔ ان درختوں پر کچھ پرندے چہچہا رہے تھے۔ گھاٹی پیچھے رہ گئی۔ ایک بار پھر درخت قریب قریب آگئے۔ دوپہر تک اس دشوار گزار خطرناک جنگل میں اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان ندیم کا سفر جاری رہا۔ پھر وہ ایک چھوٹے سے قدرتی چشمے کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ تھکن سے چور ہو گیا تھا۔ اسے بھوک بھی لگ رہی تھی چشمے کے پانی سے اس نے بوٹ اتار کر اپنے پاؤں دھوئے۔ منہ ہاتھ صاف کیے اور کینوس کے تھیلے میں سے ڈبل روٹی کے کچھ ٹکڑے نکال کر مچھلی کے ساتھ کھائے۔ پانی پیا اور سگریٹ سلگا کر سامنے والے ٹیلوں کو تکنے

لگا جن کی چوٹیوں پر درخت چھتریوں کی طرح کھڑے تھے۔ یہاں درختوں کے چھدرے ہونے کی وجہ سے دھوپ کہیں کہیں پھیلی ہوئی تھی۔ ندیم کے سامنے کچھ دو تین ٹیلے اپنی چوٹیوں پر درختوں کی چھتریاں تانے کھڑے تھے۔ ان میں سے کسی ٹیلے میں مان سنگھ ڈاکو کی خفیہ کمین گاہ تھی جہاں نجمی قید تھی۔ وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ کس ٹیلے کی طرف رُخ کرے۔ آدھے گھنٹے تک ندیم چشمے کے کنارے بیٹھا یہی سوچتا رہا کہ اسے کس طرف چلنا چاہیئے۔ وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا تو بوٹ پہن کر اٹھا اور سامنے والے ٹیلے کی طرف چلنے لگا۔ یہاں کھیت کہیں نہیں تھے۔ درخت جھاڑیاں اور جنگلی گھاس کے سوا اور کچھ نہیں تھا اب کہیں کہیں باغ کے درختوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ چلتے چلتے ندیم کو سہ پہر کا وقت آگیا۔ ایک جگہ جھاڑیوں میں ندیم کو بارش کی وجہ سے سیاہ پڑ چکی برجی نظر آئی۔ یہ برجی ایک چبوترے پر بنی ہوئی تھی۔ اور چبوترے کے ٹوٹے ہوئے فرش پر جگہ جگہ گھاس اُگ آئی تھی۔ یہ برجی کسی کی مڑھی لگ رہی تھی۔ کیونکہ برجی کے اندر مڑھی کا گول نشان بنا ہوا تھا۔ خدا جانے اس جنگل میں کس کی ہڈیاں دفن تھیں۔ ندیم برجی کے چبوترے پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور سوچنے لگا کہ کیا وہ ٹھیک راستے پر جا رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ ڈاکوؤں کے علاقے میں داخل ہو چکا ہو اور کسی طرف سے اچانک کوئی ڈاکو اس پر رائفل سے فائر کر دے۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ چبوترے سے اتر کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ چبوترے پر وہ دور سے دیکھا جا سکتا تھا۔ چبوترے کی دیوار بھی ٹوٹی ہوئی تھی اور اس میں بھی گھاس اُگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہاں سستانے کے بعد ندیم اٹھا اور ٹیلے کی طرف گھاس میں چلنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ گھاس میں سے ایک پگڈنڈی سی ابھرنے لگی ہے۔ کچھ دور چلنے پر یہ پگڈنڈی واضح ہو کر سامنے آگئی۔ پگڈنڈی اس بات کی علامت تھی کہ یہاں کوئی آبادی موجود ہے اور لوگ اس پگڈنڈی پر آتے جاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس جنگل میں انسانی آبادی کہاں سے آگئی تھی؟ ندیم نے جھک کر پگڈنڈی کو غور سے دیکھا، پگڈنڈی پر گھاس ہی گھاس تھی جو انسانی پاؤں سے کچلے جانے سے زرد پڑ چکی تھی۔ ندیم چوکس اور محتاط ہو گیا اس نے پتلون کی اس جیب میں ہاتھ ڈال لیا جس میں بھرا ہوا پستول پڑا تھا۔ احتیاط کے طور پر وہ پگڈنڈی سے اتر کر درختوں کے درمیان چلنے لگا۔ پگڈنڈی کوئی ایک فرلانگ آگے جا کر

جنگل میں ایسی جگہ پر جا کر ختم ہو گئی جہاں بہت سے درخت کٹے ہوئے پڑے تھے۔ ندیم رک گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ جنگل میں یہاں کٹائی کا کام ہو رہا ہے۔ اس وقت وہاں کوئی مزدور نظر نہیں آ رہا تھا۔ ندیم وہاں سے ہٹ کر دوسری طرف نکل گیا۔ اوپر سے بانس اور جھاڑیوں کے جھنڈوں کا چکر کاٹ کر وہ کٹائی والی جگہ سے آگے نکل آیا۔ اگر یہاں جنگل میں کٹائی ہو رہی تھی تو مزدوروں کی جھونپڑیاں بھی کہیں نہ کہیں ضرور ہوں گی۔ ندیم سوچ کر پھونک پھونک کر قدم اٹھانے لگا۔ وہ چاروں طرف غور سے دیکھتا جا رہا تھا ابھی تک اسے کوئی جھگی یا کھپریل کی جھونپڑی دکھائی نہیں دی تھی۔ اس نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کٹائی کے لیے مزدور دور کسی گاؤں سے آتے ہوں۔ چلتے چلتے وہ ایک چھوٹی سی ندی پہ آ گیا۔ ندی کا پانی بڑے سکون سے بہہ رہا تھا۔ کنارے پر بانس کے درخت تھے جن کی ہری بھری شاخیں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ندیم ندی کے کنارے بیٹھ گیا۔ اس نے منہ پر چھینٹے مارے، ٹھنڈے پانی کے کچھ گھونٹ پیئے اور کینوس کا تھیلا کاندھے سے لٹکائے ندی کے ساتھ ساتھ مشرق کی طرف چل پڑا۔ درختوں کے سائے گھنے اور ٹھنڈے تھے۔ کہیں کہیں دھوپ کا چھوٹا سا سفید ٹکڑا دکھائی دے جاتا تھا۔ سورج مغرب میں کافی نیچے اتر گیا اور بہت جلدی درختوں کے سائے گہرے ہو گئے۔ دھوپ مغرب میں سمٹ گئی تھی۔ درختوں کے اوپر ضرور غروب آفتاب کی نارنجی روشنی ہو گی۔ مگر درختوں کے نیچے سائے اندھیروں میں ڈھلنا شروع ہو گئے تھے۔

اپنے اندازے کے مطابق ندیم تیسرے ٹیلے کے دامن میں پہنچ چکا تھا۔ اب وہ چلتے چلتے رک کر اردگرد کا جائزہ لے لیتا تھا۔ ندی دائیں جانب جنوب کی طرف مڑ گئی۔ ندیم نے ندی کو چھوڑ دیا اور سامنے درختوں میں آ گیا۔ ان درختوں کے نیچے بھی ایک پگڈنڈی سی بنی ہوئی تھی۔ ندیم پگڈنڈی کے کنارے کنارے آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ جنگل میں شام بڑی جلدی پڑ جاتی ہے اور شام کے پڑنے کے ساتھ ہی رات بھی ہو جاتی ہے۔ اس جنگل میں بھی ایسا ہی ہوا جونہی شام کے سائے درختوں میں اترے اس کے تھوڑی ہی دیر بعد درختوں میں رات کا اندھیرا پھیل گیا اور وہ پرندے جو کچھ دیر پہلے درختوں پر چہچہا رہے تھے، ایکدم سے چپ ہو گئے ایک ڈراؤنا سناٹا چاروں طرف جنگل میں چھا گیا۔ ندیم کو اس اندھیرے میں بھی درختوں کے

خاکے نظر آ رہے تھے۔ وہ ان کے بالکل قریب سے ہو کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اب اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں کسی خونخوار جنگلی درندے سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ یہاں وہ گولی کا دھماکہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کمانی دار چاقو اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ لیکن شیر یا چیتے کے مقابلے میں یہ چاقو کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ ندیم ایک جگہ رک کر آنکھیں پھاڑے چاروں طرف غور سے دیکھنے لگا کہیں وہ راستے سے بھٹک کر کسی دوسری طرف تو نہیں نکل آیا؟ جنگل کہیں ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اب تک ٹیلے کے دامن میں وہ راستہ اسے مل جانا چاہیئے تھا جو اوپر ڈاکو مان سنگھ کی خفیہ کمین گاہ کو جاتا تھا۔ جنگل کا ماحول رات پڑتے ہی ڈراؤنا ہو گیا تھا۔ ندیم کے دل میں جنگل کا کوئی ڈر یا خوف نہیں تھا اس لیے کہ اس کے دل میں نجمی کی محبت کا چراغ روشن تھا اور وہ اس محبت پر اپنی جان قربان کرنے سے پہلے مان سنگھ ڈاکو کے پنجے سے نجمی کو نکال لانے کا عزم کیے ہوئے تھا....

اچانک اس کے کان کھڑے ہوئے اسے کسی عورت کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ بنگلہ زبان میں جیسے کسی سے التجائیں کر رہی تھی۔ اس آواز میں آنسوؤں کا درد بھی شامل تھا۔ ندیم جدھر سے آواز آئی تھی ادھر گھور کر دیکھنے لگا۔ اب اسے ایک مرد کی آواز بھی سنائی دی جس میں جبر اور تشدد کا انداز تھا اس کے ساتھ ہی ایک دوسرے مرد کی آواز بھی آئی جو ہندی زبان میں رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ یہ قصہ کیا ہے؟ ندیم کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پھر اندھیرے میں اس نے سامنے والے درختوں کے پیچھے ایک انسانی سائے کو ابھرتے دیکھا۔ ندیم نے جلدی سے چاقو جیب میں رکھ کر پستول نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انسانی سایہ اب قریب آ گیا تھا وہ ایک عورت کو پکڑے گھسیٹ رہا تھا اور اسے ہندی میں گالیاں بھی دے رہا تھا اس کے پیچھے چند قدم کے فاصلے پر ایک اور انسان چلا آ رہا تھا جو بار بار کہہ رہا تھا ’’میری بیٹی پر رحم کرو میری بیٹی کو چھوڑ دو۔ میں تمھارے پاؤں پڑتا ہوں۔‘‘ جو آدمی لڑکی کو گھسیٹے لیے جا رہا تھا وہ اونچا لمبا تھا اور اندھیرے میں اس کے کاندھے سے لٹکی ہوئی رائفل ندیم کو صاف نظر آ رہی تھی وہ ندیم سے چند قدموں کے فاصلے پر سے درختوں کے قریب سے لڑکی کو گھسیٹتے ہوئے اسے گالیاں دیتا گزر گیا۔ وہ کچھ لڑکھڑا بھی رہا تھا صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس نے پی رکھی ہے۔ لڑکی کا باپ ہاتھ جوڑے پیچھے پیچھے فریاد کرتا آ رہا تھا۔ ایک دم سے اونچا لمبا رائفل والا آدمی رک گیا۔ اس نے لڑکی کا

بازو چھوڑ دیا اور پیچھے آ کر لڑکی کے باپ کے منہ پر زور سے مکّا مار کر اسے گندی گالی دی بوڑھا گر پڑا۔ رائفل والا آدمی سہمی ہوئی سسکیاں بھرتی لڑکی کو کھینچتا ہوا آگے لے گیا اور درختوں جھاڑیوں کے اندھیرے میں گم ہو گیا ندیم یہ خاموشی سے دردناک ڈرامہ دیکھتا رہا۔ جب رائفل والا آدمی اندھیرے میں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو ندیم نے پستول جیب میں ڈالا اور آہستہ سے درخت کے پیچھے سے نکل کر اس جگہ آیا جہاں جھاڑیوں میں بوڑھا گھاس پر ایک طرف کو گرا ہوا نیم بے ہوشی کے عالم میں اپنی بیٹی کو آہستہ آہستہ کراہتے ہوئے پکار رہا تھا "عائشہ عائشہ۔ یا اللہ میری بیٹی کی عزت بچا لے۔" یہ کوئی مسلمان بنگالی مزدور تھا جو شاید جنگل میں کٹائی کے کام پر لگا تھا۔ ندیم نے جھک کر اس کے سر کو اپنے زانو پر رکھتے ہوئے اسے غور سے دیکھا اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ ندیم نے آہستہ سے کہا۔

"بابا! یہ کون آدمی تھا جو تمہاری بیٹی کو لے گیا ہے؟" بوڑھے مسلمان بنگالی نے آنکھیں کھول کر تاریکی میں ندیم کی طرف دیکھا اور کراہتے ہوئے عاجزی سے کہا "بیٹا میری بچی کو اس ڈاکو سے بچا لے میری بیٹی معصوم ہے وہ میرے ساتھ پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہے۔ تم مسلمان ہو تو اللہ کے نام پر میری مدد کرو"۔... ندیم کا خون ایکدم گرم ہو گیا۔ اس کے بازوؤں کی جوان مچھلیاں پھڑکنے لگیں۔ لڑکی کا باپ کراہتے ہوئے کہہ رہا تھا "وہ ہندو ڈاکو ہے میری بچی حافظ قرآن ہے یا اللہ تو ہی میری بچی کی عزت کا رکھوالا ہے۔" اور بوڑھے نے رونا شروع کر دیا۔ ندیم نے اس پر جھکتے ہوئے پوچھا "بابا! اللہ پہ بھروسہ رکھو وہی عزتوں کا محافظ ہے۔ مجھے بتاؤ یہ ہندو ڈاکو تمہاری بچی کو کہاں لے گیا ہے وہ" مسلمان بنگالی بوڑھے نے ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا "جنگل میں آگے لکڑیوں کا گودام ہے وہ اسے وہیں لے گیا ہے۔ وہ روز رات کو ہماری جھگیوں میں سے ایک لڑکی کو وہیں لے جاتا ہے۔" یہ کہہ کر بوڑھا سسکیاں بھرنے لگا۔ ندیم نے اس کو آہستہ سے اٹھا کر بٹھا دیا اور دھیمی آواز میں کہا "بابا! اسی جگہ بیٹھے رہنا میں تمہاری بیٹی کو لے کر ابھی آتا ہوں۔ آواز بالکل نہ نکالنا۔" ندیم بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور جس طرف ہندو ڈاکو گیا تھا اسی طرف دوڑ پڑا۔ وہ جھک کر ایک ایسے شیر کی طرح تیز تیز دوڑ رہا تھا جس نے اپنے دشمن کو اندھیرے میں دیکھ لیا ہو۔ جھاڑیاں جگہ جگہ اس کا راستہ روک رہی تھیں ان جھاڑیوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے

آواز پیدا ہو رہی تھی۔ ندیم جھاڑیوں کو چھوڑ کر دیودار کے درختوں میں سے ہو کر تیز تیز چلنے لگا۔ ایک جگہ درخت چھدرے ہو گئے تھے یہاں اسے ایک جھگی نظر آئی اس کے باہر بھی کٹے ہوئے درخت ایک طرف پڑے تھے۔ ندیم نے پستول کی جگہ کمانی دار چاقو ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ندیم بھی یہاں گولی کا دھماکہ نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ ڈاکو مان سنگھ کی خفیہ کمین گاہ وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے اور یہ ہندو مان سنگھ کا ہی کوئی آدمی ہے جو لکڑی کا کام کرنے والے غریب مزدوروں کی عزتوں کو لوٹتا پھرتا ہے ندیم جھکا جھکا احتیاط سے قدم اٹھاتا جھگی کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ جھگی کی دیوار لکڑی کی تھی یہ درخت کے تنوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی اور اوپر بانس کی شاخوں کی ڈھلوان چھت پڑی تھی۔ جھگی کے اندر سے لڑکی کے سسکیاں بھرنے اور کبھی بنگلہ اور کبھی ہندی زبان میں التجائیں کرنے کی دردناک آوازیں آ رہی تھیں اس کے ساتھ ہی ہندو ڈاکو کی گالیاں دینے کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ ندیم اندھیرے میں لکڑی کی دیوار کے ساتھ کھسکتا ہوا دوسری طرف آ گیا۔ وہ دروازے کی تلاش میں تھا۔ دروازہ اسے مل گیا۔ اس کے پاس سوچنے کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا۔ اس کے اندر اتنی طاقت آ گئی تھی کہ وہ ٹکر مار کر جھگی کو تہس نہس کر سکتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک حافظ قرآن، نمازی پرہیزگار لڑکی ایک کافر کے پنجے میں پھنسی رو رو کر التجائیں کر رہی تھی۔ کمانی دار کھلا چاقو ندیم کی مضبوط گرفت میں تھا اس کو اور تو کچھ نہ سوجھا۔ اس نے چاقو کے دستے سے لکڑی کے بند دروازے پر دو تین بار ٹھک ٹھک کی اور پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ بالکل سیدھا لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اندر سے ہندو ڈاکو کی غراہٹ نما آواز بلند ہوئی "کون ہے بے"؟ اس نے گالی دے کر پوچھا تھا ندیم نے ایک بار پھر چاقو کا دستہ دروازے پر مارا۔ چاقو پر ندیم کی گرفت مزید مضبوط ہو گئی تھی۔ ہندو ڈاکو نے ایک اور گالی دی اور بولا "پہلے تیری خبر لے لوں۔" جبکہ چاقو پر ندیم کی گرفت مزید مضبوط ہو گئی تھی۔ اس کی کلائی میں فولاد ایسی طاقت سرایت کر گئی تھی۔ ندیم نے اپنا سانس روک لیا۔ اسے اندر سے دروازے کی زنجیر کھلنے کی آواز سنائی دی۔ پھر دروازہ کھلا اور اندھیرے میں سب سے پہلے ندیم نے رائفل کی نالی کو دیکھا پھر اونچا لمبا ہندو ڈاکو کا سایہ دروازے سے باہر نکلا وہ کچھ لڑکھڑا رہا تھا۔ ایک بجلی سی ندیم کی آنکھوں کے آگے چمک گئی۔ وہ شیر کی

طرح جھپٹا اور دوسرے لمحے کمانی دار چاقو کا پانچ اینچ لمبا پھل ہندو ڈاکو کی بیٹھ میں گھس گیا۔ ہندو ڈاکو کے ہاتھ سے رائفل گر گئی۔ ندیم نے چاقو کھینچ کر باہر نکالا اور دوسرا وار کر دیا۔ ہندو ڈاکو منہ کے بل آگے زمین پر گر پڑا۔ چاقو ابھی تک اس کی پشت میں ہی تھا ندیم نے لپک کر چاقو کو کھینچ لیا پھر اس کی رائفل کو اٹھا کر ایک طرف پھینکا اور جھک کر ہندو ڈاکو کو دیکھا چاقو کا دوسرا وار اس درندہ صفت آدمی کے دل کو کاٹ چکا تھا اس کا منہ کھلا تھا اور حلق سے خرخراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ندیم نے اس کو مرنے کے لیے وہیں چھوڑ دیا اور خود جھگی میں گھس گیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ اس نے آہستہ سے آواز دی" عائشہ بہن! ڈرو نہیں تمھیں کوئی کچھ نہیں کہے گا" اب اسے لڑکی کے سسکیاں بھرنے کی آواز سنائی دی۔ ندیم نے اندھیرے میں غور سے دیکھا ایک لڑکی جھلنگا سی بانس کی چارپائی کے کونے میں سمٹی بیٹھی اپنے جسم کو دھوتی سے چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے سسکیاں بھر رہی تھی۔ ندیم نے آگے بڑھ کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا اور کہا" میری بہن گھبراؤ نہیں اٹھو تمھارا بابا باہر ہے میرے ساتھ آؤ"۔ مصیبت میں گھری ہوئی لڑکی کو کوئی بہن کہہ کر پکارے تو اس کے اندر ایک عجیب سی طاقت آجاتی ہے۔ عائشہ چارپائی سے اتر کر ندیم کے قریب آکر زمین پر بیٹھ گئی۔ ندیم دروازے کے پاس چلا گیا۔ ہندو ڈاکو کی لاش اسی طرح اندھیرے میں زمین پر اوندھی پڑی تھی۔ ندیم نے پیچھے مڑ کر لڑکی کو آہستہ سے آواز دی" دیر نہ کرو بہن میرے ساتھ آؤ"۔ لڑکی نے دھوتی سے اپنے جسم کو اچھی طرح چھپا لیا تھا وہ اٹھی اور ندیم کے پاس آگئی۔ ندیم نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے جھگی سے باہر لے آیا۔ لڑکی کا ہاتھ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ لڑکی نے باہر زمین پر ہندو ڈاکو کی لاش کو اندھیرے میں پڑے دیکھا تو ندیم کے ساتھ لگ گئی۔ ندیم نے چاقو لاش کے کپڑوں سے صاف کر کے بند کر کے جیب میں رکھ لیا تھا اس نے ہندو ڈاکو کی رائفل اٹھا کر لاش کے پاس ہی رکھ دی اور لڑکی کو ساتھ لے کر جھاڑیوں اور درختوں میں سے ہوتا اس جگہ پر آگیا۔ جہاں اس کا باپ اندھیرے میں بیٹھا دھوتی سے اسے ہونٹوں سے بہتا ہوا خون پونچھ رہا تھا۔ اپنی بیٹی کو دیکھ کر وہ اٹھا۔ لڑکی باپ کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ ندیم نے کہا" بابا میں بھی مسلمان ہوں اللہ نے تمھاری بیٹی کی عزت بچالی ہے اب مجھے بتاؤ تم کہاں جانا چاہتے ہو؟"

بوڑھے مسلمان بنگالی نے ندیم کے پاؤں پکڑ لیے۔ ندیم نے اسے کندھوں سے تھام کر اٹھایا اور کہا" بابا! اللہ نے تمھاری عزت ہندو کافر سے بچائی ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرو میں نے کچھ نہیں کیا"۔ بوڑھے نے ڈری ہوئی آواز میں پوچھا کہ "ڈاکو کدھر گیا؟" ندیم نے کہا" اس کی لاش جھگی کے باہر پڑی ہے میرے ساتھ آؤ ہمیں اس کی لاش کو ٹھکانے لگانا ہے"۔ بوڑھا سہمی ہوئی آواز میں بولا" تم نے اسے مار دیا؟ ڈاکو مان سنگھ ہمیں نہیں چھوڑے گا وہ مجھے اور میری بیٹی کو قتل کر دے گا۔ یا اللہ اب کیا ہوگا؟" ندیم نے بوڑھے کو حوصلہ دیا۔ عائشہ اپنے باپ کے ساتھ سہمی ہوئی ہرنی کی طرح لگی کھڑی تھی۔ ندیم نے کہا" بابا! وہ ہندو کافر تھا ڈاکو تھا تیری حافظِ قرآن بیٹی کی عزت لوٹنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے قتل کر کے ایک مسلمان کا فرض ادا کیا ہے۔ تم گھبراؤ نہیں اگر یہ ڈاکو مان سنگھ کا ساتھی تھا تو کیا ہوا وہ تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا"۔ بوڑھے بنگالی نے ندیم کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا" اس کافر کی لاش کو وہیں پڑا رہنے دو۔ میں اب اپنی جھگی میں نہیں رہ سکتا مجھے راتوں رات اپنی بیٹی کو لے کر یہاں سے نکل جانا ہوگا"۔ ندیم نے پوچھا" تمھاری جھگی کہاں ہے؟"۔ بوڑھے مسلمان بنگالی نے اسے بتایا کہ جنگل میں جو مزدور درختوں کی کٹائی کرتے ہیں انھوں نے یہاں سے قریب ہی اپنی جھگیاں ڈال رکھی ہیں یہ سارے مزدور قریبی دیہات سے مزدوری کرنے وہاں آئے ہوئے ہیں"۔ بوڑھا بنگالی مسلمان ندیم کو ساتھ لے کر پیچھے کی سمت چل پڑا۔ عائشہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی بوڑھا بنگالی جنگل کے تمام راستوں سے واقف تھا وہ جھاڑیوں میں سے نکل کر ایک طرف ہو گیا۔ یہاں چھوٹی سی پگڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ یہ وہی راستہ تھا جہاں سے ہندو ڈاکو لڑکی کو گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ لایا تھا۔ جنگل کی تاریکی میں کوئی ایک فرلانگ چلنے کے بعد ایک تھوڑی سی کھلی جگہ آگئی۔ یہاں ندیم کو اندھیرے میں کچھ جھگیاں بنی ہوئی نظر آئیں جن پر موت ایسا سناٹا طاری تھا۔ بوڑھا ندیم کو کونے والی جھگی میں لے گیا۔ یہاں اندر ایک لالٹین ابھی تک روشن تھی بوڑھے نے جھگی کا دروازہ بند کر دیا جھگی کے اندر بانس کی دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کونے میں مٹی کے کچھ برتن پڑے تھے ایک جانب کلہاڑی اور پرانے کپڑوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ عائشہ چارپائی پر چادر لپیٹ کر بیٹھ گئی۔ وہ ابھی تک ڈری ہوئی تھی۔ بوڑھے نے جلدی جلدی کپڑوں کو اٹھا کر ایک بوری میں ڈالا اور بولا" بیٹا! میں اپنی بیٹی کے ساتھ اب یہاں نہیں رہ سکتا۔ دن نکلتے ہی جب مان سنگھ کو

پتہ چلا کہ اس کا ایک ساتھی ہلاک کر دیا گیا ہے تو وہ یہاں کسی لڑکی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ ساری جھگیوں کو آگ لگا دے گا۔" اب عائشہ بھی اٹھ کر اپنے کپڑے وغیرہ سمیٹنے لگی۔ ندیم خاموش تھا۔ وہ بوڑھے اور اس کی بیٹی کو روک نہیں سکتا تھا۔ وہ انھیں روکنا چاہتا بھی نہیں تھا۔ اس نے کہا "بابا! تم رات کے اندھیرے میں بیٹی کو لے کر کہاں جاؤ گے؟" بوڑھے نے کہا "ہمارا گاؤں یہاں سے دور ہے لیکن میں سب راستوں سے واقف ہوں۔ میں دن نکلنے تک ڈاکوؤں کی پہنچ سے کافی دور نکل چکا ہوں گا۔" ندیم چارپائی پر بیٹھ گیا اور بولا "بابا! ڈاکو مان سنگھ کا ٹھکانہ یہاں سے کتنی دور ہے؟" بوڑھے نے بوری میں دو چار برتن ڈالتے ہوئے کہا "وہ سامنے والے ٹیلے کے اوپر ایک غار میں رہتا ہے مگر وہاں کوئی نہیں جا سکتا۔ ٹھیکیدار مان سنگھ کو ہر ماہ لگی بندھی رقم ادا کرتا ہے تم بھی یہاں سے بھاگ جاؤ۔ تم ہمارے ساتھ چلے چلو۔ تم نے میری بیٹی کی عزت بچائی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے جاؤ۔" ندیم نے جھگی کی بانس کی چھت پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "تمہارا شکریہ بابا لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔" بوڑھے مسلمان بنگالی نے کپڑوں وغیرہ کی بوری اپنے کاندھے پر ڈالی۔ لالٹین کی روشنی گل کر دی۔ جھگی میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ دروازہ کھول کر جھگی کے باہر ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں آ گیا ندیم بھی باہر آ گیا۔ دوسری جھگیوں پر تاریکی اور سناٹا چھایا تھا۔ بوڑھے مسلمان بنگالی نے ندیم کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تو نے میری بیٹی کی عزت بچائی اللہ تجھے اس کا ثواب دے گا۔ میں اب بھی تمھیں کہوں گا کہ میرے ساتھ میرے گاؤں چلے چلو۔ وہاں پولیس چوکی بھی ہے تم کو وہاں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

پولیس چوکی کا سن کر ندیم اور زیادہ محتاط ہو گیا۔ اسے تو ویسے ہی بوڑھے کے ساتھ نہیں جانا تھا۔ اس نے بوڑھے بنگالی سے کہا "تم جاؤ بابا۔ اللہ تمھاری حفاظت کرے۔ میں تمھارے ساتھ نہیں جا سکتا۔" بوڑھا بنگالی واپس مڑا اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑا اور وہ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے درختوں کی تاریکی میں گم ہو گئے۔ ندیم خالی جھگی کے باہر اکیلا رہ گیا۔ اس کھلی جگہ سے اسے سامنے والا ٹیلا دکھائی دے رہا تھا جس کی چوٹی کے پس منظر میں نیلے آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے۔ کینوس کا تھیلا ندیم کے کاندھے سے لٹک رہا تھا پستول ندیم کی پتلون کی جیب میں

اور کمانی دار چاقو اس کی جیکٹ کی جیب میں تھا۔ رات نہ جانے کتنی گزر گئی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ ٹیلے کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ بہت جلد وہ مزدوروں کی جھگیوں سے نکل کر ایک بار پھر گھنے جنگل میں آ گیا۔ اس نے اپنے آپ کو ٹیلے کے رخ پر ڈال دیا تھا اور درختوں کے نیچے سے گزرتا سیدھ میں چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے ہندو ڈاکو کا خیال آ رہا تھا۔ ندیم کے ہاتھوں زندگی کا پہلا قتل ہوا تھا۔ ایک عجیب بات تھی کہ ندیم کو کسی قسم کا ملال یا پچھتاوا نہیں ہو رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس نے ایک حافظ قرآن مسلمان بچی کی عزت بچانے کے لیے ایک کافر کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے میدان جنگ میں اسلام کے لیے جنگ کرتے ہوئے ایک کافر کو جہنم واصل کیا ہو۔ ایک آواز نے ندیم کے قدم پکڑ لیے۔ ندیم وہیں ساکت ہو گیا۔ یہ آواز جنگل کی جنوب کی جانب سے آئی تھی۔ ندیم وہیں ہمہ تن گوش رکا رہا۔ تھوڑی دیر بعد شیر کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ اس بار آواز مزید دور ہو گئی تھی۔ آواز جنوب کی طرف سے آئی تھی اور بوڑھا مسلمان بنگالی اپنی بیٹی کو لے کر جنگل میں مشرق کی جانب گیا تھا۔ ندیم نے ایک بار پھر چلنا شروع کر دیا۔ چلتے چلتے وہ رات کی تاریکی میں ٹیلے کے دامن میں آ کر رک گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر ٹیلے کی چڑھائی کی طرف دیکھا۔ ٹیلے پر چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں چھتریوں کی شکل میں دور اوپر چوٹی تک چلی گئی تھیں۔ ستاروں کی پھیکی دھندلی روشنی میں ان جھاڑیوں میں کہیں کہیں درختوں کے سیاہ دھبوں ایسے جھنڈ بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ندیم نے سوچا کہ اسے راتوں رات ٹیلے کی چڑھائی میں کہیں محفوظ جگہ پر چھپ جانا چاہیے تاکہ ڈاکو مان سنگھ کی خفیہ کمین گاہ کا وہ دن کی روشنی میں جائزہ لے سکے۔ ندیم نے اللہ کا نام لیا اور ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ یہاں کوئی باقاعدہ راستہ یا پگڈنڈی نہیں تھی۔ جس راستے سے ڈاکو آتے جاتے تھے وہ اس طرف نہیں تھا۔ ندیم ادھر جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ کمین گاہ کے عقب کی طرف سے جانا چاہتا تھا۔ چڑھائی زیادہ سیدھی بھی نہیں تھی مگر دشوار گزار ضرور تھی۔ جھاڑیاں کافی اونچی اونچی تھیں اور ان کی شاخیں بری طرح چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ ندیم آہستہ آہستہ اوپر چڑھتا چلا گیا۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ رک گیا اور دم لینے کے لیے ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اس کے اردگرد چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ یہاں سانپ بچھو کا بھی اسے خطرہ تھا۔ جب ذرا اس کا سانس درست

ہوا تو وہ اٹھا اور دوبارہ چڑھائی چڑھنے لگا۔ کسی وقت اسے آسمان پہ چمکتے ستاروں کی جھلک دکھائی دے جاتی تھی۔ اس کے بعد یہ ستارے جھاڑیوں کی اوپر تک پھیلی ہوئی شاخوں میں گم ہو جاتے۔ ایک جگہ ذرا کھلی جگہ آئی تو ندیم نے رک کر اوپر دیکھا۔ ٹیلے کی چوٹی قریب آ گئی تھی۔ ندیم رات کے وقت عدم واقفیت کی وجہ سے مزید خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اسے وہیں کوئی ایسی جگہ تلاش کرنی تھی جہاں وہ چھپ کر دن نکلنے کا انتظار کر سکے۔ وہ گھاس، پتھروں اور جھاڑیوں میں چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ اُسے ایک کچا راستہ دکھائی دیا جو اوپر ٹیلے کی چوٹی تک جاتا تھا۔ ندیم وہیں بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں اسے کچے راستے پر گھوڑوں کے سموں کے نشان نظر نہیں آ سکتے تھے۔ لیکن یہ بات یقینی تھی کہ یہی وہ راستہ تھا جس پر سے ڈاکو اوپر آتے جاتے تھے۔ ندیم اس راستے کے قریب مگر کچھ ہٹ کر کوئی محفوظ جگہ اپنے چھپنے کے لیے بنانا چاہتا تھا۔ وہ کچے راستے کے اوپر سے گزر کر ٹیلے کی اونچی جھاڑیوں میں دوسری طرف آ گیا۔ دوسری طرف کچھ درخت بھی تھے۔ یہاں آتے ہی اسے پانی کے گرنے کی ترل ترل ایسی آواز سنائی دی۔ ندیم پانی کی آواز کی طرف بڑھا۔ چند قدم چلا ہوگا کہ ایک چٹان کی دیوار سے جنگلی بیل چمٹی ہوئی تھی۔ ندیم چٹان کی دوسری طرف آ گیا۔ یہاں اس نے جھک کر دیکھا کہ ایک جگہ پتھروں میں سے پانی کی چھوٹی سی دھار نکل کر نیچے گر رہی تھی۔ نیچے پانی چھوٹے پتھروں میں سے ہو کر تیزی سے ڈھلوان کی طرف بہہ رہا تھا۔ ندیم پتھروں کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ کینوس کا تھیلا اتار کر نیچے رکھا۔ پانی چلّو میں لے کر چکھا۔ پانی میٹھا تھا۔ اس کو پیاس لگ رہی تھی اس نے سب سے پہلے جی بھر کر پانی پیا۔ پھر جیب سے کمانی دار چاقو نکال کر اس پہ ہندو ڈاکو کا لگا ہوا خون دھویا۔ پھر اچھی طرح سے ہاتھ صاف کیے۔ منہ پہ پانی کے دو چار چھینٹے مارے اور کینوس کا تھیلا کاندھے پہ ڈال کر غور سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ کوئی کھوہ تلاش کر رہا تھا جو اسے وہاں کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہاں اندھیرا ابھی کافی گہرا تھا۔ اگر ندیم کی آنکھیں جنگل کے اندھیرے کی عادی نہ ہو گئی ہوتیں تو اسے اتنا کچھ بھی دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔ وہ چٹان کے عقب میں دوسری طرف نکل گیا۔ یہاں ایک جگہ جنگلی جھاڑیاں اندر کو چلی گئی تھیں۔ ندیم ان جھاڑیوں میں گھس گیا۔ آگے اسے تاریک کھوہ نظر آیا۔ ندیم کے پاس ماچس موجود تھی مگر وہ وہاں روشنی کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے آنکھیں پوری کھول

دیں اور غور سے جھک کر کھوہ کو دیکھا۔ پھر زمین پر سے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر کھوہ کے اندر پھینکا۔ پتھر اندر زمین پہ جا کر لگا۔ اس کا مطلب تھا کہ اندر کوئی باؤلی یا کنواں وغیرہ نہیں تھا۔ ندیم یہ بھی اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ اس کھوہ میں کوئی جنگلی درندہ نہ سو رہا ہو۔ اس نے دوسرا پتھر زور سے کھوہ کے اندر پھینکا۔ پتھر کھوہ کی سامنے والی دیوار سے ٹکرا کر زمین پر گر پڑا۔ اب وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا، کھوہ کے اندر تاریکی میں آ گیا۔ اس نے دونوں بازو پھیلا کر اوپر کیے۔ اس کے ہاتھ کھوہ کی چٹانی چھت سے ٹکرائے۔ کھوہ کی چھت اس سے کوئی دو فٹ اونچی تھی۔ اب اس نے دیواروں کو ٹٹولا۔ یہ کھوہ چھوٹی سی تھی اور چھپنے کے لیے بڑی اچھی جگہ تھی۔ ندیم کو کسی ایسی ہی جگہ کی تلاش تھی۔ کم از کم رات کا باقی حصہ وہ اس جگہ گزار سکتا تھا۔ اس نے کینوس کا تھیلا اتار کر زمین پر رکھا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ کھوہ میں ہلکی ہلکی گرمائش تھی۔ جبکہ باہر شبنم کی وجہ سے رات کی فضا خنک تھی۔ ندیم کو یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں کسی طرف سے کوئی سانپ نہ نکل آئے۔ اس نے احتیاط کے طور پر زمین پہ دو تین بار پاؤں مارا کہ اگر آس پاس سانپ بچھو ہو تو وہ اس آواز کی دھمک سن کر وہاں سے بھاگ جائے۔

تھوڑی دیر وہ کینوس کے تھیلے سے ٹیک لگائے چپ چاپ بیٹھا جنگل کی خاموشی کو غور سے سننے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کسی طرف سے کوئی درندہ تو اس طرف نہیں بڑھ رہا۔ ٹیلے کے ڈھلان اور اوپر چڑھائی پر اُگے ہوئے جھاڑیوں کے جنگل میں موت ایسا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس سناٹے میں خاموشی جیسے سنسنا رہی تھی۔ شیر کی آواز بھی اب سنائی نہیں دی تھی۔ ساکت بیٹھے بیٹھے ندیم کو نیند آنا شروع ہو گئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ یہ جگہ چونکہ نسبتاً محفوظ ہے اور ڈاکوؤں کی راہ گزر سے ہٹ کر جھاڑیوں کے اندر واقع ہے۔ اس لیے اسے کچھ دیر آرام کر لینا چاہیئے۔ ندیم وہیں کینوس کا تھیلا سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پہلے تو اسے بالکل نیند نہیں آئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھیں بھاری ہونے لگیں اور پھر اُسے کوئی ہوش نہ رہا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو مچھروں نے کاٹ کاٹ کر اس کا بُرا حال کر دیا تھا۔ ان مچھروں کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی اسے جو چیز سب سے پہلے نظر آئی وہ کھوہ کی چھت کے ساتھ لٹکے ہوئے جالے تھے۔ کھوہ میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ندیم جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

تھیلے کو اس نے پڑا رہنے دیا اور خود کھوہ سے نکل کر جھاڑیوں میں سے گزر کر دبے دبے قدم اٹھاتا آہستہ سے باہر آگیا۔ جنگلی جھاڑیوں اور درختوں میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ چٹان کی دیوار جنگلی بوٹیوں اور زنگار کی وجہ سے گہری سبز ہو گئی تھی۔ وہ چلتے ہوئے چٹان کی اوٹ میں اس جگہ آکر بیٹھ گیا جہاں ذرا نیچے چند قدم آگے پتھروں میں سے پانی کی دھار نکل کر نیچے نالے میں گر رہی تھی۔ ندیم نے دیکھا کہ نالے کا پانی تیزی سے پتھروں سے ٹکراتا ہوا نیچے ڈھلوان کی طرف بہہ رہا تھا۔ اس چٹان کے پیچھے کچا راستہ تھا۔ مگر ندیم اس طرف ابھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے بائیں جانب ٹیلے کی بلندی کی طرف دیکھا۔ ٹیلے کی چوٹی وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ دن کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ وہ ٹیلے کی آدھی سے زیادہ چڑھائی چڑھ چکا تھا۔ وہ چٹان کی زنگ آلود دیوار کے ساتھ لگ کر کھسکتا ہوا اس طرف نکل آیا جدھر کچا راستہ اوپر ڈاکو مان سنگھ کی کمین گاہ کی طرف جاتا تھا۔ راستہ ویران سنسان تھا۔ دونوں جانب جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں جو ٹیلے کے اوپر تک چلی گئی تھیں۔ دھوپ کی روشنی میں ندیم کو کچے راستے پر گھوڑوں کے سموں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے اب اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ ڈاکوؤں کی کمین گاہ اسی ٹیلے کے اوپر ہی تھی اور نجمی بھی اسی ٹیلے کے اوپر کسی جگہ ڈاکوؤں کی قید میں پڑی تھی۔ نجمی کا خیال آتے ہی ندیم کا دل بوجھل سا ہو گیا۔ وہ کچے راستے کی ایک طرف جھاڑی کی اوٹ میں کھڑا ٹیلے کی چوٹی کی طرف دیکھنے لگا۔ اوپر گہری خاموشی تھی۔ کسی جگہ سے دھواں بھی نہیں اٹھ رہا تھا۔ اچانک نیچے جنگل کے دامن کی فضا رائفل کے دھماکوں اور لوگوں کے شور سے گونج اٹھی۔ ندیم دوڑ کر چٹان کے نیچے آ گیا۔ نیچے دامن سے گولیوں کے دھماکے کچھ دیر تک سنائی دیتے رہے۔ لوگوں کا شور اب سنائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر گولیاں چلنے کی آوازیں بھی بند ہو گئیں۔ درختوں پر سے جو پرندے شور مچاتے ہوئے اڑے تھے۔ ان کا شور بھی دب گیا۔ اس کے بعد چاروں طرف ایک سناٹا محیط ہو گیا۔ ندیم سمجھ گیا کہ یہ شور کیسا تھا۔ یقیناً مان سنگھ ڈاکو اور اس کے ساتھیوں کو اپنے ہمراہی ہندو ڈاکو کی لاش مل گئی تھی اور ان کی گولیاں مزدوروں کی جھگیوں پر قیامت ڈھا رہی تھیں۔ ندیم کو افسوس ہوا کہ وہ ان لوگوں کی کوئی مدد نہیں کر سکا تھا وہ دل میں دعا مانگنے لگا کہ مزدوروں میں سے کوئی قتل نہ ہوا ہو۔ شاید ڈاکو اس کے سوتے میں کچے راستے سے اتر کر نیچے دامن میں

گئے تھے وہ چٹان کی اوٹ میں جھاڑیوں کی شاخوں کے پیچھے ایک ایسی جگہ چھپ کر بیٹھ گیا جہاں سے اسے اوپر ٹیلے کی چوٹی پر جانے والا راستہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے گھوڑوں کے ہنہناتے اور ان کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ جھاڑیوں کے اور نیچے ہو گیا۔ اس نے اپنا سر نیچے کر لیا۔ اس کی آنکھیں کچے راستے پر جمی ہوئی تھیں۔ گھوڑوں کی ٹاپیں قریب آ رہی تھیں۔ پھر اسے جھاڑیوں کے پیچھے سے گھوڑوں پر بیٹھے آدمی نظر آئے۔ ان کے لباس ڈاکوؤں ایسے تھے۔ کاندھوں سے رائفلیں لٹک رہی تھیں۔ دو گھوڑے آگے آگے تھے پیچھے خالی گھوڑے پر اس ہندو ڈاکو کی لاش تھی۔ جسے ندیم نے جہنم رسید کیا تھا۔ اس کے پیچھے دو دو کی قطاروں میں چھ ڈاکو گھوڑوں کو بڑھاتے چلے آ رہے تھے۔ جھاڑیوں سے کچھ فاصلے پر یہ ڈاکو کچے راستے سے گزرتے ہوئے اوپر کی طرف نکل گئے۔ اگلے دو گھوڑوں میں سے ایک گھوڑے پر جو آدمی ذرا آگے تھا اس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں اور گولیوں سے بھری ہوئی بیلٹ اس کی کمر کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے وسطی ہند کے ڈاکوؤں کے سرداروں کی طرح سر پر نیلے رنگ کا بڑا سا کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے سیاہ بالوں کے پٹے گردن پر پڑ رہے تھے۔ یہ ڈاکو مان سنگھ ہی ہو سکتا تھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولہ تھا اور آنکھوں سے جیسے شرارے برس رہے تھے۔ جب ڈاکو گزر گئے تو ندیم واپس اپنی کھوہ میں آکر بیٹھ گیا۔

وہ سوچنے لگا کہ اگر وہ رات کے پچھلے پہر جاگ رہا ہوتا تو جب ڈاکو اپنی کمین گاہ سے نکل کر نیچے وادی میں گئے تھے تو وہ اوپر جا کر نجمی کو وہاں سے نکال لے جانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ ضرور اس وقت کمین میں دو چار ڈاکوؤں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ مگر اب وقت گزر گیا تھا۔ ندیم کو مان سنگھ ڈاکو کی کمین گاہ کا سراغ مل گیا تھا۔ اب اسے کوئی ایسا منصوبہ سوچنا تھا جس پر عمل کرتے ہوئے وہ نجمی کو ڈاکوؤں کی کمین گاہ سے نکال لے جانے میں کامیاب ہو سکے۔ اس نے کینوس کا تھیلا کھول کر اس میں سے ڈبل روٹی کے دو سلائس نکالے اور ساتھ مچھلی کا ٹکڑا نکال کر کھانے لگا۔ پھر اس نے اٹھ کر پانی پیا اور کھوہ میں آکر سگریٹ سلگا کر بیٹھ گیا اور غور کرنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے۔ محفوظ منصوبہ تو یہی تھا کہ وہ ڈاکوؤں کی کسی واردات پر جانے کا انتظار کرے۔ جب وہ دہاں سے چلے گئے تو وہ اوپر جا کر نجمی کا سراغ لگائے اور اسے

وہاں سے فرار کروا کر اپنے ساتھ لے جائے۔ وہ دو ایک ڈاکوؤں کا مقابلہ کر سکتا تھا اور انھیں ٹھکانے بھی لگا سکتا تھا لیکن تمام ڈاکوؤں کی موجودگی میں وہ یہ کام کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اسے ایک نہایت بہتر اور ہوشیاری سے تیار کی گئی حکمت عملی کی ضرورت تھی۔ ندیم سارا دن اس کھوہ میں بیٹھا رات ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ممکن ہے ڈاکو اپنے سردار کے ہمراہ رات کے وقت واردات کرنے اپنی کمین گاہ سے نکلیں دوپہر کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لیے کھوہ سے نکل کر درختوں اور جھاڑیوں میں بہت چوکس ہو کر ادھر اُدھر ٹہلتا رہا اور دوبارہ واپس کھوہ میں آ کر بیٹھ گیا۔ دوپہر کو بھی اس نے ڈبل روٹی کھا کر اپنا پیٹ بھر لیا تھا سیٹھ جبار نے اسے ڈبل روٹی دے کر اس پر بڑا احسان کیا تھا۔ اس کے کینوس کے تھیلے میں ابھی اتنی ڈبل روٹی باقی تھی کہ جس سے مزید دو دن وہ گزارہ کر سکتا تھا مچھلی کے تیتلے بھی چھ سات تھے۔ ندیم نے فیصلہ کیا کہ اب وہ پیٹ بھر کر نہیں کھائے گا بلکہ تھوڑی تھوڑی ڈبل روٹی استعمال کرے گا کیونکہ کچھ معلوم نہیں تھا کہ ابھی اسے کتنا وقت گزارنا پڑے گا۔ سہ پہر کے وقت ندیم تھوڑی دیر کے لیے سو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو ٹیلے کے ڈھلان کے درختوں پر غروب آفتاب کے وقت سرخ سورج کی آخری کرنیں اپنا دامن کھینچ رہی تھیں پرندے بسیرا کرتے وقت شور مچا رہے تھے۔ درختوں اور جھاڑیوں کے نیچے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ ندیم کھوہ سے باہر نکل کر آیا اس نے چٹان کے پیچھے سے ٹیلے کی طرف جانے والے کچے راستے کو دیکھا یہ راستہ نیچے سے اوپر تک سنسان پڑا تھا۔ اچانک ایک طرف سے خوبصورت ہرن اچھل کر کچی سڑک کے بیچ میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ دائیں بائیں گردن موڑ کر دیکھا۔ پھر پی ہو کی آواز نکالی اور چھلانگ لگا کر سامنے والی جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں جنگل میں اندھیرے کی حکمرانی ہو گئی۔ اور ٹیلے کی جھاڑیوں میں بھی اوپر سے نیچے تک سناٹا چھا گیا۔ ندیم نے تھوڑی سی ڈبل روٹی اور مچھلی کا ایک قتلہ کھایا۔ پتھروں کے پاس جا کر پانی پیا اور کھوہ میں آ کر سگریٹ سلگا کر بیٹھ گیا۔ وہ ساری رات جاگنا چاہتا تھا تاکہ جب ڈاکو کمین گاہ سے نکل کر نیچے جائیں تو اسے علم ہو سکے۔ لیکن یہ کوئی اتنا آسان کام نہیں تھا کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد نیند نے اس پر حملہ کر دیا۔ ندیم نے سگریٹ پر سگریٹ پھونکنے شروع کر دیئے۔ پھر اس نے سگریٹ پینے

بھی بند کر دیئے۔ اسے اچانک خیال آیا کہ سگریٹ کے دھوئیں کی خوشبو آس پاس چھپے ہوئے کسی بھی شخص کو اس کی طرف متوجہ کر سکتی ہے۔ وہ اوپر والی ڈاکوؤں کی کمین گاہ سے زیادہ دور نہیں تھا اور دو چار ڈاکو ضرور کمین گاہ سے کچھ نیچے آ کر پہرے پر موجود ہوں گے۔ ندیم نے اتنا ضرور کیا کہ کھوہ کے باہر خشک پتے جمع کر کے ہلکی سی دھونی لگا دی۔ اس کی وجہ سے مچھروں کی تکلیف دہ یلغار ختم ہو گئی۔ پتوں کے دھوئیں کی خوشبو اتنی... خطرناک نہیں تھی۔ جنگل میں نیچے مزدوروں کی جھگیاں تھیں۔ یہ دھونی کی خوشبو وہاں سے بھی آ سکتی تھی۔ جوں جوں رات گہری ہو رہی تھی جنگل کا سناٹا زیادہ گھمبیر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے بعد جنگل کی مخصوص آوازیں کبھی کبھی ابھرنے لگیں۔ ان میں کسی ہرن کی آواز کسی جانور کے پاؤں کی آواز اور دور نیچے وادی سے کبھی کبھی آنے والی کسی اُلّو کی آواز بھی شامل تھی۔ شیر کی آواز اس کے بعد پھر سنائی نہیں دی تھی۔ ندیم کو ایک بار بیچ میں نیند بھی آ گئی لیکن جلد ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور کھوہ سے نکل کر چٹان کے پاس آ گیا۔ کچا راستہ تاروں بھری رات کی دھندلی پھیکی روشنی کے سلیٹی رنگ کے غبار میں کہکشاں کی طرح لگ رہا تھا جو زمین پر آ کر بچھ گئی ہو۔ ندیم نے اوپر ٹیلے کی چوٹی کی طرف نگاہ ڈالی اوپر سوائے اندھیرے کے اور کچھ نہیں تھا کوئی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ندیم خاموشی سے کھوہ میں واپس آ کر بیٹھ گیا اور نیند کے خلاف اس کی جنگ شروع ہو گئی اسے خیال آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ڈاکو آج رات کوئی واردات کرنے کمین گاہ سے نہ نکلیں لیکن ندیم کو بہر حال جاگنا تھا کیونکہ یہ ایک چانس تھا اور ندیم یہ چانس ضرور لینا چاہتا تھا اگر ڈاکو آج کی رات واردات کرنے نہیں جاتے تو ندیم دن کے وقت کھوہ میں سو کر اپنی نیند پوری کر سکتا تھا اس نے تنگ آ کر سگریٹ سلگا لیا اور اس کے ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ کھوہ کے باہر خشک پتوں کی دھونی بجھ گئی تھی اور مچھروں نے پھر حملہ کر دیا تھا۔ ندیم نے مچھروں کے اس حملے کا خیر مقدم کیا۔ اس طرح سے وہ سو نہیں سکتا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ رات کتنی گزر گئی ہے وہ اپنے کینوس کے تھیلے سے ٹیک لگائے کھوہ میں بیٹھا سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتے ہوئے نجمی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایکدم سے اس کے کان کھڑے

ہو گئے سگریٹ اس کے ہونٹوں کے پاس آ کر وہیں رک گیا۔ وہ دور سے آتی ہوئی گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سن رہا تھا یہ آواز اوپر ٹیلے کی طرف سے قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ندیم نے سگریٹ پھینکا اور کھوہ سے نکل کر چٹان کی اوٹ میں چھپ کر کچے راستے کی طرف دیکھنے لگا گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز مزید قریب ہو گئی تھی۔ پھر چھ سات گھوڑے دوڑتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے یہ ڈاکو ہی تھے جو اپنے سردار کے ساتھ کوئی واردات کرنے جا رہے تھے قدرت نے ندیم کو نجمی کے پاس جانے کا ایک سنہری موقع فراہم کر دیا تھا جب گھوڑوں کی آواز دور نیچے وادی میں جا کر خاموش ہو گئی تو ندیم نے کینوس کا تھیلا وہیں کھوہ میں پڑا رہنے دیا۔ پستول نکال کر میگزین کو چیک کیا مزید چھ سات گولیاں اپنی جیب میں ڈالیں اور کھوہ سے نکل کر چٹان کی اوٹ سے ہوتا ہوا کچے راستے پر آ کر اس کے کنارے کی جھاڑیوں میں آ گیا۔ ایک پل کے لیے اس نے رک کر اندھیری فضا کا جائزہ لیا۔ کسی طرف کوئی آواز نہیں تھی۔ اوپر ٹیلے کی چوٹی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ندیم کو یوں محسوس ہوا جیسے نجمی ٹیلے کی چوٹی پر زنجیروں میں جکڑی اسے اپنی طرف بلا رہی ہے۔ ندیم نے اللہ کا نام لیا اور جھاڑیوں کی اوٹ میں ہوتا ہوا ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگا۔

۔۔۔ ٭ ۔۔۔

ندیم ٹیلے کے کچے راستے سے ہٹ کر اوپر چڑھ رہا تھا۔ آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے لسے جیسے ٹکٹکی باندھے تک رہے تھے۔ جنگل کی رات سانس روکے ہوئے تھی۔ اندھیرے میں ندیم ایک ایک قدم بڑی احتیاط سے اٹھا رہا تھا۔ ٹیلے کی چڑھائی ہموار نہیں تھی جگہ جگہ گڑھے اور کھائیاں اس کا راستہ روک رہی تھیں مگر ندیم برابر آگے بڑھ رہا تھا۔ کچھ اور چلنے کے بعد کچا راستہ ٹیلے کے پہلو میں دائیں جانب مڑ گیا۔ ندیم بھی اس کے ساتھ ہی دوسری طرف والی جھاڑیوں میں آ گیا۔ وہ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھ رہا تھا کہ اس کے چلنے سے خشک پتوں کی آواز پیدا نہ ہو۔ کیکر ایسے چھتری دار درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہاں اندھیرا کافی گہرا تھا لیکن ندیم کی آنکھیں ستاروں کی روشنی میں راستہ تلاش کرنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ ایک جگہ جھاڑیوں میں سے نکل کر وہ کچے راستے پر آ گیا اس نے اوپر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ ٹیلے کی چوٹی بہت قریب آ گئی تھی۔ اب اسے بہت احتیاط کی ضرورت تھی کیونکہ وہاں کسی بھی جگہ ڈاکو پہرے پر موجود ہو سکتے تھے۔ ندیم اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے ایک ایک جھاڑی ایک ایک درخت کو غور سے دیکھتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔ ایک جگہ وہ سانس لینے کے لیے درخت کی اوٹ میں بیٹھ گیا اس نے خاموشی کو غور سے سننے کی کوشش کی۔ کہیں کوئی ذرا سی آواز بھی نہیں آ رہی تھی وہ اٹھا اور دوبارہ ایک ایک قدم کر کے چڑھائی چڑھنے لگا۔ جب ٹیلے کی چوٹی کے چھتری دار درخت اندھیرے میں اسے قریب دکھائی دینے لگے تو وہ کچے راستے سے ہٹ کر پہلو میں بائیں جانب چلا گیا۔ وہ ڈاکوؤں کے راستے سے دور جا کر چوٹی کے عقب میں نکلنا چاہتا تھا کیونکہ یقینی بات تھی کہ جہاں راستہ ختم ہو گا وہاں دو تین ڈاکو پہرہ ضرور دے رہے ہوں گے۔ جنگلی جھاڑیوں میں راستہ بڑا دشوار گزار تھا۔

بلکہ وہاں کوئی راستہ نہیں تھا۔ ندیم کو خود راستہ بنا کر چلنا پڑ رہا تھا۔ اب وہ دبے پاؤں چڑھائی چڑھنے لگا۔ وہ نصف دائرے میں چکر کاٹ کر ٹیلے کی چوٹی کے عقب میں ایک ایسی جگہ آ گیا جہاں زمین ہموار تھی اور ایک طرف ذرا اوپر ٹیلے کی چوٹی تھی۔ یہ ہموار تختہ قدرتی طور پر ایک ٹیریس کی شکل میں بنا ہوا تھا۔ یہاں اونچے اونچے درخت اور لمبی گھاس اگی ہوئی تھی۔ ندیم ذرا آگے گیا تو اس نے ایک چھوٹی سی پہاڑی ندی کو دیکھا جو خدا جانے کدھر سے بل کھاتی ہوئی ٹیلے کے گرد لپٹتی دائیں جانب گھوم گئی تھی۔ یہ وہی ندی تھی جہاں صبح کے وقت نجمی کو دو ڈاکو نہلانے کے لیے لایا کرتے تھے اور جس میں غوطہ لگا کر نجمی نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ ندیم چپکے سے ندی کے کنارے بیٹھ کر ٹیلے کی چوٹی کی طرف دیکھنے لگا جو اس سے زیادہ دور نہیں تھی۔ وہاں اندھیرا اور خاموشی چھائی تھی۔ ندیم اندھیرے میں بالکل ساکت بیٹھا اوپر تکتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے۔ اور ٹیلے کے اوپر کس طرف سے جانا چاہیئے۔ ابھی تک وہاں اسے کوئی پہرے دار دکھائی نہیں دیا تھا۔ کسی کے کھانسنے کی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی۔ ندی کے کنارے کائی کی اونچی اونچی گھاس اگی تھی۔ ندیم اس گھاس کے اندر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے ندیم کو چھو کر اوپر کی طرف جا رہے تھے۔ اچانک ندیم نے ہوا میں تمباکو کی بو محسوس کی۔ اس نے جلدی سے اپنا سر نیچے کر لیا اور آہستہ آہستہ سانس لینے لگا۔ یہ کسی گھٹیا سگریٹ کے تمباکو کی بو تھی۔ یقیناً کوئی قریب ہی موجود تھا۔ ندیم آنکھوں کو سکیڑ کر سامنے ان جھاڑیوں کی طرف دیکھنے لگا جو نیچے سے اوپر جاتی تھیں اسے کسی مرد کے آہستہ سے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ ندیم نے اپنا سانس روک لیا۔ پھر اسے جھاڑیوں میں کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے ہندی زبان میں دوسرے سے کہا کہ اوپر چل کر چائے پیتے ہیں۔ دوسرے نے اسے گالی دے کر کہا کہ مان سنگھ کو پتہ چل گیا تو ہماری خیر نہیں۔ چپکے سے راؤنڈ لگاتے رہو۔ پھر جھاڑیوں میں دو انسانی سائے نکل کر سامنے آ گئے۔ ان میں سے ایک سایہ سگریٹ پی رہا تھا۔ اندھیرے میں ندیم نے غور سے دیکھا کہ ان کے کاندھوں سے رائفلیں لٹک رہی تھیں۔ یہ ڈاکو نیچے پہرہ دے رہے تھے اور اپنی راؤنڈ پر تھے۔ وہ باتیں کرتے ندیم کے سامنے سے گزر کر ندی کے کنارے کنارے چلتے دور اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ ندیم نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ یہ بنگالی

نہیں تھے۔ سیٹھ جبار نے ٹھیک کہا تھا کہ مان سنگھ ڈکیت مدھیہ پردیش کا رہنے والا تھا اور اس کے ساتھی بھی اسی صوبے کے تھے۔ ان کی باتوں سے ایک بات واضح ہو گئی تھی کہ وہ ابھی اوپر نہیں جا رہے۔ ندیم نے موقع کو غنیمت جانا اور ندی کنارے کی اونچی گھاس سے نکل کر اوپر چوٹی کی طرف چلنے لگا اسے یہ دھڑکا ضرور لگا تھا کہ کہیں اوپر کوئی دوسرا ڈاکو پہرے پر نہ ہو۔ مگر اب وہ رک نہیں سکتا تھا۔ بے حد احتیاط کے ساتھ چڑھائی چڑھتے ہوئے وہ ٹیلے کے اوپر ہموار جگہ پر پہنچ گیا۔ یہاں اسے ایک کشادہ جگہ نظر آئی جہاں ایک طرف لکڑیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ ندیم ایک بڑے پتھر کے پیچھے چھپ کر جائزہ لینے لگا۔ ستاروں کی دھیمی روشنی میں اسے وہاں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ کیا سبھی ڈاکو واردات کرنے گئے ہوئے تھے؟ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے ایک کھوہ کے اندھیرے میں سے اسے دو انسانی سائے باہر نکلتے دکھائی دیئے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کرخت لہجے میں پوچھا کہ چائے میں گڑ ڈالا تھا کہ نہیں؟ دوسرے ڈاکو کی آواز آئی: "پی کر تو دیکھ سالے۔"

وہ دونوں اندھیرے میں ہی ایک طرف بیٹھ گئے۔ ندیم نے اندھیرے میں غور سے دیکھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں چائے کے مگ یا گلاس تھے۔ وہ دھیمی آواز میں ایک دوسرے سے باتیں بھی کرنے لگے تھے۔ ندیم کو ان کی ہلکی ہلکی آواز ہی آ رہی تھی۔ الفاظ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ بہت جلد ندیم نے اندازہ لگا لیا کہ یہاں صرف دو ڈاکو ہی ہیں۔ دو ڈاکو ٹیلے کے ارد گرد چل پھر کر پہرہ دے رہے تھے۔ وہ ڈاکو مان سنگھ کی خفیہ کمین گاہ میں پہنچ چکا تھا۔ اب اسے یہ معلوم کرنا تھا کہ نجمی کو ان لوگوں نے کہاں قید میں ڈال رکھا ہے اور کیا وہاں بھی کوئی باہر پہرہ دے رہا ہے کہ نہیں۔ ندیم کو اندھیرے میں وہاں سامنے مٹی کا ایک اونچا سا تودہ دکھائی دے رہا تھا۔ جس کے باہر ایک طرف دونوں ڈاکو بیٹھے چائے پیتے ہوئے مدھم آواز میں باتیں کر رہے تھے وقت گزرتا جا رہا تھا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ جو دو ڈاکو نیچے پہرہ دے رہے ہیں وہ بھی چائے پینے اوپر نہ آ جائیں۔ دوسرا خطرہ یہ بھی سر پر منڈلا رہا تھا کہ کہیں مان سنگھ ڈکیت اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واردات کرنے کے بعد واپس نہ آ جائے۔ ندیم ایک طرح سے موت کے منہ میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔
اتنے میں دونوں ڈاکو سگریٹ بیڑی سلگانے کے بعد اٹھے اور قدم قدم چلتے ایک جگہ جھاڑیوں

کے پاس آکر رک گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا "جے سنگھ چلو نیچے کا چکر لگا آئیں۔ ادھر آج کوئی پہرے پر نہیں ہے۔"

دوسرا ڈاکو بولا "ارے سالے اس چھم چھم باٹی کو یہیں چھوڑ دیں کیا؟"

پہلے ڈاکو نے گالی دے کر کہا کہ وہ تو رسیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ سالی بھاگ کر کہاں جائے گی۔ ندیم نے یہ گفتگو غور سے سن لی تھی۔ دونوں ڈاکو جھاڑیوں کے قریب سے ہو کر ڈھلانی راستے پر اتر گئے۔ ضرور یہاں سے کچا راستہ نیچے وادی تک جاتا تھا۔ جب دونوں ڈاکوؤں کو گئے کچھ دیر گزر گئی اور ہر طرف ایک بار پھر سناٹا چھا گیا تو ندیم تھر کے پیچھے سے نکلا اور جھک کر چلتا سامنے والے تودے کی طرف بڑھنے لگا۔ جس چھم چھم باٹی کا انھوں نے ذکر کیا تھا وہ سوائے نجمی کے اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی اور وہ کسی کھوہ میں رسیوں میں جکڑی پڑی تھی۔ یہ کھوہ سامنے والے تودے میں ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا غار وغیرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ندیم دبے پاؤں چلتا تودے کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ یہاں اسے ایک کھوہ کا دہانہ دکھائی دیا جس کے باہر لکڑی کا ایک کھوکھا پڑا تھا اور اندر اندھیرا چھا رہا تھا۔ ندیم کو یہ خطرہ بھی تھا کہ کہیں اندر نجمی کی بجائے کوئی ڈاکو نہ سو رہا ہو۔ اس نے پستول جیب سے نکال کر پہلے ہی اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ وہ تودے کی دیوار کے ساتھ لگ کر اردگرد اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے تکنے لگا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اس نے کھوہ کے اندر جھانک کر دیکھا۔ اسے اندر سے کسی عورت کے آہستہ آہستہ کراہنے کی آواز سنائی دی۔ اندر کوئی عورت ہی تھی مرد نہیں تھا۔ ندیم جلدی سے کھوہ کے اندر داخل ہو گیا۔ اب اس کو نجمی کی کمزور، مرجھائی ہوئی آواز سنائی دی وہ یہ سمجھی کہ کوئی ڈاکو اندر آیا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا "میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میرے ہاتھ کھول دو پیچھے سے۔" ندیم کے دل پر جیسے تیر سا لگا۔ نجمی کی یہ حالت اس کی وجہ سے ہوئی تھی۔ وہ لپک کر اندھیرے میں آواز کی طرف بڑھا اور بولا "نجمی! میں ندیم ہوں۔"

اس کے بعد وہاں ایک گہرا سناٹا چھا گیا اور اس سناٹے میں نجمی کے سسکیاں بھرنے کی آواز بار بار ابھرنے لگیں اس کا سر ندیم کے سینے سے لگا تھا۔ ندیم کی آنکھوں سے بھی آنسو گرنے لگے تھے اور نجمی اپنا سر اس کے سینے سے لگائے سسکیاں بھر رہی تھی۔ بہت جلدی ندیم کو احساس ہو

گیا کہ وہ کہاں پر ہے اور وہاں کس مقصد کے لیے آیا ہے۔ اس نے نجمی کے ماتھے کو چومتے ہوئے کہا۔

"نجمی! مجھے معاف کر دینا۔ میں نے دیر کر دی۔ اب جتنی جلدی ہو سکے میرے ساتھ یہاں سے نکل چلو۔"

ندیم نے نجمی کے پیچھے بندھے ہوئے ہاتھوں کی رسیاں کھول ڈالیں۔ نجمی اٹھ کھڑی ہوئی اور ندیم کے سینے کے ساتھ اپنا سر لگا کر بولی "ندیم...... تم اپنی جان خطرے میں نہ ڈالو۔ یہاں سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہے تم اپنی جان بچا کر بھاگ جاؤ، میری تو قسمت میں ہی در در کی ٹھوکریں لکھی ہیں۔" دونوں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ندیم نے اس کے سر کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور پر عزم سرگوشی میں بولا "نہیں...... ایسا نہ کہو تمھیں ابھی، اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہے۔ چلو ہمت کرو۔ باہر اس وقت کوئی نہیں ہے میرے پیچھے پیچھے جھک کر چلی آنا۔"

ندیم نے جیب سے پستول دوبارہ نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور تیزی سے کھوہ کے باہر سر نکال کر دیکھا۔ سامنے چھوٹا سا ہموار صحن بالکل خالی تھا۔ ندیم نے نجمی کا ہاتھ پکڑا اور کھوہ سے باہر نکل گیا۔ دونوں اندھیرے میں کمر جھکائے صحن پار کر کے سامنے والے ٹیلے والے بڑے پتھر کی اوٹ میں آ گئے۔ ندیم نے نجمی کے کان میں سرگوشی کی "یہاں سے ہم ندی سے ہٹ کر نیچے اتریں گے گھبرانا بالکل نہیں۔ سارا راستہ میں نے دیکھ رکھا ہے۔"

ندیم نے نجمی کا ہاتھ پکڑا اور اسے ساتھ لے کر دوسری جانب ٹیلے کی ڈھلان اترنے لگا۔ یہ راستہ جھاڑیوں سے اٹا ہوا تھا اور مخالف سمت میں نیچے وادی میں جاتا تھا۔ ندیم اس کھوہ کی طرف بھی نہیں جانا چاہتا تھا جہاں اس کا کینوس کا تھیلا پڑا تھا کیونکہ وہ جگہ کچے راستے کے قریب واقع تھی اور اسی راستے پر یقینی طور پر دونوں ڈاکو موجود ہوں گے۔ اترائی پر ان کی رفتار تیز تھی۔ لیکن جگہ جگہ لمبی گھاس اور چھوٹی چھوٹی کھائیاں ان کا راستہ روک رہی تھیں۔ اب نجمی کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ وہ فرار ہو سکتی ہے اور ندیم کے ساتھ وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اس کے اندر بھی جیسے ایک نئی طاقت آ گئی تھی۔ اس نے نقاہت کے احساس کو اپنے جسم سے دور کر دیا تھا اور وہ ندیم کے پیچھے پیچھے تیز تیز قدموں سے کھائیوں اور جھاڑیوں سے بچتی نیچے اترتی جا

رہی تھی۔ ادھر بھی خطرہ ضرور تھا مگر ابھی تک انھیں کوئی ڈاکو وہاں نہیں ملا تھا۔ ٹیلے کی آدھی اترائی اترنے کے بعد ندیم نے نجمی کو ایک جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نجمی نے سرگوشی میں کہا "نہیں ندیم یہاں رکنا نہیں ہے۔ چلتے چلو۔" اور وہ ندیم کے آگے آگے چل پڑی۔ ندیم بھی نہ رکا۔ اندھیرے میں انھیں پانچ سات فٹ کے فاصلے سے آگے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ نجمی نے اپنی پرانی ساڑھی کمر کے گرد لپیٹ رکھی تھی اس کے پاؤں میں ربڑ کی چپل تھی جس کی وجہ سے پاؤں بہت حد تک راستے کے کانٹوں سے محفوظ ہو گئے تھے۔۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہ ٹیلے سے نیچے اتر آئے اب ان کے سامنے ایک خشک نالہ تھا۔ جس میں اونچی اونچی گھاس اُگ رہی تھی۔ ندیم نے اپنا رخ مزدوروں کی جھگیوں کی طرف کر لیا تھا۔ جہاں اسے بوڑھا مسلمان بنگالی اپنی بیٹی عائشہ کے ساتھ جدا ہوا تھا۔ ندیم کا ارادہ یہ تھا کہ وہ مزدوروں کی جھگیوں کے قریب سے ہو کر اسی طرف نکل جائے گا جس طرف سے بوڑھا بنگالی مسلمان اپنی بیٹی کو لے کر گیا تھا اسی طرف آگے جا کر جیسا کہ بوڑھے نے کہا تھا کہ کوئی قصبہ تھا اگرچہ وہاں بقول اس کے پولیس کی چوکی بھی تھی لیکن ندیم نے سوچ رکھا تھا کہ وہ اس قصبے کے قریب سے ہو کر گزر جائے گا۔ کم از کم ادھر انسانی آبادی تو تھی جہاں ڈاکوؤں کے آنے کا زیادہ خطرہ نہیں تھا۔ وہ نجمی کو ساتھ لے کر خشک نالے میں سے گزر کر اس کے دوسرے کنارے پر آ گیا جہاں سے وہ مزدوروں کی جھگیوں کی طرف چل پڑا۔ نجمی تھک گئی تھی۔ ندیم نے رک کر پوچھا "کیا تم آرام کرنا چاہتی ہو؟"

نجمی نے ندیم کا ہاتھ تھام لیا اور بولی "ادھر ہم کہاں جا رہے ہیں؟ وہ بڑا ظالم ڈاکو ہے۔ وہ ضرور میری تلاش میں ادھر آجائے گا۔"

ندیم نے پوچھا "جب کبھی وہ کوئی واردات کرنے جاتا ہے تو واپس کس وقت آتا ہے؟"

نجمی نے اسے بتایا "کبھی کبھی وہ دن کے وقت واپس آتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صبح ہونے سے پہلے ہی واپس آجاتا ہے۔"

ندیم نے نجمی کے الجھے ہوئے بالوں کو سنوارتے ہوئے پیار سے کہا "فکر نہ کرو اب دنیا کی کوئی طاقت تمھیں مجھ سے چھین نہیں سکتی۔ ڈاکو مان سنگھ آ گیا تو میرے پستول کی ساری گولیاں اسے بھون کر رکھ دیں گی۔" دو منٹ وہاں ستانے کے بعد ندیم اور نجمی پھر چل پڑے۔ ندیم کا خیال تھا کہ وہ مزدوروں کی جھگیوں کے پاس نکلے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ اندھیرے میں وہ راستہ بھول گیا تھا اور۔۔ جھگیاں اس کے پیچھے رہ گئی تھیں۔ چھتری نما جنگلی جھاڑیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اور اب اونچے پودوں کے درخت شروع ہو گئے تھے۔ ندیم کو یہ وہی جنگل لگا جس جنگل سے گزر کر وہ مان سنگھ ڈاکو کی کمین گاہ کی طرف آیا تھا۔ یہاں درختوں کے نیچے جھاڑیاں کم تھیں مگر گھاس بے تحاشہ اُگی ہوئی تھی۔ درختوں کے نیچے سے نکل کر وہ ذرا کھلی جگہ پر آئے تو ندیم نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر ستارے ماند پڑنے لگے تھے۔ رات ڈھل رہی تھی۔ صبح ہونے والی تھی۔ نجمی بیٹھ گئی۔ ندیم نے ستاروں کی طرف دیکھ کر کہا "میرا خیال ہے میں راستہ بھول گیا ہوں مگر فکر نہ کرو۔ بوڑھے بنگالی مسلمان کا قصبہ اسی جانب آگے ہوگا۔" پھر ندیم بھی نجمی کے پاس بیٹھ گیا اور اس نے نجمی کو بوڑھے مسلمان بنگالی اور اس کی بیٹی عائشہ کا سارا قصہ مختصر الفاظ میں سنایا۔ جب اس نے نجمی کو بتایا کہ اس نے ہی مان سنگھ ڈاکو کے ایک ساتھی کو قتل کیا تھا تو نجمی نے ندیم کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور بولی "مجھے تم پر بڑا فخر محسوس ہو رہا ہے۔ ندیم تم نے ایک پرہیزگار اور حافظ قرآن مسلمان بچی کی عزت بچا کر بڑا نیک کام کیا ہے وہ اپنے ساتھی کی لاش آج دن میں ہی اوپر لائے تھے۔ ڈاکو مان سنگھ آگ بگولا ہو رہا تھا انھوں نے نیچے کچھ مزدوروں کو قتل بھی کر ڈالا تھا۔"

ایک دم سے نجمی نے چونک کر اندھیرے میں ایک طرف دیکھا۔ ندیم نے جلدی سے نجمی کو پیچھے کر دیا اور چیتے کی طرح اچھل کر جھاڑیوں کی طرف لپکا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ نجمی آہستہ سے بولی "مجھے ایسا لگتا تھا جیسے کوئی پتوں پر چل کر آرہا ہے۔" ندیم نے پستول تان رکھا تھا۔ اس نے جھاڑیوں میں گھوم پھر کر اچھی طرح سے جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ نجمی کے پاس آ کر بولا "یہاں سے نکل چلیں۔ نجمی ابھی ہم خطرے سے باہر نہیں ہوئے۔" انھوں نے ایک بار پھر جنوب کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ گھنا جنگل اب پیچھے رہ گیا تھا اور اونچا نیچا نسبتاً کھلا میدان شروع ہو گیا تھا۔ یہاں ناریل اور تاڑ کے درخت زیادہ اُگے ہوئے تھے۔ وہ کھائیوں اور گھاٹیوں سے گزرتے چلے گئے۔ آسمان پر صبح کاذب کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ مشرق میں صبح کا تارا ماند پڑ رہا تھا۔ منہ اندھیرے کی دھندلی روشنی میں انھیں میدان میں ابھری ہوئی سیاہ چٹانیں واضح طور پر نظر آ رہی تھیں۔

جب وہ ان سیاہ زنگ آلود چٹانوں سے نکلے تو مشرق میں دور ناریل اور تاڑ کے درختوں کے عقب سے سورج کا لرزتا ہوا سنہری مکھڑا ابھرنے لگا تھا۔ اس کی سنہری روشنی چاروں طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ آگے ایک ندی آگئی انھوں نے ندی پر منہ ہاتھ دھویا۔ ندی زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ ندیم ندی میں اتر گیا پانی اس کی کمر تک آتا تھا۔ نجمی بھی پانی میں اتر گئی۔ ندی کے دوسرے کنارے پر آ کر نجمی نے اپنی گیلی ساڑھی بیٹھ کر نچوڑی اور ندیم کے ساتھ چلنے لگی۔ اس نے ندیم سے پوچھا "ہم کلکتہ سے کتنی دور ہوں گے ندیم؟ تمھیں تو اندازہ ہوگا۔"

ندیم نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہم کلکتہ سے کافی دور ہیں ابھی۔ میں چاہتا ہوں کہ غیر آباد... راستوں سے ہوتے ہوئے ہی ہم کلکتہ کے مضافات میں پہنچیں۔ کیونکہ بوڑھے مسلمان بنگالی کا قصبہ اب شاید ہمیں نہ ملے۔"

سورج کافی اوپر آ گیا تھا۔ انھیں پہلی بار سامنے کچھ کھیت اور ایک باغ دکھائی دیا۔ باغ کی چاردیواری کو کیلے کے پتوں نے گھیر رکھا تھا۔ ندیم نے نجمی کو کھیت کے کنارے ایک طرف بیٹھنے کو کہا اور خود باغ کی طرف بڑھا۔ نجمی کھیت کے کنارے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ یہ دھان کے کھیت تھے اور فصل کافی اونچی ہو رہی تھی۔ ندیم باغ میں کیلے کے درختوں کے نیچے آ کر رک گیا درختوں پر کیلے کے زرد گچھے لٹک رہے تھے۔ اس نے ایک گچھا چاقو سے کاٹ کر ہاتھ میں تھاما اور نجمی کے پاس آ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ انھوں نے پیٹ بھر کر کیلے کھائے۔ یہ کیلے چھوٹے مگر بڑے میٹھے تھے۔ ندیم اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا "باغ میں کوئی رکھوالا بھی نہیں تھا۔ آس پاس کوئی گاؤں بھی نظر نہیں رہا تھا شاید آگے کوئی آبادی ہو۔ یہ باغ اور کھیت کسی گاؤں کی موجودگی کا ثبوت ہیں۔ ہمیں آبادی سے دامن بچا کر نکلنا ہوگا۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ کلکتہ کی پولیس میری تلاش میں ہے۔"

وہ آگے روانہ ہو گئے۔ چلتے ہوئے ندیم نے نجمی کو اپنے ساتھ گزرے ہوئے سارے واقعات سنائے کہ کس طرح وہ فقیریے کی مدد سے جیل سے فرار ہوا پھر کس طرح ایک ٹرک میں بیٹھ کر لکھنؤ پہنچا اور وہاں سے کلکتہ آیا تا کہ تمھیں اس جہنم سے نکال کر اپنے ساتھ مشرقی پاکستان لے چلوں۔

"نجمی! اب میں تمھارا انکار نہیں سنوں گا۔ سیٹھ جبار بڑا نیک دل مسلمان ہے۔ وہ ہمیں انڈیا کا

بارڈر کراس کرا دے گا۔ مشرقی پاکستان ہمارا اپنا وطن ہے۔ ہم وہاں پہنچتے ہی شادی کر لیں گے پھر لاہور چلے جائیں گے۔ تم سن رہی ہو نا؟"

نجمی نے چلتے چلتے ایک گہری نگاہ ندیم پر ڈالی اور کوئی جواب نہ دیا۔ سورج کی روشنی میں ندیم نے دیکھا کہ نجمی کی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ اس کا رنگ جو لاہور میں کبھی سرخ و سفید ہوا کرتا تھا۔ اب زردی مائل سبز سا ہو گیا تھا۔ ندیم نے پیچھے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ ڈاکو مان سنگھ کے علاقے سے نکل آنے پر دل میں خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔ سب سے زیادہ خوشی اسے اس بات کی تھی کہ وہ نجمی کو بھی اس جہنم سے اپنے ساتھ نکال لایا تھا۔ یہ خدا کی مہربانی اور مدد سے ندیم نے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ یہ اسے معلوم تھا کہ اب تک مان سنگھ ڈاکو کے ساتھی نجمی کی تلاش میں آس پاس کے جنگلوں میں نکل چکے ہوں گے۔ لیکن اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ وہ ڈاکوؤں کی کمین گاہ سے کافی دور نکل آیا تھا۔ ایک اونچے ٹیلے سے وہ نیچے اترے تو انھیں بائیں جانب تاڑ کے درختوں میں ڈھلانی چھتوں والے مکانوں سے کہیں کہیں دھواں اٹھتا نظر آیا۔ یہ کوئی گاؤں تھا۔ گاؤں کے باہر تالاب تھا جہاں کچھ عورتیں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھیں۔ ندیم نے نجمی سے کہا۔

"اگر تم ان عورتوں سے یہ معلوم کر لو کہ شہر یہاں سے کتنی دور ہے اور کس طرف ہے تو ہمیں بڑی آسانی ہوگی۔ تم بنگلہ روانی سے بول لیتی ہو۔ تم جاؤ میں اس جگہ تمھارا انتظار کرتا ہوں۔"

نجمی تالاب کی طرف چل دی اور ندیم ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ پستول ہاتھ میں لیے نجمی کو برابر دیکھ رہا تھا۔ نجمی بھی بنگالی ساڑھی میں ملبوس تھی اور شکل و صورت سے بالکل بنگالی عورت لگتی تھی۔ وہ عورتوں سے باتیں کرنے لگی پھر واپس آ گئی۔ اس نے واپس آ کر ندیم سے کہا "یہاں سے دو کوس آگے دھول گھاٹ کا قصبہ ہے اس قصبے سے شمال مغرب کی جانب تین کوس پر بڑی سڑک ہے جہاں سے لاریاں کلکتہ کی طرف جاتی ہیں۔"

ندیم نے اپنے دل میں سوچ رکھا تھا کہ وہ نجمی کو واپس گناہ کی بستی سوناگاچی میں جانے نہیں دے گا وہ اسے اپنے ساتھ سیٹھ جبار کے ذکریا اسٹریٹ والے ہوٹل میں لے جائے گا اور پھر وہیں سے اس کے ساتھ بارڈر کراس کر کے مشرقی پاکستان پہنچ جائے گا۔ اسی مقصد کے لیے وہ کلکتہ شہر میں رات کے وقت پہنچنا چاہتا تھا تا کہ اندھیرے میں وہ پہچانا نہ جا سکے۔ اس نے

نجمی کو اپنے ارادے سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ وہ کلکتہ پہنچ کر یہ بات اسے بتانا چاہتا تھا۔ ندیم کو یقین تھا کہ وہ نجمی کو واپس مشرقی پاکستان جانے پر رضامند کر لے گا۔ اس نے نجمی سے کہا "میرا دن کی روشنی میں کلکتہ جانا خطرناک ہے تمھیں تو پولیس کچھ نہیں کہے گی لیکن میں گرفتار کر لیا جاؤں گا اس لیے میری رائے یہ ہے کہ ہمیں دن کسی جگہ چھپ کر گزار دینا چاہیئے۔ جب رات ہو جائے گی تو ہم دھول گھاٹ سے آگے سڑک پر کوئی لاری پکڑ کر کلکتہ روانہ ہو جائیں گے۔"

نجمی کہنے لگی "تم کلکتے کہاں جاؤ گے؟ کیا اپنے سیٹھ جبار کے پاس ہی جاؤ گے۔؟"

"اور کہاں جا سکتا ہوں۔" ندیم نے سانس بھرتے ہوئے کہا "اصل میں تو میں تمھیں اپنے ساتھ یہاں سے لے جانے آیا تھا۔ میں تو اب بھی تمھیں یہی کہوں گا کہ اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے کا خیال دل سے نکال کر پھینک دو۔ ان لوگوں سے بدلہ لینے سے کیا ہو گا؟ کچھ بھی نہیں بہرحال یہ ہمارا ملک نہیں ہے، دشمن ملک ہے۔ ہمیں اپنے ملک پاکستان میں ہی تحفظ مل سکتا ہے اور پھر کیا تمھیں اپنا شہر لاہور یاد نہیں آتا؟ یاد کرو ہم نے وہاں کتنے حسین دن گزارے ہیں۔ وہ ہمارا وطن ہے۔ وہاں ہمارا سب کچھ ہے۔"

نجمی نے اپنا ہاتھ ندیم کے ہونٹوں پر رکھ دیا "خدا کے لیے مجھے میرے ماضی کے حسین دن یاد نہ دلاؤ۔ میں انھیں بھول جانا چاہتی ہوں۔ وہ نجمی مر چکی ہے جس نے تمھارے ساتھ شادی کرنے کے لیے اپنے گھر سے باہر قدم رکھا تھا اور تمھارے ساتھ گھر چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔ جن لوگوں نے میری عزت کا خون کیا ہے میں انھیں کیسے معاف کر سکتی ہوں۔ اگر میں نے ان سے انتقام نہ لیا تو مجھے قبر میں بھی چین نصیب نہیں ہو گا اور تب میں کچھ نہ کر سکوں گی۔ اٹھو ہمیں کلکتہ جانا ہے۔"

نجمی اٹھ کر دھان کے کھیتوں کے درمیان بنی ہوئی پگڈنڈی پر چلنے لگی۔ ندیم نا امید نہیں ہوا تھا۔ وہ نجمی کو گناہ کی بستی میں چھوڑ کر واپس لاہور نہیں جا سکتا تھا اس نے سوچا کہ کلکتہ پہنچ کر وہ اسے رضامند اور قائل کرنے کی ایک اور کوشش کرے گا۔ کھیتوں، میدانوں اور ویرانوں میں سے گزرتے وہ دوپہر کے وقت دھول گھاٹ قصبے سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر رک گئے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی دھول گھاٹ قصبے کے ایک منزلہ دو منزلہ کچے پکے کھپریل کے چھتوں والے مکان، آم کے درختوں کے جھنڈوں میں سے صاف نظر آ رہے تھے قصبے کے باہر کھیتوں میں بنگالی کسان دھوتیاں

باندھے ہل چلا رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر ایک بنگالی کسان تاڑ کے درخت پر تاڑی کے لیے مٹی کی ہنڈیا اتارنے اوپر چڑھا جا رہا تھا۔ یہ ہنڈیا کسان شام کے وقت تاڑ کے درخت کی شاخ کاٹ کر باندھ دیتے ہیں۔ ساری رات تاڑ کا دودھ ایسا رس قطرہ قطرہ اس میں ٹپکتا رہتا ہے۔ اگر یہ ہنڈیا سورج نکلنے سے پہلے درخت سے اتار لی جائے تو اس تاڑی میں نشہ بالکل نہیں ہوتا اور اس کا ذائقہ دہی کی لسی جیسا ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسے دوپہر کے وقت اتارا جائے تو دھوپ کی وجہ سے اس میں نشہ پیدا ہو جاتا ہے۔

ندیم نے نجمی سے کہا "ہمیں آبادی اور لوگوں سے دور رہ کر ہی چلنا چاہیئے۔" وہ ایک چکر کاٹ کر دھول گھاٹ قصبے کے شمال مغرب کی طرف آ گئے۔ یہاں انھیں آم کے ایک گنجان درخت تلے خالی جھونپڑی مل گئی۔ اس کی چھت پر توری کی زرد پھولوں والی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ ندیم نے کہا "ہم اس خالی جھونپڑی میں دن کا باقی حصہ گزار سکتے ہیں۔ جب سورج غروب ہو گا اور شام ہو جائے گی تو بڑی سڑک پر جا کر کلکتے جانے والی لاری پکڑ لیں گے۔" نجمی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ جھونپڑی میں زمین پر سوکھی گھاس بچھی ہوئی تھی۔ کونے میں دو چار کچے ناریل پڑے تھے۔ ندیم نے چاقو سے ایک دو ناریل کاٹ دیئے انھوں نے ان کا پانی پیا گر بھوک نہ مٹ سکی۔ دھول گھاٹ قصبے کے مکان وہاں سے زیادہ دور نہیں تھے ندیم کہنے لگا "میرے پاس پیسے ہیں میرا خیال ہے میں قصبے میں جا کر کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔ بھوک تمھیں بھی لگ رہی ہو گی۔"

نجمی نے کہا "تم مت جاؤ میں جا کر لے آتی ہوں۔"

ندیم بولا "میرے جانے میں کیا حرج ہے بھلا یہ گمنام سا قصبہ ہے اور یہاں مجھے کوئی پولیس کا آدمی بھی دکھائی نہیں دے رہا۔ تمھارا جانا مناسب نہیں۔ ممکن ہے ڈاکو یا سنگھ کا کوئی ممبر اس قصبے میں موجود ہو۔ تم اس جھونپڑی میں ہی بیٹھو میں ایک منٹ میں کچھ لے کر آتا ہوں۔"

نجمی کا دل نہیں مان رہا تھا مگر ندیم جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔ بھرا ہوا پستول اور چاقو ان کی بیلٹ کی جیب میں ہی تھی اس نے جانے سے پہلے نجمی کو سارے پیسے دے دیئے تھے۔ صرف چند روپے اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ جھونپڑی کے سامنے ایک کھلا ہوا کھیت تھا۔ نجمی ندیم کو کھیت میں سے گزرتے دیکھ رہی تھی۔ اسے لاہور کے وہ دن یاد آ گئے جب ندیم اس سے ملنے چوری چھپے

کیمپس آیا کرتا تھا اور وہ اسے کیمپس کے لان میں سے اپنی طرف آتا دیکھا کرتی تھی۔ وہ دن خواب کی طرح نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے اس کے ایک چھوٹے سے غلط قدم اٹھانے کی وجہ سے حالات نے ان دونوں کو کہاں سے کہاں لا پھینکا تھا۔ ندیم ناریل کے درختوں میں سے گزر کر قصبے کے مکانوں کے پاس پہنچ گیا تھا۔ پھر وہ کونے والے دو منزلہ مکان کی دیوار کے پیچھے چلا گیا۔ نجمی دل میں اس کی خیریت کی دعائیں مانگنے لگی۔ ندیم قصبے کے کونے والے مکان کی دیوار سے نکل کر قصبے کے چھوٹے سے بازار میں آگیا۔ یہ چھوٹا سا بازار تھا جس میں دو چار دکانیں ہی تھیں۔ ندیم جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیئے۔ سر کو ذرا سا جھکائے مگر چاروں طرف سے پوری طرح باخبر بازار میں چلنے لگا۔ وہ کسی چائے خانے کی تلاش میں تھا جہاں سے اسے کچھ کھانے کو مل سکے۔ بنگال کے قصبوں اور یہاں تک کہ چھوٹے دیہات میں بھی ایک آدھ کھنڈر ایسا ضرور ہوتا ہے جہاں کانسی کے گلاسوں میں چائے وغیرہ مل جاتی ہے۔ ندیم کو ایک دکان کے باہر کچھ دیہاتی بینچ پر بیٹھے چائے پیتے نظر آئے۔ وہ اسی دکان کی طرف بڑھا۔ بازار بالکل خالی تھا۔ سامنے سے ایک آدمی سفید رنگ کے بیل کی رسی پکڑے اسے کھینچے لیے چلا آ رہا تھا۔ چائے کی دکان میں انگیٹھیوں کے پاس ایک ادھیڑ عمر کا بنگالی بیٹھا کیتلی میں چمچہ ہلا رہا تھا۔ ندیم نے اس سے پوچھا کہ اس کے پاس ڈبل روٹی یا بند وغیرہ ہوگا۔ اس نے ٹین کے صندوق میں سے ایک ڈبل روٹی نکالتے ہوئے پوچھا "کتنی ڈبل روٹی لو گے بابو؟"

ندیم نے کہا "پوری ہی دے دو۔ ساتھ کچھ چٹنی وغیرہ مل جائے گی؟"

دکاندار بولا "چٹنی تو نہیں ہے آلو کی بھجیا ہے وہ ڈال دوں؟"

ندیم نے جلدی سے کہا "ہاں ہاں وہی ڈال دو کسی دونے میں" دکاندار دونا تلاش کرنے لگا۔ اتنے میں ندیم کو موٹر کے انجن کی آواز سنائی دی اس نے ذرا سا چونک کر سامنے بازار کی نکڑ کی طرف دیکھا وہاں سے ایک سبز رنگ کی فوجی جیپ تیزی سے موڑ کاٹ کر بازار میں آگئی۔ ندیم کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔ "نہیں نہیں انہیں کیا پتہ کہ میں کون ہوں؟" ندیم نے سوچا۔ جیپ گرد کا غبار اڑاتی برق رفتاری سے چل کر ندیم کے پیچھے آن کھڑی ہوئی۔ ابھی ندیم سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ جیپ میں سے چار یا پانچ فوجی چھلانگیں لگا کر باہر کود ے اور انھوں نے ندیم کو گھیرے میں لے لیا۔ ان کی بہن گنوں

کا رخ ندیم کی طرف تھا۔ ندیم کا رنگ اڑ گیا اور ہکا بکا سا ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ بنگالی فوجی تھے اور ان کی وردیوں کا رنگ گہرا سبز تھا۔ ان کے افسر نے آگے بڑھ کر ندیم کو بازو سے پکڑ کر جیپ کی طرف زور سے دھکا دیا اور بولا "ہم کل سے تیری تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں" اس نے فوجیوں کو حکم دیا کہ اسے جیپ میں ڈال کر لے چلو۔ تین فوجی لپک کر ندیم کی طرف بڑھے اور اسے دبوچ کر گھسیٹتے ہوئے جیپ کی طرف لے گئے۔ وہ کہتا ہی رہ گیا کہ میرا قصور کیا ہے؟ مجھے کیوں پکڑ رہے ہو؟ لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے جیپ میں ڈال کر چار فوجی اس کے آمنے سامنے والی نشستوں پر بیٹھ گئے اس پر تان کر بیٹھ گئے۔ فوجی افسر نے قریب آکر کہا "اس کی تلاشی لے لو" تلاشی لینے پر ندیم کی جیب میں سے بھرا ہوا پستول، فالتو گولیاں اور کمانی دار چاقو برآمد ہو گیا بنگالی فوجی افسر نے طنز بھری ہنسی ہنس کر کہا۔

"سالا اسلحہ ساتھ لیے پھر رہا ہے۔ پاکستانی جاسوسوں کو یہاں اسلحہ کون سپلائی کرتا ہے؟ ابھی معلوم ہو جائے گا۔ چلو ہیڈ کوارٹر کی طرف۔"

فوجی افسر اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا اور جیپ تیزی سے بازار میں سے نکل کر اس کچے راستے پر آگئی جہاں سے گزر کر ندیم قصبے میں داخل ہوا تھا۔ نجمی جھونپڑی کے باہر ایک طرف درخت کی اوٹ میں کھڑی ندیم کی واپسی کا بے تابی سے انتظار کر رہی تھی کہ اچانک اس نے ایک ملٹری جیپ کو قصبے کے بازار میں سے نکل کر کچے راستے پر آتے دیکھا اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کی نگاہوں نے ندیم کو کھلی جیپ میں فوجیوں کے نرغے میں بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ ندیم بھی سر اٹھائے جھونپڑی کی طرف دیکھ رہا تھا اس کی مضطرب اور اداس نگاہیں بھی جھونپڑی پر لگی تھیں۔ جہاں سے نجمی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ نجمی جھونپڑی کے درخت کے پیچھے کھڑی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے فوجی جیپ ندیم کو لے کر اس کچے راستے پر گرد اڑاتی دوڑتی چلی گئی۔ جو دھول گھاٹ قصبے سے بڑی سڑک کی طرف جاتی تھی۔ اور جہاں سے انھیں آج شام کو اندھیرا ہو جانے کے بعد کلکتہ جانے والی لاری پکڑنی تھی۔ جب ندیم کو لے کر فوجی جیپ نجمی کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو وہ دل کو پکڑ کر وہیں بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ کیا کسی نے اس کی مخبری کر دی تھی؟ لیکن یہ تو فوجی جیپ تھی۔ ندیم کو بھارتی فوج کے سپاہیوں نے گرفتار کیا تھا۔ یہ بنگال کی پولیس نہیں تھی۔ نجمی بنگالی

پولیس کی وردی کو دور سے پہچان سکتی تھی۔ یہ بات نجمی سے چھپی ہوئی نہیں تھی کہ ندیم پاکستان سے ویزا لے کر بھارت آیا تھا۔ اس کا ویزا دلی کا تھا۔ جہاں سے وہ صرف نجمی کی خاطر لاپتہ ہو کر کلکتہ آ گیا تھا اور تب سے لے کر اب تک مصیبتیں سہہ رہا تھا۔ یہ ساری اذیتیں اس نے صرف نجمی کی خاطر برداشت کی تھیں اور نہ جانے ابھی اسے تشدد اور اذیت کے کن کن غیر انسانی مرحلوں سے گزرنا تھا یہ سوچ کر نجمی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ خالی جھونپڑی کی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھی ندیم کے لیے آنسو بہانے لگی۔ اسے لاہور میں اپنے کالج اور ندیم سے محبت کا وہ زمانہ یاد آ گیا جب وہ اپنے وطن کی آزاد فضاؤں میں ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے۔ باغ جناح کے اوپن ائیر کیفے کے کیبن میں اور کیمپس کے کیفے ٹیریا میں بیٹھ کر چائے پیا کرتے تھے اور محبت بھری باتیں کیا کرتے تھے۔ کاش اس کے ماں باپ ندیم کے رشتے کو منظور کر لیتے۔ کاش وہ اپنے گھر سے بھاگنے کا فیصلہ نہ کرتی۔ لیکن اب پچھتانے سے اور گزری ہوئی حسین یادوں کو دل میں لانے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جب رونے سے نجمی کے دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو اچانک اسے خیال آیا کہ وہ بڑے خطرے میں ہے۔ وہ اکیلی ہے، نہتی ہے اور مان سنگھ ڈاکو کے آدمی اس کی تلاش میں وہاں بھی آ سکتے ہیں۔ نجمی نے جلدی سے اٹھ کر اپنی ساڑھی کے پلو کو کمر کے ساتھ باندھا، بالوں کو درست کیا، اور جھونپڑی سے نکل کر کچے راستے کی طرف چلنے لگی۔ ندیم اسے سو سو کے پانچ نوٹ دے گیا تھا۔ نجمی کی آنکھوں میں چلتے چلتے پھر آنسو آ گئے۔ کاش یہ رقم اس نے اپنے پاس رکھی ہوتی۔ وہ فوجیوں کو رشوت دے کر بھی بھاگ سکتا تھا لیکن یہ نجمی کی خوش فہمی تھی۔ ندیم پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام تھا۔ انڈین فوجی اسے کبھی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

نجمی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا صرف ناریل کا پانی ہی پیا تھا اسے اپنے جسم میں نقاہت محسوس ہو رہی تھی مگر بھوک اسے بالکل نہیں تھی۔ ندیم کی گرفتاری کی وجہ سے اس کی بھوک جیسے مر گئی تھی۔ اسے ابھی تین کوس کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ کچے راستے کی دونوں جانب کہیں کہیں ناریل کے درخت جھکے ہوئے تھے۔ نجمی راستے کی ایک جانب ہو کر کنارے کنارے چل رہی تھی۔ بمشکل اس نے ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اسے پیچھے سے ایک بیل گاڑی آتی نظر آئی۔ اس قسم کی بیل گاڑیاں بنگال کے دیہات میں عام چلا کرتی ہیں ان کے اوپر بانس کی تیلیوں سے بنی ہوئی گنبد نما

چھت پڑی تھی۔ ایک بوڑھا بنگالی دیہاتی گاڑی کے آگے بیٹھا بیلوں کو ہانک رہا تھا۔ نجمی رک گئی۔ جب بیل گاڑی قریب آئی تو نجمی نے بنگلہ زبان میں بوڑھے سے کہا کہ وہ اسے پکی سڑک تک لے جائے۔ بوڑھے نے گاڑی روک دی اور نجمی کو بٹھا لیا۔ نجمی نے بوڑھے کو بتایا کہ وہ دھول گھاٹ میں اپنی ماسی سے ملنے آئی تھی جو کسی دوسرے گاؤں گئی ہوئی ہے۔ اب وہ واپس شہر کی لاری پکڑنا چاہتی ہے۔ پکی سڑک پر آ کر نجمی گاڑی سے اتر کر لاریوں کے اڈے پر آ گئی۔ یہاں کچھ دیہاتی لوگ ادھر ادھر بیٹھے لاری کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ کسی نے نجمی کی طرف کوئی خاص دھیان نہ دیا۔ نجمی کو پہچانے جانے کی فکر بھی نہیں تھی وہ تو بھارت کی شہری ہو چکی تھی اور ڈاکوؤں کے چنگل سے فرار ہو کر آ رہی تھی۔ وہ ملزمہ نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد کلکتہ جانے والی لاری آ گئی۔ نجمی بوجھل دل کے ساتھ اس میں سوار ہو گئی اور لاری کلکتہ کی طرف روانہ ہو گئی۔

دوسری طرف ندیم کو لے کر بنگال رائفلز کی فوجی جیپ کلکتہ کے مضافات میں سے گزرتی ہوئی دریائے ہگلی کا ہوڑہ برج عبور کر کے شہر کے بارونق بازاروں میں پہنچ چکی تھی۔ ندیم کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ ان لوگوں کا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے۔ جہاں وہ اسے لے جا رہے ہیں وہ کھلی جیپ کے درمیان میں چار بنگالی فوجیوں کے درمیان سر جھکائے بیٹھا نجمی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ نجمی ان انڈین فوجیوں کے قابو میں آنے سے بچ گئی تھی۔ ورنہ ایک "پاکستانی جاسوس" کی مدد کرنے کے الزام میں نہ جانے اس پر کیا قیامت گزرتی۔ جب جیپ چلی تھی تو ندیم کو ان انڈین فوجیوں نے اپنے گھٹنوں میں تقریباً دبوچ رکھا تھا، لیکن راستے میں جھٹکے لگتے رہے تھے اور اب یہ صورتحال تھی کہ فوجیوں کی برین گنوں کا رخ ضرور ندیم کی جانب تھا لیکن وہ ان کے درمیان جیپ کے فرش پر ذرا کھل کر بیٹھا ہوا تھا یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے ہاتھ پیچھے نہیں باندھے گئے تھے۔ ندیم کے دل میں کلکتہ شہر کے بازاروں میں آتے ہی خیال آیا کہ وہ فرار ہونے کی کوشش کرے تو فرار ہو سکتا ہے۔ اگرچہ اس میں جان جانے کا خطرہ موجود تھا لیکن فوج اور پھر بنگال اور دلی پولیس کے تشدد کے بعد بھی وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ مرنا تو اسے تھا ہی، تو پھر کیوں نہ ایک بار جان کی بازی لگا دی جائے۔ ندیم نے اس خیال کے آتے ہی جھکے ہوئے سر کے ساتھ بازار کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ جیپ جس بازار میں سے گزر رہی تھی وہاں ٹریفک اور پبلک کا رش اتنا

زیادہ نہیں تھا۔ بازار بھی کشادہ تھا اگر وہ چھلانگ لگا کر بھاگتا ہے تو پیچھے سے برین گنوں سے نکلی ہوئی گولیاں اسے بازار میں ہی بھون سکتی تھیں۔ دوسرے جیپ کی رفتار بھی تیز تھی۔ اس رفتار پر بھاگتی ہوئی جیپ سے اگر وہ چھلانگ لگائے گا تو سڑک پر گرنے کے بعد زخمی ہو جانا یقینی تھا۔ ندیم خاموشی سے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا رہا۔ بنگالی فوجی سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے ایک دوسرے سے اپنی زبان میں خدا جانے کیا باتیں کر رہے تھے۔ ایک فوجی کا گھٹنا ابھی تک ندیم کی پسلیوں سے برابر ٹکرا رہا تھا۔ فوجی جیپ کشادہ بازار کا موڑ گھوم کر نسبتاً چھوٹے بازار میں داخل ہو گئی۔ اس بازار میں دکانوں پر کافی رش تھا۔ بازار میں بھی بنگالی لوگ زیادہ تعداد میں آ جا رہے تھے۔ ندیم چوکنا ہو گیا۔ اس کے جسم میں خون گرم ہو کر گردش کرنے لگا۔ اس نے بازار میں نکلتی کچھ چھوٹی گلیاں بھی دیکھیں جیپ کی رفتار بھی ہلکی ہو گئی تھی۔ ندیم جہاں بیٹھا تھا وہاں جیپ کا عقبی دروازہ کھلا تھا۔ بلکہ دروازہ تھا ہی نہیں۔ اس کا منہ بھی بازار ہی کی جانب تھا۔ اس کے آگے چھوٹی سی آڑھتی جس پر سے ندیم آسانی سے چھلانگ لگا سکتا تھا۔ یہ ایک انمول موقع تھا۔ ندیم کے کان گرم ہو گئے۔ آنکھیں سکڑ گئیں۔ پاؤں کے پنجے کینوس کے جوتوں کے اندر سمٹ گئے۔ اس نے دونوں ہاتھ بغلوں سے نکال کر ایک مصنوعی چھینک ماری اور اس کے ساتھ ہی اللہ کا نام لے کر چلتی جیپ میں سے سڑک پر چھلانگ لگا دی۔ وہ پیچھے کی طرف گرا۔ اسے جیپ کے ایک دم بریک لگنے، فوجیوں کے شور مچانے کی آواز آئی۔ وہ اٹھا اور لوگوں کی ٹانگوں میں گھس کر ایک طرف کو بھاگا۔ وہاں لوگ اتنے تھے کہ فوجی فائر نہیں کر سکتے تھے۔ پھر بھی اسے گولیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ یقیناً ہوائی فائر تھے۔ ندیم جوان تھا اس کی رگوں میں جوان خون گردش کر رہا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ ملٹری انٹیلی جنس اور پولیس کا محکمہ اس کے ساتھ کس قسم کا وحشیانہ سلوک کرنے والا ہے۔ اس کے اندر زبردست طاقت آ گئی تھی۔ بازار میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ ندیم کو سامنے ایک گلی نظر آئی وہ بے تحاشا دوڑتا ہوا اس گلی میں گھس گیا۔ فوجیوں کے بھاری بوٹوں کی دھپ دھپ کرتی آوازیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ ندیم کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ گلی آگے کہاں جا کر نکلتی ہے اور نکلتی بھی ہے یا آگے جا کر بند ہو جاتی ہے۔ گلی میں اس نے بھاگتے ہوئے صرف اتنا دیکھا کہ دائیں بائیں مکانوں یا فلیٹوں کے زینے تھے جن کے دروازے

پر عورتیں بیٹھی شاید بیڑیاں بنا رہی تھیں۔ ندیم دوڑتا چلا گیا پیچھے فائر ہوا اسے یوں لگا جیسے گولی اس کے کان کے قریب سے گزر گئی ہو۔ وہ گھبرا گیا۔ پوری بات کی تہہ تک پہنچے بغیر ندیم دیوانہ وار ایک چھوٹی سی گلی میں گھس گیا جو اس گلی میں سے دائیں طرف نکلتی تھی۔ وہ بھاگ کر آگے گیا تو اس کا دل زور سے اچھلا گلی آگے بند تھی۔

* * *

ندیم کو کیا معلوم تھا کہ یہ گلی آگے جا کر بند ہو جائے گی۔ اپنی جان بچانے کے لیے اسے جو گلی سامنے نظر آئی وہ اس میں گھس گیا تھا۔ کلکتہ ویسے بھی اتنا بڑا شہر تھا کہ یہ علاقے ندیم کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ بنگال رائفلز کے انڈین فوجی اس کے پیچھے بھاگے چلے آرہے تھے۔ ندیم کے پاس پیچھے مڑ کر دیکھنے کی بھی مہلت نہیں تھی۔ اسے اپنے دائیں جانب ایک مکان کا دروازہ کھلا ہوا نظر آیا۔ وہ کچھ نہیں جانتا تھا کہ کس کا مکان ہے اور اس میں کون رہتا ہے۔ وہ اندھا دھند اس مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر جاتے ہی ندیم نے غیر شعوری طور پر دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی اسے سامنے والے کمرے سے کسی بھاری بھر کم مرد کی آواز آئی۔

"کون ہے اوئے باہر؟"

لہجہ پنجابی اور ضلع جھنگ کا تھا۔ کمرے کے دروازے پر پردہ لٹک رہا تھا۔ ندیم نے سوچا کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ موت تو اس کے سر پر پہنچ ہی چکی ہے۔ وہ پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ اونچی پشت والے پلنگ پر ایک پکی عمر کا آدمی بوسکی کی قمیض اور نیلے ساٹن کی دھوتی پہنے نیم دراز تھا۔ ندیم کی نگاہ بے اختیار دیوار پر پڑی جہاں مکے مدینے کا ایک قطعہ لگا ہوا تھا۔ یہ آدمی مسلمان ہے۔ اس خیال کے آتے ہی ندیم نے کلمہ شریف بلند آواز میں پڑھتے ہوئے کہا۔

"میں مسلمان ہوں۔ پولیس میرے پیچھے لگی ہے۔ اس وقت آپ مجھے بچا لیں۔ میں بے قصور ہوں۔"

وہ آدمی حقے کی نے کو آگے سے ہٹاتے ہوئے اٹھا۔ اس نے اپنے لمبے بال خضاب سے کالے کیے ہوئے تھے۔ رنگ سانولا، چہرا چوڑا اور ناک یونانیوں کی طرح ستواں تھا۔ خدا جانے اس کے دل

پر ندیم نے جو کلمہ شریف پڑھا تھا اس کا اثر ہوا تھا۔ یا کیا بات تھی کہ اس آدمی نے ندیم کو ساتھ لیا اور کمرے سے ملحقہ ایک کوٹھڑی میں لے گیا۔ وہاں لکڑی کے بے شمار خالی کھوکھے پڑے تھے "اس کھوکھے میں چھپ کر بیٹھ جاؤ۔"

ندیم خالی کھوکھے میں اتر کر بیٹھ گیا۔ اس آدمی نے اوپر لکڑی کا تختہ ڈال کر ایک خالی کھوکھا اس کے اوپر رکھ دیا۔ اتنے میں دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑانے کی آواز آئی۔ پھر باہر سے انڈین فوجی کی آواز بلند ہوئی "دروازہ کھولو۔ جلدی کرو۔ دروازہ کھولو نہیں تو ہم اسے توڑ دیں گے۔"

ندیم نے اپنا سانس روک لیا۔ اس کے کان باہر کی آوازوں پر لگے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی کسی نے تحکمانہ انداز میں پوچھا "ادھر کوئی بھگوڑا تو نہیں آیا؟"

ندیم کے محسن نے کہا "ادھر کوئی نہیں آیا جوان۔ کیوں کیا بات ہے؟"

دوسرے فوجی کی آواز بلند ہوئی "گھر کی تلاشی لے لو۔"

ندیم کھوکھے کے اندر سمٹ سا گیا۔ اسے کمرے میں فوجی بوٹوں کی آواز آئی۔ پھر چیزیں ادھر ادھر گھسیٹی جانے لگیں۔ انڈین ملٹری آفیسر کی آواز سنائی دی۔ "اوپر جا کر سرچ کرو۔"

پھر کسی نے کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر پوچھا "یہاں کیا ہے؟"

ندیم کو میزبان کی آواز سنائی دی "ادھر ہمارا کھوکھا کا سامان پڑا ہے۔ ہم ڈرائی فروٹ کا بزنس کرتا ہے مارکیٹ میں۔ آپ کو بولا صاحب کہ ادھر کوئی نہیں آیا۔ اگر وہ بھگوڑا آیا تو ہم اسے پکڑ کر تھانے لے جائے گا۔"

انڈین فوجی خالی کھوکھوں کو ٹھوکریں مار کر دیکھ رہا تھا۔ ندیم جس کھوکھے میں بند سہما ہوا تھا۔ اس کے اوپر والے کھوکھے کے تختے کو اٹھانے اور پھر زور سے اسے بند کرنے کی آواز آئی۔ ندیم دل میں خدا سے اپنے تحفظ کی دعائیں مانگنے لگا۔ انڈین فوجی اوپر والا خالی کھوکھا دیکھ کر کوٹھڑی سے باہر نکل گیا تھا۔

اب مکان کا مالک بھی مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے آواز میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا "جناب تم فکر نہ کرو۔ ادھر اگر کوئی بھگوڑا آیا تو ہم اسے یہیں پکڑ کر بند کر دے گا۔"

اب فوجی افسر کی آواز سنائی دی "وہ نوجوان ہے رنگ سانولا ہے داڑھی بڑھی ہوئی ہے۔

نسوار کی جیکٹ اور پتلون میں ہے۔ وہ پاکستانی جاسوس ہے تم نے اسے پکڑا تو تمہیں فوج سے انعام ملے گا۔"

مالک مکان کی آواز آئی "فکر نہ کرو صاحب۔ ہم کو انعام کا لالچ نہیں۔ پاکستانی جاسوس ادھر آیا تو بچ کر نہیں جائے گا۔" فوجی بوٹوں کی آواز کمرے سے باہر نکل گئی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ ندیم نے خالی کھوکھے کے اندھیرے میں سکڑ کر بیٹھتے ہوئے آنکھیں بند کر کے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے دشمن سے اسے بچا لیا تھا۔ کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ پھر اوپر والا کھوکھا ہٹا کر ندیم کے کھوکھے کا تختہ ہٹا دیا گیا۔ کوٹھری کی نیم روشن فضا میں ندیم نے اپنے محسن کا چہرہ دیکھا اور کھوکھے میں سے باہر نکلتے ہوئے بولا "میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں۔ یہ مجھ پر جھوٹا الزام لگایا گیا ہے۔ میں پاکستانی مزدور ہوں مگر جاسوس نہیں ہوں۔"

مالک مکان نے ندیم کو ہاتھ سے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ندیم کو دوسری منزل پر لے گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا جس کی گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکیاں بند تھیں۔ یہاں دیوار کے ساتھ بانس کی دو آرام کرسیاں پڑی تھیں۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک پلنگ بچھا تھا جس پر نئی مچھر دانی اوپر کو الٹ دی گئی تھی۔ سامنے شاید غسل خانہ کا دروازہ تھا جس کے باہر تانبے کی بالٹی اور لوٹا رکھا ہوا تھا۔ مالک مکان دروازہ بند کر کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور ندیم سے کہا "بیٹھ جاؤ سامنے۔"

ندیم بانس کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مالک مکان نے اسے ہاتھ ہلا کر خاموش رہنے کو کہا اور بیڑی کا کش لگا کر بولا۔

"بھائی جی میں نے تمہیں اپنے مکان میں چھپا کر جانتے ہو کتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا؟ میں نے ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کہ تم نے اندر آتے ہی کلمہ شریف پڑھا تھا۔ میں نے یہ سب کچھ خدا اور اس کے رسول کے لیے کیا ہے۔ اب مجھے صاف صاف بتاؤ کہ تم اگر پاکستانی ہو تو یہاں کیسے آ گئے ہو اور ملٹری تمہارے پیچھے کیوں لگی ہوئی ہے۔ اگر تم پاکستانی جاسوس نہیں ہو تو یوں چھپتے کیوں پھر رہے ہو؟"

ندیم کو وہ مخلص اور سچا مسلمان نظر آیا اس نے سوچا کہ اسے سب کچھ صاف صاف بتا دینا چاہیے کہ اصل ماجرا کیا ہے۔ پھر بھی اس نے اپنے دل کا حال زبان پر لانے سے پہلے پوچھا

"لگتا ہے آپ پنجاب کے رہنے والے ہیں اور سچے مسلمان ہیں۔ آپ کلکتے میں کب سے ہیں؟"

اس آدمی نے کہا "میرا نام ملک یحییٰ ہے۔ ہم اصل میں چنیوٹ کے رہنے والے ہیں لیکن ایک مدت سے کلکتے میں فروٹ کا بزنس کر رہے ہیں۔ میں اور میرے بیوی بچے بھارت کے شہری ہیں۔ میرے بچے چنیوٹ اپنے رشتے داروں سے ملنے پاکستان گئے ہوئے ہیں اب تم مجھے اپنے بارے میں سچ سچ ساری بات بتا دو۔ میں شاید تمہاری کوئی مدد نہ کر سکوں گا۔ کیونکہ مسلمان یہاں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ لیکن یہ ضرور وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

تب ندیم نے شروع سے لے کر آخر تک چنیوٹ کے نیک دل ملک صاحب کو ساری کہانی سنا دی کہ کس طرح وہ اپنی محبوبہ نجمی کے ساتھ لاہور سے بھاگ کر کراچی پہنچا کہ اس سے شادی کرے گا اور اس کے بعد کیسے نجمی اغوا ہو کر بھارت پہنچا دی گئی اور پھر وہ ویزا لے کر دہلی آ گیا اور نجمی کی تلاش میں کیسے سوناگاچی پہنچا۔ جہاں نجمی چندا بائی کے روپ میں مجرا کرتی تھی۔ پھر کیسے کیسے ہولناک حالات سے گزر کر وہ نجمی عرف چندا بائی کو ڈاکو مان سنگھ کے چنگل سے چھڑا کر ایک گاؤں میں پہنچا اور وہاں گرفتار کر لیا گیا۔ کیونکہ یہاں کی فوج اور پولیس اسے پاکستانی جاسوس سمجھتی ہے۔ اور برابر اس کی تلاش میں تھی۔ ندیم نے یہ ساری داستان پنجابی میں بیان کی تھی جب وہ اپنی کہانی بیان کر چکا تو ملک صاحب نے دوسری بیڑی سلگائی۔ اٹھ کر کھڑکی کے پاس گئے کھڑکی کھول کر نیچے گلی میں جھانک کر دیکھا۔ کھڑکی بند کر کے ندیم کے پاس آ کر بولے "پہلے تم کپڑے بدل لو۔"

ملک صاحب نے ندیم کو کھدر کا ایک کرتہ کالی واسکٹ اور دھوتی دی جسے ندیم نے فوراً پہن لیا۔ ملک صاحب نے ندیم کے کپڑے ایک گٹھڑی میں باندھ کر پلنگ کے نیچے چھپا دیئے اور کہا "تم بیٹھو میں تمہارے لیے چائے لاتا ہوں۔"

ملک صاحب نیچے اتر گئے۔ ندیم اس کے چھوٹے سے فلیٹ میں اکیلا رہ گیا تو اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے۔ کہیں یہ آدمی اسے گرفتار تو نہیں کرا دے گا؟ ندیم کے دل میں اس قسم کے خیالات کا پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔ کیونکہ وہ نامساعد حالات میں سے گزر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ ملک صاحب ایک سچے مسلمان ہیں۔ اگر انہیں اسے گرفتار ہی کرانا ہوتا تو

جب فوجی اندر آئے تھے تو اس وقت گرفتار کروا دیتا۔ تھوڑی دیر بعد ملک صاحب ایک چھوٹا سا ٹرے اٹھائے اندر آئے۔ ٹرے میں ایک بند مکھن چائے کی ایک چینک اور دو پیالیاں رکھی تھیں۔

"گھر میں کوئی نہیں ہے۔ نوکر بھی آج نہیں آیا۔ یہ اچھی بات ہوئی نوکر ہندو بنگالی ہے اس کو تمھارا پتہ چل جاتا تو ہو سکتا تھا کہ وہ پولیس کو جا کر خبر کر دیتا۔ یہ چائے میں بازار والے ہوٹل سے لایا ہوں" "لو پیو" ندیم کو بڑی بھوک لگ رہی تھی۔

وہ مکھن بند کھانے لگا۔ ملک صاحب چائے پیالیوں میں ڈالتے ہوئے بولے "اب تم کیا چاہتے ہو؟ یہاں تم زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔ تم اس علاقے میں گم ہوئے ہو لہٰذا فوج کے آدمی سفید کپڑوں میں یہاں ضرور تمھاری سراغ رسانی کے لیے لگا دیئے جائیں گے۔ بلکہ پولیس کے خفیہ آدمی تو اب تک بازار میں منڈلانے لگے ہوں گے۔ جس لڑکی کے پیچھے تم اپنی جان پر کھیل کر یہاں تک آ گئے ہو وہ تمھارے کہنے کے مطابق تمھارے ساتھ پاکستان جانے پر راضی نہیں ہے۔ تو پھر میں تمھیں بھائی جی یہی مشورہ دوں گا کہ چپکے سے کلکتے میں جو پاکستانی ہائی کمیشن کا دفتر ہے وہاں جا کر پناہ حاصل کر لو۔ سارے جھنجٹ سے چھٹکارا مل جائے گا۔ کیا خیال ہے تمھارا۔؟"

ندیم خاموشی سے چائے پی رہا تھا۔ ملک صاحب کی بات اس نے بڑے غور سے سنی تھی۔ جب وہ بات ختم کر چکے تو بولا "ملک صاحب! انجمی کے دل میں یونہی اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے کا بھوت سوار ہے۔ یہ عارضی قسم کا جذبہ ہے۔ میں اسے پاکستان جانے پر راضی کر لوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے اس سے ایک بار کھل کر بات کرنے کا موقع مل جائے۔"

ندیم نے ایک عقلمندی کی تھی کہ ملک صاحب کو یہ نہیں بتایا تھا کہ ذکریا اسٹریٹ والے سیٹھ جبار علی نے اسے اپنے پاس پناہ دی تھی۔ اس کے دل میں یہ خیال تھا کہ ہو سکتا ہے سیٹھ جبار اب اس کی مدد نہ کرے۔ ایسی صورت میں ملک صاحب اس کے کام آ سکتے تھے۔ اس بنا پر ندیم نے ان کے آگے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ ملک صاحب چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد بولے "تم اپنی چندا سے کیسے مل سکتے ہو؟ وہ تو سونا گاچی میں ہو گی، تم وہاں گئے تو پکڑے جاؤ گے اور میں بھی مصیبت میں پھنس جاؤں گا۔ نا بھائی نا۔ تو اپنے ملک کے سفارت خانے میں ہی چلا جا۔ تمھارے لیے یہی بہتر ہے۔ تمھاری چندا تو یہاں کی شہری بن چکی ہے اس کا خیال دل سے نکال ہی دے تو اچھا ہے۔"

مگر ندیم یہ کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ وہ انجمی کو لیے بغیر پاکستان واپس جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ملک صاحب کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ مانے۔ ندیم نے سوچا کہ ملک صاحب اپنے طور پر ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وہ جتنی مدد اس کی کر سکتے تھے انھوں نے اپنی اور اپنے بال بچوں کی زندگیوں کا داؤ لگا کر اس کی مدد کر دی ہے اور اسے ایک بار انڈین ملٹری سے بچا لیا ہے اب انھیں مزید مجبور کرنا ان کے ساتھ زیادتی ہو گی۔ چنانچہ ندیم نے سیٹھ جبار کے پاس ہی واپس جانے کا ارادہ کر لیا اور ملک صاحب سے کہا "پھر آپ مجھ پر ایک اور مہربانی کر دیجئے گا۔ مجھے کسی طرح ذکریا اسٹریٹ والی مسجد ناخدا میں پہنچا دیجئے۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی فراموش نہیں کروں گا۔

ملک صاحب بولے "یہ میں کر سکتا ہوں۔ اس کے لیے تمھیں رات کا انتظار کرنا ہو گا۔ کیونکہ دن کے وقت میں تمھیں نکالنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ خطرہ رات کے وقت بھی ہو گا کیونکہ سی آئی ڈی والے رات کے وقت بھی باہر کسی نہ کسی جگہ چھپے بیٹھے ہوں گے۔ مگر میں تمھیں کسی طریقے سے لے جاؤں گا۔ اب تم یہاں آرام کرو پلنگ پر۔ میں برتن لے کر ہوٹل میں جاتا ہوں اور باہر کے حالات کا جائزہ بھی لیتا ہوں۔ تم کھڑکی وغیرہ مت کھولنا۔ کیونکہ میں باہر سے مکان پر تالا ڈال کر جاؤں گا۔"

ملک صاحب چینک اور پیالے لے کر چلے گئے۔ ندیم کرسی پر سے اٹھا اور پلنگ پر دراز ہو گیا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا یہاں اسے بہت حد تک تحفظ بھی مل گیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند ہی کی تھی کہ نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ ملک صاحب مکان کے دروازے پر تالا لگا کر خالی برتن لے کر ہوٹل میں آ گئے۔ ہوٹل بازار میں تھا۔ بازار میں بڑی رونق تھی۔ ہوٹل والا ملک صاحب کا محلے دار تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آج ملک صاحب کا نوکر نہیں آیا جس کی وجہ سے انھیں خود چائے گھر لے جانی پڑی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ملک صاحب اکثر ناشتہ وغیرہ اپنے گھر پر ہی کیا کرتے ہیں۔ ملک صاحب ہوٹل کے مالک کے پاس کرسی پر بیٹھ کر اس سے بنگلہ میں باتیں کرنے لگے۔ ہوٹل کا مالک ہندو بنگالی تھا۔ ملک صاحب کی نگاہیں بازار میں آنے جانے والوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ انھیں سی آئی ڈی والوں کو پہچاننے میں مہارت نہیں تھی۔ وہ یونہی لوگوں کو آتے جاتے

دیکھ رہے تھے۔ کوئی اگر گاہک کی طرف ذرا سا دیکھتا تو ملک صاحب یہی سمجھتے کہ یہ ضرور سی آئی ڈی والا ہے۔ انھوں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ پاکستانی نوجوان ندیم کو مکان سے رات کے وقت کس طرح نکال کر ناخدا مسجد میں پہنچانا ہے۔ وہاں بیٹھ کر انھوں نے چائے کا ایک گلاس منگوا لیا اور اسے پیتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ پون گھنٹے کے بعد ملک صاحب واپس مکان میں آئے تو ندیم گہری نیند سو رہا تھا۔ انھوں نے اسے جگایا اور نیچے والے کمرے میں جا کر بیٹھ کر حقہ پینے لگے۔ اپنے دل میں انھوں نے اپنے پاکستانی مہمان کو رات کے وقت وہاں سے نکال کر مسجد تک پہنچانے کے لیے جو اسکیم بنائی تھی۔ اس پر عملدرآمد بھی رات کے وقت ہی شروع ہونا تھا۔ دوپہر کے وقت ملک صاحب بازار میں ایک بار پھر گئے وہ مکان پر تالا لگاتے گئے تھے۔ بازار میں کونے والے ہوٹل سے انھوں نے بریانی کے دو پیکٹ خریدے اور واپس آ گئے اس وقت ندیم بیدار ہو چکا تھا۔ دونوں نے مل کر بریانی کھائی۔ ملک صاحب نے پوچھا "مسجد ناخدا میں تم کس کے پاس جاؤ گے؟" ندیم نے سیٹھ جبار کا نام لیے بغیر کہا کہ وہاں میرا ایک واقف کار رہتا ہے۔ وہ مجھے سونا گاچی بخشی کے پاس پہنچا دے گا۔" ملک صاحب نے اس کے بعد مزید کچھ نہ پوچھا۔ کھانے کے بعد ندیم نے ملک صاحب سے پوچھا کہ "رات [illegible] مجھے ناخدا تک کیسے پہنچائیں گے؟" ملک صاحب بڑی [illegible] تھے۔ وہ دونوں اوپر والے کمرے میں بیٹھے تھے۔ ملک صاحب نے کہا "رات کو میری چھوٹی ویگن یہاں مال لینے آئے گی تم کو میں خالی کھوکھے میں چھپا دوں گا۔ تمھارے والا کھوکھا بھی دوسرے کچھ ڈرائی فروٹ سے بھرے ہوئے کھوکھوں کے ساتھ ہی ویگن میں رکھ دیا جائے گا۔ میرے دو آدمی ویگن کے ساتھ ہوں گے تم کھوکھے کے اندر خاموش رہنا۔ میرے کسی نوکر کو تمھارے بارے میں معلوم نہیں ہوگا۔ میں ویگن کے ساتھ ہوں گا۔ مسجد ناخدا کے پاس جا کر میں ویگن رکوا لوں گا۔ دونوں نوکروں کو میں کسی طریقے سے وہاں سے تھوڑی دیر کے لیے اپنے دوسرے والے گودام کی طرف بھجوا دوں گا۔ اس دوران ہمیں موقع مل جائے گا کہ تم کھوکھے میں سے نکل کر مسجد ناخدا میں جا سکو۔"

ندیم کو یہ منصوبہ بڑا مناسب اور محفوظ محسوس ہوا۔ ملک صاحب نے اسے بتایا کہ گلی کے باہر سی آئی ڈی والے ضرور موجود ہوں گے ان کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے یہی اسکیم سب سے بہتر رہے گی۔ دوپہر کے بعد ندیم پھر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ وہ اس موقع سے

فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے جسم کو پورا آرام پہنچانا چاہتا تھا۔ کیونکہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ آگے اس کی قسمت میں کس قدر بے آرامیاں لکھی ہوئی ہیں۔ ملک صاحب سہ پہر کے وقت تالا لگا کر ویگن کا انتظام کرنے چل دیے۔ وہ شام کو واپس آئے ندیم جاگ رہا تھا اگرچہ اندھیرا ہو گیا تھا مگر ندیم نے ملک صاحب کے آنے تک کوئی بتی روشن نہیں کی تھی۔ ملک صاحب تالا کھول کر آئے تو انھوں نے بتی جلائی اور اوپر والے کمرے میں آ کر ندیم کو بتایا کہ سارا انتظام ہو گیا ہے۔ رات کو بھی ندیم نے ملک صاحب کے ساتھ ہی بیٹھ کر کھانا کھایا۔

ملک صاحب نے کہا "بھائی جی تم تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ۔ میں وقت پر تمھیں جگا دوں گا۔"

ندیم کو نیند نہیں آ رہی تھی اس نے کافی آرام کر لیا تھا پھر بھی وہ ملک صاحب کے کہنے پر پلنگ پر لیٹ گیا۔ ملک صاحب نیچے والے کمرے میں لیٹے اخبار وغیرہ پڑھتے رہے۔ جب رات کے ٹھیک بارہ بجے تو انھوں نے اوپر والے کمرے میں آ کر ندیم کو جگایا اور کہا "میرے آدمی ویگن لے کر آ رہے ہوں گے تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میرا خیال ہے کہ تم یہاں سے نکلتے ہوئے اپنی والی جیکٹ اور پتلون پہن لو۔ کیونکہ میرے لیے انھیں کسی جگہ چھپانا مشکل ہو جائے گا۔ تم کو تو اب لکڑی کے کھوکھے میں ہی بیٹھنا ہے۔ میں نے تمھارے والے خالی کھوکھے میں تازہ ہوا کے لیے سوراخ کر دیے ہیں۔ اور پھر مسجد ناخدا یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ تمھیں تھوڑی دیر کے لیے ہی اندر بند رہنا ہوگا۔"

ندیم ملک صاحب کے ہاں اپنا کوئی سراغ چھوڑ کر انھیں مشکل میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے پلنگ کے نیچے سے جیکٹ اور پتلون نکال کر دھوتی کرتے کی جگہ پہن لی۔ ملک صاحب نے جیب سے دس دس کے دس نوٹ نکال کر ندیم کو دیے۔

"یہ تم اپنے پاس رکھ لو۔ شاید تمھیں ضرورت پڑ جائے۔" ندیم نے بہت انکار کیا کہ وہ اپنے ایک محسن کے پاس ہی جا رہا ہے اسے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے لیکن ملک صاحب نے اصرار کر کے سو روپے ندیم کی جیب میں ڈال دیے۔ پھر وہ اسے لے کر گودام میں آ گئے۔ یہاں خشک میووں سے بھرے ہوئے بیس پچیس کھوکھے پڑے تھے۔ ان میں وہ خالی کھوکھا بھی تھا جس میں

کل رات ندیم چھپا تھا۔ ملک صاحب نے اس کا تختہ اتار دیا اور کہنے لگے "ابھی تم میرے کمرے میں ہی بیٹھو۔ میرے آدمی جب آئیں گے تو تم اس میں اتر جانا۔"

ندیم ملک صاحب کے کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ بتی جل رہی تھی۔ اس نے ملک صاحب کا ایک بار پھر شکریہ ادا کیا۔ ملک صاحب بولے "بھائی جی اس کی ضرورت نہیں ہے میں نے جو کچھ بھی تھوڑا بہت کیا خدا اور رسولؐ کی خوشنودی کے لیے کیا ہے۔" پھر وہ پاکستان کی باتیں کرنے لگے کہ ہم پاکستان کو اسلام کا قلعہ سمجھتے ہیں۔

اتنے میں گلی میں ویگن کے داخل ہونے کی آواز سنائی دی۔ ملک صاحب نے حقے کی نے ایک طرف کی اور بولے "میرے آدمی آگئے ہیں۔ تم جلدی سے کھوکھے میں چھپ جاؤ۔" ندیم کوٹھری میں جا کر لکڑی کے کھوکھے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ کھوکھے میں کافی جگہ تھی۔ ملک صاحب نے ایک تکیہ ندیم کے پیچھے ڈالا اور تختہ اوپر کر کے دو تین کیلیں عارضی طور پر ٹھونک دیں اور آہستہ سے بولے "تم اگر چاہو تو ذرا سا زور لگا کر کیل اکھاڑ سکو گے۔ میں تمھارے ساتھ ہوں گا۔ فکر نہ کرنا۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ ملک صاحب کوٹھری سے نکل کر دروازے پر گئے۔ دروازہ کھولا۔ باہر دو بنگالی مزدور کھڑے تھے جو ان کے مال گودام میں ہی کام کرتے تھے۔ ملک صاحب نے انھیں بنگلہ میں کہا کہ اندر آکر کھوکھے ویگن میں رکھ دو۔ ملک صاحب کے ہاں سے اکثر و بیشتر مال آتا جاتا ہی رہتا تھا۔ ویگن گلی میں بازار کی طرف رخ کیے کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے باہر نکل کر ملک صاحب کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بونٹ سے ٹیک لگا کر بیڑی پینے لگا۔ مزدوروں نے کھوکھے اٹھا کر ویگن میں رکھنا شروع کر دیا۔ جس کھوکھے میں ندیم بند تھا اس کو ملک صاحب نے خود ہاتھ لگا کر احتیاط سے مزدور کے کاندھے پر رکھا۔ کھوکھا بھاری تھا۔ کمزور بنگالی مزدور ذرا ڈگمگایا تو ملک صاحب نے دوسری طرف سے سہارا دے دیا اور خود اسے سہارا دے کر ویگن تک لائے اور ویگن کے پیچھے دوسرے کھوکھے کے اوپر رکھ دیا۔ پھر وہ اسی جگہ کھڑے رہے تاکہ ڈرائی فروٹ سے بھرا ہوا کوئی دوسرا کھوکھا اس کے اوپر نہ رکھ دیا جائے۔ جب سارا مال ویگن میں آگیا تو ملک صاحب نے مکان کو تالا لگایا۔ دونوں مزدوروں کو آگے ڈرائیور والی سیٹ کے پاس بیٹھنے کو کہا اور خود ویگن کے

پیچھے ندیم والے کھوکھے کے پاس بیٹھ گئے۔ ویگن پیچھے سے کھلی تھی۔ وہ گلی سے نکل کر بازار میں آگئی۔ بازار آدھی رات کے وقت سنسان تھا مگر کھمبوں کی بتیاں روشن تھیں۔ ڈرائیور کو ملک صاحب نے سمجھا دیا تھا کہ وہ مسجد ناخدا کی طرف سے ہو کر چلے۔ وہاں انھیں امام صاحب کے ہاں ڈرائی فروٹ کی پیٹی رکھوانی ہے۔ ویگن کلکتے کی قدرے گنجان آبادی سے نکل کر کشادہ سڑک پر دوڑنے لگی۔ اسی سڑک کے دونوں جانب اونچے اونچے فلیٹ تھے جن میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ ملک صاحب بڑے خوش تھے کہ سی آئی ڈی یا پولیس والوں سے پالا نہیں پڑا تھا۔ ندیم کھوکھے کے اندر تکیے سے ٹیک لگائے اپنے آپ کو سمیٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ کھوکھے میں گہرا اندھیرا تھا۔ مگر تختے کے سوراخوں میں سے تازہ ہوا برابر اندر آرہی تھی۔ پھر اسے یہ بھی اطمینان تھا کہ تھوڑے فاصلے کی بات ہے ابھی مسجد ناخدا کا بازار آجائے گا اور اسے اس بند کھوکھے سے نجات مل جائے گی۔

جس بند کھوکھے میں ہو کر بیٹھا۔ ندیم یہ باتیں سوچ رہا تھا اس کے باہر دوسرے کھوکھے پر ملک صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ویگن آدھی رات کے سنسان بازاروں میں اڑی جا رہی تھی۔ پھر ویگن نے ایک موڑ کاٹا اور اس سڑک پر آگئی جو آگے جا کر لوئر چیت پور روڈ کے ساتھ جا ملتی تھی۔ مسجد ناخدا اسی لوئر چیت پور روڈ کے آخری سرے پر مشرق کی جانب واقع تھی۔ یہ سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ ویگن تھوڑی دور اس سڑک پر گئی تھی کہ اچانک ڈرائیور نے بریک لگا دی۔ ملک صاحب گرتے گرتے بچے۔ کھوکھے کے اندر ندیم کا سر کھوکھے کے تختے سے ہلکے سے ٹکرا گیا۔

ملک صاحب نے چلا کر بنگلہ میں پوچھا۔

"کیا ہو گیا ہے؟ گاڑی کیوں کھڑی کی ہے؟" اس کے ساتھ ہی وہ نیچے اتر کر ڈرائیور کی طرف بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ آگے سڑک پر چار پانچ آدمی فوجی وردی میں ملبوس رائفلیں تانے کھڑے ہیں۔ ایک فوجی نے آگے بڑھ کر ڈرائیور کو گھسیٹ کر سیٹ سے باہر نکالا اور اسے دو تین تھپڑ مار کر بنگلہ میں کہا "سالے اسمگلنگ کرتے ہو رات کو؟ کون ہے تمھارا مالک؟" ملک صاحب کا دل دھک سے رہ گیا وہ سمجھ گئے کہ ان کی خیر نہیں وہ ایک ایسے نوجوان کو بچا کر لیے جا رہے ہیں جس پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام ہے اور جس کی فوج کو تلاش ہے انھوں نے جلدی سے

آگے بڑھ کر بنگلہ زبان میں ہی کہا کہ حضور میں ڈرائی فروٹ کا بزنس کرتا ہوں۔ اپنا مال لے کر گودام میں رکھنے جا رہا ہوں۔

اسی بنگلہ فوجی نے رائفل کی نالی کا رخ ملک صاحب کی طرف کر دیا اور گرج کر کہا "تمھاری خیریت اس میں ہے کہ اپنے آدمیوں کو لے کر یہاں سے بھاگ جاؤ نہیں تو تم سب کو گولی سے اڑا دوں گا۔"

ندیم نے یہ آوازیں سنیں تو سہم کر رہ گیا۔ اتنی بنگالی زبان وہ جاننے لگا تھا کہ یہ سمجھ جائے کہ فوجی سپاہیوں نے ویگن کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ ملک صاحب نے جب یہ سنا کہ فوجی ان کو بھاگ جانے کا کہہ رہے ہیں تو فوراً سمجھ گئے کہ یہ اصلی فوجی نہیں ہیں بلکہ لٹیرے ہیں جو اکثر فوجی وردیوں میں ملبوس ہو کر رات کو وارداتیں کیا کرتے ہیں۔ اب اس خیال سے کہ ندیم کو اصل حالات کا علم ہو جائے۔ انھوں نے ہندوستانی زبان میں ذرا بلند آواز میں کہا "جناب ہم اپنا مال چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں۔ آپ کو اگر ضرورت ہے تو ڈرائی فروٹ کی دو چار پیٹیاں لے لیں۔"

اس پر بنگالی فوجی نے انھیں ڈانٹ کر ہندوستانی میں ہی کہا "بھاگ جاؤ نہیں تو شوٹ کر دوں گا۔"

اس کے ساتھ ہی اس کے دو فوجی ساتھی اچھل کر ویگن کے پیچھے بیٹھ گئے۔ دوسرے فوجی اگلی سیٹ پر چڑھ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ویگن لے کر فرار ہو گئے۔ ویران بازار میں ملک صاحب اپنے ڈرائیور اور دو بنگالی مزدوروں کے ساتھ اکیلے رہ گئے۔ وہ دل ہی دل میں ندیم کے لیے دعا مانگنے لگے اس بات کا انھیں اطمینان بھی تھا کہ یہ اصلی فوجی نہیں ہیں بلکہ لٹیرے ہیں کیونکہ اصلی فوجی کبھی ایسا نہیں کرتے کہ مال لے کر فرار ہو جائیں۔ ملک صاحب کو یقین تھا کہ ندیم کو صورتِ حال کا علم ہو گیا ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے گا۔ انھوں نے نقلی فوجیوں کو غصے میں دو چار جلی کٹی سنائیں اور مزدوروں سے کہا "یہ ڈاکو لٹیرے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ نہ ہوتا تو میں دیکھ لیتا۔ چلو واپس چلو۔" ایک مزدور نے کہا کہ سیٹھ ہمیں تھانے میں رپٹ درج کرانی چاہیے۔ ملک صاحب بھلا یہ کیسے کر سکتے تھے۔ کہنے لگے چھوڑو کون اس جھمیلے میں پڑے۔ چار پانچ ہزار کا نقصان ہے۔ بنگلہ پولیس خواہ مخواہ پریشان کرے گی اور

وہ اپنے آدمیوں کو لے کر لوئر چیت پور روڈ کی طرف چلنے لگے کہ شاید وہاں سے کوئی ٹیکسی مل جائے۔ دوسری طرف ویگن جس میں بنگالی فوجی سوار تھے واپس بڑی سڑک پر آ گئی اور اس کا رخ دریائے ہگلی کی جانب ہو گیا۔ ندیم کھوکھے کے اندر عالمِ پریشانی میں سہما ہوا بیٹھا تھا۔ اسے ساری صورتِ حال کا علم ہو گیا تھا وہ جان چکا تھا کہ فوجی ویگن کو لے کر کسی نامعلوم سمت کو جا رہے ہیں۔ اور انھوں نے ملک صاحب اور ان کے آدمیوں کو اتار کر پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ملک صاحب نے ہندوستانی میں بات کرتے ہوئے ندیم کو یہ اشارہ دے دیا تھا کہ ویگن کو فوجی چھین کر لے جا رہے ہیں وہ یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ ہندوستانی میں یہ بات ملک صاحب نے ندیم کو حالات سے آگاہ کرنے کے لیے کی تھی۔ لیکن اب یہ سوچ کر اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا کہ اگر یہ فوجی ہیں تو وہ موت کے منہ میں جا رہا ہے اور اس کی خیر نہیں ہے۔ ندیم کو ان دو فوجیوں کی باتیں کرنے کی آواز بھی ویگن کے شور میں سنائی دے رہی تھی۔ جو اس کے کھوکھے کے پاس ہی ویگن میں بیٹھے تھے۔ وہ بنگلہ میں باتیں کر رہے تھے۔ ندیم ان کی گفتگو سے کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ ویگن تیزی سے ہموار سڑک پر اڑی جا رہی تھی۔ پھر وہ ایک طرف کو مڑ گئی یہ سڑک زیادہ ہموار نہیں تھی اور ندیم کو دھچکے لگنے لگے اس نے کھوکھے کی دیواروں سے اپنے پاؤں اور ہاتھ لگا دیئے۔ خدا خدا کر کے یہ سڑک ختم ہوئی اور ویگن نسبتاً ہموار راستے پر چلنے لگی۔ اس سڑک پر بھی ویگن کوئی آدھ گھنٹے تک چلتی رہی ندیم کو جو ہوا کھوکھے کے سوراخوں میں سے اندر آ رہی تھی اس میں ایسی گھاس کی خوشبو اسے محسوس ہونے لگی جو عام طور پر دریا کے کنارے اگی ہوتی ہے اور آدھی دریا میں ڈوبی ہوتی ہے۔ اس نے یہی نتیجہ نکالا کہ ویگن دریائے ہگلی کے آس پاس رواں دواں ہے۔ وہ دل میں خدا سے دعا مانگتا اور کلمہ پاک کا ورد کرتا سہم کر سمٹا ہوا بیٹھا رہا۔ ویگن نے ایک دو موڑ کاٹے اور پھر اس کی رفتار ہلکی ہو گئی۔ ایک آخری موڑ گھوم کر ویگن جیسے کسی گیراج میں داخل ہو کر رک گئی اسے بھاری فوجی جوتوں اور ویگن کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سنائی دیں پھر کسی نے ہندوستانی میں کہا "دادا ویگن کو ادھر نہیں رکھنا۔"

دوسری آواز آئی "یہ مال اتار کر اندر رکھو اور دیکھو تو اس میں ڈرائی فروٹ ہی ہے۔"

ندیم کا دل کانپ اٹھا یہ لوگ اب سارے کھوکھوں کو کھولیں گے اور وہ پکڑ جائے گا اسے کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ کسی خطرناک گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور جب ایک آدمی نے ویگن کے پچھلے دروازے کی طرف آتے ہوئے کہا کہ دادا آج قیمتی مال ہاتھ نہیں لگا تو وہ سمجھ گیا کہ یہ فوجی نہیں ہیں بلکہ ڈاکو لٹیرے ہیں۔ کھوکھے ویگن سے نیچے اتارے جانے لگے۔ دو آدمیوں نے ندیم کے کھوکھے کو بھی اتار کر نیچے رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد ویگن کے وہاں سے باہر نکلنے کی آواز آئی یہ آواز کچھ فاصلے پر جا کر بند ہو گئی۔

کسی نے غصے میں کہا "ارے اسے بند کیوں کر دیا؟ اسے آگے لے جا کر دریا میں ڈال دو۔ جلدی کرو۔"

ویگن ایک بار پھر اسٹارٹ ہوئی اور اس کی آواز دور ہوتے ہوئے غائب ہو گئی۔ ندیم کو بھاری جوتوں کی آوازیں اپنی طرف آتی سنائی دیں۔

کسی نے کہا ایسے کھول کر رکھو۔ ایک کھوکھے کا تختہ اکھاڑنے کی آواز آئی۔

پھر کسی نے کہا "دادا ڈرائی فروٹ ہی ہے۔" دوسری آواز آئی۔

"رہنے دو۔ ایک پیٹی اپنے لیے رکھ لیں گے باقی اپنے ایجنٹ کے ہاتھ بیچ دیں گے۔ چار چھ ہزار تو مل ہی جائیں گے چلو اب ٹالی گنج کی طرف جاتے ہیں۔ دھراج جیپ لے کر آتا ہی ہو گا۔"

جوتوں کی آوازیں گیراج سے نکل کر باہر چلی گئیں۔ ندیم پر اصل بات واضح ہو گئی تھی۔ یہ لوگ لٹیرے تھے جو فوجیوں کی وردی پہن کر کلکتے کے ناکوں پر آدھی رات کو وارداتیں کرتے تھے یہ بات اس کے لیے تسکین کا باعث تھی کہ وہ فوج کے قبضے میں نہیں ہے اور یہ لوگ تھوڑی دیر بعد وہاں سے جانے والے تھے۔ شاید ان لٹیروں کا وہ ساتھی بھی آ گیا تھا جو ملک صاحب کی ویگن کو دریا میں پھینکنے گیا تھا کیونکہ کسی نے بلند آواز میں پوچھا تھا ارے کسی نے ویگن ڈالتے دیکھا تو نہیں۔ اس کے بعد وہ بنگالی میں خدا جانے کیا باتیں کرنے لگ گئے۔ تھوڑی دیر بعد جیپ کی آواز سنائی دی جو گیراج کے قریب آ کر رک گئی۔ یہ ڈاکو لٹیرے اس جیپ میں سوار ہو رہے تھے۔ جیپ اسٹارٹ ہوئی اور اس کی آواز دور جا کر غائب ہو گئی۔ ندیم کو یوں محسوس ہوا جیسے

کسی نے اس کے اوپر گرا ہوا ہزاروں من بھاری پتھر اٹھا دیا ہو۔ اب وہ یہ اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ پیچھے کوئی آدمی تو نہیں چھوڑ گیا وہ کھوکھے کے اندر ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھا رہا وہ بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔ خدا کا شکر تھا کہ اس کے اوپر کوئی دوسرا بھاری کھوکھا نہیں رکھا گیا تھا۔ تختے میں کیے گئے سوراخوں میں سے اسے تازہ ہوا اندر آتی محسوس ہو رہی تھی۔ باہر مکمل خاموشی چھائی تھی۔

تقریباً پانچ منٹ تک ندیم کھوکھے کے اندر دم سادھے بیٹھا رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ باہر کوئی آدمی موجود نہیں ہے تو اس نے دونوں ہاتھ کھوکھے کے اوپر لگے ہوئے تختے پر رکھ کر اوپر کو دباؤ ڈالا۔ ملک صاحب نے خاص طور پر کیلیں زیادہ اندر نہیں گاڑی تھیں۔ ذرا سی کوشش کے بعد تختہ اکھڑ گیا۔ اس سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ ندیم وہیں سمٹ کر آواز کا ردِعمل معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ باہر وہی سناٹا طاری تھا۔ ندیم نے تختہ ایک طرف ہٹایا اور سر باہر نکال کر دیکھا۔ یہ ایک تنگ و تاریک جگہ تھی۔ اندھیرے میں ندیم صرف اردگرد پڑے ہوئے کھوکھوں کو ہی دیکھ سکا۔ وہ کھوکھے سے باہر نکل آیا۔ اس کے گھٹنے جڑ گئے تھے۔ وہیں بیٹھ کر اس نے اپنے گھٹنوں کو دبایا۔ پھر دو چار بار کھولا۔ پھر اٹھ کر بند دروازے کی طرف گیا۔ خطرہ یہ تھا کہ کہیں باہر سے وہ لوگ تالا نہ لگا گئے ہوں۔ اگر وہ کنڈی بھی لگا گئے تھے تو ندیم اسے کھول نہیں سکتا تھا اس نے دروازے کو باہر کی جانب دبایا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔

اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ باہر سے تالا لگا ہے یا صرف کنڈی لگی ہوئی ہے۔ ندیم کو یقین تھا کہ وہ لوگ باہر سے تالا لگا گئے ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ دوسری واردات کرنے کے بعد وہاں واپس آ جاتے ندیم کو وہاں سے نکل جانا تھا۔ اندھیرے میں وہ ادھر ادھر کوئی ایسی شے تلاش کرنے لگا جس کی مدد سے وہ دروازے کو کھول سکے۔ اس گیراج نما کوٹھری میں کوئی روشندان بھی نہیں تھا اسے کونے میں ایک طرف پڑا ہوا لوہے کا ایک ایسا راڈ مل گیا جس کی مدد سے کھوکھوں کو کھولا جاتا ہے۔ یہ بے حد موزوں ہتھیار تھا۔ یہ لوہے کا ڈنڈا آگے سے پتلا ہو کر اندر کو ذرا سا مڑا ہوا تھا۔ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ کوئی پہریدار باہر نہ بیٹھا ہوا ہو۔ مگر اسے یہ خطرہ مول لینا ہی تھا۔ ندیم نے لوہے کی سلاخ دروازے کے بیچ میں ڈال کر باہر کنڈے کی زنجیر کو قابو میں کر لیا۔ اس کے بعد زور زور سے اوپر کو جھٹکا دیا تو کنڈی کی زنجیر ٹوٹ گئی۔ ندیم وہیں ساکت ہو کر کھڑا

رہا۔ باہر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ کسی کے قدم تیزی سے دروازے کی طرف نہیں آئے۔ اس کا مطلب تھا کہ باہر کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ ندیم نے دروازہ کھول دیا۔ اندھیری رات میں تازہ ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے چھو کر گزر گیا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ اندھیرے میں پہلے اسے کچھ نظر نہ آیا پھر درختوں کے دھبے سے نظر آنے لگے۔ کوٹھری سے باہر نکل کر اس نے دروازہ بند کر دیا اور دوڑ کر سامنے والے درختوں میں آ گیا۔ یہاں آتے ہی وہ گھاس میں بیٹھ کر آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ یہ کوئی ویران جگہ معلوم ہوتی تھی۔ ارد گرد کہیں دور تک کسی بلڈنگ وغیرہ کی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ندیم اٹھا اور درختوں میں سے گزرتا ہوا ایک کچی پگڈنڈی پر آ گیا۔ آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے۔ ہوا کے جھونکوں میں دریا میں ڈوبے ہوئے سرکنڈوں کی خوشبو اسے بار بار محسوس ہو رہی تھی۔ یقیناً دریا وہاں سے قریب ہی تھا اور یہ دریا سوائے ہگلی کے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اصل میں اس دریا کا نام جمنا ہے جو کلکتہ میں داخل ہونے کے بعد ہگلی کا نام اختیار کر لیتا ہے۔ یہ دریا آگے جا کر خلیج بنگال میں جا گرتا ہے۔ ندیم کو خیال آ گیا کہ نجمی یعنی چندا لکھی بائی کے جس پرانے بنگلے میں رہتی ہے وہ بھی دریائے ہگلی کے کنارے پر ہی واقع ہے۔ ندیم پہلی بار اسی بنگلے کے باہر آیا تھا۔ اس بنگلے کی سیاہ چار دیواری اور پھاٹک کے اوپر لگا ہوا ٹائپ رائٹنگ اسکول کا پرانا بورڈ اسے اب بھی یاد تھا۔ لکھی بائی، طوائفوں کی نائیکہ قتل ہو چکی تھی اور ندیم کو معلوم تھا کہ وہاں اب نجمی اور اس کی ہمراز سہیلی کرشنا بائی ہی رہتی ہیں۔ اگرچہ بدمعاش دھوبل نے اب ان کا چارج سنبھال لیا تھا اور وہاں اس کی موجودگی لازمی تھی لیکن آدھی رات گزر چکی تھی بہت ممکن تھا کہ دھوبل بدمعاش نشہ کر کے گہری نیند میں غرق ہو اور ندیم کو کرشنا یا نجمی کے پاس جانے کا موقع مل جائے۔ اس خیال کو ذہن میں رکھ کر ندیم نے دریا کی طرف چلنا شروع کیا۔ وہ دریائی سرکنڈوں کی مرطوب خوشبو پر دریا کا سراغ لیتا اندھیرے میں چل رہا تھا۔ آخر اسے ستاروں کی روشنی میں دریا کا نیلے رنگ کا چوڑا پاٹ دکھائی دیا۔ وہ تیز تیز چل کر دریا کے کنارے آ گیا۔ اس نے دریا کے بہاؤ کی طرف رخ کر لیا کیونکہ لکھی بائی کا خستہ حال بنگلہ دریا کے بہاؤ کے رخ پر ہی واقع تھا۔ وہ اپنے قیاس کے مطابق چلا جا رہا تھا۔ دریا کے کنارے ایک کچا راستہ جھاڑیوں اور ناریل کے درختوں میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ رات خنک تھی۔ یہ مئی جون کے مہینوں کی خنک رات نہیں تھی۔ ان راتوں

میں جو ٹھنڈی مست ہوا چلتی ہے تو سانپ اپنے بلوں سے باہر نکل آتے ہیں۔ لیکن اکتوبر نومبر میں راتیں سرد آمیز خنک ہو جانے کی وجہ سے سانپوں کا زیادہ خطرہ نہیں رہتا تھا۔ اس کے باوجود ندیم بے حد محتاط ہو کر چل رہا تھا۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی تھی۔ کیونکہ ان نقلی فوجیوں کے واپس آ جانے کا بھی خطرہ تھا۔ اگرچہ ندیم کو یہ اطمینان تھا کہ انھیں ایک خالی کھوکھا دیکھ کر یہ کبھی گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ اس کے اندر ایک آدمی تھا جو بھاگ گیا ہے تاہم دروازے کی اڑی ہوئی کنڈی انھیں شک میں ڈال سکتی تھی اور وہ اپنے بچاؤ کی خاطر علاقے کا جائزہ لینے نکل سکتے تھے۔

ندیم دیر تک دریا کے ساتھ والے کچے راستے پر چلتا رہا۔ ایک جگہ اس نے دو تین کشتیاں دیکھیں جو دریا کے کنارے پر کھڑی تھیں۔ آدمی وغیرہ اسے وہاں کوئی بھی نظر نہ آیا۔ وہ ان کشتیوں سے کچھ فاصلے پر ہو کر آگے نکل آیا۔ وہ دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لکھی بائی کا بنگلہ کہیں پیچھے ہو۔ وہ خدا پر بھروسہ کیے چلتا گیا۔ اب اسے دریا کے دونوں کناروں پر دور روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔ یہ روشنیاں اونچی اونچی عمارتوں اور کارخانوں کی تھیں اور کافی فاصلے پر تھیں۔ ایک جانب دور اسے سگنل کی ہری اور لال بتی دکھائی دی۔ یہ دریا کے دوسرے کنارے پر تھیں۔ یہ دونوں روشنیاں اونچے انٹینا پر لگی ہوئی تھیں اور لال بتی جل بجھ رہی تھی۔ اچانک ندیم کو یاد آ گیا کہ جس روز وہ پہلی بار کلکتہ اسٹیشن سے اتر کر چھپتا چھپاتا نجمی سے ملنے لکھی بائی کے بنگلے پر آیا تھا تو اس نے دریا پار کسی وائرلیس اسٹیشن کا اونچا انٹینا دیکھا تھا جس کے تاروں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ یقیناً وہ یہی وائرلیس اسٹیشن کا انٹینا تھا۔

ندیم کو حوصلہ ہوا وہ ٹھیک راستے پر جا رہا تھا۔ اس نے اپنے بائیں جانب اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ لکھی بائی کا بنگلہ کہیں قریب ہی ہونا چاہیئے تھا۔ وہ دریا کے کنارے سے ہٹ کر بائیں جانب ڈھلان پر آ گیا۔ یہاں اسے کچھ دور گھنے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ اس جھنڈ کو بھی اس نے پہچان لیا۔ یہ درخت لکھی بائی کی کوٹھی کے باہر کھڑے تھے۔ ندیم اسی طرف چلنے لگا مگر اسے وہاں کوئی بنگلہ اندھیرے میں ابھی تک دکھائی نہیں دیا تھا۔ کہیں وہ غلط سمت تو نہیں آ گیا؟ یہ خیال اس کے دل میں آیا ہی تھا کہ اندھیرے میں اسے کسی ایک منزلہ عمارت کا سایہ سا

ابھرتا نظر آیا۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔ ندیم کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ یہی لکھی بائی کا بنگلہ تھا بنگلے کے گیٹ کا ایک ہی پٹ تھا جو بند تھا۔ ندیم درختوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا اور غور سے بنگلے کی طرف دیکھنے لگا۔ بنگلے کے اوپر قوس کی شکل میں ایک بورڈ لگا تھا جس کی عبارت وہ پڑھ نہیں سکتا تھا، لیکن لکھی بائی کا خستہ حال پرانا بنگلہ ندیم نے پہچان لیا تھا۔ اب اسے یہ خطرہ تھا کہ اگر بنگلے کے اندر کوئی چوکیدار پہرہ دے رہا ہے تو وہ اس سے کیسے اپنے آپ کو بچائے گا لکھی بائی مر چکی تھی لیکن ندیم کو یقین تھا کہ نجمی یا کرشنا بائی میں سے کوئی نہ کوئی اس بنگلے میں ضرور موجود ہوگا۔ کرشنا اور نجمی نے بھی اسے بتایا تھا کہ لکھی بائی کے قتل کے بعد اب وہ سوناگاچی میں دھندا کرنے کے بعد اسی بنگلے میں آدھی رات کے بعد آجاتی ہیں۔ خطرہ اسے لکھی بائی کے بدمعاشوں دھومل اور اس کے دوسرے ساتھیوں کی طرف سے تھا۔ ندیم کے پاس کوئی اسلحہ وغیرہ بھی نہیں تھا۔ وہ درخت کی اوٹ میں اندھیرے میں بیٹھا سوچنے لگا کہ اسے بنگلے میں کس طرف سے داخل ہونا چاہیئے بنگلے کے اردگرد نو فٹ اونچی چار دیواری بنی ہوئی تھی۔ ندیم نے چاروں طرف دیکھا۔ رات سنسان اور اندھیری تھی۔ کسی پہریدار کی بھی کسی جانب سے آواز نہیں آرہی تھی۔ ندیم نے اللہ کا نام لیا اور اٹھ کر بنگلے کے عقب کی جانب آگیا۔ یہاں کوئی درخت نہیں تھا۔ وہ بنگلے کی پرانی مگر بے حد پختہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا۔ اس دیوار کو وہ کسی سہارے کے بغیر نہیں پھاند سکتا تھا وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا۔ دیوار کے مغرب کی طرف چلنے لگا کہ شاید کسی جگہ اسے دیوار پھاندنے کے واسطے کوئی سہارا مل جائے یا کسی جگہ سے دیوار ٹوٹی ہوئی ہو۔ بنگلے میں گہرا اندھیرا اور موت ایسا گمبھیر سناٹا تھا۔ رات کے اندھیرے میں وہ کوئی بھوت محل لگ رہا تھا۔ ایک دم سے ندیم دیوار کے ساتھ لگ کر اندھیرے میں بیٹھ گیا۔ اسے اپنے پیچھے آہٹ سی سنائی دی تھی۔

... ...

ندیم کو قدموں کی چاپ صاف سنائی دی تھی۔ یہ آواز اندھیرے میں اس کے عقب سے آئی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا اور تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جدھر سے آواز آئی تھی ادھر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ رات کے ڈیڑھ بجے کا عمل تھا۔ کلکتہ کے دریائے ہگلی کے کنارے لکھی بائی مقتولہ کا یہ قدیم خستہ حال بنگلہ آسیب زدہ معلوم ہو رہا تھا۔ سامنے کی جانب کسی طرف بھی بنگلے میں روشنی نہیں تھی۔ ندیم لٹیروں کا گیراج توڑ کر یہاں نجمی سے ملاقات کرنے آیا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ نجمی واپس یہاں پہنچ چکی ہے۔ اگر وہ رات کو سوناگاچی کے کوٹھے پر کرشنا بائی کے ساتھ مجرا بھی کرتی رہی ہوگی تو اس وقت تک یہاں پہنچ چکی ہوگی۔ ندیم کے دل میں خیال آیا کہ ہوسکتا ہے ان لٹیروں کی ٹولی میں سے کوئی ایک لٹیرا اس کے پیچھے لگا ہوا ہو۔ جنھوں نے اسے یرغمال بنا کر دریا کے کنارے والے پرانے گیراج میں بند کر دیا تھا۔ لیکن انھیں تعاقب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ انھیں تو اسے گولی مار دینی چاہیئے تھی کیونکہ ندیم ان کی خفیہ کمین گاہ کا راز اپنے ساتھ لے کر جا رہا تھا! اندھیرا اگرچہ گہرا تھا لیکن ستاروں کی دھندلی چمک میں کچھ فاصلے پر درخت تاریکی کے پس منظر میں ابھرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ندیم نے سوچا ہوسکتا ہے اس کا وہم ہو۔ اگر کوئی پیچھے لگا ہوتا تو اب تک اسے پستول دکھا کر گرفتار کر چکا ہوتا۔ کیونکہ ندیم جیل توڑ کر بھاگا ہوا مفرور قیدی تھا جس پر انڈین ملٹری انٹیلی جینس کی طرف سے پاکستانی جاسوس ہونے کا سنگین الزام لگایا گیا تھا اور سول اور ملٹری پولیس اس کی تلاش میں تھی۔ اگرچہ ندیم دلی کی جیل سے بھاگا تھا لیکن پولیس کو معلوم تھا کہ مفرور ملزم یا پاکستانی جاسوس ندیم کی محبوبہ چندا بائی کلکتہ میں ہے اور وہ اس سے ملنے کلکتہ ضرور جائے گا۔ اس طرح سے پولیس کلکتہ میں بھی چوکس تھی اور تھوڑی دیر پہلے بنگال رائفلز کے کچھ جوانوں نے اسے

گرفتار بھی کر لیا تھا۔ ندیم کی قسمت اچھی تھی کہ اس نے دلیری سے کام لیا اور ان کی قید سے بھاگ کر چنیوٹ کے نیک دل تاجر کے گھر پناہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں سے وہ امجدیہ ہوٹل کے مالک سیٹھ جبار کے پاس ایک کھوکھے میں چھپ کر جا رہا تھا کہ کلکتے میں رات کو فوجی وردی پہن کر وارداتیں کرنے والے لٹیروں نے ویگن کے کھوکھوں کو مال سے بھرا ہوا سمجھ کر ان پر قبضہ کر لیا اور گیراج میں لے گئے۔ وہاں سے ندیم کھوکھے میں سے کسی طرح نکل کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اور اب نجمی سے ملنے لکھی بائی کے پرانے بنگلے کی دیوار کے ساتھ لگا اندر جانے کا کوئی راستہ تلاش کر رہا تھا۔ گیٹ پر چوکیدار اگرچہ اسٹول پر دیوار سے ٹیک لگائے سو رہا تھا لیکن ندیم کے پاؤں کی آواز سے وہ بیدار ہو کر شور مچا سکتا تھا۔ چنانچہ ندیم نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ کسی جگہ سے دیوار پھاند کر بنگلے کے باغ میں اتر جائے گا۔ اس ارادے کے ساتھ وہ بنگلے کی عقبی دیوار کے قریب آیا ہی تھا کہ اسے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

ندیم کو جب یہ یقین ہو گیا کہ جسے وہ کسی کے قدموں کی چاپ سمجھ رہا تھا وہ محض اس کا وہم تھا۔ تو اس نے اندھیرے میں دیوار کا جائزہ لیا۔ دیوار کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا ایک جگہ سے اینٹ نکلی ہوئی تھی۔ ندیم نے اس میں پاؤں پھنسایا اور دیوار پر چڑھ کر بالکل سیدھا لیٹ گیا۔ اس نے دوسری طرف اندھیرے میں جھانکا، پپیتے کے درختوں کے نیچے ایک کھوکھا پڑا تھا۔ ندیم آہستہ سے دیوار کو ہاتھوں سے پکڑ کر دوسری طرف بنگلے کے باغ میں اتر گیا۔ پپیتے کے درختوں کے نیچے بیٹھ کر اس نے بنگلے کے عقبی برآمدے کی طرف غور سے دیکھا۔ وہاں بھی کوئی روشنی نہیں تھی۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور دبے پاؤں چلتا کوٹھی کی دوسری طرف آ گیا۔ یہاں پہلی بار اسے کھڑکی میں سے ہلکی ہلکی روشنی باہر آتی نظر آئی۔ ندیم قریب گیا۔ کھڑکی بند تھی، اندر کی جانب پردہ گرا ہوا تھا۔ کھڑکی پر شیشے لگے ہوئے تھے۔ بھاری پردے کی وجہ سے اندر کی روشنی بہت ہلکی ہو کر باہر آ رہی تھی۔ عجیب بات تھی کہ بمبئی، کلکتے کے مکانوں، بنگلوں اور فلیٹوں کی طرح اس کھڑکی پر لوہے کی سلاخیں نہیں لگی تھیں۔ ندیم کو اندر سے انسانی آوازیں آتی محسوس ہوئیں۔ اس نے کھڑکی کے ساتھ کان لگا دیئے۔ اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ اندر نجمی بول رہی تھی۔ وہ کسی سے کوئی بات کر رہی تھی۔ آواز بہت دھیمی تھی۔ ندیم یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ نجمی کس سے باتیں کر رہی ہے

اس نے ایک کان انگلی سے بند کر کے دوسرا کان کھڑکی کے شیشے کے بالکل ساتھ لگا دیا۔ نجمی غصے میں کسی سے کہہ رہی تھی۔

"اسے کہہ دو اس کی ماں مجرا کر کے ابھی آ رہی ہے۔ اگر زیادہ گڑبڑ کی تو میں چاقو مار کر اس کا پیٹ پھاڑ دوں گی۔ جاؤ۔ تم بھی دفعہ ہو جاؤ میرے کمرے سے۔"

یہ نجمی کا کمرہ تھا۔ نجمی کو شاید کوئی اپنے پاس بلا رہا تھا اور وہ مشتعل ہو رہی تھی۔ ندیم کو جانے کیوں اس نجمی کا خیال آ گیا جو لاہور کے یونیورسٹی کیمپس کے کیفے ٹیریا میں بیٹھ کر اس سے انگریزی لٹریچر پر بڑی شائستہ باتیں کیا کرتی تھی۔ اب نجمی کتنی بدل گئی تھی۔ ماحول نے اسے اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ کھڑکی کی دوسری طرف گہری خاموشی چھا گئی۔ پھر بتی بجھ گئی، ندیم سمجھ گیا کہ نجمی بستر پر سونے کے لیے لیٹ گئی ہے۔ ندیم شاید اس موقع کے انتظار میں تھا۔ اس نے کھڑکی پر آہستہ سے انگلی سے ٹھک ٹھک کی۔ دوسرے لمحے کمرے میں پھر روشنی ہو گئی۔ نجمی کی کرخت آواز بلند ہوئی "دھومل تم رات بھر کھڑکی بجاتے رہو گے تب بھی میں نہیں کھولوں گی۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

اب ندیم نے اپنا منہ کھڑکی کے ساتھ لگا کر آہستہ سے کہا "نجمی! میں ہوں ندیم۔"

کمرے کی روشنی فوراً ہی بجھ گئی۔ نجمی نے ندیم کی آواز سن لی تھی۔ کھڑکی آہستہ سے کھل گئی۔ اندھیرے میں ندیم کو نجمی کا دھندلا دھندلا چہرہ دکھائی دیا۔ نجمی نے جھک کر سرگوشی میں کہا "اندر آ جاؤ۔"

ندیم کھڑکی میں سے اندر کمرے میں آ گیا۔ نجمی نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی اور اندھیرے میں ندیم کا ہاتھ پکڑ کر اسے پلنگ کی طرف لے آئی۔ خدا کا شکر ہے تم بچ کر نکل آئے۔ میں نے تمہیں فوجی جیپ میں جاتے دیکھا تھا۔ ندیم نے جلدی جلدی سارے واقعات نجمی کو بیان کیے اور بولا "نجمی! خدا کے لیے اب بھی میری بات مان لو۔ اور اس گناہ کی کیچڑ سے نکل کر میرے ساتھ مشرقی پاکستان چلی چلو۔ نجمی میری زندگی کا اب یہی مقصد ہے کہ میں تمہیں جس قدر سکھ پہنچا سکوں پہنچاؤں لیکن اپنی زندگی بھی تم پر قربان کر دوں۔"

نجمی نے ندیم کے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں میں لیتے ہوئے کہا "ندیم! میں تمہارے اس جذبے اور محبت کی دل سے قدر کرتی ہوں لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اب تمہارے لائق نہیں رہی۔

دوسری بات یہ کہ جب تک میں اپنے دشمنوں سے انتقام نہیں لیتی یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ یہ میں نے قسم کھا رکھی ہے۔"

ندیم کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دروازے پر کسی نے زور سے ہاتھ مار کر کہا "دروازہ کھولو چندا بائی میں انسپکٹر منجریکر ہوں۔"

ندیم کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اس نے کھڑکی کھول دی اور باہر چھلانگ لگانے ہی لگا تھا کہ دو سپاہی رائفلیں تانے کر سامنے آ گئے۔ ایک نے چلا کر کہا "بھاگا تو شوٹ کر دوں گا۔"

انسپکٹر منجریکر دروازہ زور زور سے دھڑدھڑا رہا تھا۔ ایک سپاہی کود کر کمرے میں آ گیا اور ٹارچ روشن کر دی۔ نجمی اپنے دل کو پکڑ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ اب ندیم ان بھیڑیوں کے چنگل سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ دوسرا سپاہی بھی کود کر کھڑکی میں سے اندر آ گیا اور اس نے رائفل کی نالی ندیم کی گردن پر رکھ دی۔ دوسرے سپاہی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ مرہٹہ انسپکٹر منجریکر تین سپاہیوں کے ہمراہ کمرے میں گھس آیا۔ ندیم کو ٹارچ کی روشنی میں رائفل کی نالی کی زد میں دیکھا تو مسکرا دیا۔ "چندا بھائی! مجھے پورا وشواش تھا کہ ہمارا مجرم اور پاکستانی جاسوس تمھارے کمرے کے سوا اور کہیں نہیں ہوگا۔ انسپکٹر نے کمرے کی بتی جلا دی۔ کمرہ روشنی سے بھر گیا۔ ندیم نے نجمی کی طرف دیکھا وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ انسپکٹر منجریکر نے غراتے ہوئے حکم دیا۔ "اسے ہتھکڑی لگا کر باہر جیپ میں لے چلو۔" ندیم کے ہاتھ پیچھے کر کے فوراً آہنی ہتھکڑی لگا دی گئی۔ سپاہی اسے کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔ نجمی نے اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹتے ہوئے زہریلی نظروں سے انسپکٹر منجریکر کی طرف دیکھا اور کہا "تم ایک بے گناہ کو پھانسی کے تختے کی طرف لے جا رہے ہو۔ ندیم کا صرف اتنا قصور ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور صرف مجھ سے ملنے ویزے کی پابندیاں توڑ کر دلی سے کلکتے آ گیا ہے۔ اس کے سوا اس کا کوئی قصور نہیں۔" انسپکٹر منجریکر نے آگے بڑھ کر زور سے نجمی کے گال پر ایک تھپڑ مارا اور غضبناک آواز میں بولا "یہ سب کچھ جانتے ہیں چندا بائی! پر تم سے بھی نمٹ لیں گے۔"

وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ نجمی انسپکٹر منجریکر کا تھپڑ کھا کر پلنگ پہ گر پڑی تھی۔

وہ گال پر ہاتھ پھیرتی ہوئی اٹھ کر کارنس پر رکھے آئینے کے سامنے آئی۔ آئینے میں اپنے چہرے کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کے کونے میں سے خون کی ایک باریک لکیر بہنے لگی تھی۔ نجمی کو اس وقت اپنا چہرہ ایک ایسی شیرنی کی طرح لگا جو انسانی خون کی پیاسی ہو۔ انسپکٹر منجریکر کی شکل وہ اپنی آنکھوں کے سامنے لاتی ہوئی دل میں بڑبڑائی "منجریکر تیری باری سب سے پہلے آئے گی۔ وقت آنے پر میں اپنے ہاتھوں سے تیرا گلا کاٹوں گی۔" اور وہ پلنگ پہ گر کر بے اختیار رونے لگی۔

ندیم کو پولیس کی بند گاڑی میں بٹھا کر دھرم تلہ کے بڑے تھانے کی حوالات میں بند کر دیا گیا۔ ہتھکڑی تو اسے پہلے ہی لگی تھی۔ اب اس کے پاؤں میں بیڑیاں بھی ڈال دی گئیں۔ انسپکٹر منجریکر اب کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

راتوں رات پولیس کے اعلیٰ حکام کو پاکستانی جاسوس کی گرفتاری کی اطلاع کر دی گئی ملٹری پولیس کے کرنل وشوا ناتھ بھی رات کو تھانے پہنچ گئے۔ انھوں نے ندیم کو حوالات میں دیکھا اور تھانے سے ہی ملٹری انٹیلی جنیس کے ڈائریکٹر کو فون کیا کہ میں آپ سے اسی وقت ملنا چاہتا تھا۔ کرنل وشوا ناتھ رات کے تین بجے انڈین ملٹری انٹیلی جنیس کے ڈائریکٹر جنرل کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ آدھ گھنٹے کی بات چیت اور صلاح مشورے کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ "پاکستانی جاسوس" ندیم کو کالے پانی کے سینٹیل جزیرے میں قید کر دیا جائے سینٹیل جزیرہ انڈیمان کے دو سو جزیروں میں سے ایک جزیرہ ہے۔ انڈیمان کے جزائر خلیج بنگال میں برما اور انڈیا کے درمیان واقع ہیں۔ انھیں کبھی کالے پانی کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا اور انگریزوں کے زمانے میں سیاسی قیدیوں اور انتہائی خطرناک مجرموں کو یہاں عمر بھر کے لیے قید میں ڈال دیا جاتا تھا۔ یہاں انگریزوں نے اس مقصد کے لیے ایک بہت بڑی جیل بنائی تھی جس کے برآمدے اور راہ داریوں میں بھی لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ سیاسی قیدیوں کو جزیرے میں کھلا چھوڑ دیا جاتا۔ انھیں اس بات کی بھی اجازت تھی کہ وہ جزیرے کے باشندوں کے ساتھ مل کر کوئی چھوٹا موٹا کام کریں۔ خطرناک مجرموں کو جیل کی کوٹھریوں میں بند کیا جاتا۔ ان جزیروں سے فرار ناممکن تھا۔ یہ سارے کے سارے جزیرے سمندر میں گھرے ہوئے ہیں۔ یہ کالا سمندر تقریباً سارا سال ہی بپھرا رہتا ہے۔

مئی سے نومبر تک موسلا دھار بارشیں ہوتی ہیں۔ اور سمندر اس قدر بپھرا ہوا ہوتا ہے کہ کسی جہاز کا ساحل تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہاں گھنے جنگلوں میں دن کے وقت بھی اندھیرا چھایا رہتا ہے اور مکھیوں جتنے بڑے مچھر پائے جاتے ہیں۔ مقامی لوگوں میں یرقان، ملیریا اور زرد بخار عام ہوتا ہے۔ انگریزوں کے جانے کے بعد ان جزیروں پر بھارت نے قبضہ کر لیا اور اب انڈیا گورنمنٹ ہی ان جزیروں کا نظم و نسق چلاتی ہے۔ یہاں کی آبادی برمی، ملائی، بھارتی، حبشی اور مقامی قبیلے کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ مسلمان سب سے پہلے ۱۷۸۰ء میں یہاں سیاحوں کی حیثیت سے آئے اور یہاں اسلام کی شمع روشن ہوئی۔ ان جزیروں میں آج بھی مسلمان ہزاروں کی تعداد میں اپنے دینی ارکان کی پابندی کرتے ہوئے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ نکش دیپ کے جزیروں میں خوبصورت مساجد اور بزرگانِ دین کے مزار بھی ہیں۔

ندیم کو کچھ خبر نہیں تھی کہ اسے کالے پانی بھیجے جانے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ پولیس کے اعلیٰ حکام یہ چاہتے تھے کہ اس ''پاکستانی جاسوس'' ندیم کو سب سے پہلے کسی ایسی جگہ قید کر دیا جائے جہاں سے اس کے لیے فرار ہونا ناممکن ہو اور ایسی جگہ کالا پانی ہی ہو سکتی تھی۔ اس کے بعد وہ ندیم سے ایک منصوبے کے تحت پوچھ گچھ کر کے اس کے ساتھیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔

رات ندیم نے دھرم تلہ کی حوالات میں گزار دی۔ دوسرے دن اسے بند گاڑی میں ڈال کر کلکتے کی خضر پور جیٹی پر پہنچا دیا گیا۔ یہاں نیول گارڈ کی خصوصی حوالات میں دو روز اسے بند رکھا گیا۔ تیسرے دن ایک بھارتی نیوی کا جہاز مٹی کا تیل، پیاز، نمک اور چینی لے کر جزائر انڈیمان یعنی کالے پانی جا رہا تھا۔ ندیم کو اس جہاز پر اسپیشل گارڈز کی معیت میں سوار کرا دیا گیا۔ جہاز پر آنے کے بعد ندیم کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اسے کالے پانی لے جایا جا رہا ہے۔ وہ سوائے خاموش رہنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن دل میں اس نے ایک بار پھر طے کر لیا تھا کہ وہ موقع ملتے ہی کالے پانی سے بھی فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کالے پانی کے جزیرے کیسے ہیں اور ان کا محل وقوع کیا ہے۔ ان جزیروں کے بارے میں اس نے صرف جغرافیہ کی کتاب میں ہی پڑھا تھا اور یہ سن رکھا تھا کہ انگریزوں کے زمانے میں یہاں

سیاسی قیدیوں کو عمر بھر کے لیے بھیج دیا جاتا تھا اور پھر ان کی کوئی خبر نہیں آتی تھی۔ ندیم سے دل نہ کالے پانی کی دہشت ضرور تھی۔ اسے مال بردار جہاز کے نچلے ڈیک یعنی جہاز کی سب سے نچلی منزل میں پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر بند کر دیا گیا۔ صرف باتھ روم میں جاتے وقت اس کی بیڑیاں کھول دی جاتی تھیں۔ لوئر ڈیک میں اسپیشل فوجی گارڈ کے چھ ہنگامی فوجی ہر وقت اس کی نگرانی کے لیے موجود رہتے تھے۔ جہاز کلکتے کی بندرگاہ سے روانہ ہو کر دریائے ہگلی میں سے گزرتا ہوا خلیج بنگال کے کالے پانیوں میں داخل ہو گیا تھا۔ ندیم کو کچھ معلوم نہ تھا کہ کب دن ڈوبا کب رات ہوئی اور کب پھر سورج طلوع ہوا۔ بحری جہاز میں یہ اس کا پہلا سفر تھا۔ برسات کا موسم ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ سمندر چڑھاؤ پر نہیں تھا۔ پھر بھی جہاز جب جزائر انڈیمان کے پانیوں میں داخل ہوا تو بری طرح ڈولنے لگا۔ اپنے گارڈز کی باتوں سے ندیم نے اندازہ لگایا کہ جہاز کو سمندر میں سفر کرتے آج تیسرا روز ہو گیا ہے۔ یہ مال بردار چھوٹا جہاز تھا اس کی رفتار بھی زیادہ نہیں تھی۔ پہلے اور دوسرے روز جہاز زیادہ نہیں ڈولا تھا۔ تیسرے روز اس نے آگے پیچھے دائیں بائیں ڈولنا شروع کر دیا تو ندیم کو چکر آنے لگے۔ وہ بیڑیوں سمیت جہاز کے ننگے فرش پر آنکھیں بند کیے چت پڑا رہا۔ کبھی کبھی اسے یوں محسوس ہوتا کہ یہ کالے پانی کا سفر کبھی ختم نہ ہو گا۔ جیسے وہ آسمان و زمین کے درمیان لٹکا دیا گیا ہے اور طوفانی ہوائیں اسے آگے پیچھے جھولا جھلا رہی ہیں۔ یہ رات کا وقت تھا یا دن کا سماں تھا۔ ندیم نہیں جانتا تھا۔ خصوصی گارڈز کے سپاہی ہر وقت اس کے سر پر موجود رہتے لیکن اسے کوئی سوال پوچھنے کی اجازت نہیں تھی۔ جہاز بری طرح ڈول رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے باہر سمندر میں طوفان آیا ہوا ہے۔ لیکن جہاز کے نچلے حصے میں سوائے انجنوں کی آواز کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ خدا جانے کتنا وقت اس طرح گزر گیا۔ پھر اسے جہاز کے بھونپوں کے بار بار بولنے کی دھیمی آوازیں آئیں۔ جزائر انڈیمان کے جزیرہ سینٹیل کی جیٹی دور سے نظر آنے لگی تھی۔ اب جہاز کی رولنگ کافی حد تک کم ہو گئی تھی۔ جہاز کی گودی پر انڈیمان نیوی کے کچھ افسر اور ملاح کھڑے جہاز کی طرف مسلسل دیکھ رہے تھے۔ ایک اسٹیمر دوسری طرف سے نکل کر جہاز کی طرف بڑھا اور جیسے اسے راستہ دکھاتا اس کی راہنمائی کرتا آگے آگے سیاہ پانیوں کی لہروں میں چلنے لگا۔

جہاز سینٹیل بندرگاہ کی جیٹی سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔ فوراً اس کا لنگر سمندر میں پھینک دیا گیا۔ سمندر میں غیر معمولی تموّج کی وجہ سے جہاز گودی سے تھوڑی دور سمندر میں ہی لنگر انداز ہو گیا تھا۔ جہاز کے انجن بند ہوئے تو ندیم نے سکون کا سانس لیا۔ اسے جس ستون کے ساتھ رسی سے باندھا ہوا تھا کھول دیا گیا۔ بیڑیاں اس کے پاؤں میں ویسے ہی پڑی تھیں۔ گارڈز کے سپاہی اسے چلاتے ہوئے اوپر والے ڈیک پر لے آئے۔ ندیم نے کئی دنوں کے بعد نیلے آسمان اور ساحل پر ہوا میں لہراتے ناریل کے درختوں کو دیکھا تو خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ جہاز میں سے زندہ بچ کر باہر آ گیا ہے۔ وہ جزیرے کی چھوٹی سی گودی اور اس کے پیچھے کنارے سے دور لہراتے ناریل کے جھنڈوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ اسے یہاں سے ایک نہ ایک دن ضرور فرار ہونا تھا۔ کالے پانی کی جیل کے دو افسر اور سپاہی اس کو لینے وہاں آئے ہوئے تھے۔ ندیم نے جہاز سے اسٹیمر پر قدم رکھا تو اس کو ابھی تک چکر آ رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے یہ چکر کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ جس طرح نجمی کے کمرے سے وہ گرفتار ہو کر دمدم تلہ کی حوالات میں پہنچا تھا۔ وہ سب کچھ ندیم کو ایک ڈراؤنے خواب کی طرح یاد آ رہا تھا۔ کالے پانی کی سینٹرل جیل کے سکھ چیف وارڈن خاکی وردی خاکی پگڑی میں جیٹی پر کھڑا "پاکستانی جاسوس" ندیم کو بھارتی ملٹری گارڈز کے گھیرے میں اس اسٹیمر کے ڈیک پر بیٹھا غور سے دیکھ رہا تھا۔ جو مال بردار جہاز میں سے انھیں جیٹی تک لا رہا تھا۔ کالے پانی کے جیل کے سکھ چیف وارڈن کا نام گنڈا سنگھ تھا۔ سیاہ کالی داڑھی اور پھولی ہوئی مونچھوں نے گنڈا سنگھ کے چہرے کو تقریباً چھپا رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ توند باہر کو پھولی ہوئی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بید کو آہستہ آہستہ اپنی ٹانگ پر مار رہا تھا۔ اسے پہلے سے اطلاع مل گئی تھی کہ ایک خطرناک پاکستانی جاسوس اس کی جیل میں لایا جا رہا ہے۔ جہاں فوجی حکام دو روز بعد اس سے پوچھ گچھ کرنے آئیں گے۔ ندیم کو سپاہیوں نے پکڑ کر جیٹی کے فرش پر کھڑا کیا تو ایک طرف کو گرتے گرتے اس نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا۔

چیف وارڈن گنڈا سنگھ نے آگے بڑھ کر ندیم کی ٹھوڑی کے نیچے بید رکھ کر اس کے چہرے کو اوپر اٹھایا اور سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے بولا "میرا نام گنڈا سنگھ ہے۔ میں گڈ چھڈاں گا۔"
ندیم اسے بے بسی سے دیکھتا رہ گیا۔ جیٹی کے باہر ایک بند گاڑی موجود تھی۔ اسے

گاڑی میں بٹھا کر کالے پانی کی سینٹرل جیل کی طرف لے جایا گیا۔ اس چھوٹی سی بند گاڑی میں سلاخ دار ایک ہی کھڑکی تھی جس میں سے ندیم کو جزیرہ سینٹیل کے ناریل کے درخت اور گھاس پھونس کی جھونپڑیاں اور کہیں کہیں ڈھلانی چھت والی ایک آدھ عمارت نظر آ جاتی تھی۔ دھوپ کا رنگ پھیکا پڑ رہا تھا۔ سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ ہوا مرطوب تھی جس میں سمندر کی نمی اور مچھلی کی بو رچی ہوئی تھی۔ فضا میں حبس تھا اور بند گاڑی میں ندیم کو گرمی لگ رہی تھی۔ گاڑی جزیرہ سینٹیل کی مختلف چھوٹی بڑی سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی ناریل اور سینٹیل کے درختوں میں گھری ہوئی اس پکی سڑک پر آ گئی جو سیدھی سنٹرل جیل کی طرف جاتی تھی۔ سنٹرل جیل کا لوہے کا پھاٹک بند تھا۔ اگرچہ اس جیل میں اب قیدیوں کی وہ تعداد نہیں تھی جو انگریزوں کے زمانے میں ہوا کرتی تھی لیکن یہ بات صرف جیل کے حکام اور انڈین ملٹری انٹیلی جنس کو ہی معلوم تھی کہ کانگریسی حکومت نے یہاں علیحدگی پسند تحریکوں کے جوشیلے لیڈروں کو بند کر رکھا ہے۔ ان بدنصیب قیدیوں کے لواحقین کو بھارت میں کچھ خبر نہیں تھی کہ یہ لوگ کہاں اچانک غائب ہو گئے ہیں۔ بھارتی حکومت نے ان کے خلاف یہ پروپیگنڈا شروع کر رکھا تھا کہ یہ تخریب کار ہمسایہ ملک میں تخریب کاری اور دہشت گردی کی ٹریننگ کرنے گئے ہوئے ہیں۔ ان ساری باتوں کا علم ندیم کو جیل میں آنے کے بعد ایک مسلمان بنگالی نژاد انڈیمانی مسلمان نذرل کے ذریعے ہوا۔ جو جیل میں نائب میٹ تھا اور اس کی ڈیوٹی صبح اور شام کے وقت ان مختصر قیدیوں کی گنتی کر کے بلند آواز میں "سب اچھا ہے" کا اعلان کرنا تھا۔ جیل کے آہنی گیٹ پر جیل کا بہاری ہندو سپرنٹنڈنٹ "پاکستانی جاسوس" کو انڈین ملٹری گارڈز سے وصول کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ نائب وارڈن، حوالدار اور میٹ بھی ایک طرف اٹین شن کھڑے تھے۔ حوالداروں میں چار سکھ تھے۔ انھوں نے رائفلیں کاندھوں پر اٹھا رکھی تھیں۔ گنڈا سنگھ چیف وارڈن ندیم کے ساتھ ہی گاڑی سے اترا۔ ندیم کے پاؤں میں بیڑی پڑی تھی جس کی وجہ سے اسے چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ انڈین گارڈز نے ندیم کو جیل سپرنٹنڈنٹ کے حوالے کر کے دستخط لیے اور وہاں سے گاڑی میں بیٹھ کر واپس چلے گئے۔ ندیم کو بیرک نمبر ۳ کی "چکی" میں بند کر دیا گیا۔ یہ ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جس میں کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا۔ فرش پر ناریل کی چھال بچھی تھی۔ کونے میں مٹی کا گھڑا رکھا تھا جس کے اوپر ناریل کا پیالہ اوندھا پڑا تھا۔ کوٹھری کے دروازے

لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ سامنے ایک تنگ راہداری تھی جہاں سے کبھی کبھی حوالدار بندوق لیے گزر جاتا تھا۔ ندیم کو کالے پانی کی اس جیل میں آئے دو دن ہوئے تھے کہ انڈیا سے تین فوجی پوچھ گچھ کرنے آ گئے۔ ندیم کو جیل کے ایک تہہ خانے میں لے جایا گیا۔

ان فوجیوں میں ایک سکھ میجر بھی تھا۔ پہلے تو اس نے ندیم کے ساتھ بڑی ہمدردی کا اظہار کیا اور اسے قائل کرنے کی کوشش کی اور اسے پیش کش کی کہ اگر وہ اپنے ساتھی جاسوسوں کے پتے بتا دے تو اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اس پر مقدمہ بھی نہیں چلایا جائے گا اور اسے پاکستانی سفارت خانے پہنچا دیا جائے گا۔ ندیم کا جاسوسی سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ پاکستانی جاسوس نہیں تھا، وہ تو صرف نجمی کی خاطر بھارت آیا تھا اور اس کا مقصد صرف نجمی کو اپنے ساتھ واپس پاکستان لے جانا تھا۔ اس نے یہی کہہ دیا کہ وہ جاسوس نہیں ہے۔ تب اس پر تشدد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلے تو اسے بیدردی سے پیٹا گیا پھر اسے رسی کے ساتھ الٹا لٹکا دیا گیا۔ تشدد اور بربریت کا یہ سلسلہ دو روز تک جاری رہا۔ اس دوران ندیم کو سوائے چند گھونٹ پانی کے اور کچھ نہ دیا گیا۔ کئی بار وہ بے ہوش ہوا۔ اسے زبردستی ہوش میں لایا جاتا اور جسمانی اذیتوں کا سلسلہ پھر سے شروع ہو جاتا۔ پانچویں روز سکھ میجر نے جیل کے بہاری ہندو سپرنٹنڈنٹ کو بلا کر حکم دیا کہ اس "پاکستانی جاسوس" کی کڑی نگرانی کی جائے اور اسے کسی حالت میں بھی جیل کی کوٹھری سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ انڈین فوجی ہیلی کوپٹر میں بیٹھ کر کسی نئی منصوبہ بندی کے لیے واپس بھارت چلے گئے۔

ندیم کی گرفتاری کے بعد مرہٹہ انسپکٹر منجریکر کو نجمی پر تشدد کرنے کا ایک اور بہانہ ہاتھ آ گیا۔ بنگال پولیس کے محکمے نے منجریکر کو تعریفی سند عطا کر دی اس نے ایک خطرناک "پاکستانی جاسوس" [illegible] گرفتار کروایا تھا۔ انسپکٹر منجریکر کو اب کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ وہ جب جی چاہتا نجمی کو اپنے فلیٹ پر بلا لیتا اور اسے اپنی حیوانی بربریت کا نشانہ بناتا۔ نجمی کے سینے میں جو لاوا ابل رہا تھا لگتا تھا کہ اب وہ پھٹنے ہی والا ہے۔ بہت جلد نجمی کو ایک ایسا موقع مل گیا جس کی وہ مدت سے تلاش میں تھی۔ ندیم کے بارے میں اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اسے گرفتاری کے بعد کہاں رکھا گیا ہے اور وہ کس حال میں ہے۔ ایک رات نجمی، چندا بائی کے روپ میں سوناگاچی والے کوٹھے پر مجرا کر رہی تھی۔ رات کا ایک بجنے والا تھا۔ اکثر تماش بین جا چکے تھے

صرف ایک سیٹھ بیٹھا ابھی تک سو سو کے نوٹ لٹا رہا تھا۔ نجمی مجرا کرتے کرتے تھک گئی تھی لیکن دھومل بدمعاش جس نے مکھی بائی کے قتل کے بعد اپنی بدمعاشی کے بل پر کرشنا بائی اور چندا کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا، اسے مجرا جاری رکھنے کی ہدایت جاری کر رہا تھا کیونکہ سیٹھ دولت لٹا رہا تھا جسے دھومل سمیٹتا جا رہا تھا۔ کرشنا بائی اوپر والے کوٹھے پر سے اپنا دھندا ختم کر کے جا چکی تھی۔ اتنے میں ایک اونچا لمبا بڑی بڑی مونچھوں والا قوی ہیکل سرخ و سپید جوان رائفل ہاتھ میں لیے کاندھے پر گولیوں کی پیٹی لٹکائے، سر پہ لال صافہ باندھے دروازہ کھول کر بیٹھک میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے دو مسلح باڈی گارڈ بھی تھے۔ دھومل، نجمی اور سازندوں نے اس کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ مجرا رک گیا۔ نووارد جوان نے رائفل والا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا "ناچ بند نہ کرو بائی ہم تمہارا گانا سننے آئے ہیں" اور سیٹھ کے پاس ہی چاندنی پر بیٹھ گیا۔

اس کے باڈی گارڈز دروازے کے قریب ہی دری پر بیٹھ گئے۔ نجمی نے مجرا شروع کر دیا۔ طبلے پر تھاپ پڑنے لگی مگر طبلچی خوف کی وجہ سے بے تالے ہو رہے تھے۔ اجنبی نوجوان کا چہرہ مہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کوئی خونخوار ڈاکو ہے یا پھر پنجاب کا کوئی نامی گرامی بدمعاش ہے۔ اجنبی نوجوان نے جیب سے سو سو روپے کی دو گڈیاں نکال کر سامنے رکھ لیں۔ ان میں سے سو روپے کا نوٹ نکال کر نجمی کی طرف اچھالا اور کہا "چندا بائی! ہم نے تمہارے مجرے کی بڑی تعریف سنی تھی۔ سوچا آج چل کر تم سے ملاقات کی جائے۔ میرا نام لال خان ہے۔"

نجمی نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور سو روپے کا نوٹ اٹھا کر دھومل بدمعاش کی طرف پھینک دیا جو لال خان کی موجودگی سے کافی حد تک مرعوب تھا۔ بنگالی سیٹھ تو اسی وقت اٹھ کر کوٹھے سے نیچے چلا گیا۔ نجمی نے لال خان کی فرمائش پر ایک اور غزل گانی شروع کر دی۔ اسے یہ خوبصورت اجنبی لال خان اچھا لگا تھا۔ ندیم کے بعد پہلی بار کوئی مرد اسے پسند آیا تھا۔ وہ ایک خاص کیفیت میں ڈوب کر غزل گا رہی تھی۔ لال خان اس پر خوش ہو کر سو سو کے نوٹ نچھاور کر رہا تھا۔ دھومل بدمعاش بے تابی سے نوٹ اٹھا اٹھا کر چاندی کے گول ڈبے میں

جمائے جا رہا تھا۔ ایک بار وہ نوٹ اٹھانے لگا تو لال خاں نے اپنے سامنے پڑی ہوئی رائفل بائیں ہاتھ سے اٹھائی۔ نالی کا رخ دھومل بدمعاش کی طرف کیا اور کرخت لہجے میں پوچھا ”ابے چندا بائی کو بھی کچھ دے گا کہ سب اپنے پاس ہی رکھے گا؟“

دھومل بدمعاش نے ہاتھ جوڑے اور ڈری ہوئی آواز میں بولا ”دادا بھائی یہ سارا مال چندا بائی ہی کا ہے۔ ہم تو اس کے داس ہیں۔“

لال خاں نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا ”ابے میں سب جانتا ہوں تم لوگوں کو۔“ اس نے رائفل اپنے سامنے رکھ دی اور تکیے سے ٹیک لگا کر اپنی مونچھوں کو انگلیوں سے مروڑتے ہوئے نجمی کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھنے لگا۔

نجمی غزل بھی گا رہی تھی اور نرت بھی کر رہی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ لال خان نے دروازے کی طرف دیکھا اور گرج کر کہا ”جو کوئی بھی آ رہا ہے اسے واپس بھیج دو۔“

لال خان کے دونوں باڈی گارڈ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھے مگر اتنی دیر میں دوسرا اجنبی دروازے میں نمودار ہو چکا تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر دھومل اور نجمی جیسے سکتے میں آ گئے۔

یہ مان سنگھ ڈکیت تھا جو اس کوٹھے میں کئی خون کرنے کے بعد نجمی کو اغوا کر کے لے گیا تھا۔

لال خان نے مان سنگھ ڈکیت کو پہچان لیا تھا۔ مان سنگھ کے لیے لال خان اجنبی تھا۔ اس نے غراتے ہوئے کہا ”کون ہو تم؟“

لال خاں اسی طرح تکیے کے سہارے بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھیں سکڑ گئی تھیں اور ان میں سے چنگاریاں پھوٹنے لگی تھیں۔ اس کے باڈی گارڈ وہیں جم سے گئے تھے۔ مان سنگھ ڈکیت کے باڈی گارڈ بھی اب دروازے میں آ گئے۔ لال خان نے مان سنگھ ڈکیت کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑ رکھی تھیں گہری آواز میں بولا ”مان سنگھ کیا تو مجھے نہیں جانتا؟ میں لال خاں ہوں۔“ مان سنگھ ڈکیت نے رائفل کا رخ لال خاں کی طرف کر دیا اور کرختگی سے بولا ”تم جو کوئی بھی ہو۔ اگر جان پیاری ہے تو یہاں سے نیچے اتر جاؤ۔“ لال خان نے مونچھیں مروڑتے ہوئے کہا ”جان تو لال خان کو کبھی بھی پیاری نہیں ہوئی۔“ اس کے ساتھ ہی ایک بجلی چمکی۔ کچھ پتہ نہ چل سکا

کہ کب لال خان کا ہاتھ رائفل کی طرف بڑھا، کب رائفل اٹھی اور کب اس نے آگ اگلی اور گولی مان سنگھ ڈکیت کے سینے سے پار ہو گئی۔ وہ منہ کے بل آگے کو گرا لال خان کے باڈی گارڈوں نے گولیاں چلا کر مان سنگھ کے محافظوں کو خون میں لت پت کر دیا۔ نجمی نے اب جو لال خان کی طرف دیکھا تو وہ رائفل تانے چاندنی پر ٹانگیں پھیلائے کھڑا مان سنگھ ڈکیت کو نفرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ دھومل بدمعاش چاندی کے ڈبے کے پاس سہما ہوا بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سازندے وہیں لڑھک کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ لال خان نے اپنے محافظوں سے کہا ”اس کتے کے آدمی نیچے ہوں گے۔ انھیں بھی ڈھیر کر دو۔“

دونوں محافظ نیچے کو دوڑے اس کے ساتھ ہی لال خان نے نجمی کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا ”چندا بائی! تیرے کوٹھے کے فرش پر کافر کا خون بکھر گیا ہے کھنگی سے کہہ کر اسے صاف کرا دینا۔“

اسی لمحے نیچے بازار سے اوپر تلے چار گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی اور جیسے بازار میں بھگدڑ مچ گئی۔ لال خاں نیچے اترنے لگا تو نجمی نے لپک کر اس کا بازو تھام لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پورے اعتماد کے ساتھ بولی ”خان! مجھے اپنے پاس رکھو گے؟“

لال خان نے رائفل کاندھے پر ڈالتے ہوئے کچھ چونک کر نجمی کی طرف دیکھا۔ پھر چہرہ آگے کو جھکا کر کہا ”تو ہرنی ہے۔ شیر کے ساتھ کیسے رہے گی؟“

نجمی نے فوراً جواب دیا ”میں ہرنی نہیں شیرنی ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی نجمی نے پلک جھپکتے ہی لال خاں کے کاندھے سے رائفل کھینچ کر اپنے ہاتھوں میں لی اور اس کا رخ دھومل بدمعاش کی طرف کر دیا۔ دھومل بدمعاش بھیگی بلی بنا سہما ہوا بیٹھا تھا طبلچی کو ہوش آ گیا تھا اور وہ خوف زدہ آنکھوں سے یہ سب کچھ ہوتا دیکھ رہا تھا۔

نجمی نے دھومل کو گالی دے کر کہا ”تو میرا پہلا انتقام ہے دھومل“ اور نجمی نے لبلبی دبا دی۔ دھماکہ ہوا۔ نالی نے شعلہ اگلا اور گولی دھومل کو خون میں لت پت کرتی اس کے سینے سے پار ہو گئی۔ نجمی نے سیفٹی کیچ کھینچ کر دھومل پر اوپر تلے مزید دو فائر کر دیئے دھومل کے جسم میں ذرا سی حرکت پیدا ہوئی اور پھر اس کا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔

لال خان نے نجمی کے ہاتھ سے رائفل لے لی اور اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر دروازے

کی طرف لے جاتے ہوئے بولا "چندا بائی! تو سچ مچ شیرنی ہے چل میرے ساتھ۔"

نجمی لال خان کے ساتھ نیچے بازار میں آ گئی۔ بازار میں جن بھیڑ گیا لگتا تھا۔ مان سنگھ ڈکیٹ کی لاش کوٹھے پر دھوبل بدمعاش کی لاش کے ساتھ پڑی تھی اور نیچے بازار میں مان سنگھ کے چاروں ساتھیوں کی لاشیں ادھر اُدھر جیپ کے پاس پڑی تھیں۔ سامنے لال خان کی جیپ کھڑی تھی جس پر اس کے محافظ پہرہ دے رہے تھے۔ بازار خالی ہو گیا تھا نجمی لال خان کے ساتھ جیپ میں بیٹھی اور جیپ ایک زناٹے سے آگے بڑھی اور سوناگاچی کے بازار میں سے نکل کر ایک کھلی کشادہ سڑک پر بھاگنے لگی۔

نجمی نے اپنے دل میں جو فہرست بنائی تھی اس میں سے دھوبل بدمعاش کا نام کاٹ دیا ابھی اس فہرست میں بہت سے ان لوگوں کے نام باقی تھے جنھوں نے نجمی کے دامن عفت کو تار تار کیا تھا اور اسے بازار حسن میں لا کر کوٹھے پر بٹھا دیا تھا۔ اب اس کی زندگی کا یہی مقصد تھا کہ وہ ایک ایک کر کے ان ظالم اور جابر لوگوں سے بھرپور انتقام لے اور انھیں جہنم واصل کرے۔ یہی وہ مقصد تھا جس کو اپنے سینے میں چھپائے وہ لال خان کے ساتھ بازار حسن سے شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ انتقام کی آگ کا یہی وہ شعلہ تھا جو اسے ندیم کے ساتھ واپس پاکستان جانے سے روکے ہوئے تھا۔ ندیم اس سے صرف محبت کرتا تھا اور نجمی کو محبت کی نہیں انتقام کی آگ بجھانے کی ضرورت تھی اور وہ جانتی تھی کہ ندیم اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ گناہ کے بازار میں دکانداری کرتے ہوئے نجمی کو انسانوں کے چہرے پڑھنے آ گئے تھے۔ اس نے لال خان کے چہرے پر وہ شرافت دیکھ لی تھی جو ایک بہادر اور غیرت مند انسان کے چہرے پر نمایاں ہو سکتی ہے۔ نجمی کو ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے لال خان کو دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ چلی جائے گی اور جو کام وہ اکیلی نہیں کر سکتی وہ اس کے ساتھ مل کر کرے گی۔ یہی وہ آدمی تھا جس کے لیے اسے ایک روز بازار حسن چھوڑ دینا تھا۔ جیپ دھرم تلہ سے نکل کر ڈلہوزی اسکوائر کی طرف پوری رفتار سے دوڑی جا رہی تھی۔ نجمی نے جس وقت دھوبل پر گولی چلائی تھی۔ اس وقت طبلچی ہوش میں تھا اور اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس قتل کا عینی گواہ تھا۔ نجمی چاہتی تھی کہ اس

قتل کا وہ پیچھے کوئی عینی شاہد چھوڑ جائے تاکہ اگر کبھی وہ خواہش بھی کرے تو واپس بازار حسن میں نہ جا سکے۔ اس قتل سے وہ اپنے دشمنوں کو ایک طرح سے دہشت زدہ بھی کرنا چاہتی تھی۔ تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ بہت جلد ان کی باری بھی آنے والی ہے۔ نجمی نے دھوبل بدمعاش کو ہلاک کرنے سے پہلے جان بوجھ کر یہ جملہ بولا تھا کہ تم میرے پہلے انتقام ہو۔ نجمی کے انتقام کا دوسرا نشانہ مرہٹہ پولیس انسپکٹر منجریکر تھا۔ وہ اس سے کس طرح بدلہ لے گی؟ اور اسے کہاں اور کیسے موت کی نیند سلائے گی؟ یہ ابھی نجمی کے ذہن میں واضح نہیں۔

جیپ اب کلکتہ شہر سے باہر ہوڑہ برج کی طرف جا رہی تھی۔ لال خان خود جیپ چلا رہا تھا۔ اس کے چاروں محافظ جیپ میں پیچھے بیٹھے تھے۔ نجمی اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔

لال خان نے جیپ کے شور میں بلند آواز میں کہا "تم نے پہلے بھی کبھی رائفل چلائی تھی چندا بائی؟"

نجمی نے اونچی آواز میں جواب دیا "ایک بار چلائی تھی۔ جب ذلیل مان سنگھ ڈکیٹ مجھے اغوا کر کے لے گیا تھا۔"

لال خان نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے مان سنگھ ڈکیٹ کو گالی دے کر باہر تھوک دیا اور بولا "عورتوں کو اغوا کرنے والے گیدڑ ہوتے ہیں"

جیپ ہوڑہ برج عبور کر گئی۔ یہ لوگ چھ خون کر کے آ رہے تھے۔ پولیس ضرور ان کی تلاش میں نکل چکی ہو گی۔ نجمی نے ایک بار پیچھے کی طرف دیکھا۔ لال خان کی آنکھیں جیپ کے باہر لگے ہوئے شیشے کو کبھی کبھی دیکھ لیتی تھیں۔ ان کے پیچھے کوئی گاڑی نہیں آ رہی تھی۔ پل کے دوسری طرف آ کر نجمی نے لال خان سے پوچھا "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

لال خان نے قہقہہ بلند کیا اور بولا "شیر کی کچھار میں۔"

جیپ کلکتے کے صنعتی علاقے سے گزر رہی تھی۔ ادھر اُدھر کارخانوں میں بتیاں جل رہی تھیں مگر آدھی رات کے وقت سارا علاقہ سنسان پڑا تھا۔ جیپ اس علاقے سے گزرنے کے بعد دریا کے ساتھ اوپر کے رخ روانہ ہو گئی۔ نجمی کو لال خان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کوئی ڈاکو ہے یا کسی علاقے کا سردار ہے۔ اس کی شکل رنگ روپ اور اردو بولنے کا لہجہ اتر پردیش کا تھا۔ وہ کسی طرح سے بھی بنگالی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ پنجابی ہونے کا شبہ اس پر اس لیے بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ

پاکستان بننے کے بعد مشرقی پنجاب سے مسلمان پنجابی ہجرت کرکے پاکستان چلے گئے تھے۔ صرف مالیر کوٹلہ ایک ایسی ریاست تھی جہاں پنجابی مسلمانوں کے کچھ گھرانے پیچھے رہ گئے تھے۔ لیکن ان کا لہجہ مختلف تھا۔ لال خان لکھنؤ، بریلی اور بدایوں کے لہجے میں اردو بولتا تھا۔ نجمی ان تمام لہجوں سے واقف تھی۔ اس کے کوٹھے پر بھانت بھانت کے بھارتی صوبوں کے لوگ اس کا گانا سننے آتے تھے۔

جیپ دریائے ہگلی کے دائیں کنارے سے ہٹ کر ناریل کے درختوں کے ایک گنجان ذخیرے میں گم ہو گئی۔ یہاں گھپ اندھیرا تھا۔ جیپ کی روشنی میں نجمی کو درختوں کے سیدھے اور توسی تنے اور جھاڑیاں ہی نظر آ رہی تھیں۔ جیپ ہچکولے کھاتی غیر ہموار کچے راستے پر چلتی جا رہی تھی۔ ایک بات نجمی کے ذہن میں بالکل واضح ہو چکی تھی کہ اب وہ واپس سوناگاچی نہیں جا سکتی۔ اس کے خلاف عینی شاہد طبلچی کے بیان کے مطابق قتل کے جرم میں مقدمہ درج کر دیا جائے گا اور پولیس اب اسے پھانسی کے تختے تک پہنچانے کے لیے اس کی تلاش میں نکل کھڑی ہو گی۔ نجمی واپس جانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ تو ایک عرصہ سے اس موقع کی کھوج میں تھی۔ اسے ایک ایسا بہادر ساتھی مل گیا تھا جو انتقام کی آگ بجھانے میں اس کی مدد کر سکتا تھا اور جس کو وہ پسند بھی کرنے لگی تھی۔ ناریلوں کا ذخیرہ ختم ہوا تو جیپ ایک بہت بڑی جھیل کے ساتھ اگے ہوئے سنبل اور تاڑ کے درختوں کے نیچے سے ہوتی ہوئی بانس کی ایک باڑھ کے پاس آ کر رک گئی۔ لال خان نے جیپ سے اترتے ہوئے اپنے محافظوں سے کہا کہ وہ پہرے پر جا کر کھڑے ہو جائیں اور نجمی کو ساتھ لے کر بانس کے باڑے میں داخل ہو گیا۔ آگے ڈھلان آ گئی۔ یہاں آم کے بہت ہی گھنے جھنڈ تھے۔ ان کے بیچ میں ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ ندی کے اس کنارے پر ایک ٹیلے کی اوٹ میں نجمی کو اندھیرے میں ایک کھنڈر کا ہیولا ابھرتا دکھائی دیا۔۔۔
لال خاں نے نجمی کو بتایا کہ وہ اور اس کے ساتھی عارضی طور پر اس حویلی کے کھنڈر میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ حویلی کا محرابی دروازہ ایک طرف کو گرا ہوا تھا۔ ڈیوڑھی میں اندھیرا تھا۔

لال خان نے آواز دی "اوئے جگو سو تو نہیں گیا؟"

ڈیوڑھی کی ایک گھور اندھیری کوٹھری میں سے ایک آدمی لپک کر سامنے آ گیا۔ اس نے سر پہ کپڑا

لپیٹ رکھا تھا۔ "خان! جاگ رہا ہوں۔" جگو نے لال خان کو سلام کیا۔

حویلی کے اندر ایک چھوٹا سا صحن تھا جہاں ایک طرف بانس کے ساتھ لٹکی ہوئی لالٹین جل رہی تھی۔ صحن کے آگے برآمدہ تھا جس کے ساتھ تین چار کوٹھریاں تھیں۔ لال خان نجمی کو ایک کوٹھری میں لے آیا۔ یہاں ایک دیا روشن تھا۔ دیوار کے ساتھ بانس کی چارپائی پر دری بچھی ہوئی تھی۔ لال خان نے نجمی سے کہا "چندا بائی! یہ تیری کوٹھری ہے اب تو یہاں آرام کر۔ کل تجھ سے بات ہو گی۔ اور ہاں اگر تو پولیس کی ٹاؤٹ نکلی تو تیری لاش کے ٹکڑے میں خود چاقو سے کروں گا۔"

لال خان چلا گیا۔ نجمی دروازہ بند کرکے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ دشمن کافروں سے خوفناک انتقام لینے کا طریق کار کیا ہو سکتا ہے؟

⁂ ⁂ ⁂

نجمی کافی دن چڑھے تک سوتی رہی۔

جب وہ کوٹھڑی سے باہر نکلی تو آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور اس کی کوٹھڑی کے باہر ایک آدمی بندوق لیے پہرہ دے رہا تھا۔ لال خان کو ابھی نجمی عرف چندا بائی پر پورا اعتماد نہیں تھا۔ اس کے خیال میں چندا پولیس کی ایجنٹ بھی ہو سکتی تھی۔ نجمی دل میں مسکرا دی۔۔۔ ڈیوڑھی کے باہر آم کے درختوں تلے لال خان کے کچھ ساتھی بندوقیں، رائفلیں قریب رکھے آگ جلائے بیٹھے، کچھ پکا رہے تھے۔ لال خان وہاں موجود نہیں تھا۔

نجمی کو آتے دیکھ کر ایک آدمی اس کے پاس آیا اور بولا "چندا بائی! تالاب اس طرف ہے"
نجمی خاموشی سے جس طرف تالاب تھا اس جانب چل گئی۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر نجمی نے غسل کیا اور بالوں کو جھٹکتی واپس حویلی کے کھنڈر میں آ گئی۔ لال خان اس کی کوٹھڑی کے باہر گرد آلود برآمدے میں پڑے ہوئے لکڑی کے کھوکھے پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ رائفل اس کے گھٹنوں پر تھی۔

وہ نجمی کو دیکھ کر بولا "چندا بائی! کچھ کھا پی لو۔"
تھوڑی دیر بعد نجمی کوٹھڑی میں بیٹھی چاول مچھلی کھا رہی تھی۔ ایک آدمی چائے کی دو پیالیاں اور تام چینی کی کیتلی لے کر اندر رکھ کر چلا گیا اس کے جانے کے بعد لال خان آ گیا۔ بانس کی چارپائی کے پاس دو کھوکھے پڑے تھے ایک کھوکھے پر چائے کی کیتلی اور پیالیاں رکھی تھیں۔

لال خان دوسرے کھوکھے پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا "چندا بائی! اب سچ سچ بتا تو میرے ساتھ کیوں آ گئی۔۔۔ کیا تجھے پولیس نے بھیجا ہے؟"

نجمی نے پیالیوں میں چائے انڈیلی ایک پیالی لال خان کو دی دوسری اپنے ہاتھ میں تھامی اور بولی "لال خان! سب سے پہلی بات تو میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں ہندو نہیں مسلمان ہوں اور میرا نام چندا بائی نہیں نجمی ہے۔۔۔۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں بنگال کی نہیں بلکہ پاکستان کی رہنے والی ہوں اور میرا تعلق لاہور سے ہے۔"

لال خان پیالی ہاتھ میں لیے تعجب سے نجمی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر نجمی نے لال خان کو شروع سے لے کر آخر تک اپنی ساری داستان الم بیان کر دی۔ اپنی کہانی سناتے ہوئے کئی بار اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ اپنے اوپر ظلم کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے نجمی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بجائے چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ جب وہ اپنی کہانی ختم کر چکی تو لال خان نے چائے کی خالی پیالی کھوکھے پر رکھ دی۔ وہ چائے کی تین پیالیاں اور چار سگریٹ پھونک چکا تھا۔

نجمی نے ایک گہرا سانس بھر کر کہا "خان! یہ تھی میری کہانی۔۔۔۔ اب تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں تمہارے ساتھ کیوں آئی ہوں۔۔۔۔ میں نے نہ تو مبالغے سے کام لیا ہے اور نہ جھوٹ بولا ہے۔۔۔۔ اپنی دکھ بھری زندگی کا ایک ایک ورق تمہارے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے۔۔۔۔ اگر تم نے مجھے اپنے پاس نہ رکھنے کا فیصلہ کیا تو میں تمہیں اپنا فیصلہ واپس لینے پر مجبور نہیں کروں گی۔۔۔۔ پھر میں خود اپنے دشمنوں سے انتقام لینے نکل کھڑی ہوں گی۔۔۔۔ تم سے صرف اتنی درخواست کروں گی کہ مجھے ایک رائفل اور جتنے میرے دشمن، میرے قاتل ہیں۔ اتنی گولیاں گن کر مجھے دے دینا۔۔۔۔ اس کے بعد چاہے میں پھانسی چڑھ جاؤں لیکن اپنے قاتلوں میں سے ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

لال خان نے نجمی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کی چیتے ایسی آنکھیں نجمی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں کہنے لگا "پڑھ کلمہ شریف"

کلمہ شریف پڑھتے ہوئے نجمی کی آنکھوں میں اپنے آپ آنسو چھلک پڑے۔ لال خان نے نجمی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہی ہاتھ گھٹنے پر پڑی رائفل پر رکھا اور خود کلمہ شریف پڑھا اور بولا۔
"جس جس کافر نے تم کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا ہے میں جب تک ان کی لاشیں خاک و خون میں تڑپتے نہیں دیکھ لوں گا مجھے چین نہیں پڑے گا۔۔۔۔ مجھے اپنے آدمی لے کر آج رات یہاں سے واپس اپنے جنگل والے ٹھکانے پر چلے جانا تھا مگر اب میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا۔

جب تک تجھ پر ظلم کرنے والوں سے بدلہ نہیں لے لیتا۔"

نجمی نے لال خان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "خان! ان لوگوں کو میں اپنے ہاتھوں سے ہلاک کرنا چاہتی ہوں۔" لال خان بولا "یہ کام تم ہی کرو گی مگر میں بھی تمھارے ساتھ ہوں گا... اب تم مجھے بتاؤ کہ پہلی گولی تم کس کے سینے میں اتارنا چاہتی ہو؟" نجمی نے کہا "میں پہلی گولی اپنے پہلے دشمن کے سینے میں اتار چکی ہوں اور اس کا نام دھومل بدمعاش تھا!!... پھر نجمی نے لال خان کو ان تمام لوگوں کے نام اور پتے بتائے جہاں وہ رہتے تھے۔ ان میں انسپکٹر پولیس منجریکر کا نام سرفہرست تھا۔ لال خان اپنی مونچھوں کو انگلیوں سے مروڑ رہا تھا۔ رائفل پکڑ کر اٹھتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے... تم رات بھر کی جاگی ہو... ابھی آرام کرو... ہم آج رات انسپکٹر پولیس جریکر کا حال چال پوچھنے اس کے مکان پر جائیں گے۔" لال خان چلا گیا۔ نجمی چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور تصور میں مرہٹہ پولیس انسپکٹر کی لاش کو خون میں تڑپتے دیکھا... پھر اسے نیند آگئی۔ وہ کافی دیر تک سوتی رہی۔ جس وقت لال خان نے خود کوٹھری میں آکر اسے جگایا تو رات کے نو بج رہے تھے۔ حویلی کے کھنڈر کے صحن میں الاؤ روشن تھے۔ لال خان کے ساتھی کھانا کھا رہے تھے۔ ان میں سے ایک بھی بنگالی نہیں تھا سب کا تعلق اتر پردیش کے علاقے سے تھا اور سبھی بقول لال خان قتل اور ڈاکے کی وارداتیں کرکے بھاگے ہوئے تھے لاکھی نام کا آدمی لال خان کا قریبی ساتھی تھا۔ یہ ہندو تھا مگر لال خان کو اس پر بے حد بھروسہ تھا لال خان کے کہنے کے مطابق اس نے کئی بار اس کی جان بچائی تھی۔ نجمی نے ایک ہی دن میں محسوس کرلیا تھا کہ لاکھی کی نگاہ صاف نہیں ہے۔ نجمی لاکھ پردوں میں چھپی ہوئی نظروں کی حقیقت پہچان لیتی تھی۔

لاکھی پختہ عمر کا آدمی تھا، رائفل ہر وقت کاندھے پر رہتی تھی، ماتھے پر کسی گہرے زخم کا نشان تھا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ لال خان کے ساتھ ایک طرف بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتا اور سگریٹ وغیرہ پیتا رہا۔ نجمی کھانا کھانے کے بعد اپنی کوٹھری میں آکر لیٹ گئی تھی۔ کوئی گیارہ بجے رات لال خان کوٹھری میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں گٹھڑی تھی۔ نجمی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگا۔ "یہ ساڑھی ٹھیک نہیں رہے گی... یہ میں تمھارے لیے پتلون، قمیص لایا ہوں... تم اسے پہن لو... ہم بھی یہی پہنتے ہیں۔ ان کپڑوں میں واردات کرتے وقت آسانی رہتی ہے۔" وہ چلا گیا۔

نجمی نے گٹھڑی کھولی اس میں گہرے رنگ کی پتلون اسی رنگ کی پرانی قمیص اور ربڑ کے جوتے تھے۔ نجمی نے ساڑھی اتار کر یہ کپڑے پہن لیے۔ لال خان نے تھوڑی دیر بعد آکر اسے دیکھا اور بولا۔ "اب تم بالکل ٹھیک لگتی ہو... یہ لو سر پہ ہماری طرح رومال بھی باندھ لو۔" نجمی نے سر پر سرخ رومال یا صافہ باندھ لیا۔ لال خان نے ایک رائفل نجمی کو دی اور بولا "اس میں میگزین لوڈ ہے... ایک گھنٹے بعد ہم چل دیں گے... تمھیں کافر منجریکر کی کوٹھی کا پتہ معلوم ہے نا؟"

"ہاں" نجمی بولی۔ ایک ایک کافر کے گھر کا پتہ میرے دل پر نقش ہے۔"

لال خان بغیر کوئی جواب دیئے باہر نکل گیا۔ نجمی نے رائفل کا سیفٹی کیچ کھولا پھر بند کر دیا۔ میگزین چیک کیا۔ چیمبر گولیوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سر پر رومال باندھے، پتلون قمیص اور ربڑ کے سیاہ جوتوں میں چارپائی پر بیٹھ گئی اور اس وقت کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی جب وہ وہاں سے نکل کر انتقام کی آگ بجھانے پولیس انسپکٹر منجریکر کی کوٹھی کی طرف جا رہی ہوگی۔ باہر صحن میں خاموشی چھائی تھی۔ کوٹھری میں مٹی کا دیا اپنی مدھم روشنی بکھیر رہا تھا۔ قدموں کی بھاری چاپ سنائی دی۔

دروازہ کھول کر لال خان اندر آیا "چلو... کافر سے بدلہ لینے کا وقت آگیا ہے۔"

لال خان کے ساتھ اس کے قریبی دوست لاکھی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ نجمی لال خان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ رات کی تاریکی میں تالاب کے قریب سے گزر کر وہ اوپر اس جگہ آگئے، جہاں بانس کے باڑے کی ایک جانب ان کی جیپ کھڑی تھی۔ تینوں نے رائفلیں کاندھوں پر لٹکا رکھی تھیں۔ نجمی لال خان کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جیپ کی کینوس کی چھت ڈال دی گئی تھی جس کی وجہ سے باہر سے ان لوگوں کو آسانی سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ لال خان کی پیٹی میں ریوالور بھی لٹک رہا تھا۔ اس کا ساتھی لاکھی جیپ میں پیچھے بیٹھ گیا۔ جیپ کلکتہ شہر کی طرف روانہ ہو گئی۔ پولیس انسپکٹر منجریکر کی کوٹھی خضر پور کی آبادی میں واقع تھی۔ یہ کوٹھی اس نے رشوت کی کمائی سے بنوائی تھی۔ اس نے اپنے بال بچے پونا بھیج رکھے تھے اور اس کوٹھی میں اکیلا رہ کر عیش و عشرت کے دن گزارتا تھا۔ لال خان کے لیے کلکتہ شہر کوئی اجنبی شہر نہیں تھا۔ بچپن اور نوجوانی میں اس نے اس بڑے شہر میں فاقہ مستی کے بہت دن گزارے تھے۔ لال خان فیض آباد کے

ایک غریب مگر غیور گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ بچپن ہی میں ماں باپ انتقال کر گئے اور وہ رشتے داروں کے ٹکڑوں پر پڑے رہنے کی بجائے کلکتہ آ گیا۔ کلکتے میں وہ ایک کارخانے میں نوکر ہو گیا جہاں اس نے کارخانے کے ہندو بنگالی مالک کو غریبوں اور مزدوروں پر بے پناہ ظلم کرتے دیکھا۔ یہاں سے وہ ایک ہندو تعلقدار کی عالی شان حویلی میں آ گیا۔ یہاں اس کا کام بگھی کی صفائی اور گھوڑوں کی رکھوالی کرنا تھا۔ ایک روز لال خان نے بنگالی تعلقدار کو ایک نوکرانی کو بے قصور بے دردی سے پیٹتے دیکھا تو اس نے اینٹ اٹھا کر مالک کے سر پر دے ماری اس کا سر کھل گیا وہاں شور مچ گیا اور لال خان بھاگ کھڑا ہوا۔ کلکتے میں ہی وہ آوارہ گردی کرتا رہا اور جرائم پیشہ لوگوں کے ایک گروہ میں شامل ہو گیا۔ اسی گروہ میں رہ کر وہ جوان ہوا اور جوانی کی سرحد سے گزرا تو اس کے ہاتھوں ایک آدمی کا خون ہو گیا۔ وہ روپوش ہو کر بہار کے جنگلوں کی طرف نکل گیا۔ یہاں اس نے اپنا ایک گروہ بنا لیا یہ سب مفرور قاتل اور ڈاکو تھے جو ایک ایک کر کے اس کے ساتھ ملتے گئے۔ اب وہ برسات کے بعد بہار کی سیاہ پہاڑیوں اور تاریک دشوار گزار جنگلوں سے نکل کر کلکتے جا کر کبھی ناریلوں کے جھنڈوں میں واقع ویران حویلی کے کھنڈر میں اور کبھی دریائے ہگلی کے ڈیلٹا کی دلدلوں میں اپنا ٹھکانا بناتا۔ شہر میں چار چھ سرمایہ دار ہندو سیٹھوں کے گھروں میں ڈاکا ڈال کر ان کے زیور، جواہرات لوٹتا اور واپس بہار کی طرف چلا جاتا تھا بنگال کی پولیس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ لال خان کا پیچھا کرتی۔ خاص طور پر جبکہ لال خان کی رائفل ہر وقت آگ اگلنے کو تیار رہتی تھی اور وہ کئی خون کر چکا تھا۔ یہ ساری باتیں لال خان نے نجمی کو بتا دی تھیں۔

جیپ دریائے ہگلی کے کنارے جا رہی تھی۔ جب دوسرے کنارے کی طرف خضر پور جیٹی کی روشنیاں نظر آنے لگیں تو لال خان نے جیپ روک دی۔ نیچے اتر کر اس نے اپنے ساتھی لاکھی سے کہا "ادھر جا کر کوئی کشتی دیکھو.... ہم یہاں سے کشتی پر دریا پار کریں گے۔"

لاکھی اندھیرے میں دریا کے کنارے اس جانب چل دیا جدھر لالٹین کی روشنی ہو رہی تھی لال خان نے نجمی کو بتایا کہ ادھر مچھیروں کی چند جھونپڑیاں ہیں وہاں سے کشتی مل جائے گی۔ اگر ہم دریا

کے ساتھ ساتھ آگے جا کر ہوڑہ برج پار کر کے خضر پور جیٹی کی طرف آئیں تو یہ بڑا لمبا فاصلہ ہو جائے گا..... ویسے بھی اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو پولیس ہوڑہ پل کی ناکہ بندی کر سکتی ہے۔ اور ہم گھیرے میں آ جائیں گے.... بہتر یہی ہے کہ ہم اس جگہ سے دریا پار کریں۔ خضر پور جیٹی سامنے دوسرے کنارے پر ہے اور خضر پور کی آبادی اس کے پیچھے ہی واقع ہے۔

نجمی خضر پور جیٹی کی روشنیوں کو تکنے لگی جن کا عکس دریا میں پڑ رہا تھا۔ یہاں دریا کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ اس کے خیال میں لال خان نے بالکل ٹھیک سوچا تھا انھیں اسی جگہ سے دریا پار کرنا چاہئیے تھا کیونکہ خضر پور کی آبادی وہاں سے بہت قریب تھی۔ لاکھی تھوڑی دیر میں کشتی کو کھیتا ان کے پاس آ گیا۔

کشتی کو اس نے رسے سے ایک بانس کے ساتھ باندھا اور بولا "خان! تم بیٹھو..... میں جیپ جھاڑیوں کے پیچھے کھڑی کر کے آتا ہوں۔"

نجمی اور لال خان کشتی میں بیٹھ گئے۔ لاکھی جیپ کو جھاڑیوں کے پیچھے لے گیا۔ پھر اندھیرے میں نمودار ہوا اور کشتی میں بیٹھتے ہی اس نے چپو سنبھال لیے۔ کشتی چھوٹی تھی اور دریا کی لہروں پر ڈول رہی تھی۔ دریا پر سکون حالت میں تھا۔ بہت جلد انھوں نے دریا پار کر لیا۔ وہ خضر پور جیٹی سے کافی پیچھے ہٹ کر کنارے پر اتر گئے۔ کشتی کو لال خان اور لاکھی نے کھینچ کر کنارے کی گھاس میں چھپا دیا۔ اب وہ نجمی کو ساتھ لے کر دریا کے کنارے کے درختوں میں سے ہوتے ہوئے خضر پور روڈ پر نکل آئے۔ یہ سڑک کافی کشادہ ہے۔ ایک گاڑی روشنی ڈالتی بندرگاہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ لوگ فٹ پاتھ کے درختوں کے پیچھے ہو گئے۔ گاڑی گزر گئی تو انھوں نے دوڑ کر سڑک پار کر لی سڑک کی دوسری جانب ڈھلان میں اتر کر وہ خضر پور آبادی کی طرف چلنے لگے۔ اس آبادی کے مکانوں کی جھلملاتی روشنیاں دور ہی سے نظر آ رہی تھیں۔ خضر پور نام کا ایک گاؤں بھی وہاں آباد تھا۔ جہاں بندرگاہ کے قلی مزدور اور مچھیرے رہتے تھے۔ نئی آبادی اس کے عقب میں کوٹھیوں اور بنگلوں پر مشتمل تھی۔ ان میں زیادہ تر بندرگاہ کے ملازم، سرکاری افسر اور سیٹھ لوگوں کی رہائش گاہیں تھیں۔ کوٹھیوں کے بیچ میں پکی سڑکیں بنی تھیں جن کی دونوں جانب بجلی کے کھمبوں پر ٹیوب لائٹیں روشن تھیں۔ نجمی لال خان اور لاکھی کو لے کر مرہٹہ انسپکٹر پولیس کی کوٹھی کے عقبی حصے کی

طرف آ گئے۔ یہ کوٹھی آبادی کے آخری کنارے پر بنی ہوئی تھی اور کوٹھی کے پیچھے ایک ویران ریتیلا میدان تھا جہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لال خان، لاکھی اور نجمی کوٹھیوں کی عقبی دیوار کے ساتھ لگ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ لاکھی ان کے پیچھے تھا اور چند قدم چلنے کے بعد پیچھے گھوم کر دیکھ لیتا تھا۔ انسپکٹر منجریکر کی کوٹھی کی دیوار کے نیچے پہنچ کر نجمی رک گئی۔ دیوار کی دوسری طرف جو جنگلی بیل لگی تھی اس کی شاخیں باہر کی طرف ہی لٹک رہی تھیں۔ لاکھی اور لال خان نے اردگرد دیکھا۔ سارا علاقہ سنسان تھا۔ نجمی نے آہستہ سے کہا "یہی کوٹھی منجریکر کی ہے"۔

لال خان نے لاکھی کو اشارہ کیا۔ وہ دیوار کے ساتھ بیٹھ گیا۔ لال خان اس کے کاندھے پر پاؤں رکھ کر دیوار کے اوپر چڑھ گیا۔ دوسری طرف دیکھا۔ پھر نیچے اتر آیا۔ لاکھی سے کہا کہ وہ اسی جگہ رہے۔ پہلے اس نے نجمی کو دیوار پر چڑھایا اس کے بعد خود بھی اوپر آ گیا۔ کوٹھی کا عقبی لان زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ سامنے کوٹھی کے برآمدے میں ایک بلب روشن تھا۔ لان میں کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ نجمی اور لال خان لان میں کود گئے۔ دیوار کے ساتھ جھک کر چلتے ہوئے وہ کوٹھی کے سامنے والے برآمدے کے قریب آ کر لکڑی کے بڑے بڑے گملوں کے پیچھے بیٹھ گئے۔ اس برآمدے میں بھی بلب جل رہا تھا۔ وہاں کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ نجمی نے دیکھا کہ کھلے گیراج میں منجریکر کی کار موجود نہیں تھی۔ اس نے لال خان کو بتا دیا تھا کہ انسپکٹر منجریکر اس کوٹھی میں اکیلا رہتا ہے۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ نجمی اور لال خان نے رومال سر پر سے اتارا اور اسے دوبارہ اس طرح باندھ لیا کہ چہرے پر ان کی صرف آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ لال خان نے نجمی کو اشارہ کیا اور گملے کے پیچھے سے نکل کر کوٹھی کے برآمدے میں آ گئے۔ ڈرائنگ روم میں اندھیرا تھا۔ اندر سے کوئی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ وہاں سے ہٹ گئے اور کونے والے کمرے کی طرف بڑھے۔ اس کمرے کے باہر بھی تالا نہیں لگا تھا۔ لال خان نے آہستہ سے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اچانک کسی مرد کی دھیمی آواز سنائی دی۔ لال خان نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر نجمی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ دونوں نے اپنے کان دروازے سے لگا دیئے۔ اندر سے کسی عورت کے سسکیاں بھرنے اور رونے کی آواز آئی۔ مرد نے اسے بنگلہ میں گالی دے کر چپ رہنے کو کہا۔ عورت نے بنگلہ میں کہا "بھگوان کے لیے مجھے برباد نہ کرو۔

میری پرسوں شادی ہونے والی ہے۔"

مرد نے غلیظ گالی دے کر کہا "اسی لیے تو میں تمہیں اٹھا کر لایا ہوں۔"

لال خان کا خون کھول اٹھا۔ عورت کی بے بسی سے فائدہ اٹھانے والوں کو خان نے کبھی معاف نہیں کیا تھا۔ اس نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی اور جلدی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ دوسری طرف نجمی بھی اندھیرے میں ہو گئی۔ اندر ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔

پھر اسی مرد نے بنگلہ میں کرخت لہجے میں پوچھا "کون ہے؟"

لال خان نے نجمی کو اشارہ کیا۔

نجمی نے بڑی رحم طلب آواز بنا کر بنگلہ میں کہا "مجھے اندر آنے دو، میں بھوکی ہوں۔"

ایک پل کے لیے پھر وہی خاموشی طاری ہو گئی۔ اندر سے چٹخنی کھلنے کی آواز آئی۔ پھر دروازے کا ایک پٹ کھلا۔ اس کے ساتھ ہی لال خان اور نجمی اندر گھس گئے اور رائفلیں تان لیں۔ کمرے میں میز پر موم بتی جل رہی تھی اور ایک عورت پلنگ پر اس طرح پڑی تھی کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں رسیوں سے پلنگ کے ساتھ باندھ دیئے گئے تھے۔ نجمی نے مرد کو پہچان لیا۔ یہ مرہٹہ انسپکٹر منجریکر کا ایک دوست تھا جو درگاپور سے ہفتے میں ایک بار وہاں آیا کرتا تھا۔ نجمی اس اوباش آدمی کے بھی ستم کا نشانہ بن چکی تھی۔ اپنے سامنے دو رائفلوں کو دیکھ کر اس اوباش کی گھگھی بندھ گئی۔

نجمی نے رائفل کی نالی اس کے سینے سے لگا کر اسے فرش پر بٹھا دیا اور پوچھا "منجریکر کہاں ہے؟"

اس آدمی نے ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا "وہ آج ہی تفتیش کے سلسلے میں آسنسول گیا ہے۔ بھگوان کی قسم ہے میں جھوٹ نہیں بول رہا۔"

نجمی نے لال خان سے کہا "خان جی! تم اس بے زبان عورت کو کھول دو۔ مجھے اس آدمی سے بھی انتقام لینا ہے۔"

لال خان بندھی ہوئی عورت کی طرف بڑھا۔ نجمی نے رومال چہرے پر سے نیچے کھسکا دیا اور دانت پیستے ہوئے نفرت سے کہا "میں تمہارا نام نہیں جانتی مگر تم نے مجھے پہچان لیا ہوگا۔

میں وہی چندا ہوں جس کی عزت کو تم نے اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ اب تمھیں وہ رات یاد آگئی ہوگی جب میں نے بھی اس معصوم عورت کی طرح تمھیں اپنی عزت اور بھگوان کا واسطہ دیا تھا۔"

نجمی نے رائفل کی نالی کو ذرا سا اوپر اٹھا لیا۔ اوباش مرد گڑگڑا کر رحم کی بھیک مانگنے لگا۔ دوسری عورت پلنگ پر ایک طرف ہو کر سہمی نظروں سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ لال خان نے کہا "اسے ختم کرو نہیں تو میں گولی چلاتا ہوں۔"

نجمی نے رائفل کا بٹ اپنے سینے سے لگا کر کہا "یہ میرا قاتل ہے۔ میری ہی گولی پر اس کا نام لکھا ہے خان" اور نجمی نے لبلبی دبا دی۔ دھماکے کے ساتھ رائفل کی نالی میں سے گولی آگ اگلتی نکلتی اور اوباش آدمی کی کھوپڑی کو اڑاتی ہوئی سامنے والی دیوار میں گھس گئی۔

لال خان نے پلنگ پر سہمی بیٹھی ہوئی عورت سے کہا "بھاگ جا یہاں سے۔"

عورت کے خوف کے مارے دانت بج رہے تھے۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑی اور باہر نکل گئی۔

لال خان بولا "اس حرامی کو تلاش کرو وہ ضرور یہیں کہیں ہوگا۔"

نجمی اور لال خان عقبی دروازے سے دوسرے کمرے میں آگئے۔ یہ منجریکر کا بیڈروم تھا۔ کارنس پر اس کی تصویر فریم میں لگی رکھی تھی۔ نجمی نے تصویر کو نشانہ بنا کر ایک اور فائر کر دیا۔

لال خان نے پلٹ کر دیکھا اور غصے میں بولا "اصلی آدمی پر گولی چلاتا۔" انھوں نے کوٹھی کے سارے کمرے چھان مارے۔ باتھ روم بھی دیکھ لیے مگر منجریکر وہاں نہیں تھا۔ رائفل کے دھماکوں سے ساتھ والی کوٹھیوں میں جو لوگ جاگ رہے تھے وہ وہیں سہم گئے تھے۔

دیوار کے پیچھے بیٹھے لاکھی نے رائفل کا سیفٹی کیچ چڑھا دیا تھا اور رائفل تانے دونوں جانب گھورتے ہوئے خطرے کے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ کوٹھی کے اندر ہونے والے گولیوں کے دھماکوں نے اسے بتا دیا تھا کہ دو خون ہوئے ہیں۔ اتنے میں نجمی اور لال خان نے دیوار سے نیچے چھلانگیں لگا دیں۔

لال خان بولا "لاکھی! ہمارا اصلی بندہ نہیں ملا۔ اس کے ایک بدمعاش ساتھی کا خون کر

دیا ہے۔ اب یہاں سے نکل چلو۔"

نجمی کو یاد آگیا کہ اس خضر پور کی بستی میں ہریل بدمعاش اور اس کی بیوی رانی بھی رہتی ہے جہاں بردہ فروش موجمدار نے اسے لا کر فروخت کیا تھا اور پھر ہریل اور اس کی بیوی نے نجمی کو آگے روپا اور کالی بدمعاش کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا جنھوں نے اسے بازار حسن میں پہنچا دیا تھا۔ ہریل بدمعاش کا کوارٹر وہاں سے دور نہیں تھا۔ اس نے لال خان سے کہا کہ وہ ہریل اور اس کی بیوی رانی کو اسی وقت ہلاک کرنا چاہتی ہے۔

لال خان بولا "کہاں ہے ان کا مکان؟"

نجمی نے ایک طرف اشارہ کیا۔ وہ تینوں اس مکان کی طرف اندھیرے میں تیز تیز چلنے لگے۔ ہریل بدمعاش کا اکیلا کوارٹر خضر پور کی پرانی بستی کے کنارے پر تھا۔ رائفل کی آواز پر کوئی بھی آدمی اپنی کوٹھی سے باہر نہیں نکلا تھا۔ سب نے یہی کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دے لی تھی کہ یہ گولی کی نہیں بلکہ پٹاخوں کی آواز تھی۔ افسر لوگوں میں اتنی ہمت کہاں ہوتی ہے کہ وہ برستی گولیوں میں گھر سے باہر نکلیں۔

ہریل کے کوارٹر کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ نجمی اور لال خان اس کوارٹر کی دیوار پھاند کر اندر چلے گئے۔ لاکھی یہاں بھی رائفل تانے ایک طرف بیٹھ کر پہرہ دینے لگا۔ کوارٹر کے چھوٹے سے صحن میں اندھیرا تھا۔ گلی بتی کی روشنی اندر آرہی تھی۔ صحن میں طوطے کا پنجرہ لٹکا ہوا تھا۔ طوطا ٹیں ٹیں کرنے لگا۔ نجمی کو پہلی بار مشرقی پاکستان سے اغوا کر کے اس جگہ لایا گیا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ نجمی دروازے پر ہاتھ مارنے ہی لگی تھی کہ اندر سے کسی مرد کی آواز آئی۔ اس نے بنگلہ زبان میں طوطے سے کہا کہ وہ کیوں شور مچا رہا ہے۔ طوطا کم بخت بولے جا رہا تھا۔ لال خان نے نجمی کو پیچھے کی طرف کھینچ لیا۔

نجمی سرگوشی میں بولی "تم پیچھے ہٹ جاؤ میں اندر جاؤں گی یہ اسی حرامی کی آواز تھی۔"

نجمی نے ہریل کی آواز پہچان لی تھی۔ جب طوطا چپ نہ ہوا تو ہریل نے دروازہ کھول دیا وہ باہر نکلا ہی تھا کہ نجمی نے پوری طاقت سے رائفل کا بٹ اس کی ٹھوڑی پر دے مارا۔ وہ ہائے کہہ کر پیچھے کمرے کے اندر گر پڑا۔ نجمی اور لال خان لپک کر کمرے میں آگئے۔ لالٹین کی دھیمی

روشنی میں چار پائی پر سے ہریل کی موٹی بیوی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور دو انسانوں کو اندر آتے اور اپنے خاوند کو گرتے دیکھ کر چیخ اٹھی۔

لال خان نے آگے بڑھ کر اس کی گردن پر رائفل کی نالی رکھ دی اور بنگلہ میں کہا "بدبخت اگر آواز نکالی تو یہیں ختم کر دوں گا۔"

نجمی نے رومال منہ پر سے ہٹا دیا۔ ہریل اور اس کی بیوی رانی نے اسے صاف پہچان لیا نجمی نے اپنا پاؤں نیچے گرے ہوئے ہریل کے سینے پر رکھ دیا تھا۔ ہریل نے بھی چندا کو پہچان لیا تھا۔

وہ ہاتھ باندھ کر گھگھیایا "چندا! میں تو تیرا داس ہوں یہ تم کیا کر رہی ہو۔"

نجمی نے رائفل کی نالی اس کے پھولے ہوئے پیٹ کے ساتھ لگا دی اور غصّے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "ہریل! اب تک مجھ سمیت کتنی لڑکیوں کو بازار میں بٹھا چکا ہے رے؟"

ہریل کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا موت اس کے سینے پر کھڑی تھی۔ سمجھ گیا کہ اب بچ نہیں سکتا۔ آدمی بدکردار تھا۔ موت کو سامنے دیکھ کر رونے لگا۔

لال خان غرایا "کسی کی ماں بہن کو چکلے میں بٹھاتے وقت تیرا دل نہیں پگھلا تھا۔ اب کیوں روتا ہے مردار؟"

نجمی کے پاس وقت نہیں تھا اس نے رائفل کی نالی ہریل کے پیٹ کے اوپر رکھی ہوئی تھی وہیں اس نے لبلبی دبا دی۔ دھڑاک کی آواز کے ساتھ ہریل کا پیٹ اوپر کو اچھلا۔ گولی اس کے پیٹ کو پھاڑتی ہوئی نیچے فرش کو توڑ چکی تھی۔ ہریل کی نائیکہ بیوی رانی نے چیخ ماری تو نجمی کی نالی کا رخ اس کی طرف اٹھ گیا۔ فائر کا دوسرا دھماکہ ہوا اور رانی کے سینے سے خون کا فوارا اچھلنے لگا۔ وہ وہیں بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ لال خان نجمی کو لے کر کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ گلی میں کوئی شخص اپنے گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ مگر فائرنگ کی آواز علاقے میں گشت کرتی پولیس کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ اس کا لال خان کو احساس تھا۔ تھوڑی دیر کے وقفے سے ایک ہی علاقے میں رائفل کے چار دھماکے ہوئے تھے۔ رات کے سناٹے میں فائرنگ کی آواز خضر پور جیٹی تک گئی تھی۔

لاکھی نے سرگوشی میں کہا "خان! ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیئے۔ جیٹی کی طرف سے سکیورٹی گارڈز کی جیپ یہاں نہ پہنچ جائے۔"

نجمی کے سینے میں بھڑکتے ہوئے شعلوں میں سے تین کی آگ بجھ چکی تھی ابھی کئی دوسرے شعلوں کی زبانیں لہرا لہرا کر اسے جلا رہی تھیں۔ اس نے رائفل کاندھے پر ڈالی اور خضر پور روڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولی "اس طرف چلو خان جی۔ منجریکر میرے ہاتھ سے بچ گیا ہے۔ لیکن میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" لال خان تیز تیز قدموں سے خضر پور روڈ کی طرف چلتے ہوئے بولا۔ "اس کافر کے بچے کا وقت بھی آ جائے گا۔" ابھی انھوں نے خضر پور روڈ عبور کی ہی تھی کہ بندرگاہ کی طرف سے الفنس پولیس کی گاڑی کا الارم سنائی دیا۔ پولیس کو شاید خضر پور کی اس کوٹھی سے فون کر دیا گیا تھا جہاں نجمی نے منجریکر کے اوباش دوست کا خون کیا تھا۔

لاکھی بولا "جلدی کرو خان یہ پولیس کی گاڑی کی آواز ہے۔"

لال خان نے اسے جھڑک کر کہا "مرا کیوں جا رہا ہے۔ لال خان پولیس سے نہیں ڈرتا۔"

نجمی کو لال خان کا یہ دلیرانہ جملہ بڑا اچھا لگا۔ وہ سڑک کی ڈھلان سے بھاگ کر اترے اور دریا کے کنارے والی جھاڑیوں میں آ کر دریا کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کی کشتی دریا کے کنارے جھاڑیوں میں، اپنی جگہ موجود تھی۔ لاکھی نے کشتی کو دریا میں کھینچا۔ وہ کشتی میں بیٹھے اور کشتی نے دریا کے پاٹ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ دریا کی لہروں پر پہنچ کر نجمی اور لال خان نے خضر پور جیٹی کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ ادھر سے پولیس کی گاڑی کے الارم کی دھیمی آواز ابھی تک آ رہی تھی۔

لال خان نے نجمی کے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا "شاباش چندا .... تو نے شیر مردوں ایسا کام کیا ہے آج .... میں تم سے بڑا خوش ہوں۔"

نجمی نے لال خان کو خاص طور پر ہدایت کر دی تھی کہ وہ اپنے سوا اور کسی کو یہ نہ بتائے کہ چندا ہندو نہیں مسلمان ہے اور اس کا نام نجمی ہے۔ چنانچہ لال خان اسے اکیلے میں بھی چندا کے نام سے پکارتا تھا۔ کشتی دریا کے دوسرے کنارے پر چھوڑ کر لال خان نجمی اور لاکھی جیپ میں سوار ہوئے اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اپنی کمین گاہ میں پہنچنے کے بعد لال خان نے نجمی کو اس کی کوٹھری میں بھیج دیا۔ نجمی اپنے سینے پر جو بوجھ ایک عرصے سے لیے لیے پھر رہی تھی وہ بہت ہلکا ہو

گیا تھا۔ مگر انسپکٹر منجر یکر کے مکان پر نہ ملنے کا اسے بہت افسوس ہوا تھا لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ دوسری رات پھر اس کو ہلاک کرنے کی کوشش کرے گی۔

حویلی کی دوسری کوٹھری میں لال خان اپنی چارپائی پر لیٹا تھا اور اس کا ہندو دوست لاکھی رائفلوں کو کونے میں رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "خان! تم ایک بازاری عورت کی خاطر اس قاتل لڑکی میں کیوں شامل ہوئے تھے؟ مجھے یہ بات پسند نہیں آئی۔"

لال خان ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا اور لاکھی کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور غضبناک آواز میں کہا... "لاکھی ... آئندہ چندا کو بازاری عورت کہا تو میں سب سے بڑا دشمن ہوں گا۔" پھر اسے پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔

لاکھی کے ساتھ لال خان کبھی اس طرح پیش نہیں آیا تھا۔ اتنا وہ ضرور سہم گیا کہ لال خان اس عورت کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے لیکن اس رویئے سے لاکھی کو اپنی سخت بے عزتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا کوٹھری سے نکل گیا۔

دوسرے دن لال خان نے اپنے ایک آدمی کو بھیس بدلوا کر شہر کی طرف بھیجا کہ وہ معلوم کرے شہر کے حالات کیسے ہیں اور پولیس کیا کارروائی کر رہی ہے۔ دوپہر کے بعد یہ مخبر واپس آیا اور اس نے خبر دی کہ شہر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ دو راتوں میں سونا گاچی اور خضر پور کے علاقے میں آٹھ خون ہو گئے تھے۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ شہر کی ساری پولیس حرکت میں آگئی تھی۔ جگہ جگہ قاتلوں کی تلاش میں چھاپے مارے جا رہے تھے۔ انسپکٹر منجر یکر کو فوراً آسنسول سے بلا لیا گیا تھا۔ اسے اپنی ہی کوٹھی میں دوست کے قتل کی خبر ملی تو وہ دھک سے رہ گیا۔ جس عورت کو لال خان نے انسپکٹر منجر یکر کی کوٹھی سے بھگا دیا تھا پولیس نے اسے بھی شامل تفتیش کر لیا۔ اسے ذرا ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے اس عورت کا حلیہ بیان کر دیا جس نے منجر یکر کے دوست کو ہلاک کیا تھا اور یہ بھی کہا کہ اس عورت نے اپنا نام چندا بتایا تھا۔ انسپکٹر منجر یکر کو اس سے پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ چندا اپنے کوٹھے سے غائب ہے اور اس کے طبلچی نے بھی یہی بیان دیا تھا کہ چندا نے ہی کوٹھے پر دھومل بدمعاش کو گولی ماری تھی۔ طبلچی نے یہ بھی بتایا تھا کہ جو اونچا لمبا آدمی کوٹھے پر رائفل لے کر آیا تھا اس نے ہی ڈاکو مان سنگھ کو قتل کیا تھا۔

اور چندا اسی کے ساتھ فرار ہوئی تھی۔ انسپکٹر منجر یکر کو اب اس اونچے لمبے آدمی کی تلاش تھی جو چندا کو ساتھ لیے کلکتہ شہر کے علاقے میں کسی جگہ چھپے ہوئے تھے۔ انسپکٹر منجر یکر کو اپنی جان کی بھی فکر ضرور پڑ گئی تھی۔ کیونکہ چندا نے جن تین انسانوں کو قتل کیا تھا وہ وہی لوگ تھے جو چندا کو بازار حسن میں بٹھانے کے ذمے دار تھے۔ یعنی دھومل، ہریال اور اس کی بیوی رانی ..... آئی جی اور ڈی آئی جی پولیس نے اسپیشل پولیس کے دستے شہر میں پھیلا دیئے تھے۔ خاص طور پر خضر پور جیٹی کے سارے علاقے کو گھیرے میں لے کر پولیس نے گھر گھر تلاشی لینی شروع کر دی تھی۔

جب لال خان کے آدمی نے واپس آ کر اسے بتایا کہ شہر میں پولیس گشت کر رہی ہے اور خضر پور کے علاقے میں پولیس تلاشیاں لے رہی ہے تو لال خان نے نجمی کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ "شہر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ میں آج رات یہاں سے نکل کر واپس اپنے جنگل کی کمین گاہ میں جا رہا ہوں کیا تم میرے ساتھ چلو گی؟"

نجمی نے اس رات انسپکٹر منجر یکر کو جہنم واصل کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ وہ لال خان کا منہ تکنے لگی۔

جب اس نے اپنے دل کا حال اسے بتایا تو وہ بولا۔ "اس کافر کے بچے کی تم فکر نہ کرو۔ وہ اب میرا شکار ہے میں خود اسے قتل کروں گا اور تم میرے ساتھ ہو گی۔ لیکن اس وقت شہر کو پولیس نے گھیر رکھا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ پولیس فوج سے بھی مدد مانگ لے۔ دو دنوں میں آٹھ خون ہو گئے ہیں۔ اگر فوج اس کیس میں کود پڑی تو وہ یہاں تک ضرور پہنچ جائے گی مصلحت اس میں ہے کہ ہم اس وقت یہاں سے چلے جائیں۔ ذرا حالات معمول پر آجائیں تو پھر واپس آ کر انسپکٹر منجر یکر کا بھی کام تمام کر دیں گے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

نجمی مجبور ہو گئی۔ لال خان کے آدمیوں نے جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جب رات کو اندھیرا پھیلا تو لال خان کے سارے آدمی جن کی تعداد دس گیارہ کے قریب تھی، جیپوں میں سوار ہو گئے۔ ایک جیپ میں انگیٹھی برتن اور بستر وغیرہ رکھ دیئے۔ آگے آگے لاکھی چار آدمیوں کے ساتھ چل پڑا۔ اس کے پیچھے لال خان جیپ چلا رہا تھا۔ نجمی اس کے پہلو والی سیٹ میں بیٹھی تھی۔ اس نے عام بنگالی عورتوں کی طرح گہرے رنگ کی سوتی ساڑھی پہن رکھی تھی۔

دریا پار کے ویران علاقے سے تینوں جیپیں نکل کر ایک کچے راستے پر ہو گئیں جو تاڑ کے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ صرف اگلی جیپ کی بتیاں روشن تھیں۔ لال خان ان جنگلی راستوں سے واقف تھا۔ وہ انھی راستوں سے کلکتے آتا جاتا تھا۔ اس نے نجمی کو بتایا کہ صوبہ بہار کی سرحد پر واقع اس کی خفیہ کمین گاہ تک ایک رات اور ایک دن کا سفر ہے۔ اس بیچ وہ دو بار راستے میں آرام بھی کریں گے۔

ساری رات ویران جنگلوں میں سفر جاری رہا۔ اس دوران وہ بردوان، درگاپور اور آسنسول سے نکل آئے تھے اور اب وہ دھنباد کی طرف جا رہے تھے۔ جب سورج نکلا تو لال خان نے جیپ روک دی اور وہیں درختوں اور کالی کالی چٹانوں کے درمیان پڑاؤ ڈال دیا۔ دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد ڈاکوؤں کا یہ قافلہ ایک بار پھر آگے روانہ ہو گیا۔

نجمی لال خان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ لال خان کہہ رہا تھا "دھنباد سے صوبہ بہار کی سرحد شروع ہو جاتی ہے اس کے آگے بہار کا بڑا شہر "گیا"، ہے جہاں کبھی مہاتما بدھ کو گیان حاصل ہوا تھا۔ مگر ہم "گیا"، اور دھنباد کے آدھے راستے میں ہی گوما کے ریلوے سٹیشن سے بائیں جانب دریائے گومتی کی طرف مڑ جائیں گے۔ ہم رات ہونے تک اپنی منزل پر پہنچ چکے ہوں گے۔"

دوپہر کو ایک جگہ ندی کنارے جیپیں روک کر کھانا کھایا گیا اور پھر سفر شروع ہو گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا کہ لال خان نے دور ٹیلیگراف کے کھمبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نجمی کو بتایا کہ یہ کھمبے "گیا"، اور "پٹنہ" تک جاتے ہیں۔ وہ جس ویران راستے پر جا رہے تھے وہ اونچی نیچی ٹیکریوں پر سے گزرتا تھا۔ آگے ریلوے لائن آ گئی۔ کچھ فاصلے پر غروب ہوتے سورج کی ملگجی چمک میں ریلوے کے سگنل دکھائی دے رہے تھے۔ لال خان نے بتایا کہ یہ گوماہ کے ریلوے اسٹیشن کے آؤٹر سگنل ہیں۔ یہاں سے ریلوے لائن پار کر کے وہ جنوب کی طرف مڑ گئے۔

شام کا اندھیرا چھانے لگا اب پستہ قد کے اور پھیلی ہوئی شاخوں والے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ سلسلہ ایک اونچے درختوں کے جنگل میں جا کر گم ہو گیا۔

لال خان نے مسکراتے ہوئے کہا "ہم اپنے علاقے میں آ گئے ہیں۔"

ڈیڑھ دو گھنٹے تک جیپیں اس جنگل کے ناہموار راستوں پر آہستہ آہستہ چلتی رہیں۔ پھر ایک

چھوٹی سی ندی کا پل آ گیا۔ یہ پل بانس کا بنا ہوا تھا جیپیں اس پل پر سے گزر کر ندی کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ اندھیرے نے چاروں طرف سے انھیں گھیر لیا تھا۔ صرف اگلی جیپ کی روشنی میں درختوں کے تنے نظر آ رہے تھے۔ کافی اندر جانے کے بعد جیپیں ایک ٹیلے کی اوٹ میں رک گئیں۔ یہ ٹیلہ سیاہ ڈھلانی چٹانوں کا تھا اس کے ساتھ ساتھ ایک پگڈنڈی نیچے ڈھلان کو جاتی تھی۔ اس پگڈنڈی سے گزرنے کے بعد بانس کی ایک اونچی باڑھ آ گئی۔ لال خان یہاں رک گیا۔ اس نے منہ سے کوئل کی آواز نکالی۔ باڑھ کے پیچھے جو گھنے درخت تھے ان میں سے بھی جواب میں کسی نے کوئل کی آواز نکالی۔

لال خان نے لاکھی سے کہا "لاکھی! تم جیپوں پر جھاڑیاں وغیرہ ڈال کر آ جاؤ۔"

باڑھ کی دوسری جانب چار آدمی رائفلیں تھامے اندھیرے میں سے نکل آئے۔ انھوں نے لال خان کو سلام کیا اور اسے واپس آنے پر مبارکباد دی۔ یہ لال خان کی خفیہ کمین گاہ تھی جو بانس کی اونچی باڑھ کے پیچھے آم کے گنجان درختوں کے بیچ مٹی کے ایک ٹیلے کو کھود کر سرنگ کی شکل میں بنائی گئی تھی۔ اس ٹیلے کے پیچھے سے ایک چھوٹی سی ندی گزرتی تھی۔ اس ندی کے کنارے اینٹیں جوڑ کر چولھے بنائے گئے تھے جن پر ان لوگوں کا کھانا پکتا تھا۔ کمین گاہ والی غار کے سامنے بانس کی دس بارہ چارپائیاں بچھی تھیں اور ایک لالٹین درخت میں کیل ٹھونک کر لٹکائی ہوئی تھی۔ لال خان نے نجمی سے کہا کہ وہ غار سے پیچھے ندی پر جا کر منہ ہاتھ دھولے۔ پھر کھانا کھائیں گے۔ پیچھے وہ ڈاکو پہرے پر تھے۔ انھوں نے اپنے لیے کھانا تیار کر رکھا تھا۔ لال خان کے آنے کی ان کو خبر نہیں تھی۔ جلدی سے ایک بکرا ذبح کر کے اسے آگ پر چڑھا دیا گیا۔

نجمی ٹیلے کے عقب میں بہتی ندی پر آ گئی۔ یہاں گہرا سناٹا تھا۔ ندی پار جنگل میں جھینگر بول رہے تھے۔ نجمی نے ندی کنارے بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ بالوں پر جمی ہوئی گرد صاف کی اور واپس آئی تو غار کے باہر چھوٹا سا الاؤ روشن تھا۔ ڈاکو اس الاؤ کے گرد بیٹھے تھے۔ الاؤ کے اوپر بکرا بھونا جا رہا تھا۔ لال خان نے نجمی کو اپنے پاس بٹھا لیا اور باقی ساتھیوں سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ ہماری نئی ساتھی چندا ہے۔ یہ مسلمان ہے مگر بنگال میں جیسا دستور ہے کہ ایک نام ہندوانہ ٹائپ کا رکھ دیا کرتے ہیں۔ چندا کا اصلی نام نجمی ہے اور یہ پنجاب سے بنگال آئی تھی اس نے

میری جان بچانے کے لیے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ اس لیے اب یہ ہمارے ساتھ ہی رہے گی۔

سوائے لال خان کے قریبی ساتھی لاکھی کے سب نے خوشی کا اظہار کیا۔ لاکھی کے دل میں نجمی کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی تو یہ کہ نجمی ایک مسلمان عورت تھی اور دوسری سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس مسلمان عورت نے ایک ہندو عورت رانی کا بے دردی سے خون کیا تھا۔ بیا ہے وہ عورت بد کردار ہی تھی مگر لاکھی کے خیال میں وہ معزز عورت تھی اور اسے ایک مسلمان عورت نے قتل کیا تھا۔ لاکھی نے دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ نجمی عرف چندا سے بھیانک انتقام لے گا۔ ایک اسکیم اس نے اپنے دماغ میں سوچ لی تھی۔ اسکیم یہ تھی کہ وہ لال خان کو ہلاک کر کے خود ڈاکوؤں کا سرغنہ بن جائے گا اور نجمی عرف چندا کو اپنی رکھیل بنا کر رکھے گا اور اسے اذیتیں دے دے کر اس سے ہندو عورت کے قتل کا بدلہ لے گا۔ لال خان کے بعد سارے آدمی لاکھی کا بڑا احترام کرتے تھے اور اس کے آگے نہیں بولتے تھے۔ اپنی کمین گاہ میں واپس آئے دو دن ہی ہوئے تھے کہ مکار لاکھی نے لال خان کو قتل کرنے کے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ لال خان کو اس طرح قتل کرنا چاہتا تھا کہ کسی کو اس پر شک نہ ہو اور سب یہی سمجھیں کہ رات کو دشمن کا کوئی آدمی آ کر خان کو ہلاک کر گیا ہے۔ اس رات آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ لال خان غار کے آگے چارپائی پر رائفل نیچے رکھے گہری نیند سو رہا تھا۔ غار کے اندر نجمی نے بھی لالٹین بجھا دی تھی۔ مگر اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اسے ندیم کی یاد ستا رہی تھی کہ خدا جانے جیل میں اس پر بھارتی پولیس کیسے کیسے ستم توڑ رہی ہو گی۔

اچانک اسے باہر سے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی پنجوں پر چل رہا ہو۔ نجمی نے رائفل اٹھائی اور دبے پاؤں اندھیرے میں غار کے منہ پر ایک طرف جھک کر باہر دیکھنے لگی۔ اندھیرے میں اسے ایک سایہ لال خان کی چارپائی کی طرف بڑھتا نظر آیا۔

٭ ٭ ٭

نجمی نے آنکھیں سکیڑ کر اندھیرے میں غور سے دیکھا۔ انسانی سایہ لال خان کی چارپائی کی طرف دبے پاؤں بڑھ رہا تھا۔ نجمی نے پہلے تو یہ خیال کیا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ لال خان کا کوئی ساتھی ہو اور وہاں زمین پر سونے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر رہا ہو۔ لیکن جب انسانی سائے نے اپنا ایک ہاتھ بلند کیا تو نجمی کو اس کے ہاتھ میں خنجر دکھائی دیا۔ نجمی نے تیزی سے رائفل اٹھائی اور انسانی سائے پر فائر کر دیا۔ لیکن نجمی نے دیر کر دی تھی۔ انسانی سایہ لال خان کا ہندو ساتھی لاکھی تھا جس کا خنجر لال خان کے سینے میں اتر چکا تھا۔ لیکن نجمی کی گولی نے لاکھی کا بھی کام تمام کر دیا تھا۔ سارے ڈاکو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور اپنی اپنی رائفلوں کی طرف لپکے۔ نجمی دوڑ کر لال خان کی چارپائی کے پاس آ گئی۔ لال خان کے سینے میں لاکھی کا خنجر آدھے سے زیادہ اتر چکا تھا اور لال خان خون میں لت پت آخری سانس لے رہا تھا۔ پاس ہی زمین پر لاکھی کی لاش پڑی تھی۔ نجمی کی گولی نے اس کی گردن آدھی سے زیادہ اڑا دی تھی۔ ڈاکو لالٹین لے کر آ گئے۔ ہر کوئی اپنے سردار کو خون میں لت پت دیکھ کر دہشت زدہ اور دردناک تھا۔ نجمی نے جب سارا واقعہ بیان کیا تو ڈاکوؤں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ لال خان کے سینے سے نجمی نے خنجر نکالنے کی کوشش کی تو خان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لال خان کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا۔ خنجر دل کو ایک طرف سے چیر گیا تھا۔

لال خان نے انتہائی کمزور آواز میں کہا "لاکھی نے غداری کی۔ چندا نے اس سے میرا بدلہ لے لیا ہے۔ اب سنو۔ میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے۔ میرے بعد چندا کو اپنا سردار سمجھنا۔ اس کے ہر حکم پر عمل کرنا۔" نجمی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے ہاتھ پر لال خان کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور پھر وہ ایک طرف کو لڑھک گیا۔ لال خان خدا کو پیارا ہو چکا تھا۔ نجمی نے روتے

ہوئے لال خان کا مردہ ہاتھ اپنے سینے سے لگا لیا۔

لال خان کے مسلمان ساتھی بادل نے نجمی کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "ہمیں صبر سے کام لینا ہوگا چندا بی بی۔ آج سے تم ہماری سردار ہو۔ ہم لال خان کے حکم کی ہمیشہ پابندی کریں گے"۔ لاکھی کی لاش کو اٹھا کر وہاں سے دور ایک گڑھے میں گدھوں اور جنگلی جانوروں کی خوراک بننے کے لیے پھینک دیا گیا اور لال خان کو ندی کے پانی سے غسل دے کر کھدر کی چادر کا کفن پہنا کر لاش چارپائی پہ رکھ دی گئی۔ بادل اور دوسرے مسلمان ساتھی چارپائی کے گرد بیٹھ کر ساری رات کلمہ شریف کا ورد کرتے رہے۔ دوسرے دن خان کی لاش کو پورے احترام کے ساتھ وہیں جنگل میں درختوں کے نیچے قبر کھود کر دفنا دیا گیا۔

یہ سب کچھ اچانک ہو گیا تھا۔ نجمی کو سخت ملال تھا کہ وہ بروقت فائر کر کے لال خانؔ کی جان نہ بچا سکی تھی۔ لیکن شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔ موت کا ایک وقت معین ہوتا ہے۔ شاید وہ چاہتی بھی تو لال خان کو لاکھی کے خنجر کی ضرب سے نہیں بچا سکتی تھی۔ بہر حال اسے اتنی تسلّی ضرور تھی کہ اس نے خان کے قاتل کو بھی زندہ نہیں چھوڑا تھا۔ حالات نے نجمی کو ان ڈاکوؤں کا سردار بنا دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ کلکتے واپس اپنے کوٹھے پر نہیں جا سکتی تھی۔ وہ قتل کے جرم میں پولیس کو مطلوب تھی وہ زیادہ لمبے عرصے تک روپوش نہیں رہ سکتی تھی۔ اسے پولیس کہیں نہ کہیں سے ضرور گرفتار کر لیتی اور پھر پھانسی کا پھندا اس کی گردن میں ڈال دیا جاتا۔ ڈاکوؤں کی سردار بن جانے کے کئی فائدے تھے۔ پہلا فائدہ تو یہ تھا کہ وہ محافظوں کے درمیان آ گئی تھی۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ وہ اس پوزیشن میں تھی کہ انسپکٹر منجریکر اور اپنے دوسرے دشمنوں سے انتقام لے سکے۔ اس کی عزت کے قاتلوں کی فہرست میں روپا بدمعاش اس کے ساتھی ہری، انسپکٹر منجریکر اور مونچھوں والے موجمدار کے نام باقی رہ گئے تھے سب سے پہلے وہ انسپکٹر منجریکر سے اپنے اوپر کیے گئے ظلم اور بربریّت کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔ نجمی نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ لال خان کے دوسرے قریبی مسلمان ساتھی بادل کو اپنے اعتماد میں لے لیا۔ نجمی بہر حال عورت تھی اور گروہ میں سے کسی آدمی کو اپنے اعتماد میں لینا ضروری تھا۔ بادل پختہ عمر کا ایک دلیر مسلمان تھا اور ضلع بارہ بنکی میں چار ہندو جاگیرداروں کو قتل کر کے بھاگا ہوا تھا۔ لال خان کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی حیا اور غیرت تھی اور نجمی نے بہت جلد اندازہ لگا لیا تھا کہ بادل

ایک بلند کردار انسان ہے۔ یہ سارے کے سارے ڈاکو لال خان کے فدائی تھے اور اس کی وصیّت کے مطابق اب نجمی کے بھی فدائی بن گئے تھے۔ ان سبھوں نے باری باری نجمی کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر حلف اٹھایا کہ وہ چندا بی بی پر اپنی جان بھی قربان کر دیں گے۔ سب نجمی کو چندا بی بی کہہ کر پکارنے لگے۔ نجمی کو یہ نام پسند آیا۔ ایک ہفتہ وہیں گزر گیا۔ نجمی نے اپنا حلیہ مردوں جیسا بنا دیا تھا۔ اس نے اپنے بال کاٹ دیئے تھے اور سر پہ لال خان کی طرح سرخ رنگ کا صافہ باندھنے لگی تھی۔ ساڑھی اس نے ترک کر دی تھی اور ہر وقت پتلون اور چمڑے کی جیکٹ پہنے رہتی تھی۔ بادل کا بھی یہی لباس تھا۔ نجمی صبح اور شام کے وقت بادل کے ساتھ جنگل میں نشانہ بازی بھی کرتی تھی۔ ایک ہفتہ گزر گیا تو نجمی نے اپنے ایک آدمی کو کلکتہ بھیجا کہ وہ جا کر پتہ کرے کہ حالات کیسے ہیں اور پولیس لال خان اور چندا بائی کی تلاش کے سلسلے میں کیا لائحہ عمل اختیار کیے ہوئے ہے۔ یہ ڈاکو فقیر کا بھیس بدل کر گوماہ کے ریلوے اسٹیشن سے کلکتے کی جانب روانہ ہو گیا۔

چار دنوں کے بعد یہ مخبر واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ ساری بنگالی پولیس کلکتے کے کونے کونے میں بکھر گئی ہے اور لال خان اور چندا بائی کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ لال خان کی موت کی خبر کو پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ مخبر نے یہ بھی خبر دی کہ مشرقی پاکستان میں بڑی گڑبڑ ہے۔ بھارت اپنے کمانڈو زمکتی باہنی والوں کے ساتھ مشرقی پاکستان میں تخریب کاریوں کے لیے دھڑا دھڑ بھیج رہا ہے اور انڈین فوج سے بھرے ہوئے ٹرک مشرقی پاکستان کی سرحد کی طرف جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ نجمی نے بادل کو بھی اپنی زندگی کی ساری کہانی شروع سے آخر تک بتا دی تھی اور بادل کو معلوم تھا کہ نجمی نے کن کن بدمعاشوں سے اپنی زندگی کی بربادی کا بدلہ لینا ہے۔ نجمی نے بادل سے مشورہ کیا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے وہ کہنے لگا "ہم اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر انسپکٹر منجریکر کو قتل کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ چندا نے کہا "میں چاہتی ہوں کہ یہ کام میں اکیلی کلکتے جا کر کروں۔"

بادل نے فکر مندی کے ساتھ پوچھا "چندا بی بی! تم اکیلی گئیں تو پکڑے جانے کا خطرہ ہے میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔"

کافی سوچ بچار کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ انھیں بھیس بدل کر اس مشن پہ نکلنا ہوگا۔ کمین گاہ میں بھیس بدلنے کا تھوڑا بہت سامان موجود تھا۔ کیونکہ لال خان مہینے میں دو بار اپنے مخبر کو بھیس بدلوا

کہ شہروں میں حالات کا جائزہ لینے بھیجا کرتا تھا۔ ایک روز نجمی اور بادل نے بیراگن اور بیراگی کا بھیس بدلا اور خفیہ کمین گاہ سے گوماہ ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ نجمی نے اپنے ساتھیوں کو بتا دیا تھا کہ وہ انسپکٹر منجر یکہ کو قتل کرتے جا رہے ہیں اور وہ اس مشن میں کامیاب ہو کر ہی لوٹیں گے۔ نجمی نے نسواری رنگ نیل میں گھول کر اپنے چہرے، گردن، بازوؤں اور ٹانگوں پر مل رکھا تھا جس سے اس کا رنگ گہرا نسواری ہو گیا تھا۔ یہ رنگ ایسا تھا کہ پانی سے ہاتھ منہ دھونے پر بھی نہیں اتر سکتا تھا۔ گہرے رنگ کی بیراگنوں والی ساڑھی پہن لی تھی۔ سر کے بالوں کو اس نے استرے سے مونڈ ڈالا تھا اور ماتھے پر نشان بنا لیا تھا۔ گلے میں منکوں کی مالائیں ڈال لی تھیں۔ بغل میں جھولا ڈال لیا تھا۔ بادل نے بھی ایسا ہی حلیہ بنا لیا تھا۔ دونوں بنگال کے بیراگی لگ رہے تھے۔ بنگال میں اس قسم کے بیراگی اور بیراگنیں عام طور پر دیکھے جاتے ہیں۔ یہ لوگ درگا دیوی کے بھجن گا کر بھیک مانگتے ہیں۔ بادل نے اپنے ہاتھ میں اکتارا بھی پکڑ رکھا تھا۔ ان تمام باتوں کے علاوہ انھوں نے اپنے لباس کے اندر دو چھوٹے ریوالور بھی چھپا رکھے تھے جو بارہ بارہ گولیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک عام سا چاقو بادل نے اپنے جھولے میں بھی رکھ لیا تھا۔ کچھ روپے بھی بادل کی صدری کی جیب میں موجود تھے۔ اس حلیے میں نجمی بالکل پہچانی نہیں جاتی تھی۔ گوماہ کے ریلوے اسٹیشن تک وہ کچھ پیدل چل کر باقی راستہ ایک کسان کی بیل گاڑی میں بیٹھ کر گئے۔

ریلوے اسٹیشن پر وہ دوپہر کے وقت پہنچے اور پلیٹ فارم کے کونے میں اپنے جھولے رکھ کر بیٹھ گئے۔ بادل بیڑی پیتے ہوئے ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں کوئی پولیس والا نہیں تھا۔ آدھ گھنٹے بعد گاڑی آ گئی اور وہ تھرڈ کلاس کے ڈبے میں سوار ہو گئے۔ بنگال میں بیراگی بیراگنوں سے ریل کا ٹکٹ نہیں پوچھا جاتا۔ یہ لوگ جہاں چاہیں بے ٹکٹ سفر کر سکتے ہیں۔ گاڑی گوماہ سے چل کر تین گھنٹے کے سفر کے بعد دھنباد پہنچی۔ یہاں سے چلی تو شام کے وقت آسنول کے اسٹیشن پر پہنچ کر رک گئی۔ یہ بنگال کا اسٹیشن تھا۔ نجمی اور بادل محتاط ہو گئے تھے۔ وہ پلیٹ فارم پر اترنے کی بجائے ڈبے میں ہی بیٹھے رہے۔ یہ پسنجر ٹرین تھی اور گیا سے کلکتے جا رہی تھی۔ ڈبے میں بیٹھے بیٹھے نجمی اور بادل نے مٹی کے آبخوروں میں چائے منگوا کر پی۔ خدا خدا کر کے آسنول سے گاڑی چلی۔ اب آگے دوسرا بڑا اسٹیشن درگا پور تھا۔ ویسے یہ ٹرین ہر اسٹیشن پر تھوڑی دیر کے لیے

رکتی تھی۔ رات ہو گئی تھی کہ ٹرین درگا پور پہنچ گئی۔ یہاں سے چلی تو ڈیڑھ گھنٹے کے بعد بردوان آ گیا۔ بردوان سے آگے بڑا اسٹیشن کلکتہ ہی تھا۔ یہ کافی لمبا سفر تھا۔ بردوان کے پلیٹ فارم پر نجمی نے ریلوے پولیس کے دو تین آدمیوں کو گھومتے دیکھا۔ مگر یہ ان کی نارمل گشت تھی۔ رات کے دس بج رہے تھے کہ پسنجر ٹرین کلکتہ کے دوسرے بڑے اسٹیشن ہوڑہ کے پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی۔ ڈبہ مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔

بادل نے نجمی کے کان کے قریب ہو کر آہستہ سے کہا "ہم یہاں سے کالی ماتا کے مندر کی طرف جائیں گے۔" یہ بات انھوں نے پہلے ہی طے کر رکھی تھی کہ وہ کالی ماتا یعنی درگا دیوی کے اس مندر میں جا کر رات بسر کریں گے جو خضر پور آبادی کے پچھواڑے کافی آگے جا کر دریا کے کنارے بنا ہوا تھا۔ یہاں سے انسپکٹر منجر یکہ کی کوٹھی زیادہ دور نہیں پڑتی تھی۔ نجمی اور بادل کے بیراگیوں ایسے حلیے کی وجہ سے کسی نے ان کی طرف توجہ نہ دی۔ دونوں اسٹیشن سے باہر آ کر ایک طرف چلنے لگے۔ چوک میں وہ ایک طرف رک گئے۔ ایک خالی رکشا پاس ہی کھڑا تھا۔ بادل نے آگے بڑھ کر بنگالی رکشا ڈرائیور کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بنگالی زبان میں کہا "بھیا ہم درگا ماتا کے پجاری بیراگی ہیں۔ میری پتنی میرے ساتھ ہے ہم خضر پور والے درگا ماتا مندر میں دیوی کو ماتھا ٹیکنے آئے ہیں۔ ہمیں وہاں تک پہنچا دو گے۔"

رکشا ڈرائیور نے بیڑی کا کش لگا کر کہا "گوروجی میں وہاں جانے کے دس روپے لیتا ہوں۔ آپ سے پانچ روپے لوں گا۔ کیا پانچ روپے تمھارے پاس ہیں۔؟"

بادل کے پاس پانچ سو روپے موجود تھے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا "بھائی ہم غریب بیراگی ہیں پیسہ پیسہ بھیک میں لے کر جمع کیا ہے پانچ روپے بھگوان نے چاہا تو نکل آئیں گے۔ تم ہمیں درگا دیوی کے مندر پہنچا دو۔"

رکشا ڈرائیور تیار ہو گیا۔ نجمی اور بادل رکشا میں بیٹھ گئے اور رکشا خضر پور کی جانب چل پڑا۔ یہ بھی کافی لمبا راستہ تھا۔ آدھ گھنٹے میں وہ خضر پور کے پچھواڑے دریا کے کنارے والے درگا دیوی کے مندر کے قریب آ کر اتر گئے۔ رکشا والے کو پانچ روپے دیئے اور مندر کی طرف رخ کیا۔ یہ مندر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ایک بہت بڑے چبوترے پر یہ مندر بنا ہوا تھا۔ سامنے ریل

اور سنبل کے گھنے درخت تھے۔ مندر میں روشنی ہو رہی تھی۔ سامگریاں سلگ رہی تھیں۔ گھنٹیوں اور کھڑتالوں کی آواز کے ساتھ بھجن گانے کی ہلکی ہلکی آوازیں مندر سے نکل رہی تھیں۔ ایک جانب درختوں کے نیچے کچھ سادھو الاؤ جلائے رنگ بھبھوت ملے بیٹھے تھے۔ عقیدت مند ہندو بنگالی مندر سے نکلتے تو ان سادھوؤں کو بھی کچھ پیسے یا مٹھائی پیش کرتے۔ نجمی اور بادل مندر کے باہر ایک جانب ناریل کے درخت کے نیچے بیٹھ کر ماحول کا جائزہ لینے لگے۔ انھیں بھوک نہیں تھی۔ تھوڑا بہت کھانا انھوں نے بردوان اسٹیشن پر ہی کھا لیا تھا۔ بادل اور نجمی کو معلوم تھا کہ درگا دیوی کے ہر مندر کے ساتھ ایسی چھوٹی چھوٹی چھ سات اندھیری کوٹھریاں ضرور ہوتی ہیں۔ جہاں باہر سے آئے ہوئے سادھو اور بیراگی لوگ ٹھہرتے ہیں۔ بادل نے نجمی کو وہیں بیٹھنے کی ہدایت کی اور خود اٹھ کر مندر کے پچھواڑے کی طرف آ گیا۔ یہاں اسے سامنے کچھ پرانی کوٹھریاں نظر آئیں۔ کونے میں دیوار کے ساتھ بجلی کا ایک بلب روشن تھا۔ ایک بنگالی چوکیدار کوٹھری کے آگے زمین پر بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ بادل نے قریب جا کر اسے پرنام کیا اور عاجزی سے بنگلہ زبان میں کہا۔

"بھیا! ہم بیراگی ہیں۔ تریپورہ سے درگاہ میا کے درشنوں کو آئے ہیں۔ میری پتنی بھی میرے ساتھ ہے کیا یہاں دو ایک راتیں بسر کرنے کو جگہ مل جائے گی۔"

بنگالی چوکیدار پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسی طرح بیٹھا ناریل گڑگڑاتا اور بادل کو دیکھتا رہا۔ بادل نے اپنے جھولے میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا اور کہا "بھیا جی! ہم سادھو لوگ ہیں۔ لوگوں سے دکھشنا لے کر بیس پچاس روپے جمع کیے ہیں یہ تم دس روپے رکھ لو۔ بھگوان نے چاہا تو تمھاری اور بھی خدمت کر دیں گے۔"

چوکیدار دس روپے کا نوٹ لے کر بڑا خوش ہوا۔ اس نے فوراً سامنے والی کوٹھری کا دروازہ کھول دیا اور بنگلہ زبان میں بولا۔

"تم اس کوٹھری میں جتنے دن چاہے رہو۔ مگر میں تم سے ہر روز پانچ روپے وصول کروں گا۔ اگر تم نے یہ بات پجاری کو بتا دی تو یہاں سے بوریا بستر گول کر دوں گا۔"

بادل نے ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا "بھگوان تیرا بھلا کرے بھائی۔ میں پجاری کو کیوں بتانے لگا۔ بھلا تو نے ہمیں سر چھپانے کو جگہ دی۔ ہم تمھارے دھنبادی ہیں۔"

چوکیدار نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے پیچھے تالاب ہے اور غسل خانہ بھی ہے عورت یاتریوں کے لیے۔ اندر ایک چارپائی پڑی ہے۔ اپنی پتنی کو لے کر آ جاؤ۔"

بادل اسی وقت نجمی کو لے کر کوٹھری میں آ گیا۔ بنگالی چوکیدار جوانی کی سرحد سے گزر چکا تھا مگر ایک جوان بیراگن کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں عجیب سی حیوانی چمک پیدا ہوئی۔ وہ ناریل گڑگڑاتا مندر کی طرف چلا گیا۔ رات نجمی اور بادل نے اس طرح گزاری کہ نجمی چارپائی اور بادل زمین پر چادر ڈال کر سو گیا۔

انسپکٹر منجی کھنہ کی کوٹھی پر حملہ کرنے کا ان کا اگلی رات کا پروگرام تھا۔ دوسرے دن صبح صبح بادل اٹھ کر مندر میں آ گیا۔ یونہی درگا دیوی کے استھان پر پھول ارپن کیے اور پیچھے تالاب پر جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ اتنی دیر میں نجمی بھی بیدار ہو کر وہاں آ گئی۔ وہ دانت صاف کرنے لگی۔

بادل اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور بولا "تم زیادہ دیر کوٹھری میں ہی رہنا۔ میں تمھارے لیے چائے پانی وہیں لے آؤں گا۔"

نجمی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بادل کوٹھری کی طرف چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد نجمی بھی کوٹھری میں آ گئی۔ بادل کھانے کو کچھ لینے مندر کی طرف چلا گیا۔ وہ مندر کے باہر ایک طرف اکتارہ لے کر بیٹھ گیا وہ یونہی بنگلہ بھجن آہستہ آہستہ اکتارہ بجاتے ہوئے گانے لگا جو لوگ پوجا کرنے آ رہے تھے اپنے ساتھ سادھوؤں کے لیے پوری حلوہ بھی لے کر آتے تھے۔ بادل کے پاس بھی انھوں نے پوریوں اور حلوے کے دونے رکھ دیئے۔ بادل یہ دونے لے کر کوٹھری میں آ گیا۔ ان دونوں نے خوب مزے سے حلوہ پوری کھایا۔ نجمی چارپائی پر لیٹ گئی۔ بادل کوٹھری کی باہر سے کنڈی لگا کر مندر کے چبوترے سے کچھ دور ایک درخت تلے بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ حقیقت میں وہ گوشہ چشم سے ماحول کا برابر جائزہ لے رہا تھا کہ کہیں سے کوئی پولیس والا تو ادھر نہیں آ نکلا۔ پولیس کا باوردی سپاہی تو وہاں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا لیکن سی آئی ڈی والا وہاں موجود ہو سکتا تھا۔ بادل ہر نئی شکل کو بڑے غور سے دیکھتا ابھی تک اسے کسی آدمی پر بھی سی آئی ڈی والے کا شبہ نہیں پڑا تھا۔

بنگالی چوکیدار اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور بولا "گوروجی پانچ روپے شام کو لے لوں گا۔ میرے لیے پیسے جمع کر کے رکھ لینا۔"

بادل نے ہاتھ جوڑ کر کہا "بھیا جی! چنتا نہ کرو۔ تمھارا بھاڑا تمھیں شام کو مل جائے گا۔"

چوکیدار اٹھ کر چل دیا۔ بادل کو اس چوکیدار سے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ بے خیالی میں اس کی نظریں بنگالی چوکیدار کا تعاقب کر رہی تھیں اس نے دیکھا کہ چوکیدار مندر کے چبوترے کے کونے میں جا کر کھڑا ہو گیا ہے اور ایک دبلا پتلا دھوتی کرتے والا آدمی جس نے کاندھے کے ساتھ چھتری لٹکا رکھی ہے اس سے باتیں کرنے لگا ہے۔ بادل آخر ڈاکو تھا اس کا ماتھا ٹھنکا جب چوکیدار نے اس دھوتی پوش سے باتیں کرتے ہوئے بادل کی طرف گردن گھما کر دیکھا تو بادل چوکنا ہو گیا۔ دال میں کچھ کالا تھا۔ دھوتی پوش سی آئی ڈی کا آدمی ہو سکتا تھا۔ بادل بیراگی کی شکل میں وہاں نیا نیا آیا تھا اور اس پر شک کیا جا سکتا تھا۔ شہر میں ایک ساتھ آٹھ خون ہو چکے تھے۔ پولیس نے اپنے خفیہ آدمی کو خسز والی آبادی کے آس پاس خاص طور پر چھوڑ رکھے تھے۔ بادل اپنی جگہ سے بالکل نہ اٹھا۔ وہیں سادھوؤں کی طرح آلتی پالتی مارے بیٹھا نیم وا آنکھوں سے بنگالی چوکیدار کو دھوتی پوش سے باتیں کرتے دیکھتا رہا۔ پھر چوکیدار بازار کی طرف اور دھوتی پوش سامنے والے درختوں کی طرف چلا گیا۔ جب وہ بادل کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو بادل درگا دیوی کے مندر کے دروازے کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتا ہوا اپنی کوٹھری کی طرف آ گیا۔ کوٹھری میں داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور دیکھا کہ نجمی گہری نیند سو رہی تھی۔

اس نے نجمی کو جگا کر سارا ماجرا سنایا اور بولا۔

"مجھے یقین ہے کہ وہ دھوتی پوش سی آئی ڈی کا آدمی تھا۔"

نجمی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اپنے منڈے ہوئے سر پر گیروے رنگ کا رومال لپیٹا اور بولی "کچھ بھی ہو ہمیں یہاں سے کہیں نہیں جانا چاہیے۔

آج آدھی رات کے بعد ہم انسپکٹر منجریکر کی کوٹھی میں داخل ہو رہے ہیں۔ تب تک ہمارا اس کوٹھری میں رہنا بہت ضروری ہے۔"

بادل کچھ سوچ رہا تھا۔ بولا "اور اگر وہ سی آئی ڈی والا پولیس کو لے کر یہاں آ گیا تو؟"

نجمی نے گہرا سانس لیا اور چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر بادل کی طرف دیکھ کر بولی "تمھارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

بادل چارپائی کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ کوٹھری میں اندھیرا تھا۔ صرف دیوار کے اوپر والے روشندان سے دن کی ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی بادل سر جھکائے کچے فرش پر لکیریں کھینچنے لگا۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ باہر سے کسی نے بنگلہ زبان میں آواز دی "مہاراج دکھشنا لے لیجیے۔"

بادل جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ نجمی نے منکوں کی مالا اپنے ہاتھ میں لے کر پھیرنی شروع کر دی بادل نے دروازہ کھولا تو کوٹھری کے آگے وہی دھوتی پوش کاندھے سے چھتری لٹکائے ہاتھ میں مٹھائی کا دونا لیے کھڑا تھا۔ بادل کے سینے میں دل ایک بار زور سے دھڑکا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بنگلہ میں بولا۔ "مہاراج آپ کی بڑی کرپا ہے۔ دھنباد! دھنباد!"

بادل نے آگے بڑھ کر مٹھائی کا دونا لینا چاہا! تو دھوتی پوش نے ہاتھ پیچھے کر لیا اور بولا۔

"مہاراج! میں اسے اپنے ہاتھ سے آپ کی تپنی بیراگن کو بھینٹ کروں گا۔"

اور اس سے پہلے کہ بادل اسے روکتا وہ کوٹھری میں آ گیا۔ نجمی مالا کا جاپ کر رہی تھی۔ دھوتی پوش کو دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی کہ یہ وہی دھوتی پوش چھتری والا ہے جس کے بارے میں بادل نے بتایا تھا کہ مجھے پولیس کا آدمی لگتا ہے۔

دھوتی پوش نے مٹھائی کا دونا نجمی کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔۔۔ "دیوی جی! میری بیوی کے ہاں کل لڑکا ہوا ہے میں نے منت مانی تھی کہ اگر میرے گھر اس بار لڑکا ہوا تو درگا دیوی کے مندر میں جو بھی بیراگن پہلے آئے گی میں اس کے چرنوں میں مٹھائی کا دونا ارپن کروں گا اسے سویکار کریں۔"

نجمی نے مالا والا ہاتھ بلند کر کے بنگلہ میں کہا۔۔۔ "دھن ہو، دھن ہو۔"

بادل اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ دھوتی پوش مٹھائی کا دونا نجمی کو دے کر دروازے کی طرف بڑھا اور اچانک دروازے سے پلٹا اور جیب سے پستول نکال کر بادل کی طرف نالی کا رخ کر دیا۔ ساتھ ہی مکاری سے ہنسا اور بولا۔۔۔ "چپکے سے میرے ساتھ باہر نکل آؤ میں نے تم دونوں کو پہچان لیا

ہے اگر ذرا بھی گڑبڑ کی تو یہ مت بھولنا کہ پولیس کی پوری گارڈ مندر کو گھیرے میں لے چکی ہے۔"

بادل کوئی عام قسم کا جرائم پیشہ آدمی نہیں تھا۔ وہ ایک خونخوار قسم کا ڈاکو تھا اور کئی قتل کر چکا تھا۔ دھوتی پوش پولیس کا ماؤٹ یا خفیہ ایجنٹ اس سے زیادہ طاقتور بھی نہیں تھا اگر وہ اس سے دوگنا طاقتور بھی ہوتا تب بھی بادل اسے وہاں سے زندہ واپس نہ جانے دیتا۔ دوسری طرف نجمی بھی مرنے مارنے پر اُتر آئی تھی اور اس جھولے کی طرف دیکھ رہی تھی جس میں اس کا پستول تھا اور جو کوٹھری کی دیوار کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ بادل نے ہاتھ باندھ کر بڑی عاجزی سے کہا

"مہاراج! آپ کو دھوکا ہوا ہے ہم تو بیراگی ہیں۔ تری پورہ سے درگا میا کے درشن کرنے آئے ہیں۔"

دھوتی پوش نے غصّے سے دانت پیس کر کہا... "بکواس بند کرو، سیدھی طرح میرے آگے آگے کوٹھری سے نکل کر باہر چلو، چلو تم بھی فراڈ عورت میں جانتا ہوں تم کون ہو اور کلکتے میں کتنے آدمیوں کو قتل کر کے بھاگی ہو۔"

بادل گڑگڑاتے ہوئے جھک گیا... "شما کر دیں مہاراج! شما کر دیں مہاراج۔" یہ کہتے کہتے بادل نے نیچے سے دھوتی پوش کے پستول والے ہاتھ پر اپنا الٹا ہاتھ مارا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اوپر کو اُچھلا۔ بادل نے اوپر اُٹھتے ہی دھوتی پوش کی ٹھوڑی پر اچھل کر اتنے زور سے لات ماری کہ وہ پیچھے کو گرا۔ بادل نے نجمی سے کہا... "دروازہ بند کر دو۔" اور دھوتی پوش پر چھلانگ لگا کر اس کی گردن کو دونوں ہاتھوں کے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا۔ یہ ایک خونخوار سخت جان پہاڑوں میں رہنے والے قاتل ڈاکو کا شکنجہ تھا۔ دیکھتے دیکھتے دھوتی پوش کی آنکھیں باہر کو اُبل پڑیں۔ ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہو گئے۔ بادل اس کی گردن کو مزید دبائے جا رہا تھا اس نے چھ سات خوفناک جھٹکے دیئے اور اپنے ہاتھ اس وقت الگ کیے جب دھوتی پوش کی جان نکل چکی تھی۔ نجمی نے کوٹھری کے دروازے کو بند کر کے کنڈی لگا دی تھی۔ پولیس کے ماؤٹ کی لاش چارپائی کے پاس زمین پر پڑی تھی۔ نجمی نے جھک کر لاش کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی۔

اس نے بادل سے کہا... "اس لاش کو یہیں رہنے دیں گے۔ ہمیں صرف رات کے بارہ بجے تک ہی یہاں رہنا ہے اس کے بعد ہم نکل جائیں گے۔" بادل نے دھوتی پوش سی آئی ڈی کی تلاشی لی

اس کی جیب میں ایک رومال۔ سگریٹ کی ڈبیا، کچھ نقدی اور ایک شناختی کارڈ تھا۔ موم بتی روشن کر کے نجمی نے شناختی کارڈ کو دیکھا۔ یہ کلکتہ پولیس ڈپارٹمنٹ کی طرف سے جاری کردہ کارڈ تھا۔ جس پر دھوتی پوش کا نام شانتی پرداس مکرجی اور عہدہ انسپکٹر درج تھا۔ بادل نے اس کا پستول اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ جلدی سے لاش کو چارپائی کے نیچے گھسیٹ کر ڈال دیا گیا۔ اس کے اوپر چھتری بھی رکھ دی گئی۔ نجمی نے اپنا اور بادل کا جھولا اٹھا کر لاش کے اوپر ایک طرف رکھ کر اسے چھپانے کی کوشش کی مگر آدھی لاش اب بھی نظر آ رہی تھی۔ بادل بولا...." میں باہر سے گھاس پھوس جمع کر کے لاتا ہوں اس سے ہم لاش کو ڈھانپ دیں گے اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ باہر کوئی پولیس کا آدمی تو نہیں ہے۔"

نجمی نے غصّے میں کہا... "یہ حرامی جھوٹ بولتا تھا، پولیس اگر یہاں ہوتی تو اب تک ہمیں گرفتار کر لیا گیا ہوتا۔ یہ ہمیں گرفتار کر کے تھانے لے جانا چاہتا تھا تم جلدی سے سوکھے گھاس کے پتّے اٹھا کر لے آؤ۔"

بادل نے پستول وہیں چارپائی کے نیچے رکھ دیا اور جلدی سے کوٹھری سے نکل گیا۔ باہر آسمان ابر آلود ضرور تھا مگر بارش نہیں شروع ہوئی تھی۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور درگا مندر کی طرف سے گھڑیالوں اور گھنٹیوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ بادل مندر کے پیچھے درختوں کے نیچے جا کر سوکھی شاخیں اور پتے جمع کرنے لگا۔ اس کے سوکھے پتّوں اور جھاڑیوں سے اپنی جھولی بھری اور واپس کوٹھری میں آ کر اسے لاش کے اوپر ڈال کر اسے ڈھک دیا۔

بادل بولا.... "اب تمھیں ہر حالت میں اسی جگہ رہنا ہو گا، میں بھی یہاں سے نہیں جاؤں گا، باہر پولیس کہیں نہیں، اس کے باوجود میں مندر کے باہر جا کر دیکھتا ہوں۔"

بادل ایک بار پھر باہر نکل گیا۔ نجمی نے دھوتی پوش خفیہ آدمی کے پستول کو چارپائی سے اٹھا کر موم بتی کی روشنی میں غور سے دیکھا۔ یہ پرانی قسم کا پستول تھا، میگزین میں سات گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ نجمی نے پستول کو اپنی ران کے نیچے چھپا کر رکھ لیا اور جھک کر لاش کو دیکھا۔ لاش چارپائی کے نیچے بے حس و حرکت سوکھے پتّوں اور شاخوں کے اندر پڑی تھی۔ نجمی اُٹھ کر دروازے کے پاس گئی اس نے آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر دن کی روشنی میں دیکھا بادل وہاں نہیں تھا۔

مندر میں کھڑتالیں اور گھنٹیاں زور زور سے بج رہی تھیں۔ پجاری پوجا کرنے آرہے تھے۔ خدا جانے یہ کوئی خاص دن تھا کہ پوجا کرنے والوں کا تانتا بندھ رہا تھا۔ بادل مندر کے باہر پولیس کے آدمیوں کو دیکھنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ نجمی دروازے کو تھوڑا سا کھولے باہر جھانک رہی تھی کہ اچانک اس نے چوکیدار کو کوٹھری کی طرف آتے دیکھا۔ وہ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھ رہا تھا۔ بادل نے نجمی کو بتایا ہوا تھا کہ سی آئی ڈی کا آدمی چوکیدار سے باتیں کر رہا تھا اور اسی نے دھوتی پوش کو ان کی کوٹھری کی طرف بھیجا تھا۔ چوکیدار کو اپنی طرف آتا دیکھ کر نجمی نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ کنڈی لگانے کی اس نے ضرورت محسوس نہ کی۔ نجمی نے لپک کر جھولے میں سے اپنا بھرا ہوا ریوالور نکالا اور اسے چھپا کر چارپائی پر بیٹھ کر مالا جپنے لگی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔

نجمی نے بنگلہ میں پوچھا..... "کون ہے باہر؟"

چوکیدار نے لجاجت سے کہا..... "دیوی جی! میں اپنے پیسے لینے آیا ہوں پانچ روپے۔"

نجمی نے کہا..... "میرے پتی دیو باہر گئے ہیں دوپہر کے بعد آنا۔" مگر چوکیدار دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ اندر آتے ہی اس نے جیب سے چاقو نکال کر نجمی کی طرف تان دیا۔ اس کی آنکھوں میں خباثت صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ نجمی کو پہلے سے معلوم تھا کہ وہ وہاں کس لیے آیا ہے پھر بھی وہ اس کی جان لینا نہیں چاہتی تھی۔

اس نے بڑی نرمی سے کہا..... "بھائی ہم تو بیراگی لوگ ہیں ہمیں کس لیے مارتے ہو؟"

چوکیدار نے آگے بڑھ کر نجمی کا بازو پکڑ کر کھینچا اور بولا..... "تم جانتی ہو میں یہاں کیوں آیا ہوں؟"

اور ساتھ ہی اس نے نجمی کو کھینچ کر نیچے گرانے کی کوشش کی۔ اس کشمکش میں وہ خود نیچے گر پڑا اور اس کی ٹانگ چارپائی کے نیچے لاش سے ٹکرا گئی۔ موم بتی کی روشنی میں اس نے تیزی سے سوکھے پتے ایک طرف ہٹا دیئے۔ سامنے اس دھوتی پوش کی لاش اس کی طرف بے جان اُبلی ہوئی آنکھوں سے تک رہی تھی جس نے اس بیراگی اور بیراگن کے بارے میں پوچھا تھا کہ یہ کب مندر میں آئے ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ چوکیدار نے تڑپ کر چاقو نجمی پہ تان لیا اور

گھبرائی ہوئی کسی قدر تحکمانہ آواز میں بولا..... "تم نے اسے قتل کر دیا؟ میں تمھیں جانے نہیں دوں گا۔"

وہ باہر بھاگنے کے لیے پیچھے کو ہٹنے لگا لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ نجمی اُسے وہاں سے زندہ سلامت باہر جانے کی اجازت دے دیتی۔ اس نے اپنے گیروی ساڑھی کے اندر ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا اور اس کا رخ چوکیدار کی طرف کر کے بولی "یہاں چپکے سے بیٹھ جا۔"

بنگالی چوکیدار گھبرا کر بھاگنے لگا تو نجمی نے اچھل کر اسے نیچے گرا لیا۔ ریوالور اس کی گردن پر رکھا اور غرائی اب اس نے بنگالی ہی اسے کہا کہ اگر یہاں سے ہلے تو گولی چلا دوں گی بنگالی چوکیدار زمین پر پڑا خوف کے مارے کانپنے لگا تھا۔ چارپائی کے نیچے ایک اور لاش اس کے سامنے پڑی تھی۔ نجمی نے تیزی سے اٹھ کر دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ وہ ریوالور تانے چوکیدار کے سر پہ کھڑی ہوئی تھی۔ بنگالی چوکیدار پچھتا رہا تھا کہ وہ کیوں موت کے منہ میں آ گیا۔ نجمی کو بادل کے آنے کا انتظار تھا۔ وہ فائر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اگرچہ مندر میں کھڑتالوں کا اتنا شور تھا کہ اگر فائر کرتی تو ممکن تھا کہ گولی کی آواز اس شور میں دب جاتی لیکن وہ یہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ اتنے میں بادل بھی آ گیا۔ اس نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ نجمی نے بادل کے پاؤں کی چاپ پہچان لی تھی۔ پھر بھی اس نے پوچھا کہ کون ہے؟

بادل نے کہا..... "میں ہوں چینداس بی بادل۔"

نجمی نے ایک ہاتھ بڑھا کر کنڈی کھول دی۔

بادل نے اندر آ کر جو منظر دیکھا تو بولا "یہ..... یہ کہاں سے آ گیا؟"

بنگالی کے ہاتھ میں جو چاقو تھا وہ نجمی نے اٹھا لیا تھا۔

وہ ہاتھ باندھ کر بولا "دادا میں..... میں تو اپنے پانچ روپے لینے آیا تھا کہ دیوی جی نے....."

اس کا حلق سوکھ گیا اور وہ آگے نہ بول سکا۔

بادل نے کنڈی لگا دی۔ نجمی نے اُسے بتایا کہ اس نے چارپائی کے نیچے لاش کو دیکھ لیا ہے۔

بادل غرایا "تو ابھی تک یہ کافر زندہ کیوں ہے؟" اور بادل نے بنگالی چوکیدار کی گردن

کو اپنے مضبوط ہاتھوں کے شکنجے میں دبوچ کر جھٹکے دینے شروع کر دیئے ۔ ہندو بنگالی چوکیدار دبلا پتلا سا تھا ۔ اس نے کوئی مدافعت نہ کی ۔ بادل جیسے طاقتور اونچے لمبے ڈاکو کے مقابلے میں اس کی تاب بھی نہیں تھی ۔ چند سیکنڈ کے اندر وہ ٹھنڈا ہو گیا ۔

جب بادل اور نجمی کو یقین ہو گیا کہ چوکیدار مر چکا ہے تو انھوں نے اس کی لاش کو بھی چارپائی کے نیچے سی آئی ڈی والے ہندو دھوتی پوش کی لاش کے اوپر ڈال کر ان پر سوکھے پتے اور درختوں کی شاخیں اس طرح بکھیر دیں کہ دونوں لاشیں ان میں چھپ گئیں اس کے آگے انھوں نے اپنے جھولے رکھ دیئے ۔ بادل نے موم بتی بجھا دی اور دھوتی پوش کا شناختی کارڈ، رومال اور پستول بھی اس کی لاش کے اوپر دوسری طرف پھینک دیا ۔ نجمی نے اپنا ریوالور جھولے میں رکھ دیا اور بادل سے پوچھا کہ باہر پولیس تو نہیں تھی ؟ بادل نے اسے بتایا کہ سی آئی ڈی والا جھوٹ بول رہا تھا ۔ باہر پولیس کا کہیں نام و نشان تک نہیں ہے ۔ اگر وہ یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو البتہ اس وقت تک یہاں پولیس کی پوری مسلح گارڈ پہنچ چکی ہوتی ۔

نجمی چارپائی پر کچھ پریشان سی ہو کر بیٹھ گئی کہنے لگی " اگر کسی نے چوکیدار کو ادھر آتے دیکھ لیا ہو گا تو مندر کے آدمی اس کی تلاش میں ادھر آ سکتے ہیں ۔ "

بادل نے جھولے میں سے اپنا ریوالور نکال کر صدری کے اندر ڈال لیا اور بولا " اب جو ہو گا دیکھا جائے گا ۔ ہم رات ہونے سے پہلے یہاں سے نہیں نکل سکتے ۔ ہمیں نکلنا بھی نہیں چاہیئے ۔ یہ جگہ منجر یکمہ کی کوٹھی کے بہت قریب ہے ۔ اندھیرا ہونے پر ہم یہاں سے چل دیں گے ۔ کسی طرح باقی کا وقت اسی جگہ گزار لو ۔ "

نجمی نے بادل کی طرف دیکھ کر کہا " تم باہر خیال رکھو ۔ "

بادل نے گردن میں سے منکوں کی مالا اتار کر ہاتھ میں لے لی اور کوٹھری سے نکل کر ایک طرف زمین پر بیٹھ گیا ۔ نجمی نے اندر سے کنڈی لگا لی تھی ۔ بادل بیراگیوں کے بھیس میں کوٹھری کے باہر مالا کا جاپ کرتا بڑی بے چینی سے شام کا اندھیرا ہونے کا انتظار کر رہا تھا ۔ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ پولیس والے اپنے آدمی کی تلاش میں مندر میں نہ نکل آئیں ۔ مگر اس خیال سے اسے تھوڑا سا اطمینان بھی تھا کہ ایسا ہوا نہیں کرتا ۔ سی آئی ڈی والے عام طور پر شام کو جا کر تھانے میں رپورٹ دیا کرتے

ہیں ۔ بنگالی چوکیدار کی اسے فکر نہیں تھی ۔ اس کے بارے میں وہاں شاید کسی کو زیادہ تشویش نہیں ہو سکتی تھی ۔ مندر میں خوب رونق تھی ۔ پوجا کرنے والے لوگ اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ ماتھا ٹیکنے چلے آ رہے تھے ۔ دور درختوں کے نیچے الاؤ کے سامنے بیٹھے نیم عریاں سادھوؤں کی پہاندنی بن رہی تھی ۔ ایک آدمی نے سب سے الگ بیٹھے ایک بیراگی کو مالا جاپ کرتے دیکھا تو بادل کے آگے بھی بڑی عقیدت سے مٹھائی کی ٹوکری رکھ گیا ۔ بادل کو اس وقت مٹھائی بڑی غنیمت لگی ۔ کیونکہ وہ رات کا کھانا لینے بازار نہیں جا سکتا تھا ۔ جب شام کا اندھیرا چھا گیا تو بادل مٹھائی کی ٹوکری اٹھا کر کوٹھری میں آ گیا ۔ نجمی بھی اندر بے چین بیٹھی تھی ۔ دونوں کو بھوک لگ رہی تھی انھوں نے پیٹ بھر کر مٹھائی کھائی اور نجمی نے وقت پوچھا ۔ بادل نے بتایا کہ ابھی شام ہوئی ہے ۔ حالات ٹھیک جا رہے ہیں ۔ اس نے خیال ظاہر کیا کہ آدھی رات کے بعد اگر وہ کوٹھری سے نکلیں تو زیادہ بہتر ہو گا ۔ نجمی اس پر تیار نہیں تھی ۔ وہ لاشوں والی کوٹھری سے جتنی جلدی ہو سکے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن بادل کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا ۔ نجمی خاموش ہو کر بیٹھ گئی ۔ بادل ایک بار پھر حالات کا جائزہ لینے کے لیے باہر نکل گیا ۔ یوں رات گزرتی چلی گئی ۔ رات کے گیارہ بجے بادل کوٹھری کے ایک طرف بیٹھا رام رام کر رہا تھا کہ ایک مہنت اس کی طرف آیا اور بنگالی چوکیدار کے بارے میں پوچھنے لگا کہ وہ ادھر تو نہیں آیا ۔ بادل نے ہاتھ باندھ کر مہنت کو پرنام کیا اور کہا کہ "مہاراج ادھر چوکیدار بڑی دیر سے نہیں آیا" مہنت نے ترش روئی سے پوچھا " تم کب تک یہاں ٹھہرو گے ؟" "ہم بیراگیوں کو دو روز سے زیادہ یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتے ۔ "

بادل نے بڑی عاجزی سے کہا " مہاراج میری پتنی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے مگر ہم کل ضرور تری پورہ واپس چلے جائیں گے ۔ "

مہنت نے اگلے روز کوٹھری خالی کرنے کی تاکید کی اور وہاں سے چلا گیا ۔ بادل نے اطمینان کا سانس لیا ۔ وہ آدھی رات کے بعد مندر سے نکلنا چاہتے تھے ۔ خدا خدا کر کے رات کے بارہ بجے اور بادل نے نجمی کو ساتھ لیا اور کوٹھری سے نکل کر مندر کے پیچھے سے ہوتے ہوئے ایک پگڈنڈی پر آ گئے ۔ دونوں لاشیں کوٹھری میں چارپائی کے نیچے پڑی تھیں ۔ جھولے ان دونوں نے اپنے کاندھوں سے لٹکا رکھے تھے جن میں بھرے ہوئے ریوالور موجود تھے ۔ نجمی تھوڑا آگے آگے چل

رہی تھی۔ کیونکہ اسے مرہٹہ پولیس انسپکٹر منجریکر کی کوٹھی کا راستہ معلوم تھا۔ رات کی تاریکی میں چلتے ہوئے وہ انسپکٹر منجریکر کی کوٹھی کے پچھواڑے پہنچ گئے۔ خلاف توقع کوٹھی میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ صرف عقبی لان کی کوٹھی جل رہی تھی۔

بادل نے سرگوشی کی۔ ”لگتا ہے یہاں کوئی نہیں ہے۔“

نجمی دبے پاؤں چلتی کوٹھی کے سامنے والے حصّے میں آ گئی۔ یہاں بھی صرف برآمدے کی بتی روشن تھی۔ کمروں میں اندھیرا تھا۔ گیراج میں گاڑی بھی نہیں کھڑی تھی۔

نجمی نے بادل کو ایک طرف جھاڑیوں کی طرف لے جا کر آہستہ سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کافر کی اولاد منجریکر اندر سو رہا ہو۔ تم اس جگہ ٹھہرو۔ میں دوسری طرف سے اندر جا کر دیکھتی ہوں۔ مجھے اس کوٹھی کے تمام راستوں کا علم ہے۔“

بادل کو وہیں چھوڑ کر نجمی نے جھولے میں سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لیا۔ جھولے کو وہیں بادل کے پاس رکھ دیا اور خود کوٹھی کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی اس جگہ آ گئی جہاں لان میں منجریکر کے بیڈ روم کی کھڑکی کھلتی تھی۔ کھڑکی پر بھی تاریکی چھائی تھی۔ دیوار کے ساتھ اینٹوں کا چھوٹا سا ڈھیر لگا تھا۔ نجمی اس پر پاؤں رکھ کر دیوار پھاند گئی۔ لان میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتی وہ منجریکر کے بیڈ روم کی کھڑکی کے قریب آ گئی۔ اس نے کھڑکی کو اندر کو دبایا۔ کھڑکی اندر سے بند تھی۔ اس نے کھڑکی کے ساتھ کان لگا دیا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ نجمی جھک کر چلتی باتھ روم کے عقبی دروازے کے پاس آ گئی۔ دروازے کو اندر کو دبایا تو اس کے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ باتھ روم کا عقبی دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ نجمی نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ باتھ روم میں اندھیرا تھا وہ اندر چلی گئی۔ باتھ روم کا بیڈ روم کی جانب کھلنے والا دروازہ بھی کھلا تھا۔ وہ بیڈ روم میں آ گئی۔ ریوالور کا رخ پلنگ کی طرف کیے وہ دبے پاؤں آگے بڑھی مگر پلنگ بالکل خالی تھا۔ ایک طرف انسپکٹر منجریکر کا سلیپنگ گاؤن آرام کرسی پر پڑا تھا۔ نجمی وہاں سے نکل کر ساتھ والے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ اس نے کوٹھی کے سارے کمروں میں گھوم پھر کر دیکھا۔ کوٹھی خالی پڑی تھی۔ منجریکر وہاں نہیں تھا۔ نجمی کو سخت مایوسی ہوئی۔ وہ بڑی دور سے اس کافر کو ہلاک کرنے آئی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ کافر کہاں جا سکتا ہے رات کے وقت؟ نجمی کو اچانک کرشنا بائی کا خیال

آ گیا۔ آدھی رات کے وقت انسپکٹر منجریکر لکھی بائی کی پرانی کوٹھی میں کرشنا بائی کے پاس ہی ہو سکتا ہے وہ تیزی سے کمروں سے گزرتی باہر عقبی لان میں آ گئی۔ یہاں سے اس نے دیوار پھاندی اور دبے پاؤں چلتی بادل کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور اسے بتایا کہ کافر کوٹھی میں نہیں ہے مگر اسے معلوم ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہو گا؟ بادل نے پوچھا۔ چلو وہاں چلتے ہیں۔ اب آئے ہیں تو اس خبیث آدمی کو ٹھکانے لگا کر ہی جائیں گے۔ نجمی نے بادل کو وہاں سے نکالا اور حضرپور روڈ پر آ کر بتایا کہ انہیں دریائے ہگلی کے کنارے والی لکھی بائی کی پرانی کوٹھی میں جانا ہو گا۔ یہ کوٹھی وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ دریا قریب ہی بہہ رہا تھا۔ نجمی اور بادل نے سڑک پار کی اور آدھی رات کی تاریکی میں دریا کے کنارے والی ڈھلان اتر کر کائی اور تنہاری کی جھاڑیوں میں سے گزرتے لکھی بائی کی پرانی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئے۔

۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔

لکھی بائی کی پرانی کوٹھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ گیٹ کے اوپر لگا کمزور سا بلب اس تاریکی کو اجالنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ نجمی اس کوٹھی کے چپے چپے سے واقف تھی۔ اس کوٹھی میں وہ پہلی بار طوائف بنانے کے لیے لائی گئی تھی۔ اس کوٹھی کے تہہ خانے میں اس پر انسانیت سوز تشدد ہوا تھا اور اسے ناچنے اور گانے کی ٹریننگ دی گئی تھی۔ وہ اس کوٹھی کو کیسے بھلا سکتی تھی۔ اس نے بادل کو ساتھ لیا اور کوٹھی کے ٹوٹے ہوئے پھاٹک سے گزر کر برآمدے کے کونے کی طرف آ گئی۔ چوکیدار پھاٹک سے کچھ فاصلے پر گھاس پھوس کے چھپر تلے بینچ پر لمبی تانے سو رہا تھا۔ جس طرف نجمی آئی تھی ادھر کرشنا بائی کے کمرے کی پچھلی کھڑکی تھی۔ اس کا دروازہ کوٹھی کے سامنے کی جانب راہداری میں سے گزر کر آتا تھا۔ مگر نجمی اس طرف سے نہیں جانا چاہتی تھی۔ ایک بات سے نجمی کو تشویش ضرور ہوئی تھی کہ یہاں بھی اسے انسپکٹر منجریکر کی گاڑی دکھائی نہیں دی تھی ہو سکتا ہے کہ وہ کرشنا بائی کے پاس بھی نہ آیا ہو۔ لیکن نجمی کرشنا سے مل کر منجریکر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی کہ آج کل راتوں کو وہ کس کے کوٹھے پر جاتا ہے۔ کرشنا بائی کے کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ نجمی نے بند کھڑکی کے ساتھ کان لگا دیا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ نجمی نے بادل سے سرگوشی میں کہا ”ممکن ہے منجریکر اسی کمرے میں سو رہا ہو۔ تم یہاں ٹھہرو میں دروازے کی طرف سے جاتی ہوں۔“

بادل کو وہیں کھڑکی کے نیچے چھوڑ کر نجمی برآمدے اور تاریک راہداری میں سے گزرتی ہوئی کرشنا بائی کے کمرے کے سامنے آ کر رک گئی۔ دروازہ بند تھا۔ نجمی ... دروازے پر آہستہ سے دستک دینے ہی لگی تھی کہ اندر سے کرشنا بائی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ نجمی نے دروازے پر فوراً آہستہ سے ٹھک ٹھک کی۔ اندر خاموشی چھا گئی۔ نجمی نے اس خیال سے ریوالور اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا کہ اگر اندر

منجریکر ہوا تو وہ اسے یہیں ڈھیر کر دے گی۔

دوسری بار دستک دی تو کرشنا نے پوچھا ”کون ہے؟“

نجمی اپنی آواز نہیں نکالنا چاہتی تھی کہ اگر منجریکر اندر موجود ہے تو وہ اس کی آواز پہچان کر ہوشیار نہ ہو جائے۔ نجمی نے ایک بار پھر دستک دی۔

اب کرشنا نے بند دروازے کی دوسری جانب منہ قریب لا کر پوچھا ”چوکیدار تم ہو کیا؟“

نجمی نے سرگوشی میں کہا ”میں ہوں کرشنا میں۔ چندا۔“

کنڈی ایک دم سے کھلی اور دروازہ بھی ساتھ ہی کھل گیا۔ اس کے سامنے کمرے کی نیم تاریکی میں کرشنا کھڑی تھی اس کے سیاہ بال کاندھوں پر بکھرے ہوئے تھے اس سے پہلے کہ نجمی اس سے منجریکر کے بارے میں پوچھتی کرشنا نے نجمی کو بازو سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا اور دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔

”چندا تم؟ تم اس وقت کیسے؟“

نجمی نے اندھیرے میں کرشنا کے پلنگ کی طرف دیکھا۔ پلنگ پر منجریکر نہیں تھا۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ کرشنا نے جلدی سے باتھ روم کی بتی جلا کر اس کا دروازہ اس طرح سے بند کر دیا کہ بلب کی روشنی کمرے میں بھی تھوڑی تھوڑی آنے لگی تھی۔

نجمی کو بیراگنوں کے روپ میں دیکھ کر کرشنا نے پوچھا ”یہ تم نے کیا حلیہ بنا لیا ہے چندا۔“ اور پھر اسے گلے سے لگا کر کرشنا رونے لگی۔

نجمی کو بالکل رونا نہ آیا۔ وہ رونے دھونے کی حدوں سے بہت آگے آگ اور خون کی دنیا میں نکل چکی تھی جہاں عورت اپنے اوپر ظلم ہونے پر روتی نہیں تھی بلکہ رائفل اٹھا کر ظلم کرنے والے کو بھون کر رکھ دیتی تھی۔

نجمی نے کرشنا کو الگ کیا اور بولی ”میرا ایک ساتھی بادل کھڑکی کے نیچے بیٹھا ہے۔ میں اسے اندر بلاتی ہوں۔“ اور نجمی نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ ریوالور نجمی کے ہاتھ میں ہی تھا۔

کرشنا کچھ پریشان سی ہو کر پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ کھڑکی میں سے بادل بھی اندر آ گیا۔ اسے بھی بیراگیوں کے بھیس میں دیکھ کر کرشنا کو عجیب سا لگا۔

نجمی نے کھڑکی بند کر دی اور پلٹ کر کرشنا سے پوچھا "وہ حرامزادہ منجر یکہ کہاں ہے؟"

یہ ساری باتیں بنگلہ زبان میں ہو رہی تھیں۔ کرشنا نے نجمی کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ دیا اور دھیمی آواز میں بولی "او نچا مت بولو۔ وہ خبیث ساتھ والے کمرے میں نشے میں دھت پڑا ہے۔"

نجمی کی آنکھیں اس کامیابی پہ چمک اٹھیں۔ اس نے بادل کی طرف دیکھ کر کہا "بادل میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ خبیث اسی جگہ موجود ہے"

کرشنا گھبرا سی گئی۔ ریوالور اس نے نجمی کے ہاتھ میں دیکھ لیا تھا۔ اب اس کے چہرے سے اندازہ لگا چکی تھی کہ نجمی وہاں کیا کرنے آئی ہے۔ اس نے ایک دم سے نجمی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور ملتجیانہ لہجے میں بولی "چندا! بھگوان کے لیے اس خیال کو اپنے دل سے نکال دو۔ پولیس پہلے ہی تمہارے پیچھے لگی ہوئی ہے تم پر دھومل کے خون کا الزام ہے۔"

نجمی نے نفرت سے کہا "دھومل کا میں ایک بار نہیں ہزار بار خون کرنا چاہتی تھی۔ افسوس کہ وہ ایک ہی بار مر گیا۔ کرشنا! کیا دھومل نے تم پر ظلم نہیں کیا؟ کیا تم اس کی درندگی کا نشانہ نہیں بنی تھیں۔ کیا ان لوگوں نے تمہاری عزت و عفت اور تمہاری زندگی کے ٹکڑے کر کے بھوکے کتوں کے آگے نہیں ڈالے؟ پھر تم ان لوگوں سے ہمدردی کیوں کرتی ہو؟ اگر تم اپنی زندگی کی بربادی کا ان سے بدلہ نہیں لے سکتیں تو میرا راستہ کیوں روک رہی ہو۔ میں ان درندوں سے اپنی تباہی کا نہیں تمہاری بربادیوں کا بھی انتقام لے رہی ہوں۔ تم یہاں بیٹھو۔ میں اس شیطان صفت منجر یکہ سے ہزاروں بے بس عورتوں کی بے بسی اور مجبوریوں کا انتقام لے کر ابھی اسی جگہ واپس آتی ہوں۔"

کرشنا کمزور اور بزدل بنگالی عورت تھی۔ وہ نجمی کے پاؤں پر گر پڑی۔ اب وہ پچھتا رہی تھی کہ اس نے نجمی کو منجر یکہ کی موجودگی کے بارے میں کیوں بتایا۔ کوٹھی میں ایک خون ہونے والا تھا اور اس کے بعد کرشنا کے ساتھ کیا بیتنے والی تھی اسے اچھی طرح معلوم تھا لیکن نجمی کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ ان ہزاروں عورتوں کو بھی بچانا چاہتی تھی جو خبیث منجر یکہ کی بربریت کا نشانہ بننے والی تھیں۔

اس نے بادل کی طرف دیکھ کر کہا "کرشنا کو سنبھالو بادل میں ابھی آتی ہوں۔"

بادل نے کرشنا بائی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے قریب ہی فرش کی دری پر بٹھا لیا وہ نہیں چاہتا تھا کہ کرشنا اونچی آواز نکالے۔

نجمی کے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور تھا۔ وہ اس کمرے سے بخوبی واقف تھی جہاں منجر یکہ نشے میں دھت پڑا تھا۔ وہ اسے نشے میں ہلاک نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جب وہ موت بن کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تو منجر یکہ کی کانپتی ہوئی ٹانگوں کا بھی تماشا کرے اور فائر کرنے سے پہلے اسے بتائے کہ وہ کون ہے اور اسے کیوں ہلاک کر رہی ہے۔ لیکن نجمی کو موقع مل گیا تھا اور وہ اس موقع کو ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتی تھی۔ ساتھ والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔

یہی وہ کمرہ تھا جہاں کئی بار اس پر بھی منجر یکہ نے تشدد کیا تھا۔ دروازے کو اندر سے کنڈی نہیں لگی تھی۔ نجمی اندر داخل ہو گئی۔ باتھ روم کی بتی روشن تھی مگر کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ نجمی نے نیم اندھیرے میں دیکھا کہ منجر یکہ صرف دھوتی میں ملبوس پلنگ پر اس طرح اوندھا پڑا تھا کہ اس کی ایک ٹانگ پلنگ سے نیچے لٹک رہی تھی۔ میز پہ مشروب کی بوتل گلاس میں بھنی ہوئی مچھلی کے کانٹے پڑے تھے۔ نجمی نے آگے بڑھ کر پاؤں سے منجر یکہ کے چہرے کو دوسری طرف دھکیلا۔ وہ نشے میں بالکل دھت تھا اسے کوئی ہوش نہیں تھا۔ نجمی نے سوچا کہ اسے اس کتے پر گولی ضائع نہیں کرنی چاہیے۔ ریوالور نجمی نے ساڑھی میں اڑس لیا۔ وہ منجر یکہ کی گردن میں پھندا ڈال کر اسے دروازے میں لٹکانا چاہتی تھی۔ لیکن اسے ڈر تھا کہ بعد میں کرشنا اسے اتار دے گی۔ اور ممکن ہے منجر یکہ اسپتال جا کر بچ جائے۔ نجمی نے اس خیال کو دل سے نکال دیا۔

ریوالور دوبارہ نکال کر ہاتھ میں لیا اور منجر یکہ کی کھوپڑی کے عین بیچ میں رکھ کر شیرنی کی طرح دھاڑی "منجر یکہ! میں چندا ہوں۔ مرنے سے پہلے مجھے پہچان لے۔ دوزخ میں جاتے جاتے میری آواز سن لے تاکہ تیری روح جب تک جہنم میں جلتی رہے میری آواز بھی تیرے کانوں میں آتی رہے۔"

منجر یکہ نے شاید لاشعور میں چندا کی آواز سن لی تھی۔ زیادہ نشے کی وجہ سے اس کا سر تو اپنی جگہ سے نہ ہلا مگر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ڈیلے پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹوں سے بڑبڑاہٹ سی سنائی دی۔

نجمی نے جھک کر کہا "میں چندا ہوں منجر یکہ اور تجھے کتے کی موت مارنے آئی ہوں۔ تجھ سے اپنے اوپر کیے گئے ظلم کا بدلہ لینے آئی ہوں۔ کیا تو میری آواز سن رہا ہے؟ کاش تو اس گولی کی آواز بھی

سن لے جو تھوڑی دیر میں تیری کھوپڑی کو پاش پاش کرنے والی ہے۔"

منجر یکر کو کچھ ہوش نہیں تھا لگتا تھا کہ وہ چندا کی آواز سن رہا ہے۔ اسے پہچان گیا ہے۔ وہ جواب میں کچھ کہہ رہا تھا مگر الفاظ اس کے ہونٹوں سے نہیں نکل رہے تھے۔ چندا نے ریوالور کی نالی کو منجر یکر کی کھوپڑی سے ایک اپنچ اونچا کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ دوسرے کمرے میں بادل نے کرشنا کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ وہ بے تابی سے فائر کی آواز کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر گولی چلنے کا دھماکہ ہوا۔ کرشنا کے حلق سے نکلی ہوئی چیخ اس کے حلق میں ہی دب کر رہ گئی۔ بادل نے کرشنا کے ہونٹوں پر اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا۔ خطرہ تھا کہ گولی کی آواز پر وہ شور نہ مچا دے یا رونا شروع کر دے۔ باہر سے چوکیدار وہاں بھاگ کر آ سکتا تھا اور بادل خواہ مخواہ دوسرا قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس کے ساتھ ہی نجمی کمرے میں داخل ہوئی۔ ریوالور ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے بادل سے کہا: "میں نے کافر کے بچے کو مار ڈالا ہے۔"

پھر کرشنا پر جھکی اور بولی: "کرشنا! تو اس جہنم میں ہمیشہ جلتی رہے گی۔ تو یہاں سے کبھی نہیں نکل سکے گی اس لیے کہ تو پیدا ہی اس جہنم کی ایندھن بننے کے لیے ہوئی ہے۔"

اس نے بادل سے کہا کہ وہ کرشنا کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا لے۔ بادل نے ہاتھ ہٹا دیا۔ کرشنا بے حد دہشت زدہ تھی۔ اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکل رہی تھی۔

نجمی نے ریوالور پلنگ پر رکھتے ہوئے کہا: "تو فکر نہ کر۔ میں تجھ پر اس قتل کا الزام نہیں آنے دوں گی۔ لا مجھے کاپی پنسل دے۔"

کرشنا روئے جا رہی تھی۔ اس پر بے حد خوف طاری تھا۔

نجمی نے اس کی الماری میں سے کاپی پنسل نکالی اور کاغذ پر ایک مختصر سی تحریر لکھی: "انسپکٹر منجر یکر کو میں نے پستول سے ہلاک کیا ہے۔ کرشنا بائی کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ چندا بائی۔" کاغذ پھاڑ کر نجمی نے تحریر پڑھ کر کرشنا کو سنا دی اور کہا: "اب تمھیں قانون کچھ نہیں کہے گا۔ میں نے نیچے اپنے دستخط کر دیے ہیں۔"

کاغذ ملنے پر [illegible] نجمی نے کرشنا بائی کو اٹھا کر اپنے گلے سے لگا لیا۔ اس کے ماتھے کو چوما اور کہا

"اب شاید آئندہ کبھی ہماری ملاقات ہو کرشنا لیکن اگر میرے لیے کچھ کر سکو تو اتنا ضرور کرنا کہ جب میرا محبوب ندیم ادھر آئے تو اسے بتا دینا کہ میں اس کے لائق نہیں رہی وہ واپس پاکستان چلا جائے۔"

یہ کہہ کر نجمی نے پلنگ پر پڑا ہوا ریوالور اٹھا کر جھولے میں ڈالا۔ جھولا کاندھے سے لٹکایا اور بادل کو ساتھ لے کر کھڑکی کے راستے عقبی باغیچے میں کود گئی۔

کچھ دیر بعد بادل اور نجمی بیراگیوں کے بھیس میں دریائے ہگلی کے کنارے رات کی تاریکی میں کلکتے کے ہوڑہ ریلوے اسٹیشن کی طرف چلے جا رہے تھے۔ جہاں سے وہ منہ اندھیرے کوئی بھی گاڑی پکڑ کر بردوان اور پھر وہاں سے اپنی خفیہ کمین گاہ کی طرف نکل جانا چاہتے تھے۔ نجمی کو یقین تھا کہ کرشنا اس کی سہیلی ہے اور وہ اسے اتنا موقع ضرور دے گی کہ وہ کلکتے سے باہر یا کم از کم جائے واردات سے کافی دور نکل جائے۔ اس کے باوجود وہ صبح ہونے سے پہلے پہلے کلکتہ چھوڑ دینا چاہتی تھی۔ بادل اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کالی گھاٹ کے پاس پہنچے تو انھیں سڑک پر ایک خالی ٹیکسی دور سے آتی دکھائی دی۔ اس کی سرخ بتی چھت کے اوپر جل رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ ٹیکسی خالی ہے۔ بادل ہاتھ جوڑ کر سڑک کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ ٹیکسی واقعی خالی تھی ڈرائیور نے ایک سادھو منش بیراگی بیراگن کو دیکھا تو گاڑی روک لی۔

بنگلہ میں پوچھا: "گورودیو کہاں جاؤ گے؟ میں ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہا ہوں۔"

بادل نے پرنام کرنے کے بعد کہا: "بیٹا ہمیں بھی اسٹیشن جانا ہے تری پورہ والی گاڑی پکڑنی ہے۔ درگا ماتا کے درشن کو آئے تھے کالی گھاٹ پر۔"

ٹیکسی والے نے انھیں اپنی گاڑی میں بٹھا لیا اور ٹیکسی اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی۔ اسٹیشن پر پہنچے تو پتہ چلا کہ بردوان جانے والی گاڑی پلیٹ فارم پر تیار کھڑی تھی۔ نجمی اور بادل بھاگ کے پلیٹ فارم پر آئے اور تھرڈ کلاس کے ڈبے میں گھس کر بیٹھ گئے۔ اس گاڑی نے انھیں بردوان پہنچا دیا۔ یہ گاڑی آگے نہیں جاتی تھی۔ یہاں سے انھوں نے دوسری گاڑی پکڑی اور اپنی منزل کی طرف چل دیئے۔

دوسرے دن انسپکٹر منجر یکر کے قتل کی خبر علاقے کے بچے بچے کی زبان پر تھی۔ پولیس کو چندا کا خط مل گیا تھا جس میں اس نے منجر یکر کے قتل کا اعتراف کیا تھا۔ پھر بھی پولیس نے کرشنا بائی کو حراست

میں لے لیا اور اس سے چندا اور اس کے ساتھی کے بارے میں پوچھ گچھ شروع کر دی۔ انسپکٹر منجر یکر کی جگہ ایک دوسرا مدراسی پولیس انسپکٹر آ گیا تھا جس کا نام وی رامن تھا۔ یہ مدراسی پولیس انسپکٹر منجر یکر سے زیادہ سخت مزاج اور جابر قسم کا آدمی تھا۔ اس نے کرشنا بائی کا عدالت سے ریمانڈ لے کر اس پر سات دن تک بے پناہ تشدد کیا مگر اسے چندا بائی اور اس کے ساتھی کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا جتنا کرشنا بائی کو علم تھا۔ کرشنا بائی کو کلکتے کے ایک سیٹھ کی در پردہ مدد کی وجہ سے ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ چندا بائی اور اس کے ساتھی کی تلاش زور شور سے شروع ہو گئی۔ مگر پولیس کو چندا بائی عرف نجمی کے خفیہ ٹھکانے کا بالکل پتہ نہ چل سکا۔ نجمی بہار کے جنگل والی اپنی کمین گاہ میں پہنچ چکی تھی اور اب وہ روپا اور کالی بدمعاش کو قتل کرنے کا منصوبہ تیار کر رہی تھی۔ یہ وہ دو بدمعاش تھے جنھوں نے نجمی پر بے پناہ ظلم ڈھائے تھے ابھی مونچھوں والا موجمدار بھی باقی تھا جو نجمی کو مشرقی پاکستان سے خرید کر کلکتے لایا تھا۔

اس وقت کہانی ہماری اس جگہ پر پہنچ گئی ہے کہ ایک طرف نجمی پوری طرح ڈاکوؤں کے گروہ کی سرغنہ بنی ہوئی ہے اور اپنے تین دشمنوں، روپا، کالی اور موجمدار بردہ فروشوں کو قتل کرنے ان سے اپنے اوپر کی گئی زیادتیوں کا بدلہ لینے کے منصوبے تیار کر رہی ہے اور دوسری طرف ندیم کالے پانی کی جیل میں "پاکستانی جاسوس" کے بے بنیاد الزام کے تحت قید میں پڑا ہے۔ تیسری جانب ہماری... پرانی ساتھی شبانہ امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن کی ایک ہائی رائز بلڈنگ کے ڈبل بیڈ والے فلیٹ میں اپنے خاوند ظفر کے ظلم سہہ رہی ہے مگر زبان سے اف تک نہیں کرتی۔ اس کا چھوٹا بھائی عامر... کیلی فورنیا میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا ہے جس کا سارا خرچ اس کا ظالم اور احساس کمتری کا شکار خاوند ظفر اٹھا رہا ہے۔ لاہور والی کوٹھی کیناں لاج میں شبانہ کا بڑا بھائی عقیل اپنی بیوی کے ساتھ رہ رہا ہے۔ یہ کوٹھی بھی ظفر نے اس کے مرحوم باپ سے اپنے نام لکھوالی تھی کیونکہ ظفر نے شبانہ کے باپ کا قرضہ چکا کر انھیں بدنامی اور ذلت کی موت سے بچایا تھا۔ ظفر نے یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا تھا۔ وہ تو دولتیہ تھا۔ معمولی پڑھا لکھا تھا مگر امریکہ جا کر کاروبار میں اس نے لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے کمائے تھے۔ شبانہ کے ساتھ وہ بچپن ہی سے کھیلا تھا۔ شبانہ مغرور لڑکی تھی۔ اس نے ظفر کو کبھی منہ نہیں لگایا تھا اور ہمیشہ اس کی بے عزتی کی تھی۔

جب حالات نے بدتر صورت اختیار کی تو شبانہ کے باپ کو مجبوراً اس کی شادی ظفر سے کرنی پڑی۔ ظفر اب شبانہ سے انتقام لے رہا تھا۔ اسے یہ بھی ملال تھا کہ شبانہ اس سے زیادہ پڑھی لکھی کیوں ہے؟ ظفر نے شبانہ سے شادی بھی اسی لیے کی تھی کہ وہ اسے انتقام کا نشانہ بنائے وہ بات بات پر اس کی بے عزتی کرتا تھا۔ آدھی آدھی رات کو اسے اٹھا کر کہتا "کہ میرے سر میں درد ہے، میرے لیے کافی بناؤ۔"

شبانہ اگر اپنی امریکی سہیلیوں میں بیٹھی ہوتی تو ظفر جیب سے گندا رومال نکال کر اس کی طرف پھینک کر کہتا۔ "میرا رومال دھلواؤ۔ تم کیسی پڑھی لکھی لڑکی ہو کہ اپنے خاوند کا رومال بھی نہیں دھو کر رکھ سکتیں؟" شبانہ کا چھوٹا بھائی عامر کیلی فورنیا سے کبھی کبھی اپنی بہن سے ملنے واشنگٹن آ جاتا تھا۔ لیکن ظفر اس کے سامنے بھی شبانہ کی بے عزتی کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ عامر کو بے حد صدمہ ہوتا۔ وہ اپنی بہن کو چھپ چھپ کر روتے دیکھتا۔ مگر وہ اس کی کوئی مدد نہ کر سکتا تھا۔ وہ خود اپنے بہنوئی ظفر کے ٹکڑوں پر پڑا تھا اور وہی اس کی تعلیم کے سارے اخراجات اٹھا رہا تھا۔ شبانہ نے لاہور میں اپنے بڑے بھائی عقیل کو اپنی حالت زار کبھی نہیں بتائی تھی۔ ہر خط میں یہی لکھا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ظفر صاحب میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ لیکن اندر ہی اندر اس کا سینہ جل کر کوئلہ ہو گیا تھا۔ اسے رانیہا کا کئی بار خیال آتا۔ یہ خوابوں کا شہزادہ اسے پھر نہیں ملا تھا۔ اس نے اپنی آخری ملاقات میں کہا تھا کہ وہ اسے ملنے امریکہ ضرور آئے گا۔ لیکن شبانہ اس کی راہ دیکھ دیکھ کر نا امید ہو گئی۔ شبانہ کو واشنگٹن آئے ایک سال ہو گیا۔ ایک روز اس نے ڈرتے ڈرتے ظفر سے کہا کہ وہ لاہور اپنے بھائی سے ملنے جانا چاہتی ہے۔ اسے لاہور بہت یاد آ رہا ہے۔ ظفر نے اس پر بھی شبانہ اور اس کے بھائی کو گالیاں دیں اور باہر نکل گیا۔ لیکن ایک ہفتے بعد اس نے شبانہ کو اکیلی لاہور جانے کی اجازت دے دی۔ عامر اپنی تعلیم کی وجہ سے اس کے ساتھ نہیں جا سکتا تھا۔ پھر بھی عامر نے کیلی فورنیا سے لکھا کہ وہ چھٹی لے کر اپنی بہن کے ساتھ لاہور جائے گا۔ اس پر ظفر کا پارہ چڑھ گیا۔ "کیا تم اکیلی نہیں جا سکتیں۔ تم نے ایم اے کس لیے کیا تھا؟ ایم اے کیا ہے تو اب اکیلی بھی سفر کرو۔ تمھیں کوئی اٹھا کر نہیں لے جائے گا۔"

چنانچہ ایک روز شبانہ اکیلی پی آئی اے کے طیارے میں سوار ہو کر لاہور کی طرف پرواز کر گئی۔

شبانہ کا بھائی اسے لینے کراچی پہنچ گیا تھا۔ شبانہ نے اپنے بھائی کو دیکھا تو اس کے صبر کا بندھ ٹوٹ گیا اور وہ بھائی کے ساتھ لگ کر بے اختیار رونے لگی۔

بڑا بھائی عقیل اپنی بہن کے دکھوں سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انھوں نے اپنے کاروبار کی ساکھ اور اپنی خاندانی عزت کے دیوتا پر اپنی بہن کی زندگی اور اس کے مستقبل کو قربان کر کے ایک ایسے آدمی کے پلّے باندھ دیا ہے جو اسے سکھ پہنچانے کی بجائے اسے مسلسل اذیتیں دے رہا ہے مگر وہ بھی بے بس تھا۔ وہ سوائے خاموش تماشائی بنے رہنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

شبانہ کو اپنے بڑے بھائی سے بھی بڑی محبت تھی۔ ماں باپ کی وفات کے بعد اب عقیل بھائی ہی اس کے باپ کی جگہ تھا وہ اسے اپنا دکھ بتا کر اس کی گھریلو زندگی پر اپنے غم کی چھاؤں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے آج تک اپنے بھائی کو اپنے عذاب کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا تھا وہ ہمیشہ یہی کہتی کہ وہ اپنے گھر میں بڑی خوش ہے۔ شبانہ نے اپنی زندگی کو اس طرح قبول کر لیا تھا۔

"کینال لاج" میں اپنے کمرے میں آکر اس کی ویران آنکھیں شیلف میں لگی اپنی کتابوں کو تکنے لگیں جن پر گرد جم گئی تھی کسی نے آج تک کمرے کی اچھی طرح صفائی نہیں کی تھی۔ جس زرد چینی کے گلدان میں وہ گلاب کے پھول سجایا کرتی تھی۔ وہ گرد آلود میز پر ویران ویران اور خالی پڑا تھا۔ دوسرے دن وہ اپنے کالج گئی اس کی اکثر سہیلیاں تعلیم ختم کر کے اپنے اپنے گھروں کو جا چکی تھیں۔ شبانہ کو نجمی کی بہت یاد آئی۔ نجمی کو یاد کر کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خدا جانے وہ اس وقت کہاں ہو گی۔

جب سے نجمی لاہور سے ندیم کے ساتھ شادی کرنے کے خیال سے بھاگی تھی اس کے بعد سے لے کر اب تک شبانہ کو اس کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ شبانہ کار لے کر پبلک لائبریری میں آ گئی۔ لائبریری کی خاموش فضا ویسے ہی پرسکون تھی۔ آخری الماری کے پاس لکڑی کی جافری میں وہ میز اسی طرح لگی تھی جس پر راحیل کو اس نے پہلی مرتبہ دیکھا اور جو وہاں گلاب کا سرخ پھول چھوڑ جایا کرتا تھا۔ اسے راحیل کا پختہ یونانی چہرہ، بالوں کی سفید لٹ اور پائپ میں سے نکلتا نیلا خوشبودار دھواں یاد آنے لگا۔ وہ خاموشی سے لائبریری سے باہر نکل آئی۔ دوپہر کے بعد وہ نہر کے کنارے

گاڑی لیے کیمپس کے پل کے آگے اس پرانی کچی کوٹھی میں بھی گئی جہاں راحیل اسے ساتھ لے گیا تھا۔ اور جس کے عقبی باغیچے میں انگور کی بیل کے نیچے بیٹھ کر انھوں نے چائے پی تھی۔ کوٹھی ویران پڑی تھی۔ عقبی باغیچہ بھی ویران ہو گیا تھا۔ انگور کی بیل پھیل کر کہیں سے کہیں چلی گئی تھی۔ شبانہ کو ایسے لگا جیسے اس کے پیچھے کوئی آہستہ آہستہ چلتا اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ راحیل ہمیشہ اسی طرح آیا کرتا تھا اس نے پلٹ کر دیکھا مگر وہاں سوائے سوکھے پتوں کے اور کچھ نہیں تھا جنھیں سہ پہر کی خزاں آلود ہوا اپنے ساتھ اڑا رہی تھی۔ شبانہ آزردہ دل ہو کر واپس اپنی کوٹھی "کینال لاج" میں آ گئی۔ لاہور آ کر شبانہ خوش ہونے کی بجائے اداس ہو گئی تھی۔ وہ لائبریری سے انگریزی ناول نکلوا کر لے آتی اور سارا سارا دن اپنے کمرے میں بند رہ کر ان کے مطالعہ میں غرق رہنے لگی۔ بھائی عقیل کو ان ہی دنوں کاروباری سلسلے میں سلہٹ جانا پڑ گیا۔ مشرقی پاکستان کے حالات فوج کے کنٹرول سنبھالنے کے بعد نارمل ہو گئے تھے۔ مکتی باہنی اور بھارتی تخریب کار بھاگ کر بھارت جا چکے تھے۔ کاروبار پھر سے کھل گئے تھے اور ہر طرف امن و امان تھا۔ بھائی سلہٹ جانے لگا تو شبانہ کو سلہٹ کے چائے کے سرسبز باغات اور نیلے آسمان کے پس منظر میں لہراتے ہوئے ناریل کے درخت یاد آ گئے۔ اس کے کانوں میں مانجھیوں کے مدھر گیت گونجنے لگے۔ اس نے بھائی سے کہا کہ وہ اسے بھی سلہٹ لے جائے شبانہ اس سے پہلے سلہٹ جا چکی تھی۔ وہاں عقیل کے ایک گہرے دوست وزیر آباد کے چوہدری صاحب چائے کا بزنس کرتے تھے اور اپنے بال بچوں کے ساتھ سلہٹ کے مضافات میں چائے کے ایک سرسبز و شاداب باغ میں رہتے تھے، شبانہ کو ان کا چھوٹا سا خوش نما بنگلہ اور وہاں کی پرسکون فضا یاد آنے لگی۔ اس نے سوچا کہ سلہٹ کی فضا میں جا کر وہ بڑی خوش ہو گی۔

عقیل بھائی اپنی دکھی بہن کو اب ہر طرح سے خوش دیکھنا چاہتے تھے چنانچہ وہ شبانہ کو ساتھ لے جانے پر تیار ہو گئے۔ انھوں نے سلہٹ میں چوہدری صاحب کو تار دیا کہ وہ شبانہ کے ساتھ آ رہے ہیں۔ ایک روز وہ جہاز میں سوار ہو کر ڈھاکہ کی طرف پرواز کر گئے۔ شبانہ بڑی خوش تھی۔ ڈھاکہ سے انھوں نے چٹاگانگ کی پرواز پکڑی۔ چٹاگانگ سے وہ ریل میں بیٹھ کر سلہٹ آ گئے۔ ریلوے اسٹیشن پر چوہدری صاحب اپنی بیگم کے ساتھ موجود تھے۔ شبانہ کو انھوں نے سر پہ ہاتھ رکھ کر پیار کیا بیگم نے اسے گلے لگا لیا۔ شبانہ کو یوں لگا جیسے وہ غیروں سے نکل کر اپنوں میں آ گئی ہو۔ چوہدری

صاحب کی بیگم اور بڑی لڑکی نے شبانہ کو بتایا کہ فوج کے کنٹرول سنبھالنے سے پہلے مشرقی پاکستان کے حالات انتہائی سنگین صورت اختیار کر گئے تھے۔ ہم لوگ بھی سلہٹ چھوڑ کر ڈھاکہ محمد پور اپنے رشتے داروں کے ہاں چلے گئے تھے مگر پھر فوج حالات کو قابو میں کرنے کے لیے میدان میں آگئی اور بھارتی تخریب کار اور مکتی باہنی والے بھاگ گئے۔

شبانہ کی طبیعت اس خوبصورت سرسبز علاقے میں آکر بے حد خوش ہو گئی تھی۔ وہ چوہدری صاحب کی لڑکی نازی کے ساتھ چائے کے باغات میں لمبی لمبی سیریں کرتی، شام کو دونوں بنگلے کے ٹیرس میں بیٹھ کر چائے پیتیں اور جی بھر کر باتیں کرتیں۔ پھر ٹیپ ریکارڈ پر انگلش اور پنجابی گانے سنتیں۔ عقیل بھائی اس دوران شبانہ سے ملنے ڈھاکہ سے سلہٹ آئے۔ وہ واپس لاہور جا رہے تھے۔ انھوں نے شبانہ کو اپنے ساتھ واپس لے جانا چاہا۔ تو شبانہ اصرار کر کے وہاں ٹھہر گئی "بھائی جان! میں یہاں بڑی خوش ہوں..... ابھی میرے امریکہ جانے میں دو مہینے پڑے ہیں..... کچھ روز اور یہاں رہ کر آجاؤں گی۔"

عقیل بھائی نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا وہ اپنی بہن کو خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اگلے مہینے سلہٹ واپس آنے کا وعدہ کر کے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت تک کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اگلے مہینے یعنی دسمبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان پر کیا سانحہ گزرنے والا ہے۔ یہ نومبر ۱۹۷۱ء کا مہینہ تھا شبانہ کو اور مشرقی پاکستان میں رہنے والوں کو بالکل علم نہیں تھا کہ بھارت کے خطرناک عزائم کیا ہیں۔ نومبر کے آخر تک بھارت نے اپنی فوجیں مشرقی پاکستان کی سرحدوں کے ساتھ لا کر کھڑی کر دی تھیں اور وہ حملہ کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ ۴/ دسمبر کے روز دن کے دس بجے شبانہ اپنی سہیلی اور چوہدری صاحب کی بیٹی نازی کے ساتھ بنگلے کے ٹیرس میں بیٹھی کیرم کھیل رہی تھی کہ اچانک فضا میں دو چھوٹے جہاز زناٹے کے ساتھ نمودار ہوئے اور آگے کو نکل گئے۔ یہ انڈین ایئر فورس کے دو بمبار جہاز تھے پھر تڑ تڑ گولیوں کی آواز سنائی دی اور چاروں طرف ایک سناٹا چھا گیا۔ لوگ گھروں سے باہر نکل کر آسمان کی طرف دیکھنے لگے اس کے بعد دو اور بمبار جہاز نمودار ہوئے اور سلہٹ شہر کے اوپر گولیاں برسا کر واپس چلے گئے چوہدری صاحب سلہٹ ڈپو میں تھے گھبرائے ہوئے گھر آئے اور بولے کہ حالات کچھ ٹھیک نہیں دکھائی دیتے کوئی پتہ نہیں انڈیا کب مشرقی پاکستان پر حملہ کر دے۔ گھر کے سب لوگ پریشان ہو گئے۔

چوہدری صاحب کی بیگم نے فوراً کہا کہ آپ اسی وقت جا کر جہاز میں سیٹیں بک کروالیں ہم لاہور چلے جاتے ہیں مگر یہ کام اب اتنا آسان نہیں تھا۔ ایئر پورٹ پر کام کرنے والا بنگالی عملہ بھاگ گیا تھا جہاز کیسے اڑتا۔ شبانہ کے بھائی نے ٹیلی فون کر کے خیریت دریافت کی اور چوہدری صاحب سے کہا وہ لوگ فوراً سلہٹ سے لاہور آجائیں۔ چوہدری صاحب نے صورتِ حال بتائی تو عقیل پریشان ہو گیا اس نے شبانہ سے بھی بات کی اور اسے تسلی دی کہ فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا مگر سیاست کاروں اور تخریب کاروں کے ہاتھوں حالات تباہی کے کنارے پر پہنچ چکے تھے اور پھر ۴/ دسمبر کو بھارت نے مشرقی پاکستان پر بارہ ڈویژن فوج کے ساتھ تین طرف سے حملہ کر دیا۔ پہلے ہمارے جانباز جنگلوں، دریاؤں اور دلدلوں میں بے سروسامانی کے عالم میں تخریب کاروں اور مکتی باہنی کا مقابلہ کر رہے تھے۔ اب دشمن کی پوری بارہ ڈویژن فوج ان کے سامنے تھی مگر وہ سیسہ پلائی دیوار بن کے دشمن کے آگے ڈٹ گئے۔

سلہٹ شہر میں افراتفری پھیل گئی۔ بھارت کی سرحد پر واقع ہونے کی وجہ سے یہاں گولوں اور بموں کے دھماکے صاف سنائی دے رہے تھے۔ چوہدری صاحب نے اپنے بال بچوں اور شبانہ کو لیا اور ویگن میں بیٹھ کر چٹاگانگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہاں سے انھوں نے ٹرین پکڑی اور ڈھاکہ آ گئے ڈھاکہ کے محمد پور میں ان کے ایک دور کے رشتے دار مقیم تھے۔ شبانہ بھی چوہدری صاحب کی فیملی کے ساتھ ڈھاکہ کے محمد پور کے علاقے میں آگئی۔ چاروں طرف جنگ کی دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ پاک فوج کے ذرائع مسدود تھے انھیں باہر سے رائفل کی ایک گولی بھی نہیں پہنچ سکتی تھی وہ بے سروسامانی کے عالم میں صرف جذبے کے بل پر ہر محاذ پر دشمن کے دانت کھٹے کر رہی تھی۔ لاہور سے سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ شبانہ اپنے بھائی کو بھی فون نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے واشنگٹن ظفر کو فون کرنے کی کوشش کی مگر اسے لائن نہ مل سکی۔ ۷/ دسمبر کو ٹیلی فون بھی ڈیڈ ہو گیا۔ ۱۰/ دسمبر کو ڈھاکے کی فضا پر آنے والے خطرات کے سائے منڈلانے لگے تھے۔ شبانہ محمد پور والے مکان میں چوہدری صاحب کی بیگم اور بیٹی نازی کے ساتھ ایک کمرے میں سارا دن بند رہتی۔ طرح طرح کی افواہیں آ رہی تھیں کہ مکتی باہنی والے شہر میں آ گئے ہیں اور پھر ایک روز ڈھاکہ ایئر پورٹ پر دشمن نے اندھا دھند بمباری شروع کر دی۔ زمین ہل رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکیاں جھنجھنا رہی تھیں۔ شبانہ آنکھیں بند کیے خدا کو یاد کر

رہی تھی۔ پتہ چلا کہ دشمن نے ڈھاکہ ائیرپورٹ پر کھڑے طیاروں کو تباہ کر دیا۔ غیر بنگالی مسلمان اور اسلام دوست پاکستان سے محبت کرنے والے بنگالی مسلمانوں کے ہونٹ چپ تھے، آنکھیں آسمان کی طرف تھیں اور وہ اللہ سے پاکستان کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے پھر ۱۶/ دسمبر کا منحوس دن آگیا ڈھاکہ فال ہو گیا۔ میر پور اور محمد پور کی بستیوں پہ موت کا سناٹا چھا گیا۔ چوہدری صاحب نے اسی وقت اپنی فیملی اور شبانہ کو وہاں سے نکالا اور گلشن میں اپنے ایک پارسی دوست کے پاس چلے گئے۔ گلشن ڈھاکہ کا ایک فیشن ایبل علاقہ تھا اور یہاں بڑی خوبصورت کوٹھیاں تھیں اور کاروباری اور سفارتخانوں کے آفیسرز رہائش پذیر تھے۔ چوہدری صاحب کا خیال تھا کہ یہاں وہ محفوظ ہوں گے لیکن ایک دن مکتی باہنی والے ان کے پارسی دوست کی کوٹھی پہ بھی آ گئے۔ پارسی دوست کا نام ہرمز تھا اور وہ ڈھاکہ میں شپنگ بزنس کرتا تھا۔ اس کی کوٹھی میں ایک تہہ خانہ بھی تھا اس نے چوہدری صاحب کی فیملی کو تہہ خانے میں چھپا دیا۔ یہ تہہ خانہ اس طریقے سے بنایا گیا تھا کہ اس کی سیڑھیوں میں دروازہ کمرے کے فرش کا چوکھٹا اٹھا کر کھلتا تھا۔ چوکھٹا جب فرش پہ گرا دیا جاتا تو کسی کو پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ اس فرش کے نیچے تہہ خانہ بھی ہے ہرمزجی نے اوپر قالین بچھا دیا تھا اس تہہ خانے میں تازہ ہوا ایک خاص پائپ کے ذریعے پہنچائی جاتی تھی۔ مکتی باہنی والے دندناتے ہوئے کوٹھی کے اندر آ گئے۔ آگے آگے ایک مکتی باہنی فوج کا افسر تھا جس نے اسٹین گن اٹھا رکھی تھی۔

اس نے ہرمزجی سے کہا: "ہم جانتا ہے تم پارسی ہو.... ہم تم کو کچھ نہیں کہے گا پر ہمیں خبر ملی ہے کہ تمھارے ہاں پاکستانی چھپے ہوئے ہیں انھیں ہمارے حوالے کر دو نہیں تو ہم تمھارے بنگلے کو آگ لگا دیں گے۔"

ہرمزجی نے کہا: "بھائی اگر میرے پاس کوئی پاکستانی چھپا ہوتا تو میں اسے ضرور تمھارے حوالے کر دیتا.... لیکن یقین کرو یہاں سوائے میرے اور میری بیوی کے اور کوئی نہیں ہے تم خود اندر آ کر تلاشی لے سکتے ہو۔" اور ہرمزجی پیچھے ہٹ گئے مکتی باہنی والے کوٹھی میں داخل ہو کر کمروں میں گھس گئے انھوں نے ایک ایک جگہ چھان ماری، چھت پر بھی گئے، اسٹور دیکھا.... مکتی باہنی کا افسر فرش پر عین اس جگہ کھڑا تھا جس کے نیچے چوہدری صاحب ان کے بیوی بچے اور شبانہ سہمی ہوئی بیٹھی

تھی۔ مکتی باہنی والا بولا: "ہم جاتا ہے لیکن اگر تمھارے پاس کوئی پاکستانی آیا تو ہمیں فوراً خبر کرنا..... اس وقت تمھارے پاس کتنا روپیہ ہے۔"

ہرمزجی نے جیب سے بٹوہ نکال کر اس مکتی باہنی والے کو دے دیا۔ اس بٹوے میں ڈیڑھ ہزار کے قریب روپے تھے۔ مکتی باہنی والے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد نیک دل پارسی.... ہرمزجی نے تہہ خانے میں جا کر چوہدری صاحب، ان کی فیملی اور شبانہ کو تمام واقعات بتائے اور کہا کہ فکر مت کریں جب تک میں زندہ ہوں کوئی ان تک نہیں پہنچ سکے گا لیکن دوسری طرف کسی نے مکتی باہنی کے ایک ہندو کیپٹن کو مخبری کر دی کہ گلشن کے علاقے میں پارسی سیٹھ ہرمزجی کی کوٹھی کے تہہ خانے میں ایک پاکستانی فیملی چھپی ہوئی ہے۔ مخبر ہرمزجی کا سابقہ ہندو بنگلی ملازم تھا جو تہہ خانے کے خفیہ دروازے سے واقف تھا چنانچہ رات کے گیارہ بجے کے قریب مکتی باہنی کا ہندو کیپٹن اپنے غنڈوں کے ساتھ ہرمزجی کی کوٹھی میں پہنچ گیا۔ اس نے کوٹھی میں داخل ہوتے ہی فائرنگ شروع کر دی۔ ہرمزجی کے مسلمان بنگالی نوکر نے مکتی باہنی والوں کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ کوٹھی میں کوئی پاکستانی نہیں چھپا ہوا۔

ہندو کیپٹن نے مسلمان بنگالی کو دھکا دے کر ایک طرف گرایا اور کڑک کر بولا: "میں جانتا ہوں اس پارسی نے پاکستانیوں کو تہہ خانے میں چھپا رکھا ہے۔" ہرمزجی کوٹھی کے اندر یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے جونہی انھوں نے یہ بات سُنی بھاگ کر نیچے ڈرائنگ روم میں گئے۔ قالین اٹھا کر لکڑی کا تختہ ہٹایا اور چوہدری صاحب سے کہا: "جلدی سے باہر نکل آؤ..... مکتی باہنی کو اس ٹھکانے کا پتہ چل گیا ہے۔"

چوہدری صاحب، ان کی بیگم، بیٹی نازی اور شبانہ گھبراہٹ میں باہر نکل آئے۔ ہرمزجی انھیں کوٹھی کے پچھلے کمرے میں لے گئے اور دروازہ کھول کر بولے: "میں تمھارے لیے یہی کر سکتا تھا... اب اپنی جانیں بچانے کے لیے اندھیرے میں ائیرپورٹ کی طرف نکل جاؤ..... وہاں انڈین فوج شاید تمھیں قیدی بنا لے۔"

مکتی باہنی والے ڈرائنگ روم میں پہنچ چکے تھے۔ چوہدری صاحب نے اپنی بیگم، بیٹی نازی اور شبانہ کو ساتھ لیا اور اندھیری رات میں سامنے والی گراؤنڈ کی طرف دوڑ پڑے۔ بے چاری گھریلو

عورتیں آخر کب تک دوڑ سکتی تھیں پھر بھی موت کے خوف سے وہ گراؤنڈ پار کر گئیں۔ شبانہ کا دوپٹہ راستے میں کہیں گر گیا تھا اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے اور آگے کیا ہو گا۔ لاہور اسے کروڑوں میل دور لگ رہا تھا۔

جونہی وہ سڑک پر آئے سامنے کی جانب سے ایک فوجی جیپ نمودار ہوئی اس میں مکتی باہنی والے سوار تھے۔ جیپ میں سے ان پر اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ شبانہ نے ایک سوکھے نالے میں چھلانگ لگا دی وہ جدھر منہ اٹھا ادھر کو بھاگنے لگی اسے چوہدری صاحب اور ان کی فیملی کی اب کوئی خبر نہیں تھی کہ ان پر کیا بیتی۔ وہ اندھا دھند بھاگی جا رہی تھی اپنے پیچھے اسے نازی کی دلدوز چیخ سنائی دی۔ شبانہ بھاگتی چلی گئی۔ یہ برساتی نالہ تھا اور سطح زمین سے چھ سات فٹ نیچے تھا۔ نالے میں پانی نہیں تھا اونچی اونچی گھاس اگی تھی ایک جگہ وہ کسی شے سے ٹکرا کر گر پڑی وہ اٹھی اور دوبارہ بھاگنا شروع کر دیا۔ نالہ آگے جا کر دائیں جانب مڑ گیا پھر اندھیرے میں شبانہ نے دور ہلکی سی روشنی دیکھی اس کا سانس پھول رہا تھا اب اس میں دوڑنے کی ہمت نہیں تھی۔ روشنی سرخ تھی اور یہ ایک ٹرک کی پچھلی بتیوں کی روشنی تھی۔ ٹرک نالے کے باہر سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔

شبانہ ٹرک کے قریب نیچے نالے میں اونچی گھاس کی اوٹ میں بیٹھ کر ہانپنے لگی۔ ٹرک پر بڑی بڑی گانٹھیں لدی ہوئی تھیں۔ شبانہ کے کان میں ہرمزجی کا جملہ گونج اٹھا کہ ائیرپورٹ پر انڈین فوج ہو گی وہ تمھیں قیدی بنا لے گی۔ شبانہ مکتی باہنی والوں کی بربریت سے بچنا چاہتی تھی ان کی درندگی کے واقعات اس نے بہت سنے تھے۔ اس نے سوچا شاید یہ ٹرک انڈین ملٹری کا ہے اسے اس میں چھپ کر اپنی عزت بچا لینی چاہیے مگر انڈین فوجی بھی اس کے ساتھ وحشیانہ سلوک کر سکتے تھے۔

شبانہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اسے پیچھے فائرنگ کی آواز سنائی دی وہ گھبرا کر نالے سے باہر نکلی اور ٹرک کے پیچھے اس کے اندر کود گئی۔ اس نے اپنے آپ کو بڑی بڑی گانٹھوں کے پیچھے چھپا لیا۔ ٹرک کا انجن بند تھا خدا جانے اس کا ڈرائیور وغیرہ کہاں چلا گیا تھا۔ شبانہ سہمی ہوئی چھپی بیٹھی تھی۔ ایک گاڑی فائرنگ کے شور کے ساتھ ٹرک کے قریب سے گزر گئی۔ گاڑی میں سے بلند ہوتی کسی عورت کی چیخ بھی شبانہ نے سنی تھی۔ اس کا دل خوف سے لرز اٹھا وہ آنکھیں بند کر کے خدا کے حضور دعائیں مانگنے لگی۔ ایک ہی پل میں وہ گھر سے بے گھر ہو گئی تھی اور اس کا کوئی پرسان حال

نہ تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بڑی بڑی گانٹھوں کے پیچھے اچھی طرح سے چھپا لیا تھا۔ ان گانٹھوں میں پٹ سن یا خدا جانے کیا بھرا ہوا تھا۔ شبانہ کو یہ سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی اسے اپنی عزت اور جان بچانے کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ ایک بات اس نے اپنے دل میں طے کر رکھی تھی کہ اگر اس کی عزت خطرے میں پڑ گئی تو وہ خودکشی کر لے گی۔ دو آدمی بنگلہ میں باتیں کرتے ٹرک کے قریب آ رہے تھے۔ شبانہ بنگلہ زبان نہیں جانتی تھی وہ سانس روکے ٹرک میں گانٹھوں کے پیچھے دبکی بیٹھی رہی پھر کسی نے ٹرک کے پیچھے آ کر ڈرائیور کو بنگلہ میں آواز دی اور تیز تیز قدم اٹھاتا آگے چلا گیا پھر ٹرک کی کھڑکی کے دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی۔ انجن اسٹارٹ ہوا اور ٹرک نے سڑک پر ایک طرف رینگنا شروع کر دیا۔ شبانہ کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ ٹرک اسے کہاں لے جا رہا ہے لیکن کم از کم وہ اس وقت مکتی باہنی والوں سے اپنی عزت اور جان بچانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ ٹرک سڑک کے ایک طرف نپی تلی رفتار کے ساتھ چلا جا رہا تھا شبانہ آنکھیں بند کر کے خدا سے دعا مانگنے لگی اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ٹرک کسی نامعلوم منزل کی طرف رواں تھا۔

- - ۞ - -

ٹرک پوری رفتار سے سڑک پر جا رہا تھا۔

شبانہ پٹ سن کی گانٹھوں کے بیچ میں ایک طرف دبکی ہوئی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ ٹرک کدھر جا رہا ہے اور اگلی سیٹ پر جو دو آدمی بیٹھے ہیں وہ کون ہیں۔ اسے چوہدری صاحب کی فیملی کا خیال آ رہا تھا جن کے ساتھ وہ گلشن کی ایک کوٹھی میں چھپی ہوئی تھی اور جب باہر نکلی تو مکتی باہنی کے آدمیوں نے حملہ کر دیا تھا اور جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ گیا تھا۔ شبانہ کو نالے کے پار رات کے اندھیرے میں یہ ٹرک نظر آیا اور وہ چھپ کر اس میں بیٹھ گئی تھی اور تھوڑی دیر بعد ٹرک چل پڑا تھا۔ ڈھاکہ میں دشمن کی فوج داخل ہو چکی تھی اور مکتی باہنی والے گھروں کو لوٹتے اور لوگوں کو قتل کرتے پھرتے تھے۔ شبانہ کو حالات کی سنگینی کا علم تھا۔ لیکن وہ بے یار و مددگار تھی۔ یہ سوچ کر اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ وہ کہاں جا رہی ہے اور اب اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے یہی فیصلہ کیا کہ جہاں ٹرک رکے گا وہ اتر کر کسی طرف بھاگ جائے گی اور پھر کسی مسلمان بنگالی کے گھر میں پناہ لینے کی کوشش کرے گی۔ ٹرک کی رفتار کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ سڑک پر ایک ہی رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ شبانہ کو اوپر آسمان پر ستارے نظر آ رہے تھے اسے راحیل کا خیال آنے لگا وہ کسی بھی جگہ اچانک نمودار ہو جایا کرتا ہے کاش وہ یہاں بھی آ جائے اور شبانہ کو اس جہنم سے نکال کر اپنے ساتھ لاہور لے جائے۔ لاہور شبانہ کو سات سمندر پار کا کوئی شہر لگ رہا تھا جہاں تک پہنچنے کے لیے اسے شعلوں میں بھڑکتے ہوئے سمندروں کو عبور کرنا تھا۔

شبانہ ٹرک میں ایسی جگہ بیٹھی تھی جہاں اس کی دونوں جانب اور آگے پیچھے پٹ سن کی بڑی بڑی

گانٹھیں پڑی تھیں۔ صرف ایک طرف تھوڑی سی جگہ تھی جس میں سے گھس کر وہ اندر آ گئی تھی۔ اتنا اسے احساس ہو گیا تھا کہ ٹرک ڈھاکہ شہر سے نکل آیا ہے اور اب کسی دوسرے شہر کی طرف جا رہا ہے۔ ساری رات ٹرک اسی طرح چلتا رہا۔ پھر آسمان پر پو پھٹنے لگی اور ستاروں کی چمک ماند پڑنے لگی۔ ٹرک ایک طرف کو گھوم گیا۔ اب وہ ایک ایسی سڑک پر جا رہا تھا جو غیر ہموار تھی۔ ٹرک ہچکولے کھا رہا تھا اور اس کی رفتار ہلکی ہو گئی تھی۔ مگر اتنی بھی کم نہیں تھی کہ شبانہ ٹرک میں سے چھلانگ لگا سکتی۔ وہ کھسکتی ہوئی پٹ سن کی گانٹھوں میں سے باہر نکلی اور پیچھے جاتی سڑک کو دیکھا۔ پچھلے پہر کی ہلکی نیلی روشنی میں اسے چھوٹی سڑک کی دونوں جانب ناریل کے اونچے اونچے جھکے ہوئے درخت نظر آئے۔ ٹھنڈی ہواؤں میں رطوبت محسوس ہو رہی تھی۔ دریا قریب ہی تھا اور ٹرک اس کے کنارے کنارے ویران جنگل میں جا رہا تھا۔ ٹرک کی رفتار مزید کم ہو گئی۔ اب موقع تھا۔ شبانہ ٹرک کے پیچھے آ گئی۔ سڑک ویران تھی اور منہ اندھیرے کی دھندلی روشنی میں بل کھاتے سانپ کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ شبانہ کو چھلانگ لگاتے خوف سا محسوس ہو رہا تھا اس نے پہلے کبھی کسی چلتے ٹرک سے اس طرح چھلانگ نہیں لگائی تھی۔ اگرچہ ٹرک کی رفتار کم ہو گئی تھی لیکن اس بات کا احتمال تھا کہ شبانہ سڑک پر گر پڑے اور زخمی ہو جائے۔ وہ ٹرک کی رفتار مزید کم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ لگتا تھا یہ کوئی جنگل ہے۔ صبح کی دھیمی دھیمی سفیدی رات کی تاریکی پر غالب آنے لگی تھی۔ اب درخت سڑک اور آس پاس کا منظر شبانہ کو بخوبی دکھائی دینے لگا تھا۔ ٹرک کچی سڑک پر دائیں بائیں مڑتے ہوئے چلا جا رہا تھا ایک جگہ وہ ایک دھچکے کے ساتھ رک گیا۔ شاید وہ کسی گڑھے میں پھنس گیا تھا۔ شبانہ نے موقع غنیمت جان کر باہر چھلانگ لگا دی وہ سڑک پر گری جلدی سے اٹھی اور کنارے کی جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ٹرک میں سے ڈرائیور کو باہر نکلتے دیکھ لیا تھا۔ اگر وہ کسی طرف دوڑتی تو پکڑی جا سکتی تھی۔ وہ وہیں سانس روکے بیٹھی رہی۔ ڈرائیور اور اس کا ساتھی نیچے بیٹھ کر ٹرک کے پہیے کو جھک کر دیکھنے لگے۔ انھوں نے بنگلہ زبان میں کچھ کہا اور واپس ٹرک میں جا کر بیٹھ گئے۔ ٹرک کا انجن شور مچانے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد ٹرک کا پہیہ گڑھے میں سے نکل آیا اور ٹرک جنگل میں آگے چل پڑا۔ جب ٹرک شبانہ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے جھاڑیوں میں سے نکل کر جائزہ لیا۔ چاروں طرف ناریل اور سنبل

کے درخت ہی درخت پھیلے ہوئے تھے ان کے بیچ میں اُگی ہوئی جنگلی جھاڑیاں دور تک چلی گئی تھیں مشرق کی طرف آسمان پر طلوع ہوتے سورج کی گولڈن روشنی دم بہ دم پھیلتی جا رہی تھی شبانہ نے اللہ کا نام لے کر طلوع ہوتے سورج کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے درختوں میں صبح کی سنہری روشنی پھیل گئی۔ جنگلی جھاڑیاں شبانہ کے کندھوں تک آتی تھیں۔ وہ سہمی ہوئی چل رہی تھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ کونسی جگہ ہے اور راتوں رات وہ ڈھاکہ سے نکل کر کہاں آ گئی ہے۔ ایک جگہ درختوں کے درمیان کھلی جگہ پر اُسے ایک جھونپڑی نظر آئی جس کے پیچھے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔ ایک کتا اچانک بھونکنے لگا۔ اس نے کسی اجنبی کی بُو پا لی تھی شبانہ نے اپنا رخ دوسری طرف کر لیا۔ وہ جھونپڑی سے آگے نکل جانا چاہتی تھی۔ اسے ایک عورت کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ کتے کو چپ کرا رہی تھی۔

شبانہ نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ یہ پاکستانی لباس تھا اور خطرے کا نشان تھا۔ مگر وہ اپنا لباس تبدیل نہیں کر سکتی تھی۔ وہ جھونپڑی سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک جھاڑی کے عقب سے باہر نکلی تو اچانک ایک ادھیڑ عمر کی بنگالی عورت اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اس نے سفید سوتی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ پاؤں سے ننگی تھی۔ ایک ہاتھ میں درانتی اور دوسرے ہاتھ میں ترکاری پکڑی ہوئی تھی۔

اس نے شبانہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولی۔

"گھبراؤ نہیں بیٹی میں جانتی ہوں تم پاکستانی ہو ادھر مکتی باہنی والے تمھیں پکڑ لیں گے میرے ساتھ آ جاؤ۔ میں تمھیں چھپا لوں گی۔"

شبانہ کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے دل خوف سے سہما ہوا تھا۔ عورت کے جملے اس کے لیے سکون کا پیغام لائے۔ اسے یوں لگا جیسے اس قتل و غارت گری کے ماحول میں کوئی ہمدرد ساتھی مل گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بنگالی عورت نے آگے بڑھ کر شبانہ کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ اسے پیار کیا اور اپنے ساتھ اس جھونپڑی کی طرف لے گئی جس سے بچ کر شبانہ نے آگے نکلنے کی کوشش کی تھی۔ درخت سے بندھا ہوا کتا اب بھی بھونکے جا رہا تھا۔ عورت نے اسے بنگلہ میں ڈانٹا۔ کتا خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ جھونپڑی کی چھت ناریل کی چھال کی تھی۔ دروازہ بانس کا تھا۔ باہر کچھ

برتن بکھرے پڑے تھے۔ بنگالی عورت نے شبانہ کو جھونپڑی کے اندر لے جا کر چارپائی پر بٹھا دیا۔

اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کہا "گھبراؤ نہیں بیٹی شہروں میں جو کچھ ہو رہا ہے ہمیں معلوم ہے یہاں تمھیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ بتاؤ تمھارا نام کیا ہے اور تم کہاں جانا چاہتی ہو؟"

شبانہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے بنگالی عورت کو اپنا نام بتایا اور کہا کہ اسے مشرقی پاکستان سے نکال کر کسی دوسرے ملک میں پہنچا دیا جائے۔

بنگالی عورت تسلی آمیز لہجے میں کہنے لگی "فکر کیوں کرتی ہو بیٹی میرا مالک جنگل میں گیا ہوا ہے وہ بڑا نیک آدمی ہے وہ تمھیں یہاں سے نکال کر نیپال کی سرحد پار کرا دے گا۔ پہلے بھی وہ ایک عورت اور اس کے خاوند کو نیپال پہنچا چکا ہے۔ نیپال جا کر تم بالکل محفوظ ہو گی۔"

شبانہ کو اس بنگالی عورت کی باتوں سے بڑا حوصلہ ہوا۔ ان باتوں میں اسے خلوص اور انسانی ہمدردی کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اپنی عزت بچا کر محفوظ جگہ پر آ گئی ہے۔ اس نے اٹھ کر بنگالی عورت کے ہاتھ چوم لیے اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ بنگالی عورت نے اسے ایک بار پھر اپنے گلے سے لگا کر تسلی دی اور یہ کہہ کر جھونپڑی سے باہر نکل گئی کہ میں تمھارے لیے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔ شبانہ چارپائی پر بیٹھ کر خدا کا شکر ادا کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں بنگالی عورت المونیم کی تھالی میں اُبلے ہوئے چاول اور گلاس میں پانی لے آئی۔ شبانہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے چاول کھا لیے اور چائے بھی پی جو سخت کڑوی تھی۔ اتنے میں باہر سے کسی نے آواز دی۔

بنگالی عورت اٹھتے ہوئے بولی "میرا آدمی آ گیا ہے میں اسے تمھارے بارے میں بتاتی ہوں وہ تمھیں آج ہی نیپال کی سرحد پار کرا دے گا۔"

بنگالی عورت باہر چلی گئی جھونپڑی کا بانس کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔ باہر سے بنگالی عورت کے کسی مرد سے بنگلہ زبان میں باتیں کرنے کی آواز آنے لگی۔ شبانہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ پھر ایک دبلا پتلا بنگالی جس نے صرف ایک دھوتی اور بنیان پہن رکھی تھی بنگالی عورت کے ساتھ جھونپڑی میں داخل ہوا اور سلام کر کے شبانہ کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔

"بیٹی! میری بیوی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے تم نے اچھا کیا جو ہمارے پاس چلی آئی۔ شہروں

میں غدر مچا ہوا ہے مکتی باہنی والے عورتوں بچوں اور مردوں سب کو قتل کر رہے ہیں مگر یہاں تمھیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ کسی طرح آج کا دن گزار لو رات کو میں تمھیں ساتھ لے کر نیپال کی سرحد کی طرف چل دوں گا۔ مجھے سارے راستوں کا پتہ ہے میں نے پہلے بھی ایک پاکستانی میاں بیوی کو نیپال پہنچایا ہے۔ اب تم آرام کرو مگر یہ کپڑے بدل کر ساڑھی پہن لو تو اچھا ہے۔"

پھر اس نے بنگالی عورت کی طرف دیکھ کر کہا کہ بچی کو ساڑھی پہنا دو۔ وہ باہر چلا گیا۔۔۔ بنگالی عورت نے ٹین کے ایک صندوق میں سے سبز رنگ کی سوتی ساڑھی نکال کر شبانہ کو پہنا دی اس کے بالوں کا بھی سر کے پیچھے بنگالی عورتوں کی طرح جوڑا بنا دیا اور کہا کہ وہ جھونپڑی سے باہر نہ نکلے کیونکہ ہو سکتا ہے قبیلے کا کوئی آدمی اسے دیکھ لے اور پھر مکتی باہنی والوں کو جا کر خبر کر دے۔ شبانہ سارا دن جھونپڑی کے اندر ہی رہی۔ جب سورج غروب ہو گیا اور جنگل میں شام کے سرمئی سائے اترنے لگے۔ تو بنگالی عورت کا دبلا پتلا خاوند ایک بیل گاڑی لے کر آ گیا۔ گاڑی کے اوپر بانس کی محرابی چھت پڑی تھی اور آگے ایک مریل سا بیل جتا ہوا تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ گاڑی میں تھوڑے چاول ہنڈیا میں ڈال کر رکھ دے۔ پھر اس کی بیوی نے چاول گاڑی میں رکھ دیئے اور شبانہ کو سر پر لینے کے لئے دھوتی دی۔ شبانہ نے چارخانے دار سوتی دھوتی اپنے سر پر اوڑھ لی اور چاول والی ہنڈیا کے پاس گاڑی میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ بنگالی گاڑی کی گدی پر بیٹھ گیا۔ اور بیل گاڑی جنگل میں ایک طرف درختوں میں چل پڑی۔ شبانہ کو اس نے بتایا تھا کہ نیپال کی سرحد پر وہ دو دن میں پہنچیں گے اور ایک رات انھیں جنگل میں گزارنی ہو گی۔ شبانہ کے لیے یہ ساری مسافتیں اور راستے اجنبی تھے۔ اس بنگالی نے اپنے آپ کو مسلمان کہا تھا اور شبانہ نے اس پر اعتماد کر لیا تھا۔ بیل گاڑی کے نیچے لالٹین لٹک رہی تھی۔ جس کی ہلکی ہلکی روشنی میں وہ جنگل کے پیچ پیچ راستوں پر گزرتی چلی جا رہی تھی۔ بنگالی مرد کے مطابق رات کو وہ اس لیے سفر پر نکلا ہے کہ آس پاس مکتی باہنی والے پھر رہے ہیں۔ دن کے وقت انھیں دیکھا جا سکتا تھا۔ دو گھنٹے تک گاڑی لگاتار جنگل میں چلتی رہی۔ گاڑی کی رفتار بہت دھیمی تھی اور جنگل کی کچی پگڈنڈیوں پر وہ ہچکولے کھاتی جا رہی تھی۔

شبانہ بیل گاڑی کے اندر ایک جانب سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ گاڑی کے نیچے جو لالٹین لٹکی ہوئی

تھی اس کی دھیمی روشنی پیچھے کی جانب پگڈنڈی پر پڑ رہی تھی۔ اس پگڈنڈی پر شبانہ کو سوائے اونچی اونچی جھاڑیوں کے اندھیری رات میں اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بیل گاڑی اب اونچے نیچے راستوں پر سے گزرنے لگی۔ راستے میں ندی نالوں کے دو تین پل بھی آئے۔ یہ بانس کے بنے ہوئے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر اس بنگالی نے گاڑی کو ایک دم سے روک دیا۔

جلدی سے نیچے اتر کر گاڑی کے نیچے جلتی لالٹین کو بجھا دیا اور شبانہ سے کہا "آگے مجھے خطرہ لگتا ہے۔ مگر تم فکر نہ کرو یہاں سے تھوڑی دور دریا کے کنارے میرا ایک دوست رہتا ہے میرا خیال ہے ہم تھوڑی دیر کے لیے وہاں رک جاتے ہیں۔"

بنگالی نے گاڑی کو جنگل میں ایک طرف موڑ دیا۔ شبانہ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ اعتراض کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھی۔ ویسے بھی اسے اپنے اس بنگالی محسن پر پورا بھروسہ تھا۔ بیل گاڑی جھاڑیوں کے بیچ ایسی جگہ چل رہی تھی جہاں کوئی باقاعدہ پگڈنڈی نہیں تھی۔ کبھی گاڑی ڈھلان اترنے لگتی اور کبھی چڑھائی چڑھنے لگتی۔ اندھیرے کی وجہ سے اب شبانہ کو باہر سوائے درختوں، جھاڑیوں، تاریک ہیولوں کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بیل گاڑی ہموار زمین پر آتے ہی دائیں جانب گھوم گئی۔ یہاں شبانہ کو ایسی ہوا محسوس ہوئی جس میں دریا کی ٹھنڈک تھی۔ دریا قریب آ گیا تھا۔ بنگالی نے گاڑی ایک جگہ تاڑ کے درختوں میں کھڑی کر دی اور شبانہ سے کہا کہ وہ اس کے پیچھے پیچھے آئے۔ شبانہ بیل گاڑی سے اتر کر بنگالی کے پیچھے پیچھے اونچی گھاس میں چلنے لگی۔ گھاس کے چھوٹے سے ٹکڑے سے نکلنے کے بعد شبانہ کو سامنے دو تین جھگیاں اندھیرے میں سایوں کی طرح دکھائی دیں۔

بنگالی نے ان جھگیوں کی طرف اشارہ کر کے آہستہ سے کہا "یہاں میرا دوست اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتا ہے وہ بھی مسلمان ہے بڑا نیک آدمی ہے۔ دریا میں مچھلیاں پکڑ کر گاؤں میں لے جا کر بیچتا ہے آؤ میرے ساتھ۔"

وہ جھگیوں کی طرف چلنے لگے۔ وہاں کوئی روشنی نہیں تھی۔ ایک جھگی سے [illegible] پیچھے بنگالی نے شبانہ کو درخت کے پاس بٹھا دیا اور بولا "میں اپنے دوست سے جا کر پہلے بات [illegible] ہوں۔ تم اسی جگہ بیٹھی رہنا۔"

بنگالی جھگی کے پیچھے کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جھگی میں لالٹین کی روشنی ہو گئی۔

بنگالی جھگی کے پیچھے سے نکل کر شبانہ کی طرف بڑھا قریب آکر بولا "یہ سب ٹھیک ہے میرا دوست اور اس کی بیوی تم سے مل کر بہت خوش ہو گی۔ یہاں ہم باقی رات گزاریں گے صبح میرا دوست ہمارے ساتھ دریا پار تک چلے گا۔"

وہ شبانہ کو لے کر جھگی میں آ گیا۔ اس جھونپڑی کے اندر لالٹین جل رہی تھی۔ دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ ایک پر ایک بھاری بدن والی بنگالی عورت اور دوسری چارپائی پر ایک گنجے سر والا بنگالی مرد بنیان دھوتی پہنے بیٹھا تھا کونے میں بانس کے ساتھ لالٹین جل رہی تھی۔ شبانہ کو دیکھ کر گنجے بنگالی نے اسے مسلمانوں کی طرح سلام کیا اور اپنی بیوی کا تعارف کرایا "یہ میری گھر والی چمپا ہے۔ آؤ یہاں بیٹھو بیٹی ہمارے بچے شہر گئے ہوئے ہیں تم ساتھ والی جھگی میں جا کر سو جاؤ۔ صبح ہم تمھیں اپنے ساتھ دریا پار کرائیں گے۔"

اس کی بیوی چمپا چارپائی سے اٹھی۔ شبانہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کے ماتھے کو چوما اور بولی "میرے ساتھ آؤ بیٹی۔"

وہ اسے ساتھ والی جھونپڑی میں لے گئی جہاں صرف بانس کی ایک چارپائی ہی بچھی ہوئی تھی چمپا نے شبانہ کو ایک چادر دی اور کہا کہ وہ سو جائے۔ چمپا جھونپڑی کا بانس کا دروازہ بند کر کے چلی گئی۔ شبانہ نے چادر اوڑھ لی۔ جھونپڑی میں اندھیرا تھا۔ اسے خوف محسوس ہو رہا تھا وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ وہ دوبارہ لاہور پہنچ بھی سکے گی کہ نہیں۔ جھونپڑی میں مچھر بھنبھنا رہے تھے۔ شبانہ کو نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ اس کا ذہن پریشان خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ ہونٹ بار بار خشک ہو جاتے تھے۔ نیند کوسوں دور تھی۔ مچھروں سے بچنے کے لیے وہ اچھی طرح چادر اوڑھ کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ ابھی اسے لیٹے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اسے جھونپڑی کے باہر تیز تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس نے چادر منہ پر سے اتار دی اور اندھیرے میں جھونپڑی کے دروازے پر نظریں گاڑ دیں۔

دروازہ کھلا اسے پہلے والے بنگالی کی آواز سنائی دی "بیٹی! جلدی سے باہر آجاؤ یہاں خطرہ ہے۔ ہم اسی وقت دریا پار کریں گے۔"

شبانہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ چادر پھینک کر جھونپڑی سے باہر نکل آئی۔ باہر دوسرا بنگالی بھی کھڑا تھا اس نے شبانہ کو شفقت آمیز لہجے میں تسلی دی اور کہا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے بیٹی۔ میرے آدمی نے ابھی آکر خبر دی ہے کہ جنگل میں کچھ مکتی باہنی والے پاکستانی عورتوں کی تلاش میں داخل ہو گئے ہیں اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم اسی وقت دریا پار کر جائیں۔"

شبانہ اندھیرے میں خوفزدہ آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ دونوں بنگالیوں نے شبانہ کو ساتھ لیا اور پیدل ہی جنگل میں ایک طرف چلنے لگے۔

کچھ دور چلنے کے بعد دریا کا کنارا آ گیا۔ دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا اور دوسرے کنارے کے درختوں کے سیاہ جھنڈ نظر آ رہے تھے کنارے پر ایک گول قبر ایسی چھت والی کشتی کھڑی تھی۔ شبانہ ان آدمیوں کے ساتھ اس کشتی میں چھت کے نیچے بیٹھ گئی۔ وہ چپو چلانے لگے۔ کشتی کنارے سے دور ہٹتی ہوئی دریا کے وسط میں آکر مشرق کی طرف چلنے لگی۔ شبانہ چھت کے نیچے ایک طرف ناریل کے ڈھیر کے پاس گھٹنے سینے سے لگائے سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ حالات کے دھارے پر بہی جا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی قوت مفلوج ہو گئی ہے اس نے اپنا آپ ان آدمیوں کے حوالے کر دیا تھا۔ جدھر وہ اسے لیے جا رہے تھے وہ چلی جا رہی تھی۔ کشتی کی رفتار تیز تھی۔ کیونکہ وہ دریا کے بہاؤ کے رخ پر چل رہی تھی۔ شبانہ نے دھوتی سے اپنا سر ڈھانپ رکھا تھا۔ جانے کتنی دیر تک کشتی دریا میں بہتی چلی گئی۔ پھر شبانہ نے کسی اسٹیمر کے انجن کی قریب آتی آواز سنی۔ پہلے والا بنگالی چپو چھوڑ کر چھت کے نیچے آ گیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا تھا کہنے لگا "شاید بھارتی نیوی کی کوئی گشتی کشتی آ رہی ہے۔ تم اس ترپال کے نیچے چھپ جاؤ۔ خبردار آواز مت نکالنا نہیں تو انڈین فوجی ہم سب کو پکڑ کر لے جائیں گے۔"

قریب ہی ایک ترپال پڑی تھی۔ شبانہ کا حلق دہشت سے خشک ہو گیا۔ اس نے ترپال اٹھا کر اپنے اوپر ڈال لی اور کونے میں ایک ڈھیر کی طرح پڑ گئی۔ بنگالی کشتی کے سامنے رخ پر جا کر اپنے دوسرے ساتھی کے پاس بیٹھ گیا۔ انھوں نے ملاحوں کا ایک بنگلہ گیت گانا شروع کر دیا۔ اسٹیمر کی آواز بہت قریب آ گئی تھی۔ پھر انڈین نیوی کا ایک چھوٹا اسٹیمر کشتی کے قریب آکر ٹھہر گیا۔ اسٹیمر کے اوپر سے ایک بنگالی سیلر نے بلند آواز میں پوچھا "تم کون ہو اور ادھر

کہاں جا رہے ہو؟"

دوسرے بنگالی نے ہاتھ باندھ کر کہا "مہاراج مچھلیاں پکڑنے دوسرے کنارے پر جا رہے ہیں۔"

اسٹیمر والے بنگالی ملاح نے کہا "ہمارا حصہ کہاں ہے؟"

دوسرے بنگالی نے فوراً کہا "مہاراج! آپ کا حصہ میرے پاس رکھا ہوا ہے۔"

اسٹیمر کشتی کے قریب آگئی۔ دوسرے گنجے بنگالی نے ایک تھیلی اسٹیمر کے اوپر اچھال دی۔ اس میں پانچ سو کے نوٹ تھے۔ اسٹیمر والے سیلر نے تھیلی میں سے نوٹ نکال کر گنے اور کہا۔ "چلو بھاگ جاؤ یہاں سے۔"

اس کے ساتھ ہی اسٹیمر پیچھے ہٹنے لگا۔ یہ ساری گفتگو بنگلہ میں ہوئی تھی جو شبانہ کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ ترپال کے نیچے پسینے میں شرابور سہمی ہوئی بیٹھی یہ آوازیں سن رہی تھی۔ جب اسٹیمر دور چلا گیا تو گنجے بنگالی نے چھت کے نیچے آکر شبانہ کے اوپر سے ترپال ہٹا دی اور کہا "بیٹی وہ چلے گئے ہیں خدا کا شکر ادا کرو۔ انڈین فوجی تھے میں نے کہا بھائی ہم مچھیرے ہیں مچھلیاں پکڑنے جا رہے ہیں۔"

شبانہ کو اس کی بات کا یقین آگیا تھا۔ اس نے بھی گہرا سانس بھرتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور دھوتی کے پلو سے اپنی گردن اور چہرے کا پسینہ پونچھنے لگی۔

اس نے گنجے بنگالی سے پوچھا "انکل! ہم نیپال کس وقت پہنچیں گے؟"

اس پر وہ بولا "یہ دریا ہمیں صبح ایک گاؤں پہنچا دے گا جہاں سے نیپال کی سرحد دس پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ چھوٹے سے چھوٹا راستہ ہے ہم کل دوپہر تک نیپال کی سرحد پار کرلیں گے اب تم آرام کرو۔ آگے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

شبانہ وہیں لکڑی کے فرش پر لیٹ گئی۔ کشتی ایک بار پھر دریا کے بہاؤ پر چل نکلی۔ شبانہ کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی وہ سونا چاہتی تھی لیکن وہ دو راتوں سے سوئی نہیں تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اسے کچھ اطمینان بھی ہو گیا تھا۔ آنکھیں بند کرتے ہی وہ نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو دن کی دھندلی روشنی کشتی میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے اٹھ کر دیکھا

آسمان پر کالی گھٹا چھا رہی تھی اور دریا کا پاٹ چھوٹا ہو گیا تھا۔ کشتی ایک ایسے ٹاپو سے گزر رہی تھی جس میں لمبے لمبے سرکنڈے اگے ہوئے تھے۔

پہلے والا بنگالی شبانہ کے پاس آگیا اور بولا "اچھا ہوا تم نے تھوڑی سی نیند لے لی۔ ہمیں دریا میں ایک بڑا لمبا راستہ طے کرنا پڑا ہے۔ انڈین فوج دریا میں گشت لگا رہی تھی لیکن اب ہم محفوظ علاقے میں ہیں۔ یہاں زیادہ خطرہ نہیں ہے۔ میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔"

دوسرا بنگالی بھی آگیا اس نے بھی شبانہ کو تسلی دی اور کہا کہ چونکہ انہیں دریا میں ایک لمبا راستہ طے کرنا پڑا ہے اس لیے اب وہ تیسرے پہر نیپال کی سرحد والے گاؤں میں پہنچیں گے۔

شبانہ خاموش رہی وہ کیا بات کرتی بس دل میں خدا سے دعا مانگ رہی تھی کہ وہ اس کی عزت کی حفاظت کرے۔ اسے چاول اور مچھلی کھانے کو دی گئی۔ چاول ٹھنڈے اور موٹے تھے۔ شبانہ نے وہی زہر مار کیے اور چپکی ہو کر کشتی میں بیٹھی رہی۔ کشتی سرکنڈوں کے بیچ میں سے ہو کر جا رہی تھی۔ اس کی رفتار بہت سست تھی۔ بادلوں میں ہلکی ہلکی سی گرج پیدا ہوئی اور پھر بوندا باندی شروع ہو گئی۔ فضا میں خنکی بڑھ گئی شبانہ نے دھوتی اپنے شانوں کے گرد لپیٹ لی۔

کافی دیر تک کشتی اونچے اونچے سرکنڈوں کے بیچ میں سے گزرتی رہی آخر وہ ایک جگہ کنارے پر پہنچ کر رک گئی۔ بوندا باندی نے اب بارش کی شکل اختیار کرلی تھی۔ دونوں بنگالی کشتی سے اتر کر کنارے پر چلے گئے اور کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے۔

پھر پہلے والا بنگالی شبانہ کے پاس کشتی کے اندر آکر بولا "بیٹی! آگے انڈین فوج کی چوکی ہے میرا دوست ان سے بات کرنے جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے تھوڑی بہت رشوت سے کام چل جائے اور انڈین فوجی ہمیں آگے جانے کی اجازت دے دیں تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے جب تک ہم تمہارے ساتھ ہیں تمہاری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ خدا سب ٹھیک کردے گا۔ تم کشتی میں ہی بیٹھی رہو۔ میں باہر درختوں کے نیچے پہرہ دیتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ کشتی کی چھت پر بارش کی بوندیں گرنے سے ہلکا ہلکا شور بلند ہو رہا تھا۔ شبانہ کو اپنی لاہور والی کوٹھی یاد آگئی۔ بارش میں وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس آکر کھڑی ہو جاتی اور باہر لان کے درختوں پر گرتی بارش کی آواز سنا کرتی تھی۔ پھر اسے نہر کے کنارے والی وہ کچی

کوٹھی یاد آ گئی جس کے عقب میں انگور کی بیل کے نیچے بیٹھ کر وہ اور راحیل چائے پیا کرتے تھے۔ اور بارش کی بوندیں انگور کے چوڑے پتوں پر گرتے ہوئے عجیب اداس موسیقی پیدا کرتی تھیں راحیل کو یاد کر کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ماں باپ کی وفات اور اپنی پیاری سہیلی نجمی کی جدائی کے بعد راحیل ہی ایک ایسی شخصیت تھی جس سے اسے محبت کی ہلکی ہلکی مہک آتی تھی۔ اب وہ بھی اس کے پاس نہیں تھا اور وہ اکیلی مصیبتوں میں گھر چکی تھی۔ کسی وقت اسے خیال آتا کہ یہ لوگ اس سے دھوکہ کر رہے ہیں اور وہ کسی خطرناک جال میں الجھائی جا رہی ہے۔ پھر خیال آتا کہ نہیں یہ لوگ ایسے نہیں ہیں۔ یہ شریف لوگ ہیں اور دل سے اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ شبانہ کے دماغ میں ایسے ہی متضاد خیالات سمندر کی لہروں کی طرح ابھر ابھر کر اس کی روح سے ٹکرا رہے تھے۔

بارش کا شور ہلکا پڑنے لگا اب پھر پہلے ایسی بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔ کشتی کے اندر بیٹھے بیٹھے شبانہ کو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا وہ چھت کی بانس کی محرابی دیوار کے پاس آ کر باہر دیکھنے لگی۔ سامنے ناریل، آم اور تاڑ کے درخت بارش میں بھیگ رہے تھے۔ وہ پیچھے ہٹ کر واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔ گیلی زمین پر کوئی تیز تیز قدم رکھتا کشتی کی طرف آیا۔ شبانہ ناریل کی ڈھیری کی اوٹ میں ہو گئی۔ یہ پہلے والا مسلمان بنگالی تھا اس نے آتے ہی کہا۔

"آؤ بیٹی باہر آ جاؤ۔ ہم جنگل سے گزر کر آگے جائیں گے۔" باہر دوسرا گنجا بنگالی بھی بارش میں چھاتا لگائے کھڑا تھا۔ چھاتا اس نے شبانہ کو دے دیا اور وہ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ زمین گیلی تھی مگر گھاس کی وجہ سے کیچڑ کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ بارش کی پھواروں میں انھوں نے درختوں کا ایک قطعہ پار کیا اور ڈھلان سے اتر کر ایک پگڈنڈی پر چلنے لگے جس کی ایک جانب دھان کے کھیت تھے اور دوسری جانب اونچے اونچے درخت کھڑے تھے۔ کافی دور تک وہ چلتے گئے۔ دھان کے کھیت ختم ہو گئے۔

پھر ویران علاقہ آ گیا۔ یہاں درخت اور کھیت نہیں تھے۔ صرف جنگلی جھاڑیاں ہی ادھر ادھر پھیلی ہوئی تھیں۔ شبانہ کو یہاں ایک عجیب قسم کا سناٹا چھایا ہوا محسوس ہوا۔

گنجے بنگالی نے کہا "یہاں سے جتنی تیز چل سکتی ہو چلو۔ دشمن کا خطرہ ہے۔"

شبانہ بھی ان کے ساتھ تیز تیز چلنے لگی پھر انھوں نے دوڑ کر جھاڑیوں والا علاقہ پار کر لیا۔ دوسری جانب دوبارہ دھان کے کھیت شروع ہو گئے تھے۔ یہاں شبانہ نے خاردار تاروں والی باڑھ دیکھی جو دھان کے کھیتوں کے درمیان سے گزرتی دوسری جانب جا رہی تھی۔

شبانہ کو معلوم نہیں تھا وہ مشرقی پاکستان کی سرحد عبور کر کے ہندوستان میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ دونوں بنگالی جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر رہے تھے اصل میں ہندو تھے۔ اور انھوں نے شبانہ کو ایک ہندو بنگالی کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ جو تھوڑے فاصلے پر ایک جھونپڑی میں بیٹھا شبانہ کا انتظار کر رہا تھا۔ گنجا بنگالی اس سے معاملہ طے کرنے ہی گیا ہوا تھا۔ بوندا باندی اسی طرح ہو رہی تھی۔ شبانہ چھتری لگائے دونوں ہندو بنگالیوں کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ وہ گھنے درختوں کے نیچے آ گئے۔ یہاں ایک جھونپڑی تھی جس کی چھت ناریل کی شاخیں ڈال کر بنائی گئی تھی۔ جھونپڑی خالی تھی۔ زمین پر درختوں کے خشک پتے بچھے ہوئے تھے۔

گنجے بنگالی نے شبانہ سے کہا "بیٹی تم یہاں بیٹھو ہم ابھی آتے ہیں۔"

شبانہ خاموشی سے خشک پتوں کے فرش پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ دونوں باہر نکل گئے جھونپڑی کی چھت ایک جگہ سے ٹپک رہی تھی۔ دس پندرہ منٹ گزرے تو جھونپڑی میں ایک موٹی توند والا کالا کلوٹا بنگالی اندر داخل ہوا اس نے بنیان اور دھوتی پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کانسی کا گلاس تھا۔ بڑی شفقت سے بولا۔

"یہ چائے پی لو بیٹی تمھیں ٹھنڈ لگ رہی ہو گی یہاں چائے نہ پی جائے تو بخار چڑھ جاتا ہے۔"

شبانہ نے کانسی کا گلاس لے لیا۔ گلاس میں چائے گرم تھی۔ یہ کوئی نیا آدمی تھا۔ شبانہ نے سوچا اس کے ہمدرد دوستوں کا ہی ساتھی ہو گا۔ چائے تیز تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چائے پینے لگی۔ گرم چائے نے اس کے اعصاب کو کافی سکون بخشا۔ تھوڑی دیر میں ہی اس نے گلاس خالی کر دیا۔ دوسرے لمحے اس کا سر چکرانے لگا۔ شبانہ نے ہاتھ سے اپنا ماتھا دبایا۔ چکر زیادہ آنے لگے اب اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھی تو لڑکھڑا کر گر پڑی۔ اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ شبانہ کو بیہوش ہوئے دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ جھونپڑی میں وہی کالا کلوٹا ہندو داخل ہوا۔ اب اس کے ہاتھ میں

ایک لالٹین تھی۔ لالٹین کی روشنی میں اس نے جھک کر شبانہ کو دیکھا۔ اسے ہلایا جلایا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ بے ہوش ہو چکی ہے تو باہر نکل گیا۔ دوسرے لمحے وہ چار آدمیوں کو لے کر آیا۔ بے ہوش شبانہ کو اٹھا کر ایک چارپائی پر ڈالا اور جھونپڑی کے پیچھے ٹیکری کے پاس چھوٹے سے کچے راستے میں لا کر رکھ دیا۔ ایک آدمی لالٹین لے کر ٹیکری کے اوپر چڑھ گیا اور اسے زور زور سے ہلانے لگا۔

دور سے کسی جیپ کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور پھر ایک پرانی کھٹارہ سی جیپ جو ترپال سے ڈھکی ہوئی تھی وہاں آ کر رک گئی موٹے ہندو بنگالی نے ڈرائیور سے کوئی بات کی۔ شبانہ کو جیپ میں ڈال کر اوپر ترپال ڈالی۔ خود ڈرائیور کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جیپ شام کی بڑھتی پھیلتی سرمگیں فضاؤں اور گرتی بارش میں جنگل میں ایک طرف روانہ ہو گئی۔

شام ہو چکی تھی جب جیپ دریا کے ایک ویران سے گھاٹ پر پہنچ کر رک گئی۔ یہاں ایک بہت بڑی کشتی پہلے سے تیار کھڑی تھی۔ جیپ کو اس کشتی میں اتار دیا گیا اور کشتی دریا میں چل پڑی دریا پار کرنے کے بعد جیپ ایک بار پھر جنگل کے راستے پر روانہ ہو گئی۔ یہ مہا کھالی کا بھارتی علاقہ تھا۔ جیپ جنگل سے نکل کر ایک سڑک پر دوڑی جا رہی تھی۔ یہاں راستے میں ایک بھارتی فوجی کانوائے ملا جس کے ٹرکوں میں سامان لدا ہوا تھا۔ اور جو باریسال سے لوٹا ہوا سامان لاد کر کلکتے کی طرف جا رہا تھا۔ ساری رات جیپ جنگل سے نکل کر قصبوں اور گاؤں کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ شبانہ جیپ کے اندر ترپال کے نیچے بے ہوش پڑی تھی۔ ابھی صبح نہیں ہوئی تھی کہ جیپ ایک جگہ کھیتوں کے پاس پرانی بارک کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی۔ یہاں موٹے ہندو بنگالی نے شبانہ کو دوسرے ٹرک میں ڈالا اور اسی وقت آگے روانہ ہو گیا۔ اس کی منزل کلکتہ سے پچاس میل ادھر اشوا گھاٹی کا گاؤں تھا۔ جہاں اسے "شبانہ کو" ایک ہندو بردہ فروش کے پاس فروخت کرنا تھا۔ وہ اس سے پہلے ڈھاکہ سے اغواء کی ہوئی چھ سات لڑکیوں کو یہاں لا کر چار چار ہزار روپے میں فروخت کر چکا تھا۔ اب پو پھٹنے لگی تھی اور صبح کاذب کی جھلکیاں ظاہر ہو رہی تھیں۔ بارش رک گئی تھی مگر آسمان پر بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے۔ جنگل کا علاقہ ختم ہو گیا تھا۔ اب چاروں طرف دھان اور پٹ سن کے کھیت ہی کھیت تھے۔ ان کے درمیان کہیں کہیں ناریل اور تاڑ کے چھریرے درختوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا۔ تھا۔ موٹا ہندو بنگالی اپنے ساتھی ڈرائیور کے پاس ہی بیٹھا اسے گاڑی تیز

چلانے کی بار بار ہدایت کر رہا تھا۔ اشوا گھاٹ گاؤں جب تیس میل دور رہ گیا تو دن کی پھیکی پھیکی ابر آلود روشنی چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ ٹرک درختوں میں گھری ہوئی پکی سڑک پر بھاگا جا رہا تھا شبانہ کو آہستہ آہستہ ہوش آنے لگا تھا۔ ترپال کے نیچے پڑے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ آنکھوں کے سامنے گھپ اندھیرا تھا۔ وہ سمجھی کہ اسے کسی قبر میں دفن کر دیا گیا ہے۔ اس کا سانس گھٹ رہا تھا اور سر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ہلائے۔ یہ محسوس کر کے اسے خوشی ہوئی کہ وہ زندہ تھی اس نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ اس کے اوپر کوئی بھاری کپڑا ڈال دیا گیا ہے۔ اب اسے ٹرک کے انجن کی آواز سنائی دی۔ ہچکولوں سے وہ سمجھ گئی کہ اسے ٹرک میں لاد کر کہیں لے جایا جا رہا ہے۔ شبانہ نے ترپال ہٹا دی اور بھاری ترپال کو اُٹھایا۔ اس کی گردن جیسے اکڑ گئی تھی اس نے دیکھا کہ وہ ٹرک میں پڑی ہے اور ٹرک سڑک پر پوری رفتار سے جا رہا ہے۔ ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اسے چائے میں بے ہوشی کی دوا پلائی گئی تھی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ جو لوگ اسے لائے تھے ان کی نیت خراب تھی اور اسے یقیناً کسی دلدل میں گرانے کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ ٹرک تیز رفتاری سے جا رہا تھا وہ چھلانگ نہیں لگا سکتی تھی۔ اچانک ٹرک کو ایک دھچکا لگا اور ایک دم بریک لگا دی گئی۔ ٹرک رک گیا۔

شبانہ کو آدمیوں کے زور زور سے باتیں کرنے اور ٹرک سے اترنے کی آواز سنائی دی۔ وہ جلدی سے لیٹ گئی اور اس نے ترپال اسی طرح اپنے اوپر کر لی۔

موٹا بنگالی ہندو چلا رہا تھا "سالے تم نے پہلے انجن کو چیک کیوں نہیں کیا۔ میں اشوا گھاٹ ٹائم پر نہ پہنچا تو وہ آدمی کلکتے چلا جائے گا۔ میں روپیہ تمہارے باپ سے لوں گا۔؟"

دوسری آواز ڈرائیور کی تھی وہ کہہ رہا تھا "سیٹھ ابھی ٹرک چالو کرتا ہوں تم فکر نہ کرو۔"

شبانہ کو ٹرک کا بونٹ اوپر اٹھانے کی آواز آئی پھر کوئی ٹرک کے اندر چڑھ آیا۔ کسی نے اس کے منہ پر سے ترپال ہٹا دی۔ شبانہ نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ جیسے وہ بے ہوش ہو۔ موٹا ہندو بنگالی شبانہ کو غور سے دیکھ کر اپنے آپ ہی بولا "سالی خوبصورت بھی ہے چار ہزار تھوڑی رقم ہے اس کے مجھے سات ہزار سے کم نہیں لینے چاہئیں۔"

پھر اس نے شبانہ کے منہ پر ترپال ڈال دی اور وہیں سے چیخ کر ڈرائیور سے کہا "سالے جلدی

ٹھیک کر لے۔ لڑکی کو ہوش آ گیا تو مصیبت پڑ جائے گی۔"

اب ہر شے صاف ہو گئی تھی۔ شبانہ کو جس بات کا خدشہ تھا وہ صحیح نکلا تھا اسے فروخت کرنے کے لیے اشوا گھاٹ لے جایا جا رہا تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ کلکتہ شہر اشوا گھاٹ کے قریب ہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ٹرک ایک بار پھر آگے چل پڑا۔ شبانہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ راستے میں جہاں بھی ممکن ہوگا وہ ٹرک سے کود کر کھیتوں میں بھاگ جائے گی اور کلکتہ پہنچنے کی کوشش کرے گی۔ وہ پڑھی لکھی لڑکی تھی اور جانتی تھی کہ کلکتے میں بنگالی اور غیر بنگالی مسلمان بھاری تعداد میں رہتے ہیں۔ وہ کسی مسلمان گھرانے میں پناہ حاصل کرے گی۔ شبانہ کے پاس انڈین کرنسی کا ایک روپیہ تک نہیں تھا لیکن اسے یقین تھا کہ خدا اس کی مدد کرے گا اور وہ کسی نہ کسی طرح کلکتے پہنچ جائے گی۔

سڑک پکی اور کشادہ ہو گئی تھی۔ کبھی درختوں کے جھنڈ آ جاتے اور کبھی دونوں جانب دھان اور پٹ سن کے کھیت گہرے بادلوں کی پھیکی روشنی میں لہلہاتے دکھائی دیتے۔ شبانہ ترپال سے نکل کر ٹرک کے عقبی کنارے کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی اور چھلانگ لگانے کے لیے مناسب موقع کا انتظار کر رہی تھی۔ سامنے سے ایک فوجی ٹرک آ گیا۔ شبانہ والے ٹرک کی رفتار دھیمی ہو گئی۔ خوش قسمتی سے یہاں سڑک موڑ بھی کاٹتی تھی۔ جونہی ٹرک نے موڑ کاٹا شبانہ ٹرک سے سڑک کے کنارے والی جھاڑیوں میں کود گئی۔ وہ گھنی شاخوں میں گری اور وہیں دبک کر بیٹھی رہی۔ پھر اس نے جھاڑیوں میں سے سر نکال کر دیکھا اس کا ٹرک دور سڑک پر جا رہا تھا۔ یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں تھا اس کے فرار کا علم ہو جانے پر بردہ فروش ہندو بنگالی اس کی تلاش میں واپس آ سکتا تھا۔ شبانہ کو گرتے سمے کوئی چوٹ نہیں لگی تھی جھاڑیوں نے اسے بچا لیا تھا۔ جب ٹرک سڑک پر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو شبانہ نے جھاڑیوں سے نکل کر سڑک کے متوازی دھان کے کھیتوں میں چلنا شروع کر دیا۔ بارش کی وجہ سے پگڈنڈی گیلی تھی۔ شبانہ نے ساڑھی باندھ رکھی تھی جو دھوتی اسے دی گئی تھی اس کا پلو اس نے سر کے اوپر ڈال لیا تھا۔ وہ ایک ایسے علاقے میں آ گئی تھی جو اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ وہ صرف اندازے سے مغرب کی طرف چلی جا رہی تھی جس طرف اس کے قیاس کے مطابق کلکتہ شہر تھا۔

کھیتوں سے نکل کر وہ ایک میدان میں آ گئی جہاں جنگلی گھاس اگی تھی۔ دور سے ٹیلیفون کے کھمبے نظر آئے۔ شبانہ ان کھمبوں کی طرف چل پڑی۔ وہ تین چار جھونپڑیوں کے قریب سے گزری وہاں کچھ بچے مٹی میں کھیل رہے تھے۔ شبانہ خاموشی سے آگے نکل گئی۔ میدان ختم ہو گیا۔ سامنے ایک پگڈنڈی تھی جو درختوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ شبانہ پگڈنڈی پر آ گئی۔ جب وہ چلتے چلتے ٹیلیفون کے کھمبوں کے پاس آئی تو اس نے دیکھا کہ چند قدموں کے فاصلے پر ایک چھوٹی پکی سڑک پورب سے پچھم کی طرف جاتی ہے۔ شبانہ اس سڑک پر آ گئی۔ وہ سڑک سے اتر کر کنارے کی جھاڑیوں کی اوٹ لے کر آگے بڑھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ایک ٹرک جس پر مال لدا ہوا تھا سڑک پر سے گزر گیا۔ شبانہ اسے دور ہی سے دیکھ کر جھاڑیوں کے نیچے بیٹھ گئی۔ چلتے چلتے وہ تھک گئی اسے پیاس لگ رہی تھی۔ پانی وہاں کہیں نہیں تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے تالاب کے قریب سے گزری۔ تالاب کی سطح پر کائی جمی ہوئی تھی۔ تالاب کا پانی پینے کو اس کا دل نہ چاہا۔ وہ وہاں سے گزر گئی۔ ایک درخت کے نیچے وہ سستانے کو بیٹھ گئی وہ تھک گئی تھی۔ آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جب اس کی تکان کسی حد تک دور ہو گئی تو وہ اٹھی اور دوبارہ چل پڑی۔ دائیں جانب اسے جھگیوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں نظر آیا۔ دس پندرہ جھونپڑیاں تھیں۔ باہر ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ ایک عورت چولہے میں آگ جلائے کچھ پکا رہی تھی وہاں مرد کوئی نہیں تھا۔ شبانہ اس عورت کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ وہ بنگالی نہیں بول سکتی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ منہ کے ساتھ لگا کر کہا "پانی"۔

بنگالی عورت نے مسکرا کر شبانہ کی طرف دیکھا اور جھونپڑی کے اندر جا کر اس کے لیے ناریل کے پیالے میں پانی لے آئی۔ شبانہ نے پانی پی کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

عورت نے بنگلہ میں کچھ پوچھا شبانہ نے کہا "بنگلہ نہیں ہندوستانی۔"

بنگالی عورت نے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔

شبانہ نے کہا "میں بہاری ہوں۔ میرا آدمی چھوڑ کر چلا گیا ہے کلکتہ جا رہی ہوں۔"

بنگالی عورت نے تعجب سے شبانہ پر نگاہ ڈالی اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں بتایا کہ کلکتہ یہاں سے بہت دور ہے۔ اس بنگالی عورت کی زبانی شبانہ کو معلوم ہوا کہ آگے دو میل کے فاصلے پر بردوالی اسٹیشن ہے جہاں سے اسے کلکتہ جانے والی ریل مل جائے گی۔

اس بنگالی عورت نے شبانہ کو تھوڑی سی کھچڑی دی جسے شبانہ نے جلدی جلدی کھا لیا۔ پانی پیا اور آگے روانہ ہو گئی۔ مزید دو میل کی مسافت طے کرتے ہوئے شبانہ تھکن سے چور ہو گئی۔ ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کا سگنل اور ڈھلانی چھت اسے سامنے نظر آ رہی تھی۔ اس کے پاس ریل کا کرایہ نہیں تھا لیکن اسے ہر حالت میں کلکتے پہنچنا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کلکتہ ایک بڑا شہر ہے اور وہاں اسے کسی نہ کسی مسلمان گھرانے میں ضرور پناہ مل جائے گی۔

اس نے بغیر ٹکٹ کے سفر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسٹیشن کا ایک ہی پلیٹ فارم تھا۔ کچھ دیہاتی قسم کے مسافر سامان کی گٹھڑیاں سنبھالے ادھر اُدھر بیٹھے تھے۔ شبانہ بھی ایک درخت کے ساتھ لگ کر فرش پہ بیٹھ گئی۔ ایک گھنٹے بعد ٹرین آ کر رک گئی۔ اس کے اوپر انگریزی اور بنگلہ زبانوں میں "سیالدہ پسنجر ٹرین" لکھا تھا۔ یہ ٹرین کلکتے ہی جا رہی تھی۔ شبانہ عورتوں کے ایک تھرڈ کلاس کے ڈبے میں دوسری مسافر عورتوں کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ ڈبے میں کافی رش تھا۔ کسی نے شبانہ کی طرف خاص توجہ نہ کی۔ انجن نے سیٹی دی اور ٹرین اپنے سفر پہ روانہ ہو گئی۔

ریل گاڑی ہرے بھرے کھیتوں میں فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھی۔

شبانہ کو یہی دھڑکا لگا تھا کہ اگر ٹکٹ چیک کرنے والا ڈبے میں آ گیا تو وہ اسے کیا کہے گی۔ یہ پسنجر ٹرین تھی اور سارا دن کوئی ٹکٹ چیکر نہ آیا۔ ڈبے میں دیہاتی بنگالی عورتیں سوار تھیں۔ شبانہ نے انھیں بھی یہی کہانی سنائی کہ وہ بہار کی رہنے والی ہے اپنے آدمی کے ساتھ بھدرا والی آئی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے اب وہ اس کی تلاش میں کلکتہ جا رہی ہے اور وہ بنگلہ نہیں جانتی۔ عورتوں نے اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور اسے دوپہر کو چاول مچھلی بھی کھلائی۔ شبانہ نے انھیں یہ بھی بتا دیا کہ اسکے پاس ٹکٹ کے پیسے نہیں تھے۔ عورتوں نے کہا کہ تم فکر نہ کرو ٹکٹ والا بابو آئے گا تو ہم اسے سنبھال لیں گے۔ ٹرین جس وقت کلکتہ کے اسٹیشن سیالدہ پہنچی تو شام ہو چکی تھی اور اسٹیشن بجلی کی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔۔۔ پلیٹ فارم پر کافی رش تھا۔ شبانہ زندگی میں پہلی بار کلکتہ آئی تھی۔ اس کی ساتھی عورتوں میں سے ایک ادھیڑ عمر بنگالی عورت بھی تھی۔ جس کو ٹرین میں سب عورتیں بڑی دیدی کہہ کر پکارتی رہی تھیں۔ ٹرین سے نکل کر شبانہ ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ بڑی دیدی اس کے پاس آئی اور بڑی شفقت سے پوچھا کہ وہ اپنے خاوند سے ملنے کہاں جائے گی۔ شبانہ کیا جواب دیتی۔ اسے اتنے بڑے شہر میں اکیلے ہونے کی وجہ سے خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کہاں جائے گی؟ اس کے پاس کوئی پیسہ بھی نہیں ہے۔ اس نے بڑی دیدی کو اپنے دل کا حال بتا دیا اور کہا کہ اسے ڈھاکہ سے کچھ لوگ اغوا کر کے لائے تھے کہ موقع پا کر وہ جنگل میں فرار ہو گئی۔

بڑی دیدی نے شبانہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولی "بیٹی! پریشان مت ہو۔ میرے ساتھ چلو رات میرے ہاں گزارو۔ کل تمھارا کوئی بندوبست کر دوں گی۔"

شبانہ اس ادھیڑ عمر بنگالن "بڑی دیدی" کے ساتھ چل دی۔ اس عورت کا مکان دریائے ہگلی کے پار ایک گندی بستی میں تھا۔ یہ دو تنگ کوٹھڑیوں پر مشتمل ایک کوارٹر تھا۔ بڑی دیدی نے شبانہ کا بستر ایک کوٹھڑی میں لگا دیا۔ یہ عورت ہندو تھی۔ دیوار پر کالی ماتا کی تصویر لگی تھی۔ شبانہ کو ڈر لگ رہا تھا لیکن رات سر پر آچکی تھی۔ شہر میں اس کا کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ اس نے یہی سوچا کہ کسی طرح رات یہاں گزار دے۔ دوسرے دن وہ یہاں سے پاکستانی سفارتخانے پہنچنے کی کوشش کرے گی یا کسی دردمند مسلمان کے گھر میں پناہ لے لے گی۔ بڑی دیدی نے شبانہ کو کھانا کھلایا اور کوٹھری میں آکر کہنے لگی۔

"میرا بیٹا درگاپور میں ایک کارخانے میں کام کرتا ہے وہ اپنی پتنی کے ساتھ وہیں رہتا ہے۔ شاید وہ صبح آئے میں اس سے کہہ کر تمھارے پاکستان پہنچانے کا کوئی انتظام کر دوں گی۔ یہاں میرے بیٹے کے جاننے والے بہت ہیں۔ اب تم آرام سے سو جاؤ۔" بڑی دیدی نے بتی بجھا دی اور کوٹھڑی سے نکل گئی۔ شبانہ نے اٹھ کر اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ بھیانک انقلاب نے اسے دیکھتے دیکھتے کہاں سے کہاں لا پھینکا تھا۔ وہ چارپائی پر بیٹھ کر سوچنے لگی کہ کیا اسے اس عورت کے بیٹے پر بھروسہ کرنا چاہیئے؟ نہیں یہ لوگ ہندو ہیں۔ انھیں اس سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ لوگ بھی اس کو کسی جگہ بیچ دیں۔ ابھی تک شبانہ اپنی عزت کو سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ وہ اپنے فیصلے پر قائم رہی کہ دن نکلتے ہی یہاں سے شہر کی طرف بھاگ جائے گی۔

اس فیصلے کے بعد اس کے دل کو کچھ اطمینان سا ہو گیا اور وہ چارپائی پر لیٹ گئی۔ چادر اوپر کر لی اور آنکھیں بند کر کے سوچنے لگی کہ نہ جانے اس کی طرح کتنی معصوم لڑکیاں اغوا ہونے کے بعد فروخت کر دی گئی ہوں گی۔ پھر آہستہ آہستہ اسے نیند آنے لگی اور وہ سو گئی۔ وہ ساری رات گہری نیند سوتی رہی۔ اس کی آنکھ کھلی تو کوٹھری میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ شبانہ نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر بڑی دیدی چائے کا گلاس لیے کھڑی تھی اور باہر کوارٹر کے چھوٹے سے دالان کے کمرے میں ایک بوڑھی عورت بیٹھی برتن مانجھ رہی تھی۔

"لو بیٹی چائے پی لو۔ میں نے بیٹے کو پیغام پہنچا دیا ہے۔ وہ آج کسی وقت آجائے گا۔ پھر تم واپس پاکستان چلی جانا۔"

شبانہ کو یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اتنی جلدی اس جہنم سے نکل جائے گی۔ اسے بڑی دیدی پر بھی

زیادہ بھروسہ نہیں تھا۔ اس نے گلاس لے لیا اور چارپائی پر بیٹھ کر چائے پینے لگی۔ بڑی دیدی اندر آگئی اور شبانہ کے پاس چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"بیٹی! جب تک میرا لڑکا نہیں آجاتا تم یہاں سے باہر مت نکلنا۔ اگر کسی کو یہاں پتہ چل گیا کہ تم ڈھاکہ سے آئی ہو تو وہ پولیس کو خبر کر دیں گے میں کچھ ترکاری لینے جا رہی ہوں تم کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے اندر ہی رہنا۔"

شبانہ نے آہستہ سے سر ہلایا۔ بڑی دیدی شبانہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر چلی گئی۔ شبانہ اٹھ کر دروازہ بند کرنے لگی تو بڑی دیدی کوارٹر کے دروازے سے نکل کر گلی میں جا رہی تھی۔ بوڑھی عورت کمرے میں بیٹھی اسی طرح برتن دھو رہی تھی۔ شبانہ دروازہ بند کر کے چارپائی پر بیٹھ کر چائے پینے لگی۔ اسے اس بڑی دیدی کی باتوں سے خطرے کی بو آنے لگی تھی۔ ابھی اس نے چائے کے دو تین گھونٹ ہی پیئے تھے کہ کوٹھڑی کا دروازہ کھلا۔ سامنے برتن دھونے والی بوڑھی عورت کھڑی ساڑھی کے پلو سے ہاتھ پونچھ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر دالان میں ڈالی اور پھر شبانہ کے قریب آکر ٹوٹی پھوٹی ہندی زبان میں بولی۔

"یہاں سے جتنی جلدی ہو بھاگ جاؤ۔ یہ عورت تمھیں اپنے بیٹے سے مل کر کسی دلال کے پاس بیچنے والی ہے ابھی وقت ہے بھاگ جاؤ۔" اتنا کہہ کر بوڑھی عورت واپس کمرے میں جا کر بیٹھ گئی اور برتن صاف کرنے لگی شبانہ کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج گئی تھی۔ اسے پہلے ہی بڑی دیدی پر شک تھا اب یہ شک یقین میں بدل گیا۔ اس نے چائے کا گلاس وہیں رکھا۔ ساڑھی کو جسم کے گرد اچھی طرح سے لپیٹا اور کوٹھڑی سے نکل کر دالان میں آئی اور پھر کوارٹر کا دروازہ کھول کر باہر گلی میں آگئی۔ اس نے تیز تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا۔ وہ جتنی تیزی سے چل سکتی تھی چلتی ہوئی گلی عبور کر کے بازار میں آگئی۔ دن کافی نکل آیا تھا۔ اگرچہ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بارش نہیں ہو رہی تھی۔ گوالے سائیکلوں پر دودھ لے کر جا رہے تھے۔ ایک رکشا قریب سے گزر گیا وہ خالی تھا۔ مگر شبانہ کے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہ سڑک کے کنارے تیز تیز چلتی رہی۔ بازار ختم ہوا تو سامنے ایک نالے کا پل آگیا۔ وہ پل پر سے بھی گزر گئی۔ آگے ایک کشادہ پکی سڑک تھی جس پر موٹر گاڑیاں، رکشے وغیرہ آجا رہے تھے۔ ایک جانب ڈھلانی میدان تھا۔ دوسری جانب کارخانوں کی اونچی اونچی چمنیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ یہاں پہنچ کر شبانہ نے

اپنی رفتار کم کرلی اور عام عورتوں کی طرح چلنے لگی۔ جیسے بازار سودا سلف خریدنے جا رہی ہو۔ وہ دل ہی دل میں اس بوڑھی عورت کا شکریہ ادا کر رہی تھی جس نے عین وقت پر اسے ایک بہت بڑے جہنم میں گرنے سے بچا لیا تھا۔ کارخانوں کے بیچ میں سے ایک چھوٹی سڑک جاتی تھی۔ شبانہ اس سڑک پر آ گئی۔ یہاں وہ پھر تیز چلنے لگی۔ کیونکہ یہاں اِکّا دُکّا لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔ چونکہ اس نے ساڑھی پہن رکھی تھی اور سر کو چادر نما دھوتی سے ڈھانپ رکھا تھا اس لیے کسی نے اس کی طرف خاص طور پر دھیان نہ دیا۔ کارخانوں کے درمیان والا راستہ شبانہ کو ایک اور سڑک پر لے آیا۔ جہاں ایک بس اسٹاپ پر بس کھڑی تھی مسافر سوار ہو رہے تھے۔ شبانہ بھی اس میں سوار ہو گئی۔ بس چل پڑی۔ ٹکٹ چیکر اس کے پاس آیا تو شبانہ نے ہندو عورتوں کی طرح ہاتھ جوڑ کر اسے عاجزی سے کہا کہ میں غریب ہوں میرا آدمی مجھے چھوڑ گیا ہے۔ میرے پاس کرائے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ ٹکٹ چیکر نے ترش روئی سے کہا اگلے اسٹاپ پر اُتر جانا۔

اگلا اسٹاپ کافی دور تھا شبانہ نے یہی غنیمت جانا۔ کم از کم وہ شدید خطرے کے علاقے سے نکل آئی تھی۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر کسی پولیس والے کو پتہ چل گیا کہ وہ ڈھاکہ سے بھاگ کر غیر قانونی طور پر انڈیا میں داخل ہوئی ہے تو وہ اسے تھانے لے جائے گا اور پھر اس کے ساتھ جو حشر ہو گا وہ اس سے اچھی طرح واقف تھی۔ یہ لمبا روٹ تھا بس بڑی سڑک پر کافی دیر تک دوڑتی رہی۔ پھر ایک بارونق اور اونچی عمارتوں والے علاقے میں داخل ہو کر ایک اسٹاپ پر رک گئی۔ شبانہ وہیں اتر گئی اور ایک کھلی گلی میں داخل ہو گئی جہاں لڑکے فٹ بال کھیل رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ شبانہ کو کسی جگہ پناہ لینے کی ضرورت تھی۔ اس کا زیادہ دیر تک شہر کی سڑکوں پر چلتے رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ وہ سی آئی ڈی یا پولیس والوں کی نظروں میں آ سکتی تھی۔ اگرچہ اس نے بنگالی عورتوں کی طرح سوتی ساڑھی پہن رکھی تھی مگر اس کا رنگ گورا تھا اور وہ بنگالی عورت نہیں لگتی تھی۔

شبانہ ایک مکان کے پاس جا کر رک گئی۔ اس مکان کے دروازے پر ایک مسلمان وکیل کے نام کی تختی لگی تھی۔ شبانہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اسی گھر میں اسے پناہ مل سکتی ہے اس نے بغیر کچھ سوچے سمجھے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ سانولی رنگت درمیانے قد کے ایک باریش بزرگ نے دروازہ کھولا۔ چہرے پر نورانی چمک تھی اور ماتھے پر نشان تھا۔ انھوں نے غور سے شبانہ کی طرف دیکھا اور بنگلہ میں پوچھا کہ وہ کون ہے شبانہ نے اردو میں کہا کہ میں بنگالی زبان نہیں بول سکتی۔ بزرگ نے اردو میں پوچھا کہ وہ کون ہے

اور کس سے ملنا چاہتی ہے۔

شبانہ نے کہا "انکل! میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ مصیبت کی ماری ہوں مسلمان ہوں۔ کیا یہاں مجھے کوئی کام مل جائے گا۔"

بزرگ بولے "بیٹی اندر آ جاؤ۔"

کمرے میں فرش پر پٹ سن کی دری بچھی تھی۔ کونے میں پلنگ کے پاس پیچوان پڑا تھا میز پر کچھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ دیوار پر کعبہ شریف کی تصویر فریم میں لگی لٹک رہی تھی۔ بزرگ نے شبانہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بیٹھو بیٹی! میں تمھارے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔"

شبانہ ایک کرسی پر سمٹ کر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کہ وہ اس بزرگ کو اپنی داستان الم سنا دے یا خاموش رہے۔ بزرگ واپس آئے تو ایک انھی کی عمر کی ایک باوقار چہرے والی عورت بھی ان کے ساتھ تھی جس نے ہاتھ میں تھالی اٹھا رکھی تھی۔ تھالی میں چاول اور تھوڑی سی ترکاری تھی۔ تھالی شبانہ کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے عورت نے پوچھا "تم کون ہو شکل سے تم نوکرانی نہیں لگتی ہو۔"

شبانہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "مصیبت کی ماری ہوں جی۔ خاوند چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ بہار کی رہنے والی ہوں۔ بے سہارا ہوں کوئی کام مل جائے تو آپ کو دعائیں دوں گی۔"

عورت بولی "ہمارے ہاں پہلے ہی ایک نوکرانی کام کرتی ہے تم کھانا کھا لو اور کسی دوسرے گھر میں کام تلاش کرو۔"

عورت چلی گئی۔ بزرگ پلنگ پر بیٹھ کر حقہ پینے لگے "کھانا کھاؤ بیٹی گھبراؤ نہیں اللہ مسبب الاسباب ہے۔ میں تمھیں کہیں نہ کہیں کام دلوا دوں گا۔"

شبانہ کو اس نیک دل بزرگ کی باتوں سے بڑا حوصلہ ہوا۔ اگر وہ اس بزرگ کے آگے اپنا دل کھول کر رکھ دے تو یہ اس کی مدد کر سکتے ہیں۔ شبانہ کو بھوک نہیں لگی تھی وہ چائے پی کر کوارٹر سے بھاگی تھی۔ اور ابھی دن بھی زیادہ نہیں گزرا تھا۔ پھر بھی اس نے دو چار لقمے چاول کے لیے اور کہنے لگی "میں پڑھی لکھی بھی ہوں۔ تھوڑی انگریزی بھی جانتی ہوں۔ اگر کسی جگہ لکھنے پڑھنے کا کام مل جائے تو آپ کی

بڑی مہربانی ہوگی ۔"

بزرگ شبانہ کی طرف گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور آہستہ آہستہ حقہ پی رہے تھے ۔ انھوں نے کوئی جواب نہ دیا ۔ جب شبانہ نے تھالی میز پر پرے کر دی اور رومال سے ہاتھ صاف کرنے لگی تو بزرگ نے شبانہ کی طرف گھورتے ہوئے نرم آواز میں کہا " بیٹی ! مجھے لگتا ہے کہ تم بہاری نہیں بلکہ پنجابی ہو اور مشرقی پاکستان سے بھاگ کر آئی ہو ۔"

شبانہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ۔ بزرگ نے شبانہ کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا اور پدرانہ شفقت بھرے لہجے میں بولے " بیٹی روؤ نہیں ہم مسلمان بنگالیوں کے دل بھی مشرقی پاکستان کے المیے پر خون کے آنسو رو رہے ہیں ۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ تم یہاں کیسے پہنچیں اور تمھارے ماں باپ کہاں ہیں ؟ گھبراؤ نہیں مجھے اپنے باپ کی جگہ سمجھو ۔"

شبانہ نے ساڑھی کے پلّو سے آنسو پونچھتے ہوئے شروع سے آخر تک اپنی ساری داستانِ غم بیان کر دی ۔ بزرگ شبانہ کی مصیبت بھری کہانی کو غور سے سنتے رہے ۔ جب شبانہ چپ ہو گئی تو گہرا سانس بھر کر کہنے لگے " ہماری مسلمان بچیوں پہ ہندو بنگالیوں اور مکتی باہنی والوں نے بڑا ظلم کیا ہے ۔ اچھا ہوا کہ تم میرے پاس آ گئی ہو ۔ اگر سی آئی ڈی والوں کی تم پہ نظر پڑ جاتی تو خدا جانے تمھارے ساتھ کیا گزرتی ۔"

انھوں نے شبانہ کو تسلی دی اور کہا " میری بیوی تنگ مزاج عورت ہے طبیعت کی بھی سخت ہے شاید اسے تمھاری کہانی پہ یقین نہ آئے مگر میں تمھیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا ۔ میں تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں ۔"

شبانہ نے کہا " انکل ! میں آپ کو کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتی آپ مجھے کسی طرح پاکستان کی سرحد پہ پہنچا دیجیے ۔"

بزرگ نے کہا " بیٹی یہ کوئی آسان کام نہیں ہے سرحدوں پہ جنگ ہو رہی ہے ۔ میں کوئی دوسرا طریقہ نکالتا ہوں ۔ فی الحال میں تمھیں اپنی بیوہ بہن کے پاس لے جاتا ہوں وہ بڑی رحمدل خاتون ہے اسی محلّے کے ایک فلیٹ میں اکیلی رہتی ہے تم وہاں رہو ۔ اتنی دیر میں میں تمھارے پاکستان پہنچانے کی کوئی ترکیب سوچتا ہوں ۔"

اسی روز دوپہر سے پہلے پہلے اس بزرگ نے شبانہ کو اپنی بیوہ بہن کے ہاں پہنچا دیا ۔ اس نیک دل خاتون نے شبانہ کی روداد غم سنی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ اس نے شبانہ کو اپنے گلے سے لگا کر بہت پیار کیا اور حوصلہ دیا کہ خدا پہ بھروسہ رکھو ۔ وہ ضرور تمھیں تمھارے گھر والوں کے پاس پہنچا دے گا ۔ شبانہ وہاں رہنے لگی ۔ بیوہ خاتون نے اسے مکان سے باہر جانے سے منع کر رکھا تھا ۔ شفیق بزرگ شام کو آ کر شبانہ سے مل جاتے اور حوصلہ دیتے کہ وہ اس کے لیے کوشش کر رہے ہیں ۔ چوتھے دن شام کو بزرگ اپنی بیوہ بہن کے ہاں تشریف لائے تو شبانہ کو اپنے پاس بٹھا لیا ۔ بیوہ خاتون بھی چائے لے کر وہیں آ گئیں ۔ بزرگ کہنے لگے " بیٹی ! میں نے تمھارا بندوبست کر دیا ہے ۔ تمھیں کلکتے سے بحری جہاز میں سوار ہو کر رنگون جانا ہوگا رنگون میں میرا ایک دوست رہتا ہے وہ پھلوں کی تجارت کرتا ہے اور بڑا نیک دل مسلمان ہے میں نے اسے ٹیلیفون بھی کر دیا ہے اور اس کے نام ایک خط بھی تمھیں دوں گا ۔ تم رنگون پہنچو گی تو وہ بندرگاہ پہ تمھیں لینے آیا ہوگا ۔"

پھر بزرگ نے جیب سے اپنے رنگون والے دوست کی ایک پاسپورٹ سائز کی تصویر نکال کر دکھائی اور بولے " یہ میرا بچپن کا دوست ہے ۔ اس کا نام سید بہاء الدین ہے ۔ یہ بھی میری طرح بنگالی ہے ۔ بال بچوں کے ساتھ رنگون میں رہ رہا ہے ۔ وہ تمھیں رنگون سے کراچی جانے والے جہاز میں سوار کروا دے گا ۔"

شبانہ کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشخبری ہو سکتی تھی احسان مندی کے جذبے سے اس کی آنکھیں بھر آئیں ۔ دونوں نیک دل بہن بھائی نے شبانہ کو پیار کیا اور تسلّی دی کہ اب اسے کوئی فکر نہیں کرنا چاہیے ۔ انشاءاللہ وہ بہت جلد پاکستان اپنے گھر والوں کے پاس پہنچ جائے گی ۔ شبانہ کو معلوم تھا کہ رنگون جانے کے لیے پاسپورٹ کی ضرورت ہے ۔ جب اس نے پاسپورٹ کے بارے میں پوچھا تو بزرگ مسکراتے ہوئے کہنے لگے " بیٹی ! تمھارا پاسپورٹ بنانا ان حالات میں ایک ناممکن بات ہے ۔ لیکن تمھیں پاسپورٹ کی ضرورت نہیں پڑے گی جس بحری جہاز پہ تم سفر کرو گی وہ مرچنٹ نیوی کا باربردار جہاز ہے اور اس کا کپتان ناظم الدین میرا بچپن کا دوست ہے ۔ ہم کلکتے کی گلیوں میں اکٹھے فٹ بال کھیلا کرتے تھے ۔ وہ بڑا سچا مسلمان اور پاکستان سے محبت کرتا ہے میں نے تمھارے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا ہے وہ تمھیں اپنی حفاظت میں رنگون لے جائے گا ۔ تم اس کی

قریبی رشتے دار کی حیثیت سے جہاز میں اس کے ساتھ سفر کرو گی۔ وہ تمھیں رنگون کی بندرگاہ سے باہر نکال کر ہمارے مشترکہ دوست کے حوالے کر دے گا تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے! اللہ تعالیٰ نے تمھاری بہت مدد کی ہے۔ میرا کیپٹن دوست ناظم الدین اتفاق سے سنگا پور سے جہاز لے کر آج صبح ہی کلکتے پہنچا ہے۔ اب تم تیاری شروع کر دو۔ جہاز کل صبح صبح یہاں سے روانہ ہو رہا ہے۔ میں خود تمھیں بندرگاہ پر لے جاؤں گا۔"

شبانہ نے ان بزرگ کا بے حد شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے شبانہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "تم ہماری بیٹی ہو کیا باپ اپنی بیٹیوں کی مدد نہیں کیا کرتے؟"

شبانہ بے اختیار رو پڑی۔ اسے اپنا شفیق باپ یاد آ گیا جو اس کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا کس قدر خیال رکھا کرتا تھا۔ دوسرے دن صبح صبح بزرگ تشریف لے آئے۔ شبانہ پہلے ہی سے تیار بیٹھی تھی۔ ایک بستر بندھا تھا چھوٹے اٹیچی کیس میں ضرورت کی کچھ چیزیں اور دو سوتی ساڑھیاں رکھی تھیں شفیق بزرگ نے جیب سے بٹوا نکال کر شبانہ کو دو سو روپے دیئے اور کہا "کاش میں اس سے زیادہ اپنی بیٹی کی مدد کر سکتا۔"

شبانہ کا دل احسان مندی کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔ انھوں نے شبانہ کو اپنے ساتھ ٹیکسی میں بٹھایا اور خضر پور والی بندرگاہ کی طرف چل دیئے۔ باربردار انڈین بحری جہاز جیٹی نمبر دو پر ایک طرف لنگر انداز تھا اور اس پر سامان لادا جا رہا تھا۔ جہاز کے کپتان ناظم نے جس طرح بتایا اسی طرح کیا گیا۔ شفیق بزرگ ڈاک یارڈ کے عقبی کیفے میں آ کر بیٹھ گئے۔ شبانہ نے نئی ساڑھی پہن رکھی تھی کاندھوں پر چھوٹی کشمیری شال تھی۔ یہ شال شفیق بزرگ کی بیوہ بہن نے شبانہ کو دی تھی۔ ٹھیک وقت پر جہاز کا کپتان کیفے میں آ گیا۔ اس نے بحری کپتانوں والی وردی پہن رکھی تھی اپنے دوست کے گلے لگ کر ملا۔ شبانہ کو اس نے ہیلو بے بی کہہ کر یوں مخاطب کیا جیسے اسے پہلے ہی سے جانتا تھا۔ یہ سب کچھ طے شدہ منصوبے کے تحت ہو رہا تھا۔ کیونکہ جہاز کے کپتان نے وہاں یہ بتا رکھا تھا کہ اسکے ساتھ اسکی بھانجی بھی جا رہی ہے شفیق بزرگ نے ایک بار پھر کپتان کو ساری بات سمجھائی۔ پھر شبانہ کے سر کو چوما اور چلے گئے شبانہ انھیں عقیدت بھری آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ کپتان نے شبانہ کو ساتھ لیا اور ڈاک یارڈ سے نکل کر خاص راستے سے جیٹی پر آ گیا جہاں ایک بہت بڑا بحری جہاز لنگر انداز تھا۔ شبانہ کا یہ پہلا بحری سفر تھا اس سے پہلے وہ کبھی کسی بحری جہاز پر سوار نہیں ہوئی تھی کپتان اسے اپنے کیبن میں....

لے گیا۔ یہاں اس نے شبانہ کے لیے کافی منگوائی اور کہا کہ میرے دوست سید صاحب نے مجھے تمھاری بابت سب کچھ بتا دیا ہے۔ تمھیں اب فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم محفوظ ہاتھوں میں آ گئی ہو۔ دو دن کے بعد جہاز رنگون کی بندرگاہ سے جا لگے گا۔ جہاں میں تمھیں چوہدری صاحب کے حوالے کر دوں گا وہ تمھیں کراچی کے ہوائی جہاز میں سوار کرا دیں گے تم بڑی خوش قسمت ہو کہ کلکتہ پہنچ کر سید صاحب کے پاس آ گئیں۔ خدا دوسری مسلمان بچیوں کی عزتوں کی حفاظت فرمائے۔

دو گھنٹے کے بعد جہاز نے لنگر اٹھا دیا اور خلیج بنگال کے سمندر میں رنگون کی طرف روانہ ہو گیا۔ موسم ابر آلود ضرور تھا مگر سمندر پر سکون تھا معمول کے مطابق ہوا چل رہی تھی۔ شبانہ کو کپتان نے اپنے ساتھ والا الگ چھوٹا کیبن دے دیا تھا۔ دوپہر کو کپتان نے شبانہ کو اپنی میز پر ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا۔ شام کی چائے بھی اس نے کپتان کے ساتھ ہی پی۔ رات کو شبانہ کو بڑی گہری نیند آئی۔ وہ خوش تھی کہ درندوں کی دنیا سے نکل آئی ہے اور اب اپنے پیارے وطن پاکستان پہنچ جائے گی۔ دوسرا دن بھی خوشگوار تھا۔ سورج طلوع ہوا تو شبانہ اس کا نظارہ کرنے جہاز کے عرشے پر آ گئی۔ ٹھنڈی مرطوب ہوا چل رہی تھی۔ چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ مشرقی افق پر سرخ سورج کا تھال آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا۔ سورج سے لے کر جہاز تک ایک سرخ سڑک سی بچھ گئی تھی۔ شبانہ اس منظر کے سحر میں گم ہو گئی۔ نہ جانے وہ کب تک طلوع صبح کے منظر میں گم رہتی کہ اچانک ایک زبردست دھماکہ ہوا اور وہ سمندر میں گرتے گرتے بچی۔ جہاز کو ایک بھیانک دھچکا لگا اور وہ ایک طرف کو گھوم گیا۔ شبانہ وہیں جنگلے کو پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے عرشے پر خلاصی ادھر ادھر گھبراہٹ کے عالم میں دوڑنے لگے۔ پندرہ سیکنڈ کے بعد دوسرا دھماکہ ہوا یہ دھماکہ پہلے سے زیادہ شدید تھا اور جہاز ایک طرف کو جھک گیا۔ شبانہ کا دل خوف کے مارے اندر سے دھڑکنے لگا وہ عرشے کے فرش پر ایک طرف کو لڑھک گئی اگر وہ لنگر کی بڑی زنجیر کو نہ پکڑ لیتی تو سمندر میں گر گئی ہوتی۔ لنگر کی زنجیر عرشے پر گول چکر کی شکل میں پڑی تھی۔ شبانہ وہیں سہمی بیٹھی ملاحوں کو گھبراہٹ کے عالم میں ادھر ادھر دوڑتے دیکھنے لگی۔ وہ زور زور سے بنگلہ اور تامل زبانوں میں ایک دوسرے کو پکار رہے تھے جہاز آہستہ آہستہ

ایک طرف کو جھکتا جا رہا تھا۔ پھر جہاز کے بڑے ہوادان میں سے پہلے گاڑھا سیاہ دھواں نکلا اور پھر آگ کے شعلے نکلنے لگے۔ جہاز میں شور مچ گیا کہ آگ لگ گئی ہے۔ شبانہ کا دل بیٹھنے لگا۔ حلق دہشت کے مارے خشک ہو گیا۔ موت سامنے آن کھڑی ہوئی۔ چاروں طرف سمندر ہی سمندر تھا۔ جہاز ڈوب گیا تو وہ بھی اس کے ساتھ ہی سمندر میں غرق ہو جائے گی۔ وہ کوشش کر کے اٹھی کر کسی طرح جہاز کے کپتان کے کیبن تک پہنچے۔ وہ عرشے پر پڑے سامان کو پکڑتی جہاز کے نیچے جاتی سیڑھی کی طرف بڑھنے لگی اتنے میں ایک ساتھ دو زبردست دھماکے ہوئے اور جہاز کا اگلا حصہ پانی میں ڈوب گیا ساتھ ہی کیبن کی سیڑھیوں میں سے آگ کے شعلے باہر نکلنے لگے۔ جہاز کا درمیانی حصہ بری طرح آگ میں جل رہا تھا۔ ملاحوں نے کشتیاں سمندر میں پھینک دیں اور اس میں چھلانگیں لگانی شروع کر دیں۔ چاروں طرف آگ ہی آگ پھیل گئی۔ نیچے سے کوئی اوپر نہ آ سکا۔ جہاز تیزی سے پانی میں غرق ہو رہا تھا۔ عجیب عجیب سی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ کسی نے شبانہ کو دیکھا تو چلّا کر کہا "کشتی میں کود کر جان بچاؤ۔" شبانہ بھی دوسرے ملاحوں کے ساتھ دوڑتی ہوئی جنگلے تک گئی۔ کچھ کشتیاں تیزی سے سمندر میں تیرتے ہوئے جہاز سے دور جا رہی تھیں۔ ایک کشتی جہاز کے نیچے سمندر میں کھڑی ڈول رہی تھی۔ اس میں جہاز کے کچھ ملاح کھڑے اوپر دیکھ کر بنگلہ زبان میں چلا رہے تھے ایک رسّہ عرشے سے نیچے کشتی تک لٹک رہا تھا۔ شبانہ نے رسے کو پکڑ لیا اور پھر آہستہ آہستہ نیچے اترنا شروع کر دیا۔ جہاز میں آگ مزید بھڑک اٹھی تھی اور اس کی تپش شبانہ کو ناقابل برداشت محسوس ہو رہی تھی۔ کشتی سے دس پندرہ فٹ کی اونچائی سے شبانہ نے کشتی میں چھلانگ لگا دی۔ ملاحوں نے چپو زور زور سے چلانے شروع کر دیئے۔ کشتی سمندر کی بڑی بڑی لہروں پر ڈولتی تیزی سے جہاز سے دور ہونے لگی۔ شبانہ ایک طرف سہمی ہوئی بیٹھی تھی اسے رہ رہ کر جہاز کے کپتان کا خیال آ رہا تھا۔ خدا جانے وہ کہاں ہو گا۔ یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا تھا اور کشتی جہاز سے تھوڑی دور ہی پہنچی تھی کہ جہاز آدھے سے زیادہ سمندر میں ڈوب گیا۔ سمندر کی لہریں شور مچاتی۔ جہاں جہاز ڈوب رہا تھا اُس طرف کو جانے لگیں۔

جہاز کے ملاح تجربہ کار تھے وہ اس بھنور سے کشتی کو نکال کر لے گئے۔ شبانہ نے پیچھے مڑ کر

دیکھا تو جہاز سمندر میں ڈوب چکا تھا۔ اس کا دل جیسے ڈوبنے لگا۔ وہ سمندر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ چاروں طرف سمندر ہی سمندر تھا۔ کیا وہ زندہ بچ سکے گی۔ یہ کشتی اتنے بڑے سمندر میں.. کہاں تک ان کا ساتھ دے گی؟ شبانہ کا جسم خوف کے مارے ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ کشتی، سمندر کی ابھر ابھر کر ڈوبتی لہروں پر بری طرح ڈول رہی تھی۔ شبانہ نے کشتی کی دیوار کے ساتھ لگے رسّے کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ سمندر کے پانی نے اس کے کپڑوں اور سر کے بالوں کو شرابور کر دیا تھا۔ ملاح چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو آوازیں دے رہے تھے۔ سات آٹھ ملاح پوری طاقت سے دیوانہ وار بڑے بڑے چپو چلا رہے تھے۔ جہاز کے ڈوبنے سے وہاں جو بہت بڑا بھنور پیدا ہو گیا تھا وہ آس پاس کی سمندری لہروں کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ ملاح اب اس بھنور سے نکلنے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔ آخر سخت جدوجہد کے بعد وہ اس آخری بھنور سے بھی کشتی کو نکال کر لے گئے۔ اب کشتی کھلے سمندر میں قدرے سکون کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ شبانہ نے پھٹی پھٹی آنکھیں اٹھا کر ملاحوں کو دیکھا۔ یہ سب وردیوں میں تھے جو بھیگ چکی تھیں دس بارہ ملاحوں میں شبانہ ایک اکیلی لڑکی تھی۔ جب ذرا سکون ہوا تو ایک بنگالی ملاح جو پکی عمر کا تھا اور جس کی چھوٹی سی داڑھی تھی شبانہ کے پاس آ کر بنگلہ میں بولا "تم کو چوٹ تو نہیں آئی ہے؟"

شبانہ نے اردو میں کہا "میں بنگلہ نہیں جانتی۔"

ادھیڑ عمر ملاّح نے حیرانی سے شبانہ کو دیکھا اور اردو میں بولا "بیٹی تم کپتان صاحب کی بھانجی ہو اور بنگلہ نہیں جانتی؟"

شبانہ نے بتایا کہ وہ دلی میں پیدا ہوئی اور وہیں پلی بڑھی تھی۔ اس نے کپتان کے بارے میں تشویش کے ساتھ پوچھا تو ملاح نے سر جھکا دیا اور غم زدہ آواز میں بولا "افسوس بیٹی! نیچے والے کیبنوں سے کوئی بھی اوپر نہیں آ سکا کپتان صاحب بھی نیچے اپنے کیبن میں تھے۔"

شبانہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ملاح نے اسے بتایا کہ جہاز کے انجن روم میں کسی نے طاقتور ٹائم بم رکھ دیئے تھے۔ جہاز کا بچنا ناممکن تھا۔ ہم مشکل سے اپنی جان بچا سکے۔ اس لیے کہ ہم اوپر والے کیبنوں میں تھے۔ اس ادھیڑ عمر ملاح کا نام عبدل تھا اور وہ کلکتے ہی کا رہنے والا تھا۔ اس نے شبانہ کو یہ بھی بتایا کہ کشتی میں چھ دن کی خوراک اور پانی محفوظ ہے۔ یہ خوراک پندرہ

آدمیوں کے لیے ہے۔

"جہاز چلنے سے پہلے ہر کشتی میں ایک ہفتے کا راشن پانی رکھ دیا جاتا ہے جو منزل پر پہنچنے کے بعد ہٹا دیا جاتا ہے۔ اور واپسی پر اس کی جگہ تازہ راشن رکھ دیا جاتا ہے۔"

یہ کشتی، لائف بوٹ تھی اور کافی بڑی تھی۔ پیچھے کی جانب ایک جگہ ترپال ڈال کر چھوٹی سی چھت بنا دی گئی تھی۔ عبدل نے شبانہ کو اس چھت کے نیچے بٹھا دیا۔ سبھی ملاح شبانہ کی عزت کرتے تھے کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ وہ ان کے کپتان کی بھانجی ہے۔ اب انھیں اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔ آسمان بادلوں سے صاف ہو گیا تھا اور سورج اوپر آ گیا تھا۔ دھوپ چمک رہی تھی۔ سمندر کا پانی کالے رنگ کا تھا۔ عبدل نے شبانہ کو بتایا کہ اسے کالا پانی بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ بہت گہرا ہے اور اس کے نیچے کالی چٹانیں اور پہاڑیاں ہیں۔ دوپہر کو ملاحوں نے آپس میں تھوڑا سا راشن تقسیم کیا۔ شبانہ کو بھی اُبلے ہوئے چاول کی ایک پیالی اور پانی کا ایک گلاس دیا گیا۔ دن کھلے سیاہ سمندر میں سفر کرتے گزر گیا۔ عبدل شبانہ کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور بیڑی پینے لگا۔ ملاح باری باری چپو چلاتے تھے۔ کشتی چونکہ کھلے سمندر کی دیو پیکر لہروں پر بہہ رہی تھی اس لیے زیادہ چپو چلانے کی ضرورت نہیں پڑ رہی تھی۔ عبدل کہہ رہا تھا: "ہم کشتی کو انڈمان کی طرف لیجانے کی کوشش کر رہے ہیں جہاں ہمارا جہاز غرق ہوا تھا وہاں سے انڈمان کے جزیرے جنوب مشرق کی طرف ایک دن اور ایک رات کے فاصلے پر ہیں۔ اگر ہماری کشتی کی سمت ٹھیک رہی تو ہمیں آج رات کسی وقت انڈمان کے جزیروں میں پہنچ جانا چاہیے۔"

جو کشتیاں جہاز میں آگ لگ جانے کے بعد ان کے ساتھ سمندر میں اتری تھیں ان کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کس طرف کو نکل گئی تھیں۔ شبانہ کے ذہن میں سوائے خوف اور دہشت کے اور کچھ نہیں تھا۔ اتنے بڑے سمندر میں وہ اپنے آپ کو پہلی بار بے یار و مددگار پا رہی تھی۔ سورج مغرب کی طرف جھکنے لگا۔ دھوپ سنہری ہو کر سورج کی طرف سمٹنے لگی تھی۔ ایک بار پھر جب سورج نے مغربی افق کا کنارہ چھوا تو سورج سے لیکر کشتی تک ایک سنہری راستہ بن گیا۔ پھر سورج سمندر میں ڈوب گیا لیکن غروب آفتاب کی روشنی دیر تک سمندر پر پھیلی رہی۔ اس کے بعد سمندر کو اندھیرے نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شبانہ کو سمندر سے ڈر آنے لگا۔ رات کے شروع میں عبدل نے اسے چاول

کی ایک کٹوری اور پانی دیا۔ شبانہ کھانے کے بعد ترپال کے نیچے سکڑ کر لیٹ گئی۔ آسمان پر تارے نکل آئے تھے۔ سمندر کی نمکین مرطوب ہوا نے شبانہ کے چہرے پر جیسے موم کی پتلی سی تہہ جما دی تھی۔ عبدل دوسرے ملاحوں کے ساتھ کشتی میں آگے کی جانب کھڑا ستاروں کی مدد سے سمت کا تعین کر رہا تھا۔ یہ ملاح رات کے اندھیرے میں سایوں کی طرح لگ رہے تھے۔ ہوا سرد ہو گئی تھی۔ شبانہ نے چادر اوپر کر لی اور منہ باہر نکالے کشتی کو کبھی اوپر اور کبھی لہروں کے ساتھ نیچے جاتے دیکھنے لگی۔

کچھ دیر بعد عبدل اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور بولا "بیٹی سو جانے کی کوشش کرو۔ ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں۔ امید ہے آدھی رات کے بعد ہمیں انڈمان کے لائٹ ہاؤس کی روشنی نظر آ جائے گی۔"

شبانہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ایک جہنم سے نکل کر دوسرے جہنم میں گر پڑی تھی۔ دل میں خدا سے دعا مانگنے لگی۔ نیند اسے بالکل نہیں آ رہی تھی۔ عبدل اٹھ کر دوسرے ملاحوں کے پاس چلا گیا جو اندھیری رات میں بھوتوں کی طرح چپو چلاتے ہوئے آگے پیچھے ہو رہے تھے۔

شبانہ آنکھیں بند کیے سونے کی کوشش کرنے لگی۔ رات گزرتی چلی جا رہی تھی۔ شبانہ کے ذہن میں منتشر خیالات گردش کر رہے تھے اور نیند کوسوں دور تھی۔ پھر بھی وہ آنکھیں بند کیے ترپال کی چھت کے نیچے پڑی رہی۔ اچانک ایک ملاح نے چیخ کر لائٹ ہاؤس کا نام لیا۔ دوسرے ملاح بھی خوشی سے چیخنے لگے۔ شبانہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مشرق میں دور اندھیرے سمندر کے کنارے روشنی کی ایک جھلک بار بار روشن ہو جاتی اور پھر بجھ جاتی تھی۔ عبدل نے فرطِ مسرت سے کانپتی آواز میں شبانہ کے پاس آ کر بتایا کہ انڈمان کا لائٹ ہاؤس نظر آ گیا ہے وہ دیکھو۔ یہ لائٹ ہاؤس کی روشنی ہے جو ایک بار سامنے آ کر دوسری طرف گھوم جاتی ہے۔

شبانہ کے مردہ جسم میں یہ روشنی دیکھ کر جان سی پڑ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ہاتھ جوڑ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور عبدل سے پوچھا کہ وہ کتنی دیر تک ساحل پر پہنچ جائیں گے۔

عبدل نے سمندر کی تیز ہوا میں بڑی مشکل سے بیڑی سلگائی اور بولا "بس بیٹی اب پہنچے ہی سمجھو۔ ساحل قریب آنے سے سمندری لہروں کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ ہم نے کشتی کو اور تیز دیا

پر ڈال دیا ہے۔ دو تین گھنٹوں تک ہم ساحل پر ہوں گے۔ یا اللہ تیرا شکر ہے۔"

یہ کہہ کر عبدل اپنے ملاح ساتھیوں کے پاس چلا گیا۔ شبانہ بڑے غور سے اور پُر اشتیاق نظروں سے لائٹ ہاؤس کی طرف روشنیوں کو دیکھ رہی تھی۔ یہ روشنی لائٹ ہاؤس کی سب سے اوپر والی منزل میں لگی ہوتی ہے اور گھومتی رہتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ روشنی کا ایک دھیما سا جھپاکا سا دکھائی دیتا اور پھر بجھ جاتا۔ دو سیکنڈ بعد جب روشنی اپنی گردش پوری کر لیتی تو یہ جھپاکا پھر دکھائی دے جاتا۔ جوں جوں کشتی ساحل کے قریب ہو رہی تھی لائٹ ہاؤس کی روشنی اب سمندر پر بھی ایک روشن لکیر چھوڑنے لگی تھی کشتی کو سمندر کی لہریں ساحل کی طرف تیزی سے لیے جا رہی تھیں۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد کشتی سمندر سے ابھری ہوئی کالی سیاہ چٹانوں کے درمیان سے گزرنے لگی۔

ملاح بڑی جانفشانی اور مہارت سے کشتی کو چلا رہے تھے کہ وہ کسی چٹان سے نہ ٹکرا جائے۔ انڈیمان کے جزیروں کے چھوٹے چھوٹے ٹاپو شروع ہو گئے۔ شبانہ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اسے بیکراں سیاہ سمندر سے نجات مل گئی تھی۔ اب دوسرے بڑے جزیروں کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ آخر تجربہ کار ملاح کشتی کو ساحل کے قریب لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ کشتی ایک چھوٹے جزیرے کے ساحل پر چڑھ گئی۔ شبانہ بھی دوسرے ملاحوں کے ساتھ گھٹنے گھٹنے سمندری پانی میں چلتی ہوئی کنارے کی ریت پر آ گئی۔ ملاح ایک جگہ کھڑے ہو کر جزیرے کے سیاہ درختوں اور ان کے درمیان کچھ فاصلے پر ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھنے لگے۔ عبدل ان سب میں زیادہ تجربہ کار اور زیادہ عمر کا تھا۔ وہ بنگلہ میں باتیں کر رہے تھے۔ عبدل نے ان سب کو ایک طرف چلنے کے لیے کہا اور خود شبانہ کے پاس آ کر بولا۔

"بیٹی! خدا کا شکر ہے کہ ہم ساحل پر پہنچ گئے۔ یہ انڈیمان کا ایک چھوٹا جزیرہ ہے۔ یہاں اس قسم کے بے شمار جزیرے ہیں۔ مگر سب سے بڑا جزیرہ یہاں سے تھوڑی دور ہے۔ اس جزیرے میں کالے پانی کی مشہور جیل بھی ہے اور وہاں کافی لوگ آباد ہیں۔ ان جزیروں پر انڈیا کی حکومت ہے۔ ہم بھی انڈین ہیں یہ لوگ ہماری مدد کریں گے۔"

شبانہ بھی عبدل کے ساتھ ناریل کے درختوں کی طرف چل پڑی۔ عبدل کو اس نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ اسے بتانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ عبدل سمیت سب ملاح یہی سمجھ رہے تھے

کہ شبانہ جہاز کے کپتان کی بھانجی ہے۔ عبدل سمیت یہ کل سات ملاح تھے۔ ان میں بنگالی بھی تھے اور مدراس کے تامل بھی۔ ناریل کے درختوں سے نکل کر وہ ایک پکی سڑک پر آ گئے۔ اِدھر اُدھر درختوں میں کچھ بیرکیں بنی ہوئی تھیں جن کے باہر روشنی ہو رہی تھی۔ اچانک ایک طرف سے دو سنتری رائفلیں تانے نکلے اور "ہالٹ" کا نعرہ لگا کر ان کے سامنے رائفلیں تان کر کھڑے ہو گئے۔

یہ انڈین سنتری تھے۔ عبدل نے آگے بڑھ کر انھیں ساری داستان سنائی کہ کس طرح ان کا جہاز سمندر میں غرق ہو گیا اور وہ کشتی کے ذریعے اپنی جانیں بچا کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ انڈین فوجیوں پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا اور وہ ان سب کو ایک بیرک کی طرف لے گئے اور وہاں بند کر دیا۔ عبدل کہنے لگا "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ صبح کو ان کا افسر آئے گا تو وہ ہمیں صرف آزاد ہی نہیں کر دے گا بلکہ ہمیں کسی جہاز میں بٹھا کر ہندوستان بھی پہنچا دے گا۔ آخر جہاز کے ڈوبنے کی خبر ان تک پہنچ گئی ہو گی۔ کپتان نے دھماکہ ہوتے ہی ایس او ایس سگنل دے دیا ہو گا۔"

شبانہ پریشانی کے عالم میں بیرک کے کونے میں فرش پر بیٹھ گئی۔ عبدل تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے تسلی دے دیتا تھا۔ پندرہ منٹ بعد ایک سکھ کیپٹن آنکھیں ملتا ہوا یہاں آ گیا۔ اس نے آتے ہی سب کو غور سے دیکھا۔

شبانہ کی طرف گھورتے ہوئے بولا "یہ کون ہے اوئے؟"

عبدل نے بتایا کہ یہ جہاز کے کپتان کی بھانجی ہے اور کلکتے سے کپتان کے ساتھ رنگون جا رہی تھی۔ سکھ کیپٹن نے اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے کہا "اوئے تم جاسوسی کرنے یہاں آئے ہو۔ میں تم سب کو جانتا ہوں صبح تمھیں میں خود شوٹ کر دوں گا۔ ابھی رات گزر جانے دو۔"

سکھ کیپٹن اپنے گارڈز کے ہمراہ بیرک سے نکل گیا اور بیرک کے باہر دو رائفل بردار سنتریوں کا پہرہ لگا دیا گیا۔ شبانہ کا دل بیٹھنے لگا تھا۔ موت اسے سامنے نظر آ رہی تھی۔ عبدل نے اگرچہ اسے حوصلہ دیا مگر شبانہ کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ اکھڑ فوجی اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

- - ⁘ - -

دوسرے دن سکھ کیپٹن بیرک میں آیا تو وہ ہوش میں تھا۔ وہ بھول چکا تھا کہ رات اس نے عبدل اور اس کے ساتھی ملاحوں کو شبانہ سمیت شوٹ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ ان سب کو اسٹیمر میں سوار کرا کر انڈمان کے سب سے بڑے جزیرے میں لے گیا۔ جہاں کالے پانی کی سنٹرل جیل تھی اور جس کی ایک سلاخ دار زمین دوز کوٹھری میں ندیم قید و بند کے شب و روز گزار رہا تھا۔ یہاں انھیں ایک کمانڈر کے سامنے پیش کیا گیا۔ عبدل نے اسے بھی جہاز کے غرق ہونے کی داستان سنائی۔

وہ بولا "کل ہمیں اس جہاز کے سگنل موصول ہوئے تھے لیکن پھر یہ سگنل اچانک بند ہو گئے۔"

عبدل نے بتایا کہ جہاز میں دھماکے ہوئے اور آگ لگ گئی اور وہ اتنی تیزی سے ڈوب گیا کہ جہاز کے کپتان کو بھی کیبن سے اوپر ڈیک پر آنے کی مہلت نہ مل سکی۔" کمانڈر نے ان سب ملاحوں کے نام لکھ کر کلکتے میں مرچنٹ نیوی کے سنٹرل آفس کے ساتھ وائرلیس پر بات کی وہاں سے ان ملاحوں کے ناموں کی تصدیق ہو گئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کپتان کے ساتھ اس کی ایک بھانجی بھی سفر کر رہی تھی۔ عبدل نے شبانہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کمانڈر سے کہا "یہ بچی ہی کپتان صاحب کی بھانجی ہے۔ جو ہمارے ساتھ ہی بدقسمت جہاز پر سفر کر رہی تھی۔ کمانڈر نے انھیں فوراً رہا کر دیا۔

انھیں کھانا کھلایا، کافی پلائی اور کہا "تم لوگ ابھی بیرکوں میں ہی ٹھہرو گے... کرشنا نامی جہاز پندرہ دنوں کے بعد کلکتے سے انڈمان آئے گا.... دو دن یہاں ٹھہرنے کے بعد جہاز واپس جائے گا تو تم لوگوں کو بھی اس میں سوار کرا دیا جائے گا۔"

سب بڑے خوش ہوئے شبانہ نے بھی ایک بار پھر سکھ کا سانس لیا۔ پھونس کی ڈھلوان

چھتوں والی لمبی لمبی کتنی ہی بیرکیں تھیں۔ ایک بیرک میں ان سب کے لیے چارپائیاں لگا دی گئیں۔ عبدل نے شبانہ کی چارپائی بیرک کے کونے والے چھوٹے سے کمرے میں بچھا دی جہاں گھی کے کنستروں کا ڈھیر لگا تھا۔ اب یہ لوگ ہندوستان سے آنے والے "کرشنا" جہاز کا انتظار کرنے لگے۔ وہ دن بھر جزیرے کے بازاروں اور گنجان ہری بھری وادیوں میں گھومتے پھرتے اور رات کو کھانا کھا کر سو جاتے۔ شبانہ زیادہ وقت اپنی کوٹھڑی میں ہی گزارتی اسے بالکل معلوم نہیں تھا کہ اسی جزیرے میں اس کی کوٹھری سے تھوڑی دور پہاڑی ٹیلوں کے درمیان سنٹرل جیل کی ایک کوٹھری میں ندیم قید ہے۔

اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ ندیم کو انڈین آرمی انٹیلی جنس نے پاکستانی جاسوس سمجھ کر گرفتار کیا تھا اور کلکتے سے یہاں کالے پانی کی جیل میں پوچھ گچھ کے لیے لے آئے تھے یہاں لانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ندیم ان کے بقول اپنے ساتھیوں سے مل کر کلکتے میں کوئی تخریب کاری نہ کر سکے۔ حالانکہ حقیقت کا اس سے دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ ندیم پاکستانی جاسوس نہیں تھا وہ تو لاہور سے محض اپنی محبوبہ نجمی سے ملنے اور اسے وہاں سے نکال کر واپس پاکستان لے جانے کے لیے ہندوستان آیا تھا کہ کلکتے پہنچ کر پکڑا گیا۔ ہندوستان میں جو بھی پاکستانی ویزے کے بغیر یا ویزے کی مدت سے زیادہ دیر ٹھہرنے پر پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اگر وہ وی آئی پی نہیں ہے تو انڈین پولیس اسے پاکستانی جاسوس ہی سمجھتی ہے اور اسے قید کر کے اس پر تشدد کرتی ہے اور پوچھ گچھ شروع کر دیتی ہے۔

ندیم پر بھی کالے پانی کی جیل میں بھیانک تشدد کیا گیا۔ اس سے پہلے دلی اور کلکتے میں بھی وہ انڈین انٹیلی جنس والوں کے ہاتھوں کافی اذیتیں برداشت کر چکا تھا چونکہ وہ پاکستانی جاسوس نہیں تھا اس لیے ندیم نے کبھی اس کا اقرار نہیں کیا تھا۔ یہاں کالے پانی کی جیل کی کوٹھری میں شروع شروع میں اس کو شدید اذیتیں دی گئیں پھر جیل کے حکام نے کچھ دیر کے لیے ہاتھ روک لیا جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اس جیل میں نذرل نام کا ایک بنگالی مسلمان میٹ تھا جس کی ڈیوٹی صبح شام یہاں پر قیدیوں کی مختصر تعداد کی گنتی کرنا تھی۔ نذرل بڑا سچا بنگالی مسلمان تھا اور پاکستان سے محبت کرتا تھا۔ سقوط ڈھاکہ کا اسے سب سے زیادہ صدمہ ہوا تھا۔ ندیم پر جب تشدد کیا جاتا تو

وہ اس کی چیخیں نہیں سن سکتا تھا۔ وہ ایک پاکستانی مسلمان پر ہندو افسروں کے ہاتھوں ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا مگر وہ نوکری کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ ندیم پاکستانی جاسوس نہیں ہے اور اسے ملٹری پولیس محض شبہے میں پکڑ کر یہاں لے آئی ہے دن میں کسی وقت وہ ندیم کے پاس کسی نہ کسی بہانے جا کر اس سے تھوڑی بہت باتیں کر لیتا تھا۔

ایک بار اس نے ندیم سے کہا "بیٹا! اگر تم جاسوس ہو تو اقرار کر لو کم از کم اس عذاب سے تو نجات مل جائے گی، یہ لوگ تمھیں اذیتیں دے دے کر مار ڈالیں گے۔"

ندیم نے خدا کو حاضر ناظر جان کر نذرل کے سامنے تسلیم کیا کہ وہ پاکستانی جاسوس نہیں ہے .... پھر اس نے اپنی ساری کہانی نذال کو شروع سے آخر تک سنا دی۔ نذرل ایک ادھیڑ عمر کا بال بچوں والا نیک دل بنگالی مسلمان تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ ندیم جو کچھ کہہ رہا ہے جھوٹ نہیں ہے۔ چنانچہ ایک روز جب ندیم نے موقع پا کر نذرل بابا سے کہا "میں یہاں سے فرار ہو کر ہندوستان جانا چاہتا ہوں کیا اس کی کوئی ترکیب ہو سکتی ہے؟"

تو نذرل نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ندیم کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور وہاں سے چل دیا۔

دو روز بعد وہ گنتی کرنے آیا تو ندیم کی کوٹھری کی سلاخوں کے پاس باہر راہ داری میں بیٹھ کر بیڑی پینے لگا۔ سنتری راہداری کے کونے میں اسٹول پر بیٹھا تھا۔ جیل کے سنتری نذرل بابا کا بڑا احترام کرتے تھے اور کبھی اس پر روک ٹوک نہیں کرتے تھے۔

نذرل بابا نے راہداری کی طرف دیکھتے ہوئے ندیم سے آہستہ سے کہا "کرشنا" نام کا ایک انڈین جہاز مال لینے بیس روز بعد یہاں آنے والا ہے .... اگر تم کسی طرح یہاں سے نکل سکو تو اس جہاز پر بیٹھ کر ہندوستان جا سکتے ہو .... دوسرا کوئی طریقہ نہیں ہے۔"

ندیم جلدی سے سلاخوں کے پاس ایک طرف اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا اور سرگوشی میں بولا "نذرل بابا! میں یہاں سے کیسے نکلوں؟ صرف تم ہی میری مدد کر سکتے ہو۔"

نذرل بیڑی کا کش لگا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سامنے سے سنتری راہداری میں ٹہلتا ہوا ادھر آ رہا تھا۔ نذرل نے ندیم کو مخاطب کر کے بلند آواز میں کہا "ارے پاکستانی جاسوسوں کو تو ہم کبھی نہیں چھوڑا کرتے۔ بہتر یہی ہے کہ مان لو کہ تم پاکستانی جاسوس ہو۔"

اور نذرل سنتری کو سلام کرتا ہوا راہداری میں آگے چل دیا۔ ندیم دیوار کے ساتھ لگ کر پرانے کمبل پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ نذرل اگر اسے یہاں سے کسی طرح نکال دے تو وہ کرشنا جہاز پر سوار ہونے کی پوری کوشش کرے گا۔ یہ جان کر ندیم کو جیسے ایک نئی طاقت مل گئی تھی کہ نذرل اس کی مدد پر آمادہ ہو گیا ہے۔ اب اسے آزادی کی روشنی دکھائی دینے لگی تھی۔

تین دن گزر گئے۔ نذرل راہداری میں سے گنتی کی آواز لگاتا ہوا گزر جاتا۔ وہ ندیم سے کوئی بات نہ کرتا اس کی کوٹھری کے آگے ایک پل کے لیے بھی نہ ٹھہرتا تھا چوتھے روز دوپہر کے وقت وہ بالٹی ہاتھ میں لیے راہداری میں داخل ہوا اور ندیم کی کوٹھری کے آگے سلاخوں کے پاس کھڑے ہو کر بولا "ڈونگا لاؤ .... شربت لے لو .... آج رشورا تری کا تہوار ہے سب قیدیوں کو ناریل کا میٹھا شربت پلایا جا رہا ہے۔"

سنتری اس وقت کاریڈار میں نہیں تھا۔ سلاخ دار دروازے پر تالا پڑا تھا۔ ندیم ڈونگا ہاتھ میں لیے سلاخوں کے پاس آ گیا۔ نذرل نے اس کے ڈونگے میں شربت ڈالتے ہوئے آہستہ سے لوہے کی ایک چابی اس کے ڈونگے میں ڈال دی اور دھیمی آواز میں کہا "یہ چابی تمھارے تالے کی ہے۔ سیدھے ہاتھ کو راہداری میں آگے جا کر سیڑھیاں نیچے اترتی ہیں .... وہاں سے ایک نالہ باہر جنگل میں نکلتا ہے .... رات بارہ بجے کا گھنٹہ بجتے ہی تم یہاں سے نکل جانا ... اس وقت راہداری میں سنتری سو رہا ہو گا .... میں تمھیں جنگل میں نالے کے باہر ملوں گا۔ سنتری جاگ رہا ہو تو اسے مار ڈالنا۔ پکڑے گئے تو میرا نام نہ لینا .... یہ تمھارا آخری چانس ہے۔"

نذرل بالٹی اٹھائے چلا گیا۔ ندیم کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی آزادی کا پروانہ کوٹھری کے سلاخ دار دروازے کے باہر لگے ہوئے بھاری تالے کی چابی اس کے ڈونگے میں تھی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ ڈال کر ڈونگے میں سے چابی نکالی اور اسے کمبل کے نیچے چھپا دیا پھر آہستہ آہستہ شربت پیتے ہوئے رات کو فرار کا منصوبہ تیار کرنے لگا۔ وہ اس سے پہلے دلی کی جیل سے فرار ہو چکا تھا۔ اسے صرف سنتری کی فکر تھی کہ اگر وہ راہداری میں موجود ہوا اور وہ اس پر قابو نہ پا سکا تو سارا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ وہ ہر حالت میں

موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد شاید اسے ساری زندگی ایسا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ ندیم کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا ہر ایک امکان پر غور کر رہا تھا۔ ندرل نے اسے یہ اشارہ بھی دیا تھا کہ ہو سکتا ہے سنتری بارہ بجے رات راہداری میں نہ ہو۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ اس رات شوراتری کا جشن منایا جا رہا تھا ممکن ہے ہندو سنتری اس جشن میں حصہ لینے کچھ دیر کے لیے چلا جائے۔ جو بھی ہو ندیم نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر حالت میں قسمت آزمائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ وہ پکڑا جائے گا اس پر تشدد کیا جائے گا۔ تشدد تو اس پر ہوتا ہی رہتا تھا یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ بے چینی سے رات کا انتظار کرنے لگا۔

جیل میں ہر ساٹھ منٹ کے بعد ہلکی سی آواز اسے سنائی دیا کرتی تھی۔ ندرل رات کو ٹھیک نو بجے آتا تھا۔ ندرل اس رات بھی ٹھیک نو بجے آیا اور گنتی کی آواز لگاتا اس کی کوٹھری کے آگے سے گزر گیا۔ یہاں سے ندیم نے وقت کا حساب رکھنا شروع کر دیا۔ دس کا گھنٹہ بجا پھر گیارہ کا گھنٹہ بجا تو ندیم اضطراب کے عالم میں پہلو بدلنے لگا۔ کچھ دیر کے لیے وہ کوٹھری میں ٹہلتا بھی رہا اسے بارہ بجے کے گھنٹے کا انتظار تھا۔ ایک بار وہ اٹھ کر سلاخوں کے پاس آیا اس نے سلاخوں کے ساتھ منہ لگا کر دائیں جانب دیکھا ندرل نے اسے سیدھے ہاتھ کو جانے کی ہی ہدایت کی تھی۔ اسے راہداری کا تھوڑا سا کونا نظر آیا وہاں سنتری اسٹول پر بیٹھا اونگھ رہا تھا اس کے سر کے اوپر کمزور سا بلب جل رہا تھا۔ رائفل سنتری کے گھٹنوں پر پڑی تھی۔ ندیم واپس کونے میں آ کر بیٹھ گیا۔ یہ کم بخت اگر نہ گیا تو اس کے لیے کوٹھری کا تالا کھولنا ناممکن ہو جائے گا۔ ندیم خدا سے دعائیں مانگنے لگا کہ یہ کم بخت یہاں سے دفع ہو جائے۔ رات کے بارہ کا گھنٹہ بجا تو ندیم اپنی جگہ پر کانپ سا گیا۔ وہ دبے پاؤں اٹھ کر سلاخوں کے پاس گیا یہ دیکھ کر اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا کہ راہداری کے کونے میں سنتری نہیں تھا اسٹول خالی تھا اب تاخیر کا وقت نہیں تھا۔

ندیم نے کمبل کے نیچے سے چابی اٹھائی۔ سلاخوں میں سے تھوڑا سا بازو باہر نکال کر ہاتھ کو موڑتے ہوئے چابی تالے میں لگانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہو کر کانپنے لگے تھے چابی تالے میں لگ گئی۔ ندرل نے تالے کی دوسری چابی بنوا کر اسے دی تھی تالا کھل گیا۔

ندیم نے کنڈے کی سلاخ آہستہ سے پیچھے کر دی اب دروازہ کھل سکتا تھا۔ ندیم نے ایک بار پھر راہداری کے کونے میں نگاہ ڈالی راہداری اپنے موڑ تک سنسان پڑی تھی۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولا باہر نکل کر سلاخوں والے دروازے کو دوبارہ بند کیا اور دیوار کے ساتھ لگ کر راہداری میں سیدھے ہاتھ کو تیز تیز قدموں سے چلنے لگا جہاں راہداری کا موڑ تھا وہاں وہ رک گیا۔ دوسری جانب بھی راہداری بالکل خالی تھی۔ وہ آگے بڑھا تو اوپر سے لوگوں کے قہقہوں کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دیں شاید جیل کا عملہ شوراتری کا جشن منا رہا تھا۔ ندیم جتنی تیزی سے چل سکتا تھا اس نے راہداری پار کی آگے سیڑھیاں نیچے اترتی تھیں سیڑھیوں میں اندھیرا تھا وہ سیڑھیوں میں آ کر رک گیا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

. . . .

خزاں کی بارش

دُلہن کا فرار

اے حمید



اسے پتھر کے درمیان ایک گول بڑا پائپ آگے کو جاتا نظر آیا وہ پائپ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا جہاں پائپ ختم ہو کر باہر کو جاتا تھا وہاں ایک چھوٹا سا جنگلا لگا ہوا تھا۔ ندیم نے اسے پکڑ کر زور سے اپنی طرف کھینچا جنگلا لوہے کا تھا اور اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا۔ ندیم سوچنے لگا کہ نذرل نے تو کہا تھا یہاں سے ایک کھلا راستہ باہر جاتا ہے پھر سوچا کہ کھلا راستہ کیسے ہو سکتا ہے یقیناً اس کی مراد اس جنگلے ہی سے تھی مجھے اس جنگلے کو کسی طرح توڑنا ہو گا وہاں پتھر ضرور پڑے تھے مگر ندیم پتھر سے ضرب نہیں لگا سکتا تھا اس کی آواز پر سنتری چوکنے ہو کر وہاں آ سکتے تھے۔ ندیم ان پتھروں کو ہلانے کی کوشش کرنے لگا جن میں آہنی جنگلا لگا تھا۔ یہاں ایک پتھر اپنی جگہ سے ہلا ہوا تھا۔ ندیم نے اس پر اپنا سارا زور صرف کر دیا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد پتھر باہر نکل آیا اب دوسرے پتھر کا اکھاڑنا مشکل نہیں تھا تین چار پتھر نکالنے کے بعد جنگلا اپنی جگہ سے ہل گیا۔ ندیم نے اسے ایک طرف کو پاؤں کے زور سے موڑ دیا جب وہاں ایک آدمی کے گزرنے کی جگہ پیدا ہو گئی تو ندیم اس میں سے نکل کر اندھیرے میں دوسری طرف آ گیا۔ دوسری طرف بھی سیمنٹ کا پائپ آگے جا رہا تھا یہاں پہلی بار اسے جنگل کی ٹھنڈی ہوا محسوس ہوئی۔ وہ جیل کی زمین دوز دیواروں سے باہر نکل آیا تھا اس کے اردگرد جنگلی جھاڑیوں کی بھرمار تھی۔ پائپ ان کے بیچ میں سے گزرتا تھا۔ ندیم جھاڑیوں کے باہر آ کر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں آنکھیں کھول کر تکنے لگا۔ نذرل نے اسی جگہ آنے کو کہا تھا۔ وہ سانس روکے کالی سیاہ جھاڑیوں کی اوٹ میں دبکا بیٹھا رہا۔ اتنے میں پتوں پر کسی کے چلنے

کی آواز سنائی دی: ندیم نے چونک کر پیچھے دیکھا اندھیرے میں اس نے نذرل بابا کو پہچان لیا تھا۔

نذرل نے آہستہ سے کہا "جلدی سے میرے پیچھے پیچھے آجاؤ۔"

اور وہ آگے آگے چل پڑا۔ یہ کسی ٹیلے کی ڈھلان تھی اور وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ ندیم نے نذرل کو اس اندھیرے میں بھی اپنی آنکھوں کے سامنے رکھا اور اس کے پیچھے پیچھے چلتا گیا۔

ڈھلان سے اترنے کے بعد ایک ہموار جگہ آگئی پھر درختوں میں چڑھائی تھی اس چڑھائی کے بعد ایک گھاٹی آگئی۔ نذرل گھاٹی میں اتر گیا۔ اس گھاٹی میں برساتی نالہ تھا جو خشک تھا جب برسات ہوتی تھی تو نالہ بھر جاتا تھا۔ بارش کے ختم ہونے کے چند دنوں بعد ہی نالہ بالکل خشک ہو جاتا تھا۔ اس کا سارا پانی سمندر کی طرف بہہ جاتا تھا۔ یہ دونوں اندھیرے میں خشک نالے میں جنوب کی طرف چلتے گئے کافی دیر چلنے کے بعد سیاہ کالی چٹانوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ چٹانیں ختم ہوئیں تو سامنے ایک پہاڑی کھڑی تھی وہ پہاڑی کے دامن میں اس کی دوسری جانب آگئے یہاں آکر نذرل ندیم کو جھاڑیاں ادھر اُدھر ہٹا کر ایک سرنگ میں لے گیا جس کی چھت اتنی اونچی تھی کہ انھیں جھک کر اس میں داخل ہونا پڑا۔

نذرل نے کہا "یہاں تم اس وقت تک چھپے رہو گے جب تک کہ کرشنا جہاز انڈیمان سے ہندوستان کے لیے روانہ نہیں ہوتا میں تمھیں اس میں سوار کرنے کی کوشش کروں گا ایک ترکیب میرے ذہن میں ہے۔"

ندیم اندھیرے میں غار میں بیٹھ گیا اس نے کہا "نذرل چچا! میرے فرار ہونے سے تم پر تو کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔؟"

وہ بولا "میری بات تم چھوڑو.... میرا کام گنتی کی آواز لگانا ہے میں نے گنتی پوری کر دی تھی... مجھے کوئی نہیں پوچھے گا۔ ہاں سنتری سکنہ لال ضرور معطل ہو گا۔ مجھے معلوم تھا آج شوراتری ہے اور یہ لوگ اوپر والے آفس میں رات کو ادھم مچائیں گے اب میں جاتا ہوں میرا زیادہ دیر یہاں رہنا ٹھیک نہیں.... میں کل کسی وقت آکر تمھیں کھانے کو روٹی چاول دے جاؤں گا۔"

ندیم نے جب اس خدشے کا اظہار کیا کہ جیل کے لوگ اس کی تلاش میں ادھر تو نہیں آئیں گے تو نذرل بولا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو.... میں انھیں غلط راستے پر ڈال دوں گا اس طرف نہیں آنے دوں گا۔ .... اگر آ گئے تو تمھاری قسمت پھر تم جانو اور تمھاری قسمت.... میں نے ایک سچے مسلمان کے ناتے تمھاری مدد کی ہے تم مسلمان ہو بے گناہ ہو اور پاکستانی ہو تمھاری مدد کرنے کے لیے مجھے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہیئے.... اب میں جاتا ہوں.... ہاں! دن کی روشنی میں اس غار سے ہرگز باہر مت نکلنا رات کو بھی نکلو تو جھاڑیاں غار کے منہ پر ڈال دیا کرنا۔ اللہ تمھارا نگہبان ہو۔"

غار کے اندھیرے میں نذرل کا سایہ باہر نکل گیا۔ ندیم نے اس کے جانے کے بعد غار کا جائزہ لیا اسے دکھائی تو کچھ نہیں دے رہا تھا۔ ہاتھ سے دیواروں کو ٹٹول کر دیکھا۔ پتھریلی دیوار تھی جس میں کہیں کہیں سے خشک گھاس باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ وہاں مچھر بھی تھے مگر ندیم کو سب سے زیادہ ڈر سانپ بچھو کا تھا لیکن آزادی کے احساس نے اس خوف کو بھی کافی حد تک زائل کر دیا تھا۔ جنگل میں سناٹا چھایا ہوا تھا کسی وقت کسی درندے کی عجیب سی آواز گونج جاتی تھی یہ آواز بھیڑیئے کی آواز سے کافی مشابہت رکھتی تھی۔ اس قسم کی آوازیں اسے جیل کی کوٹھڑی میں بھی آیا کرتی تھیں۔

ندیم نے باقی ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔

صبح کی ہلکی ہلکی سلیٹی رنگ کی روشنی غار میں آنے لگی تو وہ اٹھ کر غار کے منہ پر آکر بیٹھ گیا۔ سامنے جنگلی جھاڑیاں تھیں اس نے جھاڑیوں کو ایک طرف ہٹا کر دیکھا۔ اس کے سامنے اونچی نیچی زمین پر گھنے درختوں، اونچی گھاس اور جھاڑیوں کا سلسلہ دور پہاڑی تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ اس قدر دشوار گزار علاقہ تھا کہ لگتا تھا ادھر کبھی کوئی نہیں آیا۔ ہوا میں سبزے کی مہک رچی ہوئی تھی۔ ندیم اٹھ کر غار میں واپس آگیا۔ اس کے پاس سگریٹ بھی نہیں تھے جن کو پھونک کر وہ وقت گزار لیتا۔ غار کی زمین ریتلی تھی اور اس کا رنگ سرخی مائل تھا۔ جیل کا سائرن رات کو نہیں بجا تھا لیکن ندیم کو یقین تھا کہ اب تک اس کے فرار کا پتہ چل گیا ہو گا کالے پانی کی جیل میں زیادہ قیدی نہیں تھے اس لیے وہاں سائرن نہیں بجایا گیا تھا۔ لیکن جیسا کہ بعد میں نذرل چچا نے اسے بتایا اس کے فرار کا علم رات دو بجے اسی وقت ہو گیا تھا جب سنتری نشے میں مدہوش وہاں آیا

اور اس کو کوٹھری کا دروازہ کھلا ہوا ملا۔ سنتری سکنہ لعل کو حراست میں لے لیا گیا تھا اور کالے پانی کی پولیس اور فوج نے مل کر جنگل میں اس کی تلاش شروع کر دی تھی۔ غار میں دن کے وقت بھی جلس اور مچھر برابر ندیم کو تنگ کر رہے تھے انھیں بھگانے کے لیے وہ دھونی بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ ندیم کو پیاس لگ رہی تھی مگر وہ پانی پینے غار سے نکل کر جنگل میں نہیں جا سکتا تھا۔ نذرل چچا نے اسے منع کیا تھا۔ دوپہر کے قریب نذرل چچا آ گیا۔ وہ ندیم کے لیے ڈبل روٹی اچار اور پانی سے بھرا ہوا چھوٹا مشکیزہ ساتھ لایا تھا۔ ندیم نے سب سے پہلے پانی پیا۔ نذرل نے اسے بتایا کہ اسے جگہ جگہ تلاش کیا جا رہا ہے۔

جیل میں نذرل چچا کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ نہ صرف یہ کہ اس نے زندگی کے تیس برس وہاں نوکری کرتے گزار دیئے تھے بلکہ وہ ایک دیانت دار اور فرض شناس ملازم تھا۔ چنانچہ اس نے جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو یہ مشورہ دیا کہ قیدی یقینی طور پر اس جزیرے سے نکل کر انڈیمان کے دوسرے کسی جزیرے میں جا چھپا ہے وہ اس جزیرے میں ٹھہرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ انڈیمان کے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں یوں اس نے جیل کے حکام اور پولیس کو غلط راستے پر ڈال دیا تھا۔ ان جزیروں کو کھنگالنے تک کافی وقت گزر جاتا اور اس دوران نذرل چچا ندیم کو وہاں سے نکال کر جہاز میں سوار کرا دیتا۔ اب نذرل نے ندیم کو وہ اسکیم بتائی جس پر عمل کرتے ہوئے ندیم کو "کرشنا" جہاز کے ذریعے واپس ہندوستان جانا تھا۔ ہندوستان واپس جانے کا فیصلہ ندیم نے اس لیے کیا تھا کہ انڈیمان سے ان دنوں بحری جہاز صرف ہندوستان کو ہی جاتے تھے۔ کولمبو یا انڈونیشیا کی جانب کوئی جہاز نہیں جاتا تھا۔ ویسے بھی ندیم ہندوستان سے نجمی کو ساتھ لیے بغیر پاکستان نہیں جا سکتا تھا۔ جب نذرل چچا نے ندیم کو اسکیم بتائی تو ایک بار تو ندیم کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اسے قبر میں بند کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اسکیم یہ تھی۔

ہندوستان سے جو بحری جہاز آتے تھے وہ مٹی کا تیل، نمک، دالیں اور دوسری چیزیں لاتے تھے یہاں سے واپس جاتے ہوئے کالی مرچ الائچی اور مقامی کاریگروں کے بنائے ہوئے ناریل کی لکڑی کے نوادرات چھوٹے چھوٹے بت، ایش ٹرے، پاندان، سجاوٹ کی چیزیں اور پٹ سن کی ٹیکوزیاں

وغیرہ اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ الائچی اور کالی مرچیں تو بوریوں میں بھری جاتی تھیں لیکن نوادرات لکڑی کے بڑے بڑے بکسوں میں پیک کر کے بھیجی جاتی تھیں۔ پٹ سن کی نوادرات کی برآمد کا کام نذرل چچا کا ایک رشتے دار کرتا تھا۔ یہ مال نذرل کے مکان کے ایک گودام میں لکڑی کے بڑے بڑے کریٹوں میں بھرا جاتا تھا۔ نذرل چچا نے ندیم کو بتایا کہ اُسے نوادرات کے ایک کریٹ میں لٹا کر "کرشنا" بحری جہاز میں لاد دیا جائے گا۔ کلکتے کی بندرگاہ پر یہ مال ایک بہت بڑے گودام میں رکھوا دیا جاتا ہے جہاں سے وہاں کا ایک مارواڑی سیٹھ آ کر اسے چھڑا کر لے جاتا ہے اور اپنے گودام میں رکھوا دیتا ہے۔ نذرل نے کہا: "اس مارواڑی سیٹھ کے گودام میں پہنچنے کے بعد تم لکڑی کے کریٹ کو کھول کر باہر نکل آؤ گے۔ اس گودام سے باہر نکلنا تمھارے لیے اتنا مشکل نہیں ہو گا۔ کیا خیال ہے؟ تم اس کے لیے تیار ہو؟ یہ ذہن میں رکھنا کہ اس کے سوا تمھارے لیے یہاں سے نکلنے کا اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔"

ندیم نے نذرل کی اسکیم کو بڑے غور سے سنا تھا۔ خیال ہی خیال میں اس نے اپنے آپ کو لکڑی کے بکس میں بند پایا تو اس کا دم گھٹنے لگا اس نے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھ کر کہا: "چچا! لکڑی کے بکس میں مجھے ہوا کہاں سے آئے گی؟"

نذرل بولا: "اس کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ لکڑی کے بکس میں سوراخ کر دوں گا جن میں سے تمھیں تازہ ہوا آتی رہے گی۔"

ندیم نے پوچھا: "اگر میرے بکس کے اوپر دوسرے کریٹ رکھ دیئے گئے تو مجھے ہوا کہاں سے آئے گی؟"

نذرل چچا نے کہا: "میں اپنے رشتے دار کے ساتھ بندرگاہ پر جاؤں گا اور کوشش کروں گا کہ تمھارے کریٹ کے اوپر کوئی دوسرا کریٹ نہ رکھا جائے بلکہ سب سے اوپر تمھارا کریٹ ہو۔ ویسے اتنا خطرہ تو تمھیں مول لینا ہی ہو گا یہ تمھاری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اس کے علاوہ کریٹ کے پہلوؤں میں بھی تمھارے منہ کے قریب سوراخ ہوں گے تمھیں وہاں سے بھی ہوا ملتی رہے گی۔"

ندیم نے زندگی اور آزادی کے لیے موت کے منہ سے گزرنے کا فیصلہ کر لیا اس نے کہا کہ میں تیار ہوں۔ نذرل چچا نے ندیم کی بہادری کی تعریف کی اور ایک بار پھر تاکید کرتے ہوئے کہا: "لیکن یہ بات یاد رکھنا اگر تم کسی وقت بھی پکڑے جاؤ تو میرا نام مت لینا۔" ندیم نے اسے یقین دلایا کہ

وہ تشدد سہتے سہتے مرجائے گا مگر اس کا نام زبان پر نہیں لائے گا۔ نذرل چچا دوسرے روز رات کو آنے کا وعدہ کرکے چلا گیا

یونہی ندیم نے اس غار میں دو ہفتے گزار دیئے "کرشنا" جہاز کے آنے میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا کہ ایک روز شام سے پہلے اسے جنگل میں کچھ انسانی آوازیں سنائی دیں۔ آوازیں قریب آتی معلوم ہو رہی تھیں کیا پولیس کے آدمی ادھر آ رہے ہیں؟ اس خیال سے ہی ندیم کو پسینہ آگیا وہ غار سے نکل کر جھاڑیوں کی اوٹ میں آگیا اور شاخوں کو ایک طرف ہٹا کر درختوں کی طرف نگاہ دوڑائی اسے درختوں کے نیچے جھاڑیوں کے اوپر انسانی سر دکھائی دیئے۔ یہ چھ سات آدمی تھے لیکن ان میں سے کسی نے بھی پولیس یا فوج کی وردی نہیں پہن رکھی تھی پولیس اور فوج کی ٹوپیوں کو ندیم دور ہی سے پہچان لیتا تھا لیکن یہ انٹیلی جنس کے آدمی بھی ہو سکتے تھے۔ ندیم نے سوچ لیا کہ اگر وہ اس طرف آئے تو وہ وہاں سے بھاگ جائے گا لیکن ان کی آوازیں دور ہونے لگیں۔ انسانی سر بھی جھاڑیوں کے پیچھے غائب ہو گئے پھر آوازیں بھی ختم ہو گئیں۔ ندیم نے اطمینان کا سانس لیا مگر اب اسے غار میں بھی بے چینی لگی رہی کہیں یہ لوگ اوپر سے ہو کر غار میں نہ آ جائیں۔ ظاہر ہے ان کے پاس اسلحہ ہو گا اور ندیم ان کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ لیکن خیریت ہی رہی اور ان لوگوں کی آوازیں پھر سنائی نہ دیں۔

سورج غروب ہو گیا۔ درختوں پر پرندوں کا شور گونج اٹھا پھر رات کا اندھیرا چھا گیا اور سب آوازیں خاموش ہو گئیں۔ ندیم احتیاط کے طور پر غار کے اندر رہنے کی بجائے غار کے منہ کے قریب ایک گھنی جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ گیا جہاں سے وہ جنگل میں دائیں بائیں اور سامنے نگاہ ڈال سکتا تھا۔ جب رات گہری ہو گئی تو اسے فضا میں مخصوص سیٹی کی آواز سنائی دی۔ نذرل اندر آنے سے پہلے ایک پرندے کی طرح ہلکی سی سیٹی بجا دیتا تھا جس سے ندیم سمجھ جاتا کہ نذرل چچا آ رہا ہے سیٹی کی آواز سنتے ہی ندیم لپک کر غار کے اندر آگیا تھوڑی دیر بعد نذرل چچا غار میں داخل ہوا وہ روٹیاں اچار اور پانی کا مشکیزہ ساتھ لایا تھا جب ندیم نے اسے بتایا کہ آج وہاں سے کچھ آدمی گزرے تھے۔ تو نذرل کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ کچھ سوچنے لگا پھر سر اٹھا کر بولا "بیٹا! تمھیں آج رات ہی میرے ساتھ گودام میں چلنا ہو گا کرشنا جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز ہو چکا ہے وہ تین دن بعد

انڈیمان سے روانہ ہو گا میرا خیال تھا کہ میں تمھیں کل یہاں سے لے جاؤں گا مگر لگتا ہے اس جنگل میں بھی تمھاری کھوج شروع ہو گئی ہے اس لیے بہتر ہے کہ تم آج ہی میرے ساتھ یہاں سے نکل چلو۔"

ندیم نے اچار کے ساتھ روٹی کھائی۔ جی بھر کر پانی پیا۔ نذرل چچا کہنے لگا "تم اسی جگہ ٹھہرو میں باہر جا کر دیکھ آؤں۔"

وہ غار سے نکل گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا اور کہنے لگا "چلو سب ٹھیک ہے میرے پیچھے پیچھے چلنا۔ شہر کی آبادی شروع ہو تو مجھ سے کچھ فاصلے پر ہو جانا۔" ندیم نے جنگل میں نذرل کے عقب میں چلنا شروع کر دیا۔ اندھیرے میں دونوں دیر تک چلتے رہے۔ انھوں نے جنگل کا سارا علاقہ عبور کر لیا تو ڈھلان سے اترتے ہوئے فاصلے پر ندیم کو مکانوں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ نذرل آگے آگے تھا۔ وہ اسے آبادی سے کچھ فاصلے پر جنوب کی طرف ایک بستی کے سرے پر لے گیا۔ یہاں روشنی کہیں کہیں تھی۔ نذرل رک گیا اور بولا۔

"اب تم میرے اور اپنے درمیان کچھ فاصلہ رکھ لو گودام میرے مکان کے عقب میں ہے اور میرا مکان سامنے والی بستی کے کونے میں ہے۔ آجاؤ۔"

نذرل چلا تو ندیم رکا رہا۔ جب وہ اس سے دس پندرہ قدم دور ہو گیا تو ندیم بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ آخر وہ ایک مکان کے احاطے میں داخل ہو گئے۔ آگے گودام کا لکڑی کا برآمدہ تھا۔ دالان میں ناریل کے درخت اندھیرے میں اپنے بھوتوں ایسے سر اٹھائے کھڑے تھے۔ نذرل ندیم کو ایک گودام میں لے گیا جس کے اندر لکڑی کے کھوکھے اور دوسرا سامان بکھرا پڑا تھا۔ چھت کے ساتھ دھیمی روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ نذرل بولا۔

"یہی وہ گودام ہے جہاں لکڑی کے کھوکھوں میں ہندوستان جانے والا سامان بھر کر لایا جاتا ہے۔ یہاں ان کھوکھوں پر کمپنی کے پتے لکھے جاتے ہیں۔ میں نے اپنے رشتہ دار سے تمھارے بارے میں ساری بات کر لی ہے۔ تم پریشان مت ہونا۔ وہ بھی میری طرح پاکستان کا سچا عاشق ہے۔ وہ بڑی خوشی سے تمھیں کھوکھے میں بند کر کے ہندوستان پہنچانے پر تیار ہو گیا ہے۔ چونکہ یہ ان کی ساکھ کا معاملہ ہے اس لیے وہ تم سے صرف یہ چاہتا ہے کہ جب تم کلکتہ میں سیٹھ کے گودام سے باہر

نکلو تو اس سے پہلے اس کھوکھے میں آگ لگا دینا جس میں بند ہو کر تم نے سفر کیا تھا۔"

ندیم نے کہا: "میں آگ ضرور لگا دوں گا۔ لیکن اتنی جلدی اسے آگ لگ جائے گی۔"

اس پر نذرل نے اسے بتایا کہ ماچس اور مٹی کے تیل کی ایک بوتل اس کے ساتھ رکھ دی جائے گی۔ نذرل کہہ رہا تھا: "یہ محض اس لیے ہے کہ اگر سیٹھ کو علم ہو گیا کہ ایک کھوکھے میں مال آدھے سے بھی کم تھا تو میرے رشتہ دار کی ساکھ کو نقصان پہنچے گا۔

ندیم نے کہا: "چچا! اگر میں خیریت سے کلکتہ پہنچ گیا اور سیٹھ کے گودام میں پہنچ کر کھوکھے سے باہر بھی نکل آیا تو یقین کرو کہ میں اس کے سارے گودام کو آگ لگا کر ہی گودام سے باہر نکلوں گا۔"

نذرل بولا: "سارے گودام کو آگ لگانے کی ضرورت نہیں بیٹا۔ تم صرف وہی کھوکھا جلا دینا جس میں بند ہو کر تم جاؤ گے۔ اچھا اب تم یہاں کہیں لیٹ کر آرام کرو۔ میں صبح آؤں گا۔ ساتھ ہی میرا مکان ہے جہاں میرے بیوی بچے رہتے ہیں۔ تم آواز بالکل نہ نکالنا۔"

نذرل چلا گیا۔ دوسرے دن وہ صبح صبح ایک پرانا سا تھرماس لے کر آ گیا۔ اس میں گرم گرم چائے تھی۔ ساتھ وہ ڈبل روٹی کے ٹکڑے بھی لایا تھا۔ ندیم نے بڑے مزے سے چائے پی۔ کتنے دنوں کے بعد چائے نصیب ہوئی تھی۔

نذرل کہنے لگا: "آج شام کو مال کے کھوکھے اس گودام میں آ کر لگا دیئے جائیں گے۔ اس وقت میں تمھیں دوسری کوٹھڑی میں چھپا دوں گا کیونکہ میرے رشتہ دار کے ساتھ مزدور بھی ہوں گے۔ دو دن بعد یہ مال یہاں سے بندرگاہ کی گودی پر پہنچا دیا جائے گا۔ اسی روز رات کو مال کرشنا جہاز پر لاد دیا جائے گا اور اس رات کی صبح کو جہاز کلکتہ کی طرف روانہ ہو جائے گا سمندری سفر دو دن میں طے ہوگا۔ تیسرا دن تمھیں کلکتہ کے گودام میں آئے گا۔ اس کے بعد تم وہاں سے نکل جانا۔"

شام کو نذرل چچا نے ندیم کو گودام کی ساتھ والی کوٹھڑی میں چھپا کر باہر سے تالا لگا دیا۔ اس کا رشتہ دار ٹرک پر مال لدوا کر مزدوروں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ بھرے ہوئے کھوکھے گودام میں ایک طرف لگا دیئے گئے۔ جب سارا سامان گودام میں پہنچ گیا تو نذرل کے رشتہ داروں نے

ٹرک ڈرائیور اور مزدوروں کو وہاں سے رخصت کر دیا۔ پھر نذرل کی طرف جھک کر رازداری سے بولا۔

"پاکستانی لڑکا کہاں ہے؟"

نذرل نے بند کوٹھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ اس کا رشتہ دار بولا: "اب اسے گودام میں لے آؤ میں تمھارے گھر جا رہا ہوں۔ جس رات سامان بندرگاہ کی گودی پر جانے والا ہوگا اس روز شام کو آ کر میں اس پاکستانی نوجوان کو اس کے لیے تیار کیے گئے خاص کھوکھے میں بند کر دوں گا۔ یہ خاص کھوکھا گودام میں مال کے ساتھ ہی پہنچا دیا گیا۔"

نذرل کا رشتہ دار اس کے گھر کی طرف مڑ گیا اور نذرل نے کوٹھڑی کھول کر ندیم کو وہاں سے نکالا اور گودام میں لے جا کر کہا: "ان کھوکھوں میں ایک خالی کھوکھا بھی ہے۔ اس کھوکھے میں لیٹ کر تم بحری جہاز میں سفر کرو گے۔" ندیم نے لکڑی کے اس بکس کو ایسے دیکھا جیسے بلی اس پنجرے کو دیکھتی ہے جس میں اسے بند کیا جا رہا ہو۔ یہ کھوکھا لمبائی میں چھ فٹ اور چوڑائی میں ساڑھے تین فٹ تھا۔ اس کے اندر گدیلا بچھا کر سرھانہ رکھ دیا گیا تھا۔ مٹی کے تیل کی ایک پلاسٹک کی بوتل، ماچس، بسکٹوں کا ڈبہ، پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ، خشک میووں کی تھیلی بھی رکھ دی گئی تھی۔ دو دن بعد جب رات کے پچھلے پہر ندیم اس کھوکھے میں اتر کر لیٹ گیا تو اسے وہ بڑا آرام دہ لگا۔ نذرل چچا اور اس کا رشتہ دار اس کے پاس ہی گودام میں موجود تھے۔ ان کے سوا وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ جہاز کی رولنگ اور دھچکوں سے بچنے کے لیے ندیم کے دائیں بائیں فوم کے لمبے تکیے اس طرح پھنسا دیئے گئے کہ ندیم کو دھچکے بھی نہ لگیں اور اسے ہلنے جلنے میں بھی آسانی ہو۔ کھوکھے کی اونچائی اتنی رکھی گئی تھی کہ ندیم گھٹنے اوپر اٹھا سکتا تھا لکڑی کی دیواروں میں منہ کے قریب دائیں بائیں چھ چھ گول سوراخ ہوا کی آمدورفت کے لیے رکھے ہوئے تھے۔

نذرل چچا بولا: "بیٹا گھبرانا بالکل نہیں۔ سمندر ان دنوں پرسکون ہوتا ہے۔ ہچکولے نہیں لگتے۔ معمولی سی رولنگ ہوتی ہے۔ تمھیں ہوا برابر آتی رہے گی اور ہم تمھارے کھوکھے کو جہاز میں اس طرح رکھوائیں گے کہ تمھارے اوپر کوئی دوسرا کھوکھا نہ رکھا جائے۔ اب میں

کھوکھے کو بند کرتا ہوں۔ ذرا دیکھو تمہیں ہوا کتنی آتی ہے۔،، یہ کہہ کر نذرل چچا نے کھوکھے کے اوپر لکڑی کا تختہ رکھ دیا۔ کھوکھے کے اندر اندھیرا چھا گیا۔ ندیم کو یوں محسوس ہوا جیسے اسے قبر میں بند کر دیا گیا ہے۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اوپر والے تختے اور دائیں بائیں کے سوراخوں میں سے تازہ ہوا کھوکھے میں آ رہی تھی۔ نذرل نے تختہ اٹھا دیا۔ اس کا رشتہ دار بولا ”دم تو نہیں گھٹتا تھا نا بیٹا؟،،

”جی نہیں۔،، ندیم نے آہستہ سے کہا۔ اسے دم گھٹنے کا احساس ضرور ہوا تھا۔ مگر یہ تکلیف اسے ہر حالت میں برداشت کرنی تھی۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ آزادی حاصل کرنے اور نجمی کے شہر کلکتے پہنچنے کے لیے اسے اس جان گسل مرحلے سے بہرحال گزرنا تھا۔

نذرل کہنے لگا ”تمہارے پاس ضرورت کی ہر شے رکھ دی گئی ہے۔ جہاز دوسرے روز شام کو کلکتہ پہنچ جائے گا۔ ہم نے مارواڑی سیٹھ کو تار دے دیا ہے کہ وہ سامان جلدی چھڑا لیا کرے۔ یقیناً وہ پرسوں شام ہی کو سامان چھڑا کر ساتھ لے جائے گا اور تمہیں بندرگاہ کے گودام میں نہیں جانا پڑے گا۔،، نذرل چچا نے گھڑی دیکھی۔ اس کا رشتہ دار بولا ”میرا خیال ہے اب کھوکھا بند کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ مال گودی تک لے جانے کے لیے ٹرک آتا ہی ہوگا۔،،

پھر ندیم کی طرف متوجہ ہو کر کہا ”تختے میں کیل اس طرح ٹھونکی جائیں گی کہ تم تھوڑی سی کوشش کر کے اسے اوپر اٹھا سکو گے۔ ایک ہتھوڑی تمہارے پاس رکھ دی گئی ہے۔“ نذرل چچا نے ندیم کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا اور کہا ”بیٹا! خدا تمہیں بہت جلد خیریت سے پاکستان پہنچائے میری طرف سے اپنے ماں باپ اور دوسرے پاکستانی دوستوں کو سلام کہنا۔ ہم ہمیشہ پاکستان کی سلامتی کی دعائیں کرتے رہیں گے۔،،

ندیم نے نذرل چچا کا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔ اس کی آواز جذباتی ہو گئی۔ اس نے نذرل اور اس کے رشتہ دار کا شکریہ ادا کیا۔ نذرل چچا نے جیب سے دو سو روپے انڈین کرنسی کے نکال کر ندیم کو دیئے اور کہا ”یہ کلکتہ میں تمہارے کام آئیں گے۔ خدا حافظ بیٹا۔،،

کھوکھے کے اوپر تختہ لگا دیا گیا۔ ندیم اندھیرے میں کھوکھے کے اندر خاموش لیٹا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ تختے کو کیلوں سے اس طریقے سے جوڑا گیا کہ وہ اندر سے تھوڑی سی

ضرب لگانے سے کھل سکتا تھا۔ باہر ٹرک کھڑے ہونے اور مزدوروں کی آواز سنائی دی۔ اس وقت گودام میں سے سارا مال ٹرک میں رکھا جانے لگا۔ نذرل کے رشتہ دار نے ندیم والے کھوکھے کو بڑی احتیاط سے دوسرے کھوکھوں کے اوپر رکھوایا اور ٹرک میں بیٹھ کر بندرگاہ کی گودی کی طرف روانہ ہو گیا۔

دوسرے دن سات بجے کرشنا جہاز کو انڈیمان سے روانہ ہونا تھا۔ ندیم چپ چاپ کھوکھے کے اندر بالکل سیدھا لیٹا تھا دل میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ وہ اسے صحیح سلامت کلکتہ پہنچا دے۔ ٹرک بندرگاہ پہ پہنچ گیا۔ نذرل کے رشتہ دار نے اپنی نگرانی میں سامان جہاز کے لوئر ڈیک میں رکھوایا۔ اس بات کا اس نے خاص خیال رکھا کہ ندیم والا کھوکھا دوسرے کھوکھوں کے اوپر رکھا جائے اور ایسا ہی ہوا۔ وہ کھوکھے کے اندر اندھیرے میں لیٹا خدا کو یاد کرتے ہوئے دل میں کلمہ شریف کا ورد کر رہا تھا۔

دوسری طرف عبدل ملاح بھی شبانہ کو ساتھ لے کر اسی جہاز میں سوار ہو چکا تھا۔ یہ باربردار جہاز تھا اور عبدل کا تعلق چونکہ مرچنٹ نیوی سے تھا اس لیے اسے اور شبانہ کو دو الگ الگ کیبن کپتان نے دے دیئے تھے باقی ملاح بھی ڈیک پر سوار ہو گئے تھے۔ دن کے ٹھیک سات بجے۔۔ ”کرشنا،، بحری جہاز نے لنگر اٹھایا اور آہستہ آہستہ بندرگاہ کی جیٹی سے دور ہٹنے لگا۔ شبانہ اور ندیم اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ وہ دونوں ایک ہی جہاز میں سفر کر رہے ہیں۔ ندیم کھوکھے کے اندر لیٹا تھا جہاز کے انجنوں کی آواز سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ جہاز اپنے سفر پر سمندر میں روانہ ہو گیا ہے۔ ندیم نے ایک لمبا سانس لیا اور آنکھیں بند کر کے خدا سے دعا مانگنے لگا۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جنوری کا مہینہ تھا ان دنوں سمندر پرسکون ہوتا ہے۔

جہاز "کرشنا" سکون سے سمندر میں سفر کر رہا تھا۔ شبانہ اپنے کیبن میں لیٹی لاہور کو یاد کر رہی تھی۔ اسے صرف ایک ہی خیال پریشان کر رہا تھا کہ کلکتہ پہنچنے کے بعد وہ بھارت کی سرحد پار کرکے پاکستان کیسے جائے گی۔ عبدل کو یہ معلوم نہیں تھا کہ شبانہ پاکستانی ہے اور اسے ڈھاکہ سے اغوا کرکے ہندوستان لایا گیا تھا۔ شبانہ نے سوچا کہ عبدل ایک نیک دل مسلمان بزرگ ہے وہ کلکتہ پہنچ کر اسے سب کچھ بتا دے گی وہ ضرور اس کی مدد کرے گا۔ شبانہ کلکتہ کے وکیل صاحب کے ہاں دوبارہ نہیں جانا چاہتی تھی یوں ان کے پولیس کے نظروں میں آجانے کا اندیشہ تھا۔ عبدل نے شبانہ سے کہہ رکھا تھا کہ کلکتہ پہنچ کر تم میرے گھر میں اُترنا میں تمھیں اپنی حفاظت میں ڈوبے ہوئے جہاز کے کپتان صاحب کے بنگلے پر پہنچا دوں گا۔ میں نے ان کا بنگلہ دیکھا ہوا ہے ٹالی گنج میں ہے۔ شبانہ وہاں نہیں جانا چاہتی تھی۔ کیونکہ نیک دل کپتان اب اس دنیا میں نہیں تھا وہ تو جہاز کے ساتھ ہی سمندر کے نذر ہو گیا تھا اور وہ اس کی بھانجی بھی نہیں تھی اس کے بیوی بچے صاف عبدل سے کہہ دیں گے کہ یہ لڑکی ہماری رشتے دار نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ میں کلکتہ پہنچ کر عبدل کو ساری بات بتا دوں وہ ضرور مجھے کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچا دے گا وہ جہاز راں ہے جہاز کی کمپنی کا ملازم ہے وہ ضرور اسے کسی ایسے جہاز میں سوار کروا دے گا جو رنگون یا کولمبو جا رہا ہو۔

کرشنا جہاز ہموار رفتار اور ہلکی بے معلوم سی رولنگ کے ساتھ کھلے سمندر میں اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا جہاز کے لوئر ڈیک کے گودام میں ندیم کا کھوکھا بھی دوسرے سامان کے ساتھ

پڑا تھا اس کے اندر ندیم لیٹا خدا کو یاد کر رہا تھا اس کا خیال تھا کہ کھوکھے میں بند ہونے سے اس کا دم ضرور گھٹے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔ اسے سوراخوں میں سے برابر تازہ ہوا آرہی تھی۔ کھوکھے میں اس نے کئی بار پہلو بھی بدلا اور گھٹنوں کو بھی اوپر کیا صرف وہ اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے پلاسٹک کے چھوٹے ڈبے میں سے تھوڑی سی خشک بھنی ہوئی مچھلی نکال کر ڈبل روٹی کے دو ٹکڑوں کے ساتھ کھائی مشکیزے کو منہ لگا کر پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ فضا میں جہاز کے انجن کی آواز کے سوا دوسری کوئی آواز اسے نہیں آرہی تھی ندیم کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس وقت دن ہے یا شام ہو گئی ہے وقت انتہائی سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ جب اسے دوبارہ بھوک لگی تو اس نے اندازہ لگایا کہ رات ہو گئی ہے تھوڑا بہت کھا کر ندیم ایک طرف پہلو کے بل لیٹ گیا یوں اسے کچھ سکون محسوس ہوا نیند اسے نہیں آرہی تھی۔ جہاز میں اب رولنگ شروع ہو گئی تھی۔

لیکن رولنگ زیادہ نہیں تھی۔ نہ جانے کس وقت تھوڑی دیر کے لیئے ندیم کی آنکھ لگ گئی۔ ایک ہی پہلو پر لیٹے رہنے سے اور کچھ کھوکھے کے اندر کی بند فضا کے باعث بہت جلد اس کی آنکھ کھل گئی اس کا جسم اٹھ کر بیٹھنے کا تقاضا کر رہا تھا مگر وہ اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتا تھا اس نے دوسری طرف پہلو بدل لیا جسم جیسے لکڑی کی طرح اکڑ گیا تھا۔ ندیم نے لیٹے لیٹے اپنی ٹانگوں اور بازوؤں کو دبانا شروع کر دیا۔ وہ بہت جلد تھک گیا اور اس کا سانس پھول گیا کیونکہ بند کھوکھے میں آکسیجن وافر مقدار میں نہیں آرہی تھی اس نے محسوس کیا کہ جب سے وہ کھوکھے میں بند ہوا ہے اس کے سانس لینے کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ ندیم کبھی آنکھیں بند کرتا کبھی کھول کر اندھیرے میں کھوکھے کی چھت کے سوراخوں کو دیکھنے کی کوشش کرتا۔ ان سوراخوں کو وہ اپنی انگلی سے کئی بار چھو چکا تھا۔

اسی جہاز کے درمیانے ڈیک کے ایک کیبن میں شبانہ برتھ پر لیٹی سونے کی کوشش کر رہی تھی عبدل دوسرے کیبن میں گہری نیند سو رہا تھا اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ جہاز رات کی تاریکی میں کالے پانی کے سمندر میں لہروں کو چیرتا ہوا اپنی منزل کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ رات گزر گئی۔ ندیم کا جسم پتھر کی طرح ہو رہا تھا اس کی رات سوتے جاگتے گزری تھی اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ رات گزر گئی ہے اور باہر سمندر پر سورج کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔

جب اسے بھوک لگی تو سمجھ گیا کہ دوسرا دن طلوع ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے بازوؤں کو دباتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا۔ اب صرف دس بارہ گھنٹوں کا سفر باقی تھا۔ شام کو جہاز کلکتے پہنچنے والا تھا۔ ندیم نے اپنی ٹانگوں پر زور زور سے رگڑ کر مالش کی۔ پھر کچھ بسکٹ ایک ٹوسٹ اور تھوڑے سے خشک میوے کھا کر پانی پیا اور پہلو کے بل لیٹ گیا۔ مگر جلد ہی سیدھا ہو گیا۔

اوپر والے کیبن میں شبانہ عبدل کے ساتھ ناشتہ کر رہی تھی۔ ناشتہ کے بعد وہ ڈیک پر سمندر کی تازہ ہوا میں آ گئی۔ سمندری ہوا میں اس کے بال اُڑنے لگے۔ اس نے سر پہ ساڑھی کا پلو کر لیا۔ اور سیاہ سمندر کی وسعتوں کو دیکھنے لگی۔ چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ اور دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر کھلی ہوا میں سمندر کا نظارہ کرنے کے بعد شبانہ نیچے اپنے کیبن میں آ کر لیٹ گئی۔ اس کے ذہن کو ایک بار پھر پریشان خیالوں نے گھیر لیا۔

جہاز اپنے سفر پر رواں دواں تھا۔ دوپہر بھی گزر گئی۔ جب سورج مغربی افق میں سمندر پر چمکنا شروع ہوا تو دور زمین کی لکیر دکھائی دی۔ جہاز کے ملاح ایک دوسرے کو دور سے نظر آتی زمین کی کالی لکیر دکھانے لگے۔ عبدل نے شبانہ کے کیبن میں جا کر کہا کہ اوپر چلو بیٹی، زمین نظر آ گئی ہے۔ ہم کلکتہ پہنچنے والے ہیں۔ شبانہ جلدی سے عبدل کے ساتھ جہاز کے عرشے پر آ گئی۔ زمین کی سیاہ لکیر ایک قوس کی طرح نظر آ رہی تھی۔ شبانہ کو زمین دیکھ کر کوئی خوشی نہ ہوئی۔ وہ دشمن کی سرزمین سے نکل کر دوبارہ دشمن ہی کی سرزمین میں داخل ہو رہی تھی۔ صرف اتنی تسلی اسے ضرور ہوئی تھی کہ اس کا جہاز خیریت سے ساحل کے قریب پہنچ گیا تھا اور اس میں کوئی دھماکہ نہیں ہوا تھا۔ شبانہ پر ایک بار پھر اضطراری کیفیت طاری ہو گئی۔ عبدل اس کے پاس ہی کھڑا قریب آتے ساحل کی لکیر دیکھ رہا تھا۔ اب آبی پرندے بھی جہاز کے اوپر منڈلانے لگے تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ ساحل دور نہیں۔ شبانہ نے سوچا کہ وہ کلکتہ پہنچ کر ہی عبدل کو اپنے بارے میں بتائے گی۔ سمندری ہوا کے شور میں وہ اطمینان سے بات نہیں کر سکتی تھی۔

ایک گھنٹے بعد ساحل اور قریب آ گیا۔ اب سمندر میں ایک جگہ پر ڈولتے ہوئے غبارے بھی گزرنے لگے جو جہاز کو راستہ دکھا رہے تھے۔ سورج غروب ہوا تو اس کی سرخ روشنی میں کنارے کے درخت صاف نظر آ رہے تھے۔ جہاز اب سمندر سے نکل کر دریائے ہگلی میں داخل ہو چکا تھا۔ پانی کا رنگ گدلا ہو گیا تھا۔ شام کا سرمئی اندھیرا پھیل گیا تھا۔ کلکتے کی بندرگاہ پر روشنیاں...

ہو رہی تھیں کہ جہاز نے بندرگاہ کے قریب پہنچ کر وسل دینی شروع کر دی۔

ندیم نے جہاز کے بھونپوں کی بار بار بلند ہوتی آوازیں سنیں تو سمجھ گیا کہ جہاز گودی پر لگنے والا ہے۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور ہاتھ سے اپنی ٹانگوں اور بازوؤں کی مالش کرنے لگا۔ جہاز گودی کے ساتھ جا کر لگ گیا۔ فوراً لنگر پھینک دیا گیا۔ انجن بند ہوئے تو ندیم کی جان میں جان آئی۔ اب وہ یہ انتظار کرنے لگا کہ کب اس کا کھوکھا دوسرے سامان کے ساتھ جہاز سے باہر نکالا جاتا ہے۔

دوسری طرف عبدل نے شبانہ کو ساتھ لیا اور بندرگاہ سے باہر آ گیا۔ شام ہو چکی تھی۔... بندرگاہ کے باہر ہی اسے رکشہ مل گیا۔ عبدل شبانہ کو لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ڈیڑھ ایک گھنٹے کے بعد جہاز کا سامان باہر نکالا جانے لگا۔

مارواڑی سیٹھ کو انڈمان کے تاجر کا تار مل گیا تھا اور وہ مال کو وصول کرنے اپنے آدمیوں کے ساتھ بندرگاہ پر موجود تھا۔ مزید دو گھنٹے مال کو کلیئر کروانے میں لگ گئے۔ ندیم کھوکھے کے اندر لیٹا تھا۔ سوراخوں میں سے بندرگاہ کی روشنی کھوکھے میں آ رہی تھی۔ گودی پر اس کا کھوکھا دوسرے کھوکھوں پر رکھا گیا تو اسے دھچکا لگا تھا مگر فوم کے تکیوں نے اسے چوٹ نہیں لگنے دی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے کھوکھے کو ٹرک میں رکھا جا رہا ہے۔ پھر ٹرک کلکتے کی سڑک پر روانہ ہو گیا۔ مارواڑی سیٹھ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اس کا گودام رپن اسٹریٹ میں تھا۔ سیٹھ نے مال گودام میں جا کر لگوا دیا۔ ندیم کو دروازہ بند کرنے کی آواز آئی اور پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ یہ ندیم کی خوش قسمتی تھی کہ اس کا کھوکھا دوسرے کھوکھوں کے نیچے نہیں دبا تھا۔ کل سات کھوکھے تھے اور ندیم جس کھوکھے میں بند تھا وہ کونے میں دو کھوکھوں کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ جب ندیم کو یقین ہو گیا کہ گودام میں اب کوئی مزدور یا چوکیدار نہیں ہے تو اس نے اپنی ٹانگ کے پاس پڑی ہوئی ہتھوڑی اٹھائی اور اوپر لگے تختے کے کنارے سے لگا کر زور سے دبانا شروع کر دیا۔ پندرہ بیس منٹ کی کوشش کے بعد وہ تختے کو اکھاڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ تختہ دوسری طرف کر کے ندیم نے اپنا آدھا دھڑ اوپر اٹھا لیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی کمر لکڑی کی بن چکی ہے۔ وہ جلدی سے دوبارہ لیٹ گیا۔ پھر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ تازہ اور وافر مقدار میں آکسیجن نے اس کی توانائی کو کافی حد تک بحال کر دیا۔ ایک بار پھر اس نے

اوپر والا دھڑ اوپر اٹھا کر باہر دیکھا۔ یہ ایک اونچی چھت والا چھوٹا سا گودام تھا جس کی چھت سے بلب لگا تھا۔ بلب کی روشنی میں ندیم نے گودام کا جائزہ لیا۔ پھر ٹانگوں کو ہتھیلیوں سے زور زور سے رگڑا اور کھوکھے سے نکل آیا۔ باہر نکلنے سے پہلے اس نے مٹی کے تیل کی بوتل اور ماچس اٹھالی تھی۔ فرش پر کھڑے ہونے سے اس کی ٹانگیں لڑکھڑا سی گئیں۔ ندیم نے دو تین بیٹھکیں نکالیں۔ دورانِ خون نارمل ہو گیا۔ گودام کے دروازے کے پاس جا کر اس نے جھری میں سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ باہر ایک تنگ سی گلی تھی جہاں ہلکی روشنی ہو رہی تھی یہ کھمبے پر لگے بلب کی روشنی تھی۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ ندیم کو کسی وقت باہر سے کسی موٹر گاڑی اور بگھی کے گزرنے کی آواز آجاتی تھی۔ ندیم وہاں سے نکلنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ گودام میں کوئی روشندان بھی نہیں تھا۔ ندیم نے دروازے کا جائزہ لیا۔ یہ لکڑی کا دروازہ تھا جس کے باہر تالا لگا تھا۔ یہ تالا لوہے کے کنڈے کو پھنسا کر لگایا گیا تھا دروازے کے دونوں کواڑوں کے درمیان ذرا دبانے سے ایک لمبی جھری نمودار ہو گئی۔ اس جھری میں سے وہ کنڈا تھوڑا سا نظر آنے لگا جس میں تالا لگایا گیا تھا۔ اب ندیم گودام میں لوہے کی سلاخ تلاش کرنے لگا۔ گودام میں اس قسم کی چیزیں مل جایا کرتی تھیں۔ اور ندیم کو بھی بہت جلد کونے کے سامان میں سے لوہے کی ایک مضبوط سلاخ مل گئی۔ اس نے سلاخ کو جھری میں زور لگا کر کنڈے میں پھنسا دیا۔ اب اس نے سلاخ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر کو جھٹکا دیا۔ کنڈا اپنی جگہ سے ہل گیا۔ تین چار جھٹکوں کے بعد کنڈا ایک جانب سے اکھڑ کر لٹکنے لگا۔ ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ ندیم کو ایسا محسوس ہوا جیسے بہشت کا دروازہ کھل گیا ہو۔ اس نے کواڑ کو ذرا سا کھول کر گلی میں جھانکا۔ یہ ایک تنگ گلی تھی جہاں بلڈنگوں کے پچھواڑے لگتے تھے اور بلب کی روشنی میں اسے کئی جگہ کچرے کے ڈھیر بھی پڑے دکھائی دیئے۔ یہ کچرا بلڈنگ میں رہنے والوں نے کچن کی کھڑکیوں سے نیچے پھینکا تھا۔ کلکتے میں اس قسم کی گلیاں ضرور رکھی جاتی ہیں اور انھیں کچرا گلی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ کچرا گلیاں تنگ کھولیوں والی عمارتوں کے پچھواڑے کے درمیان بنائی جاتی ہیں۔ کھولیوں اور فلیٹوں میں رہنے والے کچن میں سے کوڑا کرکٹ ان گلیوں میں پھینک دیتے ہیں۔ جہاں صبح و شام کارپوریشنوں کے ٹرک آکر کچرا اٹھا کر

لے جاتے ہیں۔

ندیم نے کیواڑ بند کر دیا۔ اب اسے اپنے کھوکھے کو آگ لگانی تھی تاکہ اس کے فرار کا کوئی ثبوت گودام میں باقی نہ رہے۔ اس نے مٹی کے تیل کو اپنے کھوکھے پر اچھی طرح سے چھڑک دیا۔ پھر ماچس جلائی اور کھوکھے کو دکھا دی۔ مٹی کے تیل نے فوراً آگ پکڑ لی اور کھوکھے میں سے شعلے بلند ہونے لگے۔ اس کے ساتھ ہی ندیم کیواڑ کھول کر گودام سے نکل کر کچرا گلی میں آگیا۔ ۔۔ نذرل چچا کے دیئے ہوئے دو سو روپے ندیم کی جیب میں پڑے ہوئے تھے۔ کلکتہ شہر کے بازاروں سے ندیم کافی حد تک واقف تھا۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ پولیس ضرور اس کی تلاش میں ہو گی۔ کیونکہ انڈمان سے یہاں پولیس ہیڈ کوارٹر میں اس کے فرار کی اطلاع پہنچ چکی ہو گی۔ ندیم دھوتی کرتے میں ملبوس تھا۔ یہ لباس نذرل چچا نے اسے دیا تھا۔ گلی سے گزر کر ندیم بازار میں آکر سر جھکائے ایک طرف چلنے لگا۔ بازار میں اکا دکا لوگ آجا رہے تھے۔ فلیٹوں اور کھولیوں میں۔۔ روشنی ہو رہی تھی۔ دکانیں بند تھیں۔ ندیم سمجھ گیا کہ رات کافی گزر چکی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہاں آگ کا شور مچنے والا تھا۔ ندیم تیز تیز قدموں سے بازار میں سے نکل کر ایک دوسرے بازار کی طرف مڑ گیا۔ یہ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ کونسا علاقہ ہے۔ کلکتہ ایک بہت بڑا شہر تھا اور ندیم اس کے سارے علاقوں سے واقف نہیں تھا۔ وہ ایک بڑی سڑک پر آگیا جس کی دونوں جانب اونچی رہائشی عمارتیں تھیں۔ اسے بہت جلدی کسی جگہ پناہ لینے کی ضرورت تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے کہاں پناہ مل سکتی ہے۔ کلکتے میں ایک ہی جگہ تھی جہاں وہ چھپ سکتا تھا اور یہ امجدیہ ہوٹل والے جبار سیٹھ کی بیٹھک ہی ہو سکتی تھی۔ اب اسے ایک رکشہ یا ٹیکسی کی ضرورت تھی جو اسے زکریا اسٹریٹ پہنچا دے۔ ایک خالی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر ندیم نے روک لیا۔ دوسرے لمحے ٹیکسی زکریا اسٹریٹ کی طرف جا رہی تھی۔

ندیم زکریا اسٹریٹ کے شروع میں ہی ٹیکسی سے اتر گیا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ بازار میں زیادہ رونق نہیں تھی۔ ندیم کو سیٹھ جبار کی بیٹھک کا پتہ تھا۔ وہ امجدیہ ہوٹل کے پچھواڑے اسی بلڈنگ میں تھی۔ وہ بازار میں سر جھکائے چلتا ہوا ہوٹل کے پچھواڑے سیٹھ کی بیٹھک کے پاس آکر رک گیا۔ بیٹھک کا دروازہ بند تھا اسے معلوم تھا کہ سیٹھ جبار رات دس بجے کے بعد

اپنی بیٹھک میں آجاتا ہے۔ اس نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ سیٹھ جبار کے بوڑھے بنگالی نوکر نے دروازہ کھول کر ندیم کو غور سے دیکھا وہ اس کی شکل سے شناسا تھا۔ پھر بھی اس نے پوچھا کہ کس سے ملنا ہے۔ ندیم نے سیٹھ کا نام لیا اور نوکر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد سیٹھ جبار خود وہاں آگیا۔ اس نے ندیم کو جلدی سے اندر آنے کا اشارہ کیا اور دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ وہ ندیم کو اپنی بیٹھک میں لے گیا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم ابھی تک پاکستان نہیں گئے ؟"

بیٹھک میں سوائے ان دونوں کے اور کوئی نہیں تھا۔ ندیم پلنگ کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور اسے ساری روداد سنا دی۔ سیٹھ جبار سگریٹ سلگائے غور سے سنتا رہا۔ وہ پلنگ پر بیٹھا تھا۔ جب ندیم اپنی کہانی سنا چکا تو سیٹھ جبار سگریٹ کا گل جھاڑتے ہوئے بولا۔

"برخوردار تم کو اب تک پاکستان چلے جانا چاہیئے تھا۔ میں نے تمھارا انتظام بھی کیا مگر تم غائب ہو گئے۔ اب حالات ایسے ہیں کہ اگرچہ جنگ بندی ہو چکی ہے مگر فوجیں سرحدوں پر کھڑی ہیں ڈھاکا جانے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دونوں ملکوں کے سفارت خانے بھی بند ہیں۔ میں تمھارے لیے صرف یہی کر سکتا ہوں کہ تمھیں کچھ دن اپنے پاس چھپائے رکھوں۔ اگرچہ اس میں میرے لیے بہت خطرہ ہے لیکن تم مسلمان ہو اور مصیبت میں پھنسے ہوئے ہو۔ تمھاری مدد کرنا میرا فرض ہے۔ تمھارا یہاں میری بیٹھک میں رہنا مناسب نہیں۔ رات گہری ہو جانے دو۔ میں تمھیں دریا پار ایک جگہ لے چلوں گا۔ وہاں تمھیں اس وقت تک رہنا ہوگا جب تک کہ دونوں ملکوں کی فوجیں سرحدوں سے پیچھے نہیں ہٹ جاتیں تب میں تمھیں اپنے آدمی کے سپرد کر دوں گا جو تمھیں انڈیا کا بارڈر کراس کروا دے گا۔ خبردار اب اپنی چندا کا خیال دل میں مت لانا۔ ورنہ ساری زندگی یہاں کی جیلوں میں سڑتے رہو گے۔ ایسا کرو اوپر والی کوٹھڑی میں جا کر آرام کرو۔

"تم نے کھانا کھایا ہے ؟"

ندیم نے کہا "کھوکھے میں رکھی ہوئی تھوڑی سی مچھلی شام کو کھائی تھی"۔ سیٹھ جبار نے ندیم کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "تم نے کمال کر دیا جو ایک لکڑی کے کھوکھے میں بند ہو کر یہاں پہنچے میں تمھاری بہادری کی داد دیتا ہوں تم اوپر چلو۔ میں تمھارے لیے کھانا بھجواتا ہوں"۔

ندیم اوپر والی کوٹھڑی میں آکر چارپائی پر لیٹ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں بوڑھا نوکر جو مسلمان بنگالی تھا اور سیٹھ جبار کا خاص آدمی تھا ندیم کے لیے کھانا لے کر آگیا۔ ساتھ سگریٹ کی ڈبی اور ماچس بھی تھی۔ ندیم نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ پھر سگریٹ سلگا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ پیٹ میں اناج پڑتے ہی اس کا خیال نجمی کی طرف نکل گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ نجمی کے بغیر وہ کیسے بارڈر کراس کر سکتا ہے ؟ نہیں نہیں۔ وہ نجمی کو یہاں اکیلا چھوڑ کر کبھی واپس نہیں جائے گا۔ وہ اسے اپنے... ساتھ لے کر جائے گا، اب یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ اناج کے خمار سے ندیم کی آنکھیں بار بار بند ہونے لگیں۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں دبایا اور چادر اوپر کر لی۔ اس کے ساتھ ہی وہ گہری نیند میں کھو گیا۔

ادھر شبانہ نے بھی نیک دل بزرگ ملاح عبدل کے آگے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ وہ عبدل کے چھوٹے سے مکان میں چارپائی پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ادھیڑ عمر عبدل اس کے سامنے مونڈھے پر بیٹھا تھا۔ عبدل کی بوڑھی بیوی ابھی انھیں کھانا کھلانے کے بعد برتن لے کر باہر گئی تھی۔ شبانہ کی دردبھری داستان کا عبدل پر بہت اثر ہوا تھا۔ مشرقی پاکستان سے کئی عورتوں کو مکتی باہنی والے اغوا کر کے لے آئے تھے جن میں بعض فرار ہو گئی تھیں اور کچھ نے خودکشی کر لی تھی۔ عبدل نے شبانہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے حوصلہ دیا اور کہا کہ وہ اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھے۔

"بیٹی ! تم اگر چاہو تو ساری زندگی اس گھر میں رہ سکتی ہو۔ مجھے اپنا باپ ہی سمجھو۔ میں مسلمان ہوں اور کسی مسلمان بچّی کو مصیبت میں دیکھ کر آنکھیں نہیں پھیر سکتا"۔

شبانہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا کہ وہ پاکستان جانا چاہتی ہے۔ عبدل نے کہا "اگر تمھاری یہی خواہش ہے تو میں تمھیں پاکستان پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ یہی ہو سکتا ہے کہ جس روز میں اپنے کسی دوسرے جہاز پر رنگون جاؤں تو تمھیں بھی ساتھ لیتا چلوں۔ رنگون سے جیسا کہ تم نے مجھے بتایا ہے تم اپنے ملک کے سفارت خانے میں پناہ حاصل کر سکتی ہو۔"

شبانہ بھی یہی چاہتی تھی۔ اس کے ذہن سے ایک بوجھ سا اتر گیا۔ عبدل بولا "اب تم آرام کرو بیٹی۔ کل میں اپنی کمپنی کے دفتر جا کر رپورٹ کروں گا اور یہ بھی معلوم کروں گا اب کس جہاز پر میری

ڈیوٹی لگنے والی ہے۔ ہماری کمپنی کے جہاز رنگون کے علاوہ جاپان اور افریقہ بھی جاتے ہیں۔"

دوسرے روز عبدل جانے لگا تو اس نے شبانہ کو پیار کیا اور بولا "بیٹی! میں نے اپنی بیوی کو بھی سمجھا دیا ہے۔ تم بھی خیال رکھنا گھر سے باہر مت نکلنا۔ اگر کسی نے پولیس کو خبر کر دی تو وہ لوگ تمھارے ساتھ مجھے بھی ایک پاکستانی کو پناہ دینے کے الزام میں پکڑ لیں گے۔"

عبدل اپنی بیوی کے ساتھ اس مکان میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کے بچے اپنے اپنے گھروں میں الگ رہتے تھے۔ عبدل اپنی کمپنی کے آفس میں رپورٹ کرنے چل دیا۔ عبدل کی بیوی نے شبانہ کو نئی سوتی ساڑھی پہننے کو دی اور اپنی طرف سے بھی اسے تسلّی دی۔ اس نے بھی شبانہ کی ساری دکھ بھری داستان سن لی تھی۔ وہ بھی عبدل کی طرح ایک نیک اور پارسا بنگالی مسلمان خاتون تھی۔ عبدل کا مکان جھگی ٹولہ بستی کے کونے میں ایک گندے تالاب کے کنارے پر واقع تھا۔ اس بستی میں زیادہ تر ملّاح مچھیرے اور مل مزدور رہتے تھے۔ شبانہ دن بھر مکان کے اندر ہی رہتی۔ جس قسم کی آبادی میں عبدل کا مکان تھا وہاں ایسا ہو نہیں سکتا تھا کہ شبانہ کے بارے میں لوگوں کو پتہ نہ چلتا۔ عبدل کے گھر میں محلّے کی عورتوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اگرچہ شبانہ دن کے وقت زیادہ تر کوٹھڑی میں رہتی لیکن اس کے باوجود محلّے میں یہ خبر پھیل گئی کہ عبدل کے گھر میں ایک نئی لڑکی آگئی ہے۔ خدا جانے وہ اسے کہاں سے لایا ہے۔ جب یہ خبر عبدل تک پہنچی تو اس نے یہی بہتر سمجھا کہ لوگوں کو شبانہ کے بارے میں ایک فرضی کہانی گھڑ کر سنا دی جائے۔ اس نے شبانہ کے بارے میں یہی بتایا کہ وہ اس کے ایک بہاری مسلمان دوست کی بیٹی ہے جو اس کے ساتھ رنگون جا رہا تھا۔ مگر بدقسمتی سے جہاز کے ساتھ ہی سمندر میں ڈوب گیا۔ لوگوں نے عبدل کے بیان پر اعتبار کر لیا اور اب شبانہ مکان کے دالان میں آکر عبدل کی بیوی کا کھانا وغیرہ پکانے میں ہاتھ بھی بٹانے لگی۔ لیکن اس کا ایک نقصان یہ بھی ہوا کہ اڑتے اڑاتے یہ خبر روپا نامی ہندو بنگالی بدمعاش کے کانوں تک بھی پہنچ گئی جو اس بستی کے قریب ایک کھولی میں جوا کراتا تھا۔ ہم قارئین کی یاد دہانی کے لیے یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ وہی روپا بدمعاش تھا جس نے اپنے ساتھی کالی بدمعاش سے مل کر نجمی کو خضر پور جیٹی والے ہریل سے خریدا تھا۔ نجمی نے ہریل اور اس کی موٹی بیوی کو ہلاک کر کے اپنی انتقام کی آگ سرد کر لی تھی۔ لیکن ابھی روپا اور کالی بدمعاش سے بدلہ لینا باقی تھا۔ روپا بدمعاش نے جب یہ سنا کہ عبدل ملّاح کے مکان پر کوئی بہاری لڑکی آئی ہے جس کا رنگ گورا ہے اور عبدل کہتا ہے کہ اس کا باپ سمندر میں ڈوب گیا تھا......

تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ ڈھاکا اور چٹاگانگ سے کئی لڑکیاں اغوا ہو کر کلکتے لائی گئی تھیں۔ مگر ان کے دام اتنے اونچے تھے کہ روپا اور کالی کوئی لڑکی بھی نہیں خرید سکے تھے۔ روپا نے کالی بدمعاش کو بلا کر کہا "دادا! عبدل کے گھر جو بہاری لڑکی پڑی ہے تمھارا اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

کالی بدمعاش بیڑی کا کش لگا کر بولا "دادا! سنا ہے وہ گوری چٹی ہے۔"

روپا بدمعاش کی چھوٹی چھوٹی مکّار آنکھیں سکڑ گئیں۔ سر کھجاتے ہوئے بولا "کالی! کسی کٹنی کو عبدل کے گھر بھیج کر معلوم کرو کہ یہ لڑکی کون ہے۔"

کالی کے پاس بنارس کی ایک چالاک عورت موجود تھی۔ اس عورت کا نام سندری تھا اور عمر پچاس سے اوپر ہو رہی تھی۔ اس کی ساری عمر جرائم پیشہ لوگوں میں گزری تھی۔ بھیس بدلنے میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔ وہ بیراگن کا بھیس بدل کر عبدل کے گھر جا پہنچی۔ بنگال کے مسلمان دین اسلام کے ارکان کی اگرچہ سختی سے پابندی کرتے ہیں لیکن ان پر ہندو کلچر کا بھی گہرا اثر ہے۔ عبدل کی بیوی نے بیراگن کو دیکھا تو اس کی آؤ بھگت کی۔ اس کو کھانا کھلایا۔ شبانہ نے سندری بیراگن کے لیے چائے بنائی۔ مکار سندری نے گھور کر شبانہ کو دیکھا اور پھر ہر ہر مہادیوں کا نعرہ لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے مراقبے میں چلی گئی ہو۔ شبانہ اور عبدل کی بیوی ادب سے ایک طرف خاموش بیٹھی تھیں۔ سندری بیراگن نے آنکھیں بند کیے ایک بار پھر الکھ نرنجن۔ جے کالی ماتا" کا نعرہ لگایا اور آنکھیں کھول دیں۔ پھر شبانہ کو آگے بلا کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا اور کہا "بچی! بھگوان نے تیرے کشٹ دور کر دیئے ہیں تو کالی ماتا کی مرضی سے عبدل کے گھر پہ آئی ہے۔ جا اندر جا کر آرام کر۔"

شبانہ چپکے سے اٹھ کر اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد مکّار بیراگن نے عبدل کی بیوی کی طرف اپنی لال لال آنکھیں گھمائیں اور کہا "مجھے معلوم ہے کہ یہ لڑکی ڈھاکا سے لائی گئی ہے۔ پرنتو میں تیری زبان سے سنوں گی۔ کالی ماتا کی یہی مرضی ہے۔ مجھے بتا دے عبدل اس لڑکی کو کہاں سے لایا ہے پھر کالی میا تمھیں اپنی شرن میں لے لے گی۔"

عبدل کی ادھیڑ عمر بیوی ضعیف الاعتقاد تھی۔ فوراً اس نے عیّار بیراگن کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور اسے شبانہ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

بیراگن سندری مسکرائی۔ بولی "کالی ماتا کی اچھا پوری ہو گئی۔ اب تجھے کوئی چنتا کرنے کی ضرورت نہیں۔

بھگوان تیری رکھشا کریں گے۔ میرے بارے میں عبدل کو کچھ نہ بتانا۔ میں پھر آؤں گی اور تمہیں کالی میا کی مالا کا پوتر منکا دوں گی۔"

سندری بیراگن جسے کالی ماتا کا نعرہ لگا کر وہاں سے چل دی۔ روپا بدمعاش کی جوئے کی بیٹھک میں آتے ہی اس نے کالی اور روپا کو شبانہ کی اصل حقیقت بیان کر دی۔ روپا نے کالی کی طرف دیکھا۔ دونوں ایک عجیب انداز میں مسکرائے۔ روپا نے سندری کو دس روپے انعام دے کر رخصت کر دیا۔ تین دن بعد عیار سندری نے ایک بار پھر بیراگن کا روپ بھرا اور اس وقت عبدل کے مکان پر جا پہنچی جب اسے معلوم تھا کہ عبدل گھر پر نہیں ہوگا۔ عبدل کی بیوی نے بیراگن کو سلام کر کے مونڈھے پر بٹھایا اور شبانہ کو چائے بنانے کے لیے کہا۔

عیار بیراگن نے گدڑی میں سے کالے رنگ کا ایک منکا نکال کر عبدل کی بیوی کو دکھایا اور بولی "کالی ماتا تجھ سے بڑی خوش ہیں۔ اس بے آسرا بچی کو اپنے ہاں رکھ کر تو نے کالی ماتا کا جی موہ لیا ہے۔ اس نے تیرے لیے اپنی مالا کا منکا بھیجا ہے۔ لے۔ تیرے بھاگ کھل جائیں گے۔"

عبدل کی بیوی نے منکا لے کر چوما۔ آنکھوں سے لگایا اور ساڑھی کے پلو میں باندھ کر رکھ لیا۔ کہنے لگی "میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

بیراگن نے پوچھا "تمہاری بچی کہاں ہے؟"

عبدل کی بیوی نے کہا "وہ اندر کوٹھڑی میں سو رہی ہے۔" بیراگن یہی سننا چاہتی تھی۔ فوراً آنکھیں بند کیں اور بولی "ابھی چائے مت بنانا۔ تیرے لیے کالی ماتا نے ایک حکم دیا ہے۔ اس منکے کو لے کر ابھی تالاب والے میدان میں جا اور وہاں اسے کسی جگہ مٹی میں دبا دے۔ تین دن مٹی میں دبے رہنے کے بعد یہ منکا سونے کا بن جائے گا۔ فوراً جا۔ کالی ماتا اس وقت تجھ پر بڑی مہربان ہے۔" عبدل کی ضعیف الاعتقاد بیوی نے چائے کی کیتلی وہیں رکھی اور مکان سے باہر نکل گئی۔

اسے نکلے بمشکل ایک منٹ ہی گزرا ہوگا کہ روپا اور کالی بدمعاش اندر گھس آئے۔ کالی نے ایک خالی بوری کاندھے پر ڈال رکھی تھی۔

روپا بدمعاش نے آتے ہی بیراگن سے دھیمی آواز میں پوچھا "لڑکی کہاں ہے؟"

بیراگن نے کہا "اندر سو رہی ہے۔"

دونوں بدمعاش کوٹھڑی میں گھس گئے۔ شبانہ بانس کی کھاٹ پر گہری نیند سو رہی تھی۔ روپا نے جیب سے رومال نکال کر اس پر بے ہوشی کی دوائی کے قطرے ڈالے اور شبانہ کی ناک پر رکھ کر اسے ہاتھ سے دبا دیا۔ شبانہ نے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی۔ کالی بدمعاش نے اس کے بازوؤں کو پکڑ لیا۔ شبانہ دوسرے سانس پر بے ہوش ہو چکی تھی۔ انھوں نے فوراً شبانہ کو بوری میں بند کیا۔ کالی نے بوری کاندھے پر رکھی اور دونوں تیز تیز قدموں کے ساتھ مکان سے باہر نکل گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کالی بدمعاش نے ناریلوں کی بوری کاندھے پر رکھی ہو۔ بستی کے باہر کالی کی ٹیکسی کھڑی تھی۔ انھوں نے بوری میں بند بے ہوش شبانہ کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈالا۔ روپا بدمعاش اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور کالی گاڑی اسٹارٹ کر کے وہاں سے نکال کر لے گیا۔ ان کے جانے کے فوراً بعد عیار بیراگن بھی عبدل کے مکان سے چل دی تھی۔ جب عبدل کی بیوی منکا میدان میں دبا کر واپس آئی تو دیکھا کہ بیراگن غائب ہے۔ ادھر ادھر دیکھا۔ جب وہ کہیں نظر نہ آئی تو شبانہ کی کوٹھڑی میں گئی۔ یہ دیکھ کر اس کا سانس اوپر کا اوپر رہ گیا کہ شبانہ بھی غائب ہے۔ سر کو پکڑ کر وہیں بیٹھ گئی۔ دوپہر کے بعد عبدل آ گیا۔ اسے شبانہ کی گمشدگی کا علم ہوا تو پریشان ہو کر اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ سارا علاقہ چھان مارا مگر شبانہ کا کچھ پتہ نہ چلا۔ مایوس ہو کر اپنے مکان پر واپس آ گیا۔

اس وقت شبانہ روپا بدمعاش کی ایک خفیہ کمین گاہ میں چارپائی پر بے ہوش پڑی تھی۔ یہ کمین گاہ دریا پار ایک ویران جنگل میں واقع تھی۔ یہاں روپا بدمعاش منشیات کا اسٹاک چھپا کر رکھتا تھا۔ شبانہ کو جس وقت ہوش آیا تو اس نے ایک تنگ سی کوٹھڑی میں اپنے آپ کو پایا۔ چھت میں بانس پڑے تھے۔ کونے میں ٹین کے پیپے رکھے ہوئے تھے۔ کونے میں ایک اسٹول تھا جس پر رکھی ہوئی لالٹین جل رہی تھی۔ شبانہ کی گردن دکھ رہی تھی اور سر جیسے پتھر ہو گیا تھا۔ اسے باہر دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ شبانہ نے بڑی مشکل سے گردن ہلا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ روپا اور کالی بدمعاش اندر داخل ہوئے۔ روپا بدمعاش آگے تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کیمرہ تھا جس پر فلیش لگی ہوئی تھی۔ اس نے آتے ہی شبانہ کو بنگلہ میں گالی دی اور کالی سے کہا "ارے اسے اٹھا کر بٹھا۔"

کالی نے شبانہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے چارپائی پر بٹھا دیا۔ شبانہ کا رنگ اڑ گیا تھا اور دل خوف کے مارے بیٹھا جا رہا تھا۔ کالی بدمعاش نے شبانہ کی گردن میں ہاتھ ڈال دیا۔ شبانہ کے جسم میں اتنی طاقت ہی نہیں

رہی تھی کہ وہ کالی بدمعاش کو پرے ہٹا سکتی۔ روپا بدمعاش نے اوپر تلے شبانہ کی تین تصویریں کھینچ لیں۔ پھر کیمرے سے فلیش گن اتارتے ہوئے بولا "لٹا دے اس کو کالی۔"

کالی نے شبانہ کو چارپائی پر لٹا دیا۔ دونوں باہر نکل گئے۔ شبانہ سمجھ گئی کہ اسے عبدل کے گھر سے اغوا کر لیا گیا ہے اور یہ وہ بدمعاش لوگ ہیں جو اسے بیہوش کرنے کے بعد یہاں لے آئے ہیں۔

کچھ دیر بعد شبانہ کے جسم کی توانائی کچھ بحال ہوئی تو اس نے اٹھ کر دروازے کی جھری میں سے باہر جھانکا۔ یہ رات کا وقت تھا۔ باہر کوئی روشنی نہیں تھی۔ اندھیرا تھا۔ کوٹھڑی کے آگے لکڑی کا چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ اس برآمدے کی سیڑھیوں کے پاس اسے ایک آدمی بیٹھا نظر آیا۔ یہ پہرے دار ہی ہو سکتا تھا۔ شبانہ چارپائی پر واپس آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ جو سلوک ہونے والا تھا اس کا وہ بخوبی اندازہ لگا سکتی تھی۔ اس کی عافیت اسی میں تھی کہ جس طرح سے بھی ممکن ہو وہ وہاں سے نکل بھاگے۔ وہ اٹھ کر دوبارہ دروازے کے پاس گئی۔ یہ لکڑی کا دروازہ تھا اور باہر سے تالا لگا تھا۔ برآمدے میں بیٹھا ہوا آدمی اب سگریٹ پی رہا تھا۔ اندھیرے میں جب وہ کش لگاتا تو سگریٹ کا گل سرخ ہو کر چمک اٹھتا۔ یہ آدمی اسے وہاں سے بھاگنے نہیں دے گا۔ یقیناً اس کے پاس اسلحہ بھی ہو گا۔ یہ لوگ جرائم پیشہ ہیں اور کسی کو قتل کر دینا ان کے لیے معمولی بات ہے۔ شبانہ کے ذہن میں اسی قسم کے خیالات گردش کر رہے تھے۔ وہ چارپائی پر سر تھام کر بیٹھ گئی۔ اس نے سر اٹھا کر کوٹھڑی کی دیواروں کو دیکھا دیواریں پتھر کی بنی ہوئی تھیں۔ کوئی روشندان تک نہیں رکھا گیا تھا۔ چھت میں کڑیوں کی جگہ موٹے موٹے بانس ڈالے گئے تھے۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ شبانہ نے ساری رات اسی پریشانی کے عالم میں کاٹ دی۔

دن کی روشنی دروازے کی جھریوں میں سے کوٹھڑی میں آنے لگی۔ شبانہ کا حلق خشک ہو رہا تھا اسے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ باہر سے تالا کھلنے کی آواز آئی۔ شبانہ چارپائی پر لیٹ گئی۔ ایک بھاری بدن کی عورت ایک اسلحہ بردار مرد کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ شبانہ نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ وہی مکار عورت تھی جو بیراگن کے روپ میں عبدل کے گھر آئی تھی۔ یہ عیار عورت سندری تھی، سندری نے آگے بڑھ کر شبانہ کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے اٹھا کر بٹھا دیا۔ اور بولی "چل ری۔ باہر تالاب پر چل کر نہا لے۔" شبانہ چپکے سے اٹھ کر سندری کے ساتھ باہر آ گئی۔ صبح

روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ درختوں پر پرندے بول رہے تھے۔ دور سے ریل کے انجن کی سیٹی کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ سندری شبانہ کو لیے آگے آگے چل رہی تھی۔ رائفل والا آدمی پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ سندری نے شبانہ کو تالاب کے پاس لے جا کر کہا "یہاں منہ ہاتھ دھو لے بھاگنے کی کوشش نہ کرنا نہیں تو ہمارا آدمی گولی مار دے گا۔"

شبانہ پر دہشت طاری تھی۔ آنکھوں میں آنسو بھی نہیں آ رہے تھے۔ جب وہ منہ ہاتھ دھونے سے فارغ ہوئی تو سندری نے اسے ساتھ لیا اور جھونپڑی میں آ گئی۔ شبانہ کو تھوڑے سے چاول اور آلوؤں کی ترکاری کھانے کو دی گئی جسے شبانہ نے زہر مار کیا۔ اس نے سندری سے پوچھا "تم لوگ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"

سندری نے شبانہ کو گھور کر دیکھا اور بولی "تمھیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ اب چپکے سے لیٹ جا" دروازہ بند کر کے باہر تالا لگا دیا گیا۔ شبانہ کوٹھڑی میں اکیلی رہ گئی۔ بہت جلد اسے احساس ہو گیا کہ وہ ایک کمزور عورت ہے اور ان جرائم پیشہ لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مکار سندری چوبیس گھنٹے اس کی نگرانی کرتی تھی۔ دو اسلحہ بردار غنڈے کوٹھڑی کے آس پاس منڈلاتے رہتے تھے۔ شبانہ کو وہاں قید میں پڑے تین دن گزر گئے۔ چوتھے روز شام کے وقت باہر ایک جیپ آ کر درختوں میں رک گئی اس میں روپا اور کالی بدمعاش کے ساتھ دو نئے آدمی بھی سوار تھے۔ روپا بدمعاش ان میں سے ایک آدمی کو جسے وہ دادا بھائی کے نام سے پکار رہا تھا اپنے ساتھ لے کر شبانہ کی کوٹھڑی میں آ گیا۔ اس روز سندری نے اپنے ہاتھ سے شبانہ کے بالوں میں کنگھی کی تھی اور اسے نئی ساڑھی بھی پہنائی تھی۔ شبانہ کو دوسرے ایجنٹ کے ہاتھ فروخت کیا جا رہا تھا۔ دادا بھائی نے جھک کر غور سے شبانہ کو دیکھا پھر روپا بدمعاش کو لے کر باہر چلا گیا۔ سات ہزار میں سودا طے ہو گیا۔ دادا بھائی نے روپا بدمعاش کو سات ہزار روپے اسی وقت ادا کر دیئے اور کہا "لڑکی کو میرے اڈے پر پہنچانا اب تیرا کام ہے۔"

روپا بدمعاش نوٹوں کو جیب میں ٹھونستے ہوئے بولا "اس کی تم فکر نہ کرو دادا بھائی۔ مال ایک گھنٹے میں تیرے اڈے پر پہنچ جائے گا۔"

دادا بھائی اپنے ساتھی کے ہمراہ جیپ میں بیٹھ کر چلا گیا۔ روپا بدمعاش نے کالی بدمعاش کو ساتھ لیا اور شبانہ کی کوٹھڑی کی طرف بڑھا۔

. . . . . .

اندھیری کوٹھری میں صرف ایک موم بتی جل رہی تھی۔

اس کی دھیمی روشنی میں شبانہ بانس کی چارپائی پر سر جھکائے بیٹھی اپنی بد قسمتی پر آنسو بہا رہی تھی کہ روپا اور کالی بدمعاش اندر داخل ہوئے۔ سندری ان دونوں کو دیکھ کر باہر نکل گئی۔ شبانہ نے سہمی ہوئی نظروں سے ان جرائم پیشہ ہندو بنگالیوں کو دیکھا اور پہلی بار ہاتھ جوڑ کر التجا کی کہ وہ اس پر رحم کریں۔

روپا اور کالی بدمعاش وہاں شبانہ پر رحم کرنے نہیں بلکہ اسے وہاں سے لے جانے اور دادا بھائی کے پاس فروخت کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان پر شبانہ کی التجاؤں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ کالی بدمعاش بیڑی کا کش لگانے کے بعد شبانہ کے پاس بیٹھ گیا اور بڑے نرم لہجے میں بولا۔

"ہم تو خود تمھیں یہاں سے نکال کر تمھارے ملک پاکستان پہنچانا چاہتے ہیں مگر کیا کریں مجبور ہیں۔ سرحدوں پر دونوں ملکوں کی فوجیں کھڑی ہیں۔"

روپا بدمعاش اسٹول پر بیٹھ گیا، صافے سے منہ پر آیا ہوا پسینہ پونچھا اور کہنے لگا۔

"ابھی ہم تمھیں اپنے ایک دوست کے ہاں لے جا رہے ہیں وہاں تمھیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ دو ایک روز وہاں رہنا۔ پھر ہم تمھیں پاکستان پہنچا دیں گے۔ چلو آؤ ہمارے ساتھ۔"

شبانہ پڑھی لکھی لڑکی تھی اگرچہ پے در پے مصیبتوں نے اس کے ذہن کو ماؤف کر دیا تھا لیکن وہ خوب سمجھتی تھی کہ یہ دونوں جرائم پیشہ بدمعاش اسے کہاں اور کیوں لے جا رہے ہیں۔ لیکن اس کے پاس کوئی چارہ کار نہیں تھا وہ مجبور تھی۔ ان دونوں بدمعاشوں کے سامنے بے بس تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اس نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کیا تو وہ تشدد پر اتر آئیں گے

شبانہ نے دل میں سوچ لیا تھا کہ وہ ان کو اپنے اوپر تشدد کرنے کا موقع نہیں دے گی جیسے وہ کہیں گے ویسے ہی کرے گی اور جونہی اسے کوئی موقع ملا وہ ان کے چنگل سے نکل کر فرار ہو جائے گی۔ چنانچہ وہ خاموشی سے اٹھی اور ان کے ساتھ کوٹھری سے باہر آ گئی۔

رات گہری ہو رہی تھی۔ روپا بدمعاش اور کالی بدمعاش نے سندری سے کہا "ہم دادا بھائی کے پاس جا رہے ہیں تم اڈے کا خیال رکھنا۔"

دونوں بدمعاش شبانہ کو لے کر راتوں رات دادا بھائی کے خفیہ ٹھکانے پر پہنچ گئے۔ یہ جگہ کلکتہ شہر کے جنوب مغرب میں ایک ویران مقام پر تھی اور اس کے چاروں طرف تاریکی میں دور بندرگاہ کے مال گوداموں کی بلند چھتیں پہاڑیوں کی طرح ابھری ہوئی تھیں۔ دادا بھائی بھی ایک ہندو بنگالی تھا وہ بردہ فروشوں کا ایجنٹ تھا اور اس سے پہلے کئی عورتوں کو فروخت کر چکا تھا۔ اس نے شبانہ کو ایک کوٹھری میں بند کر دیا اور روپا اور کالی کو طے شدہ رقم ادا کر دی۔ دونوں بدمعاش شبانہ کو دادا بھائی کے حوالے کر کے چلے گئے۔

دادا بھائی کا یہ خفیہ اڈا ایک چھوٹے سے کوارٹر نما جھونپڑے کی شکل میں تھا۔ دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کوئی مزدور رہ رہا ہے۔ آس پاس کوئی دوسرا کوارٹر بھی نہیں تھا۔ دادا بھائی بڑا تجربہ کار اور کائیاں بردہ فروش تھا۔ اسے یہ کام کرتے ایک عمر ہو گئی تھی۔ وہ اپنا مال اکثر آندھرا پردیش میں جا کر فروخت کرتا تھا۔ وہاں اسے اپنے مال کی زیادہ قیمت ملتی تھی۔ اپنے کوارٹر پر اس نے کسی بھی خریدی ہوئی لڑکی کو رات بھر نہیں رکھا تھا۔ چنانچہ دادا بھائی نے شبانہ کے آنے سے پہلے ہی وہاں سے آندھرا پردیش کی طرف کوچ کر جانے کا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ ایک بند جیپ کوارٹر سے تھوڑی دور تاڑ کے درختوں میں تیار کھڑی تھی۔ دکن ایکسپریس نئے ٹائم ٹیبل کے مطابق ہاوڑا اسٹیشن سے صبح کے چار بج کر دس منٹ پر روانہ ہوتی تھی۔ اس ٹرین کے ایک فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں چار نشستوں والا ایک کوپے پہلے سے بک تھا۔ دادا بھائی کے ساتھ اس کے دو با اعتماد اور خونخوار قسم کے غنڈے بھی جا رہے تھے۔

دادا بھائی شبانہ کی کوٹھری میں آ گیا اس کے ہاتھ میں پستول تھا اس نے آتے ہی پستول کا رخ شبانہ کی طرف کیا اور اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میں نے تمھیں بیس ہزار کے عوض خریدا ہے اور صبح کی گاڑی سے تمھیں ایک دوسرے شہر لے جا رہا ہوں جہاں تمھیں میرے چھوٹے بھائی کے پاس رہنا ہوگا میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میرے ساتھ میرے دو باڈی گارڈ بھی جا رہے ہیں جو کئی خون کر چکے ہیں، ان کے لیے اور میرے لیے بھی کسی کو گولی مار کر ہلاک کر دینا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اگر تم اپنا منہ بند رکھوگی اور آرام سے ہمارے ساتھ سفر کروگی تو ہم تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔ لیکن اگر تم نے شور مچانے کی ذرا بھی کوشش کی ہمارے ساتھ جو ہوگا وہ ہم بعد میں دیکھ لیں گے۔ لیکن تمھیں اسی وقت گولی مار دیں گے۔ تم سمجھ دار عورت ہو میری بات اچھی طرح سمجھ گئی ہوگی۔ اب تم آرام کرو میرے آدمی باہر پہرہ دے رہے ہیں۔ صبح ساڑھے تین بجے تمھیں اٹھا دیا جائے گا۔"

دادا بھائی پستول اپنی صدری کی جیب میں ڈال کر کوٹھری سے نکل گیا اس کے جانے کے بعد شبانہ اپنا چہرہ ہاتھوں میں رکھ کر رونے لگی۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ جانے رات کا کیا بجا ہوگا کہ اسے نیند آ گئی اور وہ سو گئی۔ صبح ٹھیک ساڑھے تین بجے اسے جگا دیا گیا۔ اسے ایک قیمتی ریشمی ساڑھی پہننے کو دی گئی۔ دادا بھائی اور اس کے غنڈوں نے بھی شریفانہ لباس پہن لیا تھا۔ شبانہ کو دادا بھائی نے ایک بار پھر سمجھا دیا کہ وہ راستے میں شور مچانے کی ہرگز کوشش نہ کرے۔ شبانہ کو جیپ میں پیچھے دادا بھائی نے اپنے پاس بٹھا لیا پستول اس نے شبانہ کی پسلیوں کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ جیپ رات کے پچھلے پہر کی نیلگوں فضا میں کلکتے کی ویران سڑکوں پر ہوڑہ ریلوے اسٹیشن کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ اسٹیشن پر پہنچ کر دادا بھائی نے پستول ہاتھ میں لے کر اس پر صافہ ڈال دیا تھا اور پستول کی نالی شبانہ کے جسم کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ وہ اسی طرح اسے چلاتا بظاہر مسکرا مسکرا کر باتیں کرتا اس پلیٹ فارم پر آ گیا جہاں دکن ایکسپریس تیار کھڑی تھی۔

دونوں غنڈے شریفانہ لباس میں ملبوس ایک ایک بھرا ہوا پستول جیبوں میں ڈالے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ وہ شبانہ کے بالکل ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ٹرین کے فرسٹ کلاس کوپے میں ان کی سیٹیں ریزرو تھیں۔ ڈبے میں داخل ہوتے ہی دادا بھائی نے شبانہ کو کونے میں بٹھایا پستول اس کی پسلیوں کے ساتھ لگا کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کوپے فرسٹ کلاس کا تھا جو کہ ریزرو تھا۔ کوئی دوسرا شخص اندر نہیں آ سکتا تھا۔ کھڑکیوں پر شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ یہ ہلکے نسواری رنگ کے

ایسے شیشے تھے کہ باہر سے دیکھو تو اندر کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ایک غنڈہ باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آ گیا۔ ٹرین ٹھیک وقت پر چل پڑی۔ ناشتہ دان یہ لوگ ساتھ لائے تھے۔ شبانہ خاموش بیٹھی حیرت زدہ آنکھیں کھولے کھڑکی کے شیشے میں سے باہر دیکھ رہی تھی۔ باہر کی روشنیاں ہلکے نسواری شیشے میں سے دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ شبانہ نے دل میں طے کر لیا تھا کہ چاہے اس کی جان کیوں نہ چلی جائے وہ معمولی سا موقع ملنے پر بھی ان لوگوں کے چنگل سے بھاگ جائے گی ٹرین سارا دن چلتی رہی۔ شبانہ کسی اسٹیشن پر بھی باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دو غنڈے ہر وقت پستول لیے اس کے سر پر موجود رہتے تھے۔ دن کی روشنی میں بھی کھڑکی کے شیشے چڑھے رہتے۔ ان شیشوں میں سے باہر کا منظر دھوپ میں بھی صاف نظر نہیں آتا تھا۔ کمپارٹمنٹ ائر کنڈیشنڈ تھا۔ دادا بھائی بھی ہر وقت چوکس رہتا۔ کسی اسٹیشن پر ٹرین رکتی تو دادا بھائی پستول نکال کر شبانہ کے قریب ہو بیٹھتا اور اس کے خونی غنڈے ڈبے کے باہر نکل کر کھڑے ہو جاتے۔ دن گزر گیا۔ شام کا اندھیرا چھانے لگا۔ پھر رات ہو گئی۔ شبانہ نے حیدر آباد دکن کے بارے میں صرف کتابوں میں ہی پڑھا تھا۔ اسے امید تھی کہ یہاں مسلمانوں کی آبادی کافی زیادہ ہے اور اسے کسی نہ کسی مسلمان خاندان میں پناہ مل جائے گی۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ کہاں اور کیسے ان غنڈوں سے چھٹکارا حاصل کرے۔ وہ مسلسل کسی موقع کی تلاش میں تھی لیکن یہ خونخوار درندے اسے ایک پل کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے کہ ٹرین کی رفتار ہلکی ہونے لگی۔ دادا بھائی نے اپنے آدمی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "کونسا اسٹیشن آ رہا ہے۔؟"

اس غنڈے نے کہا۔

"اورنگ آباد کا اسٹیشن آ رہا ہے دادا بھائی مگر وہ تو ابھی پندرہ منٹ کے بعد آئے گا۔ ٹرین کیوں آہستہ ہو گئی۔"

دوسرے غنڈے نے بیڑی سلگاتے ہوئے کہا۔

"لائن کی مرمت ہو رہی ہو گی۔"

دادا بھائی نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"تھوڑی دیر آرام کر لوں۔ ہمیں تو اورنگ آباد سے بھی آگے جانا ہے۔ تم دونوں خبردار رہنا۔"

اور دادا بھائی اپنی سیٹ پر چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ شبانہ کو بہت جلد اس کے خراٹوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ کونے میں اپنی نشست پر لیٹی یہ ظاہر کر رہی تھی کہ سو رہی ہے۔ دونوں غنڈوں کو بھی نیند آ رہی تھی مگر وہ جاگتے رہنے پر مجبور تھے۔ کمپارٹمنٹ میں صرف ایک بلب کی روشنی تھی۔ شبانہ نے تھوڑی سی آنکھ کھول کر دیکھا دونوں غنڈے دوسرے دروازے والی سیٹ پر نیم دراز تھے۔ ٹرین کی رفتار اس طرح ہلکی تھی۔ دو منٹ بعد شبانہ نے دیکھا کہ دونوں غنڈوں کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ اونگھ رہے تھے۔ اس سے بہتر موقع اس ماحول میں شبانہ کو نہیں مل سکتا تھا۔ وہ آہستہ سے اپنی نشست سے اٹھی اور دبے پاؤں ٹائیلٹ کی طرف مڑی۔ اس نے ایک منصوبہ فوراً ذہن میں تیار کر لیا تھا۔ اگر دونوں میں سے کوئی جاگ پڑا تو وہ کہہ دے گی کہ ٹائیلٹ جا رہی ہوں۔ اس میں کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ شبانہ کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ٹائیلٹ کے دروازے کے پاس آ گئی مگر دونوں غنڈوں میں سے کسی کو خبر نہ ہوئی۔ ان کی گردنیں سینوں پر لٹکی ہوئی تھیں اور ٹرین کی کھٹا کھٹ کی تال پر آہستہ آہستہ جھول رہی تھیں۔ کمپارٹمنٹ کا دوسرا دروازہ ٹائیلٹ کے دروازے کے ساتھ ہی تھا۔ ٹرین کی رفتار اتنی ہلکی تھی کہ شبانہ نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر وہ دروازے میں سے باہر چھلانگ لگا دے تو اسے زیادہ چوٹیں نہیں آئیں گی۔ ٹائیلٹ کے پاس پہنچ کر شبانہ نے تجسس آمیز نگاہوں سے ایک نگاہ بائیں جانب ڈالی دادا بھائی چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ دونوں غنڈے بھی گردنیں جھکائے سو رہے تھے۔ وہ پچھلی رات کے بھی جاگے ہوئے تھے۔ اور اب جو اونگھ آئی تو نیند کی آغوش میں چلے گئے تھے۔ یہ شبانہ کی خوش قسمتی تھی۔ قدرت نے اسے فرار ہونے کا سنہری موقع فراہم کر دیا تھا۔ شبانہ نے ٹائیلٹ کے دروازے کی بجائے کمپارٹمنٹ کا دروازہ آہستہ سے کھول دیا۔ ٹرین کی کھٹا کھٹ کے شور میں دروازہ کھلنے کی آواز دب کر رہ گئی۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اندر آیا۔ باہر اندھیرا تھا۔ شبانہ کے پاس سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے اللہ کا نام لیا اور باہر اندھیرے میں کود گئی۔ کودنے سے پہلے اس نے اپنے جسم کو سمیٹ لیا تھا اور دل میں خدا سے دعا کی تھی کہ وہ پتھروں کی بجائے جھاڑیوں میں گرے

خدا نے اس کی دعا قبول کر لی تھی اور وہ جھاڑیوں میں ہی گری۔ جھاڑیوں میں گرتے ہی وہ نیچے کی جانب لڑھکتی چلی گئی۔ یہاں کافی نشیب تھا۔ شبانہ نے اپنے آپ کو گیند کی طرح کر لیا تھا۔ وہ لڑھکتی ہوئی ایک کھیت کی مینڈ سے جا لگی۔ اس نے وہیں پڑے پڑے بغیر اپنے جسم کو ہاتھ لگائے اپنے بدن کا جائزہ لیا۔ خوش قسمتی سے جھاڑیوں میں گرتے اور ٹرین کی رفتار سست ہونے کی وجہ سے اسے کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ صرف ساڑھی کئی جگہوں سے پھٹ گئی تھی اور بازوؤں پر کچھ خراشیں آ گئی تھیں۔ شبانہ کو اپنی جگہ سے اٹھنے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا اس نے سر اٹھا کر ٹرین کی طرف دیکھا۔ ٹرین کھٹا کھٹ کرتی ہلکی رفتار کے ساتھ کسی قدر اونچائی پر سے آگے گزر گئی تھی اور اس کے آخری ڈبے کی سرخ بتی رات کے اندھیرے میں جگنو کی طرح چمکتی دور ہوتی جا رہی تھی۔ شبانہ کو اس مصیبت کا شدت سے احساس تھا کہ اگر ٹرین میں غنڈے جاگ پڑے اور اسے وہاں نہ پایا تو وہ بھی ٹرین سے چھلانگ لگا کر اس کی تلاش میں ادھر آ جائیں گے وہ جلدی سے اٹھی اور وہاں سے نکل جانے کے لیے کھیتوں کے پار جو روشنی نظر آ رہی تھی اس طرف چلنے لگی۔ اس نے ساڑھی کو جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا تھا اور تیز تیز قدموں سے چلتی کھیتوں کے درمیان والی پگڈنڈی پر آ گئی۔ اتنا اس نے سن لیا تھا کہ دکن کا شہر اورنگ آباد وہاں سے ٹرین کے ذریعے پندرہ منٹ کی مسافت پر ہے۔ اورنگ آباد کا اس نے نام سن رکھا تھا۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ آس پاس گھپ اندھیرا تھا۔ دور اسے شہر کی روشنیاں جگنوؤں کی طرح جھلملاتی نظر آ رہی تھیں۔ وہ اس طرف چلنے لگی۔

کھیتوں سے نکل کر اس نے ایک غیر ہموار پتھریلا میدان عبور کیا اور کچے راستے پر آ گئی۔ ایک بار پھر اس نے ٹرین کی سرخ بتی کو دیکھا وہ اب کافی دور جا چکی تھی اور پھر شاید کوئی موڑ گھومنے کے بعد شبانہ کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ شبانہ ایک جگہ پتھر کے پیچھے بیٹھ کر عقب میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکنے لگی۔ وہ تسلی کرنا چاہتی تھی کہ اس کے تعاقب میں دادا بھائی اور اس کے غنڈے تو نہیں آ رہے۔ ستاروں کی دھندلی پھیکی روشنی میں اب وہ اندھیرے میں بھی دیکھ سکتی تھی۔ کھیتوں میں اسے جب کوئی انسانی سایہ اپنی طرف آتا یا حرکت کرتا نظر نہ

آیا تو وہ اٹھی اور شہر کی روشنیوں کی طرف چل پڑی۔ پہلے اسے خیال آیا کہ وہ شہر میں کسی پولیس اسٹیشن جاکر پناہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ پھر اس نے سوچا کہ پولیس تو بھارت کی ہے اور ہندو ہو گی۔ پھر اس کے پاس بھارت کی شہریت بھی نہیں ہے۔ پاکستان کا ویزا یا پاسپورٹ بھی نہیں ہے۔ یقینی بات تھی کہ ہندو پولیس اسے فوراً گرفتار کرے گی اور اس کے ساتھ تشدد کا سلوک کیا جائے گا۔

یہاں کوئی اس کی مدد کرنے والا نہیں ہے وہ کسی سے مدد حاصل نہ کر سکے گی۔ اس نے سوچا کہ یہ وزنگ آباد شہر کی روشنیاں ہیں۔ یہاں مسلمانوں کے بہت سے گھر ہوں گے۔ وہ ان میں سے کسی گھر میں پناہ حاصل کرے گی۔ یہی کچھ سوچتی ہوئی شبانہ شہر کی روشنیوں کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی زمین پتھریلی تھی۔ اس کے پاؤں میں چپل تھی جس کا ایک فیتہ ٹوٹ گیا تھا اور اسے چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ پھر بھی وہ چلتی چلی گئی۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ وہ دادا بھائی اور اس کے جرائم پیشہ غنڈوں کی قید سے نکل آئی ہے۔ شہر کی روشنیاں اب ایک ٹیلے کی اوٹ میں آ گئی تھیں۔ ٹیلے پر تاڑ کے درختوں کی چھتریاں ستاروں بھرے آسمان کے پس منظر میں سیاہ دکھائی دے رہی تھیں۔ ٹیلے پر تاڑ کے درختوں کی قطار دوسری طرف نشیب میں جاکر غائب ہو جاتی تھیں۔ شبانہ ٹیلے کی دائیں جانب آ گئی۔ یہاں اندھیرے میں اس نے ایک چھوٹے سے غیر ہموار میدان کو دیکھا جس کے بیچ میں ایک نالہ بہہ رہا تھا۔ نالے پر پل بنا ہوا تھا۔ پل اندھیرے میں خالی تھا۔ وہ پل عبور کر گئی دوسری جانب تھوڑی نشیبی جگہ تھی۔ یہاں سے آگے دائیں جانب شہر کی روشنیاں پھر نظر آنے لگیں۔ وہ پل سے تھوڑی دور ہی پہنچی تھی کہ اسے کسی انسان کے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔ شبانہ کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے دادا بھائی اور اس کے غنڈوں کا خیال آگیا۔ اس نے گھبرا کر جدھر سے آواز آئی تھی ادھر دیکھا۔ اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہ آیا۔ انسانی قدموں کی آواز بائیں جانب آگے بڑھ رہی تھی۔

شبانہ وہیں ایک چھوٹی سی جھاڑی کی اوٹ میں دبک کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھ آواز پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر اسے اندھیرے میں ایک انسانی سایہ نظر آیا جو دوڑتا ہوا اس سے بیس قدم کے فاصلے پر سے گزر گیا۔ اس کے پیچھے ایک اور انسانی سایہ دوڑتا ہوا نکل گیا۔ شبانہ کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ یہ دادا بھائی کے غنڈوں کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ انہیں اس کے فرار

کا علم ہو گیا تھا اور وہ اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ وہاں بیٹھے رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ جب دوڑتے قدموں کی آواز اس طرف جاکر غائب ہو گئی جس طرف شہر کی روشنیاں تھیں تو شبانہ اٹھی اور تقریباً دوڑ کر غیر ہموار میدان عبور کر گئی۔ اب اس کے سامنے ایک چار فٹ اونچی پتھر کی دیوار تھی جو نیم دائرے کی شکل میں آگے جاکر دائیں جانب مڑ گئی تھی دیوار کی دوسری طرف گھپ اندھیرا تھا۔ شبانہ کو اور کچھ نہ سوجھا تو دیوار کی دوسری طرف کود گئی۔ دوسری طرف کودتے ہی ایک بلی غراتی ہوئی بھاگ اٹھی۔ شبانہ کا دل خوف کے مارے اچھل کر جیسے اس کے حلق کے قریب آگیا۔ وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی کہ کونسی جگہ ہے۔ کیا کسی بنگلے کا لان ہے یا کوئی باغ ہے۔ یہاں کہیں کہیں درخت اندھیرے میں بھوتوں کی مانند کھڑے تھے اس نے اندھیرے میں غور سے دیکھا تو اس کے بدن پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ اس کے سامنے ابھری ہوئی قبریں اور ان پر لگے کتبے ادھر ادھر پھیلے تھے۔ وہ کسی قبرستان میں آ گئی تھی۔

یہ جگہ اسے انسانی بستی سے زیادہ محفوظ معلوم ہوئی یہاں اسے صبح تک کوئی پریشان نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح رات گزار دے۔ پھر جب صبح کی روشنی پھوٹے گی تو وہ شہر کی طرف چل دے گی۔ اور کسی مسلمان کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹائے گی کوئی نہ کوئی ضرور اسے پناہ دے گا۔ وہ کسی کو نہیں بتائے گی کہ وہ مشرقی پاکستان سے اغوا کر کے یہاں بھارت میں لائی گئی تھی۔ شبانہ نے جھک کر غور سے دیکھا۔ وہ ایک ایسی قبر کے کنارے بیٹھی تھی جس میں گہرا شگاف اندھیرے میں منہ پھاڑے جیسے اسے تک رہا تھا۔ اس شگاف میں سے بلی اس کے کودنے کے بعد بوکھلا کر غراتی ہوئی بھاگ اٹھی تھی۔ شبانہ کو قبر کے شگاف سے خوف آنے لگا۔ وہ اٹھی اور قبروں کے درمیان درختوں کی طرف چلنے لگی۔ اندھیرے میں اسے درختوں کے نیچے ایک جھونپڑی نظر آئی۔ جھونپڑی پر موت کی خاموشی اور تاریکی چھائی تھی۔ شبانہ قبروں کے درمیان سے گزرنے کی کوشش کرتے ہوئے جھونپڑی کے قریب پہنچی ہی تھی کہ ایک جانب سے انسانی آواز بلند ہوئی۔

"ارے وہ یہیں کہیں ہو گی۔"

شبانہ نے دادا بھائی کی آواز پہچان لی تھی۔ اس کا بدن دہشت کے مارے سن ہو گیا۔ دادا بھائی

اپنے غنڈوں کے ساتھ قبرستان میں داخل ہو چکا تھا۔ شبانہ جھونپڑی کی طرف لپکی جھونپڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ یہ دروازہ بانس کا تھا اور اندر سے بند نہیں تھا۔ شبانہ جھونپڑی میں گھس گئی۔ اندر کسی نے ہڑبڑا کر کہا "جل تو جلال تو۔ کون ہے۔؟"

شبانہ سمجھ گئی کہ یہ قبرستان کا گورکن ہے۔ اس نے دھیمی آواز میں التجا کرتے ہوئے کہا۔

"میں مسلمان لڑکی ہوں غنڈے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ خدا رسول کے لیے مجھے بچا لو۔"

اندھیرے میں چارپائی پر سے کوئی اٹھا۔ شبانہ کو ایک آدمی کی سفید داڑھی دکھائی دی۔ اس نے شبانہ سے کہا۔

"بیٹی میری چارپائی کے نیچے چھپ جاؤ۔"

شبانہ پلک جھپکتے ہی چارپائی کے نیچے گھس گئی۔ بوڑھا گورکن جھونپڑی سے باہر نکل آیا اس نے دروازے کو بند کر دیا اور بلند آواز میں کلمہ شریف پڑھ کر بولا۔

"ادھر کون ہے بھائی۔ میری جھونپڑی یہاں ہے۔"

اندھیرے میں سے دادا بھائی گورکن کے سامنے آگیا۔ مسلمان گورکن نے اسلام علیکم کہہ کر پوچھا۔

"کیوں بھائی کوئی قبر کھدوانی ہے کیا؟ میّت ساتھ لائے ہو یا صبح کو لاؤ گے۔؟"

دادا بھائی نے تاریکی میں ادھر ادھر آنکھیں گھمائیں اور بوڑھے گورکن سے کہا "بابا یہاں کسی عورت کو تو نہیں دیکھا؟ میری بیوی ہے اس کا دماغ ٹھیک نہیں۔ آدھی رات کو گھر سے نکل بھاگی ہے۔"

بوڑھے گورکن نے کہا "بیٹا! یہ قبرستان ہے یہاں تو زیادہ تر میتیں ہی آتی ہیں زندہ لوگ کم ہی آتے ہیں۔ میں نے کسی عورت کو ادھر آتے نہیں دیکھا۔ آدھ گھنٹے سے جھونپڑی میں بیٹھا عبادت کر رہا ہوں۔ بھائی تم اپنا نام پتہ بتا دو۔ اگر تمھاری بیگم ادھر آئیں تو میں انھیں تمھارے گھر پہنچا دوں گا۔"

دادا بھائی کے دونوں غنڈے بھی اندھیرے میں سے نکل کر سامنے آگئے ان کی آنکھوں سے ہی بوڑھے گورکن نے اندازہ لگا لیا کہ بڑے خطرناک قسم کے جرائم پیشہ لوگ ہیں دادا بھائی بولا۔

"کوئی بات نہیں باباجی! ہم اسے خود ہی تلاش کر لیں گے۔"

ایک غنڈہ کہنے لگا "دادا وہ ضرور شہر کی طرف گئی ہوگی چلو ادھر چل کر دیکھتے ہیں۔"

دادا بھائی نے ایک نظر بوڑھے گورکن پر ڈالی۔ بوڑھے گورکن نے کہا "بیٹا! خدا کرے تمھیں تمھاری بیوی مل جائے میں تہجد کی نماز پڑھ کر تمھارے لیے ضرور دعا کروں گا۔"

دادا بھائی نے کوئی جواب نہ دیا اور اپنے غنڈوں کے ساتھ قبرستان کی ڈیوڑھی کی طرف چل دیا۔ گورکن وہیں پانی کا لوٹا لے کر بیٹھ گیا اور وضو کرنے لگا۔ حقیقت میں وہ اندھیرے میں ان غنڈوں کو قبرستان سے جاتے دیکھ رہا تھا جب اسے یقین ہو گیا کہ غنڈے قبرستان کی چاردیواری میں سے نکل گئے ہیں تو وہ پانی کا لوٹا ایک طرف رکھتے ہوئے اٹھا اور جھونپڑی کے دروازے میں آکر بیٹھ گیا۔ جیب سے مڑا تڑا سگریٹ نکال کر سلگایا اور اس کا کڑوا کش نگلتے ہوئے جھونپڑی کے اندر منہ کر کے بولا "بیٹی! تم جو کوئی بھی ہو اسی چارپائی کے نیچے چھپی رہنا غنڈے ویسے تو قبرستان سے جا چکے ہیں لیکن ان کا اعتبار بھی نہیں ہے۔ تم میری بات کا جواب ہرگز مت دینا ابھی خاموش رہو۔"

شبانہ نے جب سنا کہ دادا بھائی اور اس کے غنڈے ساتھی چلے گئے تو اس کی جان میں جان آئی جب تک وہ جھونپڑی کے باہر کھڑے بوڑھے گورکن سے باتیں کرتے رہے تھے اس کا اوپر کا سانس اوپر ہی رہا تھا تھوڑی دیر بعد بوڑھا گورکن جھونپڑی میں آگیا شبانہ چارپائی کے نیچے سے نکل آئی۔ گورکن زمین پر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں ہی شبانہ سے پوچھنے لگا کہ اب بتاؤ بیٹی تم کون ہو اور یہ غنڈے تمھارے پیچھے کیوں لگے ہوئے تھے؟

شبانہ کا دل چاہا کہ وہ اس نیک دل گورکن کو اپنی ساری بپتا سنا دے چنانچہ اس نے شروع سے لے کر آخر تک اسے اپنی داستان الم بیان کر دی۔ بوڑھا گورکن شبانہ کے حالات سن کر بڑا متاثر ہوا اٹھ کر ایک پل کے لیے دوبارہ جھونپڑی سے باہر گیا شاید وہ دیکھنا چاہتا تھا کہیں دادا بھائی کے غنڈے جھونپڑی کے آس پاس تو نہیں منڈلا رہے۔ واپس آکر کہنے لگا "بیٹی! ابھی تم رات اسی جھگی میں گزارو۔ صبح میں تمھارے بارے میں کچھ سوچوں گا۔ اب تم سو جاؤ۔ بے فکر رہو میں جھونپڑی کے باہر پہرہ دوں گا۔ اللہ نے چاہا تو وہ مفرور غنڈے دوبارہ نہیں آئیں گے۔"

شبانہ نے کسی نہ کسی طرح تنگ و تاریک جھونپڑی میں رات گزار دی۔ صبح ہوئی قبرستان کے درختوں میں چڑیاں چہچہانے لگیں۔ بوڑھا گورکن اندر آیا اس نے شبانہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "بیٹی! تو مسلمان کی اولاد ہے مشرقی پاکستان کی طرح ہم پر بھی بھارتی فوجیوں نے چڑھائی کی تھی ہم پر بھی بڑا ظلم ہوا تھا۔ میں ساری رات تمھارے بارے میں سوچتا رہا۔ یہاں تمھارا رہنا ٹھیک نہیں۔ غنڈے تمھاری تلاش میں یہاں پھر آسکتے ہیں ابھی دن کا اجالا پوری طرح اجاگر نہیں ہوا۔ میرے ساتھ آؤ۔ یہاں سے تھوڑی دور ایک مقبرہ ہے وہاں مقبرے کے باغ میں، میں نے ایک چھوٹی سی کٹیا بنا رکھی ہے تم ابھی وہاں چلی چلو۔ اس کے بعد سوچ لیں گے کہ آگے کیا کرنا ہے۔"

بوڑھے گورکن نے شبانہ کو ایک نیلی چادر دی جو اس نے اپنے جسم کے گرد لپیٹ لی۔ اس نے چادر سے اپنا آدھا چہرہ بھی ڈھانپ لیا اور بوڑھے گورکن کے ساتھ قبرستان سے نکل کر مقبرے کی طرف پیدل ہی روانہ ہو گئی۔ یہ مقبرہ اورنگ آباد شہر سے باہر مضافات میں ایک غیر آباد جگہ پر واقع تھا۔ چونے کے پتھر کا بنا ہوا یہ مقبرہ شبانہ کو خستہ حالت میں لگا۔ بوڑھا گورکن مقبرہ کے عقبی محرابی دروازے سے باغ میں آگیا جو ویرانی کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ یہاں نیم اور املی کے درختوں کے نیچے پتھروں کی دیواروں اور ناریل کی ڈھلواں چھت والی ایک چھوٹی سی کٹیا بنی ہوئی تھی۔ اس کے باہر درخت کے نیچے ایک چھوٹا سا غسل خانہ بھی تھا۔ باہر گھڑے میں مٹی کا ٹب پانی سے بھرا پڑا تھا۔ کٹیا کے اندر مٹی کی صراحی میں ٹھنڈا پانی تھا۔ زمین پر لکڑی کا پرانا تخت بچھا تھا۔ ایک طرف بستر لپیٹ کر رکھا ہوا تھا۔ یہاں شبانہ نے منہ ہاتھ دھویا۔ گورکن نے چائے بنا کر اسے پلائی اور شبانہ کو بتایا کہ یہ مقبرہ اورنگ زیب عالمگیر کی ملکہ رابعہ درانی المعروف دل رس بانو کا ہے جو ۱۶۵۷ء میں وفات پانے کے بعد وہاں دفن ہوئی تھی۔

"یہاں بہت کم لوگ آتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی غیر ملکی سیاح کیمرہ گلے میں لٹکائے آنکلتا ہے۔" شبانہ نے پوچھا کہ اسے کب تک کٹیا میں رہنا ہو گا۔ گورکن کسی سوچ میں تھا۔ کہنے لگا "بیٹی! میں چاہتا ہوں کہ تمھیں کسی طرح سے پاکستان پہنچا دوں۔ لیکن پاکستان یہاں سے بہت دور ہے۔ تمھیں پاکستان پہنچانا ناممکن ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ تمھیں مدراس سے آگے سمندر پار

کروا کر سری لنکا کے ملک میں پہنچا دوں۔ وہاں بھارت کی حکومت نہیں ہے۔ وہاں سے تم آسانی کے ساتھ اپنے وطن جا سکتی ہو۔" شبانہ کو یہ تجویز اچھی لگی۔ اس نے پوچھا کہ مدراس کا سمندر وہاں سے کتنی دور ہو گا اور وہ اسے کیسے پار کر سکے گی۔ بوڑھا گورکن کہنے لگا "مدراس یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ نیچے کی جانب دوسرا صوبہ تامل ناڈو ہے جس کا دارالحکومت مدراس ہے۔ وہاں سے تمھیں ٹرین کے ذریعے تکون تک دھنش کوڈی کے چھوٹے سے اسٹیشن تک جانا ہو گا۔ دھنش کوڈی سے بحری جہاز تمھیں سری لنکا کے شمالی ساحل منارے جائے گا۔ یہ سمندری سفر بڑا مختصر ہے۔ ایک گھنٹے میں تم سری لنکا پہنچ جاؤ گی۔"

شبانہ کی آنکھوں میں پہلی بار امید کی روشنی چمکنے لگی۔ اس نے گورکن بابا سے التجا کی کہ وہ اسے کسی طرح سری لنکا پہنچا دے۔ بوڑھا گورکن بولا "میں غریب آدمی ہوں زیادہ لوگ میرے واقف بھی نہیں ہیں۔ میرا ایک بھانجا یہاں اورنگ آباد ریلوے اسٹیشن کی کینٹین میں کام کرتا ہے۔ بڑا خدا ترس آدمی ہے۔ سچا مسلمان ہے۔ میں اس سے بات کروں گا۔ یہ تمھیں لنکا پہنچانے کا بندوبست کر دے گا۔ اب تم ایسا کرو کہ کٹیا کا دروازہ اندر سے بند کر لو۔ میں شہر اپنی بہن کے ہاں جا کر تمھارے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔ اول تو ادھر ویران مقبرے میں کوئی نہیں آتا۔ اگر کوئی نکل ہی آیا تو تم دروازہ ہرگز مت کھولنا۔ اندر سے آواز بھی نہ نکالنا۔"

اتنا کہہ کر بوڑھا گورکن چلا گیا۔ شبانہ تخت پر کچھ دیر بیٹھی سوچتی رہی کہ اگر وہ کسی طرح سری لنکا پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تو وہ سیدھی وہاں پر اپنے ملک کے سفارت خانے چلی جائے گی جو اسے پاکستان پہنچا دیں گے۔ پہلی بار شبانہ کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے سر سے آدھا بوجھ اتر گیا ہے۔

ہم شبانہ کو اورنگ آباد حیدر آباد دکن کے اس مقبرے میں چھوڑ کر واپس کلکتے آتے ہیں جہاں ندیم ذکریا اسٹریٹ والے امجدیہ ہوٹل کے پیچھے سیٹھ جبار کی بیٹھک میں چھپا ہوا ہے۔ سیٹھ جبار ندیم کو اپنی بیٹھک میں زیادہ دیر کے لیے نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ پولیس ندیم کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ سیٹھ جبار کے گرفتار ہو جانے کا بھی خطرہ تھا۔

سیٹھ جبار اس کے باوجود ندیم کو بھارتی پولیس کے بھیڑیوں کے آگے ڈالنا کبھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ جیسا کہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں اس نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ ندیم کو

دریا پار والے دلدلی جنگل میں اپنے خفیہ اڈے کے پرانے گودام میں اس وقت تک چھپا دے گا جب تک کہ سرحدوں پر سے فوجیں پیچھے نہیں ہٹ جاتیں۔ اس کے بعد وہ ندیم کو اپنے کسی آدمی کے ساتھ پنجاب کی طرف بھیج کر بارڈر کراس کروا دے گا۔ اس کا ذکر سیٹھ جبار نے ندیم سے بھی کر دیا تھا۔ ندیم نے بظاہر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ دریا پار والے پرانے گودام میں چھپنے پر راضی ہو گیا تھا لیکن اس نے دل میں طے کر رکھا تھا کہ وہ نجمی سے ہر حالت میں ملے گا۔ اور اسے اپنے ساتھ لے کر ہی پاکستان جائے گا۔ وہ نجمی کو ہندوستان میں چھوڑ کر اکیلا پاکستان نہیں جا سکتا تھا۔ چنانچہ ایک رات سیٹھ جبار نے ندیم کو اپنے ایک آدمی کے ساتھ جیپ میں سوار کروا کر دریا والے خفیہ گودام کی طرف روانہ کر دیا۔

اس گودام میں سیٹھ جبار کبھی منشیات کا اسٹاک رکھا کرتا تھا۔ جب سے اس نے منشیات کا دھندا چھوڑا تھا۔ یہ گودام ویران ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس پر ابھی تک سیٹھ جبار کا ہی قبضہ تھا۔ وہاں صرف ایک چوکیدار رہتا تھا۔ اس چوکیدار کو بھی اپنے ہوٹل میں بلوا کر سیٹھ جبار نے سمجھا دیا تھا کہ ندیم اس کا اپنا خاص آدمی ہے اور اسے مناسب وقت آنے پر انڈیا سے اسمگل کرانا ہے اور وہ اس کی ہر طرح سے خبر گیری کرے اور کسی کو کان و کان خبر نہ ہو کہ وہ گودام میں چھپا ہوا ہے۔ یہ گودام ایک انتہائی ویران اور غیر آباد دلدلی علاقے میں تھا۔ اس کے باوجود چوکیدار صبح و شام بڑی چوکسی سے پہرہ داری کرتا۔

ندیم کا مقصد وہاں چھپے بیٹھے رہنا نہیں تھا۔ اسے بہر حال نجمی کے پاس پہنچنا تھا۔ اتنا اسے معلوم تھا کہ نجمی بنگال اور بہار کی سرحد پر واقع ایک جنگل میں اپنی کمین گاہ میں کچھ ڈاکو ساتھیوں کے ہمراہ رہ رہی ہے۔ چنانچہ اس نے ایک روز گودام سے نکل کر نجمی کی تلاش میں نکلنے کا پروگرام بنا لیا۔ اس کے پاس اتنے پیسے تھے کہ وہ ٹرین کے ذریعے گوماہ کے اسٹیشن تک سفر کر سکتا تھا۔ اس سفر میں اس کے پکڑے جانے کا خطرہ قدم قدم پر تھا۔ مگر ندیم ان خطرات سے ٹکرانے کا عادی ہو گیا تھا اور پھر اس کے سامنے اس کی محبوبہ نجمی تھی جس کی کشش اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ندیم نے ویسے بھی بہاری مسلمانوں کی طرح داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ ایک شام اس نے چوکیدار سے کہا کہ وہ جنگل میں ذرا چہل قدمی کرنے جا رہا ہے۔ چوکیدار نے کہا " بابو یہ علاقہ خطرناک ہے جگہ جگہ گھاسوں میں دلدل چھپی ہوئی ہے۔ تم کہیں دلدل میں نہ پھنس جاؤ۔ میں تمہارے سا

چلتا ہوں۔ "

لیکن چوکیدار کو ندیم نے وہیں رہنے پر راضی کر لیا اور خود ناریل کے دلدلی ذخیرے کی طرف چل پڑا۔ وہ کئی دلدلی جنگل عبور کر چکا تھا۔ یہ دریائی دلدل ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ اب وہ تو گھاس کا رنگ دیکھ کر ہی پہچان لیتا تھا کہ اس کے نیچے دلدل ہے۔ سورج ابھی ابھی غروب ہوا تھا اس کی عنابی روشنی کاسنی اندھیرے میں بدل رہی تھی۔ پہلے تو ندیم چہل قدمی کے انداز میں آہستہ آہستہ ٹہلتا رہا۔ پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ چوکیدار کی نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے تو اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ وہ دریا کے کنارے آ گیا۔ اسٹیشن کی سمت کا اسے بخوبی اندازہ تھا کوئی ایک میل چلنے کے بعد وہ دریا کو چھوڑ کر آبادی والے علاقے کی طرف ہو گیا۔ یہاں زیادہ تر کارخانوں اور فیکٹریوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ان کے پیچھے کلکتہ کا دوسرا بڑا ریلوے اسٹیشن ہوڑہ تھا۔ ندیم کو یہیں سے گوماہ کے لیے کوئی ٹرین پکڑنی تھی۔ اندھیرا ہونے لگا تھا۔ ندیم کارخانوں سے دور دور ہو کر چل رہا تھا۔ ایک جگہ اسے موٹر رکشا خالی مل گیا۔ اس میں سوار ہو کر وہ ریلوے اسٹیشن سے ایک فرلانگ دور ہی ریلوے گوداموں کے پاس اتر گیا۔ یہاں چائے کی ایک دکان میں بیٹھ کر وہ چائے پینے لگا۔ وہ کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا تا کہ اندھیرا زیادہ ہو جائے۔ جب رات پوری طرح چھا گئی تو ندیم چائے کی دکان سے نکلا اور گودام کی دیوار پھاند کر اسٹیشن کے یارڈ میں آ گیا اور ریل کی پٹڑیوں کے ساتھ ساتھ پلیٹ فارم کی طرف چل پڑا۔ وہ بکنگ ونڈو پر خود ٹکٹ نہیں خریدنا چاہتا تھا۔ اس نے پروگرام یہ بنایا کہ وہ پلیٹ فارم پر پہنچ کر کسی قلی کو پیسے دے کر ٹکٹ منگوا لے گا۔

ہوڑہ کا اسٹیشن نیلی پیلی اور لال بتیوں سے خوب روشن تھا۔ ندیم کے لیے کلکتہ کے دونوں اسٹیشن یعنی سیالدہ اور ہوڑہ کوئی نئے نہیں تھے اسے معلوم تھا کہ سیالدہ سے ریل آسام اور تری پورہ یعنی بنگال کے اندر کی طرف جاتی ہے اور پنجاب، دلی، بہار کی طرف ٹرینیں ہوڑہ سے چلتی ہیں۔ وہ ریل کی پٹڑیوں میں سے گزرتا پلیٹ فارم پر آ گیا۔ پلیٹ فارم کے شروع میں ہی وہ ایک جگہ قلی کو دیکھ کر اس کی طرف مڑا۔ معلوم ہوا کہ بہار کی طرف گاڑی نو بجے رات پلیٹ فارم نمبر ۴ سے روانہ ہو گی۔ ندیم نے قلی کو ایک فرضی قصہ سنایا اور اسے پیسے دے کر گوماہ تک کی

تھرڈ کلاس کی ایک ٹکٹ منگوالی۔ تلی کو اس کی کمیشن ادا کر دی۔ تھرڈ کلاس میں اس کے لیے سفر محفوظ تھا۔ کیونکہ ایک تو تھرڈ کلاس میں رش ہوتا ہے اور اسے اپنے آپ کو چھپانے کا موقع مل جاتا۔ دوسرے پسنجر ٹرینوں کی طرف پولیس زیادہ توجہ نہیں دیتی تھی۔ ان ٹرینوں میں مسافروں کا ہجوم ہوتا تھا۔ پولیس کس کس کو دیکھتی پھرے۔ یہ ایک رات اور ایک دن کا سفر تھا۔ ندیم کو اگلے روز رات کے وقت گوماہ پہنچنا تھا۔ ٹرین سات بجے ہی آ کر پلیٹ فارم پر لگ گئی۔ مگر ندیم اس وقت ڈبے میں بیٹھا جب ٹرین کے چلنے میں چند منٹ ہی باقی رہ گئے تھے۔ پولیس کی طرف سے وہ غافل نہیں تھا۔ ڈبے میں وہ سامان کی اوٹ میں فرش پر ہی ٹائیلٹ کے پاس دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ جب ٹرین چلی تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔

جس وقت ندیم ٹرین میں بیٹھا۔ کلکتہ سے بہار کی طرف روانہ ہوا تھا عین اس وقت یعنی رات کے نو بجے نجمی اپنی جنگل والی خفیہ کمین گاہ میں اپنے مسلمان وفادار ساتھی بادل کے ہمراہ درختوں کے نیچے ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے ٹہل رہی تھی۔ شبانہ کو نجمی کا کچھ علم نہیں تھا کہ کہاں غائب ہو گئی ہے۔ اسے روپا اور کالی بدمعاش سے اپنا انتقام لینا تھا۔ صرف یہی دو اس کے دشمن اور اس کی عزت کے قاتل باقی رہ گئے تھے۔ اپنے وفادار ساتھی بادل کو نجمی نے سب کچھ بتا دیا تھا اور اس وقت وہ بادل کے ساتھ یہی مشورہ کر رہی تھی۔ اس کا پروگرام اسی رات کمین گاہ سے شہر کلکتہ کی طرف روانہ ہونے کا تھا۔ جہاں روپا اور کالی بدمعاش سندری نام کی مکار ہندو عورت کے ساتھ رہ رہے تھے اور جہاں سے انھوں نے شبانہ کو بردہ فروش دادا بھائی کے حوالے کیا تھا۔ نجمی اپنے ساتھ زیادہ آدمی نہیں لے جانا چاہتی تھی۔ طے یہ ہوا کہ اس کے ساتھ صرف بادل ہی جائے گا۔ تیز رفتار طوفانی جیپ ان کے پاس تھی۔ انھوں نے جنگل جنگل ایک آسان اور خفیہ راستے سے بنگال میں داخل ہو کر دریائے ہگلی کے کنارے روپا اور کالی بدمعاش کے اڈے تک پہنچنا تھا۔ نجمی کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ایک قاتلہ ہے۔ اپنے کئی دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتار چکی ہے اور بنگال کی پولیس شدت سے اس کی تلاش میں ہے۔

دس بجے رات نجمی [illegible] گولیاں اور فالتو رائفلیں اور پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ اور

ایک خنجر رکھوایا۔ کھانے کے لیے تھوڑی سی خشک بھنی ہوئی مچھلی بھی ساتھ لی اور اپنے وفادار مسلمان ساتھی بادل کے ہمراہ جیپ میں بیٹھ کر کلکتہ شہر کی جانب روانہ ہو گئی۔ ٹرین بنگال کی سرحد کی جانب ایک لمبا چکر کاٹ کر آتی تھی اور اسے بہت وقت لگتا ہے لیکن نجمی جنگل میں سے ہو کر جس راستے سے جا رہی تھی وہ راستہ زیادہ دور اور زیادہ طویل نہیں تھا۔

انھیں پانچ گھنٹوں میں کلکتہ شہر کی حدود میں داخل ہو جانا تھا۔ بند جیپ گھاٹیوں، کھڈوں، وادیوں اور ندی نالوں کو عبور کرتی رات کی خاموشی اور تاریکی میں تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ بادل جیپ چلا رہا تھا۔ نجمی اس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ دونوں کی اسٹین گنیں ان کے گھٹنوں پر پڑی تھیں۔ گولیوں کی بیلٹ کمر کے ساتھ بندھی تھی۔ دونوں نے اپنے سروں پر سرخ رومال باندھ رکھے تھے۔ لباس گوریلوں جیسا تھا۔ یعنی بش شرٹ اور پتلون پاؤں میں ربڑ کے جوتے تھے۔ نجمی خاموش تھی۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور وہ سوچ رہی تھی کہ روپا بدمعاش اور کالی بدمعاش اگر اپنے اڈے پر نہ ہوئے تو اسے سخت مایوسی ہوگی اور اسے دوبارہ کسی دوسری رات کو انھیں قتل کرنے کے لیے آنا پڑے گا۔ بارہ بجے رات انھوں نے ایک دریا عبور کیا۔ پل ویران تھا۔ اب وہ بڑی پکی سڑک سے ہٹ کر ایک ذیلی سڑک پر آ گئے۔ یہ سڑک آگے چل کر ناہموار علاقے میں داخل ہو گئی۔ یہاں سے ایک شارٹ کٹ بردوان پرانے محل والے کھنڈر کی طرف نکل جاتا تھا۔ جونہی ان کی جیپ بنگال کی سرحد عبور کر کے بردوان کو جانے والی سڑک پر آئی۔ اچانک جھاڑیوں میں سے دو پولیس کانسٹیبل نکل کر سڑک پر آ گئے۔ جو جیپ کو رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ نجمی نے بادل سے کہا۔

"جیپ کو روک دو۔"

بادل نے تشویش انگیز نظروں سے نجمی کو دیکھا اور کہا کہ وہ ہم پر فائرنگ کر دیں گے۔ ہمیں نکل جانا چاہیئے۔ نجمی نے سخت لہجے میں حکم دیا۔

"میں کہتی ہوں جیپ کو روک دو۔"

بادل نے کچی سڑک پر بریک لگا دی۔ جیپ بنگالی کانسٹیبلوں کے بالکل قریب جا کر رک گئی۔ نجمی کی گرفت اپنی اسٹین گن پر مضبوط ہو گئی۔

کانسٹیبل بنگال پولیس کے تھے۔ انھوں نے رائفلیں تان رکھی تھیں۔ ابھی انھوں نے وہ خونی اسٹین گنیں نہیں دیکھی تھیں جو بادل اور نجمی کے گھٹنوں پر پڑی تھیں۔ ایک کانسٹیبل نے بنگلہ زبان میں چلّا کر کہا۔

"باہر آ جاؤ۔"

اس علاقے میں ڈاکے اور قتل کی وارداتیں اکثر ہوتی رہتی تھیں اور پولیس ان ڈاکوؤں کی سرکوبی کے واسطے گشت لگایا کرتی تھی۔

بادل نے بنگلہ میں ہی کہا "ہم بردوان جا رہے ہیں وہاں ہمارا اپنا گھر ہے۔ ہم ڈاکو نہیں ہیں۔"

اس پر دوسرے کانسٹیبل نے نجمی کو کاندھے سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا اور گالی دی۔ نجمی کے بدن میں آگ لگ گئی آگ تو اس کے بدن میں بھارتی پولیس کے ہر آدمی کو دیکھ کر لگ جاتی تھی۔ لیکن اس بدقسمت انسان نے نجمی کو گالی بھی دی تھی۔ نجمی نیچے گر پڑی اس کی اسٹین گن بھی اس کے ساتھ ہی نیچے آ گئی تھی۔

اس نے لیٹے لیٹے اسٹین گن کی نالی کا رخ بنگالی کانسٹیبل کی طرف کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ گولیوں کے دھماکے ہوئے اور پورا برسٹ کانسٹیبل کے سینے کو چھلنی کر گیا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر نیچے منہ کے بل گرا۔ دوسرا برسٹ فائر ہوا اور دوسرا کانسٹیبل خاک و خون میں تڑپ رہا تھا۔ یہ دوسرا برسٹ بادل نے فائر کیا تھا۔ نجمی زمین سے اٹھی اور جیپ میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

"چلو بادل ہمیں ابھی روپا اور کالی کا قرض بھی اتارنا ہے۔"

جیپ دو تڑپتی لاشوں کو پیچھے چھوڑ کر بردوان کو دائیں جانب چھوڑتی ہوئی کلکتے کے دریا ہگلی کی جانب روانہ ہو گئی۔ بادل نے جیپ کی رفتار تیز کر دی تھی۔ رات کے اندھیرے میں جیپ کچی سڑک پر اچھلتی ہوئی دوڑتی جا رہی تھی۔ اس سڑک پر یہ لوگ کئی بار کلکتے جا چکے تھے۔

رات کے تین بج رہے تھے۔ رات ڈھل رہی تھی آسمان پر ستاروں کا رنگ فق ہونے لگا تھا کہ جیپ مشرق کی طرف سے کلکتے شہر کے مضافات میں داخل ہو گئی۔ بادل کو معلوم تھا اسے کہاں اور کس طرف جانا ہے۔ فیکٹری ایریا ان کی بائیں جانب۔ گاؤں دور رہ گیا تھا شہر کی روشنیاں دریا پار جھلملا رہی تھیں۔ ہوڑہ برج کی روشنیاں بھی صاف دکھائی دینے لگی تھیں۔ جیپ دریا کے کنارے کنارے روپا اور کالی بدمعاش کے خفیہ اڈے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ نجمی دل میں سوچ رہی تھی کہ روپا اور کالی بدمعاش کو وہاں ہونا چاہیئے۔ اس نے بادل سے کہا۔

"جیپ کی رفتار تیز کر دو۔ ہمیں دشمنوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد واپس بھی جانا ہے۔"

بادل نے رفتار مزید تیز کر دی۔ دریا کے کنارے کا راستہ ہموار اور خالی تھا۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ جیپ تھوڑی دیر بعد بائیں جانب دریا کی سڑک سے اتر کر ایک جنگل میں داخل ہو گئی۔ جنگل گھنا نہیں تھا۔ یہ جنگل بھی نہیں تھا۔ بلکہ ناریل، سنبل اور املی کے درختوں کا ذخیرہ تھا جو دور تک دریا کے ساتھ پھیلتا چلا گیا تھا۔ ان میں دلدلیں بھی تھیں اور برساتی نالے بھی تھے جو دریا میں طغیانی سے بھر جاتے تھے۔

نجمی اور بادل اس جنگل کے چپے چپے سے واقف تھے۔ انھوں نے ایک خاص مقام پر جا کر جیپ درختوں میں کھڑی کر دی۔ اسٹین گنوں کے میگزین چیک کیے اور جھاڑیوں کو ہٹاتے تیز تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگے۔ ان دونوں کو اس امر کا احساس تھا کہ رات ڈھلتی جا رہی ہے اور دن نکلنے والا ہے۔ ایک دلدلی ٹاپو کے اوپر سے ہو کر وہ ایک مقام پر آ کر آہستہ اور محتاط ہو گئے۔

درختوں کے نیچے ایک کوارٹر نما جھونپڑا دکھائی دے رہا تھا۔ جھونپڑی کے اندر روشنی ہو رہی تھی۔ نجمی اور بادل قریب گئے تو انھیں ایک عورت کی آواز بھی سنائی دی۔ نجمی نے بادل کو دوسری طرف سے جھونپڑے کے عقب میں آنے کا اشارہ کیا اور خود جھک کر بائیں جانب سے

جھونپڑے کی طرف بڑھی۔ اب اسے عورت کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ عورت بنگلہ زبان میں کہہ رہی تھی۔

"روپا سوگیا ہے کالی! تم بھی اب سو جاؤ۔"

نجمی وہیں بیٹھ گئی۔ اسے کالی بدمعاش کی آواز سنائی دی۔ "نہیں سندری میں نہیں سوؤں گا۔ میں نہیں سوؤں گا۔"

نجمی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے دونوں قاتل جھونپڑی میں موجود تھے۔ دوسری طرف سے اسے بادل کا سایہ جھاڑیوں میں جھکا جھکا باہر نکلتا نظر آیا۔ کوارٹر نما جھونپڑی کے آگے بانس کی مچان کا برآمدہ تھا دروازہ بند تھا۔ روشنی جھونپڑی کے روشن دان میں سے آرہی تھی۔ نجمی نے بادل کو ایک خاص اشارہ کیا۔ بادل زمین پر رینگتے ہوئے دروازہ کی ایک جانب درخت کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ اسٹین گن کی نالی کا رخ دروازے کی جانب تھا۔ نجمی نے پتھر اٹھا کر دروازے پر دے مارا۔ کھٹاک کی آواز رات کی خاموشی میں بلند ہوئی۔

جھونپڑی میں جو عورت یعنی سندری بول رہی تھی وہ ایک دم خاموش ہوگئی پھر کسی کے چارپائی سے اٹھنے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ نجمی نے دروازے کو اپنے اسٹین گن کی زد میں لے رکھا تھا۔ دروازہ کھلا اور پہلے سندری باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھنے لگی اس کے ساتھ ہی کالی بدمعاش بھی باہر آگیا۔

"یہ کھڑاک کیسا تھا سندری؟"

اس نے جھومتے ہوئے پوچھا۔ نجمی اسٹین گن تانے اٹھ کھڑی ہوئی جھاڑیوں سے چھلانگ لگا کر باہر نکلی اور کالی کے سامنے آکر کرخت آواز میں بولی۔

"یہ تمہاری موت کا کھڑاک تھا کالی! مجھے پہچانتے ہو۔"

جھونپڑی کے کھلے دروازے میں سے روشنی نجمی کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کی شکل دیکھتے ہی کالی بدمعاش کا رنگ اڑ گیا۔ ایک تو نجمی کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی۔ دوسرے کالی بدمعاش کو معلوم ہو چکا تھا کہ چندا ڈاکو بن چکی ہے اور ان تمام لوگوں کو ہلاک کر رہی ہے جو اس کی زندگی کی بربادی کا باعث بنے تھے۔ اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے صرف اتنا ہی

نکل سکا۔

"چندا! چندا! تم، میں میں۔"

نجمی نے بادل کو آواز دی، بادل درخت کی اوٹ سے نکل آیا۔ وہ بھاگ کر جھونپڑے میں داخل ہوگیا، روپا بدمعاش اندر کھاٹ پر گہری نیند سو رہا تھا۔ بادل نے اسے پاؤں سے ٹھوکر مار کر اٹھایا۔ روپا بدمعاش ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اپنے اوپر اسٹین گن تنی ہوئی دیکھی تو سہم گیا۔

بادل، روپا بدمعاش کو گھسیٹ کر جھونپڑے سے باہر لے آیا اور زمین پر نجمی کے قدموں میں لاکر ڈال دیا۔ نجمی نے اس کی گردن پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔

"روپا! تم نے بھی اپنی موت کو ضرور پہچان لیا ہوگا۔"

سندری تھر تھر کانپ رہی تھی۔ کالی کو بادل نے اپنی اسٹین گن کی زد میں لے رکھا تھا۔ بادل نے کرختگی سے کہا۔

"دن نکلنے والا ہے ہمیں ابھی واپس بھی جانا ہے۔ ان کا کام تمام کیے دیتے ہیں۔"

کالی بدمعاش ہاتھ باندھ کر گڑگڑانے لگا۔

"نہیں نہیں چندا بہن! مجھے مت مارنا مجھے مت مارنا۔"

نجمی نے غراتے ہوئے کہا "اس لیے کہ تم دوسری بھولی بھالی لڑکیوں کو اغوا کرکے ان کی زندگیاں برباد کر سکو، نہیں کالی نہیں اب تم کو اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ تم نے میرے ساتھ جو ظلم کیا اس کا بدلہ میں خود لے رہی ہوں۔ دوسری عورتوں کے ساتھ تم نے جو وحشیانہ سلوک کیا اس کا بدلہ تم سے آگے جاکر لیا جائے گا۔ موت.... جرائم پیشہ ظالموں کو موت!"

نجمی نے آخری جملہ چلا کر ادا کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ تڑاتڑ تڑ گولیوں کے برسٹ چلنے لگے۔ ایک، دو، تین، چار، پورے چار برسٹ فائر ہوئے اور کالی خون میں لت پت زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس کا سارا جسم گولیوں سے چھلنی ہوگیا تھا۔ نجمی نے تڑپتے ہوئے کالی پر مزید برسٹ فائر کیے اور وہ ٹھنڈا ہوگیا۔ روپا بدمعاش اور سندری دہشت زدہ تھے۔ بادل نے روپا کی طرف اسٹین گن کرتے ہوئے کہا۔

"اسے میں ختم کرنا چاہتی ہوں۔"

نجمی بلند آواز میں بولی۔

"یہ میرا قاتل ہے۔ میں اس سے اپنے قتل کا بدلہ لوں گی۔"

نجمی کی اسٹین گن شعلے اگلنے لگی۔ ان گنت گولیاں روپا بدمعاش کے جسم کو چھیدتی ہوئی گزر گئیں۔ نجمی نے اسٹین گن کا رخ اوپر کر لیا اور سندری کی طرف شعلہ بار نگاہوں سے دیکھا۔

"تم ان کی نائیکہ ہو۔ تمہارے ان ہاتھوں سے بھی کئی بے گناہ معصوم لڑکیوں کی عزتوں کے خون ہوئے ہیں۔ میں جانتی ہوں تم کیا کرتی رہی ہو۔"

سندری نجمی کے پاؤں پر گر کر گڑگڑانے لگی۔

"مجھے معاف کر دو چندا۔ میں بے گناہ ہوں۔ یہ لوگ مجھے بھی اغوا کر کے لائے تھے۔ میں نے ان کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا۔ لیکن میں نے کسی لڑکی کو اغوا نہیں کیا۔ بھگوان کی سوگند کھا کر کہتی ہوں میں بے گناہ ہوں۔"

نجمی ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ سندری کو کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ سندری ہاتھ باندھے کھڑی ہو گئی۔ نجمی نے پوچھا۔

"کیا یہاں کوئی ندیم نام کا شخص آیا تھا۔؟"

نجمی نے اسے ندیم کا حلیہ بیان کیا۔ سندری نے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے کہا۔

"نہیں چندا بیٹی! اس حلیے کے کسی آدمی کو میں نے یہاں نہیں دیکھا۔"

سندری نے نجمی کو شبانہ کے بارے میں بالکل نہ بتایا کہ ایک عورت کو ایک روز پہلے انھوں نے دادا بھائی کے ہاتھوں فروخت کیا ہے۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے بتا دیا تو چندا اسے بھی نہیں چھوڑے گی۔ بادل نے اسٹین گن سندری کی گردن سے لگا دی۔

"میں اسے شوٹ کرنے لگا ہوں۔"

نجمی نے ہاتھ کے اشارے سے بادل کو روک دیا۔ ایک گہرا سانس بھر کر اسٹین گن والا ہاتھ نیچے کر لیا اور بوجھل آواز میں بولی۔

"چلو بادل ہمیں بہت دور جانا ہے۔"

سندری کی گھگھی بندھی ہوئی تھی، رنگ فق تھا، ہونٹ خشک تھے۔ جڑے ہوئے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ روپا اور کالی بدمعاش کی چھلنی لاشیں خون میں لت پت ٹھنڈی ہو چکی تھیں۔ نجمی نے لاشوں کی طرف نفرت بھری نگاہ ڈالی۔ ان پر زور سے تھوکا اور بادل کے آگے آگے تیز تیز قدموں سے چلتی درختوں کے اندھیرے میں گم ہو گئی۔ بادل بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں اپنی جیپ میں بیٹھے تھے اور جیپ دریا کے کنارے کنارے پوری رفتار سے بنگال کی سرحد کی طرف چلی جا رہی تھی۔ پو پھٹ چکی تھی صبح کا نیلا نیلا اولیں اجالا پھیل رہا تھا۔ نجمی نے بادل کو چلا کر کہا

"اوہنی بن کی طرف سے ہو کر چلنا بادل۔"

اور بادل نے ایک فرلانگ چلنے کے بعد جیپ کو ایک کچے راستے پر چلا دیا۔

اب ہم واپس ندیم کی طرف چلتے ہیں۔ ندیم شام کے وقت صوبہ بہار کے پہلے اہم ریلوے اسٹیشن گوماہ پر ٹرین سے اتر گیا۔ شام ہو چکی تھی، اسٹیشن اور شہر کی بتیاں جگمگانے لگی تھیں۔ پلیٹ فارم پر زیادہ رش نہیں تھا۔ ندیم کو یہاں سے امرگڑھ کی طرف سے ہوتے ہوئے جنوب کی سمت اوہنی بن کے جنگل میں داخل ہونا تھا۔ نجمی کی خفیہ کمین گاہ اسی جنگل میں کسی مقام پر تھی۔ ندیم کی اطلاع کے مطابق یہ کمین گاہ شولاگڑھ برانچ لائن والی نہر سے نکل کر جنگل کی طرف جاتی ندی کے کنارے چٹانوں کے پاس تھی۔ جنگلوں میں پھرنا اور اسے تلاش کرنا اب ندیم کے لیے کوئی انوکھا کام نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ رات کے اندھیرے میں بھی نجمی کی کمین گاہ پر پہنچ جائے گا۔ وہ اسٹیشن کے گیٹ کی طرف جانے کی بجائے پلیٹ فارم سے اتر کر ریلوے لائن کی طرف بڑھا۔ ٹکٹ اس کے پاس موجود تھا لیکن وہ گیٹ پر کھڑے ٹکٹ چیکر کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہاں اس کی مڈبھیڑ کسی پولیس کانسٹیبل سے ہو سکتی تھی۔

وہ پلیٹ فارم کی ڈھال اتر رہا تھا کہ ایک ٹی ٹی اس کی طرف بڑھا۔ اس نے ندیم سے ٹکٹ طلب کیا۔ ندیم نے صدری کی جیب سے ٹکٹ نکال کر اسے دیا تو ٹی ٹی نے پوچھا "تم ادھر ریلوے یارڈ میں کس لیے جا رہے ہو؟"

ندیم نے بتایا کہ ادھر ریلوے لائن کے پار اس کے دوست کا گھر ہے۔ ٹی ٹی نے ٹکٹ چیک کر کے ندیم کو واپس کر دیا اور کچھ نہ کہا۔

ندیم آگے بڑھ گیا۔ وہ ریلوے لائن پار کر رہا تھا کہ ریلوے کے چوکیدار نے اسے روک لیا۔

"کدھر جا رہے ہو تم؟"

ندیم بڑا سٹ پٹایا۔ یہ کم بخت بار بار اس کا راستہ کیوں روک رہے ہیں۔ وہ چوکیدار کی طرف پلٹ کر بولا۔

"میرے پاس ٹکٹ ہے بھیا۔ وہ سامنے لائن پار میرے دوست کا کوارٹر ہے مجھے وہاں جانا ہے۔"

چوکیدار نے اس طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر وہاں تو گودام ہیں کوئی کوارٹر نہیں ہے۔"

ندیم نے کہا "گودام کے پار کوارٹر ہے میرے دوست کا۔"

چوکیدار نے ڈنڈا گھماتے ہوئے کہا۔

"گودام کی دوسری طرف بھی کوئی کوارٹر نہیں ہے تم مجھے کوئی چور معلوم ہوتے ہو اور ریلوے گودام میں چوری کرنے کی نیت سے جا رہے ہو۔ ابھی کل رات یہاں سے ہزاروں روپے کا مال چرا لیا گیا ہے۔"

ندیم نے ذرا سا مسکراتے ہوئے کہا۔

"بھائی میں شریف آدمی ہوں۔ چور نہیں ہوں میں تو بردوان سے اپنے دوست سے ملنے آیا ہوں۔"

چوکیدار نے سامنے سے پولیس کے ایک کانسٹیبل کو آتے دیکھا تو رعب سے بولا "چور کے سر پر سینگ نہیں ہوتے اور جدھر تم جا رہے ہو ادھر کوئی کوارٹر بھی نہیں ہے۔"

ندیم نے پولیس کانسٹیبل کو اپنی طرف آتے دیکھا تو دل زور سے دھڑکا۔ کہیں میں کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤں۔ پولیس کانسٹیبل ریلوے کا تھا مگر اس کے کاندھے سے رائفل لٹک رہی تھی ندیم نے چوکیدار سے کہا۔

"بھائی مجھے جانے دو۔ میرا دوست انتظار کر رہا ہوگا اس کی ماں بہت بیمار ہے میں اس کے لیے دوائی لایا ہوں بردوان کے ویدجی سے۔"

اتنے میں کانسٹیبل قریب آ گیا اور بولا۔

"کیا ہو رہا ہے دھنیا؟"

دھنیا چوکیدار کا نام تھا۔ چوکیدار پہلے سے زیادہ شیر ہو گیا۔ ندیم کی طرف اشارہ کر کے کانسٹیبل سے مخاطب ہوا۔

"یہ مجھے کوئی چور لگتا ہے سنتری جی، کہتا ہے سامنے والے کوارٹروں میں جا رہا ہوں۔ پر ادھر کوئی کوارٹر نہیں ہے۔"

ندیم دل میں اس لمحے کو برا بھلا کہہ رہا تھا جب اس نے گیٹ کی بجائے ریلوے یارڈ کو عبور کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کانسٹیبل نے گھور کر ندیم کو دیکھا اور تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

"کیوں بے کون ہے تو؟ کدھر سے آیا ہے؟"

ندیم نے وہی کہانی دہرائی تو چوکیدار بول پڑا "سنتری جی اس پر مجھے شک ہے۔ یہ کل والے چوروں کا ساتھی ہے۔ دوسرے گوداموں کا سراغ لگانے آیا ہے۔"

ندیم نے ادھر ادھر دیکھا۔ بھاگ چلو ندیم بھاگ چلو، اس کے دل نے کہا۔ لیکن اتنی دیر میں... کانسٹیبل نے رائفل کاندھے سے اتار کر اپنے ہاتھوں میں تھام لی تھی اور اس کی نالی کا رخ ندیم کی طرف تھا "چلو پولیس چوکی چلو، خبردار اگر بھاگے تو گولی مار دوں گا۔"

ندیم کے پاؤں تلے سے جیسے زمین کھسک گئی اسے اور کچھ نہ سوجھا۔ صدری کی جیب میں جتنے روپے تھے نکال کر سنتری کو پیش کر دیئے اور بولا "یہ لو مجھے جانے دو۔ تمھاری بڑی مہربانی ہوگی۔"

سنتری پر اس کا الٹا اثر ہوا اس نے چیخ کر کہا "ابے مجھے گئو ماتا کا ماس کھلاتا ہے۔"

ساتھ ہی اس نے آواز دے کر اپنے ساتھیوں کو بھی بلا لیا۔ پلیٹ فارم کی طرف سے اس کی آواز سن کر تین کانسٹیبل دوڑتے ہوئے آ گئے اور انھوں نے آتے ہی ندیم کو گھیرے میں لے لیا۔ وہ یہ سمجھے کہ ان کے ساتھی نے کل والا چور پکڑ لیا ہے۔ ایک سنتری نے تو ندیم کی گردن پر زور سے مکا مارا۔

"لے چلو اسے چوکی پر۔"

چار رائفلیں ندیم کے اردگرد تنی ہوئی تھیں۔ وہ پھنس چکا تھا۔ اس نے ہاتھ نیچے لٹکا لیے اور چاروں سنتری اسے آگے لگا کر ریلوے کی پولیس چوکی پر لے آئے یہ چوکی اسٹیشن کے ساتھ ہی تھی۔ یہاں ہیڈ کانسٹیبل ایک سکھ تھا اس نے ندیم کو آتے ہی دو تین تھپڑ لگا دیئے۔ اور بولا: "اس کو حوالات میں بند کر دو اوئے۔"

ندیم کو گودام میں چوری کے الزام میں حوالات میں بند کر دیا گیا۔ ابھی تک کسی کو یہ پتہ نہیں چلا تھا کہ ندیم وہ ملزم ہے جس کی تلاش میں دلی اور کلکتے کی پولیس ایک عرصے سے سرگرداں ہے اور جو دوبارہ جیل توڑ کر بھاگ چکا ہے اور جس پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام ہے۔

ندیم حوالات میں سر پیٹ کر بیٹھ گیا اور وہاں سے فرار ہونے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ صبح یہ لوگ اسے عدالت میں لے جا کر ریمانڈ لے لیں گے اور پھر اس کا سارا... بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ اور وہ کلکتہ یا دلی کی اسپیشل پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ سوال یہ تھا کہ وہ حوالات سے کیسے فرار ہو سکتا تھا۔ حوالات کے دروازے پر لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ باہر مسلح سنتری پہرہ دے رہا تھا۔ سامنے چوکی کا آفس تھا۔ ندیم کا خیال تھا کہ اگلے روز عدالت سے ریمانڈ لینے کے بعد اس سے پوچھ گچھ کی جائے گی لیکن ایک گھنٹے بعد ہی سکھ ہیڈ کانسٹیبل نے اسے چوکی کے ایک کمرے میں بلا لیا اور پوچھ گچھ شروع کر دی۔ ندیم کو ہتھکڑی لگی تھی اور وہ کمرے کے فرش پر بیٹھا تھا۔ سکھ ہیڈ کانسٹیبل نے ندیم کی اردو سے بہت جلد اندازہ لگا لیا کہ وہ پنجابی ہے: "اوئے تم پنجابی ہو؟"

ندیم نے کہا: "ہاں جی! میرا نام رمیش بھاٹیہ ہے جی میں امرتسر کا رہنے والا ہوں۔" ندیم نے ایک جھوٹ بولا تو اس کا سلسلہ برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ سکھ ہیڈ کانسٹیبل کو قائل نہ کر سکا کہ وہ کلکتے سے وہاں اپنے دوست سے ملنے آیا تھا۔ سکھ ہیڈ کانسٹیبل نے ایک پل کے لیے بڑے غور سے ندیم کو دیکھا۔ ڈاڑھی کھجاتے ہوئے کچھ سوچا اور باہر نکل گیا۔ سنتری ندیم کے سر پر کھڑا تھا۔ ندیم کا دل ڈوبنے لگا۔ یقیناً سکھ کو اس پر شک ہو گیا ہے۔ دوسرے لمحے سکھ پولیس آفیسر کمرے میں آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک فائیل تھی۔ اس میں سے ایک تصویر نکال کر اس نے ندیم کے سامنے کر دی اور بولا: "اس کو پہچانتے ہو؟"

تصویر دیکھتے ہی ندیم کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔ یہ اسی کی تصویر تھی۔ ایک زوردار ٹھڈا ندیم کی کمر پر پڑا اور وہ آگے کو گر پڑا۔ سکھ ہیڈ کانسٹیبل نے اسی وقت شور مچا دیا کہ اسے فوراً بند کر دو باہر پوری گارد پہرہ دے گی۔ ندیم کو حوالات میں بند کر کے باہر چار سنتریوں کا پہرہ لگا دیا پندرہ منٹ بعد شہر سے دو پولیس انسپکٹر وہاں آ گئے۔ ان کے پاس بھی فائیل میں ندیم کی تصویر لگی تھی۔ انھوں نے آتے ہی ندیم کو پہچان لیا اور سکھ ہیڈ کانسٹیبل کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی مدد سے بھارت کا دشمن نمبر ایک ان کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ ندیم نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اسی رات ندیم کو ایک اسپیشل پولیس کوپے میں ہتھکڑیوں سمیت بٹھا کر کلکتے کی طرف روانہ کر دیا گیا۔

کلکتہ پولیس ہیڈ کوارٹر میں ندیم کا ایک بار پھر چالان کاٹا گیا اور بنگال پولیس اسے اپنی حفاظت میں لے کر دلی کی طرف روانہ ہو گئی۔ دلی میں ندیم پہلی بار پکڑا گیا تھا اور وہیں ایک عدالت سے اسے سزا ہوئی تھی اور دلی جیل توڑ کر ہی وہ فرار ہوا تھا۔ ندیم کو فوری طور پر انٹیلی جنس والوں نے اپنی عملداری میں لے کر اس سے ازسرنو پوچھ گچھ شروع کر دی۔ پولیس نے جان بوجھ کر ندیم کو عدالت میں پیش نہ کیا۔ پولیس کو معلوم تھا کہ ندیم کو عدالت سے ایک بار سزا ہو چکی ہے اور اب جیل سے فرار ہونے کے جرم میں اس سزا میں کچھ اضافہ ہو جائے گا اور ندیم کو ایک بار پھر جیل میں ڈال دیا جائے گا۔ پولیس یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ جیل سے بھاگنے کے بعد کہاں کہاں گیا اور اپنے کن کن جاسوس ساتھیوں سے ملا۔

ندیم کے لیے یہ ایک نیا عذاب تھا اسے پرانے قلعے کے پیچھے ایک کھنڈر کے تہہ خانے میں بند کر دیا گیا۔ اس کھنڈر پر پولیس کا قبضہ تھا اور اس کے تہہ خانے کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ وہاں اگر شیر بھی زخمی ہو کر دھاڑے تو باہر کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

ندیم پر انسانیت سوز تشدد کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

شبانہ حیدرآباد دکن کے شہر اورنگ آباد میں اورنگ زیب عالمگیر کی چہیتی بیوی دل رس بانو کے مقبرے کے عقبی باغ کی کٹیا میں تھی۔ وہاں اسے رہتے ہوئے دو روز گزر گئے تھے۔ نیک دل گورکن صبح شام اس کے لیے کھانا لے آتا تھا۔ اس کا بھانجا وقار ریلوے اسٹیشن پر ایک ٹھیکیدار کی کنٹین چلاتا تھا۔ وہ کسی کام سے مدراس گیا ہوا تھا جس کی وجہ سے گورکن اس کے ساتھ شبانہ کے بارے

میں بات نہیں کر سکا تھا۔ دو دن بعد جب واپس آیا تو گورکن نے اسے اعتماد میں لیتے ہوئے شبانہ کی بات کر دی۔ وقار کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ آدمی سیدھا اور شریف تھا فوراً شبانہ کی مدد کرنے پر تیار ہو گیا۔ چنانچہ ایک روز اس نے شبانہ کو ساتھ لیا اور مدراس کی طرف روانہ ہو گیا شبانہ کو وقار نے برقع پہنا دیا تھا تاکہ کسی کو شک نہ ہو وقار نے خود بھی حیدر آبادی اچکن اور چوڑی موری کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اورنگ آباد سے وہ ٹرین میں سوار ہو کر حیدر آباد آئے۔ یہاں سے تامل ناڈو ایکسپریس پکڑی اور مدراس کی طرف چل پڑے۔ وقار نے شبانہ کو سمجھا دیا تھا کہ وہ کسی بھی اسٹیشن پر ٹرین سے باہر نہ نکلے سفر لمبا تھا۔ حیدر آباد سے قاضی پت، پھر ورنگل اور وجے واڑہ پہنچے۔ سفر آرام سے کٹ رہا تھا۔ شبانہ کو یقین تھا کہ کوئی غنڈہ اس کا پیچھا نہیں کر رہا اور وہ ان کی پہنچ سے کافی دور نکل آئی ہے۔ وجے واڑہ سے ٹرین چلی تو تنالی، انگول، نیلور سے ہوتی ہوئی آخر مدراس سینٹرل کے بہت بڑے اسٹیشن میں داخل ہو گئی۔

شبانہ ان علاقوں میں پہلی بار سفر کر رہی تھی۔ لوگوں کے رنگ گہرے سانولے اور کالے تھے۔ عورتیں دبلی پتلی اور کالی تھیں۔ مدراس اسٹیشن اتنا بڑا تھا کہ شبانہ اپنے محسن وقار کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی کہ کہیں اس بھیڑ میں گم نہ ہو جائے۔ وقار مدراس کئی بار آ چکا تھا۔ وہ شبانہ کو اپنے ساتھ ایک دوست کے گھر لے گیا اس کے اس دوست کا نام جمال تھا جو میسور کا رہنے والا تھا۔

اور مدراس میں چیٹی اسٹریٹ میں جو مدراس سنٹرل اسٹیشن کے پیچھے ایک گنجان آباد علاقہ تھا رہائش پذیر تھا۔ وقار نے اپنے مدراس کے دوست سے شبانہ کے بارے میں ابھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ دو روز پہلے وقار مدراس میں اس کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ جمال نے اپنے دوست وقار کو ایک برقع پوش عورت کے ساتھ اپنے ہوٹل کی طرف آتے دیکھا تو کچھ حیران سا ہوا۔ جلدی سے کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل آیا۔ وقار کا خیر مقدم کیا اور کچھ نہ پوچھا کہ اس کے ساتھ برقع پوش خاتون کون ہے۔ ہوٹل کے اوپر ایک ہی کمرہ تھا جس میں جمال خود رہتا تھا۔ اس نے چابی وقار کو دی اور کہا۔

”بی بی کو اوپر لے چلو میں تمہارے لیے کھانا بھجواتا ہوں۔“

رات ہو گئی تھی۔ شبانہ ایک بالکل اجنبی شہر میں تھی۔ یہاں کے لوگ کلچرل، زبان، شکلیں،

کھانا وغیرہ ہر شے پاکستان سے مختلف تھی۔ کھانا کھانے کے بعد وقار کو اس کا دوست جمال اپنے ساتھ نیچے ہوٹل میں لے گیا۔ اب اس نے پوچھا کہ یہ لڑکی کون ہے اور وہ اورنگ آباد سے اتنی جلدی کیسے آ گیا؟ وقار بولا۔

”میرے دوست اس لڑکی کا نام شبانہ بی بی ہے۔ یہ پاکستان کی رہنے والی ہے اور اسے۔“

وقار نے اپنے دوست جمال کو شبانہ کے بارے میں ساری تفصیل بیان کر دی اور بتایا کہ وہ اسے اپنے ساتھ سری لنکا لے جا رہا ہے۔ جمال خوش بھی ہوا اور کچھ پریشان بھی ہو گیا کہنے لگا۔

”تم اس لڑکی کے کاغذات کیسے تیار کراؤ گے۔ تمہارے پاسپورٹ سے کام نہیں چلے گا۔ شبانہ کے لیے بھی تمھیں الگ پاسپورٹ بنوانا ہو گا۔“

وقار چائے کے کپ میں چمچہ ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔

”میرے دوست اس کا حل بھی میں سوچ کر آیا ہوں۔ یہاں مدراس میں میرا ایک ملنے والا رہتا ہے وہ کچھ پیسے لے کر لوگوں کو پاسپورٹ بنوا دیتا ہے۔ میں اس سے شبانہ کا پاسپورٹ بنوا لوں گا۔“

جمال نے کچھ سوچ کر کہا۔

”تم کارگل ہی کی بات تو نہیں کر رہے؟“

”ہاں کارگل ہی کی بات کر رہا ہوں۔“ وقار نے چائے کا گھونٹ بھر کر کہا۔

جمال بولا ”ارے وہ تو جعلی پاسپورٹ بناتا ہے کئی بار پولیس اس کے دفتر میں چھاپا مار چکی ہے۔“

وقار نے کہا ”شبانہ کا جعلی پاسپورٹ ہی بن جائے اسے تو صرف سری لنکا میں داخل کرانا ہے میرا پاسپورٹ تو اصلی ہے تم اس کی فکر نہ کرو۔“

جمال نے تشویش کے ساتھ کہا ”اور اگر لنکا والوں کو پتہ چل گیا کہ شبانہ بی بی کا پاسپورٹ جعلی ہے تو وہ تمھیں بھی ساتھ ہی پکڑ کر حوالات میں بند کر دیں گے۔“

وقار بولا ”اللہ مالک ہے بھائی۔ میں ایک نیک کام کر رہا ہوں خدا ضرور میری مدد کرے گا۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں ہے کہ شبانہ کو لنکا ساتھ لے جاؤں اور اس مصیبت کی

ماری پاکستانی لڑکی کو لنکا پہنچانا بہت ضروری ہے۔"

جمال خاموش ہوگیا۔ وقار نے کہا "بس میں یہ چاہتا ہوں کہ تم کسی سے بات نہ کرنا۔ یہ راز تمھارے سینے میں راز ہی بن کر دفن ہو جانا چاہیئے۔"

جمال نے وقار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "بھائی تم میرے پیارے دوست ہو تمھارے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔ بھلا میں یہ راز کس کو بتا سکتا ہوں۔ تم بتاؤ اگر روپوں کی ضرورت ہے تو میں پیش کر دوں۔"

وقار نے کہا "شکریہ میرے دوست! میں اتنی رقم اورنگ آباد سے لے کر چلا ہوں جو واپسی تک میرے کام آئے۔"

شبانہ ہوٹل کے اوپر والے کمرے میں رات کو سوئی۔ جمال اور وقار نے رات ہوٹل کی دکان میں ہی گزاری۔ دوسرے دن وقار نے شبانہ کے ساتھ اوپر والے کمرے میں ناشتہ کیا اور بتایا کہ وہ اپنے ایک ملنے والے کے پاس اس کے پاسپورٹ کے سلسلے میں جا رہا ہے۔

"تم کمرے میں ہی رہنا میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔"

کارگل ایک بڑا چالاک اور ہوشیار آدمی تھا۔ اس کے پاس ہر قسم کی جعلی مہریں موجود تھیں۔ وقار نے اس سے شبانہ کے پاسپورٹ کی بات کی تو خوش ہو کر بولا "نواب صاحب آپ سے ہم دوسو روپے لیں گے کیوں آپ ہمارے پرانے ملنے والوں میں سے ہیں۔ بس آپ لڑکی کی چار پاسپورٹ سائز کی تصویریں لے آیئے اور اس فارم پر دستخط کروا دیجئے گا۔"

وقار نے دوسو روپے اسی وقت ادا کر دیئے۔ کاغذات سنبھالے اور شبانہ کے پاس لے آیا۔ شبانہ نے اس پر جہاں جہاں دستخط کرنے تھے کر دیئے۔ پھر ایک فوٹو اسٹوڈیو میں جا کر پاسپورٹ سائز کی تصویریں اتروائیں دو دن مزید لگ گئے۔ کارگل نے شبانہ کا جعلی پاسپورٹ تیار کر کے وقار کے حوالے کر دیا۔ وقار نے کہا "کارگل صاحب! کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم لنکا میں داخل ہوتے ہی پکڑے جائیں۔"

کارگل نے وقار کا ہاتھ اپنے سینے سے لگا لیا "نواب صاحب! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ بائی گاڈ اگر کوئی اس پاسپورٹ پر انگلی بھی رکھ دے تو میں اپنی گردن کٹوا دوں۔"

پاسپورٹ بالکل اصلی لگ رہا تھا۔ وقار نے شبانہ کو یہ بالکل نہ بتایا کہ کارگل نے اس کا جعلی پاسپورٹ بنایا ہے۔ اس نے پاسپورٹ شبانہ کو دیتے ہوئے کہا "اپنی واقفیت کی وجہ سے تمھارا پاسپورٹ اتنی جلدی بنا ہے شبانہ۔ ورنہ ایک مہینہ تو اس کام میں ضرور لگ جاتا۔"

شبانہ نے اپنا پاسپورٹ دیکھا۔ بالکل اصلی پاسپورٹ تھا۔ اس کے دل میں وہم تک نہ ہوا کہ یہ پاسپورٹ جعلی ہے۔ وقار اندر سے ضرور ڈر رہا تھا کہ کہیں لنکا کی سرزمین پر معاملہ خراب نہ ہو جائے۔ اگر واقعی کسٹم والوں کو پتہ چل گیا کہ شبانہ کا پاسپورٹ جعلی ہے تو بڑی مشکل ہو جائے گی لیکن وقار ہر حالت میں پاکستانی لڑکی شبانہ کو اس کی منزل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنا سفر شروع کر دیا۔ مدراس سنٹرل کی بجائے وہ مدراس کے دوسرے بڑے اسٹیشن انگمور سے شام کو ٹرین میں سوار ہوئے اور ٹرین ٹھیک سات بجے شام انگمور اسٹیشن سے نکل کر دھنش کوڈی کی طرف روانہ ہو گئی۔ جن لوگوں نے یہ سفر کیا ہے وہ جانتے ہوں گے کہ یہ پوری ایک رات اور ایک دن کا سفر ہے۔ انڈیا کے نقشے پر نگاہ ڈالیں تو نیچے اس کی تکون کے مشرق کی طرف جانا ہوتا ہے۔ یہاں سے بحری جہاز میں سوار ہو کر مسافر سمندر میں پون گھنٹے کا سفر کرنے کے بعد سیلون یا سری لنکا کے ساحل پر پہنچتے ہیں۔ سری لنکا کی اس رخ کی بندرگاہ کا نام ٹالی منار ہے۔ یہ وہی بندرگاہ ہے جس کا آج کل اخباروں میں بڑا نام آتا ہے۔ یہ تامل گوریلوں کی سرگرمیوں کا دوسرا بڑا مرکز ہے۔ پہلا مرکز جافنا اس ساحلی بندرگاہ سے اوپر شمال کی جانب ہے۔ مگر اس زمانے میں یہاں بالکل امن و امان تھا۔ ساری رات اور سارا دن شبانہ ٹرین میں سفر کرتی رہی۔ دوپہر تک ہرے بھرے کیلے کے باغ اور ناریل کے جھنڈ ٹرین کے ساتھ ساتھ رہے لیکن جوں جوں انڈیا کی جنوبی تکون قریب آتی گئی علاقہ ریتیلا ہوتا گیا۔ دونوں جانب سے سمندر ایک دوسرے سے ملنے کے لیے قریب آ رہے تھے۔ اب کہیں کہیں ناریل اور تاڑ کے جھنڈ نظر آتے تھے چھوٹے چھوٹے اسٹیشن بالکل ویران ہوتے۔ گرمی بھی یہاں زیادہ تھی۔ ہوا میں ریت ملی ہوئی تھی۔ ٹرین سہ پہر کے بعد منڈاپم کیمپ کے اسٹیشن پر آ کر رک گئی۔ وقار نے شبانہ کو بتایا کہ یہاں ٹیکے لگیں گے۔ وہ اسے لے کر ایک شیڈ کے نیچے آ کر لنکا جانے والے دوسرے مسافروں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دھوپ میں شیڈ کے ٹین کی چھت گرم ہو رہی تھی۔ شبانہ کا حلق سوکھنے لگا۔ وقار نے بڑی مشکل

سے پانی کا بندوبست کیا۔ ناٹے قد کا کالا ڈاکٹر مسافروں کو بڑی بے دردی سے ٹیکے لگائے جا رہا تھا۔ اس کام میں ایک گھنٹہ صرف ہوگیا۔ پانچ بج چکے تھے۔ جب ٹرین منڈاپم کیمپ نامی ریلوے اسٹیشن سے ریتیلا کوڈی کی طرف روانہ ہوئی۔ منڈاپم کیمپ وہی اسٹیشن ہے۔ جہاں آج کل لنکا سے آنے والے تامل مہاجروں کا کیمپ لگایا گیا ہے۔ بھارت کی فوجوں کے لنکا میں داخل ہونے کے بعد یہ مہاجر اب اس کیمپ سے واپس لنکا جانے شروع ہو گئے ہیں۔ علاقہ سارے کا سارا... ریتیلا ہوگیا تھا۔ کہیں کہیں دور سمندری پانی کے گہرے سبز رنگ کے ٹاپو نظر آنے لگے تھے۔ سورج پوری طرح غروب نہیں ہوا تھا کہ ٹرین آدم برج پر سے گزرنے لگی۔ یہ پل سمندری چٹانوں کے اوپر بنایا گیا ہے اور اس کا نام آدم برج ہے۔ اب اس کا نام بھارتی حکومت نے تبدیل کر دیا ہے۔ شبانہ نے دیکھا کہ ٹرین کی دونوں جانب گہرا نیلا سمندر ہی سمندر تھا۔ ٹرین بڑی بڑی چٹانوں کے اوپر بنے ہوئے پل پر سے گزر رہی تھی۔ دور دور سے سمندر کی نیلی موجیں آکر چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ان لہروں کے چھینٹوں کی پھوار ٹرین کی کھڑکی تک آتی تھی۔ شبانہ کے لیے یہ ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔

شام کے چراغ روشن ہو گئے تھے جب ٹرین دھنش کوڈی پہنچ گئی۔ یہ ایک لمبا پلیٹ فارم تھا جس کی دوسری جانب گودی میں ایک بحری جہاز کھڑا تھا۔ بحری جہاز زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کی بتیوں کا روشن عکس سمندر میں پڑ رہا تھا۔ لنکا جانے والے مسافروں کی قطار بن گئی۔ گودی میں کسٹم والے میز کرسیاں لگائے کاغذات چیک کر کے مہریں لگا لگا کر مسافروں کو جہاز کی طرف بھیج دیتے۔ وقار کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ کوئی مصیبت نہ بن جائے۔ شبانہ بہت خوش تھی کہ ہندوستان سے اس کو نجات مل رہی ہے اور اب وہ بڑی آسانی سے پاکستان واپس جا سکے گی۔ اسے بالکل خبر نہیں تھی کہ اس کے ہاتھ میں جو پاسپورٹ ہے وہ جعلی ہے اور اگر وہ پکڑی گئی تو اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔ وقار کی باری آئی اس کے کاغذات اصلی تھے۔ اسے اپنی بالکل فکر نہیں تھی۔۔۔ پریشانی اسے شبانہ کی تھی جو اس کے پیچھے پیچھے قطار میں چلی آ رہی تھی۔ ناٹے قد کا مدراسی جیٹی آفیسر ہر مسافر کے کاغذات دیکھنے کے بعد مہر لگاتا اور اسے جہاز کی طرف جانے کی اجازت دے دیتا۔ آخر وقار کی باری بھی آگئی۔ اس کے کاغذات اصلی اور درست تھے۔ مدراسی آفیسر نے اس کے

کاغذات پر مہر لگائی اور اسے گزر جانے دیا۔ اب شبانہ کی باری تھی۔

وقار دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہیں ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ مدراسی جیٹی آفیسر نے شبانہ کی طرف دیکھے بغیر اس کے پاسپورٹ کو دیکھا۔ اس کے ورق الٹے۔ ایک جگہ رک کر غور سے پاسپورٹ پر لگی ہوئی انڈین گورنمنٹ کی مہر کو دیکھنے لگا۔ وقار کا دل زور سے دھڑکا۔ کم بخت کو کہیں شک تو نہیں ہو گیا؟ اس نے سوچا۔ مدراسی جیٹی آفیسر نے اب شبانہ کی طرف چہرہ اٹھا کر دیکھا اور انگریزی میں پوچھا۔

"یہ پاسپورٹ تم نے کہاں سے بنوایا تھا؟"

اس سے پہلے کہ شبانہ کوئی جواب دیتی وقار نے آگے بڑھ کر تامل میں کہا "سر یہ میری چھوٹی بہن ہے اس کا پاسپورٹ میں نے بنوایا تھا حیدرآباد سے۔"

مدراسی آفیسر نے کہا "یہ پاسپورٹ جعلی ہے۔ ہمیں بتاؤ یہ کس نے تیار کیا ہے۔ ہم اس گروہ کی تلاش میں ہیں۔"

شبانہ کا رنگ زرد ہو گیا۔ وقار نے مزید وضاحت کرنے کی کوشش کی جو جیٹی آفیسر نے غصے میں کہا "تم دھوکے بازوں کے ساتھی۔ ہم تم دونوں کو گرفتار کرتے ہیں۔" اس نے پولیس کو اشارہ کیا۔ جیٹی پر پولیس موجود تھی۔ اسی وقت وقار اور شبانہ کو ہتھکڑی لگا دی گئی۔ شبانہ پریشانی کے عالم میں اپنے محسن وقار کی طرف دیکھنے لگی۔ وقار نے پہلے تو بڑے اعتماد سے احتجاج کیا پھر منت سماجت کرنے لگا کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ انہیں جعلی پاسپورٹ بنا کر دے دیا گیا ہے۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ جیٹی آفیسر نے ترش روئی سے کہا "یہ فیصلہ مدراس کی عدالت کرے گی۔ ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔"

پولیس نے وقار اور شبانہ کو گرفتار کر کے دھنش کوڈی کی جیٹی کی حوالات میں بند کر دیا گیا۔ شبانہ اور وقار کو الگ الگ حوالات میں بند کر دیا گیا۔ شبانہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

- - ❊ - -

دوسرے دن شبانہ اور وقار کو دھنش کوڈی سے پولیس ساتھ لے کر مدراس کی طرف روانہ ہو گئی۔ وقار نے صاف صاف پولیس کو کارگل کا نام بتا دیا تھا جس نے شبانہ کا پاسپورٹ بنایا تھا۔ مدراس پہنچ کر پولیس نے کارگل کے دفتر پہ چھاپا مارا۔ کارگل ایک بار پھر گرفتار ہو گیا۔ شبانہ کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ عدالت نے شبانہ اور وقار کے بیانات سننے کے بعد انھیں رہا کر دیا کیونکہ اصل مجرم کارگل گرفتار ہو چکا تھا۔ وقار نے عافیت اسی میں سمجھی کہ شبانہ کو واپس اورنگ آباد لے جا کر اپنے گورکن ماموں کے حوالے کر دے چنانچہ ایک ہفتے بعد شبانہ ایک بار پھر نیک دل بوڑھے گورکن کے پاس بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ نیک دل گورکن نے اسے تسلی دی اور کہا۔

”بیٹی! خدا کو یہی منظور تھا۔ تم آنسو نہ بہاؤ میں تمھیں پاکستان بھجوانے کا کوئی دوسرا بندوبست کرنے کی کوشش کروں گا۔“

جبکہ دل رس بانو کے مقبرے والی کٹیا میں اب شبانہ کو رکھنا مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ بوڑھا گورکن اسے اورنگ آباد شہر میں اپنی چھوٹی بیوہ بہن کے گھر میں لے آیا۔ بہن کو گورکن نے ساری بات بتا دی تھی۔ وہ بڑی خدا ترس بیوہ خاتون تھی۔ اس کی اولاد بھی کوئی نہیں تھی۔ اس نے شبانہ کو بڑی خوشی سے اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے دی۔ اورنگ آباد کسی زمانے میں حیدرآباد دکن کا ایک بڑا شہر تھا۔ آجکل اسے مہاراشٹر میں شامل کر لیا گیا۔ اورنگ آباد کی فوجی چھاؤنی میں ماڈرن بلڈنگیں اور بلند عمارتیں تھیں۔ اورنگ آباد کا پرانا شہر کافی گنجان آباد تھا اور اس کی آبادی پچاس ساٹھ لاکھ سے کم نہیں تھی۔ گنجان آباد شہر کی گلیاں اور مکانات تقریباً سو سال پرانے تھے۔ شہر کے کونے والی بستی کی ایک تنگ اونچی نیچی گلی میں بوڑھے گورکن کی بیوہ بہن

کا مکان تھا۔ دو کوٹھڑیوں والے اس پتھروں سے بنے ہوئے پرانے مکان کے اندر ایک چھوٹا سا صحن بھی تھا جس میں نیم کا گھنا درخت تھا۔ شبانہ نے گھر کے کام کاج میں بیوہ عورت کا جس کا نام حسن آرا بی بی تھا۔ ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ محلے میں بہت جلد عورتوں کو پتہ چل گیا کہ بیوہ حسن آرا بی بی کے گھر ایک گوری چٹی لڑکی آ کر رہنے لگی ہے۔ حسن آرا بی بی نے ہمسائیوں کو یہی بتایا کہ یہ لڑکی اس کی ایک دور پار کی رشتے دار خاتون کی بیٹی ہے جس کا اب دنیا میں سوائے ان کے اور کوئی نہیں ہے اس لیے وہ اس کے پاس آ گئی ہے مگر عورتوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ حسن آرا بی بی نے ایک روز اپنے گورکن بھائی کو اس کا ذکر کیا تو وہ بولا۔

”شبانہ بیٹی کو تم گھر سے باہر مت جانے دینا۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ اسے کسی کے ساتھ پنجاب روانہ کر دوں تاکہ وہ بارڈر کراس کر کے پاکستان پہنچ سکے۔“

حسن آرا بی بی نے کہا۔ ”یہ اکیلی لڑکی بارڈر کراس کیسے کرے گی؟ اور پھر تمھارا ایسا کون جاننے والا ہے یہاں؟“

گورکن بولا ”قبرستان کے قریب ایک پنجابی ملک صاحب کا لکڑی کا ٹال ہے۔ ان کے پاس مالیرکوٹلہ سے ان کے ملنے والے اکثر آتے جاتے ہیں۔ یہ وہ پنجابی مسلمان ہیں جو پاکستان بننے کے بعد ہندوستان سے پاکستان نہیں گئے تھے بلکہ ریاست مالیرکوٹلہ میں ہی رہے تھے۔ میں ان سے بات کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے ملک صاحب اس سلسلے میں میری کوئی مدد کریں۔“

دوسرے ہی دن بوڑھے گورکن نے ٹال کے مالک ملک صاحب سے شبانہ کی بات کر دی ملک صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ کہنے لگے

”یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے رمزی بابا لیکن بچی کو اس کے ماں باپ کے پاس پاکستان ضرور پہنچانا چاہیئے۔ دو ایک دن میں میرا دوست پنجاب سے آ رہا ہے اس کی ایسے لوگوں سے دوستی ہے جو بارڈر پر لین دین کا کام کرتے ہیں۔ میں اس سے بات کروں گا۔“

دو دن بعد ملک صاحب کا دوست مالیرکوٹلہ سے اورنگ آباد ان کے پاس آیا تو ملک صاحب نے ایک پاکستانی لڑکی کو بارڈر کراس کروانے کے بارے میں اس سے کھل کر بات کر دی ملک صاحب کے دوست کا نام کمال دین تھا۔ کمال دین نے کہا ”ملک! اگر تم اس لڑکی کو ضرور

پاکستان پہنچنا چاہتے ہو تو میں اسے اپنے آدمیوں کی مدد سے بارڈر کراس کرانے کی کوشش کروں گا۔ تم اسے میرے ساتھ روانہ کر دو۔" چنانچہ ایک روز شبانہ ملک صاحب کے دوست کمال دین کے ساتھ ٹرین میں بیٹھ کر اورنگ آباد سے مالیر کوٹلہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ اپنی قسمت پر آنسو بہا رہی تھی۔ ابھی اس کی تقدیر میں نہ جانے کتنی دربدری لکھی تھی اور خدا جانے اسے کب اپنے پیارے وطن پاکستان کی سرزمین دیکھنے کا اتفاق ہو۔ پھر بھی وہ اللہ تعالٰی کے اس کرم پر اس کی شکر گزار تھی کہ اس کی عزت محفوظ تھی۔ مالیر کوٹلے کا کمال دین بھی انتہائی شریف النفس آدمی تھا جس نے شبانہ کو عورتوں کے ڈبے میں الگ سوار کرایا تھا اور خود ساتھ والے ڈبے میں سفر کر رہا تھا۔ ٹرین اورنگ آباد سے چل کر منماد سے ہوتی ہوئی جل گاؤں پہنچی، یہاں سے دلی، بمبئی کی مین لائن شروع ہو جاتی تھی۔ جل گاؤں سے ٹرین بھوساول پہنچی تو شبانہ کے ڈبے میں ایک پختہ عمر کی عورت داخل ہوئی جس نے بڑا زیور پہن رکھا تھا۔ اس نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ شبانہ اس علاقے کی نہیں ہے وہ شبانہ کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور اس سے باتیں شروع کر دیں۔ شبانہ کو اس عورت پر ذرا سا شک بھی نہ ہوا کہ وہ دوسری قسم کی عورت ہے۔ اس عورت نے اپنا نام شکیلہ بتایا اور کہا کہ وہ بھوپال جا رہی ہے جہاں اس کا بہت بڑا زنانہ اسٹور ہے۔ شکیلہ نے شبانہ کو تھرماس میں سے چائے نکال کر پلائی اور پوچھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟ اور کیا اکیلی سفر کر رہی ہے؟ شبانہ نے کہا۔

"میرا بھائی میرے ساتھ سفر کر رہا ہے وہ دوسرے ڈبے میں ہے ہم مالیر کوٹلہ کے رہنے والے ہیں اور وہیں جا رہے ہیں۔"

شکیلہ نے اپنی باتوں سے شبانہ کو بہت جلد اپنی سہیلی بنا لیا اور کہا کہ مالیر کوٹلہ سے پھر کبھی اورنگ آباد آنا ہو تو بھوپال اس کے گھر ضرور آئے۔ درمیان میں کسی جگہ گاڑی رکتی تو کمال دین شبانہ کی خیر خیریت دریافت کرنے آ جاتا۔ چائے پانی کا پوچھتا اور ٹرین کے چلنے سے پہلے اپنے ڈبے میں چلا جاتا۔

گاڑی تیز رفتاری سے اڑی جا رہی تھی۔ کھنڈوہ پہنچ کر ٹرین رک گئی۔ کافی بڑا اسٹیشن تھا۔ گاڑی یہاں دس پندرہ منٹ رکی رہی۔ یہاں سے چلی تو آگے دوسرا بڑا اسٹیشن اٹارسی تھا۔

کھنڈوہ سے اٹارسی تک کافی لمبا رن ہے۔ اب پکی عمر کی پراسرار عورت نے اپنے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ جب ٹرین اٹارسی شہر کے مضافات میں سے گزرنے لگی۔ پراسرار عورت شکیلہ نے اپنے پاندان میں سے خاص طور پر دو پان نکالے ایک پان خود کھایا اور ایک شبانہ کو پیش کیا۔ شبانہ پان نہیں کھاتی تھی لیکن اس عورت نے شبانہ پر اپنی محبت اور خلوص کا اس قدر اثر کر رکھا تھا کہ اس نے پان لے کر کھا لیا۔ ٹرین اٹارسی کے ریلوے یارڈ میں سے گزر رہی تھی کہ شبانہ کا سر چکرانے لگا۔ اس نے شکیلہ سے کہا کہ میرا سر چکرا رہا ہے۔ شکیلہ نے جلدی سے تھرماس میں سے پانی نکال کر دیا اور کہا "سفر میں ایسا ہو جایا کرتا ہے۔ لو یہ پانی پی لو۔"

شبانہ نے پانی پیا تو اسے کچھ آفاقہ محسوس ہوا۔ لیکن چند سیکنڈ بعد ہی اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا، وہ بے ہوش ہو گئی۔ عیار شکیلہ نے شبانہ کا سر اپنے زانو پر رکھا اور اسے ہوا دیتے ہوئے دوسری مسافر عورتوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

"گرمی سے سر چکرا گیا ہے۔ ابھی ہوش میں آ جائے گی۔"

لیکن اس مکار عورت نے پان میں جو خاص دوائی شبانہ کو کھلا دی تھی اس کا اثر شدید تھا اور شکیلہ کے اندازے کے مطابق اسے کم از کم چار گھنٹوں تک ہوش میں نہیں آنا تھا۔ ٹرین اٹارسی کے جنکشن پر رک گئی۔ کمال دین ڈبے میں سے اتر کر شبانہ کے ڈبے کی طرف آیا۔ شکیلہ اسے شکل سے پہچانتی تھی۔ اس نے کمال دین کو دیکھتے ہی شور مچا دیا۔

"بھائی جان! بچی گرمی کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی ہے۔ مگر آپ فکر نہ کریں۔ یہاں اسٹیشن کے ہیلتھ سنٹر میں میرا ایک ڈاکٹر واقف ہے۔ ہم اسے اس کے پاس لے چلتے ہیں ابھی ہوش میں آ جائے گی گھبرائیں نہیں ٹرین یہاں کافی دیر رکتی ہے۔"

کمال دین نے شبانہ کو بے ہوش دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ مگر شکیلہ کی باتوں نے اسے حوصلہ دیا۔ بڑی مشکل سے بے ہوش شبانہ کو ڈبے سے باہر نکال کر ایک اسٹریچر پر ڈالا اور شکیلہ اسے لے کر اسٹیشن کے "ہیلتھ سنٹر" میں لے آئی، حقیقت میں یہ ہیلتھ سنٹر نہیں بلکہ فرسٹ

کلاس کا زنانہ ویٹنگ روم تھا جس کا پچھلا دروازہ ریلوے اسٹیشن کے عقبی یارڈ کی طرف کھلتا تھا۔ بھوپال اور اٹارسی قریب قریب واقع تھے اور شکیلہ یہاں آتی جاتی رہتی تھی۔ وہ بھوپال کی رہنے والی تھی اور اٹارسی شہر کی ایک ایک گلی سے واقف تھی۔ اس نے کمال دین کی باتوں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہے اور سیدھا سادھا بھی ہے اسی لیے زنانہ ویٹنگ روم کو اس نے ریلوے کا ہیلتھ سنٹر ظاہر کیا اور شبانہ کو ویٹنگ روم میں لٹا دیا۔ شبانہ بے ہوش تھی، کمال دین باہر بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ شکیلہ نے باہر آکر اسے بتایا کہ اندر لیڈی ڈاکٹر بچی کو دیکھ رہی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں اسے ہوش آ جائے گا۔ شکیلہ فوراً ویٹنگ روم میں آ گئی۔ فرسٹ کلاس زنانہ ویٹنگ روم اس زمانے میں اکثر خالی ہوا کرتے تھے۔ یہ ویٹنگ روم بھی خالی تھا۔ اندر آتے ہی شکیلہ نے بڑی احتیاط اور آہستگی سے دروازے کی چٹخنی لگا دی۔ تیزی سے عقبی دروازے کو کھولا اور باہر یارڈ میں آکر اس طرف گئی جہاں دو تین ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ اس نے ایک ٹیکسی والے سے کہا کہ میری بچی اچانک بیہوش ہو گئی ہے۔ میں اسے اٹارسی کے بڑے ہسپتال لے جانا چاہتی ہوں۔ ٹیکسی ڈرائیور شریف آدمی تھا فوراً ٹیکسی لے کر ویٹنگ روم کے عقبی دروازے کے سامنے آ گیا۔ شکیلہ نے اس کی مدد سے شبانہ کو ٹیکسی میں ڈالا اور ٹیکسی اٹارسی کے جنرل ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئی۔ شکیلہ اس شہر سے پوری طرح واقف تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اپنے منصوبے کے مطابق اسے کیا کرنا ہے۔

ٹیکسی جب اٹارسی کے جنرل ہسپتال والی سڑک پر آئی تو شکیلہ نے ڈرائیور سے کہا۔

"یہاں سے بائیں طرف پہلی سڑک پر مڑ جانا، وہاں میری بہن کا گھر ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ بچی کو پہلے وہاں لے چلوں، وہ ڈاکٹر ہے۔ شاید گھر پر ہی بچی کو ہوش آ جائے۔"

ٹیکسی ڈرائیور کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا اس نے پہلے موڑ پر جا کر گاڑی بائیں جانب موڑ لی۔ یہاں ایک طرف چھوٹی چھوٹی کوٹھیوں کی قطار تھی اور سامنے کی جانب پریڈ گراؤنڈ تھا۔ شکیلہ نے ٹیکسی ایک کوٹھی کے اندر لے جا کر رکوائی اور بولی۔

"میں اپنی بہن کو لے آؤں۔ تم اسی جگہ ٹھہرو۔"

اس چھوٹی سی کوٹھی میں شکیلہ کا ایک مرد ساتھی جبرو دو ہفتے پہلے آکر رہنے لگا تھا۔ جبرو

منشیات کا کاروبار کرتا تھا اور تھوڑے دنوں کے لیے کسی شہر میں جا کر کوٹھی کرائے پر لیتا اور پھر اپنا مال ٹھکانے لگانے کے بعد وہاں سے چلا جاتا تھا۔ شکیلہ کا وہ خاص آدمی تھا اور شکیلہ کو معلوم تھا کہ جبرو نے دو ہفتے پہلے اس شہر کی یہ کوٹھی کرائے پر لے رکھی ہے۔ جبرو اس وقت کوٹھی میں موجود تھا اور اکیلا تھا۔

شکیلہ کو دیکھ کر حیرانی سے پوچھا: "تم اس وقت کیسے آئیں؟"

شکیلہ نے کہا

"یہ باتیں بعد میں ہوں گی۔ باہر ٹیکسی میں ایک لڑکی بے ہوش پڑی ہے اسے اندر لے آؤ۔"

جبرو سمجھ گیا کہ لڑکی کو کس لیے بیہوش کیا گیا ہے۔ فوراً شکیلہ کے ساتھ باہر آیا۔ ٹیکسی کا دروازہ کھول کر بولا: "بچی تو بے ہوش ہے اللہ اپنا فضل کرے۔ ابھی ڈاکٹر صاحب کو بلاتا ہوں اسے اندر لے چلیں۔"

ہٹے کٹے جبرو نے بیہوش شبانہ کو کاندھے پر ڈالا اور کوٹھی کے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا شکیلہ نے ٹیکسی والے کو پچاس روپے دے دیئے وہ خوش ہو گیا اور سلام کر کے چل دیا۔ ڈرائنگ روم آتے ہی شکیلہ نے جبرو سے کہا: "پولیس ضرور تفتیش کرے گی اس کے ساتھ ٹرین میں اس کا ایک بھائی بند بھی سفر کر رہا تھا۔"

پھر شکیلہ نے جلدی جلدی جبرو کو سارا قصہ سنا دیا۔ وہ کہنے لگا میرا یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ مال میں نے رات کو ہی پورے کا پورا سپلائی کر دیا تھا اب میں یہاں اکیلا ہی پڑا تھا۔ مجھے کل یہ کوٹھی خالی کر ہی دینی تھی۔ ہم ابھی خالی کیے دیتے ہیں کیونکہ پولیس ٹیکسی والے کی مدد سے یہاں پہنچ سکتی ہے۔

جبرو لپک کر باہر گیا۔ وہاں سے تھوڑی دور گراؤنڈ کے دروازے کی ایک جانب اس کی بند جیپ کھڑی تھی۔ جیپ لے کر کوٹھی میں آ گیا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ انھوں نے بے ہوش شبانہ کو بند جیپ میں ڈال دیا۔ جبرو نے کوٹھی میں جا کر اپنے کپڑوں کا سوٹ کیس اور دوسری چند ایک چیزیں اٹھا کر جیپ میں رکھیں۔ چابی وہیں صحن میں ڈال دی اور شکیلہ کو ساتھ بٹھا کر اٹارسی شہر کی سڑکوں پر سے گزرتا ہوا بھوپال جانے والی سڑک پر آ گیا۔ یہ بڑی شاہراہ تھی۔ اس نے

جیپ کی رفتار تیز کر دی اور دیکھتے دیکھتے جیپ بھوپال والی سڑک پر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

دوسری طرف سیدھا سادھا کمال لیڈیز ویٹنگ روم کے باہر کچھ دیر بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ ادھر ٹرین کا سگنل ڈاؤن ہو گیا۔ کمال دین نے ویٹنگ روم کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ انجن نے وسل دے دی۔ کمال دین نے ایک ٹی ٹی سے کہا کہ اندر میری بہن ہے دروازہ نہیں کھلتا۔ ٹی ٹی نے ایک قلی کو دوڑایا دوسری طرف سے دروازہ کھول دیا گیا۔ ویٹنگ روم خالی تھا۔ کمال دین پریشان ہو گیا۔ گارڈ نے سیٹی بجا دی۔ ٹرین چلنے والی تھی۔ کمال دین کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کرے۔ ٹرین آہستہ آہستہ کھسکنے لگی۔ کمال دین گھبرا کر ٹرین کی طرف دوڑا اور ڈبے میں سوار ہو گیا۔ اس نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کر دیا کہ لڑکی پاکستانی تھی اسے بارڈر کراس کرانا تھا۔ ہو سکتا ہے اس لڑکی کا تعلق اسمگلروں کے کسی خطرناک گروہ سے ہو اور وہ ان کے ساتھ چلی گئی ہو۔ ایک طرح سے کمال دین نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ کسی مصیبت میں پھنسنے سے بال بال بچ گیا ہے۔

رات کے دس بج رہے تھے جب شکیلہ کی جیپ شہر بھوپال میں داخل ہو گئی۔ شکیلہ اس شہر کی دوسری بکھی بائی تھی۔ اس کا باقاعدہ یہاں کوئی کوٹھا تو نہیں تھا لیکن بھوپال شہر کے بازارِ حسن میں کوئی ایسا کوٹھا نہیں تھا جہاں اس کی کوئی رقاصہ، رقص نہ کرتی ہو۔ شکیلہ نے ان میں سے زیادہ تر لڑکیوں کو یا تو اغوا کیا تھا یا پھر ریاست میں گھوم پھر کر غربت کے مارے ہوئے ماں باپ کو روپے کا لالچ دے کر ان کی بچیوں کی شادی اپنے کسی آدمی سے کروا دی تھی اور اس کے بعد اسے رقص و سرور کی باقاعدہ تربیت دے کر بازارِ حسن کی زینت بنا دیا تھا۔

شبانہ کو بھی وہ بازارِ حسن کی زینت بنانے کے لیے ہی اغوا کر کے لا رہی تھی۔ بھوپال ایک وسیع و عریض شہر تھا کبھی یہ ایک ذی شان اسلامی ریاست کا دارالحکومت رہ چکا تھا۔ قلعے کی چہار دیواری میں شاہی محلات ایستادہ تھے۔ اور اونچی نیچی گلیوں میں عالی شان قدیم حویلیاں آج بھی زبانِ حال سے عہدِ پارینہ کی داستانیں سناتی تھی۔ شکیلہ نے شہر سے دور مضافاتی بستی میں ریلوے لائن کے پار ایک پرانے ویران تالاب کے پاس ویران باغ میں کوٹھی خرید رکھی تھی

اور اسی جگہ رہتی تھی۔ پہلوان ٹائپ کے چار یا پانچ نوکر اس کی حفاظت کے لیے ہر وقت کوٹھی میں موجود رہتے تھے۔ لوگوں کو دکھانے کے لیے اس نے کوٹھی سے کچھ فاصلے پر بھوپال زنانہ اسٹور کے نام سے صرف عورتوں کے واسطے منیاری کا ایک باپردہ اسٹور کھول رکھا تھا۔ یہ مقام اس کے لیے ایک ٹکسال کی حیثیت بھی رکھتی تھی۔ یہاں وہ ایسی لڑکیوں کو اپنے چنگل میں پھانسنے کی کوشش بھی کرتی جو محبت میں بدنام ہو جانے کے خوف سے خودکشی کرنے والی ہوتیں۔ شکیلہ ان سے چکنی چپڑی باتیں کرتی اور انھیں بہلا پھسلا کر اپنے دام میں پھنسا لیتی اور پھر انھیں بھوپال کی بجائے انڈیا کے کسی دوسرے شہر میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعے بھجوا دیتی۔ اس انسانیت سوز کاروبار کو وہ عرصہ پندرہ بیس برس سے چلا رہی تھی۔ پولیس کو اس نے اپنے ساتھ ملا رکھا تھا اور انھیں باقاعدہ ماہانہ ادا کرتی تھی۔

جیپ اسی ویران باغ والی کوٹھی کی طرف جا رہی تھی۔

رات گہری ہو رہی تھی۔ بھوپال شہر کی عمارتیں اور محلے بجلی کی روشنیوں میں جگمگا رہے تھے۔ جس علاقے میں شکیلہ کی کوٹھی تھی ادھر زیادہ روشنی نہیں تھی۔ یہ نسبتاً غیر آباد علاقہ تھا جیپ کوٹھی کے باغ میں داخل ہو کر محرابی دروازے والے برآمدے کے سامنے جا کر رک گئی۔ شکیلہ کے محافظ نوکر اور نوکرانی فوراً باہر آ گئے۔ انھوں نے بے ہوش شبانہ کو کوٹھی کے تہہ خانے میں لے جا کر بستر پر لٹا دیا۔ جبرو بھی شکیلہ کے ساتھ ہی تھا۔ اب انھوں نے شبانہ کو ہوش میں لانے کی تدابیر شروع کر دیں۔ لیکن پان میں بے ہوشی کی خوراک کچھ زیادہ ہی کھلا دی گئی تھی۔ جس کی وجہ سے شبانہ کو ہوش نہیں آ رہا تھا۔

جبرو نے کہا کہیں یہ مر ہی نہ جائے۔ بڑا نقصان ہو جائے گا۔ لڑکی خوبصورت ہے۔ گوری چٹی ہے۔ اس کے بڑے دام ملیں گے۔ شکیلہ کو بھی فکر پڑ گئی۔ شہر میں اس کی ایک ہندو لیڈی ڈاکٹر سہیلی تھی۔ اسے شکیلہ کے گھناؤنے کاروبار کا علم تھا اور وہ بھی شکیلہ سے ماہانہ وصول کرتی تھی اور ہر موقع پر شکیلہ کے کام آتی تھی۔ شکیلہ نے نوکرانی بھیج کر ہندو لیڈی ڈاکٹر کو کوٹھی پر بلوا لیا۔ اس لیڈی ڈاکٹر کا نام سوشیلا پنڈت تھا۔ ڈھلتی عمر کی عورت تھی۔ آنکھوں میں حلقے پڑے تھے۔ اس نے آتے ہی شبانہ کا معائنہ کیا اور آلہ کان سے الگ کرتے ہوئے بولی۔

"شکیلہ جی! یہ تم نے اسے کیا کھلا دیا تھا۔ ڈوز زیادہ اس کے اندر چلی گئی ہے۔ اس کا پیٹ فوراً صاف کرنا پڑے گا۔ نہیں تو اس کی جان جانے کا خطرہ ہے۔ اسے دوسرے کمرے میں لے چلو۔"

دوسرے کمرے میں لے جاتے ہی لیڈی ڈاکٹر نے شبانہ کو انجکشن دیا اور اس کے معدے کی صفائی شروع کر دی۔ شبانہ کا معدہ تو صاف ہو گیا مگر اسے ہوش ابھی تک نہیں آیا تھا۔ ساری رات لیڈی ڈاکٹر سوشیلا بھی وہیں کوٹھی پر موجود رہی۔ رات ایک بجے کے بعد جا کر شبانہ کو ہوش آیا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ دائرے نمودار ہو گئے تھے۔ اس نے آنکھیں کھولے بغیر کمزور آواز میں پوچھا۔

"میں کہاں ہوں؟"

شکیلہ نے بڑی ملائمت سے کہا۔

"بیٹی تو میرے پاس ہے۔ اب تو بالکل ٹھیک ہے۔ تجھے ہیضہ ہو گیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اللہ نے تیری جان بچا لی۔"

شبانہ نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں بتی روشن تھی۔ اسے سامنے دیوار پر ہندوستانی ایکٹریسوں کی نیم عریاں تصویریں لگیں نظر آئیں۔ پھر اس نے اس عورت کو دیکھا جو ٹرین میں اس کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔ یہ شکیلہ تھی۔ شکیلہ نے شبانہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"بیٹی شبانہ! تو ٹرین میں ایک دم بے ہوش ہو گئی۔ تیرا آدمی تو تجھے ٹرین میں ہی چھوڑ کر بھاگ گیا، میں تجھے بڑی مشکل سے اٹھا کر یہاں اپنے مکان پر لائی۔ یہاں لیڈی ڈاکٹر نے تیرا علاج کیا۔ اب تو فکر نہ کر سب ٹھیک ہو گیا ہے۔"

لیڈی ڈاکٹر سوشیلا پنڈت نے شکیلہ کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا "ہاں بیٹی! میں نے ہی تیرا علاج کیا ہے ابھی تجھ میں کمزوری بہت زیادہ ہے۔ چند روز یہاں آرام کرنے کے بعد تیری طاقت واپس آ جائے گی۔"

شکیلہ جلدی سے بولی۔

"پھر میں تمھیں خود تیرے گھر مالیر کوٹلہ چھوڑ آؤں گی۔ اب تو آرام کر۔ زیادہ بولنا تیرے لیے اچھا نہیں۔"

شکیلہ نے لیڈی ڈاکٹر سوشیلا کو ساتھ لیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد شبانہ نے سر اٹھانا چاہا لیکن اس کا سر پتھر بن گیا تھا۔ اسے ہلاتے ہوئے گردن میں درد ہونے لگا۔ شبانہ نے آنکھیں کھول کر کمرے کے ماحول کو دیکھا۔ یہ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ وہ پلنگ پر پڑی تھی۔ چھت پر لگا ہوا پنکھا ہلکی رفتار سے چل رہا تھا دیواروں پر فلمی ایکٹریسوں کی واہیات قسم کی تصویریں لگی تھیں۔ فرش پر قالین بچھا تھا۔ کونے میں اگلدان رکھا تھا۔ اسٹول پر ہاتھ دھلانے والی سلفچی پڑی تھی۔ شبانہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہونے کے بعد یہاں کیسے آ گئی۔ یہ عورت جو اپنا نام شکیلہ بتاتی تھی آخر اسے یہاں کیوں لے آئی؟ کمال دین اسے چھوڑ کر کیوں چلا گیا؟ نہیں نہیں۔ کمال بھائی اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ معاملہ خراب ہے۔ دال میں کچھ کالا ہے۔ شکیلہ اسے خود بے ہوش کر کے یہاں لے آئی ہے۔ اب شبانہ کو یاد آ گیا کہ شکیلہ نے اسے جو پان کھانے کو دیا تھا اُسے کھانے کے بعد چکر آئے تھے۔ پھر وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ شکیلہ وہاں سے کسی طرح اسے اٹھا کر یہاں لے آئی ہے۔ یہ کونسی جگہ ہے؟ کونسا شہر ہے؟ شبانہ کا ذہن یہ سوچتے سوچتے دکھنے لگا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور وہ سو گئی۔

جب آنکھ کھلی تو کمرے میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ شکیلہ اس کے سرہانے بیٹھی اسے یخنی پلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شبانہ کا سر اٹھا کر نوکرانی نے پیچھے تکیہ لگا دیا۔ شبانہ نے دو تین چمچ یخنی کے پیئے۔ ابھی تک اس کے جسم میں شدید کمزوری تھی اور وہ ہاتھ اوپر اٹھاتی تو وہ کانپنے لگتا تھا۔ اس نے کمزور اور نقاہت بھری آواز میں شکیلہ سے پوچھا کہ یہ کونسا شہر ہے؟

شکیلہ نے اس کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

"بیٹی خیر سے تم میرے اپنے گھر میں ہو یہ میرا بھوپال والا اپنا مکان ہے اسے اپنا گھر ہی سمجھو بیٹی۔ یہاں تمھارا ہر طرح سے خیال رکھا جائے گا۔ لیڈی ڈاکٹر صبح شام تمھیں آ کر دیکھ جایا کرے گی۔ جب تم اس لائق ہو جاؤ گی کہ چل پھر سکو تو میں خود تمھیں تمھارے گھر چھوڑ آؤں گی۔"

شبانہ خاموش رہی۔ اسی شام شکیلہ نے لیڈی ڈاکٹر سوشیلا سے پوچھا کہ لڑکی کب تک صحتیاب

ہو جائے گی ۔ کیونکہ میں ا بہت جلد اسے اپنی ڈگر پر لانے کے لیے رقص و سرور کی ٹریننگ دینا چاہتی ہوں ۔ لیڈی ڈاکٹر سوشیلا نے کہا ۔

،، شکیلہ بہن ! تم نے بغیر حساب کے اسے دوائی کھلا دی تھی ۔ تمھیں کچھ احساس نہیں رہا کہ دوائی کی شدت کتنی ہے ۔ میرے اندازے کے مطابق اس لڑکی کو پوری طرح صحت یاب ہونے میں کم از کم بیس دن اور لگ جائیں گے ۔ اس سے پہلے اگر تم نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی یا تشدد کیا تو اس کی موت واقع ہو جائے گی ۔ میں تمھیں یہی مشورہ دوں گی کہ ابھی بیس روز تک اس لڑکی کو بالکل الگ تھلگ رہنے دو ۔ کوئی اسے کچھ نہ کہے ہاں یخنی اور پھلوں کا جوس صبح و شام اسے ضرور دینا چاہیئے ۔ دو دن کے بعد اسے ڈبل روٹی دینا شروع کر دوں گی ۔،،

شکیلہ نے سوچا بیس دن سے کوئی فرق نہیں پڑے گا ۔ لڑکی بے حد خوبصورت ہے جسم بھی بے حد خوبصورت ہے ۔ اگر وہ اسے ٹریننگ دے کر بازار حسن کی زینت بنائے تو کم از کم ایک لاکھ روپے اسے ضرور مل جائے گا ۔ یہ سودا مہنگا نہیں تھا ۔ شکیلہ نے اپنے آدمیوں اور نوکرانی کو حکم دے دیا کہ شبانہ کا ہر طرح سے خیال رکھا جائے ۔

جیرو بمبئی جا چکا تھا ۔ کوٹھی میں شکیلہ کے چاروں مشٹنڈے باڈی گارڈ غنڈے نوکر اور ایک نوکرانی موجود تھی ۔ شبانہ کو کوٹھی کے تہہ خانے میں منتقل کر دیا گیا ۔ باہر پہرہ لگ گیا ۔ اگرچہ شبانہ ابھی بستر سے اٹھ نہیں سکتی تھی اس کے باوجود شکیلہ کو اس پر بھروسہ نہیں تھا ۔

اب ہم واپس نجمی کی طرف چلتے ہیں ۔ نجمی نے اپنا مشن پورا کر لیا تھا جن لوگوں نے اس کی زندگی کو برباد کیا تھا ، اس کی عزت لوٹی تھی اس کے ساتھ گھناؤنا انسانیت سوز سلوک کیا تھا ، انھیں نجمی اپنے ہاتھوں ہمیشہ کی نیند سلا چکی تھی ۔ اب اسے ندیم کی تلاش تھی ۔ وہ ندیم کو تلاش کر کے اس کے ساتھ واپس اپنے وطن پاکستان چلی جانا چاہتی تھی ۔ یہ بات نجمی نے اپنے وفادار اور با اعتماد مسلمان ساتھی بادل کو بتا دی تھی ۔ بادل نے نجمی سے کہا کہ ندیم کو ہم کہاں تلاش کریں آخری بار وہ کس شہر میں تھا ۔ نجمی نے کہا ۔" آخری بار میں نے اسے کلکتے میں ہی دیکھا تھا ۔ ذکریا اسٹریٹ میں سیٹھ جبار کا امجدیہ ہوٹل ہے وہ اس کے پاس پولیس سے چھپ کر روپوش تھا ۔ تم سیٹھ کے پاس جا کر ندیم کے بارے میں پوچھو کہ وہ کہاں مل سکتا ہے ۔،،

بادل نے بھیس بدلا اور دوسرے ہی روز وہ کمین گاہ سے نکل کر بذریعہ ٹرین گوہاٹی سے کلکتے کی طرف روانہ ہو گیا ۔ امجدیہ ہوٹل کوئی غیر معروف جگہ نہیں تھی ۔ بادل امجدیہ ہوٹل پہنچ گیا ۔ اس نے سیٹھ جبار سے اس کی بیٹھک میں ملاقات کی اور اسے اپنا مقصد بیان کیا اور پوچھا کہ ندیم اسے کہاں مل سکے گا ؟ پہلے تو سیٹھ جبار اسے کوئی سی آئی ڈی والا سمجھا ۔ لیکن جب بادل نے اسے نجمی کے بارے میں پوری تفصیل بیان کی تو سیٹھ جبار کو اس پر پورا یقین آ گیا ۔ اس نے کہا ۔

،، کچھ روز پہلے میں نے اسے خاص جگہ بھجوا دیا تھا تاکہ وہ اتنی دیر تک وہاں رہے جب تک کہ بارڈر پر فوجیوں کا تناؤ ختم نہیں ہو جاتا ۔ لیکن وہ وہاں سے بھی بھاگ گیا ۔ اصل میں بات یہ ہے کہ وہ نجمی کو یعنی چندا کو ہر حالت میں اپنے ساتھ لے کر پاکستان جانا چاہتا ہے ۔،،

بادل نے کہا ۔" نجمی بھی یہی چاہتی ہے ۔ پہلے وہ پاکستان جانے پر راضی نہیں تھی لیکن اب وہ تیار ہو چکی ہے اور چاہتی ہے کہ ندیم اسے اپنے ساتھ پاکستان لے جائے ۔ کیا آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ ندیم کہاں گیا ہو گا ؟"

سیٹھ جبار نے کہا

،، اس کا کچھ پتہ نہیں ہے وہ جب بھی میرے پاس سے گیا تو چندا یعنی نجمی کی تلاش میں ہی گیا ہے اب بھی میں یہی سمجھتا ہوں کہ وہ نجمی کو ہی تلاش کر رہا ہو گا ۔،،

بادل بولا ۔" یہی مشکل ہے کہ ندیم کو ہماری جگہ کا علم نہیں ہے ۔،،

پھر اس نے فکر مندی سے پوچھا ۔" کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ندیم گرفتار ہو گیا ہو کیونکہ انڈین پولیس اور فوج اس کی ٹوہ میں لگی ہوئی ہے ۔" سیٹھ جبار بولا ۔

" میں کچھ نہیں کہہ سکتا ، اگر ندیم گرفتار کر لیا گیا ہوتا تو اخباروں میں ضرور خبر آ جاتی ۔ مگر ایسا نہیں ہوا ۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ ابھی تک نجمی کی تلاش میں کسی نہ کسی علاقے میں سرگرداں ہو گا ۔،،

بادل نے کہا ۔" لیکن سیٹھ جی ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ پولیس نے ندیم کو گرفتار کر لیا ہو مگر اس گرفتاری کو ظاہر نہ کیا ہو ۔،،

سیٹھ جبار بولا "اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ ندیم پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام لگایا گیا ہے۔ جو وہ نہیں ہے۔ اور پولیس اور ملٹری انٹیلی جینس نہیں چاہتی ہو گی کہ اس کی گرفتاری کا اعلان کر کے اس کے نام نہاد ساتھی جاسوسوں کو خبردار ہونے یا کہیں روپوش ہونے کا موقع دیا جائے۔"

بادل گہرا سانس بھر کر بولا "ایسی صورت میں ہمیں بھی اپنی خفیہ سرگرمیوں سے مدد لینی ہو گی۔ خیر اگر ندیم آپ کے پاس آئے تو اسے اپنے پاس ہی رکھیے گا اسے کہہ دیجیے گا کہ نجمی اس کے ساتھ پاکستان جانے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ میں ایک ہفتے بعد دوبارہ آپ کے پاس آؤں گا"

بادل نے واپس کمین گاہ میں آ کر نجمی کو وہ ساری گفتگو بتا دی جو اس کے اور سیٹھ جبار کے درمیان ہوئی تھی۔ نجمی سوچ میں پڑ گئی۔ وہ کہاں چلا گیا ہے۔ وہ کہاں جا سکتا ہے۔ یہی سوال اس کے ذہن میں بار بار اٹھ رہے تھے جن کا نجمی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا اب وہ خود پاکستان جانا چاہتی تھی اور ندیم اس سے دور تھا۔ اس نے بادل سے کہا۔

"بادل! اگر ندیم گرفتار نہیں ہوا تو وہ ضرور کلکتے میں کرشنا سے ملنے گیا ہو گا۔ تا کہ اس سے میرے ٹھکانے کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے میرا خیال ہے کہ تم کرشنا سے جا کر ملو۔ مجھے یقین ہے کہ وہاں سے ندیم کا کچھ نہ کچھ پتہ ضرور مل جائے گا۔"

بادل کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ سندھی سوداگر کے بھیس میں ایک بار پھر کلکتے کی طرف چل پڑا۔ کرشنا بائی کے کوٹھے کا اسے علم تھا۔ وہ ایک رات سوناگاچی میں کرشنا بائی کے کوٹھے پر پہنچ گیا۔ کرشنا بائی نے بادل کو ایک بار نجمی کے ساتھ دیکھا ہوا تھا۔ مجرا کرتے کرتے جب اس نے بیٹھک میں بادل کو سندھی سوداگر کے بھیس میں داخل ہوتے دیکھا تو ٹھٹھک سی گئی۔ اسے شک ہوا کہ بادل آیا ہے تو نجمی یعنی چندا بھی ضرور اس کے ساتھ ہو گی۔ چندا جو ایک خونی ڈاکو بن چکی تھی بادل بھی چاندنی کے کونے میں دوسرے تماش بینوں کے پاس بیٹھ گیا۔ مجرا ختم ہو گیا۔ ایک ایک کر کے سب تماش بین چلے گئے۔ رات زیادہ ہو رہی تھی طبلے سارنگی والے اپنے ساز سمیٹنے لگے۔ ہارمونیم والے ہندو بنگالی ماسٹر نے بادل کی طرف دیکھ کر کہا۔

"سیٹھ اب تم بھی جاؤ۔ مجرا ختم ہو گیا ہے۔ بائی جی گھر جائیں گی۔"

کرشنا بائی نے ماسٹر جی سے کہا "ماسٹر جی آپ جائیں یہ میرا اپنا آدمی ہے۔ میں اس سے کوئی بات کروں گی۔"

سارنگی، ہارمونیم اور طبلے والے وہاں سے چلے گئے۔ بادل نے کرشنا بائی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم نے مجھے پہچان لیا کرشنا بائی؟"

کرشنا بائی نے کہا "ہر چہرہ ہمارے کوٹھے پر آ کر اپنی اصلیت بے نقاب کر دیتا ہے۔ اگر ہم چہرے نہ پہچانیں تو یہ دھندا کیسے چلائیں۔ تم بتاؤ کیسے آنا ہوا؟ چندا کہاں ہے؟ کیا وہ بھی تیرے ساتھ آئی ہے۔؟"

بادل نے کرشنا بائی کو ساری بات بیان کر دی۔ کرشنا بائی نے پان لگا کر بادل کو پیش کیا اور کہا۔

"ندیم پھر ادھر نہیں آیا وہ تو نجمی چندا کی تلاش میں کہیں مارا مارا پھر رہا ہو گا میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ چندا اسے کیوں تڑپا رہی ہے۔ اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتی۔؟"

بادل نے مسکراتے ہوئے پان لے لیا اور بولا "کرشنا بائی یہ دو دلوں کی باتیں ہیں۔ ہمیں کیا معلوم کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ بہر حال چندا نے مجھے تمھارے پاس ندیم کا پتہ کرنے بھیجا تھا"

کرشنا بائی نے کہا "ندیم کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہو گا۔ ہاں اگر وہ میرے پاس آیا تو میں اسے ضرور کہہ دوں گی کہ چندا اس کو یاد کرتی ہے وہ اس کے پاس پہنچ جائے۔"

بادل نے سوچا کہ اس سے زیادہ کرشنا بائی سے بات نہیں کرنی چاہیے۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور خدا حافظ کہہ کر کوٹھے سے نیچے اتر آیا۔ سوناگاچی کے علاقے سے ہی بادل نے ٹیکسی لی اور سیدھا اسٹیشن پہنچ گیا۔ پٹنہ ایکسپریس صبح نو بجے چھوٹتی تھی۔ بادل ایک سندھی سیٹھ کے لباس میں تھا۔ اس کے پاس کافی روپے بھی تھے۔ وہ فرسٹ کلاس ویٹنگ روم میں جا کر لیٹ گیا۔ ریلوے کے دربان کو اس نے پچاس روپے دے دیئے تھے اور تاکید کی تھی کہ اسے کوئی نہ جگائے۔ بادل سو گیا اور صبح اٹھا۔ اسی دربان کی مدد سے بادل نے فرسٹ کلاس کی ٹکٹ منگوائی اور پٹنہ ایکسپریس

میں سوار ہو کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔

خفیہ کمین گاہ میں پہنچ کر بادل نے نجمی کو صورتحال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ کرشنا بائی بھی ندیم کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ نجمی نے سوچ کر کہا: "ہمیں کچھ وقت انتظار کرنا ہوگا شاید ندیم اپنے آپ ادھر آ نکلے۔ اگر ایک ہفتے تک وہ نہ آیا تو میں خود اس کی تلاش میں نکلوں گی۔"

ندیم پرانے قلعے کے عقب والے کھنڈر کے تہہ خانے میں قید تھا۔ اس پر تشدد ہو رہا تھا۔ تشدد اور جسمانی اذیتیں ندیم کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ یہ ساری اذیتیں برداشت کر رہا تھا مگر زبان پر نجمی یا سیٹھ جبار کا نام نہیں لا رہا تھا۔ وہ یہ نام اپنی زبان پر لا بھی نہیں سکتا تھا۔

دوسری طرف بھوپال کے مضافات والی کوٹھی میں شبانہ ابھی تک نقاہت کے عالم میں شکیلہ بائی کے کمرے میں پڑی تھی۔ شکیلہ بائی کی سہیلی ڈاکٹر سوشیلا پنڈت ہر روز شبانہ کو دیکھنے آجاتی تھی۔ شکیلہ بائی بہت جلدی شبانہ کو اپنی لائن پر چلانا چاہتی تھی لیکن ڈاکٹر سوشیلا کی ہدایت تھی کہ اگر شبانہ کو زندہ دیکھنا چاہتی ہو تو کم از کم دس پندرہ دن تک اسے کوئی ہاتھ بھی نہ لگائے۔ شکیلہ صبر کیے بیٹھی تھی۔ وہ اتنا قیمتی مال اپنے ہاتھ سے جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ شبانہ اب اٹھ کر کمرے اور برآمدے میں تھوڑی دیر چہل قدمی کر لیتی تھی۔ مگر اسے زیادہ چلنے پھرنے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران نجمی کو ندیم کے ٹھکانے کا کچھ علم نہ ہو سکا ان ہی دنوں نجمی کے ایک ساتھی نے آکر خبر دی کہ مان سنگھ ڈاکو کا بھائی ہر دیال سنگھ ڈاکو بھوپال کے جنگل میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے اور ندیم کی شکل کا ایک نوجوان اس کی قید میں ہے۔

نجمی کے لیے اتنی ہی خبر بہت تھی۔ اس نے بادل کو ساتھ لیا اور بھوپال کی طرف روانہ ہو گئی۔

بادل نے پٹھان مرد اور نجمی نے پٹھان عورت کا حلیہ بنا لیا تھا۔ نجمی نے بالوں کی لمبی لمبی مینڈھیاں بنا کر شانوں پر بکھیر لی تھیں اور پٹھانی لباس پہنا ہوا تھا۔ بادل نے کاندھے پر گٹھڑی اٹھا رکھی تھی۔ جس میں خشک میوے وغیرہ تھے۔ اس قسم کے پٹھان اپنی عورتوں کے ساتھ ہندوستان کے شہروں میں خشک میوے بیچتے اکثر نظر آتے ہیں۔ اپنے لمبے لمبے کرتوں کے اندر نجمی اور بادل

نے بھرے ہوئے ریوالور اور گولیاں چھپا رکھی تھیں۔ بادل کے پاس ایک لمبا چاقو بھی تھا انہیں گواہ سے وایا پٹنہ سب سے پہلے بنارس پہنچنا تھا۔ وہاں سے الہ آباد کٹنی اور ساگر اور بینا نامی مین لائن کے ریلوے اسٹیشنوں سے ہوتے ہوئے بھوپال پہنچنا تھا سفر لمبا تھا۔ نجمی اور بادل پٹھانی لباس میں تھرڈ کلاس میں بیٹھ گئے اور اپنا طویل سفر شروع کر دیا۔ پورا دن اور ایک رات سفر میں گزارنے کے بعد وہ دوسرے دن شام ہونے سے کچھ پہلے بھوپال پہنچ گئے۔ ان کے ہر دیال ڈاکو کی جنگل والی کمین گاہ کے بارے میں مخبر تے نجمی کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ بھوپال پہنچتے ہی بادل اور نجمی شہر سے نکل کر جنگل کی طرف چل پڑے وہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے جنگل والی کمین گاہ میں پہنچ جانا چاہتے تھے۔ یہ جنگل شہر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بادل ان سارے جنگلوں اور ان کے آسان ترین راستوں سے واقف تھا سورج ڈوبنے سے تھوڑی دیر پہلے وہ ہر دیال ڈاکو کی خفیہ کمین گاہ کے پاس پہنچ کر رک گئے۔

درختوں کے نیچے چٹانوں کی ڈھال کے پہلو میں ڈاکوؤں کے خیمے اکھاڑے جا چکے تھے کہیں کہیں بجھی ہوئی آگ میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ کچرا بکھرا پڑا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ ڈاکو اپنا بوریا بستر اٹھا کر کسی نامعلوم مقام کو چل دیئے ہیں۔ ڈاکو جب ایک جنگل سے ڈیرہ اٹھا کر چلے جاتے تھے تو کسی کو علم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس طرف گئے ہیں اور ان کا اگلا پڑاؤ کہاں ہوگا۔ ان کی تلاش میں نکلی ہوئی پولیس بھی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتی ہے یا گھات لگا کر بیٹھے ہوئے ڈاکوؤں کی گولیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ یہ دو تین ڈاکو، گروہ کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں تاکہ اگر سی آئی ڈی یا پولیس کے آدمی پیچھے لگے ہوں تو ان کا صفایا کیا جا سکے۔ نجمی اور بادل درختوں کے نیچے بیٹھ گئے۔ بادل نے کہا: "یہ لوگ تو ڈیرا اٹھا کر جا چکے ہیں اب کیا کیا جائے۔؟"

نجمی کچھ دیر سوچتی رہی پھر رومال سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے بولی۔

"ہمیں رات بھوپال کے کسی معمولی سے ہوٹل میں گزارنی ہوگی۔ وہاں سے کل واپس چلے جائیں گے۔ کیونکہ ڈاکوؤں کا تعاقب کرنا بیکار ہے۔ ہم اپنے مخبر ان کے پیچھے بھیجیں گے۔"

نجمی اور بادل جنگل سے نکل کر بھوپال جانے والی سڑک پر آ گئے۔ یہاں کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد انہیں ایک بس مل گئی جو بھوپال جا رہی تھی۔

* * *

بس بھوپال شہر کی جگمگاتی سڑکوں پر گزر رہی تھی۔

بادل اس عظیم اسلامی روایات کے حامل شہر میں کئی بار آ چکا تھا۔ نجمی اس کے ساتھ پٹھانی لباس میں بیٹھی تھی۔ بادل نے بھی اپنا حلیہ خشک میوے اور ہینگ بیچنے والے پٹھانوں ایسا بنا رکھا تھا۔ بس کے اڈے پر اترنے کے بعد بادل نے نجمی کو ساتھ لیا اور شہر کے کونے والے علاقے میں واقع ایک معمولی سے ہوٹل آ گیا۔ یہاں انھوں نے ایک کمرہ کرائے پر لیا اور رات بسر کی۔ یہاں سے انھیں پٹنہ کی طرف بذریعہ ریل سفر کرنا تھا۔ ٹرین سوا گیارہ بجے دن بھوپال سے چلتی تھی۔ بادل اور نجمی نے یہ وقت ہوٹل کے کمرے میں ہی گزارا۔ انھیں خطرہ تھا کہ باہر نکلے تو پولیس انھیں پہچان کر گرفتار نہ کر لے۔ ساڑھے دس بجے کے قریب دونوں ہوٹل سے نکلے اور ریلوے اسٹیشن کی طرف پیدل ہی روانہ ہو گئے۔ اس علاقے میں کوئی ٹیکسی رکشا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سڑک کے کنارے کنارے چلے جا رہے تھے۔ نجمی نے پٹھانوں والا لمبا کرتا اور پھولی ہوئی شلوار پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں چھڑی سی تھی۔ سر پہ رومال بندھا تھا جس میں سے بالوں کی مینڈھیاں نکل کر اس کے شانوں پہ بکھری ہوئی تھیں۔ بادل نے کاندھے سے وہ جھولا لٹکا رکھا تھا جس میں اخروٹ، کشمش اور بادام وغیرہ بھرے ہوئے تھے۔ وہ سڑک پر جا رہے تھے کہ بادل نے آہستہ سے نجمی سے کہا

،،ہمارے پیچھے دو سپاہی آ رہے ہیں اس چھوٹی سڑک کی طرف مڑ جاؤ۔،،

نجمی نے پیچھے گردن گھما کر بالکل نہ دیکھا اور بادل کی ہدایت کے مطابق بائیں جانب چھوٹی سڑک کی طرف گھوم گئی اس سڑک پر آتے ہی بادل نے زور سے آواز بلند کی۔

،،ہو کشمش والا بادام والا اخروٹ والا لے لو کابل کا خشک میوہ۔،،

ذرا آگے جا کر بادل نے گردن کھجانے کے بہانے سے ایک نظر پیچھے ڈالی اور نجمی سے کہا۔

،،سپاہی ابھی تک ہمارے پیچھے ہیں۔ یہ سامنے والی کوٹھی میں چلے چلو۔،،

سامنے ایک پرانے باغ میں چھوٹی سی کوٹھی تھی جس کا گیٹ کھلا تھا۔ اندر محرابی برآمدے کی ایک جانب جیپ گاڑی کھڑی تھی۔ برآمدے میں ایک آرام کرسی پہ ایک عورت سر پیچھے ٹکائے نیم دراز تھی۔ بادل کا خیال تھا کہ وہ یہاں کسی بیگم صاحبہ کو کشمش بادام فروخت کرنے کے بہانے بیٹھ جائیں گے اور اگر سپاہی واقعی ان کا تعاقب کر رہے ہیں تو انھیں یقین ہو جائے گا کہ وہ خشک میوے بیچنے والے کابلی پٹھان ہیں۔ بادل نے کوٹھی میں جاتے ہی آواز لگائی۔

،،بیگم صاحب کشمش لے لو۔ بادام لے لو۔ میوہ لایا ہوں کابل سے بیگم صاحب۔،،

نجمی بادل کے پیچھے تھی۔ دونوں برآمدے میں آرام کرسی پر نیم دراز عورت کے قریب نیچے زمین پر بیٹھ گئے۔ بادل نے جلدی سے اپنی گٹھڑی کھول کر باداموں اور کشمش وغیرہ کی پوٹلیاں کھولنی شروع کر دیں۔ نجمی آرام کرسی پر دراز عورت کو دیکھ کر جیسے سناٹے میں آ گئی تھی۔ بادل اپنے خشک میووں کی بلند آواز میں تعریف کر رہا تھا۔ اس نے ایک نظر پیچھے ڈالی اور خوش ہو کر نجمی سے کہا۔

،،سپاہی آگے نکل گئے ہیں۔ اب کوئی خطرہ نہیں۔،،

لیکن نجمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ابھی تک اس عورت کو تک رہی تھی جو آرام کرسی پہ سر پیچھے لگائے بیٹھی چھت کو گھور رہی تھی۔ زرد رنگ، آنکھوں میں حلقے، جسم دبلا ہو گیا تھا مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ نجمی اپنی بچپن کی سہیلی اور کالج کے زمانے کی دوست شبانہ کو نہ پہچانتی یہ شبانہ ہی تھی اور نجمی بادل اتفاق سے شکیلہ بائی کی کوٹھی میں آ گئے تھے۔ نجمی کے ہونٹوں سے اپنے آپ نکل گیا۔

،،شبانہ!،،

شبانہ نے چونک کر خشک میوہ بیچنے والی پٹھان عورت کی طرف دیکھا وہ حیران ہوئی کہ اس پٹھان عورت کو اس کا نام کیسے معلوم ہو گیا تھا۔ اس کی نظریں پٹھان عورت کے چہرے پر جمی تھیں۔ رنگ سانولا پڑ گیا ہے۔ چہرہ کرخت ہو گیا ہے۔ آنکھوں میں حلقے ہیں مگر آنکھوں

میں وہی لاہور کالج والی چمک ہے۔ یہ نجمی ہے۔ میری پیاری سہیلی میرے کالج کی ساتھی.... شبانہ کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔

"نجمی!"

دونوں سہیلیاں بے اختیار ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ بادل کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ شبانہ سسکیاں بھرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"نجمی مجھے یہاں سے نکال کر لے چلو۔ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔"

اتنے میں کوٹھی کے عقب سے دو آدمیوں کے قہقہے لگا کر ہنسنے کی آواز آئی۔ شبانہ نے نجمی کو جلدی سے پرے کر دیا اور بولی۔

"وہ آ رہے ہیں۔"

نجمی برآمدے سے اتر کر نیچے بادل کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔ بادل نے اپنی گردان شروع کر دی۔

"بیگم جی کابل سے سیدھا کاغذی بادام لایا ہے جی...."

شکیلہ بائی اس کوٹھی میں نہیں تھی۔ اس کے دونوں ہٹے کٹے غنڈے بندوقیں کاندھے پر ڈالے شبانہ کی رکھوالی کر رہے تھے۔ وہ کوٹھی کے باغ کا چکر لگا کر جب سامنے آئے تو ایک پٹھان عورت اور پٹھان مرد کو شبانہ کے سامنے بیٹھے دیکھا۔

ایک غنڈے نے وہیں سے چلّا کر کہا۔

"تم لوگ اندر کیوں آیا۔ چلو باہر چلو۔ باہر چلو۔"

بادل اور نجمی اٹھ کھڑے ہوئے۔ نجمی نے دھیمی آواز میں بادل سے کہا...." اس وقت یہاں سے چلے چلو۔"

دونوں غنڈوں نے بندوقیں ہاتھوں میں لے لی تھیں اور وہ بادل اور نجمی کو کوٹھی سے باہر نکلنے کو کہہ رہے تھے۔ بادل نے گٹھڑی باندھ کر کاندھے پر ڈالی اور تلخ لہجے میں کہا۔

"او بھائی جھگڑا کس لیے کرتا ہے۔ ہم جاتی ہے۔ خشک میوہ نہیں لینا تو نہ لو۔ بیگم صاحب کو

سلام کرنے آیا تھا۔"

دوسرا غنڈہ آگے آیا..." خبردار ادھر پھر کبھی مت آنا۔" بادل نے ہاتھ جھٹک کر غصے سے کہا

"او بھائی ہم ادھر کیوں آتی؟ تم کو کچھ نہیں چاہیئے تو ہم ادھر کیوں آتی چلو زنانی جان چلو۔ ہم کسی دوسری کوٹھی میں جاتا ہے۔"

بادل نے نجمی کو ساتھ لیا اور کوٹھی سے باہر نکل گئے۔

باہر آتے ہی نجمی نے کہا: "اس کوٹھی کو یاد رکھنا بادل۔ ہمیں آج آدھی رات کے بعد یہاں آنا ہے۔"

بادل نے قدرے تعجب سے پوچھا: "یہ شبانہ کون تھی؟ کیا تم اسے جانتی ہو؟"

نجمی نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

"یہ میری بچپن کی سہیلی ہے۔ بادل ہم لاہور میں اکٹھے ایک ہی کالج میں پڑھا کرتے تھے۔ یہ میری ایک ہی سہیلی تھی۔ کتنی بدل گئی ہے۔ لگتا ہے بڑی مصیبتیں سہی ہیں۔ بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ اس پر بڑے ظلم ہوئے ہیں۔ یہ یہاں کیسے پہنچ گئی؟ میں اس پر کیے گئے ایک ایک ظلم کا بدلہ لوں گی۔"

بادل نے پوچھا "یہ کیا ہمیں اسے رات کو یہاں سے نکالنا ہوگا۔؟"

نجمی نے جواب میں پیچھے گردن گھما کر دیکھا۔ پولیس کے سپاہی کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ کہنے لگی

"ہاں بادل اسے یہاں سے نکال کر اپنے ساتھ اڈے پر لے جانا ہے۔ یہ لوگ جرائم پیشہ لگتے ہیں۔ شاید شبانہ کو ناجائز کاروبار میں ڈالنا چاہتے ہیں اس نے مجھ سے خود کہا ہے کہ مجھے یہاں سے نکال کر لے چلو۔"

بادل نے کوئی جواب نہ دیا۔ سڑک آگے جا کر دائیں جانب مڑتی تھی۔ موڑ مڑتے ہوئے بادل نے "خشک میوہ لے لو کابلی والے سے" کا آواز لگایا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ آہستہ سے بولا۔

"سپاہی کہیں نہیں ہیں۔ شاید وہ ہمارے پیچھے نہیں لگے تھے۔"

نجمی نے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا: ”اگر وہ ہمارے پیچھے لگے ہوتے تو میں انھیں زندہ نہ چھوڑتی۔“

دونوں چھوٹی سڑک پر سے نکل کر ریلوے اسٹیشن والی سڑک پر آگئے۔ بادل کہنے لگا۔

”یہ سڑک ریلوے اسٹیشن کو جاتی ہے اب تمہارا جو نیا پروگرام بن گیا ہے اس کے مطابق ہمیں ریلوے اسٹیشن کی بجائے کسی قریبی ہوٹل یا سرائے کی طرف جانا ہوگا۔“

نجمی نے کہا: ”ہاں جہاں ہم آدھی رات تک رہیں گے اور پھر آدھی رات کے بعد اس کوٹھی میں آکر شبانہ کو ان جرائم پیشہ بدمعاشوں کے چنگل سے چھڑا کر لے جائیں گے۔“

بادل نے کہا: ”کوٹھی میں صرف دو ہی غنڈے ہیں جن کے پاس اسلحہ بھی ہے۔“

نجمی بولی: ”غنڈے اس سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں اور اسلحہ بھی اس سے زیادہ ہو سکتا ہے لیکن ہمیں ہر حالت میں شبانہ کو یہاں سے نکالنا ہے۔ یہ گناہ کی دلدل ہے۔ بادل میں اپنی پیاری سہیلی کو اس دلدل میں گرتے نہیں دیکھ سکتی۔ میں اپنی جان قربان کر دوں گی مگر شبانہ کو ان بدمعاشوں کی قید سے ضرور آزاد کراؤں گی۔“

بادل نے کہا: ”میں تمہارے ساتھ ہوں۔ ہر حالت میں تمہارے ساتھ ہوں۔ چلو ہم ایک دوسرے ہوٹل میں چلتے ہیں۔ یہ ہوٹل سرائے بھی ہے۔ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔“

چلتے چلتے بادل نے کچھ سوچ کر نجمی سے پوچھا: ”ہمیں رات کو کوٹھی پر حملہ بولنے سے پہلے یہ ضرور سوچنا ہے کہ ہم شبانہ کو لے کر کہاں جائیں گے کیونکہ اس وقت ہم اسٹیشن پر بھی نہیں جا سکتے۔ آدھی رات کو یہاں سے کوئی ریل نہیں چلتی۔ اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ غنڈے ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہوں۔“

نجمی نے بازار کی ایک جانب نگاہ ڈالی اور پھر بادل کی طرف چہرہ گھما کر کہا: ”تم نے کوٹھی میں کھڑی جیپ ضرور دیکھی ہوگی۔“

”ہاں“، بادل نے کہا، ”کونے میں برآمدے کے پاس ایک بند جیپ کھڑی تھی۔“

نجمی نے کہا: ”ہم شبانہ کو اس جیپ میں بٹھا کر وہاں سے فرار ہوں گے۔ اسٹیشن کی طرف جانے کی بجائے ہم نیچے جنگل میں نکل جائیں گے۔ اگر جنگل میں سے کوئی راستہ آگے کٹنی یا

ساگر شہروں کی طرف جاتا ہے تو ہم یہ سفر جنگل میں ہی طے کریں گے۔“

بادل کہنے لگا: ”بھوپال کے اس جنگل سے اوپر کٹنی کی طرف ہم نہیں جا سکتے۔ آگے پہاڑیاں ہیں۔ البتہ ہم وہاں سے اٹارسی کی طرف چلے جائیں گے۔ مجھے اس سارے راستے کا پتہ ہے۔ اٹارسی بھوپال سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ اٹارسی سے ہم جبل پور کی طرف گھوم جائیں گے۔ جبل پور سے ہمیں بنارس جانے والی گاڑی مل جائے گی۔ بنارس سے آگے ہم ٹرین میں سفر کرتے ہوئے صوبہ بہار میں داخل ہو جائیں گے۔“

نجمی کو یہ روٹ پسند آیا۔ اس نے اسی راستے سے شبانہ کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سرائے نما ہوٹل کافی گندا تھا مگر ان کے لیے یہی ہوٹل موزوں تھا۔ کسی اعلیٰ ہوٹل میں قیام پذیر ہونے کی وجہ سے ان پر شک پڑ سکتا تھا کابلی پٹھان اس قسم کے نچلے درجے کے سرائے نما ہوٹلوں میں قیام بھی کرتے تھے۔ دونوں کو ہوٹل نما سرائے کے کونے میں ایک کوٹھڑی مل گئی جس میں صرف دو چارپائیاں ہی بچھی تھیں۔ کھانا انھوں نے کوٹھڑی میں ہی کھایا۔ رات دس بجے تک بادل ہوٹل کے باہر گھوم پھر کر یہ جائزہ لیتا رہا کہ کہیں سچ مچ پولیس ان کے پیچھے تو نہیں لگی ہوئی۔ جب اسے تسلی ہو گئی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے تو وہ کوٹھڑی میں نجمی کے پاس آگیا۔ وہ اپنے ساتھ تلخ چائے سے بھری ہوئی کیتلی اور دو پیالیاں بھی لیتا آیا تھا۔ وہ چائے پیتے ہوئے اپنے رات کے اپریشن پر دھیمی آواز میں باتیں کرنے لگے۔ بادل نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اگر اتفاق سے رات کو کوٹھی میں جیپ نہ ہوئی تو پھر کیا کریں گے۔ نجمی نے کہا: ”ہم کوئی ٹیکسی پکڑ لیں گے۔ ریوالور ہمارے پاس ہوں گے ٹیکسی والے نے انکار کیا تو اسے وہیں اتار دیں گے۔ یہ خشک میوے کی گٹھڑی ہم اسی ہوٹل میں چھوڑ جائیں گے۔“

بادل کے پاس گھڑی موجود تھی۔ رات بارہ بجے تک وہ جاگتے رہے اور باتیں کرتے رہے انھوں نے کوٹھڑی کی بتی بجھا دی تھی۔ ٹھیک سوا بارہ بجے بادل دبے پاؤں کوٹھڑی سے باہر نکلا۔ سڑک بالکل خالی تھی۔ چاروں طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔ ویسے بھی یہ علاقہ شہر سے باہر تھا۔ بادل نے کوٹھڑی میں جا کر نجمی سے کہا۔

”سب ٹھیک ہے۔ ہمیں اپنے مشن پر روانہ ہو جانا چاہیئے۔“

نجمی اور بادل نے ریوالور نکال کر ان میں بھری ہوئی گولیوں کو چیک کیا۔ مزید گولیاں اپنی جیبوں میں بھریں اور خاموشی سے کوٹھڑی میں سے نکل کر ہوٹل کے آگے سے گزرتے ہوئے چھوٹی سڑک پر آ گئے۔ سڑک پر اندھیرا چھایا تھا۔ وہ درختوں کے نیچے چلنے لگے۔ یہاں سے شکیلہ بائی کی کوٹھی زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پہ تھی۔ دونوں انتہائی احتیاط کے ساتھ چل رہے تھے۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ پیچھے مڑ کر دیکھ لیتے تھے۔ وہ اس سڑک پر آ گئے جس کے کونے والی کوٹھی میں شبانہ قید تھی۔ اس سڑک پر بھی تاریکی اور سناٹا چھایا تھا۔ بادل اور نجمی یہی چاہتے تھے۔ کوٹھی کے قریب آ کر وہ رک گئے۔ بادل نے ہاتھ سے ایک جانب اشارہ کیا۔ وہ سڑک چھوڑ کر نیچے نشیب میں سے گزرتے ہوئے شکیلہ بائی کی ویران باغ والی کوٹھی کے عقبی دیوار کے نیچے آ کر بیٹھ گئے۔ نجمی نے آہستہ سے کہا "باغ میں جا کر دیکھو کوئی چوکیدار تو ادھر نہیں پھر رہا۔"

بادل کے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور تھا۔ دیوار چار فٹ اونچی تھی اور بڑے بڑے پتھروں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ بادل دیوار پھاند کر باغ میں اتر گیا۔ وہ جھک کر دبے پاؤں کوٹھی کے پچھلے حصے میں جھاڑیوں کی اوٹ لیتا آگے بڑھا۔ کوٹھی کے سامنے گیٹ پر بلب روشن تھا۔ گیٹ بند تھا۔ کونے میں جیپ بھی کھڑی تھی۔ اسی جانب برآمدے کے باہر ایک چوکیدار اسٹول پر بیٹھا نوکروں کے غسل خانے کی دیوار سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔ بادل وہیں سے واپس مڑا اور نجمی کو آ کر صورت حال بیان کی۔ نجمی نے بھی بھرا ہوا ریوالور تھام رکھا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور دیوار پر چڑھ کر دوسری جانب باغ کے اندھیرے میں اتر گئی۔ بادل اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ دیوار کے پاس ہی اندھیرے میں بیٹھ گئے۔ اجڑا ہوا باغ نصف سے زیادہ اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ گیٹ پر جو بلب روشن تھا اس کی دھیمی روشنی بائیں جانب کے درختوں میں پڑ رہی تھی۔

بادل نے اس جانب اشارہ کیا جس طرف چوکیدار بندوق گھٹنوں پر رکھے اسٹول پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ نجمی دیوار کے ساتھ ساتھ جھکے جھکے آگے چلنے لگی۔ اب اسے تیس بتیس قدم کے فاصلے پہ غسل خانے کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے ساتھ ایک آدمی اسٹول پر اس طرح بیٹھا نظر آ رہا تھا کہ اس کی گردن آگے کو جھکی ہوئی تھی۔ رائفل اس کے گھٹنوں پر پڑی تھی۔ نجمی نے بادل کے کان

کے پاس منہ لے جا کر سرگوشی کی "اسے گلا گھونٹ کر مار ڈالو۔"

بادل نے ریوالور جیب میں رکھا اور دوسری جیب سے نائیلون کی مضبوط مگر باریک رسی نکال کر اپنے ہاتھوں میں تھام لی اور اندھیرے میں سے ہو کر غسل خانے والی دیوار کے عقبی جانب بڑھا۔ نجمی نے ریوالور کا رخ چوکیدار کی طرف کر رکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس قسم کے جرائم پیشہ لوگوں کے اڈوں کے چوکیدار بھی جرائم پیشہ ہی ہوتے ہیں۔ اگر بادل چوک گیا تو وہ فائر کر کے چوکیدار کو ڈھیر کر دے گی۔ پھر جو سامنے آئے گا نجمی کی گولیوں سے بچ نہ سکے گا چاہے کوٹھی کے سارے آدمیوں کو ہلاک کر ڈالنا پڑے۔ نجمی شبانہ کو یہاں سے نکال کر لے جائے گی۔

نیم تاریکی میں نجمی نے بادل کے سائے کو چوکیدار کے پیچھے دیوار کے پاس ابھرتے دیکھا وہ ہاتھوں میں نائیلون کی رسی پکڑے پھونک پھونک کر قدم رکھتا آگے بڑھ رہا تھا پھر وہ چوکیدار کے عین پیچھے اس کے سر پر آ گیا۔ یہاں آتے ہی بجلی ایسی تیزی سے بادل نے نائیلون کی رسی چوکیدار کی گردن میں ڈالی اور اسے پوری طاقت سے کس دیا۔ چوکیدار کے گھٹنوں سے بندوق نیچے گر پڑی اس کے ہاتھ بے اختیار گردن کی طرف گئے۔ اس کے حلق سے معمولی سی آواز نکلی اور پھر اس کے بازو نیچے لٹکنے لگے۔ بادل اس کی گردن کو رسی میں جکڑے ایک جگہ ساکت سا ہو گیا تھا۔ پھر اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ چوکیدار کو پرے گرا دیا۔ جھک کر اس کی گردن پہ دونوں ہاتھ رکھے اور غور سے دیکھا۔ بادل ایک مضبوط اور توانا ڈاکو تھا۔ نہ جانے وہ کتنے بدمعاشوں اور ڈاکوؤں کو ہلاک کر چکا تھا۔ وہ کئی قتلوں میں پولیس کو مطلوب تھا۔ اس کی گرفت سے اس چوکیدار کا بچ جانا ناممکن بات تھی۔ چوکیدار کمزور جسم والا نہیں تھا لیکن اچانک گردن جکڑی جانے سے وہ اپنا بچاؤ نہ کر سکا تھا۔ وہ مر چکا تھا۔

بادل نے اندھیرے میں نجمی کی طرف دیکھا اور زور سے ہاتھ ہلایا۔ نجمی دیوار سے ہٹ کر لپک کر اس کے پاس آ گئی۔ وہ کوٹھی کے عقبی برآمدے میں آ گئے۔ کوٹھی کے کسی کمرے میں روشنی نہیں ہو رہی تھی۔ برآمدے میں دو دروازے تھے۔ دونوں اندر سے بند تھے۔ نجمی بادل کو ہاتھ سے پکڑ کر برآمدے کے کونے میں لے گئی اور سرگوشی میں کہا۔

"سامنے والے برآمدے کی طرف چلو۔"

وہ کوٹھی کے کونے والے گول کمرے کی دیوار کے نیچے سے گزر کر سامنے والے برآمدے میں آ گئے۔ یہاں گیٹ کی روشنی آ رہی تھی۔ انھیں کونے والے گول کمرے کے روشندان میں بھی ہلکی روشنی دکھائی دی۔ لگتا تھا اندر ہلکی طاقت کا بلب جل رہا ہے۔ نجمی نے اس کمرے کی طرف اشارہ کیا اور بے آواز قدم اٹھاتی پنجوں کے بل گول کمرے کے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ دروازے کی دوسری جانب بادل اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اس کا ریوالور والا ہاتھ ذرا سا اوپر اٹھا ہوا تھا۔ یہ دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔ پرانا دروازہ تھا اس کی جھری میں سے نجمی نے اندر جھانک کر دیکھا کہ چھت کا پنکھا چل رہا ہے۔ کونے میں ہلکی روشنی والا بلب روشن ہے۔ فرش پر قالین پڑا ہے جس پر تین آدمی بندوقیں پاس ہی رکھے گہری نیند سو رہے ہیں۔ ایک آدمی سگریٹ کے تمباکو کو اپنی ہتھیلی پر رگڑ رہا ہے۔ اس کی بندوق بھی پاس ہی پڑی تھی۔ نجمی آہستگی سے سانس لے رہی تھی۔ اس نے بادل کو اندر جھانکنے کا اشارہ کیا۔ بادل نے بھی جھری کے ساتھ آنکھ لگا کر اندر کا منظر دیکھا۔ نجمی پنجوں کے بل چلتی ہوئی بادل کو دوسرے کمرے کی دیوار کے پاس اندھیرے میں لے گئی۔ یہاں اس نے بادل کو سرگوشی میں اس آپریشن سے آگاہ کیا جس پر وہ عمل کرنے والی تھی۔ دونوں دیوار کے ساتھ اندھیرے میں تھے۔ نجمی نے زمین پر سے دو روڑے اٹھا لیے۔ اس نے ایک روڑے کو اوپر اس طرح سے اچھالا کہ وہ برآمدے کے فرش پہ جا کر گرا۔ رات کی خاموشی میں پتھر کے گرنے سے کھڑاک پیدا ہوا تو دوسرے لمحے سامنے والا دروازہ کھلا اور شکیلہ بائی کے چار غنڈوں میں سے ایک غنڈے نے باہر جھانک کر دیکھا۔ یہ وہ غنڈہ تھا جو کمرے میں بیٹھا سگریٹ میں سے تمباکو نکال رہا تھا۔ نجمی نے بادل کا ہاتھ دبایا اور اندھیرے میں اپنی جانب دوسرا پتھر اچھال کر پیچھے ہٹ گئی۔

دوسری آواز پر غنڈے نے بندوق سیدھی کر لی اور جدھر پتھر گرا تھا ادھر کو لپکا۔ جونہی وہ اندھیرے میں املی کے گھنے درخت کے نیچے آیا بادل نے پوری طاقت سے ریوالور کا آہنی دستہ پیچھے سے اس کی کھوپڑی پر دے مارا۔ ضرب اتنی شدید اور بھرپور تھی کہ غنڈہ وہیں لڑکھڑایا اور گر گیا۔ اس کے گرتے ہی بادل نے نائیلون کی رسی اس کی گردن میں ڈال کر دو سیکنڈ میں اس کا

کام بھی تمام کر دیا۔ دروازہ کھل چکا تھا۔ نجمی اور بادل اندر داخل ہو گئے۔ کمزور بلب کی دھیمی روشنی میں باقی تینوں غنڈے قالین پر بے سدھ پڑے سو رہے تھے۔ نجمی اور بادل نے فوری طور پر تینوں غنڈوں کی بندوقیں اٹھا لیں۔ ایک بندوق میں سے کارتوس نکال کر بادل نے اپنی جیب میں ڈال لیے اور باقی دونوں بندوقوں کے کارتوس کھول کر دیکھے۔ دونوں بندوقیں لوڈ تھیں۔ بادل نے آہستہ سے جھک کر ایک غنڈے کی گردن میں رسی ڈالی اور زور سے جھٹکا دیا۔ غنڈے کی گردن کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ جھٹکے کی آواز سے باقی دونوں غنڈے جاگ پڑے۔ نجمی نے بندوق سیدھی کر لی اور آہستہ سے کہا "جان عزیز ہے تو اسی طرح لیٹے رہو۔" غنڈوں نے آنکھیں جھپک جھپک کر ایک پٹھان عورت اور مرد کو دیکھا تو اٹھنے کی کوشش کی۔ بادل نے بندوق کی نالی ایک غنڈے کی گردن سے لگا دی۔ نجمی نے دوسرے غنڈے کے سینے پر نالی رکھ دی۔

نجمی نے پوچھا "شبانہ یہاں کون سی جگہ بند ہے۔ جلدی بتاؤ نہیں تو میں گولی سے اڑا دوں گی۔"

غنڈہ ہکلاتے ہوئے بولا "ہمیں کچھ معلوم نہیں۔"

اچانک دوسرا غنڈہ زور سے چلّایا "چاند خان ہوشیار۔"

بادل نے اس کی چیخ سے گھبرا کر ٹریگر دبا دیا۔ ایک دھماکہ ہوا۔ بندوق کی نالی غنڈے کی گردن سے لگی تھی۔ فائر کے ساتھ ہی غنڈے کی گردن آدھی سے زیادہ اڑ گئی۔ نجمی نے نالی اٹھا کر بادل کی طرف دیکھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہاں فائر کا دھماکہ ہو۔ نیچے پڑے غنڈے کو موقع مل گیا۔ وہ تڑپ کر اٹھا اور نجمی کی بندوق کو پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا ہی تھا کہ بادل نے دوسرا فائر کر دیا۔ بندوق کے دوسرے کارتوس نے آخری غنڈے کے سینے میں گہرا شگاف بنا دیا اور پھیپھڑے چیتھڑوں کی طرح اڑ گئے۔ دوسرے کمرے میں جیسے کوئی دھڑ دھڑاتا ہوا ایک طرف کو دوڑا۔ بیچ والا دروازہ بند تھا۔ بادل نے زور سے لات مار کر دروازہ دھڑاک سے کھول دیا۔ سامنے کسی نے بتی جلا دی تھی اور اس کی روشنی میں شکیلہ بائی پلنگ سے نیچے اترنے کی کوشش میں ایسی حالت میں کھڑی کانپ رہی تھی کہ ایک پاؤں اس کا ابھی تک

پلنگ کے اوپر ہی تھا۔ ایک مرد عجیب حالت میں سامنے والے دروازے کے پاس کھڑا اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پٹھان مرد اور عورت کو بندوقوں کے سامنے دیکھ کر وہ وہیں ساکت ہو گیا۔

نجمی اور بادل نے جیبوں سے ریوالور نکال لیے بندوقیں پرے پھینک دیں۔ نجمی نے شکیلہ بائی کو قریب جا کر غور سے دیکھا۔ بادل سے کہا۔ "اس بدمعاش مرد کو قابو میں کرو۔"

بادل نے آگے بڑھ کر، موت کے خوف سے کانپتے ہوئے آدمی کو وہیں پلنگ کے پاس فرش پر بٹھا دیا۔ ریوالور کا رخ اس کی کھوپڑی کی طرف تھا۔ نجمی نے شکیلہ بائی سے پوچھا۔

"تم نے ایک لڑکی کو اپنے ہاں قید کر رکھا ہے۔ اس کا نام شبانہ ہے۔ وہ یہاں کس جگہ قید ہے باہر تمہارے چوکیدار اور چاروں غنڈوں کی لاشیں خون میں لت پت پڑی ہیں۔ بتاؤ شبانہ کہاں ہے؟"

شکیلہ بائی کی گگھی بندھ گئی تھی مگر وہ ایک عیار اور کائیاں عورت تھی اس عالم میں بھی اس نے مکاری سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"وہ.... وہ تو شام کو ہی اپنے ایک رشتے دار کے پاس چلی گئی تھی۔ میرے پاس وہ رات کبھی نہیں ٹھہری۔"

نجمی کی آنکھوں میں خون اتر ہوا تھا۔ اس قسم کی بدکردار عورتوں اور بدمعاش غنڈوں نے اس کا جو حشر اس کا کیا تھا وہ اس کے سامنے تھا لیکن وہ نہیں چاہتی تھی کہ یہی حشر اب شبانہ کے ساتھ ہو اور یہ گھناؤنی کہانی ایک بار پھر دہرائی جائے۔ اس نے بادل کو اشارہ کیا۔ بادل نے اس مرد سے جو پلنگ کے پاس ریوالور کی زد میں سہما ہوا بیٹھا تھا پوچھا۔ "لڑکی کہاں ہے؟ تم بتاؤ۔"

مرد نے ہاتھ جوڑ کر کہا "میں یہاں پہلی بار آیا ہوں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں بھگوان کی سوگند ہے، مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

اب نجمی نے شکیلہ کو بالوں سے پکڑ کر زمین پر گرا دیا اور ایک پاؤں اس کی گردن پر رکھتے ہوئے کہا "میں تین تک گنوں گی۔ اگر تم نے شبانہ کے بارے میں مجھے نہ بتایا تو فائر کر

دوں گی۔"

ریوالور کی نالی شکیلہ بائی کی آنکھوں کے بالکل سیدھ میں تھی۔ نجمی نے دو تک گنا تھا کہ شکیلہ بائی نے بتا دیا کہ شبانہ نیچے والے تہہ خانے میں ہے سہمے ہوئے مرد کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے رسی سے وہیں باندھ کر پھینک دیا گیا۔ شکیلہ کو بادل اور نجمی نے آگے لگا لیا وہ انھیں لے کر اندر والے کاریڈار کے ایک زینے میں سے اتر کر تہہ خانے کے دروازے پر آ گئی۔ بادل زینے کے اوپر ہی ریوالور لیے کھڑا تھا۔ شکیلہ بائی نے دروازہ کھول دیا۔ اندر شبانہ چارپائی پر لیٹی جاگ رہی تھی۔ فائر کی آوازیں اس نے بھی سنی تھیں۔ نجمی نے جاتے ہی شبانہ کو گلے لگا لیا اور اس کا ماتھا چوم کر بولی "چلو میری سہیلی! میں تمھیں یہاں سے نکالنے آئی ہوں۔" شبانہ کے جسم میں نئی زندگی دوڑ گئی تھی۔ وہ چارپائی سے اٹھی۔ چادر ساڑھی کے اوپر لی اور بولی۔

"یہ عورت مجھے پان میں بے ہوشی کی دوا کھلا کر بے ہوش کر کے یہاں لے آئی تھی نجمی۔ یہ عورت معصوم لڑکیوں کو فروخت کر کے بازار حسن پہنچاتی ہے مجھے اس کی نوکرانی نے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

نجمی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ معصوم لڑکیوں کی زندگیاں برباد کرنے والے مرد اور عورتیں نجمی کے دشمن نمبر ایک تھیں۔ اس نے ریوالور شکیلہ بائی کی کھوپڑی کے ساتھ لگایا اور لبلبی دبا دی۔ تڑاخ کی آواز کے ساتھ ہی شکیلہ بائی کی آدھی کھوپڑی اڑ گئی۔

نجمی نے شبانہ کو ساتھ لیا اور زینے پر سے ہو کر اوپر کاریڈار میں آ گئی۔ بادل نے پوچھا۔

"یہ گولی نیچے کس نے چلائی تھی۔"

نجمی نے نفرت سے کہا "ایک موذی ناگن کو مار دیا ہے میں نے۔" وہ کوٹھی کے کمروں سے لاشوں کے قریب سے گزرتے ہوئے باہر والے برآمدے میں آ گئے۔ کوٹھی آبادی سے دور تھی۔ فائرنگ بند کمروں میں ہوئی تھی۔ اس کی آواز دور آبادی تک شاید نہیں پہنچی تھی۔ باہر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نجمی نے جیپ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"پٹرول چیک کرو بادل۔"

نجمی نے شبانہ کو اپنے ساتھ اگلی سیٹ پر بٹھالیا۔ بادل نے پیٹرول چیک کیا۔ ٹنکی بھری ہوئی تھی۔ جیپ میں چابی ویسے ہی لٹک رہی تھی۔ یہ اس لیے کہ ایمرجنسی میں اگر کسی کو بھی وہاں سے بھاگنا پڑے تو جیپ فوراً اسٹارٹ کر دی جائے۔ بادل نے جیپ اسٹارٹ کر کے تیزی سے اسے کوٹھی کے گیٹ سے نکالا اور سڑک پر ڈال دیا۔

بادل بھوپال کی ان سڑکوں سے خوب واقف تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں بھی ان سڑکوں کو پہچان سکتا تھا۔ آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ شہر کے باہر والا علاقہ بالکل سنسان تھا۔ سڑکیں خالی تھیں۔ جیپ پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ بادل شہر کی مختلف ویران سڑکوں پر سے ہوتا ہوا بھوپال اٹارسی سڑک پر آ گیا۔ یہ کشادہ سڑک تھی۔ جیپ جنوب کی طرف اٹارسی کی جانب چل پڑی۔ نجمی نے شبانہ کے گرد بازو ڈال کر اسے اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ اسے بے حد خوشی تھی کہ اس نے اپنی پیاری سہیلی کو بھیانک انجام سے بچا لیا تھا۔ وہ اسے تباہی کے تاریک گڑھے میں گرنے سے بچا کر لے آئی تھی۔ جب جیپ بھوپال شہر سے کافی دور نکل آئی تو شبانہ نے نجمی سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟ نجمی نے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"تم میرے گھر جا رہی ہو شبو۔"

شبانہ نے پوچھا۔

"کیا تم نے شادی کر لی ہے نجمی؟"

"ہاں"۔ نجمی نے کہا۔ "میں نے موت سے شادی کر لی ہے۔"

شبانہ نے نجمی کے کرخت چہرے کو دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ نارمل زندگی بسر نہیں کر رہی۔ اور اب تو نجمی نے اس کے سامنے ایک عورت کا انتہائی سفاکانہ انداز سے خون کر دیا تھا اور اسے ذرا بھی ملال نہیں ہوا تھا۔ شبانہ کو شکیلہ بائی کی موت کا کوئی افسوس نہیں تھا اس کے باوجود وہ نجمی کے ہاتھوں اسے قتل ہوتے دیکھ کر کچھ سہم گئی تھی۔ نجمی اتنی بیدردی سے کسی کا خون کرے گی یہ بات شبانہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ نجمی نے شبانہ سے پوچھا کہ وہ لاہور سے انڈیا کیسے پہنچ گئی؟

شبانہ نے کہا۔

"یہ بڑی لمبی کہانی ہے نجمی! تمہیں تمہارے گھر چل کر سناؤں گی۔ صرف اتنا بتائے دیتی ہوں کہ میری شادی ظفر سے ہو گئی تھی۔ میں اس کے ساتھ امریکہ میں تھی۔ اس نے میرے ساتھ بڑا وحشیانہ سلوک کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں تنگ آ کر لاہور آ گئی۔ بھائی جان نے تبدیلی آب و ہوا کے لیے مجھے مشرقی پاکستان اپنے ایک دوست کی فیملی میں بھجوا دیا۔ میں وہیں تھی کہ انڈیا نے حملہ کر دیا۔ میں اس افراتفری میں جدھر منہ اٹھا اپنی عزت بچا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ ایک آدمی مجھے پکڑ کر کلکتے لے آیا۔ یہاں اس نے مجھے فروخت کر دیا۔ اس کے بعد جانے کہاں کہاں میں ماری ماری پھرتی رہی۔ ایک نیک دل گورکن نے مجھے سری لنکا اسمگل کروانے کی کوشش کی لیکن میرا جعلی پاسپورٹ تھا۔ پکڑی گئی۔ وہاں سے جان چھوٹی تو اورنگ آباد واپس آ رہی تھی کہ اس عورت شکیلہ بائی نے مجھے بے ہوشی کا پان کھلا کر اغوا کر لیا۔"

نجمی نے پوچھا۔ "ندیم سے تمہاری ملاقات نہیں ہوئی؟"

شبانہ نے کہا۔ "میں نے سنا تھا کہ وہ تمہاری تلاش میں انڈیا گیا ہوا ہے۔ اس کے بعد میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کیا وہ تم سے نہیں ملا؟"

نجمی نے گہرا سانس بھر کر کہا

"کئی بار ملا اور بچھڑ گیا۔ وہ مجھے واپس پاکستان لے جانا چاہتا تھا۔ میں اس وقت تک واپس نہیں جا سکتی تھی جب تک کہ میں یہاں اپنے دشمنوں سے انتقام نہ لے لیتی۔ اب میں واپس پاکستان جانا چاہتی ہوں اور ندیم کا کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے؟"

اس طرح باتیں کرتے کرتے یہ لوگ اٹارسی شہر کے قرب و جوار میں پہنچ گئے۔ اٹارسی شہر کی روشنیاں بائیں جانب چھوڑ کر بادل نے جیپ کو جبل پور والی سڑک پر ڈال دیا۔ اٹارسی سے جبل پور کافی دور تھا۔ دن کا اجالا ہوا تو وہ ایک چھوٹے سے قصبے میں پہنچے۔ وہاں انھوں نے جیپ کو جنگل میں ایک طرف کھڑا کر دیا۔ یہاں ایک ندی بہہ رہی تھی۔ ندی کے کنارے بیٹھ کر انھوں نے منہ ہاتھ دھویا۔ بادل قصبے میں گیا اور کچھ کھانے پینے کا سامان لے آیا۔ ایک گھنٹہ یہاں ناشتے کے بعد انھوں نے آرام کیا اور پھر جبل پور کی طرف چل پڑے۔ سارا دن اسی

طرح راستے میں رکتے تھوڑا آرام کرتے دن بھر سفر جاری رہا۔ پھر رات آگئی۔ رات کے بارہ بجے یہ لوگ جبل پور پہنچے۔

شہر سے باہر جیپ ایک طرف کھڑی کر کے انھوں نے وہیں آرام کیا۔ منہ اندھیرے جبل پور سے کٹنی کی جانب روانہ ہو گئے۔ کٹنی سے مانک پور ریلوے اسٹیشن کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ الٰہ آباد پہنچ گئے۔ یہاں سے انھوں نے ریل پکڑی اور بنارس پہنچے۔ بنارس سے گاڑی میں سوار ہو کر وہ رانچی کی جانب چل پڑے۔ یہ سفر بھی کافی طویل تھا۔ یونہی ریل گاڑیوں میں سفر کرتے یہ لوگ گوماہ ریلوے اسٹیشن پہنچ کر وہاں سے پیدل ہی اپنی خفیہ کمین گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔

سفر کے دوران نجمی نے شبانہ کو لاہور سے ندیم کے ساتھ فرار ہونے کے بعد سے لے کر آج کے دن تک کی پوری داستان سنادی۔ شبانہ اپنی پیاری سہیلی نجمی کی زندگی کے ہوش ربا واقعات سن کر دنگ رہ گئی۔ شبانہ کو اب بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ نجمی جرائم پیشہ لوگوں اور معصوم لڑکیوں کی عزتوں سے کھیلنے والے اور ان کی زندگیوں کو برباد کرنے والوں کے لیے سفاک قاتل بن چکی ہے اور ایسے کئی بدکرداروں کو موت کے گھاٹ اتار چکی ہے۔ نجمی کے مقابلے میں اسے اپنی تکلیفیں معمولی لگنے لگیں۔

دن ڈوب رہا تھا کہ بادل نجمی اور شبانہ جنگل میں چٹانوں کی اوٹ میں واقع اپنی کمین گاہ میں پہنچ گئے۔

نجمی کے ساتھ ڈاکوؤں نے شبانہ کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ شبانہ اتنے طویل سفر کی وجہ سے تھک گئی تھی۔ رات کو کھانا کھاتے ہی وہ گہری نیند سو گئی۔ دوسرے دن وہ ابھی تک سوئی ہوئی تھی کہ نجمی نے بادل کو بلا کر اس سے مشورہ کیا کہ ندیم کو کیسے تلاش کیا جائے۔ وہ ندی کے کنارے آمنے سامنے بچھی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ نجمی اپنے ریوالور کو کپڑے سے صاف کر رہی تھی بادل نے کہا۔

"یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے مخبر کلکتے کے آس پاس چھوڑ دیں۔ دو ایک روز میں بھی سیٹھ جبار کے پاس جانا ہے۔ ممکن ہے اس نے ندیم کا کوئی سراغ لگا لیا ہو۔"

نجمی نے کہا "ہمارے صرف ایک مخبر نے ندیم کو دیکھا ہوا ہے ہم صرف اسی کو سراغ رسانی کے لیے بھیج سکتے ہیں۔"

بادل بولا "کلکتے میں ایک ہی مخبر کافی ہے۔ وہ پولیس تھانوں سے اپنے ذرائع سے معلومات حاصل کر سکتا ہے۔"

نجمی نے اسی وقت ایک مخبر کو ضروری ہدایات دینے کے بعد کلکتے کی طرف روانہ کر دیا۔

شبانہ سو کر اٹھ بیٹھی تھی۔ نجمی اس کے پاس چلی گئی۔ دونوں نے بھنے ہوئے جنگلی مرغ اور کافی کا ناشتہ کیا۔ پھر دونوں سہیلیاں آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ وہ ماضی کی یادوں میں کھو گئیں۔ اور دیر تک لاہور والے کالج یونیورسٹی کیمپس کی سہیلیوں اور لاہور شہر کی باتیں کرتی رہیں۔ شبانہ نے نجمی کو بتایا کہ اس کی سوتیلی ماں اس کے باپ کی وفات کے بعد رنگ محل والا گھر چھوڑ کر اپنے گاؤں جا چکی ہے۔ اپنے باپ کی وفات کا سن کر نجمی کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے فوراً آنکھیں پونچھیں اور اپنے ریوالور کے دستے کو پتلون سے رگڑتے ہوئے بولی۔

"جو ہوا میں اب اسے بھلا دینا چاہتی ہوں۔ میں پاکستان گئی بھی تو لاہور میں نہیں رہوں گی۔ میں گلگت یا کاغان کے سرسبز پرسکون علاقے میں جا کر ایک نئی زندگی شروع کر دوں گی۔"

دو روز بعد بادل نے ایک جوگی کا بھیس بدلا اور ندیم کا کھوج لگانے کے لیے کلکتے کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں اس نے سیٹھ جبار سے خفیہ ملاقات کی تو سیٹھ جبار نے اسے بتایا کہ ندیم کو بنگال پولیس نے گرفتار کر لیا تھا اور اب وہ دلی میں قید ہے۔

"میرے آدمی نے مجھے اطلاع دی ہے کہ دلی کے پرانے قلعے کے پیچھے ایک پرانا کھنڈر ہے جس پر دلی پولیس انٹیلی جنس والوں کا قبضہ ہے۔ پولیس نے اس کھنڈر کے نیچے تہ خانے میں ندیم کو قید میں ڈال رکھا ہے اور اس پر تشدد کیا جا رہا ہے۔ دلی پولیس ندیم کو پاکستانی جاسوس سمجھتی ہے چنانچہ وہ اس سے اس کے ساتھیوں کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہی ہے۔"

بادل کے لیے یہ اطلاع کافی تھی۔ سیٹھ جبار نے یہ بھی بتایا کہ جہاں ندیم قید ہے وہاں پرندہ پر بھی نہیں مار سکتا۔ بادل نے یہ ساری باتیں واپس آ کر نجمی کو بیان کر دیں۔ شبانہ بھی نجمی کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ نجمی نے اس مسئلے کے ہر پہلو پر غور کیا۔ بادل سے مشورہ بھی کیا۔ آخر وہ

اسی نتیجے پر پہنچی کہ ندیم کی مدد اور بھارتی انٹلی جنس کے گماشتوں کے تشدد سے نجات دلانے کے لیے اسے خود دلی جانا ہوگا۔ شبانہ کو اس نے وہیں رہنے کی ہدایت کی اور بادل کو ساتھ لے کر ایک دن وہ دلی کی طرف روانہ ہو گئی۔

دونوں نے بیراگی اور جوگن کا بھیس بدل رکھا تھا۔

* * *

نجمی اور بادل دلی کے ریلوے اسٹیشن سے باہر نکل آئے۔

اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا اور شام کے سائے پھیلنے لگے تھے۔ اسٹیشن کے اندر کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ نجمی اور بادل دونوں ہی جوگی جوگن کے بھیس میں تھے۔ نجمی نے کھدر کی گیروی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ ماتھے پر تلک لگا تھا۔ گلے میں ریٹھوں کے منکوں کی مالا تھی۔ بالوں کو اس نے کھدر کے گیروے رومال سے ڈھانپ رکھا تھا۔ ہاتھ میں چھوٹا سا کمنڈل تھا۔ بائیں گال پر اس نے سیاہ رنگ کا ایک مصنوعی مسّہ بنا لیا تھا تاکہ آسانی سے پہچانی نہ جا سکے۔ اگرچہ دلی کی پولیس سے اسے زیادہ واسطہ نہیں پڑا تھا۔ کلکتے کی پولیس اسے زیادہ جانتی تھی۔ پھر بھی نجمی کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ بادل بھی جوگی کے بھیس میں گیروے رنگ کی چادر سے اپنا بدن لپیٹے ہوئے تھا۔ اس کے ماتھے پر وشنو بھگوان کے تلک کی تین لکیریں سفید رنگ کی پڑی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ترشول تھا اور دھوتی کے اندر بھرا ہوا ریوالور چھپا ہوا تھا۔ ایک چھوٹا ریوالور نجمی نے بھی اپنے کپڑوں میں چھپا رکھا تھا۔ بادل اس قسم کے بھیس بدلنے میں بڑا ماہر تھا اور اسے ہندی اور سنسکرت کے کچھ اشلوک بھی زبانی یاد تھے۔ یہ بات انھوں نے دلی آتے ہوئے ٹرین میں ہی طے کر لی تھی کہ وہ ریلوے اسٹیشن سے اتر کر سب سے پہلے سیدھے بھیروں جی کے مندر میں جائیں گے۔ بھیروں جی کا مندر دلی کے تیس ہزاری علاقے میں واقع ہے اس مندر کا اس لیے انتخاب کیا گیا تھا کہ یہاں سے قریب ہی مٹی کے ٹیلے کے عقب کے کوارٹروں میں بادل کا پرانا دوست امجد خان رہتا تھا۔ امجد خان کسی زمانے میں بادل کے ساتھ نجیب آباد کے جنگلوں میں ڈاکے ڈالا کرتا تھا۔ پھر اس نے شادی کر لی اور تائب ہونے کے بعد

دلی میں آگیا۔ دلی میں امجد خاں نے داڑھی رکھ لی اور عبدل بیگ کے نام سے ایک دفتر میں چپڑاسی ہو گیا تھا۔

نجمی اور بادل نے رکشا پکڑا اور سیدھے تیس ہزاری کی طرف روانہ ہو گئے۔ بھارت میں جوگی اور جوگن کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ اتر پردیش کے پہاڑی علاقوں سے جوگی لوگ اکثر دلی کے مندروں کی یاترا کو آتے رہتے ہیں اور میدانوں سے جوگی لوگ اتر پردیش اور ہماچل پردیش کے پہاڑی مندروں کی یاترا کو جاتے ہی رہتے ہیں۔ دلی کی گلیوں میں جوگی جوگنیں عام طور پر بھیک مانگتے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہندوؤں کے علاقے میں تو ان کا بڑا زور ہوتا ہے۔ مندروں میں اکثر وہ ڈیرے ڈالے ہوتے ہیں۔ نئی دلی کے کناٹ پلیس میں وہ بڑے رعب سے گاڑی والوں سے دکھشنا طلب کرتے ہیں اور ضعیف الاعتقاد ہندو انھیں فوراً بھکشا دے دیتے ہیں یہ ہندو ان جوگی جوگنوں کی بد دعا سے ڈرتا ہے۔ ان کا اعتقاد ہے کہ اگر جوگی یا جوگن سنراپ یعنی بد دعا دے تو وہ کبھی خالی نہیں جاتی۔ ہندوؤں کی اس کمزوری کا نجمی اور بادل کو بخوبی علم تھا۔ اگر انھیں کچھ خطرہ تھا تو صرف یہ کہ کہیں کوئی خفیہ پولیس کا آدمی ان کو پہچان کر پیچھے نہ لگ جائے۔ مگر رات کا اندھیرا چھایا تھا اس لیے نجمی اور بادل کو زیادہ فکر نہیں تھی۔ بادل نے یہی سوچا تھا کہ ایک رات تو وہ بھیروں جی کے مندر میں گزاریں گے اور دوسرے روز صبح ہونے سے پہلے امجد خان کے کوارٹر میں اٹھ جائیں گے۔

بھیروں جی کے مندر میں عقیدت مندوں کی بڑی بھیڑ تھی۔ مندر کی ڈیوڑھی میں لٹکتے گھنٹے اور گھنٹیاں بار بار بج رہی تھیں۔ اندر جاتے اور باہر آتے ہوئے ہر ہندو اس کو ہاتھ سے بجا دیتا تھا۔ سارا مندر جگ مگ کر رہا تھا۔ مخروطی مینار کے اوپر بتی روشن تھی۔ اندر بھیروں ماتا کی مورتی کے سامنے پجاری بیٹھا دکھشنا وصول کرنے کے بعد پجاریوں کے ماتھے پر تلک لگاتا جا رہا تھا۔ مندر کے صحن میں کئی جگھوں پہ سادھو اور جوگی لوگ زنگ بھبھوت لگائے الاؤ روشن کیے آسن جمائے بیٹھے تھے۔ بادل اور نجمی بھی ایک طرف درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ یہاں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ بادل نے اپنا ترشول اور جھولا قریب ہی گھاس پر رکھ دیا۔ آنکھوں کو سکیڑ کر چاروں طرف دیکھا اور بولا۔

"جس جگہ ہم بیٹھے ہیں اس کے پیچھے کچھ کوٹھریاں ہیں۔ یہاں باہر کے یاتری آکر قیام کرتے ہیں۔"

نجمی نے جذبات سے عاری سپاٹ آواز میں پوچھا۔

"کیا یہاں کا مہنت ہمیں کوٹھڑی دے دے گا۔؟"

بادل نے کہا "اسے رشوت چاہیئے جو ہم اسے دے دیں گے۔ میں منہ اندھیرے امجد خان کے گھر جانا چاہتا ہوں۔ تم کوٹھری میں رات بسر کرنا۔ میں یہاں باہر ہی کسی الاؤ کے پاس پڑا رہوں گا۔"

روٹیاں پکا کر وہ اپنے ساتھ ہی لائے تھے۔ ساتھ اچار بھی تھا۔ دونوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے روٹی کھائی۔ لوگ پوجا کرنے جاتے اور واپس چل دیتے۔ کوئی ان کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ وہاں جوگی جوگنیں اور سادھو لوگ آتے ہی رہتے تھے۔ جب رات کے سوا دس بج گئے اور پجاریوں کی آمد و رفت ختم ہو گئی تو بادل نے مندر کے مہنت سے جا کر بات کی کہ میری پتنی بیمار ہے۔ باہر کھلے آسمان تلے نہیں سو سکتی۔ اس کو خالی کوٹھری مل جائے تو بڑی مہربانی ہو گی۔

مہنت نے بے نیازی سے کہا "کوٹھری تو کوئی بھی خالی نہیں۔"

بادل نے جب دس روپے کا نوٹ مہنت کے قریب رکھ دیا تو وہ فوراً مورتی کے قریب بیٹھے بیٹھے بولا "کونے والی کوٹھری میں چلے جاؤ۔"

بادل نجمی کو کوٹھری میں لے آیا۔ یہاں صرف ایک چارپائی بچھی تھی جس پر کوئی بستر وغیرہ نہیں تھا۔ بادل نے جھولے میں سے کھدر کی چادر نکال کر نجمی کو دی اور کہا۔

"اسے اوڑھ کر سو جاؤ۔ اندر سے کنڈی لگا لینا۔ میں باہر سوؤں گا اور منہ اندھیرے امجد خان کے پاس جاؤں گا۔"

نجمی نے اندر سے کنڈی لگا لی۔ بھرا ہوا ریوالور اپنے پاس ہی رکھا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

بادل کوٹھری کے قریب ہی ایک آدھ بجھے خالی الاؤ کے پاس بیٹھ گیا۔ سردی گلابی تھی مگر رات کو کچھ ٹھنڈی ہو گئی تھی بادل نیم کے درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں منکوں کی مالا تھی۔ اسے یونہی پھیر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ابھی اسے نہیں سونا چاہیئے۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد بند کوٹھری کو دیکھ لیتا تھا جہاں نجمی سو رہی تھی۔ کبھی اس کی ذرا سی دیر کو آنکھ

لگ جاتی اور پھر جاگ پڑتی۔ اسی طرح سوتے جاگتے آدھی رات بیت گئی۔

مندر کی صرف چند ایک بتیاں روشن تھیں۔ کچھ فاصلے پر الاؤ کے پاس جو سادھو آسن جمائے بیٹھے تھے اب عقیدتمندوں کے رخصت ہونے پر وہ بھی وہیں زمین پر لیٹ کر سو گئے تھے۔ تیس ہزاری سڑک پر کبھی کبھی کسی موٹر گاڑی کے گزرنے کی آواز آجاتی تھی۔ جب رات آدھی سے بھی زیادہ گزر گئی تو بادل ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔ شہر پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ تیس ہزاری کی آبادی بھی خاموش تھی۔ بادل نے ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ملا اور اللہ کا نام لے کر وہاں سے اپنے پرانے دوست امجد خان کے کوارٹر کی طرف چل پڑا۔

تیس ہزاری والے بھیروں جی کے مندر کے سامنے بھی کوارٹروں کی ایک قطار تھی۔ ان کوارٹروں کے برآمدوں کی بتیاں جل رہی تھیں۔ ان پر بھی سناٹا طاری تھا۔ بادل سادھو جوگی کے بھیس میں تھا۔ اگر کوئی گشت لگاتا سپاہی یا چوکیدار مل بھی جاتا تو اسے اس پر چور ہونے کا شبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بادل بھی سینہ تان کر بڑے اعتماد سے چل رہا تھا۔ وہ سامنے والے کوارٹروں کے آگے سے گزرتا مغربی ٹیلے کی طرف آگیا۔ ٹیلا مٹی کا تھا اور اس پر کہیں کہیں جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ وہ ٹیلے کے اوپر آیا تو دوسری طرف کوارٹروں اور ان کے پیچھے پرانے بنگلوں میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ ٹیلے سے اتر کر امجد خاں کے کوارٹر کی طرف چلنے لگا۔ ابھی تک نہ تو اسے کوئی چوکیدار ملا تھا اور نہ رات کو گشت کرنے والا کوئی سپاہی۔ بادل امجد خاں کے کوارٹر کے قریب پہنچا تو کسی طرف سے ایک کتا بھونکنے لگا۔ بادل نے ترشول اپنے سیدھے ہاتھ میں لے لیا کہ اگر کتے نے اس پر حملہ کیا تو وہ اپنا دفاع کر سکے۔

امجد خاں کا کوارٹر اب اس کے سامنے تھا۔ کتا کچھ دیر بھونک کر خاموش ہو گیا تھا۔ امجد خاں کے کوارٹر کے باہر کھمبے کا کمزور بلب جل رہا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سے گلی میں کونے والا کوارٹر تھا۔ بند دروازے کے آگے گلی میں ایک بڑا سا پتھر رکھا ہوا تھا جس پر پاؤں رکھ کر اندر جاتے تھے۔ بادل پہلے بھی دو ایک بار یہاں اپنے دوست کے پاس آچکا تھا۔ دروازے کے پاس آکر بادل نے دائیں بائیں دیکھا۔ وہاں اس کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ بادل نے دروازے پر ترشول سے آہستہ سے دستک دی۔

کچھ دیر بعد کسی مرد کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز آئی "کون ہے باہر؟"

بادل نے آواز پہچان لی۔ یہ اس کے دوست کی آواز تھی۔ وہ خاموش رہا۔

دوبارہ دستک دی تو امجد خان کی آواز آئی "آتا ہوں۔"

چند سیکنڈ خاموشی طاری رہی۔

امجد خان نے دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھا "کون ہو بھئی تم؟ آدھی رات کو یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

بادل نے آہستہ سے کہا "میں بادل ہوں امجد خان۔"

دروازہ جلدی سے کھول کر لمبی داڑھی اور گھنی گھنی مونچھوں والے امجد خان نے کہا "اندر آجاؤ۔"

وہ بادل کو اپنی کوٹھڑی میں لے گیا۔ اندر جاتے ہی امجد خان نے دیوار والی بتی کا بٹن دبا دیا کوٹھڑی میں روشنی ہو گئی۔ امجد آنکھیں ملتا ہوا بولا "خیریت بالکل نہیں ہو گی جو تم اتنی رات گئے یہاں آئے ہو۔ کیا پولیس تمھارے پیچھے لگی ہے؟"

بادل نے کہا "پولیس میرے پیچھے نہیں ہے۔ گھر میں تمھارے پاس ایک بڑے ضروری کام سے آیا ہوں۔"

امجد خان نے دروازے کی کنڈی اندر سے لگا دی تھی۔ چارپائی پر سے کھیس پیچھے ہٹا دیا۔ بادل کو لوہے کی کرسی پیش کی اور خود چارپائی پر بیٹھتے ہوئے سگریٹ سلگا کر بولا "یہ تم نے سادھو والا بھیس پولیس سے بچنے کے لیے نہیں تو کس لیے اختیار کر رکھا ہے؟"

تب بادل نے امجد خان کو ساری بات کھول کر بیان کر دی۔ امجد خان بڑے غور سے بادل کی باتیں سنتا رہا پھر سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا "میرے دوست! تمھیں معلوم ہی ہے کہ میں نے پرانی زندگی سے توبہ کر لی ہے اور یہاں اپنے بچوں کے ساتھ شریفانہ اور گمنامی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ ابھی تک پولیس کو مجھ پر شک نہیں ہوا۔ شاید میری فائل بھی داخل دفتر کر دی گئی ہو۔ میں سوئی ہوئی زندگی کو پھر سے نہیں جگانا چاہتا۔ ہاں اگر تمھاری زندگی خطرے میں ہوتی تو میں دریغ نہ کرتا لیکن میں تم سے یہی کہوں گا کہ دوسروں کی خاطر اپنے آپ کو خطرے میں

نہ ڈالو۔"

بادل نے کہا "امجد خان! نجمی اور ندیم میرے لیے غیر نہیں ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ دونوں مسلمان ہیں اور پاکستان سے ان کا تعلق ہے اور پاکستان کے لیے تو تم بھی ہمیشہ سے جذباتی رہے ہو۔"

امجد خان بولا "وہ تو میں اب بھی ہوں مگر ندیم جہاں قید ہے وہاں کوئی چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔ وہ جگہ سول پولیس کی انٹیلی جنس کے پاس ہے اور وہاں ملٹری انٹیلی جنس کی بھی نگرانی ہے اور دن رات پہرہ لگا ہوتا ہے۔"

بادل نے کہا "امجد خان! نجمی اور ندیم اب واپس پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہمارا فرض بنتا ہے کہ انھیں اس جہنم سے نکال کر پاکستان پہنچانے میں ان کی مدد کریں۔"

امجد خان خاموش تھا۔ بادل نے کہا "نجمی کی ایک سہیلی شبانہ بھی ہمارے پاس ہے۔ اس پر یہاں بھارت میں نجمی اور ندیم کی طرح بڑا ظلم ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان لوگوں کی بڑی ہمت ہے کہ وہ اب تک زندہ ہیں۔ نجمی نے تو خیر میرے ساتھ بندوق اٹھا لی تھی اور اپنے دشمنوں سے انتقام لے لیا ہے۔ لیکن ندیم پر اب بھی تشدد کیا جا رہا ہے۔ اگر ہم نے اسے انڈین پولیس کی قید سے نہ نکالا تو وہ وہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گا۔ یہ لوگ پاکستان کے شریف مسلمان گھرانوں کے فرد ہیں۔ ایک غلطی ان سے ہو گئی جس کی سزا یہ کافی بھگت چکے ہیں۔"

امجد خان نے سگریٹ کا کش لگایا۔ اوپر منہ کر کے دھواں چھوڑا اور بادل کی طرف دیکھے بغیر بولا "میں تمھارے لیے چائے لاتا ہوں۔ باقی باتیں بعد میں کریں گے۔ اتفاق سے میرے بچے کانپور گئے ہوئے ہیں۔ اس وقت میں گھر میں اکیلا ہی ہوں۔ مگر تمھارے لیے چائے ابھی بنا کر لے آؤں گا۔"

بادل نے کہا "چائے بعد میں پی لیں گے۔ سب سے پہلے تو میں نجمی کو بھیروں جی کے مندر سے یہاں لانا چاہتا ہوں۔ میں تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ تم گھر پر ہی ہو۔"

امجد خان ماچس کھڑکا کر جیب میں ڈالتے ہوئے بولا "میں چائے بناتا ہوں تم نجمی کو جا کر لے آؤ۔"

بادل اسی وقت بھیروں جی کے مندر کی طرف چل دیا۔ رات ڈھلنے لگی تھی مشرق کی طرف

ستاروں کا نیلا رنگ سفید پڑ رہا تھا۔ بھیروں جی کے مندر میں ابھی تک خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بادل نے نجمی کو جگا کر اپنے ساتھ لیا اور سیدھا امجد خان کے کوارٹر میں آ گیا۔ امجد خان چائے بنا کر لے آیا۔ اس نے نجمی کو سلام کیا اور کہا "جوگن کے بھیس میں دیکھ کر مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ کا نام سن کر بنگال اور بہار کی پولیس لرز جاتی ہے۔"

نجمی امجد خان کو اس سے پہلے مل چکی تھی اور دو ایک بار بادل کو ملنے ان کے ٹھکانے پر بھی آیا تھا وہ امجد خان کا بڑا احترام کرتی تھی۔ کیونکہ وہ ایک وفادار، با اعتبار اور بہادر انسان تھا۔ اس نے کہا "امجد بھائی یہ بھیس میں نے اس شخص کے لیے رچایا ہے جس کے ساتھ میں یہاں سے واپس پاکستان جانا چاہتی ہوں۔"

امجد خان چائے کے ساتھ رات کے بنائے ہوئے پراٹھے گرم کر کے لے آیا تھا۔ وہ چائے پیتے ہوئے آپس میں باتیں کرنے لگے۔ امجد خان ندیم کو پرانے قلعے والے کھنڈر سے نکالنے میں ان کی مدد کرنے پر تیار ہو گیا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اس نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا "چندا بہن!"

نجمی نے امجد خان کی بات کاٹتے ہوئے کہا "امجد بھائی! تم مجھے نجمی کہو۔ کیونکہ تم جانتے ہو چندا میرا اصلی نام نہیں ہے۔"

امجد خان نے بادل کی طرف دیکھا۔ دونوں ذرا سا مسکرائے۔ امجد نے پیالی تپائی پر رکھ دی اور جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکالتے ہوئے بولا "نجمی بہن! میں یہ کہہ رہا تھا کہ میری اطلاع کے مطابق ندیم کو اس بار جس کھنڈر کے تہہ خانے میں بند کیا گیا ہے وہاں باہر کا کوئی آدمی نہیں جا سکتا۔ انٹیلی جنس کے افسر بھی شناختی کارڈ کے بغیر نیچے نہیں جا سکتے۔"

بادل بولا "اس کے باوجود مجھے معلوم ہے کہ تمھارا دلی شہر کے جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ بڑا اثر و رسوخ ہے۔ یہ لوگ ہماری بڑی مدد کر سکتے ہیں۔ کوئی ایسا راستہ تلاش کرو کہ ہم میں سے کوئی ایک تہہ خانے تک جا سکے۔ اس کے آگے جو ہو گا ہم اسے سنبھال لیں گے۔"

امجد خان سگریٹ سلگا کر بولا "وہاں تک کسی باہر کے آدمی کا پہنچنا ہی تو مشکل ہے۔"

نجمی نے کہا "امجد بھائی! ندیم میرا منگیتر ہے میں اس کے ساتھ شادی کر کے پاکستان میں

آباد ہونا چاہتی ہوں۔ کیا تم اس لڑکی کی مدد نہیں کرو گے جسے تم نے بہن کہہ کر پکارا ہے؟"

امجد خان نے اپنی گردن اچانک اوپر اٹھائی۔ نجمی کے سر پہ ہاتھ رکھا اور جذبات سے کپکپاتی آواز میں بولا۔

"تمھیں بہن کہا ہے تو بھائی بن کر اپنا فرض نبھاؤں گا۔ تمھاری عزت اور تمھاری خوشی کی خاطر میں اپنی جان بھی قربان کر دوں گا۔"

نجمی اور بادل پر بھی رقت سی طاری ہو گئی۔ امجد خان نے سگریٹ پاؤں تلے مسل ڈالا اور صافے سے اپنی مونچھیں صاف کرتے ہوئے بولا۔

"تم لوگ میرے کوارٹر میں ہی رہو۔ میں دن نکلتا ہے تو اپنے ایک خاص آدمی کے پاس جا کر بات کرتا ہوں۔ خدا نے چاہا تو کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور نکل آئے گا۔ ویسے تم لوگ یہ جوگیوں والے کپڑے اب تبدیل کر لو۔ اس کی ضرورت نہیں ہے میں تمھیں دوسرے کپڑے لا کر دیتا ہوں۔"

جب دن نکل آیا تو امجد خان نجمی اور بادل کو اپنے کوارٹر میں ہی چھوڑ کر اپنے خاص دوست کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا جو شہر میں واقع تھا جاتے ہوئے وہ کوارٹر کو باہر سے تالا لگا گیا تھا اور اس نے نجمی اور بادل کو تاکید کر دی تھی کہ وہ اندر خاموش بیٹھے رہیں۔ بادل اور نجمی نے گیروے کپڑے اتار کر دوسرا لباس پہن لیا تھا۔ وہ دونوں بند کوٹھڑی میں بیٹھے امجد خان کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ دو گھنٹے کے بعد امجد خان واپس آیا۔ کوٹھڑی میں آتے ہی بولا۔

"ندیم کو پولیس آج دوپہر ایک بجے واپس کلکتے لے جا رہی ہے۔"

نجمی اور بادل امجد خان کا منہ تکنے لگے۔ امجد خان نے کہا۔

"یہ بڑی پکی اطلاع ہے جو میرے دوست نے مجھے دی ہے وہ وہیں پرانے قلعے میں ہوتا ہے اس نے بتایا ہے کہ ندیم کو خاص پولیس گارڈ کی حفاظت میں آج ایک بجے والی کلکتہ.... ایکسپریس میں لے جایا جا رہا ہے۔"

نجمی کچھ سوچ رہی تھی۔ بادل بھی دانتوں سے ناخن کاٹنے لگا۔ امجد خان بولا "اب بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ تم جیسے کہتے ہو میں ویسے ہی کر دوں گا۔"

بادل کہنے لگا "ندیم کے ساتھ پولیس کی کتنی نفری ہو گی؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔" امجد خان بولا۔ "لیکن ندیم خطرناک جاسوس ہے جیسا کہ یہاں کی پولیس سمجھتی ہے۔ دس بارہ آدمیوں سے کم ساتھ نہیں ہوں گے۔ اسلحہ بھی ان کے پاس کافی ہو گا۔"

نجمی نے پوچھا "ندیم کو ہتھکڑی بھی لگی ہو گی کیا؟"

"وہ تو ضرور لگی ہو گی۔" امجد خان نے جواب دیا۔

بادل کچھ بے چین سا ہو کر کہنے لگا

"یہی موقع ہے اگر ہم نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ندیم کو آزاد نہ کرایا تو پھر شاید وہ ہمیشہ کے لیے ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

یہاں امجد خان نے لقمہ دیتے ہوئے کہا "تمھارا اندازہ بالکل درست ہے بادل۔ مجھے میرے آدمی نے یہ بھی بتایا ہے کہ پولیس ندیم سے اپنے مطلب کی باتیں اگلوانے میں کامیاب نہیں ہو سکی اور کلکتہ اسے صرف اس لیے لے جایا جا رہا ہے کہ وہاں جیل میں اسے خفیہ طور پہ پھانسی دیدی جائے گی۔ پہلے ندیم کو پرانے قلعے میں ہی ہلاک کر دینے کا پروگرام تھا مگر دلی پولیس نے ندیم کے مسلمان ہونے کی وجہ سے کچھ ہچکچاہٹ کا اظہار کیا ہے۔ شاید اسے خطرہ تھا کہ بات یہاں کے مسلمان اخباروں تک پہنچ جائے گی۔ چنانچہ اب اسے بنگال میں لے جا کر پھانسی دیدی جائے اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہو گی۔"

نجمی تڑپ اٹھی۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے لباس میں چھپائے ہوئے ریوالور پہ چلا گیا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگی تھیں۔ دانت پیستے ہوئے بولی "میں ندیم کو پھانسی نہیں لگنے دوں گی۔ چاہے اس کے لیے مجھے ساری بنگال پولیس کو قتل کر دینا پڑے۔ چاہے اس کو قتل کرتے ہوئے میں خود ہی ختم ہو جاؤں۔"

بادل نے جلدی سے کہا "ایسا وقت نہیں آئے گا۔ ہم ندیم کو پولیس کے نرغے سے نکال لے جانے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔"

امجد خان بولا "یہی میں قیمتی مشورہ دینا چاہتا تھا۔ یوں سمجھ لو کہ یہ تم لوگوں کے لیے

آخری چانس ہے۔ اگر میری خدمت کی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ میں اپنی بہن کی خوشی کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار رہوں۔"

نجمی نے امجد خان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں امجد بھائی میں تمہارے گھر کے سکون کو برباد نہیں کرنا چاہتی۔ یہ کام ہم خود کر سکتے ہیں۔ تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے ہمیں ایک بڑی اہم خبر لا کر دی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی نجمی نے بادل کی طرف دیکھ کر کہا "ہم گارڈ پر حملہ کریں گے۔"

بادل کی آنکھیں ایسے چمک اٹھیں جیسے شیر نے جنگل میں اپنا شکار دیکھ لیا ہو۔ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ندیم کو پھانسی پر لٹکانے والا ابھی پیدا نہیں ہوا۔"

پھر وہ تینوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور تیزی سے مشورہ کرنے لگے کہ انھیں اپنے پروگرام پر کس طریقے سے عمل کرنا ہوگا۔ وقت بہت کم تھا۔ اس وقت دن کے نو بج رہے تھے۔ پورے ایک بجے کی کلکتہ ایکسپریس سے پولیس گارڈ نے ندیم کو لے کر کلکتے روانہ ہو جانا تھا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ بادل خفیہ ٹھکانے پر جا کر اپنے آدمیوں کو اپنی مدد کے لیے لا سکتا۔ ان دونوں کو ہی سب کچھ کرنا تھا۔ وہ امجد خان کی زندگی کو ایک بار پھر پولیس کے حوالے نہیں کرنا چاہتے تھے۔

نجمی نے کہا "اس سے پہلے کونسی ٹرین کلکتہ جاتی ہے؟"

امجد خان کہنے لگا "سیدھی کوئی ٹرین ایک بجے سے پہلے کلکتہ نہیں جاتی۔ دس بجے پٹنہ ایکسپریس چلتی ہے۔"

نجمی نے فوراً کہا "ٹھیک ہے۔ ہم دس بجے والی ٹرین میں پٹنہ کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ دھنباد کے اسٹیشن پر اتر کر ہم کلکتہ ایکسپریس کا انتظار کریں گے۔ وہاں سے کلکتہ ایکسپریس میں سوار ہو جائیں گے اور گوماہ اسٹیشن سے دو میل پہلے جنگل شروع ہوگا تب ہم ندیم کے ڈبے میں پہنچ کر اندھا دھند فائرنگ کر کے اسے چھڑا کر اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ گوماہ کے جنگل میں ہی ہمارا خفیہ ٹھکانا موجود ہے۔"

امجد خان بولا "مگر نجمی بہن! یہ بات بھول گئی ہو کہ کلکتہ ایکسپریس میل ٹرین ہے اور گیا کے اسٹیشن پر پٹنہ ایکسپریس روک دی جاتی ہے تاکہ کلکتہ ایکسپریس کو آگے نکل جانے کا موقع دیا جا سکے۔"

نجمی اور بادل ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ بادل نے سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا "نہیں نہیں۔ ہمیں یہ رسک نہیں لینا چاہیئے۔ ہم کلکتہ ایکسپریس میں ہی سوار ہو کر سفر کریں گے۔ ہم ندیم کے ساتھ والے ڈبے میں بیٹھنے کی کوشش کریں گے۔ اور پھر گوماہ کے جنگل میں گاڑی کے پہنچنے پر حملہ کر دیں گے۔ اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

امجد خان کہنے لگا "بادل خان! تمھیں بڑا سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سانپ بھی نہ مرے اور لاٹھی بھی ٹوٹ جائے۔"

اس پر نجمی نے جذباتی انداز میں کہا

"امجد بھائی! اب سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ حملہ کرنے کا وقت ہے۔ ہم حملہ کریں گے۔"

بادل کے ذہن میں اچانک ایک خیال چمک اٹھا۔ اس نے امجد خان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"امجد خان کیا دلی میں مجھے فوجی وردی مل جائے گی؟"

نجمی اور امجد خان بڑی تعجب خیز نظروں سے بادل کی طرف دیکھنے لگے کہ یہ فوجی وردی کا معاملہ بیچ میں اچانک کہاں سے آگیا؟ اس نے لٹکے ہوئے منہ سے پوچھا "فوجی وردی تمھیں کس لیے چاہیئے؟"

بادل ابھی تک اپنے خیال میں تھا کہنے لگا "تم مجھے یہ بتاؤ میرے دوست کہ یہاں سے کس جگہ سے انڈین کیپٹن کی فل وردی مل سکتی ہے؟"

نجمی نے پوچھا "تم انڈین کیپٹن کی وردی پہن کر کیا کرو گے؟"

بادل بولا "ایک اسکیم میرے ذہن میں آچکی ہے" پھر وہ امجد خان کی طرف متوجہ ہوا۔ "دوست! اگر تم مجھے کسی سے انڈین فوجی کیپٹن کی وردی لا دو تو میں ندیم کو پھانسی کے تختے سے اتار لاؤں گا۔"

پھر اس نے نجمی اور امجد خان کو اپنی پوری اسکیم سمجھائی۔ اسکیم اگرچہ خطرناک تھی لیکن اس میں امید کی کرن روشن تھی۔ امجد خان کہنے لگا "یہاں کے ایک بازار میں فوجی نشان، ٹوپیاں اور جوتے اور بیلٹ وغیرہ مل جاتی ہیں مجھے یقین ہے کہ وردی بھی مل جائے گی۔"

بادل بولا "تو پھر ابھی جاؤ۔ ہمارے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔"

امجد خان اسی وقت نکل گیا۔ کوئی پون گھنٹے بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ کوٹھڑی میں آکر اس نے تھیلا کھولا تو اس میں کیپٹن کی پوری وردی تھی۔ بٹالین کے نشان اور کیپٹن کے تین پھول بھی تھے۔ ایک خاکی ٹوپی بھی تھی۔ امجد خان نے بتایا کہ اسے تین چار دکانوں پر تلاش کرنے کے بعد وردی پوری کرنی پڑی ہے۔ بادل نے اسی وقت وردی پہن لی۔ وردی اسے تقریباً فٹ ہی تھی۔ نجمی اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی "تم تو بالکل انڈین کیپٹن لگتے ہو۔"

بادل بولا "اب تم بھی جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہمارے پاس وقت زیادہ نہیں ہے۔"

نجمی کے لیے امجد خان نے کالا برقعہ پہلے ہی وہاں لا کر رکھ دیا تھا۔ یہ برقعہ امجد خان کی بیوی کا تھا۔ نجمی نے کالا برقعہ پہن لیا۔ امجد خان رکشا لے آیا۔ دن کے پورے بارہ بجے وہ امجد خان کے کوارٹر سے نکل کر رکشے میں سوار ہوئے اور دلی ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ اسٹیشن پر بادل پورا فوجی کیپٹن بنا نجمی کو ساتھ لیے فرسٹ کلاس ریفریشمنٹ روم میں آگیا۔ وہیں ایک بیرے کو بلا کر کہا "میں جلدی میں فوجی چالان بنوانا بھول گیا ہوں۔ تم یہ روپے لے جاؤ اور ہمیں پٹنہ تک کے دو فسٹ کلاس کے ٹکٹ لا دو۔ یہ بیس روپے تمہارا انعام ہے۔"

بیرا تھوڑی دیر میں ہی دو ٹکٹ لے آیا۔ کلکتہ ایکسپریس کے آنے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ نجمی کالے برقعے میں بادل کی نقلی بیوی کے روپ میں اس کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ بادل کا بھرا ہوا ریوالور اس کی بیلٹ کے ساتھ لگا تھا جبکہ نجمی نے اپنا ریوالور اپنی قمیض کے اندر چھپا رکھا تھا۔

بادل عین وقت پر پلیٹ فارم پر جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ ملٹری پولیس اسٹیشن پر موجود تھی اور اس کو چیک کیا جا سکتا تھا اور بادل کے پاس پے بک، شناختی کارڈ اور ٹریول آرڈر قسم کے کوئی کاغذات نہیں تھے۔ جب کلکتہ ایکسپریس پلیٹ فارم پر آکر رک گئی تو بادل فوجی کیپٹن بنا نجمی کو ساتھ لیے ریفریشمنٹ روم سے نکل کر ٹرین کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھا۔ نجمی کو اس نے کمپارٹمنٹ میں بٹھا دیا اور خود یہ دیکھنے کے لیے کہ ندیم کو کونسے ڈبے میں سوار کرایا جا رہا ہے پیچھے ہٹ کر ٹی اسٹال کے پاس کھڑا ہو گیا۔

اچانک ایک طرف سے دو ملٹری پولیس کے فوجی نمودار ہوئے۔ بادل محتاط ہو گیا۔ دونوں نوجیوں نے

بادل کو زور سے ایڑیاں جوڑ کر سیلوٹ مارا اور آگے نکل گئے۔ بادل نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بلا ٹل گئی تھی۔ اس کی آنکھیں ٹرین کے ایک ایک ڈبے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ پولیس کی گارڈ ابھی تک ندیم کو لے کر وہاں نہیں آئی تھی۔

بادل بے چین سا ہونے لگا۔ کہیں دلی پولیس نے ندیم کو لے جانے کا پروگرام منسوخ تو نہیں کر دیا۔ ایسی صورت میں ساری اسکیم کے فیل ہو جانے کا خطرہ تھا۔ بادل ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے گیٹ میں سے پولیس کے کچھ سپاہی اندر آتے نظر آئے۔ انھوں نے رائفلیں کاندھوں سے لٹکا رکھی تھیں۔ ایک سکھ سب انسپکٹر ان کے ساتھ تھا۔ ان کے درمیان ندیم اس حالت میں سر جھکائے چل رہا تھا کہ اس کے ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ ندیم اور بادل کی ملاقات پہاڑی والی کمین گاہ میں ایک بار ہو چکی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کی شکل سے آشنا تھے مگر بادل ابھی ندیم کو اپنا چہرہ نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ اسے دیکھ کر بادل کی جان میں جان آگئی۔ اب وہ اپنے منصوبے پر ہر قسم کا خطرہ مول لے کر عمل کر سکتا تھا۔

ندیم کو پولیس کی گارڈ اپنے ساتھ لے کر ایک ڈبے میں داخل ہو گئی۔ اس ڈبے کے باہر "پولیس" لکھا تھا۔ اس کی ہر کھڑکی پر لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ بادل نے دیکھا کہ یہ ڈبہ [illegible] فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ سے تین ڈبے چھوڑ کر پیچھے تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا اپنے ڈبے میں آگیا ڈبے میں ایک لالہ اور اس کی بیوی بھی سوار تھی۔ ایک فوجی کو اندر آتا دیکھ کر ہندو لالے نے ہاتھ جوڑ کر مسکراتے ہوئے نمسکار کہا۔ بادل نے سر ہلا کر اس کے نمسکار کا جواب دیا اور نجمی کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ نجمی نے نقاب ڈال رکھا تھا اور کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

بادل نے بھی باہر دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا "پولیس اسے لے آئی ہے۔ ہم سے تین ڈبے چھوڑ کر پیچھے ہے۔"

سارے منصوبے کی ایک ایک تفصیل طے تھی۔ کہاں کس نے کیا کرنا ہے۔ پہلے سے طے کر لیا گیا تھا۔ تمام اسٹیشنوں کے نام بادل اور نجمی نے ازبر کر لیے تھے۔ آخر انجن نے وسل دی۔ گارڈ نے سیٹی بجائی اور پھر کلکتہ ایکسپریس چھک چھک کرتی پلیٹ فارم پیچھے چھوڑتی چلی گئی۔ اس ٹرین کو ہاپڑ، مراد آباد، بریلی اور شاہجہان پور سے ہوتے ہوئے لکھنؤ اور پھر وہاں سے کانپور،

الٰہ آباد، بنارس، پٹنہ سے ہوتے ہوئے گیا اور آگے دھنباد، درگاپور، بردوان اور کلکتے پہنچنا تھا۔ بادل اور نجمی کو اپنا آپریشن دھنباد ریلوے اسٹیشن پر شروع کرنا تھا۔ کیونکہ اس اسٹیشن سے تھوڑی دور آگے گوماہ کا چھوٹا دیہاتی اسٹیشن تھا جہاں کلکتہ ایکسپریس نہیں ٹھہرتی تھی اور نجمی اور بادل کی خفیہ کمین گاہ کو گوماہ اسٹیشن سے راستہ ایک جنگل سے ہو کر جاتا تھا۔ یہ ایک دن اور ایک رات کا سفر تھا۔ دن کے ایک بجے ٹرین دلّی سے چلی۔

وہ دن گزر گیا۔ پھر رات آئی۔ رات بھی گزر گئی۔

دوسرے دن دوپہر کے بعد ٹرین بہار کے مشہور مذہبی شہر گیا پہنچی۔ اسی شہر میں وہ مقدس درخت تھا جس کے نیچے مہاتما گوتم بدھ کو گیان حاصل ہوا تھا۔ اب اگلا بڑا اسٹیشن دھنباد کا تھا۔ بادل نے نجمی کو ہوشیار کر دیا۔ دونوں نے باری باری ٹائلٹ میں جا کر اپنے اپنے ریوالور کا میگزین چیک کیا۔ اس دوران بادل نے بے حد احتیاط سے کام لیا تھا۔ وہ تین چار مرتبہ راستے میں پلیٹ فارم پر اُترا ضرور تھا مگر جان بوجھ کر پولیس کے ڈبے کے آگے سے نہیں گزرا تھا۔ اس نے ہر بار دور ہی سے یہ دیکھ کر تسلی کر لی تھی کہ ندیم پولیس کے ڈبے میں موجود ہے۔

دھنباد کا اسٹیشن ابھی نہیں آیا تھا کہ شام کا اندھیرا چھانے لگا۔ کمپارٹمنٹ کی بتیاں جل اٹھیں۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین کی رفتار ہلکی ہونے لگی۔ بادل اٹھ کر کمپارٹمنٹ کی راہداری میں گیا۔ اس نے دیکھا کہ اسٹیشن دھنباد کی روشنیاں قریب آ رہی تھیں۔ ٹرین ریلوے یارڈ میں سے گزر رہی تھی۔ بادل خاموشی سے واپس آ کر نجمی کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کی طرف جھک کر آہستہ سے بولا "دھنباد آ رہا ہے۔"

ٹرین دھنباد کے اسٹیشن پر رک گئی۔ بادل نے نجمی کو سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ ٹرین کے رکنے کے بعد بادل کمپارٹمنٹ میں ہی بیٹھا رہا۔ یہاں ٹرین پندرہ منٹ رکتی تھی۔ پانچ منٹ بعد بادل ڈبے سے نکل کر پلیٹ فارم پر آ گیا اور سامنے ایک گارڈ کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہ تین ڈبے چھوڑ کر پیچھے پولیس کے ڈبے پر لگی تھی۔ پھر انجن نے وسل دی۔ گارڈ نے تیسری بار سیٹی بجائی تو ٹرین چل پڑی۔ بادل اپنی جگہ پر ہی کھڑا رہا۔ ٹرین کی رفتار ذرا تیز ہوئی تو وہ ٹرین کی طرف دوڑا۔ ٹرین کی رفتار تیز ہو چکی تھی۔ بادل پولیس کے ڈبے کے سامنے آ گیا۔ وہ ڈبے کی طرف

بڑھا۔ وہاں ایک سپاہی کھڑا تھا۔ ایک فوجی افسر کو سپاہی دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ بادل جلدی سے پولیس کے ڈبے میں گھس گیا اور بولا "مائی گارڈ! میں اسٹال پر چائے پی رہا تھا کہ ٹرین چل پڑی۔ آپ کا دھنواد دوستو!"

سکھ پولیس انسپکٹر نے مسکرا کر کہا "سر! یہاں بیٹھ جائیے۔ یہ بھی آپ کا ہی ڈبہ ہے۔"

بادل کی فوجی وردی نے سب کو مرعوب کر دیا تھا۔ اس نے ندیم کی طرف دیکھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ ندیم کے دل میں امید کی کرن جاگ اٹھی تھی۔

سکھ سب انسپکٹر نے بادل کو پھل پیش کرتے ہوئے کہا "سر! کلکتے جا رہے ہیں؟"

بادل نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے اپنی ٹانگیں پھیلا دیں اور کہا "جی ہاں۔ وہاں سے مجھے آسام جانا ہو گا۔ آج کل ہماری بٹالین وہاں ایکسرسائز کر رہی ہیں۔"

ٹرین نے رفتار پکڑ لی تھی۔ دھنباد کا اسٹیشن پیچھے رہ گیا تھا۔ اب گوماہ کا اسٹیشن زیادہ دور نہیں تھا۔ یہاں ٹرین نہیں رکتی تھی۔ بادل نے سارا حساب لگا رکھا تھا۔ پورے پانچ منٹ کے بعد اس نے ٹرین کی زنجیر کھینچ دینی تھی۔ اس نے پولیس گارڈ اور موقع کا پورا جائزہ لے لیا تھا۔ تین منٹ بعد وہ سیٹ پر سے اٹھ کر ڈبے کے دروازے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک منٹ بعد اس نے ٹوپی اتاری اور اسے جان بوجھ کر ٹرین سے باہر گرا دی۔ پھر خود ہی چلّا کر بولا "میری ٹوپی گر گئی ہے۔"

اور ساتھ ہی اس نے زنجیر کھینچ دی۔ سب انسپکٹر سکھ اور پولیس کے دوسرے سپاہی ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ بادل نے ریوالور تان لیا اور چلّا کر کہا "اگر کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلا تو میں گولی چلا دوں گا۔"

سکھ سب انسپکٹر کی موت آ چکی تھی۔ اس نے اپنے پستول والی پیٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ بادل نے فائر کر دیا۔ دوسرے لمحے سکھ سب انسپکٹر کی لاش خون میں لت پت اپنی سیٹ پر اوندھی پڑی تھی۔

ـــ ـــ ؞ ـــ ـــ

سکھ سب انسپکٹر کی موت کی دہشت ابھی کم نہیں ہوئی تھی کہ بادل نے اوپر سے فائر کر کے تین مزید بھارتی سپاہیوں کو موت کی نیند سُلا دیا۔ پستول تان کر ندیم کی ہتھکڑی کھلوائی۔ ایک رائفل اپنے کاندھے سے لٹکائی۔ ایک رائفل ندیم کی طرف اچھالی اور چلّا کر کہا۔

"میرے ساتھ نیچے چھلانگ لگا دو۔"

پولیس گارڈ کے باقی سپاہی دہشت زدہ ہو کر ڈبے کے کونے میں دبکے ہوئے تھے۔ بادل نے ان کی طرف ریوالور کی نالی کا رخ کیا اور گرجدار آواز میں کہا "اگر کوئی اپنی جگہ سے ہلا تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

پھر اس نے باقی کی ساری رائفلیں اٹھا کر ٹرین سے باہر پھینک دیں۔ ٹرین کی رفتار آہستہ ہو گئی تھی۔ وہ رکنے ہی والی تھی کہ بادل اور ندیم ڈبے سے باہر دوسری طرف کود گئے۔

جھاڑیوں میں گرتے ہی بادل اٹھا اور آگے کی طرف دوڑا۔ ندیم رائفل اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ بادل نے خوف طاری کرنے کے لیے رائفل کے دو فائر اوپر تلے داغ دیئے۔ وہ نجمی کے کمپارٹمنٹ کے پاس آ کر رک گیا۔ نجمی نے بھی ڈبے میں سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ اس نے برقعہ وہیں اتار کر پھینک دیا تھا۔

ندیم نے رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں بھی نجمی کو پہچان لیا۔ نجمی کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے ندیم کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"یہاں سے نکل چلو۔"

اور وہ تینوں جھاڑیوں والی ڈھلان پر سے دوڑتے ہوئے کھیتوں میں آ گئے اور پھر

کھیتوں میں بھاگتے گئے۔ انھیں معلوم تھا کہ انھیں کہاں جانا ہے۔ یہ کھیت کچھ دور تک جاتے تھے۔ پھر آگے گوماہ کا خطرناک جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ جہاں آدمی دن کے وقت بھی جاتے ہوئے گھبراتا تھا۔ وہ کھیتوں کے اندھیرے میں گم ہو چکے تھے۔ ٹرین پیچھے رک گئی تھی۔

جنگل میں داخل ہونے سے پہلے بادل، ندیم اور نجمی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دور کھیتوں کے پار رات کے اندھیرے میں کلکتہ ایکسپریس کی بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ پھر وہ جنگل میں داخل ہو گئے۔

بادل اور نجمی اس خطرناک جنگل کے چپے چپے سے واقف تھے۔ وہ رات کے اندھیرے میں بھی اپنی کمین گاہ تک پہنچ سکتے تھے۔ ندیم ان کے درمیان میں چل رہا تھا۔ وہ کچھ دور تک جنگل کی فائر لائن پر چلتے رہے پھر ایک باولی کے قریب سے ہوتے ہوئے ڈھلان سے اتر کر گھاٹی میں آ گئے۔ گھاٹی کو پار کر کے سامنے والی پہاڑی پر چڑھے۔ وہاں سے دوسری طرف اترے تو سال اور دیودار کا گھنا تاریک جنگل منہ پھاڑے سنسنا رہا تھا۔ نجمی نے ندیم کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم پھر ہمارے پاس آ گئے ہو۔ اس جنگل میں درندوں کا خطرہ ضرور ہے مگر ہمارے پاس اسلحہ موجود ہے۔ تم گھبراؤ گے تو نہیں۔"

ندیم بھی کافی سختیوں سے گزر چکا تھا۔ اس نے نجمی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہ نجمی کا وہ ہاتھ نہیں تھا جو کبھی لاہور میں ہوا کرتا تھا اب یہ ہاتھ کھردرا اور سخت ہو گیا تھا۔ اس نے نجمی کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"سب سے زیادہ خوشی تو مجھے ہو رہی ہے کہ تم میرے پاس ہو نجمی۔ اگر تمھارا ہاتھ ہاتھ میں ہو تو میں موت کی وادی میں سے بھی بے خوف و خطر گزر سکتا ہوں۔"

بادل دیودار کے اونچے درختوں کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "ہمیں سال بنی کی طرف نہیں جانا ہو گا۔ وہاں اس وقت شیر کے نکلنے کا خطرہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہمیں رائفل کا فائر کرنا پڑے۔"

نجمی اس کے قریب آ گئی تھی۔ کہنے لگی۔

"بائیں جانب گھاس پٹی کی طرف چلو۔ ادھر سے ہم کالی چٹانوں کی طرف نکل جائیں گے۔"

اور وہ سال بنی کے راستے سے ہٹ کر گھاس پٹی کی طرف چل پڑے۔ جنگل میں چاروں طرف

اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مگر اس اندھیرے میں بھی نجمی اور بادل کو راستہ نظر آ رہا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹہ وہ سال کے دیوقامت درختوں کے نیچے جنگلی جھاڑیوں کے درمیان چلتے رہے۔ پھر گھاس پٹی کا علاقہ شروع ہو گیا۔ یہ گھاس کا ایک غیر ہموار میدان تھا گھاس اتنی اونچی تھی کہ اس میں سے گزرتے وقت ان کی صرف گردنیں ہی باہر تھیں۔ بادل رائفل ہاتھ میں لیے آگے آگے چل رہا تھا۔ گھاس کے اس میدان کے بیچ میں جنگلی جانوروں کے چلنے پھرنے کی وجہ سے ایک قدرتی چھوٹی سی پگڈنڈی بن گئی تھی۔ یہ لوگ اس پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ گھاس کا یہ سمندر ختم ہوا تو چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ خطرناک سال بنی ان کی دائیں جانب کافی پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ سانس لینے کے لیے ایک جگہ بیٹھ گئے۔ دائیں جانب سال بنی کی طرف سے کسی شیر کی ہلکی سی دھاڑ سنائی دی۔ نجمی نے کہا۔

"جنگل کا بادشاہ اپنے شکار کی تلاش میں نکل آیا ہے۔"

بادل بولا "اس کا ایک فائدہ ہو گا کہ آگے ہمیں کوئی ریچھ یا دوسرا چھوٹا درندہ نہیں ملے گا۔ ہمیں اب آگے چلنا چاہیے۔"

وہ اٹھے اور ٹیلوں کے درمیان سے گزرنے لگے۔ اسی طرح چلتے چلتے آخر وہ کالی چٹانوں کے پاس آ گئے۔ یہ کالی چٹانیں رات کے اندھیرے میں اور زیادہ سیاہ لگ رہی تھیں۔ ان کو پیچھے چھوڑتے ہوئے بادل، ندیم اور نجمی آخر اس اونچی چٹان کی طرف بڑھے جس کے غار میں ان کی کمین گاہ تھی۔ وہ چٹان کے قریب پہنچے ہی تھے کہ دو آدمی درختوں پر سے کود کر ان کے سامنے آ گئے۔ نجمی نے کہا۔

"پیچھے ہٹ جاؤ۔"

یہ ان کے اپنے گروہ کے آدمی تھے جو کمین گاہ سے چند قدم دور جنگل میں پہرہ دے رہے تھے۔ اپنے سردار کی آواز سن کر دونوں ڈاکو پیچھے ہٹ گئے۔ انھوں نے بادل اور نجمی کو نمسکار کیا۔ کیونکہ اب نجمی کے گروہ میں بادل کے سوا دوسرا کوئی مسلمان نہیں تھا۔ سب ہندو جرائم پیشہ آدمی تھے۔ کمین گاہ میں شبانہ ان کا انتظار کر رہی تھی۔ لالٹین روشن تھی اور باہر ڈاکو آگ پر کھانا وغیرہ تیار کر رہے تھے۔ شبانہ آگے بڑھ کر نجمی سے گلے ملی۔ ندیم کو دیکھا تو اس کی

خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ ندیم نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ شبانہ سے ہاتھ ملایا۔

"شبانہ! تمھیں یہاں محفوظ دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم بھی یہاں ہو۔ نجمی نے مجھے بتایا تھا۔"

نجمی بادل کو لے کر دوسرے ڈاکوؤں کی طرف چلی گئی۔ شبانہ اور ندیم غار میں آ کر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ ندیم سخت تھک گیا تھا۔ شبانہ نے مٹی کے پیالے میں اسے پانی لا کر دیا۔ پانی پی کر ندیم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا "نجمی اب میرے ساتھ جانے پر تیار ہے"

شبانہ ندیم کے پاس ہی بیٹھ گئی اور بولی "اگر تیار نہ ہوتی تو تمھیں موت کے منہ سے نکال کر کس لیے لائی ہے۔ اب وہ یہاں نہیں رہنا چاہتی۔ اس نے مجھے بتا دیا ہے کہ وہ اپنے تمام دشمنوں کو ٹھکانے لگا چکی ہے اور اب وہ ہمارے ساتھ واپس پاکستان جانا چاہتی ہے۔"

ندیم نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ میں جس مشن کو لے کر آج سے کافی عرصہ پہلے لاہور سے چلا تھا، اور اس ملک میں آ کر انتہائی سنگین تشدد برداشت کرتا رہا ہوں، آج اس میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ میں نجمی کو واپس لے جانے کے لیے ہی یہاں آیا تھا۔ میرا مقصد بھارت کی جاسوسی کرنا نہیں تھا نجمی کی زندگی کی تباہی کا میں ہی ذمہ دار ہوں۔ میری وجہ سے نجمی اس ملک میں مصیبت اور بدنامی کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ میں اس کو لیے بغیر کیسے واپس اپنے وطن جا سکتا تھا۔ میں جب بھی نجمی سے ملا اس کو واپس چلنے کا کہا مگر وہ ہمیشہ یہی کہتی رہی کہ جب تک وہ اپنی عزت کے قاتلوں کو جہنم میں نہیں پہنچا دے گی میرے ساتھ واپس نہیں جائے گی۔"

شبانہ نے بیچ میں کہا "اور میں تمھاری وفاشعاری کی بھی داد دیتی ہوں کہ تم واپس جا سکتے تھے مگر نہیں گئے۔ اور قدم قدم پر گرفتار ہو کر دشمن کی ہولناک اذیتیں برداشت کرتے رہے۔"

ندیم بولا "شبانہ! تم سے ہماری کوئی بات نہیں چھپی ہوئی۔ تم جانتی ہو کہ میں نجمی سے کس قدر پیار کرتا ہوں۔ ہم لاہور یونیورسٹی کیمپس کے وہ دن کیسے بھلا سکتے ہیں جب ہم اکٹھے کیمپس کی کینٹین میں بیٹھ کر چائے پیا کرتے تھے۔ دنیا جہان کی باتیں کیا کرتے تھے۔ قہقہے لگایا کرتے تھے۔ پھر ہم سے ایک بھول ہو گئی۔ میں نے نجمی کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے شریف ماں باپ کے گھر کی دہلیز سے باہر

قدم نکالے اور میرے ساتھ کراچی بھاگ چلے۔ میری نیت نیک تھی۔ میں کراچی جاتے ہی نجمی سے نکاح کرنے کے فوراً بعد اگلے روز واپس لاہور آجانے والا تھا۔ مگر میرے نام نہاد دوست نے مجھ سے فریب کیا اور نجمی کی زندگی کا المناک باب شروع ہو گیا۔"

شبانہ نے کہا۔ "اب ہمیں ان باتوں کو بھول جانا چاہیئے۔ میں نے بھی کم تکلیفیں نہیں اٹھائیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہم تینوں ساتھی ایک بار پھر ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔ اگرچہ یہ دشمن کا ملک ہے اور ابھی ہماری منزل ہم سے کوسوں دور ہے لیکن مجھے اللہ کے فضل سے پوری امید ہے کہ جس نے ہمیں یہاں ملا دیا ہے وہ ہمیں پاکستان بھی پہنچا دے گا۔"

"انشاء اللہ،" ندیم کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

اتنے میں نجمی اور بادل اندر آگئے۔ بادل کے ہاتھ میں ایک کٹورا اور ایک چنگیر تھی۔ کٹورے میں ہرن کا پکا ہوا گوشت تھا اور چنگیر میں روٹیاں تھیں۔ نجمی نے ندیم اور شبانہ سے کہا۔ "تم لوگ کھانا کھا کر آرام کرو۔"

شبانہ نے نجمی سے کہا۔ "کیا وہ ان کے ساتھ کھانا نہیں کھائے گی۔"

جس پر نجمی نے رائفل کا بولٹ چڑھاتے ہوئے کہا۔ "مجھے کچھ دیر کے لیے پہرہ دینا ہوگا۔ پیچھے ہم ٹرین میں چار خون کر کے آرہے ہیں۔ پولیس ہو سکتا ہے ہماری تلاش میں ادھر نکل آئے۔ تم اطمینان سے سونا جب تک ہم زندہ ہیں تمھیں کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

یہ کہہ کر نجمی بادل کے ساتھ غار سے باہر نکل گئی۔ نجمی کا یہ روپ شبانہ اور ندیم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ انھیں لاہور کی دبلی پتلی نازک سی کالج کی لڑکی نجمی یاد آگئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کے دل میں ایک ہی خیال تھا۔ وہ کھانا کھانے لگے۔ نجمی اور بادل کمین گاہ سے باہر چٹانوں میں بنے ہوئے مورچے میں آکر بیٹھ گئے۔ دونوں کی رائفلوں کا رخ نیچے جنگل کے اندھیرے درختوں کی طرف تھا۔ وہاں ان کے دوسرے ساتھی پہرے پر موجود تھے۔ نجمی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"بادل! اب ہمیں یہاں سے نکل کر انڈیا کا بارڈر کراس کرنا ہے۔ تم جانتے ہو میں نے اپنا مقصد پورا کر لیا ہے مجھے اب یہاں نہیں رہنا۔ میں ندیم اور شبانہ کو لے کر واپس پاکستان

جانا چاہتی ہوں۔ تم مجھے مشورہ دو کہ ہمیں کس جگہ سے انڈیا کا بارڈر کراس کرنا چاہیئے۔"

بادل ایک لمحے کے لیے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ "بمبئی کی طرف سمندری راستے سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ راجستھان اور پنجاب کی سرحدوں پر انڈیا کی فوجیں ابھی تک بیٹھی ہیں میرا مشورہ تو یہی ہے کہ تم لوگ مدراس کی طرف سے بارڈر کراس کر کے سری لنکا چلے جاؤ۔ سری لنکا آزاد ملک ہے وہاں سے تم بڑی آسانی کے ساتھ پاکستان جا سکتے ہو۔"

نجمی کہنے لگی۔ "مدراس تک کا سفر بڑا لمبا سفر ہے۔ راستے میں جگہ جگہ ہمارے پکڑے جانے کا خطرہ رہے گا۔ دوسرے یہ بات بھی ہے کہ مدراس والوں کی ہم زبان نہیں جانتے۔ وہاں سمندر پار کر کے لنکا جانا ہوگا۔ جب تک وہاں کے اسمگلروں سے واقفیت نہ ہو ہم کچھ نہیں کر سکیں گے۔ یہ دشوار کام ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ ہمیں راجستھان کے علاقے سے بارڈر کراس کر کے پاکستان میں داخل ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے۔"

بادل بولا۔ "لیکن وہاں تو میری اطلاع کے مطابق جگہ جگہ بھارتی فوج کے مورچے ہیں۔ بارڈر سکیورٹی فورس ہوتی تو اسمگلروں سے بات چیت ہو سکتی تھی مگر ۱۹۷۱ء کی جنگ کو ختم ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے۔ دونوں طرف فوجیں سرحد پر موجود ہیں۔"

نجمی خاموش ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرف سے بارڈر کراس کر کے پاکستان جا سکتی ہے۔ نیپال کا بارڈر دور تھا۔ آخر اس نے کہا۔

"پنجاب سے ہم بارڈر کراس نہیں کر سکتے بادل خان۔"

بادل منہ نیچے کر کے اس طرح سگریٹ سلگا رہا تھا کہ ماچس کی روشنی دور سے نہ دیکھی جا سکے سگریٹ سلگانے کے بعد اس نے ہلکا سا کش لگایا اور بولا۔ "پنجاب کی سرحد پر بھی دونوں طرف فوج موجود ہے لیکن وہاں ایک سہولت ہے۔"

"وہ کیا؟" نجمی نے پوچھا۔

بادل بولا۔ "ضلع گورداس پور میں ایک سکھ ڈاکو میرا جگری یار ہے۔ وہ تمھیں بارڈر کراس کرانے میں بڑی مدد دے سکتا ہے۔ علاقے کے سارے سکھ اسمگلر اس کے فرمانبردار ہیں۔"

"یہ سکھ ڈاکو قابل اعتبار آدمی ہے۔" نجمی نے پوچھا۔ بادل نے مسکرا کر کہا۔ "اس کا نام

زنگو ڈکیٹ ہے۔ ہے تو وہ سکھ مگر مرد کا بچہ ہے اور شروع ہی سے مسلمانوں کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا رہا ہے۔ وہ ہندوؤں سے اس لیے ہی نفرت کرتا ہے کہ وہ بتوں کی پوجا کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو وہ بہت پسند کرتا ہے کیونکہ مسلمان ایک خدا کو مانتے ہیں اور بتوں کی پوجا نہیں کرتے بلکہ بتوں کو توڑ دیتے ہیں۔ کسی زمانے میں نجیب آباد اور بھوپال میں ہم اکٹھے ایک آرڈیننس فیکٹری میں مزدوری کیا کرتے تھے تب سے لے کر اب تک ہماری دوستی ویسی ہی گہری ہے۔ وہ بھوپال سے گورداس پور میں اپنے گاؤں چلا گیا۔ اس کا باپ بھرالہ گاؤں کی ٹھٹھی میں ہندو زمیندار کا نوکر تھا۔ زنگو ابھی ڈکیٹ نہیں بنا تھا۔ وہ اپنے باپ کے پاس ٹھٹھی میں ہی تھا کہ ایک روز اس کے سامنے گاؤں کے ہندو زمیندار نے زنگو کے باپ کی بے عزتی کر دی اور اسے پنچ اور کمینہ کہا اور پھر بہن کی گالی دے دی۔ زنگو سے برداشت نہ ہو سکا اس نے وہیں ہندو زمیندار کو نیچے گرا لیا اور چاقو سے اس کو ذبح کر ڈالا۔ زنگو فرار ہو گیا۔ اس کے بعد ہندو پولیس نے اس کے گھر والوں پر بے پناہ تشدد کیا۔ زنگو ڈاکو بن گیا اور اس نے تھانے کے سارے ہندو سپاہیوں کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا۔ سارے ضلع میں اس کی دہشت بیٹھ گئی۔ لوگ اس کا نام سن کر کانپ جاتے تھے۔ ابھی تم ہمارے گروہ میں نہیں آئی تھیں کہ ایک روز اتفاق سے بھوپال کے بازار حسن میں ایک بائی جی کے کوٹھے پر زنگو سے میری ملاقات ہو گئی۔ ہم ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے زنگو ڈاکو بھوپال میں ایک جگہ اپنے دوست کے پاس چھپا ہوا تھا۔ اس نے مجھے اپنے گروہ میں آنے کے لیے کہا مگر میں یہ علاقہ چھوڑ کر پنجاب نہیں جانا چاہتا تھا۔ کچھ میری اپنی مجبوریاں تھیں۔ لیکن کبھی کبھی ہماری ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ زنگو ڈکیٹ آج بھی ضلع گورداس پور اور ہوشیار پور کے درمیانی نیم پہاڑی علاقے میں رہتا ہے۔ مجھے اس کی خفیہ کمین گاہ کا علم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تم لوگوں کو بارڈر کراس کرانے میں کافی مدد دے سکتا ہے۔"

نجمی نے زنگو ڈاکو کے قصے کو بڑی دلچسپی سے سنا پھر کہنے لگی۔

"بادل! میرا خیال ہے ہمیں یہاں سے زنگو ڈکیٹ کے پاس ہی جانا چاہیئے۔ ویسے بھی پنجاب میں دریا بہتے ہیں اور وہاں سے سرحد پار کرنے کے بہت سے راستے ہمیں مل سکتے ہیں۔"

بادل نے جواب میں سگریٹ کا ہلکا سا کش لگا کر کہا "اگر تم تیار ہو تو ہم کل ہی یہاں سے پنجاب کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔"

دوسرے دن نجمی نے شبانہ کو اور ندیم کو پاس بٹھا کر بتا دیا کہ وہ پنجاب کے راستے بارڈر کراس کر کے پاکستان میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے اور آج اندھیرا ہوتے ہی اس جنگل والی کمین گاہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں گے۔ ندیم اور شبانہ بہت خوش ہوئے۔ ندیم نے شبانہ کو بتا دیا تھا کہ وہ پاکستان جا کر نجمی سے شادی کر لے گا۔ نجمی بھی یہی چاہتی تھی۔ ان کا ارادہ شادی کے بعد پاکستان کے خوبصورت علاقے ہنزہ یا بلتستان میں جا کر آباد ہونے کا تھا انھیں کوئی خاص تیاری تو کرنی نہیں تھی۔ نجمی نے بادل کے مشورے سے اپنے ہندو ڈاکو ساتھیوں کو یہی بتایا کہ وہ اپنے مہمانوں شبانہ اور ندیم کو کلکتے چھوڑنے جا رہے ہیں۔ نجمی نے بادل کو بھی اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی۔

"بادل! یہاں تمھارا کوئی مستقبل نہیں۔ تم ساری زندگی یہاں پولیس سے چھپتے پھرو گے اور جب بھی پکڑے گئے تمھارا مقدر پھانسی کا تختہ ہی ہوگا۔ میرے ساتھ پاکستان چلے چلو۔ وہاں تم کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر کے شریفانہ زندگی شروع کر دینا۔"

اس پر بادل نے مسکراتے ہوئے کہا تھا "نجمی بہن! میں شریف لوگوں سے بہت دور ہو گیا ہوں۔ اب ان میں واپس چلا بھی گیا تو اپنے آپ کو پردیسی محسوس کروں گا۔ تمھارے جانے کے بعد میں اپنے گروہ میں کچھ نئے آدمی بھرتی کروں گا۔ میں جانتا ہوں میرا انجام پھانسی کا تختہ یا پولیس کی گولی ہے۔"

نجمی بادل کے کردار اور اس کی دلیر شخصیت سے بیحد متاثر تھی۔ وہ جانتی تھی کہ پاکستان جانے کے بعد وہ اسے بہت یاد آئے گا۔ اس کے بعد نجمی نے بادل کو مجبور نہ کیا تھا۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ وہ جنگل اس قدر دشوار گزار تھا اور ان کی کمین گاہ ایسی جگہ پر تھی کہ وہاں پولیس کا پہنچنا ناممکن تھا۔ شبانہ، ندیم اور نجمی نے ساری تیاری کر لی تھی۔ نجمی کے حصے کا کچھ سونا اور روپیہ غار میں موجود تھا۔ نجمی نے اس میں سے روپے اپنے پاس رکھ لیے اور سونا بادل کو دے دیا۔ ایک ریوالور نجمی نے ندیم کو دے دیا ایک اپنے پاس رکھ لیا۔ ایک اسٹین گن بھی نجمی نے کچھ فالتو میگزین کے ساتھ

اپنے پاس رکھ لی۔ انھوں نے عام کپڑے پہن لیے تھے۔ نجمی شلوار قمیض میں ملبوس تھی۔ اوپر اس نے نسواری رنگ کی چادر اوڑھ لی تھی۔ شبانہ کا لباس بھی ایسا ہی تھا۔ ندیم نے کرتا پاجامہ پہن لیا تھا۔ ساتھ لے جانے کو ان کے پاس کوئی سامان وغیرہ نہیں تھا۔ وہ اندھیرا ہونے سے پہلے ہی اپنی خفیہ کمین گاہ سے نکل پڑے۔ جنگل کے ایک خاص مقام پر پہنچنے کے بعد وہ ایک جگہ چھپائی ہوئی جیپ میں سوار ہو گئے۔ آدھی رات تک وہ جنگل میں ہی سے گزرتے رہے۔ پچھلے پہر جنگل کا خطرناک علاقہ ختم ہو گیا۔ بادل نے جیپ ایک خفیہ جگہ پر چھپا دی۔ واپسی پر اسے یہیں سے جیپ کو واپس لے جانا تھا۔

بادل نے بھی دیہاتیوں والے کپڑے پہن لیے تھے۔ سر پہ پگڑی باندھ لی تھی جس سے وہ آسانی سے پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ ان کی پہلی منزل جالندھر تھی۔ جالندھر کی ایک بستی میں زنگوڈاکو کا ایک خاص آدمی رہتا تھا جس سے بادل نے زنگو ڈاکو کے موجودہ ٹھکانے کا پتہ معلوم کرنا تھا۔ ان کی منزل کافی دور تھی۔ راستے میں جگہ جگہ خطرہ تھا کہ کہیں وہ پکڑے نہ جائیں۔ شبانہ کے سوا باقی تینوں پولیس کو مطلوب تھے اور بڑے سنگین جرائم میں مطلوب تھے۔ نجمی اور ندیم کی تو تصویریں بھی اخباروں میں چھپ چکی تھیں۔ اس وقت ادرا ریلوے اسٹیشن کی طرف ان کا رخ تھا جو بنگال کے صوبے میں تھا۔ ادرا سے انھیں ریل میں بیٹھ کر گیا اور دھنباد جانے کی بجائے دوسری ریلوے لائن پر آسنول کی طرف جانا تھا۔ وہاں سے بھاگلپور سے ہوتے ہوئے انھیں مین لائن پر آ جانا تھا جو کلکتہ سے سیدھی امرتسر تک جاتی تھی یہ بڑا طویل سفر تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ لاریوں کے ذریعے اتنا لمبا سفر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ویسے بھی سڑک پر جگہ جگہ چیکنگ کا امکان تھا۔

صبح ہو رہی تھی کہ انھیں ادرا کے ریلوے اسٹیشن کی روشنیاں دکھائی دیں۔ اسٹیشن کے پاس ہی ایک چھوٹا سا تالاب تھا۔ تالاب کے ساتھ ایک چائے کی دکان تھی جو ابھی کھلی نہیں تھی۔ بادل نے نجمی، ندیم اور شبانہ کو تالاب سے کچھ دور ناریل اور تاڑ کے درختوں کے نیچے بٹھا دیا اور خود ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ کلکتے سے پٹنہ جاتے ہوئے ادرا نام کا یہ ریلوے اسٹیشن ایک جنکشن ہے جہاں سے ایک طرف کو آسنول، اعظم گڑھ اور سلی گڑھی اور دارجلنگ کی طرف ریل جاتی ہے۔ اور دوسری طرف جنوب میں روڈ کیلا اور آگے ناگپور کی

طرف ٹرین جاتی ہے۔ اسٹیشن پر مسافروں کی ریل پیل تھی۔ تھوڑی دیر میں سورج نکلنے والا تھا۔ بادل نے قلی سے پوچھا کہ بھاگلپور جانے والی گاڑی کب آئے گی۔ قلی نے بتایا کہ ایک گاڑی تو ابھی آدھے گھنٹے میں آنے والی ہے اور دوسری گاڑی دوپہر کے دو بجے آئے گی۔ بادل نے اسی وقت وایا بھاگلپور پٹنا اور بنارس سے آگے جالندھر تک کے چار ٹکٹ لے لیے ٹکٹ اس نے فرسٹ کلاس کے لیے تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ فرسٹ کلاس میں پولیس یونہی نہیں آ جایا کرتی۔ رات کے وقت تو ٹی ٹی کو بھی فرسٹ کلاس کا دروازہ کھٹکھٹانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ٹکٹ لیتے ہی بادل واپس ندیم، شبانہ اور نجمی کے پاس آ گیا۔ وہ ٹرین آنے کے بعد پلیٹ فارم پر جانا چاہتے تھے کیونکہ جنکشن ہونے کی وجہ سے ٹرین وہاں دس پندرہ منٹ تک رکتی تھی۔ آدھا گھنٹہ انھوں نے وہیں ناریل کے درختوں کے نیچے گزار دیا۔ جب ٹرین آ کر اسٹیشن میں داخل ہو گئی تو وہ اٹھے اور اسٹیشن کی طرف چلے۔ اسٹین گن کو چادر میں لپیٹ کر بادل نے اپنی بغل میں لٹکائے ہوئے تھیلے میں چھپا رکھا تھا شبانہ اور نجمی چادریں لپیٹے شریف گھرانوں کی مسلمان خواتین کی مانند بڑے سکون سے بادل اور ندیم کے ساتھ ساتھ چلتی پلیٹ فارم پر آ گئیں۔ ٹرین کھڑی تھی اس میں ڈاک اور پارسل وغیرہ لادے جا رہے تھے۔ مسافروں کا کافی رش تھا۔

فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ خالی پڑا تھا۔ بادل اور نجمی یہی چاہتے تھے۔ یہ چھ سیٹوں کا ڈبہ تھا۔ نجمی نے بادل سے کہا "ان دو سیٹوں کے بھی ٹکٹ لے کر سیٹیں ریزرو کروا لو اس طرح سے ہم زیادہ محفوظ ہو جائیں گے۔"

بادل کو یہ تجویز پسند آئی۔ وہ فوراً پلیٹ فارم سے نکل کر ٹکٹ آفس میں گیا اور اس ڈبے کی مزید دو نشستیں بھی مخصوص کروا کر ٹکٹ لے لیے۔ روپوں کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ بنگال کے ہندو ساہوکاروں کو انھوں نے لوٹ کر بہت سا روپیہ جمع کر رکھا تھا۔ یہاں مال مفت دل بے رحم والا معاملہ تھا۔ اب فرسٹ کلاس کا وہ پورے کا پورا کوپے ان کے پاس ہی تھا۔ بادل نے اسٹین گن چادر میں لپیٹے اسی طرح سیٹ کے نیچے چھپا دی۔ پندرہ منٹ رکنے کے بعد ٹرین چل پڑی۔ پٹنہ پہنچ کر بادل نے ناشتہ منگوا لیا۔ انھوں نے بڑے مزے سے ناشتہ کیا اور اپنے آئندہ سفر کے امکانی

خطرات پر آپس میں باتیں کرتے رہے۔ سارا دن ٹرین سفر کرتی رہی شام ہو رہی تھی کہ گاڑی الٰہ آباد پہنچی۔ شبانہ، ندیم اور نجمی اس دوران اپنے ڈبے میں ہی بند رہے۔ صرف بادل کسی خاص ضرورت کے وقت نیچے اترتا تھا۔ لکھنؤ پہنچ کر انھوں نے کھانا کھایا اور شبانہ اور نجمی سو گئیں۔ ندیم بھی کچھ دیر بادل کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد سو گیا۔

آدھی رات کو ٹرین بریلی پہنچی۔ وہاں سے چلی تو مراد آباد سے ہوتی ہوئی دوسرے روز دن کے آٹھ بجے دلی کے عظیم الشان جنکشن میں داخل ہو گئی۔ ابھی تک معاملہ پرسکون تھا۔ حالات معمول کے مطابق تھے۔ کسی ٹکٹ چیکر نے بھی ان کے ڈبے کا رخ نہیں کیا تھا۔ دلی پہنچ کر بادل ندیم اور نجمی محتاط ہو گئے۔ بادل اکیلا ڈبے سے باہر آکر ذرا سامنے ایک طرف اسٹال پر کھڑا ہو کر آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ یہ ڈبہ امرتسر تک جاتا تھا اس لیے اس کے کٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ریلوے پولیس کے سپاہی ادھر ادھر منڈلا رہے تھے۔ یہاں ملٹری پولیس کے آدمی بھی نظر آرہے تھے۔ ریلوے کے فراش فرسٹ کلاس ڈبے کی صفائی کے لیے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ بادل نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

”کیا بات ہے؟“

”سر! ڈبے کی صفائی کرنی ہے۔“

بادل نے کہا ”ٹھہرو۔“

بادل ڈبے میں داخل ہو کر بولا ”چادریں اوڑھ کر لیٹے رہو۔ صفائی کرنے والے آرہے ہیں۔“ ندیم، شبانہ اور نجمی اپنی اپنی نشستوں پر چادریں اوڑھ کر پڑ گئے۔ ریلوے کے ملازم بادل کے اشارے پر اندر آگئے۔ انھوں نے تھوڑی بہت صفائی کی اور سلام کر کے باہر نکل گئے۔ دلی ٹرین کافی دیر رکتی تھی یہاں ناشتہ بھی آتا تھا۔ بادل چوکس تھا۔ وہ برابر ڈبے کے باہر چند قدم کے فاصلے پر کھڑا پہرہ دے رہا تھا۔ ناشتے والا بیرا آیا تو وہ ایک بار پھر ڈبے میں چلا گیا۔ سب نے ڈبے کے اندر ہی ناشتہ کیا۔ خدا خدا کر کے گاڑی یہاں سے چلی۔ سب نے سکون کا سانس لیا۔ اسٹین گن اور ریوالور ابھی تک ان کے پاس محفوظ پڑے تھے۔ سارا دن ٹرین سفر کرتی رہی۔ شام کے وقت جالندھر شہر کے مضافات شروع ہو گئے۔ بادل نے نجمی سے کہا۔

”اب تک تو ہم محفوظ رہے ہیں مگر آگے ہمارا خطرناک سفر شروع ہونے والا ہے۔ ٹرین سے باہر نکلنے پر ہمیں کسی جگہ پر بھی چیک کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے ہمیں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوگی۔“

نجمی نے کہا ”کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم یہیں جالندھر میں کسی ہوٹل میں رات بسر کریں اور صبح تمھارے دوست کے گھر روانہ ہوں۔“

بادل نے مسکرا کر کہا ”تم بھول گئی ہو کہ میرے دوست زنگو ڈاکو کا ایک با اعتماد ساتھی جالندھر شہر کی ایک بستی میں رہتا ہے۔ ہم اس کے پاس جائیں گے۔ رات اسی کے پاس بسر ہوگی۔ وہی ہمیں بتائے گا کہ زنگو ڈاکو اس وقت کہاں ہوگا اور ہم اس سے کہاں مل سکیں گے۔“

نجمی چپ ہو گئی۔ ندیم کہنے لگا ”پنجاب پولیس سے ہمیں بے حد چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔ یہاں میں ایک بار پکڑا بھی گیا ہوں۔“

بادل کھڑکی کے شیشے میں سے باہر دیکھ رہا تھا۔ غروب ہوتی شام کے اندھیرے میں جالندھر شہر کی اضافی آبادیوں کی روشنیاں شروع ہو گئی تھیں۔ بادل نے چہرہ پیچھے کر لیا اور بولا ”آپ لوگ سب میرے پیچھے پیچھے اسٹیشن سے باہر نکلیں گے۔“

اس نے نجمی اور شبانہ کو ہدایت کی کہ وہ چادروں سے سر اور تھوڑا تھوڑا چہرہ ڈھانپے رکھیں۔ ندیم کے سر پر بھی بادل نے ایک صافہ بندھوا دیا تھا تاکہ وہ آسانی سے شناخت نہ کیا جا سکے۔ ٹرین پلیٹ فارم پر رک گئی۔ سامان تو ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ بادل سب سے پہلے باہر نکلا۔ اس کے پیچھے ندیم، پھر شبانہ اور نجمی باہر آگئے۔ اسٹین گن بادل نے اپنے جھولے میں ڈال رکھی تھی گیٹ پر ایک سکھ ٹکٹ چیکر کھڑا تھا۔ فرسٹ کلاس کے ٹکٹ نے سکھ ٹکٹ چیکر پر بھی اثر ڈال دیا تھا۔ اس نے جلدی سے ٹکٹ لے کر انھیں جانے کی اجازت دیدی۔ بادل، ندیم، شبانہ اور نجمی چپکے سے چلتے ہوئے اسٹیشن سے باہر آگئے۔ اسٹیشن کی ایک جانب ٹاہلیوں کے نیچے تانگے کھڑے تھے۔ وہاں خالی ٹیکسیاں اور رکشے بھی تھے مگر بادل نے سب کو ایک خالی تانگے میں بٹھایا۔ خود آگے سکھ کوچوان کے ساتھ بیٹھ گیا اور اسے ایک خاص بستی کی طرف

چلنے کو کہا۔

تانگہ جالندھر کے بارونق بازاروں میں چل پڑا۔ دکانوں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ سکھ ہندو عورتیں اور مرد سائیکلوں، رکشوں پر اور پیدل چلے جارہے تھے۔ بازاروں میں کافی ہجوم تھا۔ تانگہ جالندھر شہر کے پرانے علاقے سے نکل کر ایک بستی کی طرف چل پڑا۔ یہ ایک مزدور بستی تھی جو کھاد کے ایک بہت بڑے کارخانے کے عقب میں بنائی گئی تھی۔ اس بستی میں چھوٹی چھوٹی کوٹھیاں بھی تھیں اور مزدوروں کے کوارٹر بھی تھے۔ زنگو ڈاکو کا ساتھی انہی کوارٹروں میں رہتا تھا۔ بادل پہلے بھی زنگو ڈاکو کے اس پرانے ساتھی اور مخبر سے مل چکا تھا۔ اس کا نام وریام سنگھ تھا۔ وہ بظاہر کارخانے میں مزدوری کرتا تھا لیکن حقیقت میں وہ زنگو ڈاکو کا مخبر تھا اور اسے شہر کی پولیس کے بارے میں پل پل کی خبر پہنچاتا تھا۔ وریام سنگھ کے کوارٹر سے کچھ ہی دور بادل نے تانگہ چھوڑ دیا اور شام کے جھٹپٹے میں وریام کے کوارٹر کی طرف بڑھا۔ وریام گھر پر ہی تھا۔ بادل خان کو دیکھتے ہی وریام نے پہچان لیا۔ اس کے ساتھ ایک مرد اور دو عورتوں کو دیکھا تو ایک طرف لے جاکر پوچھا "یہ کون ہیں؟"

بادل نے کہا "اپنے ہی آدمی ہیں۔ ہمیں آج رات تمہارے پاس رہنا ہے۔ تمہیں کوئی دقت تو نہیں ہوگی؟"

وریام سنگھ نے بادل کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "بادل جی! یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے اندر آجاؤ۔"

وریام سنگھ کی بیوی اور بچے بھی وہیں موجود تھے۔ انھوں نے نجمی، ندیم اور شبانہ کی بڑی خدمت کی۔ فوراً کھانا لگا دیا۔ منہ ہاتھ دھلایا۔ بادل نے وریام کو ساری بات بتادی اور کہا کہ وہ زنگو کی مدد سے انھیں بارڈر کراس کرانا چاہتا ہے۔ وریام نے بادل کو بتایا کہ زنگو ڈاکو اسے بیاس کنارے شمال کی طرف گاؤں رتنہ جھلانی کی رکھ میں ملے گا۔ آج کل وہ اسی رکھ میں ہے۔ رکھ درختوں کا وہ ذخیرہ ہوتا ہے جو کسی بھی دریا کے کنارے بنایا گیا ہو۔ رکھ ایک چھوٹا سا جنگل بھی ہوتا ہے لیکن اس میں درندے وغیرہ نہیں ہوتے۔ بادل نے کہا۔
"ہم منہ اندھیرے یہاں سے نکل جانا چاہتے ہیں۔"

وریام بولا "ٹھیک ہے میں خود تم لوگوں کو یہاں سے نکال دوں گا فکر نہ کرو۔ اب آرام سے سو جاؤ۔ صبح تمہیں جگا دوں گا۔"

رات انھوں نے وریام کے گھر میں آرام کیا۔ دوسرے دن منہ اندھیرے وریام نے انھیں جگا دیا۔ شبانہ، ندیم اور نجمی نے جلدی جلدی تیاری کی اور وریام کے ساتھ بستی سے نکل پڑیں۔ بادل وریام کے ساتھ ساتھ تھا۔ ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ منہ اندھیرے کا وقت تھا۔ وریام نے ایک خالی تانگہ لیا اور جالندھر سے امرتسر جانے والی سڑک کے پہلو میں چھوٹی کچی سڑک پر روانہ ہوگیا۔ جالندھر اسٹیشن سے آگے جو اسٹیشن آتا تھا۔ وہاں تانگہ چھوڑ دیا گیا۔

وریام بولا۔ یہاں سے تم پسنجر ٹرین پکڑ کر کرتارپور اتر جانا۔ کرتارپور سے ایک نہر جنڈیالہ بھالے کو جاتی ہے اس نہر کے چوتھے پل کی بائیں جانب ایک کچّا راستہ رتنہ جھلانی کی رکھ کو جاتا ہے۔ زنگو تمہیں اس رکھ میں ملے گا۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتا۔ معاف کر دینا۔"

بادل نے کہا "نہیں نہیں وریام۔ میں جانتا ہوں تم یہاں بہت مصروف ہوتے ہو۔ تم نے راستہ بتا دیا ہے ہم پہنچ جائیں گے۔"

وریام نے ہاتھ باندھ کر شبانہ، ندیم اور نجمی کو پرنام کیا اور اسی تانگے میں واپس چلا گیا جو وہاں سے چند قدم پیچھے درختوں کے نیچے کھڑا تھا۔ نجمی نے بادل سے پوچھا "کیا تم نے راستہ اچھی طرح سمجھ لیا ہے بادل؟"

ندیم اور شبانہ کے چہروں پر بھی یہی سوال تھا۔ بادل بولا "یہ سارا علاقہ میرا جانا پہچانا ہے تم لوگ فکر کیوں کرتے ہو۔ ہم انشاءاللہ رتنہ جھلانی پہنچ جائیں گے۔ صرف یہ دعا مانگتے رہو کہ کوئی پولیس یا سی آئی ڈی کا آدمی ہمارے پیچھے نہ لگ جائے۔"

ندیم کو خفیہ پولیس کا بڑا تجربہ تھا۔ دن کی روشنی پھیل گئی تھی۔ ندیم نے آس پاس نگاہیں دوڑائیں۔ اسے کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ بادل نے ان سب کو اپنے ساتھ لیا اور چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کی طرف چلا جو وہاں سے تھوڑے فاصلے پر ہی تھا اور جس کی عمارت اور سگنل درختوں کے پیچھے دکھائی دے رہے تھے۔ اسٹیشن پر وہ ایک طرف خالی بینچ پر بیٹھ گئے۔

شبانہ اور نجمی نے دیہاتی عورتوں کی طرح چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔

اسٹین گن بادل نے جالندھر میں وریام کے پاس ہی چھوڑ دی تھی۔ کیونکہ نجمی اور بادل کے خیال کے مطابق انھیں اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ انھوں نے ریوالور ضرور اپنے پاس ہی رکھے تھے۔

ایک قلی سے معلوم ہوا کہ پسنجر ٹرین دس بجے آئے گی۔ موسم گلابی تھا۔ دھوپ میں زیادہ گرمی نہیں تھی۔ بادل ایک دکان سے پھلکے اور دال بھاجی لے آیا۔ انھوں نے بینچ پر بیٹھ کر ہی کھانا کھایا اور ٹرین کا انتظار کرنے لگے۔ وہ صرف ایک دوسرے کو گاہے گاہے دیکھ لیتے تھے۔ ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہے تھے۔ بادل اور ندیم پلیٹ فارم کے فرش پر بینچ کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ جس وقت ٹرین کے آنے کا وقت ہوا تو پولیس کا ایک سکھ کانسٹیبل ان کے قریب آگیا اس نے بادل سے پوچھا "کہاں جاؤ گے بھئی تم لوگ؟ کہاں سے آئے ہو؟" بادل جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اگرچہ کافی عرصہ بھوپال نجیب آباد کے علاقے میں رہا تھا مگر پنجابی بڑی روانی سے بول لیتا تھا۔ کہنے لگا "سردار جی! یہ میری پتنی، یہ میری بہن اور یہ بھائی ہے میرا نام سندر داس ہے۔ میں کھاد فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔ اپنی ماتا جی سے ملنے کرتارپور جا رہا ہوں۔"

سکھ کانسٹیبل بادل کو گھور رہا تھا۔ کہنے لگا "تم مجھے ہندو نہیں لگتے۔ ذرا ادھر آ کر تلاشی تو دو۔"

نجمی کا ہاتھ چادر کے اندر اپنے ریوالور پر چلا گیا۔ ایک ریوالور ندیم نے بھی کپڑوں میں چھپا رکھا تھا۔ ایک بھرا ہوا ریوالور بادل کی قمیص کے اندر تھا۔ صورت حال ایک دم مخدوش ہو گئی تھی۔ ایک سیکنڈ میں سارا بھانڈا پھوٹنے والا تھا۔ بادل نے نجمی کی طرف دیکھا اور کہا "کملا جی تم یہیں بیٹھو میں سردار جی کو تلاشی دے دوں۔"

اور بادل سکھ کانسٹیبل کے ساتھ پیچھے درختوں کی طرف چل دیا۔

بادل نے ذہن میں فوری طور پر ایک اسکیم سوچ لی تھی۔

سکھ کانسٹیبل نے بادل کو کاندھے سے پکڑ رکھا تھا۔

جب وہ درختوں کی اوٹ میں آئے تو بادل نے اپنی سوچی ہوئی اسکیم پر عمل کرتے ہوئے فوراً ہاتھ باندھ لیے اور بولا۔

"شما کر دیں سردار جی! بات یہ ہے کہ میں مالیر کوٹلے کا رہنے والا مسلمان ہوں۔ یہ ساتھ میرا دوست ہے۔ دونوں عورتیں بھی مالیر کوٹلے کی مسلمان عورتیں ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے ہمارے ساتھ آئی ہیں۔ ہم قادیان جا رہے ہیں جہاں جا کر ہم شادی کر رہے ہیں۔ ہمارے ماں باپ ہماری شادی کے خلاف تھے اس لیے ہم وہاں جا رہے ہیں۔"

پھر جلدی سے اپنی صدری کی اندرونی جیب سے سو سو کے دو نوٹ نکال کر بادل نے سکھ کانسٹیبل کی مٹھی میں تھماتے ہوئے کہا۔

"آپ اپنا چائے پانی لے لیں جی۔ باقی میرے پاس تھوڑے سے پیسے ہی بچتے ہیں۔ آپ کی بڑی کرپا ہوگی۔"

سو سو کے دو نوٹ دیکھ کر سکھ کانسٹیبل نے اپنا ہاتھ بادل کے کاندھے سے ہٹا لیا۔ نوٹ اپنی پتلون کی جیب میں ڈالے اور بولا۔

"جاؤ چپکے سے جا کر بیٹھ جاؤ۔ کسی سے بات کی تو تم سب کو اندر کر دوں گا۔"

بادل نے سکھ کانسٹیبل کی داڑھی کو ہاتھ سے چھو کر کہا "فکر نہ کریں سردار جی! مجھے کیا ضرورت ہے کسی سے بات کرنے کی۔ آپ نے بڑی کرپا کی ہے۔ آپ کا دھنواد۔"

سکھ کانسٹیبل وہیں سے دوسری طرف چلا گیا اور بادل واپس نجمی وغیرہ کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہوئی ہے" نجمی نے آہستہ سے پوچھا۔ شبانہ اور ندیم بھی پریشان تھے۔

بادل نے اپنے سر پہ صافہ دوبارہ باندھتے ہوئے کہا "سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ دو سو روپے رشوت دیکر اس کا منہ بند کر دیا ہے۔ ٹرین آ رہی ہے پچھلے ڈبوں میں بیٹھنا ہو گا۔"

پسنجر ٹرین، چھک چھک کرتی اسٹیشن کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔ یہ لوگ ایک بڑی مصیبت سے بچ گئے تھے۔ معاملہ یہیں گڑبڑ ہونے والا تھا۔ اگر سکھ کانسٹیبل رشوت نہ لیتا اور انھیں تھانے لے جاتا تو سب کچھ چوپٹ ہو گیا تھا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر رک گئی۔ بادل، ندیم، شبانہ اور نجمی تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں گھس گئے۔ ٹرین میں کافی رش تھا۔ ٹرین چل پڑی۔ یہ ٹرین امرتسر جا رہی تھی۔ کرتارپور اسٹیشن پہ یہ لوگ اتر گئے۔ یہاں سے وہ پیدل ہی بڑی نہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ بادل ان راستوں سے واقف تھا۔ وہ ان کی راہنمائی کر رہا تھا۔ دھوپ میں حدت آنے لگی تھی۔ کھیتوں اور میدانوں سے گزرتے ہوئے وہ علی وال نام کی بڑی نہر پہ آ گئے۔

نہر کی دونوں جانب چوڑی کچی پٹڑی بنی ہوئی تھی۔ دونوں جانب ٹاہلیوں کے گھنے درخت تھے۔ یہ نہر وہاں سے چکر کھاتی ہوئی جنڈیالہ اور بٹالے کو نکل جاتی تھی۔ انھیں اس نہر کے چوتھے پل پر سے بائیں جانب رتہ جھلانی کی طرف نکل جانا تھا۔ ایک پل آ کر گزر گیا۔ پھر دوسرا اور تیسرا پل بھی گزر گیا اب چوتھا پل ڈیڑھ ایک میل کے فاصلے پہ نظر آ رہا تھا۔ بادل نے کہا "یہاں کچھ دیر آرام کر لیتے ہیں۔"

وہ کھانا وغیرہ ساتھ نہیں لائے تھے انھوں نے نہر کا پانی پیا اور تھوڑی دیر وہاں آرام کرنے وہاں بیٹھ گئے۔ ندیم کہنے لگا "اگر سکھ کانسٹیبل کو ذرا سا بھی شک پڑ جاتا کہ ہم کون ہیں تو معاملہ خراب ہو گیا تھا۔"

نجمی بولی "بادل نے بڑی حاضر دماغی سے کام لیا ہے۔ ورنہ میں ریوالور نکالنے ہی والی تھی"

بادل نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ ریوالور نکالنے کا موقع نہیں تھا۔ ریوالور تو میرے پاس بھی تھا۔ لیکن اگر میں گولی چلا دیتا تو پھر ہم سب کا گرفتار ہو جانا یقینی تھا۔ خدا نے ہمیں بہت بڑی مشکل سے نکال دیا۔"

کچھ دیر وہاں آرام کرنے کے بعد وہ لوگ اٹھے اور نہر کے کنارے کنارے درختوں کے نیچے

چوتھے پل کی طرف چل پڑے۔ چوتھا پل ریل کا پل تھا۔ اس کے اوپر سے ٹرین گزرتی تھی۔ یہ برانچ لائن تھی جو گورداسپور سے کپور تھلے کی طرف جاتی تھی۔ بادل نے پل پہ پہنچنے کے بعد بائیں جانب ایک کچی پگڈنڈی کو دیکھا اور بولا "یہی راستہ رتہ جھلانی کی رکھ کو جاتا ہے۔ وریام نے اس راستے کے بارے میں بتایا تھا۔"

نجمی، شبانہ اور ندیم اس کے پاس ہی کھڑے تھے۔ وہ نہر کی پٹڑی سے نیچے کچی پگڈنڈی پر آ گئے۔ کوئی دو میل چلنے کے بعد دائیں جانب انھیں ایک ویران میدان ملا۔ اس میدان کو پار کیا تو شور زدہ زمین آ گئی۔ اس کے آگے ایک جھلار تھی۔ جھلار کی دوسری طرف ٹاہلیوں کے ذخیرے کا ایک جنگل سا شروع ہو گیا تھا۔ نجمی نے اس کی طرف دیکھا اور بولی "یہی وہ رکھ ہے بادل جہاں تمھارا دوست زنگو ڈاکو رہتا ہے۔"

"ہاں" بادل نے کہا "ہمیں اب احتیاط کی ضرورت ہو گی کیونکہ زنگو کے آدمی رکھ میں ادھر ادھر ضرور پہرہ دے رہے ہوں گے۔ تم میں سے اب کوئی نہ بولے۔"

جھلار کا پل پار کرنے کے بعد یہ لوگ رکھ میں داخل ہو گئے۔ جہاں چھوٹی بڑی ٹاہلیوں کے درخت ایک دوسرے کے اتنے قریب اُگے ہوئے تھے کہ کئی جگہ تو آگے چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ زمین پر اونچی اونچی سوکھی گھاس بھی کثرت سے تھی۔ وہ رکھ میں تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ کسی نے رعب دار آواز میں پیچھے سے پکار کر کہا "کون ہو بھئی تم؟ کدھر جا رہے ہو؟"

بادل نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کچھ فاصلے پہ درخت کے پیچھے سے ایک اونچا لمبا آدمی نکل کر سامنے آ گیا۔ اس نے منڈاسا باندھ رکھا تھا جس سے اس کا آدھا چہرہ چھپ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں دونالی بندوق تھی۔ بادل نے ہاتھ سے نجمی شبانہ اور ندیم کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود ایک قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ اجنبی نے بندوق تان لی "وہیں کھڑے رہو اوئے۔ کون ہو تم؟"

بادل وہیں رک گیا اور بولا "میں بادل خان ہوں۔ زنگو کا دوست بادل خان۔ اس سے ملنے آیا ہوں۔ یہ میرے اپنے آدمی ہیں۔"

منڈاسے والے اجنبی کی سرخ آنکھیں بدستور بادل کو گھور رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے

وہ اپنی جگہ پر بندوق تانے ساکت کھڑا رہا۔ پھر بندوق کا اشارہ کیا اور بولا ”نیچے بیٹھ جاؤ۔ اپنی جگہ سے کوئی ہلا تو میں گولی چلا دوں گا۔“

بادل نے نجمی، شبانہ اور ندیم سے کہا ”بیٹھ جاؤ۔“

سب وہیں گھاس پر بیٹھ گئے۔ بادل نے سرگوشی میں کہا ”یہ نیا آدمی ہے۔ مجھے نہیں پہچانتا۔“

منڈاسے والے آدمی نے بندوق کی نال اوپر درخت کی طرف کی اور دھڑ سے فائر کر دیا۔ فائر سے جنگل گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی تین آدمی ایک طرف سے جھاڑیوں اور گھاس کو لتاڑتے ہوئے وہاں آن موجود ہوئے۔

ایک آدمی ان کے آگے آگے تھا۔ آتے ہی بولا ”کیا ہوا ہے اوئے؟ فائر کیوں کیا؟“

پہلے والا آدمی جس نے فائر کیا تھا بولا ”مجھے یہ پولیس کے بھیجے ہوئے آدمی لگتے ہیں پھوجے۔“

پھوجے نے بادل کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور خوش ہو کر بولا ”سلاماں لیکم خان جی! آپ کیسے آ گئے۔“

پھوجے نے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا ”اوے یہ بادل خان جی ہیں۔ ہمارے سردار جی کے جگری یار ہیں۔ آئیے خان جی سردار جی رکھ میں ہی ہیں۔ یہ بی بیاں کون ہیں؟“

بادل نے پھوجے سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا ”اپنی بہنیں ہی ہیں۔“

دوسرے ڈاکو واپس چلے گئے۔ پھوجا جو زنگو ڈاکو کا دست راست تھا بادل، ندیم، شبانہ اور نجمی کو لے کر درختوں میں آگے آگے چل پڑا۔ وہ بولتے ہی جا رہا تھا ”بڑے دنوں کے بعد آپ کا آنا ہوا خان جی! ادھر پولیس کا کیا حال ہے؟ یہاں تو کسی مائی کے لال کی ہمت نہیں کہ اس طرف رخ کرے۔ ابھی پرسوں ہم نے ایک جھڑپ میں چار پولیسیوں کو بھون ڈالا تھا۔“ اس ٹھکانے کا آپ کو کیسے پتہ چلا؟“

بادل نے کہا ”جالندھر میں وریام سے مل کر معلوم ہوا۔“

”وریام کیسا ہے؟“ پھوجے نے پوچھا ”بالکل ٹھیک ہے“ بادل نے جواب دیا۔

درختوں کے ذخیرے میں ایک تھوڑی سی کھلی جگہ آ گئی۔ یہاں درختوں میں ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی جس کو بڑی آسانی سے پھلانگ کر پار کیا جا سکتا تھا۔ ندی کی دوسری طرف درختوں میں ایک کٹیا سی بنی ہوئی تھی۔ باہر ایک بڑی سی چارپائی بچھی تھی۔ چارپائی پر کچھ ڈاکو بیٹھے تھے۔ بادل خان کو دیکھ کر وہ چارپائی سے نیچے اتر آئے۔

”رام رام خان جی،“ ان میں سے دو ایک نے بادل خان کو سلام کیا۔

”یہاں بیٹھئے۔ سردار جی ابھی آتے ہی ہوں گے۔“

بادل، شبانہ، ندیم اور نجمی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ شبانہ تو چلتے چلتے بے حد تھک گئی تھی۔ ڈاکو اس وقت ان کے لیے لسی کا گڑوا بھر کر لے آئے۔ سب نے لسی پی۔ اتنے میں ایک جانب درختوں میں ایک اونچا لمبا، بھاری بھرکم، بھری بھری داڑھی مونچھوں اور سرخ آنکھوں والا سکھ نمودار ہوا جس نے نیلے رنگ کی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ کرپان ایک جانب لٹک رہی تھی۔ کمر میں گولیوں سے بھری ہوئی پیٹی کے ساتھ پستول لگا تھا۔ وہ نسواری رنگ کے لمبے کرتے اور دھوتی میں ملبوس تھا۔ پاؤں میں چانتی جوتی تھی۔ یہ پنجاب کا مشہور ڈکیت زنگو تھا جس کا نام سن کر ہی لوگ سہم جاتے تھے۔ زنگو ڈاکو نے بادل خان کو دیکھا تو وہیں ٹھٹک گیا۔ چہرہ خوشی سے کھل گیا۔

وہیں بازو پھیلائے اور آگے بڑھتے ہوئے بولا ”میرا خان یار آیا اے۔“

دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ بادل نے زنگو سے ندیم، شبانہ اور نجمی کا تعارف کرایا اور بولا ”باقی سب باتیں تمھیں آرام سے بتاؤں گا۔ یہ بتاؤ کہ تم ٹھیک ٹھاک ہو۔“

زنگو مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا ”خان جی! اسیں تے انڈیا کی پولیس کے جوائی ہیں۔“

اور پھر دونوں قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ اسی وقت کہیں سے چارپائیاں لا کر وہاں بچھا دی گئیں۔ زنگو ڈاکو نے پھوجے کی طرف دیکھ کر کہا ”پھوجے! ہمارے مسلمان بھائی اور بہنیں آئی ہیں۔ ان کے لیے ساری مرغیاں تم حلال کرو گے۔“

پھوجے نے وہیں سے پوچھا ”سردار جی! بوتل بھی نکال لاؤں؟“

زنگو بولا ”نہیں پتر پھوجے۔ دیکھتا نہیں بہن جی آئی ہیں۔“

اسی وقت پھوجے نے چھ سات مرغیاں ذبح کر کے چڑھا دیں۔ بادل نے زنگو ڈاکو کو

ساتھ لیا اور کٹیا کی طرف آ کر چارپائی پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ پھر اس نے نجمی اور شبانہ اور ندیم کے بارے میں ساری بات کھول کر اسے بتا دی اور کہا "میں نے سارا معاملہ تمہارے سامنے رکھ دیا ہے رنگو! اب تم مجھے بتاؤ کہ اس سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہو۔ میں ان تینوں کو جتنی جلدی ہو سکے باڈر کراس کرا کر پاکستان پہنچا دینا چاہتا ہوں۔"

رنگو ڈاکو نے اپنی لال لال آنکھیں گھماتے ہوئے کہا "بادل خان! میرے بڑے سو بھاگ ہیں کہ میرے ڈیرے پر تم ایک بہادر عورت چندا کو لائے ہو جس کے نام سے بنگال پولیس آج بھی کانپ اٹھتی ہے۔ واہ گورو کی قسم ہے میرا تو یہ دل چاہتا ہے کہ چندا اور تم میرے ساتھ مل جاؤ۔ سارے ملک میں بس ہمارا ہی راج ہوگا۔"

بادل نے رنگو کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "رنگو! میرے یار! چندا کا کھیل اب ختم ہو چکا ہے اس نے جس کام کے لیے ڈاکو کا روپ دھارا تھا وہ پورا ہو گیا ہے۔ اب وہ پاکستان جا کر ندیم سے شادی کر کے شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔"

رنگو خاموش ہو گیا۔ اپنے بڑے سر کو ہلاتے ہوئے بولا "تم ٹھیک کہتے ہو خان جی! شریف عورت کے لیے تو ہم اپنی جان بھی قربان کر دیں اب بات یہ ہے میرے یار کہ جنگ کے بعد سرحدوں پر فوج آ کر بیٹھ گئی ہے بلکہ یہ کہو کہ جہاں جہاں فوج بیٹھی تھی وہاں سے ابھی اٹھ کر واپس بیرکوں میں نہیں گئی۔ اسمگلروں کا کام ٹھپ ہو گیا ہے۔ ان کا سرحدوں پر آنا جانا بالکل بند ہو گیا ہوا ہے۔ تمہیں کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔ اگر باڈر پر فوج نہ ہوتی تو یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ میں آج رات ہی انہیں پاکستان پہنچا دیتا۔"

بادل فکر مند سا ہو کر بولا "تمہارے اندازے کے مطابق ابھی فوج کب تک بیٹھی رہے گی۔"

رنگو ڈاکو نے اپنی پنڈلی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "کچھ نہیں کہا جا سکتا خان جی! ویسے میں کرتارے کو آج ہی بلا کر تمہارے سامنے اس سے بات کرتا ہوں۔ دیکھتا ہوں وہ کیا کہتا ہے۔"

کرتارا اس علاقے کا نامی گرامی اسمگلر تھا۔ وہ ایسے تمام خفیہ راستوں سے واقف تھا جو سرحد کے آر پار جاتے تھے۔ شام کو رنگو ڈاکو نے کرتارے اسمگلر کو بلا لیا۔ وہ چارپائی پر سر جوڑ کر بیٹھ

گئے۔ قریب ہی درخت کے ساتھ لالٹین جل رہی تھی۔ شبانہ، ندیم اور نجمی ندی کے پاس چارپائیوں پر بیٹھے اور نیم دراز آرام کر رہے تھے۔ کرتارا اسمگلر چارپائی کے پاس ہی زمین پر بیٹھا تھا۔ رنگو کی ساری بات سننے کے بعد کہنے لگا "سردار جی! آپ کا حکم ہم کبھی ٹال ہی نہیں سکتے۔ ویسے سرحد کے جو حالات ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں۔"

رنگو نے پوچھا "تمہارے خیال میں یہ حالات کب تک رہیں گے؟"

کرتارا صافے سے منہ صاف کرتے ہوئے بولا "کچھ کہا نہیں جا سکتا سردار جی! جنگ تو بند ہو چکی ہے مگر تناؤ بڑا ہے لگتا ہے کہیں پھر جنگ چھڑ نہ جائے۔ شاید اسی لیے دونوں طرف کی فوج اپنے مورچے نہیں چھوڑ رہی۔"

بادل خان نے کہا "دوسری کوئی ترکیب نکالو۔ کیا اتنے لمبے چوڑے باڈر پر کہیں بھی کوئی ایسی جگہ نہیں ہے کہ جہاں سے سرحد پار کی جا سکے۔ آخر ہر جگہ تو فوج کے مورچے نہیں ہوتے۔"

رنگو ڈاکو نے کرتارے کی طرف دیکھا۔ کرتارا ذرا ہنس کر بولا "خان جی! آپ باڈر سے واقف نہیں ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ سینکڑوں میل لمبی سرحد پر ہر جگہ فوج کے مورچے نہیں ہیں لیکن آپ یہ بات بھول گئے ہیں کہ دونوں طرف بارودی سرنگیں ابھی تک بچھی ہوئی ہیں۔ ایسی صورت میں خطرہ مول لینا تو اپنی جان ہی گنوانا ہے۔ راستے تو مجھے کئی آتے ہیں مگر سارے راستوں پر موت بیٹھی ہے آپ کچھ روز ٹھہر جائیں۔ ممکن ہے حالات جلدی ٹھیک ہو جائیں اور فوج بارکوں میں چلی جائے اور سیکورٹی فورس آ جائے پھر تو کوئی بات ہی نہیں ہو گی کیونکہ جانے سے پہلے فوج دونوں طرف کی بارودی سرنگیں صاف کر جائے گی۔ میں آپ کے مہمانوں کو راتوں رات باڈر کراس کرا دوں گا۔"

معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا۔ رنگو ڈاکو نے کہا "خان جی! تم میرے پاس ہی ٹھہر جاؤ۔ یہ بھی تمہارا اپنا ہی ڈیرہ ہے۔ پرسوں میں نے دریا پار ایک ساہوکار کے گھر ڈاکا ڈالنے جانا ہے۔ تم بھی میرے ساتھ چلنا۔"

بادل خان نے کہا "اب تو ٹھہرنا ہی پڑے گا رنگو یار... مگر میں پیچھے رہوں گا۔ تمہارے ساتھ دریا پار نہ جا سکوں گا۔"

رنگو ڈاکو قہقہہ لگا کر بولا "ارے نہیں خان جی! یہ بھی تمہارا ہی علاقہ ہے اسے صرف میرا

علاقہ ہی نہ سمجھو۔"

پھر اس نے کرتارے سے پوچھا "کل شام تک مجھے دریا پار والے ہندو ساہوکار کی ساری خبر لا کر دو کہ وہ حویلی میں کہاں سوتا ہے اور تجوری کونسی کوٹھڑی میں ہے۔ میرا خیال ہے لالہ تجوری کے آگے ہی سوتا ہوگا۔" اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

کرتارا بولا "میں ساری خبر لا کر دوں گا سردار جی! کل دوپہر کے بعد آؤں گا۔ اب میں جاؤں۔"

"ہاں جاؤ۔ مگر کرتارے میرے مہمانوں کو بارڈر کراس کرانے کی کوئی ترکیب ضرور سوچو۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

کرتارا ہاتھ باندھ کر بولا "سردار جی! آپ کیوں شرمندہ کرتے ہیں جی۔ آپ کے آدمی میرے آدمی ہیں جونہی کوئی ترکیب دماغ میں آئی میں فوراً حاضر ہو جاؤں گا۔"

کرتارا چلا گیا۔ بادل نے نجمی، شبانہ اور ندیم کو آ کر بتایا کہ ابھی انھیں کچھ روز زنگو ڈاکو کے ڈیرے پر ہی رہنا ہوگا۔ ان کے چہرے اتر گئے۔ وہ اب پاکستان واپس جانے کے لیے بے چین تھے۔ پاکستانی سرحد کے بالکل قریب بیٹھے تھے۔

نجمی نے پوچھا "کیا ہم کشمیر کی طرف سے بھی سرحد پار نہیں کر سکتے؟ ادھر تو پہاڑوں میں بہت سے راستے ہوتے ہیں۔"

بادل نے کہا "شاید ادھر سے سرحد پار کرنا زیادہ مشکل ہو کیونکہ وہاں ایسے ایسے دشوار گزار راستے ہیں کہ ہم بغیر کسی گائیڈ کے سرحد پار نہیں کر سکیں گے۔ اور کرتارے کو ان راستوں کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ویسے اس نے کہا ہے کہ وہ کوئی راستہ نکالے گا۔ یہاں کچھ دیر ٹھہرنے میں کوئی حرج نہیں۔ زنگو اپنا دوست ہے۔ یہاں تو ہم ایک طرح سے بالکل محفوظ بھی ہیں۔ کسی دوسری جگہ تو ہر وقت خطرہ لگا رہتا۔"

ندیم اور شبانہ خاموش تھے۔ شبانہ کو اب اپنے گھر کی اور بڑے بھائی کی یاد ستانے لگی تھی۔ اس کا خاوند تو ایک جابر آدمی تھا۔ شبانہ اسے کیا یاد کرتی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ جب وہ اس کے پاس امریکہ پہنچے گی تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ شبانہ کو ننانوے فیصد یقین تھا کہ اب وہ اسے اپنے ساتھ

نہیں رکھے گا اور طلاق دے دے گا۔ شبانہ نے بھی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر ایسی بات ہو گئی تو وہ طلاق لے کر لاہور آ جائے گی اور کسی کالج میں لیکچرار لگ جائے گی اور باقی ساری زندگی کتابوں میں بسر کر دے گی۔ اس نے بادل سے کہا "بھائی جان! آپ کے خیال میں ہمیں یہاں کتنے دن مزید رہنا ہوگا۔؟"

بادل گردن کو ایک طرف جھکاتے ہوئے بولا "کچھ نہیں کہا جا سکتا شبانہ بہن! ایک مہینہ بھی لگ سکتا ہے۔ پندرہ دنوں میں بھی فوج بارودی سرنگیں صاف کر کے واپس بارکوں میں جا سکتی ہے۔"

شبانہ ٹھنڈی آہ بھر کر چپ ہو گئی۔ نجمی نے بھی سر جھکا لیا تھا۔

ندیم کہنے لگا "یہاں بھی تو ہم زیادہ محفوظ نہیں ہیں۔ کسی وقت بھی پولیس پارٹی چھاپہ مار سکتی ہے۔"

بادل نے ہنس کر کہا "پولیس زنگو کے ڈیرے پر خودکشی کرنے کبھی نہیں آئے گی۔ میں جانتا ہوں۔ میں بھی یہاں تمہارے ساتھ ہی ہوں۔ تم دیکھ لوگے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

چاروناچار ان لوگوں کو زنگو ڈاکو کے ڈیرے پر ہی رکنا پڑ گیا تھا۔ وہاں سے واپس دلّی یا بہار کی طرف جانے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نجمی نے بادل سے ضرور کہا کہ اگر وہ واپس جانا چاہتا ہے تو چلا جائے۔

اس پر بادل بولا "نجمی بہن! میں آپ سب کو بارڈر کراس کرائے بغیر یہاں سے واپس نہیں جا سکتا۔ میں نے آپ کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

دوسرے دن رات کو زنگو ڈاکو دریا پار ہندو ساہوکار کے گھر ڈاکا ڈالنے چلا گیا۔ آدھے آدمی وہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ڈیرے پر باقی آدھے ڈاکو موجود تھے۔ اسی رات صبح صبح زنگو واپس آ گیا۔ وہ بہت سے زیور اور نقدی وہاں سے لوٹ کر لایا تھا۔ اس نے سونے کا ایک ہار شبانہ اور نجمی کو پیش کرنا چاہا مگر انھوں نے یہ کہہ کر ہار واپس کر دیئے کہ ان پر ان کا کوئی حق نہیں ہے۔ زنگو ڈاکو [illegible] اصرار نہ کیا۔

اس سے اگلے دن شام کے وقت اچانک کرتارا اسمگلر آ گیا۔ وہ زنگو ڈاکو کے پاس زمین

پر بیٹھ گیا اور بولا "سردار جی! آپ کے مہمانوں کے واسطے ایک خوشی کی خبر لایا ہوں۔"

رنگو نے بادل خان کو بھی بلا لیا۔ کرتارا کہنے لگا "میں نے بارڈر پر مورچہ بند ایک ہندو صوبیدار سے بات کر لی ہے۔ وہ دو ہزار روپے فی آدمی کے حساب سے بارڈر کراس کرانے پر راضی ہو گیا ہے۔"

بادل نے جلدی سے کہا "ہم اسے چار ہزار فی آدمی بھی دے دیں گے۔ مگر کہیں وہ دھوکہ تو نہیں دے گا۔"

رنگو نے بات کاٹتے ہوئے کہا "بادل! تم میرے مہمان ہو۔ جتنے پیسے لگیں گے میں دونگا یار میری توہین تو نہ کرو۔"

بادل خاموش ہو گیا۔ رنگو نے اب وہی سوال دہرایا جو بادل نے پوچھا "صوبیدار قابل اعتبار آدمی ہے کیا؟ کہیں وہ اپنی بات سے پھر تو نہیں جائے گا۔"

اس پر کرتارا بولا "سردار جی! کرتارا کچی گولیاں نہیں کھیلا کرتا۔ میں نے پوری طرح سے چھان بین کرنے کے بعد صوبیدار سے بات طے کی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس نے پہلے وہ دو دو ہزار روپے لے کر کچھ لوگوں کو بارڈر کراس کرا چکا ہے۔"

تب بادل نے کہا "لیکن وہ ہندو صوبیدار تو صرف انڈیا کا بارڈر ہی کراس کرائے گا۔ آگے پاکستانی فوج ہوگی۔ وہاں سے ہم کیسے نکلیں گے؟"

کرتارا بولا "خان جی! آپ کے بہن بھائی بھی پاکستانی ہیں۔ اصولی طور پر تو آپ کو چاہیئے کہ بارڈر کراس کرتے ہی اپنے آپ کو پاکستانی فوج کے حوالے کر دیں۔ اس وقت تو آپ کو ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ کیونکہ پاکستانی بارڈر ان حالات میں کراس کرنا ناممکن ہے۔"

رنگو نے بادل کی طرف متوجہ ہو کر کہا "میرے خیال میں بہن جی اور بھائی صاحب کو ایسا ہی کرنا چاہیئے کہ بارڈر کراس کرنے کے بعد خود کو پاکستانی فوج کے حوالے کر دیں۔ کم از کم یہ لوگ پاکستان میں تو پہنچ جائیں گے۔"

بادل بولا "یہ میں ان لوگوں سے بات کر کے ہی بتا سکتا ہوں۔"

کرتارا کہنے لگا "لیکن ہندو صوبیدار نے ایک شرط یہ لگائی ہے کہ وہ سب کو اکٹھے بارڈر

کراس نہیں کرا سکتا۔ بلکہ ایک ایک کر کے بارڈر پار پہنچائے گا۔ اس نے اس بات کی گارنٹی بھی دی ہے کہ جب تک آپ کا آدمی انڈیا کی زمین کے اندر ہوگا اس پر پیچھے سے گولی نہیں چلائی جائے گی۔ پاکستانی فوج گولی چلا دے تو اس کی وہ ذمہ داری نہیں لیتا۔"

رنگو بولا "خان جی! انھیں سمجھا دیں کہ پاکستانی مورچوں کے سامنے پہنچتے ہی ہاتھ اٹھا کر بول دیں کہ ہم پاکستانی ہیں۔ ہم اسمگلر نہیں ہیں۔"

بادل کہنے لگا "میں ابھی بات کر کے آتا ہوں۔"

کٹیا کے پیچھے شبانہ اور ندیم بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ انھیں امید تھی کہ کرتارا اسمگلر کوئی اچھی خبر ہی لے کر آیا ہوگا۔ بادل قریب آیا تو ندیم نے پوچھا "خان بھائی! کوئی خوشخبری لائے ہو نا؟"

"ہاں" بادل یہ کہہ کر ان کے قریب بیٹھ گیا۔

اس نے وہ ساری باتیں بتا دیں جو کرتارے نے اسے بتائی تھیں۔ سب سوچ میں پڑ گئے۔ موقع سنہری تھا مگر یہ خطرہ اپنی جگہ پر موجود تھا کہ اگر پاکستانی مورچوں سے ان پر فائرنگ شروع ہو گئی تو پھر کیا بنے گا؟ نجمی کہنے لگی۔

"پاکستانی مورچوں کے سامنے جاتے ہی ہم کلمہ شریف پڑھ کر ہاتھ اٹھا دیں گے۔ مسلمان کبھی کسی دوسرے مسلمان پر گولی نہیں چلاتا اور پھر عورتوں پر گولی چلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ کام ایک مسلمان سپاہی کبھی نہیں کرے گا۔ وہ ہمیں گرفتار ضرور کر لیں گے۔ گرفتار ہونے کے بعد معاملہ عدالت میں جائے گا جہاں ساری بات کھل جائے گی۔ مجھے پوری امید ہے کہ اس طرح ہمیں صرف غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کرنے کی سزا ہی ہوگی۔ کم از کم ہم اپنے پیارے وطن میں تو پہنچ جائیں گے۔"

بادل زمین پر سے گھاس کا تنکا اکھاڑتے ہوئے کہنے لگا "لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ ہمیں ایک ایک کر کے بارڈر کراس کرایا جائے گا۔ کیونکہ جس ہندو صوبیدار سے ہمارے آدمی نے معاملہ طے کیا ہے وہ پہلے ایک کو پھر اگلی رات دوسرے اور اس سے اگلی رات تیسرے کو بارڈر کراس کرائے گا۔"

اب تو شبانہ اور نجمی کو مزید حیرت ہوئی۔ شبانہ نے کہا "میں اکیلی سرحد پار کیسے کروں گی۔ مجھے تو کچھ معلوم نہیں کہ آگے کس طرف جانا ہوگا اور پاک فوج کے مورچے کہاں ہوں گے۔ کیا معلوم کوئی مجھ پر فائر کر دے۔ پھر رات کا وقت ہوگا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ہم سرحد پار ہی نہ کریں۔"

نجمی نے بادل سے پوچھا "کیا یہ شخص ہمیں دن کے وقت سرحد پار نہیں کرا سکتا؟"

بادل نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "دن کی روشنی میں آجکل بارڈر کراس نہیں ہو سکتا۔ پہلے بارڈر سیکورٹی تھی تو اور معاملہ تھا۔ یہ لوگ انڈین بارڈر سیکورٹی والوں سے ملے ہوئے ہیں۔ مگر اب معاملہ دوسرا ہے۔ اگر آپ لوگ پاکستان جانا چاہتے ہیں تو میرا خیال ہے کہ آپ کو ایک ایک کر کے ہی بارڈر سے پار جانا ہوگا اور آگے جا کر اپنے آپ کو پاک فوج کے حوالے کر دینا ہوگا اور پھر اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ جو بارڈر کراس کرواتے ہیں بڑے ذمہ دار لوگ ہوتے ہیں۔ یہ کم از کم آپ کو سرحد کی دوسری طرف ضرور لا کھڑا کر دیں گے۔"

ندیم کافی دیر سے خاموش تھا۔ جب نجمی نے اس کی رائے بھی مانگی، تو وہ کہنے لگا "میں سمجھتا ہوں کہ بادل کی رائے بالکل درست ہے۔ ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اس ملک بھارت میں رہ سکیں۔ یہاں ہم جس دن بھی پکڑے گئے ہمارا انجام پھانسی کا تختہ ہی ہوگا۔ میرے اور نجمی کے کھاتے میں کئی قتل ہیں شبانہ کو پھانسی نہ لگے تب بھی وہ ساری عمر یہاں کی جیلوں میں سڑتی رہے گی۔ ظاہر ہے اس پر بھی جاسوسی کا الزام ہی لگے گا۔"

ندیم ٹھیک کہہ رہا تھا۔ نجمی اور شبانہ کو یوں محسوس ہوتے لگا جیسے اگر انھوں نے اس سنہری موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر شاید دیر ہو جائے وقت گزر جائے اور ممکن ہے زنگو ڈاکو کے ڈیرے پر ہی چھاپا پڑ جائے اور وہ ساتھ ہی گرفتار ہو جائیں۔

نجمی نے کہا "تو پھر میری تجویز یہ ہے کہ سب سے پہلے ندیم بارڈر کراس کرے اس کے بعد شبانہ اور سب سے آخر میں میں بارڈر کراس کروں گی۔"

اس پر ایک نئی بحث شروع ہو گئی۔ ندیم کہہ رہا تھا کہ نجمی کو آخر میں نہیں جانا چاہیئے۔ شبانہ الگ پریشان تھی کہ میں اکیلی رات کے اندھیرے میں کیسے جاؤں گی۔ کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ

رہا تھا۔ بادل خاموش تھا۔ کافی بحث مباحثے کے بعد آخر وہی فیصلہ کیا گیا جس کا اظہار نجمی کر چکی تھی۔ یعنی سب سے پہلے ندیم اور اس کے بعد شبانہ بارڈر کراس کرے گی۔ زنگو ڈاکو اس فیصلے سے آگاہ کر دیا گیا۔ ساتھ ہی کرتارے اسمگلر کو بتا دیا گیا۔ بادل خان نے اسی وقت ندیم کو سرحد پار کرانے کی رقم کرتارے کو ادا کر دی۔

کرتارے نے کہا "کل اپنے آدمی کو تیار رکھنا میں آٹھ بجے رات کو پھر آؤں گا۔"

وہ رات اور اگلا دن نجمی، شبانہ اور ندیم نے ایک دوسرے کی معیت میں گزارا۔ نجمی بار بار ندیم کو ہدایت کر رہی تھی کہ وہ پاکستانی سرحد میں جانے کے بعد اپنے ہاتھ کھڑے کرنا نہ بھولے اور چیخ کر اعلان کر دے کہ میں مسلمان ہوں۔ پاکستانی ہوں۔ ندیم اسے تسلی دے رہا تھا کہ وہ فکر نہ کرے اور ساتھ ہی تاکید بھی کرتا جاتا تھا کہ وہ بھی احتیاط سے بارڈر کراس کرے۔ ندیم نے ایک بات خاص طور پر نجمی اور شبانہ کو بتا دی تھی کہ میں پاکستانی سرحد پر جاتے ہی پکڑا گیا تو انھیں بتا دوں گا کہ میرے بعد تم دونوں بھی بارڈر کراس کرنے والی ہو۔

"اسی طرح سے سرحد کراس کرتے ہوئے تم دونوں کو زیادہ خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔"

آخر دن گزر گیا۔ رات آ گئی۔ زنگو ڈاکو تے ان سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ وہ بھی بار بار ان کو تسلیاں دے رہا تھا۔ رات کے ٹھیک آٹھ بجے کرتارا اسمگلر وہاں پہنچ گیا۔ وہ جیپ ساتھ لے کر آیا تھا۔ ساتھ ایک ڈرائیور بھی تھا۔ اس نے آتے ہی کہا "اپنا بندہ لے کر میرے ساتھ چلو جی۔ ابھی ہمیں کافی دور جانا ہے۔"

ندیم نے باری باری سب سے ہاتھ ملایا۔ بادل اور زنگو ڈاکو کا شکریہ ادا کیا۔ پھر نجمی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا "اپنا خیال رکھنا میں تمھارا انتظار کروں گا۔"

نجمی کا دل ضرور اداس تھا مگر آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ آنسو نجمی کی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکے تھے۔ اس نے ندیم کا ہاتھ گرم جوشی سے دباتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "اللہ تمھارا نگہبان ہو۔"

ندیم نے شبانہ کو بھی حوصلے کے دو چار بول کہے اور کرتارے اسمگلر کے ساتھ جیپ میں سوار ہو گیا۔ شبانہ نے ندیم کو خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ وہ لاہور جا کر صرف اس کے بھائی کو بتا دے

کرنیبانہ زندہ ہے اور دو روز بعد بارڈر پر پہنچ جائے گی ۔ جیپ کچے راستے پر رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں بارڈر کی طرف روانہ ہو گئی ۔ ندیم پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا ۔ کرتارا اگلی سیٹ پر اپنے ساتھی سکھ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا ۔ وہ بالکل چپ تھا ۔ جیپ دو گھنٹے تک اس ویران علاقے میں دوڑتی رہی آگے ایک کھال آ گیا ۔ کھال پار کرنے کے بعد جیپ کو ایک طرف کیکر کے درخت کے نیچے روک دیا گیا ۔ کرتارے نے ندیم سے وہیں جیپ میں بیٹھے رہنے کو کہا اور خود اکیلا ہی چادر کی بکل مار کر اندھیرے میں آگے چلا گیا ۔ چاروں طرف اندھیرا اور خاموشی تھی ۔ آسمان تاروں سے بھرا ہوا تھا ۔ دور دور کسی جگہ سے بھی کوئی ٹمٹماتی ہوئی روشنی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی ۔ سکھ ڈرائیور جیپ کی اگلی سیٹ پر اور ندیم پچھلی سیٹ پر خاموش بیٹھا تھا ۔

دس پندرہ منٹ گزر گئے ۔ پھر اندھیرے میں ایک ہیولا نظر آیا ۔ یہ کرتارا تھا ۔ اس نے آتے ہی ڈرائیور سے کہا کہ وہ جیپ واپس لے جائے ۔ ندیم جیپ سے اتر آیا ۔ کرتارا اسے ایک طرف لے گیا اور بولا "یہاں سے خطرناک سرحدی علاقہ شروع ہوتا ہے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ۔ یہاں بارودی سرنگیں نہیں ہیں ۔ ہندو صوبیدار نے خاص طور پر مجھے یہ راستہ بتایا ہے ۔ میرے پیچھے پیچھے چلو آؤ خبردار ۔ ذرا سا کھانسنا بھی نہیں ۔ ایک فرلانگ پر ہماری بائیں جانب بھارتی فوج کے مورچے ہیں ۔"

چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا تھا ۔ ندیم خاموشی سے کرتارے کے پیچھے پیچھے چلنے لگا ۔ یہاں سوکھی جھاڑیاں جگہ جگہ اُگی ہوئی تھیں ۔ ستاروں کی دھیمی دھیمی روشنی کے غبار میں دونوں انسانی سائے پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے آگے بڑھ رہے تھے ۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد کرتارا رک کر اندھیرے میں ادھر اُدھر دیکھ لیتا تھا ۔ جھاڑیاں ختم ہو گئیں ۔ اب سامنے بنجر علاقہ تھا ۔ اندھیرے میں وہاں کوئی درخت یا جھاڑی نظر نہیں آ رہی تھی ۔ آگے ایک چھوٹا سا ٹبہ آ گیا ۔ ٹبہ کی ایک جانب کھال بہہ رہا تھا ۔ کرتارے نے ندیم کو کھال کے کنارے ٹبے کے پاس اشارہ سے بٹھا دیا اور خود جھک کر ٹبے کی دوسری جانب چلا گیا ۔ دو منٹ بعد واپس آیا تو اس کے پیچھے پیچھے ایک دوسرا انسانی سایہ بھی تھا چلا آ رہا تھا ۔ قریب آنے پر ستاروں کی پھیکی روشنی میں ندیم نے دیکھا کہ وہ ایک

فوجی تھا جس کے ہیلمٹ کی جالی میں درخت کی شاخیں لگی تھیں اس کے ہاتھ میں رائفل تھی ۔ اندھیرے میں اس کی زردی مائل آنکھیں چمک رہی تھیں ۔ دونوں وہیں بیٹھ گئے ۔ کرتارے نے آہستہ سے کہا ۔ "صوبیدار جی! یہ ہمارا آدمی ہے ۔"

صوبیدار نے بھی سرگوشی میں جواب دیا "اب تم جاؤ ۔ اسے میرے ساتھ کر دو ۔"

کرتارے نے ندیم کے کاندھے کو آہستہ سے دبایا اور اٹھ کر کھال کے کنارے کنارے واپس چل دیا ۔

صوبیدار نے ندیم سے کہا "میرے پیچھے چلے آؤ ۔"

ہندو صوبیدار ندیم کو لے کر کھال کے اندر اتر گیا ۔ یہ کھال ادھر اُدھر سے گھوم گھام کر ایک چھوٹی سی جھلار کے پاس نکل آیا ۔ صوبیدار نے ندیم کو ہاتھ سے باہر آنے کا اشارہ کیا ۔ باہر آ کر اس نے ندیم کو زمین پر بٹھا دیا اور اس کے کان کے پاس منہ لا کر سرگوشی میں بولا "وہ سامنے بائیں جانب پاکستانی فوج کے مورچے ہیں ۔ یہاں سے ادھر بھاگ جاؤ پیچھے سے تم پر گولی نہیں چلائی جائے گی ۔ آگے کی ذمہ داری تمہاری ہے چلو ۔ ڈبل لگاؤ ۔" ندیم کو آگے اور پیچھے دونوں جانب موت نظر آ رہی تھی ۔ اس کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا ۔ لیکن وہ آگے بڑھنے پر مجبور تھا ۔ ہندو صوبیدار نے اسے آگے دھکا دے دیا اور ندیم نے جھک کر سامنے کی جانب دوڑنا شروع کر دیا ۔ یہ دونوں سرحدوں کے درمیان غیر جانبدار علاقہ تھا ۔ اندھیرے میں ندیم بے تحاشا بھاگتا جا رہا تھا ۔ سامنے اونچی ڈھیریاں سی آ گئیں ۔ ندیم دوڑتا ہوا ان ڈھیریوں کے پاس پہنچا تو کسی نے چلا کر کہا "ہالٹ! کون ہے ۔"

ندیم نے بلند آواز میں کلمہ شریف پڑھا اور دونوں ہاتھ بلند کر دیئے ۔

⁂

دوسری رات کرتارے اسمگلر نے شبانہ کو بھی سرحد پار کرا دی۔

ان دونوں کو غیر قانونی طور پر سرحد پار کرنے کی کوشش میں پاکستانی حکام نے حراست میں لے لیا۔ ان کے ساتھ قانونی کارروائی ایک لازمی بات تھی ان دونوں کو ہم قانون کے حوالے کر کے نجمی اور بادل کی طرف چلتے ہیں۔ کرتارے نے زنگو ڈاکو، نجمی اور بادل کو بتا دیا تھا کہ ندیم اور شبانہ پاکستان پہنچ چکے ہیں اور پاکستانی حکام کی حراست میں ہیں۔ نجمی نے اطمینان کا سانس لیا کہ چاہے کسی طرح سے بھی سہی لیکن وہ دونوں پاکستان پہنچ گئے تھے اور ان کی زندگی اور عزت محفوظ ہو گئی تھی۔ زنگو ڈاکو نے کرتارے سے کہا "اب ہماری دوسری بی بی چندا کو بھی پاکستان پہنچانا ہے کرتارے!"

کرتارا بولا "میں حاضر ہوں سردار جی۔"

اس نے نجمی سے کہا "بہن جی! آپ آج کی رات آرام کر لیں واہگو رو کی کرپا سے کل رات کو آپ کو بھی سرحد پار کرا دوں گا۔"

سارا دن زنگو ڈاکو کے ڈیرے پر نجمی نے کچھ سو کر اور کچھ بادل سے باتیں کرتے گزار دیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ان کا بہت بڑا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ شبانہ اور ندیم پاکستان پہنچ چکے تھے یہ ایک بہت بڑا مسئلہ طے ہو گیا تھا اب کل رات وہ بھی بارڈر کراس کر کے پاکستان پہنچنے والی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ اسے بھی پاکستان کی سرحد میں داخل ہوتے ہی حراست میں لے لیا جائے گا۔ یہ اسے ندیم کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ اس کے باپ کا لاہور میں انتقال ہو چکا ہے اور سوتیلی ماں اپنے گاؤں جا چکی ہے اور لاہور کے پرانے مکان پر تالا پڑا ہے۔ نجمی کے کچھ

رشتے دار لاہور میں ضرور تھے لیکن ظاہر ہے وہ اس کی مدد کبھی نہیں کریں گے۔ بلکہ وہ تو نجمی کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیں گے۔ نجمی خود بھی ان سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا مشن اب یہی تھا کہ ندیم سے شادی کر کے ہنزہ یا کاغان وغیرہ کے علاقے میں چلی جائے اور ایک نئی اور شریفانہ زندگی کا آغاز کرے۔ اس کے ماضی کے ساتھ کچھ ایسے واقعات منسلک ہو گئے تھے کہ شہر میں اس کے رشتے دار اسے کبھی اطمینان سے زندگی بسر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ اسے یقین تھا کہ ندیم اور شبانہ اس کے لیے بھی کسی وکیل کا انتظام کر دیں گے اور بہت ممکن ہے کہ عدالت اس کی طویل اور المناک کہانی سن کر اسے بری کر دے۔

انہی خیالات میں گم نجمی کو پتہ بھی نہ چلا کہ شام ہو گئی ہے۔ اس نے بادل کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ بادل بھی ندیم اور شبانہ کے پاکستان پہنچ جانے پر خوش اور مطمئن تھا۔ کہنے لگا۔

"اب خدا کرے کہ تم بھی خیریت سے اپنے وطن پہنچ جاؤ۔"

نجمی نے کہا "بادل! پاکستان پہنچ کر تمہارے احسان ضرور یاد آئیں گے۔"

بادل بولا "نجمی بہن! یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ میں نے تو اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اس میں احسان والی بات نہیں ہے۔"

کھانا کھانے کے بعد وہ کٹیا کے سامنے چارپائی پر بیٹھے، زنگو ڈاکو کے پاس جا کر بیٹھ گئے زنگو کھانا کھا چکا تھا اور دو ڈاکو اس کے کاندھے دبا رہے تھے۔ دور درخت میں لالٹین جل رہی تھی جہاں کچھ گھوڑے کھڑے چارہ وغیرہ کھا رہے تھے۔ باقی ڈاکو رات کو سونے کے لیے ادھر ادھر زمین پر دریاں اور بانس کی چارپائیاں بچھا رہے تھے اتنے میں ایک آدمی درختوں کے اندھیرے میں سے نکل کر دوڑتا ہوا آیا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ آتے ہی بولا "سردار! کرتارا پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔"

زنگو ڈاکو نے حیرت سے پوچھا "پولیس مقابلہ؟ ارے پولیس یہاں کہاں سے آ گئی۔؟"

وہ آدمی جو زنگو ڈاکو کا خاص مخبر اور جاسوس تھا سانس درست کرتے ہوئے بیٹھ گیا اور بولا "سردار! پولیس رکھ میں داخل ہو گئی ہے۔ سب سے پہلے کرتارا ان کے سامنے آ گیا۔ کرتارے نے گولی چلانی چاہی تو سب انسپکٹر نے اسے گولی مار کر وہیں ڈھیر کر دیا۔"

زنگو ڈاکو یہ سن کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو آواز دی "تیاری کرواوئے۔ ہمارے سالے ہندو پولیس والے آگئے ہیں۔"

نجمی اور بادل بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ زنگو ڈاکو نے ان کی طرف دیکھ کر کہا "پریشان کیوں ہوتے ہو یار! جب تک زنگو زندہ ہے تم پر کوئی مائی کا لال ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔"

نجمی کو سب سے زیادہ دکھ اس بات کا ہوا تھا کہ جس شخص یعنی کرتارے نے اسے اگلی رات باڈر کراس کرانا تھا وہ مارا گیا تھا۔ فوری طور پر سرحد پار کرنے کی امید کی شمع گل ہو گئی تھی۔ زنگو ڈاکو کے ڈیرے میں ایک ہل چل سی پڑ گئی۔ ڈاکو ادھر ادھر دوڑ کر رائفلیں اور بندوقیں وغیرہ سنبھالنے لگے۔ زنگو ڈاکو نے ریوالور میں گولی ڈالتے ہوئے اپنے مخبر سے پوچھا "کتنی نفری ہے پولیس کی؟"

مخبر نے کہا "بڑی نفری ہے سردار جی!"

زنگو ڈاکو نے چلا کر پوچھا "اوئے بڑی کے بچے یہ بتا آدمی کتنے ہیں؟"

مخبر نے فوراً جواب دیا "ڈیڑھ دو سو سپاہی ہیں سردار جی! ان کے ساتھ اسلحے کی جیپیں بھی ہیں۔"

ایک لمحے کے لیے زنگو ڈاکو چپ سا ہو گیا "ڈیڑھ دو سو؟" اس نے کسی قدر تعجب سے کہا۔ پھر فوراً ہی نفرت انگیز قہقہہ لگا کر کہنے لگا "سوں گورو کی میں ایک ایک کو بھون کر رکھ دوں گا۔ آج ان میں سے ایک بھی زندہ واپس نہیں جائے گا۔"

مخبر اٹھ کر دوسری طرف چلا گیا زنگو نے بادل اور نجمی کی طرف دیکھ کر کہا "گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے یارو۔ ایسے چھاپے پڑتے ہی رہتے ہیں۔ تم کو بھی اس کا تجربہ ہو گا۔ میرے ساتھ آؤ۔"

تمام لالٹینیں فوراً بجھا دی گئیں۔ زنگو نے اپنے ساتھیوں میں اسلحہ بانٹ کر انھیں ذخیرے میں چاروں طرف پھیلا دیا اور خود نجمی اور بادل کو لے کر ذخیرے کے جنوب کی طرف بڑھا۔ ایک ایک رائفل نجمی اور بادل نے بھی تھام رکھی تھی۔ ڈیرے سے کچھ دور ایک چھوٹا سا ٹیبہ تھا جہاں ان لوگوں نے مورچہ بنا رکھا تھا۔ زنگو ڈاکو، نجمی اور بادل اس مورچے میں بیٹھ گئے۔ رائفلوں کا رخ سامنے درختوں کی جانب تھا۔ ایک پل کے لیے چاروں طرف گہری خاموشی چھا گئی۔ زنگو ڈاکو، نجمی اور بادل

کے درمیان میں مورچہ سنبھالے بیٹھا تھا۔ ان سب کی رائفلوں کا رخ بالکل سامنے تھا۔ زنگو نے آہستہ سے کہا "ان کو آنے دو سب میرے سالے ہیں۔ ایک ایک کو ختم کر دوں گا۔"

بادل نے دبی زبان میں کہا "زنگو یہاں کے حالات تم بہتر جانتے ہو لیکن میری رائے میں ہمیں آگے جا کر مورچے سنبھالنے چاہیئے تھے۔"

زنگو نے ہندو پولیس کو گالی دیتے ہوئے کہا "میں انھیں یہاں گھیر کر ماروں گا۔ میرے آدمی ان کے پیچھے سے آگے بڑھیں گے۔ تم دیکھتے جاؤ خان۔"

پھر نجمی کی طرف دیکھ کر بولا "بہن جی! معاف کرنا تمھیں پریشان ہونا پڑا۔ پر تم بھی تو دلیر بچی ہو۔"

اور زنگو ہنس دیا۔ نجمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک بات کا اسے ضرور احساس تھا کہ پولیس کی نفری زیادہ ہے اور مخبر کی اطلاع کے مطابق وہ اسلحے کا کافی اسٹاک لے کر آئی ہے۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ انھیں ذخیرے میں آگے جا کر پولیس پر حملہ کرنا چاہیئے تھا۔ مگر وہ مشورہ دینے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔ سب سے زیادہ غم نجمی کو اس بات کا تھا کہ اسے سرحد پار کرانے والا ہلاک ہو چکا تھا۔ اب انھیں نئے سرے سے منصوبہ بندی کرنی ہو گی۔ جنگل میں سناٹا تھا۔ اچانک ایک طرف سے فائر کی آواز گونجی۔ اس کے ساتھ ہی دھائیں دھائیں تین چار فائر ہوئے یہ تھری ناٹ تھری کے فائر تھے۔ جنگل گونج اٹھا۔ زنگو نے کہا "فائر پیچھے سے آیا ہے۔ میرے آدمی مقابلہ کر رہے ہیں۔"

بادل نے کہا "اس طرف سے بھی پولیس ضرور آگے بڑھ رہی ہو گی۔"

زنگو ڈاکو نے قہر بھری آواز میں کہا "میں ایک ایک کو بھون کر رکھ دوں گا۔" ابھی تک سامنے سے کوئی فائر نہیں آیا تھا۔ پیچھے کی جانب بھی خاموشی چھا گئی۔ یہ خاموشی بڑی ہولناک تھی، اس میں آنے والے طوفان کی بجلیاں چھپی ہوئی تھیں۔ پھر یہ خاموشی جیسے پھٹ گئی اور دائیں بائیں... فائرنگ شروع ہو گئی۔ فائرنگ مسلسل ہونے لگی تھی۔ کوئی پتہ نہیں تھا کہ پولیس کدھر سے فائر کر رہی ہے اور زنگو کے ساتھی کس طرف فائر کر رہے ہیں۔ فائرنگ ایک جگہ پہلے تو رکی رہی۔ پھر اس کی آواز پیچھے اور دائیں بائیں سے آگے بڑھنے لگی۔ زنگو ڈاکو کچھ بے چین سا دکھائی دیتا تھا۔ وہ

بار بار مورچے میں سے گردن نکال کر پیچھے دیکھ رہا تھا "کتے! پیچھے سے آرہے ہیں میرے آدمی ان سب کو ڈھیر کر دیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی سامنے سے بھی فائر کھول دیئے گئے۔ پولیس ذخیرے کے اس جنگل کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے کر مسلسل فائرنگ کرتی آگے بڑھ رہی تھی۔ زنگو ڈاکو نے اونچی آواز میں للکار کر کہا "بھون کر رکھ دوں گا سو گورو دی۔"

اور ساتھ ہی اس نے دھڑا دھڑ فائرنگ شروع کر دی۔ نجمی اور بادل بھی فائر کرنے لگے۔ گولیاں سامنے اندھیرے میں درختوں سے ٹکرا ٹکرا کر گر رہی تھیں۔ ابھی تک کسی انسان کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ پولیس بڑے نظم و ضبط کے ساتھ برابر آگے بڑھ رہی تھی۔ فائرنگ کی آواز قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ پولیس آگے بڑھ رہی ہے۔ زنگو ڈاکو کا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔ نجمی اور بادل نے محسوس کیا کہ زنگو ڈاکو کی منصوبہ بندی ناقص تھی اور وہ چاروں طرف سے پولیس میں گھر گئے ہیں۔ تڑا تڑ فائر ہو رہے تھے۔ سارا جنگل گونج رہا تھا۔ اب گولیاں نجمی، بادل اور زنگو کے سروں کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ بادل نے کہا "زنگو ہمیں بائیں جانب آگے جا کر مورچہ سنبھالنا چاہیئے۔ اس طرح ہم پولیس کے پیچھے نکل آئیں گے۔"

مگر زنگو ڈاکو کو کوئی ہوش نہیں تھا۔ وہ للکار رہا تھا۔ بھڑکیں مار رہا تھا اور میگزین چڑھا چڑھا کر دھڑا دھڑ بیکار فائر کر رہا تھا۔ اچانک ایک گولی سامنے سے آکر اس کے ماتھے میں لگی وہ پیچھے کو گرا۔ اس کا چہرہ خون آلود ہو گیا۔ تھری ناٹ تھری کی گولی نے اس کی آدھی کھوپڑی اڑا دی تھی۔ نجمی نے اوپر تلے تین فائر کیے اور بادل سے کہا "یہاں سے بائیں طرف نکل چلو بادل۔"

بادل نے بھی اندازہ لگا لیا تھا کہ بائیں جانب سے فائر نہیں آرہا تھا۔ وہاں ایک خالی شگاف تھا۔ گولیاں چاروں طرف چل رہی تھیں۔ بادل مورچے میں سے کھسک کر پیچھے ڈھلان پر آگیا۔ نجمی اس کے پیچھے تھی۔ دونوں جھکے جھکے درختوں کی طرف دوڑ پڑے۔ درختوں کے اندھیرے میں وہ دور تک دوڑتے چلے گئے۔ پہلے گولیاں ان کے سروں کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ اب ان کے شرارے بائیں جانب پہلو میں نظر آنے لگے تھے۔ دونوں ٹاہلی کے چھریرے درختوں میں

دوڑتے جا رہے تھے۔ رائفلیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ وہ جنگل کے شمال مغرب کی جانب کافی آگے نکل گئے۔ اب فائرنگ ان کے پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ اب بھی دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ اس شدید فائرنگ میں صرف یہی ایک علاقہ محفوظ تھا۔ پیچھے سے اب ڈاکوؤں اور پولیس کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ نجمی اور بادل کافی دور نکل آئے ہیں۔ لیکن ابھی تک وہ محفوظ نہیں تھے۔ نجمی تھک گئی تھی لیکن بادل اسی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندھیرے میں درختوں سے بچتا آگے بڑھ رہا تھا۔ درختوں کا یہ ذخیرہ بہت وسیع تھا۔ وہ ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا انھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ جہاں یہ جنگل ختم ہوتا ہے اس سے آگے کیا ہے؟

نجمی جب بالکل ہی بے دم ہو گئی تو ایک جگہ بیٹھ گئی۔ بادل بھی وہیں بیٹھ گیا۔ دونوں کا سانس پھولا ہوا تھا۔ چند سیکنڈ ان سے بولا نہ گیا۔ پھر بادل نے سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا "ہمیں یہاں سے نکلنا ہے نجمی۔ اٹھو۔ ہمت کرو۔"

وہ اٹھے اور ایک بار پھر دوڑ پڑے۔ اسی طرح اندھیری رات میں دوڑتے دوڑتے وہ ایک ایسی جگہ پر آگئے جہاں درختوں کا یہ ذخیرہ ختم ہو گیا تھا۔ سامنے ایک چھوٹا سا کھلا میدان تھا۔ اوپر آسمان پر چمکتے ستارے نظر آنے لگے تھے۔ فائرنگ کی آواز اب بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ ادھر سے انسانی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور بھی بلند ہو رہا تھا۔ پھر یہ شور بھی ختم ہو گیا۔ لگتا تھا پولیس نے ڈاکوؤں کو یا تو مار دیا ہے یا انھیں پکڑ لیا ہے۔ کیونکہ چند لمحوں کے بعد فائرنگ بھی بند ہو گئی۔ بادل اور نجمی درختوں سے نکلتے ہی میدان کے کنارے سوکھی گھاس پر بیٹھ کر سستانے لگے۔ نجمی کے منہ سے جیسے اپنے آپ نکل گیا "بڑی اچھی بات ہوئی ہے کہ شبانہ اور ندیم اس مصیبت سے نکل چکے ہیں۔"

بادل نے دو تین لمبے سانس لیے اور بولا "مجھے افسوس ہے کہ تمھیں پاکستان نہ پہنچا سکا۔ کرمارا بھی مارا گیا۔ زنگو بھی مارا گیا۔ اب ہمیں کوئی اور ترکیب نکالنی ہو گی لیکن سب سے پہلے ہمیں پولیس سے جان بچانے کی ضرورت ہے۔"

نجمی نے اندھیرے میں سامنے پھیلے ہوئے میدان کی طرف دیکھ کر کہا "ادھر آگے ضرور کوئی گاؤں ہو گا۔ میدان اونچا نیچا ہے۔ لگتا ہے آگے پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔"

بادل نے پیچھے جنگل کی طرف نگاہ ڈالی اور بولا "اس علاقے سے میں تھوڑا بہت واقف ہوں لیکن ہمیں یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیئے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

اور وہ دونوں غیر ہموار میدان میں سے گزرنے لگے۔ ان کا رخ شمال کی طرف تھا جہاں آسمان پہ دور قطبی ستارہ چمک رہا تھا۔ نجمی شلوار قمیض میں تھی۔ گلے میں چادر لٹک رہی تھی۔ ہاتھ میں رائفل تھی اور پاؤں میں ربڑ کے جوتے تھے جو زنگو کے ڈیرے پر آکر اسے دیئے گئے تھے۔ بادل بھی شلوار قمیض میں ملبوس تھا۔ اس نے صدری پہن رکھی تھی۔ دونوں کے اپنے ریوالور ان کے پاس ہی تھے۔ کچھ فالتو گولیاں بھی بادل کی صدری میں محفوظ تھیں۔ مگر رائفل کا میگزین خالی ہو چکا تھا۔ میدان کے پار ایک چھوٹی سی کھائی آئی تو بادل نے کہا "میرا خیال ہے رائفلیں اب ہمارے لیے بیکار ہیں انھیں اسی جگہ پھینک دینا چاہیئے۔"

اور انھوں نے دونوں رائفلیں کھائی کے کیچڑ میں پھینک دیں۔ کھائی کو انھوں نے ایک چھوٹے سے پل کے ذریعے پار کیا۔ بادل نے دور سامنے اندھیرے میں ایک پہاڑی کی چوٹی کی طرف اشارہ کیا اور بولا "پٹھان کوٹ کی پہاڑیاں وہاں سے شروع ہو جاتی ہیں۔ ہمیں اسی طرف چلنا ہو گا۔"

نجمی نے کہا "کیا ادھر ہمیں کسی جگہ پناہ مل سکتی ہے؟"

بادل ایک لمحہ خاموش رہا۔ پھر بولا "نجمی بہن! میرا تو خیال ہے کہ ہمیں واپس اپنے ڈیرے پہ ہی چلے جانا چاہیئے اور کسی دوسرے موقع کا انتظار کرنا چاہیئے کہ تم پنجاب میں آ کر سرحد پار کر سکو۔"

نجمی نے فوراً جواب دیا "نہیں بادل! اب میں واپس نہیں جاؤں گی اپنے ڈیرے سے نکل چکی ہوں اب میرا رخ پاکستان کی طرف ہے۔ میں سرحد کے قریب بھی ہوں۔ یہیں کہیں آس پاس کوئی ڈیرہ بنا لیتے ہیں۔ خدا نے چاہا تو سرحد پار کرنے کی کوئی نہ کوئی ترکیب نکل آئے گی۔"

بادل نے نجمی کو اس وقت زیادہ مجبور کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ نجمی کی ضدی طبیعت سے واقف تھا اسے یہ بھی علم تھا کہ ایک طرح سے نجمی پیچھے اپنی ساری کشتیاں جلا کر آئی ہے اور اس نے عہد کر رکھا ہے کہ اب وہ پاکستان ہی جائے گی۔ اس کے واپس جانے کا بظاہر کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن بادل اپنے ساتھ اسے بھی کسی مصیبت میں گرفتار کرانا نہیں چاہتا تھا۔ اس علاقے میں اس کا ایک بااعتماد دوست زنگو ڈکیت تھا جو مارا جا چکا تھا۔ آگے جو علاقہ شروع ہو رہا تھا وہ جموں کشمیر

کے بارڈر کا ایریا تھا اور سارے کا سارا خطرناک علاقہ تھا بادل کو اپنی اور نجمی کی حفاظت سب سے مقدم تھی۔ آگے کا سارا علاقہ بادل کا دیکھا بھالا تھا۔ اس سارے ایریا میں صرف ایک جگہ پناہ مل سکتی تھی اور یہ جگہ جموں کشمیر کی ایک بستی تھی جہاں بادل کا ایک مسلمان ڈوگرہ دوست منیاری کی دکان کرتا تھا جس زمانے میں بادل ابھی ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل نہیں ہوا تھا اور بھوپال کی فیکٹری میں نوکر تھا تو جموں کا یہ دوست جس کا نام لال دین تھا۔ بھوپال میں منیاری کی دکان کیا کرتا تھا۔ لال دین کا مکان بادل خان کی گلی میں ہی تھا۔ دونوں کی آپس میں بڑی دوستی تھی۔ پھر بادل سے محلے میں ایک قتل ہو گیا اور وہ مفرور ہو کر جنگلوں میں نکل گیا جہاں اس نے ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس کے بعد دو ایک بار اپنے دوست لال دین سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ لال دین اب بھی بادل کو اپنا گہرا دوست سمجھتا تھا اور اس نے ایک بار بادل کو اپنے مکان میں پناہ بھی دی تھی جب پولیس اس کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ پھر لال دین بھوپال چھوڑ کر واپس اپنے شہر جموں چلا گیا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی اور جموں میں سکون کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ جموں میں ایک بار بادل کو اپنے گروہ کے سردار کے ساتھ بھیس بدل کر آنا پڑا تو وہ چھپ کر لال دین کے گھر اس سے ملنے چلا گیا تھا۔

بادل نے یہی سوچ رکھا تھا کہ وہ سیدھا جموں کشمیر اپنے دوست کے پاس جا کر پناہ لے گا اور وہاں اطمینان کے ساتھ نجمی کو اس بات پہ راغب کرنے کی کوشش کرے گا وہ واپس بہار کے جنگل میں اپنی کمین گاہ میں چلی چلے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس علاقے میں بادل نجمی کو ساتھ لے کر آزادی سے نہیں پھر سکتا تھا۔ اس سارے علاقے میں خفیہ پولیس کے آدمی سفید لباس میں موجود تھے۔ یہ بات پہلے ہی سے بادل کو معلوم ہو چکی تھی چلتے چلتے وہ دونوں ایسے علاقے میں آگئے جہاں چھوٹی چھوٹی گھاٹیاں شروع ہو گئی تھیں۔ یہ ہماچل پردیش کی ابتدائی ترائی کا علاقہ تھا اوپر اس ترائی کی شمال کی طرف چمبہ تھا۔ مشرق کی طرف کانگڑہ وادی شروع ہو جاتی تھی اور شمال مغرب کی طرف جموں کا ایریا تھا۔ یہاں سے آگے بادل کی پہلی منزل پٹھان کوٹ تھی۔ وہاں سے وہ جموں اپنے دوست کے پاس جانا چاہتا تھا۔ اپنے دوست کے بارے میں بادل نے نجمی کو بتایا اور کہا کہ وہ جموں پہنچنے کی کوشش کریں گے۔

نجمی بولی "یہ ٹھیک ہے۔ جموں سے آگے ہم کشمیر کی طرف نکل جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ کشمیر کی

پہاڑیوں میں سے میں پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ بادل کشمیر میں تمہارا کوئی ایسا آدمی واقف نہیں ہے جو مجھے آزاد کشمیر پہنچا دے ؟"

بادل نے کہا "سب سے پہلے ہمیں جموں پہنچنا ہے وہاں جا کر میں اپنے دوست لال دین سے بات کروں گا۔ ہو سکتا ہے وہاں کوئی سبیل پیدا ہو جائے اور سرحد پار کرنے کا کوئی راستہ نکل آئے۔"

نجمی بادل کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھی، وہ تھک گئی تھی۔ کھائیاں اور گھاٹیاں ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ رات بھی گھپ اندھیری تھی کہیں سبزہ آ جاتا اور کہیں سنگلاخ پتھریلی زمین شروع ہو جاتی۔ ایک جگہ انھیں پانی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اس آواز کی طرف بڑھے۔ ایک جگہ پتھروں میں پانی کا چشمہ بہہ رہا تھا۔ دونوں کو سخت پیاس لگ رہی تھی چشمے پر بیٹھ کر انھوں نے سیر ہو کر پانی پیا۔ منہ ہاتھ اور پاؤں دھوئے۔ تھوڑی دیر وہاں سستانے کے لیے بیٹھ گئے۔ جب طبیعت بحال ہوئی تو پھر چل پڑے۔ بادل نے قطبی ستارے کو اپنا راہنما بنا رکھا تھا۔ ساری رات وہ دونوں اسی طرح چلتے رہے کہ تھک جاتے تو کہیں تھوڑی دیر کے لیے سستاتے اور پھر سفر شروع کر دیتے دن کی نیلی نیلی روشنی آسمان پر پھیلنے لگی۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلے اور میدان اندھیرے میں سے ابھرنے لگے۔

بادل نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر شمال مغرب کی طرف دیکھا اور بولا "ہم ٹھیک راستے پر چلتے رہے ہیں۔ نجمی! وہ سامنے پہاڑیاں دیکھ رہی ہو۔ یہ پٹھان کوٹ کی پہاڑیاں ہیں۔ ہماری پہلی منزل پٹھان کوٹ ہی ہے۔"

بادل نے صدری کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر کہا "روپے میرے پاس موجود ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آگے دنیا نگر آئے گا۔ ہم وہاں سے پٹھان کوٹ والی بس پکڑ لیں گے۔"
نجمی نے کہا "سو سو کے پندرہ بیس نوٹ میرے پاس بھی ہیں۔ ان ریوالوروں کا کیا کریں۔ آگے کہیں پولیس چیکنگ تو نہیں کرتی ؟"

بادل سر کھجاتے ہوئے بولا "ایسی کوئی بات نہیں ہونی چاہیئے۔ ہم عام شہریوں کے لباس میں ہیں۔ کسی کو ہم پر شک نہیں ہوگا۔ ہاں پولیس کو اگر شک ہو گیا تو ہماری تلاشی لی جا سکتی ہے کیونکہ

اس علاقے میں ہر وقت ہنگامی حالات ہی رہتے ہیں۔"
نجمی نے کہا "میں ریوالور اپنے پاس رکھنا چاہتی ہوں۔"
میرا ریوالور بھی میرے پاس ہی ہے۔ تم بھی اپنا ریوالور اپنے پاس ہی رکھو اگر کوئی ایسی صورتحال پیدا ہو گئی تو دیکھا جائے گا۔" یہ کہہ کر بادل ٹیلے سے نیچے اتر آیا۔ تھوڑی دیر میں ساری ترائی میں سورج کی سنہری روشنی پھیل گئی۔ اس سارے علاقے میں چھوٹے قد کی چھتری دار درخت جگہ جگہ جھنڈوں کی صورت میں موجود تھے۔ نجمی کو اس کی پچھلی زندگی نے کافی سخت جان بنا دیا تھا۔ پھر بھی وہ ساری رات سے بادل کے ساتھ وقفے وقفے کے بعد چل رہی تھی اور اب وہ تھک کر چور ہو چکی تھی۔ ساری رات کا جگراتا الگ تھا۔ لیکن یہ ان دونوں کی زندگی اور موت کا معاملہ تھا جس کی وجہ سے وہ ابھی تک چلے جا رہے تھے۔ دن نکلا تو انھیں ہر شے صاف نظر آنے لگی۔ ایک جگہ نشیب میں چھوٹی سی پانی کی آبشار گر رہی تھی۔ یہاں انھوں نے منہ ہاتھ دھویا۔ پانی پیا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر تازہ دم ہوئے۔ بادل نے راستے کا تعین کیا پھر اندازے سے دنیا نگر کی طرف چل پڑے۔ گھاٹیاں ختم ہونے لگیں۔ زمین ہموار ہو گئی تھی۔ پہاڑیاں دور سے صاف دکھائی دے رہی تھیں، ایک جانب چھپے اور دوسری جانب جموں کے پہاڑ وہاں سے کافی فاصلے پر تھے۔ چھتری دار درخت ختم ہوئے تو کیکر اور دھریک کے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پھر چھوٹے چھوٹے کھیت نظر آنے لگے۔

بادل نے کہا "سامنے ایک گاؤں نظر آ رہا ہے۔"
نجمی نے بھی درختوں کے جھنڈوں میں ایک گاؤں میں سے دھواں اٹھتے دیکھ لیا تھا۔ گاؤں کے قریب پہنچ کر وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ گاؤں وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مکانوں کی ڈھلانی چھتیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ ایک کسان کھیتوں میں ہل چلا رہا تھا۔ ایک عورت سر پر چارے کا گٹھا رکھے گاؤں میں داخل ہو رہی تھی۔ بادل کہنے لگا "تم اسی جگہ بیٹھو میں جا کر پتہ کرتا ہوں کہ یہاں سے دنیا نگر کو کونسا راستہ جاتا ہے۔"
نجمی کو دھریک کے درخت کے نیچے بٹھا کر بادل آہستہ آہستہ اس کسان کی طرف چل پڑا جو کھیتوں میں ہل چلا رہا تھا۔ کھیت کے کنارے پہنچ کر اس نے کسان کو دور سے سلام کیا اور پوچھا کر

دینانگر کو یہاں سے کونسا راستہ جاتا ہے۔ کسان نے ہل روک لیا۔ ماتھے پر آیا ہوا پسینہ صافے سے پونچھتے ہوئے بادل کی طرف دیکھا پھر مغرب کی طرف اشارہ کر کے بولا "وہاں تمھیں بادلی کے قریب جاتی پکی سڑک ملے گی۔ اس پر دو کوس چلو گے تو دیناںگر والی پکی سڑک آ جائے گی۔ یہی کوئی چھ کوس ہو گا دینانگر، تم کہاں سے آ رہے ہو؟"

بادل نے کہا "میری بہن بیمار ہے۔ وہ میرے ساتھ ہے۔ اسے دینانگر کے اسپتال میں داخل کرانے لے جا رہا ہوں۔"

بادل کسان کے سوال کو گول کر گیا۔ وہ اسے کیا بتاتا کہ کہاں سے آ رہا ہوں کسان نے کوئی جواب نہیں دیا اور بیلوں کو ہانکتے ہوئے دوبارہ ہل چلانے میں مصروف ہو گیا۔ بادل کو یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ وہ اپنی منزل کے قریب ہے اور اس کا اندازہ ٹھیک نکلا۔ وہ منزل سے بھٹک کر بارڈر کے خطرناک علاقے میں بھی نکل سکتا تھا۔ اس نے واپس آ کر نجمی کو بتایا کہ ہم دینانگر کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ نجمی نے پوچھا "وہاں سے پٹھان کوٹ کتنی دور ہے؟"

بادل بولا "کوئی زیادہ دور نہیں اور پھر ہم دینانگر سے پیدل تھوڑا ہی جائیں گے، پٹھانکوٹ والی بس پکڑ لیں گے۔ آؤ اب چلتے ہیں۔ یہاں زیادہ دیر رکنا ٹھیک نہیں۔"

گاؤں کو ایک طرف چھوڑ کر وہ کھیتوں کھیت بادلی کے پاس آ گئے۔ یہاں سے ایک کچی سڑک باہر ہو گئے یہ دو کوس کا فاصلہ انھوں نے سڑک سے ہٹ کر کھیتوں ہی سے گزرتے ہوئے طے کیا۔ آگے پکی سڑک آ گئی۔ یہاں سے ایک لاری شور مچاتی ہوئی گزر گئی۔ بادل نے نجمی سے کہا کہ یہاں سے دینانگر زیادہ دور نہیں ہے اتنے میں دو فوجی ٹرک گزرے۔ بادل اور نجمی نے دوسری طرف منہ کر لیا۔ انھیں یونہی فوجی ٹرکوں سے خطرہ محسوس ہوا تھا۔

نجمی نے کہا "بادل! یہاں سے دینانگر جانے والی لاری کیوں نہ پکڑ لیں؟ ادھر سے کوئی لاری یا بس آئی تو اسے ہاتھ دے کر روک لینا۔"

مگر بادل یہ خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ کیا معلوم لاری میں پہلے سے پولیس کا کوئی سپاہی موجود ہو۔ رات کو ہی پولیس نے نہر والے جنگل میں چھاپہ مارا تھا۔ گھمسان کا رن پڑا تھا۔ کچھ ڈاکو جان بچا کر بھاگے بھی ہوں گے اور بہت ممکن تھا کہ پولیس ان کی تلاش میں سارے علاقے

میں پھیل گئی ہو۔ اس نے نجمی سے کہا "یہاں سے بس میں بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔ نجمی دینانگر یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے چلتی چلو۔" سورج مشرق میں کافی اوپر تک آ گیا تھا۔ یہاں موسم ٹھنڈا تھا اور گرمی بنگال بہار والی نہیں تھی ویسے بھی یہ پہاڑی ترائی کا علاقہ تھا۔ نجمی نے اپنے سر اور جسم کو چادر میں اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ بادل کے کاندھے پر بھی چادر تھی اور وہ چاروں طرف نگاہ رکھے نجمی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ دینانگر کے مضافاتی مکانات شروع ہو گئے تھے۔ سڑک پر ٹریفک بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ یہ کوئی زیادہ بڑا شہر نہیں تھا۔ مگر امرتسر سے پٹھان کوٹ جاتے ہوئے یہی ایک اہم شہر تھا۔ لاری اڈہ شہر کے باہر ہی تھا۔ وہاں لاریاں اور چھوٹی چھوٹی بسیں کھڑی تھیں۔ کچھ میں سے مسافر اتر رہے تھے۔ کچھ میں مسافر بیٹھے تھے۔ ہارن بجتا اور کوئی نہ کوئی بس اڈے سے نکل کر امرتسر یا پٹھان کوٹ کی طرف روانہ ہو جاتی۔ لاری اڈے میں پہنچ کر بادل نے نجمی کو ایک گیراج نما مسافر خانے میں دوسری مسافر عورتوں کے پاس بٹھایا اور خود ٹکٹ والی کھڑکی کی طرف بڑھا۔ پٹھان کوٹ والی بس اڈے پر تیار کھڑی تھی۔ بادل نے دو ٹکٹ لیے۔ واپس آ کر نجمی کو ساتھ لے کر بس میں سوار ہو گیا۔

بس جب بھر گئی تو پٹھان کوٹ کی طرف چل پڑی۔ بس نیم پہاڑی سڑک پر چلی جا رہی تھی۔ نجمی چادر سر پر آگے کیے خاموش بیٹھی تھی۔ کسی کو اندازہ تک نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ وسطی ہند کی ایک ایسی خطرناک ڈاکو ہے جس کو پولیس ایک عرصے سے تلاش کر رہی ہے۔ یہی حال بادل کا تھا۔ دونوں اپنے کئی دشمنوں کو ٹھکانے لگا چکے تھے۔ دونوں کبھی کبھی ایک دوسرے کو نگاہیں ملا کر دیکھ لیتے تھے۔ ابھی تک ان کی کسی پولیس والے یا خفیہ آدمی سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ نجمی نے اس سے پہلے پٹھان کوٹ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بادل دو تین بار پٹھان کوٹ آ چکا تھا۔ یہاں سے اسے جموں کی طرف جانا تھا۔ پٹھان کوٹ کافی بڑا شہر تھا۔ نیم پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے شہر کی سڑکیں کہیں کہیں ڈھلوان تھیں تو کہیں چڑھائی آ جاتی تھی۔ شہر کا وسطی حصہ ہموار تھا۔ یہاں ریلوے اسٹیشن بھی تھا۔ جموں تک ٹرین بھی جاتی تھی لیکن بادل لاری کے ذریعے سفر کرنا چاہتا تھا۔ بس پٹھان کوٹ کے لاری اڈے میں داخل ہونے کے بعد رک گئی۔ بادل اور نجمی نے کھڑکی میں سے باہر نگاہ دوڑائی۔ دو پولیس والے اڈے کی ایک طرف چائے کی دکان

کے باہر لوہے کی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ بادل اور نجمی لاری سے اتر آئے۔ بادل اسے مسافر خانے میں لے آیا۔ یہاں جموں جانے والی سواریاں پہلے سے بیٹھی تھیں۔

پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ جموں جانے والی لاری دوپہر کے تین بجے روانہ ہو گی پٹھان کوٹ سے جموں تک پہاڑی راستہ تھا۔ ایسا پہاڑی راستہ نہیں تھا جیسا کہ ہمارے ہاں پنڈی سے مری تک کا ہے۔ کٹھوعہ سے آگے تین بڑے بڑے پہاڑ تھے جن کے گرداگرد بنی ہوئی سڑک پر سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ بادل نے جموں کے دو ٹکٹ لے کر رکھ لیے اور کھانے کے لیے ایک ڈھابے سے دال کا کٹورا اور چھ سات چھوٹے چھوٹے پھلکے لے آیا۔ بھوک سے دونوں کا برا حال ہو رہا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ان کی کھوئی ہوئی طاقت بحال ہوئی۔ نجمی نے چہرہ نیچے کیے کیے بادل سے کہا "ایک آدمی میری دائیں جانب دکان کے باہر بیٹھا مجھے دیر سے گھور رہا ہے۔"

بادل نے اس آدمی کی طرف دیکھے بغیر نجمی سے کہا "تم اس طرف اب مت دیکھنا۔"

بادل نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگا لیا اور دیہاتیوں کی طرح کش لگانے لگا۔ جان بوجھ کر وہ زور زور سے کھانسنے لگا اور کھانستے کھانستے دائیں جانب گھوم کر اس طرف دیکھا جہاں پان سگریٹ کی دکان کے باہر ایک کھدر پوش، صدری والا ہندو بینچ پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کی نظریں اس وقت بھی نجمی اور بادل کی جانب تھیں۔ جب بادل نے اس کی طرف دیکھا تو صدری والے ادھیڑ عمر ہندو نے آنکھیں دوسری طرف کر لیں۔ پہلے تو بادل کو لگا کہ وہ یونہی اوباش قسم کا آدمی ہے جن کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ہر عورت کو گھور کر دیکھتے ہیں۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس قسم کے آدمی مسلسل ایک جگہ بیٹھ کر نہیں گھورا کرتے۔ ویسے شکل سے بھی وہ ہندو کوئی اوباش آدمی نہیں لگتا تھا۔ کہیں یہ خفیہ پولیس کا آدمی نہ ہو؟ اس خیال سے بادل ہوشیار ہو گیا۔ وہ اس بات کی تصدیق کیے بغیر جموں کی طرف روانہ نہیں ہونا چاہتا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اگر یہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے تو ان کے تعاقب میں جموں تک ساتھ جائے یا کسی دوسرے آدمی کو ان کے پیچھے لگا دے۔

بادل نے نجمی سے کہا "تم اسی جگہ بیٹھی رہو۔ مجھے شک ہے کہ یہ آدمی جموں کی خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ میں اس کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔ میں سامنے والے بازار میں سگریٹ لینے کے بہانے

جاتا ہوں۔ ابھی واپس آ جاؤں گا۔"

اور بادل خان آہستہ سے اٹھا اور لاری اڈے سے نکل کر سامنے والے بازار کی طرف چل پڑا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کھدر پوش صدری والا آدمی وہیں بیٹھا رہتا ہے یا اس کے پیچھے آتا ہے۔ بادل نے بازار عبور کیا۔ سامنے کچھ چائے سگریٹ کی دکانیں تھیں ایک دکان پر کھدر کے تھیلے لٹکے ہوئے تھے۔ بادل ان تھیلوں کو دیکھنے لگا۔ ایک تھیلا اس نے خرید لیا۔ اور ایسے دوسری دکان کی طرف مڑا جیسے اسے مزید کسی شے کی ضرورت ہو۔ دوسری دکان میاری کی تھی۔ یہاں اس نے دکاندار کو جوتوں کے سفید تسمے دینے کو کہا۔ دکاندار تسمے نکالنے لگا تو بادل نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ اس کا شبہ صحیح نکلا۔ صدری والا آدمی پیچھے کی جانب تین دکانیں چھوڑ کر ایک دکان کے سامنے کھڑا سگریٹ پیتے ہوئے اس پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ بادل خان نے تسمے لے کر پیسے دیئے اور چوک میں آ گیا۔ یہاں ایک ریڑھی والا سنگترے بیچ رہا تھا۔ اس نے کچھ سنگترے خرید کر تھیلے میں ڈالے اور واپس لاری اڈے کی طرف مڑ گیا۔ صدری پوش برابر اس کے تعاقب میں تھا۔ پرانی چھت والے مسافر خانے میں آ کر بادل تھیلے میں سے سنگترے نکال کر نجمی کو دکھاتے ہوئے بولا "یہ خفیہ پولیس کا آدمی ہے۔ یہ ہمارا پیچھا کرتے جموں تک جائے گا۔ اس سے یہیں نمٹنا ضروری ہے۔"

نجمی نے ایک سنگترے کو چھیلتے ہوئے آہستہ سے کہا "اس شہر میں ہم اجنبی ہیں۔ یہاں ہم اس سے کیسے نمٹ سکتے ہیں؟"

بادل بولا "یہ تم مجھ پر چھوڑ دو اور میرے ساتھ چلو۔ ہم ابھی جموں نہیں جائیں گے۔"

بادل نے نجمی کو ساتھ لیا اور پٹھان کوٹ کے لاری اڈے سے نکل کر اسٹیشن بازار کی طرف روانہ ہو گئے۔ بازاروں میں کافی رونق تھی۔ اسٹیشن کے احاطے میں زرد اور کیسری رنگ کی پگڑیاں باندھے چمبہ کانگڑہ کے دیہاتی ٹکڑیاں بنا کر بیٹھے باتیں وغیرہ کر رہے تھے۔ بادل اسٹیشن سے آگے نکل گیا کنک منڈی کی طرف گھومتے ہوئے اس نے بڑے طریقے سے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ صدری پوش آدمی برابر ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ بادل نے اپنے دل میں اس ہندو سی آئی ڈی والے سے چھٹکارا حاصل کرنے کے عہد کو مزید پختہ کر لیا تھا۔ اس نے نجمی کے قریب ہو کر کہا "وہ ہمارا

پیچھا کر رہا ہے۔"

کنک منڈی کے بیچ میں سے ایک چھوٹا سا بازار شہر کے کمیٹی باغ کی طرف جاتا تھا۔ بادل ادھر مڑ گیا۔

نجمی اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ اس نے پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

بادل نے آہستہ سے کہا "تم خاموشی سے چلتی رہو سب ٹھیک ہو جائے گا یہ آدمی ہمارے لیے بے حد خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

باغ کا ایک پرانا گیٹ تھا جس کے درمیان میں آر پار لوہے کی موٹی زنجیر سڑک سے دس پندرہ انچ اونچی بندھی تھی تاکہ رکشہ اسکوٹر وغیرہ اندر نہ لے جائے جا سکیں۔ باغ میں دھوپ نکلی ہوئی تھی، دن کے وقت سیر کرنے والے نظر نہیں آ رہے تھے۔ کہیں کہیں پلاٹوں میں دو ایک آدمی بیٹھے یا کاہلی سے لیٹے دکھائی دے جاتے تھے۔ بادل اس باغ کے حدود اربعہ سے واقف تھا۔ وہ باغ کی دوسری جانب پرانے کنوئیں کے پاس آ کر چیڑ کے ایک درخت کے نیچے نجمی کو ساتھ لے کر بیٹھ گیا اس نے نگاہیں گھما کر دیکھا۔ صدری پوش ہندو بھی کچھ فاصلے پر درخت کے پاس کھڑے ہو کر یونہی سامنے کی طرف تکنے لگا تھا۔ بادل نے نجمی سے کہا "اب تم اسی جگہ بیٹھی رہنا میں اسے ٹھکانے لگا کر آتا ہوں۔"

نجمی نے تھیلے میں سے سنگترہ نکال کر چھیلتے ہوئے کہا "یہ کہیں شور نہ مچا دے۔"

"اس کا موقع نہیں دوں گا۔"

یہ کہہ کر بادل آہستہ سے اٹھا اور پرانے کنوئیں کے پیچھے جو ڈھلان نیچے بدرو کی طرف جاتی تھی اس پر اتر گیا۔ یہاں ڈھلان پر چیڑ اور کیکر کے بے شمار درخت بالکل ساتھ ساتھ اُگے ہوئے تھے۔ بادل ان میں جان بوجھ کر مشتبہ انداز میں چلنے لگا۔ وہ بار بار جھک کر یوں زمین کو دیکھنے لگتا جیسے اسے کسی شے کی تلاش ہو۔ یہاں سامنے بھی گندے نالے کی ڈھلان تھی۔ یوں یہاں ایک گھاٹی سی بن گئی تھی۔ اور ادھر باہر کے مکان دکھائی نہیں دیتے تھے۔ بادل نے خاص طور پر یہ جگہ منتخب کی تھی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ صدری پوش خفیہ پولیس کا آدمی کچھ فاصلہ رکھ کر برابر اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ بادل نے ایک تناور درخت کو چن لیا۔ اس درخت کا تنا کافی بڑا تھا۔

بادل اس کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے صدری کے اندر والی جیب میں ہاتھ ڈال کر ریوالور نکالا اور اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ وہ اپنے پیچھے لگے ہوئے خفیہ آدمی کا انتظار کرنے لگا۔ وہ آدمی کچھ پریشان ہو گیا تھا کیونکہ اسے اپنا ٹارگٹ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ تیز تیز چلنے لگا۔ بادل کو اس کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز اس کے درخت کی طرف آ رہی تھی۔ پھر یہ آواز بہت قریب سے آنے لگی۔ خفیہ پولیس والا درخت کے قریب پہنچ گیا تھا۔ ریوالور پر بادل کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ جونہی وہ آدمی درخت کے قریب سے گزرا بادل نے لپک کر ریوالور کی نالی اس کی گردن کے ساتھ لگا دی اور کہا "یہیں بیٹھ جاؤ۔ ذرا آواز نکالی تو گولی چلا دوں گا۔"

خفیہ پولیس والا ہندو بالکل ساکت ہو گیا۔ بادل نے ریوالور کی نالی کو ذرا دبایا اور کہا "بیٹھ جاؤ۔" خفیہ پولیس والا وہیں بیٹھ گیا۔

٭٭٭

بادل کی انگلی پستول کے ٹریگر پر مضبوطی سے جمی ہوئی تھی۔

پستول کی نالی ہندو سی آئی ڈی والے کی گردن میں تھوڑی سی اندر کو دھنسی ہوئی تھی۔ یہ ہندو درختوں کی اوٹ میں بدرو کی ڈھلان پر دونوں پاؤں پر بیٹھا کانپ رہا تھا۔ بادل اسے جان بوجھ کر اپنے پیچھے لگا کر یہاں لے آیا تھا۔ نجمی پٹھان کوٹ کے پارک میں بیٹھی تھی۔ وہ اسے بتا کر آیا تھا کہ میں اس سی آئی ڈی والے کو ٹھکانے لگانے جا رہا ہوں۔ کیونکہ وہ آگے جموں میں جا کر ہماری گرفتاری کا باعث بن جائے گا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اس طرف کوئی انسان دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ بادل پستول کا فائر بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس ہندو سی آئی ڈی والے کے زمین پر بیٹھتے بیٹھتے بادل نے سوچ لیا کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔ بادل کوئی معمولی جرائم پیشہ آدمی نہیں تھا۔ وہ ایک پورا ڈاکو تھا اور اس کی ساری جوانی ڈاکے مارتے اور قتل و غارت میں گزری تھی۔ وہ ایک طاقتور اور بے رحم آدمی تھا اور دشمن کو اس نے کبھی معاف نہیں کیا تھا۔ وہ نجمی کا وفادار تھا اور اسے ہر حالت میں بارڈر کراس کروا کر واپس پاکستان بھیجنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ سی آئی ڈی والا ہندو اس کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔ نجمی اور بادل عام آدمیوں کے بھیس میں دلی سے جموں جا رہے تھے۔ جہاں بادل کا ایک لال دین نام کا پرانا دوست رہتا تھا اور جس کی مدد سے بادل نجمی کو بارڈر کراس کروانا چاہتا تھا کہ راستے میں یہ کم بخت سی آئی ڈی والا اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔

سی آئی ڈی والے نے کپکپاتی آواز میں کہا: ”مجھے جان سے نہ مارو میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ میں دھرم کی قسم کھاتا ہوں۔“

لیکن بادل دل میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے پستول سی آئی ڈی والے کی گردن سے ہٹا لیا وہ سمجھا کہ بادل نے اسے معاف کر دیا ہے لیکن عین اسی لمحے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے اوپر اچانک کوئی پہاڑ گر پڑا ہو۔ اس کی آنکھوں میں بجلی سی چمک گئی۔ یہ اس کی زندگی کی آخری روشنی تھی۔ اس کے بعد سی آئی ڈی والے کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ بادل نے پوری طاقت سے نیچے بیٹھے ہوئے سی آئی ڈی والے کی گردن پر عین پیچھے کی جانب مکا مارا تھا۔ اس ضرب نے اس کی گردن کا منکا دو جگہوں سے توڑ ڈالا تھا۔ وہ آگے کی جانب لڑھک گیا۔ بادل نے اسے پکڑنا چاہا۔ کیونکہ وہ اس کی لاش کو خود بدرو میں کسی مناسب جگہ کیچڑ میں دبا دینا چاہتا تھا لیکن ہندو سی آئی ڈی والے کی لاش ڈھلان کی وجہ سے نیچے لڑھکتی چلی گئی اور دھپ سے بدرو کے گندے پانی میں گری پھر ڈوب گئی۔ بادل نے تیز نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ اسے اپنے اردگرد اور سامنے بھی کوئی نظر نہ آیا۔ سامنے بدرو کے دوسرے اونچے کنارے کے پیچھے کوٹھیوں کے پچھواڑے لگتے تھے۔ کوٹھیوں کی اکثر دیواروں پر گارڈینیا کی جنگلی بیل چڑھی ہوئی تھی اور یوکلپٹس اور کہیں پوپلر کے درخت پٹھان کوٹ کی چمکیلی دھوپ میں لہرا رہے تھے۔ بادل اوپر چڑھنے لگا۔

پستول اس نے شلوار کے اندر چھپا لیا تھا۔ چادر کو اس نے جسم کے گرد اچھی طرح سے لپیٹا اور باغ میں آ کر نجمی کو ساتھ لے کر بڑے آرام سے لاری اڈے کی طرف روانہ ہو گیا مگر اس کی عقابی نظریں اردگرد کا جائزہ برابر لے رہی تھیں۔ اسے ایک خطرہ ضرور تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس خفیہ آدمی کے پیچھے بھی اس کی حفاظت کے لیے کوئی دوسرا خفیہ آدمی بھی لگا ہوا ہو۔ بظاہر ایسی بات نظر نہیں آتی تھی۔ پھر بھی بادل پوری احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ پٹھان کوٹ کے باغ سے نکل کر وہ لاری اڈے کی طرف جانے کی بجائے ایک تنگ اور ویران سی سڑک کی طرف چل پڑا۔ اس سڑک پر کوئی دکان وغیرہ نہیں تھی۔ یہاں بھی کوٹھیوں کے عقبی حصے تھے۔ ایک آدمی ریڑھے پر بیٹھا چلا آ رہا تھا۔ جب وہ بادل کے قریب سے گزرا تو اس نے بادل سے وقت پوچھا۔ بادل نے کہا: ”گھڑی نہیں ہے میرے پاس۔“ ریڑھے والا رام رام کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

چند قدم چلنے کے بعد بادل نے پیچھے مڑ کر دیکھا ریڑھا سڑک کا موڑ گھوم چکا تھا۔ بادل آگے جا کر دوسری سڑک پر آ گیا اور تیز تیز چلنے لگا۔

نجمی اور بادل لاری اڈے کی طرف چلنے لگے۔ بادل نے مڑ کر دیکھا نجم، بھی بڑی بے نیازی سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔ بادل نے باہر ایک دکان سے پکوڑے خرید لیے تھے۔

پکوڑوں والا لفافہ نجمی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے وہ خاموشی سے اس کے پاس بیٹھ گیا اور دھیمی آواز میں بولا "ختم کر دیا ہے اُسے۔"

نجمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ خود اس خفیہ پولیس والے کی وجہ سے پریشان تھی۔ کیونکہ اس مرحلے پر اگر پولیس بادل اور نجمی کو گرفتار کر لیتی ہے تو پھر ان دونوں کے سامنے بے پناہ مسائل کھڑے ہو سکتے تھے اور شاید اس بار پولیس بھی انھیں کسی بہانے ہلاک کر ڈالتی۔ نجمی نے لفافہ کھول کر پکوڑوں کو دیکھا اور آہستہ سے کہا "لاری کس وقت چلے گی؟"

بادل نے اڈے کی اس جانب دیکھا جہاں ایک لاری مسافروں سے بھر چکی تھی یہ لاری جموں نہیں جا رہی تھی۔ بادل آہستہ سے اٹھا اور لاری کی طرف چلا۔ نجمی نے چادر سے سر کو اس طرح ڈھانپ رکھا تھا کہ اس کا آدھا چہرہ بھی ساتھ ہی چھپ گیا۔ وہ روشن چمکیلی اور تیز نگاہوں سے فضا کا جائزہ لینے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ یہاں سے کچھ فاصلے پر اس ہندو کی لاش پڑی ہے جسے بادل قتل کر آیا ہے۔ اگرچہ اسے یقین تھا کہ بادل نے لاش کو بڑی احتیاط سے ٹھکانے لگایا ہوگا۔ اس کے باوجود کوئی اتفاق بھی ہو سکتا تھا جائے قتل سے کوئی آدمی بادل کے پیچھے بھی لگ سکتا تھا۔ بادل لاری کے پاس ایک سکھ سے باتیں کر رہا تھا۔

واپس آ کر بادل نے نجمی کو بتایا کہ جموں کو جانے والی لاری اس کے بعد ایک گھنٹے بعد چلے گی۔ نجمی نے سر پہ چادر ٹھیک کرنے کے بہانے پیچھے نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا "ہم کسی دوسرے اڈے سے لاری نہیں پکڑ سکتے بادل؟"

بادل نے پکوڑوں کا لفافہ نجمی کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ وہ بڑے سکون سے پکوڑے کھا رہا تھا کہنے لگا "اس کو میں نے بدرو کی کیچڑ میں دبا دیا ہے۔ دو گھنٹے تک لاش اوپر نہیں آئے گی۔ مجھے کسی دوسرے لاری اڈے کا علم بھی نہیں۔"

ایک پھولی ہوئی توند والا کانسٹیبل ہاتھ میں چھڑی لیے بادل اور نجمی کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ بادل کے ہاتھ میں پکوڑا ویسے ہی پکڑے کا پکڑا رہ گیا۔ مگر اس نے اپنے حواس بحال رکھے اور دھیمی آواز میں نجمی سے کہا "تم فائر مت کرنا۔"

بادل نے لفافہ پھینک کر چادر سے ہاتھ پونچھنے کے بہانے ہاتھ چادر کے اندر پستول پر جما لیا۔ موٹی توند والا کانسٹیبل بادل کے قریب سے گزر گیا اور دو قدم پر رک کر بنچ پر بیٹھی ہوئی ایک ہندو عورت سے کہنے لگا "راجو! یہاں کب تک بیٹھی رہو گی۔ میرے ساتھ چلو میں تمھیں پولیس کی گاڑی پر سامان لیے چلتا ہوں۔"

اور وہ ہندو عورت اپنی پوٹلی سنبھال کر اٹھی اور کانسٹیبل کے ساتھ دوسری طرف نکل گئی۔ بادل نے اپنا ہاتھ پستول سے الگ کر لیا۔ نجمی نے قریب ہو کر پوچھا "میں نے فائر کی آواز نہیں سنی تھی۔"

بادل کی نگاہیں ہندو کانسٹیبل کا تعاقب کر رہی تھیں۔ کہنے لگا "میں نے اس کا منکا توڑا تھا۔ اس کانسٹیبل نے ایک بار تو مجھے ہلا دیا تھا۔"

نجمی کہنے لگی "یہاں زیادہ دیر بیٹھے رہنا مناسب نہیں ہے۔"

بادل نے کہا "میرا خیال ہے جو لاری جموں جائے گی اسی میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ میں ابھی پتہ کر کے آتا ہوں۔"

بادل اٹھ کر لاری اڈے کے سکھ منیجر کے پاس گیا۔ اُسے کہا کہ میری بیوی کے بچہ ہونے والا ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اسے اس لاری میں بٹھا دوں جو تھوڑی دیر بعد جموں جائے گی۔ سکھ منیجر نے سر سے پاؤں تک بادل کو ایک نظر دیکھا اور ایک طرف اشارہ کر کے بولا "وہ سامنے پیپل کے نیچے لاری کھڑی ہے اس میں اپنی تیئنی کو جا کر بٹھا دو۔"

بادل نے ہاتھ باندھ کر دھنواد کہا اور نجمی کے پاس آ کر بولا "آؤ لاری میں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

جموں جانے والی لاری ایک طرف ہٹ کر پیپل کے درخت کے تلے کھڑی تھی اور دو ہندو لڑکے اس کے ٹائروں پر پانی ڈال کر دھو رہے تھے۔ بادل نجمی کو لے کر لاری کی طرف بڑھا تو سکھ منیجر نے پیچھے سے ان لڑکوں کو آواز دی "اوئے! اپنے لالہ تے لالی نو بیٹھن دیو۔" دونوں لڑکوں کے ہاتھ وہیں رک گئے۔ انھوں نے ایک نظر بادل اور نجمی کو دیکھا۔ نجمی کا ہاتھ

بادل نے تھام رکھا تھا اور وہ جان بوجھ کر آہستہ آہستہ چل رہی تھی جیسے بیمار ہو۔ ایک لڑکے نے آگے بڑھ کر لاری کا دروازہ کھول دیا۔ لاری کے اندر بیٹھ کر نجمی کو کچھ اطمینان ہوا۔ آہستہ سے کہنے لگی " وہاں ہم کھلی جگہ پر بیٹھے تھے۔"

بادل بھی نجمی کے ساتھ ہی بیٹھ گیا پھر نیچے اتر کر وہ اس کے لیے سوڈا واٹر کی بوتل لے آیا۔ نجمی کہنے لگی " ہماری تصویریں پولیس نے اخباروں میں ضرور چھپوا دی ہوں گی۔ جموں بڑا شہر ہے وہاں ہمیں بڑی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔"

بادل نے کہا " اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" دس بارہ کو مار کر مروں گا۔"

نجمی بوتل پینے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ایک سکھ ڈرائیور جھومتا جھامتا مونچھوں کو ایک ہاتھ سے مروڑتا کلینر لونڈوں کو گالیاں بکتا لاری کی طرف بڑھا۔ گھور کر نجمی اور بادل کی طرف دیکھا اور لڑکوں سے پوچھا " اوئے! اینہاں نوں کنّے اندر واڑیا اے۔"

بادل نے فوراً عاجزانہ انداز میں کہا " میری تیمی بیمار ہے سردار جی! مینیجر صاحب نے ہمیں اندر بٹھایا ہے۔"

سکھ ڈرائیور نے لاری اڈے کے مینیجر کو زیر زبان ایک گندی گالی دی اور اگلی سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے غرایا " اوئے! اگوں ہٹ جاؤ اوئے۔"

لاری دھونے والے لڑکے فوراً آگے سے ایک طرف ہٹ گئے۔ سکھ ڈرائیور لاری کو پیپل کے نیچے سے نکال کر اڈے کی چھت کے نیچے لے آیا جہاں پہلے سے کئی سواریاں سامان لیے تیار کھڑی تھیں۔ سکھ ڈرائیور نے کلینر کو آواز دے کر کہا " اوئے گوپالے! ٹائی راڈ چیک کر لئیں اوئے۔"

لاری دیکھتے دیکھتے بھر گئی۔ اوپر سامان لاد کر رسوں سے باندھا جانے لگا سامان کے اوپر ترپالیں بھی ڈال دی گئی تھیں۔ بادل اور نجمی اپنی اپنی جگہوں پر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ نجمی کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ سکھ مینیجر سکھ ڈرائیور کو کاغذ کاپی میں سے کاٹ کر دے رہا تھا۔ کاغذ صدری میں ڈالتے ہوئے سکھ ڈرائیور مونچھوں کو مروڑتے لاری کی طرف آیا۔ سیٹ پر چڑھتے ہوئے اس نے کلینر کو گالی دے کر پوچھا سب کے ٹکٹ چیک کر لیے ہیں؟ کلینر گوپال ایک دبلا پتلا لڑکا سا تھا۔ لاری کے پچھلے دروازے سے اس نے آواز لگائی " ٹھیک ہے استاد جی۔"

پھر اس نے زور سے لاری کی باڈی پر ہاتھ مارا " چلو استاد جی رام بھروسے۔"

سکھ ڈرائیور نے لاری اسٹارٹ کر دی۔ لاری پٹھان کوٹ شہر کے گنجان بازاروں میں سے نکل کر کٹھوعا روڈ پر آئی تو نجمی اور بادل نے اطمینان کا سانس لیا۔

کھلی نیم پہاڑی سڑک پر آتے ہی لاری کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ لاری چلتی چلی گئی تھی کبھی کھلی وادی آ جاتی کبھی دونوں طرف ویران ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ پٹھان کوٹ کی پہاڑیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ پھر سہ پہر کے وقت کٹھوعا کا علاقہ شروع ہو گیا۔ کٹھوعا لاری اڈے پر بھی نجمی اور بادل پوری طرح چوکس رہے۔ یہاں سے لاری نکلی تو سانبا جا کر رکی۔ یہ سارا علاقہ خالص پہاڑی علاقہ نہیں تھا بلکہ نیم میدانی اور نیم پہاڑی علاقہ تھا اور یہاں سردی بھی واجبی سی تھی۔ بس گرمی نہیں تھی۔

سورج غروب ہو رہا تھا کہ دور سے جموں توی کے پہاڑ تیزی سے قریب آنے لگے اب لاری اونچے نیچے ٹیلوں کے ارد گرد سے گھوم کر آگے بڑھ رہی تھی۔ جموں پہنچتے پہنچتے گھروں، دکانوں اور سڑکوں کی روشنیاں جلنے لگی تھیں۔ جموں کا لاری اڈہ پٹھان کوٹ سے زیادہ بڑا تھا اور یہاں رش بھی زیادہ تھا کیونکہ یہاں سے آگے کشمیر کو لاری جاتی تھی۔

سیزن شروع ہو چکا تھا جس کی وجہ سے وہاں کافی سواریاں موجود تھیں۔ پولیس کے دو چار سپاہی بھی ادھر ادھر منڈلا رہے تھے۔ بادل نے نجمی کو ساتھ لیا اور پیدل ہی اپنے دوست لال دین کے محلے کی طرف چل پڑا۔ بادل جموں شہر کے سارے علاقوں سے واقف تھا۔ نجمی نے کہا " کوئی سواری کر لیتے ہیں۔"

بادل بولا " میں شارٹ کٹ سے لے جاؤں گا۔ سواری کی تو وہ لوگوں سے بھرے ہوئے بازاروں سے گزرے گی۔"

بادل پرانی منڈی کے پہلو سے گزر کر دریائے توی کے پل کی طرف چلنے لگا۔ اب شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ جموں کے خوبصورت اور گنجان شہر کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ پرانی منڈی سے کچھ فاصلے پر بادل رگھوناتھ مندر کے عقب سے ہو کر ایک خالی سڑک پر آ گیا جو آگے جا کر محلہ استاداں کو جانے والی سڑک پر مل جاتی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد جموں میں مسلمانوں

بڑا قتل عام ہوا تھا۔ ہزاروں مسلمان شہید ہو گئے تھے۔ محلہ استاداں جموں کا وہ محلہ ہے جہاں سن سنتالیس کے مسلم کش فسادات میں بچے، کچھ مسلمان کسی نہ کسی طرح یہیں رہ گئے تھے۔ یہاں ایک کشادہ بازار ہے اور پرانی جامع مسجد بھی ہے۔ بادل کا پرانا دوست لال دین جو کبھی بھوپال میں اس کے ساتھ زندگی کے کچھ دن گزار چکا تھا اسی محلے استاداں میں ہی رہتا تھا۔ بادل نجمی کو لے کر اسی کے پاس جا رہا تھا۔ بادل کا خیال تھا کہ ہو سکتا ہے لال دین بارڈر کراس کرانے میں اس کی کوئی مدد کر سکے۔ کیونکہ ایک بار جموں سے لال دین اس کے پاس بھوپال آیا تھا اور اس نے باتوں ہی باتوں میں بادل سے کہا تھا کہ وہ جموں کشمیر کے بارڈر پر کچھ اسمگلروں کے ساتھ مل کر چیزیں ادھر ادھر پہنچانے کا کاروبار کرتا ہے۔ دو تین بار بادل جموں آ کر لال دین سے مل بھی چکا تھا۔

یہاں ایک خالی سائیکل رکشا گزرتا دیکھ کر بادل نے اسے آواز دے کر روک لیا وہ دونوں رکشے میں بیٹھ گئے۔ رات ہونے کی وجہ سے موسم ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ دور دریائے توی کے پل کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ محلہ استاداں والی سڑک پہ پہنچ کر بادل نے رکشا رکوا لیا۔ یہاں سے وہ نجمی کو لے کر پیدل ہی بڑے بازار میں داخل ہو گیا۔ بائیں جانب ایک گلی دو تین گلیوں میں سے ہو کر لال دین کے مکان کو جاتی تھی۔ لال دین نے شادی نہیں کی تھی اور وہ اکیلا ہی تھوڑا بہت کاروبار کر کے زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ محلہ استاداں کی گلیوں کے مکانوں میں کہیں اندھیرا تھا اور کہیں روشنی نظر آ جاتی تھی۔ گلیاں بھی کہیں اندھیری تھیں اور کہیں کھمبوں پر بلب جل رہے تھے۔ بادل ان تمام راستوں سے واقف تھا۔ وہ لال دین کے مکان کے سامنے آ کر رک گیا۔

نجمی نے منہ کے آگے سے چادر ہٹا کر پوچھا "کیا یہی تمہارے دوست کا مکان ہے؟"

"ہاں۔"

مکان کا دروازہ بند تھا۔ دوسری منزل کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ بادل نے آہستہ سے مکان کے بند دروازے پہ دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد اوپر والے کمرے کی کھڑکی کھلی۔

لال دین نے نیچے جھانک کر پوچھا "کون ہے؟"

بادل نے منہ اوپر کر کے آہستہ سے کہا "نیچے آؤ تو بتاؤں یار۔"

لال دین نے بادل کی آواز پہچان لی تھی۔ جلدی سے نیچے آ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ بادل کو دیکھتے ہی وہ اس کے گلے لگ کر ملا۔ ساتھ ایک عورت کو دیکھا تو جلدی سے انہیں اندر آنے کو کہا۔ اوپر والی منزل کے چھوٹے سے کمرے میں دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ کونے میں صندوق رکھا تھا۔ زمین پر ایک طرف دری بچھی تھی اور دو بڑے تکیے دیوار کے ساتھ لگے تھے۔ لال دین نے نجمی اور بادل کو چارپائیوں پہ بٹھایا اور نجمی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "بھابی! یہ میرا بڑا دوست ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہی نہیں اور چپکے چپکے شادی بھی کر لی۔"

یہاں نجمی کی جگہ کوئی دوسری عورت ہوتی تو وہ شرما کر منہ دوسری طرف کر لیتی مگر نجمی ان باتوں سے اب بہت دور ہو چکی تھی۔ اس نے لال دین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے گھورتے ہوئے کہا "میں بادل کی بیوی نہیں ہوں۔"

لال دین چپ سا ہو گیا فوراً نجمی سے معافی مانگنے لگا۔

پھر بولا "تم بیٹھو میں تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں۔ تم تو جانتے ہو کہ میں چھڑا ہوں۔ تم فکر بالکل نہ کرو۔ ابھی بازار سے سب کچھ آ جاتا ہے۔"

لال دین تھیلا لے کر نیچے اتر گیا۔ بادل نے نجمی سے معذرت کے انداز میں کہا "لال دین نے نا سمجھی میں ایسا کہہ دیا تھا۔ تم اس کی بات کا برا نہ ماننا ویسے یہ دل کا بڑا اچھا ہے میرا دوست۔"

نجمی نے اس بات کا بادل کو کوئی جواب نہ دیا وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی کہنے لگی "مجھے نہیں لگتا کہ یہ شخص مجھے بارڈر کراس کروا سکے گا۔ یہ شکل سے شریف اور گھامڑ لگتا ہے۔"

بادل مسکراتے ہوئے بولا "شریف اور گھامڑ ضرور ہے لیکن اس کے اسمگلروں کے ساتھ پرانے تعلقات ہیں۔"

نجمی نے بوسیدہ مکان کے اس پرانے کمرے کو چاروں طرف سے دیکھتے ہوئے کہا "اگرچہ یہ مسلمانوں کا علاقہ ہے لیکن ہمیں یہاں زیادہ دیر تک نہیں رہنا چاہیئے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہاں ہماری کوئی مخبری نہ کر دے۔"

بادل نے پستول نکال کر سامنے رکھ لیا اور نجمی سے کہا "تم بھی اپنا پستول مجھے دے دو اور وہ سامنے غسل خانہ ہے جا کر منہ ہاتھ دھو لو۔ پھر میں بھی منہ ہاتھ دھو لوں گا۔ بہرحال میں آج

رات لال دین سے بات کروں گا۔ کل تک معاملہ سامنے آجائے گا میرا خیال ہے ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رہیں گے۔"

نجمی نے کپڑوں کے اندر سے پستول نکال کر بادل کو دے دیا۔ بادل نے دونوں پستول سرہانے کے نیچے چھپا دیئے۔ نجمی غسلخانے میں چلی گئی۔ نیچے گلی میں خاموشی تھی۔ تھوڑی دیر بعد لال دین کچھ کباب کچھ مچھلی اور نان وغیرہ لے کر آگیا کہنے لگا "چائے ہم خود بنالیں گے۔"

جب اس نے دیکھا کہ نجمی وہاں نہیں تو بادل کے قریب ہو کر بولا "یار مجھ سے بڑی بھول ہو گئی مگر یہ عورت کون ہے؟ بڑی منہ پھٹ عورت ہے۔"

بادل نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا "اس کا نام نجمی ہے۔ بنگال والی چندا ڈکیت کا نام تم نے کبھی نہیں سنا؟"

لال دین کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا "تو یہ چندا ڈکیت ہے؟"

"ہاں" بادل نے جواب دیا۔ اب تم کیا سوچتے ہو؟ کیا میں اسے لے کر یہاں سے چلا جاؤں؟"

لال دین نے بادل کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا "یار! ہم تیرے یار ہیں۔ تیرے لیے جان بھی حاضر ہے۔ خدا کی قسم تو سارے شہر کے ہندوؤں کو قتل کر کے میرے پاس آجا۔ کوئی تیری طرف دیکھے تو سہی۔"

بادل نے موقع غنیمت جان کر کہا "لال دین! میں تیرے پاس ایک خاص مقصد لے کر آیا ہوں۔"

"کہو! میں حاضر ہوں۔ اگر کوئی خدمت کر سکا تو مجھے دلی خوشی ہو گی۔"

بادل نے مختصر لفظوں میں لال دین کو ساری کہانی بیان کر دی اور پھر کہا "اب وہ بارڈر کراس کر کے واپس پاکستان جانا چاہتی ہے۔ تم بتاؤ کہ تم اس معاملے میں ہماری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

لال دین سوچ میں پڑ گیا کہنے لگا "اصل میں بات یہ ہے کہ جن اسمگلروں سے میرے تعلقات تھے اب وہ مجھ سے کافی دور ہو گئے ہیں۔ میں نے عرصہ ہوا یہ دھندا چھوڑ رکھا ہے اور یہاں شہر میں چھوٹی موٹی دکانداری کر کے عزت کی روٹی کما رہا ہوں۔ ویسے بھی جموں کی پولیس مسلمانوں کو جینے نہیں دیتی پہلے کچھ اور بات تھی۔ لیکن تم فکر نہ کرو میں کل ہی اپنے ایک اسمگلر دوست

کے پاس جاتا ہوں مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔"

نجمی غسل خانے سے باہر آئی تو بادل نے اندر جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ لال دین پر نجمی کا بے حد رعب پڑ چکا تھا۔ کن اکھیوں سے اسے بالوں میں کنگھی کرتے دیکھ رہا تھا کہ یہ ہے بنگال کی شیرنی چندا ڈاکو۔ جس کا نام سن کر بنگال کی پولیس پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ نجمی کارنس پر رکھے شیشے کے سامنے کھڑی بالکل آدمیوں کی طرح جلدی جلدی اپنے کٹے ہوئے بالوں میں کنگھی چلا رہی تھی۔ اس نے کوئی میک اپ بھی نہیں کیا۔ تولیے سے منہ پونچھ کر چارپائی پہ بیٹھ گئی۔ لال دین نے کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ کہا "بہن جی! میں غریب آدمی ہوں آپ کی پوری طرح سے خدمت نہیں کر سکوں گا۔ بازار سے جو کچھ مل گیا ہے لے آیا ہوں۔"

نجمی نے لفافہ کھولتے ہوئے کہا "یہ تو نان کباب اور مچھلی ہے مجھے یہ بہت پسند ہے۔ آپ کا شکریہ ہماری وجہ سے آپ کو تکلیف ہو رہی ہے۔"

لال دین فوراً بچھ سا گیا "چندا بہن! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں میں تو....."

نجمی نے چونک کر لال دین کی طرف دیکھا "آپ کو کس نے کہا کہ میرا نام چندا ہے؟"

اب تو لال دین گھبرا گیا کہ کہیں یہ عورت بادل اور اس پر بھی نہ برس پڑے۔ فوراً ہاتھ باندھ کر بولا "معافی چاہتا ہوں بہن جی! مجھے میرے دوست بادل نے آپ کا نام بتایا ہے۔ اصل میں وہ آپ کا تعارف کروا رہا تھا۔"

نجمی سمجھ گئی کہ بادل نے اسے بتایا ہو گا کہ مجھے کیوں غیر قانونی بارڈر کراس کرنا پڑ رہا ہے۔ نجمی نے ہاتھ ذرا سا اٹھا کر کہا "کوئی بات نہیں بھائی صاحب سب ٹھیک ہے۔ ویسے آپ مجھے چندا کی بجائے نجمی کہہ کر پکاریں تو مجھے زیادہ خوشی ہو گی اور ہاں یہ ہندوؤں کی طرح ہاتھ نہ جوڑا کریں آپ مسلمان ہیں اور مسلمان کسی انسان کے آگے ہاتھ نہیں جوڑا کرتے۔"

لال دین شرمسار سا ہو کر بولا "بہن جی! معافی چاہتا ہوں۔ یہاں جموں کے ہندو ڈوگروں میں رہ کر عادت پڑ گئی ہے۔"

نجمی نے کہا "اسی لیے تو قائداعظم نے پاکستان کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ ان کے مذہب رہن سہن ہر شے الگ ہے یہ کبھی ایک ساتھ نہیں

رہ سکتے۔"

لال دین نے حسرت سے کہا" خوش قسمت ہیں بہن جی! وہ مسلمان جو اسلامی ملک پاکستان میں رہ رہے ہیں یہاں تو ہمیں ہندوؤں کا غلام بن کر رہنا پڑ رہا ہے۔ ہندو مسجدوں کے آگے باجا بجاتے گزرتے ہیں اور ہم انھیں منع نہیں کر سکتے۔ ہمارے مسلمان بچوں کو زبردستی ہندووانی تہذیب سکھائی جا رہی ہے۔ جموں میں تو کشمیر کی وجہ سے پھر بھی اردو پڑھنے کی سہولت ہے لیکن باقی ہندوستان میں تو ہر مسلمان بچے کو لازمی طور پر ہندی پڑھنی پڑتی ہے ورنہ تو کہیں نوکری نہیں ملتی۔"

نجمی نے کہا" میں جانتی ہوں دلی جو اردو کا گھر تھا وہاں کے مسلمانوں کی حالت بھی کسی سے چھپی نہیں۔ کلکتہ مدارس کے مسلمانوں کے بارے میں بات کرنی ہی بیکار ہے۔"

اتنے میں بادل غسل خانے سے باہر آگیا انھوں نے مل کر کھانا کھایا۔ رات کو نجمی الگ کمرے میں سو گئی۔ بادل اور لال دین بیٹھک میں آگئے۔ لال دین اپنے پرانے دوست آسمگلر سے ملنے چلا گیا۔ کوئی دو گھنٹے بعد واپس آیا اس کے چہرے سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔ بادل اس کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔" کیوں لال دین کیا ہوا؟"

لال دین سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گیا اور بولا" بات نہیں بنی بادل خان! بارڈر پر فوج گشت کر رہی ہے۔ دینا رام آسمگلر کا کہنا ہے کہ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب بارڈر پر تناؤ ختم ہو گا۔"

بادل خان بھی چپ ہو گیا۔ جانتا تھا کہ وہ نجمی کو لے کر لال دین کے پاس زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتا۔ اس کا خیال تھا کہ لال دین اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے دو ایک دن میں نجمی کو بارڈر پار کروا دے گا اور کہانی کا انجام بخیر و خوبی وقوع پذیر ہو جائیگا۔ لیکن یہاں معاملہ ٹھیک نہیں تھا بادل نے دونوں پستول لال دین کے حوالے کر دیئے تھے جو اس نے لکڑی کے پرانے صندوق میں چھپا دیئے تھے۔ بادل نے پوچھا کہ" کیا کوئی دوسرا ایسا آدمی نہیں جو تمہارا واقف ہو اور جو اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکے۔؟"

لال دین کھیس اپنے اوپر کھینچتے ہوئے بولا" بادل خان! میں سوائے اپنے پرانے ساتھی دینا رام سنگھ کے دوسرے کسی آسمگلر پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ یہاں کسی آسمگلر کو یہ بتانا بڑی خطرناک بات ہے

کہ میں کسی لڑکی کو پاکستان پہنچانا چاہتا ہوں۔ جموں میں پولیس مسلمانوں کے بارے میں بڑی محتاط ہے کسی پر ذرا سا بھی شبہ ہو جائے تو اسے پولیس پوچھ گچھ کے لیے پکڑ کر لے جاتی ہے اور پھر اس کی کوئی خبر نہیں ملتی۔"

بادل خاموش ہو گیا پھر بولا" ایسی صورت میں تم کیا مشورہ دیتے ہو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں یہاں تمہارے پاس بھی زیادہ دیر تک چھپا نہیں رہ سکتا۔ پولیس ہم دونوں کی تلاش میں ہے اور نجمی کی تو تصویریں بھی اخباروں میں چھپ چکی ہیں۔ محلے کی کسی عورت نے نجمی کو دیکھ کر پہچان لیا تو تم پر بھی مصیبت ٹوٹ پڑے گی۔"

لال دین کہنے لگا" تم میری بات نہ کرو میں تم پر اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔"

بادل بولا" لیکن میں تمھیں یوں ہی اپنے اوپر قربان ہونے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

دونوں خاموش ہو گئے۔ دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ بادل نے لال دین سے پوچھا۔" تم مجھے کیا مشورہ دیتے ہو؟ میرا تو خیال ہے کہ بہتر یہی ہے کہ میں نجمی کو لے کر واپس اپنے گوماہ والے جنگل میں چلا جاؤں۔ کم از کم وہاں ہم پولیس سے محفوظ ہوں گے۔ ایک دو ماہ بعد میں پھر تمہارے پاس آ کر پتہ کر جاؤں گا۔ اگر حالات ٹھیک ہو گئے تو نجمی کو بھی لے آؤں گا۔"

لال دین بولا" میرا خیال ہے ان حالات میں تمھارے لیے یہی بہتر رہے گا کیونکہ یہاں کچھ ایسے مسلمان بھی رہتے ہیں جن کے بارے میں مجھے شک ہے کہ وہ پولیس کے مخبر ہیں۔ دو ایک دن کی بات ہوتی تو میں تمھیں چھپا سکتا تھا لیکن اب معاملہ لمبا ہے اور تمھیں اور نجمی کو یہاں دیکھا جا سکتا ہے۔ مجھے یہاں کے مشکوک لوگوں سے خطرہ ہے۔"

بادل نے کہا" گھبراؤ نہیں لال دین! آج کی رات تو کسی طرح گزار لیتے ہیں کل رات کو نجمی کو لے کر میں یہاں سے واپس نکل جاؤں گا۔"

لال دین نے کہا" اگر پیسوں کی ضرورت ہو تو پیش کر سکتا ہوں۔"

بادل نے کہا" پیسے تمھاری دعا سے ہمارے پاس بہت ہیں۔ اچھا کل بات کریں گے مجھے نیند آ رہی ہے۔"

لال دین چارپائی پر لیٹتے ہوئے بولا" سو جاؤ دوست سفر کے تھکے ہوئے ہو۔"

اور تھوڑی دیر بعد دونوں گہری نیند سو رہے تھے۔ دوسرے دن بادل اور نجمی کافی دیر سے اٹھے لال دین بازار سے ان کے لیے ڈبل روٹی اور مکھن لینے گیا ہوا تھا۔ لال دین بیکری میں ہی چیزیں لفافے میں ڈلوا رہا تھا کہ غلام احمد زرگر نے قریب آکر پوچھا "کیوں لال دین کیا بات ہے باہر سے مہمان آگئے ہیں کیا۔ رات بھی تم نان کباب اور مچھلی بازار سے لے کر گئے تھے۔"

لال دین کچھ پریشان سا ہو گیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ غلام احمد زرگر کے جموں کی خفیہ پولیس سے تعلقات ہیں۔ لال دین نے اس پریشانی کو اپنے چہرے سے ظاہر نہ ہونے دیا اور مسکرا کر بولا "ارے بھائی میرا ایک رشتے دار کٹھوعہ سے آگیا تھا رات کو اب ناشتہ کرکے چلا جائے گا تم سناؤ تمھارا کیا حال ہے؟"

غلام احمد بڑی معنی خیز نگاہوں سے لال دین کی طرف دیکھ رہا تھا کہنے لگا "بس لال دین تمھاری دعا سے ٹھیک ٹھاک ہوں اچھا چلتا ہوں۔"

اور وہ بیکری سے باہر چلا گیا۔ لال دین کا ماتھا ٹھنکا۔ غلام احمد زرگر کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے لال دین کی بات کا اعتبار نہیں آیا۔ لال دین ناشتے کا سامان لے کر واپس اپنے مکان پر آگیا اس نے بادل اور نجمی سے کوئی بات کرنا مناسب خیال کیا۔ ناشتے کے بعد لال دین نے کہا "بادل خان! تم اور نجمی اوپر والے کمرے میں ہی رہنا۔ کوئی بھی آئے اوپر سے آواز مت دینا۔ میں مکان پر تالا لگا کر تھوڑی دیر کے لیے جا رہا ہوں۔"

لال دین مکان کو تالا لگا کر چلا گیا۔ بادل اور نجمی دوسری منزل والے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بادل نے نجمی کو بتا دیا تھا کہ لال دین ابھی بارڈر کراس نہیں کروا سکتا اور ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہم مہینے دو مہینے کے لیے واپس اپنے جنگل والے ٹھکانے پر چلے جائیں۔"

نجمی نے کہا "ٹھیک ہے مجبوری ہے یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔"

دوپہر کے وقت لال دین بھی آگیا۔ وہ بازار سے مچھلی کباب وغیرہ ساتھ لایا تھا۔ گلی میں اسے ایک بار پھر غلام احمد زرگر مل گیا وہ معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا بولا۔

"تمھارا مہمان تمھارا بڑا خرچہ کرا رہا ہے لال دین۔ کہو تو میں کھانا بھجوا دیا کروں؟"

لال دین کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ خاموش رہا۔ شام ہو چکی تھی۔ گلی میں ہلکا ہلکا رات کا اندھیرا

اترنے لگا تھا کہ لال دین گھبرایا ہوا مکان کا تالا کھول کر اوپر آیا اور بولا۔

"جلدی سے میرے ساتھ آؤ پولیس کو تمھاری خبر ہو گئی ہے جلدی کرو۔"

بادل اور نجمی نے پستول اور روپے تھیلے میں ڈال کر ساتھ لیے اور لال دین کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اتر کر گلی کے اندھیرے میں تیز تیز چلنے لگے۔ لال دین نے مکان پر تالا لگا دیا تھا۔ وہ بازار کی طرف جانے کی بجائے دوسری طرف ایک اور گلی میں آگیا۔ یہ گلی ڈھلانی تھی آگے ایک اور تنگ گلی آتی تھی ان گلیوں سے گزرتا لال دین بادل اور نجمی کو لے کر دریائے توی کے پل کی طرف آگیا۔ پل کی روشنیاں جل رہی تھیں۔

یہاں آکر لال دین نے بادل اور نجمی کو بتایا کہ غلام احمد زرگر نے مخبری کر دی ہے۔ ہو سکتا ہے اب تک پولیس میرے مکان پر پہنچ گئی ہو۔ مگر تم فکر نہ کرو۔ وہاں تمھاری موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ میں واپس جا کر پولیس کو سنبھال لوں گا۔"

بادل نے پوچھا "اب وہ انھیں کہاں لے جا رہا ہے؟"

لال دین نے دریائے توی کے دوسرے کنارے والے سنگتروں کے گھنے باغوں کی طرف اشارہ کرکے کہا:

"دریا پار کے سنگتروں کے باغ میں ایک جگہ ہے وہاں تم محفوظ ہوگے۔ ابھی تو وہاں رہو بعد میں دیکھا جائے گا۔"

اور وہ تینوں دریا کے پل پر سے گزرنے لگے۔

-- -- ؞ -- --

جموں شہر کے رہنے والوں کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ دریائے توی کے شمال کی جانب دوسرے کنارے پر آم اور سنگتروں کے گھنے باغ ہیں ان کے پیچھے پہاڑیوں کی ڈھال میں جگہ جگہ بڑے بڑے کھوہ یعنی گہرے شگاف بنے ہوئے ہیں یہ قدرتی کھوہ ہیں اور ان کو وہاں کی مقامی زبان میں پیر کھوہ کہتے ہیں۔ لال دین نے بادل خان اور نجمی کو ساتھ لے کر دریائے توی پار کیا اور آم سنگتروں کے گھنے باغ میں سے ہوتا ہوا پہاڑیوں کے پیر کھوہ کے پاس آ کر رک گیا۔ شام کا اندھیرا کافی گہرا ہو گیا تھا۔ لال دین نے بادل سے کہا ”تم لوگ اس پہاڑی کھوہ میں کسی طرح رات گزار لو میں منہ اندھیرے آؤں گا۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں اس اجاڑ جگہ پر کوئی نہیں آئے گا۔“

لال دین تیزی سے واپس چل دیا۔ بادل اور نجمی پہاڑی کھوہ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ پستول دونوں کے پاس موجود تھے۔

بادل کہنے لگا ”ہماری مخبری ہو گئی ہے۔ لال دین نے تو کہا ہے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ہر اعتبار سے چوکس رہنا چاہیئے۔ تم یہاں بیٹھو میں باہر پہرہ دیتا ہوں۔“

بادل کھوہ سے نکل کر باہر آ گیا یہاں اندھیرے میں پہاڑ کی ڈھلان پر جگہ جگہ جنگلی جھاڑیاں اگی تھیں۔ آگے جا کر آم کے گھنے باغ آ جاتے تھے۔ دور نیچے جموں شہر کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ بیچ میں دریائے توی بہہ رہا تھا جو دکھائی نہیں دیتا تھا صرف اس کے پل کی روشنیاں جھلملاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ بادل نے پستول نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا وہ کھوہ کے سامنے ایک جھاڑی کے پیچھے بیٹھ گیا۔

دوسری طرف لال دین جب اپنے مکان پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ مکان کا تالا توڑ کر پو

مکان کی تلاشی لے رہی ہے۔

لال دین کو دیکھتے ہی ہندو ڈوگرا تھانیدار نے گرجدار آواز میں کہا ”وہ پاکستانی جاسوس کہاں ہیں جنہوں نے تمہارے پاس پناہ لے رکھی تھی۔“

لال دین نے ہاتھ باندھ لیے اور عاجزانہ لہجے میں کہا ”مہاراج کسی نے آپ کو غلط اطلاع دی ہے میرے گھر تو کٹھوعہ سے رات ایک رشتے دار آیا تھا سویٹر اور پراندے خریدنے۔ ابھی ابھی وہ چلا گیا ہے میں اسے کٹھوعہ جانے والی لاری میں چڑھا کر آ رہا ہوں۔“

ہندو تھانیدار نے آگے بڑھ کر اتنی زور سے لال دین کے منہ پر تھپڑ مارا کہ وہ لڑھک کر گر پڑا اور اس کے ہونٹ کا ایک کنارہ پھٹ گیا اور خون بہنے لگا ”حرامی جھوٹ بولتے ہو۔ ہم تم سب غداروں سے واقف ہیں سیدھی طرح بتا دو کہ پاکستانی جاسوسوں کو تم نے کہاں چھپایا ہے ورنہ ہمیں راز اگلوانا آتا ہے بتاؤ۔“

لال دین اسی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑا تھا اور عاجزی سے کہنے لگا ”مہاراج! یہ کسی نے میرے ساتھ دشمنی کی ہے۔ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا کہ کسی پاکستانی جاسوس کو پناہ دوں“

ہندو تھانیدار نے لال دین کو ایک اور تھپڑ مارا اور اپنے کانسٹیبل سے کہا ”اسے تھانے لے چلو یہ ایسے نہیں بکے گا۔“

لال دین کے مکان سے پولیس کو بادل اور نجمی کی موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔ صرف اوپر والی کوٹھڑی میں ایک بستر بچھا تھا جس کے بارے میں لال دین نے یہی کہا کہ یہ اس نے اپنے کٹھوعہ والے رشتے دار کے لیے بچھایا تھا۔ پولیس لال دین کو پکڑ کر تھانے لے گئی۔ اس کے مکان کو دوبارہ تالا لگا دیا گیا۔ ساری رات لال دین پر شدید تشدد ہوتا رہا۔ اسے لاتوں، گھونسوں اور جوتوں سے مارا گیا چھت سے الٹا لٹکایا بھی گیا۔

مگر ہر بار لال دین ہاتھ باندھ کر یہی کہتا ”مہاراج! کسی نے میرے ساتھ دشمنی کی ہے میرے ہاں اگر کوئی پاکستانی جاسوس آتا تو میں خود تھانے آ کر اطلاع کر دیتا۔“

مگر ہندو تھانیدار کو ابھی تک لال دین کے بیان پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ لال دین پر ساری رات تشدد کا سلسلہ جاری رہا لیکن لال دین کی ہمت اور دلیری کی داد دینی پڑے گی کہ اس

نے شدید درد اور تکلیف میں بھی بادل اور نجمی کا نام نہ لیا۔

پولیس کو بھی ابھی تک یہ علم نہیں تھا کہ اس کے ہاں جو لوگ ٹھہرے تھے ان میں ایک بادل ڈاکو تھا اور دوسری عورت بنگال کی مشہور ڈکیت اور قاتل چندا ڈاکو تھی۔ مخبر نے صرف یہی خبر دی تھی کہ لال دین کے گھر کوئی ایسا مہمان آیا ہے جس کو اس نے مکان کے اندر بند کر کے رکھا ہوا ہے اور اسے باہر نہیں نکلنے دیتا۔ مخبر نے یہ بھی خدشہ ظاہر کیا تھا کہ یہ دو مہمان ہیں اور یقینی طور پہ پاکستانی جاسوس ہیں جو بارڈر کراس کر کے وہاں پہنچے ہیں۔

جموں توی کے تھانے میں رات بھر لال دین پہ تشدد ہوتا رہا۔ اس کی چیخوں کی آوازیں در و دیوار ہلاتی رہیں اور دوسری طرف بادل اور نجمی رات بھر توی دریا کے پار والے ویرانے میں جاگتے رہے۔ نجمی پہاڑی کی پیر کھوہ میں چھپی رہی اور بادل باہر جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھا پستول ہاتھ میں لیے پہرہ دیتا رہا۔ رات کے پچھلے پہر وہ نجمی کے پاس کھوہ کے اندر آ گیا۔ نجمی کی آنکھ لگ گئی تھی۔ بادل باہر آ گیا رات تیزی سے ڈھلنے لگی تھی۔ آسمان پہ سلیٹی رنگ کی دھندلی دھندلی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ اندھیرے میں سے جموں شہر کے مکانوں، گھنے باغ کے آم کے درختوں اور توی کے پل کا خاکہ ابھر رہا تھا۔ لال دین نے بادل سے کہا تھا کہ وہ رات کے پچھلے پہر آئے گا۔ رات کا پچھلا پہر بھی گزر گیا۔ پھر مشرقی پہاڑیوں کے عقب سے سورج کی سنہری کرنیں نمودار ہوئیں۔ بادل اب واپس کھوہ کے اندر چلا گیا تھا۔ نجمی جاگ پڑی تھی۔ بادل نے پہلے سے دیکھ لیا تھا کہ ایک چھوٹا سا پہاڑی نالہ قریب ہی پتھروں کے درمیان بہہ رہا ہے۔ بادل نے ہاتھ منہ دھو لیا تھا اور ٹھنڈا پانی بھی پیا تھا۔ اس نے نجمی سے کہا: "نیچے پتھروں میں نالہ بہہ رہا ہے تم بھی وہاں جا کر منہ ہاتھ دھو لو"

نجمی بولی "تمہارا دوست ابھی تک نہیں آیا دن تو نکل آیا ہے۔"

بادل بولا: "وہ نہیں آیا خدا خیر کرے کہیں پولیس اسے پکڑ کر نہ لے گئی ہو۔"

نجمی نے تشویش کے لہجے میں کہا: "کہیں وہ بک تو نہیں پڑے گا۔"

بادل کہنے لگا: "وہ مر جائے گا مگر ہمارا نام نہیں لے گا وہ نڈر آدمی ہے میں اس کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

نجمی نے کہا: "ٹھیک ہے لیکن ہم یہاں کب تک چھپے رہیں گے اگر اسے پولیس پکڑ کر لے گئی

ہے تو وہ اسے نہیں چھوڑے گی۔ ظاہر ہے کسی نے یہی مخبری کی ہو گی کہ اس کے ہاں بادل اور چندا ڈکیت چھپے ہوئے ہیں۔"

بادل بولا: "میرا خیال ہے پولیس کے مخبر کو ہمارا علم نہیں ہے اس نے یہی اطلاع دی ہو گی کہ لال دین کے ہاں پاکستانی جاسوس ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

نجمی نے کہا: "یہ بھی بڑا سنگین الزام ہے۔ پولیس لال دین کو کم از کم ایک ہفتے تک اپنی حراست میں ضرور رکھے گی۔ مجھے خطرہ لگتا ہے بادل! اگر جسمانی اذیت سے گھبرا کر لال دین بک پڑا تو ہماری گرفتاری یقینی ہے۔ ہمیں یہاں سے کسی دوسری طرف نکل جانا چاہیئے تم تو اس شہر سے واقف ہو کیا ہم کسی اور جگہ جا کر نہیں چھپ سکتے؟"

بادل سوچنے لگا۔ پھر بولا: "دوسری کوئی جگہ اوپر پہاڑیوں کا جنگل ہی ہو سکتا ہے۔"

نجمی نے پوچھا: "کیا اوپر والے چیڑ کے جنگل میں دیہاتی لوگ نہیں رہتے؟"

بادل بولا: "گوجروں اور گوالوں کے کچھ کچے پکے مکان ضرور ہیں مگر جنگل اتنا بڑا ہے کہ ہم وہاں کوئی محفوظ جگہ تلاش کر سکتے ہیں۔"

نجمی نے کہا: "تو پھر ہمیں اوپر والے جنگل میں ہی چلے جانا چاہیئے۔ میں منہ ہاتھ دھو کر آتی ہوں۔ ہم ابھی یہاں سے نکل چلیں گے۔"

نجمی کھوہ میں سے نکل کر نیچے پہاڑی نالے کی طرف چلی گئی۔ بادل کا ذہن تیزی سے سوچنے لگا کہ کیا جنگل میں انہیں چھپنے کے لیے کوئی مناسب جگہ مل جائے گی۔ لیکن نجمی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ان کا وہاں رہنا کسی طرح سے بھی مناسب اور محفوظ نہیں تھا۔ لال دین لاکھ پُر اعتماد اور بھروسے کا آدمی سہی لیکن پولیس کے تشدد سے گھبرا کر وہ ہتھیار بھی ڈال سکتا تھا۔ یہ سوچ سوچ کر بادل نے آخر اوپر والے جنگل میں ہی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جب نجمی چشمے سے واپس آئی تو بادل خان اسے ساتھ لے کر پہاڑیوں کی آڑ میں پہاڑی کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ چڑھائی زیادہ تکلیف دہ نہیں تھی وہ رک رک کر چڑھائی چڑھتے چلے گئے۔ جب وہ پہاڑ کی چوٹی والے چیڑ کے گھنے جنگل میں پہنچے تو نجمی بے دم سی ہو کر ایک جگہ لیٹ گئی اس چڑھائی نے اسے تھکا دیا تھا۔ جب ان کے سانس درست ہوئے تو نجمی نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور بولی "یہاں کوئی مکان وغیرہ نظر نہیں آ رہا۔"

بادل بولا "آگے مشرق کی طرف جائیں تو نیچے ڈھلوان پر کسانوں اور گوالوں کے چند ایک پتھریلے مکان ضرور ہیں مگر ہم اس طرف نہیں جائیں گے۔"

نجمی نے کہا "ہم ادھر نہیں جائیں گے لیکن وہ تو بھیڑ بکریاں چراتے ادھر آ سکتے ہیں۔"

بادل بولا "تو پھر ہمیں پہاڑ کی جنوب کی طرف چھپنے کے لیے کوئی نہ کوئی جگہ تلاش کرنی ہوگی"

سورج کی روشنی اب پہاڑی کے اوپر چیڑ کے درختوں میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں سے نیچے جموں شہر کا سارا منظر نظر آرہا تھا۔ چیڑ کے درختوں کا یہ جنگل کافی گھنا تھا۔ اونچے اونچے درخت اوپر جا کر ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے۔ جنوب کی جانب ڈھلان پر کئی چٹانیں باہر کو ابھری ہوئی تھیں ان چٹانوں میں ایک جگہ چھوٹا سا چشمہ بہہ رہا تھا۔ یہ چشمہ درختوں اور پہاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ بادل نے آس پاس کسی محفوظ پناہ کی تلاش شروع کر دی۔ بہت جلد انھیں چشمے ہی کے پاس چٹان کے اندر چھوٹا سا غار نما شگاف مل گیا وہ اس کے اندر جا کر بیٹھ گئے

بادل کہنے لگا "یہاں ہمیں کھانے کو کچھ نہیں ملے گا پانی تو چشمہ پہ مل جائے گا۔" نجمی نے دوسری ٹیکریوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم اس علاقے سے واقف ہو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم ادھر کسی گاؤں سے کچھ کھانے کو لے آؤ۔"

نجمی کی تجویز معقول تھی۔ دن کافی چڑھ آیا تھا۔ بہر حال یہ لوگ وہاں بھوکے نہیں رہ سکتے تھے۔ بادل نے اپنا پستول اور روپے نجمی کے پاس رکھے۔ صرف دس روپے کا نوٹ اپنے پاس رکھا اور بولا "میں کہیں سے کھانے کو کچھ لاتا ہوں۔ تم اسی جگہ بیٹھی رہنا۔"

بادل وہاں سے چلتا ہوا نیچے ایک پہاڑی پگڈنڈی پر آگیا یہاں اسے ایک جانب چھوٹا سا گاؤں نظر آیا وہ پگڈنڈی پر سے گزر کر گاؤں میں آگیا۔ یہ گاؤں ڈھلانی چھتوں والے چند ایک دیہاتی مکانوں پر مشتمل تھا۔ ایک ٹیلے کی چوٹی پر چھوٹا سا مندر بنا ہوا تھا جس پر مائی شیراں والی کا پیلا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ گاؤں کا ایک ہی چھوٹا سا بازار تھا جس میں چار پانچ دکانیں تھیں یہاں ایک دکان پر سے بادل نے کچھ گڑ، تیل میں تلی ہوئی بڑی بڑی چھ سات مٹھیاں اور ڈھابے سے دس بارہ چھوٹی چھوٹی روٹیاں خریدیں اور جدھر سے آیا تھا ادھر ہی سے چلتا واپس نجمی کے پاس آگیا۔ انھوں نے گڑ کے ساتھ تھوڑی تھوڑی روٹی کھائی۔ باقی چادر میں لپیٹ کر ایک طرف رکھ

دی۔ پہاڑی کے اوپر اس چیڑ کے جنگل میں خنک ہوا چل رہی تھی۔ دن کافی چڑھ آیا تھا۔ اب ایک طرف سے کچھ بکریاں نمودار ہوئیں ایک گوالن چھڑی لیے ان کے ساتھ تھی۔ یہ جموں کی دیہاتی گوالنوں والے لباس میں تھی۔ نجمی نے کہا "یہ ادھر تو نہیں آئے گی بادل؟"

بادل نے دیکھا گوالن وہاں سے کافی دور درختوں میں بکریوں کو آوازیں دیتی چل پھر رہی تھی کہنے لگا "میرا خیال ہے وہ ادھر نہیں آئے گی۔ بکریاں نیچے ڈھلانوں پہ ہی عام طور پر چرا کرتی ہیں۔"

اس غار میں بیٹھے بیٹھے انھیں سارا دن گزر گیا پھر دن کی روشنی کم ہونے لگی۔ سورج مغرب کی طرف پہاڑیوں کے عقب میں چلا گیا۔ آہستہ آہستہ دن کی روشنی بھی مغرب کی طرف سمٹ گئی اور سارے چیڑ کے جنگل پر شروع رات کا سرمئی سا اندھیرا چھا گیا۔ نجمی نے کچھ بے چین سا ہو کر پوچھا "بادل! یہاں اس طرح ہم کب تک پڑے رہیں گے؟ ظاہر ہے تمھارا دوست اب ہمیں بارڈر پار کرانے کی پوزیشن میں نہیں ہے پھر ہم کس لیے خطرات میں گھر کر یہاں بیٹھے ہیں۔"

بادل نے کہا "میں آج ہی رات شہر جا کر لال دین کا پتہ کرتا ہوں۔"

نجمی نے کہا "تمھارا شہر جانا ٹھیک نہیں پولیس کے آدمی ضرور لال دین کے مکان کی نگرانی کر رہے ہوں گے۔ میرا تو خیال ہے کہ ہمیں یہیں سے واپس اپنے کوہ ماہ والے جنگل کی کمین گاہ کی طرف کوچ کر جانا چاہیے۔ اب یہاں پڑے رہنا بیکار ہے۔"

بادل کو بھی اب بارڈر کراس کرنا اب ناممکن نظر آرہا تھا کہنے لگا "تم ٹھیک کہتی ہو لیکن میں ایک بار لال دین سے ملنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اتنی دور سے چل کر ہم یہاں آئے ہیں اتنا طویل فاصلہ طے کر کے اتنے خطروں میں سے گزر کر واپس جانا بھی آسان کام نہیں ہے۔ ایک بار لال دین سے مل کر پتہ کر لوں شاید وہ کوئی دوسرا راستہ بتا دے اس کے اس علاقے کے اسمگلروں سے تعلقات ہیں۔"

نجمی کہنے لگی "کیا تمھیں یقین ہے کہ پولیس نے اسے چھوڑ دیا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اسے ملنے جاؤ اور پولیس تمھیں پکڑ لے۔"

بادل کچھ سوچ کر بولا "تمھارا خدشہ بھی صحیح ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ جانے سے پہلے لال دین سے ایک بار مل لوں۔ آخر ہمیں یہاں سے واپس جانا ہے ہی تو کیوں نہ یہ چانس بھی

دل سے نکال لی جائے۔ ممکن ہے وہ گھر واپس آ گیا ہو اور ہمیں کوئی دوسری ترکیب بتا دے وہ ہمیں آگے کشمیر کے بارڈر تک بھی پہنچا سکتا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ جموں کو چھوڑ کر وادی سے بھی ہمیں بارڈر کراس کروا سکتا ہے۔"

نجمی نے دم بدم گہری ہوتی شام کے اندھیرے میں گم ہوتے چیڑ کے درختوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے تم جا کر دیکھ لو لیکن وہاں دیر مت لگانا یہ بات دھیان میں رکھنا کہ جب تک تم واپس نہیں آؤ گے میں پریشان رہوں گی۔"

بادل بولا "میں ہر حالت میں واپس آؤں گا انشاءاللہ۔"

جونہی اندھیرا ہوا بادل نے اپنا بھرا ہوا پستول کپڑوں کے اندر چھپایا، گڑ کے ساتھ تھوڑی سی روٹی کھائی اور نجمی کو غار کے اندر ہی بیٹھے رہنے کی تاکید کر کے اللہ کا نام لے کر وہاں سے نیچے اترنے لگا۔ پہاڑی ٹیکریوں کی اترائی آسان تھی۔ وہ دس پندرہ منٹ میں نیچے بیر کھوہ کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں آ گیا۔ یہاں سے اس نے آم اور سنگتروں کے اندھیرے باغ کو عبور کیا اور توی دریا کے پل کا رخ پکڑ لیا۔ پل کراس کرتے ہوئے اسے خطرہ تھا کہ اگر وہاں پولیس ہوئی تو اس کی چیکنگ ضرور ہو گی وہیں سے بادل نے فیصلہ کر لیا کہ وہ پیدل چل کر پل عبور نہیں کرے گا۔ پل ابھی ایک فرلانگ دور تھا کہ بادل سڑک کی ایک جانب بیٹھ گیا اس نے چادر لپیٹ رکھی تھی۔ بھرا ہوا پستول اس کی صدری کی جیب میں پڑا تھا۔ پیچھے اودھم پور والی سڑک کی طرف سے ایک لاری آتی نظر آئی۔ اس کی بتیاں جل رہی تھیں اس کے ہارن کی آواز سے بادل نے اندازہ لگا لیا کہ یہ لاری ہی ہو سکتی ہے جو بانہال بٹوت وغیرہ سے آ رہی ہو گی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لاری قریب آئی تو بادل نے اسے ہاتھ دے دیا۔ لاری اس کے قریب سے ہوتی ہوئی تھوڑا آگے جا کر رک گئی۔ بادل اس کے پیچھے دوڑا کلینر دروازے میں لٹکا ہوا تھا اس نے وہیں سے آواز لگائی "دو روپے لگیں گے جموں اڈے کے۔"

بادل نے لاری میں گھستے ہوئے کہا "ہاں ہاں لے لینا یارا۔"

کلینر نے زور سے لاری کی دیوار پہ ہاتھ مارا۔ لاری پل کی طرف روانہ ہو گئی۔ جوں جوں دریائے توی کا پل قریب آ رہا تھا بادل کی تشویش بڑھ رہی تھی اندھیرے میں اسے کچھ نظر

نہیں آ رہا تھا کہ پل کے پاس پولیس کھڑی ہے کہ نہیں... لاری پل کے دروازے پہ پہنچ کر رک گئی۔ ایک ڈوگرہ پولیس کانسٹیبل دروازے میں سے جھک کر لاری کے اندر آ گیا۔ یہ سکھ تھا اس نے اندر آتے ہی مسافروں پر ایک اڑتی ہوئی نظر ڈالی اور پوچھا "سواریاں کہاں سے آ رہی ہیں بھائی؟"

ایک دو ہندو مسافروں نے بیک زبان کہا کہ ہم بٹوت سے آ رہے ہیں اتنی دیر میں سکھ کانسٹیبل دو تین قریب کی سواریوں کو یوں جھک کر دیکھ چکا تھا جیسے انھیں سونگھ رہا ہو۔

کلینر جو باہر سڑک پہ کھڑا تھا چلا کر بولا "کسی کے پاس ناجائز اسلحہ ہے تو نکال کر رکھ دے یہاں۔"

بادل کی اندرونی صدری میں بھرا ہوا پستول موجود تھا لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ بادل جیسا ڈاکو اتنی آسانی سے اپنا پستول ان کے حوالے کر دیتا۔ وہ چپکا بیٹھا رہا۔ سکھ کانسٹیبل لاری سے اتر گیا۔ باہر والے کانسٹیبل نے پوچھا "ٹھیک ہے سردارا؟"

سکھ کانسٹیبل نے گالی دے کر کہا "ٹھیک ای اے۔" کلینر نے دونوں کانسٹیبلوں کو سلام کیا اور لاری کی باڈی پہ زور سے ہاتھ مار کر چلایا "چلو جی۔"

لاری توی کے پل پر سے گزرنے لگی۔ بادل خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے صرف اتنا کیا کہ جو ہاتھ صدری کے اندر پستول پہ جما ہوا تھا باہر نکال لیا۔

لاری پل پار کر کے جموں کے مین لاری اڈے کی طرف بڑھنے لگی۔ بادل نے ایک خاص سڑک پہ لاری کو رکوایا اور نیچے اتر کر محلہ استاداں کی طرف چلنے لگا وہ بڑی سڑک کی طرف جانے کی بجائے تنگ گلیوں کی جانب سے محلہ استاداں میں داخل ہوا۔ گلیاں نیم روشن تھیں۔ وہ لال دین کے مکان کے سامنے آ کر رک گیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ لال دین کے مکان پہ تالا نہیں لگا ہوا تھا، اوپر والے چوبارے میں بتی جل رہی تھی۔ بادل کو بڑی خوشی ہوئی کہ لال دین تھانے سے واپس آ گیا تھا۔ اس نے دروازے کو ذرا سا اندر دھکیلا۔ دروازہ اندر سے کھلا تھا۔ بادل کو دستک دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ڈیوڑھی میں آ گیا۔ دائیں طرف جو بیٹھک تھی اس کے دروازے پہ قفل چڑھا ہوا تھا۔ ڈیوڑھی میں سے اوپر تنگ زینہ دوسری منزل کو جاتا تھا۔

یہاں زینے میں اوپر چڑھ کر بادل نے آہستہ سے آواز دی "لال دین؟"

اوپر سے کوئی جواب نہ آیا۔ بادل خان نے دوسری بار آواز دی تو اوپر والے چوبارے کے بند دروازے کے پیچھے سے ایک عورت کی آواز آئی "کون ہے؟"

بادل حیران ہوا کہ یہ عورت کہاں سے آ گئی؟ اتنی دیر میں دروازہ کھلا۔ ایک جوان عورت جس نے ساڑھی پہن رکھی تھی دروازے میں نمودار ہوئی اور نیچے سیڑھیوں میں جھانک کر بولی۔ "تمھیں یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں۔"

بادل سمجھ گیا کہ یہ لال دین کی کوئی رازدار عورت ہے اور لال دین نے ہی یہاں رکھا ہوا ہے اس کے باوجود بادل نے اپنی شناخت ظاہر کرنی مناسب نہ سمجھی اور کہا "بی بی! میں لال دین سے ملنے ادھم پورے سے آیا ہوں۔"

جوان عورت دروازے میں بیٹھ گئی اور ہاتھ کا اشارہ کر کے سرگوشی میں بولی "اتنی اونچی آواز میں کیوں بول رہے ہو؟ میری بات کا جواب دو تمھیں یہاں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

بادل پھر بھی اپنی جگہ پر قائم رہا۔ کہنے لگا "بی بی! میں تمھاری بات نہیں سمجھا۔ مجھے یہاں آتے کوئی دیکھ بھی لے گا تو کیا ہو گا۔ میں کوئی چور ڈاکو تو نہیں ہوں۔ میں لال دین کا پرانا دوست ہوں اور ادھم پور میں منیاری کی دکان کرتا ہوں۔"

جوان اور خوبصورت عورت نے سیڑھیوں میں آ کر بادل کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی "مجھے لال دین نے خاص طور پر تمھارے لیے یہاں بھیجا ہے۔ تم سیڑھیوں میں کس لیے کھڑے ہو؟ اپنے ساتھ مجھے بھی گرفتار کرواؤ گے کیا؟"

بادل چپکے سے اوپر والے کمرے میں آ گیا ابھی تک اس نے اپنے آپ کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ اوپر آتے ہی بولا "لال دین کہاں ہے؟ کیا جموں سے باہر گیا ہوا ہے؟"

جوان عورت نے گلی والی کھڑکی بند کر دی اور بادل کو چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بادل چارپائی پر بیٹھ گیا تو عورت بھی سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اپنی ساڑھی کے پلّو کو سینے پر درست کرتے ہوئے کہنے لگی "اسے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے میں اس سے حوالات میں ملنے گئی تو اس نے مجھے تمھارے بارے میں بتایا کہ تم اسے ملنے شاید اس کے مکان پر آؤ گے۔"

بادل نے انجان پن سے پوچھا "پولیس اسے کیوں پکڑ کر لے گئی ہے؟ اس نے کیا کیا ہے؟ وہ تو بڑا شریف آدمی ہے۔"

جوان عورت نے کہا "تمھاری وجہ سے تو وہ حوالات میں بند ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ اسے پولیس کیوں پکڑ کر لے گئی ہے؟"

بادل چپ ہو گیا۔ وہ ایک زیرک ڈاکو تھا۔ یہ ایک چال اور پولیس کا بچھایا ہوا جال بھی ہو سکتا تھا۔ اس نے عورت سے ایک ایسا سوال کر دیا جس کے جواب میں عورت کچھ بوکھلا سی گئی۔ بادل نے پوچھا "لال دین نے تمھیں میرا نام کیا بتایا تھا۔؟"

لال دین نے پولیس کی گھناؤنی اذیتیں برداشت کر لی تھیں مگر زبان سے بادل یا چندا گجی کا نام تک نہیں لیا تھا۔ جوان عورت کچھ چکر سا کھا گئی۔ مگر جلد ہی سنبھل کر بولی "اس نے مجھے تمھارا نام نہیں بتایا۔ اتنا وقت ہی نہیں تھا۔ ہمارے سر پر حوالات کے باہر کانسٹیبل کھڑا تھا۔"

بادل اب اپنی جگہ پر پکا ہو گیا اس کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ پولیس کی ایک سازش ہے۔ ایک جال ہے جس کے وہ بالکل قریب بلکہ اس کے تقریباً اندر آ چکا ہے۔ اس نے چادر کے اندر ہی اندر اپنا ہاتھ صدری کی پستول والی جیب میں ڈال لیا اور کہا "بی بی! مجھے کچھ معلوم نہیں کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میں تو ادھم پور سے لال دین سے مال لینے آیا ہوں اب تم کہہ رہی ہو کہ وہ حوالات میں ہے۔ پولیس اسے پکڑ کر لے گئی ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اچھا میں چلتا ہوں۔"

بادل اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک صدری کی جیب میں پستول پر ہی تھا جوان اور خوبصورت عورت نے بادل کو اٹھتے دیکھا تو بے اختیار اس سے لپٹ گئی "رات کے وقت کہاں جاؤ گے۔ آج رات میرے پاس ہی رہ جاؤ میں تمھارے لیے کھانا بناتی ہوں۔"

اب اس میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ گیا تھا کہ اس عورت کو یہاں پولیس نے بھیج رکھا ہے اور یقیناً پولیس بھی اس مکان میں موجود ہے۔ بادل نے اسے جھٹک کر اپنے سے الگ کیا اور بولا۔ "میں ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں بی بی! لال دین سے جا کر کہہ دینا کہ بشیرا ادھم پور والا آیا تھا۔"

یہ کہہ کر بادل نیچے سیڑھیوں کی طرف بڑھا ہی تھا کہ جو زینہ چھت کو جاتا تھا وہاں سے ایک سکھ چھلانگ لگا کر سامنے آ گیا اور تحکمانہ لہجے میں بولا "کھڑا رہ اوئے ایتھے ای۔"

سکھ کے ہاتھ میں پستول تھا۔ بادل پولیس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس چکا تھا لیکن وہ اتنی آسانی سے پولیس کے قبضے میں آنے والا نہیں تھا۔ وہ کوئی شریف سیدھا سادا احمق اور ناتجربہ کار آدمی نہیں تھا ایک ایسا سنگدل اور بے رحم ڈاکو تھا جو اب تک نہ جانے کتنے سکھ پولیس والوں کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔ موت اس کے بالکل سامنے تھی۔ سکھ کانسٹیبل ایک سیکنڈ میں فائر کر سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بادل نے موت کا خطرہ اور چیلنج قبول کر لیا اور بجلی کی تیزی کے ساتھ ہاتھ چادر سے باہر نکالا اور سکھ پر گولی چلا دی۔ اس کا ہاتھ باہر نکلنا اور اس پستول میں سے دھماکے کے ساتھ گولی کا فائر ہونا یہ جیسے ایک ہی فعل تھا۔ ایک ہی عمل تھا۔ گولی سکھ کے سینے میں جا کر لگی اور سب سے پہلے اس کے ہاتھ والا پستول نیچے گرا اس کے بعد وہ بھی دھڑام سے نیچے گر پڑا۔ جوان عورت کی چیخ نکل گئی۔ بادل جانتا تھا کہ وہاں مزید پولیس والے موجود ہیں۔ وہ چھلانگ لگا کر نیچے جاتے والی سیڑھیوں میں آگیا ڈیوڑھی میں سے چھلانگ لگا کر گلی میں آیا تو دھپ دھپ کرتے دو پولیس کانسٹیبل جو وردیوں میں تھے اس کی طرف بڑھے ان کے پاس بندوقیں تھیں ایک نے بندوق کا فائر کر دیا۔ بادل جلدی سے سامنے والے مکان کے تھڑے کے پیچھے ہو گیا۔ اس نے اندھا دھند دونوں کانسٹیبلوں پر فائرنگ شروع کر دی ایک کانسٹیبل وہیں گلی میں ڈھیر ہو گیا دوسرا پیچھے کو بھاگا۔ بادل نے پیچھے سے بھاگتے ہوئے دوسرے کانسٹیبل پر فائر کیا۔ بادل کا نشانہ بے حد اچھا تھا وہ ایک نامی گرامی ڈاکو تھا اور اسے اندھیرے جنگلوں میں بھی دشمن پر فائر کرنے کا بڑا تجربہ تھا۔ گولی گلی میں بھاگتے ہوئے کانسٹیبل کی پیٹھ میں گھس گئی۔ وہ لڑھک کر منہ کے بل گر پڑا بادل اس کے اوپر سے چھلانگ لگا کر گلی میں آگے کی طرف دوڑا۔ آگے گلی میں اندھیرا تھا۔ یہ گلیاں زیادہ روشن نہیں تھیں۔ مکانوں کی کھڑکیاں کھل رہی تھیں اور لوگ نیچے دیکھ رہے تھے کہ یہ فائرنگ کیوں ہو رہی ہے اتنی دیر میں بادل گلیوں سے نکل کر توی دریا کے پل کی طرف نکل آیا تھا۔ رات ہونے کی وجہ سے وہ اندھیرے میں ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ تھوڑے فاصلے پر سامنے ایک پولیس کی جیپ کھڑی تھی اس میں کوئی کانسٹیبل نہیں تھا۔

دونوں کانسٹیبل جو اس میں بیٹھے تھے فائرنگ کی آواز سن کر گلی کی طرف بھاگے تھے اور اب

دونوں کی لاشیں گلی میں پڑی تھیں۔ بادل جیپ کی طرف بڑے آرام سے بڑھا۔ ایک رکشا اس کے قریب سے گزر گیا۔ بجلی کے کھمبے دور دور لگے تھے۔ جیپ میں چابی لگی ہوئی تھی۔ فائرنگ کی آواز پر گھبراہٹ میں کانسٹیبل چابی لگی ہوئی چھوڑ گئے تھے۔ بادل جیپ میں بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کر کے تیزی سے ایک طرف نکل گیا۔ وہ دریا کے پل پر جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ پولیس کی جیپ دیکھ کر اسے وہیں گرفتار کیا جا سکتا تھا۔ اگر وہ گاڑی کو بھگا کر لے بھی جاتا ہے تو پل کے دوسرے کنارے پر اس کی ناکہ بندی کی جا سکتی تھی۔ پل کی دوسری طرف بھی مسلح پولیس موجود تھی۔ اس پر فائرنگ کر کے اسے ہلاک کیا جا سکتا تھا۔ بادل نے جیپ کا رخ دریا کے پیچھے کی جانب پرانے جموں کے ریلوے اسٹیشن کی طرف موڑ دیا۔ اسے ہر حالت میں پہاڑیوں میں نجمی کے پاس پہنچنا تھا۔ جموں کے پرانے ریلوے اسٹیشن کے علاقے میں روشنیاں بھی تھیں اور ٹریفک بھی کافی تھی وہ سویلین کپڑوں میں تھا اور جیپ جموں پولیس کی تھی۔ کوئی بھی پولیس گاڑی اس کے پیچھے لگ سکتی تھی۔ ایک بات کا اسے علم تھا کہ جو عورت لال دین کے گھر بیٹھی تھی اس نے اب تک پولیس اسٹیشن اطلاع کر دی ہو گی کہ لال دین کا ساتھی جس کی کھوج میں پولیس نے اسے وہاں بھیجا تھا۔ تین پولیس کانسٹیبلوں کا خون کر کے بھاگ گیا ہے اور تھوڑی ہی دیر بعد سارے جموں شہر کی پولیس چوکس ہو جائے گی اور اس کی تلاش شروع ہو جائے گی چوکوں، بازاروں کے ناکوں ریلوے اسٹیشن اور لاریوں کے اڈوں اور شہر سے پٹھانکوٹ اور کشمیر جانے والی سڑکوں کی ناکہ بندی کر دی جائے گی۔ بادل جیپ کو پوری رفتار سے چلاتے ہوئے پرانے ریلوے اسٹیشن کے علاقے سے بھی نکل گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے جموں کشمیر روڈ پر وہ دریا کو پار کیے بغیر نہیں جا سکتا تھا اور دریا کے پل پر پولیس موجود تھی تو کیا وہ تیر کر دریا پار کرے۔ دریا کا پانی تیز اور یخ تھا اس کے پاس وقت بہت تھوڑا تھا اسے جو کچھ بھی کرنا تھا پندرہ بیس منٹ کے اندر اندر کر گزرنا تھا۔ ورنہ اس کے بعد پولیس ہر حالت میں سارے شہر میں پھیل جانے والی تھی اور اس کی جیپ کو کسی بھی جگہ پکڑا جا سکتا تھا۔ بادل دریا کے نیچے دور تک جیپ بھگاتا چلا گیا۔ پرانے مندر کے قریب اس نے ایک کھڈ کے پاس اندھیرے میں جیپ کھڑی کر دی اور اتر کر دریا کے کنارے آگیا۔ دریا کا پانی ایک ہلکے ہلکے شور کے ساتھ رات کے اندھیرے میں تیزی سے بہہ رہا تھا۔ بادل نے پستول کو کھول کر دیکھا اس کی ساری گولیاں ختم ہو چکی تھیں اس نے

پستول صدری میں رکھ لیا۔ کنارے پر بیٹھ کر پانی میں ہاتھ ڈالا۔ پانی بے حد ٹھنڈا تھا۔ دریائے توی کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا مگر جموں سے گزرتے وقت اس کا بہاؤ تیز ہو جاتا ہے۔ بادل نے سامنے دوسرے کنارے کی طرف نگاہ ڈالی دوسرا کنارہ اونچا تھا اوپر درخت تھے اور ایک طرف پیچھے راجہ کے محل کی بلند عمارت اندھیرے میں ایک بڑے قلعے کی طرح نظر آ رہی تھی۔ بادل نے چادر اتار کر اپنی کمر کے گرد اچھی طرح لپیٹی۔ جوتے اتار کر چادر میں پھنسائے اور اللہ کا نام لے کر دریا میں اتر گیا۔ ٹھنڈا یخ پانی نے اس کے جسم کو جیسے ایک دم سرد کر دیا۔ بادل نے تیرنا شروع کر دیا دریا کا تیز بہاؤ اسے پُل کی طرف بہائے لے جانے لگا۔ بادل پورا زور لگا کر اپنی سیدھ میں دوسرے کنارے کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا آخر بادل نے دریا پار کر لیا مگر پانی کا تیز بہاؤ اسے اس مقام سے کافی آگے لے گیا جہاں اس کا خیال تھا کہ وہ کنارے پر اترے گا۔

یہاں وہ آم اور سنگترے کے گھنے باغ نہیں تھے۔ جہاں سے گزر کر وہ نجمی کے ساتھ اوپر والی پہاڑی پر گیا تھا اور جہاں اس وقت بھی وہ جانا چاہتا تھا وہ آم کے باغوں والے علاقے سے آگے نکل آیا تھا جہاں ڈھلان پر کہیں کہیں کوٹھیوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ یہ آباد علاقہ تھا بادل اس طرف نہیں جانا چاہتا تھا۔ دریا سے نکلتے ہی وہ واپس آم کے باغوں کی طرف چلنے لگا خالی پستول اس کی جیب میں تھا اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے اسے سردی بھی لگنے لگی تھی لیکن وہ تیز تیز چل رہا تھا وہ آم اور سنگترے کے باغوں میں سے ہو کر اوپر پہاڑی کے گھوہ میں نجمی کے پاس پہنچنا چاہتا تھا کئی بار اسے خیال آیا کہ وہ خالی پستول پھینک دے لیکن پھر کچھ سوچ کر وہ اس خیال پر عمل نہ کر سکا۔ وہ آبادی والے علاقے سے جب کافی نکل آیا تو اسے اپنی بائیں جانب آم کے باغوں کا اندھیرا نظر آنے لگا۔ یہاں سے چھوٹی سی چڑھائی چڑھنے کے بعد وہ آم کے باغ میں آ گیا یہاں وہ رک گیا اس نے اپنی چادر کمر سے اتار کر نچوڑی اسے جھاڑ کر کندھے پر ڈالا اور صدری کو بھی نچوڑ کر دوبارہ پہن لیا۔ صدری کی جیب میں خالی پستول موجود تھا اس کے پاس جو کرنسی نوٹ تھے وہ بھی گیلے ہو گئے تھے مگر بادل نے انہیں ویسے ہی رومال میں لپٹے رہنے دیا۔ آم کے باغ میں اندھیرا چھایا ہوا تھا رات ہو گئی تھی۔ بادل نے ایک راستہ متعین کیا اور آگے بڑھا۔ جونہی وہ آگے بڑھا اس پر تین جانب سے روشنی کی آبشاریں گرنے لگیں۔ ساتھ ہی بیک وقت چار پانچ ہوائی فائر

ہوئے اور کسی کی بلند آواز گونجی: "کھڑے رہو اپنی جگہ ورنہ بھون دیئے جاؤ گے۔"

بادل کچھ بوکھلا سا گیا روشنی میں وہ اور آس پاس کے درخت نہا گئے تھے۔ ایک تھانیدار چار مسلح کانسٹیبلوں کے ساتھ روشنی کے دائرے میں نمودار ہوا اس نے پستول تان رکھا تھا۔۔۔ کانسٹیبلوں نے رائفلوں کا رخ بادل کی طرف کیے ہوئے تھا۔ تھانیدار نے چلا کر کہا: "ہاتھ اوپر اٹھا لو نہیں تو گولی مار دوں گا۔"

بادل نے آہستہ سے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔

٭ ٭ ٭

بادل کے ہاتھ اٹھاتے ہی سپاہی اس کی طرف بڑھے۔

تین سپاہی اور تھانیدار ابھی تک اس کی طرف اپنی رائفلیں اور پستول تانے ہوئے تھے۔ پولیس کی دو جیپیں آم کے باغ میں درختوں کے نیچے قریب کھڑی تھیں۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پولیس نے بادل کو الٹی ہتھکڑی لگا دی اس کے دونوں ہاتھ پشت پر لے جا کر ہتھکڑی لگائی گئی تھی۔ تلاشی لینے پر بادل کی گیلی صدری میں سے وہ پستول بھی برآمد ہو گیا جس سے اس نے تھوڑی دیر پہلے تین کانسٹیبلوں کو ہلاک کیا تھا۔

تھانیدار نے پستول اور رائفلوں کی نوک پر بادل خان کو جیپ میں سوار کرایا اور دونوں جیپیں جموں پولیس اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئیں۔ لال دین نے پولیس کے تشدد کے باوجود پولیس کو بادل اور نجمی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اسی محلے میں مقیم پولیس کے ایک مخبر نے اطلاع دی تھی کہ اس نے ایک مرد اور ایک عورت کو لال دین کے ساتھ رات کے وقت آم کے باغوں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ پولیس نے اسی وقت آم کے باغ کی ساری تلاشی لی مگر اسے بادل اور اس کی ساتھی وہاں نہ مل سکے لیکن جب پولیس نے لال دین کو حراست میں لے لیا تو اس کے گھر سی آئی اے نے اپنی ایک مخبر عورت کو رکھ دیا کہ ہو سکتا ہے لال دین کے ہاں پناہ لینے والا پاکستانی جاسوس وہاں اس کی تلاش میں آ جائے اور ایسا ہی ہوا۔ بادل خان وہاں گیا اور پھر اس کے ہاتھوں بیک وقت تین کانسٹیبلوں کا قتل ہو گیا۔ اس تہرے قتل کی اطلاع ملتے ہی پولیس نے باغ کو گھیرے میں لے لیا۔ پولیس کو یقین تھا کہ قاتل جو پاکستانی جاسوس ہے اسی طرف آئے گا۔ چنانچہ جب بادل دریا پار کر کے رات کے اندھیرے میں باغ میں داخل ہوا تو ایک دم سے اس پر حملہ کر کے اسے

گرفتار کر لیا گیا۔

پولیس کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ ہندو ڈوگرہ تھانیدار اپنی اس کامیابی پر بے حد خوش تھا۔ ابھی تک پولیس کو یہ علم نہیں ہوا تھا کہ بادل اصل میں چندا ڈاکو کا ساتھی ہے اور خود بھی قتل اور ڈکیتی کی ان گنت وارداتوں میں ملوث رہ چکا ہے۔

پولیس نے اسے پاکستانی جاسوس تصور کر کے اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ لال دین کو بادل کی گرفتاری سے بے خبر رکھا گیا۔ صرف اس پر کیے جانے والا تشدد روک دیا گیا۔ کیونکہ اب پولیس بادل سے پوچھ گچھ کر کے اس کے نام نہاد ساتھیوں کا پتہ کرنا چاہتی تھی۔ بادل پولیس کی حراست میں آتے ہی گونگا بن گیا۔ اس نے چپ سادھ لی۔ ساری رات اسے پولیس مارتی رہی۔ اسے الٹا لٹکا کر ڈنڈوں سے پیٹا گیا مگر بادل نے زبان نہ کھولی۔ پولیس اس سے معلوم کرنا چاہتی تھی کہ جس عورت کے ساتھ وہ بارڈر کراس کر کے انڈیا میں داخل ہوا تھا وہ عورت کہاں ہے؟ مگر بادل ہر قسم کا بھیانک تشدد برداشت کرتا رہا اور زبان نہ کھولی۔ اخباروں میں نجمی کی تصویر چھپی تھی۔ بادل کی تصویر پولیس کے پاس موجود نہیں تھی اس لیے پولیس اسے نہ پہچان سکی۔

دوسرے روز پولیس نے چالان کر کے بادل کو عدالت میں پیش کیا اور عدالت سے اس کا تین دن کا ریمانڈ لے لیا۔ ریمانڈ لینے کے بعد بادل پر تشدد کا دور شروع ہو گیا۔

اب ہم واپس نجمی کی طرف آتے ہیں۔ رات کے وقت بادل نجمی کو پہاڑی کے اوپر چٹان کی کھوہ میں چھوڑ کر لال دین کا پتہ کرنے جموں شہر کے محلہ استاداں کی طرف گیا تھا اور جلدی واپس آ جانے کا کہہ گیا تھا۔ نجمی کا خیال تھا کہ آدھی رات تک بادل واپس آ جائے گا یا زیادہ سے زیادہ پچھلے پہر پلٹ آئے گا۔ لیکن جب رات گزر گئی اور دن نکل آیا اور بادل واپس نہ آیا تو نجمی کو تشویش ہوئی کہ خدا خیر کرے۔ بادل شہر میں رکنے والا نہیں ہے کہیں وہ پولیس کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو۔ اس خیال کے ساتھ ہی نجمی کا خون کھولنے لگا وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کھوہ سے باہر آ گئی اس نے سب سے پہلے اپنے پستول کو چیک کیا۔ بارہ بور کا پستول گولیوں سے بھرا ہوا تھا وہ کسی طرح شہر جا کر بادل کا کھوج لگانا چاہتی تھی۔ مصیبت کے اس دور میں بادل نجمی کا وفادار ساتھی ہی نہیں بلکہ اس کا واحد سہارا بھی تھا۔ اچانک وہ اپنے آپ کو دشمن ملک میں تنہا

محسوس کرنے لگی تھی۔ لیکن نجمی مایوس ہونے اور مصیبت میں صبر شکر کر کے بیٹھی رہنے والی عورت نہیں تھی وہ مصیبت کا مردانہ وار مقابلہ کرنا جانتی تھی۔ اس کے باوجود نجمی نے اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کیا کہ وہ اکیلی رہ کر دشمن کا زیادہ دیر تک مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ وہ ہر حالت میں کسی نہ کسی ترکیب سے بارڈر کراس کر کے پاکستان پہنچ جانا چاہتی تھی۔

ندیم پاکستان جا چکا تھا اسے پاکستان میں نجمی کا انتظار ہوگا۔ لیکن نجمی بادل کی مدد کے بغیر بارڈر کراس نہیں کر سکتی تھی وہ اس سارے علاقے سے ناواقف تھا۔ اس کے ہم پیشہ ساتھی بہت پیچھے بہار کے ایک جنگل کے غار میں پناہ گزین تھے جہاں بادل کو واپس جانا تھا۔ نجمی اتنی آگے آ کر اب واپس ان لوگوں کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی۔ واپس جا کر وہ سوائے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھی رہنے کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ بادل کے سوا وہاں اس کی بات سمجھنے اور اس کو مشورہ دینے اور اس کی مدد کرنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔

نجمی چیڑھ کے درختوں میں آ کر ایک پتھر کی اوٹ میں بیٹھ گئی۔ دن کی سنہری روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ نجمی نے سوچا کہ ہو سکتا ہے بادل کسی خاص وجہ سے اپنے دوست لال دین کے پاس رک گیا ہو۔ آخر اسے بارڈر کراس کروانے کا مسئلہ بھی تو حل کرنا ہے۔ ممکن ہے لال دین اسے اپنے کسی ساتھی کے پاس لے گیا ہو۔ یہ سوچ کر نجمی کو کچھ حوصلہ ہوا اور اس نے یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دی کہ بادل دوپہر یا زیادہ سے زیادہ شام تک آ جائے گا۔ وہ ڈھلان کے پتھروں سے اترتی ہوئی نیچے گھاٹی کے چشمے تک گئی وہاں اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ واپس غار میں آ کر نمکین مٹھی کھائی تھوڑا ساگڑ بھی کھایا اور غار کے اندر بچھی ہوئی چادر پر نیم دراز ہو کر بادل کے بارے میں غور و فکر کرنے لگی۔ وقت گزرتا چلا جا رہا تھا۔ سورج چیڑھ کے درختوں کے اوپر آ گیا۔ دوپہر ہو گئی نجمی نے کل کی باسی روٹی گڑ کے ساتھ کھائی۔ نیچے چشمے پر جا کر پانی پیا۔ وہ اوپر واپس آ کر اپنے غار کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اسے ایک عورت کی ہلکی سی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ یہ وہی گوالن تھی جسے ایک روز پہلے ڈھلان کے سبزے پر بکریاں چراتے دیکھا تھا۔ یہ گوالن درخت کے پاس کھڑی نجمی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی اس کے ایک ہاتھ میں چھڑی تھی اور دوسرے ہاتھ کی انگلی اس نے دانتوں میں داب رکھی تھی۔ دو بکریاں اس کے پیچھے درختوں کے نیچے بڑے انہماک سے گھاس چر رہی تھیں۔

سب سے پہلے نجمی کو یہ خیال آیا کہ گوالن کو اسے نہیں دیکھنا چاہیئے تھا مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ گوالن چند قدموں پر کھڑی نجمی کی طرف دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ نجمی نے اپنی حیرت پر بہت جلد قابو پا لیا اور کچھ سوچ کر گوالن کی طرف بڑھی۔

نجمی نے اپنا لہجہ بھی دیہاتی عورتوں جیسا بنا کر پوچھا "کیا نام ہے تمہارا؟"

مگر نجمی کا پنجابی لہجہ کسی صورت میں بھی جموں کے ڈوگری لہجے جیسا نہیں تھا۔ گوالن اسی طرح نجمی کی طرف دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھی۔ اتنی دیر میں نجمی نے ایک فرضی کہانی دماغ میں سوچ لی تھی۔ کہنے لگی "میرا نام بملا ہے۔ میں بٹالہ کی رہنے والی ہوں۔ میں اپنے پتی کے ساتھ جموں کی سیر کو آئی ہوئی ہوں۔ میرا پتی میرے ساتھ ہی تھا ہم ان پہاڑوں کی سیر کر رہے تھے کہ بھگوان جانے وہ کہاں چلا گیا میں اسے ڈھونڈ رہی ہوں۔"

گوالن نے مسکراتے ہوئے کہا "میرا نام سرداراں ہے ہم مسلمان ہیں۔ پر ہمارے گاؤں میں ہندو بھی ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔"

نجمی ابھی اپنے غار میں نہیں جا سکتی تھی۔ وہ گوالن کے قریب جا کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی اسے بیٹھتے دیکھ کر سرداراں بھی بیٹھ گئی۔ نجمی نے کہا "کیا یہاں سے آگے بھی کسی گاؤں کو راستہ جاتا ہے۔؟"

سرداراں بولی! "ہاں جی! آگے کئی گاؤں ہیں۔" پھر اس نے ایک ایک کر کے سب گاؤں کے نام بول دیئے اس کے بعد کچھ فکر مند سی ہو کر کہنے لگی "تمہارا پتی کس طرف گیا تھا۔؟"

نجمی نے یونہی ایک طرف اشارہ کر کے کہا "ہم ادھر دریا کی طرف سے یہاں آئے تھے میرا پتی گوردیال بھی میرے ساتھ تھا بس یہاں آ کر کہیں ادھر ادھر ہو گیا ہے۔ یہیں کہیں ہو گا۔ میں اسے ڈھونڈ لوں گی۔"

نجمی مسکراتے ہوئے اٹھی اور درختوں میں ایک طرف چلنے لگی۔ کچھ دور جا کر وہ رکی۔ یونہی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے نگاہ پیچھے ڈالی تو دیکھا گوالن اپنی بکریوں کو ہنکاتی ہوئی پہاڑی کی دوسری طرف جا رہی تھی۔ نجمی نے خدا کا شکر ادا کیا اور اوپر سے ہو کر واپس غار میں آ کر بیٹھ گئی۔

اب اسے یہ خطرہ بھی تھا کہ کہیں وہی گوالن پھرتی پھراتی ادھر نہ آ جائے۔ نجمی غار سے باہر

نکل کر جو سامنے گھنی جھاڑی تھی اس کی اوٹ میں بیٹھ گئی۔ اس کے پیچھے چٹان اور غار تھا اور دائیں بائیں اور سامنے چیڑھ کے درخت تھے۔ اگر کوئی اس طرف آئے تو وہ اسے دور ہی سے دیکھ سکتی تھی لیکن وہ وہاں کب تک بیٹھی رہتی۔

تھوڑی دیر بعد اٹھی اور غار میں چلی گئی۔ دن غروب ہونے لگا۔ نجمی کو ایک بار پھر بادل کا فکر دامن گیر ہو گیا۔

خدا جانے کیا بات ہے جو وہ ابھی تک نہیں آیا۔ جوں جوں دن ڈھل رہا تھا نجمی کی فکر میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جب سورج ڈوب گیا اور چیڑھ کے درختوں میں شام کا سرمئی دھندلکا پھیلنے لگا تو نجمی بے چین سی ہو کر غار سے باہر آ گئی اس کی حالت اس شیرنی ایسی تھی جس کو پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ وہ وہاں رہنا بھی نہیں چاہتی تھی اور وہاں سے جانے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتی تھی۔ لیکن یہ خطرہ مول لیے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

نجمی نے تھوڑا بہت کھایا اور چشمے پر آ کر پانی پینے لگی چیڑھ کے پہاڑی جنگل میں خنک ہوا چلنے لگی تھی۔ موسم ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ نجمی کا ذہن تیزی سے سوچنے لگا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے کیا وہ آج رات بادل کا انتظار کرے یا پھر شہر میں خود جا کر اس کا کھوج لگائے؟ مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ شہر میں کہاں جائے؟

اگر لال دین پولیس کی حراست سے نکل کر اپنے گھر آ گیا ہوتا تو اب تک بادل بھی اس سے مل کر واپس آ چکا ہوتا۔ اور اگر لال دین اپنے مکان پر نہیں ہے اور ابھی تک پولیس کی حراست میں ہی ہے تو یقینی طور پر پولیس اس کے مکان کی نگرانی کر رہی ہو گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بادل کو پولیس نے پکڑ لیا ہو گا۔ نجمی بے چین سی ہو گئی وہ اٹھ کر چشمے کے پاس درختوں میں ٹہلنے لگی۔ لیکن نہیں۔ وہ اپنے آپ کو تسلی دینے لگی۔ ایسی بات نہیں ہو گی بادل پکڑا نہیں جا سکتا۔ وہ شیر ہے وہ دو چار کو مار کر فرار ہو سکتا ہے لیکن فرار ہونے کے بعد بھی اسے اب تک واپس آ جانا چاہیئے تھا۔ آخر نجمی اسی نتیجے پر پہنچی کہ بادل اپنے دوست لال دین کے ساتھ بارڈر کراس کروانے کے سلسلے میں کسی خاص جگہ گیا ہو گا وہاں دن چڑھ آیا ہو گا اور اب بادل اس انتظار میں ہو گا کہ رات کا اندھیرا ہو اور وہ واپس نجمی کے پاس جائے۔

نجمی کے دماغ سے جیسے اچانک بوجھ سا اتر گیا اس نے دل میں کہا بادل آج رات ضرور آ جائے گا اور چشمے سے چل کر واپس اپنے غار میں آ گئی۔ شام کے سرمئی سائے رات کے اندھیرے میں بدل گئے۔ رات پڑتے ہی چیل کے درختوں میں سے گزرتی ہوا کی پُراسرار سرسراہٹیں صاف طور پر سنائی دینے لگیں ایسا لگ رہا تھا جیسے چیڑھ کے درخت آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ نجمی کے پاس کھانے کے لائق اب صرف گُڑ ہی باقی رہ گیا تھا۔ روٹیاں باسی ہو گئی تھیں نمکین مٹھیوں پر چیونٹیوں نے حملہ کر دیا تھا۔ گڑ اس لیے بچ گیا کہ نجمی نے اس کی پوٹلی کو غار کے ایک پتھر سے لٹکا رکھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بادل رات کو آیا تو وہ اسے لے کر صبح ہونے سے پہلے پہلے کسی طرف نکل جائے گی۔ اول تو بارڈر کراس کرانے کا سارا بندوبست کر کے آئے گا اور ممکن ہے کل صبح وہ انڈیا کی سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہو جائے۔ نجمی نے باسی روٹیاں اور مٹھیاں اٹھا کر نیچے گھاٹی میں پھینک دیں۔ چادر کو پھر سے جھاڑ کر غار کے اندر بچھایا اور اس پر لیٹ کر بادل کا انتظار کرنے لگی۔ اسے سردی لگنے لگی۔ اس نے نیچے سے چادر نکال کر اپنے جسم کے گرد لپیٹ لی۔ جسم کو گرمائش پہنچی تو اسے نیند آنے لگی اور وہ سو گئی۔ آنکھ کھلی تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ چاروں طرف چیڑھ کے جنگل میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہوا کی درختوں کے ساتھ سرگوشیاں بھی ختم ہو چکی تھیں۔

نجمی کو معلوم نہیں تھا کہ رات کا کیا بجا ہو گا جسم کے گرد چادر لپیٹ کر وہ غار سے باہر آ گئی باہر غار کے مقابلے میں ٹھنڈ تھی مگر زیادہ سردی نہیں تھی۔ نجمی فکرمند ہو گئی۔

بادل کا ابھی تک کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ وہیں بیٹھ کر درختوں کے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تنوں کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگی تھوڑی ہی دیر بعد اسے آسمان پر ستاروں کی روشنی ماند پڑتی نظر آنے لگی۔ تو کیا یہ رات کا پچھلا پہر تھا؟ کیا وہ ساری رات سوتی رہی تھی؟ لیکن بادل ابھی تک کیوں نہیں آیا؟ رات گزر گئی۔

ایک بار پھر سورج طلوع ہوا اور چیڑھ کے درخت اس کی روشنی میں سنہری ہو گئے۔ پرندے بولنے لگے۔ نجمی کا دل جیسے ڈوبنے لگا۔

ایک دم سے اس پر مایوسی کا شدید حملہ ہوا اور وہ وہیں دل کو تھام کر بیٹھی رہی لیکن مایوسی

کی یہ کیفیت تھوڑی ہی دیر بعد گزر گئی اس نے اپنی گردن اٹھا کر مشرق میں صبح کی نیلی روشنی بڑھتے پھیلتے دیکھی اور اس کی مٹھیاں اپنے آپ بھینچ گئیں۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ خود جا کر بادل کا کھوج لگائے گی۔ وہ چشمے پر سے نیچے اتر گئی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر بالوں میں انگلیاں پھیر کر انھیں سنوار رہی تھی۔ پھر اس نے سر اور جسم کو چادر میں اچھی طرح سے ڈھانپا قمیض کے اندر چھپائے ہوئے پستول کو ہاتھ لگا کر محسوس کیا اور اللہ کا نام لے کر نیچے پیر کوہ کی ٹیکریوں کی طرف اترنے لگی۔ اترائی زیادہ خطرناک اور مشکل نہیں تھی۔ آدھ گھنٹے بعد وہ پہاڑی سے اتر کر ان چٹانوں اور ٹیکریوں کے پاس پہنچ گئی جہاں قدرتی کھوہ بنے ہوئے تھے اور جہاں سب سے پہلے لال دین انھیں چھپا کر گیا تھا۔ یہاں سے آگے آموں کے گھنے باغ تھے۔ ایک جانب سنگتروں کے باغ تھے۔ پھلوں کا موسم نہیں تھا اس لیے یہ باغ ویران پڑے تھے نجمی کو بھوک بھی لگ رہی تھی۔ یہاں سے اسے باغ کے شروع میں پانی کا ایک چھوٹا سا نالہ بہتا دکھائی دیا۔ یہ پہاڑی نالہ تھا جس میں شفاف پانی بڑی تیزی سے آم کے باغ کے اندر کی طرف بہہ رہا تھا نجمی نے یہاں بیٹھ کر ٹھنڈا پانی پیا جس سے اس کی تھکان کافی حد تک دور ہو گئی۔ وہ پتھر کی ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے پیچھے تقریباً چھپ کر بیٹھ گئی اب اسے خیال آیا کہ شہر جموں اس کے سامنے ہے اور اسے دن کی روشنی میں لال دین کے مکان پر نہیں جانا چاہیے۔ اگر بادل کا یہ دوست مکان پر نہ ہوا اور وہاں پولیس کی نگرانی ہوئی تو وہ یقینی طور پر گرفتار ہو جائے گی۔ اس نے یہی سوچا کہ اسے کسی نہ کسی طرح دن اسی جگہ گزار دینا چاہیئے اور رات کے اندھیرے میں لال دین کے گھر جائے۔ اس نے دائیں بائیں نگاہ ڈالی آم کے باغ میں دور اسے ایک چھوٹی سی ویران بارہ دری نظر آئی۔ بارہ دری ٹوٹی پھوٹی تھی اور آس پاس کوئی انسان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کسی باغبان کی جھگی بھی نہیں تھی۔ وہاں سے دور آم کے درختوں کے نیچے ہی ایک غیر آباد سی پرانی کوٹھی دکھائی دے رہی تھی مگر وہاں بھی کسی انسان کا نام نشان نہیں تھا۔ نجمی کو صرف دن کے دن وہاں بیٹھنا تھا۔ وہ بارہ دری کی ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔

جوں جوں دن گزرتا گیا اسے بھوک اور پیاس ستانے لگی دوپہر کے بعد پیاس کی وجہ سے نجمی چادر اوڑھ کر اٹھی اور باغ کے ویران علاقے میں پانی کی تلاش میں نکل گئی۔ باغ کے باہر قریبی

ٹیکری کے پاس اسے ایک باؤلی کی شکل میں پانی مل گیا۔ اس نے پانی پیا اور بارہ دری میں واپس آنے کی بجائے وہیں اجڑی ہوئی باؤلی کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ بھوک اسے ضرور لگی تھی مگر بھوک وہ برداشت کر سکتی تھی۔ پانی پی کر اس کی توانائی بحال ہو گئی تھی۔ خدا خدا کر کے سورج غروب ہوا۔ پھر شام گہری ہوتی گئی۔ جب رات پوری طرح سے چھا گئی تو نجمی اٹھ کر دریائے توی کے پل کی جانب چل پڑی۔ بھوک سے اسے کمزوری ضرور محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ چلتی چلی گئی۔

چادر اوڑھنے کی وجہ سے وہ بالکل دیہاتی عورت لگ رہی تھی۔ اندھیرا ہونے کے باعث اسے کوئی آسانی سے پہچان بھی نہیں سکتا تھا۔ لال دین کی گھر والی گلی اسے یاد تھی۔ نجمی کی یادداشت اس معاملے میں کافی تیز تھی اور ایک بار دیکھی ہوئی جگہ اسے یاد رہ جاتی تھی۔

دریائے توی کے پل پر گاڑیوں کو پولیس چیک کر رہی تھی مگر پیدل چلنے والوں کو کوئی چیک نہیں کر رہا تھا۔ نجمی نے منہ سر اچھی طرح سے ڈھانپ رکھا تھا پستول اس کے پاس ہی تھا۔ اس نے ایک ہاتھ پستول پر جما لیا تھا کہ اگر خطرناک صورت حال پیدا ہوئی تو وہ آسانی سے فائر کر سکے مگر اسے پل پر سے آتے ہوئے کسی نے نہ پوچھا اور کسی نے اس کی طرف دھیان بھی نہ دیا۔ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ پل پر سے گزر گئی۔ پل کی دوسری طرف آ کر اس نے پیپل کے درخت کو دیکھا۔ یہ اس کی نشانی تھی اس درخت کے ساتھ ہی ایک گلی آگے دو چار گلیوں میں سے گزر کر لال دین کے گھر کو جاتی تھی۔

نجمی اللہ کا نام لے کر گلی میں داخل ہو گئی۔ یہ دھندلی اور نیم روشن گلیاں تھیں اپنی یادداشت کے بھروسے آخر نجمی لال دین کے مکان پر پہنچ گئی ایک بار تو وہ مکان کے آگے سے گزر گئی اس نے انتہائی ہوشیاری سے آس پاس کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہاں اسے کوئی مشتبہ شخص نظر نہ آیا۔ گلی کے سر پر جا کر وہ واپس پلٹی اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ بادل کے دوست لال دین کے مکان پر تالا نہیں لگا تھا۔ اب وہ مکان کے سامنے آ کر رک گئی اور ایک دم سے دستک دے دی وہ چاہتی تھی کہ دروازہ جلدی سے کھل جائے مگر دوسری بار دستک دینے پر دروازہ کھلا۔ نجمی نے دیکھا کہ ڈیوڑھی میں بادل کا دوست لال دین کھڑا تھا۔ اس نے جلدی سے نجمی کو ڈیوڑھی میں بلا لیا اور فوراً ہی دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ پھر وہ سکون کا سانس لے کر کچھ پریشانی کے

سے بولا "تمھیں کسی نے دیکھا تو نہیں ؟"

نجمی نے کہا "میرا خیال ہے کسی نے نہیں دیکھا۔ بادل کہاں ہے ؟"

"وہ تو پولیس کے ہتھے چڑھ گیا ہے ۔" لال دین بولا۔

نجمی کا دل ایک دم بیٹھ گیا جس کا اسے ڈر تھا وہی ہوا تھا۔ لال دین نجمی کو اوپر لے گیا۔ نجمی کو دیکھ کر وہ خود بھی پریشان ہو گیا تھا۔ کھڑکی کھلی تھی اس نے گلی میں جھانک کر دیکھا۔ پھر کھڑکی بند کر دی اور بولا "بہن جی! آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیئے تھا۔ میری نگرانی ہو رہی ہے مجھے پولیس نے پکڑ لیا تھا۔ مجھے انھوں نے بڑی اذیتیں دیں مگر میں نے آپ میں سے کسی کا نام نہیں لیا۔"

"تو پھر بادل کیسے پکڑا گیا ؟" نجمی نے پوچھا۔

لال دین بولا "میں یہاں نہیں تھا میرے گھر کی پولیس نگرانی کر رہی تھی۔ بادل مجھے ملنے میرے پیچھے یہاں آیا۔ یہاں پولیس اس پر جھپٹی اس نے گولی چلا کر تین کانسٹیبلوں کو ڈھیر کر دیا اور فرار ہو گیا۔ لیکن توی دریا کے پار آم کے باغ میں پولیس نے انھیں گھیرے میں لے کر گرفتار کر لیا۔"

نجمی یہ جان کر حیران رہ گئی کہ بادل نے تین خون بھی کر ڈالے تھے۔ لال دین کہہ رہا تھا "یہاں کسی نے مخبری کر دی تھی کہ بادل آموں کے باغ کی طرف گیا ہے۔ مجھے حوالات میں ہی یہ ساری کہانی معلوم ہو گئی تھی۔ بادل کی گرفتاری کے بعد پولیس نے مجھے چھوڑ دیا۔"

نجمی نے لال دین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا تم سچ کہہ رہے ہو کہ تم نے ہمارا نام نہیں لیا تھا ۔؟"

لال دین بولا "بہن جی! اگر میں پولیس کے آگے بک دیتا تو پھر آپ بھی گرفتار ہو چکی ہوتیں۔ ہم یاروں کے یار ہیں اور یار کے لیے جان بھی قربان کرنا جانتے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ جلدی سے اٹھا اور کھڑکی کھول کر نیچے گلی میں دیکھنے لگا۔ "آپ ابھی میرے ساتھ چلیں۔ میں آپ کو ایک محفوظ مقام پر چھوڑ آتا ہوں بہن جی!"

نجمی کا بھوک کے مارے برا حال ہو رہا تھا اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا اس نے ادھر اُدھر دیکھ کر کہا ۔ "بھائی صاحب تمھارے گھر میں کھانے کو کچھ ہوگا میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا"

لال دین فوراً باورچی خانے میں گیا اور دو روٹیاں اور اچار لے آیا۔ "اس وقت میں یہی پیش کر سکتا ہوں۔ لیکن میری گزارش ہے کہ یہاں سے نکل چلو بہن جی! یہاں تمھارا رہنا ہمیں کسی بہت بڑی مصیبت میں ڈال دے گا۔"

نجمی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ لال دین نجمی کے ساتھ ڈیوڑھی میں آگیا اس نے دروازہ کھول کر گلی میں دیکھا پھر بولا "میرے پیچھے چلی آؤ۔"

لال دین نجمی کو کسی دوسری طرف سے نکال کر باہر لے گیا۔ یہ ایک نیا ہی بازار تھا۔ لیکن نجمی نے اس بازار کی ایک نشانی بھی ذہن میں یاد کر لی۔ یہ ایک اونچا گھنا درخت تھا جس کے چبوترے پر ہنومان کے بت کے آگے دیا جل رہا تھا۔ لال دین نے دور سے آتے ہوئے ایک رکشے کو ہاتھ دے کر روک لیا۔ پھر اسے قریب جا کر کچھ کہا۔ اور نجمی کو رکشہ میں ساتھ بٹھا لیا۔ رکشہ الٹے رخ کو بازار میں روانہ ہو گیا۔ کئی بازاروں کا چکر کاٹنے کے بعد رکشا وہیں دریا کے پل کے پاس نکل آیا۔

لال دین نے پل کی ایک جانب رکشہ رکوا لیا۔ رکشے سے باہر آ کر لال دین نے نجمی سے کہا "تم اپنے طور پر پل پار کرو گی میں تمھارے بعد آؤں گا پل کے پار دائیں جانب والی گھاٹی کے نیچے میرا انتظار کرنا۔"

نجمی کو ایک بار پھر پل عبور کرنا پڑ گیا تھا۔ لیکن اسے اطمینان تھا کیونکہ پیدل چلنے والوں سے پولیس کے سپاہی کچھ نہیں بولتے تھے۔ نجمی چادر لپیٹے پہلے کی طرح دیہاتی عورتوں کی طرح چلتی پل پار کر گئی پل کی دوسری طرف پہنچ کر وہ دائیں جانب والی گھاٹی میں اتر گئی اور ایک طرف جھاڑیوں کے پاس اندھیرے میں بیٹھ گئی۔

نیچے ڈھلان میں دریائے توی بہہ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد لال دین بھی وہاں آگیا۔ نجمی جھاڑیوں سے باہر نکل آئی۔ لال دین گھاٹی چڑھنے لگا اوپر وہی آم کے گھنے باغ تھے نجمی لال دین کے ساتھ ساتھ تھی۔ آم کے باغ میں گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

لال دین نے نجمی کو ایک درخت کے نیچے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا "بہن جی! تم یہاں بیٹھ کر روٹی کھاؤ۔ میں ایک آدمی سے بات کر کے ابھی آتا ہوں۔"

لال دین درختوں کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔ نجمی روٹی کھانے لگی۔ لال دین آم کے گھنے باغ میں گزرتا اس ویران اور اجڑی ہوئی مغلیہ طرز کی پرانی کوٹھی کے باہر آ کر رک گیا جسے نجمی نے دور سے دن کے وقت دیکھا تھا۔ کوٹھی خالی اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے پیچھے ایک چھوٹی سی جھگی میں چراغ جل رہا تھا اور ایک بوڑھا آدمی بوریئے پر بیٹھا تسبیح پھیر رہا تھا۔

لال دین نے جاتے ہی السلام علیکم کہا۔ بوڑھے نے آنکھیں کھول کر لال دین کو چراغ کی روشنی میں پہچان لیا۔ اور پوچھا "کہو لال دین بیٹا کیسے آنا ہوا رات کے وقت؟"

لال دین بولا "شاہ جی! آپ کی مدد لینے آیا ہوں۔"

"میں حاضر ہوں بیٹا تم حکم کرو۔" شاہ جی نے بڑی شفقت سے کہا۔

تب لال دین نے نجمی اور بادل کے بارے میں سب کہانی بیان کر دی۔ یہ بزرگ آم کے باغوں اور پرانی کوٹھی کا چوکیدار تھا۔ اس کا نام شاہ ہاشم دین تھا۔ پاکستان قائم ہوا تو جموں میں ہندو سکھوں نے مسلمانوں کا بے دریغ قتل عام شروع کر دیا تھا۔ ان فسادات میں شاہ ہاشم دین کے کنبے کے سارے افراد شہید ہو گئے تھے۔ تب سے لے کر آج تک شاہ ہاشم دین نے اللہ سے لو لگائی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں اپنے کنبے کے سارے شہیدوں کو قبرستان میں دفن کیا تھا۔ جب اس کے سارے بچے جموں میں ہی شہید ہو گئے تو شاہ ہاشم دین اکیلا پاکستان کیسے جاتا؟ اس نے اپنے شہیدوں کی قبروں کے پاس ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا اب وہ ہر جمعرات کو اپنے پیاروں کی قبروں پر جا کر دیئے جلاتا تھا۔ اور فاتحہ خوانی کرتا تھا۔ آم کے باغ والی پرانی کوٹھی محکمہ اوقاف کی ملکیت تھی۔ موسم میں شاہ ہاشم آم کے باغ کی رکھوالی بھی کرتا تھا۔ اس محکمہ نے شاہ ہاشم کو کوٹھی کی چوکیداری پر لگا دیا تھا۔

لال دین کو وہ اپنے بچوں کی طرح پیار کرتا تھا۔ لال دین کو معلوم تھا کہ شاہ ہاشم کو پاکستان سے بے پناہ محبت تھی جس کو اس نے اپنے دل میں چراغ کی طرح روشن کر رکھا تھا۔ کیونکہ اسی چراغ کی روشنی کے لیے شاہ ہاشم کے بچوں نے اپنی جانیں قربان کر ڈالی تھیں۔ وہ ہر روز نماز پڑھنے کے بعد جہاں اپنے بچوں کی روحوں کو ثواب پہنچاتا وہاں پاکستان کی ترقی کے لیے دعا مانگتا

بھی نہیں ہوتا تھا یہی وجہ تھی کہ لال دین نجمی کو شاہ ہاشم کے پاس لے آیا تھا۔

شاہ جی نے لال دین کی زبانی نجمی کی ساری داستان سنی اسے یہ بھی بتا دیا کہ بادل تین خون کرنے کے بعد پولیس کی حراست میں ہے۔

شاہ جی نے نجمی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "فکر نہ کرو بیٹی اللہ مالک ہے یہاں تم بالکل محفوظ رہو گی۔" شاہ جی نے لالٹین نکال کر جلائی۔ نجمی اور لال دین کو ساتھ لیا اور پرانی مغلیہ کوٹھی کے عقبی برآمدے میں آ کر ایک پرانے کمرے کو کھول کر اندر آ گئے۔ یہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جس میں سے ایک زینہ اوپر والی منزل کو جاتا تھا اوپر والی منزل میں ایک دالان تھا جس کے ساتھ ہی ایک کمرہ تھا۔ یہ کمرہ بھی چھوٹا سا تھا اور اس کا پتھر کا فرش اکھڑا ہوا تھا۔ اس کے کونے میں ایک چارپائی بچھی تھی دو کھڑکیاں نیچے ویران باغ کی طرف کھلتی تھیں۔ ان کے لکڑی کے کواڑ بند تھے۔ لگتا تھا یہاں کبھی کبھی کوئی آ کر رہتا رہا ہے۔

شاہ جی نے کہا "بیٹی! کبھی میں اس کمرے میں رہا کرتا تھا۔ لیکن اب میں نے نیچے جھونپڑی بنا لی ہے اپنے لیے تم بے فکر ہو کر یہاں رہو۔ صرف اتنا خیال رکھنا کہ رات کو لالٹین روشن ہو تو کھڑکیوں کے پٹ بند رکھنا دن کے وقت بہت کم باہر نکلنا اور اس وقت نکلنا کہ جب تمہیں یقین ہو جائے کہ آس پاس کوئی نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آموں کے موسم سے پہلے یہاں کوئی نہیں آئے گا پھر بھی تم جب تک یہاں رہو میں چاہتا ہوں کہ احتیاط ضروری ہے۔"

شاہ جی نے لال دین کی مدد سے کمرے میں نجمی کے لیے بستر لا کر لگا دیا۔ پھر شاہ جی نے نجمی کو غسلخانہ دکھایا جو نیچے پہلی منزل میں برآمدے کے ساتھ ہی تھا "تمہیں کھانا اور چائے وغیرہ اسی جگہ پہنچ جایا کرے گی۔ بیٹی تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ جب تک تمہارے پاکستان جانے کا بندوبست نہیں ہو جاتا تم زیادہ سے زیادہ اسی کمرے میں رہو۔ اب میں جاتا ہوں تم لوگوں نے کوئی بات کرنی ہے تو کر لو۔"

شاہ جی کے جانے کے بعد نجمی نے لال دین سے کہا "صورتحال مختلف ہو گئی ہے۔ میں بادل خان کو پولیس کے تشدد میں چھوڑ کر پاکستان واپس نہیں جا سکتی۔"

لال دین کہنے لگا "بہن جی! ابھی آپ کا پاکستان جانا بھی یقینی نہیں ہے۔ بارڈر پہ دونوں

طرف فوج بیٹھی ہے۔ میرا دوست تمھیں بارڈر کراس نہیں کروا سکتا۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ بادل کسی طرح سے باہر آ جائے اس کے بعد تم جو فیصلہ کرو گے مجھے منظور ہو گا۔"

نجمی نے کہا "بھائی تمھاری کوشش سے بادل کیسے باہر آ جائے گا تمھارے کہنے کے مطابق پولیس نے اس کا ریمانڈ لے لیا ہے اس کے بعد بادل کے خلاف مقدمہ چلے گا اور اسے قید ہو جائے گی یا وہ پھانسی چڑھ جائے گا اس نے تین پولیس کے سپاہیوں کو قتل کیا ہے۔"

لال دین نے سر جھکا لیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا نجمی کہہ رہی تھی "معاف کرنا بھائی صاحب آپ خود پولیس کی نظروں میں ہیں۔ آپ بادل کی کیا مدد کر سکیں گے۔ پولیس کو ذرا سا بھی شک پڑ گیا کہ آپ کا بادل سے کوئی تعلق ہے تو وہ آپ کو بھی پکڑ لے گی۔"

لال دین نے نجمی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا "بہن جی! بادل کو میں آپ سے بہت پہلے کا جانتا ہوں۔ ہم نے زندگی کا ایک لمبا عرصہ اکٹھا گزارا ہے۔ میں نے پولیس کا ایسا ایسا تشدد برداشت کیا ہے کہ اگر میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو ایک ہزار ایک مرتبہ آپ کا نام لے دیتا لیکن میری زبان پہ چپ ہی لگی رہی۔ میں نے الٹے لٹکے ہوئے اپنے سر پر ڈنڈوں کی مار سہتے ہوئے بھی یہی کہا کہ میرے پاس کوئی پاکستانی جاسوس کبھی نہیں آیا۔"

نجمی نے کہا "میں تمھارے اس کردار کی تعریف کرتی ہوں حقیقت یہ ہے کہ ہم سب اسی کردار کے مالک ہیں ہم ڈاکو سہی مگر ہم جو عہد کرتے ہیں جو قول دیتے ہیں اس پر مر مٹتے ہیں تمھاری جگہ اگر بادل ہوتا یا میں ہوتی تو ایسا ہی کرتی۔ یہ کوئی عظیم بات نہیں ہے بلکہ ہمارے کردار کا تقاضا ہی یہی ہے۔ اب مجھے بتاؤ بھائی صاحب کہ تم ان حالات میں بادل کی کیا اور کیسے مدد کر سکتے ہو؟"

لال دین بولا "یہ میں کل بتاؤں گا ابھی تم آرام کرو میں کل دن کے وقت نہیں بلکہ رات کے وقت آؤں گا ابھی تم آرام کرو۔"

لال دین کے جانے کے بعد نجمی بستر پر بیٹھی دیر تک بادل خان کے بارے میں سوچتی رہی۔ پھر کمبل اوڑھ کر سو گئی۔

دوسرا دن اس کا پرانی کوٹھی کی دوسری منزل والے اس کمرے میں ہی گزر گیا۔ شاہ جی صبح کے

وقت اسے چائے اور بند دے گئے دوپہر کو روٹی اور ساگ لے کر آ گئے۔ شام کو بھی نجمی نے وہی ساگ روٹی کھائی۔ شاہ جی اسے رات کو لالٹین بجھا دینے کی تاکید کر کے چلے گئے۔

دس بجے رات کو لال دین آ گیا اس نے بتایا کہ بادل خان کا ریمانڈ کل ختم ہو رہا ہے کچھ پتہ نہیں پولیس نے اس سے کیا کچھ معلوم کیا ہے۔ بہر حال قتل کے الزام میں تو اس پر مقدمہ ضرور چلے گا۔

نجمی نے تڑپ کر کہا "آخر تم کیا سوچ رہے ہو؟ اور اگر بادل پر مقدمہ ہی چلنا ہے تو پھر مجھے یہاں کس لیے رکھا گیا ہے؟ اس سے تو بہتر ہے کہ میں خود بادل خان کو جیل سے فرار کروانے کی کوشش کروں میں ایسا کر سکتی ہوں۔"

لال دین ذرا سا مسکرایا اور ہاتھوں کو ملتے ہوئے بولا "بہن جی! ذرا صبر سے کام لیں میرے بھی کچھ بازو ہیں جب تک میں زندہ ہوں آپ کو تکلیف نہیں کرنی پڑے گی۔ بادل خان کو حوالات سے جیل میں جانے دو پھر میں اسے وہاں سے نکلوا لوں گا۔"

اتنے میں شاہ جی وہاں آ گئے۔ کہنے لگے "میری ایک منہ بولی بیٹی کے ہاں سے پیغام آیا ہے کہ وہ سخت بیمار ہے میں اس کی طرف جا رہا ہوں۔ لال دین! تم آج کی رات یہیں ٹھہر جاؤ۔"

اس پر نجمی نے قدرے ترش روئی سے کہا "ان بھائی صاحب کے ٹھہرنے کی ضرورت نہیں ہے شاہ جی! میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔"

شاہ جی خاموش رہے اور چلے گئے لال دین جانتا تھا نجمی کس مزاج کی عورت ہے اس نے بھی وہاں ٹھہرنے پر اصرار نہ کیا جاتی دفعہ صرف اتنا کہا کہ اپنا خیال رکھنا بہن جی! یہ علاقہ کچھ ویران ہے۔

نجمی نے پھنکار کی طرح سانس چھوڑتے ہوئے کہا "تم فکر نہ کرو۔"

لال دین چلا گیا۔ نجمی کو اس آدمی پر شروع ہی سے کوئی خاص بھروسہ نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ شخص بادل کو جیل سے فرار نہیں کروا سکے گا۔ اور وہ پھانسی چڑھ جائے گا۔ اس لیے اسے غصہ آ رہا تھا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد نجمی نے لالٹین کی روشنی میں سرہانے کے نیچے سے پستول نکال کر

کھولا۔ اس کی گولیوں کو چیک کیا۔ دوبارہ بند کر کے سرہانے کے نیچے رکھا۔ اٹھ کر دروازے کی اندر سے کنڈی لگائی اور لالٹین بجھا کر بستر پر لیٹ گئی۔

رات کا تاریک سناٹا جیسے باہر آم کے کالے باغ میں سنسنا رہا تھا۔ نجمی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ دیر تک بستر پر پہلو بدلتی رہی۔ اس وقت آدھی رات گزر چکی تھی کہ جہاں آم کے باغ کی حد شروع ہوتی تھی وہاں ایک جیپ آکر رکی اس میں سے تین آدمی جنھوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ خاموشی سے اتر کر اندھیرے میں پرانی کوٹھی کی طرف بڑھے۔

--- ... ⁂ ... ---

ایک آدمی جیپ میں ہی بیٹھا رہا۔

یہ تینوں پراسرار آدمی جنھوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے اور کاندھے سے رائفلیں لگی تھیں، ہاتھوں میں ریوالور لیے رات کے اندھیرے میں آم کے درختوں کے نیچے سے ہوتے، پرانی مغلئی کوٹھی کی طرف بڑھ رہے تھے جس کی دوسری منزل پر نجمی نینداور بیداری کے درمیان جھول رہی تھی۔

جیپ کی دھیمی آواز اس نے ایسے سنی تھی جیسے خواب میں یہ آواز آئی ہو۔ اس پر نیند کا غلبہ تھا۔ تینوں آدمی ایسے چل رہے تھے جیسے وہ وہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ اندھیرا بھی ان کی راہ میں حائل نہیں ہو رہا تھا۔

ایک آدمی کوٹھی کے سامنے والے برآمدے میں ایک طرف ریوالور لے کر کھڑا ہو گیا۔ باقی دونوں بھی برآمدے کے پاس آ گئے۔ اوپر منزل کو جانے والی سیڑھی خالی پڑی تھی۔ اس کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ دونوں آدمی ایک دوسرے کے پیچھے دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل کے دالان میں آ گئے۔ یہاں اندھیرا تھا۔ دروازہ بند تھا اندر نجمی اب نیند کی آغوش میں تھی۔

دونوں دبے پاؤں چل کر دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے پھر انھوں نے بند دروازے کے ساتھ کان لگا کر اندر کوئی آواز سننے کی کوشش کی۔ مگر اندر خاموشی چھائی ہوئی تھی وہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے پھر ایک ساتھ پانچ قدم پیچھے ہٹے، رکے اور پھر ایک ساتھ کندھوں کے بل دوڑ کر آئے اور پوری طاقت سے بند دروازے سے ٹکرا گئے۔ دھڑام کی آواز کے ساتھ دروازے کا پرانا پٹ ٹوٹ کر گر پڑا۔

نجمی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اندھیرے میں اسے دو آدمیوں کے سائے چھلانگ لگا کر اندر آتے

نظر آئے۔ اس کا ہاتھ بجلی کی تیزی کے ساتھ سرھانے کے نیچے رکھے پستول کی طرف گیا۔ مگر اتنی دیر میں دونوں آدمی اس کے اوپر چھلانگ لگا کر اسے دبوچ کر قابو میں لے چکے تھے۔ عورت چاہے دلاور ہی کیوں نہ ہو جسمانی طور پر مرد کے مقابلے میں کمزور ہوتی ہے۔ وہ دلیری اور جرأت میں مرد سے آگے نکل سکتی ہے مگر جسمانی طاقت میں وہ مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ دونوں مرد طاقتور اور پہلوان ٹائپ کے تھے۔ انھوں نے نجمی کو پوری طرح سے اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ نجمی نے چیخنا چاہا لیکن اس کے منہ کو سب سے پہلے ہاتھ رکھ کر بند کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ شاہ جی اپنی جگہ میں نہیں ہیں پھر بھی وہ احتیاط سے کام لے رہے تھے۔ آن کی آن میں انھوں نے نجمی کے منہ میں کپڑے کا گولا ٹھونس دیا۔ دونوں ہاتھ رسی سے پیچھے باندھ دیئے اور اسے گریبان سے پکڑ کر چارپائی سے نیچے کھینچ لیا۔ پھر اسے گھسیٹتے ہوئے نیچے لے آئے جہاں ان کا تیسرا آدمی بھی ریوالور لیے ان میں شامل ہو گیا۔ نجمی نے ان کی گرفت سے نکلنے کی بہت کوشش کی لیکن بہت جلد اس نے ہتھیار پھینک دیئے۔ اب دو آدمیوں نے نجمی کو ڈولی ڈنڈا کر کے اٹھا لیا تھا۔

جیپ آم کے باغ کے باہر ستاروں کی دھندلی روشنی میں بالکل تیار کھڑی تھی۔ نجمی کو جیپ میں آلوؤں کی بوری کی طرح پھینک کر اس کے اوپر ترپال ڈال دی گئی۔ تینوں آدمی اسے دبوچ کر اوپر بیٹھ گئے اور جیپ اندھیرے میں دریائے توی کے پل کی طرف جانے کی بجائے دوسری طرف کو روانہ ہو گئی۔ ترپال کے نیچے نجمی کا دم گھٹنے لگا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا ہوا تھا۔

وہ دو تین بار تڑپی تو ایک آدمی نے دوسرے سے کہا: "اب اس کے منہ سے کپڑا نکال دو۔"

دوسرے آدمی نے ترپال کے نیچے ہاتھ ڈالا اور نجمی کے منہ سے کپڑا کھینچ کر نکال دیا۔ نجمی ہانپنے لگی۔ جلدی جلدی سانس لینے لگی۔ اس کا گلا خشک ہو کر لکڑی کی طرح ہو گیا تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ کون لوگ ہیں۔ اسے کہاں لیے جا رہے ہیں اور اسے کس غرض سے اغوا کیا گیا ہے۔

ایک بات صاف ظاہر تھی کہ یہ پولیس کے آدمی نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس جرائم پیشہ لوگ تھے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کو خبر کس نے دی کہ پرانی کوٹھی میں ایک عورت اکیلی موجود ہے۔ نجمی کا ذہن کچھ سوچ رہا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ یہ چاروں ہندو جرائم پیشہ ڈوگرہ تھے جو علاقے کے ایک نامی گرامی بد

اور بردہ فروش ست پال کے آدمی تھے۔ ست پال ہماچل پردیش اور جموں کشمیر کے علاقے میں ناجائز منشیات کا کاروبار بھی کرتا تھا اور اس کا جنوب مشرقی ایشیا کے ایک بہت بڑے بردہ فروش گینگ سے بھی تعلق تھا۔ ست پال بے سہارا، گھر سے بھاگی ہوئی مظلوم لڑکیوں کو اغوا کر کے جموں سے اپنے خاص آدمیوں کے ذریعے جالنگ پہنچا دیتا تھا جہاں مشرق بعید کے گینگ کے ایجنٹ ڈالروں کی کرنسی میں رقم ادا کر کے عورتیں خرید کر لے جاتا تھا۔ ست پال اس سے پہلے کتنی ہی لڑکیوں کو اغوا کر کے مشرق بعید کے ممالک میں پہنچا چکا تھا جہاں وہ امیر و کبیر افیونی جاگیرداروں کے تہہ خانے میں لونڈیوں کی زندگیاں بسر کر رہی تھیں۔

نجمی کے بارے میں بھی اس کے مخبروں نے ست پال کو خبر کر دی تھی کہ ایک گھر سے بھاگی ہوئی عورت پرانی کوٹھی میں آکر ٹھہری ہے جسے شاہ ہاشم نے مسلمان ہونے کی وجہ سے پناہ دے رکھی ہے۔ ست پال نے اسی وقت ایک اسکیم تیار کی۔ شاہ ہاشم جی کو اس کی منہ بولی بیٹی کی بیماری کی جھوٹی خبر پہنچائی۔ جب شاہ جی جھگی سے چلے گئے تو ست پال نے اپنے آدمی بھیج کر نجمی کو اغوا کروا لیا۔ اسے بالکل معلوم نہیں کہ نجمی حقیقت میں بنگال کی وہ نامی گرامی چندا ڈکیت ہے جس کی پولیس کو تلاش ہے۔ شمالی ہندوستان کے اس علاقے تک چندا کی خبریں اتنی تفصیل سے نہیں پہنچی تھیں۔

راتوں رات نجمی کو ست پال کے خفیہ اڈے پر پہنچا دیا گیا جو جموں شہر سے دور جمبہ پٹھانکوٹ والی سڑک پر پہاڑیوں کے درمیان ایک پرانی حویلی میں واقع تھا۔ ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں نجمی کو پھینک کر اور باہر سے تالا لگا کر ست پال کے آدمی چلے گئے۔ ست پال اس وقت مے نوشی میں مشغول تھا۔ اس کے آدمیوں نے جا کر اطلاع کر دی کہ "مال" کوٹھری میں ڈال دیا گیا ہے۔

ست پال نے اپنے آدمیوں کو انعام دے کر کہا: "جاؤ دوسرے ساتھیوں کے ساتھ پہرے پر کھڑے ہو جاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی ست پال نے بھرا ہوا ریوالور صدری کی جیب میں رکھا اور اس کوٹھری کی طرف چلا گیا۔ اندھیرے میں نجمی جھلنگا سی کھاٹ پر بیٹھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی کہ یہاں سے فرار کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ اس کے ہاتھ ابھی تک پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ ست پال تالا کھول کر اندر آگیا۔ نجمی نے ایک لحیم شحیم آدمی کے سائے کو اندر آتے دیکھا تو تیز لہجے میں پوچھا کہ اسے یہاں

کیوں لایا گیا ہے؟ ست پال نے اس کی بات جیسے سنی ہی نہیں تھی۔ وہ کوٹھڑی کے طاق کی طرف بڑھا۔ ماچس جلا کر طاق میں رکھی لالٹین روشن کی۔ لالٹین کی دھیمی روشنی میں نجمی نے دیکھا کر کچھ سفید اور کچھ سیاہ بالوں والا ایک اونچا، لمبا، بھاری بھرکم آدمی طاق کے پاس کھڑا آگے پیچھے جھول رہا تھا۔

نجمی کو سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ اس نے پی رکھی ہے۔ وہ ایسے کئی پرعذاب مرحلوں سے گزر چکی تھی۔ ست پال جھومتا ہوا نجمی کے پاس آیا اور صدری اوپر اٹھا کر اس نے منہ سے ایک لفظ بولے بغیر صدری کی جیب سے نائیلوں کی رسی نکالی۔ نجمی کے منہ پر الٹے ہاتھ کا بھرپور تھپڑ مار کر اسے چارپائی پر گرا یا اور پھر اس کا پاؤں چارپائی کی پائنتی کی طرف باندھنے لگا۔ نجمی پوری طاقت کے ساتھ چارپائی پر سے اچھلی مگر بندھے ہوئے ہاتھ اسے کچھ نہیں کرنے دے رہے تھے۔ ست پال نے ایک اور زوردار تھپڑ نجمی کو رسید کر دیا۔ ساتھ ہی نجمی کی دوسری ٹانگ بھی پائنتی کے ساتھ رسی سے باندھ دی۔

پھر اس نے ریوالور نکالا اور چارپائی کے پاس رکھے اسٹول پر بیٹھ کر جھومتے ہوئے بولا "آج سے تیرا نام کملا ہے۔" نجمی کا کھولتا ہوا خون اس کی آنکھوں میں آگیا مگر وہ بے بس تھی۔ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ ست پال نے آہستہ آہستہ ریوالور کا دستہ نجمی کی ناک پر مارنا شروع کر دیا "تمھاری ناک توڑ کر یہاں نئی ناک لگائی جائے گی۔"

نجمی درد کے مارے تڑپ اٹھی۔ ست پال نے قہقہہ لگا کر ریوالور اوپر اٹھا لیا اور بولا "مگر تمھاری ناک تو خوبصورت ہے کملا! میں ست پال ہوں تمھارا پتی دیو۔ تم میری پوجا کرو۔ میری آرتی اتارو۔ میں تمھارا پتی دیو ہوں۔"

اور ست پال ہنسنے لگا اس کی توند اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ نجمی نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے اس مکروہ صورت عفریت سے نفرت ہو رہی تھی۔ اگر اس کے ہاتھ کھلے ہوتے تو وہ کم از کم اس عفریت کو جہنم میں پہنچانے کی کوشش ضرور کرتی۔

رات گزر گئی۔ دوسرے دن ایک آدمی نے آکر نجمی کی ٹانگوں کی رسیاں کھول ڈالیں پھر اس کے ہاتھوں کو بھی کھول دیا اور ایک غسل خانے میں دھکا دے کر دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔

تین دن اور تین راتیں نجمی اس قید خانے کی اندھیری کوٹھڑی میں پڑی رہی۔ چوتھے دن کی آدھی رات کو ست پال کے آدمی نجمی کی کوٹھڑی میں آئے۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس کے منہ میں رومال ٹھونسا اور اسے اٹھا کر باہر لے گئے۔

باہر ایک بند ویگن کھڑی تھی جس پر شیواجی ایمبولینس انگریزی اور ہندی میں لکھا ہوا تھا۔ نجمی کو اٹھا کر ایمبولینس میں ڈال کر ویگن کا دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا گیا اور ویگن رات کے اندھیرے میں کانگڑا کی طرف روانہ ہو گئی۔

کانگڑا پہنچنے کے بعد ایمبولینس کے اندر ہی ست پال کے ایک خاص آدمی نے نجمی کو ایک ایسا انجکشن لگایا جس سے اس کا جسم سن ہو گیا۔ وہ دیکھ سکتی تھی۔ سن سکتی تھی مگر بول نہیں سکتی تھی اور اپنے ہاتھ پیر بھی نہیں ہلا سکتی تھی۔ اب اس کے منہ سے رومال نکال دیا گیا اور اس کے ہاتھ پیر بھی کھول دیئے گئے اسے گلوکوز کا ڈرپ لگا دیا گیا تاکہ اس کی توانائی بحال رہے۔

ایمبولینس کانگڑا سے نکل کر منڈی کی طرف چل پڑی۔ منڈی میں نجمی کو ایک دوسری ایمبولینس میں لٹا دیا گیا۔ اب منزل شملہ تھی۔ شملے میں نجمی کو ایک ویران کوٹھی میں دن بھر رکھا۔ رات کے وقت اسے ایک بار پھر ایمبولینس میں لٹا کر چنڈی گڑھ کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ چنڈی گڑھ میں ست پال پہلے سے موجود تھا یہاں بھی نجمی کو شہر سے باہر ایک گم نام سی کوٹھی میں رکھا گیا۔ یہاں پہنچتے پہنچتے انجکشن کا اثر ختم ہو گیا تھا۔ نجمی کے پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ وہ اس ناگہانی آفت سے نڈھال ہو چکی تھی۔ پہلے سے کمزور بھی ہو چکی تھی۔

چنڈی گڑھ کی اس کوٹھی میں نجمی کو پورے پندرہ دن رکھا گیا۔ اسے بہتر سے بہتر خوراک دی گئی پندرہ دنوں تک ست پال اس کے سامنے نہ آیا۔ صرف اس کے جلاد صورت کارندے ہی اس کی دیکھ بھال اور نگرانی کرتے رہے۔ نجمی بھی چپ تھی اور کسی طرح سے وہاں سے بھاگنے کے متعلق مسلسل سوچ رہی تھی مگر جن لوگوں کے وہ قبضے میں تھی وہ اسے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی جگہ سے ہلنے نہیں دیتے تھے۔ ایسے سنگدل اور ظالم لوگوں سے نجمی کا پہلی بار واسطہ پڑ رہا تھا۔

یہاں سے نجمی کو ہوائی جہاز میں سوار کروا کر آسام کے دارالحکومت دارجلنگ پہنچانا تھا۔ ست پال نے اپنے چار آدمیوں کے علاوہ نجمی کا بھی ہوائی جہاز کا ٹکٹ لے لیا تھا۔ فلائیٹ رات

بارہ بجے کی تھی۔

پورے گیارہ بجے چار آدمی نجمی کے کمرے میں آئے اسے زبردستی قابو کرکے اس کو پھر وہی انجکشن لگا دیا جس کے لگاتے سے نجمی پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر نہ بول سکتی تھی نہ ہاتھ پاؤں ہلا سکتی تھی۔

ست پال کے ساتھی کھدر کے لباس میں ملبوس تھے۔ ست پال نے نجمی کو دھرم پتنی ظاہر کیا جو بیمار تھی اور جس کے علاج کے لیے وہ اسے دارجلنگ لے جا رہا تھا۔

رات ٹھیک بارہ بج کر دس منٹ پر جہاز چنڈی گڑھ ائیر پورٹ سے دارجلنگ کے لیے ٹیک آف کر گیا۔ نجمی سکتے کے عالم میں جہاز پر اسٹریچر پر پڑی تھی۔ کسی نے اس کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا تھا۔ اس قسم کے مریض جہازوں میں سفر کرتے ہی رہتے تھے۔ دارجلنگ پہنچ کر ست پال اور اس کے آدمی نجمی کو اسٹریچر پر ڈال کر ائیر پورٹ سے باہر لے آئے۔ باہر انٹرنیشنل بردہ فروشوں کے دو ٹھگنے قد مگر مضبوط جسم کے آدمی انگریزی سوٹ پہنے پہلے سے گاڑی لیے موجود تھے۔ نجمی کو گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈال دیا گیا اور گاڑی پچھلے پہر کی تاریکی میں ایک پہاڑی مقام کی طرف روانہ ہو گئی۔

یہ پہاڑی مقام دارجلنگ شہر سے بیس پچیس میل کے فاصلے پر بانس اور چیل کے درختوں کی ڈھلانوں والی پہاڑیوں کے درمیان واقع تھا۔ یہاں ایک ٹیلے کے پہلو میں بانس کے جھنڈوں میں گھرا ہوا ایک چھوٹا سا کاٹیج تھا۔ اس کاٹیج میں سامبا نام کا ایک چوڑے نتھنوں اور باریک آنکھوں والا آسامی اسمگلر پہلے سے "مال" وصول کرنے تیار بیٹھا تھا۔ نجمی ابھی تک سکتے کی حالت میں تھی۔ اسے کاٹیج کے ایک کمرے میں پلنگ پر لا کر ڈال دیا گیا۔ ست پال اور سامبا اس کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے ست پال نے کہا "سامبا اس بار بالکل تازہ مال لایا ہوں۔ لڑکی جوان اور خوبصورت ہے اس کا رنگ بھی گورا ہے۔"

سامبا نے نجمی کا اس طریقے سے معائنہ کیا جس طرح قصائی بکرا خریدتے وقت کرتا ہے۔ پھر ست پال کی طرف دیکھ کر بولا "لڑکی کی عمر زیادہ ہے۔"

ست پال نے فوراً کہا "اتنی زیادہ بھی نہیں ہے سامبا جی!"

سامبا ست پال کو دوسرے کمرے میں لے گیا اسے مشروب پیش کیا اور پھر دس ہزار پر سودا ہو گیا۔ روپے لے کر ست پال اپنے آدمیوں کے ساتھ دارجلنگ سے واپس جموں کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب نجمی سامبا اور اس کے بدمعاشوں کی تحویل میں تھی۔ چوبیس گھنٹے کے بعد ٹیکے کا اثر ختم ہو گیا۔ نجمی نے ہوش میں آتے ہی دیکھا کہ اس کے پاؤں میں لوہے کی ایک مضبوط زنجیر ہے جس کا سرا کمرے کے وسط میں گڑھے ہوئے لوہے کے کھمبے کے ساتھ بندھا ہے۔ زنجیر اتنی لمبی تھی کہ وہ کمرے میں چل پھر سکتی تھی۔ کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی اس کی دیواریں پتھر کی تھیں اس کے دو دروازے تھے۔ ایک دروازہ باہر برآمدے میں کھلتا تھا اور دوسرا دروازہ غسل خانے کا تھا۔ غسل خانے میں اوپر ایک چھوٹا روشندان تھا جس میں آہنی سلاخیں لگی تھیں۔ ان سلاخوں میں سے ایسی روشنی آ رہی تھی جیسے سورج غروب ہو چکا ہو۔ نجمی نے منہ ہاتھ دھویا۔ وہاں کوئی آئینہ نہیں لگا تھا۔ ایک کنگھی پڑی تھی۔ نجمی نے اپنے بالوں میں کنگھی پھیری اور زنجیر کو جھنجھناتی واپس کمرے کے وسط میں بچھی ہوئی بانس کی چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور تین آدمی اندر داخل ہوئے تینوں ناٹے قد کے تھے۔ ان کے چہرے آسامیوں کی طرح چپٹے تھے۔ انھوں نے رنگدار بش شرٹیں اور جینز پہن رکھی تھیں دو آدمیوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ تیسرے کے ہاتھ میں کھانے کا ٹرے تھا۔ دونوں مسلح آدمی دروازہ بند کر کے پستول لیے کھڑے ہو گئے تیسرے نے نجمی کے آگے کھانا رکھا اور پھر تینوں باہر نکل گئے۔ نجمی کو باہر تالا لگانے کی آواز آئی۔

نجمی ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گئی۔ اسے سخت بھوک لگ رہی تھی اس نے ٹرے کی طرف دیکھا۔ ٹرے میں بھنی ہوئی چھوٹی مرغی، مرغی کا سوپ، چاول اور ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا جگ پڑا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ ست پال اسے سامبا کے پاس فروخت کر کے چلا گیا ہے اور چونکہ سامبا کو اسے آگے کسی سیٹھ یا جاگیردار کے پاس فروخت کرنا ہے اس لیے اسے بہتر سے بہتر غذا دی جا رہی ہے تاکہ اس کی خوبصورتی بحال رہے اور سامبا اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کر سکے۔ نجمی نے مایوسی اور ناامیدی کے خیالات کو جھٹک دیا اور ڈٹ کر کھانا کھایا۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ جہاں سے اور جب بھی اسے فرار کا موقع ملا تو وہ واپسی کے سفر میں اپنے ان دشمنوں سے پورا پورا انتقام لے گی۔

رات تو اس کے لیے چارپائی پر آرام دہ بستر لگا دیا گیا۔ نجمی کو دارجلنگ کے نواح میں واقع اس کاٹیج نما قید خانے میں پندرہ روز تک رکھا گیا۔ اس دوران اسے بہترین کھانا کھلایا گیا۔ رات کو سونے سے پہلے اسے انناس کا جوس بھی بلا ناغہ پلایا جاتا رہا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پندرہ دنوں میں ہی نجمی کی صحت پہلے سے بہتر ہو گئی۔ اس کا رنگ نکھر آیا اور چہرے پر بھی چمک آ گئی۔ اسے کمرے سے باہر ایک بار بھی نہیں نکالا گیا تھا اور پاؤں میں بندھی ہوئی زنجیر کو جرائم پیشہ مرد دن میں دو بار چیک کر لیتے تھے۔ جس بردہ فروش سامبا نے نجمی کو خریدا تھا وہ اس عرصے میں صرف ایک بار نجمی کے پاس آیا۔ اس کا اچھی طرح سے معائنہ کیا اور چلا گیا۔ نجمی نے اسے کہا کہ وہ اسے چھوڑ دے۔ وہ اسے اس زیادہ رقم ادا کرے گی مگر سامبا نے اس کی بات پہ دھیان نہ دیا اور نجمی کو ہر طرف سے جانچتا اور پرکھتا رہا کہ اچھی خوراک اس پر کیا اثر کر رہی ہے۔

اس طرح نجمی کو وہاں بیس روز گزر گئے۔ نجمی کی نگرانی دن کے وقت سات آدمی کرتے تھے۔ جن کے پاس رائفلیں بھی تھیں اور آسام کے تلوار نما چھرے بھی تھے جیسے وہ کمر کمر ی بھی کہتے تھے۔ رات کے وقت کاٹیج کے ارد گرد آگ کا الاؤ روشن کر کے دس آدمی پہرے پر بیٹھ جاتے۔ ان لوگوں کو خاص طور پر رات کو شراب پینے سے منع کر دیا گیا تھا۔ نجمی نے بہت غور و فکر کیا لیکن وہاں سے فرار کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ غسل خانے کا روشندان اونچا تھا ویسے بھی اس میں لوہے کی سلاخیں لگی تھیں جنھیں نجمی بغیر کسی ہتھیار کے نہیں کاٹ سکتی تھی۔ آخر ایک روز نجمی کے لیے سرخ رنگ کی ریشمی ساڑھی اور نقلی سونے کے زیور اور پھولوں کے ہار اور گجرے لے کر ایک بوڑھی عورت اندر آئی۔ وہ سوائے آسامی زبان کے اور کوئی زبان نہیں جانتی تھی۔

نجمی سمجھ گئی کہ اسے آگے کسی کے ہاتھ بیچا جا رہا ہے۔ اس نے کوئی احتجاج نہ کیا اور خاموشی سے نئے کپڑے پہن لیے۔ اب وہ بھی اس قید خانے سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ شاید آگے کسی نئے ماحول میں جا کر اسے فرار کا موقع مل جائے۔ یہ اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ آگے وہ کس قسم کے بھیانک ماحول میں جا رہی ہے۔ ریشمی ساڑھی پہن کر اس نے بال بنائے۔ آسامی عورت اس کی مدد کر رہی تھی۔ بالوں میں گجرے باندھے گئے۔ گلے میں نقلی سونے کے زیور پہنے، پاؤں میں موتیوں والی چپل پہنی۔ جب آسامی عورت نے نجمی کو شیشہ دکھایا تو نجمی کو اپنی شکل بڑی خوبصورت لگی۔ اسے کئی سال پہلے

لاہور والی نجمی یاد آ گئی۔ نجمی نے جلدی سے شیشہ پرے ہٹا دیا۔ وہ لاہور والی نجمی کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

تیسرے پہر سامبا ایک گول مٹول کالے رنگ کے پھولی ہوئی توند والے آدمی کو لے کر اندر آیا جس نے سلک کا کرتہ اور سلک ہی کی دھوتی پہن رکھی تھی۔ ماتھے پر لال تلک لگا تھا۔ گلے میں چھوٹا سا چمڑے کا بیگ لٹک رہا تھا اس نے آتے ہی نجمی کی طرف گھورنا شروع کر دیا۔ اس وقت کمرے میں سو واٹ کا بلب روشن تھا۔ اور نجمی خاموش ریشمی بستر پر بیٹھی تھی۔ نجمی بھی جان بوجھ کر اس کالے بھجنگ ہندو کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ وہ تو بے حد خوش ہوا۔ سامبا بھی بہت خوش ہوا۔ کیونکہ اس طرح سے نجمی کی قیمت میں اضافہ ہو سکتا تھا۔

سامبا نے نو وارد ہندو سے انگریزی میں کہا: "ایسا مال سارے انڈیا میں اس وقت نہیں ہے مہنگے دام دے کر اسے لکھنؤ سے خریدا ہے۔ ویسے یہ پنجاب کی رہنے والی ہے اور اس کا نام کملا ہے۔"

موٹے کالے بھجنگ ہندو نے دانت نکال کر کہا: "دودھ مکھن کی پلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

یہ کالا بھجنگ ہندو شکل صورت سے تامل لگتا تھا اس کا انگریزی بولنے کا لہجہ بھی جنوبی ہند کے لوگوں جیسا تھا۔

نجمی نے بھی انگریزی میں کہا: "وہ شخص خوش قسمت ہو گا جو مجھے اپنے پاس رکھے گا۔"

ہندو کالے بھجنگ کو تو حیران ہونا ہی تھا لیکن سامبا کا تو حیرت کے مارے منہ کھل گیا اس کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ جس لڑکی کو وہ ناجائز طور پر فروخت کر رہا ہے وہ اپنی فروخت پر اتنی خوش ہو گی اور انگریزی زبان بھی جانتی ہو گی۔ سامبا کو موقع مل گیا جھٹ ہندو تامل کی طرف دیکھ کر بولا "دیکھا۔ کملا پڑھی لکھی بھی ہے۔ ایم اے پاس ہے وہ خود کہتی ہے کہ مجھے جو اپنے پاس رکھے گا میں اسے خدمت کر کے خوش کر دوں گی۔"

کالے بھجنگ تامل نے سامبا کا ہاتھ پکڑا اسے باہر لے گیا۔ اس کے باہر نکلتے ہی سامبا کے آدمیوں نے دروازہ بند کر کے باہر تالا لگا دیا اور پہرہ بیٹھ گیا۔ اسی رات نجمی کو وہاں سے نکال کر اگلی منزل کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ نجمی کو کیا خبر کہ سامبا نے اسے پچاس ہزار کے عوض خلیج بنگال میں واقع

انڈیمان کے اوپر شمال میں لینڈ فال نام کے ایک دور افتادہ جزیرے کے بہت بڑے چائے، کوکو اور کافی فارم کے ایک مرہٹہ نژاد جاگیردار کاٹل کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ ہندو تامل اس مرہٹہ جاگیردار کاٹل کا ایجنٹ تھا اور ایک لاکھ روپیہ لے کر اپنے مالک کے لیے کوئی خوبصورت عورت خریدنے آیا تھا۔ اس کے ساتھ جاگیردار کاٹل کے باڈی گارڈز کا پورا دستہ آیا ہوا تھا۔ نجمی کو اس دستے کی نگرانی میں دارجلنگ سے خلیج بنگال کے دور افتادہ، عین سمندر کے بیچ میں واقع جزیرے لینڈ فال جانا تھا۔ لینڈ فال نامی جزیرہ زیادہ بڑا نہیں تھا اور سارے کا سارا کافی اور گرم مسالوں کے درختوں سے بھرا ہوا تھا۔ مرہٹے کاٹل کے دادا نے انگریزوں سے یہ جزیرہ اس زمانے میں ستر ہزار روپے میں خرید لیا تھا۔ انگریزوں کے جانے کے بعد اس جزیرے پر بھی انڈیا نے قبضہ کر لیا لیکن مرہٹہ جاگیردار کاٹل نے انڈین گورنمنٹ سے یہ جزیرہ بارہ لاکھ روپے کے عوض لیز پر لے لیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے صرف یہ شرط لکھوائی کہ جزیرے کی کل پیداوار کا ایک بٹہ تین حصہ اسے دیا جائے گا۔ یہ سودا مرہٹے جاگیردار کاٹل کو مہنگا نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے بھی یہ شرط لکھوائی کہ جزیرے پر اس کا اپنا حکم چلے گا اور انڈین گورنمنٹ اس میں دخل نہیں دے گی۔ ہندوستان کی حکومت نے خفیہ طور پر کاٹل سے اس ہدایت کے بعد معاہدہ کر لیا کہ جزیرے کا امن امان خراب نہیں ہوگا چنانچہ اب اس چھوٹے سے جزیرے میں کاٹل کی اپنی فوج تھی۔ اپنا جیل خانہ تھا۔ پولیس کا بھی اپنا انتظام تھا۔ جزیرے میں امن وامان بحال رکھنے کے نام پر وہ انڈیا سے خفیہ طور پر - اسلحہ بھی خریدتا تھا۔

انڈین گورنمنٹ نے محض نام رکھنے کی خاطر وہاں اپنا ایک بنگالی پولیٹیکل ریجنٹ چھوڑا تھا جو جزیرے کے مالک کاٹل کے احسانات کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور اسے شراب و کباب ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ کاٹل نے اپنی چھوٹی سی فوج اور پولیس میں زیادہ تر گورکھے بھرتی کر رکھے تھے۔ باقی مرہٹہ تھے۔ مہاراشٹر ہی سے اس نے مرہٹہ مزدوروں اور کاشتکاروں کے کنبے بھی منگوا کر جزیرے میں آباد کروا لیے تھے وہ انھیں ہر قسم کی سہولت دیتا تھا۔

خود مرہٹہ تھا اس لیے مرہٹوں کا بے حد خیال رکھتا تھا۔ جزیرے کے درمیان ایک جگہ اس نے اپنے لیے شاندار محل نما بہت خوبصورت اور بہت بڑا بنگلہ بنوا رکھا تھا۔ اس بنگلے میں ہر قسم کی جدید سہولت موجود تھی۔ اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ عمر پچاس کے قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ ایک بھینسے کی

طرح مضبوط تھا۔ اس نے اپنے محل میں بیس عورتیں ڈال رکھی تھیں جن میں آسامی، برمی، بنگالی اور سیلون کی عورتیں بھی تھیں۔ نجمی پہلی پنجابی عورت تھی جو اس کے محل میں داخل ہو رہی تھی۔ چونکہ اس جزیرے کا موسم گرم تھا اور حبس بے پناہ ہوتا تھا اس لیے کاٹل ہمیشہ سفید بش شرٹ اور سفید پتلون پہنے رکھتا تھا۔

بی اے تک وہ بمبئی میں پڑھتا رہا تھا پھر باپ کے مرنے کے بعد جزیرے میں آکر اس نے جاگیر کا نظام سنبھال لیا تھا۔

نجمی اس مرہٹہ بھینسے نما جاگیردار کاٹل کی داشتہ بن کر خلیج بنگال کے جزیرے لینڈ فال میں جا رہی تھی ابھی تک اسے صرف اتنا ہی معلوم تھا کہ اسے کسی تیسرے گاہک نے خرید لیا ہے اور ہو سکتا ہے وہ چوتھے ہاتھ مزید فروخت کر دی جائے۔

دارجلنگ سے رات کے وقت اسے ایک بند ویگن میں بٹھا کر لے جایا گیا۔ اگرچہ نجمی نے اپنے رویے سے یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ اپنی نئی زندگی سے مطمئن ہے تاہم تامل ہندو کی گورکھا گارڈ نجمی کے ساتھ ہی ویگن میں بیٹھی۔ اس ویگن میں کوئی کھڑکی نہیں تھی صرف چھت میں ہوادان تھا۔ دارجلنگ سے یہ لوگ میزورام صوبے کے ایک چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں آگئے۔ یہاں ان کا پڑاؤ چاپا ٹونگ کا ایک پہاڑی مقام تھا جو سطح سمندر سے تقریباً پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ اس علاقے کی ایک جانب برما کی سرحد تھی اور دوسری طرف چٹاگانگ کا پہاڑی سلسلے کاکس بازار تک پھیلا ہوا تھا۔

دو روز نجمی کو اس جگہ رکھا گیا۔ شیلانگ سے کرائے پر لیا گیا ایک ہیلی کاپٹر چوتھے روز وہاں پہنچا۔ یہ ہیلی کاپٹر جزیرے کے مرہٹہ جاگیردار کاٹل نے اپنے ذاتی استعمال کے چیزوں کی سپلائی کے لیے چارٹرڈ کروایا تھا اور اسے کہا گیا تھا کہ وہ چاپا ٹونگ سے آتی دفعہ اس کے آدمیوں کو بھی لیتا آئے۔ تامل گورکھا گارڈ نے نجمی کو بھی اپنے ساتھ اس ہیلی کاپٹر میں سوار کروایا تو نجمی کو پہلی بار تشویش ہوئی اسے کہیں بہت دور لے جایا جا رہا ہے۔ کیا وہ ہندوستان سے باہر جا رہی ہے؟ ایک احساس اس کے دل میں وسوسہ بن گیا تھا کہ جوں جوں وہ دور ہوتی جا رہی ہے اس کے فرار کے راستے میں مزید دشواریاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کے باوجود نجمی نے ہمت نہیں ہاری تھی اس نے اپنے دل میں عہد کر لیا کہ وہ جہاں بھی جائے گی وہاں سے ایک نہ ایک دن ضرور فرار ہو گی اور ان لوگوں سے

اپنی رسوائیوں کا بدلہ لے گی۔ جو اسے جموں سے اغوا کر کے لے جا رہے ہیں اور جن کی وجہ سے وہ ایک بار پھر ذلتوں کے دلدل میں دھکیل دی گئی ہے۔ رات کے پچھلے پہر ہیلی کاپٹر چاپاٹونگ کی پہاڑی سے اڑا اور جنوب کی طرف پرواز کرنے لگا۔ دن کی روشنی جب ہوئی تو نجمی نے نیچے جھانک کر دیکھا وہ کالے سیاہ سمندر کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ نجمی نے انگریزی میں ہندو تامل سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اس نے گردن کھجاتے ہوئے انگریزی میں کہا "تم اپنے گھر جا رہی ہو۔"

نجمی نے دل ہی دل میں اسے ایک گالی دی اور چپکی ہو کر بیٹھ گئی۔ دوپہر کے وقت ہیلی کاپٹر جزیرہ لینڈ فال کے اوپر منڈلانے لگا۔ نجمی نے نیچے دیکھا بیضوی شکل کا ایک ہرا بھرا سرسبز و شاداب جزیرہ سمندر میں پان کے پتے کی طرح پڑا تھا۔ وہ جغرافیہ پڑھی ہوئی تھی وہ سمجھ گئی کہ یہ جزیرہ جزائر انڈیمان کا ہی کوئی جزیرہ ہے کیونکہ اسے دور سمندر میں دوسرے چھوٹے چھوٹے جزیروں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر نیچے ہو رہا تھا۔ جزیرے کے درخت اوپر آ رہے تھے نجمی کو سبزے اور ناریل کے درختوں کے درمیان ٹیلوں کے بیچ ایک محل نما بہت بڑا کاٹیج دکھائی دیا۔ جس کے لان میں ایک طرف دو سفید موٹر کاریں کھڑی تھیں۔ ہیلی کاپٹر اسی سرخ و سفید محل کے عقبی لان میں ایک جگہ اتر گیا۔ محل کے مدراسی، مراٹھی اور گورکھے نوکر جو سفید وردیوں میں ملبوس تھے آگے بڑھے۔ ہیلی کاپٹر کے پنکھے ساکت ہوئے تو نجمی کو لے کر ہندو تامل، نوکروں کی معیت میں محل کے اونچے اونچے ستونوں والے برآمدے کی طرف بڑھا۔ سامنے لکڑی کا اونچا دروازہ تھا۔ باہر دو مسلح گورکھے پہرہ دے رہے تھے۔ اس نے ہندو تامل کے اشارے پر دروازہ کھول دیا۔ اندر ایک وسیع ہال تھا جس کا فرش بیش قیمت قالینوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ گول چھت کے ساتھ چھ فانوس لٹک رہے تھے۔

دونوں طرف سے منقش ریلنگ والی گھومتی سیڑھیاں اوپر کی گیلری کی طرف جاتی تھیں۔ یہ سیڑھیاں بھی قالین سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ یہاں وردی پوش نوکر رک گئے۔ صرف ہندو تامل جس نے نجمی کو سامبا سے خریدا تھا نجمی کو ساتھ لے کر سیڑھیاں چڑھنے لگا اوپر گیلری کے آگے بھی ایک عالی شان دروازہ تھا۔ یہاں بھی ایک گورکھا پہرہ دے رہا تھا۔ اس نے ہندو تامل کو دیکھ کر دروازہ کھول دیا۔ یہ بھی ریشمی قیمتی قالینوں والا ایک عالی شان کمرہ تھا جس کی کھڑکیاں محراب دار اور بلند تھیں۔ ان کے آگے

گلابی اور سفید باریک ریشمی پردے پڑے تھے جس کی وجہ سے کمرے میں عجیب قسم کی ملی جلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

یہاں پہلی بار نجمی نے دو ادھیڑ عمر برمی چہرے والی عورتوں کو دیکھا جنھوں نے بے حد میک اپ کیا ہوا تھا۔ زریفت کی ساڑھیوں میں ملبوس تھیں کمرے کی فضا ائیر کنڈیشنڈ تھی اور لطیف خوشبو فضا میں تیر رہی تھی۔ ان عورتوں نے نجمی کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ ہندو تامل یہاں سے واپس چلا گیا۔

یہ عورتیں نجمی کو ایک اور کمرے میں لے گئیں۔ جہاں آرائش کا بے شمار سامان پڑا تھا۔ یہ کوئی بیوٹی پارلر لگتا تھا۔

ایک عورت نے انگریزی میں نجمی سے پوچھا "کیا تم انگریزی سمجھ لیتی ہو؟"

نجمی نے اثبات میں جواب دیا تو عورت نے کہا "تمھیں اب تیار ہونا ہوگا۔"

دوسری برمی عورت کلوزٹ میں سے دس بارہ ساڑھیاں نکال کر لے آئی۔ دونوں نے آپس میں چند لمحے مشورہ کیا اور پھر ایک نیلی ساڑھی نجمی کے لیے پسند کر لی۔ نجمی کرسی پر چپ چاپ بیٹھی یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔ نجمی کو نہلایا گیا۔ اس کے جسم پر خوشبوئیں چھڑکی گئیں۔ بال خاص انداز سے گوندھے گئے۔

ساڑھی پہن کر نجمی نے آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو وہ ایک راجکماری لگ رہی تھی اس کا گورا رنگ سنگ مرمر کی طرح چمک رہا تھا۔ دونوں برمی عورتیں بھی اس کے حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں اس کے بعد نجمی کو ساتھ والے کمرے میں لے جایا گیا۔ جو بیڈ روم تھا اس کی شان ہی نرالی تھی۔ دیواروں پر کم خواب کے نسواری پردوں کے درمیان دیواروں پر جگہ جگہ نیم عریاں عورتوں کی آئیل پینٹنگز لگی تھیں۔ بہت بڑے چاندی کے پایوں والے ڈبل بیڈ کی دونوں جانب کیوپڈ کے بت لگے تھے۔ چھت پر بھی ہیجان خیز تصویریں بنائی گئی تھیں۔ کمرے میں روشنی ہلکی تھی پلنگ کے چاروں کونوں پر ڈھکے ہوئے لیمپ روشن تھے جن کی روشنی بہت پر اسرار اور بڑی رومانی تھی۔

ایک برمی عورت نے کہا "یہ آج کی رات تمھارا بیڈ روم ہوگا۔"

نجمی کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "اور اس کے بعد مجھے کہاں رہنا ہوگا۔"

دونوں تجربہ کار بڑی خادماؤں نے چونک کر نجمی کی طرف دیکھا۔ ایک خادمہ اپنی آنکھوں کو سکیڑ کر بولی۔"یہ تمھیں کل صبح بتا دیا جائے گا کہ اس کے بعد تم کہاں رہو گی؟" دلہن بنی نجمی کو شاہی محل ایسے بیڈروم میں اکیلا چھوڑ کر دونوں بڑی خادمائیں چلی گئیں۔ نجمی نے دوبارہ بیڈروم کا جائزہ لیا۔ پھر وہ ایرانی قالین پر آہستہ آہستہ بے آواز قدموں سے چلتی اونچی محرابی کھڑکی کے پاس آ گئی اس نے کھڑکی کا سفید ریشمی پردہ ایک طرف ہٹا کر نیچے کشادہ لان میں دیکھا۔ ایک سرخ رنگ کی اسپورٹس کار وہاں آ کر رکی۔ دو وردی پوش نوکروں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ اندر سے ایک گھٹے ہوئے سر اور چوڑے چکلے بن مانس ایسے شانوں والا ایک سیاہ فام آدمی باہر نکلا جس نے سلک کا سفید کرتا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہنٹر تھا۔ وہ ہنٹر کو فضا میں لہراتا محل کے دروازے کی طرف بڑھا۔ نجمی سمجھ گئی کہ یہی وہ مرہٹہ جاگیردار کاٹل ہے جس نے اسے پچاس ہزار روپے میں خریدا ہے۔ وہ جلدی سے پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی۔

٭ ٭ ٭

نجمی بیش قیمت ساڑھی پہنے دلہن بنی پلنگ پر بیٹھی تھی۔

اسے ہر حالت میں اس نئے اور خوبصورت قید خانے سے فرار ہونا تھا کچھ وقت کے لیے اس نے حالات سے سمجھوتہ کرنے اور پھر صورت حال کا جائزہ لے کر کوئی راہ فرار اختیار کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ وہاں جس قسم کا ماحول تھا اور ہندوستان سے وہ جتنی دور آ گئی تھی اس کے پیش نظر اس قسم کے لائحہ عمل کے سوا دوسرا کوئی راستہ اسے بظاہر نظر نہیں آ رہا تھا۔

اونچے محلاتی دروازے کا پردہ ہٹا۔ نجمی نے گردن موڑ کر دیکھا دروازے میں وہی کالا سیاہ بھینسا نما جاگیردار کاٹل ہاتھ میں ہنٹر لیے کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

یہ کس قسم کا آدمی ہے؟ نجمی کے دل میں خیال آیا کاٹل چمڑے کے ہنٹر کو مروڑتا ہوا نجمی کے پاس آ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ نجمی کو عجیب قسم کی بو آئی۔ یہ بو اس نے گھنے جنگلوں میں پھیلتے پانیوں والے جوہڑوں کے قریب سے گزرتے اکثر محسوس کی تھی۔ کاٹل نے اگرچہ اپنے سلک کے کرتے پر اعلیٰ پرفیوم کی پوری بوتل انڈیل رکھی تھی اس کے باوجود جھپلتے پانی کی ناگوار بو نمایاں تھی۔ نجمی کو اس آدمی سے شدید کراہت محسوس ہوئی اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس بھینسے سے دور رہے گی۔

مرہٹہ بھینسا کاٹل بھاری اور بیٹھی ہوئی آواز میں انگریزی میں کہنے لگا "مجھے بتایا گیا ہے کہ تم انگریزی جانتی ہو کیا یہ سچ ہے۔؟"

نجمی نے نگاہیں اٹھا کر کاٹل کو دیکھا کالے سیاہ بھاری بھرکم چہرے پر دو آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ نجمی نے اثبات میں سر ہلایا تو کاٹل نے انگریزی میں بات شروع کی۔

"میں نے تمھیں سب سے زیادہ قیمت دے کر خریدا ہے آج سے تم میری ہو اور جب تک زندہ

یہاں میری بن کر ہی رہو گی۔

نجمی نے دل میں نفرت کے ساتھ کہا... تو کیا تیرا باپ بھی مجھے یہاں نہیں رکھ سکے گا تم جانتے ہی نہیں ہو کہ تمھارا احمق دلال کس عورت کو خرید کر یہاں لایا ہے۔

کاٹل کہہ رہا تھا۔

"اٹھو میرے ساتھ آؤ۔"

نجمی نے کاٹل کی طرف دیکھا کاٹل ہنٹر کو مروڑتے ہوئے نجمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے گھور رہا تھا "اٹھو میرے ساتھ آؤ" اس نے اپنی بات کو کرخت آواز میں دہرایا۔

نجمی پلنگ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کاٹل آگے آگے چلنے لگا۔ بیڈ روم سے نکل کر وہ دوسرے کمرے میں آیا تو یہاں سے لکڑی کا ایک زینہ نیچے جاتا تھا۔ کاٹل پرے ہٹ گیا اور بولا۔

"نیچے چلو۔"

نجمی سے نہ رہا گیا اس نے پوچھا۔

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

کاٹل نے ہنٹر کا دستہ نجمی کی گردن سے لگا کر دبایا اور بولا۔

"تمھیں مجھ سے کوئی بات پوچھنے کا حق کس نے دیا۔؟"

نجمی کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی اس کی آنکھیں بھی دہکنے لگیں مگر اس نے انتہائی ضبط سے کام لیا۔ مصلحت بھی اسی میں تھی وہ زینہ اترنے لگی نیچے ایک تہہ خانہ تھا جس کے فرش پر لوہے کا خالی پلنگ بچھا تھا۔ تہہ خانے میں نیم اندھیرا تھا۔ نجمی یہ دیکھ کر چونک سی گئی کہ پلنگ کے سرہانے کی جانب دیوار کے ساتھ لگ کر دو ناٹے قد کے سیاہ فام حبشی نما ہٹے کٹے آدمی ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

وہ رک گئی۔ اس نے کاٹل کی طرف دیکھا۔ کاٹل نے سیاہ فام نوکروں کو اشارہ کیا اشارہ پاتے ہی دونوں حبشی نجمی پر ٹوٹ پڑے انھوں نے اس کو پلنگ پر زبردستی لٹا کر اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں پلنگ کی ریلنگ سے باندھ دیئے۔

نجمی نے چیخ کر کہا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے کیا تم اپنی خریدی ہوئی عورتوں سے یہ سلوک کرتے ہو؟"

کاٹل نے کوئی جواب نہ دیا۔ نوکروں کو اشارہ کیا وہ سر جھکانے کے بعد زینہ چڑھ کر تہہ خانے سے باہر نکل گئے۔ ان کے نکلتے ہی کاٹل نے نجمی پر ہنٹر برسانے شروع کر دیئے۔ نجمی کے لیے یہ ایک ناگہانی آفت تھی۔ ہنٹر کی ضربوں سے اس کا جسم تڑپ اٹھا۔ ہنٹر اس کی رانوں اور سینے پر پڑ رہے تھے۔ درد سے اس کا جسم پھٹا جا رہا تھا۔

کاٹل نے ہاتھ روک لیا اور نجمی کے قریب آ کر اس کی گال پر زور سے تھپڑ مارا اور بولا "جو عورت پہلی بار یہاں آتی ہے اس کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے میں اسے ضروری سمجھتا ہوں۔"

کاٹل کا سانس پھولا ہوا تھا وہ بن مانس کی طرح سانس لے رہا تھا ہنٹر کو اس نے اپنی گردن میں ڈالا اور زینہ چڑھتے ہوئے تہہ خانے سے چلا گیا۔

نجمی پر اچانک یہ سب کچھ گزر گیا تھا اس کے جسم پر جہاں جہاں ہنٹر پڑے تھے وہاں درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کے کنارے سے خون کی باریک لکیر بہہ رہی تھی اس نے اپنی زبان پر خون کا نمکین ذائقہ محسوس کیا اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی بجائے خون اتر آیا تھا مگر وہ جکڑی ہوئی تھی وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ کم از کم ابھی کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی اس نے پہلے جو ارادہ دل میں کر رکھا تھا اسے فوراً رد کر دیا اور اسی وقت دل میں ٹھان لی کہ وہ کاٹل سے اس ظلم کا اپنی ایسی دوسری عورتوں کے ظلم کا پورا پورا بدلہ لیے بغیر وہاں سے فرار نہیں ہو گی۔

پندرہ بیس منٹ اسی طرح گزر گئے پھر لکڑی کے زینے پر سے وہی بڑی عورت جس نے نجمی کو بنا سنوار کر پلنگ پر بٹھایا تھا اتر کر اس کے پاس آئی اور اس کے ہاتھ پاؤں کی رسیاں کھولنے لگی۔ نجمی نے اس ادھیڑ عمر بڑی عورت سے کوئی بات کرنا گوارا نہ کیا۔ بڑی عورت کے ہاتھ اس طرح چل رہے تھے جیسے وہ کسی انسان کی نہیں بلکہ کسی بکری کی رسیاں کھول رہی ہے۔ ظاہر ہے یہ منظر وہ کئی بار پہلے بھی دیکھ چکی تھی اس سے کوئی بات کرنا بیکار تھا۔ نجمی پلنگ پر بیٹھ کر اپنی کلائیاں سہلانے لگی۔ اس کا جسم درد کر رہا تھا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ ہنٹر کی ضربوں سے نیل پڑ گئے تھے۔

بڑی عورت نے انگریزی میں کہا "میرے ساتھ اوپر آ جاؤ۔"

نجمی اوپر والے کمرے میں آ گئی اس سے ٹھیک طرح سے چلا نہیں جاتا تھا کتنا وہ بیڈ روم میں

دوسری ادھیڑ عمر آسامی عورت پلنگ کے پاس کھڑی تھی گول چاندی کی تپائی پر کچھ شیشیاں رکھی تھیں آسامی اور برمی عورتوں نے نجمی کو پلنگ پر لٹا کر اس کے جسم پر جہاں جہاں نیل کے نشان پڑے تھے وہاں شیشیوں میں سے مرہم نکال کر لگانا شروع کر دیا۔ ٹھنڈے مرہم سے نجمی کو سکون محسوس ہوا اس کے بعد نجمی کو گرم دودھ پلایا گیا۔

برمی عورت چلی گئی تو آسامی عورت نے کہا۔

"تم کچھ دن اسی کمرے میں رہو گی۔ تمھیں باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔"

یہ عیار آسامی عورت بھی چلی گئی۔ نجمی نے ساڑھی پہن لی اور پلنگ پر لیٹ گئی۔ دوپہر کو ایک تیسری بوڑھی عورت اس کے لیے کھانا لے کر آگئی۔ کھانا پر تکلف تھا شام کو اسے کافی اور پھل دیئے گئے۔ رات کو بھی پر تکلف کھانا دیا گیا۔ اس دوران نجمی پلنگ سے اٹھ کر دروازے کے پاس گئی تو اس نے دیکھا کہ باہر دوسری طرف ہال کمرے میں دو گورکھا نوکر اسٹین گنیں اٹھائے پہرہ دے رہے تھے انھوں نے گھور کر نجمی کی طرف دیکھا اور واپس جانے کا اشارہ کیا۔

تین دن نجمی اسی کشادہ بیڈ روم میں بند رہی بہتر غذا اور مرہم وغیرہ کی مالش سے اس کی طبیعت بحال ہو گئی تھی جسم پر نیل کے نشان بھی مدہم پڑ گئے تھے۔ درد بھی برائے نام باقی رہ گیا تھا۔ چوتھا اور پھر پانچواں دن بھی اسی کمرے میں قید کی حالت میں گزر گیا جب ایک ہفتہ گزر گیا تو برمی اور آسامی عورت اس کے لیے بیش قیمت لباس لے کر بیڈ روم میں داخل ہوئیں۔ نجمی کو نہلایا گیا اس کے جسم پر مختلف عطریات کی مالش کی گئی اسے بیش قیمت لباس پہنایا گیا پھر اسے دلہن کی طرح بنا سنوار کر پلنگ پر یہ کہہ کر بٹھا دیا گیا کہ آج اس کی سہاگ رات ہے۔

نجمی نے دل میں دونوں عورتوں کو گالی دی اور ہونٹ کاٹنے لگی۔ جب رات گہری ہو گئی اور محل کے آس پاس خاموشی چھا گئی تو بن مانس مرہٹہ جاگیردار کاٹل نشے میں وحشت اندر داخل ہوا وہ سگریٹ پی رہا تھا اور ایک ہاتھ میں چاندی کا سگریٹ کیس تھا۔ آتے ہی اس نے واہی تباہی بکنا شروع کر دی اور نجمی پر تشدد شروع کر دیا۔

شمالی انڈیمان کے اس دور افتادہ چھوٹے سے جزیرے لینڈ فال میں قید نجمی کو ایک مہینہ گزر گیا تھا۔ وہ جاگیردار کاٹل کے شاندار محل کے اندر قید تھی۔ اسے محل سے باہر نکلنے کی اجازت

نہیں تھی اس کی دوسری عورتوں کو بھی محل کی پچاس فٹ اونچی چار دیواری سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ صبح شام نجمی کو محل کے اندر عقبی باغ میں تھوڑی دیر ٹہلنے کی ضرور اجازت تھی۔ وہاں بن مانس کاٹل کی دوسری عورتوں میں سے کبھی کبھی کوئی بدقسمت عورت اس سے مل لیتی تھی۔

آسامی عورت سائے کی طرح نجمی کے ساتھ ہوتی۔ کاٹل کی دوسری عورتوں میں ایک دلی کی عورت بھی تھی۔ یہ سانولے رنگ کی جوان عورت تھی بہت خوبصورت تھی۔ اس سے کبھی کبھی عقبی باغ کے لان میں دور سے سلام دعا ہو جاتی تھی۔ برمی عورت کی زبانی اسے اتنا ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ اس عورت کا تعلق دلّی سے ہے اور وہ بھی مسلمان ہے۔

نجمی نے دل میں اس عورت کی قسمت پر بھی افسوس کیا۔ وہ اس کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ لیکن نجمی نے وہاں سے فرار کے منصوبوں پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہاں سے فرار ہونا نجمی کو کچھ ناممکن سا لگتا تھا۔ ایک تو محل کے باہر چوبیس گھنٹے مسلح گورکھوں کا پہرہ رہتا تھا۔ دوسرے یہ دور دراز سمندر میں ایک جزیرہ تھا۔ یہاں سے وہ کیسے فرار ہو کر انڈیا پہنچ سکتی تھی۔ اسے کئی بار بادل کا خیال آیا نہ جانے وہ کس حال میں ہو گا۔ جموں کی جیل میں ہو گا یا جیل سے فرار ہو کر نجمی کی تلاش میں سرگرداں ہو گا۔

دوسرا مہینہ بھی شروع ہو گیا اب بارشوں کا موسم آگیا۔ زبردست بارشیں ہونے لگیں اب نجمی لان میں ٹہلنے کے لیے دوسرے تیسرے دن نکلتی تھی ایک روز دوپہر کے وقت جب آسمان پر گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔ نجمی نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے ایک ہیلی کاپٹر کو محل کے بائیں باغ میں ہیلی پیڈ پر اترتے دیکھا۔ محل کے نوکر ہیلی کاپٹر کی طرف دوڑے ہیلی کاپٹر میں سے ایک ناٹے قد مگر گٹھے ہوئے بدن کا سکھ پائلٹ باہر نکلا۔ اس نے سرخ پگڑی اور نیلی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ نوکر ہیلی کاپٹر میں سے سامان اتارنے لگے۔ سکھ پائلٹ ایک طرف کھڑا ہو گیا پھر اس نے جیکٹ کے بٹن کھولتے ہوئے محل میں دائیں بائیں دیکھا تو اس کی نظر نجمی پر پڑ گئی۔

سکھ پائلٹ کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی وہ ہر ماہ اکیاب سے جاگیردار کاٹل کے لیے خاص قسم کی اعلیٰ ترین شراب اور دوسرا ضروری سامان تعیش لاتا تھا اور محل کی کھڑکی میں اسے کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی عورت دکھائی دے جاتی تھی۔ سکھ پائلٹ کا نام گرجن سنگھ تھا اور وہ جانتا تھا کہ

جاگیردار کاٹل ایک عیاش شخص ہے اور اس نے محل میں کئی داشتائیں ڈال رکھی ہیں چنانچہ نجمی کو ایک نظر دیکھنے کے بعد وہ محل کے برآمدے کی طرف بڑھا جہاں اسے محل کے بڑے منشی سے سامان کی رسید لینی تھی لیکن اسی دوران نجمی کے ذہن میں ایک زبردست اسکیم پوری کی پوری تشکیل پا چکی تھی اسے معلوم تھا کہ ایک پائلٹ مہینے میں ایک بار اکیاب سے جاگیردار کا خاص سامان لے کر وہاں آتا ہے اور ایک دن وہاں ٹھہر کر چلا جاتا ہے جونہی سکھ نجمی کی کھڑکی سے نیچے گزرا نجمی نے اوپر سے ٹھیٹ پنجابی میں کہا۔

"ست سری اکال! اپنی سنگھنی دا کوئی خیال نہیں؟"

گرجن سنگھ نے چونک کر اوپر دیکھا۔ نجمی نے سکھوں کی طرح ہاتھ جوڑ کر ایک بار پھر ست سری اکال کہا اور بولی۔

"اساں نوں تہاڈی اڈیک اے۔"

اتفاق سے اس وقت وہاں ان کے سوا اور کوئی نہیں تھا محل کے نوکر سامان اٹھائے دوسری طرف اسٹور کی طرف جا رہے تھے۔ گرجن سنگھ سکھ تھا اس نے ایک سکھنی کی زبان سے بے بسی کے الفاظ سنے تو چکرا سا گیا۔ انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھ کر اشارہ کیا کہ خاموش رہو پھر اپنی بندھی ہوئی داڑھی کو اوپر کھینچا اور برآمدے میں سے گزرتا ہوا ہیڈ منشی کے سائیڈ روم میں داخل ہو گیا۔

نجمی جلدی سے کھڑکی سے پرے ہٹ گئی وہ ہاتھ ملتے ہوئے قالین پر ٹہلنے لگی اسے یقین تھا کہ اس کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا ہے یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے پہلی بار ہی اس سکھ پائلٹ تک اپنے دل کی بات بتانے کا موقع مل گیا تھا۔ سکھوں کے ذہن سے نجمی خوب واقف تھی وہ جانتی تھی کہ یہ سکھ پائلٹ اب اس کے پاس آنے کی ضرور کوشش کرے گا جبکہ جاگیردار کاٹل ایک روز کے لیے نیچے انڈیمان کے مارشل نامی جزیرے میں کسی ضروری کام سے گیا ہوا تھا۔ نجمی ٹہلتی ٹہلتی بیڈ روم کے اونچے محرابی دروازے کے پاس گئی پردہ ہٹا کر اس نے دروازے کو کھولنا چاہا مگر دروازہ باہر سے بند تھا اس نے دروازے کی چھوٹی سی دراڑ میں سے جھانک کر دیکھا باہر برآمدے میں گورکھا پہرے دار موجود تھا نجمی واپس آ کر پلنگ کے قریب آتشدان کے پاس رکھے ہوئے عالی شان صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ دیوار پر پرانا کلاک لگا تھا اس کی سوئی ٹک ٹک کرتی چل رہی تھی

کھڑکی کے باہر سے کسی درخت پر کوئل بول رہی تھی۔ دوپہر گزر گئی پھر بارش شروع ہو گئی۔ نجمی کچھ ناامید سی ہو گئی۔ شاید سکھ پائلٹ اسے ملنے نہیں آئے گا۔ شاید وہ یہ خطرہ مول نہیں لے گا آخر اس کی نوکری کا سوال ہے مگر اس کا دل کہتا تھا کہ جس انداز سے اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر نجمی کو اشارہ کیا تھا وہ ضرور آئے گا۔

رات ہو گئی۔ نوکرانی نجمی کے لیے کھانا لے کر آ گئی۔ کھانا کھانے کے بعد نجمی نے لباس تبدیل کیا اور کمرے کی تمام روشنیاں گل کر کے صرف بیڈ لیمپ جلا دیا۔ وہ پلنگ پر لیٹنے کی بجائے کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کر نیچے پائیں باغ میں دیکھنے لگی۔ بارش ہو رہی تھی محل کے باغ میں روشنیاں بارش میں بھیگ رہی تھیں۔ باغ خالی اور ویران تھا گیٹ بند تھا باغ میں ایک جانب ہیلی بید پر ہیلی کاپٹر اسی طرح کھڑا باغ میں بھیگ رہا تھا۔ نجمی نے پردہ چھوڑ دیا اور بوجھل قدم اٹھاتی پلنگ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ بارش کی وجہ سے کمرے میں خنکی ہو گئی تھی اس نے ہلکا سا کپڑا اپنے گھٹنوں پر کر لیا۔ عین اس وقت دروازہ کھلا پردہ ہٹا کر نجمی نے دیکھا کہ آسامی خادمہ آ رہی ہے۔ اس کا اس وقت آنا معنی خیز تھا۔ آسامی خادمہ تے قریب آ کر ایک نظر گردن گھما کر پیچھے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے بولی

"میرے ساتھ آؤ۔"

اب نجمی سمجھ گئی کہ اس نے دوپہر کو جس منصوبے کا آغاز کیا تھا یہ اسی کا ردعمل ہے۔ اس نے انجان بن کر پوچھا۔

"کہاں جانا ہے؟"

آسامی خادمہ نے غصے سے کہا۔

"کیا تمھیں معلوم نہیں ہے؟ زبان بند رکھو اور میرے ساتھ آؤ۔"

جاگیردار کاٹل جزیرے میں نہیں تھا ظاہر ہے اسے کاٹل کے پاس نہیں بلکہ کسی دوسرے شخص کے پاس لے جایا جا رہا تھا اور دوسرا شخص اس وقت سکھ پائلٹ ہی ہو سکتا تھا وہ آسامی خادمہ کے پیچھے پیچھے چل دی۔ بیڈ روم کے خاص دروازے کی بجائے خادمہ اسے عقبی دروازے کی طرف لے گئی جو دوسرے کمرے میں نکلتا تھا۔ یہ دوسرا کمرہ بالکل بند تھا اور اس میں سے باہر نکلنے

کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہاں نجمی دن کے وقت بیٹھ کر رسالے اور کتابیں وغیرہ پڑھا کرتی تھی۔ اس کمرے کی دیوار کے ساتھ کتابوں کا ایک شیلف جڑا ہوا تھا۔ آسامی خادمہ نے نجمی کو صوفے پر بیٹھنے کو کہا اور خود پردہ ہٹا کر شیلف کے پیچھے چلی گئی دوسرے لمحے چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ کتابوں کا شیلف اپنی جگہ سے کھسک گیا اور پھر پردے کے پیچھے سے سکھ پائلٹ ہاتھوں کو زور زور سے ملتا ہوا نمودار ہوا۔ آسامی خادمہ نے مشینی انداز میں انگریزی میں کہا۔

"پندرہ بیس منٹ سے زیادہ وقت مت لگانا۔"

گرجن سنگھ پائلٹ نے کہا

"او کے۔"

آسامی خادمہ شیلف کے پیچھے چلی گئی۔ شیلف چرچراہٹ کی آواز کے ساتھ واپس اپنی جگہ پر آگیا۔ نجمی نے اپنے منصوبے پر فوراً کام شروع کر دیا اس سے پہلے کہ سکھ پائلٹ کچھ کہتا نجمی نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر آنکھوں سے لگایا اور آنسو بھر کر بولی۔

سردار جی! میں سکھنی ہوں میرا نام ہرنام کور ہے میں امرتسر کے پاس وڈیرہ کا گاؤں کے گرنتھی سردار سنگھ کی بیٹی ہوں یہ لوگ مجھے مسلمان سمجھ کر اغوا کر کے یہاں لے آئے ہیں۔ یہ بڑی لمبی کہانی ہے پھر سناؤں گی، اس وقت گورو کا واسطہ دیتی ہوں مجھے یہاں سے کسی طرح نکال دو۔ میں گورو گرنتھ صاحب کے آگے تیری ارداس کروں گی۔"

سکھ پائلٹ ہکا بکا سا ہو کر نجمی کا منہ دیکھنے لگا۔ نجمی نے اسے سوچنے کا موقع دیئے بغیر دوسرا حملہ کر دیا۔ گرجن سنگھ کا ہاتھ ایک بار پھر آنکھوں پر لگا کر بولی۔

"سردار جی! میں گرنتھی کی بیٹی ہوں سنگھنی ہوں۔ اگر تم مجھے یہاں سے نہیں نکال سکتے تو مجھے گورو کی کرپان لا دو تاکہ میں اس سے خودکشی کر سکوں۔"

اب سکھ پائلٹ گرجن سنگھ نے اپنی ڈاڑھی کو ہاتھ سے اوپر کھینچتے ہوئے کہا۔

"ہرنام کور! تمھیں کرپان سے اپنے آپ کو مارنے کی ضرورت نہیں میں یہاں کس لیے ہوں۔ تم فکر نہ کرو میں بہت جلد تمھیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔"

گرجن سنگھ ہتھیلیاں رگڑنے لگا پھر اٹھ کر کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

نجمی نے جلتی پر مزید تیل ڈالا وہ پنجابی میں بول رہی تھی۔

تجھے کلغی والے گورو جی کی قسم ہے میری خاطر اپنی جان مشکل میں نہ ڈالنا بس مجھے کرپان لا دو میں سنگھنی ہوں، شیرنی ہوں، میں مرنا جانتی ہوں۔"

سکھ آخر سکھ تھا۔ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ آخر نجمی نے اب تک وہاں خودکشی کیوں نہیں کی۔ وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ نجمی کے پاس ہی بیٹھ گیا اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"ہرنام جی! میں بھی سنگھ ہوں شیر ہوں تم کو اکیلی نہیں چھوڑوں گا یہاں۔ تم تو گورو گرنتھ صاحب کے گرنتھی کی لاج ہو۔ میں کوئی ترکیب نکالتا ہوں۔"

اس نے نجمی کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنی سرخ پگڑی کو سر پر دوبارہ جماتے ہوئے بولا۔

"میں تو کچھ اور ہی سمجھا ہوا تھا۔ میں نے اس عورت کو پانچ سو روپے دے کر تم سے ملاقات کے لیے راضی کیا ہے خیر کوئی بات نہیں۔ اچھا ہوا کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔ گورو گرنتھ صاحب کے گرنتھی کے لیے تو سنگھ ناں اپنی جان بھی قربان کر سکتی ہیں۔"

پھر کہنے لگا... "وقت تھوڑا ہے مجھے تمھیں بہت کچھ بتانا ہے۔ میں انڈیمان کے جزیرے مارشل میں رہتا ہوں میری شادی نہیں ہوئی۔ میں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔ میرے ماتا پتا دلی میں رہتے ہیں چھ مہینے میں ایک بار ان سے جا کر مل آتا ہوں۔ یہاں مہینے میں ایک بار کاٹل کا سامان اکیاب سے لاتا ہوں۔ یہ ہیلی کاپٹر کمپنی کا ہے میں کمپنی کا ملازم ہوں مگر میں تمھیں اس پر بٹھا کر انڈیا تک نہیں لے جا سکتا۔ یہ بڑا لمبا سفر ہے میں کوئی ترکیب نکالتا ہوں ہرنام کور جی! تم فکر نہ کرو۔ میں یہاں ایک دن ٹھہرا کرتا ہوں مگر تمھاری خاطر میں کل کا دن بھی کوئی بہانہ بنا کر یہاں ٹھہر جاؤں گا۔"

پھر خود ہی اپنی تردید کرتے ہوئے بولا۔

"لیکن یہاں ٹھہرنے کی کیا ضرورت ہے میں ساتھ والے سمندر میں سندر سنگھ سے بات کروں گا۔ گھبراؤ نہیں سندر سنگھ میرا گہرا یار ہے وہ ہماری مدد کرے گا۔ یہ گوروؤں کی سیوا کا معاملہ ہے۔ گرنتھی کی بیٹی یہاں نہیں رہ سکتی یہ گورو کی نہیں رہ سکتی۔ ایسا کرنا تم اس آسامی عورت سے کوئی بات نہ کرنا پوچھے تو یہی کہنا کہ گرجن سنگھ مجھ پر عاشق ہے بس ملنے آیا تھا۔ میرا نام گرجن سنگھ ہے یاد کر لینا۔"

اتنے میں شیلف اپنی جگہ سے کھسک گیا اور آسامی خادمہ اندر آگئی۔

"چلو اب ختم کرو ٹائم ہو گیا ہے۔"

گرجن سنگھ پائلٹ جلدی سے اٹھا اور بولا۔

"او کے او کے۔"

پھر اس نے نجمی کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور آسامی خادمہ کے ساتھ پردے کے پیچھے چلا گیا۔ دوسرے لمحے کتابوں کا شیلف واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔ نجمی نے اٹھ کر پردہ ہٹایا وہاں کتابوں کے شیلف کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اسی شیلف میں کسی جگہ وہ خفیہ بٹن تھا جس کو دبانے سے شیلف اپنی جگہ سے ہٹ جاتا تھا۔ لیکن اب نجمی کو وہ خفیہ بٹن تلاش کرنے کی ضرورت نہیں تھی خفیہ بٹن اسے گرجن سنگھ پائلٹ کی شکل میں مل گیا تھا۔ اگلے روز بھی نجمی کو گرجن سنگھ پائلٹ کا انتظار رہا اس روز جاگیردار کاٹل کو رات کے کھانے پر واپس آنا تھا۔ چنانچہ دوپہر کے بعد جب حسبِ معمول بارش ہو رہی تھی آسامی خادمہ نے نجمی کو آ کر بتایا کہ سکھ سردار تم سے ملنے آ رہا ہے۔ ساتھ ہی آسامی خادمہ نے نجمی کو سمجھا دیا کہ اس کا ذکر کسی سے مت کرنا۔ اگر کسی سے بھی بات کی تو تمھارے حق میں اچھا نہ ہو گا۔

نجمی نے کہا ..." میڈم مجھے کسی سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے تمھاری مہربانی ہے کہ تم دو محبت کرنے والوں کے ملنے کا انتظام کر دیتی ہو۔"

اس پر آسامی خادمہ نے ترش روئی سے کہا۔

"چلو اب باتیں نہ بناؤ میرے ساتھ ساتھ والے کمرے میں آؤ تمھارا دوست وہاں بیٹھا ہوا ہے۔ پندرہ بیس منٹ سے زیادہ مت لگانا۔"

دوسرے کمرے میں گرجن بیٹھا نجمی کا انتظار کر رہا تھا نجمی کو دیکھتے ہی وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ست سری اکال ہرنام جی۔!"

نجمی نے بھی ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال کہا آسامی خادمہ پردے کے پیچھے سے ہو کر دوسری طرف جا چکی تھی گرجن سنگھ نے فوراً پردہ ہٹا کر دیکھا وہاں آسامی عورت نہیں تھی۔ کہنے لگا۔

ہرنام جی! ساتھ والے کمرے میں نہ چلیں یہاں خطرہ ہے کہ ہماری باتیں وہ آسامی بلی کہیں چھپ کر سن نہ رہی ہو۔"

اس کا اندیشہ بجا تھا وہ گرجن سنگھ کو ساتھ والے بیڈ روم میں لے آئی وہ آتشدان کے پاس قالین پر ہی بیٹھ گئے گرجن سنگھ کہنے لگا۔

"میں صبح سے ساتھ والے جزیرے میں اپنے یار سندر سنگھ کے پاس گیا ہوا تھا جب میں نے اسے بتایا کہ وہیر کا کے گرنتھی کی پوتری بیٹی کاٹل نے اپنے گھر میں ڈال رکھی ہے تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا فوراً ہماری مدد کے لیے تیار ہو گیا۔"

نجمی نے پوچھا۔" وہ ہماری کس طرح سے مدد کرے گا۔"

گرجن سنگھ نے کہا ..." اس سے ساری بات طے ہو گئی ہے ہو گا یہ کہ تم میرے ساتھ یہاں سے نکل کر سندر سنگھ کے جزیرے پر چلو گی وہاں سے ہم ایک کشتی میں بیٹھ کر رات کے اندھیرے میں شمال کی طرف انڈمان کے آخری جزیرے میں جائیں گے۔ وہاں ہمیں ایک اسٹیمر مل جائے گا جو ہمیں اکیاب پہنچا دے گا۔ اکیاب سے میں اپنا ہیلی کاپٹر لوں گا جو وہاں پہلے سے موجود ہو گا وہاں سے ہم ہیلی کاپٹر میں بیٹھ کر آسام میں داخل ہو جائیں گے۔"

نجمی کو کامیابی کی روشنی سی نظر آ رہی تھی اس کا منصوبہ کامیابی کی طرف پیش قدمی کر چکا تھا مگر وہ درندہ صفت جاگیردار کاٹل سے انتقام لیے بغیر وہاں سے نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس موضوع کو ابھی اس نے اپنے پاس محفوظ ہی رکھا اور گرجن سنگھ سے پوچھا۔

"تمھارے خیال میں ہمیں کب یہاں سے نکل پڑنا چاہیے سردار جی؟" گرجن سنگھ کچھ سوچ کر بولا۔

"ہرنام جی! میں اس کام میں دیر نہیں لگانا چاہتا۔ میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ پوتر گرنتھی کی بیٹی اس ہندو جاگیردار کے پاس ایک دن بھی رہے۔ سندر سنگھ نے تو سارا انتظام کر دیا ہے۔ میں کل ہیلی کاپٹر لے کر واپس جا رہا ہوں۔ مارشل جزیرے سے یہ ہیلی کاپٹر لے کر دوسرے پائلٹ کے پاس چلا جائے گا۔ جو شیڈول کے مطابق تین دن بعد اسے اکیاب شہر کے ہیلی پیڈ پر پہنچا دے گا۔ اس حساب سے ہمیں یہاں سے تین دن بعد نکل پڑنا ہو گا۔ میں نے سندر سنگھ کو بھی ٹائم ٹیبل بنا دیا ہے۔ میں پرسوں آدھی رات کو یہاں آؤں گا تم تیار رہنا۔"

نجمی نے کہا... "میں یہاں سے کیسے نکلوں گی؟ یہاں تو چاروں طرف گورکھے اسٹین گنیں لیے کھڑے ہوتے ہیں۔"

گرجن سنگھ بولا... "اس کا بھی سارا انتظام کر لیا گیا ہے میں نے آسامی خادمہ کو بھاری رقم کا لالچ دے کر اس کام پر آمادہ کر لیا ہے۔"

نجمی نے کہا... "کیا وہ تیار ہو گئی ہے؟"

گرجن سنگھ نے کہا... "میں نے اسے کہا ہے کہ وہ تمھیں صرف محل کے باہر نکال دے۔ اس کے عوض میں اسے ایک لاکھ روپیہ دوں گا۔"

نجمی حیران ہو کر بولی... "سردار جی! ایک لاکھ تو بہت بڑی رقم ہوتی ہے۔"

گرجن سنگھ ہنسنے لگا... "میں اسے یہ رقم تھوڑی دوں گا کیا مجھے واپس آ کر جاگیردار کاٹل کی نوکری نہیں کرنی؟ کیا مجھے یہ خیال نہیں کہ آسامی خادمہ کاٹل کو بعد میں سب کچھ بتا سکتی ہے۔"

"تو پھر تم نے اس کا کیا علاج سوچا ہے؟" نجمی نے پوچھا۔

گرجن سنگھ بولا "میں آسامی خادمہ کو قتل کر دوں گا۔ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور قتل کر کے سمندر میں پھینک دوں گا۔ اس عورت نے بھی تم پر ظلم کیے ہیں۔ کئی عورتوں پر ظلم کیے ہیں۔"

تب نجمی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"سردار جی! مجھ پر تو سب سے زیادہ ظلم اس مرہٹہ جاگیردار کاٹل نے کیے ہیں ایک روز میں گوربانی کا پاٹھ کر رہی تھی کہ اس نے آتے ہی مجھے پیٹنا شروع کر دیا اور گوربانی کا گٹکا اٹھا کر پاؤں تلے مسل ڈالا۔"

گرجن سنگھ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔

"اس ہندو کی یہ مجال؟ میں اسے کبھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

نجمی نے فوراً کہا "تمھیں اسے مارنے کی ضرورت نہیں۔ اسے میں قتل کر دوں گی تم صرف مجھے ایسا زہر لا دو جو میں اسے شراب میں ڈال کر پلا دوں۔ یہ کتا اپنی موت آپ مر جائے گا۔"

گرجن سنگھ ڈاڑھی کو ایک ہاتھ سے اوپر چڑھانے لگا۔

ٹھیک ہے ہرنام جی! میں تمھیں زہر کے کیپسول لا دوں گا تم خود اس حرام زادے کو ہلاک کر ڈالنا۔

اب ایسا ہے کہ میں پرسوں آدھی رات کے وقت آؤں گا تم تیار رہنا۔ لیکن زہر کا کیپسول تمھیں آسامی خادمہ کے ہاتھ ڈبی میں بند کر کے بھجوا دوں گا۔ تم رات کو اس ہندو حرامزادے کو ختم کر دینا۔ مگر جب تک ہم یہاں سے نکل نہیں جاتے کاٹل کی موت کی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیئے۔"

نجمی نے گرجن سنگھ کو تسلی دلاتے ہوئے کہا۔

"کسی کو خبر ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ تو میرے پلنگ پر مردہ پڑا ہو گا۔ کسی کو کیا معلوم کہ وہ مر گیا ہے میں پرسوں رات تمھارا انتظار کروں گی۔"

گرجن سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال کہا۔ اٹھا اور فوراً ہی یہ کہہ کر بیٹھ گیا کہ میں اکیلا تو یہاں سے نکل ہی نہیں سکتا مجھے تو وہ آسامی بوڑھی بلی ہی یہاں سے نکال سکتی ہے۔"

"چلو ساتھ والے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ وہ آ ہی رہی ہو گی۔"

نجمی اور گرجن سنگھ ساتھ والے کمرے میں آ گئے تین منٹ بعد آسامی خادمہ آ گئی۔ گرجن سنگھ چلا گیا۔

اسی دن رات کو جاگیردار بن مانس کاٹل بھی واپس پہنچ گیا۔ جب اسے پتہ چلا کہ گرجن سنگھ پائلٹ ایک دن زیادہ وہاں رہا ہے تو اس نے سارے نوکروں کو فال ان کرا دیا اور باری باری سب سے پوچھا کہ گرجن سنگھ ایک دن جو فالتو جزیرے میں ٹھہرا ہے تو وہ کیا کرتا رہا ہے۔ کسی نے کہا کہ وہ یہاں نہیں تھا کسی نے یوں ہی کہہ دیا کہ وہ شراب پی کر فارم میں پڑا رہا تھا۔ رات کو جب کاٹل نجمی کے بیڈروم میں آیا تو اس سے بھی نشے کی حالت میں بار بار پوچھنے لگا۔

"وہ سکھ یہاں ایک دن زیادہ کیوں ٹھہرا؟"

نجمی نے کہا "میں نے تو اسے آج تک دیکھا بھی نہیں۔ آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

کاٹل شراب پینے اور منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا۔ وہ گرجن سنگھ کو گالیاں بک رہا تھا۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ تیسرا دن آ گیا۔ اس روز نجمی کو بے چینی سے شام کا انتظار تھا۔ آج رات اسے انتقام کی آگ بجھا کر اور کاٹل کو جہنم رسید کر کے وہاں سے نکل جانا تھا کسی وقت اسے خیال آتا کہ ہو سکتا ہے گرجن سنگھ کو بعد میں خیال آ گیا ہو کہ وہ خواہ مخواہ اس مصیبت میں کیوں پڑے اور اس نے اپنا ارادہ بدل دیا ہو۔ وہ کبھی کچھ سوچتی کبھی کچھ سوچتی۔

دن گزرتا چلا گیا پھر سورج غروب ہو گیا۔ آسمان پر بادل اس روز نہیں تھے۔ دن بھر دھوپ کی وجہ سے سخت حبس رہا تھا۔ شام کے وقت بھی شدید حبس تھا۔ دن کے وقت آسامی خادمہ ناشتے کے وقت آئی تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنی شکل تک نہیں دکھائی تھی۔ جب شام کے بعد رات کا اندھیرا چھانے لگا تو نجمی کو پریشانیوں نے گھیر لیا۔ گرجن سنگھ نے ضرور اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ ورنہ وہ آسامی خادمہ کے ہاتھ زہر کا کیپسول ضرور بھیجتا۔

رات کے کھانے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ جاگیردار کاٹل کا یہ معمول تھا کہ وہ رات کے دس بجے کھانا وغیرہ کھا کر نجمی کے پاس آتا تھا۔ وہ نجمی کے پاس بیٹھ کر صرف شغل مے نوشی سے جی بہلایا کرتا تھا۔ بیڈ روم کے کلاک رات کے ٹھیک آٹھ بجا رہا تھا کہ آسامی خادمہ اندر داخل ہوئی اس کے رویے میں کسی قسم کا فرق نہیں آیا تھا۔ حالانکہ طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے علم ہونا چاہئے تھا کہ وہ آج آدھی رات کے وقت وہاں سے فرار کروا رہی ہے۔ مگر یہ ایسی پتھر کی بے جان، جذبات والی عورت تھی کہ اس کا چہرہ ہر قسم کی صورتِ حال میں ایک جیسا ہی رہتا تھا۔ نجمی کے دل میں کھلبلی ہو رہی تھی کہ آخر یہ اسے کیوں نہیں کہتی کہ رات کو تیار رہے۔

آسامی خادمہ نے قریب آ کر اپنے بلاؤز کے اندر سے رومال میں لپٹی ہوئی ایک چھوٹی سی ڈبی نجمی کو دی اور کہا۔

”یہ تمہارے دوست سکھ نے دی ہے اور ہاں آج رات کے ساڑھے بارہ بجے تیار رہنا۔ اگر سو گئیں تو اس جگہ سے کبھی آزاد نہیں ہو سکو گی۔“

نجمی کی جان میں جان آئی اس نے ڈبی لے لی اور آسامی خادمہ کا شکریہ ادا کرنے والی تھی کہ وہ واپس پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ نجمی ڈبی لے کر ساتھ والے کمرے میں آ گئی۔ اس نے ڈبی کھولی اس میں ایک کیپسول تھا۔ کیپسول میں تھوڑا سا سفید رنگ کا سفوف تھا۔ نجمی سمجھ گئی کہ یہ کوئی بڑا ہی مہلک اور بے ذائقہ زہر ہے اس نے کیپسول اپنے بلاؤز میں چھپا لیا۔ رات کے دس بج رہے تھے کہ رزندہ صفت مرہٹہ جاگیردار کاٹل جھومتا جھامتا کمرے میں داخل ہوا آج نجمی کو اس کا بے تابی سے انتظار تھا اس نے حسبِ عادت آتے ہی نجمی کو انگریزی میں گندی گالیاں دیں۔ پھر آتشدان کے پاس آلات مے نوشی لے کر بیٹھ گیا۔

نجمی آج اس کی زیادہ آؤبھگت کر رہی تھی۔ خود جام تیار کر کے اسے پیش کرتی وہ پہلے ہی نشے میں تھا۔ کچھ دیر تک وہ آتشدان کے پاس بیٹھا رہا پھر اٹھا اور پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔ وہ مسلسل بولے جا رہا تھا کبھی نجمی کو گندی گالیاں دینے لگتا کبھی اس کے جسم کی تعریف کرنے لگتا نجمی نے ایک گلاس میں شراب ڈال کر اس میں کیپسول کا زہر ملا دیا تھا اور گلاس میز کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کاٹل سونے سے پہلے ایک آخری جام ضرور پیتا ہے اور یہ اس کی زندگی کا واقعی آخری جام ہی تھا نجمی اس کی دلجوئی میں مصروف تھی۔

پھر نجمی نے گلاس اٹھا کر کاٹل کو انتہائی دلربائی کے ساتھ پیش کیا اور کہا ”کیا اسے میری خاطر نوش نہیں کریں گے۔“

کاٹل نے قہقہہ لگا کر ہنسنے کی کوشش کی مگر آواز اس کی توند میں ہی پھنس کر رہ گئی۔ وہ ذرا سا اٹھ بیٹھا اس نے نجمی کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور اس کی آنکھوں میں اپنی لال لال آنکھیں ڈال کر بولا ”اس میں کچھ ملا تو نہیں دیا تم نے۔“

نجمی کا جسم ایک بارگی تو سن ہو کر رہ گیا فوراً کاٹل کے بھدے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر انگریزی میں بولی۔

”خدا کے لیے ایسا پھر نہ کہنا اب تمہارے سوا میرا کون ہے میں تو یہاں شہزادیوں کی طرح عیش کر رہی ہوں۔“

بن مانس نما کاٹل نے غٹا غٹ گلاس میں جو کچھ بھی تھا اسے حلق میں انڈیل لیا خدا جانے گرجن سنگھ کس قسم کا زہر لایا تھا پیتے ہی کاٹل کا سانس بند ہو گیا اس کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں اس کے بھاری بھرکم بھینسے جیسے جسم کو ایک دھچکا لگا وہ پلنگ پر ایک فٹ اوپر کو اچھلا پلٹ کر گر پڑا گیا نجمی پلنگ سے کود کر پرے ہو گئی کاٹل اسے خونی نظروں سے تک رہا تھا۔ ہاتھ اس کی طرف بڑھائے اسے پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا اس کی آواز بند ہو گئی تھی حلق سے خرخر کی آواز آ رہی تھی لگتا تھا اس کے پیٹ کی ہر شے کٹ رہی ہے وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں رہا تھا۔ پھر اس کے منہ سے خون ابل پڑا اور اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔

بیڈروم کی روشنی پہلے ہی دھیمی تھی۔

نجمی نے چادر درندہ صفت کاٹل کی لاش پر ڈال دی وہاں کسی ملازم یا خادمہ کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا گرجن سنگھ پامکٹ نے نجمی کو ایسا مہلک زہر لاکر دیا تھا کہ اسے پیتے ہی کاٹل کا جگر وغیرہ کٹ گیا تھا اور اس کے حلق سے آواز تک نہ نکل سکی ورنہ اگر وہ شور مچا دیتا یا ایک چیخ بھی بلند کرتا تو بیڈروم کے باہر راہداری میں موجود گورکھا سپاہی دروازہ توڑ کر اندر آجاتا اور سارے کیے کرائے پر پانی پھر جاتا۔

نجمی نے کلاک کی طرف دیکھا۔ ابھی رات کے بارہ نہیں بجے تھے پلنگ پر کاٹل کی بے حس لاش چادر میں ڈھکی ہوئی پڑی تھی۔ نجمی کو خوشی تھی کہ اس نے ایک درندے کے ظلم وستم سے آنے والی عورتوں کو بچا لیا اور اپنے اوپر کیے گئے ظلم کا بدلہ بھی لے لیا ہے۔ کاٹل کا ہنٹر آتشدان کے پاس دیوار پر ٹنگا ہوا ہے۔ نجمی کا دل چاہا کہ وہ لاش پر اتنی دیر تک ہنٹر برساتی رہے جب تک وہ تھک کر گر نہیں پڑتی لیکن وہ خاموش رہی۔

اب اسے گرجن کا انتظار تھا اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر آہستہ سے پٹ کھول کر نیچے دیکھا بارش کی ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی لان میں جو کھمبے لگے تھے ان کے بلب روشن تھے۔ گیٹ بند تھا۔

نجمی پیچھے ہٹ گئی گرجن سنگھ کو کسی دوسرے راستے سے محل کے بیڈروم میں آنا تھا۔ وہ ساتھ والے کمرے میں آگئی۔ کتابوں کے شیلف کے پہلو میں جو ریشمی بھاری پردہ گرا ہوا تھا۔ اسے ہٹا کر دیکھا وہاں سوائے کتابوں کے شیلف کے اور کچھ نہیں تھا۔ اس شیلف کو ایک طرف ہٹنا

تھا۔ پھر گرجن سنگھ کو آنا تھا۔ وقت بڑی مشکل سے گزر رہا تھا۔

نجمی بیڈروم میں آئی تو چادر کے نیچے لاش اسی طرح ساکت تھی اس نے چادر کو ذرا سا ہٹا کر دیکھا کاٹل کا سیاہ فام چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا اس نے جلدی سے چادر ڈھک دی۔

بیڈروم کے کلوزٹ میں اس کی ایک قیمتی نیلی جینز نما پتلون پڑی تھی اس نے شب خوابی کا لباس اتار کر پتلون اور جیکٹ پہن لی۔ پاؤں میں ٹخنوں تک بند چمڑے کے جوتے پہنے اور بالوں کو گردن پر رومال سے باندھ لیا جیب میں کچھ رقم ٹھونس لی اور بے چینی سے گرجن سنگھ کا انتظار کرنے لگی۔

جب آدھی رات بھی گزر گئی تو نجمی کو فکر لاحق ہوئی اگر گرجن سنگھ کسی وجہ سے نہ آسکا تو سارا کام خراب ہو جائے گا۔ اس نے ایک بار پھر سائیڈ روم میں جاکر شیلف کو دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا اسی وقت شیلف کو حرکت ہوئی نجمی کا دل زور سے دھڑک اٹھا شیلف ایک طرف کھسک گیا پھر پردے کے پیچھے سے آسامی خادمہ نمودار ہوئی وہ نجمی کو پتلون اور جیکٹ میں دیکھ کر کچھ حیران سی ہوئی نجمی اس سے گرجن سنگھ کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی کہ آسامی خادمہ نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور آہستہ سے پوچھا۔ "راج۔ جی سو گئے ہیں؟"

نجمی نے بھی آہستہ سے جواب دیا

"وہ گہری نیند سو رہے ہیں۔"

آسامی خادمہ نے نجمی کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ نجمی نے پہلی بار کتابوں کے شیلف کے پیچھے ایک زینہ نیچے اترتا دیکھا یہ زینہ عقبی لان کے برآمدے کے کونے میں بنی ہوئی ایک کوٹھڑی میں نکلتا تھا۔ کوٹھی میں آٹے چاول کی بوریاں بھری ہوئی تھیں آسامی خادمہ نے کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر باہر جھانک کر دیکھا پھر نجمی کو ساتھ لے کر برآمدے سے نکلتی لان کے درختوں کے نیچے آگئی۔ بارش کی پھوار پڑ رہی تھی ہوا میں خنکی اور ناریل کے درختوں کی دھیمی مرطوب مہک رچی ہوئی تھی۔ باغ ختم ہوا تو کاٹل کے محل کی دیوار آگئی۔ یہاں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جو کھلا تھا۔ دروازے کی دوسری جانب اندھیرے میں نجمی کو گرجن سنگھ کا سایہ دکھائی دیا۔ گرجن سنگھ

ان دونوں کو دیکھتے ہی آگے آگے چلنے لگا۔ یہاں اندھیرے میں جھاڑیاں اور گھاس اور ناریل کے درخت بے ترتیبی سے اُگے ہوئے تھے ان جھاڑیوں میں وہ دس پندرہ منٹ تک چلتے رہے۔ اب سمندر کا کنارہ آگیا یہاں ایک چھوٹی سی کشتی کھڑی تھی۔

گرجن سنگھ نجمی کے قریب آیا اور بولا "ہرنام جی کام ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا۔؟"

نجمی نے آہستہ سے کہا —

"واہگورو کی کرپا سے سب ٹھیک ہو گیا ہے۔"

گرجن سنگھ نے اندھیرے میں ہی ایک ہاتھ سے اپنی بندھی ہوئی داڑھی کو اوپر چڑھایا اور نجمی کو سہارا دے کر کشتی میں سوار کرا دیا۔ آسامی خادمہ نے انگریزی میں گرجن سنگھ سے اپنی رقم کا مطالبہ کیا۔ نجمی کے کان کھڑے ہو گئے آسامی خادمہ کی موت کا وقت آن پہنچا تھا۔ نجمی کے لیے کسی دشمن کو ہلاک کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ گرجن سنگھ اس عورت کو کیسے ہلاک کرتا ہے گرجن سنگھ نے آسامی خادمہ کو انگریزی میں ہی جواب دیا۔

"میڈم تم میرے ساتھ چلو۔ سندر سنگھ کے پاس پہنچ کر تمھیں تمھاری رقم دے دوں گا۔"

آسامی خادمہ غصّے میں آ گئی۔

"تم میرے ساتھ دھوکا نہیں کر سکتے میری رقم ابھی دو نہیں تو میں شور مچا دوں گی۔"

گرجن سنگھ نے سکھوں والا کام کیا۔ اچھل کر آسامی خادمہ کی گردن دونوں ہاتھوں سے دبوچ لی وہ اس کے ساتھ ہی زمین پر گر پڑی اس کے حلق سے خرخر کی دو بار آواز نکلی۔ گرجن سنگھ بھرپور جوان تھا آسامی خادمہ ادھیڑ عمر عورت تھی جب گرجن سنگھ اس سے الگ ہوا تو وہ گھاس پر مردہ حالت میں پڑی تھی۔ گرجن سنگھ نے اس کی لاش کو بھی کشتی میں ڈال لیا اور کشتی چلاتا کھلے سمندر کی طرف چل پڑا نجمی نے جھک کر آسامی خادمہ کو دیکھا اس کی آنکھیں تھوڑی تھوڑی کھلی تھیں جیسے وہ نجمی کو دیکھ رہی ہو۔ گرجن سنگھ پوری طاقت سے چپو چلا رہا تھا اب نجمی نے بھی چپو چلانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کاٹل جاگیردار کے مختصر سے جزیرے سے کافی دور نکل گئے اب گرجن سنگھ نے لاش کو اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا۔

"اسے مچھلیاں کھا جائیں گی۔"

نجمی نے کہا "تم گورو کے سچے سنگھ ہو۔"

گرجن سنگھ بولا "اب مجھ پر کسی کو شک و شبہ نہ ہو گا۔ ویسے میں تمھیں سندر سنگھ کے پاس چھوڑ کر صبح واپس آجاؤں گا تاکہ معلوم کر سکوں کہ پیچھے کیا ردعمل ہوا ہے۔ اگر میں تمھارے ساتھ ہی چلا گیا جو کہ مجھے جانا ہی ہے تو یہاں سب کو یہی شبہ ہو گا کہ میں کاٹل کو قتل کر کے تمھیں اغوا کر کے بھاگ گیا ہوں۔"

اصولی طور پر گرجن سنگھ نے ٹھیک سوچا تھا۔ سندر سنگھ جس جزیرے میں رہتا تھا وہ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ سندر سنگھ ان لوگوں کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ یہ جزیرہ بھی درختوں سے بھرا ہوا رات کی تاریکی میں بڑا ڈراؤنا لگ رہا تھا اور زیادہ بڑا نہیں تھا گرجن سنگھ کشتی کو جزیرے کی پچھلی طرف سمندر پر جھکے ہوئے درختوں کے نیچے چھوٹی چھوٹی چٹانوں میں لے گیا یہاں سندر سنگھ پہلے سے موجود تھا وہ بھاری بھرکم سکھ تھا۔ اندھیرے میں اس کی شکل نجمی اچھی طرح نہ دیکھ سکی۔ اس نے نجمی کو ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال کیا۔ نجمی نے بھی ہاتھ جوڑ کر جواب میں ست سری اکال کہا کشتی انھوں نے اوپر کھینچ کر جھاڑیوں میں چھپا دی۔ سندر سنگھ کا یہاں ناریل کا ایک باغ تھا۔ اس باغ میں اس نے اپنے لیے ایک چھوٹا سا لکڑی اور بانس کا کاٹج بنا رکھا تھا اور یہاں اکیلا رہتا تھا۔ کاٹج کے پیچھے ایک چھوٹا سا اسٹور تھا سندر سنگھ نے اسے پہلے ہی سے خالی کر دیا تھا۔ یہاں ایک چارپائی پر بچھونا اور مچھر دانی لگا دی گئی تھی۔ بجلی اس جزیرے پر نہیں تھی۔ سندر سنگھ نے نجمی کو بڑے احترام سے اس اسٹور میں بٹھایا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"سری گرنتھ صاحب کے والی گرنتھی کی بیٹی کے لیے ہمارا سر بھی حاضر ہے۔ آپ جی یہاں آرام کریں۔"

گرجن سنگھ بھی بڑے احترام سے کھڑا تھا کہنے لگا۔

"ہرنام جی! تم آرام کرو صبح بات کریں گے۔"

گرجن سنگھ اور سندر سنگھ دروازے کو باہر سے تالا لگا کر چلے گئے تالا لگانے سے نجمی کو کچھ شک سا ہوا گو یہ شک زیادہ دیر اس کے دل میں نہ رہ سکا وہ مچھر دانی کے اندر بچھونے پر لیٹ گئی اس کی آنکھوں کے سامنے زندہ صفت کاٹل کا خون میں لتھڑا ہوا چہرہ آ رہا تھا اس نے

نفرت سے منہ دوسری طرف کر لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ اسٹور میں بارش کی وجہ سے ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ مچھر دانی نے مچھروں کو روک دیا تھا جس کی وجہ سے نجمی جلدی سو گئی۔

صبح جب وہ اٹھی تو دن کا اجالا پھیل چکا تھا۔ سندر سنگھ دروازہ کھول کر آ گیا نجمی نے دیکھا کہ وہ بھری بھری داڑھی والا موٹا سکھ ہے جس کی داڑھی میں سفید بال آنا شروع ہو گئے تھے۔ اس نے سیاہ رنگ کی اکالیوں والی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ ہاتھ جوڑ کر اس نے نجمی کو ست سری اکال بلایا اور کہنے لگا۔

"کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی ہرنام کور جی؟" نجمی بستر سے باہر نکل آئی۔

"بالکل نہیں سردار جی! آپ کا بڑا دھنواد ہے۔"

سندر سنگھ ہاتھ جوڑے جوڑے بولا۔

گورو کے پیاروں اور پیاریوں کے لیے تو ہماری جان بھی حاضر ہے گرنتھی کے خاندان پر آنچ نہیں آ سکتی آپ آ کر چائے پانی کر لیں۔ گرجن سنگھ تو واپس چلا گیا کہہ گیا ہے کہ پرسوں آ جاؤں گا اس کا جانا بڑا ضروری تھا ہرنام جی! اس طرح سے تو سب کو اسی پر شک پڑتا۔"

نجمی سندر سنگھ کے ساتھ اسٹور روم سے باہر نکلی باہر بارش رکی ہوئی تھی۔ سبزہ رات کی پھوار سے نکھر گیا تھا۔ درختوں پر کہیں کہیں کوئل بول رہی تھی سندر سنگھ کے کاٹج کے پچھلے کمرے میں میز پر ناشتہ لگا ہوا تھا سندر سنگھ کہنے لگا۔

"میرے یہاں مکان پر دو ملازم ہی ہیں میں نے ان کو بھی دو تین دنوں کے لیے دوسرے جزیرے پر اپنے اپنے گھر بھیج دیا ہے اب آپ جی میرے کاٹج کے کسی بھی کمرے میں سو سکتی ہیں"

سندر سنگھ چلا گیا نجمی نے ناشتہ کیا اور کھڑکی کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا وہ یہاں سے خیریت کے ساتھ نکل جائے گی بڑا لمبا سفر تھا۔ کاٹل کی لاش کے ملتے ہی اب تک جزیرہ مارشل کی پولیس بھی وہاں پہنچ گئی ہو گی اور اس کی تلاش بھی شروع ہو گئی ہو گی۔ نجمی سوچنے لگی کہ کیا وہ اس چھوٹے سے جزیرے میں محفوظ ہے؟ مارشل جزیرے کی پولیس اس کی کھوج میں وہاں بھی پہنچ سکتی تھی اسے سندر سنگھ پر پورا اعتماد تھا کہ وہ ایک بہادر آدمی کی طرح اس کی حفاظت کرے گا۔ معاملہ گرنتھی کی بیٹی کا بھی تھا یہ فارمولا بڑا کامیاب رہا تھا اور نجمی کی

ذات کے گرد سکھ دھرم کا ایک ہالہ سا بن گیا تھا جس کی وجہ سے سندر سنگھ اور گرجن سنگھ ہر لمحے اس پر اپنی جان نثار کرنے پر تیار تھے۔

دن گزر گیا رات بھی گزر گئی۔ دوسرے روز رات کے وقت گرجن سنگھ واپس آ گیا اس نے بتایا کہ کاٹل کی لاش دن کے آٹھ بجے ملی اسی وقت پولیس کو اطلاع کر دی گئی کہ جاگیردار کاٹل کو قتل کر دیا گیا ہے اور محل سے اس کی داشتہ اور آسامی خادمہ غائب ہیں۔ دس بجے پولیس وہاں پہنچ گئی میں بھی مارشل جزیرے میں ہی تھا قتل کا سن کر میں نے بھی بظاہر سخت افسوس کا اظہار کیا اور پولیس کے ساتھ ہی محل میں آ گیا۔

پولیس نے آس پاس کے سارے جزیروں میں اپنے مخبروں اور جاسوسوں کو چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں بڑی احتیاط سے کام لینا ہو گا۔"

سندر سنگھ بولا "ان کی کیا مجال کہ یہاں آ کر ہرنام جی کو لے جائیں۔ میں ایک ایک کو بھون کر رکھ دوں گا۔ یہ گورو گرنتھ صاحب کا معاملہ ہے۔"

گرجن سنگھ نے سندر سنگھ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "تمھیں ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ پولیس یہاں آ بھی گئی تو ہم نے یہ ظاہر ہی نہیں ہونے دینا کہ ہرنام جی یہاں ہیں۔"

سندر سنگھ کا خدشہ درست نکلا۔ اگلے روز پولیس کے آدمی آ گئے ان میں ایک تامل ہیڈ کانسٹیبل اور دو جزیرے کے مقامی کانسٹیبل تھے۔ سندر سنگھ نے ان کی خوب آؤ بھگت کی.. گرجن سنگھ بھی نجمی کے ساتھ ساتھ ہی ایک جھونپڑی میں چھپ گیا تھا۔ سندر سنگھ نے بڑی ڈپلومیسی سے کام لیا اور ایک گھنٹہ وہاں رہنے کے بعد پولیس کے آدمی کھا پی کر چلے گئے۔ ان کا اسٹیمر جب سمندر میں نظروں سے اوجھل ہو گیا تو سندر سنگھ جھونپڑی میں آ گیا۔

"وہ لوگ چلے گئے ہیں اب کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

نجمی، گرجن سنگھ اور سندر سنگھ کاٹج کے چھوٹے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے گرجن سنگھ کہنے لگا۔

"اب ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں رہنا ہے۔ کیونکہ پرسوں تمھارے نوکر بھی واپس آ جائیں گے"
سندر سنگھ بولا "تمھارا کیا پروگرام ہے کیا اکیاب پہنچ کر تم ہیلی کاپٹر حاصل کر سکو گے؟"

گرجن سنگھ نے کہا۔۔۔۔"میرا ہیلی کاپٹر کل سے وہاں پہنچ گیا ہے اور جیلیٹی کے ہینگر میں موجود ہوگا میں وہاں جاکر اسے حاصل کر سکتا ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ تمھارے اسٹیمر کی کیا پوزیشن ہے؟"

سندر سنگھ نے بتایا کہ اس کا اسٹیمر بھی تیار ہے صرف اسے بڑے اسٹیمر والے اسمگلر فرینڈو کو اطلاع کرنی ہوگی۔" وہ گرجن سنگھ کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

فرینڈو کا بڑا اسٹیمر تم لوگوں کو کیاب کی طرح جاتے ہوئے راستے میں ہی ملے گا جیسا کہ تم جانتے ہو فرینڈو اس علاقے کا نامی گرامی اسمگلر ہے اور میرا یار غار ہے میں نے اس سے پہلے ہی ساری بات سمجھا دی ہے وہ تمھارے بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ ہمارے راز ایک دوسرے کے پاس بالکل محفوظ ہوتے ہیں وہ تمھیں بھی جانتا ہے۔"

"پھر تمھارے خیال میں ہمیں کب یہاں سے نکلنا چاہیئے۔؟"

گرجن نے پوچھا۔

سندر سنگھ بولا۔

"آج رات پڑتے ہی تم میرا اسٹیمر لے کر یہاں سے نکل جاؤ سمندری راستے کا تمھیں علم ہی ہے۔ میں فرینڈو کو اطلاع کر دوں گا وہ تمھیں یہاں سے بچاس میل شمال کی جانب سمندر سے اٹھالے گا اب یہ خطرہ تو تمھیں مول لینا ہی پڑے گا۔"

گرجن سنگھ نے اپنی پگڑی کو ٹھیک طرح سے جماتے ہوئے کہا۔

"کوئی خطرہ نہیں سندر سنگھ کوئی خطرہ نہیں۔ ہاں ہرنام جی کو کہیں ڈر تو نہیں لگے گا۔؟"

یہ لوگ ابھی تک" ہرنام جی "یعنی نجمی کو بالکل نہیں جانتے تھے کہ وہ اصل میں کون ہے۔

نجمی نے تھوڑی گھبراہٹ کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"ڈر تو ضرور لگے گا جی سمندر سے مگر سنگھنی ہوں سنگھنی موت سے نہیں ڈرتی۔ پھر گرجن سنگھ جی میرے ساتھ ہوں گے۔"

گرجن سنگھ نے کہا

"ہرنام جی! میں تو اب آپ کو آپ کے پتا جی گرنتھی لاکھ سنگھ جی کے گھر پہنچا کر ہی دم لوں گا میں نے تو سنگھنی کی قسم کھا کر گوردوارہ جن ریو جی کی ارداسی بھی کر رکھی ہے۔"

سندر سنگھ بولا۔۔۔۔"تو پھر ٹھیک ہے کل رات تم لوگ یہاں سے گورو کا نام لے کر نکل پڑنا۔ میں فرینڈو کے پاس ابھی آدمی بھجوا دیتا ہوں اس کا اسٹیمر یہاں قریب کے جزیرے میں ہوتا ہے۔"

دوسری رات سندر سنگھ نے نجمی اور گرجن سنگھ کو اپنے اسٹیمر میں سوار کرایا اور ہاتھ باندھ کر بولا۔

"گورو تمھاری رکھشا کریں گے ہرنام جی! مجھ سے کوئی بھول ہوگئی ہو تو شما کر دینا۔"

گرجن سنگھ اسٹیمر کو ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ ایک اچھا انجینئر تھا۔ بہت جلد وہ اسٹیمر کو جزیرے سے دور لے گیا اس نے نجمی کو بتایا کہ وہ ایسے سمندری علاقے میں سفر کرے گا جہاں پولیس کی گشتی پارٹی کے ملنے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ رات اندھیری تھی آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا مرطوب ہوا چل رہی تھی خدا کا شکر تھا کہ سمندر میں طوفان نہیں تھا۔ پھر بھی سمندر اوپر تلے ہو رہا تھا۔ ایک گھنٹہ سمندر میں سفر کرنے کے بعد گرجن سنگھ نے اسٹیمر کی رفتار کم کر دی اور وہ اسے ایک خاص علاقے میں دائرے کی شکل میں گھمانے لگا۔

"فرینڈو کے اسٹیمر کو ہمیں اسی جگہ ملنا ہوگا۔"

آدھ گھنٹہ اسٹیمر دائرے کی شکل میں سمندر میں ایک ہی جگہ چکر لگاتا رہا پھر دور سے روشنی نظر آئی۔ گرجن سنگھ نے اپنے اسٹیمر کی بتیاں بجھا رکھی تھیں کہنے لگا۔

"یہ فرینڈو کے اسٹیمر کی بتی ہی ہو سکتی ہے مگر میں اس وقت تک اپنے اسٹیمر کی بتی نہیں جلاؤں گا جب تک مجھے سگنل نہیں ملتا۔"

دو منٹ بعد روشنی قریب آگئی اب وہاں اسٹیمر کے اوپر ایک نیلی روشنی تین بار چمک کر بجھ گئی گرجن سنگھ خوش ہو کر بولا۔

"ہرنام جی! یہ فرینڈو کا ہی اسٹیمر ہے۔"

اب گرجن سنگھ نے بھی اپنے اسٹیمر کی بتی جلا کر سگنل دیا۔ دونوں اسٹیمر کھلے سمندر میں رات کے اندھیرے میں ایک دوسرے کی طرف بڑھنے لگے۔

جب فرینڈو کا اسٹیمر قریب [illegible] کہ وہ اسٹیمر کافی بڑا تھا اور اس پر دھان اور [illegible] کے بورے لدے ہوئے تھے۔ ایک آدمی اسٹیمر کے ڈیک پر جنگلے کے پاس

کھڑا تھا اس نے وہیں کھڑے کھڑے انگریزی میں پوچھا۔

”سندر کے کون ہو تم ؟“

گرجن سنگھ کو بتا دیا گیا تھا کہ اسے کیا کہنا ہوگا۔ اس نے بھی بلند آواز میں انگریزی میں کہا

”میں سندر کا بھائی ہوں۔“

اس پر فرینڈو بولا ”میں فرینڈو ہوں گرجن۔ آجاؤ۔“

فرینڈو کے اسٹیمر پر اس کے علاوہ دو آدمی تھے۔ نجمی اور گرجن سنگھ کو اوپر اسٹیمر پر اٹھا لیا گیا۔ فرینڈو نے آگے بڑھ کر گرجن سنگھ کو گلے لگایا اور نجمی کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”نمستے۔“

نجمی نے بھی ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا ایک آدمی فرینڈو کے حکم پر سندر سنگھ کے چھوٹے اسٹیمر میں اتر گیا اور اسے واپس لے کر سمندر کی تاریکی میں غائب ہو گیا وہ اسٹیمر واپس سندر سنگھ کے جزیرے پر لے جا رہا تھا۔ فرینڈو نجمی اور گرجن سنگھ کو نیچے اپنے کیبن میں لے آیا یہاں مشروب کی بوتلیں پڑی تھیں۔

گرجن سنگھ نے بوتلوں کو دیکھتے ہی کہا۔

”فرینڈو! ان بوتلوں کو یہاں سے ہٹا دو۔ ان کی ضرورت نہیں ہے۔“

فرینڈو ایک چوڑے شانوں والا سانولا پرتگالی اسمگلر تھا ہنس کر بولا ”میں سمجھ گیا۔ میں سمجھ گیا کوئی بات نہیں“ اور اس نے بوتلیں میز سے اٹھا کر نیچے ایک طرف رکھ دیں کیبن میں ایک طرف دیوار کے ساتھ برتھ بنا ہوا تھا جس پر بستر لگا تھا۔ فرینڈو نے نجمی سے کہا۔

”سسٹر! تم آرام کرو۔ ہم دوسرے کیبن میں چلے جاتے ہیں۔“

نجمی نے شکریہ ادا کیا اور برتھ پر بچھے ہوئے بستر پر لیٹ گئی۔ اسٹیمر کا انجن ان کے نیچے آتے ہی اسٹارٹ ہو گیا تھا اور اس نے کھلے سمندر میں اکیاب کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا تھا۔ گرجن سنگھ اور فرینڈو کیبن کا دروازہ بند کر کے وہاں سے چلے گئے۔ نجمی برتھ پر لیٹ گئی۔ اسٹیمر سمندری سناٹے ڈول رہا تھا مگر نجمی کو نیند آگئی۔

اسٹیمر ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ سفر کرتا رہا۔ منہ اندھیرے اسٹیمر اکیاب

بندرگاہ سے تھوڑے فاصلے پر ایک جگہ رک گیا۔ فرینڈو اور گرجن سنگھ ڈیک پر موجود تھے۔ فوراً سمندر میں لنگر ڈال دیا گیا۔ اسٹیمر کی ساری بتیاں گل کر دی گئیں۔ اسٹیمر پر اندھیرا تھا۔ ساحل سمندر پر بھی اندھیرا تھا۔ آسمان چونکہ بادلوں سے بھرا ہوا تھا اس لیے صبح کاذب کی روشنی بھی دبی دبی سی تھی۔ گرجن سنگھ بھی جیکٹ اور پتلون میں تھا اس نے فرینڈو سے کہا۔ ”میں ساحل سمندر پر ہی ہیلی کاپٹر کو لاتا ہوں ہرنام جی ابھی سو رہی ہیں میں آکر انھیں جگاؤں گا۔“

یہ کہہ کر گرجن سنگھ ایک چھوٹی ڈونگی میں بیٹھ کر ساحل پر اتر گیا اور ریت پر چلتا درختوں میں غائب ہو گیا۔ فرینڈو نے اپنے دونوں آدمیوں کو دونوں کونوں پر رائفلیں دے کر کھڑا کر دیا کہ اگر کوئی خطرہ پیش آجائے تو اس کا مقابلہ کیا جائے۔ گرجن سنگھ جنگل کے سارے راستوں سے باخبر تھا۔ وہ وہاں سے نکل کر جیٹی کے ہینگر میں پہنچ گیا۔ کارڈ اس کے پاس تھا۔ شیڈول کے مطابق اسے صبح صبح ہیلی کاپٹر واپس مارشل جزیرے پر لے جانا تھا گارڈ کے اعتراض کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

نجمی کی اچانک آنکھ کھل گئی اس نے محسوس کیا کہ اسٹیمر کھڑا ہے اور اس کا انجن بھی بند ہے وہ کیبن سے نکل کر اوپر ڈیک پر آگئی منہ اندھیرے کا سماں تھا صبح کاذب کے اندھیرے میں سے ساحل کے درختوں کے خاکے ابھرنے لگے تھے۔ فرینڈو جلدی سے نجمی کے پاس آیا اور انگریزی میں سلام کر کے بولا۔

”میڈم! گرجن سنگھ ہیلی کاپٹر لے کر آتا ہی ہوگا سب ٹھیک ہے۔“

نجمی نے فرینڈو کا شکریہ ادا کیا اور ریٹ سن کے گٹھوں کے پاس کھڑی ہو کر ساحل سمندر کے درختوں کو تکنے لگی صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی مرطوب ہوا چل رہی تھی اتنے میں فضا میں گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی فرینڈو نے کہا۔

”گرجن آگیا ہے۔“

نجمی کی نگاہیں مشرق کی جانب بادلوں بھرے آسمان پر لگی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہاں ہیلی کاپٹر کی نیلی اور سرخ روشنی دکھائی دی۔ اس کے بعد ہیلی کاپٹر نیچے ہوتا گیا اور پھر ساحل کی ریت پر ایک جگہ اتر گیا۔ فرینڈو اور نجمی ڈیک پر خاموش کھڑے ہیلی کاپٹر کی طرف دیکھ رہے

تھے۔ ڈونگی پہلے ہی سے ساحل پر تھی۔ گرجن سنگھ ہیلی کاپٹر میں سے نکل کر دوڑتا ہوا ڈونگی کی طرف بڑھا اور اسے جیپ سے چلاتا اسٹیمر کے پاس آگیا۔ اس نے منہ اوپر کر کے فرنیڈو سے کہا

”ہرنام جی کو تم ہی جگا دو فرنیڈو۔ وقت بہت کم ہے۔“

نجمی نے نیچے جھک کر کہا۔

”میں جاگ رہی ہوں سردار جی!“

”او کے۔ نیچے آؤ۔“ گرجن کی آواز بلند ہوئی۔

رسی کی سیڑھی لٹکا دی گئی نجمی بڑی احتیاط سے سیڑھی اتر کر نیچے ڈونگی میں آگئی۔ گرجن سنگھ نے فرنیڈو کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

”تھینک یو فرنیڈو۔“

فرنیڈو نے مسکرا کر کہا.... نو پرابلم مائی ڈیئر گرجن! گڈ لک۔“

اس کے ساتھ ہی فرنیڈو نے لنگر اٹھا دیا گرجن سنگھ ڈونگی چلاتا ساحل پر آگیا نجمی کو ساتھ لیا۔ ہیلی کاپٹر میں اسے اپنے ساتھ والی سیٹ پر بٹھایا۔ انجن اسٹارٹ کیا۔ ہیلی کاپٹر کے پنکھے پر گردش کرنے لگے تھوڑی ہی دیر بعد ہیلی کاپٹر ایک طرف کو جھکا۔ درختوں کے اوپر پرواز کرتا ہوا شمال کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہیلی کاپٹر انڈیا کے میزورام صوبے کے چمپا ٹاؤن نامی قصبے میں اتر گیا۔ گرجن سنگھ نے نجمی کو بتایا کہ ہیلی کاپٹر اسے یہاں اپنے ایک ساتھی کے حوالے کرنا ہوگا جو اسے لے کر واپس اکیاب اور وہاں سے مارشل جزیرے پر پہنچ جائے گا۔

نجمی نے پوچھا.. ”یہاں سے آگے ہم کس طرف کو جائیں گے سردار جی؟“

گرجن سنگھ کہنے لگا ” یہ میں واپس آکر بتاتا ہوں۔ تم اسی جگہ رہنا۔ میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔“

نجمی کو گرجن سنگھ نے میزورام کے چمپا ٹاؤن میں ایک جگہ ہیلی کاپٹر سے اتار دیا اور تاکید کی کہ وہ ان چٹانوں کے پاس ہی چھپ کر بیٹھ جائے۔ گرجن سنگھ ہیلی کاپٹر لے کر اڑ گیا نجمی نے ارد گرد دیکھا دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی یہاں بھی آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا

ارد گرد ناریل کے درخت کم اور مہاگنی کے گھنے درخت زیادہ تھے نجمی عجیب کشمکش میں تھی اسے گرجن سنگھ سے کسی نہ کسی جگہ جلد الگ ہو جانا تھا وہ اس کے ساتھ امرتسر کے گاؤں ویرکا نہیں جا سکتی تھی کیونکہ وہاں لابھ سنگھ نام کا کوئی اس کا باپ نہیں تھا ویسے بھی انڈیا نجمی کے لیے خطرناک ایریا تھا۔ یہاں بنگال، پنجاب اور جموں کی پولیس اس کی تلاش میں تھی اسے ابھی جموں جا کر اپنے ساتھی بادل کا بھی سراغ لگانا تھا وہ اس کا پتہ کیے بغیر بارڈر کراس کر کے پاکستان داخل نہیں ہونا چاہتی تھی وہ اگر خواہش بھی کرتی تو ایسا ناممکن تھا وہ جموں کے محلہ استاداں میں جا کر لال دین کا بھی پتہ کرنا چاہتی تھی۔ اسے دریائے توی کے پار پرانی منگلی کوٹھی میں شاہ جی سے بھی ملاقات کرنی تھی۔ جہاں سے اسے اغوا کیا گیا تھا جس ہندو ڈوگرہ بدمعاش نے اسے اغوا کیا تھا۔ نجمی کو اس سے بھی اپنے اغوا کا بدلہ لینا تھا۔ یہ صورت حال ایسی تھی کہ نجمی گرجن سنگھ کے ساتھ انڈیا کے علاقے میں زیادہ دیر نہیں رہ سکتی تھی۔

آدھ گھنٹے بعد گرجن سنگھ واپس آگیا۔ وہ ایک جیپ میں سوار تھا آتے ہی اس نے نجمی کو بٹھایا اور بولا۔

”یہاں سے ہم ناگا ڈیم چلیں گے۔ وہاں سے دوپہر کے بعد ایک ٹرانسپورٹ فلائٹ آسنول جاتی ہے ہم اس کے ذریعے آسنول پہنچیں گے اور وہاں سے ٹرین پکڑ کر امرتسر کے لیے روانہ ہو جائیں گے واہے گورو کی کرپا سے سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب ہرنام جی تم اپنے پتا جی کے پاس بڑی جلدی پہنچ جاؤ گی۔“

نجمی نے گہرا سانس بھر اگرجن سنگھ کا شکریہ ادا کیا۔ اس کی تعریف کی۔ سکھ اپنی تعریف سن کر حیران سا ہوا جیسے نجمی کسی دوسرے آدمی کی تعریف کر رہی ہو۔ جیپ چمپا ٹاؤن کے جنگل میں سے گزرتی ناگا ڈیم کی طرف ایک چھوٹی سی نیم پہاڑی سڑک پر روانہ ہو گئی یہ ساتھ ستر میل کا فاصلہ تھا جو دو گھنٹے میں طے ہو گیا۔ ناگا ڈیم ایک نیم فوجی اڈہ تھا گرجن سنگھ یہاں کچھ لوگوں کو جانتا تھا۔ انھوں نے اس کی بڑی مدد کی اور بھاری بھرکم ٹرانسپورٹ طیارے میں بٹھا دیا وہیں گرجن سنگھ اور نجمی نے کھانا کھایا اس ٹرانسپورٹ طیارے میں سرکاری سامان آتا جاتا تھا۔ طیارہ گرجتا ہوا فضا میں بلند ہو گیا۔ تین گھنٹے کے سفر کے بعد طیارہ آسنول کے پرانے ائیرپورٹ پر اتر رہا تھا۔

اب نجمی کو بے حد محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ آسنول بنگال کا شہر تھا اور آسنول میں نجمی چندا ڈاکو کی حیثیت سے مشہور تھی اور یہاں اس کی تصویریں بھی اخباروں میں چھپ چکی تھیں پولیس ابھی تک اس کی تلاش میں تھی۔

گرجن سنگھ وہاں سے اسے اپنے ایک دوست کے کوارٹر میں لے گیا گرجن سنگھ کا یہ دوست پنجابی ہندو تھا اور آسنول میں ریلوے کی ملازمت کرتا تھا۔ یہاں نجمی نے عیسائی عورتوں کی طرح اپنے بالوں کی منڈلیاں کر کے انھیں کانوں کے اوپر باندھ لیا۔ اس طرح سے اس کا حلیہ تھوڑا سا بدل گیا تھا۔ رات اس نے اسی کوارٹر میں گزاری۔ گرجن سنگھ کا ہندو دوست ریلوے میں ملازم تھا اس نے اگلے روز شام کو امرتسر جانے والی جنتا ایکسپریس میں سیکنڈ کلاس کی دو سیٹیں بک کروا دیں۔ چنانچہ دوسرے روز شام کو گرجن سنگھ نے نجمی کو ساتھ لیا اور اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا اب نجمی نے اپنے سر اور منہ کو چادر سے ڈھانپ لیا تھا۔ جنتا ایکسپریس کلکتہ سے ابھی تک نہیں آئی تھی۔ گرجن سنگھ اور نجمی پلیٹ فارم پر آ گئے۔ نجمی نے ریلوے پولیس کے آدمیوں کو دیکھا تو گرجن سنگھ سے کہا۔

"میرا خیال ہے میں سیکنڈ کلاس کے زنانہ ویٹنگ روم میں آرام کرتی ہوں۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" گرجن سنگھ بولا۔ "ٹرین آئے گی تو میں تمھیں اندر سے بلا لوں گا۔"

نجمی زنانہ ویٹنگ روم میں آ گئی۔ ویٹنگ روم میں پہلے سے کچھ ساڑھیوں والی بنگالی قسم کی عورتیں بیٹھی تھیں۔ نجمی بھی ایک جانب کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ ایک گلابی رنگ کی ساڑھی والی پختہ عمر اور بھاری بدن کی سانولی عورت نجمی کو گھورنے لگی۔ نجمی نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ جب تھوڑی دیر بعد پلٹ کر دیکھا تو وہ عورت ابھی تک نجمی کو گھور رہی تھی۔ نجمی اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی باتھ روم سے باہر نکل رہی تھی کہ گلابی ساڑھی والی عورت نے پنجابی زبان میں نجمی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے تمھیں پہلے کہیں دیکھا ہے بہن جی!"

نجمی نے بے نیازی سے کندھے اچکا کر اردو میں کہا۔

"دیکھا ہو گا مگر میں پنجابی نہیں ہوں۔ میں کانپور کی رہنے والی ہوں۔"

گلابی ساڑھی والی عورت مسکرائی۔

"بہن جی! میرا اندازہ کبھی غلط نہیں ہوا ہاں اب مجھے یاد آ گیا میں نے تمھیں کلکتہ میں دیکھا ہے۔"

کلکتہ کا نام سن کر نجمی ایک بار تو کانپ گئی جلدی سے بولی۔

"میں تو کلکتے صرف ایک بار گئی ہوں اپنی بہن کے پاس۔"

گلابی ساڑھی والی عورت ہنس کر کہنے لگی۔

"شاید میں نے تمھیں کسی شادی میں دیکھا ہے مجھے لگتا ہے کہ تم پنجابی بول رہی تھی۔"

نجمی نے کوئی جواب نہ دیا اور کونے میں اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی اس عورت کی وجہ سے وہ کچھ پریشان ہو گئی تھی کیونکہ دو ایک بار کن انکھیوں سے ان عورت کو دیکھا تو وہ برابر نجمی کو تکے جا رہی تھی یا اللہ جلدی سے ٹرین آ جائے نجمی دعائیں مانگنے لگی اس گلابی ساڑھی والی عورت کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے نجمی کی کسی بات پر یقین نہیں آیا ہے نجمی نے دل میں اس عورت کو ایک گالی دی اور کہا۔

"جہنم میں جاؤ تم۔"

باہر پلیٹ فارم پر لوگوں میں کچھ ہل چل سی مچ گئی تھی۔ نجمی سمجھ گئی کہ جنتا ایکسپریس آ رہی ہے۔ پھر ایک زبردست شور کے ساتھ جنتا ایکسپریس اسٹیشن میں داخل ہو گئی۔ گرجن سنگھ نے اندر آ کر نجمی سے کہا۔

"ہرنام جی گاڑی آ گئی ہے۔"

گلابی ساڑھی والی عورت نے غور سے گرجن سنگھ کو دیکھا۔ نجمی گرجن سنگھ کے ساتھ تیزی سے باہر نکل گئی۔ پلیٹ فارم پر مسافروں کی ریل پیل تھی مسافروں نے ٹرین پر جیسے یلغار کر دی تھی۔ گرجن سنگھ اور نجمی ایک سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں گھس گئے ان کی دو سیٹیں بک تھیں یہ سیٹیں آمنے سامنے کی تھیں اور ڈبے کے کونے میں واقع تھیں۔ سامان تو ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ نجمی اپنی سیٹ پر کھڑکی کے پاس بیٹھ گئی۔ کھڑکی کھلی تھی اور اس میں سے دوسرے پلیٹ فارم کا منظر نظر آ رہا تھا۔ گرجن سنگھ بولا۔

"ہرنام جی! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں پہلے دلی جاؤں گا جہاں میری بڑی بہن ہرمندر کور رہتی ہے میں آپ کو اس سے ملانا چاہتا ہوں۔ دلی میں ایک دن رہیں گے پھر میں آپ کو آپ کے پتا جی کے پاس لے چلوں گا اب ہم دلی جا رہے ہیں۔ میں نے ٹکٹ دلی کے ہی لیے تھے۔"

نجمی کو یاد آیا کہ اسے پہلے دلی جانا ہے۔ نجمی کے لیے دلی شہر بھی اپنے اندر بے پناہ خطرات

لیے ہوئے تھا۔ یہاں کی پولیس کے پاس بھی اس کی اور ندیم کی فائلیں پہنچ چکی تھیں۔ یہاں کی پولیس بھی اس کی تلاش میں تھی۔ نجمی عجیب مصیبت میں پھنس گئی تھی۔ وہ تو سیدھی جموں آموں کے باغ میں شاہ جی کے ڈیرے پہنچنا چاہتی تھی مگر گرجن سنگھ نے دلی کے ٹکٹ لے لیے تھے۔ امرتسر تک اسے گرجن سنگھ کا تحفظ حاصل تھا۔ اس نے سوچا کہ چلو ایک دن کی تو بات ہے دلی میں ٹھہر جاتے ہیں اتنا بڑا شہر ہے اسے کوئی کہاں پہچانے گا۔ اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے سردار جی! میں دلی ہی جاؤں گی پہلے۔"

جنتا ایکسپریس ابھی چلی نہیں تھی دو چار منٹ باقی تھے کہ اچانک نجمی کی نظر ویٹنگ روم کی گلابی ساڑھی والی عورت پر پڑی۔ وہ بریف کیس اٹھائے مسکراتی ہوئی ڈبے میں داخل ہوئی اور نجمی کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان ہوتے ہوئے بولی۔

"اچھا ہوا تم بھی اسی ڈبے میں ہو۔ اچھا سفر کٹے گا امرتسر جا رہی ہو نا تم؟"

گرجن سنگھ نے بیچ میں بولتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں ہم دلی جا رہے ہیں۔"

سیدھا سا آدمی تھا، یہ گرجن سنگھ۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ وہ ایک آدمی کو قتل کر کے آ رہے ہیں اسے رازداری سے کام لینا چاہیے تھا مگر وہ اپنے دل کی آواز نہ چھپا سکا نجمی نے کہا۔

"ہو سکتا ہے ہم پہلے کانپور جائیں وہاں میری ننھیال ہے۔"

گرجن سنگھ نے اب چونک کر نجمی کی طرف دیکھا۔ نجمی نے اسے آنکھ کا ہلکا سا اشارہ کیا۔ اب گرجن سنگھ کی سمجھ میں آیا کہ وہ ایک خطرناک جرم کر کے آ رہے ہیں۔ انھیں بے حد احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ اپنی داڑھی کو دونوں ہاتھوں سے اوپر چڑھاتے ہوئے بولا۔

"ہاں جی ہو سکتا ہے ہم پہلے کانپور ہی جائیں۔ آپ کہاں جا رہی ہیں بہن جی؟"

گلابی ساڑھی والی نے کہا۔

"جی! میں تو دلی جا رہی ہوں میرا بھائی وہاں رہتا ہے اس سے ملنے جا رہی ہوں۔ میرا نام کملا بھاٹیہ ہے اور تمھارا کیا نام ہے بہن جی؟ کملا بھاٹیہ نے نجمی کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"ہرنام کور۔"

کملا بھاٹیہ بڑے سنسنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔ نجمی اپنا دل مسوس کر رہ گئی۔ یہ عورت اسے ایک عذاب لگ رہی تھی یہ ضرور کوئی گل کھلانے والی ہے۔ اسے سارا علم ہے یہ اس کی خاطر دلی جا رہی ہے۔ یہ سی آئی ڈی کی عورت ہے۔ نجمی سوچنے لگی۔ انجن نے سیٹی دی اور ٹرین آہستہ آہستہ پلیٹ فارم سے کھسکنا شروع ہو گئی۔

— — ٭ — —

جنتا ایکسپریس رات کو چلی تھی۔

کملا تیسری نشست پر بیٹھی تھی۔ نجمی اور گرجن سنگھ آمنے سامنے والی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ گرجن سنگھ اَن جان تھا۔ کملا بھاٹیہ ایک تجربہ کار عورت تھی۔ اس نے گرجن سنگھ کو ذرا نخرے دکھائے تو سکھ بھوت گیا اور اس سے گھل مل کر باتیں کرنے لگا۔

نجمی نے سر درد کا بہانہ کر کے گرجن سنگھ کو اپنے قریب بلایا اور کہا "میرا سر درد کر رہا ہے ذرا پٹی باندھ دو گے۔"

گرجن سنگھ نجمی کے سر پہ رومال باندھنے لگا تو نجمی نے سرگوشی میں کہا "یہ عورت مجھے سی آئی ڈی کی لگتی ہے۔ واہے گورو کا واسطہ ہے اس سے دور ہی رہو۔"

سی آئی ڈی کا نام سن کر گرجن سنگھ تو بھونچکا سا ہو کر رہ گیا۔ نجمی نے مزید ہدایت کی "بیحد احتیاط سے کام لو۔" گرجن سنگھ پر اس بات کا اتنا اثر ہو گیا کہ ایک بار کملا بھاٹیہ نے پانی مانگا تو گرجن سنگھ روکھے لہجے میں بولا "بی بی میرے پاس کوئی تھرمس وغیرہ تو ہے نہیں۔ اگلا.... اسٹیشن آئے گا تو منگوا لینا۔"

جنتا ایکسپریس اسٹیشن پر اسٹیشن چھوڑتی جا رہی تھی۔ کان پور آیا تو کملا بھاٹیہ نے مسکراتے ہوئے گرجن سنگھ سے کہا

"سردار جی! آپ کانپور نہیں اتریں گے۔"

نجمی نے تنگ آ کر کہا "کملا جی! آپ ہماری اتنی فکر نہ کریں ہمیں جہاں اترنا ہو گا وہیں اتریں گے۔"

کملا بھاٹیہ نے منہ دوسری طرف کر لیا اور ایسے ظاہر کیا جیسے سو گئی ہو۔ صبح ہو گئی تھی۔ دلی قریب آ رہا تھا۔ غازی آباد بھی گزر گیا۔ اگلا جنکشن دلی تھا۔ کملا بھاٹیہ باتھ روم میں گئی تو نجمی نے گرجن سنگھ سے کہا "یہ عورت بڑی خطرناک معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں دلی اسٹیشن پر اتر کر کچھ دیر ویٹنگ روم میں ٹھہرنا ہو گا۔ جب یہ عورت چلی جائے گی تب ہم اسٹیشن سے باہر نکلیں گے۔"

گرجن نے پگڑی باندھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے ہرنام جی۔"

جنتا ایکسپریس دلی کے پلیٹ فارم پر آ کر رک گئی۔ نجمی نے چادر سے اپنا سر اور تھوڑا سا چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔ ٹرین سے اتر کر سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم کی طرف بڑھی۔ اندر جا کر اس نے باتھ روم میں منہ ہاتھ دھویا۔ بال بنائے سر پر رومال باندھا۔ پھر باہر آ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

گرجن سنگھ مردانہ ویٹنگ روم میں تھا۔ ناشتہ دونوں نے راستے میں ہی کر لیا تھا۔ نجمی نے گرجن سنگھ سے کہا تھا کہ وہ پورے بیس منٹ تک ویٹنگ روم میں رہیں گے۔ جب بیس منٹ پورے ہو گئے تو گرجن سنگھ نے زنانہ ویٹنگ روم کے دروازے پر آ کر نجمی کو آواز دی۔ نجمی نے باہر نکلتے ہی پوچھا۔

"وہ مصیبت تو یہاں موجود نہیں ہے؟"

گرجن سنگھ ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ حالانکہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ مگر گرجن سنگھ ہر قدم پر اپنی سادگی اور سادہ دلی کا ثبوت دے رہا تھا۔ کہنے لگا "مجھے تو وہ کہیں نظر نہیں آ رہی۔"

"چلو اب نکل چلتے ہیں کدھر چلنا ہے میرا مطلب ہے۔ تمھاری بہن ہرمندر کور جی کس محلے میں رہتی ہے؟"

گرجن سنگھ نجمی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"موتی نگر جائیں گے ہرنام جی تم نے موتی نگر دیکھا ہے؟"

نجمی نے کہا "نہیں جی دلی تو ضرور دیکھا ہے مگر موتی نگر کبھی نہیں گئی۔"

اسٹیشن سے باہر آ کر انھوں نے ٹیکسی لی وہ ٹیکسی میں بیٹھ رہے تھے کہ اچانک نجمی کی نگاہ کملا بھاٹیہ پر پڑ گئی۔ وہ بھی ریلوے اسٹیشن کے باہر ایک طرف کھڑی ٹیکسی والے سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے ایسے ظاہر کیا جیسے نجمی کو اس نے بالکل نہیں دیکھا۔ لیکن نجمی سمجھ گئی تھی کہ کملا بھاٹیہ نے اسے دیکھ لیا ہے بلکہ وہ اسی کی انتظار میں اسٹیشن کے پورچ میں اتنی دیر تک کھڑی رہی تھی۔

نجمی نے ٹیکسی کے چلتے ہی گرجن سنگھ کو بتا دیا کہ سی آئی ڈی والی عورت نے اسے دیکھ لیا ہے۔ گرجن سنگھ کو غصہ آ گیا۔ پہلی بار نجمی نے گرجن سنگھ کے منہ سے گالی سنی۔ یہ گالی اس کے منہ سے بے اختیار نکل گئی تھی۔ "میں اس کو ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ یاد رکھے گی۔"

ٹیکسی موتی نگر کی طرف جا رہی تھی۔ نجمی نے آہستہ سے کہا "ٹیکسی سیدھی موتی نگر مت لے جاؤ، کسی دوسری طرف لے چلو۔"

گرجن سنگھ کو غصہ آ گیا بولا "ہم اس سے ڈرتے ہیں۔ کیا ہرنام جی؟"

سامنے والے شیشے میں سے ڈرائیور نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ نجمی نے گرجن سنگھ کا ہاتھ دبایا اور خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ گرجن سنگھ نے ڈرائیور سے کہا "ذرا پہلے چاندنی چوک کی طرف چلو وہاں سے کچھ مٹھائی لینی ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے گاڑی چاندنی چوک کی طرف موڑ دی۔ چاندنی چوک میں ٹل والوں کی مشہور مٹھائی کی دکان ہے جہاں سے کبھی لال قلعے میں مٹھائی جایا کرتی تھی ان کی دکان کا ماتھا بارہ دری ایسا ہے اور مٹھائی ساری دلی میں مقبول ہے۔ یہاں گاہکوں کا بڑا رش تھا۔ گرجن سنگھ نے ٹیکسی ایک طرف کھڑی کروا دی اور نجمی کو لے کر مٹھائی کی دکان کی طرف بڑھا "ہرنام جی تم ہی دیکھو کہ وہ سی آئی ڈی والی مصیبت ہمارے پیچھے پیچھے تو نہیں آئی؟"

نجمی نے گرجن سنگھ کو خاموش رہنے کی ہدایت کی۔ تھوڑی دیر بعد وہ مٹھائی کا لفافہ لیے واپس ٹیکسی کی طرف جا رہے تھے۔ نجمی نے اس دوران میں ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہاں رش اور ٹریفک اتنی تھی کہ نجمی کوئی صحیح اندازہ نہ لگا سکی ویسے اسے کملا بھاٹیہ کہیں نظر نہیں آئی۔

ٹیکسی گرجن سنگھ کی بہن ہرمندر کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔ دن کی روشنی میں نجمی کو اپنے پہچانے جانے کا بھی خطرہ تھا۔ وہ ٹیکسی کی پچھلی نشست پر ایک طرف کو جھک کر بیٹھی ہوئی تھی۔ ٹیکسی دلی کی مختلف سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی موتی نگر کی نئی آبادی میں داخل ہو گئی یہاں چھوٹی چھوٹی کوٹھیاں بھی تھیں اور عالی شان بنگلے بھی۔ کوارٹر بھی تھے جن کو کوٹھیوں میں تبدیل کرنے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔

گرجن سنگھ کی بہن کا مکان بھی ایسا ہی ایک کوٹھی نما کوارٹر تھا۔ ہرمندر کور ایک دراز قد پختہ عمر کی عورت تھی جس کے چہرے سے شگفتگی اور خوش مزاجی ٹپکتی تھی۔ گرجن سنگھ نے ہرمندر کور کو جاتے ہی نجمی کے بارے سب کچھ بتا دیا۔ ہرمندر کور نے نجمی کو سینے سے لگا لیا اور پیار کرتے ہوئے کہا "تم پر بڑے ظلم ہوئے ہیں ہرنام بہن پر فکر نہ کرو واہے گرو کی کرپا سے تمہارے کشٹ اب دور ہو گئے ہیں اب گرجن سنگھ خود تم کو تمہارے پتا جی کے پاس ویر کے پہنچا دے گا۔"

ہرمندر کور کا خاوند دلی میں کپڑے کا کاروبار کرتا تھا دوپہر کو وہ بھی آ گیا۔ گرجن سنگھ کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ اسے گلے ملا اور پھر نجمی کی طرف دیکھ کر بولا "یہ بی بی کون ہے۔ میں نے اسے پہچانا نہیں۔"

گرجن سنگھ نے مختصر لفظوں میں اپنے بہنوئی سرجن سنگھ کو بھی نجمی کی داستانِ غم بیان کی۔ سرجن سنگھ پر بڑا اثر ہوا۔ کہنے لگا "گرجن سنگھ تم نے بڑا پن کا کام کیا ہے۔ گورو گرنتھ صاحب کے گرنتھی کی بیٹی کو ظالموں کے گھر سے نکال لائے ہو۔ تو نے تو اپنا کلیان کر لیا ہے اب بی بی ہرنام کور کو اس کے گھر پہنچا دو بس۔"

نجمی سر جھکائے نیک دل ہرنام کور بنی، خاموشی سے یہ سب کچھ سن رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے وہ کہاں سے کس مقام سے گرجن سنگھ سے الگ ہو۔ ظاہر ہے وہ اس کے ساتھ ویر کے نہیں جا سکتی تھی کیونکہ وہاں تو اس کا کوئی نہیں تھا۔ دلی بڑا شہر تھا۔ یہاں وہ آسانی سے گرجن سنگھ سے الگ ہو کر اپنے طور پر جموں روانہ ہو سکتی تھی۔ اس کے پاس روپے موجود تھے۔ گرجن سنگھ کے بہنوئی سرجن سنگھ نے نجمی کی پتلون جیکٹ پر اعتراض کیا تو گرجن سنگھ بولا "یہ وہاں یہی پہنا کرتا تھا۔ جیجا جی ساڑھی شلوار تو وہاں کوئی عورت نہیں پہنتی تھی۔"

سرجن سنگھ بولا "مگر پتر تو اب اسے اپنی بہن کی ساڑھی دے دے۔ شلوار قمیض دے دے۔ اسے اپنے پتا کے گھر اپنے لباس میں جانا چاہیئے۔"

چنانچہ نجمی کو بادل نخواستہ شلوار قمیض پہننی پڑی اسے سفید چادر بھی دی گئی جو اس نے سر پر اوڑھ لی۔

دلی کا موسم خوشگوار تھا۔ برسات گزر چکی تھی۔ رات کو موسم خنک ہو جاتا تھا۔ رات کو ہرمندر کور نے نجمی کو اپنے کمرے میں چارپائی پر سلایا۔ کچھ دیر تک وہ اس سے باتیں کرتی رہی اور پوچھتی رہی کہ مرہٹہ جاگیردار کے پاس دوسری کون کون عورتیں تھیں۔ کیا وہ بڑا ظلم کرتا تھا؟ نجمی مختصر جواب دیتی رہی۔ پھر ہرمندر کور سو گئی۔ نجمی جاگ رہی تھی اس لیے کہ اسے آج صبح صبح منہ اندھیرے اس گھر سے ہمیشہ کے لیے نکل جانا تھا۔ نجمی نے گھر کا پچھلا دروازہ دیکھ لیا تھا۔ یہ دروازہ جس کمرے میں وہ سو رہی تھی اس کے غسل خانے سے نکلتا تھا۔ اس وقت رات کے ساڑھے دس بجے تھے۔ سفر کی تھکان کی وجہ سے گرجن سنگھ باہر دالان میں نو بجے ہی سو گیا تھا۔ سرجن سنگھ بھی وہیں ایک چارپائی پر کھیس اوڑھے سو رہا تھا۔ ہرمندر کور بھی سو گئی تھی صرف نجمی جاگ رہی تھی۔

رات کے پونے گیارہ بجے کے قریب کوارٹر کے باہر پولیس کی جیپ آکر رکی اور اس میں سے چار پانچ کانسٹیبل، ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ نکل کر سرجن سنگھ کے کوارٹر کی طرف بڑھے۔ گلابی ساڑھی والی کملا بھاٹیہ پولیس کے ساتھ تھی۔ باہر سے جیپ کی آواز آتے ہی نجمی کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ جلدی سے چارپائی پر سے اٹھی۔ چھوٹی سی کھڑکی کی درز سے باہر دیکھا بجلی کے کھمبے کی روشنی میں اسے پولیس اور کملا بھاٹیہ نظر آئی تو اس کے بدن میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔

کھڑکی سے پیچھے ہٹ کر سیدھی غسل خانے میں گھس گئی۔ اس کا عقبی دروازہ کھولا اور کوارٹر کی پچھلی چھوٹی سی گلی میں نکل آئی۔ پولیس کو اس گلی کے بارے میں علم نہیں تھا۔ ورنہ وہ پہلے اس کا محاصرہ کرتی۔ نجمی کو یقین تھا کہ ادھر گلی میں بھی پولیس کا کوئی نہ کوئی آدمی ضرور ہوگا۔ وہ اندھیرے میں بڑی محتاط ہو کر باہر نکلی تھی۔ یہ دیکھ کر کہ گلی بالکل خالی پڑی ہے۔ نجمی بھاگ کر گلی میں سے دوسری گلی کی طرف نکل گئی۔ یہ کوٹھی نما کوارٹروں کے پچھواڑے تھے اور کافی رات گزر جانے کی وجہ سے سنسان پڑے تھے۔ کہیں کہیں مکانوں کے عقبی والانوں کی روشنی گلی میں پڑ رہی تھی۔ نجمی جتنی تیزی سے دوڑ سکتی تھی دوڑتی ہوئی ان گلیوں سے نکل کر سڑک پر آگئی یہ موتی نگر علاقے کی چھوٹی سڑک تھی۔ یہ علاقہ نجمی کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ وہ یہاں کبھی نہیں آئی تھی۔ اس نے بھاگ کر سڑک عبور کی اور سامنے والی سڑک سے ہوتی ہوئی کوٹھیوں کے بیچ والے راستوں سے گزرتی موتی نگر سے باہر کھلی سڑک

پر آگئی۔ وہ جانتی تھی کہ اب تک گرجن سنگھ کی بہن کے گھر پولیس کو اس کے فرار کا پتہ چل گیا ہوگا اور وہ اس کی تلاش میں جیپ لے کر علاقے میں نکل آئی ہو گی۔ اسے راستے کی خاموشی میں زور سے جیپ کی آواز سنائی دی۔

نجمی سڑک کی دوسری جانب آگئی اور درختوں کے نیچے ایک طرف تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔ وہ دل میں گلابی ساڑھی والی کملا بھاٹیہ کو گالیاں دے رہی تھی۔ آخر اس کا خدشہ درست نکلا۔ وہ سی آئی ڈی ہی کی عورت تھی۔ جیپ کی آواز قریب ہوتی جا رہی تھی۔ یہ پولیس کی جیپ ہی ہو سکتی تھی۔ وہاں کوئی ٹیکسی رکشا بھی نظر نہیں آ رہا تھا جو نجمی کو اس خطرناک علاقے سے نکال کر لے جاتا۔

اس کے پیچھے دور سڑک پر جیپ کی روشنی نمودار ہوئی۔ نجمی نے پلٹ کر دیکھا۔ جیپ کی روشنی قریب آ رہی تھی۔ نجمی کو اور تو کچھ نہ سوجھا۔ وہ ایک کوٹھی کے کھلے گیٹ میں داخل ہو گئی۔ دائیں جانب کوٹھی کا باغ تھا۔ نجمی باڑھ پھلانگ کر باغ میں گھس گئی اور بھاگتی ہوئی درختوں کی طرف آگئی۔ یہاں نوکروں کے کوارٹر تھے۔ ایک بندھا ہوا کتا اس کی بو سونگھ کر غرایا۔ نجمی وہیں بیٹھ گئی اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ اس کے کان جیپ کی آواز پر لگے تھے۔ آنکھیں جھاڑیوں میں سے دور سڑک کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جیپ کی روشنی سڑک پر سے تیزی سے آگے نکل گئی۔ نجمی کی جان میں جان آئی۔ جیپ کی آواز بھی دور جا کر غائب ہو گئی۔ کتا اب غرا نہیں رہا تھا۔

خطرہ ٹل گیا تھا۔ نجمی آہستہ سے اٹھی اور باغ میں سے گزرتی کوٹھی کے گیٹ پر آگئی اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ گیٹ کے آگے سڑک خالی تھی۔ وہاں کوئی چوکیدار بھی نہیں تھا۔ ورنہ اسے مشکل پیش آسکتی تھی۔ وہ تیزی سے کوٹھی میں سے نکل کر دوبارہ سڑک پر آگئی۔ سڑک کے کنارے چھوٹے چھوٹے درخت تھے۔ وہ ان کے درمیان چلنے لگی پچاس ساٹھ قدموں کے بعد سڑک دائیں جانب مڑتی تھی۔ آدھی رات کے وقت سڑک تقریباً خالی تھی۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی گزر جاتی۔ نجمی دور سے گاڑی کی روشنی دیکھ کر درخت کے پیچھے ہو جاتی۔

اسے چوک میں دکانوں وغیرہ کی روشنیاں نظر آئیں۔ وہاں کچھ ٹیکسی رکشا بھی موجود تھے۔ نجمی اکیلی تھی اگرچہ وہ ایک دلیر عورت تھی اور اپنا بچاؤ کرنا جانتی تھی مگر وہ ایک نازک صورتِ حال سے دوچار تھی۔ وہ امن وامان کے ساتھ اس علاقے سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ کہاں جائے؟ ریلوے اسٹیشن پر جانا مناسب نہیں تھا۔ اس کے فرار کے بعد ظاہر ہے پولیس کے آدمی ریلوے اسٹیشن پر تو ضرور موجود ہوں گے۔ اچانک نجمی کے دل میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی درگاہ کا خیال آگیا۔ درگاہ شریف میں وہ محفوظ رہ کر رات گزار سکتی ہے۔ اس کا پولیس کو شاید خیال نہ آئے۔ ٹیکسی یا رکشے والا بھی درگاہ شریف کا سن کر اسے حفاظت سے وہاں پہنچا دے گا۔

نجمی سڑک پار کر کے دکانوں کے آگے کھڑی ٹیکسی، رکشاؤں کے پاس جانے کی بجائے۔۔ وہیں ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی۔ بائیں جانب سے ایک موٹر رکشا آیا اور اس کے قریب آکر رک گیا۔ "بی بی جی! کہاں چلنا ہے؟"

ڈرائیور ادھیڑ عمر تھا۔ نجمی نے کہا "مجھے درگاہ حضرت نظام الدین لے چلو بھائی۔"

"بیٹھو بی بی" رکشا ڈرائیور نے کہا۔

چند لمحوں کے بعد رکشا موتی نگر کے علاقے سے نکل گیا اور درگاہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی طرف بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ نجمی نے ایک مصیبت سے تو چھٹکارا حاصل کر لیا تھا مگر وہ کسی بھی جگہ گرفتار ہو سکتی تھی اب تو دلی پولیس اور دلی کی خفیہ پولیس بھی اس کو گرفتار کرنے کے لیے میدان میں نکل آئی تھی۔ درگاہ حضرت نظام الدینؒ وہاں سے کافی دور تھی۔ کوئی پون گھنٹے کے بعد رکشے نے اسے درگاہ شریف کے باہر پہنچا دیا۔ کسی زمانے میں نظام الدینؒ اولیاء کا مزار دلی شہر سے باہر ہوا کرتا تھا اور شہر سے کافی دور تھا۔ لیکن اب یہ علاقہ شہر کے بیچ میں آگیا ہے اور مزار شریف تک پہنچنے کے لیے گلیوں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔ درگاہ شریف پر بڑی رونق تھی۔ قوالی ہو رہی تھی۔ عقیدتمند نذرانے چڑھا رہے تھے۔ دعائے فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ نجمی نے چادر سے سر اور منہ کو اچھی طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ درگاہ شریف میں دالان میں مرقد مبارک کے دائیں جانب سنگ مرمر کے چبوترے پر فرش پر بیٹھ گئی۔ اس

نے آنکھیں بند کر لیں اور دعائے فاتحہ پڑھی۔ اللہ سے دعا مانگی اور درگاہ شریف کے گیٹ کی طرف دیکھا۔

عقیدت مند چلے آ رہے تھے۔ فضا میں روشنی اور خوشبوئیں تیر رہی تھیں۔ قوالی دوسرے دالان میں ہو رہی تھی۔ کچھ دوسری عورتیں بھی وہاں سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ یہاں نجمی کو دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ کہاں جائے۔ اس نے گردن موڑ کر ایک طرف دیکھا نیچے ایک دالان تھا۔ یہاں ایک باؤلی تھی۔ یہاں بھی کافی عقیدت مند مرد اور خواتین موجود تھیں۔ نجمی نے ایک بار پھر دعا مانگی اور سیڑھیاں اتر کر دالان میں آئی۔ آہستہ آہستہ چلتی دالان کی جنوبی دیوار کی طرف گئی۔ یہاں ایک دروازہ تھا جو نیچے چھوٹے سے قبرستان کی طرف کھلتا تھا۔ نجمی کو اس قبرستان کا علم نہیں تھا۔ اس نے دروازے کے باہر کچھ خاموشی سی دیکھی تو ادھر چل دی۔ یہاں بجلی کے کھمبوں کی روشنی تھی مگر لوگ نہ ہونے کے برابر تھے۔ نجمی کو ایسا ہی ماحول چاہیئے تھا۔ وہ کسی محفوظ جگہ بیٹھ کر سوچنا چاہتی تھی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے۔ آیا وہ یہاں سے واپس صوبہ بہار کے مقام گوماہ کے جنگل میں واقع اپنی خفیہ کمین گاہ کی طرف جائے یا جموں کی جانب نکلنے کی کوشش کرے۔ اپنی خفیہ کمین گاہ کے بارے میں اسے پورا یقین نہیں تھا کہ اس کے پرانے ڈاکو ساتھی وہاں پر موجود ہوں گے۔ دوسرے اُسے یہ بھی خیال تھا کہ بادل بھی وہاں موجود نہیں ہے اور اب سارے ڈاکو ہندو ہوں گے اور وہ اُن کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہیں۔

یہی سوچتی ہوئی نجمی درگاہ شریف کے عقبی قبرستان کے چھوٹے سے دروازے کے پاس آ کر رک گئی جہاں اُردو کے عظیم شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب کی بھی قبر ہے۔ کسی زمانے میں یہ قبر خستہ حالت میں تھی لیکن اب حکومت ہند نے اس کے اوپر سنگ مرمر کی ایک چھتری سی بنوا دی تھی۔ قبرستان کا دروازہ کھلا تھا۔ نجمی نے جھانک کر دیکھا تو اسے دیوار والی بتی کی روشنی میں وہاں قبریں ہی قبریں نظر آئیں وہ قبرستان میں داخل ہو گئی اور یونہی دیوار کی اوٹ میں ایک قبر کے پاس چبوترے پر بیٹھ گئی۔ وہ یوں بیٹھی تھی کہ اگر کوئی دیکھے تو یہی سمجھے کہ یہ اس کے کسی عزیز کی قبر ہے اور وہ وہاں فاتحہ پڑھنے آئی ہے۔ اب اس نے آئندہ کے منصوبے

پر غور کرنا شروع کر دیا۔

آخر وہ اسی نتیجے پر پہنچی کہ اسے یہاں سے کسی طرح جموں ہی پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اپنی خفیہ کمین گاہ میں جانا بیکار ہو گا۔ کیونکہ وہاں سے اسے پھر بادل کی تلاش میں واپس جموں شاہ جی کے پاس جانا پڑے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ دلی سے باہر کیسے نکلے۔ اسٹیشن پر جا کر گاڑی پکڑنا اپنے آپ کو خود پولیس کے حوالے کرنے کے مترادف تھا اگر وہ لاری پکڑتی ہے تو لاری کے اڈوں پر بھی پولیس کی چیکنگ کا خطرہ تھا۔ لاری کو تو راستے میں بھی روکا جا سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دلی سے انبالے کی طرف کسی دوسرے راستے ریلوے اسٹیشن سے ریل میں سوار ہو گی۔ اب مسئلہ رات گزارنے کا تھا۔ قبرستان میں وہ رات نہیں گزار سکتی تھی۔ اسے درگاہ شریف پر ہی رات گزار دینی چاہیئے اور یہیں کسی سے معلوم کرنا چاہیئے کہ دلی سے انبالے جاتے ہوئے دوسرا اسٹیشن کونسا ہے اور وہاں تک کوئی لاری جاتی ہے یا نہیں۔؟

نجمی اٹھنے ہی والی تھی کہ کسی نے پیچھے سے آواز دی "بیٹی حوصلہ کرو مرنے والوں کے ساتھ کوئی نہیں مرتا۔ خدا کی مرضی میں کوئی دخل بھی نہیں دے سکتا۔"

نجمی نے پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے ایک سفید ریش بزرگ کھیس کاندھوں پر ڈالے سر پر سبز ٹوپی اوڑھے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک عصا تھا۔ نجمی نے اٹھ کر ادب سے انھیں سلام کیا بزرگ نے کہا "میں دیکھ رہا تھا کہ تم دیر سے قبر پر بیٹھی ہو۔ یہ تمھارے کس عزیز کی قبر ہے بیٹی؟ نجمی جھوٹ نہیں بولنا چاہتی تھی لیکن جھوٹ بولنے کے سوا کوئی چارہ کار بھی نہیں تھا۔ اس نے اللہ سے معافی مانگی اور بزرگ کی طرف دیکھ کر کہا" یہ میری والدہ کی قبر ہے جی۔"

نجمی نے دیکھ لیا تھا کہ قبر کے سرہانے کوئی کتبہ نہیں لگا تھا۔ اس نے بزرگ کو بتایا کہ آج سے چار برس پہلے اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا اور اسے اسی قبرستان میں دفن کر دیا گیا تھا۔ بزرگ نے بڑی شفقت سے پوچھا کیا" تم درگاہ پر اکیلی آئی ہو بیٹی۔؟"

نجمی نے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کہنا ہے۔

"باجی میرے ساتھ بڑی عجیب بات ہوئی ہے۔ میں اپنے میاں کے ساتھ درگاہ پر حاضری دینے اور والدہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آئی تھی۔ ہم شام کے وقت انبالہ سے یہاں پہنچے تھے۔

پھر ایسا ہوا کہ خدا جانے میرے میاں کہاں غائب ہو گئے اور میں یہاں اکیلی رہ گئی۔"

بزرگ نے پوچھا "کیا تمھارے میاں کو معلوم نہیں تھا کہ تم درگاہ شریف پر ہو؟"

نجمی نے کہا "بات یہ ہے حضور کہ میرے میاں کو کبھی کبھی دورہ سا پڑتا ہے اور وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہتے۔ تب وہ جہاں کہیں بھی ہوں۔ بس وہاں سے واپس انبالے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ اس وقت انھیں صرف اپنا گھر ہی یاد رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے میاں بھی واپس انبالے چل دیئے ہیں۔ میں اکیلی عورت ہوں۔ یہ سوچ کر یہیں بیٹھی ہوں کہ رات کسی نہ کسی طرح گزار دوں اور صبح انبالے چلی جاؤں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ انبالے کو یہاں سے کونسی لاری جاتی ہے۔"

بزرگ نے نجمی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "یہ خواجہ کی چوکھٹ ہے بیٹی یہاں اللہ کی رحمت کا سایہ ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ میرے ساتھ آؤ وہ سامنے میرا چھوٹا سا گھر ہے وہاں میری بڑی لڑکی اپنے بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ تم اس کے پاس رات گزارو۔ صبح میں خود تمھیں انبالے جانے والی گاڑی یا لاری میں بٹھا دوں گا۔"

نجمی درگاہ شریف کے دالان میں ہی رات بسر کر دینا چاہتی تھی لیکن اب وہ بزرگ کے سامنے انکار بھی نہیں کر سکتی تھی چپکے سے ان کے ساتھ چل پڑی۔ اس بزرگ کا مکان چھوٹا سا تھا۔ دو کوٹھریاں اور ایک دالان تھا۔ دالان میں ان کی بیٹی اپنے بچوں کے ساتھ سو رہی تھی۔ بزرگ نے اسے جگایا بے چاری نیک دل خاتون اسی وقت اٹھ بیٹھی۔ نجمی کے لیے اس نے کوٹھری سے چارپائی نکال کر دالان میں ڈال دی۔ بچھونا لگایا اور نجمی سے کہا "سو جاؤ بہن تمھیں کچھ کھانا ہو تو میں روٹی لاؤں۔"

نجمی نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "میں نے کھانا کھا لیا تھا۔"

بزرگ بولے "اب تم آرام کرو بیٹی میں صبح آ کر تمھیں لاری اڈے لے چلوں گا۔ ٹرین کا بھی پتہ کر آؤں گا۔ ہاں تمھارا نام کیا ہے بیٹی؟"

"عائشہ" نجمی کی زبان پر یہی نام آیا۔

بزرگ دعائیں دیتے چلے گئے۔ نجمی چارپائی پر کھیس اوپر کر کے لیٹ گئی۔ بزرگ کی بیٹی اپنی چارپائی پر لیٹ گئی اس کے بچے چھوٹی چارپائی پر سو رہے تھے۔ وہ کہنے لگی۔

"خدا کرے تمھارے میاں گھر پہنچ گئے ہوں۔"

نجمی نے کہا: "وہ دورہ پڑنے کے بعد گھر پہنچ جایا کرتے ہیں اور تو وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں مگر گھر نہیں بھولتے۔"

عورت بولی: "یہ بھی اللہ کا بڑا کرم ہے۔ تم اپنے میاں کا علاج کیوں نہیں کراتیں۔"

تھوڑی دیر اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ نجمی نے اس عورت سے پوچھا: "دلی سے آگے کونسا اسٹیشن ہے؟ میرا مطلب ہے اگر ہم دلی سے انبالے جائیں تو دوسرا اسٹیشن کونسا آتا ہے؟"

وہ عورت بولی: "دلی سے انبالے کی طرف جائیں تو پہلا اسٹیشن تو شاہدرہ ہی آتا ہے۔ کیوں تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

نجمی نے جمائی لیتے ہوئے کہا: "یونہی پوچھ رہی تھی۔"

"اچھا بہن اب سو جاؤ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

یہ کہہ کر بزرگ کی نیک دل بیٹی چپ ہو گئی وہ سو گئی تھی۔ نجمی ابھی تک جاگ رہی تھی۔ وہ یہاں سے شاہدرہ جانا چاہتی تھی۔ صبح تک اگر وہ اس گھر میں رہتی ہے تو لازمی طور پر اسے بزرگ کے ساتھ دلی ریلوے اسٹیشن جانا ہوگا اور وہاں وہ نہیں جانا چاہتی تھی۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ سوئے گی نہیں اور تھوڑی دیر بعد وہاں سے چپکے سے اٹھے گی اور درگاہ شریف کے باہر رکشا پکڑ کر شاہدرہ کی طرف چل دے گی۔ مگر نیند نے اس پر ایسی غفلت طاری کی کہ اسے کوئی ہوش نہ رہا اور جب اس کی آنکھ کھلی تو دالان میں دن کی روشنی پھیل چکی تھی اور نیم کے پیڑ پر چڑیاں بول رہی تھیں۔ نجمی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ بزرگ کی بیٹی رسوئی کے باہر چولہا جلائے بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔ اس کے بچے نلکے کے نیچے نہا رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ نجمی نے بے اختیار پوچھا۔

"کیا وقت ہو گیا ہوگا؟"

عورت نے روٹی توے پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"شاید سات بج گئے ہیں۔ ابا آ کر تمھارا پوچھ گئے تھے۔ تم سو رہی تھیں۔ ابھی پھر آئیں گے۔ اٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو اور ناشتہ کر لو۔"

نجمی ایک بار تو سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ نیند اسے دھوکا دے

گئی تھی۔ اتنے میں بزرگ بھی تشریف لے آئے۔ آتے ہی نجمی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور دعائیں دینے کے بعد بولے: "بیٹی عائشہ میں نے سب کچھ معلوم کر لیا ہے۔ لاری یہاں سے سیدھی انبالے نہیں جاتی تمھیں کرنال سے دوسری لاری پکڑنی پڑے گی۔ ٹرین سیدھی انبالے جاتی ہے۔"

نجمی نے پوچھا کہ ٹرین کس وقت دلی سے چھوٹتی ہے۔ بزرگ نے بتایا کہ "نو بجے ٹرین کا ٹائم ہے۔ تم تیار ہو جاؤ۔ میں خود تمھیں گاڑی پر چڑھا کر آؤں گا۔" نجمی یہ نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ "آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں آپ مجھے یہاں رکشے میں بٹھا دیں آگے میں خود ٹرین پکڑ لوں گی۔"

بزرگ اصرار کرتے رہے اور بولے: "تم تیار ہو جاؤ بیٹی میں آٹھ بجے آؤں گا ابھی آدھا گھنٹہ ہے آٹھ بجنے میں۔"

نجمی نے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر بالوں میں کنگھی کی، تھوڑا بہت ناشتہ کیا۔ پورے آٹھ بجے بزرگ تشریف لے آئے۔ نجمی ان کی بیٹی سے گلے لگ کر ملی۔ اس کے بچوں کو زبردستی پچاس روپے دیئے اور بزرگ کے ساتھ درگاہ شریف میں فاتحہ پڑھنے کے بعد باہر آ گئی۔ وہ کھلی سڑک پر نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہاں پولیس کے مخبروں کا خطرہ تھا۔ بزرگ اس کے ساتھ اسٹیشن تک جانے پر اصرار کر رہے تھے۔ لیکن نجمی نے انھیں وہیں سے واپس چلے جانے پر راضی کر لیا۔ ان کا بے حد شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ رکشے میں بیٹھ گئی۔ بزرگ رکشے والے کو بار بار تاکید کر رہے تھے کہ بیٹی کو سیدھا ریلوے اسٹیشن جا کر چھوڑنا۔ جب رکشا نظام الدین اولیاء کی بستی سے نکل کر کھلی سڑک پر آیا تو نجمی نے رکشا ڈرائیور سے کہا: "شاہدرہ ریلوے اسٹیشن کی طرف چلو۔"

رکشا ڈرائیور بولا: "بی بی جی شاہ جی نے تو مجھے دلی اسٹیشن پر لے جانے کے لیے کہا تھا۔"

نجمی نے فوراً کہا: "میں تمھیں دس روپے زیادہ دوں گی۔ مجھے جتنی جلدی ہو سکے شاہدرہ پہنچا دو ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔"

رکشا وہیں سے شاہدرہ کی طرف مڑ گیا۔ جس وقت نجمی شاہدرہ اسٹیشن پہنچی تو ٹرین کے آنے میں صرف پندرہ منٹ باقی تھے۔ نجمی کے لیے یہ خوش آئند بات تھی۔ کیونکہ وہ اسٹیشن پر زیادہ وقت نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ اس نے رکشا ڈرائیور کو کرائے کے علاوہ دس روپے انعام دیا اور چادر کی بکل

مار کر ٹکٹ گھر کی طرف آ گئی۔ شاہدرہ اسٹیشن پر کافی رونق تھی۔ یہ دلی ہی کا اسٹیشن تھا۔ نجمی نے وہیں سے جموں کا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لے لیا۔ وہ شاہدرہ سے جالندھر اور وہاں سے ہوشیار پور، کٹھوا جموں جانا چاہتی تھی۔ جالندھر سے اسے ہوشیار پور کے لیے ٹرین تبدیل کرنی تھی۔ فرسٹ کلاس کا ٹکٹ اس نے اس لیے لیا تھا کہ فرسٹ کلاس میں وہ محفوظ رہ سکتی تھی اور اس کلاس کے مسافروں کی چیکنگ کرنا کوئی آسان بات نہیں ہوتی۔ نجمی ٹکٹ لے کر پلیٹ فارم پر انتظار کرنے کی بجائے فرسٹ کلاس کے زنانہ ویٹنگ روم میں آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی ہوشیار نگاہیں چاروں طرف جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے یہی ڈر تھا کہ کہیں وہ سی آئی ڈی والی کملا بھاٹیہ یہاں بھی کسی طرف سے نہ نکل آئے۔ مگر ایسی بات نہیں تھی۔ پندرہ بیس منٹ کی بات تھی۔

پلیٹ فارم کی گھنٹی نے ٹرین کے آنے کا اعلان کیا تو دوسری عورتیں تو باہر نکل گئیں مگر نجمی اندر ہی بیٹھی رہی۔ جب ٹرین پلیٹ فارم پر آ کر کھڑی ہو گئی تو نجمی نکل کر ٹرین کی طرف بڑھی۔ فرسٹ کلاس کا زنانہ ڈبہ انجن کے قریب ہی تھا۔ ان کی سیٹ ریزرو نہیں تھی۔ ٹکٹ بابو نے کہا تھا کہ ایک سیٹ آگے جا کر خالی ہو جائے گی۔ دن کا سفر تھا اس لیے فرسٹ کلاس کی ریزرویشن کے بغیر بھی نجمی کو ٹکٹ مل گیا تھا۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے میں کل چار لمبی نشستیں اور دو آمنے سامنے کے برتھ تھے۔ کچھ مسافر عورتیں اپنے بچوں کے ساتھ بیٹھی تھرمس میں سے ٹھنڈا شربت نکال کر گلاسوں میں ڈال رہی تھیں۔ نجمی بھی ایک طرف کھڑکی کے پاس ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک نظر میں تینوں عورتوں کو دیکھ لیا۔ یہ عام گھریلو قسم کی ساڑھی پوش عورتیں تھیں۔ پھر وہ کھڑکی سے باہر تکنے لگی۔ کن انکھیوں سے وہ برابر دیکھ رہی تھی کہ کہیں کوئی پولیس والا یا پولیس والی تو اس طرف نہیں آ رہی؟ پلیٹ فارم پر کافی رش ہو گیا تھا۔ لوگ اپنا اپنا سامان ڈبوں میں پھینک رہے تھے۔

ٹرین صرف تین چار منٹ ٹھہرنے کے بعد آگے روانہ ہو گئی۔ ٹرین اسٹیشن سے باہر نکلی تو نجمی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب اس کے سامنے ایک طویل سفر تھا۔ جالندھر میں اسے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ پہچان نہ لی جائے لیکن اتنا خطرہ تو اسے مول لینا ہی تھا۔ ٹرین ایکسپریس تھی اور چھوٹے چھوٹے اسٹیشن چھوڑتی چلی جا رہی تھی۔ راج پورہ ٹھہری۔ اس کے بعد سرہند شریف اور پھر لدھیانے تک دوڑتی چلی گئی۔ سفر خیریت سے کٹ رہا تھا۔ فرسٹ کلاس ہونے کی وجہ سے کمپارٹمنٹ میں کوئی

نہیں آیا تھا۔ لدھیانہ میں لنچ تھا۔ ٹرین لنچ کے لیے چند منٹ زیادہ رکی رہی۔ نجمی نے ڈبے میں ہی لنچ کیا۔ ساتھی عورتوں نے اس دوران نجمی سے کافی باتیں کر لی تھیں۔ نجمی کو انھیں الو بنانا آتا تھا۔ انھیں ایک نئی کہانی سنا ڈالی۔ لدھیانہ سے آگے جالندھر آتا ہے۔ جالندھر ٹرین رکی تو نجمی نے کھڑکی کے نیم نسواری رنگ کے شیشے میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ پلیٹ فارم پر کافی رش تھا۔ کچھ سپاہی بھی نظر آئے لیکن ڈبے میں کوئی نہ آیا۔ یہاں سے نجمی نے ٹرین بدل کر ہوشیار پور جانے والی گاڑی پکڑنی تھی۔ جب ٹرین کے چلنے میں دو چار منٹ رہ گئے تو نجمی ڈبے سے اتر گئی۔

اترتے ہی اس نے سیدھا فرسٹ کلاس زنانہ ویٹنگ روم کا رخ کیا۔ وہاں جا کر منہ ہاتھ دھویا پھر اندر جو ریلوے کی بوڑھی ملازمہ تھی اس سے ہوشیار پور جانے والی گاڑی کے بارے میں پوچھا اس نے کہا کہ میں باہر جا کر بابو سے پتہ کرتی ہوں۔

نجمی نے اسے دس روپے انعام دے کر کہا۔ "جلدی پتہ کر کے آؤ کہ ہوشیار پور جموں کو گاڑی کب چلے گی۔؟"

چھ سات منٹ بعد اس عورت نے آ کر نجمی کو بتایا کہ جموں کی گاڑی شام پانچ بجے یہاں سے چلے گی۔

نجمی نے دیوار پر لگا کلاک دیکھا۔ ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ کیا وہ ایک گھنٹہ ویٹنگ روم میں ہی گزار دے؟ نجمی ویٹنگ روم سے نکل کر فرسٹ کلاس کے ریفریشمنٹ روم میں آ گئی جو تقریباً خالی پڑا تھا۔ اس نے چائے اور کچھ سینڈوچ منگوائے اور چاروں طرف سے پوری طرح باخبر رہتے ہوئے چائے پینے اور سینڈوچز کھانے لگی۔ ہوشیار پور جانے والی ٹرین میں ابھی کافی وقت تھا۔ نجمی ریفریشمنٹ روم میں ہی بیٹھی رہنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے مزید چائے اور سینڈوچ منگوا لیے۔ یہ ریفریشمنٹ روم زنانہ نہیں تھا۔ دو ایک مسافر اندر آ کر اس دوران بیٹھے بھی تھے لیکن انھوں نے نجمی کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔

نجمی چائے کا دوسرا پیالہ بنا رہی تھی کہ یونہی اس کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ چائے کی کیتلی اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ دروازے میں گرجن سنگھ کھڑا نجمی کی طرف ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو گئی ہو۔ نجمی چاہتی تھی کہ بیٹھے بیٹھے اچانک غائب ہو جائے مگر

وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ یہ بات اس کے اختیار میں نہیں تھی۔ گرجن سنگھ آہستہ آہستہ چلتا اس کے قریب آ کر رک گیا۔ دونوں ہاتھ جوڑے اور بولا "تم نے مجھے پہلے بتا دیا تھا جی۔ میں کوئی تمھارا دشمن تو نہ تھا۔"

نجمی نے کیتلی میز پر رکھ دی اور چہرہ نیچے کر کے ایک ہاتھ سے اپنے ماتھے کو دباتے ہوئے بولی "مجھے معاف کر دو۔ مگر میں مجبور تھی۔ تمھیں تو میرے بارے میں سب معلوم ہو ہی گیا ہوگا۔"

چہرہ اٹھا کر اس نے گرجن سنگھ کو دیکھا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ گرجن سنگھ ساتھ والی خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک بار اس نے پیچھے گردن گھما کر دروازے کی طرف بھی دیکھا۔ نجمی کہہ رہی تھی "کیا میں مجبور نہیں تھی۔ اگر تم میری جگہ پر ہوتے تو کیا ایسا نہ کرتے؟"

گرجن سنگھ نے ایک ہاتھ سے اپنی بندھی ہوئی داڑھی کو اوپر چڑھاتے ہوئے کہا "چندا جی تم نے جو کچھ کیا میں کچھ نہیں کہوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ تم چندا بھی نہیں ہو بلکہ مسلمان ہو اور تمھارا نام نجمی ہے اور پولیس تمھاری تلاش میں ہے۔"

گرجن سنگھ نے دوبارہ دروازے کی طرف دیکھا اور کسی قدر گھبراہٹ سے بولا "پولیس اسی وقت بھی ادھر ہی آ رہی ہے۔ شاید اسے تمھارا پتہ چل گیا ہے۔"

اب نجمی بھی گھبرا گئی۔ گرجن سنگھ اٹھتے ہوئے بولا۔

"نجمی جی میرے پیچھے آؤ میں تمھیں یہاں سے نکالنے کی کوشش کروں گا۔ جلدی کرو۔"

نجمی اٹھی دس روپے کا نوٹ میز پر رکھ دیا اور گرجن سنگھ کے پیچھے پیچھے ریفریشمنٹ روم کے باتھ روم کی طرف چل پڑی۔

....

جالندھر ریلوے اسٹیشن کے اس ریفریشمنٹ روم کے باتھ روم کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جو اسٹیشن کے پوسٹ آفس کے احاطے میں کھلتا تھا۔ گرجن سنگھ کو اس راستے کا علم تھا جب نجمی گرجن سنگھ کے ساتھ ریلوے پوسٹ آفس کے نیم کے پیڑ والے احاطے میں آئی تو اسے خیال آیا کہ کہیں گرجن سنگھ کی بھی نیت تو نہیں بدل گئی۔

اس پر تو نجمی کا سارا ماضی کھل چکا ہوگا۔ دلی پولیس نے اسے نجمی کا سارا ریکارڈ بتا دیا ہوگا۔ آخر وہ سکھ ہے اور ہندوستانی ہے پولیس نے اسے یہ بھی بتا دیا ہوگا کہ نجمی عرف چندا بائی کا تعلق ندیم نام کے ایک نام نہاد پاکستانی جاسوس سے بھی رہا ہے جو بارڈر کراس کر کے فرار ہو چکا ہے اور نجمی عرف چندا بھی انڈیا میں رہ کر پاکستان کے لیے جاسوسی کرتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ گرجن سنگھ بھی اس کی تلاش میں آیا ہو اور اب اسے اپنے بچھائے ہوئے جال میں پھنسانے لے جا رہا ہو۔

نجمی کے قدموں کی رفتار سست ہو گئی گرجن سنگھ نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور قریب آ کر بولا۔

"نجمی جی! کیا تم پولیس کے ہتھے چڑھنا چاہتی ہو؟ یقین کرو پولیس تمھارے پیچھے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئی ہے وہ ادھر بھی آ سکتی ہے جلدی کرو چلو۔"

گرجن سنگھ کے لہجے میں وہ مکاری اور عیاری نہیں تھی جو نجمی اس سے پہلے کئی ہندو نام نہاد دوستوں میں دیکھ چکی تھی۔ اس کے دل نے کہا نہیں گرجن سنگھ دھوکے باز نہیں ہے وہ نجمی کے ساتھ دھوکا نہیں کرے گا اگر اسے نجمی کو پکڑنا ہوتا تو وہیں پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیتا وہ منافقت

نہیں کرے گا۔ نجمی کے قدم ایک بار پھر تیز ہو گئے۔

گرجن سنگھ نے ریل بازار میں آ کر ایک خالی ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور نجمی کو اس میں بٹھا کر ڈرائیور سے کہا " ماڈل ٹاؤن چلو۔"

جالندھر میں لاہور سے آئے ہوئے ہندوؤں سکھوں نے مل کر ایک نئی بستی ماڈل ٹاؤن کے نام سے بنائی تھی آزادی کے بعد جالندھر کی پہلی ماڈرن اور مضافاتی بستی تھی اس میں سڑکیں کشادہ تھیں اور پھل دار درخت لگائے گئے تھے۔ مکان کوٹھیوں کی طرز کے تھے اور زیادہ تر مالک مکان ہی رہائش پذیر تھے۔

ٹیکسی میں گرجن سنگھ نے نجمی سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ ماڈل ٹاؤن کی ایک چھوٹی سی کوٹھی کے احاطے میں اتر گیا۔ اس کوٹھی میں آم کے درخت تھے اور گیٹ پر صرف کوٹھی کا نمبر ہی لکھا ہوا تھا۔ گرجن سنگھ نجمی کو کوٹھی کے ایک اونچی چھت والے مختصر سے کمرے میں لے گیا جہاں دیوار کے ساتھ پلنگ اور آتشدان کے آگے صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ فرش پر پرانا قالین بچھا ہوا تھا۔ نجمی صوفے پر بیٹھ گئی۔ گرجن سنگھ نے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی لگائی تو نجمی نے آنکھیں ذرا سی سکیڑ کر گرجن سنگھ کی طرف دیکھا۔ گرجن سنگھ پر اس کا کوئی ردّعمل ظاہر نہ ہوا۔ شاید اس لیے کہ گرجن سنگھ کا دل صاف تھا وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا اس نے بیٹھنے سے پہلے چھت کا پنکھا چلا دیا تھا۔ گرجن سنگھ جیکٹ کی بجائے ٹی شرٹ اور سفید پتلون میں ملبوس تھا۔ بیٹھتے ہی دونوں ہاتھوں کو آہستہ ملتے ہوئے بولا۔

" آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ آپ ایک مسلمان ہیں۔ پاکستان سے آ کر کلکتے رہنے لگی تھیں۔ پھر چندا ڈاکو بن گئی۔ کئی خون کیے۔ پولیس تو کہتی تھی کہ آپ پاکستان کی جاسوس بھی ہیں مگر میرا دل نہیں مانتا۔ اگر آپ جاسوس ہوتیں تو اغوا ہو کر مرہٹہ کاٹل کے قید خانے میں نہ پہنچ جاتیں۔ جاسوسوں کے تو بڑے بازو ہوتے ہیں۔"

نجمی گرجن سنگھ کی باتیں خاموشی سے سن رہی تھی اس کا قیاس درست نکلا اسے سب کچھ معلوم ہو چکا تھا وہ کہہ رہا تھا۔

" اس رات پولیس نے میری بہن جی کے گھر چھاپہ مارا وہ گلابی ساڑھی والی ہندنی جاسوس ہی تھی۔

وہ بھی پولیس کے ساتھ آئی تھی ہم تو ہکا بکا رہ گئے تھے پولیس بولی ہمارے گھر میں پاکستانی جاسوس اور قاتل ڈاکو چندا بائی چھپی ہوئی ہے میرا بہنوئی سرجن سنگھ بھی گھبرا گیا۔ ہر مندر کور کے کمرے میں جا کر دیکھا کہ تم وہاں نہیں تھیں ہم تو صاف مکر گئے کہ ہمارا کسی پاکستانی جاسوس سے کوئی تعلق نہیں کسی نے ہم سے دشمنی کی ہے جو ہمارا گھر بتا دیا ہے۔ سرجن سنگھ اور میں پولیس پہ چڑھ گئے۔ پولیس واپس چلی گئی لیکن سرجن سنگھ بولا کہ یہ عورت کون تھی گرجن سنگھ؟ اب میں کیا جواب دیتا۔ میں نے کہا بھاپا جی مجھے خود یقین نہیں آ رہا۔"

سوچ رہی تھی کہ اب اسے کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ وہ اب بھی گرجن سنگھ کو یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ جموں جا رہی ہے گرجن سنگھ کہہ رہا تھا۔

"میرے دل کو بڑا صدمہ ہوا۔ ڈاکو بننا کوئی بری بات نہیں۔ ڈاکو بڑے دلیر ہوتے ہیں اور عورت ڈاکو بن جائے تو مجھے بڑا اچھا لگتا ہے میری نظروں میں ایسی عورت کی عزت بڑھ جاتی ہے۔ عورت یونہی ڈاکو نہیں بنتی اس پر ہزاروں لاکھوں ظلم ہوں تب لاکھوں میں سے ایک عورت مردوں سے بدلہ لینے کے لیے بندوق اٹھاتی ہے۔ ہر کوئی عورت ایسا کہاں کرتی ہے۔ بے چاری عورتیں تو مردوں کے ظلم سہتی جاتی ہیں اور مرتی جاتی ہیں۔ افسوس مجھے اس لیے ہوا کہ تم نے مجھے اپنے راز میں شامل نہیں کیا۔ اگر تم صاف صاف اپنے دل کا حال بتا دیتیں تو میرے دل میں اور عزت بڑھ جاتی۔ اب مجھے پریشانی ہوئی کہ تم دلی میں نہ جانے کہاں بھٹک رہی ہو گی۔ میں تمہاری تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ سارا دن اور ساری رات تمہیں دلی میں جگہ جگہ ڈھونڈتا رہا پھر سوچا کہ شاید تم بارڈر کی طرف نہ نکل گئی ہو میں ٹرین میں بیٹھ کر امرتسر کی طرف چل پڑا اتفاق سے جالندھر پہنچ کر خیال آیا کہ کیوں نہ تمہیں یہاں بھی تلاش کرتا چلوں واہے گورو نے ملاقات کرانی تھی میں جالندھر اتر گیا اب واپس امرتسر جا رہا تھا کہ سوچا ریفریشمنٹ روم میں ہی ایک نظر جھانک کر دیکھ لوں۔ بس میرا دل مجھے تمہاری طرف کھینچے لیے آ رہا تھا اور تم سے ملاقات ہو گئی۔"

جب گرجن سنگھ نے اپنی بات ختم کر دی اور حسب عادت ایک ہاتھ سے اپنی بندھی ہوئی داڑھی کو اوپر چڑھانے لگا تو نجمی نے کہا۔

" سردار جی! تمہارا سلوک شروع ہی سے میرے ساتھ اتنا شریفانہ رہا کہ میں خواہش کے باوجود

تمھیں اپنے بارے میں کچھ نہ بتاسکی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں۔ ندیم لاہور میں میرا کلاس فیلو تھا میں بُرے حالات میں اغوا ہو کر ہندوستان لائی گئی۔ یہاں دربدر کی ٹھوکریں کھاتی کلکتے کے بازارِ حسن میں پہنچا دی گئی۔ ندیم کو میں نے لاہور خط لکھا۔ وہ زائرین کی ایک جماعت میں شامل ہو کر دلی آگیا ویسے اسے انڈیا کا ویزا نہیں مل سکتا تھا اگر وہ پولیس کو خدا کے لیے بغیر ہی مجھ سے ملنے کلکتے آگیا مجھے کوٹھے پر دیکھا تو ششدر رہ گیا بولا میں تمھیں یہاں سے لے کر ہی پاکستان جاؤں گا میں نے کہا میں جب تک اپنے قاتلوں اپنے دشمنوں سے بدلہ نہیں لے لیتی یہاں سے نہیں جاؤں گی بس اس کشمکش میں وقت گزرتا چلا گیا۔ ندیم گرفتار ہو گیا۔ پولیس نے اس پر پاکستانی جاسوس ہونے کا مقدمہ درج کر لیا مجھ سے ایک بدمعاش کا خون ہو گیا پولیس میرے پیچھے بھاگی میں روپوش ہو گئی اور اتفاق سے ایک ڈاکو کے گروہ میں شامل ہو گئی اس ڈاکو کی موت کے بعد میں گروہ کی سردار چندا ڈاکو بن گئی اور میں نے عورتوں پر ظلم کرنے والوں اور ان کی عزتوں کے سودے کرنے والوں —————— کو قتل کرنا شروع کر دیا ندیم اس اثنا میں تنگ آکر بارڈر کراس کر کے واپس پاکستان چلا گیا۔ جب میرے انتقام کی آگ سرد ہو گئی تو بدقسمتی سے مجھے ایسے حالات میں اغوا کر کے بردہ فروشوں کے پاس پہنچا دیا گیا کہ میں بالکل بے بس تھی۔ مجھے بے ہوش کر دیا گیا تھا یوں میں انڈمیان کے جزیرے میں کاٹل کے محل میں آگئی جہاں تم سے ملاقات ہو گئی اور میں نے تم سے درخواست کی کہ مجھے یہاں سے نکالو اپنے آپ کو میں نے سنگھنی اس لیے ظاہر کیا کہ اس طرح سے تمھیں مجھ سے زیادہ ہمدردی ہو جائے گی۔"

گرجن سنگھ بولا۔۔۔ "آپ اپنے آپ کو سنگھنی نہ بھی ظاہر کرتیں تب بھی میں آپ کی ضرور مدد کرتا۔ ایک مصیبت میں پھنسی ہوئی عورت کی مدد کرنا ہر مرد کا فرض ہے۔" نجمی نے سر جھکا لیا اور قالین کے پھولوں کو تکتے ہوئے سوچنے لگی کہ اب یہاں سے کدھر کو اور کیسے جانا ہو گا۔ گرجن سنگھ نے بھی اس سے یہی سوال کر دیا۔

"اب آپ کا کیا ارادہ ہے آپ کدھر جا رہی تھیں؟"

نجمی نے کہا۔۔۔ "میں۔۔۔ میں تو ویسے ہی پولیس سے چھپتی پھر رہی تھی میری تو کوئی بھی منزل

نہیں ہے۔ کلکتے بھی واپس نہیں جا سکتی۔"

گرجن سنگھ اپنے ہاتھوں کو ایسے مَل رہا تھا جیسے پانی سے ہاتھ دھو رہا ہو۔ یہ اس کی عادت تھی کہنے لگا۔

"نجمی جی! ہندوستان میں تو آپ جہاں بھی رہیں گی پولیس آپ کو پکڑ لے گی۔ تم پر کئی قتلوں کے کیس چل پڑیں گے۔ میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ اگر تمھارے گروہ کے لوگ ہندوستان میں موجود ہیں تو ان کے پاس چلی جاؤ۔ وہاں کم از کم پولیس سے تو بچی رہو گی۔"

نجمی نے جواب میں کہا "گرجن سنگھ میرا گروہ بکھر چکا ہے۔ پتہ نہیں باقی لوگ کہاں چلے گئے ہیں۔"

گرجن سنگھ بولا۔۔۔ "پھر تو تمھیں پاکستان اپنے ہونے والے خاوند ندیم کے پاس ہی چلے جانا چاہیے جی۔"

گرجن سنگھ کے منہ سے پاکستان جانے کا سُن کر نجمی کو عجیب سا لگا اس نے کہا۔

"میں پاکستان بھی تو نہیں جا سکتی۔ میں بارڈر کیسے کراس کر سکتی ہوں؟"

گرجن سنگھ کچھ سوچنے لگا پھر اس نے نجمی کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کے ذہن میں کوئی ترکیب آگئی ہو۔ کہنے لگا۔

"ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔"

نجمی گرجن سنگھ کو تکنے لگی گرجن سنگھ کہہ رہا تھا۔

"دس پندرہ دن بعد امرتسر سے سکھوں کا ایک جتھہ ننکانہ صاحب کی یاترا کرنے پاکستان جا رہا ہے اگر تم چاہو تو میں تمھیں اس جتھے کے ساتھ پاکستان لے جا سکتا ہوں۔"

نجمی کے سامنے اچانک جیسے ایک بند دروازہ اپنے آپ کھل گیا اس نے دروازے کی دوسری جانب ایک باغ دیکھا جو سنہری دھوپ میں روشن تھا اور جہاں ندیم ایک درخت کے نیچے کھڑا اسے اپنے پاس بلا رہا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا وہ گرجن سنگھ پر بھروسہ کر سکتی ہے؟ گرجن سنگھ قابلِ اعتبار آدمی تھا۔ لیکن یہ ہندوستان کی سرحد پار کرنے کا مسئلہ تھا راستے میں کئی مشکلیں پیدا ہو سکتی تھیں کیا گرجن سنگھ ایک ایسی عورت کو پاکستان لے جائے گا جس کے

بارے میں پولیس نے یہ پروپیگنڈہ کر رکھا ہے کہ وہ صرف خونی ڈاکو ہی نہیں بلکہ پاکستانی جاسوس بھی ہے اس نے گرجن سنگھ سے کہا۔

"یہ بڑا مشکل کام ہے میرا پاسپورٹ کیسے بنے گا اگر کسی کو پتہ چل گیا تو تم پر بھی مصیبت آ جائے گی پھر پولیس والے یہ تفتیش بھی کریں گے کہ میں تمھاری کون ہوں۔"

گرجن سنگھ اپنی داڑھی کو اوپر چڑھاتے ہوئے کچھ شرماتے ہوئے بولا "آپ جی اگر اجازت دیں تو میں تمھیں اپنی بیوی ظاہر کر کے اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ پھر پولیس انکوائری بھی نہیں کرے گی۔"

نجمی کی آنکھوں کے آگے سے پردہ سا اٹھ گیا ہاں اس نے سوچا اس طریقہ سے وہ آسانی سے پاکستان جا سکے گی۔ اچانک اسے اپنے ساتھی بادل کا خیال آگیا کیا یہ اس کے ساتھ غداری نہیں ہو گی؟ مگر وہ تو خدا جانے پولیس کی حراست سے رہا بھی ہوا ہے یا نہیں اس کے بارے میں تو نجمی کو خدا جانے کچھ ٹھیک طرح سے پتہ بھی نہیں تھا۔ بادل کو اس کے حال پر چھوڑ دو نجمی....

"یہ سنہری موقعہ شاید پھر کبھی نہیں ملے گا۔ گرجن سنگھ قابل اعتبار سکھ ہے وہ تمھیں بڑی آسانی سے سرحد پار کرا دے گا۔ نجمی نے سوچا پھر گرجن سنگھ سے کہا۔

"کیا ایسا ہو سکے گا گرجن سنگھ جی؟ میرا مطلب ہے کہیں تم پر کوئی آفت تو نہیں آ جائے گی کہیں میرے ساتھ تم بھی تو نہیں پکڑے جاؤ گے؟"

گرجن سنگھ بولا... "نجمی جی! میں نے پہلے دن سے آپ کی عزت کی ہے اور اسے مرتے دم تک نبھاؤں گا مجھے جو کچھ بھی کرنا پڑا کروں گا مگر آپ کو پاکستان ضرور پہنچا دوں گا میں پاسپورٹ بھی بنوا لوں گا تمھارا نام میں ہرنام کور ہی لکھواؤں گا۔ یہ سب کچھ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ صرف اپنی اجازت دے دو۔"

نجمی نے کہا "میری طرف سے تمھیں اجازت ہے۔"

گرجن سنگھ صوفے سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

"تو پھر ٹھیک ہے آج ہی امرتسر چلے چلتے ہیں۔ جتھا امرتسر سے روانہ ہونے والا ہے امرتسر میں میرا ایک بچپن کا دوست کرپال سنگھ پاسپورٹ آفس میں ملازم ہے ہندوستان سے سکھوں کا

جو جتھہ پاکستان کے گوردواروں کی یاترا کو جا رہا ہے۔ اس کے لیڈر گیانی جی سے اس کی رشتے داری بھی ہے۔ وہ ہمارے پاسپورٹ بھی بنوا دے گا اور جتھے میں نام بھی درج کرا دے گا۔"

نجمی نے فکر مندی سے کہا۔

"لیکن گرجن! ظاہر ہے میں پاکستان میں رہ جاؤں گی جتھہ جب واپس انڈیا کے باڈر پر پہنچے گا تو تم سے ضرور پوچھا جائے گا کہ تمھاری بیوی ہرنام کور کہاں ہے اس کا تم کیا جواب دو گے؟"

گرجن سنگھ نے بازو ہلا کر کہا۔

"یہ بعد میں دیکھ لوں گا تم تیاری کرو ہم تھوڑی دیر بعد امرتسر کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ اور ہاں یہاں سے ہی تمھیں پوری سکھنی بن کر میرے ساتھ چلنا ہوگا میں تمھارے لیے کڑا اور کرپان اور زرد دوپٹہ کہیں سے لاتا ہوں تم یہاں سے باہر مت جانا۔ یہ جگہ بالکل محفوظ ہے میں جلدی یہ چیزیں لے کر آ جاؤں گا اندر سے کنڈی لگا لینا ویسے میں باہر سے تالا بھی لگاتا جاؤں گا۔"

گرجن سنگھ چلا گیا تو نجمی کو بادل کا خیال ستانے لگا اس کے ضمیر میں کانٹا سا کھٹکنے لگا تھا۔ اسے بادل کو یوں چھوڑ کر نہیں جانا چاہیئے لیکن بادل تو ہندوستان ہی کا باشندہ ہے وہ تو یہیں رہے گا اور پھر بادل بھی تو اسے باڈر کراس کرانے کے ہی جتن کر رہا تھا۔ فرض کر لیا کہ اگر بادل ابھی تک پولیس کی حراست میں ہے تو نجمی اسے وہاں چھڑا تو نہیں سکے گی اور اگر وہ پولیس کی حراست سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے تو نجمی اسے اتنے بڑے ملک میں تلاش بھی نہیں کر سکتی یوں نجمی کے ذہن نے اپنے منطقی استدلال سے اس کے ضمیر کو مطمئن کر دیا اور وہ خوش ہو گئی کہ اب وہ جلد پاکستان پہنچ کر ندیم سے مل سکے گی اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ندیم کے ساتھ شادی کر کے کسی دوسرے ملک میں جا کر آباد ہو جائے کیونکہ اس کے رشتے دار اس کو پاکستان میں چین سے نہیں بیٹھنے دیں گے کوئی پون گھنٹے بعد گرجن سنگھ واپس آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا اس میں سے لوہے کا ایک کڑا، کالی پٹی والی کرپان اور بسنتی دوپٹہ نکال کر گرجن سنگھ نے نجمی کو دیا اور بولا "یہ کڑا اور کرپان پہن کر سر پر دوپٹہ اوڑھ لو امرتسر میں میں تمھیں اپنے دوست کرپال سنگھ کی بیوی سے اپنی پتنی.. ہرنام کور کے نام سے ملواؤں گا تم بھی ان پر یہی ظاہر کرنا کہ تم میری بیوی ہو اور ایک ماہ پہلے دلی میں ہماری شادی ہوئی تھی تم بہت کم بات کرنا۔ ساری باتیں میں کروں گا۔"

نجمی نے اپنی کلائی میں کڑا اور گلے میں کرپان ڈال لی سر پہ دوپٹہ اوڑھ لیا اب وہ پوری سنگھنی لگ رہی تھی۔ گرجن سنگھ کہنے لگا۔

"ٹرین ایک گھنٹے بعد امرتسر جائے گی کیوں نہ ہم لاری پکڑ لیں؟"

نجمی نے کہا... "نہیں نہیں لاری میں خطرہ ہے ٹرین ہی ٹھیک رہے گی۔"

"جیسے تمہاری مرضی" گرجن سنگھ ہاتھوں کو رگڑتے ہوئے بولا "تو پھر میں چلتا ہوں آدھے گھنٹے بعد آؤں گا۔"

جالندھر سے تیسرے پہر جو گاڑی امرتسر کے لیے چلی وہ دلی سے آ رہی تھی اس میں کافی رش تھا لیکن گرجن سنگھ نے مسٹر اور مسز گرجن سنگھ کے نام سے سیکنڈ کلاس میں پہلے ہی سے دو... نشستیں ریزرو کروا لی تھیں پلیٹ فارم پر کافی رش تھا۔ نجمی ہرنام کور کے روپ میں گرجن سنگھ کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ کلائی کے کڑے کرپان اور بسنتی دوپٹے کی وجہ سے وہ بالکل سنگھنی لگ رہی تھی۔ سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں ہندو سکھ عورتیں اور مرد پہلے سے بیٹھے تھے۔ گرجن سنگھ بھی نجمی کو ساتھ لے کر ڈبے میں بیٹھ گیا۔ ٹرین امرتسر کے لیے روانہ ہو گئی۔ امرتسر تک صرف چالیس میل کا فاصلہ تھا ٹرین بھی ایکسپریس قسم کی تھی۔ چار بجے یہ لوگ امرتسر پہنچ گئے۔ اسٹیشن سے دونوں ایک سائیکل رکشا پر بیٹھے اور رکشا شہر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں گرجن سنگھ نے اپنی فیملی کے بارے میں نجمی کو ضروری باتیں سمجھا دی تھیں۔

"اپنے بارے میں صرف یہی کہنا کہ تم انڈیمان میں اپنے باپ کے پاس رہتی تھیں۔ وہیں تمہاری شادی مجھ سے ہو گئی اور اب گوردواروں کی یاترا کے لیے اپنے خاوند کے ساتھ انڈیا آئی ہو"

نجمی نے ساری باتیں اپنے ذہن میں پکا لی تھیں ویسے بھی وہ ایک تجربہ کار اور ہوشیار عورت تھی اور ہر قسم کے بھیس کو بڑی خوش اسلوبی سے نبھا سکتی تھی خطرہ صرف اسے پولیس کی جانب سے تھا کہ کہیں پاسپورٹ آفس میں کوئی اس کی شکل کو پہچان کر پولیس کو خبر نہ کر دے۔ اس کے لیے گرجن سنگھ نے یہ کہہ کر تسلی کر دی تھی کہ وہ اس کی تصویر سر پر دوپٹہ اوڑھا کر اس طرح سے اتروائے گا کہ کوئی بھی اسے آسانی سے پہچان نہ سکے گا۔ امرتسر میں گرجن سنگھ کے پاسپورٹ آفس والے دوست کا گھر مجیٹھہ روڈ پر تھا کمپنی باغ امرتسر میں گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول کے

سامنے ایک سڑک مال روڈ سے مشرق کی طرف جاتی ہے یہ مجیٹھہ روڈ کہلاتی ہے۔ اس سڑک کی دونوں جانب اونچے اونچے جامن کے درخت ہیں برسات کے موسم میں ان درختوں پر سے ٹپ ٹپ جامنیں گرتی رہتی ہیں آج کل یہ علاقہ کافی آباد ہو گیا ہے اور میڈیکل کالج سے بھی آگے تک آبادی چلی گئی ہے میڈیکل کالج کے پاس ہی کرپال سنگھ کا گھر تھا اس گھر میں گرجن سنگھ اور نجمی کا بڑی گرم جوشی سے استقبال ہوا کرپال سنگھ کی بیوی اور دو چھوٹے بچے تھے گھر معمولی قسم کا تھا گرجن سنگھ نے جاتے ہی ان لوگوں کو اپنی شادی اور اب بیوی کے ساتھ پاکستان کی یاترا کے بارے میں سب کچھ بتا دیا کرپال سنگھ کی بیوی نے نجمی کو تاری والا دوپٹہ تحفے میں دیا۔ کرپال سنگھ نے پچاس روپے منہ دکھائی دی جو نجمی نے ہرنام کور کی حیثیت سے لے لی۔

رات کے کھانے کے بعد گرجن سنگھ نے کرپال سنگھ سے پاسپورٹ کی بات کرتے ہوئے کہا۔

"میرے پاس تو پاسپورٹ ہے مگر میری بیوی ہرنام کور کا پاسپورٹ ابھی نہیں بنایا گیا۔ جتھے کے پاکستان جانے میں تھوڑے دن رہ گئے ہیں میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر میری بیوی کا پاسپورٹ بنوا دو اور ساتھ ہی گیانی جی سے مل کر اس جتھے میں ہم دونوں کا نام بھی درج کرا دو کیونکہ اگر یہ چانس ہاتھ سے نکل گیا تو پھر مجھے دو سال تک چھٹی نہ مل سکے گی۔"

کرپال سنگھ گلاس ہاتھ سے رکھتے ہوئے بولا۔

"گرجن سیاں! تو فکر کیوں کرتا ہے میرے یار! بھابھی کا پاسپورٹ بھی بن جائے گا اور جتھے میں تم دونوں کا نام بھی شامل کرا دوں گا یہ کونسی بڑی بات ہے لو۔ اپنے گلاس میں ڈالو"

کرپال سنگھ نے دوسرے ہی دن نجمی کی پاسپورٹ سائز کی تصویریں بنوائیں اور ضروری باتیں معلوم کر کے آفس چلا گیا اس نے دو ایک دن میں نجمی کا ہرنام کور کے نام سے پاسپورٹ بنوا دیا۔ نجمی کے... پاسپورٹ کی تصویریں بالکل سنگھنی کی معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بڑی خوش ہوئی اب صرف پاکستان جانے والے سکھوں کی جماعت میں اس کا نام درج کروانا باقی تھا کرپال سنگھ اسی شام جتھے کے لیڈر اور اپنے قریبی رشتے دار گیانی جی سے ملنے اس کے گھر پر چلا گیا اسے بتایا کہ گرجن سنگھ اپنی پتنی کے ساتھ کالے پانی سے یاترا کی خواہش لے کر آیا ہے اس کا نام جتھے میں شامل نہ ہوا تو پھر کئی سالوں تک وہ یہ یاترا نہ کر سکے گا۔ گیانی جی نے فوراً گرجن سنگھ اور اس کی بیوی ہرنام کور کا نام لسٹ میں شامل کر

لیا اور کرپال سنگھ سے کہا کہ وہ کل ان کے پاسپورٹ پہنچا دے۔ نجمی اور گرجن سنگھ کو جب اس خوش خبری کا علم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ رات کو گرجن سنگھ اور نجمی کو ایک کمرے میں چارپائی ڈال دی گئی۔ گرجن سنگھ نے فرش پر بستر لگا لیا اور نجمی سے کہا۔

"میں یہاں سو جاؤں گا آپ چارپائی پر سوئیں اب صبح کرپال کو پاسپورٹ دینے ہوں گے میرا نہیں خیال کہ پولیس تمھاری شکل پہچانے تمھارا کیا خیال ہے نجمی جی؟"

نجمی نے بٹوے میں سے اپنا پاسپورٹ نکال کر اپنی تصویر غور سے دیکھی اور پھر گرجن سنگھ کو دکھاتے ہوئے بولی۔ دوپٹے سے سر ڈھانپنے کی وجہ سے میرا حلیہ کافی بدل گیا ہے پولیس کے پاس جو میری تصویر ہے اس میں میں نے ساڑھی پہن رکھی ہے اور کانوں میں لمبے لمبے کانٹے بھی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ پولیس کو یہ تصویر دیکھ کر میرا خیال نہیں آئے گا۔"

گرجن سنگھ غور سے میری تصویر دیکھ رہا تھا پھر نجمی کو پاسپورٹ واپس کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"اس تصویر میں تم کافی بدلی ہوئی لگتی ہو۔"

نجمی نے پاسپورٹ لے کر اپنے پرس میں رکھ لیا۔ گرجن سنگھ چارپائی سے ایک قدم کے فاصلے پر فرش پر بستر لگائے نیم دراز تھا چھت کا پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا تھا رات کے گیارہ بج رہے ہوں گے نجمی نے کہا۔

"مجھے یہی خیال آتا ہے کہ واپسی پر جب تم اکیلے بارڈر کراس کرنے لگو گے تو کسٹم والوں کو کیا جواب دو گے؟ کہ تمھاری بیوی کہاں ہے؟"

گرجن سنگھ لیٹے لیٹے بولا "نجمی جی! یہ باتیں تم مجھ پر چھوڑ دو میں جانوں اور میرا کام۔" پھر نجمی کی چارپائی کی طرف پہلو بدل کر کہنے لگا۔

"تم لاہور میں مجھ سے جدا ہو جاؤ گی نا؟ لاہور کی تو ساری سڑکوں کا آپ کو پتہ ہو گا وہ تمھارا اپنا شہر جو ہوا میرا خیال ہے کہ قلعے والے گوردوارے سے ہم انار کلی کی سیر کو جائیں گے بس وہاں سے تم مجھ سے الگ ہو جانا۔"

نجمی کو عجیب سا لگ رہا تھا اسے گرجن سنگھ سے محبت تو کبھی نہیں ہوئی تھی مگر وہ اس

کردار سے بڑی متاثر ہوئی تھی وہ جانتی تھی کہ جب وہ اپنی "بیوی" کے بغیر بارڈر کراس کرنے لگے گا تو اسے بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ بات کوئی معمولی نہیں ہو گی کہ آدمی بیوی کے ساتھ یاترا کرنے جاتا ہے اور واپسی پر اس کی بیوی اس کے ساتھ نہیں ہے لیکن نجمی اس ضمن میں اس کی کوئی مدد بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے گرجن سنگھ کی باتیں سننے کے بعد کہا۔

"ہاں لاہور میرا شہر ہے۔ مجھے معلوم ہے انار کلی سے نکل کر مجھے کدھر جانا ہو گا۔ ہمارا پرانا گھر رنگ محل انار کلی سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

گرجن سنگھ بولا۔۔۔ "میں صرف دوبار لاہور گیا ہوں۔ لاہور مجھے بڑا پسند ہے بڑے اچھے لوگ ہیں لاہور کے۔ اچھا زندگی رہی تو پھر کبھی تمھیں ملنے لاہور ضرور آؤں گا اب میں سو رہا ہوں مجھے نیند آ رہی ہے۔"

اور تھوڑی ہی دیر بعد گرجن سنگھ کے خراٹوں کی آواز گونجنے لگی۔

سکھوں کے جتھے کی پاکستان روانگی کا دن قریب آ رہا تھا۔ نجمی گرجن سنگھ کے ساتھ اس کے دوست کرپال سنگھ کے گھر پر ہی مقیم تھی جتھے کی روانگی میں ایک دن باقی رہ گیا تھا کہ کرپال سنگھ نے بتایا کہ امرتسر کے دربار صاحب میں گیانی جی نے جتھے میں شریک ہونے والے تمام لوگوں کو بلایا ہے یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی گرجن سنگھ نے نجمی کو ساتھ لیا اور دربار صاحب کی طرف روانہ ہو گیا۔ ٹیلر روڈ سے دربار صاحب کافی دور تھا انھوں نے رکشا پکڑا اور ہال بازار چوک ملکہ وکٹوریہ اور جلیانوالہ باغ سے گزرتے ہوئے دربار صاحب پہنچ گئے وہاں اکال تخت کے سامنے تمبو قناطیں لگی تھیں۔ وہ سارے سکھ مرد عورتیں قناتوں کے اندر دریوں پر بیٹھے تھے جنھیں ایک دن بعد جتھے کی شکل میں یاترا کے لیے پاکستان روانہ ہونا تھا۔ گرجن سنگھ اور نجمی بھی ایک طرف ہو کر دری پر بیٹھ گئے۔ کرپال سنگھ نے جتھے کے سردار گیانی صاحب کے نام ایک پرچی لکھ کر دے دی تھی کہ یہ میرے دوست گرجن سنگھ اور اس کی پتنی ہرنام کور ہے۔ گیانی صاحب لمبی سفید ڈاڑھی والے لحیم و شحیم سکھ تھے جنھوں نے زرد چولا پہن رکھا تھا وہ باری باری ہر یاتری کو اکال تخت کے ساتھ والے چھوٹے سے کمرے میں بلاتے ان کو ضروری باتیں بتلاتے کہ پاکستان جا کر انھیں سوائے گوردواروں کے اور کسی جگہ نہیں

جانا ہوگا اور ہندوستان کے بارے میں کوئی غیر ذمے داری کی بات زبان سے نہیں نکالنی ہوگی۔ ایک طرح کی بریفنگ تھی جو ضروری ہوتی ہے گیانی صاحب کرسی میز لگائے بیٹھے تھے ان کے ساتھ دوسری کرسی پر علاقے کا تھانیدار آتمارام بھی بیٹھا تھا جو یاتری آتا آتمارام تھانیدار اسے سر سے پاؤں تک غور سے اسے دیکھتا اور اگر کوئی سوال کرنا ہوتا تو وہ بھی کر لیتا گرجن سنگھ اور نجمی کی باری بھی آ گئی۔

نجمی نے اکالی سکھوں والی نیلی شلوار قمیص پہن رکھی تھی نیلے رنگ کی چادر سر پر تھی اور کمر میں کرپان لٹک رہی تھی۔ گرجن سنگھ نجمی کو لے کر گیانی صاحب کے سامنے حاضر ہو گیا۔ دونوں نے ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال کہا گیانی صاحب نے بھی ست سری اکال کہا اور رجسٹر پر نیل سے نشان لگاتے ہوئے بولے۔

”گرجن سنگھ ولد شیرا سنگھ۔“

”ہاں جی“، گرجن سنگھ نے جواب دیا۔

پھر گیانی صاحب نے نجمی کی طرف بے نیازی سے دیکھا اور کہا۔

”یہ تمھاری پتنی ہرنام کور ہے؟“

”ہاں جی۔“

”تم لوگ انڈیا سے آئے ہو؟“ گیانی نے پوچھا

”ہاں جی۔“ گرجن سنگھ نپے تلے انداز میں جواب دے رہا تھا۔

نجمی سنگھنی کی طرح ہاتھ باندھے گرجن سنگھ کے ساتھ ہی خاموش کھڑی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ باوردی تھانیدار آتمارام اسے ضرورت سے زیادہ دلچسپی اور تجسس کے ساتھ گھور رہا ہے اس کا ماتھا ٹھنکا پھر خیال آیا کہ ممکن ہے جس طرح بعض مردوں کو عورتوں کی طرف گھور کر دیکھنے کی عادت ہوتی ہے یہ بھی ایسا ہی مرد ہو مگر وہ تھانیدار تھا اور اس کی نظروں میں تیرتا ہوا شک نجمی کو صاف دکھائی دے رہا تھا۔ گرجن سنگھ گیانی صاحب کے مختصر سوالوں کا جواب دینے میں مصروف تھا۔

اچانک تھانیدار آتمارام نے پوچھا

”آپ لوگ کلکتے میں بھی رہے ہیں؟“

کلکتے کا نام سنتے ہی نجمی کے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔

گرجن سنگھ نے کہا... ”جی کلکتے ایک دو بار گیا ضرور ہوں مگر وہاں رہا کبھی نہیں۔“

تھانیدار نے اب نجمی کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

”بی بی! تم شادی سے پہلے کبھی کلکتے گئی ہو؟“

نجمی نے بڑے بھولے پن سے جواب دیا۔

”جی نہیں میں کلکتے کبھی نہیں گئی۔“

اب گیانی صاحب نے تھانیدار کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کیا بات ہے آتمارام جی۔ آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”ویسے ہی گیانی جی۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر تھانیدار آتمارام تیز تیز قدموں سے دربار صاحب کے گھنٹہ گھر والے دروازے کی طرف جا رہا تھا نجمی نے گرجن سنگھ سے کہا ”گرجن سنگھ مجھے یقین ہے اس ہندو تھانیدار نے مجھے پہچان لیا ہے۔“

گرجن سنگھ گھنٹہ گھر والے گیٹ کی طرف دیکھنے لگا۔

”تمھیں کیسے یقین ہے؟“

نجمی نے کہا... ”بس مجھے یقین ہے یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیئے۔“

گرجن سنگھ مسکرانے لگا پھر دونوں ہتھیلیوں سے اپنی بندھی ہوئی ڈاڑھی کو اوپر چڑھاتے ہوئے بولا۔

”آپ کو وہم ہو گیا ہے تھانیدار اپنے کسی کام سے گیا ہوگا اسے کیا پتہ کہ تم کون ہو اچھا میں ذرا ماتھا ٹیک آؤں تم یہیں بیٹھنا میں ابھی آتا ہوں۔“

اس سے پہلے کہ نجمی گرجن کو جانے سے روکتی وہ قناتوں سے نکل کر پراکرما والی عمارت میں داخل ہو چکا تھا نجمی کی نگاہیں بے اختیار گھنٹہ گھر والے دروازے کی طرف اٹھ گئیں یہ دروازہ اکال تخت سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ قناتوں سے باہر آ کر سامنے جو بیری کا پرانا سوکھا ہوا درخت

تھا اس کی اوٹ میں آکر کھڑی ہوگئی اچانک اس نے دیکھا دروازے میں سے تھانیدار آتمارام چلا آتا ہے اس کے ساتھ چار پولیس کانسٹیبل ہیں جنھوں نے سر پہ رومال باندھ رکھے ہیں نجمی خاموشی سے ان سکھ عورتوں کے ہجوم میں شامل ہوگئی جو دربار صاحب کے درشنی ڈیوڑھی والے دروازے کی طرف جا رہی تھی اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تھانیدار آتمارام چلا آتا ہے اس کے ساتھ چار پولیس کانسٹیبل چلے آتے ہیں جو تیز تیز قدموں سے قناتوں کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ وہ نجمی عرف چندا ڈاکو کو گرفتار کرنے آئے تھے۔ نجمی نے اپنی رفتار تیز کر دی اور عورتوں کے ہجوم کو پیچھے چھوڑتی ہوئی درشنی ڈیوڑھی والے دروازے سے نکل کر امرتسر کے گنجان بازار میں آگئی اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ کونسا محلّہ تھا۔ یہاں ہندوؤں اور سکھوں کی دکانیں تھیں اور اتنا رش تھا کہ نجمی کے لیے چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ جتنی جلدی ہو سکے دربار صاحب کے علاقے سے نکل جانا چاہتی تھی اسے معلوم تھا کہ اب تک تھانیدار آتمارام اور اس کے سپاہی نجمی کی تلاش میں دربار صاحب کا چپہ چپہ چھان رہے ہوں گے اور ممکن ہے کہ وہ درشنی ڈیوڑھی کی طرف بھی آجائیں اس دروازے کا نام نجمی نے ضرور سن رکھا تھا مگر وہ بالکل نہیں جانتی تھی کہ یہ بازار آگے امرتسر کے کونسے علاقے کی طرف نکلتا ہے۔ تنگ پیچدار بازار ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا نجمی سکھنی کے بھیس میں چلتی چلی جا رہی تھی۔ ہر قدم پر خطرہ تھا کسی بھی لمحے کوئی پیچھے سے اسے پکڑ سکتا تھا۔

٭٭٭

امرتسر شہر کے یہ بازار بڑے گنجان تھے۔ نجمی نے اس خیال سے کہ اس پر کسی کو شک نہ ہو اپنی رفتار ماحول کے مطابق کر لی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ پیچھے دیکھ لیتی تھی کہ کہیں کوئی پولیس والا تو اس کے پیچھے نہیں لگا ہوا۔ ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ نجمی کے اندازے کے مطابق پولیس اس کا پیچھا نہیں کر رہی تھی۔ اب یہ سوال اسے پریشان کر رہا تھا کہ وہ جا کہاں رہی ہے؟ امرتسر شہر اس کے لیے ایک اجنبی شہر تھا۔ واپس دربار صاحب وہ نہیں جا سکتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ... تھانیدار آتمارام نے اسے پہچان لیا ہے کہ وہ گرجن سنگھ کی بیوی پرنام کور نہیں بلکہ ہندوستان کی مشہور ڈکیت چندا بائی ہے جس پر پاکستان کی جاسوس ہونے کا بھی الزام ہے۔ ان حالات میں گرجن سنگھ بہت بڑی مصیبت میں پھنس سکتا ہے۔ نجمی کو افسوس ہونے لگا کہ اس نے محض اپنی ذاتی غرض کے لیے اس سیدھے سادے انسان کو پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ لیکن اس سیدھے سادے انسان یعنی گرجن سنگھ کی مدد کے بغیر نجمی اس کالے پانی کے جزیرے والے خونی محل سے نکل بھی نہیں سکتی تھی۔ بازار تنگ تھے اور لوگ کافی تعداد میں آجا رہے تھے۔ دکانیں کھلی تھیں۔ اس ہجوم کی وجہ سے نجمی بغیر کسی کی نظروں میں آئے وہاں سے گزرتی چلی گئی۔ بازار جلدی جلدی موڑ گھوم جاتے تھے یوں نجمی کئی بازاروں میں سے گزر گئی تھی۔ ایک بازار سے وہ باہر نکلی تو سامنے کھلا چوک تھا اور چوک کے بیچ میں ملکہ وکٹوریہ کا مجسمہ لگا تھا۔ ساتھ ہی ایک چھوٹا سا باغ تھا جس کا نام کمپنی باغ تھا۔ نجمی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ انجانے میں امرتسر شہر کی پولیس کوتوالی کی طرف چلی جا رہی ہے۔ ذرا آگے جا کر جب اسے پولیس کی بیرکیں اور اونچی چھت ہوئی کوتوالی کی ڈیوڑھی نظر آئی تو جلدی سے دوسری سڑک پر ہو گئی اور تیز تیز

چلنے لگی۔ اس نے سر اچھی طرح سے ڈھانپ رکھا تھا۔ ایک بات یقینی تھی کہ پولیس نے شہر میں اس کی تلاش شروع کر دی ہو گی اسے جلدی کسی جگہ پناہ لینے کی ضرورت تھی مگر سوال یہ تھا کہ وہ کہاں پناہ لے؟

وہ کیسری باغ والی پانی کی بڑی ٹینکیوں کے پیچھے سے ہو کر بازار رنگریزاں میں آگئی تھی۔ یہاں سے وہ مشرق کی طرف چل پڑی۔ یہ سڑک قدرے کشادہ تھی آگے شہر کا دروازہ آگیا یہ چاٹی ونڈ دروازہ تھا۔ دروازے کے باہر آ کر اس نے فصیل شہر کے ساتھ جو گندہ بدرو تھا اس سے ذرا ہٹ کر چلنا شروع کر دیا۔ آگے دروازہ مہان سنگھ آ کر گزر گیا۔ اب نجمی کی بائیں جانب شہر کی فصیل والے مکان تھے اور دائیں جانب ہاتھی گراؤنڈ اور اس کے پیچھے شریف پورے کی آبادی تھی۔ یہاں بھی مسلمان رہتے تھے اور اب یہاں زیادہ آبادی سکھ شرنارتھیوں کی تھی جنھوں نے اس کا نام سنگھ پورہ رکھ دیا تھا لیکن عام لوگ اب بھی اسے شریف پورہ ہی کہتے تھے۔ نجمی ان سارے علاقوں سے بے خبر تھی۔ اب آگے رام باغ کا پولیس اسٹیشن تھا۔ نجمی نے دور سے چند ایک سپاہیوں کو دیکھا تو ہاتھی گراؤنڈ سے ہوتی ہوئی ریلوے پل کی طرف چلنے لگی چلتے چلتے وہ تھک بھی گئی تھی۔ ستمبر کے دن تھے اسے پسینہ بھی آ رہا تھا مگر وہ چلتی چلی جا رہی تھی۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ بھی رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے؟ آخر اس نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ امرتسر شہر سے موقعہ ملتے ہی کسی طرح سے نکل کر جموں کی طرف روانہ ہو جائے گی۔ جموں اس کی منزل تھی... سکھوں کے جتھے کے ساتھ گوردواروں کی یاترا کے بہانے پاکستان میں داخل ہونے کا اس کا منصوبہ ناکام ہو گیا تھا۔ پل سے اتری تو سامنے امرتسر پٹھان کوٹ کا لاری اڈہ تھا۔ کچھ لاریاں کھڑی تھیں۔ ایک لاری مسافروں سے بھری ہوئی تھی اور ایک آدمی شور مچا رہا تھا، "چلو پٹھانکوٹ ایک سواری،" نجمی نے سوچا کہ اسے اس لاری میں بیٹھ کر پٹھانکوٹ چلے جانا چاہیئے۔ وہاں سے وہ جموں چلی جائے گی۔ وہ لاری اڈے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ اسے دو سکھ پولیس کانسٹیبل لاری کی طرف جاتے نظر آئے۔ نجمی وہیں ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی۔ پولیس کے سپاہیوں نے سارے مسافروں کو لاری سے نیچے اتروا لیا اور ایک ایک کر کے ان سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

وہ نجمی ہی کی تلاش میں تھے۔ نجمی نے ایک منٹ بھی ضائع نہ کیا اور واپس مڑ کر پل کی چڑھائی چڑھنے لگی۔ یہاں سے وہ دوسری طرف آگئی اور پھر جو سامنے سڑک نظر آئی ادھر ہی نکل گئی۔ یہ سڑک ضلع کچہری کی طرف جاتی تھی۔ نجمی دائیں جانب مڑ گئی۔ اب وہ امرتسر کے مشہور باغ... کمپنی باغ میں داخل ہو گئی تھی۔ یہاں وہ محفوظ نہیں تھی باغ میں کسی جوان عورت کو مشکوک سمجھا جا سکتا تھا۔ نجمی ان ہی خیالات میں ڈوبی باغ کی باڑھ کے ساتھ ساتھ چلی جا رہی تھی کہ اچانک اس کی نظر ایک سکھ سپاہی پر پڑی جو آگے ایک پرانی مغلیہ طرز کی بارہ دری کے سامنے کھڑا تھا۔ نجمی نے اپنی رفتار آہستہ کر دی اور باڑھ میں سے گزر کر گراؤنڈ میں آگئی اب اس کا رخ سامنے والی سڑک کی طرف تھا۔ سڑک پر آتے ہی اسے ایک خالی رکشا مل گیا وہ لپک کر رکشے میں بیٹھ گئی اور بولی۔

"اسٹیشن چلو۔"

یہ اس نے ویسے ہی کہہ دیا تھا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اسٹیشن جانا اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کرنے کے برابر تھا کیونکہ اسٹیشن پر تو پولیس ضرور اس کی ٹوہ میں موجود ہو گی۔ یہ سائیکل رکشا تھا اور اسے ایک ادھیڑ عمر کمزور سا سکھ چلا رہا تھا۔ نجمی کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے؟ سائیکل رکشہ اسٹیشن کی طرف چلا جا رہا تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد نجمی نے رکشہ ڈرائیور سے کہا۔

"سردار جی! رکشہ ایک طرف کر لو۔"

اس نے رکشہ سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے کھڑا کر دیا۔ یہ شہر کا باہر والا علاقہ تھا اور یہاں ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ رکشہ ڈرائیور نے گردن گھما کر نجمی سے پوچھا۔

"بی بی! تمھیں جانا کہاں ہے؟"

سکھ رکشہ ڈرائیور نے نجمی کے گلے میں لٹکتی کرپان اور کلائی میں پڑے ہوئے لوہے کے کڑے سے پہچان لیا تھا کہ یہ کوئی سکھ عورت ہے۔ نجمی نے کہا "سردار جی! میں اپنے آدمی کے ساتھ دربار صاحب میں ماتھا ٹیکنے آئی تھی۔ ہم دربار صاحب سے اس باغ کی سیر کرنے آ گئے۔ وہ مجھے یہاں بٹھا کر کھانے کو کچھ لینے چلا گیا دو گھنٹے ہو گئے ہیں واپس نہیں آیا۔"

سکھ رکشہ ڈرائیور سائیکل رکشہ کی گدی سے نیچے اتر پڑا۔ نجمی کے قریب آ کر بڑی شفقت سے کہنے لگا۔

"دھی رانی! فکر کی کوئی بات نہیں۔ تمھارا آدمی آجائے گا۔ تمھیں اسی جگہ بیٹھے رہنا چاہئے تھا جہاں وہ تمھیں چھوڑ گیا ہے۔"

نجمی نے جلدی سے کہا "اسے آنا ہوتا تو آگیا ہوتا۔ دو گھنٹے ہو گئے ہیں میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"رکشا ڈرائیور نے پوچھا "دھی رانی! تم کون سے گاؤں سے آئی ہو؟"

نجمی کو امرتسر کے کسی گاؤں کا نام یاد نہیں تھا یونہی بولی "اکال گڑھ نام ہے ہمارے گاؤں کا۔ ہم پہلے یکے پہ پھر لاری پر سوار ہو کر امرتسر آئے تھے۔ مجھے اپنے گھر کا راستہ بھی نہیں آتا۔"

سکھ رکشہ ڈرائیور کرتے سے اپنے منہ پر آیا ہوا پسینہ پونچھتے ہوئے بولا "میں پھر بھی تمھیں یہی کہوں گا کہ جہاں تمھارا آدمی تمھیں بٹھا گیا ہے وہیں اس کا انتظار کرو۔"

نجمی اس دوران اردگرد کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ وہاں اس وقت کوئی پولیس والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سکھ کی طرف دیکھ کر عاجزی سے کہا "سردار جی! میرے پیٹ میں کچھ درد بھی ہو رہا ہے آپ مجھے اپنے گھر لے چلیں پھر میں واپس اسی جگہ آجاؤں گی۔"

"چلو دھی رانی! میرے گھر چلو وہاں میری پتنی تمھیں چورن کھلا کر درد ٹھیک کر دے گی۔"

اور سکھ رکشہ ڈرائیور نجمی کو لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا گھر دیرکا جانے والی سڑک پر سے ہٹ کر ایک ٹیلے کے پاس تھا۔ وہاں دس بارہ ایک منزلہ بوسیدہ کوارٹر سے بنے ہوئے تھے۔ سکھ رکشہ والے کی دھرم پتنی نجمی کو اندر لے گئی۔ نجمی باتھ روم میں گئی وہاں منہ ہاتھ بھی دھویا۔ سکھ کی بیوی نے نجمی کو چورن کھلایا۔ "میرا سر بھی چکر کھا رہا ہے۔"

سکھ کی بیوی نے نجمی کو چارپائی پر لٹا دیا اور اس کا سر دبانے لگی۔ نجمی نے اس کا ہاتھ روک دیا اور بولی "بہن جی! آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ سر درد اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ صرف میرے لیے چائے بنا دیں۔"

سکھ رکشہ ڈرائیور باہر صحن میں بیٹھا تھا۔ اس کی بیوی نے فوراً چائے بنا کر نجمی کو پیش کی۔ نجمی نے انھیں اپنا نام جیت کور عرف جیتی بتایا اور کہا کہ اس کی شادی کو چار سال ہو گئے ہیں مگر اولاد نہیں ہوئی۔

سکھ ڈرائیور نے باہر سے آواز دی "دھی رانی چلو تمھیں باغ میں لیے چلتا ہوں ہو سکتا ہے تمھارا آدمی وہاں آگیا ہو اور پریشان ہو؟"

نجمی وہاں ہرگز نہیں جانا چاہتی تھی اب اس نے ایک اور ڈرامہ کیا اور چہرے پہ پلو ڈال کر رونے لگی۔ سکھ اور اس کی بیوی بے چارے گھبرا گئے۔ نجمی نے روتے ہوئے کہا "کیا بتاؤں سردار جی! اصل بات یہ ہے کہ میرا خاوند مجھ سے لڑ جھگڑ کر چلا گیا ہے۔ وہ اب واپس نہیں آئے گا۔"

یوں نجمی نے وہاں ایک جھوٹ موٹ کا قصہ گھڑ کر انھیں سنا دیا۔ دونوں میاں بیوی نجمی کو سمجھانے لگے کہ خاوند سے لڑائی جھگڑا تو ہوتا ہی رہتا ہے مگر تمھیں واپس اپنے خاوند کے پاس ہی جانا چاہیئے۔ سکھ بولا "میں تمھیں خود تمھاری سسرال اکال گڑھ چھوڑ آؤں گا۔ لیکن یہ گاؤں ہے کہاں؟ ضلع امرتسر میں تو میں نے آج تک اس نام کا کوئی گاؤں نہیں سنا۔"

نجمی نے چادر کے پلو سے جھوٹ موٹ کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "یہاں سے لاری جاتی ہے مجھے خود راستے کا پتہ نہیں ہے۔ ہم دن کو چل کر دوپہر سے کچھ پہلے امرتسر پہنچے تھے۔ راستے میں بجلی والی نہر بھی آئی تھی۔"

سکھ بے چارا پریشان ہو گیا تھا کہنے لگا "دھی رانی! اب تو شام ہو رہی ہے ایسا کرتے ہیں کہ تم رات یہیں آرام کرو۔ صبح میں پہلی لاری میں تمھارے گاؤں کا پتہ کر کے وہاں چھوڑ آؤں گا۔ دھیاں اپنے سسرال میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ وہی ان کا گھر ہوتا ہے۔"

نجمی کو یہی چاہیئے تھا۔ اسے سوچنے اور کوئی نیا منصوبہ بنانے کے لیے یوں کافی وقت مل جاتا تھا۔ آنسو پونچھ کر بولی "جیسی آپ کی مرضی! آپ میرے پیتا سمان ہیں۔"

یہ ساری گفتگو پنجابی میں ہوتی رہی تھی۔ رات کو کھانا کھا کر نجمی چارپائی پر لیٹ گئی سکھ اور اس کی بیوی تو باہر چھپر کے نیچے سوئے اور نجمی کی چارپائی انھوں نے کوٹھڑی میں ڈال دی۔ ستمبر کی راتیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں۔ نجمی بستر پر لیٹ کر سوچنے لگی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے۔ اس کے

پاس صرف یہی ایک رات تھی ۔ دوسرے دن اسے وہاں سے نکل جانا تھا۔ گرجن سنگھ اور اس کے مجیٹھ روڈ والے دوست کرپال سنگھ کے پاس وہ واپس نہیں جانا چاہتی تھی ۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں یہ دونوں سکھ پاکستانی جاسوس ہونے کی وجہ سے قومی جذبات میں آکر پولیس کے حوالے نہ کر دیں ۔ ویسے بھی اب نجمی کو گرجن سنگھ کے پاس واپس جانے کی ضرورت نہیں تھی ۔ کیونکہ اب وہ اسے سکھوں کے جتھے کے ساتھ پاکستان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ کوٹھڑی میں بجلی کا کمزور سا بلب روشن تھا۔ نجمی نے بلب بجھا دیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی ۔ سونے سے پہلے نجمی نے اپنے ذہن میں ایک منصوبہ تیار کر لیا تھا۔

صبح صبح سکھ رکشہ ڈرائیور کی دھرم پتنی نے نجمی کو جگایا۔ ”دھی رانی لاری سویرے سویرے جاتی ہے اٹھو واہے گرو کا نام جپو ۔“

نجمی لاری اڈے کبھی نہیں جا سکتی تھی ابھی دن کی روشنی پوری طرح سے نہیں پھیلی تھی ۔ نجمی نے سکھ رکشہ والے سے کہا۔ ”تایا جی ! آپ مجھے اپنے رکشہ پر بیٹھا کر جو سڑک پٹھانکوٹ کو جاتی ہے اس کے ذرا آگے کر کے چھوڑ آؤ ۔ وہاں سے ایک کچا راستہ میرے گاؤں کو جاتا ہے ۔ اتنا مجھے یاد ہے آگے کوئی یکہ لے کر میں چلی جاؤں گی ۔“

سکھ رکشہ ڈرائیور نے کافی اصرار کیا کہ وہ اسے خود لاری پر بیٹھا کر سسرال چھوڑ آتا ہوں ، مگر نجمی نے کہا۔ ”میں خود ہی چلی جاؤں گی تایا جی ! بس تم مجھے پٹھان کوٹ جانے والی سڑک پر کچے راستے تک چھوڑ آؤ ۔“

سکھ رکشہ ڈرائیور نے نجمی کو رکشے پر بیٹھایا اور صبح کی پھیکی پھیکی روشنی میں پٹھان کوٹ جانے والی سڑک پر آ گیا۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی ۔ نجمی کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ سڑک پر کچھ آگے جا کر پٹھان کوٹ جانے والی لاری پکڑ لے گی اور اس طرح سے لاری اڈے پر پولیس کی چیکنگ سے بچ جائے گی ۔ رکشہ پکی سڑک پر چلا جا رہا تھا جب رکشہ دو چار میل آگے نکل گیا تو بائیں جانب کھیتوں میں ایک کچے راستے کو نکلتے دیکھ کر نجمی نے رکشہ رکوا لیا ۔ ”بس تایا جی ! یہی راستہ میرے گاؤں کو جاتا ہے میں نے پہچان لیا ہے ۔“

پھر نجمی نے رکشے سے اتر کر سکھ رکشہ ڈرائیور کے پاؤں چھوئے اس کا شکریہ ادا کیا ۔ سکھ رکشہ

والے کا سانس پھولا ہوا تھا اس نے نجمی کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے شفقت سے کہا ۔

”دھی رانی ہم غریب لوگ ہیں ۔ تمھاری خدمت نہیں کر سکے قصور ہو گیا ہو تو معاف کر دینا ۔“

نجمی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ یہ آنسو سچے تھے ۔ جس طرح اس سکھ رکشہ ڈرائیور کا جذبہ سچا تھا۔ نجمی کو اپنا باپ یاد آ گیا وہ جلدی سے اس جذباتی کیفیت سے باہر نکل آئی کیونکہ یہ جذبات کا وقت نہیں تھا اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا ”ست سری اکال ۔“

”ست سری اکال دھی رانی !“ سکھ بوڑھا عاجزی سے بولا۔

نجمی کھیتوں میں چل پڑی ۔ آگے اونچی فصل تھی ۔ وہ فصل کی اوٹ میں ہو کر پیچھے دیکھنے لگی ٹاہلیوں میں گھری ہوئی پکی سڑک پر نیک دل ادھیڑ عمر سکھ کا رکشہ کافی دور چلا گیا تھا جب یہ رکشہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو نجمی کھیتوں کا چکر کاٹ کر پکی سڑک پر آگے جا کر نکل آئی وہ ٹاہلی کے ایک درخت کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گئی ۔ اس نے کرتے کی جیب میں سے رومال نکال کر کھولا اس کے پاس اڑھائی سو کے قریب رقم تھی ۔ اس میں سے بیس روپے نکال کر اس نے الگ رکھ لیے اور رومال جیب میں سنبھال کر رکھ لیا اس کی نظریں امرتسر لاری اڈے سے آتی سڑک پر لگی تھیں ۔ دو ایک بجری سے بھرے ٹرک گزرے تھے ۔ لاری ابھی تک کوئی نہیں گزری تھی ۔

دن کی روشنی کافی ہو گئی تھی ۔ سورج کھیتوں میں سونا بکھیر رہا تھا۔ آخر ستمبر کی صبح خنک تھی ۔ دور سے ایک لاری آتی دیکھ کر نجمی اٹھ کر سڑک کے کنارے آ گئی ۔ اس نے سر کو چادر سے اچھی طرح ڈھانپ لیا تھا۔ لاری ابھی دور ہی تھی کہ نجمی نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ لاری قریب آ کر رک گئی ۔ کلینر نے پچھلے دروازے سے آواز دی ”ڈالہ گورداسپور پٹھان کوٹ ۔ کتھے جانا اے بی بی ؟“

نجمی نے کوئی جواب نہ دیا اور لاری میں بیٹھ گئی ۔ پھر اس نے بیس روپے کلینر کی طرف بڑھا دیئے اور کہا ”پٹھان کوٹ جانا اے ویرا ۔“

لاری سواریوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی کچھ سواریاں بٹالے اتر گئیں ۔ یہاں سے مزید سواریاں چڑھ گئیں ۔ نجمی چادر سے جسم لپیٹے لاری میں ہی کھڑکی کے پاس بیٹھی رہی ۔ اس کی آنکھیں باہر

لاری اڈے کا برابر جائزہ لے رہی تھیں۔ پولیس کے دو ایک سپاہی اسے نظر آئے مگر وہ لاری کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ بٹالہ سے لاری چلی تو گورداسپور پہنچ کر رکی۔ یہاں بھی خیریت ہی رہی پھر پٹھان کوٹ آگیا۔ لاری اپنے اڈے میں جا کر رک گئی۔ یہ وہ لاری اڈہ نہیں تھا جہاں سے نجمی پہلی بار بادل کے ساتھ جموں کی طرف روانہ ہوئی تھی۔ یہاں سے نجمی کو جموں جانا تھا۔ اڈے میں ہی عورتوں کا ایک بوسیدہ سا ویٹنگ روم بنا ہوا تھا۔ نجمی نے معلوم کیا۔ جموں لاری شام سے ذرا پہلے چلتی تھی۔ نجمی نے ٹکٹ لے کر اپنے پاس رکھ لیا۔ ایک ڈوگرہ عورت بھی ویٹنگ روم میں اپنے بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ اس نے نجمی سے باتیں شروع کر دیں۔

"بہناں تم کہاں جا رہی ہو؟"

نجمی کو جموں کے محلہ استاداں کا نام یاد تھا۔ اس نے کہا "محلہ استاداں میں میری ایک بہن رہتی ہے اس کے پاس جا رہی ہوں۔"

ڈوگرہ عورت نے پوچھا "کیا تم مسلمان ہو؟ مگر تم نے تو کرپان رکھی ہوئی ہے۔"

اب نجمی کو یاد آیا کہ محلہ استاداں میں زیادہ آبادی مسلمانوں کی ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "میں سکھنی ہوں۔ محلہ استاداں میں سکھ بھی تو رہتے ہیں۔"

"ہاں کچھ مکان سرداروں کے ہیں۔" وہ عورت بولی۔

نجمی نے وہیں سے باہر روٹی اور دال منگوا کر اس ڈوگرہ عورت کے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ خدا خدا کر کے چار بجے اور جموں جانے والی لاری اڈے پر آ کر لگ گئی۔ نجمی اور ڈوگرہ عورت لاری میں آ کر بیٹھ گئیں۔ ساڑھے چار بجے لاری وایا کٹھوعہ جموں کی طرف روانہ ہو گئی۔ راستے میں ہی شام ہو گئی۔ نجمی جموں پہنچی تو رات ہو چکی تھی۔ نجمی کو بادل کے دوست اور راز دار لال دین کے گھر کا پتہ یاد تھا اس نے لال دین کے مکان واقع محلہ استاداں جانے کا ہی سوچ رکھا تھا۔ اڈے میں ہی نجمی نے رکشا کروایا اور محلہ استاداں کی طرف روانہ ہو گئی۔

اسے جموں سے نکلے کافی وقت گزر چکا تھا اور نجمی کو یقین تھا کہ اب لال دین کے مکان کی نگرانی نہیں ہو رہی ہو گی۔ رکشے والے نے اسے محلہ استاداں کے باہر سڑک پر اتار دیا۔ نجمی نے اس جگہ کو پہچان لیا تھا۔ وہ چادر لپیٹے، سر جھکائے خاموشی سے گلی میں داخل ہو گئی۔ یہ

گلیاں اسے یاد تھیں۔ وہ مکانوں کو پہچانتی آخر لال دین کے مکان کے باہر جا کر رک گئی۔ مکان کی دوسری منزل میں روشنی ہو رہی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ گلی میں دوسرا کوئی نہیں تھا۔ نجمی نے آہستہ سے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ دو تین بار کنڈی کھڑکانے پر اوپر کی کھڑکی کھلی اور لال دین نے نیچے جھانک کر پوچھا "کون ہے بھئی؟"

نجمی نے کوئی جواب نہ دیا صرف چہرہ اوپر اٹھا کر لال دین کی طرف دیکھا اس نے لال دین کو پہچان لیا تھا۔ لال دین نے ابھی تک نجمی کو نہیں پہچانا تھا وہ کھڑکی بند کر کے سیڑھیاں اتر کر نیچے آگیا۔ دروازہ کھول کر متجسسانہ نظروں سے نجمی کی طرف دیکھ کر پوچھا "کس سے ملنا ہے بہن جی؟"

نجمی نے چادر پوری طرح سے چہرے پر سے ہٹا لی تھی "میں ہوں کاکا جی!"

اب لال دین نے بھی نجمی کو پہچان لیا تھا۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا "اندر آجاؤ۔"

نجمی تیزی سے مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہو گئی۔ لال دین نجمی کو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا وہ اسے اوپر والی بیٹھک میں لے گیا۔ جاتے ہی اس نے نجمی سے کہا "ندیم لاہور سے واپس آگیا ہے۔"

نجمی کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا "آپ نے کیا کہا؟" اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

لال دین نے کھڑکی کے آگے پردہ گرا دیا اور چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا "تمھیں کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

نجمی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ندیم.... ندیم کے بارے میں کیا کہا تھا آپ نے؟"

لال دین بولا "وہ تمھاری تلاش میں بارڈر کراس کر کے ہندوستان پہنچ گیا ہے۔ کہتا تھا نجمی نہیں آئی تو میں گھبرا کر یہاں آگیا ہوں۔"

نجمی نے اپنا سر تھام لیا "ندیم کیوں واپس آگیا؟ نہیں نہیں۔ وہ واپس نہیں آ سکتا۔ وہ ایسی حماقت نہیں کر سکتا۔" اس نے سر اٹھا کر لال دین کی طرف دیکھا "کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟"

لال دین بولا "بالکل سچ کہہ رہا ہوں ابھی چار روز پہلے وہ اسی جگہ جہاں تم بیٹھی ہو بیٹھا مجھ سے تمھارے بارے میں پوچھ رہا تھا جب میں نے اسے بتایا کہ تم کو بردہ فروش اغوا کر کے لے گیا، لی

کی طرف لے گئے ہیں تو وہ پریشان ہو گیا بولا میں دلی جاؤں گا۔ اس بار میں اسے اپنے ساتھ بارڈر کراس کراؤں گا۔ میں نے سخت غلطی کی جو نجمی کے بغیر بارڈر کراس کر کے چلا گیا۔"

نجمی کا چہرہ اتر گیا تھا۔ ندیم اس کی مصیبتوں اور مشکلوں میں اضافہ کرنے آ گیا تھا۔ جس جہنم سے نجمی نے اسے ہزار کوششوں سے نکال کر جنت کی طرف بھیجا تھا وہ اسی جہنم میں ایک بار پھر آ گیا تھا۔ نجمی کا جی چاہا کہ ندیم اس کے سامنے آ جائے اور وہ تھپڑ مار مار کر اس کا منہ لال کر دے۔ لال دین کہہ رہا تھا "تم کہاں سے آ رہی ہو؟ تمہارے ساتھ کیا گزری لیکن یہ باتیں آرام سے بیٹھ کر ہوں گی پہلے یہ بتاؤ کہ تم جہاں سے بھی آ رہی ہو تمہارے پیچھے پولیس تو نہیں لگی تھی؟"

نجمی نے پوچھا "کیا تمہاری نگرانی ابھی تک ختم نہیں ہوئی؟"

لال دین نے کہا "میری نگرانی تو بڑی مشکل سے ختم ہو گئی ہے لیکن تمہارے پیچھے لگی ہوئی پولیس پھر سے مجھے گرفتار کروا سکتی ہے۔"

نجمی کو لال دین پر غصہ بھی آیا کہ عجیب شخص ہے کبھی بڑا بہادر بنتا تھا اور اب کسی چوہے کی طرح گھبرا رہا ہے۔ اس نے سینے پر ہاتھ مار کر جذباتی لہجے میں کہا "چچا! اگر تمہیں کوئی پکڑنے آئے گا تو اسے میری لاش پر سے گزرنا ہو گا۔"

لال دین نے نجمی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "بیٹی! یہ معاملہ جذبات کا نہیں ہے۔ یہاں آنکھیں کھول کر اور دل کو ٹھنڈا رکھ کر سوچنا پڑتا ہے۔ جموں کشمیر میں مسلمانوں کو پہلے ہی پاکستان کا جاسوس سمجھا جاتا ہے اگر ہم پر پولیس کو ذرا سا بھی شک پڑ جائے تو پھر ہماری خیر نہیں اس سے پہلے بھی میں بڑی سزا بھگت چکا ہوں۔"

تب نجمی نے کہا "چچا! میں تمہارے پاس نہیں ٹھہروں گی۔ میں تمہارے لیے کسی نئی مصیبت کا باعث نہیں بنوں گی تم صرف یہ بتا دو کہ بادل کس حال میں ہے؟ کیا اس کو سزا ہو گئی؟"

لال دین کہنے لگا "بادل کا کیس ابھی تک چل رہا ہے لیکن چونکہ پولیس تمہیں پاکستانی جاسوس بھی سمجھتی ہے اس لیے بادل پر بھی یہی الزام لگا دیا گیا ہے۔ وہ پاکستانی جاسوسوں کے ساتھ ملا ہوا ہے اور ہندوستان میں انہیں اپنے ہاں پناہ دیتا ہے اسی وجہ سے پولیس نے اس کا کیس

گول کر دیا ہے اور اسے امرتسر جیل میں بند کر دیا گیا ہے جہاں اس سے صرف پاکستانی جاسوسوں کے بارے میں اور تمہارے بارے میں پوچھ گچھ ہوتی ہے۔"

نجمی نے دانت پیستے ہوئے کہا "یہاں کی پولیس تو ہر مسلمان کو پاکستانی جاسوس سمجھتی ہے۔"

لال دین بولا "حالات ہی ایسے ہو گئے ہیں پولیس کو مجھ پر بھی شبہ تھا مگر میں نے بڑی مشکل سے اپنا کیس کلیئر کروا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ تم زیادہ دیر یہاں ٹھہرو میرے ساتھ تم بھی پکڑی جاؤ گی۔"

نجمی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے ذہن کا ایک حصہ مسلسل ندیم کے بارے میں فکرمند تھا کہ وہ پاکستان کی جنت چھوڑ کر اس ملک کے جہنم میں کیوں واپس آ گیا؟ یہ حماقت اس نے کیوں کی؟ اب وہ کیسے وطن واپس جائے گا۔ کہنے لگی "چچا! ندیم نے کچھ بتایا تھا کہ وہ دلی کہاں ٹھہرے گا۔؟"

لال دین بولا "اس بارے میں اس نے یقین سے کچھ نہیں بتایا۔ کہہ رہا تھا ہو سکتا ہے مجھے نجمی کی تلاش میں ایک بار پھر کلکتہ جانا پڑے۔"

نجمی کو ایک لمحے کے لیے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے سامنے اندھیرے کی بھاری چادر گرا دی ہے اور اس کے تمام راستے بند ہو گئے ہیں۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ شبانہ اور ندیم کو پاکستان بھیج کر نجمی کا سب سے بڑا بوجھ اس کے سر سے اتر گیا تھا لیکن ندیم کے واپس ہندوستان آ جانے سے اسے محسوس ہونے لگا کہ ناقابل برداشت بوجھ تلے اس کے کندھے جھکے جا رہے تھے ایک بار تو اس کے دل میں خیال آیا کہ جہنم میں جائے ندیم اور ندیم کی محبت۔ کیوں نہ ایک بار پھر وہ رائفل اٹھا لے اور جو سامنے آئے اسے بھونتی چلی جائے۔

لال دین نے پردہ ذرا سے ہٹایا اور کھڑکی تھوڑی سی کھول کر نیچے گلی میں جھانکا۔ پھر جلدی سے کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔ نجمی نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا "چچا! میں تمہیں کسی نئی مصیبت میں نہیں پھنسانا چاہتی۔ میں جا رہی ہوں۔"

"کہاں؟ کہاں جاؤ گی تم؟" لال دین نے بے اختیار پوچھا۔

نجمی طنزیہ انداز میں مسکرائی اور بولی "میں ڈاکو ہوں اور ڈاکوؤں کو زمین جگہ دے دیتی ہے"

لال دین نے نجمی کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا "تم میرے جگری یار کی بھابھی ہو اور مجھ سے اتنی چھوٹی ہو کہ میں تمہیں اپنی بیٹی بھی کہہ سکتا ہوں اگر ضرورت سے زیادہ محتاط ہوں تو تم مجھے معاف کر دو۔ ہم جموں کشمیر کے مسلمانوں کی یہاں کچھ مجبوریاں ہیں۔ ہمیں یہاں زندہ رہنا ہے عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنا ہے اس کے لیے ہمیں بڑی چیزوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ بہر حال اس وقت تم تھک گئی ہو گی۔ میں تمہارے لیے روٹی ڈال کر لاتا ہوں رات کو تم یہیں آرام کرو منہ اندھیرے میں تمہیں ایک محفوظ مقام پر پہنچا دوں گا۔"

لال دین باورچی خانے میں گیا اور روٹی اور ساگ ڈال کر لے آیا۔ نجمی کو بھوک لگ رہی تھی۔ روٹی کھانے کے بعد وہ وہیں چارپائی پر لیٹ گئی۔ لال دین نیچے بیٹھک میں جا چکا تھا۔ نجمی کو بادل کی پریشانی تو لگی ہی تھی۔ اب ندیم کی فکر بھی پڑ گئی تھی۔ بادل کو جیل سے نکالنا نجمی کا اخلاقی فرض تھا۔ بادل نے نجمی کے لیے کئی بار اپنی زندگی موت کے منہ میں ڈالی تھی اور اب صرف اسی کی وجہ سے امرتسر کی جیل میں پولیس کی سختیاں اور المناک تشدد سہہ رہا تھا۔ دوسری طرف ندیم بھی کسی وقت پولیس کے ہتھے چڑھ سکتا تھا۔ نجمی اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ اس کی تکلیف بھی کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ یہی سوچتے سوچتے اسے نیند آ گئی۔

رات کا پچھلا پہر تھا کہ لال دین نے دروازے پر دستک دی۔ دو چار بار دستک دینے کے بعد لال دین نے نجمی کو آواز دی۔ نجمی کی آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں اندھیرا تھا وہ کچھ نہ سمجھ سکی کہ وہ کہاں پر ہے اور یہ آواز کس کی تھی۔ جب لال دین نے دوسری بار اپنا نام لے کر آواز دی۔ تو نجمی نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ چادر لپیٹ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ لال دین نے اندر آتے ہی کہا "نجمی بیٹی میرے ساتھ چلو۔"

نجمی کو معلوم تھا کہ وہ اسے کسی محفوظ جگہ لے جانا چاہتا ہے۔ اس نے آنکھیں جھپکتے ہوئے کہا "چچا ہمیں کہاں جانا ہو گا؟ شاہ جی تو آم کے باغ میں نہیں ہوں گے۔"

نجمی جوتی تلاش کرنے لگی۔ لال دین بولا "شاہ جی یہاں نہیں ہیں لیکن میں تمہیں اس بار یہاں سے قریب ہی ایک گاؤں ہے۔ وہاں ایک قابل اعتبار عورت کے پاس لے جا رہا ہوں۔"

یہ قابل اعتبار عورت جموں شہر سے اوپر شمال کی جانب ایک چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں اکیلی

رہتی تھی۔ اس کا نام شاداں تھا عمر چالیس کے قریب تھی کسی زمانے میں لال دین سے بیاہ کرنا چاہتی تھی۔ ایسا نہ کر سکی اس کی شادی ایک شریف گوجر سے ہو گئی وہ اسے بے اولاد چھوڑ کر مر گیا تھا۔ شاداں بیوہ تھی اور ایک زمیندار کے ہاں کام کاج کر کے اپنا پیٹ پالتی تھی لال دین نے نجمی کو شاداں کے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دیا اور آخر میں کہا۔ "وہ صرف ایک ہی ایسی عورت ہے جس پر میں آنکھ بند کر کے بھروسہ کر سکتا ہوں اور پھر تمہیں دو ایک روز ہی اس کے پاس ٹھہرنا ہو گا اس کے بعد میں تمہارا کوئی بندوبست کر دوں گا۔"

نجمی اس کے ساتھ رات کے پچھلے پہر کے اندھیرے میں جموں کی گلیوں سے نکل کر دریا کی طرف جا رہی تھی۔ یہاں ایک باڑے میں کچھ گائے بھینسیں بندھی تھیں۔ کونے میں ایک موٹر رکشہ بھی تھا۔ لال دین نے نجمی کو اندھیرے میں ایک طرف ٹھہرنے کو کہا اور خود باڑے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس کے پاس موٹر رکشہ کی چابی تھی۔ اس نے نجمی کو رکشے میں بٹھایا اور رکشہ نکال کر ایک سڑک پر روانہ ہو گیا۔ دریا انھوں نے دوسرے پل سے پار کیا۔ اب وہ کشمیر جانے والی سڑک پر جا رہے تھے۔ آسمان پر مشرق کی جانب پہاڑیوں کی چوٹی کے اوپر صبح کاذب کی نیلی روشنی کی لکیر نمودار ہو گئی تھی۔ ہوا کافی ٹھنڈی تھی۔ رکشہ کشمیر کو جاتی سڑک پر سے ایک چھوٹی اور کچی سڑک پر بائیں جانب اتر گیا۔ یہاں دونوں جانب اونچے نیچے میدان تھے جن کے پیچھے پہاڑ ابھر ہوئے تھے۔ دور کسی گاؤں کی روشنیاں نظر آنے لگیں تو لال دین نے رکشے کی رفتار دھیمی کر دی۔ پھر ایک طرف درختوں میں رکشہ روک دیا۔ نجمی نے باہر نکل کر دیکھا۔ چند قدموں کے فاصلے پر چند ایک دیہاتی مکان اندھیرے اور صبح کاذب کے نیم اجالے میں ڈوبتے ابھرتے نظر آ رہے تھے۔ ان مکانوں سے الگ ہٹ کر کسی درخت کے پاس ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کے صحن میں بھینس بندھی ہوئی تھی۔ لال دین نے کوٹھری پر دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ اندر لالٹین روشن تھی۔ ایک عورت آنکھیں ملتی ہوئی باہر نکلی۔

"کون ہے؟"

لال دین نے کہا "میں ہوں۔"

جب رات کو نجمی سو گئی تھی تو لال دین اس عورت کے پاس آ کر نجمی کے بارے میں سب کچھ بتا گیا تھا۔ یہ شاداں تھی۔

"اندر آ جاؤ۔"

لال دین اور اس کے پیچھے پیچھے نجمی کوٹھڑی میں داخل ہو گئی۔ کوٹھڑی میں چنبیلی کے تیل کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں نجمی نے شاداں کو اور شاداں نے نجمی کو دیکھا۔

شاداں نے نجمی کو اپنے گلے لگا لیا اور بولی: "یہ تو بڑی پیاری ہے لال!"

لال دین نے نجمی سے کہا: "بیٹی! یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی میں کل نہیں تو پرسوں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔"

شاداں بولی: "اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں اس کی حفاظت کر سکتی ہوں لال!"

لال دین نے کہا: "ایسی بات نہیں ہے شاداں! مگر نجمی کو ایک ضروری کام سے یہاں سے آگے بھی جانا ہے۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔ دن نکلنے سے پہلے پہلے مجھے جموں پہنچ کر اپنے دوست کو رکشہ واپس کرنا ہے۔"

لال دین چلا گیا شاداں نے نجمی کے سر پر پیار کیا تو نجمی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی تابوت میں بند کر دی گئی ہے۔

ـ ـ ٭ ـ ـ

دن بھر نجمی شاداں کی کوٹھڑی میں بند رہی۔

شاداں نے اس کی بڑی خاطر داری کی مگر نجمی کو دن کے وقت باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی شام کو شاداں اسے گھمانے ایک گھاٹی میں لے گئی۔ رات کو لال دین آ گیا آتے ہی کہنے لگا۔

"بیٹی نجمی! اب تمہارا جو پروگرام ہے وہ بتا دو کیونکہ یہاں تمہارا زیادہ رہنا مناسب نہیں جموں کی سی آئی ڈی بہت خطرناک ہے۔ اگر اس کو ذرا سا بھی سراغ مل گیا تو تمہارا یہاں سے نکلنا ناممکن ہو جائے گا۔"

نجمی خود بھی اس بند کوٹھڑی میں نہیں رہ سکتی تھی اسے جنگلوں میں آزادانہ زندگی بسر کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ ویسے بھی جموں میں اب اس کا ٹھہرے رہنا بیکار تھا۔ ندیم وہاں نہیں تھا اور بادل کو پولیس نے امرتسر جیل میں قید کر رکھا تھا۔ ندیم پر نجمی کو سخت غصہ آ رہا تھا۔ اسے کسی حالت میں بھی واپس نہیں آنا چاہیئے تھا اور پھر اس کا کچھ پتہ بھی نہیں تھا کہ وہ کہاں دربدری کرتا پھر رہا ہے۔ نجمی پر بادل کا قرض تھا۔ وہ سب سے پہلے اپنے اس جاں نثار ساتھی کو ہندوستانی پولیس کے تشدد سے نجات دلانا چاہتی تھی جو اس کی وجہ سے اتنی تکلیفیں جھیل رہا تھا۔ اس نے لال دین سے کہا۔

"میں خود بھی یہاں نہیں رہنا چاہتی کیونکہ یہاں رہ کر میں سوائے وقت ضائع کرنے کے اور کیا کروں گی۔"

لال دین نے پوچھا: "تو پھر تم کہاں جاؤ گی۔"

نجمی چارپائی پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ کوٹھڑی میں لالٹین جل رہی تھی شاداں

باہر چولہے پر روٹیاں پکا رہی تھی۔ نجمی نے کہا۔

"میں امرتسر جا کر سب سے پہلے بادل کو جیل سے نکالنے کا کوئی انتظام کرنا چاہتی ہوں۔"

لال دین چپ ہو گیا پھر کہنے لگا "یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہی ہو بیٹی امرتسر کی جیل پنجاب میں سب سے زیادہ سخت اور مضبوط جیل ہے۔ یہاں بڑے خطرناک قیدی رکھے جاتے ہیں اور اتنا سخت حفاظتی انتظام ہے کہ چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔"

نجمی نے لال دین کے ادھیڑ عمر چہرے کی طرف گھورتے ہوئے کہا "میں چڑیا نہیں ہوں میں بادل کو وہاں سے ضرور نکالوں گی۔"

لال دین گردن کو ایک طرف جھکا کر بولا "میں تمھیں یہ مشورہ نہیں دوں گا کیونکہ مجھے یقین ہے اگر تم نے کوئی ایسا قدم اٹھایا تو مشکل میں پھنس جاؤ گی۔ امرتسر پولیس ویسے بھی تمھاری تلاش میں ہے۔ تم پہ پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام بھی ہے اور یہ وہ جرم ہے کہ انڈین پولیس ایسے شخص کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دے تو اسے پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔"

نجمی نے جھنجھلا کر کہا "آپ کی باتیں میرا حوصلہ کم نہیں کر سکتیں۔ میں آج صبح امرتسر جا رہی ہوں"

لال دین خود بھی یہی چاہتا تھا کہ نجمی جتنی جلدی ہو سکے وہاں سے چلی جائے اس کی وجہ سے وہ خود کسی مصیبت میں گرفتار ہو سکتا تھا کہنے لگا۔

"جیسے تمھاری مرضی منہ اندھیرے چار بجے ایک گاڑی امرتسر جاتی ہے۔ تمھیں کچھ پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھ سے لے لو۔"

نجمی نے کہا "مجھے پیسوں کی نہیں کچھ دوسری چیزوں کی ضرورت ہے، وہ مجھے اگر آج رات لا دو تو میں صبح یہاں سے نکل جاؤں گی۔"

"کونسی چیزیں؟" لال دین نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

نجمی چارپائی پر سنبھل کر بیٹھ گئی جب اس نے لال دین کو مطلوبہ دو چار چیزیں تبلائیں تو وہ اس کا منہ تکنے لگا "کیا تم ....؟" نجمی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "ہاں جو تم سمجھتے ہو میں وہی کرنے والی ہوں لیکن میں چاہتی ہوں کہ یہ ساری چیزیں مجھے مل جانی چاہئیں۔"

اس وقت رات کے نو بج رہے تھے جموں کے کچھ بازار ابھی تک کھلے تھے۔ لال دین بہت جلدی واپس آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ شاداں باہر روٹیاں پکا رہی تھی۔ نجمی کے منصوبے کا اسے ابھی تک کچھ علم نہیں تھا۔ دو گھنٹے بعد لال دین واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا بھی تھا۔ نجمی اور شاداں کوٹھڑی میں ہی بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ لال دین نے تھیلے میں سے چیزیں نکال کر نجمی کے سامنے رکھ دیں۔ شاداں نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ گیروی ساڑھی اور سادھوؤں ایسی مالائیں کس لیے لائے ہو لال؟"

لال دین نے نجمی کی طرف اشارہ کیا اور بولا "نجمی کے لیے لایا ہوں یہ جوگن بن کر امرتسر جائے گی۔"

شاداں اب نجمی کا منہ تکنے لگی۔ نجمی نے لال دین سے پوچھا "قینچی اور استرا لائے ہو؟"

لال دین نے یہ دو چیزیں بھی تھیلے میں سے نکال کر سامنے رکھ دیں۔ شاداں کو نجمی کے بال بڑے پسند تھے وہ اسے منع کرتی رہی مگر نجمی نے کسی قدر ڈانٹ کر کہا کہ وہ اس کے معاملے میں دخل نہ دے۔ شاداں چپ ہو کر بیٹھ گئی۔

لال دین نے قینچی سے نجمی کے سارے بال کاٹ دیئے۔ پھر پانی منگوا کر اس کے سر کو گیلا کیا اور استرے سے اس کا سر مونڈ ڈالا۔ اس کے بعد نجمی نے گیروے رنگ کی ساڑھی پہن لی کاندھے پر گیروے رنگ کی چادر رکھی اور ماتھے پر زعفران بھگو کر تلک لگا لیا۔ شیشے میں اپنی شکل دیکھی تو ایک لمحے کے لیے وہ خود بھی اپنے آپ کو نہ پہچان سکی۔ لال دین کہنے لگا "تمھاری شکل کافی بدل گئی ہے لیکن پھر بھی تمھیں امرتسر پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے بڑی احتیاط سے کام لینا ہو گا۔"

نجمی نے چادر کاندھے سے اتار کر چارپائی کے سرہانے رکھ دی اور بولی "یہ گُر مجھے خوب آتا ہے۔ تم فکر نہ کرو اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ ٹرین کا صحیح وقت کیا ہے۔"

لال دین نے کہا کہ گاڑی جموں توی اسٹیشن سے ہی تیار ہوتی ہے اور صبح سوا چار بجے منہ اندھیرے نکل جاتی ہے۔ نجمی کے پاس کچھ نوٹ تھے وہ اس نے کپڑے میں لپیٹ کر اپنی کمر کے ساتھ باندھ لیے۔ لال دین جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا بیٹی اب میں چلتا ہوں۔ میں خدا سے دعا کروں گا کہ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ۔" پھر پلٹ کر دبی زبان میں کہنے لگا: "مجھے یقین ہے کہ اگر ایسی ویسی بات ہو گئی تو تم میرا نام....."

نجمی نے بات کاٹ کر کہا: "تمھارا نام میری زبان پر کبھی نہیں آئے گا چاچا! اس شبہے کو ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دو۔"

لال دین خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد شاداں کہنے لگی: "بہن! تم تو بالکل جوگن بن گئی ہو۔ ایک نظر دیکھنے سے تو میں بھی تمھیں نہیں پہچان سکتی۔"

نجمی نے چارپائی پر لیٹتے ہوئے شاداں سے پوچھا کہ صبح صبح یہاں سے کوئی سواری مل جائے گی۔ شاداں نے کہا: "رکشے تو صبح صبح ہی چلتے ہیں۔ تم کہو گی تو میں تمھیں جا کر رکشا لا دوں گی سڑک پاس ہی تو ہے۔"

نجمی نے کہا: "نہیں تمھارا شکریہ۔ اس کی ضرورت نہیں۔ میں خود رکشہ لے لوں گی تم صرف ایک کام کرنا کہ صبح اذان کے وقت سے کچھ پہلے مجھے جگا دینا کیا ایسا ممکن ہے؟"

شاداں نے کہا: "میں اذان سے آدھ گھنٹہ پہلے اٹھ کر بھینس کا دودھ دھوتی ہوں۔ میں تمھیں اسی وقت جگا دوں گی۔"

اس کے بعد نجمی نے لالٹین بجھا دی اور چارپائی پر لیٹ گئی۔ بادل کو جیل سے نکالنے کا اس نے تہیہ کر رکھا تھا۔ جوگن کا بھیس بدلنے سے اسے ایک آسانی ہو گئی تھی کہ وہ امرتسر شہر میں کسی بھی مندر میں جا کر اپنا ٹھکانا بنا سکتی تھی۔ ہندوستان میں ایک طویل عرصے سے رہنے کی وجہ سے وہ ہندوؤں کے مذہب کی موٹی موٹی باتوں سے اچھی طرح واقف ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ وہ بہت کم بات کرے گی۔ زیادہ وقت یہ ظاہر کرے گی کہ وہ گیان دھیان میں رہنا زیادہ پسند کرتی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ سو گئی۔

شاداں نے حسب وعدہ اذان سے آدھ گھنٹہ پہلے نجمی کو جگا دیا۔ نجمی نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ شاداں اس کے لیے تازہ دودھ لے آئی اس نے دودھ پیا اور گیروی چادر اپنے کاندھے پر رکھ لی اور بولی: "تمھارا بہت بہت شکریہ شاداں۔"

نجمی نے اسے کچھ روپے دینے چاہے جنھیں شاداں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ اس نے ایک مسلمان

عورت ہونے کے ناطے اپنا فرض ادا کیا ہے وہ اس کا معاوضہ نہیں لے گی۔ نجمی نے لالٹین کی روشنی میں اپنے سراپا پر ایک نظر ڈالی۔ وہ گیروی ساڑھی میں جوگن لگ رہی تھی۔ یہ کھدر کی ساڑھی تھی۔ ماتھے پر تلک اور کاندھے پر گیروے رنگ کی چادر، سر منڈا ہوا، پاؤں میں معمولی چپل، اس کا حلیہ بالکل ہی بدل چکا تھا۔ اس نے شاداں کو بے اختیار گلے سے لگا لیا۔ شاداں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ نجمی اس کے گھر سے نکل کر کشمیر روڈ کی طرف روانہ ہو گئی۔ بال منڈوا دینے سے اس کے سر کو ٹھنڈی ہوا لگ رہی تھی۔ نجمی نے گیروے چادر کا پلو سر کے اوپر کر لیا۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا اور کسی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ نجمی نے ہاتھ اٹھا کر خدا سے اپنی کامیابی کی دعا مانگی۔ بائیں جانب اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں صبح کی پہلی نیلی روشنی میں اندھیرے میں سے ابھرنے لگی تھیں۔ نجمی کشمیر روڈ پر آ کر ایک طرف رک گئی۔ سڑک پر ہلکا ہلکا اندھیرا تھا کوئی سواری وہاں نہیں تھی نجمی شہر کی طرف تیز تیز قدموں سے چل پڑی۔ کچھ دور گئی ہو گی کہ پیچھے سے ایک موٹر گاڑی آئی اس کی روشنی میں ایک طرف کھڑے ہو کر نجمی نے بے اختیار اسے ہاتھ دے دیا۔ یہ ایک پرانے ماڈل کی موٹر گاڑی تھی اور اسے ایک بوڑھا ہندو ڈوگرہ چلا رہا تھا اس نے ایک جوگن کو ہاتھ دیتے دیکھا تو گاڑی روک لی۔ نجمی نے آگے بڑھ کر بڑے باوقار انداز میں کہا۔

"جوگن کو اسٹیشن پر پہنچا دو گے بابا؟"

ہندو ڈرائیور نے ہاتھ جوڑ کر کہا: "بیٹھو ماتا میں ادھر ہی جا رہا ہوں۔"

نجمی کار کا پچھلا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی کار اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی۔ نجمی نے ڈرائیور سے وقت پوچھا تو اس نے کہا: "چار بجنے والے ہیں ماتا۔"

شمالی ہند میں بیراگنوں اور جوگنوں کو خواہ وہ جوان ہوں احترام سے ہندو لوگ ماتا کہہ کر پکارتے ہیں۔ نجمی نے کوئی جواب نہ دیا اس نے شکریہ بھی ادا نہ کیا۔ اسے معلوم تھا کہ جوگی لوگ اپنے اوپر کیے احسانوں کا شکریہ ادا نہیں کرتے بلکہ الٹا ان پر احسان جتاتے ہیں۔

ٹرین سوا چار بجے چھوٹتی تھی نجمی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہاں سے اسٹیشن کتنی دور ہے۔ وہ ڈرائیور کو یہ تاثر نہیں دینا چاہتی تھی کہ وہ اسٹیشن پہلی بار دیکھ رہی ہے اس نے ڈرائیور سے اتنا ضرور کہا کہ گاڑی تیز چلاؤ ہمیں ٹرین پکڑنی ہے۔ ڈرائیور نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ چند لمحوں

کے بعد دور سے ریلوے اسٹیشن کی ہری بتیاں نظر آنے لگیں۔ اسٹیشن پر سواریاں اتر رہی تھیں نجمی کار سے باہر نکلی تو ہندو ڈرائیور نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔

"ماتا! میرا پتر بیمار ہے بھگوان سے پرارتھنا کرنا کہ وہ اچھا ہو جائے۔"

نجمی نے کوئی جواب نہ دیا اور اسٹیشن کی عمارت کی طرف چل دی۔ ہندوستان میں جوگی سنیاسی ریل کا ٹکٹ نہیں لیتے۔ نجمی کے پاس پیسے تھے مگر اس نے جان بوجھ کر ٹکٹ نہ خریدا۔ وہ اپنے آپ کو پوری جوگن ثابت کرنا چاہتی تھی۔ امرتسر جانے والی ٹرین پلیٹ فارم پر لگ چکی تھی اور کافی رش بھی تھا نجمی تھرڈ کلاس کے ڈبے میں کچھ ہندو عورتوں کے پاس بیٹھ گئی۔ نجمی بہر حال خوبصورت تھی۔ اور رنگ بھی نکھرا ہوا تھا۔ ہندو عورتیں اس کی آؤ بھگت کرنے لگیں۔ نجمی نے سوچا کہ یہ عورتیں سفر میں اس کے لیے عذاب نہ بن جائیں چنانچہ اس نے حفظ ماتقدم کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ایک عورت کو جھڑک کر جلالی آواز میں کہا۔

"چپ رہو۔ ہم گیان دھیان میں ہیں کسی نے بلایا تو ہم اس کا ناش کر دیں گے جے ماتا شیراں والی کی۔"

نجمی کو معلوم تھا کہ ہماچل پردیش اور خاص طور پہ چمبہ اور جموں میں شیراں والی ماتا کی عقیدت سے پوجا ہوتی ہے۔ ہندو عورتیں تو فوراً سہم کر پرے پرے ہٹ گئیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ سارا راستہ انھوں نے پھر نجمی کو تنگ نہ کیا اور نجمی کو یہ سوچنے کا موقع مل گیا کہ امرتسر پہنچ کر اسے سب سے پہلے کہاں جانا ہوگا امرتسر کے سیتلا مندر کا نجمی نے نام سن رکھا تھا کہ یہ امرتسر میں ہندوؤں کا سب سے بڑا مندر ہے یہاں وہ پہلے کبھی نہیں گئی تھی اسے وہاں جانے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ اپنے مشن کا آغاز وہ اسی سیتلا مندر سے کرنا چاہتی تھی۔

دن کافی نکل آیا تھا جب ٹرین امرتسر اسٹیشن پہنچی تو اسٹیشن پر بڑا رش تھا۔ پولیس بھی تھی ریلوے پولیس کے آدمی بھی تھے مگر نجمی نے اپنا حلیہ اس حد تک تبدیل کر رکھا تھا کہ اسے ایک نظر میں پہچاننا تقریباً ناممکن تھا وہ ٹرین سے اتر کر بڑے اطمینان سے قدم قدم چلتی اسٹیشن سے باہر آ گئی۔

باہر سائیکل رکشہ اور تانگے کھڑے تھے لوگ اس میں اپنا اپنا سامان لاد کر گھروں کو جا رہے

تھے نجمی کی طرف کسی نے کوئی دھیان نہ دیا۔

ہندوستان میں جوگی جوگنیں عام چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ نجمی نے اپنے سر پہ سے چادر ہٹا رکھی تھی تاکہ منڈا ہوا سر ہونے کی وجہ سے وہ آسانی سے پہچانی نہ جا سکے۔ ایک سائیکل رکشا والے کے پاس جا کر اس نے کہا "بابا! ہم سیتلا مندر کا درشن کرنے آئے ہیں ہمیں سیتلا مندر پہنچا دو"

سائیکل رکشا والا ہندو تھا یہ لوگ جوگی اور سنیاسیوں کے عادی تھے مگر ایک خوبصورت جوگن کو دیکھ کر اس نے نجمی کو رکشے میں بٹھا لیا۔ ویسے بھی سیتلا مندر ریلوے اسٹیشن سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بیچ میں صرف ریلوے کا ایک پل ہی پڑتا تھا۔ سیتلا مندر کا اونچا دروازہ تھا جس کے اندر چھوٹی بڑی گھنٹیاں زنجیروں سے بندھی ہوئی لٹک رہی تھیں۔ لوگ آتے جاتے ان گھنٹیوں کو ہاتھ سے ہلا کر بجاتے تھے۔ پوجا کرنے والوں کی یہاں کثیر تعداد موجود تھی پوجا کا وقت عام طور پہ صبح اور شام کو ہوتا ہے لیکن دوپہر کے وقت بھی اس مندر میں کافی لوگ پوجا کرنے اور ماتھا ٹیکنے آ رہے تھے۔ مندر کا بہت کشادہ صحن تھا جہاں برآمدے کے پیچھے کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک جگہ ریڈ کراس کا نشان بنا ہوا تھا۔ نجمی نے بھی مندر کی وسیع ڈیوڑھی میں داخل ہوتے ہوئے زنجیر ہلا کر گھنٹی بجائی اور چاروں طرف سے چوکس ہو کر مندر کے دالان میں آ گئی۔

اب اس نے دیکھا کہ یہ مندر ایک بہت بڑے تالاب میں بنا ہوا ہے جہاں تک ایک کشادہ راستہ تالاب کے اوپر سے ہو کر جاتا تھا اسی راستے کی دونوں جانب برجیاں بنی تھیں جن پہ گول روشنی کے گلوب لگے تھے۔

مندر ایک کافی بڑے چوکور کمرے کی شکل میں تھا۔ تالاب چاروں طرف دکھائی دے رہا تھا مندر میں رام اور سیتا کے قد آدم بت رکھے تھے جو بے حد سجے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے روشنی کا ایک چکر گھوم رہا تھا۔ مورتیوں کے آگے مسند لگائے بڑا پجاری بیٹھا لوگوں سے پیسے لے کر ان کے ماتھے پر زعفران کا تلک لگاتا جاتا تھا۔ نجمی نے مندر کا ایک چکر لگایا اور پھر باہر برآمدے میں سنگِ مرمر کی ایک برجی کے پاس آسن جما کر بیٹھ گئی۔ اس کی ایک جانب مندر کا بڑا کمرہ تھا اور دوسری جانب تالاب تھا۔ عورتیں اور مرد مندر میں ماتھا ٹیکنے کے بعد نکلتے تو نجمی کے بھی احترام سے پاؤں چھوتے۔ نجمی نے بظاہر آنکھیں بند کر رکھی تھیں لیکن حقیقت میں وہ نیم وا آنکھوں سے

ایک ایک آدمی اور عورت کا جائزہ لے رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے آگے پھل اور مٹھائی کا ڈھیر لگ گیا۔ نجمی نے ان کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ آدھ گھنٹے تک وہاں آسن جمائے رکھنے کے بعد نجمی نے ”جے ماتا شیراں والی،، ”جے سیتا میا،، کا نعرہ لگایا اور پھل اور مٹھائی کے ڈھیر کو وہیں چھوڑ کر اٹھی اور مندر کے گرد دو چکر لگانے کے بعد تالاب کے اوپر بنے ہوئے راستے پر سے ہوتی مندر کے کشادہ دالان میں آ کر پیپل کے ایک درخت کے نیچے بنے ہوئے چبوترے کی طرف آ گئی۔ یہاں قریب ہی ہنومان کی ایک مورتی کھڑی تھی۔ نجمی کو ہنومان کبھی اچھا نہیں لگا تھا لیکن اب مجبوری تھی اس نے ہاتھ جوڑ کر ہنومان کی مورتی کو پرنام کیا اور پیپل کے نیچے چبوترے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ دو چار جٹا دھاری سادھو لوگ ادھر ادھر دھونی رمائے اپنے عقیدت مندوں کے... درمیان بیٹھے بظاہر جاپ میں مشغول تھے۔

نجمی آلتی پالتی مارے، گردن بالکل سیدھی کیے سادھوؤں کی طرح پیپل کے درخت تلے بیٹھی تھی آتے جاتے ہندو پجاری یہاں بھی اس کے پاس پھل اور مٹھائی کے دونے رکھنے لگے نجمی کو بھوک تو لگ رہی تھی مگر انھیں ہاتھ نہ لگانا اس کے منصوبے کا اہم حصہ تھا۔ اس کی تیز نگاہیں کن انکھیوں سے ماحول کا برابر جائزہ لے رہی تھیں اپنے منصوبے کے مطابق اسے کسی سپاہی کی تلاش تھی۔

اچانک اس کی نظر ایک لیڈی کانسٹیبل پر پڑی۔ یہ عورت اس کے کام کے لیے نہایت موزوں تھی۔

نجمی نے دیکھا کہ بھاری بدن والی لیڈی کانسٹیبل عورتوں کو قطار بنا کر مندر میں جانے کی تلقین کر رہی تھی۔ وہ اپنی ڈیوٹی پر تھی اور نجمی کو یقین تھا کہ وہ اتنی جلدی وہاں سے نہیں جائے گی۔ نجمی کچھ دیر خاموشی سے پیپل تلے بیٹھی رہی وہ برابر کن انکھیوں سے لیڈی کانسٹیبل کا جائزہ لے رہی تھی۔

جب نجمی نے دیکھا کہ لیڈی کانسٹیبل پیچھے ہٹ کر برآمدے میں اسٹول پر ذرا سستانے کے لیے بیٹھ گئی ہے تو وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور ”سیتا رام سیتا رام،، کا جاپ کرتی دالان کی طرف جانے کی بجائے برآمدے میں چلنے لگی۔

لیڈی کانسٹیبل کے قریب سے گزرتے ہوئے نجمی نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ برآمدہ جہاں ختم ہوتا تھا وہاں بھی ہنومان کی ایک مورتی نصب تھی۔ نجمی نے ہاتھ جوڑ کر اسے بھی پرنام کیا اور اسی طرح بلند آواز میں سیتا رام سیتا رام کا جاپ کرتی ہاتھ میں پکڑی ہوئی مالا کے منکے

پھیرتی برآمدے میں واپس چلنے لگی۔ لیڈی کانسٹیبل اسی طرح اسٹول پر بیٹھی تھی۔ اس کا بدن بھاری مگر عمر زیادہ نہیں تھی۔ کھلتا ہوا رنگ تھا اور ماتھے پر تلک لگا تھا جس سے نجمی کو معلوم ہو گیا کہ یہ سکھنی نہیں ہے ہندو ہے۔ کیونکہ سکھ عورتیں عام طور پر ماتھے پر تلک نہیں لگاتیں۔ نوجوان لڑکیاں اب فیشن کے طور پر بندیا ضرور لگانے لگی ہیں۔ نجمی عین لیڈی کانسٹیبل کے آگے آ کر رک گئی اور اس کی طرف تیز نظروں سے تکنے لگی۔ نجمی کو یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں یہ اسے پہچان کر گرفتار نہ کر لے لیکن نجمی نے اپنے اندر غضب کی خود اعتمادی پیدا کر لی تھی۔ لیڈی کانسٹیبل نے ایک جوان سر منڈی جوگن کو اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھا تو ضعیف الاعتقاد ہونے کی وجہ سے فوراً اسٹول چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ جوڑ لیے۔

نجمی نے گہری پر اعتماد آواز میں کہا ”تیرے پچھلے جنم کے کرم ایسے ہیں کہ تجھ کو افسر ہونا چاہیے تھا تو یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے۔،،

لیڈی کانسٹیبل نے چند روز پہلے لیڈی ہیڈ کانسٹیبل کے عہدے پر اپنی ترقی کی درخواست دے رکھی تھی اس نے جب ایک جوگن کی زبان سے اپنی افسری کی بات سنی تو فوراً نجمی کے پاؤں چھوئے اور ہاتھ باندھ کر بولی ”ماتا! میری رکشا کرنا میں نے ترقی کی عرضی دے دی ہے۔،،

نجمی کے لیے یہ تصور کرنا کوئی عجیب یا انوکھی بات نہیں تھی کہ پولیس کے ایک کانسٹیبل یا لیڈی کانسٹیبل کو اپنی ترقی کی ضرور خواہش ہوتی ہے اور اس کے لیے وہ تگ و دو کرتا ہی رہتا ہے۔ اس کا چلایا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر جا لگا تھا۔ نجمی نے لیڈی کانسٹیبل کی طرف جلالی نظروں سے پہلے سے زیادہ گھور کر دیکھا اور کہا ”بچی! تیرا ایک دشمن ہے جس نے تیرے گھر میں راکھ پھنکوائی ہے۔

کس کا دشمن نہیں ہوتا اور پھر پولیس کے محکمے میں تو یہ دشمنیاں چلتی ہی رہتی ہیں“ لیڈی کانسٹیبل نے ہاتھ باندھ کر کہا ”ماتا! تم انتریامی ہو میرا ایک ہی دشمن ہے وہ میری جگہ خود ہیڈ کانسٹیبل بننا چاہتا ہے۔،،

پھر ادھر ادھر دیکھ کر بولی ”ماتا! میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ مجھے اپنی سیوا کرنے کا موقع دو تم تو دلوں کا حال جانتی ہو مجھ پر کرپا کرو۔،،

نجمی خود یہی چاہتی تھی۔ اس نے پہلے تو صاف انکار کر دیا کہ سنیاسی لوگ کسی کے گھر نہیں جاتے۔

لیکن جب لیڈی کانسٹیبل اس کے آگے بچھ گئی تو نجمی نے سر اٹھا کر کہا: "اچھا بچی! ہم تیرے گھر چلیں گے۔ تیرے پچھلے جنم کے کرموں کا پھل تمھیں ضرور دلوائیں گے تیرے دشمنوں کا ناش کر دیں گے۔"

ضعیف الاعتقاد ہندو لیڈی کانسٹیبل کو اور کیا چاہیئے تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ نجمی کو اپنے ساتھ رکشے میں بٹھائے اپنے گھر لیے جا رہی تھی۔ لیڈی کانسٹیبل اپنی ماں کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی اور وہ اپنی ماں کے ساتھ سیتلا مندر کے قریب ہی ایک گلی میں رہتی تھی ایک جوان اور خوبصورت جوگن کو اپنے گھر میں رام نام کا جاپ کرتے، آتا دیکھ کر، لیڈی کانسٹیبل کی ماتا نے جلدی سے دالان میں چادر بچھا دی۔ لیڈی کانسٹیبل نے اپنی ماں کو ایک طرف لے جا کر بتا دیا کہ جوگن ماتا بڑی پہنچی ہوئی ہے اور دلوں کے بھید جانتی ہے۔ اب نجمی کی آؤ بھگت شروع ہو گئی۔ نجمی نے بھی بہت جلد ان ماں بیٹی کے دل پر اپنا سکہ جما دیا۔ یونہی پانی سے بھری ہوئی کٹوری پر دم کر کے مکان کی دہلیزوں پر چھڑکوایا۔ کچھ اوٹ پٹانگ اشلوک پڑھ کر فضا میں پھونکیں ماریں اور کہا: "کوشلیا بچی! ہم نے تیرے دشمن کا کیا ہوا جادو بھنگ کر دیا ہے اب تجھے ہیڈ کانسٹیبل بننے سے کوئی نہیں روک سکتا لیکن اس کے لیے ہمیں تیرے گھر میں کچھ روز ٹھہر کر شیراں والی ماتا کا چلہ کاٹنا ہو گا۔"

کوشلیا اس لیڈی کانسٹیبل کا نام تھا ان کو اور کیا چاہیئے تھا۔ ہاتھ باندھ کر ماں بیٹی یک زبان ہو کر بولیں: "ماتا یہ ہمارے دھن بھاگ ہیں کہ آپ ہماری کٹیا میں پدھاریں اور ہمیں سیوا کرنے کا موقع دیا۔"

دوپہر کا کھانا بڑا پر تکلف تھا رات کو بھی کھانے میں پوریاں کچوریاں اور مٹھائی تھی نجمی نے خوب مزے لے کر کھایا اور کہا "ہم شیراں والی ماتا کے چیلے ہیں ہمیں شیروں کی طرح کھانے کی آگیا دی گئی ہے۔"

رات کو جب کوشلیا کی ماتا اپنی کوٹھڑی میں جا کر سو گئیں تو نجمی نے کوشلیا سے کہا: "ہم آج رات شیراں والی ماتا کا چلہ کریں گی ہمارے سرہانے ایک دیا جلا کر رکھ دو۔"

کوشلیا نے فوراً مٹی کا دیا جلا کر نجمی کی چارپائی کے سرہانے رکھ دیا اور خود اس کے پاؤں چھو کر دوسری کوٹھڑی میں چلی گئی۔ کچھ دیر تو نجمی چارپائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھی رہی لیکن پھر مرغن غذا نے

اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا اور نجمی اونگھنے لگی اس نے "جے ماتا شیراں والی" کا ایک ہلکا سا نعرہ لگایا اور چارپائی پر لیٹ کر گہری نیند سو گئی۔

صبح اس نے کوشلیا کو اپنے پاس بٹھا لیا اس کی ماں رسوئی میں چلائے کچوریاں تیار کر رہی تھی نجمی نے اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے دوسرے مرحلے پر عمل کرتے ہوئے کوشلیا کی طرف جلالی انداز میں دیکھتے ہوئے کہا: "تمھارے دھن بھاگ ہوں کوشلیا! رات ماتا شیراں والی نے ہمیں درشن دیئے ہیں۔"

"سچ ماتا جی؟" یہ کہہ کر کوشلیا نے نجمی کے پاؤں چوم لیے۔

نجمی نے کہا "شیراں والی ماتا نے کہا ہے کہ تیرے راستے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے پر تو چنتا نہ کر ہم وہ رکاوٹ دور کر دیں گے یہ بتا کہ اس شہر میں کوئی بڑی جیل بھی ہے؟"

"ہاں ماتا! امرتسر میں ہمارے پنجاب پرانت کی سب سے بڑی جیل ہے۔"

نجمی جیسے گہری سوچ میں ڈوب گئی پھر سر اٹھا کر کہنے لگی: "کوشلیا! اس جیل میں کس کا حکم چلتا ہے؟"

کوشلیا نے ہاتھ باندھ رکھے تھے کہنے لگی۔

"ماتا! جیل کے جیلر کا حکم چلتا ہے اس کا نام ملک راج بھاکھڑی ہے۔"

نجمی نے پوچھا: "یہ بتا اس کی پتنی تیرے خلاف کیوں ہے؟"

کوشلیا نے عرض کی: "ماتا! میں نے اسے صرف ایک بار ہی دیکھا ہے۔ بھگوان جانے وہ میرے خلاف کیوں ہے؟"

نجمی نے کہا: "رات مجھے شیراں والی ماتا نے بتایا ہے کہ اس شہر کے جیل خانے پر جس کا حکم چلتا ہے اس کی پتنی کوشلیا کے خلاف اپنے پتی کے کان بھرتی ہے۔"

کوشلیا بولی: "مگر ماتا! اسے میرے ساتھ کیا دشمنی ہو سکتی ہے وہ ایک بڑے افسر کی پتنی ہے۔ میں ایک معمولی کانسٹیبل ہوں۔"

نجمی نے گرج کر کہا: "دشمنی پچھلے جنم سے چلی آ رہی ہے۔ وہ تیری جگہ اپنی ایک رشتے دار عورت کو ترقی دلانا چاہتی ہے۔"

کوشلیا لیڈی کانسٹیبل نے نجمی کے پاؤں پکڑ لیے " ماتا! مجھ پر کرپا کیجئے کوئی ایسا چلہ کریں کہ مجھے ترقی مل جائے ہم غریب ہیں۔ ابھی مجھے اپنے بیاہ کے لیے جہیز بھی اکٹھا کرنا ہے۔"

نجمی نے مزید کریدتے ہوئے پوچھا: "تو چنتا نہ کر شیراں والی ماتا تیری مدد کرے گی یہ بتا کہ جیل کے بڑے افسر کی پتنی چھپ چھپ کر کسی سے ملتی ہے کیا؟"

یہ بھی نجمی نے اندھیرے میں ایک تیر چلا دیا تھا کہ اگر جیلر کی بیوی کا کوئی اسکینڈل ہوگا تو کوشلیا تک یہ بات ضرور پہنچی ہو گی اور آگے چل کر نجمی کے لیے یہ بات بڑی فائدہ بخش ثابت ہو گی۔

"ماتا! آپ تو دلوں کے بھید جانتی ہیں پھر میرا منہ کیوں کھلواتی ہیں۔"

نجمی نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا: "ہم تیری زبان سے سننا چاہتے ہیں۔"

کوشلیا نے فوراً ہاتھ باندھ لیے اور کہا: "ماتا! میں نے سنا ہے کہ جیلر صاحب کی پتنی کملا جیل کے وارڈن روپ کمار سے راتوں کو چھپ چھپ کر ملتی ہے۔ جیلر صاحب تو اپنی پتنی کملا پر جان چھڑکتے ہیں ان کی شادی کو تین سال ہوئے ہیں کوئی اولاد نہیں ہوئی جیلر صاحب کئی مندروں کی یاترا کر آئے ہیں کہ اولاد ہو۔ کملا اپنے پتی کو کچھ نہیں سمجھتی۔ وہ تو سنا ہے وارڈن روپ کمار سے بیاہ بھی کرنا چاہتی ہے۔"

اتنی معلومات نجمی کے لیے کافی تھیں اس نے تلخ لہجے میں کہا: "بس بس کوشلیا! کسی کے عیب بڑھ چڑھ کر بیان نہ کر تیری زبان سے ہمیں جو سننا تھا سن لیا اب ہماری بات غور سے سن یہ جیلر صاحب کی پتنی کملا تیرے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ بن کر کھڑی ہے۔"

کوشلیا نے گڑگڑا کر کہا۔

"ماتا کسی طرح یہ رکاوٹ ہٹا دو میں تمہارے چرن دھو دھو کر پیوؤں گی۔"

نجمی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا: "خبردار آئندہ بیچ میں مت بولنا۔ سن! اس لیے ہمیں کملا کے گھر میں جا کر پورے سات دن چلہ کرنا ہوگا۔ شیراں والی ماتا کا بھی یہی حکم ہے۔"

کوشلیا تو خوشی سے نہال ہو رہی تھی کہ یہ جوگن ماتا اس کی خاطر اتنی تکلیف کرنے والی ہے وہ ہاتھ باندھے خاموش بیٹھی تھی نجمی نے کہا: "اب ہم تجھ سے جو جو پوچھیں بتاتی جا۔"

نجمی نے بڑے طریقے سے اس لیڈی کانسٹیبل کوشلیا سے امرتسر جیل کے جیلر ملک راج بھاکڑی اس کے خاندان، کملا اور کملا کے خاندان کے بارے میں مزید ضروری باتیں معلوم کر لیں ان میں جیلر ملک راج بھاکڑی اور اس کی بیوی کملا کا حلیہ وغیرہ بھی شامل تھا تب نجمی نے کہا۔

"کوشلیا! ہمیں شیراں والی ماتا کے حکم پر آج ہی کملا کے گھر جا کر رات کو چلہ شروع کر دینا ہوگا۔ اگر یہ کر دی تو تیرے دشمنوں کا جادو چل جائے گا شیراں والی ماتا تجھ پر بڑی مہربان ہے۔"

ساتھ ہی نجمی نے کوشلیا کو خاص طور پر تاکید کر دی کہ وہ یہ بات کسی کو نہ بتائے کہ وہ جیلر کی کوٹھی پر چلہ کرنے جا رہی ہے: "اپنی ماتا سے بھی اس بات کو چھپانا ورنہ تیری موت ہو جائے گی۔"

کوشلیا بھلا کیسے کسی کو بتا سکتی تھی۔ کہنے لگی: "ماتا! میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ پرنتو تم واپس میرے پاس ضرور آنا۔"

نجمی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "کوشلیا! ہم سات دن کے بعد سیدھا تیرے پاس ہی آئیں گے اور تجھے یہ اچھی خبر سنائیں گے کہ تیرے دشمنوں کو شکست ہو گئی ہے۔ سات دن کے بعد ہی تیری ترقی ہو جائے گی۔"

کوشلیا خوشی سے پھول گئی اتنے میں اس کی ماتا کچوریاں اور چائے لے آئی نجمی نے ڈٹ کر ناشتہ کیا اور کوشلیا کی ماتا سے کہا: "ہم کچھ دنوں کے لیے ہردوار جا رہے ہیں۔ سات دن بعد واپس آ کر درشن دیں گے۔"

کوشلیا کی ماتا بالکل گائے تھی ہاتھ جوڑے دوزانو بیٹھی تھی بولی: "جو حکم ماتا دیوی کا ہمارے اگن بھاگ کہ آپ پھر ہمارے گھر پدھاریں گی۔"

تھوڑی دیر بعد نجمی کوشلیا کی گلی سے نکل کر سائیکل رکشے میں سوار امرتسر کی سب سے بڑی جیل کی طرف جا رہی تھی اس نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ جیلر ملک راج بھاکڑی کی کوٹھی جیل کے احاطے کے اندر ہی ایک طرف بنی ہوئی ہے۔ دور سے سنٹرل جیل امرتسر کا دروازہ نظر آیا تو نجمی رکشے سے اتر گئی۔ اور پیدل ہی ہاتھ میں مالا لیے "رام نام" کا جاپ کرتی جیل کی طرف چل پڑی۔ دل میں ایک ہلکا سا دھڑکا ضرور تھا کہ کہیں کوئی سپاہی یا وہاں آیا ہوا تھانیدار اسے پہچان نہ لے۔ کہیں آمنا سامنا تھانیدار ہی سے نہ ہو جائے لیکن نجمی کو یقین تھا کہ سر منڈے ہوئے جوگن کے حلیے میں وہ پہچانی نہیں جا

سکے گی۔ جیل کا بہت بڑا آہنی دروازہ بند تھا۔ باہر ایک سکھ کانسٹیبل بندوق کاندھے پر رکھے پہرہ دے رہا تھا اس نے ایک جوگن کو اپنی طرف آتے دیکھا تو ہاتھ کے اشارے سے اسے واپس جانے کو کہا مگر نجمی واپس جانے کے لیے وہاں نہیں آئی تھی اس نے اپنا مالا والا ہاتھ فضا میں بلند کرتے ہوئے کہا "ہمیں جیلر صاحب کی پتنی کملا دیوی نے بلایا ہے۔"

جیلر کی بیوی کا نام سنتے ہی سکھ سپاہی اٹین شن ہو گیا نجمی کو اندازہ تھا کہ اس وقت جیلر دفتر میں ہو گا اور کملا کوٹھی میں اکیلی ہو گی وہ اسے تنہائی میں ہی ملنا چاہتی تھی۔ سکھ سپاہی کے لیے ایک جوگن بے ضرر سی ہستی تھی اس نے چھوٹا دروازہ کھول دیا اور نجمی اس میں سے گزر کر دوسری طرف چلی گئی۔ دوسری طرف ایک بہت کشادہ صحن تھا جس کے سامنے کی جیل کا ایک اور آہنی دروازہ تھا پہلو کی جانب قیدیوں سے ملاقات کے لیے برآمدے میں سلاخدار جنگلے لگے تھے۔ بائیں جانب ایک خوش نما باغ تھا جس کے بیچ میں ایک چھوٹی سی کوٹھی تھی۔ باغ کے لان میں کچھ قیدی گھاس وغیرہ صاف کر رہے تھے نجمی کوٹھی کی طرف بڑھی کوٹھی کے باہر چوکور ستون پر انگریزی اور ہندی میں جیلر ملک راج بھاکڑی کا نام اور پورا عہدہ ایک تختی پر لکھا تھا۔ جامن کے درخت کے نیچے سوکھے پتوں کو ایک قیدی مالی سمیٹ رہا تھا اس نے ایک سرمنڈی جوگن کو کوٹھی کے برآمدے کی طرف بڑھتے دیکھا تو جلدی سے نجمی کے پاس آ کر پوچھنے لگا "سنیاسنی جی کس سے ملنا ہے تمھیں؟ کہاں جا رہی ہو منہ اٹھائے؟"

نجمی نے گردن تیزی سے گھما کر قیدی مالی کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا اور مالا والا ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا "جیلر کی پتنی کو بلاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی سامنے والے ڈرائینگ روم کا جالی دار دروازہ کھلا اور ایک گوری چٹی خوبصورت عورت ماتھے پر تلک لگائے، جامنی ساڑھی پہنے باہر نکلی اس نے ایک جوگن کو دیکھا تو غصّے سے جھڑک کر بولی "کون ہو تم ادھر کیا لینے آئی ہو؟"

نجمی سمجھ گئی کہ یہی کملا ہے۔ اس نے عورت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور پوچھا "کیا تم ہی کملا ہو؟"

"ہاں کملا ہی ہوں مگر تمھارا یہ روپ یہاں نہیں چلے گا" کملا نے تنک کر کہا "تیری جیسی کئی...

جوگنیں میں نے دیکھی ہیں۔" نجمی نے اپنے ہونٹوں پر ایک طنزیہ تبسّم طاری کیا اور انگلی آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا "تیرا سندر روپ تو ایسا ہے کہ تیرا بیاہ کسی راج کمار سے ہونا چاہیئے تھا۔"

نجمی نے جان بوجھ کر ایسا جملہ بولا تھا جس میں کملا کے عاشق روپ کمار کا نام بنتا تھا۔ جیلر کی بیوی نے یہ جملہ سنا تو قیدی مالی سے کہا "تم جا کر اپنا کام کرو۔"

اور نجمی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بولی "سنیاسنی ماتا پدھاریئے میرے دھن بھاگ کہ آپ نے درشن دیئے۔"

نجمی نے دل میں کہا "اب آئی ہو سیدھی راہ پر۔" اور کملا کے آگے آگے ڈرائینگ روم میں داخل ہو گئی۔

* * *

ڈرائنگ روم میں آرائشی سامان کی بھرمار تھی مگر وہ بڑے بھدے طریقے سے سجایا گیا تھا یہ ایک ایسی عورت کا ہی ڈرائنگ روم ہو سکتا تھا جسے اپنے خاوند سے اور اس کے گھر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور جو کسی دوسرے مرد سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ آرائشی سامان میں زیادہ تعداد ان اشیائ کی تھی جو جیل کے قیدیوں نے تیار کی تھیں۔ کارنس کے اوپر کرشن بھگوان کی مورتی رکھی تھی جس کے آگے تھالی میں رتن جو کے کچھ پھول پڑے تھے۔ نجمی نے ڈرائنگ روم میں آتے ہی چاروں طرف ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور کملا کی طرف مڑ کر کہا۔

"سن کملا میری بات دھیان سے سن مجھے پہاڑوں سے اتر کر تیرے پاس آنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن مجھے شیراں والی ماتا نے تیرے نام ایک سندیسہ دے کر بھیجا ہے"۔

جیلر کی خوبصورت خوش لباس بیوی کملا تو نجمی کے آگے بچھ گئی۔ جلدی سے بولی "ماتا جی آپ بیٹھ جائیں میرے دھن بھاگ کہ ماتا شیراں والی نے مجھے یاد کیا ہے"، اور کملا کی آنکھوں میں فرطِ عقیدت سے آنسو آ گئے۔ نجمی نے تیز لہجے میں کہا "آنسو مت بہا میری بات دھیان سے سن! تو نے ایک سادھو کو ایک بار کھانا کھلایا تھا ماتا شیراں والی کو تیرا یہ کام پسند آ گیا اس نے تیرے نام ایک سندیسہ بھیجا ہے"۔

نجمی جانتی تھی کہ اس ملک میں جوگی سادھو عام پھرتے رہتے ہیں اور ہندو عورتیں انھیں بھوجن بھی کرواتی رہتی ہیں تو کبھی نہ کبھی کملا نے بھی کسی سادھو کو کھانا ضرور کھلایا ہو گا۔ کملا بڑے ادب سے قالین پر ہاتھ باندھ کر بیٹھ گئی۔

"ماتا جی! شیراں والی ماتا جی نے مجھ جنم جلی کے پاس کیا سندیسہ بھیجا ہے میں شیراں والی ماں کی

جنم جنم کی داسی ہوں"۔

ایک نوکرانی ڈرائنگ روم میں کسی کام سے آ گئی۔ نجمی نے اس کی طرف اشارہ کیا اور کملا سے کہا "اسے یہاں سے باہر نکال دو"۔

کملا نے فوراً نوکرانی کو وہاں سے باہر بھیج دیا۔ اب نجمی نے چاروں طرف غور سے دیکھا اور کملا کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی "کملا شیراں والی ماں نے تمھیں سندیسہ بھیجا ہے کہ تیرے ہاں چاند سا لڑکا ہو گا"۔

کملا نے کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہ کیا نجمی کو معلوم تھا کہ کملا اپنے جیلر خاوند سے طلاق لے کر جیل کے وارڈن روپ کمار سے بیاہ کرنا چاہتی ہے۔ پھر بھی کملا نے ہاتھ باندھے عرض کی "میرے دھن بھاگ ماتا"۔

نجمی نے اچانک اپنا مالا والا ہاتھ کملا کے کندھے پر رکھ دیا اور بولی "یہ بھی دھیان سے سن کہ یہ لڑکا تیرے خاوند ملک راج بھاکڑی سے نہیں بلکہ روپ کمار سے ہو گا"۔

کملا اپنی جگہ پر ساکت ہو گئی جب آتے ہی نجمی نے روپ کمار اور راج کمار کا نام لیا تھا تو کملا سمجھ گئی تھی کہ یہ کوئی پہنچی ہوئی جوگن ہے اور دلوں کے بھید جانتی ہے۔ اب جو اس نے صاف صاف یہ بات کر دی تو کملا نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اٹھ کر اندر والے دروازے کا پردہ ہٹا کر دوسری طرف دیکھا کہ کسی نے جوگن ماتا کی آواز تو نہیں سن لی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور نجمی کے چرنوں کے پاس بیٹھ کر ہاتھ جوڑ کر بولی "ماتا تم انتریامی ہو تم پر دلوں کا بھید کھلا ہوا ہے شیراں والی ماں نے میرے آتما کو پرسن کر دیا ہے۔ میں ماتا کی آبھاری ہوں پر جوگن ماتا یہ کیسے ہو سکتا ہے میرا بیاہ تو بھاکڑی صاحب سے ہو چکا ہے"۔

نجمی نے کملا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"مگر تم روپ کمار سے پیار کرتی ہو تم اس سے بیاہ کرنا چاہتی ہو کیا میں جھوٹ کہہ رہی ہوں؟ شیراں والی ماں نے مجھے تمھارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے"۔

کملا نے روتے ہوئے اپنا سر نجمی کے قدموں پر رکھ دیا۔ نجمی نے اپنے پاؤں کو ایک لمحے کے لیے بھی پیچھے نہ ہٹایا۔ کملا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "جوگن ماتا! کہیں میں پاپ تو نہیں کر رہی؟

بیاہ میری مرضی کے خلاف ہوا ہے مجھے شروع ہی سے روپ کمار سے پریم تھا۔ شادی کے بعد میں نے اپنے پتی سے کہہ کر اسے یہاں جیل میں وارڈن لگوایا ہے۔"

نجمی نے کہا: "پریم کرنا پاپ نہیں ہے بچی اور شیراں والی ماں اگر چاہے تو وہ کیا نہیں کر سکتی۔ تمھارا بیاہ ایک سال بعد روپ کمار سے ہو جائے گا۔"

کملا کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ اس نے نجمی کے پاؤں پکڑ لیے۔ "ماتا جوگن! کیا ایسا ہی ہوگا؟"

"ایسا ہی ہوگا بچی!" نجمی نے کہا۔ "پھر تیرے گھر شیراں والی ماں ایک پتر دے گی، تو دولت میں کھیلے گی۔ راج کرے گی۔ لکشمی دیوی تجھ پر مہربان ہوگی لیکن اس کے لیے ایک شرط ہے۔"

کملا نے جلدی سے پوچھا "مجھے ہر شرط منظور ہے۔"

نجمی نے کہا "یہ شرط تجھے نہیں مجھے پوری کرنی ہوگی میں یہ کشٹ کبھی نہ اٹھاتی مگر میں شیراں والی ماں کی داسی ہوں اس کے حکم کے آگے میں سر نہیں اٹھا سکتی۔ شیراں والی ماں کے حکم سے مجھے تیرے گھر پر ایک مہینہ ماں کا چلہ کاٹنا ہوگا۔"

کملا نے فوراً ہاتھ جوڑ کر کہا "جوگن ماتا میرا گھر آپ کا گھر ہے آپ کی سیوا کر کے تو میرا جنم سپھل ہو جائے گا۔ مگر ماتا جی ایک بنتی کروں گی۔"

نجمی جانتی تھی کملا کیا کہنے والی ہے۔ اس نے چھت پر لگے پنکھے کی طرف نظریں اٹھا کر پوچھا "میں جانتی ہوں تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ تم چنتا مت کرو۔ تیرے پتی دیو کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔"

کملا تو نجمی کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو گئی۔ "میا! آپ تو دل کا حال جانتی ہیں۔"

نجمی نے گہری سانس کھینچ کر "جے شیراں والی ماتا کی" کا ایک ہلکا سا نعرہ لگایا اور کملا کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "بچی! روپ کمار تیرے پچھلے جنم میں بھی تیرا خاوند تھا۔ اس جنم میں بھی تیرا اسے پتی دیو ہونا تھا۔ پر اس سے ایک پاپ ہو گیا جس کے کارن تم دونوں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ لیکن شیراں والی ماں کے حکم سے تم ایک بار پھر مل جاؤ گے اور اس کے آگے جنم میں

ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارو گے۔"

نجمی نے کملا کے دل کا حال کتاب کی طرح کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا اور شیراں والی ماں کے حوالے سے اسے یہ خوش خبری بھی سنا دی تھی کہ نہ صرف یہ کہ اس جنم میں وہ وارڈن روپ کمار کی بہت جلد پتنی بن جائے گی بلکہ ہر جنم میں اس کی پتنی ہی رہے گی۔ نجمی نے کہا "تمھارے گھر میں مجھے صرف ایک چھوٹی سی کوٹھڑی چلہ کرنے کے لیے چاہیے۔ تم اپنے پتی دیو سے کہہ دینا کہ جوگن ماتا اولاد کے لیے ہمارے ہاں چلہ کرنے آئی ہے اور اسے شیراں والی ماں نے بھیجا ہے۔"

کملا نجمی کے پاؤں دباتے ہوئے بولی "ماتا! ایسا ہی ہوگا، بھاگڑی جی تو شیراں والی ماں کے پجاری ہیں۔ وہ تو اولاد کی خاطر وہاں دو بار یاترا بھی کر آئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے" نجمی نے جلال آمیز لہجے میں کہا "ہمیں یہ بھی شیراں والی ماں نے بتا دیا ہے۔ باقی ہم خود تمھارے پتی سے بات کریں گے۔"

کملا بولی "ماتا آپ میرے کمرے میں بیٹھ کر چلہ کریں آپ کو وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی آپ کو جس چیز کی ضرورت ہوگی میں آپ حاضر کر دوں گی۔"

نجمی اٹھ کھڑی ہوئی "ہمیں اپنا کمرہ دکھاؤ۔"

کملا نجمی جوگن کو اپنے کمرے میں لے گئی یہ کمرہ چھوٹا تھا لیکن سامان سے بھرا پڑا تھا۔ فرش قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ باتھ روم ساتھ ہی تھا۔ نجمی صوفے پر بیٹھ گئی۔ "یہ جگہ ہمارے چلے کے لیے ٹھیک رہے گی۔"

کملا جلدی سے بولی، "ماتا آپ آرام کریں میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

نجمی نے اسے منع نہ کیا۔ کملا چلی گئی تو نجمی نے کمرے کا جائزہ لیا اس کی عقبی دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی بھی تھی۔ نجمی نے اٹھ کر کھڑکی کھولی۔ پیچھے چھوٹا سا برآمدہ تھا جس کے آگے کوٹھی کا عقبی لان تھا جہاں کوٹھی کی دیوار آم اور جامن کے درختوں میں نصف چھپ گئی تھی۔ اس کے پیچھے جیل کی اونچی دیوار تھی۔ نجمی نے سوچا اگر یہ کوٹھی جیل کے احاطے سے باہر ہوتی تو بادل کو وہاں سے نکال لے جانے میں زیادہ آسانی ہوتی۔ اب نجمی کو زیادہ سوچ بچار اور چالاکی سے کام لینا تھا اس کے لیے وہ پوری طرح تیار ہو کر آئی تھی۔ نجمی نے اسی کمرے میں اپنا آسن جما لیا۔ کملا خود

جائے بنا کر لائی تھی۔ اس نے مٹھائی کی تھال نجمی کے سامنے بڑے ادب سے رکھتے ہوئے کہا "ماتا اسے سوئیکار کریں میں نے خود بنائی ہے"۔

نجمی کو کملا کی زبانی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا جیلر خاوند دن کے ایک بجے کھانا کھانے کوٹھی پر آتا ہے۔ اس سے پہلے پہلے نجمی نے کملا کے ذریعے نوکرانی کو باہر بھیج کر سندھور، زعفران، ہرمل، لوبان اور گیندے کے پھول منگوا لیے تھے۔ وہ اب صوفے کے آگے قالین پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ کانسی کی تھالی میں پوجا کی ساری سامگری رکھی ہوئی تھی۔ لوبان سلگ رہا تھا۔ گیندے کے کیسری پھولوں کے بیچ میں نجمی نے کرشن بھگوان کی گھر میں پڑی ہوئی کانسی کی مورتی منگوا کر رکھ دی تھی۔ کملا کے خاوند کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ دیوار پر لگا ہوا کلاک ایک بجا رہا تھا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی، کملا نے کہا "بھاکڑی جی آگئے ہیں"۔

نجمی نے دل میں کہا تیرے بھاکڑی ہی کا مجھے انتظار تھا۔ اوپر سے بولی "اسے ادھر لے آ۔ ہم آشیرباد دیں گے"۔

کملا تیزی سے باہر نکل گئی۔ ڈرائنگ روم میں ایک اونچے قد کا چوڑے شانوں والا آدمی کوٹ پتلون پہنے ہاتھ میں چمڑے کا بریف کیس لیے داخل ہو چکا تھا۔ کملا کی طرف دیکھے بغیر اس نے بریف کیس صوفے پر پھینک دیا اور کوٹ اتارتے ہوئے بولا "کملا جی! آج کیا پکایا ہے یہ پنکھا چلا دو۔ ستمبر جا رہا ہے اور گرمی نہیں جاتی"۔

اس نے اپنے آپ کو صوفے پر دھم سے گرا لیا۔ کملا نے چھت والا پنکھا چلا دیا۔ جیلر بھاکڑی نے فضا میں ناک سے سونگھتے ہوئے پوچھا "کملا جی! یہ آج کوئی خاص پوجا پاٹھ ہو رہی ہے لوبان کی خوشبو آرہی ہے؟"

کملا اپنے جذبات کو بڑی مشکل سے قابو میں کرتے ہوئے اپنے خاوند بھاکڑی کے قریب آکر بیٹھ گئی اور بولی۔

"راج جی! ہمارے گھر میں بھگوان کی اوتار آئی ہوئی ہے"۔

"کیا مطلب" بھاکڑی نے کملا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

تب کملا نے اسے سب کچھ بتا دیا کہ ایک بڑی پہنچی ہوئی جوگن ماتا ان کے مکان پر پدھاری ہے

جو شیراں والی ماں کی داسی ہے"۔

"شیراں والی ماں نے اسے ہمارے گھر خوشی کی خبر دے کر بھیجا ہے کہ بہت جلد ہمارے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا"۔

بھاکڑی پڑھا لکھا ہندو تھا مگر وہ بھی ضعیف الاعتقاد تھا اور دیوی دیوتاؤں کے نام پر اپنے آپ اس کا سر جھک جاتا تھا اور پھر وہ شیراں والی ماں کا چیلا بھی تھا۔ اسے اولادِ نرینہ کی شدید خواہش بھی تھی اور اس مراد کو لے کر وہ دو بار ماتا شیراں والی کے مندر کی یاترا بھی کر چکا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا کہ کہیں یہ کوئی ڈھونگی عورت نہ ہو جو اولاد کا لالچ دے کر ان کا مال ٹورنے آگئی ہو۔ مگر جب کملا نے "جوگن ماتا" کے بارے میں واقعات بیان کر کے بتایا کہ وہ دل کا سارا حال جان لیتی ہے تو بھاکڑی بولا۔

"مجھے اس کے چرنوں میں لے چلو"۔

جیلر بھاکڑی جب اپنی خوبصورت بیوی کملا کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو نجمی قالین پر آسن جمائے آنکھیں بند کیے آرام سے میٹھی رام نام کا جاپ کر رہی تھی۔ مالا اس کی انگلیوں میں پھر رہی تھی۔ کانسی کی تھالی میں کرشن کی مورتی کے آگے لوبان سلگ رہا تھا۔ جیلر بھاکڑی نے غور سے نجمی کو دیکھا۔ گیروے کپڑوں میں بیٹھی گیان دھیان میں مشغول جوگنی اسے عجیب سی لگی۔ اتنی جوان جوگن بھاکڑی نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی لیکن اس کے ہندو مت نے اس کے خون میں یہ بات ڈال دی ہوئی تھی کہ کرشن بھگوان اور ماتا شیراں والی کی عقیدت میں جوان لڑکیاں جوگنیں بھی ہو جاتی ہیں اور دیوداسیاں بن کر اپنی ساری زندگی مندروں کے لیے وقف کر دیتی ہیں۔ تب نجمی نے آنکھیں کھول کر گہری نظروں سے کملا کے خاوند راج بھاکڑی کو دیکھا اور اپنا ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔

"تیرے بھاگ جاگنے والے ہیں ملک راج! ماتا شیراں والی کی کرپا سے اس گھر میں ایک لڑکا جنم لینے والا ہے جو بڑا بھاگیہ وان ہوگا"۔

پھر نجمی نے کانسی کی تھالی میں سے گیندے کا کیسری پھول اٹھا کر اسے کرشن کی مورتی کی آنکھوں سے لگایا اور جیلر بھاکڑی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:

"اس پھول کو ہمیشہ اپنی جیب میں رکھنا یہ بھگوان سری کرشن کے بندرابن کی کنج کا پھول ہے

تیرے سارے پاپ کٹ گئے۔ شیراں والی ماں تجھ پر مہربان ہو گئی۔"

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان باتوں کا ایک ایسے ہندو پر اثر نہ ہوتا جس نے پوجا کے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اور جو خود شیراں والی ماں کا پجاری تھا۔ جیلیہ بھاکڑی نے فوراً دونوں ہاتھ بڑھا کر بڑی عقیدت سے گیندے کا پھول لے لیا اسے آنکھوں سے لگایا چوما اور اپنی جیب میں رکھ لیا پھر ادب سے بولا۔

"ماتا میں شیراں والی میا کا داس ہوں اور تیرا بھی داس ہوں۔ میرے ہاں ایک پتر ہو جائے میں ماتا کے مندر میں سونے کا پنجہ چڑھاؤں گا۔"

نجمی نے اس کے بعد ایسی باتیں کیں کہ جیلیہ بھاکڑی قدرتی طور پر اس کا گرویدہ ہو گیا آخر میں نجمی نے کہا۔

"ہم ماتا شیراں والی کے حکم سے یہاں چلّہ کرنے آئے ہیں۔ ہمیں تم سے کسی قسم کا لالچ نہیں ہے چلّہ کر کے ہم جیسے آئے ہیں ویسے ہی چلے جائیں گے۔ ہمارے جانے کے نو ماہ بعد تم سونے کا پنجہ چڑھانے ماتا کے مندر میں آ جانا۔"

جیلیہ بھاکڑی نے نجمی کے قدم چھو کر کہا۔

"ماتا! میں ضرور آؤں گا۔ شیراں والی ماں نے مجھ پر کرپا کی ہے میں کتنا بھاگیہ وان ہوں۔"

اور جیلیہ بھاکڑی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نجمی یہی چاہتی تھی اس کا ڈرامہ ابھی تک کامیابی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بے حد محتاط بھی تھی اس نے کملا اور اس کے خاوند بھاکڑی کو ہدایت کر دی تھی کہ کسی کو یہ نہ بتایا جائے کہ شیراں والی ماں کی داسی ان کے مکان پر چلّہ کر رہی ہے کملا نے گھر کے نوکروں اور نوکرانیوں کو صرف اتنا ہی بتایا کہ یہ جوگن اپنی مرضی سے ان کے ہاں کچھ روز کے لیے آ کر ٹھہر گئی ہے۔ نوکر نوکرانیوں نے بھی اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ کیونکہ ہندو سرمایہ داروں اور امیر گھرانوں میں جوگی جوگنیں آتی جاتی ہی رہتی تھیں۔ نجمی سارا دن کوٹھی کے کمرے میں گزارتی۔ وہ اگرچہ سخت بور ہو رہی تھی مگر بادل کی خاطر اسے ہر قسم کی جسمانی اور ذہنی تکلیف گوارا تھی۔ کیونکہ بادل ایک سچا وفادار اور نیک دل دوست تھا اور اس نے بھی نجمی کے لیے بڑی مصیبتیں جھیلی تھیں اور ابھی تک جیل میں پولیس کا تشدد برداشت کر رہا تھا۔ شام کا اندھیرا ہو جانے کے بعد

نجمی کمرے سے نکل کر پلاٹ کے درختوں میں تھوڑی دیر کے لیے اکیلی ٹہلتی اور ساتھ ہی ساتھ جیل کی دیوار کا جائزہ بھی لیتی جاتی۔

کسی وقت نجمی کو احساس ہوتا کہ جیل کی اتنی اونچی دیوار کو پار کرنا ممکن نہیں۔ جیل کی دیوار کے اوپر چاروں کونوں پر جو چیک پوسٹیں بنی ہوئی تھیں وہاں سے سرچ لائٹ کی روشنی رات بھر جیل کی دیواروں کو ٹٹولتی رہتی تھی۔ بغیر کمند کے جیل کی اتنی اونچی دیوار پار نہیں کی جا سکتی تھی جیل میں حفاظتی انتظامات نہایت سخت تھے۔ لوہے کا دروازہ کسی قلعے کے دروازے کی مانند تھا جو ہمیشہ بند رہتا تھا صرف اس کی چھوٹی کھڑکی یا بڑا نصف پٹ کسی گاڑی کے آنے جانے کے لیے کھلتا تھا۔ نجمی کو جیلیہ کے مکان میں "چلّہ" کاٹتے چھ روز گزر گئے تھے۔ اس دوران اس نے کتنے ہی منصوبوں پر غور و فکر کیا مگر بادل کو وہاں سے نکالنے کی کوئی ترکیب اس کے ذہن میں نہیں آ رہی تھی

اس اثناء میں نجمی نے یہ بھی اندازہ لگایا تھا کہ جیلیہ بھاکڑی دفتری نظم و ضبط کے معاملے میں انتہائی سخت آدمی تھا۔ جیلیہ بھاکڑی ایک دن اور ایک رات کے لیے جالندھر گیا تو کملا نے رات کو وارڈن روپ کمار کو اپنی کوٹھی پر بلوا لیا۔ اس نے نجمی کو بتا دیا تھا کہ میں اسے آج کی رات [illegible] رہی ہوں۔ نجمی نے اسے سختی سے متنبہ کیا کہ وہ اس کے بارے میں روپ کمار کو کچھ نہ بتائے ورنہ سارا چلّہ بھنگ ہو جائے گا۔"

ساتویں روز نجمی کے دماغ میں جیسے اپنے آپ ایک ترکیب آ گئی۔ یہ ترکیب کوئی مکمل اور خطرے سے خالی نہیں تھی لیکن پھر بھی اس میں فرار کا امکان موجود تھا۔ نجمی کو لیڈی کانسٹیبل کوشلیا کا بھی خیال لگا ہوا تھا وہ اسے سات روز تک جیلیہ کی کوٹھی میں چلّہ کرنے کا کہہ کر آئی تھی۔ چنانچہ آٹھویں دن نجمی نے شام کو جب کہ بھاکڑی اور کملا دونوں اس کے آس پاس [illegible] تھے اچانک اٹھتے ہوئے کہا۔

"ماتا شیراں والی نے سیتلا مندر میں بلایا ہے۔"

جیلیہ اور کملا بھی اٹھ کھڑے ہوئے ...... بھاکڑی نے کہا "میں جیپ منگواتا ہوں آپ کے لیے ماتا۔"

نجمی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا "ہمیں تمہاری جیپ کی ضرورت نہیں ہے ہم ماتا کے حکم سے

اڑ کر بھی سیتلا مندر جا سکتے ہیں لیکن سنسار والوں کے خیال سے ہم ایسا نہیں کریں گے۔ ہم پیدل چل کر سیتلا مندر کے درشن کو جا رہے ہیں۔"

اور نجمی جیلر کی کوٹھی سے نکل کر گول باغ کے سامنے والے سیتلا مندر کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ جان بوجھ کر شام کے وقت اندھیرا ہو جانے کے بعد نکلی تھی تاکہ کوئی اسے پہچان نہ لے۔ ریل کا پل عبور کر کے وہ مندر کے عقبی محلے میں آ گئی۔ یہاں گلی میں لیڈی کانسٹیبل کوشلیا کا مکان تھا۔ کوشلیا نے جوگن ماتا کو دیکھا تو خوشی سے نہال ہو گئی۔ اس کی ماتا جی نے فوراً چارپائی پر چادر بچھا دی۔ نجمی نے کوشلیا کو رازداری سے بتایا کہ وہ ایک چلہ پورا کر چکی ہے مگر ابھی سات روز کا دوسرا چلہ باقی ہے۔ ماتا شیراں والی نے حکم دیا ہے کہ کوشلیا کی ترقی کے واسطے دوسرا چلہ بھی کاٹا جائے۔ لیڈی کانسٹیبل نے نجمی کے پاؤں کو چھو کر کہا "ماتا میں تیرا احسان نہیں اتار سکتی۔"

نجمی نے کہا "اس کی ضرورت نہیں بچی! ہم ماتا شیراں والی کے حکم سے ایسا کر رہے ہیں۔ ابھی ہم زیادہ دیر نہیں رکیں گے کیونکہ ہمیں ماتا کے درشن کو سیتلا مندر بھی جانا ہے۔"

ایک گھنٹہ کوشلیا کے ہاں ٹھہرنے اور اسے اپنی جگہ پر مطمئن کرنے کے بعد نجمی واپس چل دی گول باغ سے وہ ایک سائیکل رکشا میں بیٹھی اور امرتسر سنٹرل جیل پہنچ گئی۔ جیلر بھاکڑی اور اسکی پتنی کملا اس کا انتظار ہی کر رہے تھے۔ نجمی سیدھی اپنے کمرے میں آ گئی۔ دونوں میاں بیوی بھی پیچھے پیچھے آ گئے۔ نجمی فوراً قالین پر کانسی کی تھالی کے آگے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور خوش ہو کر بولی "تم بھاگوان ہو۔ ماتا نے تمھیں اپنی آشیرباد بھیجی ہے۔"

جیلر بھاکڑی اور اس کی بیوی کملا دونوں بڑے خوش ہوئے۔ ادب سے نجمی کے سامنے ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے اپنے ہاتھ باندھ رکھے تھے اور عقیدت سے شرابور چہروں سے نجمی کو تک رہے تھے۔ اچانک نجمی نے آنکھیں کھول دیں۔ غضب آلود نگاہیں اوپر چھت پر ڈالیں اور پھر ہاتھ بلند کر کے کہا "ماتا نے خون مانگا ہے۔"

ایک پل کے لیے جیلر بھاکڑی اور کملا دونوں کانپ سے گئے۔ نجمی نے اپنی نظریں ان کے چہروں پر گاڑ دیں اور کہا "لیکن خون تمھارا نہیں بلکہ ایک راکھشش کا ہو گا جو اس وقت ایک قیدی کی شکل میں اسی جیل کی چاردیواری میں موجود ہے۔ شیراں والی ماتا نے مجھے اس کا چہرہ دکھا دیا ہے

اس کی پیٹھ پر گردن کے نیچے شیراں والی ماتا کے ایک شیر کے پنجے کا نشان ہے۔"

یہ نجمی کے منصوبے کا آخری مرحلہ تھا اور نجمی نے شب و روز کے غور و فکر کے بعد تیار کیا تھا۔ نجمی نے بادل کی پیٹھ پر ایک بار یہ نشان دیکھ لیا تھا۔ پوچھنے پر بادل نے اسے بتایا تھا کہ ایک بار وہ جنگل میں جا رہا تھا کہ درخت کے اوپر سے ایک چھوٹے چیتے نے اس پر اچانک حملہ کر کے زخمی کر دیا تھا۔ اس کی پیٹھ پر چیتے کے ایک پنجے کے ناخنوں کا نشان باقی رہ گیا تھا۔ جیلر بھاکڑی کا منہ کھلا تھا اور وہ نجمی کی طرف تک رہا تھا۔ "کیا اس قیدی کا خون کرنا پڑے گا؟"

نجمی نے فوراً کہا...... نہیں! اس راکھشش قیدی کی پیٹھ پر شیر کے پنجے کے زخم کا جو نشان ہے وہیں سے تھوڑا سا خون نکال کر اس کا تلک ماتا شیراں والی کے نام پر مجھے اپنے مستک پر لگانا ہو گا۔ اس کے بعد ماتا کا چلہ پورا ہو جائے گا اگر اس راکھشش کے خون کا تلک میں نے اپنے ماتھے پر نہ لگایا تو چلہ بھنگ ہو جائے گا۔ شیراں والی ماں ناراض ہو جائے گی اور تمھارے گھر کبھی اولاد نہیں ہو گی۔"

جیلر بھاکڑی نے جلدی سے کہا "نہیں... نہیں جوگن ماں میں اس راکھشش کو تمھارے سامنے حاضر کر دوں گا کیا وہ ہماری جیل میں ہے؟"

"ہاں"...... نجمی نے آنکھیں نکال کر کہا "شیراں والی ماں نے مجھے اس کا چہرہ بھی دکھا دیا ہے۔ میں اسے فوراً پہچان لوں گی۔ تم مجھے جیل کے قیدیوں کے چہرے دکھاؤ یہ راکھشش ابھی قیدیوں میں یہاں موجود ہے۔ پچھلے جنم میں یہ راکھشش تھا اور اگلے جنم میں یہ لومڑ کے روپ میں آئے گا۔"

جیلر بھاکڑی نے کہا "ماتا میرے پاس جیل کے تمام قیدیوں کی تصویریں دفتر میں موجود ہیں کیا آپ ان کو دیکھ کر راکھشش کو پہچان لیں گی؟"

"کیوں نہیں" نجمی نے کڑک کر کہا "شیراں والی ماں نے مجھے اس کا چہرہ صاف صاف دکھا دیا ہے۔ میں اسے فوراً پہچان لوں گی۔ یہ راکھشش تمھاری اولاد کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔"

جیلر بھاکڑی اٹھ کھڑا ہوا اور بولا "میں ابھی قیدیوں کی تصویروں والا رجسٹر لاتا ہوں ماتا"

بھاکڑی کمرے سے نکل گیا تو کملا نے نجمی کے پاؤں پکڑ کر کہا "میا کہیں اس بھاکڑی سے تو مجھے اولاد نہیں ہو گی؟ میں ایسا نہیں چاہتی ماتا! میں تو روپ کمار سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔"

نجمی نے کملا کا کندھا آہستہ سے تھپتھپایا "کملا تو کیوں پریشان ہوتی ہو یہ سب کچھ تیرے روپ کمار کے بیاہ کے لیے ہی ہو رہا ہے۔ شیراں والی ماں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے سیتلا مندر میں درشن دیئے تھے اور کہا تھا کہ کملا کا روپ کمار سے بیاہ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ جیل کے اندر جو راکھشش قیدی کی شکل میں موجود ہے اس کی پیٹھ پر شیر کے پنجے کا جو نشان ہے وہاں سے خون نکال کر میں اس کا تلک لگاؤں۔ پچی میں تو سب کچھ تیرے ہی لیے کر رہی ہوں۔ بھاکڑی سے تو تمہیں کبھی اولاد نہیں ہو گی۔ تیری تو اگلے سال روپ کمار سے شادی ہو جائے گی۔"

کملا بڑی خوش ہوئی۔ اس نے نجمی کے پاؤں سے ہاتھ لگا کر کہا "شیراں والی ماتا کی جے ہو۔"

"جے ہو" نجمی نے بھی اس کی تائید میں نعرہ لگایا۔

نجمی نے آنکھیں بند کر لیں اور خود ہی بولنے لگی "ماں شیراں والی! تیری آگیا کا پالن ہو گا، راکھشش کے خون کا تلک میرے ماتھے پر لگے گا اور کملا کا وواہ روپ کمار سے ہی ہو گا جو اس کا جنم جنم کا پتی ہے۔"

کملا کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ جھوم جھوم کر نجمی کے پاؤں دبانے لگی۔ جیلر کا دفتر وہیں جیل کے اندر ہی تھا اگرچہ رات ہو گئی تھی مگر جیلر کو اپنے دفتر میں سے کوئی فائل اٹھا کر لانے سے کون روک سکتا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جیلر بھاکڑی وہ رجسٹر نما فائل اٹھا کر لے آیا جس میں جیل کے تمام قیدیوں کی تصویریں لگی تھیں اور نیچے ان کے جرائم کی تفصیل اور سزا کی مدت لکھی ہوئی تھی۔ بھاکڑی نے یہ رجسٹر نجمی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا "ماتا! اس میں تمام قیدیوں کی تصویریں لگی ہیں اس راکھشش کو پہچان لیجیے جس کے خون کا تلک لگانا ہے۔"

نجمی نے ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا "مجھے اس کو ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہے تم خود ہی اسے کھول کر دکھاؤ۔"

جیلر نے رجسٹر کے ورق الٹنے شروع کر دیئے وہ ہر ورق الٹ کر دو سیکنڈ کے لیے توقف کرتا

اور نجمی کے نفی میں سر ہلانے سے دوسرا ورق الٹ دیتا۔ نجمی کو یقین تھا کہ اگر اس رجسٹر میں جیل کے تمام قیدیوں کی تصویریں لگی ہیں تو بادل کی تصویر بھی ضرور ہو گی۔ رجسٹر کے ورق الٹتے چلے گئے مگر بادل کی تصویر نہیں آ رہی تھی۔ نجمی کے دل میں تشویش ہوئی کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ بادل کو یہاں سے کسی دوسری جیل میں تبدیل کر دیا گیا ہو۔ پھر کیا ہو گا وہ اس کی تلاش میں یوں ماری ماری پھرے گی۔ رجسٹر کے ورق الٹے جا رہے تھے زیادہ تر سکھ قیدیوں کی تصویریں تھیں۔ نجمی کا دل ایک تصویر پر اپنے آپ زور سے دھڑک اٹھا یہ بادل کی تصویر تھی بلکہ دو تصویریں تھیں۔ ایک سائیڈ پوز تھا اور ایک سامنے کا پوز تھا۔ اس تصویر کو دیکھتے ہی نجمی نے ہاتھ بلند کر کے کہا "یہی ہے وہ راکھشش جس کی شکل مجھے ماتا والی نے سیتلا مندر میں دکھائی تھی۔"

جیلر بھاکڑی نے تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے قیدی کا نام وغیرہ پڑھا اور بولا "ماتا! یہ تو ایک قاتل ڈاکو اور پاکستانی جاسوس۔۔۔۔"

نجمی نے ترش روئی سے بھاکڑی کو جھاڑتے ہوئے کہا "تمہیں یہی معلوم نہیں کہ یہ کون ہے یہ پچھلے جنم میں راکھشش تھا اس جنم میں قاتل ہے اور اگلے جنم میں خونخوار لومڑ ہو گا۔ بس شیراں والی ماں کو اسی کے خون کی ضرورت ہے ابھی جا کر دیکھو۔ اس کی پیٹھ پر گردن سے نیچے شیر کے پنجے کا نشان ہو گا، ابھی جاؤ۔"

"جو آگیا ماتا!"

یہ کہہ کر جیلر بھاکڑی رجسٹر سنبھال کر اسی وقت اٹھا اور اپنے دفتر کی طرف تیز تیز قدموں سے چل دیا۔ دفتر میں جا کر اس نے رجسٹر کو الماری میں اس کی جگہ پر رکھ دیا اور نائب وارڈن کو جو ڈیوٹی پر تھا بلا کر کہا "سیل نمبر ۱۵ کی چابیاں لے کر میرے ساتھ آؤ۔"

جیلر بھاکڑی کو معلوم تھا کہ جس راکھشش کی تصویر جوگن ماتا نے پہچانی ہے وہ خطرناک ڈاکو بادل ہے جس پر پاکستانی جاسوس ہونے کا بھی الزام ہے۔ اس وقت جیلر بھاکڑی پر شیراں والی ماتا کا بھرپور اثر تھا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ شیراں والی ماتا انتریامی ہے اور اس کے کہنے کے مطابق بادل کی پیٹھ پر شیر کے پنجے کا نشان ضرور ہو گا۔ سیل نمبر ۱۵ جیل کے دوسرے بلاک کے تہہ خانے میں تھا رات کے وقت جیلر صاحب کو آتا دیکھ کر جمعدار اور پہرے دار چوکس ہو گئے تھے۔ وہ یہی سمجھے کہ جیلر صاحب

اچانک راؤنڈ پر آئے ہیں۔ بادل سیل نمبر پندرہ میں پھٹے پرانے بوریئے پر پڑا تھا۔ اس کی ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔

پولیس کے تشدد کی وجہ سے آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ وہ دیوار کی طرف منہ کیے، سونے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ سوچ رہا تھا کہ کیا کبھی وہ جیل کی چار دیواری سے فرار ہو سکے گا۔ چھت کے ساتھ بجلی کا بلب روشن تھا اسے قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس نے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ قدموں کی آواز جب اس کے سیل کے سلاخ دار دروازے کے پاس آ کر رک گئی اور باہر پہرے پر کھڑے سنتری کے سلیوٹ کرنے کی آواز سنائی دی تو بادل نے گردن گھما کر دیکھا۔ اسے جیل کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ سنگ دل آفیسر یعنی جیلر بھاکڑی نظر آیا جو پتھر ایسا چہرہ لیے خاموش کھڑا تھا اور اسسٹنٹ وارڈن تالہ کھول رہا تھا۔ بادل یہی سمجھا کہ اسے امرتسر سنٹرل جیل سے نابھہ یا انبالہ جیل میں بھیجا جا رہا ہے۔ اس نے بے زاری سے چہرہ دیوار کی طرف کر لیا۔ دروازہ کھلا۔

جیلر اندر آ گیا۔ پھر اس نے رعب دار آواز میں حکم دیا "کھڑے ہو جاؤ۔"

بادل مجبور تھا۔ بادلِ نخواستہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا "جیلر صاحب! آپ میرا ایک ہی بار کام تمام کیوں نہیں کر دیتے۔"

جیلر بھاکڑی نے بادل کو انگریزی میں گالی دیتے ہوئے کہا "قمیص اتارو۔"

بادل کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے چپ سا ہو گیا کہ آخر اس کی قمیص کس لیے اتروائی جا رہی ہے۔ جیلر بھاکڑی نے زور سے بادل کو ایک تھپڑ مارا اور کہا "سنا نہیں؟ اپنی قمیص اتارو۔"

بادل کو طیش تو بہت آیا مگر وہ بے بس تھا۔ اسسٹنٹ وارڈن نے زبردستی بادل کی قمیص اتار دی۔ جیلر نے کہا "دیوار کی طرف منہ کرو۔"

بادل نے دل میں جیلر بھاکڑی کو چھ سات گالیاں دیں اور دیوار کی طرف منہ کر دیا۔ چھت سے لگے بلب کی روشنی میں جیلر بھاکڑی نے بادل کی پیٹھ کو دیکھا تو دنگ ہو کر رہ گیا اس کے منہ سے زیرِ لب بے اختیار نکل گیا "جے شیراں والی ماتا کی۔" کیونکہ بادل کی پیٹھ پر گردن سے ذرا نیچے

پنجے کے زخم کا نشان صاف نظر آ رہا تھا۔

وہ کچھ کہے بغیر کوٹھڑی سے باہر نکل آیا اور تیز تیز قدموں سے اپنی کوٹھی کی طرف چلنے لگا۔

اس کے دل میں شیراں والی ماتا کے ساتھ ساتھ اپنے گھر میں آئی ہوئی جوگن ماں کی قدر و منزلت دوبالا ہو گئی تھی۔ اس کا دل دونوں کی عقیدت میں شرابور تھا۔ یہ جوگن ماتا سچی ہے۔ شیراں والی ماتا سچی ہے جوگن نے بادل کو کبھی نہیں دیکھا تھا اسے کیسے علم ہو سکتا ہے کہ اس قیدی کی پیٹھ پر شیر کے پنجے کا نشان ہے۔ یہ کرامت شیراں والی ماتا کی ہی ہے اسی نے جوگن کو بتایا ہے۔ جیلر راستے میں سوچتا آ رہا تھا۔ اب میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری ہو جائے گی میرے گھر لڑکا جنم لے گا۔ شیراں والی ماں کی ہر بات ٹھیک ہو رہی ہے۔ جب وہ واپس کمرے میں آیا تو اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ نجمی کو معلوم تھا کہ وہ کیا دیکھ کر آیا ہے۔ کملا نجمی کے چرنوں میں بیٹھی تھی۔ نجمی جان بوجھ کر خاموش رہی۔ کملا نے بے تابی سے پوچھا "کیا راکھشش کی پیٹھ پر......"

جیلر بھاکڑی نجمی کے پاؤں پر گر پڑا اور بولا "ماتا تیری جے ہو۔ شیراں والی ماں کی جے ہو اس راکھشش کی پیٹھ پر شیر کے پنجے کا نشان موجود ہے۔ میں...... میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔"

کملا "ہری اوم ہری اوم" پکارنے لگی۔ نجمی نے جیلر بھاکڑی کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور کہا "شیراں والی کا کہا کبھی جھوٹ نہیں ہو سکتا۔"

جیلر بھاکڑی کے لیے اس سے بڑی کرامت اور کیا ہو سکتی تھی۔

کہاں ہماچل پردیش کے پہاڑوں میں رہنے والی ایک سنیاسن جو دنیا کو چھوڑ چکی ہے اور کہاں وسطی ہند کا ایک بدنام ڈاکو بادل! وہ بھلا کیسے جان سکتی ہے کہ اس بدنام ڈاکو کی پیٹھ پر شیراں والی ماں کے شیر کے پنجے کا نشان موجود ہے۔ جیلر بھاکڑی تو نجمی کے سامنے سربسجود ہو گیا تھا وہ اپنا سر نہیں اٹھاتا تھا۔ نجمی کی سکیم بڑی کامیابی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اب سب سے خطرناک مرحلہ بادل کے جسم سے خون نکالنے کا تھا۔ نجمی چاہتی تھی کہ کوئی ایسی ترکیب لڑائی جائے کہ خون نکلوانے اور اپنے ماتھے پر خون کا ٹیکا لگانے کے لیے بادل کو جیل سے باہر لے جایا جائے۔ اسے یہ خطرہ بھی تھا کہ کہیں اس مرحلے پر جیلر بھاکڑی کو اس پر شک نہ ہو جائے اگرچہ اس کا امکان ایک فیصد ہی تھا تاہم ذرا سے شک پر نجمی کے کیے دھرے پر نہ صرف یہ کہ پانی پھر سکتا تھا بلکہ وہ خود بھی گرفتار ہو سکتی تھی۔ جیلر کی بیوی عاشق مزاج، کملا پر بھی نجمی کی اس "کرامت" کا بے حد اثر ہوا تھا ان دونوں کو دل سے یقین ہو گیا تھا کہ "سنیاسن" بڑی پہنچی ہوئی ہے اور شیراں والی ماں نے اسے غیب کا حال معلوم کرنے کی طاقت عطا کر رکھی ہے۔ جیلر بھاکڑی نے نجمی کے چرنوں سے اپنا سر اٹھا کر بڑے ادب سے ہاتھ باندھ کر کہا "ماتا اب مجھے اجازت دو کہ میں اس راکھشش قیدی کے جسم کے نشان میں سے خون نکال کر لے آؤں"۔

بھلا نجمی اس بات کی کیسے اجازت دے سکتی تھی۔ اسے بادل کا خون نہیں بلکہ خود بادل چاہیے تھا۔ نجمی کچھ دیر تک منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی رہی پھر جیلر بھاکڑی سے مخاطب ہو کر بولی "اس کے لیے مجھے شیراں والی ماں سے اجازت لینی ہو گی۔ کل صبح سویرے میں شیراں والی ماں کے

درشن کرنے ستیلا مندر جاؤں گی پھر جو وہ حکم دے گی ویسا ہی ہو گا۔ لیکن ایک بات تم دونوں دھیان سے سن لو اس بات کا ذکر اگر تم میں سے کسی نے بھی کسی دوسرے شخص سے کیا تو نہ صرف یہ کہ تم اولاد سے محروم ہو جاؤ گے بلکہ تم پر ماتا شیراں والی کا عذاب نازل ہو گا"۔

جیلر بھاکڑی اور کملا نے ہاتھ باندھ لیے "ماتا! ہم بھول کر بھی ایسا نہیں کر سکتے"۔

نجمی نے انہیں حکم دیا کہ اب جا کر سو جاؤ ہمارے گیان دھیان کا وقت ہو رہا ہے۔ جب دونوں نجمی کے پاؤں چھو کر چلے گئے تو نجمی نے اپنے منصوبے کو آخری شکل دینا شروع کر دی۔ سب سے بڑا مسئلہ اس کے سامنے یہی تھا کہ وہ بادل کو جیل کی چار دیواری سے باہر کیسے نکالے اور کہاں لے جائے۔ نجمی کو وہم تھا کہ جیلر بھاکڑی اس کا کتنا ہی عقیدت مند کیوں نہ ہو۔ شاید وہ اتنا اہم مجرم کو جس پر پاکستان کے جاسوس ہونے کا بھی الزام ہے جیل کی چار دیواری سے باہر لے جانے کی اجازت نہیں دے گا۔ لیکن بادل کو جیل سے باہر لے جانا بھی بہت ضروری تھا۔ جیل کے اندر رہ کر نجمی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ کافی دیر تک سوچ بچار کرنے کے بعد آخر ایک ہی راستہ اس کی سمجھ میں آیا۔ اسی پر اکتفا کر کے وہ سو گئی۔ صبح منہ اندھیرے حسبِ عادت وہ بیدار ہو گئی۔ اس نے اٹھ کر غسل کیا ماتھے پر تلک لگایا اور کمرے سے باہر آ گئی۔ ہندو لوگ صبح جلدی اٹھنے کے عادی ہیں۔ ان کی عورتیں تو منہ اندھیرے اٹھ کر پوجا پاٹھ اور گھر کے کام کاج میں لگ جاتی ہیں۔ کملا اور جیلر بھاکڑی بھی اٹھ بیٹھے تھے۔ بھاکڑی ڈرائنگ روم میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ نجمی کو آتا دیکھ کر اس نے جلدی سے اٹھ کر پرنام کیا اور بولا "ماتا! میں ستیلا مندر آپ کو چھوڑ آتا ہوں"۔

نجمی خود بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ گاڑی میں بیٹھ کر جائے۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

جیلر بھاکڑی نے فوراً اپنی چھوٹی سی گاڑی نکالی اور نجمی کو بٹھا کر جیل کے احاطے سے نکل کر ستیلا مندر کی طرف چل دیا۔ راستے میں نجمی نے اس سے کوئی بات نہ کی۔ ایک بار جیلر نے کچھ کہنے کی کوشش بھی کی لیکن نجمی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بات کرنے سے منع کر دیا وہ اسے یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ وہ ویدوں کے اشلوک کا ورد کر رہی ہے۔

ستیلا مندر میں صبح کے وقت کافی رونق تھی۔ جیلر نے گاڑی باہر ہی ایک طرف کھڑی کر دی

ابھی پولیس کے سپاہی وغیرہ وہاں نہیں پہنچے تھے۔ نجمی نے جیلر سے کہا کہ وہ گاڑی میں اس کا انتظار کرے جیلر بولا" ماتا! میں بھی مندر میں ماتھا ٹیک آؤں"۔

نجمی نے اسے سختی سے منع کرتے ہوئے کہا" ماں شیراں والی مجھے درشن دینے آرہی ہے میں تمہیں مندر میں نہیں لے جانا چاہتی"۔

"جو حکم ماتا"۔

اور جیلر گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ نجمی جوگن کے بھیس میں مندر میں گھنٹی بجانے کے بعد اندر چلی گئی۔ وہ تالاب کے اوپر بنے ہوئے راستے پر سے گزر کر مندر کے سب سے بڑے کمرے میں آگئی۔ اس نے رام اور سیتا کی مورتیوں کو ہاتھ باندھ کر پرنام کیا اور دل میں کہا" میں جانتی ہوں کہ تم صرف مٹی کے بت ہو اور کچھ نہیں ہو"۔

اس نے کبھی ان مورتیوں کے آگے ماتھا نہیں ٹیکا تھا باہر آکر اس نے مندر کے چوکور کمرے کا طواف کیا پھر ایک طرف کھمبے کے پاس بیٹھ کر غور و فکر کرنے لگی وہ اپنے منصوبہ کو آخری شکل دے رہی تھی۔ ویسے بھی وہ کچھ وقت وہاں لگانا چاہتی تھی۔ پندرہ منٹ کے بعد نجمی وہاں سے اٹھی اور واپس چل پڑی۔ جب وہ مندر کی بڑی ڈیوڑھی میں سے باہر نکل رہی تھی تو اتفاق سے امرتسر دربار صاحب تھانے کا ایس ایچ او تھانے دار آتما رام بھی پوجا کرنے مندر آیا ہوا تھا۔ اس وقت وہ مندر میں داخل ہو رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر نجمی پر پڑ گئی۔ وہ ٹھٹھک سا گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے اس جوگن کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ مگر اسے یاد نہیں آرہا تھا۔ اگر نجمی کے سر پہ لمبے بال ہوتے اور کمر میں کرپان لٹک رہی ہوتی تو تھانے دار آتما رام اسے فوراً پہچان لیتا۔ منڈے ہوئے سر اور ماتھے پر تلک اور گیروے کپڑوں کی وجہ سے آتما رام کو پہچاننے میں دقت ہو رہی تھی۔ نجمی نے تھانے دار آتما رام کو نہیں دیکھا تھا۔ آتما رام پہلے تو اپنی جگہ پر وہیں کھڑا رہا جب اس نے جوگن یعنی نجمی کو مندر کے احاطے میں کھڑی ایک کار کی طرف بڑھتے دیکھا تو بڑا حیران ہوا کہ یہ جوگن کار میں کس کے ساتھ جا رہی ہے۔ اس کی شکل وصورت پر کچھ شبہ اسے پہلے ہی ہو گیا تھا چنانچہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ کر کار کی طرف آیا۔

نجمی جوگن کار میں بیٹھ چکی تھی اور جیلر بھاکڑی کار کو اسٹارٹ کرنے کے بعد اسے احاطے سے

باہر نکل رہا تھا۔ تھانے دار آتما رام کی نظر جب اس پر پڑی تو اس نے جیلر ملک راج بھاکڑی کو فوراً پہچان لیا۔ وہ دل میں سوچنے لگا کہ یہ پڑھا لکھا شخص بھی جوگی جوگنوں کے بارے میں کس قدر وہمی ہے اس کے خیال میں بھاکڑی صاحب نے اس جوگن کو خیر و برکت کے لیے اپنے گھر میں مہمان بنا رکھا ہوگا۔ مگر میں نے اس عورت کو پہلے کہاں دیکھا ہے۔ تھانے دار آتما رام یہی سوچتا ہوا مندر میں داخل ہو گیا ابھی تک اس کے ذہن میں نجمی جوگن کی شکل واضح ہو کر نہیں آئی تھی۔

دوسری طرف نجمی جوگن کے بھیس میں جیلر کی گاڑی میں بیٹھی تھی اور گاڑی سینٹرل جیل کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ جیلر بھاکڑی کو اتنی جرات نہیں ہو رہی تھی کہ وہ نجمی سے یہ پوچھے کہ ماتا شیراں والی کے درشن ہوئے تو ماتا نے کیا حکم دیا ہے۔ نجمی بھی خاموش تھی وہ تو زیادہ باتیں کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ جیلر کی کار کو آتا دیکھ کر دربان نے فوراً جیل کے بڑے دروازے کا ایک پٹ کھول دیا۔ کوٹھی میں کملا بھی نجمی کا انتظار کر رہی تھی اس نے میز پر ناشتہ لگا دیا تھا۔

نجمی نے کسی سے کوئی بات نہ کی اور اپنے کمرے میں آکر خاموشی سے قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جیلر اور اس کی بیوی کملا دبے دبے قدم اٹھاتے اندر آکر ایک طرف ادب سے بیٹھ گئے۔ نجمی نے کن اکھیوں سے انھیں اندر آتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور منہ میں بڑبڑانے لگی۔ کچھ وقت اسی طرح گزر گیا تب نجمی نے آنکھیں کھول کر جیلر اور اس کی بیوی کملا پر نگاہ ڈالی اور کہا" ماتا شیراں والی تم سے بہت خوش ہے۔ اس گھر میں لہر بہر ہونے والی ہے"۔

جیلر اور اس کی بیوی کملا خوشی سے جھوم اٹھے۔ نجمی بولی" ماتا شیراں والی نے سنہرا مندر میں مجھے درشن دے کر بتا دیا ہے کہ اس راکھشش قیدی کا خون نکال کر مجھے کس جگہ اس کے خون کا تلک لگانا ہوگا لیکن سب سے پہلے ضروری ہے کہ اس راکھشش قیدی کو میرے سامنے حاضر کرو میں اسے ماتا شیراں والی کا ایک خاص منتر پانی پر پھونک کر پلاؤں گی یہ بہت ضروری ہے"۔

جیلر بھاکڑی نے عرض کی" جو حکم ماتا میں ابھی اس راکھشش قیدی کو آپ کے چرنوں میں حاضر کیے دیتا ہوں"۔

یہ کہہ کر جیلر اٹھا اور الٹے قدموں کمرے سے نکل گیا۔ کملا نے اپنے خاوند کے جاتے ہی نجمی کے

پاؤں پکڑ لیے اور بولی۔

"ماتا شیراں والی نے میرے بارے میں کچھ کہا؟"

نجمی نے جلدی سے اپنا پاؤں پیچھے کھینچ لیا اور کرخت آواز میں کہا "تم کون ہوتی ہو، شیراں والی ماں کی باتیں پوچھنے والی۔"

کملا ہاتھ باندھ کر چپ ہوگئی۔ نجمی کے لیے اس عورت کو قابو میں رکھنا بھی ضروری تھا، اس نے دوسرے لمحے اپنی آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا "کملا تو گھبراتی کیوں ہے شیراں والی ماں نے مجھے بتا دیا ہے کہ کملا کا بیاہ روپ کمار سے ہی ہوگا اور اسی کے لڑکے کی ماں بنے گی اور لاکھوں میں کھیلے گی۔"

کملا اپنی جگہ پر خوشی سے نہال ہوگئی۔ نجمی کے پاؤں چھونے کے بعد چائے اور مٹھائی لانے کے لیے رسوئی کی طرف چل دی۔ نجمی کو اب بادل کا بے تابی سے انتظار تھا۔ کیا وہ اسے اس حلیہ میں پہچان لے گا؟ کہیں پہچان لینے کے بعد اچانک جذباتی ردعمل کا اظہار نہیں کرے گا؟ اگر وہ نجمی کو دیکھتے ہی جذباتی ہوگیا یا اس کے چہرے پر حیرانی کے اثرات آگئے تو کہیں جیلر بھاکڑی کو شک نہ ہو جائے مگر نہیں بادل بڑا تجربہ کار ہے۔ وہ نجمی کو جوگن کے روپ میں پہچان لینے کے بعد بھی کسی قسم کے تاثر کا اظہار نہیں کرے گا اور فوراً سمجھ جائے گا کہ نجمی نے اسے جیل سے نکالنے کے لیے یہ سوانگ رچایا ہے۔ دوسری طرف جیلر بھاکڑی سیل نمبر ۱ میں پہنچ چکا تھا۔

دو سپاہی اس کے ساتھ تھے جیلر نے سپاہیوں کو یہی بتایا تھا کہ قیدی کے کچھ خصوصی فنگر پرنٹس وغیرہ لینے ہیں اس نے بادل کو ہتھکڑی لگوائی اور اپنے ساتھ لے کر کوٹھی کی طرف چلا۔

بادل کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اسے نجمی کے پاس لے جایا جا رہا ہے۔ پہلے تو وہ یہ سمجھا کہ اسے وقت سے پہلے عدالت میں لے جایا جا رہا ہے لیکن جب جیلر اپنی کوٹھی کی طرف گھوم گیا تو وہ کچھ حیران ضرور ہوا پھر اسے خیال آیا کہ ممکن ہے اسے کوٹھی کے اندر مشقت کرنے کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ کوٹھی کے اندر ضرور کوئی فرش وغیرہ توڑنا ہوگا۔ دیواروں کی صفائی وغیرہ کرنا ہوگی۔ جیلر نے دونوں سپاہیوں کو برآمدے میں رکنے کا حکم دیا اور ہتھکڑی کی زنجیر تھام کر بادل کو اندر ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ اس دوران نجمی نے دروازہ کھلنے کی آواز سن لی تھی۔ کملا اس کے

سامنے ادب سے سر جھکائے بیٹھی تھی آگے مٹھائی کی تھالی اور چائے پڑی تھی۔ نجمی نے چائے کا ایک پیالہ ابھی ابھی ختم کیا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ جیلر بھاکڑی اکیلا اندر داخل ہوا اور ہاتھ جوڑ کر بولا "ماتا! راکھشش قیدی میں لے آیا ہوں۔"

نجمی کا دل ایک بار زور سے دھڑک اٹھا اس نے اپنے دل سے کہا "خبردار یہ بے تابی دکھانے کا وقت نہیں۔"

پھر جیلر کی طرف دیکھا اور کہا "اس راکھشش کو اندر لے آؤ۔"

جیلر باہر چلا گیا۔ نجمی نے کملا سے کہا "کانسی کے کٹورے میں صاف پانی بھر کر لے آئے۔"

کملا جلدی سے رسوئی کی طرف چل دی دروازہ دوسری بار کھلا اور جیلر کے ساتھ بادل اس حالت میں اندر آیا کہ اس کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی داڑھی بڑھ آئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ جونہی بادل کی نظر جوگن پر پڑی وہ وہیں ٹھٹھک سا گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جوگن کو تک رہا تھا۔ اس نے نجمی کو فوراً پہچان لیا تھا۔ نجمی نے آنکھیں کھول کر بادل کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا اور کڑک کر کہا "راکھشش! آنکھیں نیچی کرو اور بیٹھ جاؤ..... نہیں تو ابھی منتر پھونک کر بھسم کر دوں گی۔"

بادل سمجھ دار تھا اس سے پہلے بھی وہ نجمی کے ساتھ بھیس بدل چکا تھا۔ فوراً سمجھ گیا کہ نجمی نے یہ سب کچھ اسے وہاں سے نکالنے کے لیے کیا ہے۔ فوراً نظریں نیچی کر کے وہیں صوفے کے پاس قالین پر بیٹھ گیا۔ تب نجمی نے جیلر کی طرف چہرہ اٹھا کر کہا "بیٹا کرشن بھگوان کی جو مورتی کمرے میں پڑی ہے تم اس کے سامنے لوبان سلگا کر پچاس بار رام نام کا جاپ کرو۔ کملا پانی لا رہی ہے میں اس راکھشش پر شیراں والی ماں کا منتر پڑھ کر پھونکوں گی۔"

جیلر ایک خطرناک قاتل اور ڈاکو کو جوگن ماتا کے پاس اکیلا چھوڑ کر جانے سے ذرا ہچکچایا تو نجمی نے گرجدار آواز میں کہا "گھبراتے کیوں ہو بھاکڑی؟ تمہیں معلوم نہیں شیراں والی ماں کے پانچ شیر میرے پیچھے کھڑے میری حفاظت کر رہے ہیں۔"

بادل نے دل میں سوچا نجمی نے کمال کر دیا ہے۔ جیلر جلدی سے ہاتھ جوڑ کر کمرے سے نکل گیا اتنے میں کملا پانی کا کٹورا لے کر آ گئی نجمی نے اسے بھی کڑک کر کہا "تم بھی باہر جا کر بیٹھو۔" وہ بھی

فوراً باہر نکل گئی۔ جب کمرے میں بادل اور نجمی اکیلے رہ گئے تو نجمی نے بلند آواز میں "ہرے کرشنا ہرے راما" کے بول دہرائے۔ پھر سرگوشی میں بادل سے کہا۔

"آج رات میں تمھیں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گی۔"

بادل نے آہستہ سے دھیمی آواز میں پوچھا "لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟"

نجمی نے سختی سے کہا "تم یہ کیوں پوچھتے ہو۔ خاموش رہو۔"

اس کے ساتھ ہی نجمی نے ہرے کرشنا ہرے راما کا جاپ کرنا شروع کر دیا پھر کملا کو آواز دی۔ کملا فوراً اندر آگئی نجمی نے کہا "اپنے پتی دیو کو بھی بلاؤ۔"

جیلر بھاکڑی بھی اپنا جاپ ادھورا چھوڑ کر جوگن ماتا کے چرنوں میں حاضر ہو گیا۔ نجمی اس وقت "ہرے راما ہرے کرشنا" کا جاپ کر رہی تھی اور بادل اس کے سامنے دوزانوں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ نجمی نے جاپ ختم کر کے کٹوری والے پانی پر سات بار پھونک ماری اور بادل سے کہا "اسے پی جاؤ راکھشش۔"

بادل جان بوجھ کر ذرا ہچکچایا اس نے جیلر کی طرف دیکھا۔ جیلر نے اسے ڈانٹ کر کہا "ماتا جو کہتی ہے ویسے ہی کرو۔"

بادل نے کٹوری اٹھائی اور پانی پی گیا۔ تھالی میں کچھ گلاب جامن پڑے تھے۔ نجمی نے سوچا کہ بادل بیچارے کو جیل میں کھانے کو کچھ بھی نہیں ملتا ہوگا۔ اس نے مٹھائی پر بھی سات بار پھونک ماری اور کڑک کر کہا "ان گلاب جامنوں کو بھی کھا جاؤ، جلدی کرو۔"

بادل دل میں بڑا خوش ہوا ایک عرصے سے مٹھائی اسے نہیں ملی تھی وہ دیکھتے ہی دیکھتے سارے گلاب جامن چٹ کر گیا۔ تب نجمی نے جیلر کی طرف متوجہ ہو کر کہا "اس راکھشش کو واپس لے جا کر بند کر دو اور فوراً میرے پاس آؤ مجھے ماتا شیراں والی کا اگلا حکم تمھیں سنانا ہے۔"

جیلر نے بادل کی ہتھکڑی کی زنجیر پکڑ کر اسے کھینچ کر کہا "چلو۔"

برآمدے میں مسلح سپاہی کھڑے تھے انھوں نے فوراً بادل کو اپنی حراست میں لے لیا۔ جیلر بھی ساتھ ہی رہا۔ اپنی نگرانی میں اس نے بادل کو اس کے سیل میں بند کر کے سلاخوں والے دروازے کو تالا لگوایا اور اپنی کوٹھی کی طرف واپس روانہ ہوا۔ وہاں نجمی ابھی تک "ہرے راما، ہرے کرشنا" کا

جاپ جھوم جھوم کر کر رہی تھی۔ جیلر کو آتے دیکھ کر اس نے کملا کو وہاں سے بھجوا دیا۔ جیلر کو اپنے سامنے بٹھایا اور بولی "سن بیٹا! شیراں والی ماتا کسی پر مہربان ہوتی ہے تو بڑا بھاگوان ہے کہ ماتا تجھ پر مہربان ہو گئی ہے اور وہ تجھے نہال کرنا چاہتی ہے۔ راکھشش پر شیراں والی ماں کا منتر پورا ہو گیا ہے اب اس کی پیٹھ پر جو شیر کے پنجے کا نشان ہے وہاں سے خون نکال کر اس کا تلک لگانا باقی ہے بس اس کے بعد تیرے گھر پر لکشمی دیوی اتر آئے گی اور شیراں والی کے حکم سے تیرے گھر چاند ایسے دو بیٹے باری باری پیدا ہوں گے جو تیرا نام روشن کریں گے تیری ترقی ہو جائے گی اور تیرے پاس اتنی دولت آجائے گی کہ تجھ سے سنبھالی نہیں جائے گی۔"

جیلر بھاکڑی چونکہ شیر کے پنجے کے نشان کو قیدی کی پیٹھ پر اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اس لیے وہ جوگن کا بے دام مرید ہو گیا تھا اور اس کی ہر بات کو سچ سمجھ رہا تھا بلکہ پتھر پر لکیر جان رہا تھا وہ اس کے آگے بچھا جا رہا تھا کہنے لگا: "ماتا! راکھشش ابھی آپ کے پاس تھا۔ آپ نے اس کا خون کیوں نہیں نکالا؟"

نجمی نے سر کو دائیں بائیں دو بار جھٹکا اور بولی "ماتا شیراں والی کا حکم ہے کہ اس راکھشش کا خون یہاں نہیں نکالا جائے گا۔ مجھے بتاؤ کیا اس شہر میں کوئی ایسی شمشان بھومی ہے جو شہر سے باہر کسی ویران جگہ پر ہو؟"

جیلر ایک لمحے کے لیے چپ سا ہو گیا۔ نجمی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی "میری بات کا جواب دو کیا تم شیراں والی ماں کا حکم نہیں مانو گے؟"

جیلر بھاکڑی ہاتھ باندھ کر بولا "ضرور مانوں گا میا! ضرور مانوں گا۔"

نجمی نے سخت لہجے میں پوچھا "تو بتاؤ یہاں کوئی ایسی شمشان بھومی ہے جہاں لوگ اپنے مُردے جلاتے ہوں اور جو شہر سے باہر ویران جگہ پر بھی ہو جہاں کیکر کے درخت بھی ہوں۔"

نجمی کو معلوم تھا کہ جہاں ہندو لوگ اپنے مُردوں کو جلاتے ہیں وہاں عام طور پر کیکر کے دو چار بے ڈھنگے درخت ضرور ہوتے ہیں۔ جیلر نے ایک سیکنڈ کے لیے غور کیا پھر بولا "ایسی شمشان بھومی ہے ماتا۔ یہاں سے دکن کی طرف رام تلائی کے پاس ویران جگہ پر ہے۔"

نجمی نے پر اعتماد انداز میں اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور کہا "تو پھر آج شام جب سورج ڈوبتا

پچھم میں ڈوب جائے تو اس راکھشش کو اس شمشان بھومی میں لے چلو۔ مجھے ایک چاقو اور ایک کانسی کی کٹوری کی ضرورت ہوگی وہاں میں اسے ٹھنڈی چتا پر الٹا لٹا کر خود اپنے ہاتھ سے اس راکھشش کی پیٹھ سے خون نکال کر کٹوری میں ڈالوں گی اور پھر وہیں اس کا تلک لگاؤں گی۔ یہی شیراں والی ماں کا حکم ہے اس کے ساتھ ہی تجھ پر دولت اور خوشیوں کے دروازے کھل جائیں گے۔ کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟ اگر نہیں تو میں ابھی یہاں سے جا رہی ہوں۔ پھر تمہارا گھر نرک کے راکھششوں کا ٹھکانہ بنے گا۔"

نجمی نے جیلر بھاکڑی کو ڈرانا ضروری خیال کیا تھا۔ جیلر سوچ رہا تھا وہ ایسے خطرناک قیدی کو جیل سے باہر کیسے لے جائے۔ دوسری طرف اسے اپنے گھر کی تباہی کا بھی خیال تھا اگر وہ جوگن ماتا کی شیر کے پنجے کے نشان والی کرامت نہ دیکھ چکا ہوتا تو شاید وہ قیدی کو باہر لے جانے سے انکار کر دیتا لیکن وہ خود اپنی آنکھوں سے بادل کی پیٹھ پر وہ نشان دیکھ چکا تھا جس کی پیش گوئی نجمی نے کی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ پولیس کی گارڈ ساتھ لے جائے گا یہ اس کے گھر کی تباہی اور خوشحالی کا معاملہ تھا وہ خود بھی ماتا شیراں والی کا مرید تھا۔ وہ نجمی کی ایک ایک بات پر یقین کر رہا تھا۔
اس نے کہا "میں تیار ہوں ماتا! میں تیار ہوں"۔
نجمی نے اطمینان کا سانس لیا کہنے لگی "بس اب جاؤ اور جب سورج دیوتا پچھم میں اتر جائے تو راکھشش کو شمشان میں پہنچا دینا میں بھی اس راکھشش کے ساتھ جاؤں گی ماتا شیراں والی کا یہی حکم ہے"۔

جیلر ادب سے پرنام کر کے چلا گیا سارا دن دفتر میں بیٹھا وہ یہی سوچتا رہا کہ اگر یہ بات باہر نکل گئی کہ وہ ایک خطرناک قیدی کو باہر لے گیا تھا تو کہیں اس کے خلاف محکمانہ کارروائی نہ شروع ہو جائے۔ آدمی چونکہ ضعیف الاعتقاد بھی تھا اور شیراں والی ماتا کا پجاری بھی تھا۔ اس لیے ساتھ ہی یہ بھی اسے خیال آتا کہ وہ یہ سب کچھ شیراں والی ماں کے حکم پر کر رہا ہے اور ماں اس کی ضرور حفاظت کرے گی لیکن حفظ ماتقدم کے طور پر اس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ وہ اپنے خاص آدمیوں کو مسلح کر کے جیپ میں ساتھ بٹھا کر لے جائے گا اور جب تک جوگن ماتا قیدی کا خون نکالے گی اس کے آدمی شمشان میں برابر پہرہ دیتے رہیں گے اس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ وہ قیدی کو ہتھکڑی

لگانے کے علاوہ اس کے پاؤں میں بیڑیاں بھی ڈال دے گا تاکہ اس کے بھاگ جانے کا امکان ہی باقی نہ رہے۔
نجمی نے سارا دن اندر ہی اندر بے چینی سے گزارا اسے دھڑکا لگا رہا کہ جیلر ملک راج بھاکڑی محکمے اور اپنے منصب سے متاثر ہو کر کہیں فیصلہ تبدیل نہ کر دے۔ اس نے زیادہ وقت اپنے کمرے میں ہی گزارا۔ کملا نے درمیان میں ایک دو دفعہ آکر اس سے اپنے عاشق روپ کمار کے بارے میں بات کرنی چاہی مگر نجمی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے باہر بھیج دیا اور یہ ظاہر کیا کہ وہ گیان دھیان میں محو ہے۔ حقیقت میں اسے سورج غروب ہونے کا انتظار تھا۔ ستمبر کی آخری تاریخیں تھیں اور سورج غروب ہونے کے بعد اندھیرا جلدی ہو جاتا تھا۔ نجمی کو اپنے اوپر پورا اعتماد تھا کہ اگر وہ ایک بار بادل کو شمشان بھومی میں لے جانے میں کامیاب ہو گئی تو پھر وہ واپس امرتسر سنٹرل جیل میں نہیں آئے گا۔ خدا خدا کر کے دن ڈھلا اور سورج غروب ہونے لگا۔ ہلکا ہلکا اندھیرا چھا رہا تھا کہ باہر کوٹھی کے صحن میں کسی گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ نجمی سمجھ گئی کہ جیلر بھاکڑی "راکھشش" بادل کو لے کر آگیا ہے اور ایسا ہی تھا۔ جیلر نے کمرے میں آکر جوگن ماتا کو پرنام کیا اور کہا "ماتا! میں راکھشش کو لے آیا ہوں صرف اتنی بنتی کروں گا کہ شمشان میں زیادہ دیر نہ لگانا بس جاتے ہی خون نکال کر تلک لگا لینا"۔
نجمی نے اٹھتے ہوئے کہا "گھبراؤ نہیں شیراں والی ماں تیری رکھشا کرے گی مجھے رات کی سیاہی چھا جانے سے پہلے راکھشش کا خون نکال کر تلک لگا لینا ہے، ورنہ ماتا ناراض ہو جائے گی، چلو!"۔
نجمی نے باہر آکر دیکھا کہ کوٹھی کے برآمدے کی بتی جل رہی تھی شام کا اندھیرا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ سامنے ایک جیپ کھڑی تھی۔ جیپ کے باہر دو مسلح سپاہی رائفلیں لیے پہرے پر کھڑے تھے۔ جیلر بولا "میرے ساتھ آگے پدھاریے ماتا راکھشش قیدی پیچھے بیٹھا ہے"۔
نجمی نے جیپ کے قریب سے گزرتے ہوئے اندر نگاہ ڈال کر دیکھا اندر بھی دو سپاہی بندوقیں لیے بیٹھے تھے۔ بادل ان کے درمیان بیٹھا تھا۔ نجمی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جیلر نے آہستہ سے کہا "ماتا! میں نے چاقو اور کٹوری اپنے پاس رکھ لی ہے"۔

"شاباش ! جے ماتا شیراں والی کی ۔"

جیپ تیزی سے شمشان بھومی کی طرف چل دی ۔ سرکاری جیپ شہر کی مصروف سڑکوں پر شام کے جھٹپٹے میں کم رفتار سے چل رہی تھی ۔ نجمی نے جیلر سے کہا "ملک راج ! تیز اوپر مینہ برسنے والا ہے مگر جلدی چلو رات ہو گئی تو کام بگڑ جائے گا ۔"

جیلر نے جیپ کی رفتار تیز کر دی اور جلدی جلدی جیپ کو ٹریفک کے ہجوم میں سے نکال کر جی ٹی روڈ پر لے آیا ۔ اب رام تلائی والا شمشان زیادہ دور نہیں تھا ۔ چند لمحوں میں وہ شمشان بھومی میں پہنچ گئے ۔ ابھی رات نہیں ہوئی تھی ۔ آسمان پر شفق سرخ سے گہری قرمزی ہو رہی تھی ۔ شمشان بھومی کا بڑا دروازہ کھلا تھا یہ ایک ویران شمشان تھا ۔ اندر نحوست اور ویرانی برس رہی تھی ۔ جیلر نے جیپ ایک طرف کھڑی کر دی ۔ نجمی نے پوچھا "یہاں کیکر کے درخت کہاں ہیں ؟"

جیلر نے کہا "اندر ایک طرف لگے ہیں ماتا ! میں نے دیکھ رکھے ہیں ۔" جب بادل کو جیپ میں سے نکالا گیا تو یہ دیکھ کر نجمی پریشان ہو گئی کہ بادل کو ہتھکڑی تو لگنی ہی تھی ۔ مگر اس کے پاؤں میں بیڑیاں بھی پڑی ہوئی تھیں ایک لمحے میں اس کے ذہن نے اس کا توڑ بھی سوچ لیا اور جیلر سے کہا "اسے اندر لے جا کر اس جگہ الٹا لٹا دو جہاں مُردوں کو جلایا جاتا ہے ۔"

جیلر نے مسلح سپاہیوں کو اشارہ کیا وہ شام کے اندھیرے میں بادل کو شمشان بھومی کے اندر لے گئے ۔ دو سپاہی باہر پہرہ دیتے رہے اور دو اندر جیلر کے ساتھ آ گئے ۔ نجمی یہ ساری کارروائی بڑی گہری نظر سے دیکھ رہی تھی اسے خوب معلوم تھا کہ کیا کرنا ہو گا ۔ جب بادل کو چتا والے چبوترے پر لٹانے لگے تو نجمی نے آلتی پالتی مار کر چبوترے پر ایک طرف پہلے ہی بیٹھ گئی تھی اور "ہرے راما ہرے کرشنا" اور جے شیراں والی ماں کا ورد شروع کر دیا تھا بولی "ملک راج بیٹا ! راکھشش کے دونوں بازو اور ٹانگیں پھیلانی بہت ضروری ہیں ۔"

اس کے لیے ضروری تھا کہ بادل کی ہتھکڑی اور بیڑیاں کھول دی جائیں جیلر اس بار بھی کچھ جھجکا ۔ نجمی نے کڑک کر کہا "میں جا رہی ہوں اب تم جانو اور ماں شیراں والی جانے ۔۔۔۔۔"

جیلر نے فوراً بادل کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں کھلوا دیں اور اسے راکھ پر اس طرح الٹا لٹا دیا کہ اس کے دونوں بازو اور ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں ۔ تب نجمی نے چاقو کھول کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا

کانسی کی کٹوری اپنے سامنے رکھ لی ۔ بادل کی پیٹھ پر سے قمیص اوپر اٹھا دی اور زور زور سے "ہرے راما ہرے کرشنا" کا جاپ شروع کر دیا ۔ دونوں مسلح سپاہی چند قدموں کے فاصلے پر کھڑے تھے ۔

جیلر نجمی کے قریب ہی ہاتھ باندھے موجود تھا وہ اندر سے بے حد پریشان تھا اور چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہو جوگن ماتا قیدی کی پیٹھ والے شیر کے پنجے کے نشان سے خون نکالے اور وہ اس کے فوراً بعد اسے دوبارہ بیڑیاں پہنا کر ہتھکڑی لگا دے ۔ نجمی نے چاقو بادل کی ننگی پیٹھ پر زخم کے نشان پر رکھا ہی تھا کہ ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ باندھ کر جیسے ہوا سے باتیں کرتے ہوئے بولی "جے ہو ماتا شیراں والی ! تیری پجارن تیرے حکم کی پالن کر رہی ہے جی ماتا جی ! جی ماتا جی ! میں آپ کے پجاری کو آپ کے پاس بھیج رہی ہوں ۔"

اس کے ساتھ ہی نجمی نے پلٹ کر جیلر کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی "دھن ہو دھن ملک راج ! شیراں والی ماں تجھے درشن دینے تیرے گھر پر آ رہی ہے جتنی جلدی ہو سکے اپنے گھر پہنچو ، شیراں والی ماں نے تجھے وہاں نہ پایا تو ۔۔۔ ہو جائے گی ۔"

جیلر ملک راج بھاکڑی اپنے فرض اور عقیدے کے دو پاٹوں میں بُری طرح پھنس گیا تھا گھبرا کر بولا "مگر ماتا ! میں ۔۔۔۔۔ میں اس قیدی کو چھوڑ کر ۔۔۔۔۔ ؟"

نجمی نے گرج کر کہا "نہیں جاؤ گے تو یہ شیراں والی ماں کا اپمان ہو گا ۔ وہ تیرے سارے خاندان کو بھسم کر دے گی ۔ جلدی جاؤ تیرے آدمی قیدی کو لے آئیں گے ۔"

جیلر عجیب الجھن میں مبتلا تھا وہاں سے جانا بھی نہیں چاہتا تھا اور وہاں رک بھی نہیں سکتا تھا ۔ جب نجمی نے دھمکی دی کہ وہ واپس جا رہی ہے تو جیلر نے جلدی سے مسلح سپاہیوں کو قیدی کے سر پر کھڑے رہنے اور بھاگنے کی صورت میں اسے وہیں گولی مار دینے کی ہدایت کی اور تیز تیز قدم اٹھاتا شمشان سے باہر کی طرف چل دیا ۔

جیپ میں بیٹھا اور اسے فل سپیڈ پر چھوڑ دیا کوٹھی پر پہنچتے ہی کملا نے پوچھا "جوگن ماتا کہاں ہے ؟" جیلر نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا "شیراں والی ماتا نے درشن دیئے کیا ؟" ۔

کملا نے حیرانی سے پوچھا "یہ کیا کہہ رہے ہیں ؟"

تب جیلر نے اسے سب کچھ بتایا اور کہا کہ ابھی تھوڑی دیر میں ماں شیراں والی درشن

دینے آئے گی جلدی سے لوبان سلگاؤ۔ کملا نے اسی وقت لوبان سلگا کر کارنس پر رکھ دیا۔ اتنے میں نوکر نے آکر بتایا کہ آتمارام ایس ایچ او، علاقہ دربار صاحب ملنے آیا ہے۔ جیلر نے غصے میں کہا "اسے کہو صبح آفس میں آئے"۔

نوکر چلا گیا، ساتھ ہی واپس آگیا اور دبی زبان میں بولا: "صاحب جی! وہ کہتا ہے بڑا ضروری کام ہے"۔

جیلر ملک راج بھاکڑی نے دل میں آتمارام کو موٹی سی گالی دی اور نوکر سے کہا "اسے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ"۔ شیراں والی ماتا نے درشن تو نہیں دیئے تھے مگر اس کی جگہ ایس ایچ او آتمارام آگیا تھا۔ جیلر جب ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو تھانے دار آتمارام ہاتھ میں ایک فائل لیے قدرے بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ جیلر صاحب کو دیکھتے ہی اس نے سلیوٹ کیا اور بولا "شما کیجیے گا حضور! میں غلط وقت پر آگیا ہوں"۔

جیلر نے کرخت لہجے میں پوچھا "جلدی بتاؤ کیا کام ہے میں اس وقت بڑا مصروف ہوں"۔

ڈرائنگ روم کی بتیاں روشن تھیں تھانے دار آتمارام نے فائل کھول کر جیلر بھاکڑی صاحب کی طرف بڑھا دی فائل کے صفحے پر ایک عورت کی تصویر لگی تھی یہ نجمی کی تصویر تھی اور نیچے لکھا تھا "چندا بائی"۔ اصل نام نجمی، مسلمان، چندا ڈاکو کے نام سے جانی جاتی ہے۔ قتل اور ڈکیتی کے جرم میں مطلوب ہے۔ پاکستانی جاسوسوں کے ساتھ اس کا رابطہ بھی ہے۔ کئی بار جیل توڑ کر فرار ہو چکی ہے"۔

تھانیدار آتمارام نے کہا "حضور! کیا آپ اس عورت کو پہچانتے ہیں؟"

جیلر کو نجمی کی فوٹو دیکھتے ہی ایسے لگا جیسے اس نے اس عورت کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے تھانے دار نے کہا "حضور! میں آپ کو یاد دلاتا ہوں آج صبح آپ اس عورت کے ساتھ سیتلا مندر گئے تھے۔ اس عورت نے جوگن کا بھیس بدل رکھا ہوا تھا"۔

جیلر کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی وہ جلدی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھانیدار بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا اور بولا "حضور! جب سے میں نے اس عورت کو جوگن کے بھیس میں آپ کے ساتھ دیکھا تب سے مجھے پریشانی لگی ہوئی تھی کہ اس عورت کو کہیں دیکھا ہے۔ دن بھر میں اسی الجھن میں

پھنسا رہا۔ شام کو جا کر مجھے خیال آیا کہ سیکرٹ ایجنٹوں کی فائل دیکھنی چاہیے پھر میں بھاگا بھاگا سی آئی اے آفس پہنچا وہاں سے فائل نکالی تو اس عورت کو میں نے غور سے دیکھا۔ حضور! اس عورت کے بالوں کو مونڈ ڈالیں، اسے گنجا کر دیں تو کیا یہ وہی جوگن نہیں ہے جو آپ کے ساتھ صبح سیتلا مندر آئی تھی"۔

جیلر ملک راج بھاکڑی کی آنکھیں فائل پر نجمی کی تصویر کو تک رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے، ہونٹ خشک ہو گئے تھے ایک سیکنڈ کے اندر اندر وہ ساری واردات کو سمجھ چکا تھا۔ مگر دستی بم کا پن نکل چکا تھا۔ بم کسی وقت بھی پھٹ سکتا تھا۔ اس نے فائل وہیں پھینکی اور تھانیدار آتمارام سے چلا کر کہا "میرے ساتھ آؤ"۔

جیلر ملک راج بھاکڑی دوڑتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل کر باہر کھڑی جیپ کے پاس آیا۔ تیزی دروازہ کھول کر اندر بیٹھا۔ جیپ اسٹارٹ کی اور تھانے دار آتمارام ابھی جیپ میں پوری طرح سوار بھی نہیں ہوا تھا کہ جیپ بجلی کی تیزی کے ساتھ کوٹھی سے نکل کر جیل کے بڑے دروازے کی طرف بڑھی۔ گارڈ نے جیلر صاحب کی جیپ کو دور سے آتے دیکھ کر جلدی سے آدھا دروازہ کھول دیا جیپ تیزی سے دروازے میں سے گزر کر رام تلائی والی شمشان بھومی کی طرف دوڑنے لگی۔ جیلر ملک راج بھاکڑی کا حلق کڑوا ہو رہا تھا۔ کنپٹیاں جل رہی تھیں۔ اسے نہ صرف اپنی نوکری جاتی نظر آ رہی تھی بلکہ وہ اپنے آپ کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھی دیکھ رہا تھا۔

بادل چتا پر بالکل سیدھا لیٹا تھا

نجمی جوگن کے بھیس میں اس کے پاس بیٹھی تھی۔ چاقو اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے باہر جیپ کی آواز سنی تو اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ بادل بھی سمجھ گیا کہ حملہ کرنے کا وقت آگیا ہے دو سکھ سپاہی ان کے سر پر کھڑے تھے۔ نجمی نے انھیں کہا۔

"دیکھو باہر کس کی جیپ آئی ہے؟"

ان میں سے ایک سپاہی وہیں کھڑا رہا۔ دوسرا شمشان بھومی کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ ابھی اس نے ایک قدم ہی اٹھایا ہو گا کہ نجمی نے زور سے چاقو اپنے پاس کھڑے سپاہی کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ بادل اچھل کر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس سے پہلے کہ زخمی سپاہی بندوق سے فائر کرتا اسے لات مار کر گرا دیا۔ چاقو سپاہی کے پیٹ کے اندر دھنسا ہوا تھا وہ وہیں شدید زخمی حالت میں پڑا رہا دوسرے سپاہی نے پلٹ کر دیکھا بادل نے اس پر فائر کر دیا گولی اس کی گردن چیرتی ہوئی گزر گئی۔ اب جیلر بھاکڑی کی جیپ شمشان بھومی میں داخل ہو گئی تھی وہ فائر کی آواز سے سمجھ گیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ جیپ ایک دم رکی وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ چھلانگ لگا کر جیپ سے کودا۔ ایک بندوق نجمی کے ہاتھ میں بھی تھی۔ بادل اور نجمی نے جیلر بھاکڑی اور اس کے سپاہیوں پہ اندھا دھند گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ ان کے نشانے کبھی خطا نہیں گئے تھے۔ دیکھتے دیکھتے شمشان بھومی میں لاشیں بچھ گئیں۔ نجمی نے چلا کر کہا۔

"بادل جیپ میں بیٹھو۔"

چند لمحوں کے بعد ان کی جیپ رام تلائی کی شمشان بھومی سے نکل کر جی ٹی روڈ پر جالندھر کی

طرف دوڑ رہی تھی۔ شام کا اندھیرا رات کی سیاہی میں تبدیل ہونے لگا تھا۔ بادل نے کہا۔

"ہمیں یہاں سے اپنا رُخ بٹالہ گورداس پور کی طرف موڑ دینا چاہیے۔ یہ مین لائن ہے ہم جالندھر پہنچنے سے پہلے ہی گرفتار کر لیے جائیں گے۔"

اور بادل نے بجلی والی نہر پر جا کر جیپ کو نہر کے کنارے بٹالہ کی طرف ڈال دیا۔ بادل اس علاقے سے واقف ہو چکا تھا۔ بٹالہ ابھی دور تھا کہ وہ گورداس پور کی طرف ہو گیا۔ نجمی نے کہا۔

"تم کس طرف جانا چاہتے ہو؟ خطرہ تو ادھر بھی ہو گا۔"

بادل بولا "پولیس کو کچھ دیر بعد جیلر اور دوسرے سپاہیوں کے قتل کی خبر ہو گی وہاں کوئی زندہ نہیں بچا تھا۔"

اب رات ہو گئی تھی۔ جیپ گورداس پور سے آگے نکل چکی تھی۔ اب وہ نیم پہاڑی علاقے سے گزرتے ہوئے سجان پور کی طرف جا رہی تھی۔ بادل نے نجمی کو بتایا کہ اسے دلی کی بجائے واپس جموں ہی جانا چاہیے۔ وہ وہاں سے اس کو بارڈر کراس کروانے کی بہتر کوشش کر سکتا ہے۔ نجمی نے اس سے کہا کہ ندیم پاکستان سے واپس آیا ہوا ہے اور اس کی اطلاع کے مطابق وہ دلی میں مقیم ہے۔ بادل نے کہا۔

"تمھارا دلی جانا کسی طرح بھی مناسب نہیں تم جموں میں لال دین کے پاس ٹھہرو گی میں دلی جا کر ندیم کو بھی وہاں سے نکال لاؤں گا اس نے واپس آ کر بڑی حماقت کی ہے۔"

نجمی خاموش ہو گئی۔ راتوں رات وہ سجان پور پہنچ گئے۔ یہاں انھوں نے جیپ کی ٹینکی پٹرول سے بھروائی اور اب ان کا رخ کٹھوہا کی طرف تھا۔ راستے میں انھیں کسی نے چیک نہ کیا۔ نیم پہاڑی سڑکیں ویران تھیں۔ بادل نے کٹھوہا سے جیپ کو ایک دوسرے پہاڑی راستے پر ڈال دیا اور رات کے پچھلے پہر اسے دور سے جموں شہر کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ اس نے جیپ کو دوبارہ ایک نسبتاً پکی سڑک پر ڈال دیا۔ یہ سڑک جموں کے دریائے توی کو بہت پیچھے سے کراس کر کے دوسری جانب سے ہوتی ہوئی اس علاقے کی طرف نکل جاتی تھی جہاں لال دین کا محلہ تھا۔ بادل کے نزدیک لال دین کے گھر سے زیادہ اور کوئی جگہ محفوظ نہیں تھی۔

جموں شہر میں داخل ہونے کے بعد بادل بہت محتاط ہو گیا تھا۔ نجمی نے اگرچہ جوگنوں والا بھیس بدل رکھا تھا اور اس کا سر بھی منڈا ہوا تھا۔ پھر بھی پولیس کی پوچھ گچھ خطرناک صورت اختیار کر سکتی تھی کیونکہ اب تک اس علاقے کی پولیس کو بھی نجمی کے حلیے کے بارے میں یقیناً خبردار کر دیا گیا تھا۔ بادل نے ایک جگہ سڑک کے کنارے جیپ کو دریا کے قریب کھڑا کر دیا اور نجمی سے کہا۔

"نیچے اتر آؤ میں جیپ کو دریا میں پھینکنے لگا ہوں کیونکہ یہ جیپ امرتسر جیل کی ہے اور یہ ہمیں یہاں گرفتار کروا سکتی ہے"۔

نجمی نیچے اتر آئی بادل رات کے پچھلے پہر کے اندھیرے میں جیپ کو تھوڑا چلا کر دریائے توی کے کنارے پر لے آیا۔ یہاں ڈھلان تھی دریائے توی کا پانی پتھروں سے ٹکراتا تیزی سے گزر رہا تھا۔ اس نے جیپ کو ڈھلان پر لا کر پیچھے سے دھکیل دیا۔ جیپ ڈھلان پر تیزی سے گزرتی ہوئی ایک ہلکے سے دھماکے کے ساتھ دریا میں جا گری اور دیکھتے ہی دیکھتے دریا کے پانی نے اسے نگل لیا"۔

اس کے بعد بادل نے نجمی کو ساتھ لیا اور محلہ استاداں کی طرف روانہ ہو گیا۔ لال دین کا مکان اسی محلے میں تھا۔ جموں شہر کا علاقہ بھی رات کے پچھلے پہر سنسان تھا۔ مکانوں میں روشنیاں کہیں نہیں ہو رہی تھیں۔ صرف سڑک کی بتیاں روشن تھیں۔ گلی کے کونے پر آ کر بادل نے نجمی کو ایک طرف مکان کی دیوار کے ساتھ اندھیرے میں کھڑا کر دیا اور کہا۔ "میں لال دین کو اطلاع دینے جاتا ہوں تم اسی جگہ رہنا"۔

نجمی اندھیرے میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے جوگنوں والا لباس پہن رکھا تھا۔ گلی اور بازار سنسان تھے دور ایک ٹرک پل پر سے گزرا اس کی آواز آئی تو نجمی نے پل کی طرف دیکھا۔ پل پر ٹرک کی روشنی تھوڑی دیر تک نظر آتی رہی پھر غائب ہو گئی۔ دس منٹ بڑی مشکل سے گزرے۔ تب بادل گلی میں دکھائی دیا اس نے آتے ہی کہا۔

"لال دین کو میں نے سب کچھ سمجھا دیا ہے میرے ساتھ آؤ"۔

"لال دین نے پہلے تو نجمی کو بالکل نہ پہچانا پھر کہنے لگا" "تم تو بالکل جوگن بن گئی ہو"۔

پھر اس نے بادل سے کہا۔

"آج کی رات تم لوگ اسی جگہ چھپے رہو۔ کل میں تم لوگوں کا کسی دوسری جگہ بندوبست کر دوں گا وہاں سے تم بے شک دلی چلے جانا۔ نجمی اس جگہ بالکل محفوظ رہے گی"۔

وہاں انھوں نے رات کا بچا ہوا تھوڑا بہت کھانا کھایا اور سو گئے ساری رات کے تھکے ہوئے تھے ایسے سوئے کہ دوسرے دن دو بجے دوپہر کو آنکھ کھلی۔ لال دین باہر سے مکان کو تالا لگا کر جا چکا تھا اس نے بادل کو سمجھا دیا تھا کہ پیچھے مکان میں کیسے رہنا ہے۔ انھوں نے مکان کی کھڑکیاں بند ہی رکھیں۔ نجمی نے کچن میں جا کر چائے اور ٹوسٹ وغیرہ بنائے۔ وہیں بیٹھ کر اس نے اور بادل نے ناشتہ کیا۔

نجمی نے پوچھا۔

"تم دلی کب جاؤ گے اور ندیم کو کہاں تلاش کرو گے؟"

بادل کہنے لگا "تمھاری اطلاع کے مطابق ندیم دلی میں حضرت نظام الدین کی درگاہ کے آس پاس کہیں چھپا ہوا ہے اس نے تمھیں یہی پیغام پہنچایا ہے۔ میں اسے تلاش کر لوں گا، تم بے فکر رہو"۔

نجمی خاموشی سے چائے پی رہی تھی، کہنے لگی۔

"تمھارا خیال ہے کہ ہم جموں کشمیر کی سرحد سے ہندوستان کا بارڈر کراس کر سکیں گے؟ تم نے ہی بتایا تھا کہ یہاں کے حالات بہت سنگین ہیں اور بارڈر پر فوج موجود ہو گی"۔

بادل نے کہا "اس میں کوئی شک نہیں کہ فوج بارڈر پر موجود ہے لیکن لال دین کا ایک دوست ہمارے کام آئے گا وہ تمھیں کشمیر کی پہاڑیوں میں کسی جگہ سے بارڈر کراس کرا دے گا لیکن سب سے پہلے ندیم کا یہاں پہنچنا بہت ضروری ہے"۔

نجمی نے چائے کی پیالی تپائی پر رکھ دی۔

"ندیم نے یہاں واپس آ کر ہمیں نئی مشکل میں پھنسا دیا ہے"۔ بادل نے دبی آواز میں کہا "اس نے جذبات میں آ کر ایسا کیا ہے اصل میں وہ تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا"

نجمی نے گہری سانس بھر کر چھت کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا اور بولی "یہ باتیں اب مجھے بچوں جیسی لگتی ہیں۔ بہرحال تم کب دلی جاؤ گے؟ لال دین تو میرا خیال ہے آج شام ہو جانے کے

رہی ہمیں کسی دوسری جگہ پر لے جائے گا۔"

بادل نے کہا "اگر لال دین تمھیں آج شام یا رات کو کسی دوسری پناہ گاہ میں پہنچا دیتا ہے تو میں پچھلے پہر کی گاڑی پکڑ کر روانہ ہو جاؤں گا۔"

"تم ٹرین میں جاؤ گے؟" نجمی نے پوچھا "ٹرین میں تو خطرہ زیادہ ہوگا۔"

بادل نے گردن کو آہستہ سے جھٹک کر کہا۔

"خطرہ کہاں نہیں ہے نجمی؟ ہماری، خاص طور پر میری ساری زندگی خطروں کا مقابلہ کرتے ہی گزر گئی ہے۔ ویسے تم فکر نہ کرو میں انشاءاللہ خیریت کے ساتھ دلی پہنچ جاؤں گا اور ندیم کو بھی وہاں سے نکال کر یہاں لے آؤں گا۔"

نیچے مکان کا تالا کھولنے کی آواز آئی بادل بولا "لال آ گیا ہے؟"۔

دونوں خاموش ہو گئے۔ کسی نے دروازہ اندر سے بند کر کے کنڈی لگا دی۔ پھر سیڑھیوں میں قدموں کی آواز آئی اور لال دین نمودار ہوا آتے ہی بولا۔ "سارا انتظام ہو گیا ہے۔"

پھر لال دین نے انھیں بتایا کہ ان کو اسی رات جموں شہر سے نکل کر کشمیر روڈ پر کوئی ساٹھ میل آگے ایک گاؤں میں جا کر رہنا ہوگا۔ جہاں لال کا ایک پرانا اسمگلر دوست اپنی حویلی میں رہتا ہے لال کہہ رہا تھا۔

"وہاں سے بارڈر دس میل دور پہاڑیوں میں ہے میرا دوست اس سارے علاقے کے چپے چپے سے واقف ہے پہلے تو وہ حامی نہیں بھر رہا تھا لیکن پھر میں نے اسے راضی کر لیا۔ نجمی اب تم یہ جوگنوں والا لباس اتار کر شلوار قمیض پہن لو۔ تمھاری ایک شلوار قمیض میرے پاس امانت کے طور پر پڑی ہے میں وہ تمھیں لائے دیتا ہوں۔"

نجمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ جوگنوں والا لباس اتار کر شلوار قمیض پہن چکی تھی۔ اس نے ماتھے پر لگا ہوا تلک بھی دھو کر صاف کر لیا تھا۔ سر پر اس نے رومال باندھ کر اوپر دوپٹہ لے لیا تھا۔ رات کو لال دین دوبارہ مکان کو باہر سے تالا لگا کر چلا گیا واپس آیا تو مچھلی اور نان ساتھ لایا تھا۔ ان سب نے مل کر کھانا کھایا۔ لال دین کہنے لگا۔

"بادل یہاں اب میری نگرانی کچھ کم ہوئی ہے اس لیے میں بہت زیادہ محتاط ہوں اگر مجھ سے

کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو تم اور نجمی مجھے معاف کر دینا۔"

بادل نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں ہے لال دین! تم نے ہمارے ساتھ جو دوستی کا بہترین سلوک کیا ہے اسے میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

لال بولا "اس وقت رات کے نو بج رہے ہیں۔ بارہ بجے رات گلی کے باہر ایک ٹرک آ کر رُکے گا اس پر پرالی لدی ہوگی تم دونوں کو اس پرالی میں گھس کر چھپ کر جانا ہوگا۔"

نجمی نے بادل سے کہا "تمھیں میرے ساتھ جانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ بادل میں اکیلی ہی چلی جاؤں گی۔"

لال بولا "میں تمھارے ساتھ ہوں گا تم اکیلی نہیں ہو گی میں تمھیں خود اپنے دوست کے پاس چھوڑ کر آؤں گا۔"

نجمی کہنے لگی "بس ٹھیک ہے پھر بادل کو میرے ساتھ جانے کی کیا ضرورت ہے تم یہاں سے دلّی کی طرف روانہ کیوں نہیں ہو جاتے۔"

لال دین پوچھنے لگا "تم دِلّی کیسے جاؤ گے؟"

بادل بولا "میرا خیال ہے میں جالندھر جانے والی صبح کی گاڑی پکڑ دوں گا۔ جالندھر سے مجھے فرنٹیئر میل مل جائے گی۔"

لال نے کہا "کیا تم ٹرین کے سفر میں محفوظ ہو گے؟ جالندھر اور امرتسر کا علاقہ تمھارے لیے بہت خطرناک ہے۔"

بادل بولا "کون سا علاقہ میرے لیے خطرناک نہیں ہے؟ جب نجمی میرے ساتھ ہو تو پھر قدم قدم پر مجھے خطرے کا احساس ضرور رہتا ہے اب تو میں اکیلا ہوں۔ میں حالات کو سنبھال لوں گا تم فکر نہ کرو انشاءاللہ دلّی پہنچ جاؤں گا۔"

آخر میں طے ہوا کہ نجمی رات کو لال دین کے ساتھ جموں کشمیر کے پہاڑی علاقے کی طرف روانہ ہو جائے گی اور بادل جموں شہر کے ریلوے سٹیشن سے جالندھر جانے والی گاڑی پکڑے گا نیند کسی کو بھی نہیں آ رہی تھی۔ رات گیارہ بجے تک وہ بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کمرے کی بتی انھوں نے بجھا رکھی تھی۔ باتیں بھی وہ اونچی آواز سے نہیں کر رہے تھے۔ جب رات کے بارہ بجے تو لال دین ٹرک

دیکھنے اٹھ کر بازار کی طرف چل دیا۔ ابھی تک ٹرک نہیں پہنچا تھا وہ ایک بند دکان کے پھٹے پر چادر اوڑھ کر لیٹ گیا اس خیال سے کہ اگر کسی نے دیکھا بھی تو یہی سمجھے گا کہ کوئی مسافر سو رہا ہے۔ اتنے میں اسے ٹرک کی آواز آئی۔

آواز گلی کے نکڑ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ لال دین اٹھ بیٹھا ٹرک کی روشنیاں بجھی ہوئی تھیں وہ گلی کے نکڑ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ لال دین نے آگے بڑھ کر دیکھا۔

رحمت ڈرائیور نے کھڑکی میں سے سر نکال کر لال دین سے پوچھا "کاکا مال تیار ہے تو پیچھے رکھوا دو"۔

رحمت ڈرائیور کو بھی معلوم تھا اس کے مالک یعنی اس علاقے کے مشہور اور زبردست اسمگلر بلے کے کوئی مہمان ہیں جنھیں لے کر ڈیرے پہنچانا ہے۔

لال دین نے آہستہ سے کہا "ابھی لاتا ہوں"۔

ٹرک کی آواز نجمی اور بادل نے بھی سن لی تھی اور سنبھل کر بیٹھ گئے تھے۔

لال نے آکر بتایا کہ ٹرک آگیا ہے۔

بادل نے نجمی سے کہا "خدا حافظ نجمی! پریشان مت ہونا میں ندیم کو لے کر ہی آؤں گا اور انشاءاللہ ضرور آؤں گا اب تم جاؤ"۔

نجمی نے کوئی جواب نہ دیا اور لال دین کے ساتھ سیڑھیاں اُتر کر گلی میں آگئی باہر اندھیرے میں ٹرک موجود تھا اس کے پیچھے پرالی لدی ہوئی تھی۔ رحمت ڈرائیور نے پہلے ہی اس کے اندر بیٹھنے کی جگہ بنا دی تھی۔ نجمی اس کے اندر گھس کر بیٹھ گئی۔

لال دین اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے پاس بیٹھ گیا۔ ٹرک سری نگر کشمیر روڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔ توی دریا کے پُل پر پولیس ضرور موجود تھی مگر پرالی سے لدے ہوئے ٹرک کی کیا چیکنگ ہو سکتی تھی۔ ٹرک پُل پر سے گزر گیا اور کھلی سڑک پر روانہ ہو گیا۔ پُل سے نکلتے ہی ٹرک نے اسپیڈ پکڑ لی لال دین نجمی کو بہت جلد اپنے دوست بلے کے پاس پہنچانا چاہتا تھا کیونکہ اسے واپس آکر بادل کو بھی رخصت کرنا تھا۔ رحمت ڈرائیور بڑا ماہر اور تجربے کار ڈرائیور تھا۔ ٹرک کی بتیاں روشن تھیں۔ سڑک خالی تھی ٹرک پوری رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ نجمی ٹرک کے پیچھے پرالی کے اندر اپنے آپ کو

سمیٹ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ پرالی میں لوہے کی سلاخوں سے اوپر ایک چھوٹی سی چھت ڈال دی گئی تھی۔ اس کی وجہ سے نجمی کے اوپر پرالی نہیں گر رہی تھی اسے دھچکے ضرور لگ رہے تھے، کیونکہ ٹرک کافی رفتار سے جا رہا تھا۔ ایک مقام پر آکر رحمت ڈرائیور نے ٹرک کو بائیں طرف موڑ دیا۔

یہ ایک کچی سڑک تھی جس پر سنگریزے بکھرے ہوئے تھے یہاں اس نے ٹرک کی رفتار دھیمی کر دی۔ اب بلے سمگلر کا ڈیرہ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا۔ ٹرک کبھی کسی ٹیلے کے پہلو سے ہو کر اور کبھی دو ٹیلوں کے درمیان سے ہو کر گزر رہا تھا ایک جگہ ٹرک نے ٹیلے کا موڑ کاٹا تو ایک آدمی ٹیلے کے پیچھے سے نکل کر سامنے آگیا۔ اس نے رائفل تان رکھی تھی۔

رحمت ڈرائیور نے سر باہر نکال کر کہا "میں ہوں رحمت اوئے یارا!"

وہ آدمی ایک طرف ہو گیا ٹیلے کی دوسری طرف دھریک اور پیپل کے درختوں کے پاس ایک پرانی حویلی تھی جس کے باہر ایک کمزور سا بلب جل رہا تھا۔ ٹرک رک گیا۔

رحمت اور لال جلدی سے پیچھے آئے انھوں نے پرالی کو آگے سے ہٹایا۔ نجمی اپنے کپڑوں سے لگی ہوئی تنکے جھاڑتی ٹرک سے نیچے اتر آئی۔

لال نے پوچھا "تکلیف تو نہیں ہوئی نجمی؟"

نجمی نے جواب دینے کی بجائے نفی میں سر ہلا دیا اور حویلی کے دروازے کی طرف دیکھا جو اب کھل گیا تھا اور اس کے اندر سے ایک درمیانے قد اور گٹھے ہوئے بدن والا آدمی کاندھے پر شال ڈالے آنکھیں ملتا ہوا باہر نکل رہا تھا۔ لال دین نے آگے بڑھ کر کہا۔

"میں ہوں لال دین! بلے سے کہو مال آگیا ہے"۔

مال کا لفظ سن کر نجمی کا ماتھا ٹھنکا۔ کہیں لال دین کی نیت تو نہیں بدل گئی۔ کہیں اسے ان اسمگلروں کے ہاتھوں فروخت تو نہیں کیا جا رہا؟ اس نے وہیں سوچ لیا کہ اگر ایسی بات ہوئی تو لال دین کا خون سب سے پہلے کرے گی۔ لیکن ایسی بات نہیں تھی۔ آدمی اندر چلا گیا۔ لال دین بھی نجمی کو حویلی میں لے آیا۔ بائیں جانب ایک کوٹھری کھول دی گئی۔ وہاں چارپائی اور کمبل پڑا تھا۔

لال نے کہا "تم یہاں آرام کرو میں بادل کو رخصت کر کے آتا ہوں۔ مجھے مکان پر تالا بھی لگانا ہے

یہاں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس جگہ کو لال دین کے چچا کا گھر ہی سمجھو۔ میں صبح ہونے سے پہلے پہلے آجاؤں گا۔ ویسے بلے سے بھی تمھاری ملاقات صبح کو ہی ہوگی"۔

لال دین چلا گیا نجمی نے اٹھ کر اندر سے کنڈی لگالی اور چارپائی پر کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ اسے کئی طرح کے خیال آرہے تھے مگر وہ ان سب کو سلا کر خود بھی سوگئی۔

لال دین جب اسی ٹرک میں واپس جموں پہنچا تو پو پھٹ رہی تھی مندروں میں سے گھنٹیوں کی آوازیں آنا شروع ہوگئی تھیں۔ اور ایک مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ لال نے مکان کا تالا کھولا اور اوپر والی منزل میں آگیا۔ بادل سو رہا تھا۔ اس نے بادل کو جگایا اور کہا" کیا آج دلی جانے کا ارادہ نہیں ہے؟"۔

بادل جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھا اور آنکھیں ملتے ہوئے بولا۔

" ابھی ٹرین جانے میں پورا آدھا گھنٹہ ہے"۔

لال نے کہا" تمھیں ایک گھنٹہ پہلے نکلنا چاہیے تھا اب جلدی کرو۔ نجمی کو میں نے اپنے دوست کے ڈیرے پر پہنچا دیا ہے۔ آج دن کو میں بھی وہاں پہنچ جاؤں گا۔ اب نجمی کو ندیم کا انتظار رہے گا۔ جس دن ندیم آگیا میں ان دونوں کو بارڈر کراس کرادوں گا۔ ساری باتیں بلے سے طے ہوچکی ہیں"۔

بادل نے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا اور کمبل کندھے پر رکھتے ہوئے لال دین سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا:

"لال! تم میری خاطر جو کچھ کر رہے ہو اسے میں ساری زندگی فراموش نہیں کروں گا"۔

لال نے بادل کو گلے سے لگا لیا اور بولا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو بادل! ہم یاروں کے یار ہیں اب تم جلدی سے اسٹیشن کا راستہ پکڑو چاروں طرف سے چوکس رہنا"۔

بادل نے ایک بار پھر گرمجوشی سے لال سے ہاتھ ملایا اور بولا" میں جلد سے جلد ندیم کو لے کر یہاں پہنچنے کی کوشش کروں گا"۔

لال نے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

"کوشش کرنا کہ یہاں رات کے وقت آؤ اس وقت میں گھر پر ہی ہوں گا"۔

بادل خدا حافظ کہہ کر تیزی سے سیڑھیاں اتر کر گلی کے اندھیرے میں گم ہوگیا اسٹیشن یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا ابھی دن بھی نہیں چڑھا تھا پچھلے پہر کا اندھیرا آہستہ آہستہ دور ہو رہا تھا۔ بادل اس اندھیرے میں ہی تیز تیز چلتا چلا جا رہا تھا۔ ایک جگہ بازار میں اسے رکشا مل گیا۔ وہ رکشے میں بیٹھ گیا اسٹیشن پر کافی رش تھا اسٹیشن کی بتیاں جل رہی تھیں۔ ایک ریل گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی بادل نے سر پر کمبل لپیٹ رکھا تھا کیونکہ یہاں کافی سردی تھی۔ ویسے بھی سردی کا موسم شروع ہوچکا تھا۔ بادل نے ٹکٹ خریدا اور پلیٹ فارم پر آگیا۔ یہی گاڑی جالندھر جا رہی تھی۔ یہ نئی نئی چلی تھی اور جموں سے گورداس پور بٹالہ اور امرتسر ہوتی ہوئی جالندھر جاتی تھی۔ پہلے امرت سر سے ٹرین بدلنی پڑتی تھی۔

ٹرین میں روشنی تھی۔ بادل بھی ایک ڈبے میں گھس کر مسافروں کے بیچ میں بیٹھ گیا۔ پلیٹ فارم پر پولیس کے دو تین سپاہی بھی جیسے نیند میں چل پھر رہے تھے۔ ٹرین جموں ہی سے تیار ہوتی تھی ٹھیک وقت پر چل پڑی۔ اب ایک لمبا سفر سامنے تھا۔ بادل نے بھی فیصلہ کیا تھا کہ وہ ٹرین ہی سے سفر کرے گا اور جالندھر پہنچ کر دلی جانے والی ٹرین ہی پکڑے گا۔ گورداسپور پہنچنے سے پہلے پہلے صبح ہوگئی تھی دن نکل آیا تھا۔ مسافروں میں کچھ سکھ بھی تھے۔ بادل نے باری باری سب مسافروں کا جائزہ لیا۔ اس کے اندازے کے مطابق ان میں خفیہ پولیس کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ ٹرین امرتسر کی طرف چلی جا رہی تھی۔

دوسری طرف نجمی بھی صبح ہوئی تو اٹھ بیٹھی اس کی کوٹھری میں روشن دان سے دھوپ آرہی تھی۔ وہی درمیانے قد کا گٹھے ہوئے جسم والا آدمی دروازے پر آکر بولا۔

" بی بی! دن چڑھ آیا ہے، میں چائے لایا ہوں"۔

لال دین ابھی تک نہیں پہنچا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ جب بادل کو اسٹیشن کی طرف روانہ کرنے کے بعد وہ چارپائی پر یوں ہی کمر سیدھی کرنے کی خاطر لیٹا تو اس کی آنکھ لگ گئی اور ایسا سویا کہ جب آنکھ کھلی تو دن نکل آیا تھا فوراً اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور ٹیکسی پکڑ کر بلے کی حویلی کی طرف روانہ ہوگیا اب وہ ٹیکسی کو حویلی تک نہیں لاسکتا تھا مجبوراً اس نے ٹیکسی پہاڑیوں والی کچی سڑک پر ہی

چھوڑنی پڑی اور وہاں سے پیدل چل پڑا۔

نجمی نے پوچھا۔

"لال چچا کہاں ہے؟"

باہر سے جواب آیا "وہ ابھی نہیں پہنچا تم چائے پی لو، کوئی بات ہو گئی ہوگی، آتا ہی ہوگا"۔

نجمی نے دروازہ کھول دیا، چائے کی پیالی پکڑی اور کہا

"لال چچا آئے تو مجھے خبر کر دینا"۔

وہ آدمی چلا گیا۔ نجمی چارپائی پر بیٹھے چائے پیتے ہوئے سوچنے لگی کہ کہیں کوئی ناخوشگوار حادثہ تو نہیں ہو گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ پولیس نے چھاپہ مار کر بادل اور لال دونوں کو پکڑ لیا ہو۔ نجمی خاموشی سے چائے پیتی رہی اب یہ چھاپے اور گرفتاریاں اس کے لیے معمولی بات ہو کر رہ گئی تھیں۔ ابھی اس نے چائے ختم ہی کی تھی کہ لال دین بھی آگیا تھکاوٹ سے اس کا برا حال ہو رہا تھا کم از کم چھ میل پہاڑی راستوں پر پیدل چلنا پڑا تھا۔ آتے ہی چارپائی پر گر پڑا۔ ساری بات نجمی کو سنائی تو وہ ہنس پڑی۔

"چچا تم تھکے ہوئے تھے نیند آ گئی بادل تو چلا گیا تھا نا؟"

"اس کو خدا حافظ کہہ کر ہی تو میں ذرا کمر سیدھی کرنے لیٹا تھا کہ بے ہوش ہو کر سو گیا"۔

لال نے نجمی کو وہیں بیٹھی رہنے کی تلقین کی اور خود اٹھ کر حویلی میں چلا گیا۔ اسے پتہ چلا کہ بلا بارڈر کے کسی گاؤں گیا ہوا ہے بس آنے ہی والا ہوگا۔ لال نے منہ ہاتھ دھویا چائے پی اور نجمی کی کوٹھری میں آگیا۔

"بلا رات کا باہر گیا ہوا ہے ابھی آنے والا ہے میں تمہاری اس سے ملاقات کروا کر ہی جاؤں گا"۔

نجمی نے کہا "لال چاچا! مجھے یہاں کتنے دن رہنا پڑے گا؟"۔

لال بولا "یہ تو بادل کے واپس آنے پر منحصر ہے اگر وہ کل آجاتا ہے تو میں بلے سے کہہ کر پرسوں رات کو تمہیں بارڈر کراس کرا دوں گا"۔

نجمی نے سر جھکا لیا اور اپنے اوپر کمبل کرتے ہوئے بولی "میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے یہاں"۔

لال مسکرایا۔

"اری اسلحے کی یہاں تمہیں کیا ضرورت ہے تو میرے دوستوں کی حویلی میں بیٹھی ہے۔ ان لوگوں کے پاس تمہاری حفاظت کرنے کے واسطے بے پناہ اسلحہ ہے"۔

باہر جیپ کی آواز آئی لال اٹھتے ہوئے بولا۔

"بلا آگیا ہے میں ابھی اسے یہاں لاتا ہوں"۔

لال جلدی سے باہر نکل گیا۔

نجمی نے دروازہ بند کر لیا اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں کے بعد بھاری جوتوں کی آواز قریب آتی سنائی دی پھر دروازے پر لال دین نے دستک دیتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

"نجمی! دروازہ کھولو! بچی"۔

نجمی نے دروازہ کھول دیا اور چارپائی کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔ کوٹھری میں لال کے ساتھ ایک اونچے قد کا چوڑا چکلا مگر ذرا پکی عمر کا سرخ و سپید آدمی داخل ہوا۔ اس کے کاندھے سے سٹین گن لٹک رہی تھی۔ کمر میں میگزین کی پیٹی بندھی ہوئی تھی سر پر نیلا رومال رکھا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی نوکیلی مونچھیں تھیں اس نے نجمی کی طرف اپنی ہلکی ہلکی نیلی آنکھوں سے گھور کر دیکھا اور کہا۔

"یہاں تمہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی آرام سے رہو"۔

یہ کہہ کر وہ کوٹھری سے نکل گیا، لال بھی اس کے ساتھ ہی چلا گیا۔

نجمی کو یہ اسمگلر بڑا عجیب سا لگا۔ اس کی شخصیت دیکھ کر نجمی نے کم از کم یہ اندازہ ضرور لگا لیا تھا کہ وہ دلیر آدمی ہے اور اسے اور ندیم کو بارڈر کراس کرا دے گا۔ اسمگلر عام طور پر کمزور ہوتے ہیں لیکن یہ آدمی اسمگلر سے زیادہ ڈاکو لگتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد لال بھی آگیا کہنے لگا۔

"بلے سے ایک بار پھر ساری بات ہو گئی ہے وہ کہتا ہے کہ اگرچہ بارڈر پر حالات تشویشناک ہیں مگر میں ان دونوں کو کسی نہ کسی طرح بارڈر کراس کرا دوں گا"۔

نجمی نے لال سے پوچھا:

"کیا تم نے اسے میرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔"

لال دین کہنے لگا۔

"سب کچھ تو نہیں بتایا ہاں اتنا ضرور بتا دیا ہے کہ تم ایک دلیر عورت ہو، ندیم سے بیاہ کرنا چاہتی ہو پاکستان جا کر! اور دونوں تم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو اور ندیم صرف تمھیں لینے بارڈر کراس کر کے یہاں آیا تھا۔ باقی اگر بلّے کو اپنے مخبروں کی زبانی کچھ علم ہو گیا ہو تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ یہاں کوئی ایسا آدمی نہیں آسکتا جس کے بارے میں بلّے کو خود سب کچھ معلوم نہ ہو یا اسے اس کے مخبروں نے نہ بتا دیا ہو۔"

نجمی لال دین کو تکتی رہی پھر بولی:

"چاچا تمھارا کیا خیال ہے ندیم دلی میں ہی ہو گا؟"

لال نے کہا۔

"ہمیں تو یہی اطلاع ملی تھی کہ وہ دلی میں ہے اور خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے آس پاس ہی کسی جگہ چھپا ہوا ہے۔"

نجمی نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

"اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا اب خدا کرے کہ وہ وہیں پر ہو اور بادل کو مل جائے۔"

لال مسکرا کر بولا۔

"بادل بڑا کائیاں اور تجربے کار آدمی ہے وہ ندیم کو زمین کے اندر سے بھی کھینچ لائیگا۔"

"ویسے اس کا جیل سے بچ نکلنا بھی ایک معجزہ ہی ہے۔ اگر تم اس کی مدد نہ کرتیں تو اسے پھانسی کے تختے سے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکتی تھی۔"

نجمی نے کہا۔

"خدا کو یہی منظور تھا میں نے اس پر کوئی احسان نہیں کیا۔ بادل نے میرے لیے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں چاچا۔ میرا خیال ہے کہ وہ جالندھر پہنچ گیا ہو گا۔"

لال دین نے گھڑی دیکھ کر کہا۔

"میرے اندازے کے مطابق تو وہ اس وقت فرنٹیئر میل میں بیٹھا دلی جا رہا ہو گا۔"

بادل فرنٹیئر میل کے سیکنڈ کلاس کے ڈبے کے برتھ پر منہ کھڑکیوں کی طرف کیے لیٹا تھا اور نیم کھلی آنکھوں سے نیچے بیٹھے ہوئے مسافروں کو دیکھ رہا تھا۔ ان میں دو سکھ ایک ہندو اور دو سادھو قسم کے لوگ تھے۔ یہ سادھو ایسے تھے جو انگریزی فر فر بولتے تھے اور امیر لوگوں کو اپنی باتوں سے گرویدہ کر کے انھیں مرید بنا لیتے ہیں اور پھر ان سے دولت بٹورتے ہیں اور عیش آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ بادل نے بڑے غور سے اور تجزیاتی انداز میں دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ ان میں خفیہ کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ بادل نے اتنی احتیاط کی کہ راستے میں بہت کم کسی اسٹیشن سے اترا جس وقت ٹرین دلی کے وسیع و عریض ریلوے یارڈ میں سے گزرتی ہوئی پلیٹ فارم پر جا کر رکی تو شام ہو چکی تھی۔ بادل کے لیے یہ وقت بڑا موزوں تھا۔

دلّی بادل کے لیے کوئی نیا اجنبی شہر نہیں تھا اس شہر کے گلی کوچوں اور نئی آبادیوں کی سڑکوں اور مارکیٹوں سے وہ خوب واقف تھا۔ تیس ہزاری کی پرانی بستی میں اس کا ایک جرائم پیشہ دوست بھی تھا۔ مگر بادل فی الحال اس کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا اسے معلوم تھا کہ وہ نہ صرف جیل توڑ کر بلکہ چار آدمیوں کا خون کر کے امرت سر سے بھاگا ہے اور پولیس اس کے دوستوں کے اڈوں اور ڈیروں کی ضرور نگرانی کر رہی ہو گی۔

پلیٹ فارم پر کافی بھیڑ تھی بادل ان کے درمیان چلتا ہوا پلیٹ فارم سے باہر آ گیا اب مسئلہ ندیم کو خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کی بستی میں تلاش کرنے کا تھا۔ کسی زمانے میں یہ واقعی شہر سے پہلے ایک بستی ہوا کرتی تھی لیکن اب وہ شہر کا ایک حصہ بن چکی تھی اور آس پاس اتنی آبادی ہو گئی تھی کہ وہاں کسی ایسے آدمی کو تلاش کرنا جو خود پولیس سے چھپتا پھر رہا ہو بڑا مشکل کام تھا لیکن بادل نے عہد کر رکھا تھا کہ وہ ندیم کو تلاش کر کے ہی رہے گا۔

اس نے اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی ایک رکشہ لیا اور سیدھا بستی خواجہ نظام الدین کی طرف روانہ ہو گیا یہاں اسے پولیس کا بھی زیادہ خطرہ نہیں تھا اس لیے کہ عقیدت مندوں کا صبح و شام جمگھٹا لگا رہتا تھا جن میں بادل بڑی آسانی سے اپنے آپ کو گم کر سکتا تھا۔ بستی خواجہ صاحب یہاں سے کافی دور تھی۔ رات ہو گئی تھی جب وہ بستی میں پہنچا دور ہی سے اسے درگاہ شریف کی طرف سے قوالی کی روح پرور آواز سنائی دی۔ فضا میں گلاب اور عطریات کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی

درگاہ شریف میں فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ باولی کے پاس ایک طرف دیوار کے پاس لگ کر بیٹھ گیا اور آنے جانے والے لوگوں کو غور سے تکتا رہا۔ نو بجے رات کے قریب اس نے بھنڈارے کی روٹی کھائی اور اٹھ کر ٹہلتا ہوا پیچھے قبرستان کی طرف نکل گیا۔

قبرستان کے علاقے میں زیادہ روشنی نہیں تھی وہ امیر خسرو کے مزار کے قریب سے گزر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ بادل کے سارے بدن میں سنسنی دوڑ گئی اس نے پلٹ کر دیکھا۔

ایک اونچا لمبا داڑھی والا آدمی بادل کو اپنی لال لال آنکھوں سے دیکھ کر مسکرا رہا تھا "استاد مجھے پہچانا نہیں۔ میں سکھیا ہوں"۔

بادل نے اسے پہچان لیا تھا۔ سکھیا نے داڑھی رکھ لی تھی مگر اس کا چہرہ اسی طرح مسکرا رہا تھا جس طرح ان دنوں مسکرایا کرتا جب وہ اس کے گروہ میں شامل تھا۔ یہ بات اس زمانے کی ہے جب بادل کے گروہ میں ابھی نجمی شامل نہیں ہوئی تھی۔ بادل نے سکھیا کو گلے لگا لیا۔ سکھیا اسے ایک طرف نیم کے پیڑ تلے لے گیا اور رازداری سے پوچھا: "استاد بادل! کیا کوئی واردات کی ہے؟"

بادل نے کہا ایسی بات نہیں سکھیا میں ویسے ہی دربار پر حاضری دینے آیا تھا مگر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تم سے ایک عرصے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ ہمارا گروہ چھوڑنے کے بعد تم کہاں چلے گئے تھے؟"

سکھیا بولا "استاد یہ بڑی لمبی کہانی ہے، ڈیرے پر چلو گے تو سنا دوں گا۔ تمھارے ساتھ کوئی اور آدمی تو نہیں ہے؟"۔

"نہیں میں اکیلا ہوں" بادل نے کہا۔

"تو پھر میرے ڈیرے پر چلو فکر نہ کرو پولیس ادھر پھٹکتی بھی نہیں"۔

پھر ہنس کر بولا: "میں پورے تھانے کو مہینہ دیتا ہوں"۔

سکھیا کا ڈیرہ بستی سے ذرا ہٹ کر ایک پرانے سوکھے ویران تالاب کے کھنڈر کے پاس ہی تھا۔ سکھیا ایک عرصے سے وہاں مقیم تھا۔ اس نے چند لڑکے رکھ چھوڑے تھے جو شہر میں گھوم پھر کر لوگوں کی جیبیں کاٹتے تھے اور سارا مال لا کر سکھیا کے حوالے کر دیتے تھے۔ سوکھے تالاب کے پیچھے دو

کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں جن کے آگے ایک کشادہ صحن تھا۔ ایک کوٹھڑی کے باہر بلب روشن تھا برآمدے میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور دو لڑکے کام کاج میں لگے ہوئے تھے۔ سکھیا بادل کو اپنی کوٹھڑی میں لے گیا۔ "کیا کھاؤ گے، بولو!"

بادل نے کہا کہ وہ بھنڈارہ کھا چکا ہے۔ سکھیا نے اسی وقت چائے بنوائی اور دونوں پرانے دوست باتیں کرنے لگے بادل نے سکھیا کو اپنے بارے میں زیادہ نہیں بتایا بس اتنا ہی کہا کہ اس کا ایک دوست جس کا نام ندیم ہے پاکستان سے بارڈر کراس کر کے دلی اسے ملنے آیا تھا مگر مل نہیں سکا کیونکہ پولیس اس کے پیچھے لگی ہے اور سنا ہے کہ وہ بستی نظام الدین میں کہیں روپوش ہے۔ سکھیا اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کچھ سوچنے لگا پھر بولا "استاد تم فکر نہ کرو میں اس کا پتہ کروا لوں گا تم مجھے اس کا حلیہ بتا دو اگر وہ اس بستی میں ہوا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میرے آدمی اس کا سراغ لگانے میں کامیاب نہ ہوں"۔

بادل سکھیا پر اتنا اعتبار کر سکتا تھا۔ ویسے وہ قابلِ اعتبار آدمی تھا۔ کیونکہ بادل کے سامنے سکھیا کا سارا ماضی روشن تھا۔ ماضی میں سکھیا نے کبھی اپنے کسی دوست کو دھوکہ نہیں دیا تھا وہ بات کا پکا اور دلیر آدمی تھا۔ بادل نے اسے ندیم کا حلیہ بتایا اور کہا۔ "پولیس میرے پیچھے بھی لگی ہوئی ہے تم جانتے ہی ہو کہ ہمارا پیشہ کس قسم کا ہے"۔

سکھیا مسکراتے ہوئے بولا: "استاد کیا اب بھی تم اسی گروہ میں ہو یا تم نے اپنا الگ گروہ بنا لیا ہے؟ یار میں اس زندگی سے تنگ آگیا ہوں چاہتا ہوں پھر کسی گروہ میں شامل ہو کر ڈاکے مارنے شروع کر دوں ڈاکے مارنا مجھے اس بک بک سے زیادہ اچھا لگتا ہے یہاں تو ایک ایک جیب کا حساب لینا پڑتا ہے اور پھر لونڈے مال کھا بھی جاتے ہیں"۔

بادل نے کہا۔ "سکھیا ایک بار پھر سوچ لو میری طرف سے تمھیں انکار نہیں"۔

سکھیا بولا: "میں نے سوچ لیا ہے استاد۔ تم فکر نہیں کرو میں اس زندگی سے بیزار ہو گیا ہوں"۔

بادل نے کہا۔ "کوئی بات نہیں ندیم کو برآمد کر کے مجھے اس کے لواحقین کے ہاں پہنچا آنے دو واپسی پر تمھیں بھی اپنے ساتھ لیتا چلوں گا"۔

سکھیا نے بادل کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر کہا۔ "وعدہ رہا؟"

بادل نے پرجوش انداز میں کہا۔ "پکا وعدہ"۔

"ڈاکوؤں ایسا وعدہ؟" سکھیا نے پوچھا۔

"ہاں ڈاکوؤں والا وعدہ"۔ سکھیا نے خوش ہو کر بادل کو گلے لگا لیا اور کہنے لگا "تم فکر ہی نہ کرو بادل یہاں پولیس والا کبھی نہیں آتا۔ میں پہلی تاریخ کو انھیں مہینہ پہنچا دیا کرتا ہوں تم آرام کرو۔ میں ایک ڈیرے پر جاتا ہوں ممکن ہے وہاں سے تمھارے ندیم کا کوئی سراغ مل جائے"۔

بادل نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "یاد رکھنا اس لڑکے ندیم پر پاکستانی جاسوس ہونے کا بھی الزام ہے"۔

سکھیا جاتے جاتے رک گیا "استاد یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں بتائی"۔

بادل نے کسی قدر تشویش کے ساتھ پوچھا۔ "کیوں کوئی خاص بات ہے؟"

سکھیا چارپائی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ کا لمبا کش لگا کر بولا "خاص بات یہ ہے کہ اب مجھے ایک ایسے آدمی کے پاس جانا ہو گا جو اس قسم کے مشتبہ آدمیوں کی پوری خبر رکھتا ہے"۔

بادل نے کہا۔ "لیکن ندیم پاکستانی جاسوس نہیں ہے یہ تو اس پر انڈین پولیس نے الزام لگایا ہے اور پھر ندیم کبھی کسی کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتائے گا"۔ سکھیا بولا۔ "چاہے وہ کسی کو کچھ نہ بتلائے لیکن جس آدمی کے پاس اب میں جانے والا ہوں اس کو ہر آدمی کی خبر ہوتی ہے، بس تم مجھے جانے دو میں رات دیر سے آؤں گا تم سو جانا۔ صبح اپنی کارگزاری بتاؤں گا"۔

اور سکھیا کوٹھڑی سے باہر نکل گیا۔ بادل کو سکھیا کی سراغ رسانی اور اس کے ذرائع پر اتنا اعتماد نہیں تھا۔ بھلا ندیم کے بارے میں اس کا آدمی کیسے کچھ معلوم کر سکے گا۔ ندیم اگر ان لوگوں سے ملا بھی تو وہ کہاں اپنے بارے میں انھیں بتلائے گا۔ بادل اپنے طور پر ندیم کو تلاش کرنے کے سلسلے میں ذہن میں منصوبہ بندی کرنے لگا۔

وہ چارپائی پر نیم دراز ہو گیا، کمبل اوپر کر لیا اور سگریٹ سلگا کر سوچنے لگا کہ ندیم کو اس بستی میں کہاں اور کس مقام پر تلاش کیا جائے۔ اگر اس نے نجمی کو یہ اطلاع پہنچائی تھی کہ وہ بستی نظام الدین میں کسی جگہ چھپا ہوا ہے تو ظاہر ہے کسی واقف کار کے ہاں چھپا ہوا ہو گا اور وہ آدمی

ندیم کے بارے میں کبھی کسی کو نہیں بتلائے گا اچانک بادل کو خیال آیا کہ ہو سکتا ہے اس آدمی کا تعلق سکھیا کے گروہ سے ہو اور وہ روپوں کے لالچ میں آ کر ندیم کے بارے میں سکھیا کے کسی آدمی کو کچھ بتا دے۔ یہ بادل کا قیاس ہی تھا۔ اس نے سگریٹ بجھایا اور کمبل اوپر کر کے لیٹ گیا۔ دن بھر کے سفر کا تھکا ہوا تھا تھوڑی ہی دیر بعد اسے نیند آ گئی۔ رات کا ایک بج رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی بادل جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ باہر سے سکھیا کی آواز آئی: "استاد سو گئے ہو کہ جاگ رہے ہو؟"

بادل نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سکھیا اندر آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا وہ سگریٹ پی رہا تھا۔ باہر سردی ہو گئی تھی۔ سکھیا نے کہا۔ "استاد تم نے لحاف کیوں نہیں کھولا یہاں تو ٹھنڈ ہے"۔

بادل آنکھیں ملتے ہوئے چارپائی پر کمبل اوڑھ کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ "کیا خبر لائے ہو سکھیا؟"

سکھیا نے سگریٹ کا کش لگایا اور کہنے لگا۔ "استاد تم نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ تم امرتسر میں چار خون کر کے جیل سے بھاگے ہو اور تمھارے ساتھ کوئی جوگن بھی تھی"۔

کوٹھری میں مدھم روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ بادل نے سانس بھرتے ہوئے کہا" یہ بات تمھیں بتانے کی نہیں تھی اور پھر قتل اور جیل تو ہماری زندگیوں کا حصہ بن گئے ہیں۔ ہاں اگر تمھیں خطرہ ہے کہ پولیس کہیں میرے ساتھ تمھیں بھی گرفتار نہ کر لے تو میں ابھی یہاں سے چلا جاتا ہوں"۔

سکھیا نے سگریٹ فرش پر پھینک کر اسے پاؤں سے مسل دیا اور بادل کی طرف گردن ٹیڑھی کر کے دیکھتے ہوئے بولا: "بادل کیا تم مجھے ایسا آدمی سمجھتے ہو، یار بڑے افسوس کی بات ہے کہ تمھارے ساتھ اتنا عرصہ گزارا ہے پھر بھی تم مجھے نہیں سمجھ سکے"۔

بادل نے کھسیانہ سا ہو کر سکھیا کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور کہا۔ "سکھیا مجھے تمھاری نیت پر ہرگز ہرگز شک نہیں ہے میں تو صرف تمھاری سلامتی کی بات کر رہا تھا کہ میری وجہ سے تم بھی کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ"۔

سکھیا نے بادل کے ہاتھوں کو گرمجوشی سے دباتے ہوئے کہا۔" بادل کبھی مجھے آزما کر دیکھو خدا کی قسم اپنے دوست کی خاطر جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔ اب سنو میں دو ڈیروں پر گیا تھا

وہاں سے مجھے ندیم کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ کل ایک اور ڈیرے پر جا رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ وہاں سے تمھارے ندیم کا کوئی نہ کوئی سراغ ضرور مل جائے گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ تم آرام کرو۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے"۔

اور سکھیا بادل کا ہاتھ گرمجوشی سے دبا کر کوٹھری سے نکل گیا۔ بادل کچھ دیر تک سگریٹ پیتے ہوئے ندیم اور سکھیا کے اثر و رسوخ کے بارے میں غور کرتا رہا پھر سگریٹ بجھا کر سو گیا۔ دوسرے دن بھی بادل نے سارا وقت سکھیا کے ڈیرے پر ہی کوٹھری کے اندر گزارا۔ سکھیا صبح ہی سے ندیم کی سراغرسانی میں نکل گیا تھا اور بادل کو تاکید کر گیا تھا کہ وہ کوٹھری سے باہر نکلتے وقت ذرا احتیاط سے کام لے کیونکہ خفیہ پولیس کے آدمیوں کا آس پاس امکان ہو سکتا ہے۔ دو لڑکے بادل کی خدمت پر مامور کر دیئے گئے تھے۔ انھوں نے ہی بادل کو چائے اور کھانا وغیرہ کوٹھری کے اندر ہی لا کر دے دیا۔ دوپہر کے بعد سکھیا آ گیا۔

وہ مسکرا رہا تھا۔ بادل کو محسوس ہوا کہ شاید اس نے ندیم کا سراغ لگا لیا ہے۔ سکھیا نے اندر آتے ہی پوچھا۔" یہ بتاؤ تم نے کھانا وغیرہ کھا لیا؟ کسی قسم کی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

بادل نے کہا۔" ارے نہیں سکھیا میں تو یہاں مزے میں ہوں۔ تمھارے لڑکوں نے میری بڑی خدمت کی ہے، اچھا بتاؤ کیا خبر لائے ہو؟"

سکھیا نے لڑکے کو چائے لانے کے لیے آواز دی اور کوٹھری کا دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔" استاد تمھارے آدمی کی سن گن مل گئی ہے"۔

پھر سکھیا نے بادل کو بتایا کہ ایک خفیہ اڈے سے اسے معلوم ہوا ہے کہ ایک مشتبہ نوجوان کو اس علاقے کی ایک مسجد میں نماز پڑھتے دیکھا گیا جو نماز پڑھنے کے بعد بھی مسجد میں ہی بیٹھا رہا پھر اس نے امام مسجد سے کچھ باتیں کیں اور امام صاحب نے اسے مسجد کے حجرے میں ہی ٹھہرا لیا ہے اگر تم میرے ساتھ چلو تو وہ نوجوان ابھی تک اسی مسجد کے حجرے میں ہی ہے۔ اس کا نام حلیہ تقریباً وہی ہے جو تم نے مجھے بتایا تھا صرف اس نوجوان کا سر منڈا ہوا ہے"۔

بادل کے دل میں امید کی کرن پیدا ہو گئی تھی ممکن ہے یہ ندیم ہی ہو۔ سکھیا کے آدمی علاقے میں آنے والے ہر نئے اور مشتبہ آدمی کی خبر رکھتے تھے۔ ندیم کا سراغ مل جانا بھی اسی

حفظِ ماتقدم کی ایک کڑی تھی۔ بادل بولا: "میں ابھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں"۔

سکھیا کہنے لگا: "ابھی نہیں ذرا شام کا اندھیرا ہو جانے دو۔ میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا"۔

بادل خاموش ہو گیا جب شام کا اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا تو سکھیا نے ایک بند رکشا وہاں منگوایا اور بادل کو ساتھ لے کر اس مسجد کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ایک مشتبہ نوجوان حجرے میں رہ رہا تھا۔ یہ مسجد بستی نظام الدین کے علاقے میں ہی تھی مگر کافی فاصلے پر تھی۔ یہاں مکان دور دور بنے ہوئے تھے اور بیچ میں کچھ پارک بھی تھے۔ ایک بس سٹینڈ بھی قریب ہی تھا۔ مسجد سے تھوڑی دور سکھیا نے رکشا رکوالیا وہ دونوں مسجد کی طرف بڑھے۔ مسجد میں مغرب کی نماز ہو چکی تھی۔ سردی کی وجہ سے مسجد کا صحن خالی تھا۔ سکھیا نے بادل سے کہا "تم اسی جگہ ٹھہرو میں جا کر امام مسجد سے ملتا ہوں"۔

بادل کہنے لگا: "میرا خیال ہے تمھاری بجائے مجھے جانا چاہیے تمھیں دیکھ کر ہو سکتا ہے ندیم وہاں سے بھاگ جائے کیونکہ وہ تمھیں خفیہ پولیس والا بھی سمجھ سکتا ہے لیکن میری شکل دیکھ کر وہ حجرے سے باہر آجائے گا"۔

سکھیا بولا: "ٹھیک ہے تم جاؤ میں اسی جگہ ٹھہرتا ہوں رکشا میں نے اسی لیے رکوالیا ہوا ہے"۔

بادل نے اپنے سر پر رومال باندھا اور مسجد کے باہر جوتے اتار کر صحن میں داخل ہو گیا سامنے کونے میں ایک حجرہ تھا جس کا دروازہ بند تھا۔ مسجد خالی تھی۔ بادل نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ حجرے کے دروازے پر دستک دی۔ کسی نے اندر سے بھاری آواز میں پوچھا: "کون ہے میاں؟"

بادل نے کہا: "حضور! مسافر ہوں بھوک لگی ہے میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں"۔

اندر سے آواز آئی: "بیٹھ جاؤ"۔

بادل چادر جسم کے گرد لپیٹ کر مسجد کے صحن میں دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہ امام مسجد ہے تو وہ ندیم کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتائے گا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے

ندیم نے امام صاحب کو صاف صاف بتا دیا ہو کہ وہ مسلمان ہے اور غیر قانونی طور پر بارڈر کراس کر کے یہاں اپنی والدہ یا بھائی بہنوں سے ملنے آیا ہے اور اب پولیس اس کے پیچھے لگ گئی ہے بادل ابھی خیالات میں گم تھا کہ حجرے کا دروازہ کھلا اور باریش شخص ہاتھ میں تھالی لیے نمودار ہوا۔

"لو میاں کھچڑی ہے اسے قبول کرو"۔

بادل نے آگے بڑھ کر کھچڑی کی تھالی امام صاحب کے ہاتھوں سے تھام لی اور کہا: "حضور آپ کی بڑی مہربانی ہے"۔

اور بادل دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور کھچڑی کھانے لگا۔ امام صاحب نے حجرے کا دروازہ بند کر دیا۔ بادل نے فوراً اٹھ کر دروازے کے ساتھ کان لگا دیا۔ اندر سے کسی کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی: "حضور! یہ ضرور کوئی خفیہ پولیس والا ہوگا"۔

بادل کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اس نے ندیم کی آواز پہچان لی تھی اب بادل کے لیے صبر کرنا ناممکن تھا۔ اس نے دروازے کے ساتھ منہ لگا کر کہا: "ندیم! دروازہ کھولو میں بادل ہوں"۔

حجرے میں ایک لمحے کے لیے بالکل سناٹا چھا گیا۔ پھر کسی نے جلدی سے دروازہ کھول دیا بادل کے سامنے ندیم اور ندیم کے سامنے بادل کھڑا تھا۔ دونوں بے اختیار ہو کر ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ امام مسجد دونوں کو حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ ندیم جلدی سے بادل کو حجرے میں لے آیا۔ اس نے امام صاحب سے کہا: "حضور یہی وہ شخص ہے جس کی مجھے تلاش تھی میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے حجرے میں پناہ دی۔ اگر آپ مجھے یہاں پناہ نہ دیتے تو شاید میں اپنے بھائی سے کبھی نہ مل سکتا"۔

بادل نے ندیم سے کہا: "میرے ساتھ چلو ندیم تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں"۔

ندیم اسی وقت چلنے کو تیار ہو گیا۔ امام مسجد نے کہا: "بیٹا تمھاری مہمان نوازی میں اگر کوتاہی ہو گئی ہو تو مجھے معاف کر دینا"۔

ندیم نے امام صاحب کا ہاتھ تھام کر چوم لیا اور جذباتی آواز میں بولا: "حضور! میں آپ کا احسان ساری زندگی نہیں بھول سکوں گا آپ نے اسلامی اخوت کی لاجواب مثال پیش کی ہے۔ اب

مجھے اجازت دیجیے میں اپنے آدمیوں کے پاس پہنچ گیا ہوں"۔

امام صاحب نے ندیم کو گلے لگا کر دعا دی۔ ندیم اور بادل سلام کر کے مسجد سے باہر آگئے باہر آتے ہی ندیم نے پوچھا "ہم یہاں محفوظ ہیں نا بادل بھائی؟"

"بالکل محفوظ ہیں میں تمھیں اپنے دوست سے ملواتا ہوں"

بادل نے ندیم کا سکھیا سے تعارف کرایا اور کہا "اگر میرا یار سکھیا میری مدد نہ کرتا تو شاید میں کبھی تم تک نہ پہنچ پاتا"۔

ندیم نے سکھیا کا بھی شکریہ ادا کیا اور رکشہ میں بیٹھ کر یہ لوگ سکھیا کے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گئے۔ ڈیرے پر آکر سب نے مل کر کھانا کھایا پھر سکھیا چائے بنوانے باہر چل دیا۔ بادل نے ندیم سے کہا "تم نے پاکستان سے انڈیا آنے کی غلطی کیوں کی؟"

ندیم نے کہا "صرف نجمی کے لیے میں نے ایسا کیا ہے۔ اب اس کے بغیر میرا کہیں بھی دل نہیں لگتا۔ یہ بتاؤ وہ کہاں ہے، خیریت سے تو ہے نا؟"

بادل نے کہا "وہ تم سے ناراض ہے کہ جب تم اس مصیبت سے نکل چکے تھے تو دوبارہ یہاں کیوں آگئے ہو؟"

ندیم بولا "میں مجبور ہوں بادل بھائی۔ نجمی کا میں نے لاہور میں بڑا انتظار کیا جب اس کی جدائی برداشت نہ کر سکا تو بارڈر کراس کر کے یہاں پہنچ گیا۔ بارڈر پر میں مرتے مرتے بچا وہاں محسوس ہوا کہ دونوں طرف سیکورٹی کتنی سخت ہو گئی ہے۔ نجمی خوش ہے نا؟"

بادل نے اسے بتایا کہ نجمی بالکل خیریت سے ہے اور شمالی علاقے کی سرحدی پہاڑیوں میں اس کا انتظار کر رہی ہے تاکہ دونوں مل کر انڈیا کا بارڈر کراس کریں۔ ندیم نے کسی قدر تشویش کے ساتھ بادل سے کہا "بادل بھیا! کیا اس علاقے سے بارڈر کراس کر سکیں گے ہم؟ جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ہے اس وقت بارڈر کراس کرنا اپنی موت کو آواز دینے کے برابر ہے۔ کیا ہم کچھ عرصہ روپوش نہیں رہ سکتے؟"

بادل نے کہا "نجمی نہیں مانے گی۔ ویسے بھی جو آدمی تم دونوں کو بارڈر کراس کرائے گا ایک تو وہ بڑے اعتماد والا آدمی ہے دوسرے اسے بارڈر کی ایک ایک انچ زمین کا پتہ ہے جموں کشمیر کے

پہاڑی علاقوں میں وہ ایسی کئی خفیہ جگہوں کو جانتا ہے جہاں سے اس کے آدمی بارڈر کراس کرتے ہی رہتے ہیں"۔

سکھیا بھی چائے لے کر وہاں آگیا۔ اب بادل نے اس سے کہا کہ وہ ندیم کو لے کر جموں جانا چاہتا ہے جہاں سے اسے بارڈر کراس کروا کر پاکستان بھیجا جائے گا"۔

سکھیا بولا "یہ تو بڑا لمبا فاصلہ ہے تم کب جانا چاہتے ہو؟"

بادل نے کہا "میں تو کل صبح ہی روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔ ویسے تو میں ندیم کو لے کر جا سکتا ہوں مگر صورتِ حال پیچیدہ ہو گئی ہے تم سے میں نے اس لیے مدد مانگی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ تم کوئی ایسا بندوبست کر دو کہ ہمیں زیادہ پریشانی نہ اٹھانا پڑے اور خطرہ بھی کم ہو جائے۔ کیا تم کوئی اس قسم کا بندوبست کر سکتے ہو؟"

سکھیا کچھ سوچنے لگا پھر بولا "ایک بات ہو سکتی ہے"۔

"وہ کیا" بادل نے پوچھا۔

سکھیا سگریٹ کا کش لگا کر بولا "میرا ایک دوست چرس اور کوکین جموں کشمیر اسمگل کرتا ہے ویسے تو وہ پھلوں کا کاروبار کرتا ہے۔ کشمیر کے سیب وغیرہ کلکتے لے جاتا ہے اور کلکتے سے ناریل اور اناس جموں کشمیر لے جاتا ہے لیکن اصل میں وہ ناریلوں میں چرس اور کوکین بھر کر لے جاتا ہے وہ خود تو نہیں لیکن اس کا ایک خاص آدمی اپنی نگرانی میں یہ منشیات جموں ٹرک میں پہنچاتا ہے۔ اس کا ٹرک پرسوں آنے والا ہے تم دونوں اس میں بیٹھ کر چلے جانا۔ میرا خیال ہے کہ اس سے بہتر تمھارا کوئی انتظام نہیں ہو سکتا"۔

بادل [illegible] ہوا لیکن اس نے پوچھ ہی لیا "اگر راستے میں چیکنگ ہو گئی تو ہم ضرور پولیس کے ہتھے [illegible] جائیں گے"۔

سکھیا ہنستے ہوئے بولا [illegible] اتنا عرصہ ہو گیا تمھیں اپنا گروہ چلاتے ہوئے اور ابھی تک تم کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ایسے [illegible] سارا بندوبست کرنے کے بعد ہی اپنے گھر سے چلتے ہیں یہ کوئی اناڑی نہیں ہیں یہاں سے لے کر جموں تک میرے دوست نے سب پولیس والوں کا بھتہ مقرر کر رکھا ہے۔ ارے ان کے ٹرک کی طرف تو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا"۔

ندیم بولا۔ "بادل بھیا! تب تو یہ ہمارے لیے خوب رہے گا"۔

سکھیا نے کہا۔ "یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں پرسوں ٹرک یہاں پہنچ جائے گا۔ ٹرک اڈے پر ہی کھڑا ہوتا ہے میں خود بوگن سے جا کر مل لوں گا۔ یہ بوگن میرے دوست کا خاص اور پر اعتماد آدمی ہے۔ اس روٹ پر اسمگلنگ کا سارا کام وہی کرتا ہے۔ یہ جو چرس کوکین ہے نا؟ یہ میرے دوست کو برما کے بارڈر سے اسمگل ہو کر ملتی ہے۔ بہر حال تم ایک دن اور یہاں ٹھہر جاؤ"۔

بادل اور ندیم کو سکھیا کی یہ سکیم پسند آئی۔ اب انھوں نے کلکتے سے آنے والے ٹرک کا انتظار شروع کر دیا۔ دونوں سکھیا کے مکان میں چھپے رہے رات کو بھی باہر نہیں نکلتے تھے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے کہ وہ کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟ آخر وہ دن بھی آگیا جس روز کلکتے سے ٹرک آنا تھا۔ سکھیا شام کے وقت ٹرکوں کے اڈے پر پہنچ گیا۔ بوگن کا ٹرک آ چکا تھا اور ایک طرف کھڑا تھا۔ بوگن دکان کے باہر لکڑی کے بنچ پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ سکھیا کو دیکھتے ہی بولا۔ "دادا میں چائے پی کر تمھاری طرف آنے ہی والا تھا"۔

سکھیا اس کے پاس ہی اسٹول پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "دو امانتیں جموں پہنچانی ہیں"۔

بوگن ڈرائیور نے پرچ میں سے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔ "امانتیں سوکھی ہیں یا تر"؟ سکھیا نے کہا۔ "دو آدمی ہیں پولیس کو ڈھکینی میں مطلوب ہیں میرے یار ہیں انھیں جموں کشمیر روڈ تک پہنچانا ہے"۔

بوگن کو معلوم تھا کہ سکھیا اس کے مالک کا گہرا یار ہے اور سکھیا کے اس کے مالک پر احسانات بھی ہیں۔ ویسے وہ خود بھی سکھیا سے کئی کام کروا چکا تھا کہنے لگا۔ "دادا یہ تو کوئی بات ہی نہیں اپنی امانتیں لے آنا میں منہ اندھیرے نکل جاؤں گا"۔

سکھیا خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔ آتے ہی اس نے ندیم اور بادل کو بتا دیا کہ ان کا بندوبست ہو گیا ہے اور وہ تیار رہیں۔ منہ اندھیرے انھیں ٹرک میں سوار کرا دیا جائے گا۔ ندیم کہنے لگا۔ "سکھیا بھائی ہم ٹرک میں چھپ کر جائیں گے یا ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ کر؟"

سکھیا نے کہا۔ "خطرہ پنجاب میں ہے۔ کیونکہ یہاں کی پولیس بادل کی شکل سے واقف ہے

اور ابھی تازہ تازہ اس نے وارداتیں بھی کی ہیں۔ اس لیے تمھارا چھپ کر ہی جانا بہتر رہے گا کیا خیال ہے بادل؟"

بادل اس معاملے میں سکھیا سے متفق تھا کہنے لگا۔ "ٹرک میں ایسی جگہ بنا لیں گے جہاں دن کے وقت چھپ کر بیٹھے رہیں گے رات کو باہر نکل آئیں گے"۔

سکھیا بولا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا باقی تم راستے میں پولیس کی چیکنگ کی فکر نہ کرو۔ ایسے ٹرک کی چیکنگ ہو سکتی ہے جس پر سرکاری سامان لدا ہوا ہو مگر یقین کرو ہمارے ٹرک کی چیکنگ نہیں ہوگی۔ یہاں سے لے کر جموں کشمیر تک سارے روٹ کی پولیس میرے دوست کی خریدی ہوئی ہے ان کو گھر بیٹھے بیٹھے باقاعدہ بھتہ ملتا ہے"۔

بادل کے لیے یہ بھی حوصلہ افزا بات تھی اس کے باوجود بادل نے ندیم سے یہ ضرور کہا کہ ہمیں ہر وقت چوکس رہنے کی ضرورت ہوگی۔ اگر راستے میں کہیں کوئی گڑبڑ ہو گئی تو یاد رکھو ہمیں جدھر سینگ سمائے بھاگ جانا ہوگا اور ہم واپس اس سکھیا کے مکان میں ہی آئیں گے"۔

رات ندیم اور بادل نے کچھ سو کر اور زیادہ جاگ کر گزاردی ابھی رات کا کچھ حصہ باقی تھا کہ سکھیا آگیا تینوں مکان سے نکل کر اس اڈے پر آگئے جہاں ڈرائیور بوگن کوچ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ سکھیا نے بادل اور ندیم کو اس سے ملوایا اور کہا۔ "بوگن یہ میری امانتیں ہیں انھیں اپنی حفاظت میں جموں پہنچانا ہے باقی سب کچھ میں نے تمھیں بتا دیا ہے"۔

بوگن نے ندیم اور بادل سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ "کوئی بات نہیں ہے دادا سمجھو تمھاری امانتیں جموں پہنچ گئیں۔ میں نے ان کے بیٹھنے کے لیے ٹرک کے پیچھے جگہ بنا رکھی ہے۔ دن کے وقت انھیں یہاں چھپنے کی ضرورت ہوگی۔ رات ہم اپنی جگہ پر پہنچ کر سوئیں گے"۔

ٹرک میں ناریلوں کے بڑے بڑے ٹوکرے لدے ہوئے تھے ان میں اناس بھی تھے ان کے بیچ میں آگے جا کر دو آدمیوں کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنا دی گئی تھی۔ ٹرک اس وقت اڈے سے باہر نکل کر کھڑا تھا بوگن نے یہ جگہ ندیم اور بادل کو دکھائی اور کہا۔ "دادا تم دونوں یہاں مزے سے بیٹھو چاہے سو جاؤ فکر مت کرنا کوئی تمھیں پوچھنے نہیں آئے گا ہمارے لیے سارا راستہ صاف ہوتا ہے"۔

اور وہ بڑی کا کش لگا کر ہنسنے لگا اس کو کچھ خبر نہیں تھی کہ جس آدمی یعنی بادل کو وہ یہ بات سمجھا رہا ہے وہ اس علاقے کا بدنام ترین خونخوار ترین ڈاکو ہے۔ بادل نے بوگن کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ذرا کاندھا دبایا اور کہا "بڑے اچھے آدمی ہو بوگن"

پھر اس نے سکھیا کو گلے لگا لیا۔ گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ ندیم نے بھی سکھیا سے ہاتھ ملایا اور اس کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ بوگن نے اشارہ کیا کہ ٹرک میں بیٹھ جاؤ وقت ہو گیا ہے۔

بادل اور ندیم ٹرک میں چڑھ کر ناریل اور انناس کے ٹوکروں کے درمیان پیچھے جا کر بیٹھ گئے۔ ان ناریلوں میں سے ایک ہزار کے قریب ایسے ناریل تھے جن میں چرس اور کوکین کی تھیلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے درمیان ٹرک کے کونے میں بیٹھنے کے لیے اچھی خاصی جگہ بنی ہوئی تھی ہوا کا بھی انتظام تھا۔ ندیم اور بادل ناریل کے بوروں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ٹرک سٹارٹ ہوا اور اپنے طویل روٹ پر روانہ ہو گیا۔

ابھی رات کا اندھیرا تھا۔ ٹرک شہر سے نکل کر گرینڈ ٹرنک روڈ پر آ گیا۔ یہ روٹ دلی سے انبالہ جالندھر اور ہوشیار پور سے کٹھوعا اور پھر جموں کا تھا۔ جالندھر سے ٹرک نے اپنا روٹ ہوشیار پور کٹھوعا کی طرف تبدیل کرنا تھا۔ ندیم اور بادل جہاں بیٹھے تھے وہاں ٹرک پر لدے ہوئے ٹوکروں اور بوروں کے درمیان صبح کی روشنی آنے لگی۔ ایک جگہ ٹرک رُک گیا اور بوگن نے ٹرک کو جان بوجھ کر اڈے سے کچھ فاصلے پر کھڑا کیا تھا اس نے خود بھی ناشتہ کیا اور بادل اور ندیم کو بھی ناشتہ کروایا۔ دونوں ٹرک میں سے باہر نکل آئے تھے یہاں ایک جانب ہرے بھرے کھیت دور تک پھیلتے چلے گئے تھے ٹرک یہاں سے چلا تو دوسرے شہر جا کر رکا۔ یہاں ٹرک میں پیٹرول ڈالا گیا۔ پھر ایک تاریخی شہر سے ''پانچ چھ میل پیچھے ٹرک روک کر ایک ڈھابے میں کھانا کھایا۔

یہاں سے ٹرک چلا تو اس شام کو ایک جگہ پہنچ کر ہی دم لیا۔ ٹرک کی رفتار ڈرائیور نے خاصی تیز رکھی ہوئی تھی۔ اس بوسیدہ سی آبادی والے علاقے میں ٹرک ایک پیپل کے درخت تلے جا کر رک گیا۔ بادل اور ندیم باہر نکل آئے بیٹھے بیٹھے ان کے گھٹنے چڑھ گئے تھے۔ باہر نکل کر

انھوں نے تھوڑی سی ورزش کی۔ بوگن نے انھیں بتایا کہ یہ شہر کی باہر والی بستی ہے اور رات وہ اپنے آدمی کے ڈیرے پر گزاریں گے یہ رات بھی خیریت سے گزر گئی۔ بادل ایک ایک میل گن گن کر طے کر رہا تھا اسے اگرچہ بڑی امید دلائی گئی تھی کہ راستے میں کہیں بھی چیکنگ نہیں ہوگی۔ پھر بھی وہ بے حد محتاط تھا اور ہر قسم کی صورتِ حال کے لیے اپنے آپ کو اور ندیم کو تیار کیے ہوئے تھا۔

اس شہر سے ٹرک منہ اندھیرے روانہ ہوا۔ اب انھیں ایک اور شہر میں رات بسر کرنی تھی۔ پھر وہ علاقہ آ گیا۔ ٹرک یہاں تھوڑی دیر کے لیے رُکا۔ بادل اور ندیم کو کچھ ایسی آوازیں آئیں جیسے بوگن کسی پولیس والے سے باتیں کر رہا ہے وہ ہنس ہنس کر بول رہا تھا۔ پولیس والے نے ٹرک پر دو ایک بار ڈنڈا مارا اور اس کی آواز آئی "سیٹھ کو بول دینا ہمارا کم ہے اسے بڑھا دے مہنگائی بہت ہو گئی ہے"۔

بوگن نے ہنس کر کہا "فکر نہ کر دادا! سب ٹھیک ہو جائے گا"

بادل نے ندیم کے کان میں کہا۔ "یہ پولیس کانسٹیبل ہے"۔

ٹرک یہاں سے چلا تو بادل نے خدا کا شکر ادا کیا۔ پھر سفر کرتے ہوئے رات ہو گئی۔ یہ ایک بڑا شہر تھا یہاں پولیس اور خفیہ پولیس جگہ جگہ پھرتی رہتی ہے۔ بوگن بادل اور ندیم کو ایک خفیہ اڈے پر لے گیا اور تاکید کر دی کہ وہاں سے باہر نہ نکلیں۔ بادل خود بھی یہی چاہتا تھا اس کوٹھڑی میں انھوں نے رات بسر کرنی تھی اور صبح منہ اندھیرے وہاں سے آگے کی طرف روانہ ہونا تھا۔ اس کوٹھری میں بوگن ان کو کھانا دے گیا۔ کھانا کھانے کے بعد بادل اور ندیم باتیں کرنے لگے۔ ندیم نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ آدھے سے زیادہ راستہ طے ہو گیا ہے"۔ بادل کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اسے جیپ کے آنے اور رکنے کی آواز سنائی دی۔ بادل نے جلدی سے ندیم کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ دونوں ہمہ تن گوش ہو گئے۔ ان کے کان باہر جیپ کی آواز پر لگے ہوئے تھے جس کا انجن ابھی تک چل رہا تھا۔ پھر بوگن کی آواز آئی۔ "آؤ دادا! آج تھانے سے نکل کر ادھر کیسے آنا ہوا؟" بادل اور ندیم ایک دم ساکت سے ہو گئے یہ کوئی پولیس افسر تھا جو خدا جانے کیوں وہاں آ گیا تھا

بادل اور ندیم نے دروازے کے ساتھ کان لگا دیئے۔

باہر سے جیپ کے انجن کی آواز آنی بند ہو گئی۔ پھر بوگن کی کسی پولیس افسر سے باتیں کرنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آتی رہیں۔ وہ ماہانہ رقم میں اضافے کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ندیم اور بادل نے اطمینان کا سانس لیا۔ تھوڑی دیر بعد جیپ اسٹارٹ ہوئی اور اس کی آواز آہستہ آہستہ دور ہوتے ہوئے غائب ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد بوگن اندر آگیا اور بولا "علاقہ کا ایس ایچ او تھا وہ اپنی رقم کی بات کر رہا تھا۔ تم بے فکر ہو کر سو جاؤ صبح صبح جگا دوں گا۔ ہم تین بجے یہاں سے چلیں گے۔"

بادل اور ندیم کو بارہ ایک بجے تک نیند نہ آئی۔ انھیں دھڑکا ہی لگا رہا کہ کہیں ان کی مخبری نہ ہو جائے اور پولیس پارٹی اچانک چھاپہ نہ مار دے۔ مگر ڈیڑھ بجے تک باہر خاموشی طاری رہی۔ اس کے بعد وہ سو گئے۔ منہ اندھیرے بوگن نے آکر انھیں جگا دیا۔ دونوں ٹرک کے نیچے اپنی خاص جگہ پر گھس کر بیٹھ گئے اور ٹرک روانہ ہو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ ٹرک کو شہر سے نکلتے ہوئے لگ گیا۔ جب سڑک پر دونوں طرف خاموشی ہو گئی تو بادل سمجھ گیا کہ ٹرک شہر سے نکل آیا ہے۔ پھر ٹرک کے اندر آہستہ آہستہ دن کی روشنی ہونے لگی۔ ٹرک انبالے اور پانی پت سے بھی گزر گیا۔ لدھیانہ پہنچ کر انھوں نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ ندیم اور بادل کو باہر نکال کر ایک درخت کے نیچے بٹھا کر بوگن نے کھانا دیا۔ بوگن نے کہا "آگے جالندھر آرہا ہے۔ میں وہاں نہیں رکوں گا وہاں سے میں ٹرک کا رخ ہوشیار پور کی طرف کر دوں گا۔ ہم رات ہونے سے پہلے پہلے جموں پہنچ جائیں گے۔ تم بالکل فکر نہ کرو سب ٹھیک

ہو جائے گا۔ دیکھ لو کہیں بھی ٹرک کی چیکنگ نہیں ہوئی پیسہ ہر جگہ کام آرہا ہے۔"

اور وہ ہنسنے لگا۔

ٹرک لدھیانہ سے جالندھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جالندھر آیا تو سڑک پر ٹریفک بڑھ گیا یہاں سے بادل اور ندیم نے اندازہ لگایا کہ وہ جالندھر شہر میں سے گزر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ٹرک مختلف سڑکوں سے ہوتا ہوا ایک نسبتاً کم ٹریفک والی سڑک پر آگیا۔ یہ سڑک سیدھی جموں جاتی تھی۔ یہاں ٹرک کی رفتار تیز ہو گئی۔ دن کے چار بجے وہ ہوشیار پور پہنچے۔ نیم پہاڑی علاقہ یہاں سے شروع ہو گیا تھا۔ یہاں بوگن نے بادل اور ندیم کو باہر آنے کا اشارہ دیا۔ وہ ٹرک کی سائیڈ کو تین بار کھٹکھٹا کر اشارہ دیتا تھا۔ اس سفر میں بوگن کے ساتھ کلینر نہیں ہوتا تھا۔ اسے کلینر ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ہوشیار پور میں دھوپ نکلی ہوئی تھی اور فضا میں خنکی شروع ہو گئی تھی۔ یہاں انھوں نے چائے وغیرہ پی ایک نالے پر منہ ہاتھ دھویا۔ تھوڑی دیر آرام کیا اور پھر ٹرک میں گھس گئے۔ بوگن نے انھیں بتا دیا تھا کہ ٹرک یہاں سے چل کر اب جموں ہی جا کر رکے گا۔ بادل نے بوگن کو بتایا کہ انھیں دریائے توی پار کرنا ہوگا اور پل پر دونوں جانب پولیس ہوتی ہے جو ہر گاڑی کی ضرور چیکنگ کرتی ہے۔

بوگن نے بیڑی نکال کر سلگائی اور ہنس کر بولا "دادا! توی دریا کے پل والے سپاہی ہم سے سب سے زیادہ پیسے لیتے ہیں۔ وہ تو ہمارے ٹرک کو ہاتھ تک نہیں لگاتے۔ دور سے میری شکل دیکھ کر راستہ کھول دیتے ہیں۔"

ٹرک جموں کی طرف روانہ ہو گیا۔ کٹھوعا بھی گزر گیا آگے جموں تھا۔ اب شام کا اندھیرا بہت ہرا ہو گیا تھا۔ جموں پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ ڈرائیور بوگن نے جموں شہر سے باہر ایک پٹرول ہپ کے آگے ٹرک کھڑا کر دیا۔ یہاں اس نے تیل وغیرہ ڈلوایا اور کوئی چھ سات میل آگے ے جا کر ایک جگہ ٹرک روک دیا۔ اس نے ٹرک کی سائیڈ کو ہاتھ سے تین بار بجایا۔ ندیم اور ادل ٹرک سے باہر آگئے۔ انھیں اپنے سامنے اور دائیں بائیں پہاڑی ڈھلانوں اور وادی ں جموں شہر کی روشنیاں جھلملاتی نظر آئیں۔ بوگن بیڑی پی رہا تھا۔ بادل کو باہر آتے دیکھ ر اس نے اپنی جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک پستول نکال لیا۔ بادل ایک سیکنڈ کے لیے

بوکھلا سا گیا۔

بوگن نے مسکرا کر کہا "ایسی کوئی بات نہیں، یہ پستول بھرا ہوا ہے۔ اسے اپنے پاس رکھو مجھے آگے خطرہ لگ رہا ہے۔ میری اسٹین گن میرے پاس موجود ہے۔ اگر ایسی ویسی بات ہوئی تو تم بھی اندر سے فائرنگ شروع کر دینا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

بادل نے اطمینان کا سانس لیا اور بھرا ہوا پستول لے کر رکھ لیا اور پوچھا "خطرہ کس کا ہے۔؟"

بوگن نے بیڑی کا کش لگایا اسے ایک طرف پھینک کر بولا "بس کوئی ایس پی گارڈ وغیرہ لے کر آیا ہوگا۔ جب تک میں گولی نہ چلاؤں تم مت چلانا۔" یہ کہہ کر بوگن اپنی سیٹ کی طرف بڑھا۔ ندیم نے بادل سے کہا "کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

بادل نے پستول جیب میں ڈالی اور بولا "اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

ٹرک کشادہ سڑک پر سے گذرتا دریائے توی کے پل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بوگن کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید پل پر ایس پی یا ڈی ایس پی وغیرہ چیکنگ کے لیے موجود ہو۔ کسی نے مخبری کر دی ہو۔ ٹرک کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔ بوگن ڈرائیور کی نظریں اندھیرے میں پل کی روشنیوں کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ پل کے اس طرف چیک پوسٹ پر بوگن کو پولیس کی وہی شکلیں نظر آئیں جنھیں وہ ہر پھیرے پر دیکھا کرتا تھا۔ اسٹین گن اس نے اپنے سامنے کلچ والی جگہ پر رکھی ہوئی تھی۔ جہاں سے وہ ذرا سا جھک کر اسے اپنی گرفت میں لے سکتا تھا۔

پل پر چیک پوسٹ کے پاس بوگن نے ٹرک کو روک دیا۔ ہردیال سنگھ کانسٹیبل اس کی طرف بڑھا۔ بوگن نے مسکراتے ہوئے اسے سلام کیا۔ ہردیال سنگھ نے کھڑکی کے قریب آ کر آہستہ سے کہا "جلدی سے نکل جا آج ایس پی صاحب کے آنے کا خطرہ ہے۔ تو نکل جا میں پل کی دوسری پوسٹ پر اطلاع کر دیتا ہوں۔"

بوگن کی چھٹی حس نے یونہی اسے چوکس نہیں کیا تھا۔ اس نے سلام کر کے ٹرک پل پر بڑھا دیا۔ پل کے دوسرے کنارے ڈوگرہ ہیڈ کانسٹیبل کالی رام ہاتھ کے اشارے سے بوگن کو جلدی

سے ٹرک نکال لے جانے کا اشارہ کر رہا تھا۔ یہ دونوں بوگن کے مالک سے ہر ماہ چار چار ہزار روپے وصول کرتے تھے۔ بوگن ٹرک کو تیزی سے نکال کر لے گیا۔ پل سے کافی دور جانے کے بعد بوگن نے ٹرک کو سڑک کے کنارے ایک طرف کھڑا کیا نیچے اتر کر ٹرک کی سائیڈ پر تین بار ہاتھ مارا۔ ندیم اور بادل ناریل کے بوروں کے پیچھے سے نکل آئے بوگن بولا "خطرہ تھا مگر ٹل گیا ہے دادا پستول واپس دے دو اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

بادل نے پستول بوگن کو واپس کر دیا اور بائیں جانب کے اونچے اونچے پہاڑوں کی طرف دیکھ کر کہا "بوگن دادا یہاں سے وہ علاقہ شروع ہو جاتا ہے جہاں ہمیں ٹرک سے اترنا ہوگا۔"

بوگن بولا "تو پھر اب تم دونوں میرے پاس آ کر بیٹھ جاؤ۔ اب اندر چھپنے کی کیا ضرورت ہے؟"

بادل اور ندیم نے بھی اطمینان کا سانس لیا اور وہ ٹرک کی اگلی سیٹ پر بوگن کے ساتھ آ کر بیٹھ گئے۔ بوگن نے کہا "جہاں اترنا ہو ہمیں بتا دینا۔"

ٹرک جموں کشمیر روڈ پر رات کے اندھیرے میں دوڑا چلا جا رہا تھا۔ وہ شہر سے کافی دور نکل آئے تھے۔ بادل ایک ایک جگہ کو غور سے دیکھے جا رہا تھا۔ اندھیرے میں بھی اس نے ایک خاص درخت کی نشانی کو اپنے ذہن میں رکھا ہوا تھا۔ جب وہ درخت بادل کو نظر آیا تو اس نے بوگن سے کہا "بس دادا اس درخت کے آگے جہاں سڑک بائیں جانب جاتی ہے وہیں ٹرک روک لینا۔"

تھوڑی دیر بعد ٹرک اس کچی سڑک کے پاس رک گیا جو جموں کشمیر روڈ میں سے نکل کر بائیں جانب دور دراز پہاڑیوں کی طرف نکل گئی تھی۔ بادل نے بوگن ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا اور ندیم کو ساتھ لے کر کچی سڑک پر چل پڑا۔ ندیم نے دور پہاڑیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیا ان پہاڑیوں کے اوپر جانا ہے۔"

بادل نے کہا "نہیں ان پہاڑیوں کی دوسری طرف جانا ہوگا تمھیں اور مجھی کو، کیونکہ ان پہاڑیوں کی دوسری طرف پاکستان ہے۔"

ندیم کے دل سے ایک آہ نکل گئی۔ کہنے لگا "بادل! ایک بار پاکستان پہنچ گیا تو پھر وہاں سے کبھی باہر نہیں جاؤں گا۔ اس بار پاکستان سے باہر آ کر محسوس ہوا کہ اپنا وطن کیا

ہوتی ہے۔ واقعی انسان کی عزت اور سلامتی صرف اپنے وطن میں ہی ہے۔"

بادل کہنے لگا: "اس میں کوئی شک نہیں۔ کاش میں بھی تمھارے ساتھ پاکستان جا سکتا۔"

ندیم نے کہا: "تو تم ہمارے ساتھ چلے کیوں نہیں جاتے بادل؟ یہاں انڈیا میں تمھارے لیے سوائے جیل اور خواری کے اور کیا ہے۔"

بادل نے چلتے چلتے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور کہنے لگا: "ندیم تم ابھی چھوٹے ہو۔ ہاں اگر کبھی میں پاکستان آیا تو وعدہ کرتا ہوں تمھیں اور نجمی سے ضرور ملوں گا۔"

سڑک اونچی نیچی تھی اور اس پر چھوٹے چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ ندیم نے پوچھا کہ انھیں کتنی دور تک چلنا ہو گا۔ بادل نے کہا: "ابھی چار میل چلنا ہو گا۔"

رات گہری ہوتی جا رہی تھی، سردی بھی بڑھ گئی تھی لیکن پیدل چلنے کی وجہ سے انھیں زیادہ احساس نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ کچھ دیر بعد تو ندیم کو پسینہ آ گیا۔ جب چار میل کی مسافت بھی طے ہو گئی ندیم نے سانس درست کرتے ہوئے پوچھا: "ابھی کتنی دور اور چلنا ہو گا بادل بھائی؟"

بادل نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ندیم کو لے کر ایک ٹیلے کا موڑ گھوما تو کچھ فاصلے پر انھیں ٹمٹماتی ہوئی روشنی دکھائی دی۔ بادل نے اس روشنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "ہمیں وہاں جانا ہو گا۔"

یہ سوچ کر ندیم کا دل دھڑکنے لگا کہ وہاں نجمی اس کا انتظار کر رہی ہو گی اس کے منہ سے اپنے آپ نکل گیا: "نجمی کی صحت ٹھیک ہے نا بادل بھائی۔؟"

بادل نے مسکراتے ہوئے کہا: "یہ بات تمھیں پہلے یاد کیوں نہیں آئی؟"

ندیم نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا: "اسے اپنے قریب پا کر بس اپنے آپ ہی یہ سوال منہ سے نکل گیا۔"

بادل نے کہا: "وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ تمھارے لیے بے حد پریشان تھی...... وہ تو تمھاری تلاش میں ایک بار پھر دلی آنے لگی تھی۔ میں نے اسے روک دیا۔ اور ہاں نجمی میں ایک تبدیلی ضرور محسوس ہو گی۔"

"وہ کیا؟" ندیم نے کسی قدر تجسس سے پوچھا۔

بادل بولا: "اس کے سر پہ بال نہیں ہیں۔"

اور بادل نے قہقہہ لگایا۔ ندیم کو اس نے بتایا تھا کہ نجمی کو جوگن کا بھیس بدلنے کی خاطر اپنے سر کے بال منڈوانے پڑے تھے۔

بادل نے کہا: "ندیم! نجمی نے میری خاطر بڑی قربانی دی ہے اور اس نے جس دلیری سے کام لیتے ہوئے مجھے جیل بلکہ پھانسی کی کوٹھڑی سے نکالا ہے میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ مجھ پر اس کا بڑا احسان رہے گا۔"

ندیم کہنے لگا: "کوئی بات نہیں بال تو سر پر پھر اُگ آئیں گے۔"

"وہ اب سر پہ نیلا رومال باندھے رکھتی ہے۔" بادل نے کہا۔

وہ دونوں اب بلے اسمگلر کی حویلی کے قریب پہنچ رہے تھے۔ بادل اور ندیم کے بارے میں لال دین نے بلے کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ ندیم اور بادل کی سب سے بڑی پہچان خود نجمی تھی جس نے ان دونوں کو پہچاننا تھا۔ حویلی کے قریب پہنچے ہی تھے کہ دو آدمی اسٹین گنیں تان کر ان کے سامنے آ گئے۔ بادل نے ندیم کو ہاتھ سے اپنے پیچھے کر لیا اور ایک خاص کوڈ لفظ بولا جس کے جواب میں ان میں سے ایک نے بھی جواب میں ایک خاص لفظ بولا۔ بادل نے کہا: "مجھے بلے کے پاس لے چلو۔ میں اس کا مہمان ہوں۔"

اتنے میں حویلی کے کونے والے برآمدے میں سے بلا اسمگلر بھی اسٹین گن پکڑے باہر نکل آیا۔ اس نے بادل اور ندیم کو روشنی میں اپنے قریب آنے کو کہا۔ پھر اپنے آدمی کو اشارہ کیا۔

نجمی کو اندر دیکھ کر ندیم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ نجمی نے ندیم اور بادل کو دیکھا اور بلے سے کہا: "یہی میرے آدمی ہیں۔" بلے نے اسٹین گن کی نالی نیچے کر لی اور بادل سے کہا: "تم لوگ اندر چلے جاؤ۔"

ندیم اور بادل نجمی کی طرف بڑھے۔ نجمی نے سر پہ نیلا رومال باندھ رکھا تھا کیونکہ اس کے سر پہ بال نہیں تھے۔ ندیم نے محبت بھری آواز میں کہا: "مجھے یقین نہیں آ رہا کہ میں تمھیں اپنے پاس دیکھ رہا ہوں۔"

نجمی نے کسی قدر غصے سے کہا "میں تمھیں دوبارہ یہاں نہیں دیکھنا چاہتی تھی تمھیں کس احمق نے یہ مشورہ دیا تھا کہ تم دوبارہ بارڈر کراس کر کے اس جہنم میں آؤ"۔ ندیم نے آہستہ سے کہا "میرے دل نے۔"

نجمی کا دل بھی اب دھڑک اٹھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ندیم نجمی سے بے پناہ پیار کرتا تھا۔ اگرچہ اسی وجہ سے نجمی آج اس حالت میں پہنچی تھی۔ لیکن ندیم نے بھی اپنی ساری زندگی اور جوانی کی ساری خوشیاں اور آرام اس پر قربان کر دیا تھا۔ وہ بار بار موت کے منہ سے نکل کر نجمی سے ملنے اور اسے وہاں سے نکالنے آیا تھا۔ نجمی نے ندیم کا ہاتھ تھام لیا اور اسے اپنے ساتھ اندر لے گئی۔ بلے نے اپنے آدمی کے ہاتھ ان کے لیے کھانا بھجوایا اور یہ پیغام بھی کہ وہ کل ان سے ملاقات کرے گا۔ ندیم، بادل اور نجمی کھانا کھانے کے بعد دیر تک باتیں کرتے رہے۔ نجمی کو شبہ تھا کہ وہ بارڈر کراس کر سکیں گے۔ اس نے بادل سے کہا کہ بلا اسمگلر کسی سے باتیں کر رہا تھا کہ بارڈر پر نئی سیکورٹی فورس آ گئی ہے۔ بادل نے کہا "یہ تو اس سے بات کر کے ہی کچھ معلوم ہو سکے گا۔" رات گزر گئی۔ دوسرے دن بلا ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور بولا "تمھیں بارڈر کراس کرانا میرا فرض بن گیا ہے۔ حالات سازگار نہیں ہیں لیکن میں نے ایک راستہ تلاش کر لیا ہے۔ وہاں سے تم لوگوں کو آدھی رات کے بعد گزرنا ہو گا۔ وہاں قدم قدم پر خطرہ ہو گا۔ لیکن تمھیں ان خطروں کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ ورنہ تم ان حالات میں کبھی بارڈر کراس نہیں کر سکو گے۔"

بادل نے کہا "نجمی اور ندیم سخت جان ہیں انھیں مشکلیں برداشت کرنے کی عادت ہے۔ تم فکر نہیں کرو۔"

بلے نے کہا "ٹھیک ہے پھر آج رات تیار رہنا۔ میں تمھیں لے کر ٹھیک نو بجے رات یہاں سے چل پڑوں گا۔" بلا اسمگلر یہ کہہ کر چلا گیا۔ بادل نے اس کے جانے کے بعد نجمی اور ندیم سے کہا "آج رات نو بجے تم اپنے وطن کی طرف سفر شروع کرو گے۔ یہ سفر خطرناک ضرور ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ خدا کی مدد سے تم اپنے پیارے وطن پہنچ جاؤ گے۔"

ندیم بولا "یہ شخص کہاں تک ہمارے ساتھ جائے گا؟"

نجمی نے کہا "جہاں تک وہ جا سکتا ہے جائے گا۔ ایک خاص حد کے بعد ہمیں خود ہی بارڈر کراس

کرنا ہو گا۔ کیا تم ڈر رہے ہو ندیم؟"

ندیم نے محبت بھری نظروں سے نجمی کی طرف دیکھا اور بولا "تم میرے ساتھ ہو تو پھر موت بھی مجھے خوفزدہ نہیں کر سکتی۔"

نجمی کے چہرے پر محبت کی روشن مسکراہٹ پھیل گئی۔ یہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر بادل پہلی بار دیکھ رہا تھا وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔ ندیم اور نجمی کوٹھری میں اکیلے رہ گئے۔ ندیم نے نجمی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا "مجھے معاف کر دینا نجمی۔ میں نے دوبارہ بارڈر کراس کر کے تمھیں ذہنی کوفت دی لیکن یقین کرو تمھارے بغیر وہاں ایک لمحے کے لیے بھی میرا دل نہیں لگتا تھا۔"

نجمی نے اپنا ہاتھ آہستہ سے کھینچتے ہوئے پوچھا "شبانہ لاہور میں ہی ہے کیا؟"

ندیم نے اسے بتایا کہ شبانہ اپنے خاوند کے پاس امریکہ چلی گئی ہے۔ نجمی نے پھر اپنے گھر والوں کے بارے میں دریافت کیا۔ اتنا نجمی کو معلوم تھا کہ اس کا باپ اس کے صدمے سے فوت ہو گیا تھا اور سوتیلی ماں اپنے بیٹے کو لے کر گاؤں چلی گئی تھی۔ ندیم نے کہا "تمھارے گھر کو تمھاری ماں نے بیچ دیا ہے۔ وہاں دوسرے لوگ آ کر رہنے لگے ہیں۔ تمھاری سوتیلی ماں پھر لاہور نہیں آئی۔"

نجمی کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے لگی "ندیم اگر میری سوتیلی ماں تمھارے ساتھ میرا نکاح کرنے پر راضی ہو جاتی تو آج ہم یہاں نہ ہوتے۔"

ندیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ نجمی کی ساری مصیبتوں اور اذیتوں کا باعث وہی ہے۔ اگر وہ اسے گھر سے بھگا کر اپنے ساتھ کراچی نہ لے جاتا تو یہ نوبت کبھی نہ آتی۔ نجمی نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ کہ ہمیں بھی کوئی اسلحہ اپنے ساتھ رکھنا چاہیئے کیا؟"

ندیم نے کہا "اسلحے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میرا خیال ہے ہمیں تو چوری چھپے بارڈر کراس کرنا ہو گا۔"

شام کا کھانا کھانے کے بعد بادل ندیم اور نجمی اپنی کوٹھری میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ بلا اسمگلر اندر آ گیا کہنے لگا "تم دونوں تیار رہنا؟"

نجمی اور ندیم نے بلے کی طرف دیکھا۔ بادل بولا "ہم تو بالکل تیار ہیں لالہ۔"

بلے نے ندیم اور نجمی کی طرف انگلی اٹھا کر کہا "میں ان سے پوچھ رہا ہوں۔"

نجمی نے کہا "ہم تیار ہیں۔"

یہی جواب ندیم نے بھی دیا۔ بلا اسمگلر ذرا کھانس کر بولا "ایک بات یاد رکھنا۔ سرحد تمھیں اکیلے ہی پار کرنا ہوگی۔ اگر سیکورٹی فورس کی طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی تو وہیں لیٹ جانا اور لیٹے لیٹے بارڈر کی طرف جانا۔ اگر اٹھے تو سیکورٹی فورس کی گولیاں تم دونوں کو بھون کر رکھ دیں گی۔ دوسری بات.... اگر پکڑے گئے تو چاہے کچھ ہو جائے میرا نام نہ لینا۔"

ندیم اور نجمی نے بلے کو یقین دلایا کہ وہ اس کی ہدایت کے مطابق چلیں گے اور پکڑے جانے کی صورت میں اس کا نام زبان پر نہیں آئے گا۔ بلے اسمگلر کو ان پر زیادہ یقین نہیں تھا لیکن وہ اپنے دیرینہ دوست لال دین کی وجہ سے ان لوگوں کو بارڈر کراس کرانے پر مجبور تھا۔ بلا اسمگلر رات نو بجے آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ رات کو ٹھیک نو بجے جیپ تیار تھی وہ سب لوگ اس میں سوار ہوئے اور جیپ پہاڑی راستے پر بارڈر کی طرف روانہ ہو گئی۔ بلے اسمگلر کے ساتھ اس کے تین محافظ تھے جنھوں نے اسٹین گنیں تھام رکھی تھیں۔ جیپ اونچے نیچے پہاڑی راستے پر ایک خاص رفتار کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ جیپ کی بتیاں بجھا دی گئی تھیں۔ بلا خود جیپ چلا رہا تھا۔ اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بادل اور بلے کا ایک محافظ بیٹھا تھا۔ نجمی اور ندیم جیپ کے پیچھے بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ دو مسلح محافظ تھے۔ جیپ اوپر سے بند تھی۔ سائیڈ پر ترپال میں ایک ایک کھڑکی رکھی تھی جس میں سے ندیم اور نجمی کو سوائے اندھیرے کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ان اونچے نیچے سنگلاخ پہاڑی راستے پر جیپ ایک گھنٹہ تک چلتی رہی۔ پھر بلے نے جیپ روک دی۔ یہاں اس کے چار آدمی ایک ٹیکری کے پیچھے خچر لیے کھڑے تھے۔ یہاں جیپ چھوڑ دی گئی اور وہ خچروں پر سوار ہو گئے۔ اب دشوار گزار پہاڑی راستہ تھا۔ کبھی چڑھائی آ جاتی کبھی اترائی۔ کہیں کسی دیہاتی آبادی کا نشان بھی نہیں تھا۔ بلے نے ندیم کو بتایا کہ یہ سارا علاقہ غیر آباد ہے اور انڈین فوج کی تحویل میں ہے۔ خچروں پر سفر کافی تکلیف دہ اور لمبا تھا۔ گیارہ بجے رات وہ ایک اونچا پہاڑ پار کر کے اس کی دوسری طرف پہنچے تو ندیم اور نجمی نے دیکھا کہ آگے اونچی نیچی ٹیکریوں کا ایک طویل سلسلہ اندھیرے میں ستاروں بھرے آسمان کے نیچے پھیلتا چلا گیا تھا۔ یہاں پہنچ کر خچروں کو بھی واپس بھیج دیا تھا۔ بلے نے بادل سے کہا "یہاں سے تم بھی ان کے ساتھ ہی واپس

چلے جاؤ کیونکہ اب آگے تمھارا کام نہیں ہے۔ میں اکیلا ہی انھیں بارڈر کی آخری پٹی تک لے جاؤں گا۔ میرے ساتھ میرا ایک مسلح محافظ ہوگا۔"

بادل کا نجمی اور ندیم کو چھوڑنے کا دل نہیں چاہتا تھا مگر وہ مجبور تھا۔ ندیم بادل کے گلے لگ گیا اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

رات اندھیری تھی۔ پہاڑیوں میں تاریک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نجمی نے بادل کی طرف اندھیرے میں دیکھا اور کہا۔

"بادل! تم ایک بہادر آدمی ہو۔ میں بھی بہادر اور دلیر لڑکی ہوں میں چاہتی ہوں کہ ہم بہادر آدمیوں کی طرح ایک دوسرے سے جدا ہوں۔ شاید اس کے بعد ہم زندگی میں کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں۔ تمھاری دوستی کی میں نے ہمیشہ قدر کی ہے اور ہمیشہ اسے عزت اور قدر و منزلت سے یاد کروں گی۔"

نجمی نے ہاتھ آگے بڑھایا بادل نے نجمی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مصافحہ کرتے ہوئے بولا "میں تم دونوں کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ خدا تم دونوں کو ہمیشہ سلامت اور خوش و خرم رکھے بس میری زندگی کی یہی ایک آرزو ہے۔"

بادل نے نجمی کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا کر چھوڑ دیا۔ بلے نے کہا "جلدی کرو۔"

بادل بلے کے آدمیوں کے ساتھ خچر پر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں یہ خچر بلے کے دو مسلح محافظوں کے ساتھ واپس چل پڑے۔ نجمی اور ندیم اس وقت بادل کو دیکھتے رہے جب تک کہ بادل اندھیرے میں ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

اب ندیم اور نجمی کے ساتھ صرف دو آدمی تھے ایک بلا اسمگلر اور دوسرا اس کا مسلح محافظ۔ رات سرد تھی اور آسمان پر ستارے بھی چپ چاپ ان لوگوں کو تک رہے تھے۔ آس پاس چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر ایک مہیب سناٹا چھایا تھا۔ بلا اسمگلر آگے آگے چل رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ رک کر اندھیرے کا جائزہ لیتا ہاتھ کے اشارے سے ندیم اور نجمی کو رکنے کے لیے کہتا فضا میں کچھ سونگھتا اور پھر قدم قدم آگے چل پڑتا۔ پتھروں اور سنگ ریزوں پر چلنے کی وجہ سے ہلکی ہلکی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ بلا ایک ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ وہ ٹیلے کے پہلو سے ہو کر اوپر

ڈھر رہا تھا۔ ندیم، نجمی اور مسلح محافظ بھی اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ ٹیلے کی دوسری طرف ایک گھاٹی تھی جس کے درمیان میں ایک چھوٹا سا پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا۔ انھوں نے وہ نالہ عبور کیا سامنے ایک کالا اونچا پہاڑ آگیا بلا پتھروں پر بیٹھ گیا اور سرگوشی میں بولا "اب بولنا نہیں، کھانسنا نہیں، پاؤں کی آواز پیدا نہ ہو۔ ہم انڈین بارڈر کے قریب آگئے ہیں۔ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔"

بلے اسمگلر کا مسلح محافظ وہیں بیٹھ گیا۔ بلا اکیلا پہاڑ کو جانے والی پگڈنڈی چھوڑ کر چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کے درمیان سے گزرنے لگا۔ ندیم اور نجمی اس کے پیچھے تھے۔ یہ سب جھک کر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے جا رہے تھے۔ اندھیرے میں انھیں بلے اسمگلر کا سایہ سا نظر آرہا تھا۔ ندیم نے نجمی کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ بلا اسمگلر اب ہر چھ سات قدم چلنے کے بعد رک جاتا تھا اور ہاتھ سے ندیم اور نجمی کو بھی رکنے کا اشارہ کر دیتا۔ اس سرد رات میں بھی ندیم اور نجمی کے جسم پسینے میں شرابور ہو گئے تھے۔ اچانک ایک پٹاخہ چھوٹا اور سارا علاقہ گلابی روشنی میں شرابور ہو گیا۔ بلا تیزی سے جھاڑیوں میں بیٹھ گیا۔ ندیم اور نجمی نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ انڈین بارڈر سیکورٹی فورسز نے ایک روشنی کا گولا فضا میں چھوڑا تھا۔ سرخی مائل روشنی کا گولا ننھے سے پیراشوٹ کے ساتھ آہستہ آہستہ زمین پر آتا گیا۔ اس کے بعد ایک بار پھر وہاں اندھیرا چھا گیا۔ بلا اسمگلر رینگتا ہوا ندیم اور نجمی کے پاس آیا اور سرگوشی میں بولا ...

"یہ روشنی کے گولے بارڈر سیکورٹی والے چلاتے رہتے ہیں۔ خاموش لیٹے رہو۔"

دس پندرہ منٹ اسی طرح جھاڑیوں میں شبنم سے گیلی گھاس پر یہ لوگ بے حس و حرکت لیٹے رہے۔ اس کے بعد بلا اسمگلر آہستہ آہستہ آگے بڑھا اس کے ہاتھ سے ندیم اور نجمی کو بھی پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ رینگتے رینگتے یہ لوگ ایک جگہ آگئے جہاں سامنے سے تھوڑی سی کھلی جگہ تھی جہاں ایک خشک نالہ تھا۔ بلے نے ندیم کے کاندھے کے ساتھ اپنا منہ لگاتے ہوئے بہت ہی دھیمی سرگوشی میں کہا "اس خشک نالے کے پار پاکستان کی سرحد شروع ہوتی ہے اس نالے کو پار کرنا تمھارا کام ہے۔ میرا کام تمھیں یہاں تک لانے کا تھا میں واپس جا رہا ہوں۔ تم پر فائرنگ بھی ہو سکتی ہے اب تم جانو تمھارا کام ..... میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔"

اور بلا تیزی سے لیٹے لیٹے پیچھے کو گھوم گیا اور کہنیوں کے بل رینگتا ہوا جھاڑیوں کے اندھیرے

میں گم ہو گیا۔ ندیم اور نجمی وہاں اکیلے رہ گئے۔ انھیں محسوس ہوا کہ وہ دشمن کے پیٹ کے اندر آ گئے ہیں اور کسی بھی وقت ان پر مشین گن کا فائر کھل سکتا ہے۔ ندیم کچھ گھبرا رہا تھا۔ نجمی رینگ کر اس کے قریب آگئی اور اس کے کان میں کہا "اب ہمت ہاری تو تھوڑی دیر بعد یہاں ہماری لاشیں پڑی ہوں گی۔ میرے پیچھے پیچھے آؤ۔"

نجمی انتہائی دلیری کے ساتھ خشک نالے کی طرف رینگنے لگی۔ یہاں زمین اونچی گھاس سے بھری ہوئی تھی انھیں زمین میں لگی ہوئی بارودی سرنگوں کا بھی خطرہ تھا۔ بلے اسمگلر نے ان بارودی سرنگوں کے بارے میں ان دونوں کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ رینگتے رینگتے دونوں خشک نالے کے کنارے پہنچ گئے نالے میں پانی نہیں تھا اس کے کنارے زیادہ اونچے بھی نہیں تھے مگر نالہ کافی کشادہ تھا۔ نجمی نے لیٹے ہی لیٹے اپنے آپ کو نالے میں لڑھکا دیا۔ ندیم نے بھی اس کے پیچھے ایسا ہی کیا۔ وہ خشک نالے کی ریتلی تہہ میں گر پڑے۔ ان کے گرنے سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ دونوں وہیں پڑے رہے۔ جب انھیں یقین ہو گیا کہ ہر طرف خیریت ہے اور ان کے گرنے کی آواز کسی دوسرے نے نہیں سنی تو نجمی نالے میں اس کے دوسرے کنارے کی طرف رینگنے لگی۔ ندیم اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ نالے کے دوسرے کنارے پر گھنی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ جب وہ ان جھاڑیوں کے پاس پہنچے تو نالے میں ایک طرف سے روشنی ہو گئی۔ ساتھ ہی جیپ کے انجن کی آواز سنائی دی۔ وہ تیزی سے لڑھکتے ہوئے جھاڑیوں میں گھس گئے۔ یہ انڈین بارڈر فورس کی جیپ تھی جو تیزی سے خشک نالے میں سے گزر گئی۔ جیپ میں بارڈر فورس کے سپاہی بیٹھے ہوئے تھے۔

نجمی نے آہستہ سے کہا "میرا خیال ہے نالے کے اس کنارے کے پار پاکستانی بارڈر ہے"۔

ندیم نے نجمی کا بازو دباتے ہوئے کہا "جینا تمھارے ساتھ مرنا تمھارے ساتھ اللہ کا نام لے کر پاکستان کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔"

نجمی ابھی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ندیم نے نجمی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور رات کی تاریکی میں جتنی تیز دوڑ سکتا تھا سامنے کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ قسمت ان دونوں مصیبت کے ماروں اور ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرنے والوں کا ساتھ دے رہی تھی۔ قدرت کو بھی اب ان پر رحم آگیا تھا اور وہ دو دلوں کا ملاپ چاہتی تھی۔ وہ ایک ایسی ڈگر پر اندھیرے

میں دوڑ رہے تھے۔ جدھر سے ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک بارڈر اسکواڈ گزرا تھا۔ یہ ایک فرلانگ کا سارا علاقہ جھاڑیوں سے بالکل صاف تھا جو دونوں محبت کرنے والوں نے دوڑ کر طے کر لیا۔ آگے پھر جنگلی جھاڑیوں اور اونچے نیچے مٹی کے تودوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جن پر کانٹی کی لمبی لمبی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ دونوں بے دم ہو کر ان جھاڑیوں کے پاس گر گئے۔ وہ ہانپ رہے تھے وہ ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے ڈر رہے تھے کہ کوئی ان کی آواز نہ سن لے۔ جب ان کا سانس درست ہوا تو انھوں نے وہیں لیٹے لیٹے رینگنا شروع کر دیا۔ مٹی کے تودے ختم ہو گئے شور زدہ زمین آ گئی۔ یہ علاقہ بھی انھوں نے رینگتے ہی پار کیا۔ آگے پھر جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا یہاں وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ نجمی نے ندیم کے کان میں کہا "ہم پاکستان میں آ گئے ہیں" وہ اندھیرے میں سامنے گھور رہے تھے جہاں کالے کالے درختوں کی قطار دائیں سے بائیں جانب دور تک چلی گئی تھی ان کے پیچھے ایک جیپ روشنی کے سیلاب کے ساتھ شور مچاتی تیزی سے گزر گئی۔ ایک طرف پہاڑیاں تھیں جنگلی جھاڑیوں کو پار کرنے کے بعد انھوں نے ٹیلوں کی گھاٹی میں دوڑنا شروع کر دیا۔ یہاں اندھیرے میں پہلی بار انھوں نے ٹیلوں کی ڈھلانوں پر چھوٹے چھوٹے کھیت دیکھے وہ بھاگتے چلے گئے۔ گھاٹی سے نکلے تو سامنے ایک چھوٹی سی پگڈنڈی تھی جو چیڑھ کے درختوں میں گھری ہوئی تھی۔

دور ایک جگہ انھوں نے ٹمٹماتی ہوئی روشنی دیکھی وہ قریب گئے تو ایک چھوٹا سا کچا مکان تھا جس کے باہر لالٹین روشن تھی۔ رات کے دو اڑھائی بجے کا وقت ہو گا۔ سرد ہوا چل رہی تھی پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں سردی تھی مگر ندیم اور نجمی کو بالکل سردی نہیں لگ رہی تھی ندیم نے نجمی کو ایک طرف لے جا کر کہا "کہیں ہم انڈیا کے علاقے میں ہی نہ ہوں۔"

نجمی نے درختوں ٹیلوں اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "یہاں! مجھے میرے پیارے وطن پاکستان کی مٹی کی خوشبو آ رہی ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ۔"

نجمی نے کچے مکان کے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھے نے دروازہ کھول کر پوچھا "کون ہے بھئی اس وقت؟" ندیم نے بے تابی سے پوچھ لیا "یہ پاکستان ہے بابا۔؟"

"ہاں" بوڑھے نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا "تم کہاں سے آ رہے ہو۔ کون ہو تم؟"

نجمی اور ندیم وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ نجمی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ اپنا چہرہ اپنی ہتھیلیوں میں چھپا کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔ ایک مدت کے بعد اس نے اپنے وطن کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ ایک مدت کے بعد اس کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہہ رہے تھے، یہ خوشی کے آنسو تھے، غم کے آنسو تھے، پچھتاوے اور ملال کے آنسو تھے۔ نجمی کو کچھ معلوم نہیں تھا وہ بچوں کی طرح چہرہ تھامے رو رہی تھی۔ بوڑھا حیران کھڑا تھا اور ندیم اسے دلاسہ دینے کی کوشش کرتے ہوئے خود بھی آنسو بہا رہا تھا۔

...

نجمی اور ندیم پاکستان پہنچ گئے۔ نجمی لاہور میں اپنا پرانا مکان دیکھنے گئی اور نہ ہی اپنے کالج کو ایک نظر دیکھنے گئی۔ ایک دن وہ لاہور کے ایک ہوٹل میں وہ ٹھہرے اور اگلے دن پنڈی اور ہری پور ہزارہ سے ہوتے ہوئے ایبٹ آباد اور پھر وہاں سے کاغان کی طرف نکل گئے۔ یہاں ایک گاؤں میں انھوں نے ایک امام مسجد کے پاس جا کر چار مسلمان گواہوں کی موجودگی میں شادی کر لی اور پھر اسی چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں اپنی نئی زندگی شروع کر دی۔

ایک رات اچانک وادی میں گولی چلنے کی آواز گونج گئی۔ نجمی سو رہی تھی۔ اس کا ہاتھ.... بے اختیار دائیں جانب اٹھا جیسے وہ اپنی رائفل اٹھانے لگی ہو۔ اس کا ہاتھ رائفل کی بجائے ندیم کے شانے پر گیا۔ ندیم جاگ پڑا "کیا بات ہے نجمی؟" نجمی مسکرا دی۔

"کہیں گولی کا دھماکہ ہوا تھا۔ میں سمجھی دشمن آ گیا ہے اور میں اپنی رائفل اٹھانے لگی تھی۔"

ندیم نے نجمی کا ہاتھ چوم کر کہا "یہاں دشمن اب کبھی نہیں آئے گا۔" باہر وادی کی سرد رات میں گلاب اور چیڑھ کی خوشبو پھیلتی چلی گئی اور رات چلتے چلتے جیسے رک گئی۔

ختم شد